عنایت اللہ کی ہنگامہ خیز اور سحر انگیز خودنوشت

منزل اور مسافر

حصہ اوّل

عنایت اللہ



گھٹا تو کُھل کے برسی تھی مگر موسم نہ بدلا تھا
یہ ایسا راز تھا جس پہ مری آنکھوں کا پردہ تھا

مرے دامن کے صحرا میں کئی جھیلوں کا قصّہ تھا
جو بادل کی زبانی مَیں ہواؤں کو سناتا تھا

نہ اُس میں کوئی منطق تھی نہ اُس میں کوئی دھوکہ تھا
مری خاطر ہی نکلا تھا جو دانہ میں نے کھایا تھا

حصولِ رزق میں دن بھر نزولِ فکر میں شب بھر
دُھواں بن کر میں اُڑتا تھا فغاں بن کر میں جلتا تھا

مسافر ہوں، منزل سے ابھی دُور ہوں۔

کوئی ایسا دُور بھی نہیں.... اگر قبر ہی انسان کی منزل ہے تو پھر کسی بھی دن، کسی بھی وقت جا پہنچوں گا لیکن دانشور کہتے ہیں کہ انسان کی منزل قبر نہیں ہوتی۔ قبر میں تو انسان مر کر اُترتا ہے بلکہ اُتارا جاتا ہے۔

پھر انسان کی منزل کیا ہے؟

میری منزل کیا ہے؟.... کہاں ہے میری منزل؟

میری زندگی میں ایک دَور ایسا بھی آیا تھا کہ میں پورے یقین اور وثوق سے اپنے آپ سے کہا کرتا تھا کہ میں منزل کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں اور منزل میرے پیچھے بھٹکتی پھر رہی ہے۔

میری اِن باتوں سے آپ کو یہ شک نہیں ہونا چاہیے کہ میں شاید فلسفی ہوں یا عالمِ دین ہوں یا کسی اور علم کا عالم ہوں.... نہ صاحب!.... میں نے صرف دس جماعتیں پڑھی ہیں۔ میٹرک کا سرٹیفکیٹ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے لیکن دس سال لگا کر جو پڑھا تھا وہ میرے ذہن میں محفوظ نہیں۔ میں نے کتابوں میں جو پڑھا تھا وہ میں کبھی کا بھول چکا ہوں۔ میرے پاس جو علم ہے وہ میں نے انسانوں سے حاصل کیا ہے۔

یوں کہہ لیں کہ میں نے انسانوں کو پڑھا ہے۔

دنیا کھُلی ہوئی ایک کتاب ہے۔ اِس سے وہی انسان علم حاصل کر سکتا ہے جو آنکھیں اور دل و دماغ کے دریچے کھول کر رکھے۔

میں آپ کو اپنے سفر کی داستان سُنانے چلا ہوں۔ یہ سفر میرے گھر سے شروع ہُوا اور گھر پر ہی آ کر ختم ہُوا۔ میں ایک بات صاف طور پر کہہ دوں کہ میں اپنا نام ظاہر نہیں کروں گا۔ کسی شہر، قصبے یا گاؤں کا نام صحیح نہیں لکھوں گا۔ صرف اُن لوگوں کے نام صحیح لکھوں گا جن کے ساتھ مجھے ہندوستان میں واسطہ پڑا تھا۔ ہندوستان کے اُن مقامات کے نام بھی صحیح ہوں گے جہاں جہاں میں گیا اور کچھ وقت گزارا تھا۔

یہ داستان سُناتے ہُوئے کہیں کہیں مجھے اپنا کوئی نام لکھنا پڑے گا۔ وہاں میں صفدر خان لکھوں گا۔

میں اپنی زندگی کی اِس داستان کے واقعات اپنے گھر والوں اور دوستوں کی محفلوں میں سُناتا رہا ہوں۔ لکھنے کا کبھی ارادہ نہیں کیا تھا۔ ارادہ تو دُور کی بات ہے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ہُوا یوں کہ محمد خاں مرحوم کی داستان ـــــ "رات کے راہی" ـــــ کی دونوں جلدیں اتفاق سے مجھے ملیں تو وہ مَیں نے ختم کر کے چھوڑیں اور میں ان کے ایڈریس کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ ان کا ایڈریس کہیں سے بھی نہیں مل سکے گا لیکن اُس علاقے سے مَیں واقف تھا۔ ایک جگہ سے اُن کے گاؤں کا ایڈریس مل گیا اور ساتھ یہ خبر کہ انہیں فوت ہُوئے چھ مہینے گزر گئے ہیں۔ پھر بھی وہاں چلا گیا اور فاتحہ پڑھ کر آ گیا۔

پھر "حکایت" کے ہی ادارے کی چھاپی ہوئی دوسری کتاب ـــــ "دھُندلی راہیں" ـــــ کی چاروں جلدیں ہاتھ لگیں۔ یہ سکندر مرحوم کی داستان ہے جو انہوں نے سنائی اور وقاص صاحب نے لکھی ہے۔ مَیں نے ان کا ایڈریس معلوم کر لیا اور اُن کے ہاں چلا گیا۔ وہ بہت ہی بوڑھے ہو چکے تھے۔

اپنا تعارف کرایا اور انہیں بہت ہی مختصر کر کے اپنی زندگی کی داستان سُنائی۔

"یہ داستان اپنے ساتھ قبر میں نہ لے جانا" ـــــ سکندر مرحوم نے کہا ـــــ "یہ لکھو یا لکھواؤ اور "حکایت" کے ایڈیٹر کو دے دو۔ وہ کتاب چھاپ دیں گے۔ ایسی سچّی کہانیاں لوگوں تک پہنچنی چاہئیں"۔

ان کے ساتھ بہت باتیں ہوئیں۔ دو اڑھائی ماہ بعد اُن سے ملنے گیا تو یہ افسوسناک خبر ملی کہ سکندر صاحب ایک ہفتہ گزرا فوت ہو گئے ہیں۔

میں نے محمد خان مرحوم اور سکندر مرحوم اور ان کی کتابوں کا ذکر اِس لیے کیا ہے کہ جو مجھ پر بیتی ہے وہ ان دونوں کی آپ بیتیوں سے ملتی جلتی ہے۔ مَیں بھی ان دونوں کی طرح گھر سے بے گھر ہُوا تھا۔ برما اور انڈونیشیا تک گیا اور واپسی کا سفر ایسی صورت اختیار کر گیا کہ ـــــ "منزل منزل پھرا مسافر" ـــــ والی بات ہو گی۔

اس تمہید کے بعد مَیں اپنی کہانی کی طرف آتا ہوں۔ یہ مَیں آپ پر چھوڑتا ہوں کہ اسے آپ بیتی کہیں، سفر نامہ کہیں یا جو جی میں آئے کہہ لیں۔



میں ایک قصبے میں ایک پڑھے لکھے گھرانے میں پیدا ہُوا تھا۔ اُس زمانے میں جب مسلمان تعلیم کو حرام سمجھتے تھے، کسی مسلمان کا آٹھ یا دس جماعتیں پاس کر لینا بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ میں بڑے شہروں کی نہیں، قصبوں اور دیہات کی بات کر رہا ہوں۔ ہمارا گھر صاف ستھرا تھا۔ ہماری ماں ہمیں صاف ستھرے کپڑے پہنایا کرتی تھی میرے والد صاحب ریلوے میں ملازم تھے۔ بڑا بھائی بھی ریلوے میں ملازم تھا۔ گھر میں خوشحالی تھی۔ میں ایک بہن اور دو بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ سب مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ ہمارے گھر کی شائستگی، آداب و اخلاق اور شرافت مشہور تھی لیکن ذات پات کے لحاظ سے ہم تیسرے درجے کے لوگ تھے۔ وہ انگریزوں کا دورِ حکومت تھا۔ مسلمانوں نے ہندوؤں سے جو رسمیں اور رواج اپنی معاشرت میں شامل کر لیے تھے۔ ان میں ذات پات کی قباحت بھی تھی۔ مسلمان چھوٹی بڑی ذاتوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ جس طرح ہندو برہمن دوسری ذاتوں کو آج بھی حقیر سمجھتے تھے اسی طرح مسلمانوں نے کچھ اونچی ذاتیں پیدا کر لی تھیں۔ ان ذاتوں کے لوگوں نے ہُنرمند لوگوں کو اپنا غلام سمجھ لیا۔ ہُنرمند سے مراد وہ لوگ ہیں جو کپڑا بُنتے ہیں۔ لوہار ترکھان ہیں، راج مزدور ہیں۔ لوگوں کے بال کاٹتے اور کپڑے دھوتے ہیں، کپڑے سیتے ہیں۔ جُوتے بناتے اور مرمّت کرتے ہیں، لکڑی کا کام کرتے ہیں اور دیگر دستکاری کرتے ہیں۔

جاگیردار، بڑے زمیندار وغیرہ سب کے چوہدری اور حاکم بن گئے۔ کوئی چوہدری کہلاتا ہے، کوئی راجہ، کوئی ملک اور اسی طرح اُونچی ذاتوں والوں نے ہُنرمندوں کو کمّی اور کمین کہنا شروع کر دیا۔ دیہات میں آج بھی چوہدری اور راجے وغیرہ چھوٹی ذاتوں کے لوگوں سے بیگار لیتے ہیں۔

یہ تو مجھے زیادہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہم مسلمان کس طرح ذاتوں میں بٹے ہُوئے ہیں۔ انگریزوں نے مسلمانوں میں ذات پات کو اور زیادہ پکّا کر دیا تھا کیونکہ انگریز چاہتے تھے کہ مسلمان متحد نہ ہو سکیں اور چھوٹے بڑے میں تقسیم رہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اسلام میں ذات پات کا تصور ہی موجود نہیں۔ اسلام میں تو خلیفہ بھی اپنے آپ کو عوام سے بالا اور برتر نہیں سمجھا کرتا تھا۔

مَیں جنگِ عظیم سے دو اڑھائی سال پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ مَیں نے میٹرک پاس کر لی۔ اُس زمانے میں تعلیم صرف اس لیے حاصل کی جاتی تھی کہ نوکری کرنی ہے۔ اس کے لیے دس جماعتیں کافی سمجھی جاتی تھیں۔ مجھے بھی اب نوکری تلاش کرنی تھی۔ اُس زمانے

میں نوکری کسی قسمت والے کو ملتی تھی۔ مجھے اس کا کوئی غم نہیں تھا۔ میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا اس لیے سب کا لاڈلا تھا۔ انہیں ایسی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے پہلے بتایا کہ والد صاحب اور بڑا بھائی ملازمت کرتے تھے۔ ہماری تھوڑی سی زمین بھی تھی جو ہم نے بٹائی پر دے رکھی تھی۔ دانے خاصے آجاتے تھے۔ اُس زمانے میں مہنگائی نہیں تھی منڈی کے بھاؤ چڑھتے نہیں تھے۔ تھوڑی سی آمدنی میں باعزت گزارہ ہو جاتا تھا۔ اپنے علاقے کے متعلق یہ بتا دوں کہ بارانی علاقہ ہے اور یہ علاقہ میدانی نہیں۔ سطح مرتفع ہے۔ کھڈ نالے ہیں، گھاٹیاں اور ٹیلے ہیں اور چھوٹے بڑے برساتی نالوں کا تو جال بچھا ہوا ہے۔

اب اس علاقے میں سڑکیں بن گئی ہیں اور چھوٹے چھوٹے گاؤں بہت پھیل گئے۔ آبادیاں زیادہ ہو گئی ہیں۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں، اُس وقت ویرانے اور بنجر علاقے بہت تھے۔ ہم لوگ جو قصبے میں رہتے تھے، شہری اور تہذیب یافتہ کہلاتے تھے۔ دیہاتی علاقے میں بعض جگہیں مٹی کی پہاڑیوں میں گھری ہوئی ایسی تھیں کہ قصبے کے لڑکے وہاں ڈر جایا کرتے تھے۔

معلوم نہیں میری نفسیات کیا تھی کہ مجھے یہ ڈراؤنی جگہیں اچھی لگتی تھیں اور کبھی کبھی تو میں اکیلا ہی اُدھر نکل جایا کرتا تھا۔ مجھے خطروں سے پیار تھا اور میں ایڈونچر کا دلدادہ تھا۔ ایسے درختوں پہ چڑھنا جن پہ چڑھا نہ جا سکے اور ان کی انتہائی بلندی پر پہنچنا میری ہابی ہوا کرتی۔ ساون کی بارشوں میں نالوں میں طغیانی آجاتی تو ہم تین لڑکے دو منزلہ مکان جتنے بلند کناروں سے ڈائیو لگایا کرتے تھے۔ مجھے تیراکی کا بہت شوق تھا۔ میں سیلابی نالوں میں تیرا کرتا تھا۔ کئی بار ایسے ہوا کہ نالے کے موڑ پر سیلاب نے مجھے چٹانی کنارے کے ساتھ بڑی زور سے پٹخا۔ ایسے لگا جیسے میری ہڈیاں ٹوٹ گئی ہوں لیکن اتنی شدید چوٹوں سے بھی مجھے لطف آیا کرتا تھا۔

میں اپنی جو کہانی سنانے چلا ہوں، اس کے لیے ضروری ہے کہ میری نفسیات میری فطرت اور میری اُس وقت کی عادات ذہن میں رکھ لیں۔

میں نے بتایا ہے کہ میں پُروقار، تعلیم یافتہ، شائستہ اور خوشحال گھرانے کا فرد تھا۔ جس کی شرافت مشہور تھی۔ مجھ میں وقار بھی تھا، تعلیم اور شائستگی بھی تھی اور میں شرافت کا بھی قائل تھا لیکن میں پارسا اور زاہد نہیں تھا۔ صاف بات یہ ہے کہ میں مومنوں والی شرافت کے خلاف تھا۔

اکثر لوگ بزدل ہوتے ہیں۔ لڑائی جھگڑے اور ہاتھا پائی سے ڈرتے ہیں۔ ایسے

بزرگ لوگ اپنے آپ کو شریف کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ بزدل آدمی کو شریف کہتے ہیں۔

مجھ میں بزدلی والی شرافت نہیں تھی۔

میری دوستی ایسے لڑکوں کے ساتھ تھی جو زندہ دل اور شرارتی تھے اور وہ غیر معمولی طور پر دلیر اور نڈر تھے۔ یہی اوصاف مجھ میں بھی پیدا ہو گئے تھے۔



میں نے دس جماعتیں تو پاس کر لی تھیں لیکن پڑھنا میرے خاندان کی روایت تھی اس لیے میں نے یہ روایت پوری کر دی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ تعلیم میرے مزاج کے خلاف تھی۔ والد صاحب اور بھائی جان چاہتے تھے کہ میں بی اے کر لوں۔ والدہ نے میرا بہت ساتھ دیا۔ والدہ میری ہر بات مانتی تھی اور بڑی بہن بھی مجھے بہت پیار کرتی تھی۔ اُسے بھی گوارا نہ تھا کہ میرے اعصاب پہ کوئی ناگوار بوجھ پڑے۔ تعلیم سے بڑھ کر اور ناگوار بوجھ کیا ہو سکتا تھا!

"چودہ پڑھ لے چاہے سولہ پاس کر لے" ـــــ والدہ میرے حق میں یہی دلیل دیا کرتی تھی ـــــ "اسے نوکری تو کلرکی کی ملے گی۔ یہی نوکری دسویں پاس کو ملتی ہے.... بچے کے دماغ پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو۔"

"ہاں ابا جان!" ـــــ میری بہن دلیل دیا کرتی تھی ـــــ "اس کی صحت تو ٹھیک ہو لینے دیں۔ دیکھیں تو سہی، کیا ذرا سا منہ نکلا ہوا ہے، رنگ بے چارے کا پیلا پڑا ہوا ہے۔"

میری صحت آوارگی میں ٹھیک رہتی تھی۔

دراصل گھر میں خوشحالی تھی۔ یہ ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی کہ میں بھی نوکری کروں۔ میں نے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں نکما اور نکھٹو نہیں ہوں۔ میں نے اپنی زمینوں پر جانا شروع کر دیا اور زمینوں اور بٹائی والے مزارعوں کی باتیں اس طرح شروع کر دیں جیسے زمینیں خراب ہو رہی ہیں یہ پوری پیداوار نہیں دے رہیں اور بٹائی والے محنت بھی نہیں کر رہے اور دھوکہ بھی دے رہے ہیں۔

یہ نہ سمجھیں کہ ہم سینکڑوں یا بیسیوں ایکڑ زمین کے مالک تھے۔ کُل آٹھ ایکڑ زمین تھی۔ میں نے گندم کی فصل گھر آتے ہی اُن مزارعوں کی چھٹی کرا دی جو بڑے لمبے عرصے سے ہماری زمینیں سنبھالے ہوئے تھے۔ میں نے جو نئے مزارعے رکھے وہ میرے قصبے سے دو میل دُور ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ غریب کسان تھے جن کی سوچیں پیٹ پر

مرکوز رہتی تھیں۔

یہ ایک کنبہ تھا جس میں باپ تھا، ماں تھی، دو جوان بیٹے تھے۔ ایک بیٹے کی نوجوان دُلہن تھی۔ ان کے پاس دو بیل اور ایک گدھی تھی۔ اس کنبے تک میری رسائی اس طرح ہو گئی کہ اس گاؤں میں میرے ایک دوست کی بہن بیاہی ہوئی تھی۔ ایک روز وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔

مَیں نے اس گھر میں بیس اکیس سال عمر کی ایک لڑکی دیکھی جو بھینس کی کھُرلی میں بھوسہ اور بنولے وغیرہ ملا رہی تھی۔ اس لڑکی کو میں افسانے لکھنے والوں کی طرح بڑی ہی خوبصورت یا بے حد حسین تو نہیں کہوں گا لیکن وہ جس قدر خوبصورت تھی اس خوبصورتی میں کچھ عجیب سی کشش تھی۔ چھریرا بدن، گردن ملبوتری اور گول چہرے پر ایسی لالی جیسے انگارے دہک رہے ہوں۔ ایسے دمکتا ہُوا چہرہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

اُس نے ہماری طرف دیکھا۔ اُس وقت میری عمر اٹھارہ سال ہو گئی تھی۔ عقل ابھی خام تھی اور زندگی کا تجربہ کوئی تھا نہیں، پھر بھی اُس کی آنکھیں دیکھیں تو مَیں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ لڑکی پیاسی ہے یا اس میں کوئی محرومی ہے یا اس کی آنکھیں کوئی گمشدہ چیز ڈھونڈھ رہی ہیں۔

وہ ہم سے بارہ چودہ قدم دُور تھی۔ مَیں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اُس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم آگیا اور وہ اپنے کام میں لگ گئی۔ کھُرلی سے ہٹی تو کوئی اور کام کرنے لگی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ میری طرف دیکھتی اور اُس کا تبسم کھِلتا ہی چلا جا رہا تھا۔

مَیں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اُسے صاف نیّت سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ میرے دوست نے سرگوشی میں مجھے بتا دیا تھا کہ اُس کی بہن نے اس لڑکی کو گھر کے کام کاج کے لیے رکھا ہے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد لڑکی چلی گئی۔ دروازے سے نکلتے ہُوئے اُس نے گھوم کر میری طرف دیکھا اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میرا دوست دُبلا پتلا اور گہرے سانولے رنگ کا نوجوان تھا۔ اُس کے مقابلے میں اُس نے میرے وجود اور چہرے مہرے میں کشش محسوس کی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں بھاگنے دوڑنے، تیرنے اور درختوں پر چڑھنے کا عادی تھا۔ میٹرک کا امتحان دے کر مَیں نے اگلے روز ہی باڈی بلڈنگ کی ورزشیں شروع کر دی تھیں۔ مگدر پھیرنا، ڈنٹر اور بیٹھکیں اور پتھر اُٹھانا (ویٹ لفٹنگ) روزمرّہ کا معمول بن گیا تھا۔

اتنی سخت ورزشوں اور اچھی خوراک کا اثر یہ ہُوا کہ ڈیڑھ سال کے عرصے میں میرا قد بڑھ گیا اور جسم باکسروں جیسا ہو گیا۔ مَیں نے تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا اس لیے ذہن اور اعصاب سے بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اس کا یہ اثر ہُوا کہ چہرے پہ رونق آ گئی۔ خدا تعالیٰ نے شکل وصورت اچھی عطا کی تھی۔ رنگ صاف تھا۔

اُس زمانے میں مردوں کی خوبصورتی چہرے سے نہیں دیکھی جاتی تھی، جسم دیکھے جاتے تھے۔ لوگ گٹھے ہوئے جسم اور اونچے قد کو پسند کرتے تھے۔ لباس کو اونچ نیچ کا معیار نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کسی کی تعریف صرف اس لیے نہیں کی جاتی تھی کہ اُس نے کپڑے بڑے قیمتی پہنے ہُوئے ہیں۔ لوگ دیکھتے تھے کہ کپڑوں کے اندر کیا ہے۔

میں کپڑوں کے اندر جو کچھ تھا وہ دوسروں کے لیے قابلِ قبول تھا۔ یہ دوسروں نے مجھے بتایا تھا۔ مَیں نے اپنی تعریف خود کبھی نہیں کی تھی نہ کبھی یوں کیا تھا کہ آئینے کے سامنے بیٹھا اپنے آپ کو دیکھتا رہتا۔



"یہ نوکرانی رکھی ہے؟" —— میرے دوست نے اپنی بہن سے پوچھا۔

"ہم نے نوکرانی رکھ کر اس سے کیا کرانا ہے" —— بہن نے جواب دیا —— "یہ بڑا ہی غریب گھرانا ہے۔ اس کا خاوند تحصیل میں ہرکارہ ہے۔ خاوند کے باپ اور بھائی نے کسی کی زمین بٹائی پر لی ہُوئی تھی۔ وہ زمین ان سے چھڑوا لی گئی ہے۔ ان کا گزارہ بڑے بیٹے کی تنخواہ پہ ہے۔ تنخواہ بہت تھوڑی ہے۔ یہ لڑکی ایک روز میرے پاس آئی اور اپنا رونا رونے لگی۔ مَیں نے اُسے کہا کہ میرا کام کر جایا کرو، آٹا دانہ دے دیا کروں گی۔"

"اگر یہ شہر آ جائیں تو مَیں انہیں اپنی زمین دے دوں گا" —— مَیں نے کہا —— "کرائے پر کوئی کچا کوٹھا بھی مل جائے گا۔"

لڑکی کے سُسر کو بلایا۔ میں نے اُس سے بات کی تو وہ تیار ہو گیا۔ ہمارے قصبے میں ہی تحصیل ہیڈ کوارٹر تھا جہاں اُس کا بیٹا ہرکارہ تھا۔ وہ لوگ ایک دو دنوں بعد اپنے مویشی اور گھر کا سامان لے کر آ گئے۔ ہمارے کھیت قصبے کے ساتھ ہی تھے۔ مَیں نے کچّے سے ایک مکان کا انتظام کر لیا تھا۔ یہ کسی نے اپنے مویشیوں کے لیے بنوایا تھا۔ کچھ عرصے سے خالی پڑا تھا۔ یہ مکان آج ہوتا تو اس کا کرایہ ڈیڑھ سو روپے ماہوار سے کم نہ ہوتا لیکن اُس زمانے میں اس کا کرایہ ڈیڑھ روپیہ ماہوار تھا۔

انہوں نے ہمارے کھیتوں میں کام شروع کر دیا۔

مَیں نے آگے بڑھنے اور ملازمت سے بچنے کے لیے گھر میں یہ اعلان پہلے ہی کر رکھا تھا کہ مَیں زمین کی دیکھ بھال کیا کروں گا۔ مجھ میں ایک وصف قدرتی طور پہ پیدا ہو گیا تھا کہ میں ایسی خود اعتمادی سے اور ایسے پُر اثر طریقے سے بات کرتا تھا جس سے دوسرے متاثر ہو جاتے اور میری بات مان لیتے تھے۔ اِس کی ایک وجہ یہ تھی کہ گھر میں مجھے ہر کسی کا پیار ملا تھا اور مَیں کسی محرومی کا شکار نہیں تھا۔

اللہ نے دوسری نعمت یہ عطا کی کہ میری آواز میں سُر اور سوز تھا۔ میں اتنا اچھا گاتا تھا کہ سُننے والے مسحُور ہو جاتے تھے۔ جمعہ کے روز میں جامع مسجد میں تلاوتِ قرآن کرتا تو میں سُننے والوں کو جھُومتے دیکھا کرتا تھا۔ تین چار آدمیوں نے مجھے کہا تھا کہ حقّہ یا سگریٹ پینے شروع نہ کر دینا ورنہ گلا خراب ہو جائے گا اور آواز بھدی ہو جائے گی۔ کسی اُستاد کی شاگردی کر لو۔ گانے میں نام پیدا کرو گے۔

میں نے حقّہ نہیں پیا، کبھی سگریٹ کا کش نہیں لگایا اور کسی اُستاد کی شاگردی بھی نہیں کی۔ البتہ اُستادیاں بہت کیں۔ اللہ نے ایک وصف زندہ دِلی کا بھی دیا تھا۔ اپنے آپ میں گھُٹن کبھی بھی پیدا نہیں ہونے دی۔



میں نئے مزارعوں کی بات کر رہا تھا۔ ان کی بہو کا نام کچھ اور ہے۔ میں اُس کا نام عائشہ لکھوں گا۔ اُس کے خاوند کو مَیں نے دیکھا۔ پہلا خیال یہ آیا کہ یہ آدمی عائشہ کے قابل نہیں۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ مرجھائی ہوئی سی کھال میں لپٹا ہُوا تھا۔ چہرے کا رنگ گہرا سانولا تو تھا لیکن ایسا جیسے لاش کا رنگ ہوتا ہے۔ اُس کے ساتھ میں نے کچھ باتیں کیں تو معلوم ہُوا کہ وہ احمق نہیں بلکہ ہونق ہے۔ بات کرنے سے پہلے بے مقصد ہنستا پھر بات کرتا تھا۔

میں حیران تھا کہ یہ تحصیل میں سوائے حقّہ بھرنے یا دفتر کے اہلکاروں کو پانی پلانے کے کیا کرتا ہو گا۔ کچھ دنوں بعد پتہ چلا تھا کہ وہ اپنی ڈیوٹی ٹھیک ٹھاک پوری کرتا تھا۔ اَن پڑھ دیہاتی تحصیل کے دفتر میں اپنے کاموں کے سلسلے میں آتے تھے تو یہ شخص اُن کی راہنمائی کرتا اور اُن سے آنہ دو آنے وصول کر لیا کرتا تھا۔ اِس طرح وہ ایک سے ڈیڑھ روپیہ یومیہ بالائی آمدنی کما لیتا تھا۔ یہ اُس زمانے میں جب بکرے کا گوشت چار آنے سیر ملتا تھا، خاصی آمدن سمجھی جاتی تھی۔ اِس شخص کی چال ڈھال ہیجڑوں جیسی تھی۔

میں پہلے روز ان کے گھر گیا۔ عائشہ گھر میں اکیلی تھی۔ اُس کا خاوند اپنے کام پر چلا گیا تھا۔ اُس کا سُسر اور دیور کھیتوں میں چلے گئے اور اُس کی ساس بھی ان کے ساتھ چلی گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر عائشہ کے چہرے پر چمک اور ہونٹوں پر مُسکراہٹ آ گئی۔ میں صحن میں چارپائی پر بیٹھنے لگا تو عائشہ نے روک دیا۔

"یہاں نہیں" ـــــ اُس نے روک دیا ـــــ "اندر چلیں۔"

اُس نے باہر والے دروازے کی اندر سے زنجیر چڑھا دی اور مجھے بازو سے پکڑ کر اندر لے گئی۔ کمرے میں ایک پلنگ بچھا ہُوا تھا۔ یہ یقیناً اُس کے جہیز کا تھا۔ اُس نے مجھے پلنگ پر بٹھایا اور خود فرش پہ بیٹھ گئی۔ مَیں نے اُسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔

"آپ مالک ہیں نا!" ـــــ اُس نے سادگی سے کہا ـــــ "مَیں آپ کی برابری نہیں کر سکتی۔"

مَیں نے اُس کی کمر میں بازو ڈال کر اُسے بالکل ہی اپنے قریب کر لیا۔ مَیں نے محسوس کر لیا کہ وہ اس سے بھی زیادہ قریب ہونا چاہتی تھی۔ مَیں نے ذرا گھبراہٹ کا اظہار کیا کہ کوئی آ جائے گا۔

"اتنی جلدی کوئی نہیں آئے گا" ـــــ عائشہ نے کہا ـــــ "آپ ذرا اور جلدی آ جایا کریں" ـــــ اُس نے ذرا رُک کر اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا ـــــ "آیا کریں گے نا؟"

اُس کے لب و لہجہ اور انداز میں تشنگی اور کوئی نہ کوئی محرومی صاف نظر آ رہی تھی۔ مَیں نے گھِسا پِٹا فلمی مکالمہ بولا ـــــ "مجھے آپ نہ کہا کرو، تم کہا کرو۔"

اُس روز میں کوئی ایک گھنٹے بعد اُس کے گھر سے نکلا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اندر سے بالکل ہی بدل گیا ہوں۔ مجھ پر نشے کی سی کیفیت طاری تھی۔ عائشہ کی آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر مُسکراہٹ تھی۔



پھر میں اُس کے گھر جاتا رہا۔ وہاں سے میں کھیتوں کو چلا جاتا۔ مَیں نے دیکھا کہ یہ لوگ شریف اور محنتی تھے۔ پہلے بٹائی والے مزارعے چلتا کام کرتے تھے۔ انہوں نے دوسرے لوگوں کی بھی زمینیں بٹائی پر لے رکھی تھیں اس لیے وہ کسی ایک کے لیے محنت نہیں کرتے تھے۔

میں ایک روز عائشہ کے گھر گیا۔ وہ حسبِ معمول اکیلی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اُس روز اُس کی مزاجی حالت اُکھڑی اُکھڑی سی تھی۔ اُس نے روزمرہ کی طرح باہر کے دروازے کی زنجیر چڑھا دی اور مجھے اندر لے گئی۔ ہم پلنگ پر بیٹھ گئے۔ مجھے اپنے پا دیکھ کر اُس پر دیوانگی طاری ہو جایا کرتی تھی لیکن اُس روز وہ کچھ افسردہ اور مایوس لگ رہی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ آج اُس کا موڈ کیوں بگڑا ہوا ہے!

یہ ذہن میں رکھیں کہ اُس زمانے میں موڈ کا لفظ انگریزی ڈکشنری میں تو شا ہو گا، لوگ ابھی اس سے واقف نہیں تھے۔ میں نے دس جماعتیں پڑھی تھیں لیکن م کا لفظ کبھی نہیں پڑھا۔ آج کل تو یہ حال ہے کہ کسی جاہل اور اَن پڑھ بیوی کو خاو پھینٹی لگا دے تو وہ پڑوسنوں سے کہتی ہے ——"آج میرے گھر والے کا تو کا موڈ ٹھیک نہیں۔"

مجھے آج بھی یاد ہے کہ میں نے عائشہ سے یوں پوچھا تھا ——"کیا بات ہے .... آج تمہاری ناک کیوں چڑھی ہوئی ہے؟"

"میں رات سوئی نہیں" —— اُس نے کہا۔

"کیوں؟"

"کیا بتاؤں!" —— اُس نے آہ لے کر کہا —— "تم سمجھتے ہو گے کہ اس لڑکی ک چال چلن شادی سے پہلے کا خراب ہے۔ تم جو چاہو کہہ سکتے ہو۔ غلطی میری ہے۔ مجبو میری ہے۔"

"یہ کس چکر میں پڑ گئی ہو عائشہ!" —— میں نے کہا —— "میں نے تمہیں کو طعنہ نہیں دیا۔"

"میں اِس خاوند کے ہاتھوں بہت تنگ اور مجبور ہوں" —— اُس نے کہا —— "ایک تو میں عورت ذات، دوسرے غریب کی بیٹی۔ اگر کسی بوڑھے کھڑے کے ساتھ با دیتے تو میں کچھ نہیں کر سکتی تھی.... میرے خاوند کو تم نہیں جانتے۔ اس کی شادی ہونی ہی نہیں چاہیے تھی۔ یہ شادی کے قابل ہے ہی نہیں۔ یہ اس قابل ہے ک نوکری کرے اور ماں باپ کی خدمت کرے۔ اگر اس کا رنگ توے جیسا کالا ہوتا ت بھی میں اسے خوشی سے قبول کر لیتی لیکن یہ خبط کا مریض ہے اور یہ اگر عورت نہیں تو مرد بھی نہیں۔ رات کو میں یہی سوچتی رہی کہ اس کے ساتھ ساری عمر کیسے گزاروں اس کے دماغ میں بھی کوئی خرابی ہے۔"

"نہیں عائشہ!" —— میں نے کہا —— "اس کے دماغ میں کوئی خرابی نہیں۔ بڑے پکے طریقے سے نوکری کر رہا ہے۔"

عائشہ نے آہ بھری، دوپٹے سے آنسو پونچھے اور منہ سے کچھ بھی نہ بولی۔

مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے کھیتیاں اس کی ملکیت ہیں اور میں اس کا مزارعہ ں۔ معلوم نہیں کیوں مجھ پر مرعوبیت طاری ہو گئی۔ خیال آیا کہ مجھے یہاں نہیں بیٹھنا چاہیے ر اس لڑکی پر میرا کوئی حق نہیں۔ میں جانے کے لیے اُٹھا۔

"چلتا ہوں۔"

"بیٹھے رہو" —— اُس نے میرا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا —— "کیا جلدی ہے؟"

میں اس طرح بیٹھ گیا جیسے اُس کے حکم کی تعمیل کی ہو۔ ایسا تجربہ مجھے پہلی بار ر رہا تھا۔ میں اس لڑکی میں کوئی تبدیلی دیکھ رہا تھا جسے میں سمجھ نہیں سکتا تھا۔ ایک ال یہ بھی آیا کہ اسے شاید مجھ سے بہتر کوئی آدمی مل گیا ہے۔ اُس نے جمائی لی۔ نیند سے اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ وہ رات سوئی نہیں تھی۔

"نیند آ رہی ہے" —— اُس نے کہا۔

"سو جاؤ" —— میں نے کہا۔

وہ پلنگ پر لیٹ گئی۔ وہ نوجوان تھی۔ نیند پر غالب نہیں آ سکتی تھی۔ لیٹتے ہی گئی۔ میں آہستہ سے اُٹھا اور وہاں سے نکل آیا۔ میری ذہنی اور جذباتی حالت بگڑتی چلی ا رہی تھی۔ بار بار یہی وہم سامنے آتا تھا کہ یہ لڑکی مجھ سے تنگ آ گئی ہے اور اس نے ی اور کے ساتھ تعلقات پیدا کر لیے ہیں۔

میں دو دن اُس کے گھر نہ گیا۔

تیسرے دن علی الصبح عائشہ کا سسر ہمارے گھر آیا۔ وہ بہت ہی گھبرایا اور ڈرا ہوا ا۔ اس نے بتایا کہ گزشتہ رات عائشہ کو اچانک کوئی دورہ پڑا ہے۔ اُس کے ہاتھ پاؤں ڑ جاتے ہیں اور وہ چارپائی سے گرتی اور اوپر کو اُچھلتی ہے اسے قابو کرنے کے لیے سب زور لگاتے ہیں لیکن وہ کسی کے ہاتھ نہیں آتی۔

میری امی نے مجھے اور میرے ابا جان سے کہا کہ ہم دونوں جا کر دیکھیں اور اگر کٹر کی ضرورت پڑے تو بُلا لیں یا ہسپتال لے جائیں۔

میں ابا جان کے ساتھ عائشہ کے گھر گیا۔ وہاں تو عجیب ہی منظر دیکھا۔ پہلے تو میں

عائشہ کو پہچان ہی نہ سکا۔ اس نے اپنے بال نوچ نوچ کر بکھیرے ہوئے تھے۔ اُس کا چہرہ اس طرح لال سُرخ تھا جسے دیکھ کر خوف آتا تھا۔ اس نے اپنی قمیض بھی پھاڑی ہوئی تھی، اُس کی ساس الگ بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کا خاوند بھی وہیں تھا۔ خاوند کا تو رنگ ہی اُڑا ہُوا تھا۔ عائشہ نے مجھے اور ابا جان کو دیکھا تو اُس نے اتنی زور سے چیخ ماری کہ میرا دل دہل گیا اور ابا جان بھی ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے ساتھ ہی عائشہ لیٹے لیٹے چارپائی سے اُچھلی اور فرش پر جا پڑی۔ ابا جان اور عائشہ کا سُسر اسے اٹھانے لگے تو اُس نے اُٹھ کر اپنے بازوؤں اور جسم کو اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ دونوں بوڑھے دیوار سے جا لگے۔ اس کا خاوند اور میں بڑی تیزی سے آگے بڑھے۔ خاوند نے اس کے بازو پکڑے، میں نے اسے کمر سے دبوچ لیا۔ عائشہ نے اپنے خاوند سے بازو چھڑا لیے۔ خاوند کمزور سا آدمی تھا، وہ ابھی کھڑا دیکھ ہی رہا تھا کہ کیا کرے کہ عائشہ نے اُس کے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ خاوند چکرا کر پلنگ پر جا گرا۔

میں نے اُسے کمر سے پکڑے ہوئے اُٹھا کر پلنگ پر پھینکا۔ وہ پیٹھ کے بل پلنگ پر گر پڑی۔ میرے بال ذرا لمبے تھے۔ عائشہ نے میرے بال مٹھی میں لے لیے اور مُٹھی اتنی زور سے بند کی کہ مجھے بال کھچنے سے شدید درد ہُوا۔ اس نے میرے بالوں کو پکڑے ہوئے اپنے ہاتھ کو زور زور سے جھٹکے دیے۔ میرے دانت درد سے بجنے لگے۔

"یہاں سے چلا جا"—— عائشہ نے دانت پیس کر کہا —— "میں تجھے قتل کر دوں گا۔ میں اس کے خاوند کو بھی قتل کر دوں گا۔"

"میں جا رہا ہوں"—— میں نے کہا —— "مجھے چھوڑ دو۔"

اُس نے میرے بال چھوڑ دیے۔ اُس نے اس طرح بات کی تھی جیسے وہ عورت نہیں بلکہ مرد ہے۔ یہ صاف نشانی تھی کہ اس پر جن کا قبضہ ہو گیا ہے۔ وہ تو بس ماندگی کا دَور تھا، آج تعلیم اور ترقی کے دَور میں بھی لوگ عقیدے کی طرح مانتے ہیں کہ جو انسان اس طرح جنات کے قبضے میں آ جائے، ظاہری طور پر تو وہ خود بولتا ہے لیکن وہ دراصل ہوتا جن ہے، جو اُس کی زبان سے بول رہا ہوتا ہے۔

جس پر جن کا قبضہ ہوتا ہے اسے جن دوسرا شخص سمجھتا ہے۔ مثلاً جن کہتا ہے کہ میں اسے مار ڈالوں گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ متاثرہ شخص یہ کہہ رہا ہے کہ میں اپنے آپ کو مار ڈالوں گا۔

میرے والد صاحب اور باقی سب نے جب یہ سُنا کہ یہ لڑکی اپنے آپ کو مرد سمجھ کر

بول رہی ہے تو سب سے پہلے میرے ابا جان بولے کہ یہ تو جن ہے۔

"ہاں!"—— عائشہ بولی —— "میں جن ہوں۔ یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"

عائشہ کے سُسر اور ساس نے قریب آ کر ہاتھ جوڑے اور منت سماجت کرنے لگے۔

"ہم غریبوں سے آپ نے کیا لینا ہے شاہ جی!"—— سُسر نے کہا —— "ہم سے یا اس بیچاری سے کوئی غلطی قصور ہو گیا ہے تو معاف کر دیں۔ ہم غریبوں کو یہ سزا نہ دیں۔"

"میں نہیں جاؤں گا"—— عائشہ نے کہا —— "میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ اس کے خاوند کو نہیں چھوڑوں گا۔"

اُس کے ان الفاظ سے بلکہ دھمکی نے ہم سب پر دہشت طاری کر دی۔ میں بھی جنات کے وجود کا قائل تھا۔ ہر کوئی مانتا تھا کہ جنات موجود ہیں۔ اور اگر کوئی انسان کسی جن کو پریشان یا تنگ کرے تو وہ جن اس کا یہی حال کرتا ہے جو میں عائشہ کا ہوتا دیکھ رہا تھا۔ چونکہ جنات کے متعلق یہ عقیدہ عام رہا ہے اور اب بھی عام ہے۔ اس لیے جن نکالنے والے عامل اور "شاہ جی" وغیرہ بھی موجود ہیں۔ یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے قبضے میں جنات ہیں اور کسی انسان پر کوئی جن قابض ہو جائے تو اسے وہ بھگا سکتے ہیں۔ لوگ ان کے عقیدت مند ہیں اور وہ ان کے دعوؤں کو برحق سمجھتے ہیں۔

یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی نوجوان لڑکی کو یا کسی لڑکے کو ہسٹریا یا مرگی کا دَورہ پڑے تو یہ عامل وغیرہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ جن کا قبضہ ہے۔ سیدھے سادھے مصیبت کے مارے لوگ ان کی باتوں کو مان کر نقصان اٹھا لیتے ہیں پھر بھی یہ نہیں کہتے کہ عامل نے انہیں دھوکا دیا ہے۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ عامل یا "شاہ جی" اس گھر میں ڈیرے ڈال دیتے ہیں جس گھر کے کسی فرد پر جن قابض ہوتا ہے۔ پھر یوں ہوتا ہے کہ جن تو نکل جاتا ہے لیکن عامل صاحب کچھ دن لگا کر ہی نکلتے ہیں۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ بعض انسانوں پر جنات نہیں بلکہ شاہ جی قابض ہو جاتے ہیں۔

عائشہ کے متعلق ہم سب نے تصدیق کر دی کہ یہ جن کا قبضہ ہے۔ ایک شاہ جی ہمارے قصبے میں موجود تھے جن کا دعویٰ تھا کہ بڑے ہی شیطان جنات ان کے قبضے میں ہیں۔ میرے والد صاحب نے مجھے دوڑایا کہ میں ان شاہ جی کے پاس جاؤں کہ انہیں اپنے ساتھ لے آؤں۔

میں دوڑا گیا۔ شاہ جی گھر میں مل گئے۔ ان کا ایک بیٹا میرا دوست تھا اس لیے

شاہ جی مجھے بڑی اچھی جانتے تھے اور مجھے اپنے بیٹوں جیسا سمجھتے تھے۔ مجھے گھبرایا ہوا دیکھ کر سمجھ گئے کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ میں نے انہیں عائشہ کے متعلق بتایا اور ساتھ یہ کہا کہ وہ ہمارے مزارعے ہیں تو میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ شاہ جی کے چہرے پر ناپسندیدگی کا تاثر آگیا۔ انہیں خیال آگیا ہوگا کہ غریب مزارعوں سے کیا ملے گا۔

"شاہ جی!" —— میں نے کہا —— "بیچاری نوجوان اور بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ اس کی شادی کو چھ مہینے بھی نہیں ہوئے۔"

یہ سنتے ہی شاہ جی کے چہرے پر جو بے مزہ سا تاثر آیا تھا۔ وہ بدل گیا اور ان کے چہرے پر رونق آگئی۔

"وہ تو بیچارے غریب لوگ ہیں" —— میں نے کہا —— "آپ کی خدمت تو ہم کریں گے۔"

"نہ بیٹا!" —— شاہ جی نے کہا —— "یہ تو میرے گھر کا معاملہ ہے میں درویش آدمی کوئی خدمت نہیں کرانا چاہتا!"

شاہ جی نے یہ بات تو کہہ دی لیکن میں نے دیکھا کہ خوبصورت اور نوجوان لڑکی اور خدمت کا سن کر ان کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔ میری اس وقت عمر اتنی زیادہ نہیں تھی کہ میں لوگوں کے چہرے پڑھ سکتا لیکن شاہ جی کے چہرے پر ایسے نمایاں رنگ آئے تھے جو میں نے فوراً پڑھ لیے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی یقین تھا کہ شاہ جی جن کو بھگا بھگا دیں گے اور عائشہ کو نجات مل جائے گی۔

شاہ جی نے کچھ چیزیں چھوٹے سے تھیلے میں ڈالیں اور میرے ساتھ چل پڑے۔

عائشہ کے گھر پہنچے تو اس کی حالت پہلے سے زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ اب وہ اتنی زور زور سے چیخیں مارتی تھی کہ مجھے یہ کچا سا مکان کانپتا ہوا نظر آتا تھا۔ شاہ جی اس پلنگ پر بیٹھ گئے جس پر عائشہ لیٹی ہوئی تھی۔

"اچھا جی!" —— شاہ جی نے عائشہ کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا —— "تم یہاں بھی پہنچ گئے ہو۔ میں نے تمہیں وہاں سے نکالا تھا۔ اور تم یہاں آگئے ہو؟ اٹھ کر بیٹھ!"

عائشہ اٹھ بیٹھی۔

"یہاں سے نکلو گے یا نہیں؟" —— شاہ جی نے پوچھا۔

"نہیں" —— عائشہ نے کہا جو دراصل جن کی آواز تھی —— "میں اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"اس بیچاری نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" —— شاہ جی نے پوچھا۔

"میں اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا" —— جن نے کہا —— "اس لڑکی کو میں اس کے خاوند کے پاس نہیں رہنے دوں گا۔ یہ میرے دل کو اتنی اچھی لگتی ہے کہ میں خود اس کے ساتھ شادی کروں گا۔"

"میں تمہیں یہاں سے نکال کر جاؤں گا" —— شاہ جی نے کہا —— "تمہارے پورے خاندان کو جلا کر راکھ کر دوں گا۔"

عائشہ نے بڑی زور سے چیخ ماری اور ہاتھ لمبا کر کے شاہ جی کی داڑھی پکڑ لی اور داڑھی کو اوپر نیچے زور زور سے جھٹکے دیے۔ پھر داڑھی چھوڑ کر شاہ جی کے منہ پر بڑی زور سے تھپڑ مارا۔ شاہ جی پلنگ سے گرے لیکن پاؤں فرش پر لگا کر سنبھل گئے۔

"اسے پکڑ لو" —— شاہ جی نے حکم دیا۔

میں نے، عائشہ کے خاوند اور خاوند کے بھائی نے پلنگ پر چڑھ کر عائشہ کو جکڑ لیا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ مجھ پر اتنا زیادہ خوف طاری تھا کہ میں سوچ رہا تھا کہ یہاں سے بھاگ جاؤں لیکن میں اس لیے بھاگنے کا کوئی بہانہ نہیں سوچ رہا تھا کہ ان سب کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔

شاہ جی نے اپنے تھیلے سے لوبان کی دو بتیاں نکالیں اور دونوں کے سروں کو جلا دیا۔ شعلے بجھ گئے تو بتیوں سے دھواں نکلنے لگا۔ یہ بتیاں ایک جوان آدمی کی شہادت کی انگلی جتنی موٹی اور اتنی ہی لمبی تھیں۔ شاہ جی نے ایک بتی عائشہ کی ناک کے ایک نتھنے میں داخل کر دی اور دوسری دوسرے نتھنے میں۔ یوں سمجھیں کہ ایک ایک انچ بتیاں ناک میں چلی گئی تھیں۔ عائشہ کا منہ سانس لینے کے لیے کھل گیا تھا اور دھواں اس کی آنکھوں کو لگ رہا تھا۔

اس کے ساتھ ہی شاہ جی نے عائشہ کے دونوں ہاتھ الٹی طرف سے ایک دوسرے سے ملا دیے اور اپنے ایک ہاتھ میں اس کے دونوں ہاتھ لے کر اتنی زور سے دبایا کہ عائشہ کی چیخیں نکل گئیں۔

"میں دیکھتا ہوں تم کس طرح یہاں سے نہیں نکلتے!" —— شاہ جی نے کہا۔

آپ یہ سمجھ لیں کہ شاہ جی نے بالکل اس طرح عائشہ کو بلکہ جن کو ٹارچر کرنا شروع کر دیا تھا جس طرح پولیس کسی ملزم یا مشتبہ سے اقبالی بیان لینے کے لیے اسے ٹارچر کرتی ہے۔ ہم تین آدمیوں نے عائشہ کو دبوچ رکھا تھا۔ اسے ہم تڑپنے بھی نہیں دے

رہے تھے۔



اگر میں ہر ایک تفصیل سنانے لگوں کہ عائشہ کے ساتھ کیا کیا سلوک ہوا تو میری یہ داستان، جو میری عمر جتنی لمبی ہے، اور زیادہ لمبی ہو جائے گی۔ یہ تو میری زندگی کا پہلا واقعہ ہے۔ میں نے تو آپ کو برما، انڈونیشیا اور وہاں سے سارے ہندوستان میں گھمانا پھرانا ہے اور ایسے ایسے واقعات سنانا ہیں جو آپ کے رونگٹے کھڑے کر دیں گے میں عائشہ کا یہ واقعہ ذرا مختصر کر دیتا ہوں۔

سارا دن شاہ جی عائشہ کو ٹارچر کرتے رہے۔ کبھی بتیاں اس کی ناک سے نکال لیتے اور اس کے ساتھ کچھ باتیں کر کے اور کچھ دھمکیاں دے کر پھر اس پر "تشدد" شروع کر دیتے۔ میرے دل کو بہت ہی تکلیف ہو رہی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ ایک تو جن ہے جس نے عائشہ کے وجود کو اپنے قبضے میں لے رکھا ہے اور دوسرے شاہ جی نے جو دراصل جن پر تشدد کر رہے ہیں لیکن یہ تشدد عائشہ کے جسم کو اذیت دے رہا تھا۔

میرے ابا جان دوپہر کو مجھے اپنے ساتھ گھر لے آئے۔ وہ کہتے تھے کہ شاہ جی اس کو بھگا دیں گے۔ میری جذباتی کیفیت یہ تھی کہ عائشہ کے پاس جا پہنچوں اور اُسے اس اذیت سے نجات دلاؤں لیکن اُس کے پاس جانے کے خیال سے ہی دل خوف کی گرفت میں جکڑا جاتا تھا۔ پھر ایک اور خوف دل پر آ پڑا۔ جن نے کہا تھا کہ عائشہ اس کے دل کو بہت اچھی لگتی ہے۔ جن نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ عائشہ کو خاوند کے پاس نہیں رہنے دے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جن عائشہ پر عاشق ہو گیا تھا۔ میں اس خوف میں مبتلا ہو گیا کہ جن میرا بھی دشمن ہو جائے گا کہ عائشہ کے ساتھ میرے بھی خفیہ تعلقات تھے۔

رات کو میری امی عائشہ کو دیکھنے گئی۔ واپس آ کر اُس نے کانوں کو ہاتھ لگا لگا کر سُنایا کہ عائشہ کی حالت کتنی بُری ہے۔ شاہ جی ابھی وہیں تھے اور جن ان کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ جسم عائشہ کا رُوئی کی طرح دُھنکا جا رہا تھا۔

اگلے روز میرے ابا جان وہاں گئے۔ میں اس ڈر سے نہ گیا کہ جن مجھے اپنا رقیب سمجھ کر میرا گلا دبا دے گا۔ ایک روز پہلے جن نے میرے بال پکڑ لیے تھے۔ اُس وقت تو میں سمجھا تھا کہ بال عائشہ نے پکڑے ہیں۔ اُس نے میرے بال کھینچ کر کہا تھا یہاں سے نکل جا۔ پھر شاہ جی نے بتایا کہ یہ جن ہے تو مجھے احساس ہُوا کہ میرے بال جن نے پکڑے تھے۔ اُس نے بال کھینچے تھے تو مجھے محسوس ہُوا تھا کہ میری کھوپڑی سے کھال اُکھڑ رہی

ہے۔ یہ گرفت جن کی ہو سکتی تھی۔ عائشہ میں اتنی طاقت تو نہیں تھی۔

دیہاتی علاقوں میں آج بھی لوگ مانتے ہیں کہ کوئی جن کسی لڑکی پر عاشق ہو جاتا ہے اور کوئی چڑیل اپنی پسند کے کسی آدمی کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ ایسا جن انسان کے رُوپ میں آ جاتا ہے اور ایسی چڑیل بڑی خوبصورت عورت کا روپ دھار لیتی ہے۔ میری نوجوانی کے زمانے میں اس قسم کی کہانیاں مشہور تھیں کہ ایک آدمی مر گیا تو اُس کی بیوی اُس کی میت پر روتے روتے غائب ہو گئی۔ مرنے والے کے ایک دوست نے بتایا کہ یہ عورت نہیں بلکہ عورت کے رُوپ میں چڑیل تھی جو اتنے سال اُس آدمی کی بیوی بنی رہی تھی۔ وہ آدمی مر گیا اور چڑیل اپنے روپ میں غائب ہو گئی۔

آپ نے اپنے دوستوں یا رشتہ داروں میں سے کسی شادی شدہ آدمی کو یہ کہتا سُنتے ہوں گے ——— "میرے ماں باپ نے کیا چڑیل میرے پلّے باندھ دی ہے!" ——— اس سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ اُس شخص کی بیوی واقعی چڑیل ہے جس نے عورت کا روپ دھار رکھا ہے۔ ایسے مظلوم خاوندوں کی بیویاں دراصل عورتیں ہوتی ہیں جو شادی کے بعد چڑیلوں کے روپ میں آ جاتی ہیں۔

ابا جان نے بتایا کہ شاہ جی ساری رات عائشہ کے گھر میں اسی طرح رہے کہ انہوں نے گھر کے کسی اور فرد کو اندر نہیں جانے دیا کہتے تھے کہ وہ جن کے ساتھ تنہائی میں شرطیں اور سودا طے کریں گے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ جن پہلے سے زیادہ بگڑ گیا ہے۔

شام کو عائشہ کا خاوند آیا۔ اُس نے بتایا کہ شاہ جی یہ کہہ کر چلے گئے ہیں کہ یہ جن کافر ہے اور شیطان کا خاص چیلا ہے۔ اسے وہ اپنے گھر بیٹھ کر ایک بڑے ہی سخت عمل کے ذریعے جان سے مار دیں گے۔

دو دن شاہ جی عائشہ کے گھر نہ گئے۔ کسی نے ان لوگوں کو ایک اور شاہ جی کا پتہ بتایا۔ یہ شاہ جی تین میل دُور ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ عائشہ کا سُسر اُسے ساتھ لے آیا۔ معلوم ہُوا کہ جن نے اس کا بھی استقبال بڑی بدتمیزی سے کیا لیکن اس شاہ جی نے عائشہ پر تشدد نہیں کیا بلکہ جن کے ساتھ بڑی شرافت سے مذاکرات کرتے رہے۔ اِس شاہ جی کے کہنے پر جن نے روٹی کھائی اور پانی بھی پیا۔ تین چار دن جن نے کچھ نہیں کھایا تھا، یعنی اتنے دِن عائشہ کا پیٹ خالی رہا تھا۔

یہ شاہ جی جن سے یہ پوچھ رہا تھا کہ یہ چاہتا کیا ہے اور کس شرط پر وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائے گا۔

"خاوند اسے طلاق دے دے" ـــــ جن نے کہا۔

"غریبوں کا گھر نہ اُجاڑو" ـــــ شاہ جی نے کہا ـــــ "یہ لڑکی بھی اُجڑ جائے گی۔ اس کے اور اس کے خاوند کے ماں باپ ان کے لیے نئے رشتے ڈھونڈتے پھریں گے، نئے سرے سے ان کو رقمیں خرچ کرنی پڑیں گی۔"

"لڑکی کے لیے فوراً رشتہ مل جائے گا" ـــــ جن نے کہا ـــــ "اس کے خاوند کی مجھے پرواہ نہیں۔"

شاہ جی جن کی منت سماجت کرتے رہے لیکن جن نہیں مان رہا تھا۔

"میں ابھی تمہاری منت کر رہا ہوں" ـــــ شاہ جی نے کہا ـــــ "میرے ہاتھ میں اتنا سخت عمل ہے کہ میں تمہارا بیڑہ غرق کر سکتا ہوں۔"

"میں اس کے خاوند کو جان سے مار ڈالوں گا" ـــــ جن نے کہا ـــــ "میں تین دنوں کے لیے جا رہا ہوں۔ اگر ان تین دنوں میں اس لڑکی کو خاوند نے آزاد نہ کیا تو میں خاوند کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

جن چلا گیا لیکن عائشہ کی جسمانی حالت اتنی بُری تھی کہ وہ پلنگ سے اُٹھ نہ سکی۔

"تم اب اپنا بُرا بھلا سوچ لو" ـــــ شاہ جی نے کہا ـــــ "بڑا ظالم جن ہے۔ تمہیں اپنے بیٹے کی جان کی سلامتی چاہیے تو اس لڑکی کو طلاق دے دو.... اور یہ خیال بھی رکھنا کہ کسی اور عامل کو نہ لے آنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس اُمید پر لگے رہو اور جن اپنا وار کر جائے۔ میں تم سے کوئی نذرانہ، کوئی پیسہ دھیلا نہیں لوں گا۔ میں تمہارا کام نہیں کر سکا۔ صرف اتنا کیا ہے کہ جن کا مقصد اور ارادہ معلوم کر لیا ہے۔"



یہ شاہ جی چلا گیا۔ عائشہ کا سُسر، ساس اور خاوند ہمارے گھر آئے اور بتایا کہ جن یہ الٹی میٹم دے کر تین دنوں کے لیے چلا گیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ یہ تینوں ہمارے گھر آ گئے ہیں اور یہ سُنا کہ جن چلا گیا ہے تو میں گھر سے چپکے سے کھسک گیا۔ میں عائشہ کو تنہائی میں دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ نہ سوچا کہ اُس کے خاوند کا بھائی گھر ہو گا۔

میں ڈرتے ڈرتے اُس گھر میں داخل ہُوا اور پلنگ والے کمرے میں گیا۔ عائشہ پلنگ پر چت لیٹی ہوئی تھی۔ پہلے تو یہ شک ہُوا کہ یہ عائشہ نہیں۔ بال بکھرے ہُوئے، آنکھیں لال سُرخ اور اندر کو دھنسی ہوئیں، اُس کا اتنا زیادہ دلفریب رنگ لاش کی طرح پھیکا سفید ہو گیا تھا۔ وہ ٹی بی کی آخری سٹیج کی مریضہ لگتی تھی۔ اُس کا دیور چارپائی پر بیٹھا تھا۔

"جا میرے بھائی!" ـــــ عائشہ نے مرِیل سی آواز میں دیور سے کہا ـــــ "مویشیوں کو پانی پلا لا۔ مجھے تو آج ذرا ہوش آئی ہے۔"

قریب ہی برساتی نالہ تھا۔ مویشی وہاں سے پانی پیا کرتے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ عائشہ دیور کو کھسکا رہی ہے.... دیور برخورداروں کی طرح اُٹھا، دونوں بیلوں اور گدھی کو کھول کر لے گیا۔

"سُنا ہے جن تین دنوں کے لیے چلا گیا ہے" ـــــ میں نے کہا ـــــ "اور یہ بھی سُنا ہے...."

"تم نے جو سُنا ہے سب جھُوٹ ہے" ـــــ عائشہ نے کہا ـــــ "صرف تم ہو جسے اپنا بھید دے رہی ہوں۔ تمہارے اور میرے درمیان کوئی پردہ نہیں۔ میرے دل میں جو دُکھ اور اِس دل میں جو کچھ بھی تھا وہ تمہارے آگے رکھ دیا تھا۔"

"بات صاف صاف کرو اور جلدی کرو" ـــــ میں نے کہا ـــــ "کوئی آ گیا تو بات ادھوری رہ جائے گی۔"

"صاف صاف بات یہ ہے کہ مجھ پر کسی جن کا قبضہ نہیں" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "میں نے تنگ آ کر یہ ناٹک کھیلا ہے۔ ہمارے گاؤں سے چار کوس دُور ایک گاؤں کی ایک لڑکی نے ایسے ہی کیا تھا۔ اُس کی ایک سہیلی ہمارے گاؤں میں بیاہی ہوئی آئی ہے۔ وہ میری سہیلی بن گئی تھی۔ اُس نے مجھے اُس لڑکی کی بات اس طرح سُنائی تھی کہ اپنی پسند کے ایک لڑکے کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی لیکن ماں باپ نے بات کسی اور کے ساتھ پکی کر دی....

"اس لڑکی کو ایک خرانٹ عورت نے یہ سوانگ رچانے کا مشورہ دیا۔ لڑکی نے ایسا ڈھونگ رچایا کہ اُس کے گھر والوں پر آفت آ گری۔ امیر کبیر لوگ تھے۔ پیر اور عامل بن بلائے دوڑے آئے۔ سب نے کہا کہ بڑا زبردست جن ہے۔ تین چار دنوں بعد جن بول پڑا۔ اُس نے کہا کہ اُس لڑکے کے ساتھ اس کی شادی کی گئی تو لڑکے کا کلیجہ منہ کے راستے باہر نکال دوں گا۔ لڑکے والوں کو خبر ملی تو انہوں نے لڑکی کا رشتہ لینے سے انکار کر دیا....

"تم جانتے ہو کہ جنّوں سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ جن موجود ہیں۔ میں اپنے خاوند سے اتنی تنگ آ گئی تھی کہ میں نے پہلے تو یہ سوچا تھا کہ اسے زہر دے دوں یا خود زہر کھا لوں۔ پھر میں نے صبر کر لیا اور دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ قسمت میں جو لکھا تھا

مل گیا ہے لیکن انسان کو یہ تو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ قسمت میں اور کیا کچھ لکھا ہے۔ ہم لوگ یہاں آ گئے اور تم مل گئے۔ تمہیں دیکھ کر میرا دماغ کسی اور طرف چل پڑا۔"

"لیکن عائشہ!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "میں اکیلا ہی تو قصوروار نہیں!"

"میں تمہیں قصوروار نہیں کہہ رہی" ـــــ عائشہ نے کہا ـــــ "قصور میرا ہی سمجھ لو۔ میں بتا رہی ہوں کہ تم میرے پاس آ گئے تو میرا صبر ختم ہو گیا۔ خاوند مجھے اور زیادہ بُرا لگنے لگا.... ایک روز میرے دماغ میں یہ سوچ آئی کہ یہ میں کیا کر رہی ہوں اور زندگی اس طرح تو نہیں گزرے گی۔ آخر تمہاری شادی ہو جائے گی اور تم کسی اور کے ہو جاؤ گے۔ یہ سوچ بھی آئی کہ میں اپنے جیسی کسی عورت کو دھوکا نہیں دوں گی اور کسی کا حق نہیں ماروں گی۔ میرا تم پر کوئی حق نہیں۔ تم میرے خاوند نہیں بن سکتے، کچھ عرصہ میرے ساتھ پیار محبت کا کھیل کھیل سکتے ہو....

"خدا کی قسم، دماغ میں کبھی گناہ کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ میں ایک پوری رات جاگ کر سوچتی رہی۔ یہ سوچ بھی آئی کہ تم زمین جائیداد والوں کے بیٹے ہو اور میں تمہارے مزارعوں کی بہو ہوں۔ میرا تمہارا ساتھ نبھ ہی نہیں سکتا۔ میں بہت پچھتائی اور اس سوچ میں آکر میرا دماغ ٹھہر گیا کہ کوئی دوسرا گناہ کروں جس سے اس بیکار خاوند سے نجات مل جائے اور پھر وہ آدمی مل جائے جسے میں اپنا خاوند کہہ سکوں۔ مجھے وہ لڑکی یاد آ گئی اور میں نے یہ ڈھونگ رچا دیا۔"

"یہ ڈھونگ کام کر گیا ہے" ـــــ میں نے کہا ـــــ "کوئی ماں باپ اپنے جوان بیٹے کو مروانا نہیں چاہتے۔ تمہیں طلاق مل جائے گی.... میں شاہ جی پہ حیران ہوں کہ انہوں نے ویسے ہی کہہ دیا کہ یہ جن ہے اور یہ کافر اور شیطان ہے۔"

"شاہ جی کی بات سن لو" ـــــ عائشہ نے کہا ـــــ "وہ پوری رات یہیں رہا اور سب کو باہر نکال کر دروازہ اندر سے بند کر دیا، پھر میرے پاس بیٹھ گیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ تم اپنے سسرال سے کوئی بات منوانا چاہتی ہو تو مجھے بتا دو۔ میں انہیں ڈرا کر منوا لوں گا.... میں نے اس کی اس بات کی پرواہ نہ کی اور جنوں کی طرح بولتی رہی۔ آدھی رات کے بعد اس شاہ جی نے میرے جسم کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا۔ میں نے اس کے منہ پر بڑا ہی زوردار تھپڑ مارا اور جن کی زبان میں کہا۔ ہاتھ پیچھے رکھ بدمعاش، یہ لڑکی میری ہے....

"میں اس کی نیت جان گئی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ یہ شاہ جی اور پیر جی اندر سے

کیا ہوتے ہیں۔ شادی سے پہلے میری ماں مجھے اپنے پیر کے پاس مریدنی بنانے کے لیے لے گئی تھی۔ پیر نے کہا کہ اپنی بیٹی کو اکیلے میں میرے پاس بھیجنا۔ دوسرے دن ماں نے مجھے پیر کے پاس بھیج دیا۔ پیر مجھے الگ کمرے میں لے گیا۔ اس نے شیطانی حرکتیں شروع کر دیں اور میں وہاں سے بھاگ آئی۔"

"ایک اور شاہ جی آئے تھے!" ـــــ میں نے کہا۔

"وہ شریف آدمی ہے" ـــــ عائشہ نے کہا ـــــ "اس نے بھی یہی کہا ہے کہ یہ جن ہے لیکن اس کی نیت بُری نہیں تھی.... اب تم چلے جاؤ۔ یہ لوگ آنے والے ہوں گے۔"

"تم یہاں سے چلی گئیں تو میرا کیا بنے گا؟" ـــــ میں نے جذباتی لہجے میں کہا ـــــ "پھر تم مجھے کیسے اور کہاں ملو گی؟"

"مجھے طلاق مل گئی تو اپنے گاؤں چلی جاؤں گی" ـــــ اس نے کہا ـــــ "میں تمہیں کہیں بھی نہیں ملوں گی نہ ملنے کی کوشش کروں گی نہ دل میں ملنے کی خواہش رکھوں گی۔ دوسری شادی کر دوں گی اور اپنے خاوند کی ہو کے رہوں گی۔"

میں وہاں سے اس طرح نکلا کہ میرا سر جھکا ہوا تھا اور مجھ پر ایسی کیفیت طاری تھی جس میں ندامت بھی تھی اور مرعوبیت بھی۔



عائشہ کا سسر اور ساس عائشہ کے گاؤں چلے گئے۔ اس کے ماں باپ کو بتایا کہ ایک جن نے عائشہ کے لیے اور ان کے لیے کیا صورتِ حال پیدا کر دی ہے۔ وہ دوڑے آئے۔ عائشہ نے انہیں دیکھتے ہی اپنے اوپر وہی کیفیت طاری کر لی جیسے اس کے وجود میں جن حاضر ہو گیا ہو۔

"اسے یہاں سے لے جاؤ" ـــــ جن نے عائشہ کی زبان سے کہا ـــــ "اسے خاوند نے طلاق نہ دی تو خاوند کو زندہ نہیں چھوڑوں گا اور لڑکی کو میں غائب کر دوں گا۔"

اسی روز طلاق ہو گئی۔ جن رخصت ہو گیا اور عائشہ کو اس کے ماں باپ گاؤں لے گئے۔

یہ میری زندگی کا پہلا اور بڑا ہی انوکھا تجربہ تھا۔ میرے لیے عائشہ کا کردار بڑا ہی عجیب تھا۔ میں اسے سیدھی سادی دیہاتن سمجھتا تھا لیکن اس نے جس کامیابی سے ایکٹنگ کی اور اس نے میرے ساتھ جو باتیں کہ کے میری بھی چھٹی کروا دی، ان باتوں نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔

میں نے سنا تھا کہ عورت ایک بھید ہے جسے آج تک کوئی نہیں پا سکا۔ یہ بھی

سُنا تھا کہ عورت نے بادشاہوں کے تختے اُلٹے ہیں اور یہ بھی سُنا تھا کہ عورت بادشٖ کو بھکاری اور بھکاری کو بادشاہ بنا سکتی ہے۔

یہ سب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

میں نے ایسے کچھ واقعات سُنے تھے۔ میرے قصبے میں دو آدمی تھے جو اپنے فرا کی وارداتیں خود ہی سُنایا کرتے تھے۔ ان میں ایک سکول ٹیچر تھا۔ وہ گرمیو کی چھٹیوں میں درویشی کا بہروپ دھار کر دیہاتی علاقے میں چلا جاتا اور مہینے ڈیڑ مہینے میں اچھی خاصی رقم کما لاتا تھا۔ وہ اکثر اپنے دوستوں کو بڑے دلچسپ واقعات سُنایا کرتا تھا۔

وہ جس علاقے میں جایا کرتا تھا، اس علاقے کے چند ایک جرائم پیشہ اور فراڈیے اُسے مختلف گھروں کے مسائل پہلے ہی بتا دیتے پھر ہر گاؤں میں خبر پہنچا دیتے کہ شاہ جی کہیں جا رہے تھے اور فلاں گاؤں والوں نے انہیں روک لیا ہے۔ دوسرے گاؤں کے حاجت مند لوگ دوڑ دوڑ کر "شاہ جی" کے پاس آتے، اپنی مشکلات اور مرادیں پیش کرتے اور "شاہ جی" کو منہ مانگے نذرانے دے کر جھوٹی اُمیدوں سے سرشار چلے جاتے تھے۔

دوسرے آدمی کا بھی یہی طریقۂ واردات تھا۔ وہ بھی ایک دو مہینوں کے لیے دیہات سے نکل جاتا اور "پہنچ والا بزرگ" اور "غیب کا حال جاننے والا عامل" بن کر چرب زبانی کے جادو سے پسماندہ اور مجبور دیہاتیوں کو خوب ٹھگتا اور اپنے خاندان کے لیے پورے سال کا خرچہ کما لاتا تھا۔

ان دونوں میں فرق یہ تھا کہ سکول ٹیچر چالیس سال سے کم عمر کا تھا۔ اس کی داڑھ نہیں تھی۔ وہ نوسربازی کے لیے جاتا تو پندرہ بیس دن پہلے شیو چھوڑ دیتا اور واپسی تک شیو نہیں بناتا تھا۔ دوسرے آدمی کی عمر پچاس سال سے کچھ اوپر تھی۔ اُس نے ایک بالشت لمبی داڑھی رکھی ہوئی تھی جس کے آدھے سے زیادہ بال سفید تھے۔

اگر میں ان دونوں کے سنائے ہوئے نوسربازی اور دیہاتیوں کی سادگی کے واقعات سنانے لگوں تو یہ ایک الگ کتاب بن جائے لیکن میں اس باب کو مختصر رکھوں گا کیونکہ میں آپ کو اپنے ساتھ بڑے لمبے سفر پہ لے جا رہا ہوں۔

چونکہ بات عائشہ کی ہو رہی ہے اس لیے یہ دو آدمی یاد آ گئے تھے ہمانہوں نے ایسے ہی واقعات سنائے تھے جیسا عائشہ کا میں نے اپنی آنکھوں دیکھ لیا۔ انہوں نے جو واقعات سنائے تھے وہ عائشہ کی ایکٹنگ سے ذرا مختلف تھے۔ وہ اس طرح کہ ان دونوں نوسربازو

ں کوئی ایک کسی گاؤں میں گیا ہُوا ہے۔ اُسے بتایا جاتا ہے کہ ایک جوان لڑکی کو کوئی دورہ ا ہُوا ہے "شاہ جی" کو لڑکی کے گھر لے جایا جاتا ہے۔ وہ لڑکی کی حرکتیں دیکھتا اور اُس کی باتیں ا ہے۔ گھر کے تمام افراد کو باہر نکال کر دروازہ بند کر لیتا ہے۔

لڑکی سے پوچھتا ہے، کیا چاہتی ہو؟ سچ سچ بتا دو ورنہ تمہارے باپ کو بتا دوں گا کہ ہ اس لڑکی کو کچھ بھی نہیں، یہ اپنی کوئی بات منوانے کے لیے ڈرامہ کر رہی ہے، اگر بتا وگی تو میں تمہاری خواہش اور مرضی پوری کروا دوں گا لیکن تمہیں میرے دو مطالبات پورے رنے پڑیں گے۔

لڑکی بتا دیتی ہے کہ جس لڑکے کے ساتھ اُس کی شادی طے کی گئی ہے، اسے وہ سند نہیں کرتی اور وہ فلاں کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔ "شاہ جی" بند کمرے میں لڑکی ے اپنے مطالبات پورے کروا کے اُسے کچھ اور ایکٹنگ سکھاتا ہے اور ایک دو دنوں میں ڑکی کے والدین "جن" کا مطالبہ پورا کر دیتے ہیں۔

چھوٹی عمر والا نوسرباز ایک بار ایک گاؤں سے ایسی ہی ایک لڑکی کے کانوں سے ونے کے جھمکے اُتروا کے لے آیا تھا۔ یہ لڑکی نے اُسے بقائمی ہوش وحواس خود دیے تھے۔ سرباز نے گھر والوں سے منوا لیا تھا کہ جن اتنے غصے میں نکلا ہے کہ لڑکی کے جھمکے اتار ے گیا ہے۔

حادثہ یہ ہے کہ دیہاتی ہی نہیں، شہروں کے پڑھے لکھے لوگ بھی اِس خرافات ماننے، دھوکہ کھاتے اور عاملوں کے ہاتھوں لُوٹے جاتے ہیں۔

میں فلاسفر نہیں، عالم دین نہیں اور میں سوشیالوجسٹ بھی نہیں۔ میں نے وعظ نہیں رنی نہ لیکچر دینا ہے نہ پند ونصیحت کرنی ہے میں واقعات سُنا رہا ہوں، کچھ کردار دکھا ہا ہوں۔ آپ اپنی رائے میں آزاد ہیں۔ جو نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہیں کر لیں۔ میں یہ کہوں گا ہمارے معاشرے میں عامل، شاہ جی، پیر، جوتشی اور نجومی وغیرہ بہت ہی خطرناک مجرم ہیں۔

عائشہ ایک پُراسرار تصور بن کر میرے ذہن میں رہ گئی اور میری زندگی سے اُس کا وجود یشہ کے لیے نکل گیا۔



میری زندگی میں ایک اور لڑکی عائشہ سے پہلے داخل ہو چکی تھی۔ اُس کے ساتھ رے تعلقات عائشہ والے نہیں تھے۔ وہ ایک بڑے زمیندار کی بیٹی تھی۔ اپنے علاقے ں اُس کی خاصی زمین تھی۔ پانچ چھ ایکڑ میں اس کا سبزیوں کا باغ تھا جس میں ناشپاتی

خوبانی اور آلوچے کے بھی درخت تھے۔ سبزیوں کو پانی دینے کے لیے رہٹ تھا۔ اس زمیندار کی نہری علاقے میں بھی انگریزوں کی دی ہوئی دو تین مربعے اراضی تھی۔

اسے میں راجہ کہوں گا اور اس کی بیٹی کا جو کچھ بھی نام تھا وہ مجھ تک ہی رہنے دیں، کہانی میں اُس کا نام واجدہ لکھوں گا۔ راجے کے خاندان کی روایت یہ تھی کہ روپیہ پیسہ اور اناج گھر میں جتنا بھی آئے کم ہے، تعلیم کا ایک لفظ بھی گھر میں داخل نہ ہونے پائے۔ یہ لوگ جتنے اَن پڑھ تھے، پگڑیوں کے شملے اُتنے ہی اونچے رکھتے تھے۔ یہ اپنے آپ کو اونچی ذات کی وجہ سے چھوٹی ذاتوں کو نیچ سمجھتے تھے۔ اِن کے اونچے پن میں جو نیچ پن تھا، یہ انہوں نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

میں ذرا چھوٹی ذات کے خاندان کا فرد تھا۔ مَیں نے میٹرک پاس کر لی تو کبھی کبھار یہ راجہ صاحب مجھے اپنے گھر بلا لیا کرتے اور ساتھ حکم دیتے کہ قلم دوات اور کاغذ لیتے آنا۔ میں چلا جاتا۔

"اوئے آگیا توُ! ___ راجہ ایسے لہجے میں کہتا جیسے آقا اپنے غلام کو حکم دیتا ہے"
قلم دوات اور کاغذ لایا ہے؟"

"لایا راجہ جی!"

"خط لکھ لے گا؟"

"لکھ لوں گا۔"

دیکھتا ہوں توُ کس طرح لکھتا ہے" ___ راجہ طنزیہ لہجے میں کہتا ___ "توُ اتنا لائق کہاں سے آگیا.... لکھ!"

جناب راجہ صاحب خود چِٹے اَن پڑھ، اردو بول بھی نہیں سکتے، مجھ سے خط لکھوا رہے ہیں اور تھوڑے وقفے سے کہے جا رہے ہیں ___ "توُ تو یار بڑا نالائق ہے"۔ اور کبھی کہتے ___ "معلوم ہوتا ہے توُ نے چھولے دے کر دس جماعتیں پاس کی ہیں۔"

مجھ میں اتنی جرأت نہیں کہ میں اُسے کہتا، راجہ جی، آپ تو کورے اَن پڑھ ہیں.... دراصل راجے کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ اَن پڑھ ہے، یا یہ کہ وہ اَن پڑھ ہی ہے لیکن مجھ سے مرعوب نہیں کہ مَیں میٹرک پاس ہوں۔

پھر اس راجے کے گھر میں انقلاب آگیا۔ اُس کا بڑا بیٹا تیرہ چودہ سال کا ہو گیا تھا، وہ دوسری جماعت سے بھاگ گیا اور اس نے پڑھنے سے ایسی توبہ کی کہ پھر کبھی سکول نہ گیا۔ اُس کا چھوٹا بیٹا آٹھ سال کا ہو گیا تھا۔ اُسے اس نے سکول میں داخل کرایا ہی نہیں

تھا۔ سُنا تھا راجے نے دو تین بار کہا تھا ___ "تعلیم حاصل کریں چھوٹی ذاتوں والے جنہوں نے نوکریاں کرنی ہیں۔ ہماری اولاد اَن پڑھ رہی تو بھی حکم ہی چلائے گی۔"

"راجے کے گھر میں نہ جانے کیسے یہ انقلاب آگیا کہ اس نے چھوٹے بیٹے کو سکول داخل کرا دیا۔ اُس وقت اُس کی بڑی بیٹی کی عمر سترہ اٹھارہ سال تھی۔ باپ نے بیٹوں کو نہیں پڑھایا تھا، بیٹی کو پڑھانے کی تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا، لیکن ایک روز راجے نے مجھے گھر بلا کر حیران کر دیا۔

"آج سے مَیں تمہیں ایک ڈیوٹی دے رہا ہوں" ___ راجے نے کہا ___ "واجدہ کو پڑھانا ہے۔ یہ سکول میں تو داخل نہیں ہو سکتی، اسے تم گھر پڑھا دیا کرو۔ تمہیں جو وقت ٹھیک لگے اُس وقت آ جایا کرو اور دو تین گھنٹے لڑکی کو پڑھا دیا کرو۔ قاعدہ، تختی اور قلم دوات کا بندوبست میں کر دوں گا۔"

راجے نے یہ نہ کہا کہ وہ مجھے اس کام کی اُجرت دے گا یا نہیں۔ اُس کا انداز بڑے لوگوں والا تھا اور وہ مجھے حکم دے رہا تھا۔ مَیں نے گھر آکر اپنے والدین کو بتایا تو والد صاحب نے اجازت دے دی۔ انہوں نے کہا کہ یہ بڑے لوگ ہیں اور یہ بد دماغ بھی ہیں۔ ہم نے ان کے ساتھ رہنا ہے، تم ویسے بھی فارغ ہو، وہاں چلے جایا کرو۔"

مسلمانوں کی پسماندگی اور بدنصیبی کا یہ حال تھا کہ وہ اُس دَور میں بیٹوں کو بھی تعلیم سے دوُر رکھتے تھے۔ ان کے مقابلے میں ہندو اور سکھ اپنی بیٹیوں کو بھی سکولوں میں پڑھاتے تھے۔ میں حیران تھا کہ راجہ اپنی بیٹی کو کیوں پڑھانا چاہتا تھا۔ میں راجے سے یہ وجہ معلوم نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے اگلے روز واجدہ کو پڑھانا شروع کر دیا۔ ان لوگوں کی بہت بڑی حویلی تھی۔ اس میں چھوٹا سا ایک کمرہ تھا جس میں ایک پلنگ اور دو کرسیاں تھیں۔ واجدہ کے باپ نے ہم دونوں کو اس کمرے میں بٹھا دیا۔

"دیکھ بچے!" ___ راجے نے کہا ___ "تم نے اسے اس قابل بنا دینا ہے کہ یہ خط پتر لکھ لیا کرے۔"

"ہاں راجہ جی!" ___ مَیں نے کہا ___ "میں اسے اس قابل بنا دوں گا۔"

راجہ جی ہمیں تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ واجدہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی نہ میں اُس کے لیے اجنبی تھا۔ اُس کا گھر ہمارے گھر سے دوُر نہیں تھا۔ اُن کی گلی تنگ تھی۔ ہماری گلی بہت کشادہ تھی۔ اس لیے زیادہ تر بچے ہماری گلی میں آکر کھیلا کرتے تھے۔ ان میں واجدہ

بھی ہوتی تھی۔ وہ تیرہ چودہ سال عمر تک ہماری گلی میں کھیلتی رہی تھی۔ اُن کے ہاں لڑکیوں کو پردے میں بٹھانے کا رواج نہیں تھا۔ ذرا اور بڑی ہو کر واجدہ نے گلی میں کھیلنا چھوڑ دیا تھا، پھر بھی وہ دوسرے تیسرے دن نظر آجاتی اور ہم ہنستے مسکراتے ایک دوسرے سے خیر خیریت دریافت کرتے تھے۔

اب واجدہ کی عمر سترہ سال سے کچھ اوپر ہو گئی تھی۔ وہ تو بچپن ہی سے خوبصورت تھی۔ لیکن سترہ سال کی عمر میں اُس کے حُسن میں جو نکھار آیا، وہ دیکھنے اور محسوس کرنے والا تھا۔ کم از کم میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اُس کے قد کاٹھ میں اپنی سی ایک کشش تھی۔ رنگ گورا، چہرے کے نقش دلفریب اور گردن لمبوتری تھی۔

وہ گھریلو لڑکیوں کی طرح شرمیلی اور گھُٹی گھُٹی نہیں تھی۔ وہ چونکہ اونچی ذات کی لڑکی تھی اس لیے اُس میں اپنے ماں باپ کی طرح تکبّر اور غرور تھا۔ اُس میں بات کرنے کی جرأت تھی۔ اور پورے اعتماد سے بات کرتی تھی۔ اگر میں کہوں کہ وہ شہزادی تھی تو اس میں مبالغہ آرائی نہیں ہو گی۔ مجھے یہی ایک خطرہ نظر آ رہا تھا کہ وہ مجھ پر حکم چلائے گی اور مجھے چھوٹی ذات کا لڑکا سمجھ کر مجھے اپنا نوکر سمجھے گی۔

میں نے اُسے پڑھانا شروع کر دیا۔ میرا یہ خطرہ اُس نے پہلے دن ہی رفع کر دیا کہ وہ مجھے اپنا نوکر سمجھے گی۔ اُس نے میرے ساتھ بچپن والی بے تکلفی شروع کر دی۔

"تمہیں پڑھنے کا خیال کیسے آگیا ہے؟" —— میں نے پوچھا۔

"میں نے ہوش سنبھالتے ہی کہنا شروع کر دیا تھا کہ میں پڑھوں گی" —— اُس نے جواب دیا "ابّا مانتے ہی نہیں تھے۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ ابّا نے اب مجھے پڑھنے کی اجازت اس لیے دی ہے کہ مجھے جس گھر میں دے رہے ہیں اُس گھر میں تھوڑی بہت تعلیم ہے اور جس کے ساتھ مجھے باندھا جائے گا وہ فوج میں نائک ہے۔ اُس نے نو جماعتیں پڑھی تھیں۔ سُنا ہے فوج میں اُس نے اتنے امتحان پاس کر لیے ہیں کہ اُسے بڑی جلدی اگلا عہدہ مل جائے گا۔ ابّا کو اب خیال آیا ہے کہ مجھے کچھ پڑھ لکھ لینا چاہیے، نہیں تو مجھے سسرال سے طعنے ملیں گے کہ شہر میں رہتے ہیں، اللہ نے دیا بھی ہے اور بچوں کو الف سے ب بھی نہیں پڑھائی۔"

"تم اتنی جلدی تو خط پتر لکھنے کے قابل نہیں ہو سکو گی" —— میں نے کہا۔

"میری شادی اتنی جلدی تو نہیں ہو رہی" —— واجدہ نے کہا —— "میں جب تک

پڑھنے لکھنے کے قابل نہیں ہو جاؤں گی شادی نہیں کروں گی۔"

میں نے اُس کی شادی کے متعلق اُس سے زیادہ بات نہ کی۔ میں اُس کے ساتھ زیادہ فری نہیں ہونا چاہتا تھا، لیکن چند دنوں ہی میں وہ میرے ساتھ بہت ہی فری ہو گئی اور ایسی فضا پیدا کر دی کہ میں اُس کے ساتھ بے تکلف ہو گیا۔ ذہن میں یہ رکھیں کہ یہ بے تکلفی عائشہ والی نہیں تھی۔ واجدہ کی بے تکلفی میں وقار اور خود اعتمادی تھی۔

"تم اتنے بُدھو اور بھلے مانس تو نہیں ہو" —— ایک روز اُس نے مجھ سے کہا —— "لیکن میں تمہارے ساتھ ذرا کھُل کے بات کرتی ہوں تو تم کچھوے کی طرح سُکڑ جاتے ہو۔ کیا تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتے کہ میں تمہارے ساتھ اپنے دل کی اور اپنے دُکھ سُکھ کی بات کروں؟"

"ہاں واجدہ!" —— میں نے کہا —— "تم ٹھیک کہتی ہو، میں سُکڑ جاتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو اپنی جگہ اور اپنے اصلی ٹھکانے پر رکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے خاندان کے مقابلے میں ہم چھوٹے لوگ ہیں۔ تمہارے ابّا مجھے اپنا نوکر سمجھتے ہیں۔"

"تم یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ میں تمہیں کیا سمجھتی ہوں؟" —— اُس نے کہا —— "تمہارا تعلق میرے ساتھ ہے.... اور.... اور" —— اُس نے رُک رُک کر کہا —— "تم مجھے بالکل ہی اپنے لگتے ہو۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ مجھے اپنے دل کی ہر بات تمہارے ساتھ کرنی چاہیے۔"

اُس نے یہ بات ایسے جذباتی انداز میں کی تھی کہ میں پگھل کر اُس کے سانچے میں ڈھل گیا۔ لڑکی بہت ہی خوبصورت تھی اور میں اس حقیقت کو چھپا نہیں سکتا کہ مجھ پر اُس کی خوبصورتی کا سحر طاری تھا لیکن میری نیّت میں ذرا سا بھی فتور نہیں تھا۔

جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے، واجدہ مجھے اپنے قریب کرتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی میرے دل میں اُترتی جا رہی تھی۔

میں اپنے فرض میں کوتاہی نہیں کر رہا تھا۔ واجدہ کے باپ نے کہا تھا کہ میں واجدہ کو اردو پڑھا لکھا دوں لیکن میں نے اُسے انگریزی پڑھانی بھی شروع کر دی۔ اُس وقت انگریزی پانچویں جماعت سے شروع ہوتی تھی۔ میں نے واجدہ کو الف ب کے ساتھ اے، بی، سی بھی پڑھانی شروع کر دی۔ واجدہ کو پڑھنے کا شوق تھا اور اُس کا دماغ بھی اچھا تھا، وہ بڑی تیزی سے لکھنا پڑھنا سیکھ رہی تھی۔

پھر ایسے ہُوا کہ ہم دونوں ایسی محبّت کی زنجیر میں جکڑے گئے جس کا جسموں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں پہلے اُسے ڈیڑھ کبھی دو گھنٹے پڑھاتا تھا، اب تین گھنٹے پڑھانے

لگا۔ ہم ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر رہ گئے۔ دنیا کی ہوش نہ رہی لیکن میں نے واجدہ کی پڑھائی میں کوتاہی نہ کی۔

ہمیں چھُپ چھُپ کر کہیں اور ملنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہم ہر روز تین گھنٹوں کے لیے کمرے میں تنہا بیٹھ سکتے تھے۔ ہمیں روکنے اور ٹوکنے والا کوئی نہ تھا۔ ہم کہیں اور ملنے کی ضرورت تب محسوس کرتے کہ ہماری نیّتیں خراب ہوتیں۔

"واجدہ!"۔۔۔ ایک روز میں نے کہا۔۔۔ "ہم دونوں بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں تھوڑے ہی عرصے پر تمہاری شادی ہو جائے گی۔ تم اپنے خاوند میں گم ہو جاؤ گی اور میں کُڑھنے اور سڑنے کے لیے رہ جاؤں گا۔"

"میری شادی اتنی جلدی نہیں ہو گی"۔۔۔ واجدہ نے کہا۔۔۔ "اور میری شادی اُس شخص کے ساتھ نہیں ہو گی جس کے لیے مجھے تیار کیا جا رہا ہے۔ ان لوگوں کو خوش کرنے کے لیے مجھے پڑھایا جا رہا ہے۔"

"کیا تمہاری کوئی سُنے گا؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ "کوئی تمہاری مرضی پوچھے گا؟"

"کوئی نہ سُنے!"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "کوئی نہ پوچھے۔ میں ایک بار ضد پہ آ گئی تو تم بھی دیکھ لینا۔"

"کیا تمہاری اپنی کوئی پسند، کوئی مرضی ہے؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔

"میں حیران ہوں کہ یہ سوال تم پوچھ رہے ہو!"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "کیا میں تمہیں چھوڑ کر کسی اور کی ہو سکتی ہوں؟"

مجھ پہ تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ یہ ایک اٹل حقیقت تھی کہ وہ مجھے دیوانہ وار چاہتی تھی اور میں اُس کی محبت میں پاگل ہُوا جا رہا تھا، لیکن یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں واجدہ کے ساتھ شادی کروں گا۔ ذاتوں کی اونچ نیچ ایک ایسی وسیع اور گہری خلیج تھی جسے عبور کرنا کسی صورت میں ممکن نہیں تھا۔

"تمہیں چُپ کیوں لگ گئی ہے؟"۔۔۔ واجدہ نے پوچھا۔

"نہیں نہیں!"۔۔۔ میں نے اُکھڑی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔ "میں چُپ نہیں ہوں.... تمہاری باتیں سُن رہا ہوں۔"

وہ بھانپ گئی کہ میں گھبرا اور بوکھلا گیا ہوں۔

"تم کچھ اور ہی سوچ رہے ہو"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "کس سوچ میں گم ہو گئے ہو؟"

میں نے اُسے ٹالنے کی بہت کوشش کی۔ باتوں کا رُخ پھیرنا چاہا لیکن اُس روز وہ

فیصلہ کرنے پر آئی ہوئی تھی۔

"میری بات کان کھول کر سُن لو"۔۔۔ اُس نے جذباتی انداز سے کہا۔۔۔ "میری شادی تمہارے ساتھ ہو گی۔"

اُس کا انداز تو جذباتی تھا لیکن لہجہ ایسا دو ٹوک کہ میں بول نہ سکا۔ اُس کا ایک بازو میری کمر میں اور میرا ایک ہاتھ اُس کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اُس کے وجود میں تحلیل ہو گیا ہوں۔ میں بھی نوجوان تھا۔ مجھ پر بھی جذبات کا نشہ طاری ہو گیا۔ پھر وہی ہُوا جو نوجوانی کی نادان عمر میں محبت کرنے والے کیا کرتے ہیں ....عہد و پیمان، کبھی جُدا نہ ہونے کی قسمیں، گھروں سے بھاگ کر کہیں چلے جانے کا عزم، ایک ساتھ جینے ایک ساتھ مرنے کے حلف!

میں کوئی ایسا گیا گزرا اور بزدل تو نہیں تھا کہ پیٹھ دکھا آتا۔ ایک لڑکی ایسی غیر معمولی دلیری کا مظاہرہ کر رہی تھی تو میں نے دل میں عہد کر لیا کہ میں اس سے زیادہ دلیر بن کر دکھاؤں گا۔

آج اُس وقت کو یاد کرتا ہوں تو شرمساری الگ اور پچھتاوا الگ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں بڑھاپے میں انسان جوانی کی حسین یادوں کے سہارے بڑھاپے کی اذیت سے محفوظ رہتا ہے۔ دلفریب تصوّر بڑھاپے کا سرمایہ ہوتے ہیں، لیکن میرا معاملہ کچھ اور ہے۔ واجدہ اور اُس کے والہانہ پیار سے بڑھ کر اور حسین یاد کیا ہو گی مگر یہ یاد جب ذہن میں انگڑائی لیتی ہے تو میرے بوڑھے نحیف وجود میں بھونچال آ جاتا ہے۔

یہ حسین یاد اُسی طرح بڑی ہی بھیانک یادوں میں دم توڑ جاتی ہے جس طرح رات کی تاریکیوں کو روشن کرنے والے چاند کو سیاہ کالی گھٹا نگل لیا کرتی ہے۔



اِن ہی دنوں عائشہ میری زندگی میں داخل ہُوئی۔

جی ہاں! آپ مجھ پر الزام عائد کریں گے کہ میں نے واجدہ کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔ میں آپ سے اتنی سی عرض کروں گا کہ میری اُس وقت کی عمر دیکھیں۔ نوعمری کا زمانہ تھا۔ ناتجربہ کاری تھی۔ جذبات بے لگام ہو جاتے تھے۔ اس عمر میں ہر ایڈونچر اچھا لگتا ہے۔

یہ بھی سوچیے کہ میں بھلا مانس ہوتا، اصولوں کا پابند ہوتا تو اس سنسنی خیز کہانی کا کردار نہ بنتا جو میں سنانے لگا ہوں۔ کہانی ایک یا ایک سے زیادہ انسانوں کی حماقتوں یا شرمستیوں سے بنا کرتی ہے۔

کہانی اُس وقت بنتی ہے جب کوئی آدمی فریب کاروں اور جھوٹ بولنے والوں کی محفل میں بیٹھ کر سچ بولنا شروع کر دیتا ہے۔

میں اپنے متعلق کوئی دعویٰ نہیں کر رہا کہ میں یہ تھا یا وہ تھا۔ البتہ یہ دعویٰ ضرور کروں گا کہ میں کہانی سنانے کے معاملے میں سو فیصد صداقت پسند ہوں۔ دروغ گوئی اور مبالغہ آرائی نہیں کروں گا۔

عائشہ کی ساری بات سُنا چکا ہوں۔ اُس کے ساتھ میرے جو تعلقات بن گئے تھے وہ من وعن سُنا دیے ہیں۔ اُس نے جس فریب کاری سے اپنے خاوند سے طلاق لی تھی، وہ بھی سُنا دی ہے۔ اب یہ سنانا باقی ہے کہ میں نے واحدہ کو بے خبر رکھا تھا کہ میں اپنے نئے مزارعوں کے گھر جایا کرتا ہوں۔ اُسے یہ سُنایا تھا کہ مزارعوں کی بہو پر جن آتا ہے۔ یہ بھی بتایا کہ جن کیا کہتا ہے۔

میں اپنے آپ پر فخر کیا کرتا تھا کہ بیک وقت دو نوجوان لڑکیاں مجھ پر مرتی ہیں میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔

اس دوران جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ ہمارے بزرگ جنگ کی خبریں سُنایا کرتے تھے۔ میں نے ان خبروں میں کبھی دلچسپی نہیں لی تھی۔ جنگ یورپ میں شروع ہوئی تھی۔ یورپ کے ساتھ کم از کم میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔

میں واحدہ کو اردو اور انگریزی پڑھاتا رہا اور جرمنی نے فرانس پر قبضہ کر لیا۔ ایک روز پتہ چلا کہ واحدہ قرآن مجید پڑھنا بھی نہیں جانتی۔ میں نے اُسے پہلا پارہ پڑھانا شروع کر دیا۔

ایک روز میں نے واحدہ کو پڑھانے کے لیے قرآن مجید سامنے رکھا تو واحدہ نے میرا دایاں ہاتھ پکڑ کر قرآن مجید پر رکھ دیا اور میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"قسم کھاؤ کہ تم میرے ساتھ شادی کرو گے" ___ اُس نے کہا ___ "میں گھر سے بھاگوں گی تو تم میرا ساتھ دو گے اور مجھے دھوکہ نہیں دو گے۔"

"ہوش کی بات کرو واحدہ!" ___ میں نے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا ___ "نہ مجھے گناہگار کرو نہ خود گناہگار بنو۔ کیا تم قرآن مجید کی قسم کو کھیل تماشہ سمجھتی ہو؟ میں نے تمہارے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ تمہیں دھوکا نہیں دوں گا اور پیٹھ نہیں دکھاؤں گا۔"

"میں بھی قسم کھاؤں گی؟"

"ہم دونوں مجبور ہیں واحدہ!" ___ میں نے کہا ___ "ہو سکتا ہے ہم قسم پوری نہ

کر سکیں۔ انسان فرشتہ نہیں نہ جن ہے کہ ناممکن کو ممکن کر دکھائے.... میں یہ قسم کھا سکتا ہوں اور کھاتا ہوں کہ شادی سے پہلے تمہارے ساتھ پاکیزہ تعلقات رکھوں گا۔ پاک محبت کروں گا۔"

"تم بُزدل ہو" ___ اُس نے کہا اور قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر بولی ___ "جس شخص کے ساتھ میری شادی کی جا رہی ہے، میں اُسے قبول نہیں کروں گی۔ اگر مجھے زبردستی اُس کی بیوی بنا دیا گیا تو میں اُسے دل سے خاوند نہیں مانوں گی.... میں تمہارے سوا کسی اور کو خاوند تسلیم نہیں کروں گی۔"

میں اندر باہر سے کانپ گیا۔ مجھ پر ایسی گھبراہٹ طاری ہو گئی جیسے کسی بڑی ہی خوفناک چیز نے میرے دل کو اپنے پنجوں میں جکڑ لیا ہو۔ واحدہ کی برادری کا ہی ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا جو اپنی ذات اور برادری کے دوسرے آدمیوں کی طرح شملہ اونچا اور گردن اکڑا کر رکھتا اور دوسری ذاتوں کے لوگوں کے ساتھ اس طرح تکبّر اور غرور سے بولا کرتا تھا جیسے وہ اس کے غلام ہوں۔

اُسے جوڑوں میں درد شروع ہوا جو علاج کے باوجود بڑھتا گیا اور تین مہینوں بعد اُس کا یہ حال ہو گیا کہ اُس کے ہاتھ مڑ گئے۔ انگلیاں ہتھیلیوں کی طرف مڑ گئیں۔ ٹانگیں آدھی دوہری ہو گئیں۔ یہ گھٹنوں کی وجہ سے ہوئی تھیں مجھے آج تک یاد ہے کہ میں نے اُسے اِس پوزیشن میں سرکتے دیکھا جس طرح آدمی اُکڑوں بیٹھتا ہے۔ اُس کا رنگ سیاہ اور عجیب طرح سے پھیکا ہو گیا تھا۔

اُس نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا ___ "کبھی قرآن مجید کی قسم نہ کھانا.... یا اللہ مجھے بخش دے۔ میں نے قسم توڑ دی تھی۔"

یہ تو مشہور ہو گیا کہ اُس نے قرآن مجید کی قسم کھا کر توڑی لیکن یہ پتہ نہ چل سکا کہ اُس نے کیا قسم کھائی تھی۔ اُس کی رعونت ختم ہو گئی اور ہم نے اُسے گلی میں غلیظ کیڑے کی طرح رینگتے دیکھا۔ ایک سال بعد وہ مر گیا۔

اب واحدہ نے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا لی تو میرا دل بیٹھنے لگا اور میں محسوس کرنے لگا جیسے مجھ پر غشی طاری ہو جائے گی۔

یہاں میں ایک بات کہوں گا۔ یہ تو ایک واقعہ ہے جس کا میں عینی شاہد ہوں۔ ایک شخص نے قرآن مجید کی قسم کھا کر توڑی اور وہ کسی اذیت میں مبتلا ہو کر کیسی بُری موت مرا۔ ایسے تین چار اور واقعات بھی سُنے تھے۔ یہ ایک عقیدہ تھا کہ جس نے قرآن مجید

کی قسم کھا کر توڑی وہ لوگوں کے سامنے بڑے ہی بھیانک اور عبرت ناک انجام کو پہنچا۔
آج میں یہ سوچتا ہوں کہ پاکستان کی سیاست میں، حکومت اور معاشرے میں جھوٹ ہی جھوٹ ہے۔ کیا لیڈر اور کیا عوام، اللہ، رسولؐ اور قرآن مجید کی قسمیں بلے دھڑک کھاتے اور اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں لیکن ان پر عذاب نازل نہیں ہوتا۔ عذاب اگر نازل ہوتا بھی ہے تو اُن پر ہوتا ہے جو ابھی تک سچ اور دیانتداری کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

دانشور کہتے ہیں کہ قوم پر عذاب گرنا شروع ہو گیا ہے۔ یہ عذاب کیا کم ہے کہ قوم پر وہ حکمران مسلط ہوتے چلے آ رہے ہیں جو خود تو عیش و عشرت کرتے اور قوم کو فاقہ کش بناتے چلے جا رہے ہیں۔

کیا یہ عذاب نہیں تھا کہ مشرقی پاکستان میں بھائی نے بھائی کا خون بہایا اور ملک آدھا رہ گیا!

اور کیا یہ عذاب نہیں کہ ملک کی آدھی آبادی دوسری آدھی آبادی کو ڈاکہ زنی، رہزنی اور رشوت خوری کے ذریعے لوٹ رہی ہے؟ لوگ اس طرح قتل ہو رہے ہیں جیسے مکھیاں ماری جاتی ہیں۔ کسی عورت کو پکڑ لیا اور اُس کے ساتھ اجتماعی زیادتی کر ڈالی۔
سمجھنے والوں کے لیے یہ عذابِ الٰہی ہے اور جو نہیں سمجھنا چاہتے، اُن کے لیے یہ واقعات

اور بعض کے لیے یہ دلچسپ خبریں ہیں۔
میں اپنے وقتوں کی بات کر رہا ہوں۔ واجدہ نے جذبات کے غلبے میں قرآن پر ہاتھ رکھ کر ایسی قسم کھالی جسے وہ پورا نہیں کر سکتی تھی۔ میں اب یہی توقع رکھ سکتا تھا کہ واجدہ یہ قسم پوری نہ کر سکی تو اسے دُنیا میں سزا ملے گی اور یہ میں برداشت نہیں کر سکوں گا۔



ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزر گیا۔
یوں لگا جیسے وقت اُڑتا ہوا آگے نکل گیا اور ہمیں کانوں کان خبر نہ ہوئی ہو۔ میں اور واجدہ ایک دوسرے میں ایسے گم ہو گئے تھے کہ گرد و پیش کا کچھ ہوش نہیں رہتا تھا۔ ہوش رہتا تھا تو صرف اتنا کہ میں نے واجدہ کو پڑھانا ہے۔ میں اُسے دلچسپی سے پڑھاتا اور وہ شوق سے پڑھتی تھی۔ اس عرصے میں اُس نے اس حد تک اُردو لکھنی شروع کر دی تھی کہ اچھا خاصا خط لکھ سکتی تھی۔
ہمیں اچانک پتہ چلا کہ ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے۔ ایسے لگا جیسے ہمیں بڑے ہی حسین خواب سے جگا دیا گیا ہو۔ یہ یوں ہوا تھا کہ ایک روز میں واجدہ کو پڑھانے گیا تو واجدہ کو کسی اور ہی مزاجی کیفیت میں دیکھا۔ میں نے پوچھا۔
"میری بات پکی کر دی گئی ہے" — اُس نے کہا — "کل لڑکے کی ماں اور اُس کا باپ آئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ لڑکا کسی بھی وقت جنگ پر چلا جائے گا اس لیے شادی جلدی ہو جانی چاہیے۔ اب وہ لوگ کسی بھی وقت دن مقرر کرنے کے لیے آئیں گے۔"
مجھے معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن ایسا ہو گا لیکن وہ دن اچانک آ گیا اور بہت جلدی آ گیا۔
"میں نے گزشتہ رات ماں سے کہہ دیا ہے" — واجدہ کہہ رہی تھی — "میں نے کہا ہے کہ میں اس شخص کے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔ ماں نے مجھے یوں دیکھا جیسے اُسے یقین نہ آیا ہو۔ میں نے کہا کہ وہ کہتے ہیں کہ لڑکا کسی بھی وقت آگے بھیج دیا جائے گا اس لیے شادی جلدی ہونی چاہیے۔ میں کہتی ہوں کہ میں اس عمر میں بیوہ نہیں ہونا چاہتی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ جنگ میں جاتے ہی مارا جائے۔ میں جنگ ختم ہونے تک شادی نہیں کروں گی۔"
"یہ تم نے ٹھیک کہا" — میں نے کہا — "تمہاری امی کا اپنا بھی یہی خیال ہو گا۔"
"توبہ کرو جی!" — واجدہ نے کہا — "اُس نے اُلٹا مجھے ڈانٹ دیا۔ کہنے لگی کہ زبان کو قابو میں رکھو۔ باپ نے سُن لیا تو جان سے مار ڈالے گا۔"
اس کے بعد واجدہ مجھے تین روز خبریں سناتی رہی۔ وہ اپنی ماں سے یہ منوانے کی

کوشش کرتی رہی کہ ابھی شادی کا دن مقرر نہ کیا جائے لیکن ماں نہیں مان رہی تھی۔

"تم مرد ہو" — اُس نے مجھے کہا — "ہمت کرو۔ مَیں اپنے ساتھ سارا زیور بھی لے آؤں گی اور بہت سارے پیسے بھی چُرا لاؤں گی۔ تیاری کرو اور کہیں چلے چلتے ہیں۔"

میں نے اُسے بتایا کہ اس میں کیا کیا خطرے ہیں لیکن وہ خطروں کی پرواہ ہی نہیں کر رہی تھی۔ وہ محبت کے واسطے دیتی اور روتی تھی۔ مَیں نے مجبور ہو کر اُسے کہا کہ مجھے ایک دو دن سوچنے دو۔

اُسے میرے انداز سے پتہ چل گیا ہو گا کہ میں اُسے ٹال رہا ہوں۔ اُس نے اپنی ماں کو اس فیصلے سے آگاہ کر دیا کہ وہ اس تانگ کے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔ اُس نے یہ بھی کہہ دیا ہو گا کہ وہ میرے ساتھ شادی کرے گی۔ اس کا اندازہ مجھے اگلے روز اُس کے گھر جا کر ہُوا۔ مَیں اُسے پڑھانے گیا تو اُس کا باپ اپنے دروازے پر کھڑا تھا۔

"بھاگ جاؤ یہاں سے!" — واجدہ کے باپ نے مجھے کہا — "پھر کبھی اس گھر میں قدم نہ رکھنا۔"

میں چُپ چاپ لَوٹ گیا۔

پھر پتہ چلا کہ واجدہ کی شادی کا دن مقرر ہو گیا ہے۔ تو دس دنوں بعد بارات آنی تھی۔

کسی گھر کی کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ پتہ چلا کہ واجدہ کو باپ نے بہت مارا پیٹا ہے اور اسے کمرے میں بند کر دیا ہے۔

دو دن اور گزر گئے۔ میں کھیتوں میں گھوم پھر رہا تھا۔ اپنے شہر کا ایک دس نمبریا بدمعاش دو جوان سے آدمیوں کے ساتھ میرے پاس آ رُکا۔

"ہم تمہیں ایک بات کہنے آئے ہیں" — دس نمبریئے نے کہا — "اگر تم نے اس پر عمل نہ کیا تو گم کر دیے جاؤ گے اور تمہارے گھر ڈکیتی کی ایسی واردات ہو گی کہ صفایا ہو جائے گا۔"

"بات کیا ہے یار؟" — مَیں نے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ اس شہر سے غائب ہو جاؤ" — دس نمبریئے نے کہا۔

"کیوں؟" — مَیں نے پوچھا — "تمہیں میں نے کیا تکلیف دی ہے؟"

"پچھتاؤ گے" — اُس نے کہا — "اور تمہارے پچھلے باقی عمر روتے رہیں گے۔"

میں اِس دس نمبریئے بدمعاش کو جانتا تھا۔ اس کے ساتھ جو دو آدمی تھے، میرے لیے اجنبی تھے۔ دونوں کے چہرے کھُردرے اور خوفناک تھے۔ میں ان کا ابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھ میں اتنی عقل تھی کہ میں اصل بات سمجھ گیا۔ واجدہ ے اپنے گھر کہہ دیا ہو گا کہ وہ میرے سوا اور کسی کے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔ اجدہ کے باپ نے اس دس نمبریئے کی خدمات حاصل کی ہوں گی کہ مجھے ڈرا دھمکا کر ہر سے غائب کر دیا جائے۔

"میں کہاں غائب ہو جاؤں؟" — میں نے ڈرے ڈرے سے لہجے میں پوچھا۔

"اوئے بیوقوف!" — دس نمبریئے نے کہا — "فوج میں بھرتی ہو جا۔ شہر کے ے شمار لڑکے فوج میں چلے گئے ہیں۔ تم فارغ اور نکمّے پھرتے رہتے ہو۔ تمہارا روزگار ں جائے گا اور ہمارا کام ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے" — میں نے کہا — "میں کل ہی جا کر بھرتی ہو جاؤں گا لیکن یہ عاملہ کیا ہے؟"

"تم نے بہت اونچی جگہ ہاتھ ڈالا ہے" — اُس نے کہا — "زندہ رہنا چاہتے ہو تو ہاں سے چلے جاؤ۔"

میں گھر آیا تو میرے والد صاحب بھی ڈرے ہوئے تھے۔ انہیں بھی یہی دھمکی مل چکی ی۔ انہوں نے، امّی اور بھائیوں نے یہی فیصلہ کیا کہ میں فوج میں بھرتی ہو جاؤں۔

برما کی طرف سے جنگ ہندوستان کی طرف آ رہی تھی۔ فوج میں بھرتی اتنی عام ی کہ جسمانی لحاظ سے ذرا کمزور جوان کو بھی بھرتی کر لیتے تھے۔

میں اگلے ہی روز بھرتی ہونے کے لیے روانہ ہو گیا۔

اسے انسان کی بدبختی کہیئے، کم فہمی کہیئے، حماقت کہیئے کہ وہ اچھے اور بُرے کو، خیر اور شر کو، نیک اور بد کو، جزا اور سزا کو اُس وقت سمجھتا ہے جب وہ بڑھاپے کی دلدل میں دھنس چکا ہوتا ہے۔ اُس وقت وہ سوائے پچھتانے کے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ عمرِ رفتہ واپس نہیں آیا کرتی کہ انسان اپنی حماقتوں کی تلافی کر سکے اور گناہوں کا کفارہ ادا کر سکے۔

بچپن کچھ سمجھتا نہیں۔

لڑکپن کچھ سمجھ تو لیتا ہے لیکن کہتا ہے ابھی تو ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں، ساری عمر پڑی ہے سمجھنے اور سمجھانے کے لیے!

جوانی عقل پر جذبات کو غالب کر دیتی ہے۔

اور عقل اُس وقت آزاد ہوتی ہے جب جوانی پر بڑھاپا غالب آ چکا ہوتا ہے۔

پھر بدبخت انسان کُڑھتا اور پچھتاتا ہے کہ یہ نہ کرتا تو یوں ہوتا، ویسے نہ کرتا تو ایسے نہ ہوتا۔

اسی اذیت میں عمر تمام ہو جاتی ہے۔

ایک بزرگ ملے تھے.... افسوس یہ ہے بہت دیر سے ملے.... انہوں نے کہا تھا کہ انسان کی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو صرف جسم سمجھتا ہے، گوشت اور ہڈیوں کا چلتا پھرتا مجسمہ، اور وہ اُس کی زیب و زینت میں اور اسی کی ضروریات پوری کرنے میں لگا رہتا ہے۔ جھوٹ بولتا ہے تو جسم کی لذت کے لیے، فریب کاری کرتا ہے تو جسم کی آسائش کے لیے، چوری اور حرام خوری کرتا ہے تو جسمانی خواہشات کی تکمیل کے لیے!

بزرگ نے کہا تھا، انسانِ کامل وہ ہے جو اس حقیقت کو قبول کرتا ہے کہ اُس کی اصلیت جسم نہیں روح ہے۔ جسم کی ٹریجیڈی یہ ہے کہ یہ جوان ہو کر بوڑھا ہوتا ہے اور روح کی عظمت یہ ہے کہ بوڑھی ہو کر جوان ہوتی ہے۔

عظمت اُسی کو حاصل ہوتی ہے جو اپنے آپ کو روح سمجھتا اور روح کی ہی زیب و زینت میں لگا رہتا ہے۔

جسم کا یہ رشتہ مٹی سے ہے۔ مجھ جیسے چھوٹے ذہن کے لوگ اس نکتے کو نہیں سمجھتے۔

یہی وجہ ہے کہ ولی اللہ صدیوں بعد پیدا ہُوا کرتے ہیں۔ ولی وہی ہوتا ہے جو اپنے آپ کو روح اور روح کو اللہ کی امانت سمجھتا ہے۔

باپ اپنے بچّوں کو غلط کاموں سے روکتا ٹوکتا ہے، پند و نصیحت کرتا ہے، مگر بچے اُس وقت اپنے باپ کی بات سمجھتے ہیں جب وہ خود باپ بن کر اپنے بچوں کو غلط کاموں سے روکتے ٹوکتے اور پند و نصیحت کرتے ہیں۔

مَیں نے کسی کی نہیں سُنی۔ آج سب کو اپنی سُنا رہا ہوں۔

کوئی نہیں سُنے گا!



مَیں کہہ رہا تھا کہ میں فوج میں بھرتی ہونے کے لیے چلا گیا۔ یہ تو سُنا چکا ہوں کہ مجھے بھرتی ہونے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی۔ راجہ صاحب کے بدمعاش نے مجھے یہ جو کہا تھا کہ تم نے بڑی اونچی جگہ ہاتھ ڈالا ہے۔ ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس اونچی جگہ کے خطرے مجھے بھاگنے پر مجبور کر رہے تھے۔

انگریزوں کو اپنی وہ بادشاہی جو آدھی دُنیا میں پھیلی ہوئی تھی، سُکڑتی نظر آ رہی تھی۔ اُدھر جرمنی نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو یورپ سے بھگا دیا تھا، اِدھر جاپان کی افواج سنگاپور اور ملایا میں دندناتی پھر رہی تھیں۔ ان کا رُخ برما کی طرف تھا اور برما سے آگے ہندوستان تھا۔ انگریزوں کی افواج جن میں برطانیہ، ہندوستان اور آسٹریلیا کی فوجیں شامل تھیں۔ بُری طرح پسپا ہو رہی تھیں۔

ان حالات میں انگریزوں نے فوج میں بھرتی کے معیار ختم کر دیے تھے اور فوج میں بھرتی ہونے کے لیے کچھ ایسی کشش پیدا کر دی تھی کہ جوان آدمی جوق در جوق بھرتی ہو رہے تھے۔ اور مختلف محاذوں پر زخمی اور ہلاک ہو رہے تھے۔ بھرتی کرنے والے فوجی افسر اپنے عملے کے ساتھ قصبوں اور دیہات کے سرکاری ریسٹ ہاؤسوں (ڈاک بنگلوں) میں آتے اور جوانوں کو بھرتی کر کے لے جاتے۔

ہمارے قصبے میں بھی ڈاک بنگلہ تھا۔ یہاں بھرتی کرنے والے آتے رہتے تھے۔

من نے ان کا انتظار نہ کیا اور ضلع کے شہر میں چلا گیا جو بہت بڑی چھاؤنی
ہیں نے بتایا ہے کہ انگریزوں نے فوج میں بھرتی ہونے کے لیے کشش پیدا کر رکھی
اس کا مجھے فائدہ ہوا۔ اس سے پہلے فوج میں جو کلرک بھرتی کیے جاتے تھے وہ
ہوتے تھے اور سپاہی کلرک کہلاتے تھے۔ جنگ شروع ہوئی تو انگریزوں نے
کشش پیدا کر دی کہ کلرکوں کو حوالداری کا عہدہ دے کر بھرتی کیا جانے لگا۔
بھی حوالدار کلرک لیا گیا اور مجھے کہا گیا کہ میں لاہور چھاؤنی میں متعلقہ سنٹر میں پہنچ جاؤں
مجھے دو دنوں کی مہلت دی گئی۔

میں اسی شام کو واپس آگیا اور گھر والوں کو بتایا کہ میں حوالدار کلرک بھ
ہو گیا ہوں۔ گھر والوں کے تاثرات ملے جلے تھے۔ ایک تو انہیں یہ خوشی تھی کہ
روزگار لگ گیا ہے اس کے ساتھ ہی گھر والے رنجیدہ بھی ہوئے جس کی وجہ یہ
میں کسی کے دھمکانے پر گھر سے جا رہا ہوں اور دوسری وجہ یہ کہ جنگ لگی ہوئی تھ
میرے مارے جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے سب کو تسلی دی کہ اس میں
کوئی بہتری ہو گی۔ دعا کریں کہ میں ترقی کروں اور کوئی بڑا عہدہ لے کر گھر آؤں۔

مجھے اس بدمعاش پر بہت غصہ تھا جس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں اس
سے چلا جاؤں ورنہ میں ساری عمر پچھتاؤں گا۔ اس شخص نے میرے باپ کو ایس
ہی دھمکی دی تھی۔ میں شام کا کھانا کھا کر باہر نکل گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ بدمعاش
کہاں ہو گا۔ شام کے بعد وہ کچھ دیر پان سگریٹ کی ایک دکان پر گپ شپ لگا
کے لیے بیٹھا کرتا تھا۔ میں اسے وہاں جا ملا اور اسے الگ لے گیا۔

"میں بھرتی ہو کر جا رہا ہوں" ——— میں نے کہا ——— "اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ
تمہاری دھمکی سے ڈر کر یہاں سے بھاگ رہا ہوں تو یہ خیال دماغ سے نکال دو۔ ا
راجہ صاحب کو بھی بتا دینا۔ میں اپنے ماں باپ کی عزت کی خاطر جا رہا ہوں۔ تم ج
بدمعاش کئی دیکھے ہیں۔"

اُس نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور طنزیہ سی ہنسی ہنس پڑا۔ میں نے اس
بازو پر اپنا ہاتھ مار کر اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا دیا۔

"تم نے عقلمندی کی ہے کہ یہاں سے جا رہے ہو" ——— اُس نے کہا ——— "اگر
یہاں رہتے تو تمہیں پتہ چلتا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"میں ہمیشہ کے لیے تو نہیں جا رہا" ——— میں نے کہا ——— "میں آؤں گا پھر دیکھ

اس شہر میں تم رہتے ہو یا میں۔ تم کرائے کی بدمعاشی کرنے والے آدمی ہو۔ تم
ے کے قدموں بیٹھ کر اس کا دیا کھاتے ہو۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ راجہ جس بیٹی کی
مجھے یہاں سے نکلوا رہا ہے وہ بیٹی اس کے ہاتھوں سے نکل چکی ہے اور وہ
اُس کے لیے مصیبت بنی رہے گی اور تم میرے ساتھ ٹکر لے کر اپنے لیے مصیبت
ی کر رہے ہو۔"

میں بزدل نہیں تھا۔ میں اُسے جو کچھ بھی کہہ رہا تھا وہ خالی دھمکیاں نہیں تھیں۔
نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اس شخص سے انتقام لوں گا لیکن وہ بھی آخر شہر کا
اش تھا اور لوگ اُس سے ڈرتے تھے۔ وہ چاقو زنی کی تین چار واردات کر چکا
۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ میری دھمکیوں سے ڈر جاتا اور چپ رہتا۔ اُس نے
ں دھمکیوں کا جواب دھمکیوں ہی سے دیا لیکن میں یہ دیکھ رہا تھا کہ وہ تھوڑا سا
گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ جنگ کے زمانے میں انگریز فوجیوں کی بہت
کرتے تھے اور ان کے گھر والوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بدمعاش
وجہ سے کچھ دب گیا تھا۔ میں اسے وہیں کھڑا چھوڑ کر وہاں سے آگیا۔

میں اگلی صبح اپنے ایک نوجوان دوست سے ملا۔ اس کا اصل نام ظاہر نہیں کروں گا۔
اس کا نام صداقت لکھوں گا۔ صداقت مجھ سے سال ڈیڑھ سال چھوٹا تھا اور وہ واجدہ
قریبی رشتہ داروں میں سے تھا۔ اُن کے گھر جاتا رہتا تھا۔ وہ میرا راز دار بھی تھا۔ میں
ملا اور اُسے بتایا کہ بھرتی ہو کر جا رہا ہوں اور وہ مجھے واجدہ کے متعلق ہر خبر لکھتا رہے۔
یقین تھا کہ میرا یہ دوست مجھے دھوکہ نہیں دے گا۔

واجدہ کی شادی کا دن مقرر ہو چکا تھا۔ صرف ایک ہفتہ باقی تھا۔
جس کے ساتھ واجدہ کی شادی ہو رہی تھی وہ واجدہ سے پانچ چھ سال بڑا تھا۔
نے اسے دو مرتبہ دیکھا تھا۔ اچھا خوبصورت جوان تھا۔ ہمارے قصبے سے پانچ چھ میل
کے بڑے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ بھی میٹرک پاس تھا اسی لیے وہ سگنل کور
ٹیک تھا۔



میں اپنے شہر سے رخصت ہو کر ٹریننگ سنٹر میں لاہور چلا گیا اور میری ایک نئی
کا آغاز ہوا۔ یوں سمجھ لیں کہ میرے ایک ایسے سفر کا آغاز ہوا جو سنسنی خیز کہانیوں کا
بن گیا۔

میں اگر یہ بتانے لگوں میں نے ٹریننگ سنٹر کے شب و روز کو ذہنی طور پر
طرح قبول کیا تو یہ الگ تھلگ ایک اور ہی کہانی بن جائے گی۔ جس میں آپ کی
کی شاید کوئی بات نہ ہو۔ مختصر یوں ہے کہ مجھے ہزاروں رنگروٹوں میں دھکیل دیا
یہ دیہاتی اور ان پڑھ تھے۔ ان میں اچھے خاندانوں کے جوان بھی تھے۔ وہ بھی ان
تھے یا کوئی تین جماعتیں پڑھا ہوا تھا۔ وہ دوسروں سے اس لیے مختلف لگتے
بات ذرا تمیز سے کرتے تھے۔ باقی سب اُجڈ اور جانگلی تھے۔

غور کیجئے کہ میں شہر کا رہنے والا اور میٹرک پاس تھا جو اُس زمانے میں
زیادہ تعلیم سمجھی جاتی تھی۔ مجھ میں شائستگی اور تہذیب تھی۔ میں نے تھوڑے ہی دن
محسوس کر لیا کہ یہاں نہ شائستگی کی ضرورت ہے نہ تہذیب کی۔ اس فوجی دنیا میں
سکے نہیں چلتے تھے۔

آپ تجربہ کر کے دیکھیں۔ آٹھ دس ایسے آدمی جو ہر وقت مادر زاد برہنہ رہتے ہیں
اپنا پورا لباس پہنے ہوئے ان ننگوں کے ساتھ رہنے لگیں۔ دو تین دنوں بعد آپ
محسوس کرنے لگیں گے جیسے آپ ننگے ہیں اور ان سب نے کپڑے پہنے ہوئے ہیں
آدھا دن اور گزرے گا تو آپ لباس کو غیر ضروری بلکہ خلافِ تہذیب سمجھ کر الگ پھینک
یہ میرے ساتھ ٹریننگ سنٹر میں ہوا۔ میں آٹھ دس دن تو بہت پریشان رہا
تو ٹریننگ اتنی سخت کہ گدھا بھی بھاگ جائے اور دوسرے اُجڈ اور ان پڑھ لوگوں
ساتھ رہنا۔ آٹھ دس دنوں بعد میں نے اپنے آپ میں یہ تبدیلی دیکھی کہ میں نے
ان پڑھ رنگروٹوں کی طرح باتیں شروع کر دیں اور میرے طور طریقے انہی جیسے ہو
انسان کو خدا نے یہ وصف عطا کیا ہے کہ وہ ہر قسم کے حالات کے سانچے
ڈھل جاتا ہے۔

میں یہ بھی بتا دوں کہ آپ کو حیران ہونا چاہیے کہ میں پڑھا لکھا جوان
میں کیوں چلا گیا۔ اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ میں اُس علاقے
رکھتا ہوں جو فوج میں بھرتی ہونے کو بہت بڑا اعزاز سمجھتے ہیں۔ یہ ہمارے علا
صدیوں پرانی روایت ہے۔

اس قسم کے سوال ذہن سے نکال دیں کہ یہ کیوں ہوا اور وہ کیسے ہوا
ساتھ حالات نے جو کھیل کھیلا اور میں نے حالات کے ساتھ جو سلوک کیا
ہوں۔ آپ نے بڑے نیک حضرات کی بڑی لمبی لمبی کہانیاں پڑھی ہیں، اب ایک

کی داستان بھی پڑھ لیں۔

میرے دوست صداقت کا خط آیا۔ اُس نے لکھا کہ واجدہ کی شادی ہو گئی ہے اور
اب وہ اپنے سسرال میں ہے۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ صداقت میرا رازدار تھا۔ واجدہ
بھی جانتی تھی۔ صداقت واجدہ کے گھر جاتا تھا تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں تھا۔

صداقت کے خط کے ساتھ واجدہ کا مختصر خط بھی تھا۔ واجدہ نے یہ خط شادی سے
دو دن پہلے لکھا اور صداقت کو دے دیا تھا۔ یہ خط آج بھی میرے پاس موجود اور محفوظ
ہے۔ آدھی صدی سے کچھ برس اوپر کے اس خط کا کاغذ پیلا اور مٹیالا سا ہو گیا ہے۔
یہ خط کسی برگزیدہ پیر کے دیئے ہوئے تعویذ کی طرح ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے۔ واجدہ
نے میرے نام کے ساتھ والہانہ پیار کے دو الفاظ لکھ کر آگے لکھا:

"...تم چلے گئے۔ یہ تم نے اچھا کیا۔ ان ظالموں کے ارادے بہت خطرناک
تھے۔ میں کسی کو دھوکہ دینا اور جھوٹ بولنا گناہ سمجھتی ہوں۔ میں نے ماں اور
اپنے باپ کو صاف لفظوں میں تمہارا نام بتا دیا اور کہا تھا کہ خدا نے میری
قسمت اس لڑکے کے ساتھ جوڑ دی ہے اور میں خدا کے حکم کے خلاف نہیں
چل سکتی۔ باپ نے میری بہت پٹائی کی اور ایک کمرے میں قید کر دیا۔ یہ
خط چھپ کر لکھ رہی ہوں۔ ساری باتیں نہیں لکھ سکتی۔ باپ نے اور بڑے
بھائی نے کہا کہ وہ تمہیں قتل کر دیں گے....

"اب یہ سن لو کہ میری شادی ہو جائے گی لیکن میں اس شخص کو قبول نہیں
کروں گی۔ میں زہر کھا کر مر سکتی ہوں لیکن میں تمہارے لیے زندہ رہنا چاہتی ہوں۔
میرے ساتھ شادی کرنے والا شخص بہت پچھتائے گا۔ میری روح تمہیں
قبول کر چکی ہے۔ میرا تمہارا روحوں کا ساتھ ہے۔ میں صرف تمہارے لیے
زندہ رہوں گی اور ساری عمر تمہارا انتظار کروں گی۔"

واجدہ کا خط دیکھ کر مجھے یہ خوشی ہوئی کہ اُسے لکھنا پڑھنا میں نے سکھایا تھا
اُس کے باپ نے مجھے کہا تھا کہ اسے اتنا پڑھا لکھا دو کہ یہ خط پتر لکھنے کے
قابل ہو جائے۔ میں نے اُسے اس قابل بنا دیا تھا اور اُس نے پہلا خط مجھے
لکھا تھا۔

صداقت دھوکہ دینے والا دوست نہیں تھا۔ واجدہ نے خط لکھ کر اُسے دے دیا
اور اُس نے اپنے خط کے ساتھ مجھے بھیج دیا۔ اُس خط نے مجھ پر جو اثر کیا وہ میں لفظوں

میں بیان نہیں کر سکوں گا۔ مجھ پر پاگلوں جیسی کیفیت طاری ہو گئی۔ کبھی خیال آتا کہ ابھی جاؤں اور واجدہ کو ساتھ لے آؤں۔ واجدہ کے باپ اور بڑے بھائی پر غصہ آیا تو غصے سے میرا وجود کانپنے لگا۔ مَیں نے ارادہ کر لیا کہ جا کر دونوں کو قتل کر آؤں اور پھر موقع دیکھ کر واجدہ کے خاوند کو بھی قتل کر دوں۔

میری سوچیں اور میرے ارادے جذبات کے زیرِ اثر تھے۔ وہ عمر ہی ایسی تھی میں پریشان اور بے چین ہوتا چلا گیا۔ شام کا وقت تھا۔ مَیں نہایا اپنے کپڑے پہنے اور پریڈ گراؤنڈ کی طرف نکل گیا۔ وہاں ایک جگہ درختوں کا گھنا جھنڈ اور نیچے ہری بھری گھاس تھی۔ مَیں وہاں جا بیٹھا اور تصوروں کی جذباتی دنیا میں چلا گیا۔

کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ مَیں تو خواب و خیال اور عشق و محبت کی دنیا میں بھٹک رہا تھا۔ مَیں نے بدک کر پیچھے دیکھا۔ وہ میرا دوست حمید تھا۔

"تم تو لگتا ہے کسی کا ماتم کر رہے ہو" —— حمید نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا —— "کیا بات ہے؟ گھر سے کوئی ایسا ویسا خط ہے یا گھر کی عیش موج یاد آ رہی ہے؟"

مَیں نے سر جھکا لیا۔

"جانے دے خانی!" —— حمید نے میری ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر میرا سر اوپر کر کے کہا —— "جا یار! تُو تو شاید رو تا بھی رہا ہے.... مجھے نہیں بتاؤ گے تو یہ نہ کہا کرو کہ ہم دوست ہیں۔ میں سمجھوں گا کہ ہم ساتھی ہیں۔ ٹریننگ ختم ہو گی تو اپنی اپنی پلٹن میں چلے جائیں گے۔"

"نہیں حمیدے!" —— میں نے کہا —— "تمہیں نہیں بتاؤں گا تو اور کسے بتاؤں گا۔ میں نے تمہیں اپنا یہ راز ابھی نہیں دیا تھا۔ اب سن لو۔"

میں ٹریننگ سنٹر میں آیا تو دو ہی دنوں بعد حمید میرا دوست بن گیا تھا۔ میری تحصیل کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا جو ہمارے قصبے سے سات ساڑھے سات میل دور تھا۔ مَیں نے پہلے سوچا ہی نہ تھا کہ اُس کے گاؤں کے ساتھ ایک رشتہ بننا ہے۔

حمید بڑا پیارا دوست تھا۔ میری طرح وہ بھی اُونچی ذات کا آدمی نہیں تھا اور وہ کمی کمین ذات کا بھی نہیں تھا۔ اُس کے گاؤں سے دو اڑھائی میل دور ایک بڑے گاؤں میں مڈل سکول تھا۔ اس سکول میں اُس نے سات جماعتیں پڑھی تھیں۔ وہ باعزت خاندان کا فرد تھا۔ میرے ساتھ اُس کی دوستی ہوئی تو مَیں نے فوراً پہچان

لیا کہ مضبوط دل گردے والا جوان ہے۔ اس میں اصل خوبی تو یہ تھی کہ ہنس مکھ اور ہمدرد تھا۔

اُس نے مجھے اکیلے اِدھر آتے اور بیٹھے دیکھا تو میرے پاس چلا آیا۔ اُس وقت میں خود ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ کوئی غمخوار مل جائے جو میرے دل کو سکون دے دے۔

"ہاں خانی!" —— حمید نے کہا —— "بتا وہ کیا راز ہے؟"

مَیں نے اُسے راز بتا دیا۔ کوئی بات نہ چھپائی۔ مجھے جس طرح واجدہ کے بھائی نے شہر سے نکلوایا تھا وہ بھی سنایا اور سب سنا کر اُسے واجدہ کا خط دکھایا۔ خط پڑھ کر اس نے مجھے دیا اور اُس کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہو گئی۔ چند سیکنڈ تو وہ کچھ بولا ہی نہیں۔

"کیوں حمیدے!" —— میں نے کہا —— "تمہیں تو چُپ ہی لگ گئی ہے۔ تم مجھے یہ نصیحت کرو گے کہ بھول جاؤ واجدہ کو، اس کی شادی ہو گئی ہے۔ کوئی اور لڑکی دیکھ لو۔"

"نہ خانی!" —— اُس نے کہا —— "میں تو تمہیں یہ کہنے لگا تھا کہ مرد بنو اور قسم کھاؤ کہ اس لڑکی کو حاصل کر کے رہنا ہے.... دیکھو یہ عورت ذات تمہاری محبت کی خاطر کیسی قربانی دے رہی ہے۔ اس نے جس دن اپنے خاوند کو کہہ دیا کہ مَیں نے تمہیں دل سے قبول نہیں کیا؟ وہ اس لڑکی کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔ اپنے علاقے کے لوگوں کو تم جانتے ہو۔ ذرا سی بات پر قتل اور خون خرابہ ہو جاتا ہے۔"

"ہاں حمیدے یار!" —— میں نے کہا —— "یہ تو میں نے دیکھ لیا ہے کہ یہ لڑکی اپنی جان کی بازی لگا چکی ہے۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں!.... مَیں نے تو یہ سوچا ہے کہ واجدہ کے خاوند کو اور باپ کو قتل کر دوں۔"

"قتل کرنا پڑے گا" —— حمید نے کہا —— "لیکن اس طرح کہ کسی کو پتہ نہ چلے قاتل کون ہے۔ اس کام کے لیے حوصلہ اور صبر چاہیے۔ اندھا دھند کوئی کارروائی نہیں کرنی۔ جو تم نے اپنے دل کو روگ لگا لیا ہے یہ چھوڑ دو۔ ہتھیلی پر سرسوں نہیں اُگا کرتی۔ لیکن یہ خیال رکھنا کہ صبر صبر میں لڑکی کو ہی بھول جاؤ۔"

"میں نے سب سے پہلے تو ایک انتقام لینا ہے" —— مَیں نے کہا —— "جس بدمعاش نے مجھے دھمکی دی تھی اُسے نہیں چھوڑوں گا۔"

"اُسے قتل نہیں کرنا" —— حمید نے کہا —— "اُسے اتنا مارنا پیٹنا ہے کہ مرے بھی نہیں اور زخمی بھی نہ ہو اور احتیاط یہ کرنی ہے کہ کوئی گواہ نہ ہو.... پہلے یہ بتاؤ تم میں

اتنی ہمت ہے بھی یا نہیں؟"

"یہ تم دیکھ لینا" ــــ میں نے کہا ــــ "اپنی زبان سے تو میں یہی کہوں گا کہ میں بہت ہی دلیر اور شیر ہوں لیکن تم نہیں مانو گے۔ کہو گے کہ ایک بدمعاش نے تمہیں دھمکی دی کہ اس شہر سے نکل جاؤ اور تم بھاگ آئے۔"

"نہیں خانی!" ــــ حمید نے کہا ــــ "میں تمہیں ایسا طعنہ نہیں دوں گا۔ میں خود تمہاری طرح ہی اپنے گاؤں سے نکلا ہوں، بلکہ بہ مجبوری نکالا گیا ہوں۔ تم جس طرح کہتے ہو کہ تم اس بدمعاش سے انتقام لو گے جس نے تمہیں دھمکیاں دی تھیں اسی طرح میں نے بھی قسم کھا رکھی ہے کہ میں اُن لوگوں سے انتقام لوں گا جنہوں نے مجھے گاؤں سے نکلوایا ہے۔ تمہیں تو واجدہ کے باپ نے ایک بدمعاش سے دھمکیاں دلوائی تھیں، مجھے مارا پیٹا گیا تھا... میں نے بھی انتقام لینا ہے خانی!"



اُس کی یہ بات سُن کر میں اپنی بھول گیا۔ اُس سے پوچھا کہ وہ مجھے اپنا قصہ سنانا پسند کرے گا؟

"کیوں نہیں خانی!" ــــ اُس نے کہا ــــ "تم نے اپنا راز مجھے دے دیا ہے میں اپنا راز تم سے نہیں چھپاؤں گا۔ یار یاروں کے کام آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ہم دونوں مل کر اپنے دشمنوں سے انتقام لیں۔ میں تمہیں بزدل تو نہیں سمجھتا۔"

"ہاتھ آئے حمید!" ــــ میں نے ہاتھ اُس کی طرف بڑھا کر کہا۔

اُس نے میرا ہاتھ مصافحہ کی طرح اپنے ہاتھ میں لے کر زور سے دبایا۔

"میں نے کبھی قسم نہیں کھائی حمید بھائی!" ــــ میں نے اُس کے ہاتھ پر دوسرا ہاتھ رکھ کر کہا ــــ "آج اللہ کو حاضر ناظر جان کر قسم کھاتا ہوں کہ ہر حال میں اور ہر مشکل میں تمہاری مدد کروں گا اور جان کی بازی بھی لگانی پڑی تو لگا دوں گا۔"

"اور میں بھی اللہ اور رسولؐ کی قسم کھاتا ہوں" ــــ حمید نے اپنا دوسرا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر کہا ــــ "تمہیں اپنا سگا بھائی سمجھتا ہوں۔ جہاں کہو گے جس وقت کہو گے، جان دینے کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔ ہر مشکل میں مدد کروں گا۔ تمہارے دشمن کو اپنا دشمن سمجھوں گا۔"

یہاں میں اپنی کہانی روک کر ایک بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں اُس دَ[ور] کی باتیں سُنا رہا ہوں جس دَور کا آج کل تصور بھی نہیں رہا۔ زمانہ اس طرح بدل گ[یا]

ہے جیسے زمین و آسمان اوپر نیچے ہو گئے ہوں۔ میں نے اور حمید نے ایک دوسرے کو حلفیہ بھائی بنالیا تھا اور ہم نے ایک دوسرے پر جان قربان کرنے کی قسم کھائی تھی۔ یہ کوئی عجیب یا جذباتی بات نہیں تھی بلکہ یہ اُس زمانے کا ایک رواج تھا کہ دو آدمی ایک دوسرے کو بھائی بنا لیتے تھے اور وہ ساری عمر عملی طور پر بھائی بن کر رہتے تھے۔

اس طرح منہ بولے بھائی بننے کا ایک طریقہ اور بھی اختیار کیا جاتا تھا جو یہ تھا کہ بھائی بننے والے دو آدمی اپنی پگڑیاں یا ٹوپیاں تبدیل کرتے تھے۔ یہ ایک باقاعدہ تقریب ہوتی تھی۔ چند ایک آدمیوں کو مدعو کیا جاتا، ان کی خاطر تواضع کا انتظام ہوتا اور پھر یہ دونوں آدمی اعلان کرتے تھے کہ وہ بھائی بن گئے ہیں۔ پھر دونوں اپنی اپنی پگڑیاں یا ٹوپیاں اُتار کر ایک دوسرے کے سر پر رکھ دیتے تھے اور اس کے بعد اس تقریب میں جو بزرگ ہوتا تھا وہ دعائے خیر کرتا اور محفل برخاست ہوتی تھی۔

اکثر لوگ خصوصاً نوجوان، بغیر کسی تقریب، حلف یا قسم کے آپس میں بھائیوں جیسا پیار پیدا کر لیتے تھے اور ایک دوسرے کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ صرف مرد ہی نہیں بلکہ کوئی مرد اور عورت بھی منہ بولے بہن بھائی بن جاتے تھے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ سگے بہن بھائیوں والا رویّہ ہی رکھتے تھے۔ آج کی جدید فیشن زدہ سوسائٹی کے لوگ یقین نہیں کریں گے کہ منہ بولے بہن بھائی اگر تنہائی میں اکٹھے بیٹھے ہوئے ہوتے تو اِن پر کوئی بھی آدمی شک نہیں کرتا تھا۔

آج کے مصنوعی، خود غرض، مفاد پرست اور مغرب کے کلچر کا لبادہ اوڑھے ہوئے معاشرے میں سگے بہن بھائی جیسے پاکیزہ رشتوں کو کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ لوگوں پر دو بھوت سوار ہو گئے ہیں۔ ایک یہ کہ زیادہ سے زیادہ دولت کماؤ اور دوسرا بھوت جنسیت کا ہے۔ کیا لڑکے اور کیا لڑکیاں، دوستی لگانے کو جائز فیشن سمجھتے ہیں۔ امریکہ اور یورپ کی جنسی آزادی جسے مغرب والے بڑے فخر سے سیکس لبرٹی کہتے ہیں، ہمارے ملک میں بھی رواج پا گئی ہے۔

یہ لعنت وی سی آر کی ہے جس سے گھروں میں چھوٹے بڑے، لڑکیاں اور لڑکے عریاں اور فحش فلمیں دیکھتے ہیں۔ وی سی آر کے علاوہ اور بھی کئی عناصر ہیں جنہوں نے معاشرے کو شرم و حجاب اور خاندانی غیرت سے محروم کر دیا ہے۔ بے حیائی ہمارے کلچر میں شامل ہو گئی ہے۔ میں آج اپنے قصبے کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے لڑکپن اور نوجوانی والا

قصبہ یاد آتا ہے۔ اب تو یوں لگتا ہے جیسے میں اپنے قصبے میں اجنبی ہو گیا ہوں۔ ہر گھر کے دروازے پر ٹاٹ یا بوری کا پردہ لٹک رہا ہوتا تھا جو نشانی ہوتی تھی کہ یہ مسلمانوں کا گھر ہے اور اس گھر کی خواتین پردہ نشین ہیں۔

اب سب پردے اُٹھ گئے ہیں۔

میرا قصبہ شہر بن گیا ہے۔ ہر گھر میں ٹی وی اور ہر دسویں گھر میں وی سی آر ہے۔ ویڈیو فلموں کی دُکانیں کھُل گئی ہیں۔ میں لڑکیوں کو ویڈیو لے جاتے دیکھتا ہوں۔

میری نوجوانی کے وقتوں کی پردہ نشین خواتین کی بہو بیٹیوں اور پوتیوں، دوہتیوں کے سروں سے دوپٹے سرک کر کندھوں اور سینوں پر آ گئے ہیں۔ بال کٹ گئے ہیں۔ لباس ایسے کہ ان کے جسم ملبوس ہوتے ہوئے بھی مستور نہیں لگتے۔

یہ لباس اور یہ جسم ہر کسی کو دیدار کی دعوت دیتے ہیں۔

ایک محلے یا ایک گاؤں کی لڑکی کو کوئی مَیلی آنکھ سے دیکھتا تھا تو سارا محلہ یا گاؤں مشتعل ہو کر مرنے مارنے پر اُتر آتا تھا۔

اب کسی محلے یا گاؤں کی لڑکی باہر نکلتی ہے تو محلے یا گاؤں کے جوان اُسے دیکھنے کو باہر نکل آتے ہیں۔ ہر آنکھ مَیلی ہوتی ہے۔

غیرت دم توڑ گئی ہے۔

شاید آپ نہ مانیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعض نوجوانوں پر جنسیت اس حد تک غالب آ گئی ہے کہ ان میں سے بعض اپنی نوجوان بہنوں پر بُری نظر رکھتے ہیں۔ دوست اپنی بہنوں کا تبادلہ کرتے ہیں۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک دوسرے سے اپنی بہنوں کا تعارف کراتے اور بہنوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ وہ ان کے دوستوں کے ساتھ بے تکلف ہو جائیں۔

میں آپ کو کوئی نئی بات نہیں سُنا رہا۔ کوئی عجوبہ پیش نہیں کر رہا۔ اپنا معاشرہ آپ کے سامنے ہے۔ یہ "آزادی" آپ کے گھر میں بھی داخل ہو چکی ہے، میرے گھر میں بھی داخل ہو گئی ہے۔

میں آج کی وہی باتیں سُنا رہا ہوں جو ایک شرمناک حقیقت کی طرح آپ کے سامنے ہیں۔ البتہ میں اپنی نوجوانی کے دَور کی جو باتیں سُنا رہا ہوں۔ یہ اُن لوگوں کے لیے عجوبہ اور شاید ناقابلِ یقین ہوں گی جو دیر سے پیدا ہوئے ہیں اور انہوں نے آج کا دَور دیکھا ہے۔



میں سُنا رہا تھا کہ میں اور حمید قسمیں کھا کر بھائی بن گئے۔ میں نے اُسے کہا کہ اب وہ سنائے کہ وہ گاؤں سے کس طرح نکلا یا نکالا گیا تھا۔

"تمہاری طرح میرے ساتھ بھی ایک لڑکی کا چکر چل گیا تھا"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "وہ کسی راجے یا چوہدری کی بیٹی نہیں۔ غریب سے کسانوں کی بیٹی ہے۔ ان کی اپنی زمین تھوڑی ہے۔ دوسروں کی زمینیں بٹائی پر کاشت کرتے ہیں اور ان کی دال روٹی پوری ہوتی ہے۔"

"ایک بات بتاؤ"۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ "اس کے ساتھ تمہارا تعلق کیسا ہے؟"

"ہیر رانجھے والا!"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "کوئی سی قسم لے لو تعلق سولہ آنے ستھرا اور سچا ہے، حالانکہ اُسے طلاق ہوئی ہے۔ خاوند کے ساتھ چند مہینے رہی تھی۔"

"اس کے ساتھ تمہاری محبت اُس کی شادی سے پہلے کی ہو گی!"

"نہیں!"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "طلاق کے بعد!"

"طلاق کیوں ہوئی؟"

"خاوند بیکار تھا"۔۔۔ حمید نے کہا۔۔۔ "ہیجڑہ سمجھ لو.... تم جانتے ہو ہم لوگ اپنی لڑکی کو جس کے ساتھ باندھ دیتے ہیں اُسے ساری عمر اُسی کے ساتھ گزارنی پڑتی ہے خواہ وہ جہنم میں پڑی رہے۔ لڑکی چھُپ چھُپ کر رو سکتی ہے، یہ نہیں کہہ سکتی کہ اس خاوند کے ساتھ میرا گزارا مشکل ہے، میں طلاق لوں گی۔"

"اس نے خاوند کو تنگ کیا ہو گا"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اور خاوند نے طلاق دے دی ہو گی۔"

"نہیں!"۔۔۔ حمید نے کہا۔۔۔ "طلاق ایک جنّ نے دلوائی ہے۔ یہ جنّ اس لڑکی پر قابض ہو گیا تھا۔ اس جنّ نے اس لڑکی کی ساس اور سُسر سے کہا کہ اس لڑکی کے ساتھ مجھے محبت ہے۔ اسے طلاق دو ورنہ تمہارے بیٹے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ دو شاہ جی بلائے گئے۔ انہیں بھی جنّ نے یہی کہا۔ اُن لوگوں نے اپنے بیٹے کی جان کی سلامتی کی خاطر لڑکی کو طلاق دے دی۔"

میں زور سے ہنس پڑا۔

"کیوں!"۔۔۔ حمید نے پوچھا۔۔۔ "تمہیں ہنسی کس بات پر آئی ہے؟"

"ہنسی اس جنّ پر آئی ہے"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "تم اسے سچ سمجھتے ہو گے۔ میں

نے ایک لڑکی کو یہی ڈرامہ کھیلتے دیکھا ہے۔"

"اُس نے بھی ڈرامہ ہی کھیلا تھا یار!" ـــــ حمید نے کہا ـــــ "میں یہ تو نہیں کہہ رہا کہ اُس پر سچ مچ جن کا قبضہ ہو گیا تھا۔"

"جن نکالنے والے کسی شاہ یا عامل کو بلایا گیا ہوگا!" ـــــ میں نے کہا۔

"مجھے تو تم بات ہی نہیں کرنے دے رہے!" ـــــ حمید نے جھنجھلا کر کہا ـــــ "یہ تمہارے شہر کی واردات ہے۔ اُس وقت وہ تمہارے شہر میں تھی۔ اُس کے سسر نے وہاں کسی کی زمین بٹائی پر لی تھی۔ یہ جن والا واقعہ ہو گیا اور پھر طلاق ہو گئی تو اس کے سسرال اتنے بددل ہوئے کہ زمین چھوڑ کر واپس گاؤں آ گئے۔ مجھے اپنا یہ ڈرامہ اسی لڑکی نے سنایا تھا۔"

میں چونک پڑا۔ خیال آیا کہ حمید عائشہ کے میکے گاؤں کا رہنے والا ہے۔

"اُس لڑکی کا خاوند تحصیل میں ملازم تو نہیں؟" ـــــ میں نے پوچھا۔

"ہاں!" ـــــ حمید نے کہا ـــــ "وہ تحصیل میں چپڑاسی یا ہرکارہ ہے" ـــــ اُس نے عائشہ کے خاوند کا نام لیا۔

"پھر اُس لڑکی کا نام عائشہ ہے" ـــــ میں نے کہا ـــــ "ان لوگوں نے ہماری زمینیں بٹائی پر لی تھیں۔ یہ جن والا ڈرامہ میرے سامنے کھیلا گیا تھا۔"

"ہاں خانی!" ـــــ حمید نے کہا ـــــ "اس کا نام عائشہ ہے.... کیا تمہیں معلوم تھا کہ یہ لڑکی جن کا ڈھونگ رچا رہی ہے؟"

میں فوراً چوکس ہو گیا۔ اچھا ہوا کہ حمید نے پہلے بتا دیا تھا کہ عائشہ سے وہ ہیر رانجھے جیسی پاک محبت کرتا ہے۔ میں اُسے یہ بتا کر اُس کے دل کو دکھ نہیں دینا چاہتا تھا کہ جس کے ساتھ وہ پاک محبت کرتا ہے اُسے میں ناپاک کر چکا ہوں۔ میرے سامنے یہ مسئلہ بھی آ گیا کہ میں نے قسم کھا کر حمید کو بھائی بنایا ہے۔ کیا میں اسے دھوکے میں رکھوں؟.... یہ سوچ بھی آئی کہ اسے اصل بات بتا دی تو نہ جانے یہ کیا کر بیٹھے۔

وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا، کیا مجھے معلوم تھا کہ عائشہ جن کا ڈھونگ رچا رہی ہے؟ میں نے بڑی تیزی سے سوچا اور دماغ میں جواب آ گیا۔

"نہ حمیدے بھائی!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "مجھے شک تھا۔ یہ ہمارے مزارعے تھے۔ اس لیے میں عائشہ کو اس حالت میں دیکھنے گیا تھا۔ میں نے اُس کے خاوند کو بھی دیکھا

تھا اور بہت ہی اچھی طرح دیکھا تھا۔ وہ عائشہ کے قابل تھا ہی نہیں۔ اس شخص کی بول چال اور انداز زنانہ سے ہیں۔ عائشہ تندرست اور توانا لڑکی ہے۔ خوبصورت ہے.... میں سمجھ گیا تھا کہ عائشہ اس خاوند سے آزاد ہونے کے لیے ڈھونگ رچا رہی ہے۔"

"تم نے اُس کے ساتھ کبھی باتیں کی تھیں؟" ـــــ حمید نے پوچھا۔

"نہ یار!" ـــــ میں نے جھوٹ بولا ـــــ "اس کے ساتھ بھلا میرا کیا تعلق تھا.... تم اپنی سناؤ۔"

میں نے اپنی طرف سے اُس کی توجہ ہٹا دی۔ ویسے بھی اُس کے دماغ پر عائشہ سوار تھی۔



"میں اپنی کیا سناؤں خانی یار!" ـــــ حمید نے کہا ـــــ "میں ایک چکر میں آ گیا ہوں۔ میں بھاگنا نہیں چاہتا۔ مشکل یہ ہے کہ میں اکیلا ہوں۔ میں نے انتقام لینا ہے۔"

"اپنے آپ کو اکیلا نہ سمجھو" ـــــ میں نے کہا ـــــ "کیا میں نے قسم نہیں کھائی کہ ہر حال میں اور ہر مشکل میں تمہارا ساتھ دوں گا؟ تم بات تو کرو۔"

"بات یہ ہے میرے بھائی!" ـــــ حمید نے کہا ـــــ "عائشہ کو میں اُس کی شادی سے پہلے بھی جانتا تھا اور یہ لڑکی مجھے اچھی لگتی ہے۔ ایک تو اس کی خوبصورتی دل کو کھینچتی ہے، دوسرے وہ ہنس مکھ ہے اور اصل خوبی یہ کہ اُس کا اخلاق اور چال چلن سولہ آنے صاف اور اچھا ہے۔ ہماری تھوڑی سی زمین ہے جو کئی سالوں سے بٹائی پر عائشہ کے باپ کے پاس ہے۔"

"پھر تو عائشہ کے ساتھ تمہاری اچھی بات چیت ہوگی" ـــــ میں نے کہا۔

"نہیں خانی!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "میں یہ نہیں کہتا کہ میں شریف آدمی ہوں لیکن عائشہ کو میں نے بُری نظر سے کبھی نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی ہمارے گھر آتی تھی۔ ایسے پتہ چلتا تھا جیسے گھر میں رونق آ گئی ہو۔ ہر بات ہنسی مذاق کے رنگ میں کرتی تھی اور مجھے اچھی لگتی تھی۔ میرے ساتھ بھی ہنسی مذاق کے رنگ میں ہی بات کرتی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ نیت کی صاف لڑکی ہے....

"پھر اُس کی شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد تین چار بار میکے آئی۔ ہر بار ہمارے گھر آئی۔ میں نے دیکھا کہ اُس کی شوخیاں ختم ہو گئی تھیں۔ ایک بار میں نے اُسے اپنی بہن

کے پاس بیٹھے دیکھا۔ اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے بے تکلفی سے پوچھا، "کیا بات ہے عائشہ؟ گھر میں خیریت تو ہے؟" اُس کے آنسو بہہ رہے تھے لیکن اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور بولی، "سب ٹھیک ہیں، ویسے ہی دل کچھ اُداس ہو گیا تھا...." وہ چلی گئی تو میری بہن نے بتایا کہ خاوند کی جان کو رو رہی تھی۔ اس کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے....

"یہ تو میں نے تمہیں بتایا ہے اور تم نے خود بھی دیکھا ہے کہ اُس کے ساتھ کیا زیادتی ہوئی تھی کہ اسے سولہ سال کی عمر میں بیاہ دیا گیا۔ ابھی تو وہ پوری طرح جوان بھی نہیں ہوئی تھی۔ ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ وہ طلاق لے کر آ گئی اور ساتھ ہی گاؤں میں یہ مشہور ہو گیا کہ عائشہ کو جنوں نے طلاق دلوائی ہے اور یہ کہ اس پر ایک جن عاشق ہو گیا ہے۔ گاؤں کی عورتیں عائشہ کے گھر پر ٹوٹ پڑیں۔ یہ تو ہر کوئی مانتا ہے کہ کوئی جن کسی خوبصورت عورت سے دل لگا لیتا ہے اور کوئی چڑیل کسی آدمی پر عاشق ہو جاتی ہے۔"

"لوگوں کے لیے عائشہ عجوبہ بن گئی ہو گی" ـــــ میں نے کہا ـــــ "وہ حیرت سے اُسے دیکھتے ہوں گے۔"

"کچھ حیرت سے؟" ـــــ حمید نے کہا ـــــ "وہ باہر نکلتی تھی تو گاؤں کے مرد اُسے رُک رُک کر دیکھتے تھے۔ اُس کے ماں باپ بہت پریشان تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ عائشہ ابھی نوجوانی کی عمر میں تھی۔ اُس کی دوسری شادی فوراً ہو جانی چاہیے تھی لیکن اب اُسے کسی نے بھی قبول نہیں کرنا تھا کیونکہ سب اُس جن سے ڈرتے تھے جس نے عائشہ کو اپنی محبوبہ بنا لیا تھا....

"اُس پر اب جن تو نہیں آتا تھا لیکن اُس کے باپ نے سوچا کہ اسے کسی عامل اور پیر کے پاس لے جایا جائے اور کہا جائے کہ اس جن سے عائشہ کو آزاد کرایا جائے.... ہمارے گاؤں کے ساتھ ہی بالکل چھوٹا سا ایک گاؤں ہے وہاں ایک شاہ رہتا ہے۔ وہ کوئی بڑا پیر تو نہیں لیکن ہمارا پورا گاؤں اُسے پیر مانتا ہے اور ارد گرد قریب کے گاؤں بھی اُس کے اثر کے نیچے ہیں۔ مشہور ہے کہ اُس کے قبضے میں جن ہیں اور اس علاقے کے تمام لوگ اُس کے مرید ہیں۔ میں بھی اُسے پہنچ والا بزرگ مانتا ہوں۔"

"بوڑھا ہے؟" ـــــ میں نے پوچھا۔

"نہیں یار!" ـــــ حمید نے جواب دیا ـــــ "ہٹا کٹا، لال سُرخ، جوان ہے۔ عمر

چالیس سال سے کم ہے۔ شاید چونتیس پینتیس ہو لیکن بالکل جوان لگتا ہے۔ عائشہ کا باپ ایک روز عائشہ کو اُس کے پاس لے گیا اور اُسے بتایا کہ عائشہ کو ایک جن نے طلاق دلوائی ہے۔ اب اس پر جن تو نہیں آتا لیکن ڈر ہے کہ لڑکی کی شادی کر دی تو پھر جن اس پر سوار ہو جائے گا اور دوسرے خاوند کو ڈرا کر طلاق دلوا دے گا....

شاہ جی نے بہت کوشش کی کہ جن حاضر ہو لیکن جن حاضر نہ ہوا۔ شاہ جی نے کہا کہ یہ کسی اور ولایت کا جن ہے اور بہت ہی شیطان ہے۔ اسے حاضر کرنا ضروری ہے ورنہ لڑکی کی زندگی تباہ کر دے گا۔ شاہ جی نے کہا کہ وہ لڑکی کو ایک رات اپنے پاس رکھے گا اور جنوں کے سردار کو حاضر کر کے اس جن کا بندوبست کرے گا....

"مجھے تو ان باتوں کا علم ہی نہیں تھا۔ میں دوسرے لوگوں کی طرح اس کو سچ سمجھ رہا تھا کہ عائشہ کو جن نے طلاق دلوائی ہے۔ مجھے اصل بات کا علم اس طرح ہوا کہ ایک روز میں قبرستان میں ایک خانقاہ پر سلام اور فاتحہ کے لیے گیا۔ میں ہر جمعرات کی شام وہاں جایا کرتا تھا۔ اس خانقاہ کا راستہ مجھے ایک بزرگ نے دکھایا تھا۔ میں نے دو جمعراتیں عائشہ کو خانقاہ میں دیا جلانے کے لیے جاتے دیکھا۔ تیسری جمعرات وہ خانقاہ میں دیا جلا رہی تھی اور میں خانقاہ میں داخل ہوا۔ اس وقت خانقاہ کے اندر اور کوئی نہیں تھا۔"

حمید کے ساتھ عائشہ کی جو گفتگو ہوئی وہ حمید نے اس طرح سنائی۔

"میں تمہارے لیے یہاں رُکی ہوئی ہوں" ـــــ عائشہ نے حمید سے کہا ـــــ "میری ایک بات سنو گے؟"

"یہاں؟"

"یہیں سن لو" ـــــ عائشہ نے کہا ـــــ "یہاں کوئی شک نہیں کرے گا۔ میں نے بدکاری اور بدمعاشی کی کوئی بات نہیں کرنی۔ یہاں بات کروں گی تو ہو سکتا ہے یہ جو بزرگ اس خانقاہ میں دفن ہیں، ہماری مدد کریں۔ مجھے اس درگاہ پر بھروسہ اور یقین ہے۔ اگر کوئی آ گیا تو باہر نکل چلیں گے۔"

"بات کرو" ـــــ حمید نے کہا۔

عائشہ نے اُسے بتایا کہ اُس کے ماں باپ اُسے شاہ جی کے پاس لے گئے تھے اور کہا تھا کہ جس جن نے اس کے سسرال کو دھمکی دے کر طلاق دلوائی تھی، وہ اس کی کہیں بھی شادی نہیں ہونے دے گا۔ اس جن سے نجات دلا دیں، اور یہ جن جو صدقہ یا نذرانہ مانگے گا وہ دیں گے۔

"پتہ نہیں تم سمجھ سکو گے یا نہیں حمید!" ــــــ عائشہ نے کہا ــــــ "میں سب لوگوں کی طرح اس شاہ جی کو مانتی تھی کہ پہنچ والے بزرگ ہیں۔ ان کے ہاتھ میں اتنی طاقت ہے کہ جن اور چڑیلیں بھی انہیں اپنا پیر اور مرشد مانتی ہیں لیکن حمید! میں جاہل دیہاتن ضرور ہوں لیکن خدا نے عقل تو دی ہے۔ اس شاہ جی نے جن نظروں سے مجھے دیکھا ان نظروں میں بزرگی نہیں تھی شیطان مجھے گھور رہا تھا۔ میرے ماں باپ کو باہر نکال کر شاہ جی نے مجھے اپنے پہلوانوں جیسے بازوؤں کی لپیٹ میں لے کر اپنے قریب کر لیا۔ میری آنکھوں کو اپنی انگلیوں سے کھول کر آنکھوں میں اس طرح دیکھنے لگا کہ اس کا منہ میرے منہ کے قریب آتا گیا اور اس کا منہ میرے منہ کے ساتھ لگ گیا....

"میں نے اپنا منہ پیچھے کر لیا۔ شاہ جی نے کہا، اب پیچھے ہٹ کر کہاں جائے گا مردود! ہم نے تجھے پہچان لیا ہے۔ ہماری مریدنی کی زندگی برباد کر کے تو جائے گا کہاں؟ جلا کر راکھ کر دوں گا..... اس نے پھر مجھے اپنے قریب کیا تو میں سرک کر پیچھے ہو گئی۔ شاہ جی نے کہا، عائشہ بی بی! آج رات میں تجھے اپنے پاس رکھوں گا۔ یہ ایک شیطان جن ہے۔ کوئی کوئی جن ایسا نکل آتا ہے جو اپنے پیغمبر حضرت سلیمانؑ کو ماننے کی بجائے شیطان کا چیلا بن جاتا ہے۔ ایسا جن بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ یہ جن تمہیں کسی کی بیوی نہیں بننے دے گا۔ کچھ دنوں بعد یہ خود تمہارا خاوند بن جائے گا اور تمہارے جسم کا وہی حال ہو جائے گا جو دیمک لکڑی کا کر دیتی ہے....

"اس نے میرے ماں باپ کو اندر بلایا اور انہیں بھی بہت ڈرایا اور ایسی ننگی اور بے شرمی کی باتیں کیں جو میں اپنی زبان پر نہیں لا سکتی۔ اس نے میرے ماں باپ کو بہت ہی غصے اور رعب سے کہا کہ اپنی بیٹی کی خیر چاہتے ہو تو لڑکی کو آج رات میرے پاس چھوڑ جانا۔ میں نے گھر آ کر اپنے ماں باپ سے کہا کہ میں رات شاہ جی کے گھر نہیں جاؤں گی۔ میرے باپ نے میرے منہ پر تھپڑ مار کر کہا، تو شاہ جی کی حکم عدولی کرتی ہے؟ وہ اللہ والے ہیں اور تو نہ جانے کیا سوچ کر ان کی بے ادبی کر رہی ہے۔ انہوں نے اس جن کو پہچان لیا ہے اور آج رات وہ اسے حاضر کریں گے۔"

حمید حیران تھا کہ عائشہ اتنی پہنچ والے شاہ جی کا حکم نہیں مان رہی تھی اور اس کے دل میں اس جن کا ذرا سا بھی ڈر اور خوف نہیں تھا۔ اتنے میں دو عورتیں خانقاہ میں داخل ہوئیں۔ حمید نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا لیے اور عائشہ نے دیا جلایا۔ پھر عائشہ

س کے قریب بیٹھ گئی اور فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ حمید اٹھ کر باہر نکل گیا۔ عورتیں دیا جلا کر چلی گئیں۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ حمید قبرستان سے نکل کر نصل کی اوٹ میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد عائشہ باہر نکلی اور ادھر اُدھر دیکھ کر حمید کے پیچھے چلی گئی۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گئے۔

"رات کو مجھے مجبور کر دیا گیا کہ میں شاہ جی کے گھر جاؤں" ــــــ عائشہ نے حمید کو سنایا ــــــ "وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا۔ اس نے شراب کی بوتل نکالی۔ دو گلاسوں میں تھوڑی تھوڑی شراب ڈالی، پھر گلاسوں میں سوڈے کی بوتل ڈالی۔ ایک گلاس میرے آگے کر کے بولا، یہ پی جاؤ پھر دیکھنا جن کس طرح حاضر ہوتا ہے.... میں اتنی سیدھی اور بے عقل تو نہیں کہ شراب کی بوتل اور اس کی بدبو کو نہ پہچان سکتی۔ میں نے شراب پینے سے انکار کر دیا۔"

میں عائشہ کی اس بات کو جو اس نے حمید کو سنائی تھی، ذرا مختصر کر دیتا ہوں۔ شاہ جی نے اپنے آپ پر کشف کی کیفیت طاری کر کے عائشہ کو متاثر کرنے کی بہت کوشش کی۔ اُسے جن سے ڈرایا اور کہا کہ جن تمہارے وجود میں موجود ہے اور اسے حاضر کرنا ضروری ہے۔

"میں یہ شراب تمہیں نہیں پلا رہا" ــــــ شاہ جی نے آخر یہ کہا ــــــ "یہ میں اس شیطان جن کو پلا رہا ہوں۔ شراب جائے گی تمہارے منہ میں لیکن اس کا نشہ جن کو ہوگا۔ پھر یہ باہر نکل آئے گا اور میں تمہارے سامنے اسے زندہ جلا دوں گا۔"

عائشہ پھر بھی نہ مانی۔ شاہ جی نے اس کا گلاس پی لیا۔ پھر وہ عائشہ کے ساتھ وجدانی کیفیت میں باتیں کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد نشہ اسے بدمستی میں لے آیا اور اس نے عائشہ سے کہا کہ وہ پلنگ پر لیٹ جائے تاکہ جن کو حاضر کیا جائے۔

عائشہ نے انکار کر دیا۔

شاہ جی غصے میں آ گیا اور عائشہ کو دو تین گالیاں دے ڈالیں۔

شاہ جی کسی وجہ سے ذرا پیچھے ہٹا تو عائشہ وہاں سے اٹھ دوڑی۔ لوگوں کا یہ برگزیدہ پیر شراب کے نشے میں ایسا دھت تھا کہ عائشہ کا تعاقب نہ کر سکا۔ تعاقب کرتا بھی تو عائشہ اس کے ہاتھ نہ آتی۔ جسمانی طور پر عائشہ پھرتیلی لڑکی تھی۔

دوسرے دن شاہ جی نے عائشہ کے باپ کو اور اس کی ماں کو بھی اپنے آستانے میں طلب کیا اور انہیں گالی گلوچ کی کہ ان کی بیٹی نے ان کی توہین کی ہے۔ پھر انہیں

بتایا کہ ان کی بیٹی کے اندر سے جن نہ نکلا تو انہیں کسی قسم کا بھیانک نقصان ہوگا۔ یہ دونوں بے چارے وہاں سے خوفزدگی کی حالت میں کانپتے ہوئے گھر آئے۔

باپ نے پہلے عائشہ کو مارا پیٹا تھا لیکن اب اُس نے عائشہ کی مِنّت سماجت کی کہ وہ شاہ جی کے پاس جا کر معافی مانگے اور ان کے قدموں میں سر رکھے۔

"مجھے جان سے مار ڈالو" ــــ عائشہ نے کہا ــــ "مَیں وہاں نہیں جاؤں گی۔"

باپ اُسے مارنے پیٹنے کے لیے اُٹھا۔ ماں درمیان میں آ گئی اور اُسے الگ لے گئی۔ ماں نے اُس سے پوچھا کہ وہ شاہ جی کے پاس کیوں نہیں جاتی۔ عائشہ نے ماں کو اصل بات بتا دی۔ یہ بھی بتایا کہ شاہ جی اُسے زبردستی شراب پلا رہا تھا لیکن اُس نے پینے سے انکار کر دیا۔ پھر عائشہ نے ماں کو وہ ساری حرکتیں بتائیں جو شاہ جی نے اُس کے ساتھ کی تھیں۔

"مجھے دوسرا خاوند نہ ملے" ــــ عائشہ نے کہا ــــ "مَیں ساری عمر اکیلی گزار دوں گی لیکن اس شاہ جی کی بے نکاحی بیوی نہیں بنوں گی۔ یہ دھوکہ باز اور فریبی ہے اور میرا باپ بے غیرت ہے۔"

ماں کچھ دیر خاموش رہی۔ کبھی عائشہ کی طرف دیکھتی اور کبھی سر جھکا لیتی۔

"کیا تم میرے اِس باپ کو کچھ نہیں سمجھا سکتیں ماں؟" ــــ عائشہ نے کہا اور اُس کے آنسو بہنے لگے۔



"نہیں عاشی پُتر!" ــــ ماں نے عائشہ سے کہا ــــ "مَیں تیرے باپ کو کچھ نہیں سمجھا سکتی۔ تُو نے اپنے باپ کو بے غیرت کہا ہے۔ مَیں بھی اسے بے غیرت ہی سمجھتی ہوں لیکن اسے منہ پر بے غیرت کہنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ کہوں تو یہ مجھے قتل کر دے۔ مَیں تجھے ایک بات بتاتی ہوں لیکن تُو اسے سچ نہیں سمجھے گی۔ یہ ایک راز ہے جو مَیں صرف تجھے دے رہی ہوں۔"

"بات ذرا جلدی کرو ماں!" ــــ عائشہ نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا ــــ "مَیں تو اس جینے سے بیزار ہو گئی ہوں۔"

"بات یہ ہے کہ یہ شاہ جی تیرا بھائی ہے" ــــ ماں نے کہا ــــ "تیری رگوں میں اسی باپ کا خون ہے۔"

عائشہ کی آنکھیں اتنی زیادہ کھُل گئیں جیسے اُس کے ڈھیلے باہر آ جائیں گے۔

"ہاں عاشی پُتر!" ــــ ماں نے کہا ــــ "حیران مت ہو۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ ایک عورت کی کوکھ سے اُس کے پیر یا شاہ جی کا بچہ پیدا ہوا ہے۔ یہ جو عورتیں پیروں اور عاملوں کے پاس اولاد کے لیے لے جاتی ہیں، انہیں اولاد پیر کے تعویذ نہیں دیتے اولاد پیر دیا کرتا ہے.... یہ ہمارے مردوں کی بے غیرتی ہے۔"

"تم اپنی بات کرو!" ــــ عائشہ نے کہا۔

"میری شادی ہوئی تو دو سال بچہ نہ ہوا" ــــ ماں نے کہا ــــ "میری ساس اور نندوں نے تو میرا جینا حرام کر دیا۔ اُس وقت اس شاہ جی کا باپ اِسی شاہ جی کی طرح لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا تھا۔ تیرا باپ بھی میری جان کھانے لگا کہ بچہ پیدا کرو ورنہ تمہیں بانجھ اور بددعائی ہوئی سمجھ کر طلاق دے دی جائے گی۔

"ساس مجھے شاہ جی کے پاس لے گئی۔ مَیں اُس وقت تیری طرح نئی نئی جوان ہوئی تھی۔ خدا نے شکل و صورت بھی ذرا ٹھیک ہی دی تھی۔ شاہ جی نے موجودہ شاہ جی کی طرح میری آنکھیں اپنی انگلیوں سے پوری طرح کھول کر دیکھا اور بولا، اوہ! یہ تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ اُس نے میری ساس کو بہت ڈرایا کہ اس لڑکی پر اتنا خطرناک سایہ ہے کہ اتارا نہ گیا تو اس کا خاوند حرام موت مرے گا پھر تمہارا پورا خاندان تباہ و برباد ہو جائے گا....

"مَیں تو بہت ہی ڈری اور میری ساس نے شاہ جی کے پاؤں پکڑ لیے اور رو رو کر منتیں کیں کہ کچھ کریں۔ تیری طرح شاہ جی نے مجھے بھی اکیلے بلایا اور میرے ساتھ وہی حرکتیں اور وہی باتیں کیں جو اُس کے بیٹے نے تیرے ساتھ کی ہیں۔ جو ہمت اور جرأت تجھ میں ہے وہ مجھ میں نہیں تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ مَیں خوش بھی ہوئی تھی کہ اتنے پہنچ والے شاہ جی مجھ پر اتنے مہربان ہیں....

"مَیں ان کے پاس اکیلی جاتی رہی اور پھر تُو پیدا ہوئی۔ اُس وقت یہ شاہ جی آٹھ دس سال کا تھا۔ اس کا باپ اس سے زیادہ خوبصورت اور قوی ہیکل تھا۔ اس کا رنگ پکے ہوئے سیب جیسا تھا۔ تجھے اُسی سے گورا رنگ ملا ہے اور تجھے خوبصورتی بھی اُسی سے ملی ہے۔"

"تم نے اپنے اس بے غیرت خاوند کو بتایا نہیں کہ مَیں اس کی بیٹی نہیں؟" ــــ عائشہ نے کہا ــــ "مَیں بتا دیتی ہوں۔"

"نہیں عاشی پُتر!" ــــ ماں نے کہا ــــ "یہ نہیں مانے گا۔ ہم پر یہ الزام لگائے

گا کہ ہم شاہ جی کی بے ادبی کر رہی ہیں۔۔۔۔ میں نے تجھے راز کی یہ بات اس لیے سنائی ہے کہ ہم عورتیں ہیں۔ ہم مال مویشی ہیں۔ گائے ہل کے آگے بھی جوتی جاتی ہے، اس سے دودھ بھی لیا جاتا ہے، اس سے بچھڑے بھی پیدا کیے جاتے ہیں، اور جب یہ بیکار ہو جاتی ہے تو اسے ذبح کر کے کھا لیتے ہیں۔ ہم گائیں ہیں عائشی پتر!۔۔۔ اور یہ مت سوچ کہ تو اس شاہ جی کے خلاف بول کر لوگوں سے منوا لوگی کہ یہ شخص فریبی ہے۔ اسے پہنچ والا اور آسمانی طاقت اور جنوں کا بادشاہ تیرے باپ جیسے باپوں اور خاوندوں نے بنایا ہے۔۔۔۔ وہ بڑا شاہ جی جانتی ہو کس طرح مرا تھا؟ تم ابھی چھوٹی تھیں۔"

"مجھے یاد ہے"۔۔۔ عائشہ نے کہا۔۔۔ "اس پر بجلی گری تھی۔"

"وہ اپنے مریدوں کے ایک گاؤں گیا ہوا تھا"۔۔۔ ماں نے کہا۔۔۔ "اپنے چیلوں کے ساتھ گھوڑی پر سوار واپس آ رہا تھا۔ راستے میں بارش شروع ہو گئی۔ شاہ جی بڑ کے ایک پرانے اور بہت بڑے درخت کے نیچے رک گیا۔ بجلی بار بار چمکتی اور کڑکتی تھی۔ بجلی بڑ کے درخت پر گری۔ ایک بہت بڑا ٹہن ٹوٹ گیا اور یہ شاہ جی کے سر پر گرا۔ گھوڑی بدک کر دوڑ پڑی اور شاہ جی کے نیچے سے نکل گئی۔ شاہ جی وہیں مر گیا۔۔۔۔ آج تک لوگ بڑ کے اس درخت کے نیچے دیئے جلاتے ہیں۔"

عائشہ پر تو خاموشی ہی طاری ہو گئی تھی۔



عائشہ نے یہ ساری داستان حمید کو سنائی۔

"یہ تو میں تم سے بعد میں پوچھوں گا کہ تم نے یہ رام کہانی مجھے کیوں سنائی"۔۔۔ حمید نے عائشہ سے کہا۔۔۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ اس جن کا کیا کرو گی جو شاہ جی کہتے ہیں کہ تمہارے اندر موجود ہے؟ شاہ جی کا حکم جنوں پر چلتا ہے۔ وہ اس جن کو ایسا حکم دیں گے کہ وہ تمہارا حلیہ بگاڑ دے گا اور تمہارے گھر کو تباہ کر دے گا۔"

عائشہ ہنس پڑی اور بڑی بے تکلفی سے حمید کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ حمید نے مجھے سنایا کہ سورج غروب ہو چکا تھا اور اندھیرا گہرا ہو رہا تھا لیکن عائشہ کو ذرا ڈر نہ تھا کہ کوئی آ جائے گا۔

"میرے اندر کوئی جن نہیں حمید!"۔۔۔ عائشہ نے کہا۔۔۔ "میں نے خود جن بن کر خاوند سے طلاق لی تھی۔"

عائشہ نے حمید کو اپنے جن کی اصل حقیقت ویسے ہی سنا دی جیسے اس نے مجھے سنائی تھی۔

"خانی یار!"۔۔۔ حمید نے یہ بات سنا کر مجھ سے کہا۔۔۔ "مجھے یقین نہیں آیا۔ میں نے مان تو لیا لیکن کبھی کبھی میرا یقین ہل جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس لڑکی نے جھوٹ بولا تھا۔ دیہاتی لڑکی ایسا سوانگ نہیں رچا سکتی۔"

"نہیں حمید!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اس نے یہ سوانگ رچایا تھا اور میں اس کا عینی شاہد ہوں۔ یہ لوگ ہمارے مزارعے تھے۔ اس لڑکی نے ہمیں بھی مصیبت میں ڈال دیا تھا۔"

میں نے حمید کو سنایا کہ عائشہ نے کیسی کمال کی ایکٹنگ کی تھی اور اس نے جن نکالنے والے دو عاملوں کو کس طرح بھگایا تھا۔

"یہ ہمارے مزارعے تھے"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "یہ ہماری زمینیں سنبھالنے کے لیے اپنے گاؤں سے آئے تھے اس لیے یہ ہمارا فرض تھا کہ ایسے مشکل وقت میں ان کی مدد کریں۔ میں نے بہت بھاگ دوڑ کی تھی۔ جب عائشہ کو طلاق ہو گئی تو گاؤں جانے سے پہلے وہ مجھے اکیلی مل گئی۔ اس نے مجھے کہا کہ تم نے میرے لیے بہت بھاگ دوڑ کی ہے۔ اس لیے میں تمہیں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی۔ مجھ پر کوئی جن نہیں آیا تھا۔ میں نے ڈھونگ رچایا تھا۔ طلاق لینی تھی۔ وہ لے لی ہے۔ میں تمہیں اور تمہارے امی ابا کو ہمیشہ دعائیں دیتی رہوں گی کہ تم سب نے میری مشکل میں میرے لیے دن رات ایک کر دیا۔"

میں نے حمید کو یہ نہ بتایا کہ عائشہ کے ساتھ میرے در پردہ تعلقات کیا تھے۔

"اب آگے سناؤ کیا ہوا!"۔۔۔ میں نے حمید سے کہا۔



حمید نے مجھے اس سے آگے بات یوں سنائی کہ اس نے عائشہ سے پوچھا کہ اس نے یہ ساری باتیں اسے کیوں سنائی ہیں۔

"تم چاہو برا جانو حمید!"۔۔۔ عائشہ نے اسے کہا۔۔۔ "میں نے تمہیں اپنا سمجھ کر اپنی یہ مشکل سنائی ہے۔ تم مجھ سے پوچھو کہ میں نے تمہیں اپنا کیوں سمجھا ہے تو میں اس کا جواب نہیں دے سکتی۔ تم زمینوں کے مالک ہو۔ میں مزارعوں کی بیٹی ہوں۔ اگر

تم شیر اور دلیر مرد ہو تو میرے سر پہ ہاتھ رکھو۔ اگر تمہارے دل میں یہ بات ہے کہ مالک اور مزارعہ میں ایسی محبت نہیں ہو سکتی جیسی میرے دل میں ہے تو میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتی۔ میرا تم پر کوئی حق نہیں۔"

"نہیں عاشی!" ـــ حمید نے بے اختیار اپنا ایک بازو اُس کے گلے میں ڈال کر اُسے ساتھ لگا لیا اور کہا ـــ "تم نے میری مردانگی کو للکارا ہے اور بات محبت کی کی ہے۔ میں پیچھے نہیں ہٹوں گا اور تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"میں لوگوں کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اس شاہ جی کے قبضے میں کوئی جن نہیں" ـــ عائشہ نے کہا ـــ "اور اس کے ہاتھ میں کوئی خدائی طاقت نہیں۔"

"بیوقوف نہ بنو عاشی!" ـــ حمید نے کہا ـــ "تم نے یا کسی نے یہ بات منہ سے نکالی تو لوگ قتل کر دیں گے۔ خدا کے بعد لوگ شاہ جی کو مانتے ہیں۔"

"اور کچھ لوگ خدا کی جگہ شاہ جی کو مانتے ہیں" ـــ عائشہ نے کہا ـــ "میں جاہل دیہاتن کچھ نہیں جانتی۔ یہ تو عالموں کے سمجھنے سمجھانے کی باتیں ہیں۔ مجھے معلوم نہیں شاہ جی کا درجہ کیا ہے لیکن اس شاہ جی کو دیکھو۔ میرے اندر کوئی جن نہیں نہ مجھ پر کبھی کوئی جن آیا ہے۔ یہ تو میں نے جھوٹ بولا تھا کہ مجھ پر جن آتا ہے اور اس جن نے مجھ کو طلاق دلوائی ہے۔ طلاق کے بعد مجھے میرے ماں باپ اس شاہ جی کے پاس لے گئے تو میں ڈر گئی تھی کہ شاہ جی مجھے دیکھ کر کہہ دیں گے کہ یہ لڑکی جھوٹ بولتی ہے، اس پر کسی جن کا قبضہ نہیں لیکن شاہ جی نے میرے جھوٹ کو سچ کہہ دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ جن اس لڑکی کے وجود میں موجود ہے۔"

"میں سمجھ گیا ہوں عاشی!" ـــ حمید نے کہا ـــ "یہ شاہ جی خود تمہارے وجود پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ تم جیسی خوبصورت اور نوجوان لڑکی کو وہ ہاتھ سے نہیں جانے دے گا۔"

"یہ بھی دیکھو حمید!" ـــ عائشہ نے کہا ـــ "میں تمہیں اپنی ماں کی بات بتا چکی ہوں، میں اس شاہ جی کی بہن ہوں۔ اگر میں اسے بتا دوں۔"

"تو وہ نہیں مانے گا" ـــ حمید نے کہا۔

"پھر مجھے کچھ بتاؤ حمید!" ـــ عائشہ نے کہا ـــ "میں کیا کروں؟.... میں کسی کی داشتہ نہیں بننا چاہتی خواہ وہ کتنا ہی بڑا پیر کیوں نہ ہو۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میرے ساتھ شادی کوئی نہیں کرے گا، کیونکہ ہر طرف مشہور ہو گیا ہے کہ مجھ پر بڑے خطرناک

جن کا قبضہ ہے۔ میں گھر سے بھاگ جاؤں گی، کچھ کھا کر مر جاؤں" ـــ یہ کہتے کہتے وہ اچانک جذباتی ہو گئی۔ اپنے بازو حمید کے گلے میں ڈال دیئے اور بڑے ہی والہانہ لہجے میں بولی ـــ "میں صرف تمہیں اپنا سمجھتی ہوں حمید! اگر تم مجھے اپنا نہ سمجھو تو صاف جواب دے دو۔ میں دل پر پتھر رکھ لوں گی اور تمہاری طرف کبھی دیکھوں گی بھی نہیں۔"

حمید نے اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا پھر یوں ہُوا جیسے یہ دو نہیں ایک جسم ہو۔



"خانی بھائی!" ـــ حمید نے یہ سارا واقعہ مجھے سناتے ہوئے کہا ـــ "میں حیران ہوں۔ ذرا تم بھی سوچو۔ اتنی خوبصورت لڑکی، تنہائی اور رات کی تاریکی، لڑکی میرے بازوؤں میں، میں لڑکی کے بازوؤں میں مگر اللہ گواہ ہے کہ میرے دل میں کوئی شیطانی خیال نہیں تھا۔ ہم دیہاتی لوگ جانور ہوتے ہیں۔ عورت کو صرف جسم سمجھتے ہیں جس کے ساتھ کھیلا جاتا ہے اور اس کا یہی ایک استعمال جانتے ہیں لیکن لیکن جسمانی طور پہ میں برف ہو گیا تھا اور میری روح جاگ پڑی تھی۔"

"یہ باتیں سمجھنے کے لیے ہمارے پاس علم نہیں حمید بھائی!" ـــ میں نے کہا ـــ "یہ اللہ کے راز ہیں جو اللہ ہی جانتا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ اللہ اُس کا ہے جو اُس کے حکم پر چلتا ہے۔ اگر تم بدنیت ہو جاتے تو وہیں پکڑے جاتے.... تم بات سناؤ پھر کیا ہُوا!"

"پہلے میں تمہیں ایک اور بات سُنا لوں" ـــ حمید نے کہا ـــ "یہ لڑکی اُس وقت سے مجھے اچھی لگنے لگی تھی جب وہ تیرہ چودہ سال کی ہوئی تھی۔ بڑی شوخ اور ہنسوڑ تھی اور میرے ساتھ تو اس کی بہت ہی بے تکلفی تھی۔ پھر یہ بڑی ہوتی گئی۔ پہلے تو ہم بچوں کی طرح کھیلتے رہے۔ یہ لوگ ہمارے مزارعے تھے۔ میں ان کے گھر چلا جاتا اور کبھی کھیتوں میں چلا جاتا لیکن سولہ سال کی عمر میں عائشہ بھرپور جوان ہو گئی۔ اس کا حسن ایسا نکھرا کہ لوگ تو اسے رک رک کر دیکھتے ہی تھے، میرے اندر جذبات کے طوفان اُٹھنے لگے۔ اب میں اس کے ساتھ کھیل نہیں سکتا تھا....

"میں نے دل سے اس لڑکی کو نکالنے کی بہت کوشش کی لیکن یہ بدلے ہوئے روپ میں میرے دل میں موجود رہی۔ اس کی شوخیاں اور اُچھل کود پہلے سے زیادہ ہو گئی۔ میں نے کئی بار سوچا کہ یہ ہمارے مزارعوں کی لڑکی ہے، اسے پیسوں کا لالچ دوں

گا تو میری بُری نیت کو قبول کر لے گی لیکن اس کے ساتھ بات کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ صرف ایک بار ایسے ہُوا کہ میں نے اس کے ساتھ بے تکلفی کی باتیں کرتے ایسی بات کہہ دی جس سے بُری نیت کا اظہار ہوتا تھا۔ فوراً ہی اس کا ہنستا مسکراتا چہرہ بدل گیا۔ اُس نے کہا، نہ حمید، تمہارے منہ سے ایسی بات اچھی نہیں لگتی....

"اس سنجیدگی کی حالت میں وہ مجھے اتنی اچھی اور اتنی معزز لگی کہ اس کے متعلق میرے خیالات بدل گئے۔ وہ کسی بڑی ذات والے خاندان کی لڑکی لگتی تھی۔ میرے دل میں آئی کہ مَیں اپنے ماں باپ سے کہوں کہ میں اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن خیال آ گیا کہ یہ بڑے کم درجے کی لڑکی ہے۔ میرے ماں باپ مجھے جوتے ماریں گے اور عائشہ کے باپ سے اپنی زمینیں واپس لے لیں گے....

"مَیں نے عائشہ سے دُور ہٹنے کی کوشش شروع کر دی لیکن میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میں کھچا ہُوا عائشہ کے گھر یا کھیتوں میں چلا جاتا اور جب عائشہ مجھے دیکھ کر مسکراتی تو مجھے نشہ سا ہو جاتا۔ تم یہ سمجھ لو خانی کہ میرے دل پر اس لڑکی کا قبضہ ہو گیا تھا۔ پھر اچانک ہی اس کی شادی ہو گئی۔ اُس روز تو میرے آنسو نکل آئے تھے۔"

"یوں کہو ناکہ تمہیں اس سے محبت ہو گئی تھی" ــــ میں نے کہا۔

"ہاں خانی!"

"پھر زیادہ بیان نہ کرو" ــــ مَیں نے کہا ــــ "میں محبت کے معاملات اور جذبات کو سمجھتا ہوں۔ مَیں نے واجدہ سے محبت کی ہے۔ یاد آتی ہے تو سمجھ نہیں آتی کیا کروں۔"

"لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی" ــــ حمید نے کہا ــــ "عائشہ ہمارے مزارعوں کی بیٹی ہے۔ اس کی حیثیت نوکرانی کی ہے لیکن اتنی بے تکلفی کے باوجود میں اُس کے سامنے محبت کا اظہار نہ کر سکا۔ اُس کی شادی ہو گئی اور پھر وہ طلاق لے کر آ گئی۔ مَیں اُس کے گھر جاتا رہا، وہ میرے گھر آتی رہی، ہم پہلے کی طرح باتیں کرتے رہے لیکن میں اُسے دل کی بات نہ کہہ سکا۔ میں دل کا اتنا کمزور اور ڈرپوک نہیں تھا، دراصل اُس کے چہرے اور انداز میں کوئی ایسی بات تھی کہ مجھ پر اُس کا رُعب طاری ہو جاتا تھا....

"اُس روز وہ خانقاہ میں ملی تو اس نے بڑی لمبی کہانی سُنا ڈالی۔ میرے دل سے محبت کا طوفان اُٹھا اور مَیں نے اس کا اظہار کر دیا۔ مَیں اُس کے لیے ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہو گیا۔ اُس نے بتایا کہ شاہ جی نے اُس کے پیچھے ایک غنڈہ چھوڑ دیا تھا

جو اُسے اور اُس کے باپ کو دو بار بڑی سخت دھمکیاں دے چکا ہے وہ کہتا ہے کہ عائشہ کو اغوا کر کے چکلے میں پہنچا دیا جائے گا۔"

"تم نے نمبردار کو بتانا تھا" ــــ مَیں نے کہا۔

"تم شہر کے رہنے والے ہو خانی!" ــــ حمید نے کہا ــــ "گاؤں کی دنیا نرالی ہے۔ دیہاتی علاقے میں راجہ جی، چوہدری جی، پیر اور شاہ جی اور ان کے غنڈے حکومت کرتے ہیں۔ غریب کی شنوائی نہیں ہوتی۔ نمبردار اور ذیلدار وغیرہ بھی طاقتور کا ساتھ دیتے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ یہ غنڈہ جو عائشہ اور اس کے ماں باپ کو ڈراتا رہتا ہے، شاہ جی کا آدمی ہے.... میں نے عائشہ سے کہا کہ اب وہ گھر چلی جائے، میں کل اس غنڈے بدمعاش سے ملوں گا۔ عائشہ نے کہا کہ اس کے ساتھ بچ کر بات کرنا۔ میری خاطر اپنے آپ کو کسی مصیبت میں نہ ڈال لینا.... مَیں نے اُسے کہا کہ وہ اب چوکس رہا کرے اور میری فکر نہ کرے.... وہ چلی گئی۔"



حمید بڑا دلیر جوان تھا۔ اُس کے دو دوست اُسی جیسے دلیر اور قربانی دینے والے جوان تھے۔ ان میں سے ایک نمبردار کا بیٹا تھا۔ حمید نے اگلے دن ان کے ساتھ بات کی۔ انہوں نے کہا کہ شاہ جی کے خلاف تو نہ کوئی بات ہو سکتی ہے نہ کوئی کارروائی۔ اگر شاہ جی کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو سارا گاؤں تمہارا دشمن ہو جائے گا۔ اس بدمعاش کے ساتھ بات ہو سکتی ہے۔

"اور ہونی چاہیے" ــــ حمید نے کہا ــــ "یہ بھی سُن لو کہ مَیں اس کے ساتھ زبانی بات نہیں کروں گا۔ مَیں نے اُس کی ایک دو ہڈیاں توڑنی ہیں۔"

"توڑ دو" ــــ نمبردار کے بیٹے نے کہا ــــ "لیکن مجھے فوراً بتا دینا۔ مَیں اپنے باپ کو بتاؤں گا۔ میرے والد اُس کے سخت خلاف ہیں۔ وہ اسے تھانے بلوا کر جوتے لگوا دیں گے۔"

"وہ ہے کیا یار!" ــــ دوسرے دوست نے کہا ــــ "ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے اور بدمعاش بنا پھرتا ہے۔"

یہاں میں غنڈوں اور بدمعاشوں کے متعلق ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ ان غنڈوں اور دس نمبریے بدمعاشوں سے لوگ اس وجہ سے نہیں ڈرتے کہ وہ قوی ہیکل اور رستم زماں ہوتے ہیں بلکہ اُن سے ڈرنے کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان غنڈوں کی کوئی

عزت نہیں ہوتی اور نہ ان میں غیرت ہوتی ہے۔ کوئی شریف اور باعزت شہری کسی غنڈے سے منہ لگا بیٹھے تو غنڈہ اُسے سرِعام بے عزت کر دے گا۔ غنڈے کا کچھ نہیں بگڑے گا کیونکہ وہ تو ہے بے غیرت۔ دوسری وجہ یہ کہ غنڈوں کے پیچھے بڑے لوگوں یا پولیس کا ہاتھ ہوتا ہے۔

حمید نے اپنے گاؤں کے اِس غنڈے کے متعلق بتایا کہ وہ دُبلا پتلا تیس سال عمر کا آدمی تھا۔ دس نمبریا بدمعاش تھا۔ اُس کی طاقت یہ تھی کہ اُس کی پیٹھ پر شاہ جی کا ہاتھ تھا لیکن عائشہ کی محبت اور اُس کی باتوں نے حمید کو دستی بم بنا دیا تھا۔ اسے اب ذرا سی ٹھوکر کی ضرورت تھی۔ پھر بھی اُس نے یہ ارادہ کیا کہ اس غنڈے کے ساتھ آرام سے بات کرے گا۔ اگر نہ مانا تو کچھ اور کرے گا۔

اُسی روز اتفاق سے یہ بدمعاش حمید کے سامنے آ گیا۔ حمید نے اُسے روک لیا۔

"اُن غریبوں کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو یار!" ——— حمید نے اُسے کہا۔

"کون سے غریب؟"

"میں عائشہ اور اُس کے باپ کی بات کر رہا ہوں" ——— [illegible] ——— "ٹکر لینی ہے تو کسی حیثیت والے گھر سے لو۔"

"وہ تمہارے کیا لگتے ہیں؟"

"میں یہ بھی بتا دوں گا" ——— حمید نے کہا ——— "تمہارے [illegible] تھ [illegible] ذاتی دشمنی تو نہیں۔ تم تو کرائے کی غنڈہ گردی کر رہے ہو۔"

"اور تم عائشہ کے لیے جھک مار رہے ہو" ——— بدمعاش نے کہا ——— "اپنا سَر اُکھلی میں نہ دے بیوقوف! عائشہ کو میں ایسا غائب کروں گا کہ تم ساری عمر اُسے ڈھونڈتے رہو گے۔"

یہاں سے بات بڑھ گئی۔ گالی گلوچ ہوئی۔ حمید نے بڑی تیزی سے بدمعاش کے منہ پر دو تین گھونسے مارے۔ غنڈے نے چاقو نکال لیا اور حمید کو مارا۔ حمید نے اُس کا چاقو والا بازو اپنے بازو پر روک لیا لیکن چاقو کی نوک حمید کے بازو پر لگ گئی۔ یہ نہایت معمولی زخم تھا۔ حمید نے بدمعاش کے اس بازو کی کلائی پکڑ کر اتنی زور سے مروڑی کہ اُس کے ہاتھ سے چاقو گر پڑا۔

حمید نے چاقو اُٹھانے کے لیے بدمعاش کی کلائی چھوڑ دی۔ وہ جھکا ہوا تھا۔ بدمعاش نے اُس کی پیٹھ پر گھونسے مارے اور پھر اُسے کمر سے پکڑ کر گرانے لگا۔ حمید نے

جھکے جھکے اُس کی ران میں چاقو مارا جو ایک دو انچ اُس کے پٹھے میں اُتر گیا ہو گا۔ گاؤں کے کچھ آدمی اور حمید کا بڑا بھائی آ گئے۔ بدمعاش بھاگ گیا۔

نمبردار بھی آ گیا۔ ساتھ اُس کا بیٹا بھی تھا جو حمید کا دوست تھا۔ اُس نے باپ کے ایسے کان بھرے کہ نمبردار حمید کو اور تین چار معزز آدمیوں کو ساتھ لے کر تھانے چلا گیا اور تھانیدار کو بتایا کہ فلاں دس نمبریے نے حمید پہ قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ اُس نے اِس بدمعاش کا چاقو تھانیدار کے آگے رکھ دیا اور حمید سے پوچھا کہ بات کیا ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ اِس دس نمبریے کو تھانے لے آئے۔

حمید نے تھانیدار کو بتایا کہ یہ بدمعاش ان کے مزارعوں کی بیٹی کو تنگ کرتا رہتا ہے اور اُس کے ماں باپ اور بھائی کو دھمکیاں دیتا رہتا ہے۔ حمید نے کہا کہ مَیں نے اُسے کہا کہ ان غریبوں کا پیچھا چھوڑ دے۔ اُس نے چاقو نکال کر مجھے مارا۔ مَیں نے اُس [illegible] ہاتھ سے چاقو [illegible]ین کر اُس کی ٹانگ میں مارا۔

حمید نے پوری لڑائی سُنائی۔ نمبردار نے الگ اس بدمعاش کے خلاف تھانیدار کے کان بھرے۔ حمید نے تھانیدار کو یہ بھی بتا دیا کہ یہ بدمعاش شاہ جی کا پالتو غنڈہ ہے [illegible]ر شاہ جی [illegible] لینا چاہتے ہیں لیکن یہ لڑکی اُن کے ہاتھ نہیں آئی۔

"کیا تم اس کے خلاف پرچہ کرانا چاہتے ہو؟" ——— تھانیدار نے حمید سے پوچھا۔

"نہیں جی!" ——— حمید نے جواب دیا ——— "یہ تو نمبردار صاحب مجھے تھانے لے آئے ہیں۔ میں نے تو آپ کے پاس آنا ہی نہیں تھا۔"

کچھ دیر بعد بدمعاش آ گیا۔ تھانیدار نے اُس سے کچھ بھی نہ پوچھا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور اُسے کہا کہ اِس دس نمبریے کو لے جاؤ اور اِس کا دماغ درست کرو۔ ظاہر ہے کہ اُسے بُری طرح مارا پیٹا گیا تھا۔



اس کے بعد اس غنڈے کو شاہ جی کے گھر جاتے کبھی نہ دیکھا گیا۔

شاہ جی اپنی یہ توہین برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے انتقام لینا تھا لیکن وہ بہت ہی چالاک آدمی تھا۔ اُس نے اپنے کسی اور غنڈے کو حمید کے پیچھے ڈالنے کی بجائے ایک اور ہی طریقہ اختیار کیا۔

اس واقعہ کے دوسرے تیسرے دن حمید کو اُس کے گاؤں کے ایک آدمی نے بتایا کہ شاہ جی اُس کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ کہتے تھے کہ حمید اصل مرد ہے جس

نے ایک دس نمبریے کو اپنے آگے جھکا لیا ہے۔ اس آدمی نے حمید کو اور بھی کچھ باتیں سنائیں۔ یہ سب حمید کی تعریف میں تھیں۔

"حمید یار!" —— اُسی شام ایک اور آدمی نے حمید سے کہا —— "شاہ جی تم پر بہت خوش ہیں۔ میں وہاں گیا تو وہ تمہاری بات کر رہے تھے۔"

اس طرح چار پانچ آدمیوں نے حمید کو بتایا کہ شاہ جی اُس پر بہت خوش ہیں کہ اُس نے ایک ایسے بدمعاش کا سر نیچا کر دیا ہے جس سے سب ڈرتے تھے۔ حمید اس سوچ میں پڑ گیا کہ یہ بدمعاش تو شاہ جی کا اپنا آدمی تھا پھر شاہ جی اُس کے خلاف کیوں ہو گئے ہیں؟ بہر حال حمید پھونک میں آ گیا۔ وہ غیر معمولی طور پر دلیر ہو سکتا تھا اور تھا بھی لیکن وہ شاہ جی جیسا چالاک اور عیار نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ شاہ جی کی باتوں میں آ گیا۔

ایک آدھ دن اور گزرا تو اُسے ایک آدمی نے کہا کہ شاہ جی اُسے بہت یاد کرتے ہیں کہتے ہیں کہ اس لڑکے کو شاباش دینا چاہتا ہوں۔

"کسی وقت چلا جاؤں گا" —— حمید نے کہا۔

"کسی وقت نہیں" —— اس آدمی نے کہا —— "ابھی چلے جاؤ۔ وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ تم تو خوش قسمت ہو یار! شاہ جی تمہیں خود بلا رہے ہیں۔"

حمید اُسی وقت چلا گیا۔



شاہ جی اپنے خاص کمرے میں تھا۔ اُسے حمید کے آنے کی اطلاع ملی تو حمید کو اُس نے اُسی کمرے میں بلا لیا۔ حمید اُسے اُسی احترام سے ملا جس احترام سے پیروں کو ملا جاتا ہے۔ اُس نے شاہ جی کے گھٹنے چھوئے اور دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھ کر سلام کیا۔

"واہ حمید واہ!" —— شاہ جی نے کہا —— "اصیل مرد ہو۔ تم نے ایک دس نمبریے کو لگام ڈالی اور تھانیدار کو بھی رام کر لیا۔"

"آپ کی دُعا ہے شاہ جی!" —— حمید نے کہا۔

"مجھے تم جیسے شیر کی ضرورت ہے" —— شاہ جی نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ بولا —— "آؤ ساتھ والے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ یہاں کوئی نہ کوئی آ جاتا ہے۔ میں نے تم سے ایک خاص بات کرنی ہے۔"

شاہ جی نے ایک دروازہ کھولا اور حمید کو ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ دروازہ

بند کر دیا لیکن زنجیر نہ چڑھائی۔ یہ کمرہ زیادہ کشادہ تھا۔ اس میں صرف دو چارپائیاں پڑی تھیں۔ ایک چارپائی پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے جو حمید کے لیے اجنبی تھے۔ ایک ادھیڑ عمر تھا اور دوسرے کی عمر اس سے ذرا کم تھی۔

"لو بھائیو!" —— شاہ جی نے حمید کے پیچھے ہو کر کہا —— "تمہارا شکار جال میں آ گیا ہے۔ اس کو سنبھالو اور ایسی مرمت کرو کہ ساری عمر یہاں آ کر سجدے کرتا رہے۔ اندر کی مار دو۔"

اس کا مطلب تھا کہ گھونسوں کی مار دو تا کہ کوئی زخم اور کوئی چوٹ نظر نہ آئے۔ شاہ جی نے پیچھے سے حمید کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ حمید کی پیٹھ شاہ جی کے سینے کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ شاہ جی قوی ہیکل تھا۔ وہ دونوں آدمی حمید کی طرف آئے۔ حمید سمجھ گیا کہ وہ اُس کے پیٹ میں گھونسے ماریں گے۔ جب وہ اُس کے قریب آئے اور انہوں نے مکے تانے تو حمید پوری طاقت سے اُچھلا اور ایک فلائنگ کِک ایک کے پیٹ میں اور دوسری دوسرے کے پیٹ میں ماری۔

وہ دونوں پیچھے کو گرے۔ چونکہ حمید شاہ جی کی گرفت میں تھا اور شاہ کے سینے سے اس کی پیٹھ لگی ہوئی تھی۔ حمید طاقتور جوان تھا۔ اُس نے دونوں آدمیوں کو اُچھل کر کِک ماری تو اُس کے جسم کا پیچھے کا دھکہ شاہ جی کو اتنی زور سے لگا کہ وہ دیوار سے جا لگا۔ دیوار فٹ ڈیڑھ فٹ دُور تھی۔ شاہ جی کا سر بھی دیوار سے لگا۔ حمید کے گرد اُس کے بازوؤں کی گرفت بے جان ہو گئی۔

حمید پھُرتیلا جوان تھا۔ وہ فوراً شاہ جی کے بازوؤں سے نکل آیا، پیچھے کو گھوما، شاہ جی ٹانگیں پھیلائے دیوار کے سہارے کھڑا تھا۔ وہ ابھی سنبھلا نہیں تھا۔ اُس کا سینہ اندر سے ہل گیا تھا۔ حمید نے اُچھل کر شاہ جی کی دونوں ٹانگوں کے درمیان اوپر کو کِک ماری۔ شاہ جی کے منہ سے کربناک آواز نکلی اور وہ وہیں دوہرا ہو گیا۔

یہ سارا ایکشن تین چار سیکنڈ میں ہو گیا۔

شاہ جی تو دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ ہی گیا۔ اُس کے دونوں آدمی سنبھل کر حمید کی طرف آئے۔ حمید ایک چارپائی کی دوسری طرف ہو گیا۔ دونوں چارپائی پر چڑھ کر اُس تک پہنچنا چاہتے تھے لیکن حمید نے چارپائی اپنی طرف کھینچی اور پھر بڑی ہی زور سے اُن کی طرف دھکیلی۔ چارپائی کا لمبا بازو اُن دونوں کے گھٹنوں پر لگا۔ ہڈی کی چوٹ بڑی سخت ہوتی ہے۔

دونوں آدمی چوٹ کھا کر پیچھے ہٹے۔ حمید نے اپنی طرف سے چارپائی اٹھائی اور اُن دونوں پر پھینک دی۔ بیشتر اس کے کہ وہ سنبھلتے، حمید کمرے سے نکل گیا اور شاہ جی کی حویلی سے بھی نکل گیا۔ پیچھے اُس کی للکار رہ گئی — "اپنے جنّوں کو میرے پیچھے بھیج اوئے دھوکے شاہ!"



حمید نمبردار کے ہاں گیا اور اُسے یہ واقعہ سُنایا۔ نمبردار کا بیٹا جو حمید کا دوست تھا، باپ کے پیچھے پڑ گیا کہ تھانے چلو ورنہ شاہ جی حمید کو مروا دے گا۔ حمید خود بھی یہی چاہتا تھا۔ نمبردار اُسے تھانے لے گیا۔ تھانہ کچھ دُور ایک بڑے گاؤں میں تھا۔

تھانیدار بڑا ہی سخت اور اپنے فرائض کو سمجھنے والا آدمی تھا۔ دو تین دن پہلے شاہ جی کا ایک غنڈہ حمید پر حملہ کر چکا تھا۔ اب یہ دوسرا واقعہ ہو گیا۔ تھانیدار نے اے ایس آئی سے کہا کہ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لو اور اس شاہ اور اِن دونوں آدمیوں کو تھانے لے آؤ۔

شاہ جی اور اُس کے آدمی ڈیڑھ گھنٹے بعد آ گئے۔

"ان دونوں کو حوالات میں بند کر دو" — تھانیدار نے حکم دیا — "اور شاہ صاحب! آپ میرے ساتھ بیٹھ جائیں۔"

شاہ جی کے دونوں آدمیوں کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

"شاہ صاحب!" — تھانیدار نے شاہ جی سے کہا — "آپ کے قبضے میں جن ہوں گے، چڑیلیں ہوں گی اور بھوت بھی ہوں گے لیکن میں انگریز کے قانون کا پابند ہوں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ آپ نے اِس لڑکے پر آج دوسرا وار کیا ہے۔ میں اسے قاتلانہ حملہ لکھ کر آپ کی عزت خاک میں مِلا سکتا ہوں۔ آپ پانچ سال کے لیے اندر ہو جائیں گے۔ آپ کی منڈی چل رہی ہے۔ اسے چلتا رہنے دیں۔"

شاہ جی نے ایک دو دفعہ بولنے کی کوشش کی لیکن تھانیدار نے اُسے بولنے نہ دیا۔

"میں آپ پر مہربانی کر رہا ہوں" — تھانیدار کہہ رہا تھا — "آپ مجھے تحریر دیں کہ آئندہ اس قسم کی حرکت نہیں کریں گے اور اِن مزارعوں اور ان کی بیٹی عائشہ کو تنگ نہیں کریں گے اور ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔"

تھانیدار نے شاہ جی سے یہ تحریر لکھوائی۔ اُس کے دستخط کروا لئے۔ نمبردار کا بحیثیت گواہ انگوٹھا لگوایا اور نمبردار کے بیٹے کو بھی گواہ بنا کر اُس کے دستخط لیے اور شاہ جی

کو خوب ڈرایا دھمکایا۔ اُس کے جو دو آدمی حوالات میں بند تھے انہیں کانسٹیبلوں سے چھتر لگوائی اور انہیں چلتا کیا۔

"حمید!" — تھانیدار نے کہا — "تم فارغ اور نکمّے گاؤں میں کیوں پھرتے رہتے ہو؟ تم لوگوں نے زمینیں بٹائی پر دے رکھی ہیں۔ بہتر ہے فوج میں بھرتی ہو جاؤ اور اپنی زندگی کا کوئی راستہ بناؤ۔ آج تو میں ہوں۔ میرا ایمان کچھ اور ہے۔ کل پرسوں کوئی ہندو یا سکھ تھانیدار آ گیا یا کوئی حرامخور مسلمان میری جگہ آ گیا تو یہ شاہ اُسے ہاتھ میں لے کر تمہیں اُڑا دے گا اور تمہارے خاندان کے لیے نئی سے نئی مصیبت کھڑی کیے رکھے گا۔ تم فوجی بن گئے تو ڈپٹی کمشنر کو صرف ایک درخواست دو گے کہ گاؤں میں فلاں آدمی تمہارے والدین کو تنگ کرتا ہے تو اُس آدمی کی گرفتاری کا حکمنامہ جاری ہو جائے گا۔"

"اس طرح میں بھرتی ہو گیا" — حمید نے مجھے یہ داستان سُنا کر کہا — "میں نے اس شاہ سے بہت بڑا انتقام لینا ہے۔"

"ضرور لینا ہے" — میں نے کہا — "میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

ہم دونوں نے بڑا ہی خوفناک پروگرام بنا لیا۔

اپنی

زندگی کی داستان سناتے سناتے خیال آتا ہے کہ میں کسے سنا رہا ہوں، پڑھنے والے یہ پڑھیں گے ہی کیوں؟ میں کوئی بہت بڑا سیاسی لیڈر نہیں ہوں، بڑے بڑے علماءِ دین میں سے نہیں ہوں لیکن ابنِ صحرا صاحب اور ایڈووکیٹ صاحب کہتے ہیں بولتے جاؤ، سناتے جاؤ، پڑھنے والے دلچسپی سے پڑھیں گے۔

میں صرف یہ خرابی محسوس کر رہا ہوں کہ زمانہ بالکل ہی بدل گیا ہے۔ لوگ بدل گئے ہیں۔ لوگوں کی سوچیں اور ان کے کردار بدل گئے ہیں۔ میں کچھ ایسے کردار پیش کروں گا جو آج کے دور میں کسی افسانے کے کردار معلوم ہوں گے۔ وہ خلوص، پیار اور جذبۂ ایثار کا زمانہ تھا۔ آج لوگوں میں تصنع اور شو بازی آ گئی ہے۔ شہروں کا معاملہ تو بالکل ہی کچھ اور ہو گیا ہے۔

پھر بھی سُنا رہا ہوں۔

کچھ دنوں بعد میرے دوست صداقت کا ایک اور خط آیا۔ مجھے معلوم تھا دوست نے کیا لکھا ہو گا۔ خط میں پہلی خبر ہی یہی تھی کہ واجدہ کی شادی ہو گئی ہے۔ صداقت کو یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ واجدہ نے نکاح کے وقت "قبول کیا" کہا تھا یا نہیں یا اُس نے قبولیت کے لیے سر ہلایا تھا یا نہیں، صداقت نے لکھا تھا کہ اُس کی بہن نے اُسے بتایا تھا کہ لڑکیاں گھروں سے رُخصت ہوتے روتی ہی ہیں لیکن واجدہ کا رونا کسی سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو یوں روتی تھی جیسے اُس کا باپ مر گیا ہو۔

وہ جنگ کا زمانہ تھا۔ فوجیوں کو بہت کم چھٹی ملتی تھی۔ واجدہ کے خاوند آصف کو شادی کے لیے صرف دس دن چھٹی ملی تھی۔ صداقت کا اگلا خط بیس بائیس دنوں بعد آیا۔ اُس نے کہا کہ وہ واجدہ سے ملا تھا۔ واجدہ نے اُسے بتایا کہ پہلی رات اُس نے اپنے خاوند کو صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ میں نے نکاح کے وقت تمہیں قبول نہیں کیا تھا۔ اس لیے تم میرے خاوند نہیں بن سکتے نہ میں تمہیں اپنا خاوند مانتی ہوں۔

صداقت نے اُس کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا۔ واجدہ نے اسی قسم کا تھپڑ اُس کے

منہ پر مارا۔ وہ تو ہکا بکا رہ گیا۔ یقین جانیئے جب میں نے خط میں یہ پڑھا تو میں نے اسے سچ نہ مانا۔ ہمارے دیہاتی علاقے میں کوئی عورت، خصوصاً پہلے روز کی دُلہن، اپنے خاوند کو تھپڑ مار دے؟.... انہونی بات ہے۔ خاوند اُس کا گلا گھونٹ دے۔ اگر گلا نہ گھونٹے تو یہ ضرور کرے کہ اُسی وقت اُسے میکے روانہ کر دے۔

صداقت نے لکھا کہ واجدہ نے آصف کے منہ پر تھپڑ مار کر کہا کہ مجھ پہ ہاتھ اُٹھایا تو چیختی چلاتی باہر نکل جاؤں گی اور تمہارے اس سارے گاؤں کو جگا کر ایسا الزام تھوپوں گی کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔

"میں تمہیں اس تھپڑ کا جواب دوں گا" ــــ آصف نے کہا ــــ "لیکن سوچ کر ساری عمر یاد رکھو گی"۔

بہت دیر آصف خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے واجدہ کے ساتھ اس طرح باتیں شروع کر دیں جیسے ان دونوں نے ایک دوسرے کو تھپڑ مارا ہی نہیں تھا۔

"میں مرد ہوں" ــــ آصف نے واجدہ سے کہا ــــ "عورت دلیر اور نڈر ہو سکتی ہے لیکن وہ مرد سے زیادہ طاقتور نہیں ہو سکتی۔ میں تمہاری ہڈیاں توڑ سکتا ہوں تمہیں مجبور کر سکتا ہوں کہ فوراً میری بیوی بن جاؤ لیکن جس مرد میں طاقت ہو اُسے زیب نہیں دیتا کہ وہ عورت پہ اپنی طاقت آزمائے۔ میں اونچی ذات کا خاندانی آدمی ہوں اور تمہاری بھی یہی ذات ہے اور تم بھی خاندانی لڑکی ہو۔ میرا فرض بنتا ہے کہ ایک بار تمہیں اونچ نیچ سمجھا دوں۔ آگے تمہاری مرضی ہے۔ سمجھو یا نہ سمجھو.... میں تمہیں زبردستی بیاہ کر نہیں لایا"۔

"میں نے اپنے ماں باپ کو بتا دیا تھا" ــــ واجدہ نے کہا ــــ "میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ میں آصف کو قبول نہیں کروں گی"۔

"اس میں میرا کیا قصور؟" ــــ آصف نے کہا ــــ "میں نے تمہیں اغوا تو نہیں کیا۔ تم کسی طرح مجھے بتا دیتیں تو میں اپنے ماں باپ کو تمہارا رشتہ لینے سے روک دیتا۔ تمہارے ساتھ تمہارے اپنے ماں باپ نے زبردستی کی ہے اور تم سزا مجھے دے رہی ہو۔ میرے ساتھ لڑائی جھگڑے سے تمہیں کیا ملے گا؟"

"تم نے مجھے تھپڑ مارا تھا" ــــ واجدہ نے کہا ــــ "میں نے تمہیں تھپڑ اس لیے مارا ہے کہ دوبارہ مجھ پر ہاتھ نہ اُٹھاؤ۔ تم باتیں کرو۔ میں سنوں گی اور لڑائی جھگڑا نہیں کروں گی۔ میں نے مان لیا ہے کہ تم مجھے اُٹھا کر نہیں لائے"۔

"میں نے ایک ہی بات کہنی ہے" ــــ آصف نے کہا ــــ "اپنے ماں باپ اور اپنے خاندان کی عزت کا خیال رکھو۔ میں تمہیں ابھی گھر سے نکال سکتا ہوں۔ یہ سوچو کہ جہیز سمیت جب تم اپنے گھر واپس جاؤ گی تو تمہارے باپ کی کیا عزت رہ جائے گی۔ مجھ سے لوگ پوچھیں گے کہ میں نے تمہیں واپس کیوں بھیجا ہے تو میں تم پر بہت بڑا الزام عائد کروں گا پھر تم ساری عمر گھر بیٹھی رہو گی۔ میں ضد میں آ کر تمہیں طلاق نہیں دوں گا میں جانتا ہوں تم کسی اور کو چاہتی ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اپنے دل میں میری محبت پیدا کرو لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ جس کسی کو بھی تم چاہتی ہو وہ تمہارے ساتھ بیوفائی بھی کر سکتا ہے۔"

واجدہ نے یہ باتیں صداقت کو سنائی تھیں جو صداقت نے مجھے لکھ بھیجیں اور واجدہ نے صداقت سے کہا کہ یہ ساری باتیں خانی کو لکھ دینا۔ صداقت نے یہ بھی لکھا کہ واجدہ نے آصف سے اپنی یہ شرط منوالی ہے کہ وہ آصف کی غیر حاضری میں اُس کے گھر نہیں رہے گی، اپنے ماں باپ کے پاس رہا کرے گی۔

آصف چلا گیا اور واجدہ اپنے گھر آ گئی۔

میں جانتا تھا کہ واجدہ میں مردوں سے زیادہ جرأت تھی اور وہ کسی سے دبنے والی نہیں تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ آصف اس سے دب گیا تھا۔ یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کیسا آدمی ہے۔ اگر اُس نے واجدہ کا تھپڑ کھا کر بھی ایسی باتیں کی تھیں تو میں آج بھی یہی کہتا ہوں کہ وہ اُونچے کردار کا آدمی تھا۔ وہ تو واجدہ کو ذلیل و خوار کر سکتا تھا۔

ایک بات اور بھی۔ واجدہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ آصف اتنی خوبصورت لڑکی کو کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ میں جانتا تھا کہ اُس کے حسن میں کوئی طلسماتی سا اثر تھا جو دیکھنے والے پر ہپناٹزم جیسا اثر کر دیتا تھا۔

☆

میری ٹریننگ کے تقریباً چار مہینے گزر گئے تھے۔ صداقت کا خط آیا جس میں اُس نے لکھا تھا کہ آصف قریبی چھاؤنی میں آ گیا ہے۔ یہ چھاؤنی ہمارے قصبے سے تقریباً تیس میل دُور تھی۔ میں اس کا نام نہیں لکھوں گا۔

ٹریننگ ہوتی رہی۔ بڑی ہی سخت ٹریننگ تھی۔ حمید تو دیہاتی تھا، سختیاں جھیلنے کا عادی تھا، میں شہری زندگی کا عادی تھا۔ آہستہ آہستہ میں بھی فوجی ڈسپلن کا عادی ہو گیا۔

امن کے زمانے میں ٹریننگ کا عرصہ زیادہ تھا لیکن جنگ کی وجہ سے یہ عرصہ کم کر دیا گیا تھا۔ اُدھر جاپانی فوجیں برما کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ آگے ہندوستان تھا۔ انگریزوں کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ ٹریننگ سات مہینوں میں ختم کر دی گئی اور مجھے اور حمید کو چند اور سپاہیوں کے ساتھ بٹالین میں بھیج دیا گیا۔ یہ بٹالین اُسی چھاؤنی میں تھی جس میں آصف کی سگنل یونٹ تھی۔

بٹالین میں بھیجنے سے پہلے ہمیں پانچ پانچ دن کی چھٹی دی گئی۔ صداقت سے ملاقات ہوئی۔ میں کسی نہ کسی طرح واجدہ سے ملنا چاہتا تھا لیکن صداقت نے بتایا کہ تین دن گزرے آصف آیا تھا۔ اُسے سرکاری کوارٹر مل گیا ہے اور وہ واجدہ کو ساتھ لے گیا ہے۔

شام ہونے کو تھی۔ میں بازار سے گھر کو آ رہا تھا کہ وہ بدمعاش مل گیا جس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اس شہر سے چلے جاؤ ورنہ پچھتاؤ گے۔

"کیوں خانی!" ــ اُس نے طنزیہ کہا ــ "کیسی گزر رہی ہے۔ یہاں رہتے تو بہت خوار ہوتے۔"

"کون خوار کرتا مجھے؟" ــ میں نے پوچھا ــ "تم؟ کرائے کے غنڈے!"

"جا با اُو جا!" ــ اُس نے ایسے انداز سے کہا جیسے مجھے کچھ سمجھتا ہی نہ ہو ــ "ابھی تیری انتڑیاں بازار میں بکھری ہوئی ہوں گی۔"

میں تو اُس کی شکل دیکھ کر ہی کھول اُٹھا تھا۔ اُس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ میرے ارادے کے بغیر میرے دائیں ہاتھ کی مٹھی بند ہوئی اور میرا مکا اُس کی آنکھوں کے درمیان ناک پر اتنی زور سے پڑا کہ وہ چار پانچ قدم پیچھے کو گرا۔ اٹھنے لگا تو اُس نے سر کو دائیں بائیں ہلایا۔ اُس کا سر ڈول رہا تھا۔ اُس سے اُٹھا نہیں جا رہا تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ میرے دل میں اُس کے خلاف آٹھ نو مہینوں سے قہر بھرا ہوا تھا جو کم ہونے کی بجائے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ خوش قسمت تھا کہ میرا ہاتھ اُس کی گردن پر نہیں چلا گیا تھا ورنہ میں اُس کا گلا گھونٹ دیتا۔ میرے جسم میں جان تو پہلے ہی بہت تھی لیکن فوجی ٹریننگ نے میرے جسم کو لوہے جیسا مضبوط بنا دیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میرا مکا ہتھوڑے کی طرح اُسے لگا ہو گا۔ مجھ میں اتنی طاقت تھی یا نہیں، یہ بات بھی تھی کہ اُس کے جسم میں چرس نے کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ بدمعاشی کے زور پر ہر کسی کے لیے خوف کا باعث بنا ہوا تھا۔

وہ ابھی پوری طرح اُٹھا نہیں تھا۔ مَیں نے اُس کے سر کے بال مُٹھی میں لیے اور جھٹکے سے اوپر کو کھینچے۔ وہ فوراً اُٹھا۔ اُس نے بڑی تیزی سے کُرتے کی پہلو والی جیب سے چاقو نکالا۔ یہ لمبا چاقو تھا جو بدمعاش اور غنڈے اپنے پاس رکھا کرتے تھے۔ اسے ہم کمانی دار چاقو کہا کرتے تھے۔ میں نے چاقو دیکھ لیا تھا۔ اُس کے بال میری مُٹھی میں تھے۔

اُس نے دائیں طرف سے چاقو میرے پہلو میں مارنا چاہا۔ اُس کا وار بڑا تیز تھا لیکن میں چوکنا تھا۔ مَیں نے بائیں بازو سے اُس کا وار روک لیا اور اُس کے بال چھوڑ کر اُس کے مُنہ پر پہلے جیسا مکہ مارا۔ وہ پہلے کی طرح تیورا کر گرا اور اُس کے ہاتھ سے چاقو گر پڑا۔

اُس میں اب مزید مار کھانے کی ہمّت نہیں رہی تھی۔ لوگ بھی اکٹھے ہو گئے تھے۔ دو تین آدمی درمیان میں آ گئے۔ وہ غنڈہ اُٹھ کر چاقو اُٹھانے لگا۔ اُس کا ایک پہلو میرے سامنے تھا۔ وہ جُھکا ہُوا تھا۔ دو آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا تھا۔ مَیں نے اُس کے پہلو میں بڑی زور سے ٹھڈ مارا۔ اُس کے بعد وہ اُٹھ نہ سکا۔

"تم عزّت دار خاندان کے آدمی ہو خانی!" — ایک آدمی مجھے کہہ رہا تھا — "کس گھٹیا آدمی کے ساتھ تم نے لڑائی مول لے لی ہے۔"

"یہ پولیس سے ملے ہُوئے ہیں خانی!" — ایک اور آدمی نے میرے کان میں آہستہ سے کہا — "یہ پولیس کے مخبر ہوتے ہیں اس کمینے سے منہ نہ لگاؤ۔"

وہ کمینہ پہلو میں لات کھا کر اُٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ مَیں نے جھوٹ بولنا شروع کر دیا۔ میں بڑی ہی بلند اور غصیلی آواز میں کہہ رہا تھا کہ یہ فلاں راجے کا کرایہ کا غنڈہ ہے۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اس شہر سے نکل جاؤ ورنہ ساری عمر پچھتا گے۔ راجہ صاحب اس کی ہلا شیری کر رہے ہیں۔ مَیں نے تو ویسے بھی فوج میں بھرتی ہونا تھا۔ مَیں بھرتی ہو گیا۔ کل ہی چھُٹی پر آیا ہوں۔ آج یہ مجھے راستے میں ملا اور میرے ساتھ اس طرح باتیں کیں جیسے میں اس کا کمی کمین ہوں اور جیسے میں اس کے ڈر سے شہر سے بھاگ گیا۔ اور فوج میں بھرتی ہُوا تھا۔

مَیں نے مزید جھوٹ بولا کہ مَیں نے اس کے ساتھ شرافت سے بات کی تو اس نے چاقو نکال لیا اور مجھے مارا لیکن میں نے اس کا بازو پکڑ لیا اور اس کے اسے دو تین مُکّے مارے۔

اُس چرسی غنڈے کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ اُس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ مَیں نے کہا کہ میں تھانے جا رہا ہوں۔ دو تین آدمیوں نے مجھے تھانے جانے سے روکا۔

"میں تھانے ضرور جاؤں گا" — میں نے کہا — "میں نے کل پرسوں اپنی نوکری پر چلے جانا ہے۔ میرے بعد یہ میرے گھر والوں کو تنگ کرے گا۔ میں تو اس کے پالنے والے راجے کے خلاف رپورٹ لکھواؤں گا۔"

جو لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان میں سے بہت سے حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ وہ اس لیے حیران تھے کہ میں ایک راجہ صاحب کے خلاف زبان درازی کر رہا ہوں۔ میں اس وجہ سے اتنا دلیر ہو گیا تھا کہ میں فوجی تھا۔ جنگِ عظیم کے وقت کے جو لوگ زندہ ہیں، اُن سے پوچھئے کہ اُس زمانے میں فوجی کی کتنی قدر تھی اور انگریزوں نے لوگوں پر ہی نہیں بلکہ سرکاری محکموں پر بھی فوجیوں کا رعب بٹھا رکھا تھا۔ تحصیلداروں، تھانیداروں اور ان سے چھوٹے سرکاری اہلکاروں کو ڈپٹی کمشنروں کی طرف سے حکم ملا ہُوا تھا کہ کوئی فوجی کسی بھی قسم کی کوئی شکایت لے کر آئے یا کوئی درخواست دے تو فوری طور پر اس کی شکایت رفع کی جائے اور اس کی درخواست پر کارروائی کی جائے۔ وجہ یہ تھی کہ انگریز بادشاہ اپنی اتنی بڑی بادشاہی کو جرمنوں اور جاپانیوں سے فوجی طاقت سے ہی بچا سکتا تھا۔

فوجیوں کے متعلق لوگوں کی جو رائے تھی وہ میں اپنے محلّے کے ایک بزرگ کی زبانی بتاتا ہوں۔ مَیں چھُٹی آیا تو وہ مجھے ملے اور بہت خوش ہُوئے۔ کہنے لگے کہ آج کل دو ہی چیزوں کی قدر ہے۔ ایک سرکاری ڈیری کی گائے اور دوسرے فوجی۔

میرے دو تین دوست بھی تماشائیوں میں موجود تھے۔ انہوں نے میرا ساتھ دیا۔ انہیں اس لڑائی کے پس منظر کا علم تھا۔ مَیں نے اُنہیں ساتھ لیا اور ہم تھانے چلے گئے۔ میں چونکہ وردی میں نہیں تھا اس لیے اپنا تعارف کرانا پڑا۔ میں حوالدار کلرک تھا۔ اس کے ساتھ مَیں نے یہ بھی کہہ دیا کہ میں انٹیلی جنس میں ہوں۔ تھانے دار پر اچھا خاصا اثر ہُوا۔ اُس نے بڑی ہمدردی سے پوچھا کہ مَیں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔

میں نے اس غنڈے اور اس کی پشت پناہی کرنے والے راجہ صاحب کے خلاف جھوٹ سچ ملا کر تھانیدار کو سارا معاملہ سُنا دیا اور آخر میں کہا کہ اس غنڈے نے مجھ پر چاقو سے قاتلانہ حملہ کیا ہے۔

"اس راجے کو آپ کے ساتھ کیا دشمنی ہے؟" ——— تھانیدار نے پوچھا۔

"دشمنی یہ ہے جناب!" ——— میں نے کہا ——— "راجہ صاحب اپنی بیٹی کو تعلیم دلوانا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ لڑکی کو اردو انگریزی پڑھایا کروں۔ میں نے اُن کا حکم مانا اور اُن کے گھر جا کر لڑکی کو پڑھانا شروع کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ اس لڑکی میں اپنے باپ والا اور اپنی اونچی ذات والا تکبّر اور غرور بالکل نہیں۔ وہ بڑی شریف اور سمجھ دار لڑکی ہے۔ اُس کی ایک جگہ منگنی ہو گئی تھی۔ جب شادی کا دن مقرر کرنے کا وقت آیا تو لڑکی نے اُس لڑکے کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اُس نے بیوقوفی یہ کی کہ اپنی ماں سے یہ کہہ دیا کہ وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔ راجہ صاحب کو پتہ چلا تو انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں آئندہ ان کے گھر نہ آیا کروں۔ اگلے روز انہوں نے اس بدمعاش کو میرے پیچھے ڈال دیا۔ اس شخص نے مجھے دھمکی دی کہ شہر سے فوراً نکل جاؤ ورنہ پچھتاؤ گے....

"میں ان دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں تھا لیکن میرے والد صاحب اور دوسرے بزرگوں نے بھی مشورہ دیا کہ بہتر یہی ہے کہ تم فوج میں بھرتی ہو جاؤ ورنہ یہ لوگ تمہیں تنگ کرتے رہیں گے۔ جنابِ عالی! میں نے ماں باپ کی عزت کی خاطر یہ فیصلہ مان لیا اور فوج میں بھرتی ہو گیا۔ میری قابلیت کو دیکھتے ہوئے انگریز افسروں نے مجھے انٹیلی جنس کی ٹریننگ دی! اور مجھے حوالداری کا عہدہ دے دیا۔ آپ جانتے ہیں کہ انٹیلی جنس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ یہ دشمن کے جاسوسوں کو پکڑنے والا محکمہ ہوتا ہے۔

"اب میں ٹریننگ کے بعد پانچ دنوں کی چھٹی آیا ہوں۔ آج یہ بدمعاش راستے میں مل گیا۔"

اس کے بعد میں نے وہی جھوٹ بولا جو تماشائیوں کے سامنے بولا تھا۔ میں نے بار بار یہ کہا کہ اس بدمعاش نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔

تھانیدار نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا ——— "یہ تو فلمی سٹوری ہے.... لڑکی کے ساتھ آپ نے کوئی چکّر چلایا ہو گا۔"

"نہ جی نہ!" ——— میں نے کہا ——— "میں پہلے بتا چکا ہوں کہ بڑی شریف اور بُرا بھلا سمجھنے والی لڑکی ہے۔ اُس کی تو شادی بھی ہو چکی ہے۔"

"کیا آپ اس غنڈے کے خلاف قاتلانہ حملے کا پرچہ کرانا چاہتے ہیں؟" ——— تھانیدار نے پوچھا۔

"نہیں جی!" ——— میں نے جواب دیا ——— "میں پرسوں چلا جاؤں گا۔ کون عدالتوں کی پیشیاں بھگتتا رہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ اس غنڈے کو لگام ڈال دیں۔"

"یہ ٹھیک ہے" ——— تھانیدار نے خوش ہو کر کہا ——— "میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ مقدمے بازی میں نہ ہی پڑیں۔ آپ باہر بیٹھیں میں ابھی ان کا بندوبست کرتا ہوں۔"

ہم باہر بیٹھ گئے۔ تھانیدار نے راجہ صاحب اور اُس کے غنڈے کو بُلا لیا۔ کچھ وقت تو لگ گیا لیکن تماشا بڑا اچھا رہا۔ تھانیدار نے دونوں کو اپنے پاس بُلایا۔ مجھے اور میرے دوستوں کو بھی بُلا لیا۔ پھر اُس نے راجہ صاحب کی جو بے عزتی کی ہے وہ میری توقع سے بہت زیادہ تھی۔ میں پوری تفصیل سے لکھنا ضروری نہیں سمجھتا کہ تھانیدار نے راجہ صاحب کو کیا کیا باتیں کہی تھیں۔

"وہ چاقو میرے حوالے کر دو" ——— تھانیدار نے غنڈے سے کہا ——— "تیرے خلاف تو میں قاتلانہ حملے کا پرچہ کر رہا ہوں۔ تمہارے یہ راجہ صاحب بھی اس واردات میں شامل ہیں۔ میں دونوں کو حوالات میں بند کر دوں گا۔"

دونوں نے تڑپنا شروع کر دیا۔ اپنی صفائی میں کچھ نہ کچھ کہے جا رہے تھے اور کبھی ہاتھ جوڑ کر تھانیدار کی منت سماجت کرتے لیکن تھانیدار اُن پر دباؤ ڈالتا چلا گیا۔ غنڈے نے جیب سے چاقو نکال کر تھانیدار کے حوالے کر دیا۔ پھر تھانیدار نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ صاحب تمہیں معاف کر دیں تو میں یہ پرچہ نہیں کروں گا۔

دونوں نے رُخ میری طرف کر لیا اور میری منتیں کرنے لگے۔ میں نے غنڈے کے چہرے کو دیکھا۔ دو جگہ پر اُبھار تھا اور وہاں اُس کے چہرے کا رنگ نیلا ہو گیا تھا۔ تھانیدار نے اُس کے ان نشانات کی طرف توجہ ہی نہ دی حالانکہ اُس نے کہا تھا کہ میں نے اسے مارا ہے۔

"جنابِ عالی!" ——— میں نے تھانیدار سے کہا ——— "کوئی ضمانت ہونی چاہیے کہ میری غیر حاضری میں یہ لوگ میرے گھر والوں کو پریشان نہیں کریں گے۔"

"میں اس کی ضمانت کا بندوبست تو ابھی کر دیتا ہوں" ——— تھانیدار نے اس بدمعاش کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ پھر اُس نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور کہا ——— "اسے لے جاؤ اور اس کے دماغ سے بدمعاشی نکال دو۔"

ہیڈ کانسٹیبل نے اُسے بازو سے پکڑا اور باہر لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد تھانے کے

پچھواڑے سے چیخ و پکار سُنائی دینے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ بدمعاش کے دماغ سے بدمعاشی نکالی جا رہی ہے۔

"راجہ صاحب!" ـــ تھانیدار نے کہا ـــ "میں آپ کو زیادہ ذلیل نہیں کروں گا۔ آپ کوئی معزز اور ذمہ دار ضامن پیش کر دیں جو دو گواہوں کے سامنے یہ تحریر دے دے کہ آپ ان کے خاندان کو عملی یا زبانی طور پر پریشان نہیں کریں گے۔"

"جو حکم سرکار!" ـــ راجہ صاحب نے کہا ـــ "میں ایک ضامن لے آتا ہوں۔"

مختصر یہ کہ تھانیدار نے میرا رُعب جما دیا۔ راجہ صاحب سے ایک ضامن کی تحریر لی گئی۔ اُس بدمعاش کا تو یہ حال تھا کہ پہلے اُس نے مجھ سے مار کھائی پھر تھانے میں اُس کی پٹائی ہوئی۔ میں اور میرے دوست تھانیدار سے ہاتھ ملا کر تھانے سے نکل آئے اور ہنستے کھیلتے اپنے گھر پہنچے۔ گھر والے بہت پریشان تھے۔ اُنہیں اطلاع مل چکی تھی کہ میری لڑائی ہو گئی ہے اور معاملہ تھانے تک پہنچ گیا ہے۔ میں نے گھر والوں کو بتایا کہ میں اپنی اور ان کی حفاظت کا کیا انتظام کر کے آیا ہوں۔

❦

میں تیسرے روز اپنی بٹالین میں چلا گیا۔ یہ تو آپ سب کو معلوم ہو گا کہ بٹالین کو دیسی زبان میں پلٹن کہا جاتا تھا۔ حمید بھی آ گیا تھا۔ میں چونکہ حوالدار کلرک تھا اس لیے مجھے دفتر میں کلرکی کا کام ملا۔ حمید سپاہی تھا۔ اُسے اُس کی کمپنی میں شامل کر لیا گیا۔ ہماری نئی زندگی شروع ہو گئی۔ یہ ٹریننگ سنٹر سے اچھی، مختلف اور آرام دہ زندگی تھی۔ دو تین دنوں بعد مجھے پتہ چلا کہ آصف کی سگنل بٹالین ہماری بارکوں کے قریب ہے۔ دو تین دن گزرے، سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے میں ٹہلتا ٹہلتا سگنل بٹالین کی بارکوں کی طرف چلا گیا۔ سڑک کے ساتھ ایک جنگلہ تھا۔ اس جنگلے سے ذرا پرے پانچ چھ عورتیں کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ اُنہیں دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ ان میں واجدہ بھی کھڑی تھی۔ تب میں نے ذرا اچھی طرح دیکھا۔ یہ اس یونٹ کے فیملی کوارٹر تھے۔ میں جنگلے کے [illegible] رُک گیا اور زور سے کھانسا۔ سب عورتوں نے میری طرف دیکھا۔ واجدہ کے چہرے پر [illegible] ہی حیرت آ گئی جیسی میرے چہرے پر تھی۔ بار بار ہی حیرت والی تھی۔ وہاں ہمارا ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ جانا ایک معجزہ تھا۔ میرے دل میں ایسی توقع نہیں تھی کہ واجدہ میرے قریب آ جائے گی۔ وہ فوجی ماحول تھا اور فوجی ماحول بالکل دیہات جیسا ہوتا ہے۔ کوئی غیر مرد اور عورت کھلے عام اکٹھے کھڑے ہو کر بات کرنے کی سوچ بھی نہیں سکتے تھے لیکن واجدہ تیز تیز چلتی میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"تم کہاں خانی!" ـــ واجدہ نے آنسو دوپٹے سے پونچھتے ہوئے پوچھا ـــ "تمہاری پلٹن یہیں ہے؟"

"ہاں واجو!" ـــ میں نے کہا ـــ "ہماری بارکیں یہ بالکل قریب ہیں۔ تمہارا خاوند کہاں ہے؟"

"ڈیوٹی پر ہے" ـــ اُس نے جواب دیا ـــ "رات نو بجے آئے گا۔"

"ان عورتوں کو کیا بتاؤ گی، میں کون ہوں؟" ـــ میں نے پوچھا۔

"کہوں گی میرے ماموں کا بیٹا ہے" ـــ واجدہ نے جواب دیا ـــ "تم ان کی فکر نہ کرو.... صداقت تمہیں خط لکھتا رہا ہے؟"

"ہاں!" ـــ میں نے جواب دیا ـــ "تم نے اُسے جتنی باتیں بتائیں تھیں وہ اُس نے ساری کی ساری لکھ دی تھیں۔ اُس نے اپنی دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔ اب میں پانچ دنوں کی چھٹی پر گھر گیا تھا۔ صداقت نے ساری باتیں زبانی بھی سُنائی تھیں۔ یہ بتاؤ کیسے گزر رہی ہے؟"

"بس گزر رہی ہے" ـــ واجدہ نے کہا ـــ "یہاں ہمارا زیادہ دیر کھڑا رہنا ٹھیک نہیں۔ اس کے ساتھ میں نے کچھ شرطیں طے کر لی ہیں۔ عجیب آدمی ہے۔ کبھی تو میرے آگے غلاموں کی طرح جھک جاتا ہے اور کبھی بیٹھے بیٹھے غصے میں آ جاتا ہے۔ لیکن خانی! میں اس کے ساتھ ساری عمر تو نہیں گزار سکتی۔"

"وہ تو گزارنی پڑے گی" ـــ میں نے کہا ـــ "نہیں گزارنا چاہو گی تو کیا کرو گی؟"

"کچھ دیر میرے پاس بیٹھو خانی!" ـــ واجدہ نے کہا ـــ "تم مل گئے ہو تو مجھے نیا حوصلہ مل گیا ہے۔ میں تمہیں ساری باتیں سنانا چاہتی ہوں۔"

"سچ پوچھتی ہو واجو!" ـــ میں نے کہا ـــ "میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ تمہیں دل سے نہیں نکال سکتا۔ اس چھٹی پر گھر گیا تو ماں نے پہلی بات یہ کہی کہ اس سال کے اندر اندر تمہاری شادی کرنی ہے۔ میں شادی نہیں کروں گا واجو! تمہیں دل سے نکال کر میں کسی اور کو دل میں نہیں رکھ سکتا۔"

"یہی تو مشکل ہے خانی!" ـــ واجدہ نے کہا ـــ "لوگ شادی کو دلوں کا ملاپ سمجھتے ہیں۔ یہی حشر میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ میں اس خاوند سے طلاق لے سکتی ہوں چاہے

گھر والے مجھے قتل کر دیں۔ میں چاہوں تو اس خاوند کو زہر بھی دے سکتی ہے لیکن یہ بتاؤ خانی! پھر تم مجھے کس طرح ملو گے۔ یہ جو ذاتوں کا معاملہ ان لوگوں نے بنا رکھا ہے اس کا کیا بنے گا۔ میں نے تمہارے سامنے یہ بات کہ دی ہے۔"

"زہر دینے والی بات تو دماغ سے نکال دو" ــــ میں نے کہا ــــ "طلاق لینے کے متعلق سوچ لیں گے۔ اگر تم طلاق کے بعد گھر سے بھاگ آئیں تو میں تمہارے ساتھ نکاح پڑھوا لوں گا۔ پھر دیکھوں گا کون ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے.... اب یہ بتاؤ کہ ہماری ملاقات کس طرح ہو سکتی ہے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"ایک ہمت کر سکتے ہو؟" ــــ واجدہ نے کہا ــــ "پرسوں رات میرا خاوند ڈیوٹی پر ہوگا۔ اس کی ڈیوٹی آٹھ بجے شروع ہوتی ہے اور صبح پانچ چھ بجے ختم ہوتی ہے۔ آج اس کی پہلے ٹائم کی ڈیوٹی تھی اس لیے نو بجے آ جائے گا۔ پرسوں ساری رات ڈیوٹی پر ہوگا۔ یہ درمیان والی لمبی بارک دیکھ رہے ہو۔ ادھر سے تیسرا کوارٹر ہمارا ہے۔ رات کسی بھی وقت آ جانا۔ باہر والا دروازہ کھلا ہوگا۔"

"میں آؤں گا واجو!" ــــ میں نے کہا ــــ "رات نو ساڑھے نو بجے آ جاؤں گا۔"

واجدہ نے جنگلے کو پکڑا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ پھر وہ عورتوں کی طرف چلی گئی اور میں وہاں سے ہٹ آیا۔

میں نے اپنے دوست حمید کو بتایا۔ وہ تو اچھل پڑا۔ حمید غیر معمولی طور پر بلکہ غیر قدرتی طور پر دلیر جوان تھا۔ یاری دوستی میں اتنا وفادار کہ دوست کی خاطر آگ میں بھی کود جاتا۔

"میری بات کو سچ مانو خانی!" ــــ حمید نے کہا ــــ "تمہارا اور واجو کا ملاپ اللہ کو منظور ہے۔ نہ ہوتا تو وہ تمہیں یہاں نہ ملتی۔ تمہیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ تمہارے اتنی قریب رہتی ہے۔ تم اللہ کے اشارے پر ادھر چلے گئے تھے اور وہ تمہیں نظر آ گئی اور اس کے ساتھ تمہاری باتیں بھی ہو گئیں۔"

"اتنے صوفی اور ولی نہ بنو یار!" ــــ میں نے کہا ــــ "مجھے یہ بتاؤ کہ میں پرسوں رات اس کے ہاں جاؤں یا اس خطرے میں نہ پڑوں؟"

"تم جاؤ" ــــ اس نے کہا ــــ "اور اس خطرے میں پڑو۔ وہ یہ نہ کہے کہ جس سے دل لگایا تھا وہ بزدل نکلا.... اور یہ بھی سن لو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں گا۔ تم اس

کے کوارٹر میں چلے جاؤ گے تو میں قریب ہی کہیں چھپ کر دیکھتا رہوں گا۔ تم کسی مصیبت میں پھنس گئے تو مدد کو پہنچوں گا۔"

عام شہری اس خطرے کو نہیں سمجھ سکتے جو میں مول لے رہا تھا۔ رات کے وقت کسی دوسری بٹالین کے علاقے میں داخل ہونا اور داخل بھی فیملی کوارٹروں کے علاقے میں ہونا اتنا بڑا جرم تھا کہ کورٹ مارشل ہو سکتا تھا۔ جس میں سروس سے تو ڈسمس ہونا ہی تھا، جیل بھی جانا پڑتا۔ پھر بھی میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اگلے روز شام سے کچھ دیر پہلے میں اور حمید ادھر گئے۔ سامنے سڑک تھی۔ ادھر گیٹ تھا۔ وہاں ہر وقت سنتری موجود رہتا تھا۔ چونکہ یہ سگنل بٹالین تھی اس لیے اس کے بارکوں اور دفتروں کے علاقے کے اردگرد لوہے کے کھڑے پائپوں کا جنگلہ تھا۔ ایک گیٹ پیچھے کی طرف تھا۔ وہاں بھی چوبیس گھنٹے سنتری موجود رہتا تھا۔ سنتری کسی کو اندر جانے سے روکتے تو نہیں تھے لیکن یہ بتانا پڑتا تھا کہ کس سے ملنا ہے۔ جنگ لگی ہوئی تھی۔ ہندوستان میں جرمنی اور جاپان کے جاسوس موجود تھے جو جرمنی اور جاپان کے باشندے نہیں بلکہ ہندوستانی تھے۔ اس لیے ہر آنے اور اندر جانے والے کو چیک کیا جاتا تھا۔ یہ سگنل بٹالین تھی جہاں پیغام آتے جاتے رہتے تھے اس لیے وہاں چیکنگ زیادہ سخت تھی۔

ہم نے فیملی کوارٹروں کے ایک پہلو میں جنگلہ دیکھا۔ ایک جگہ سے دو پائپ نکلے ہوئے تھے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہاں سے گزرنے کا رستہ خود ہی بنا لیا گیا ہے۔

"یہ رستہ ٹھیک ہے" ــــ حمید نے کہا ــــ "رات کو ادھر اندھیرا بھی ہوتا ہوگا اور وہ کوارٹر بھی دور نہیں۔"

ہم واپس اپنی بارکوں میں چلے گئے۔

وہ رات آ گئی۔ میں اور حمید نو بجے چل پڑے۔ تھوڑا سا تو فاصلہ تھا۔ ایک ڈر یہ تھا کہ آصف کسی وجہ سے گھر ہی نہ ہو، وہ بیمار ہو سکتا ہے، ڈیوٹی بدل بھی سکتی ہے۔

"مت ڈرو یار!" ــــ حمید نے کہا ــــ "سیدھے اندر نہ چلے جانا۔ دروازے پر آہستہ سے دستک دینا۔ اگر دروازے میں درز نہ ہوئی تو اس میں سے اندر دیکھ لینا۔ اگر وہ آتا نظر آیا تو بھاگ آنا۔"

یہ کوئی دانشمندی والا مشورہ نہیں تھا۔ میں نے واجدہ کے پاس جانا ہی تھا۔

اُس نے میری خاطر گھر والوں سے مار کھائی تھی۔ اپنی ازدواجی زندگی میں زہر گھول لیا تھا۔ اُس نے اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کی تھی۔ اُس نے مجھ سے محبت کی تھی اور مردوں کی طرح کہا تھا کہ وہ میرے سوا کسی کو قبول نہیں کرے گی۔

اب اس نے مجھے بُلایا تھا۔ میں مرد ہو کر کیسے کہہ دیتا کہ میں اُس کے گھر آنے سے ڈرتا ہوں۔

ہم دونوں اُس جگہ پہنچے جہاں سے جنگلے میں سے کسی نے دو پائپ نکال کر رستہ بنایا ہوا تھا۔ میں نے حمید سے کہا کہ وہ یہیں ٹھہرے لیکن اُس نے جنگلے کے اندر ایک درخت دیکھ لیا تھا۔ یہ پیپل کا درخت تھا جس کا تنا بہت چوڑا تھا۔ سڑک کی بتی دُور تھی۔ حمید تنے کی اندھیری طرف کھڑا ہو گیا۔ وہاں سے اُسے واجدہ کا کوارٹر نظر آتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ سب ایک ایک کمرے کے کوارٹر ہیں۔

میں تیسرے کوارٹر سے چار پانچ قدم دُور تھا کہ دروازے سے ایک سر باہر نکلا۔ میں نے اندھیرے میں بھی پہچان لیا کہ یہ واجدہ ہے۔ میں اس کے قریب گیا تو اُس نے دروازہ کھول دیا اور ہمارے علاقے کے رواج کے مطابق "بسم اللہ، بسم اللہ" کہہ کر میرا استقبال کیا۔ میں اندر گیا تو اس نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔

چھوٹا سا صحن تھا، ذرہ جتنا برآمدہ تھا اور تنگ سا ایک کمرہ تھا۔ سپاہی سے حوالدار تک کو ایسے ہی کوارٹر دیے جاتے تھے۔ انگریز بادشاہ ہندوستانیوں کو اسی قابل سمجھتا تھا۔ کتے کے ڈربے جیسے فیملی کوارٹر بنا دیے تھے۔ بعض پُرانے فوجیوں اور حوالداروں کے چار چار پانچ پانچ بچے ہوتے تھے۔ اتنی بڑی فیملی کو بھی یہی ڈربے جیسے ایک کمرے کا کوارٹر دیا جاتا تھا۔

واجدہ نے مجھے اندر لے جا کر چارپائی پر بٹھایا اور میرے پاس بیٹھ گئی۔ ہم دونوں کے ضمیر پر ایسا بوجھ نہیں تھا کہ ہمارے تعلقات ناجائز تھے۔ ہماری محبت روحوں کا ملاپ تھا۔ البتہ اُس گناہ کا مجھے احساس تھا کہ میں ایک شادی شدہ عورت کے پاس اُس کے خاوند کی غیر حاضری میں بیٹھا ہوا تھا لیکن جوانی میں اتنی گہرائی میں کون سوچتا ہے۔

ذرا سی دیر میں ہم دونوں بھول ہی گئے کہ ہم کہاں بیٹھے ہیں۔ مجھے آج بھی وہ وقت اُس طرح یاد ہے جیسے کل پرسوں ہم اُس کوارٹر میں اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔ دل سے سب خوف اور خطرے نکل گئے تھے۔ واجدہ مجھے اپنی ازدواجی زندگی کی داستان سُنا رہی تھی۔ کبھی اُس کے آنسو نکل آتے اور کبھی وہ مسکرانے لگتی۔ اُس نے

وہی باتیں سُنائیں جو صداقت مجھے لکھ چکا تھا۔

"میں تمہیں ایک بات بتا دوں خانی!" ___ واجدہ نے کہا ___ "میں نے اسے تمہارا بتا دیا تھا۔ یہ شخص میرے زیر ہو گیا اور میری باتیں ماننے لگا تو میں نے اس کے ساتھ اپنا رویہ نرم کر لیا۔ ایک روز یہ میرے پیچھے پڑ گیا کہ بتاؤ تم کسے چاہتی ہو۔ میں ٹالتی رہی۔ اُس نے مِنّت سماجت کے لہجے میں پوچھا تو میں نے اسے تمہارا نام بتا دیا اور ساتھ یہ کہا کہ یہ نہ سمجھنا کہ میرے اُس کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے۔ وہ میرا استاد ہے اس لیے میرے دل میں اُس کا احترام ہے اور ہماری جو محبت ہے وہ آسمان پر چمکنے والے ستاروں کی طرح پاک اور شفاف ہے۔"

"وہ تو مجھے جانتا ہے" ___ میں نے کہا ___ "کبھی اُس سے میرا آمنا سامنا ہو گیا تو وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟"

"وہ جیسا بھی سلوک کرے" ___ واجدہ نے کہا ___ "تم اُس کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ اگر تمہارے ساتھ رعب یا دبدبے کی بات کرے اور زیادہ بدتمیزی کرے تو میری طرف سے اجازت ہے۔ جو بہتر سمجھو وہ کرنا۔ ہوسکتا ہے تمہارے ساتھ بک بک کرے۔ یہ کہتا تھا خانی تو چھوٹی ذات کا آدمی ہے .... میں نے اسے کہا تھا کہ ہم اونچی ذاتوں والوں میں نیچ پن ہوتا ہے کہ خانی کی ذات ہم سے پیچھے ہے لیکن وہ بہت اونچا آدمی ہے۔"

"اب یہ بتاؤ کہ ہم کریں گے کیا؟" ___ میں نے پوچھا ___ "تم نے سوچا کیا ہے؟ اس کے ساتھ بنا کر رکھو یا اِدھر اُدھر ہو جاؤ۔"

"جب دل ہی کہیں اور ہو تو بنا کر کیسے رکھوں؟" ___ واجدہ نے کہا ___ "یہ خدا کی ذات نے مجھ پر رحم کیا ہے کہ اس اکھڑ آدمی کو میرے آگے جھکا دیا ہے۔ باقی رہا اِدھر اُدھر کا معاملہ، یہ فیصلہ تم کرو گے۔"

"میں وہی ہوں جو پہلے تھا" ___ میں نے کہا ___ "میں نے تمہیں کہہ دیا ہے کہ میں شادی نہیں کروں گا۔ میرے گھر میں تم آؤ گی یا کوئی نہیں آئے گا۔"

⬇

دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم دونوں چونک اُٹھے۔

"یہ کون ہے؟" ___ واجدہ نے پوچھا۔

"میرا دوست ہوگا" ___ میں نے کہا ___ "وہ میرے ساتھ آیا ہے۔ جنگلے کے قریب پیپل کے نیچے کھڑا ہے۔"

دستک پھر ہوئی۔

"آصف ہی نہ ہو"—— واجدہ نے کہا۔—— "تم اس چارپائی کے نیچے ہو جاؤ۔ و ہُوا تو جلدی چلا جائے گا۔"

مَیں چارپائی کے نیچے ہو گیا۔ واجدہ نے چارپائی پر بچھی چادر کو اور نیچے کر دیا۔ دوسری طرف سے چارپائی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ واجدہ دروازہ کھولنے چلی گئی

وہ واجدہ کا خاوند آصف تھا۔ کہتا آ رہا تھا کہ تم شاید گہری نیند سو گئی تھیں۔ مَیں نے دو تین دفعہ دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ واجدہ یہ کہتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی، میری آ ایسی آنکھ لگی کہ ہوش ہی نہ رہا۔

"ڈیوٹی ہو گئی؟"—— واجدہ نے پوچھا۔

"ہو کہاں گئی"—— آصف نے کہا —— "ساری رات کی ڈیوٹی ہے۔ تمہیں دیکھ آ گیا ہوں۔"

وہ بڑے اچھے موڈ میں تھا بلکہ رومانی موڈ میں۔

"کچھ دیر رکو گے نا!"—— واجدہ نے پیار سے پوچھا۔

"تھوڑی دیر!"—— آصف نے کہا —— "پہلے کبھی میں ڈیوٹی چھوڑ کر نہیں آیا۔ آج معلوم نہیں کیا ہُوا کہ اچانک دل گھبرانے لگا اور پھر اس طرح محسوس ہونے لگ جیسے کوئی بہت بُری خبر آ رہی ہے یا کچھ ہونے والا ہے۔ بار بار خیال تمہاری طرف ج تھا۔ پہلے بھی مَیں تمہیں اکیلا چھوڑ جایا کرتا تھا لیکن آج معلوم نہیں کیوں مجھے وہم ہو گیا کہ تم خیریت سے نہیں ہو۔"

دونوں اُسی چارپائی پر بیٹھ گئے جس کے نیچے میں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چھپا ہُوا تھا اور مَیں سوچ رہا تھا کہ آصف نے مجھے دیکھ لیا تو وہ کیا کرے گا اور مَیں کیا کروں گا۔ اُس نے یہ تو ضرور ہی کرنا تھا کہ واجدہ کو اُس نے گھر سے نکال د تھا اور مجھے جان سے مار دینا تھا۔

مَیں یہی سوچتا رہا اور آصف رومانی اور جذباتی حرکتیں کرتا رہا۔ وہ آخر میاں بیوی تھے۔ میں اُس لااُبالی عمر میں تو کچھ نہیں سمجھ سکا تھا۔ آج اس بڑھاپے میں جب زندگی کے تجربات، واقعات اور حالات نے دماغ کو پختہ کر دیا ہے، اُس وقت کی ہر بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ میں آصف کی غیر حاضری میں واجدہ کے پاس جا بیٹھا تو آصف نے اپنے دل میں گھبراہٹ محسوس کی اور اُس پر بے چینی کی ایسی کیفیت طا

ہو گئی کہ وہ ڈیوٹی چھوڑ کر واجدہ کے پاس دوڑ آیا۔ یہ ایک صاف علامت تھی یا ثبوت تھا کہ آصف کے دل میں اور روح میں واجدہ کی محبّت بڑی گہری اُتری ہوئی تھی۔ ایک غیر مرد واجدہ کے پاس جا بیٹھا تو آصف کا دل بے چین ہو گیا۔

اسے ٹیلی پیتھی کہہ لیں، روحانی تعلق کہہ لیں، یہ حقیقت ہے کہ انسانوں کا آپس میں غائبانہ تعلق ہوتا ہے۔

"واجو!"—— آصف واجدہ سے کہہ رہا تھا —— "میری محبّت کا اندازہ کرو۔ دل نے بے چین ہو کر مجھے مجبور کر دیا کہ اُڑ کر تم تک پہنچوں۔ تمہیں دیکھ لیا ہے کہ تم ٹھیک ٹھاک ہو تو دل کو سکون آ گیا ہے، اور تم ایسی پتھر دل ہو کہ ...."

"مَیں تمہاری کونسی ضرورت پوری نہیں کرتی!"—— واجدہ نے بڑے ہی پیارے لہجے میں کہا —— "مَیں پتھر دل نہیں ہوں۔ یہ سمجھ لو کہ مَیں نے دل پر پتھر رکھا ہُوا ہے لیکن تمہیں ناراض نہیں کروں گی .... تم ڈیوٹی پر پہنچو۔ یہ باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی افسر راؤنڈ پہ آ جائے۔"

جا رہا ہوں واجو!"—— آصف نے کہا۔

میں چارپائی کے نیچے پیچ و تاب کھا رہا تھا اور چارپائی پر محبّت کا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ ایک بار تو میں بے قابو ہو چلا تھا۔ میری ذہنی اور جذباتی کیفیت اُس بچے جیسی تھی جس کے کھلونے کے ساتھ کوئی اور بچہ کھیل رہا ہو۔

بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا ورنہ میں اس ارادے سے چارپائی کے نیچے سے نکلنے لگا تھا کہ آصف کا گلا گھونٹ دوں گا اور واجدہ کو ساتھ لے کر کہیں بھاگ جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے کرم کیا کہ مجھے یہ سوچ آ گئی کہ مَیں فوراً پکڑا جاؤں گا۔ مَیں تو سزائے موت خوشی سے قبول کر لوں گا لیکن واجدہ بے گناہ ماری جائے گی اور اس کی رسوائی الگ ہو گی۔

اتنے میں آصف جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ چارپائی کے نیچے سے مجھے دونوں کی ٹانگیں نظر آ رہی تھیں جو مجھ سے صرف ایک قدم دُور تھیں۔ آصف وردی میں تھا۔ اُس نے فوجی بوٹ پہن رکھے تھے۔ واجدہ اُس کے ساتھ دروازے تک گئی۔

مجھے خیال آتا ہے کہ کمزور سی عورت ایک بڑے ہی طاقتور آدمی کی کتنی بڑی کمزوری بن جاتی ہے۔ آصف بزدل اور بے غیرت خاندان کا آدمی نہیں تھا۔ اس خاندان کے

مردوں نے کسی وقت اپنے ایک دشمن خاندان کے ساتھ کھلی لڑائی میں دو آدمی قتل کیے اور اپنا ایک آدمی پھانسی چڑھوایا تھا۔ ان کے گاؤں میں اردگرد کے علاقے میں اس خاندان کا رعب چلتا تھا۔ آصف بھی جوانمرد اور لٹھ باز تھا لیکن یہ آصف واجدہ کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔

اگر واجدہ آصف سے غصے اور احتجاج والا رویہ اختیار کرتی اور اکھڑپن دکھاتی تو آصف اُسے دن کو تارے دکھا دیتا۔ اس کی بجائے واجدہ نے اسے پیار اور اپنے حسن کی مار دی اور اس کے سامنے ایک رقیب کھڑا کر دیا۔ اُس کے اشاروں پر چلنے لگی اور ساتھ اُسے یہ کہہ دیا کہ اُسے اس سے محبت نہیں اور وہ مجھے چاہتی ہے۔

میں چارپائی کے نیچے چھپا ہُوا تھا۔ میں اپنے اوپر ان دونوں کی بات سن رہا تھا اور ان کی حرکتیں محسوس کر رہا تھا۔ میں نے پہلی بار واجدہ کی باتیں سنیں اور آصف کے ساتھ اس کا برتاؤ دیکھا۔ میں حیران ہُوا کہ اس لڑکی میں اتنی عقل ہے۔ وہ فریب کار اور چالاک نہیں تھی۔ بڑی کھری اور سچ بولنے والی لڑکی تھی۔

آصف کو رخصت کر کے اور دروازے کی چٹخنی چڑھا کر وہ اندر آئی۔

"کچھ دیر وہیں رہو" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "اُسے اپنی ڈیوٹی والی جگہ تک پہنچ لینے دو۔"

تھوڑی دیر بعد اُس نے مجھے باہر آنے کو کہا۔ میں چارپائی کے نیچے سے نکلا۔

"دیکھا خانی!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "میں نے کس طرح دل پر پتھر رکھ کر اس شخص کو خاوند بنا رکھا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ میں یہ کب تک برداشت کروں گی۔ میں نے اسے فریب سے رام کیا ہُوا ہے۔ اسے میں گناہ سمجھتی ہوں۔ کوئی راستہ نکالو خانی!"

اُس وقت میرے جذبات دہکتے انگارے بنے ہوئے تھے۔ میری سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔

"مجھے ایک ہی رستہ نظر آتا ہے واجو!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "میں اپنے دوست حمید کو ساتھ ملا کر اسے یہیں قتل کر سکتا ہوں۔ ہم ایسا طریقہ سوچ لیں گے جس سے قاتل کا سُراغ نہیں ملے گا۔ تم اپنے گھر چلی جاؤ گی، پھر تم میرے ساتھ بھاگ آنا۔ نکاح پڑھا لیں گے۔ تمہارا باپ ہمارے خلاف انتقامی کارروائی کرنا چاہے گا تو میں ڈپٹی کمشنر کو درخواست دے کر اُس کا منہ بند کرا دوں گا۔"

"چاہتی تو میں بھی یہی ہوں" ـــــ واجدہ نے کہا ـــــ "لیکن ڈر صرف یہ ہے کہ تم

پکڑے جاؤ گے۔"

"ہم اندھا دُھند کچھ نہیں کریں گے" ـــــ میں نے کہا ـــــ "اچھی طرح سوچ سمجھ کر کریں گے۔ میں تمہیں پہلے بتا دوں گا.... اب مجھے جانا چاہیے۔"

ہم نے اگلی ملاقات اس طرح طے کی کہ میں دس دنوں بعد فلاں دن چار بجے کے لگ بھگ جنگلے کے باہر سڑک سے گزروں گا اور واجدہ مجھے بتا دے گی کہ آصف کی رات کی ڈیوٹی کس روز ہو گی۔

میں وہاں سے نکل آیا۔ دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ حمید پیپل کی اوٹ میں بیٹھا ہُوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُٹھا۔

"کوارٹر میں کون آیا تھا؟" ـــــ اُس نے پوچھا ـــــ "اُس کا خاوند تو نہیں تھا؟"

"وہی تھا یار!" ـــــ میں نے اُسے ساتھ لے کر چلتے ہوئے کہا ـــــ "واجو نے مجھے چارپائی کے نیچے چھپا دیا تھا۔"

"میں نے دیکھا تھا وہ جلدی چلا گیا تھا" ـــــ حمید نے کہا ـــــ "لیکن میں تو پریشان ہو گیا تھا۔ میں تو سمجھ بیٹھا تھا کہ وہ اچانک آ گیا تھا اور تم دونوں کو قتل کر کے چلا گیا ہے۔ یار، مجھے تو ایک اور خطرہ بھی نظر آنے لگا تھا۔ میں نے سوچا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ واجو نے تمہیں دھوکے میں گھر بلا کر مروا دیا ہے۔ میں تین بار کوارٹر کے دروازے تک گیا اور کان کوارٹر سے لگائے۔ ایک بار تو میں دروازہ کھٹکھٹانے لگا تھا لیکن اندر سے دھیمی سی آواز آئی۔ یہ شاید تمہاری آواز تھی۔ اس سے مجھے ذرا تسلی ہوئی اور میں واپس آ کر بیٹھ گیا۔ لیکن میری بے چینی تمہیں دیکھ کر ختم ہوئی ہے۔"

یہ تھی اُس وقت کی دوستی۔ دوست دوستوں پر جانیں قربان کرتے تھے۔



آج کی فوج اُس وقت کی فوج سے بہت مختلف ہے۔ اُس زمانے میں سپاہی اَن پڑھ ہوتے تھے اور ہر سپاہی کی اتنی سی اہمیت ہوتی تھی کہ وہ سپاہی ہے، حکم کا پابند جس کی اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی۔ بعض سپاہی دماغی لحاظ سے اچھے نکل آتے تھے، بات چیت اچھے اور پُراثر انداز سے کر لیتے تھے اور اچھے بُرے کی تمیز رکھتے تھے۔ ایسے ہی سپاہی ترقی کرتے اور عہدے حاصل کرتے تھے۔

حمید ایسے ہی سپاہیوں میں سے تھا۔ جسمانی لحاظ سے سمارٹ اور دماغی لحاظ سے چُست اور چالاک۔ جرأت سے بات کرتا اور عہدیداروں وغیرہ پر اپنا اثر پیدا کر لیتا تھا۔

ایسی ہی کچھ خوبیوں کی بدولت وہ اپنے پلاٹون حوالدار اور کمپنی کے حوالدار میجر کا منظورِ نظر بن گیا تھا۔ اتفاق سے یہ دونوں عہدیدار ہمارے ہی علاقے کے تھے۔

میں حوالدار کلرک تھا اور میں ہیڈ کوارٹر کمپنی میں تھا۔ کلرکوں کو پلٹن میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اللہ نے مجھے بھی کچھ خوبیاں اور کچھ جوہر عطا کیے تھے جن میں ایک یہ تھا کہ میں خوش طبع اور زندہ دل تھا اور میں ہر بات مزاحیہ انداز میں کیا کرتا تھا۔ ان اوصاف نے مجھے ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔

ہماری بٹالین میں ایک نائیک اور اس کی ایک واردات بہت مشہور تھی۔ یہ دو اڑھائی سال پہلے کا واقعہ تھا۔ اُس وقت بٹالین جالندھر چھاؤنی میں تھی۔ یہ نائیک جالندھر سے بیس میل دُور ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اُس کی کسی کے ساتھ خاندانی دشمنی تھی۔ دشمن خاندان میں ایک آدمی فتنہ اور فساد کی اصل جڑ تھا۔ بعض لوگوں کو فتنہ و فساد میں لطف آتا ہے۔

یہ نائک اس آدمی کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ اس آدمی نے نائک کے خاندان کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ نائیک اپنے کمپنی صوبیدار کا خاص آدمی تھا۔ اُس نے کمپنی صوبیدار کو اپنا ارادہ بتایا۔ صوبیدار نے اُسے قتل کا پلان بتا دیا۔ ایک شام گنتی کے بعد نائک ایک لمبا چاقو لے کر چلا گیا۔ رات کو اُس نے اپنے دشمن کے گھر پہنچ کر اُسے آواز دی۔ وہ سویا ہُوا تھا۔ جاگ کر باہر آیا۔ نائک نے اُس کے سینے اور پیٹ میں چاقو مارے اور بھاگ آیا۔

وہ شخص فوراً مرا نہیں۔ اُس نے گھر والوں کو آوازیں دیں۔ سب باہر آئے تو اُس نے نائک کا نام لے کر بتایا کہ وہ اُسے مار گیا ہے۔ اُسے اُٹھا کر تھانے لے گئے۔ وہاں تک وہ زندہ رہا۔ تھانیدار کو بیان دے کر مرا۔

نائک کو معلوم تھا کہ رات ایک پسنجر ٹرین جالندھر کو جاتی ہے۔ سٹیشن چار میل دُور تھا۔ نائک گاڑی کے وقت پر پہنچ گیا اور اس گاڑی نے اُسے جالندھر پہنچا دیا۔ وہ اپنی بیرک میں گیا اور کپڑے بدل کر سو گیا۔ تھانیدار اُس کی گرفتاری کے لیے اُس کے گاؤں گیا۔ اُس کے گھر پر چھاپہ مارا۔ گھر والوں نے کہا کہ وہ گھر آیا ہی نہیں۔ گاؤں کے کسی بھی مرد، عورت یا بچے نے نہیں کہا کہ وہ گاؤں میں دیکھا گیا تھا۔

تھانیدار جالندھر چھاؤنی نائک کی گرفتاری کے لیے بٹالین کے صوبیدار میجر سے ملا اور انگریز کمانڈنگ آفیسر سے ملا اور اُسے بتایا کہ فلاں نائک ایک آدمی کو قتل کر آیا ہے۔ کمپنی صوبیدار اور نائک کو بلایا گیا۔ نائک نے حیران ہو کر کہا کہ میں تو رات

دس بجے تک صوبیدار صاحب کے حکم سے فلاں کام کرتا رہا ہوں۔ صوبیدار نے اس کے بیان کی تائید کی۔ بیرک میں اُس کے ساتھ رہنے والے جوانوں کو بلایا گیا۔ سب نے کہا کہ یہ تو صوبیدار صاحب کا بتایا ہُوا کام کر کے سو گیا تھا اور صبح اپنے بستر سے اُٹھا تھا۔

کمانڈنگ آفیسر نے تھانیدار کو چلتا کیا اور قتل ہضم ہو گیا۔



"خانی بھائی!" —— ایک روز حمید میرے پاس آیا اور کہنے لگا —— "میں اس نائک سے ملا ہوں اور اُس سے پوری واردات سنی ہے۔ اب ذرا تم میری بات پر غور کرو اور مجھے مشورہ دو.... میں نے اُس شاہ جی کے ساتھ حساب برابر کرنا ہے۔ اُس نے مجھے دھوکے میں اپنے گھر بلایا اور اپنے دو بدمعاشوں سے مجھ پر حملہ کروایا تھا۔ میں ٹریننگ سنٹر سے پانچ دنوں کی چھٹی گھر گیا تھا تو عائشہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ابھی تک اُس کے ہاتھ نہیں آئی اور شاہ جی اُس کے ماں باپ کو پریشان کرتا رہتا ہے۔ اب اُس نے عائشہ کو دھمکی دی تھی کہ وہ اُسے اپنے بدمعاشوں سے اغوا کرا لے گا۔"

"تمہارا ارادہ کیا ہے؟" —— میں نے اُس سے پوچھا —— "کیا تم اس نائک جیسی واردات کرنا چاہتے ہو؟"

"نہیں!" —— اُس نے جواب دیا —— "میں شاہ کو قتل نہیں کروں گا۔ اس کے ساتھ کوئی اور سلوک کروں گا۔"

"تم نے خود بھی تو کچھ سوچا ہو گا" —— میں نے کہا —— "اکیلے جاؤ گے؟"

"نہیں!" —— اُس نے کہا —— "تم میرا ساتھ دو گے۔ میں نے جو سوچا ہے وہ بتاتا ہوں۔ پہلے یہ بتاؤ میرا ساتھ دو گے؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے یار!" —— میں نے کہا —— "میں نے تمہیں بھائی بنایا ہے۔"

"پھر کام ہو گیا" —— اُس نے کہا —— "شام گنتی کے بعد یہاں سے نکل جائیں گے۔ بس مل جائے گی۔ تمہارے شہر (قصبے) میں اُتریں گے۔ وہاں سے میرا گاؤں سات آٹھ میل دُور ہے، پیدل چلیں گے۔ شاہ کے گھر تک جائیں گے۔ باہر والی دیوار پر چڑھنا اور اندر اُترنا کوئی مشکل نہیں۔ شاہ کو جگا کر باہر لے آئیں گے۔ مار پٹائی کریں گے۔ اُس کے کپڑے اُتار کر گھر سے دور درخت کے ساتھ باندھ دیں گے اور واپس آ جائیں گے۔ رات دو بجے ریل گاڑی تمہارے سٹیشن سے گزرتی ہے۔ یہ گاڑی ہمیں ڈیڑھ گھنٹے میں

واپس لے آئے گی۔"

"یار! یہ نہ سمجھ لینا کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دینا چاہتا" ـــــ میں نے کہا ـــــ "اصل بات یہ ہے کہ یہ واردات اتنی آسان نہیں جتنی تم سمجھ رہے ہو۔ یہ سوچو کہ شاہ گھر میں اکیلا نہیں ہوگا۔ اس کی بیوی اور بچوں کا تو ڈر نہیں، ہو سکتا ہے اُس نے ایک دو بدمعاش ڈیوڑھی میں سلائے ہوئے ہوں۔"

"ہاں خانی!" ـــــ حمید نے کہا ـــــ "بدمعاشوں کی تو میں نے سوچی ہی نہیں اور نہ ہی سوچوں گا۔ ایک اور خطرہ یاد آگیا۔ شاہ کا رکھوالی والا کتا مشہور ہے۔ میں نے یہ کتا دیکھا ہے۔ بوہلی نسل کا خونخوار کتا ہے۔ شاہ رات کو اسے کھول دیتا ہے اور یہ کتا کسی کو مکان کے قریب سے گزرنے ہی نہیں دیتا" ـــــ حمید سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد بولا ـــــ "اس کا بندوبست ہو جائے گا۔"

جوانی میں دماغ میرا بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میری فطرت ایڈونچر کو بہت پسند کرتی تھی جسے اُردو میں شاید مہم جوئی کہتے ہیں لیکن اللہ نے عقل بھی عطا کی تھی۔ اندھیرے میں جانے سے پہلے میں سوچ لیا کرتا تھا کہ اندھیرے میں کیا ہے۔ مطلب یہ کہ میں کوئی کارروائی اندھا دھند نہیں کیا کرتا تھا۔

میں نے حمید سے کہا کہ میں اُس کا ساتھ دوں گا لیکن ہر خطرے کا پہلے بندوبست کر کے چلیں گے۔



انگریزوں کی حکومت میں جنگِ عظیم سے پہلے فوج میں سپاہی کو بھی ٹھونک بجا کر بھرتی کیا جاتا تھا۔ چند ایک ذاتوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ بھرتی ہونے والے کے گاؤں کے نمبردار سے اور اُس علاقے کے تھانے سے چال چلن اور ذات کی تصدیق کرائی جاتی تھی۔ جسمانی صحت اور قد وغیرہ کا بڑا سخت معیار تھا۔ اگر معیار نہیں تھا تو تعلیم کا نہیں تھا۔ سپاہی کورے اَن پڑھ ہوتے تھے۔ انہیں فوجی روبوٹ (مشینی انسان) بنا دیا جاتا تھا، پھر ان سپاہیوں کی سوچیں بھی فوجی بن جاتی تھیں۔ وہ انگریز کو بادشاہ، اَن داتا اور "خدا" سمجھنے لگتے تھے۔

جنگِ عظیم شروع ہوئی تو انگریز کی بادشاہی تباہ و برباد ہونے لگی۔ اِدھر جاپانی فوجوں نے سنگاپور، ملایا اور برما پر قبضہ کر لیا اور ہندوستان خطرے میں آگیا۔ جنگ سے پہلے کے تندرست و توانا جوان محاذوں پر مارے گئے یا جاپانیوں نے

ٹھوک کے حساب سے جنگی قیدی بنا لیے۔ انگریزوں نے بھرتی کے تمام معیار نظرانداز کر دیے اور جو آیا اُسے بھرتی کر لیا۔ نہ قد دیکھا نہ چھاتی اور نہ صحت دیکھی۔ میری بٹالین میں دو نئے سپاہی ٹریننگ کر کے آئے۔ ایک میں یہ نقص تھا کہ وہ چلتا تھا تو اُس کے ٹخنے آپس میں ٹکراتے تھے اور دوسرے کے گھٹنے ٹکراتے تھے۔ دُبلے، لاغر اور مریل سے جوانوں کو بھی بھرتی کیا جا رہا تھا۔

اس بھرتی کو بڑا موزوں نام دیا گیا تھا ـــــ GUN FODDER ـــــ جس کے لفظی معنی ہیں، توپوں کا چارہ، توپوں کو کھلانے کے لیے ہرے پتے۔ مطلب یہ کہ اس قسم کی غیر معیاری بھرتی کا استعمال یہ تھا کہ دشمن کی توپوں کا نشانہ بنے گی اور دشمن کا ایمونیشن ضائع ہوگا۔ اور اس کی پیشقدمی کی رفتار تیز نہیں ہو سکے گی۔

یہ تو جسمانی لحاظ سے کمزور اور ناقص جوان تھے۔ ایسے جوان بھی بھرتی کر لیے گئے تھے جو اخلاقی لحاظ سے ناقص تھے۔ ان میں ایسے جوان بھی تھے جو پولیس کو مطلوب تھے، وہ چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں کر کے آئے تھے۔ ہماری بٹالین کی سکھ کمپنی میں ایک سکھ سپاہی دو آبے (مشرقی پنجاب) کے علاقے کے بڑے مشہور ڈاکو اُتم سنگھ عرف اُتو کا بالکا تھا۔ ڈاکہ زنی کی ایک واردات میں مطلوب تھا۔ وہ بھاگ کر بھرتی ہو گیا تھا۔

ان جرائم پیشہ جوانوں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ ان میں دو تین نے بڑی دلچسپ بات سنائی تھی۔ کسی بڑے گھر میں ڈاکہ زنی یا نقب زنی کی واردات کرنی ہو اور وہاں رکھوالی والا خونخوار کتا ہو تو ڈاکو اس کو اس طرح قابو میں لاتے ہیں کہ بھینس یا بیل کا سینگ کسی مردار سے کاٹ لاتے ہیں۔ خشک سینگ کہیں نہ کہیں سے مل ہی جاتا ہے۔ اس میں گوشت یا قیمہ بھر کر ساتھ لے جاتے ہیں۔ جس مکان میں واردات کرنی ہو، اس کے قریب جا کر سینگ کتے کے آگے پھینک دیتے ہیں۔ کتا سینگ میں سے گوشت نکالنے میں مگن ہو جاتا ہے۔ سینگ میں سے گوشت یا قیمہ نکلتا نہیں اور کتا اسے چھوڑتا بھی نہیں۔ ڈاکو بڑے آرام سے اپنا کام کر جاتے ہیں۔

اُتم سنگھ اُتو کے بالکے نے بتایا کہ سینگ نہ ملے تو بانس کا ایک یا ڈیڑھ فٹ لمبا ٹکڑا لے لو۔ بانس اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے۔ اس کا ایک سرا بند کر دو اور اس میں گوشت یا چھیچھڑے اس طرح دبا کر بھر دو کہ آسانی سے نکل نہ سکیں۔ یہ کتے کے آگے پھینک دو تو کتا دنیا جہان کو بھول کر بانس سے گوشت نکالنے میں لگ جاتا ہے، بانس کو اُچھالتا ہے اور اُسے کوئی زندہ چیز سمجھ کر اس سے لڑتا ہے.... اُتو کہتا تھا

کہ اُس نے اِس طرح ڈکیتی کی دو وارداتیں کی تھیں۔
حمید کا تو یہ عالم تھا کہ یہ طریقہ معلوم ہو جانے پر خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا۔ اُس نے شاہ جی سے انتقام لینے کا بڑا ہی پکا ارادہ کر چکا تھا۔ مَیں خود بھی ان پیروں اور عاملوں اور شاہ صاحبوں سے بدظن ہو چکا تھا۔ اِس کا ذریعہ عائشہ بنی تھی۔ حمید اور اُس کے گاؤں کے شاہ جی کی دُشمنی کی وجہ بھی عائشہ ہی بنی تھی۔



ایک دو دن ہی گزرے تھے کہ حمید نے مجھے بانس کا ایک ٹکڑا دکھایا جو ایک فٹ سے کچھ زیادہ تھا۔ اِس کا منہ دو انچ سے ذرا زیادہ کُھلا تھا۔ اِس کے علاوہ اُس نے مجھے ادوائین کی رسّی دکھائی۔
"ایک چاقو میرے پاس ہے" ——— اُس نے کہا ——— "اپنے لیے چاقو کا بندوبست تم خود کرو۔ بید کی دو چھڑیاں مل گئی ہیں۔"
"تم کرنا کیا چاہتے ہو؟" ——— مَیں نے پوچھا۔
اُس نے اپنی سکیم بتائی۔ یہ بہت ہی مشکل سکیم تھی بلکہ ناممکن بھی ہو سکتی تھی۔ مَیں نے اِس میں ردّ و بدل کرنا چاہی لیکن اُس نے میرا پورا مشورہ نہ مانا۔ صرف دو تبدیلیاں قبول کر لیں۔
پھر اُس نے مجھے اپنے پلاٹون حوالدار اور کمپنی حوالدار سے ملوایا۔ مَیں چونکہ حوالدار کلرک تھا اِس لیے یہ دونوں حوالدار میرے ساتھ عزت سے پیش آئے۔ وہ ہمارے ہی علاقے کے رہنے والے تھے۔ ان سے پتہ چلا کہ حمید ان کے ساتھ بات کر چکا ہے اور دونوں اس کے ساتھ پورا پورا تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں۔ مَیں نے انہیں یقین دلایا کہ مَیں اِس کا ساتھ دوں گا۔
ہم سب نے آپس میں جو باتیں کیں اور سکیم کو جو آخری شکل دی، وہ بتانے کی ضرورت نہیں، مَیں سناؤں گا کہ اِس سکیم پر مَیں نے اور حمید نے کس طرح عمل کیا۔
سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ہم رات کے وقت بیرکوں سے غیر حاضر نہیں ہو سکتے تھے۔ فوجی قانون کے تحت یہ جرم تھا۔ ہم حکماً مچھر دانیاں لگا کر سوتے تھے۔ مَیں جس بیرک میں رہتا تھا اِس میں سب حوالدار کلرک تھے۔ فوج میں یہ خوبی ہُوا کرتی تھی (معلوم نہیں اب ہے یا نہیں) کہ ساتھی ایک دوسرے کی بہت مدد کیا کرتے تھے۔
ہم نے جس رات غائب ہونا تھا، اُس شام گنتی کے بعد مَیں نے اپنے تین چار ساتھیوں

سے کہا کہ میری والدہ بیمار ہے، آج ہی خط آیا ہے۔ مَیں ابھی غائب ہو جاتا ہوں۔ بس مِل جائے گی جو مجھے ایک گھنٹے میں گھر پہنچا دے گی۔ تین چار گھنٹے ماں کے پاس رہوں گا۔ دو بجے کی پسنجر ٹرین سے واپس آ جاؤں گا۔
میرے ساتھیوں نے تسلّی دی کہ کچھ نہیں ہو گا، تم جاؤ، خیال یہ رکھنا کہ صبح چار بجے سے پہلے پہلے آ جانا۔
اُدھر حمید کو پلاٹون حوالدار اور کمپنی حوالدار میجر نے تسلّی دلاسہ دے کر بھیج دیا۔ ہم دونوں الگ الگ بٹالین کی حدود سے نکلے اور بہت دُور جا کر اکٹھے ہوئے۔ حمید نے دن کے وقت بڑا گوشت لانگری کے ہاتھ منگوا لیا تھا جو کپڑے میں بندھا ہُوا اُس کے پاس تھا۔ اُس کے پاس ایک تو ادوائن تھی اور بید کی پتلی سی دو چھڑیاں تھیں۔ جنگ سے پہلے یہ چھڑی ہر جوان کو ملتی تھی۔ جنگ شروع ہوئی تو جوانوں سے چھڑیاں واپس لے لی گئیں۔ حمید حوالدار سے دو چھڑیاں لے آیا تھا۔ ہم دونوں کے پاس چاقو تھے۔ حمید کے پاس بانس کا ٹکڑا بھی تھا۔
اُس علاقے میں تھوڑے فاصلوں کے لیے لاریاں چلتی تھیں۔ تھوڑا ہی عرصہ پہلے لمبے فاصلوں کے لیے لاہور کے دو ٹرانسپورٹروں نے بس سروس شروع کی تھیں۔ ان کے اڈے الگ الگ تھے۔ ہم ایک اڈے پر گئے لیکن بس میں جگہ نہ ملی۔ دوسرے اڈے پر گئے۔ بس چلنے والی تھی۔ ہم دونوں کو جگہ مل گئی۔ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ ہم بس میں بیٹھے اور بس چل پڑی۔



تیس میل سے ذرا کم ہی فاصلہ تھا۔ بس نے ایک گھنٹہ اور پندرہ بیس منٹ میں میرے قصبے میں پہنچا دیا۔ رات کا پہلا پہر تھا۔ اڈے پر تین آدمی مجھے پہچاننے والے تھے۔ مَیں منہ چھپا کر وہاں سے نکل آیا۔ ہم دونوں نے قصبے کے اندر سے گزرنے کی بجائے باہر باہر سے حمید کے گاؤں کا رُخ کر لیا۔ ہم بہت تیز چل رہے تھے۔ راستے میں چلتے چلتے حمید نے بانس میں گوشت بھر لیا۔
حمید کا گاؤں آ گیا۔ شاہ کا گھر گاؤں سے الگ تھلگ تھا۔ گاؤں اور شاہ کے مکان کے درمیان قبرستان تھا۔ ہم اُس طرف چل پڑے۔ مَیں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ ہم بہت دلیر اور نڈر تھے لیکن ہم جن بھوت نہیں تھے۔ جوں جوں شاہ کا گھر قریب آ رہا تھا، میرے دل کی دھڑکنیں تیز اور بے قاعدہ ہوتی جا رہی تھیں۔ مجھے پوری اُمید

تھی کہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ شاہ کا کتا گوشت کے دھوکے میں آجائے گا۔ مجھے یہ خطرہ بھی نظر آرہا تھا کہ شاہ کے گھر سے دو تین آدمی اٹھیں گے اور ہم دونوں کو پکڑ لیں گے۔ پہلے خود ہماری ہڈیاں توڑیں گے پھر تھانے لے جائیں گے۔ بٹالین سے ہم غیر حاضر ہوں گے تو ہمیں بھگوڑا قرار دے کر ہمارے تھانوں کو اطلاع دی جائے گی۔ جنگ کے دوران بھگوڑا ہونا سنگین جرم تھا۔ کم از کم سزا دو سال تھی۔

میں آج اُس وقت کو یاد کرتا ہوں تو کانپ سا جاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ جوانی عقل پہ پردہ ڈال دیا کرتی ہے۔ یہی کہتا ہوں کہ میں جوانی میں بہت بیوقوف ہُوا کرتا تھا۔

پھر ہُوا یہ کہ ہم شاہ کے گھر سے ذرا ہی دُور تھے کہ اُس کا کتا غراتا ہُوا ہماری طرف آیا۔ اندھیرے میں بھی شاہ کے گھر کی چاردیواری نظر آرہی تھی۔ ہم نے اس دیوار پہ چڑھنا اور اندر جانا تھا۔ شاہ کو اُٹھا کر باہر لانا تھا۔

کتا غصّے سے بھونکا اور ہم پر حملہ کرنے کے انداز سے آیا۔ شاہ کے صحن میں سے آواز آئی ـــــ "ہلا ڈبو.... شاباش ڈبو" ـــــ یہ آدمی کتے کی آواز پر اُس کی ہلا شیری کر رہا تھا۔

"یہ شاہ کی آواز ہے" ـــــ حمید نے تیزی سے سرگوشی میں کہا ـــــ "جاگ رہا ہے"

یہ کہتے کہتے حمید نے بانس کا ٹکڑا کتے کے آگے پھینک دیا۔ کتا ذرا بدکا اور خوفناک طریقے سے غرّایا لیکن گوشت کی بُو نے اُس کا موڈ بدل دیا۔ اُس نے بانس کو منہ میں لیا اور پھینک دیا، پھر اسے ایک سرے سے پکڑا اور بھنبھوڑا۔ گوشت تو نکل نہیں سکتا تھا اور کتا کہتا تھا کہ نکال کے چھوڑوں گا۔

جب کتا بانس کے ساتھ مصروف ہو گیا تو ہم دونوں دیوار کی طرف چل پڑے لیکن بہت آہستہ آہستہ۔ ہماری نظریں کتے پر لگی ہوئی تھیں۔ خطرہ یہ تھا کہ ہمیں مکان کے قریب دیکھ کر کتا بانس کو چھوڑ کر ہم پر حملہ کر دے گا۔ ہم ڈرتے ڈرتے اُس کی طرف دیکھتے دیوار کے قریب چلے گئے۔ یکلخت کتے کی ایسی آواز آئی جیسے کتے آپس میں لڑتے وقت نکالتے ہیں۔

اُفق سے چاند اُبھر رہا تھا۔ اُس کی روشنی میں ہمیں کتا بانس کے ٹکڑے کے ساتھ لڑتا دکھائی دیا۔ بانس اچھلتا اور گرتا تھا اور کتا شاید اُسے کوئی زندہ چیز سمجھتا

تھا۔ اُس کی غصیلی آواز اونچی ہوتی جا رہی تھی۔

مکان کے اندر، صحن سے، آواز آئی ـــــ "اوئے کون ہے تیرے ساتھ!" ـــــ پھر چلتے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ مکان کا دروازہ دوسری طرف تھا۔ دروازے کی زنجیر اُترنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھُلا۔ ہم دونوں دیوار کے ساتھ ساتھ دروازے کے قریب ہو گئے۔ دروازہ ساتھ والی دیوار میں تھا۔ کتا دروازے کے سامنے پندرہ سولہ قدم دُور تھا۔

"اوئے آج کیا ہو گیا تجھے!" ـــــ اس آدمی نے دروازے سے نکل کر کتے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

حمید چیتے کی طرح جھپٹا۔ ٹریننگ سنٹر میں ہمیں خالی ہاتھ لڑائی سکھائی گئی تھی۔ حمید نے پیچھے سے شاہ کی گردن کے گرد ایک بازو لپیٹ دیا۔ سکیم کے مطابق میں نے بڑی ہی تیزی سے رومال شاہ کے منہ میں ٹھونس دیا کہ اُس کی آواز نہ نکلے۔ پھر چاقو کھول کر اُس کی نوک شاہ کے پیٹ پر رکھ دی۔

"آرام سے ہمارے ساتھ چل پڑو" ـــــ میں نے کہا ـــــ "ذرا سی بھی گڑبڑ کی تو چاقو پیٹ کے اندر چلا جائے گا!"

اُس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ حمید نے اُس کی گردن چھوڑ دی۔ اُس کا ایک بازو میں نے پکڑا دوسرا حمید نے پکڑا اور اُسے قبرستان میں لے گئے۔ اُس کا خونخوار ڈبو بانس میں سے گوشت نکالنے میں پاگل ہُوا جا رہا ہے۔

چاند ذرا اوپر آگیا تھا۔ ہمیں کچھ دُور سے دیکھا جا سکتا تھا۔ قبرستان کے درمیان میں ایک مقبرہ اور اُس کے ساتھ کیکر اور پھلاہی کے تین چار درخت تھے۔ ہم شاہ کو وہاں لے گئے۔ وہ مقبرے کی اوٹ تھی۔ اس لیے چاندنی نہیں تھی۔ ہم نے شاہ کے کپڑے اتار کر بالکل برہنہ کر دیا تھا۔ حمید نے ادوائن کھولی۔ اس سے اُس کے ہاتھ آگے کو باندھے۔ اِسی رسّی سے اُس کے پاؤں باندھے۔

"چل میرے بھائی!" ـــــ حمید نے مجھے کہا ـــــ "اگلا کام شروع کر دے۔"

اُس نے شاہ کے پہلو میں ہو کر بید کی چھڑی کی اتنی زوردار ضرب شاہ کی پیٹھ پر لگائی کہ شاہ کے منہ میں رومال ٹھونسا ہُوا تھا پھر بھی اُس کی آواز سنائی دی جیسے بکرا ذبح ہو رہا تھا۔

"تم نے مجھے دھوکے میں گھر بلا کر مجھ پر اپنے بدمعاش چھوڑے تھے" ـــــ حمید

نے شاہ سے کہا اور بید کی ایک اور ضرب لگائی۔

میں بھی اُسے بید مارنے لگا۔ وہ منہ کے بل گرا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اور حمید نے اس کی پیٹھ پر کتنے بید مارے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس بید کی ضرب کتنی شدید ہوتی ہے اور صرف ایک ضرب انسان کا کیا حال کر دیتی ہے۔ یوں درد ہوتا ہے جیسے کسی نے تیز چھری یا چاقو سے لمبا کٹ لگا دیا ہو۔ شاہ جس طرح تڑپا تھا وہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ حمید ساتھ ساتھ کہتا جا رہا تھا — "تُو مجھے اپنے بدمعاشوں سے مروانا چاہتا تھا.... تُو عائشہ کی عزت کے پیچھے پڑا ہوا ہے.... بلا اپنے جنوں اور چڑیلوں کو.... تجھ میں خدائی طاقت ہے تو ہمارے ہاتھ روک لے" — حمید نے اور میں نے جو گالیاں بکیں وہ تحریر میں نہیں لائی جا سکتیں۔

▼

ہم نے اُسے اُٹھایا۔ اُس کے منہ میں سے رومال نکالا۔ اُس کا منہ کھُلا ہی رہا۔ میں تو سمجھا تھا کہ مر گیا ہے لیکن اُس نے منہ بند کیا۔ اُسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ حمید نے اُس کے پاؤں کھول دیے اور وہ پیچھے مقبرے کے سہارے کھڑا ہو گیا۔

"او ظالمو.... او ظالمو!" — اُس کی سسکیاں سنائی دیں — "پانی پلا دو۔"

"پلائیں گے شاہ جی!" — حمید نے طنزیہ کہا — "پانی کے ساتھ ہم شیرینی اور نذرانہ بھی پیش کریں گے۔"

"زیادہ مت رکو یار!" — میں نے کہا — "اس کی شہ رگ پر چاقو پھیرو اور چلو۔"

ہم نے اسے قتل نہیں کرنا تھا، صرف ڈرانا تھا۔ وہ تڑپنے لگا۔

"مجھے بخش دو حمید!" — اُس نے حمید کو پہچان لیا تھا۔ سسک سسک کر کہنے لگا — "مجھے زندہ رہنے دو۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچوں پر رحم کرو۔ میری بیٹی جوان ہو رہی ہے۔ اُس کا دنیا میں کوئی نہیں رہے گا۔"

بیدوں کی اتنی زیادہ اتنی شدید ضربیں کھا کر بھی وہ ہوش میں تھا۔ اُس کی صحت سرکاری سانڈ جیسی تھی۔ لال سُرخ آدمی تھا۔ عمر پینتیس چھتیس سال ہو گی۔ وہ اس علاقے کا "خدا" بنا ہوا تھا۔ بڑے بڑے راجے اُسے جُھک کر سلام کرتے تھے۔ موت کا نام سُن کر وہ پوری طرح ہوش میں آ گیا تھا۔ اُس سے اچھی طرح بولا نہیں جاتا تھا۔ کراہتا زیادہ اور بولتا کم تھا۔

پھر وہ رو پڑا اور بہت ہی دبی ہوئی کربناک آواز میں بولا — "قتل نہ کرنا۔"

"اب میری بات سُن شاہ!" — حمید نے کہا — "ہم نے تجھے قتل کرنا تھا لیکن تُو نے اپنے بچوں کا واسطہ دیا ہے۔ میں تیرے بچوں پر رحم کرتا ہوں۔ تُو نے جو کام کرنے ہیں وہ سُن لے۔ ایک یہ کہ تُو نے میرا نام نہیں بتانا۔ میرے اس دوست کو تو تُو جانتا ہی نہیں۔ کہنا کہ تُو نے کسی کو پہچانا نہیں۔ معلوم نہیں کون تھے۔ دوسرا کام یہ کہ عائشہ کا پیچھا چھوڑ دے۔ اُس کے ماں باپ کو تنگ نہیں کرنا۔ تیسرا کام یہ کہ عائشہ کے ماں باپ اور میرے ماں باپ سے کہنا کہ عائشہ پر جو جن آتا تھا، اُس نے حکم دیا ہے کہ عائشہ کی شادی حمید کے ساتھ کر دو ورنہ میں سب کا بیڑہ غرق کر دوں گا.... آگے بات بنانا تیرا کام ہے۔ باتیں بنانا تو تُو جانتا ہے۔ زبان کا جادو چلا کر ہی تُو سب کا بادشاہ بنا ہُوا ہے۔"

شاہ رضامندی میں سر ہلاتا جا رہا تھا۔ دو بار اُس نے کہا — "ایسے ہی ہو گا۔"

"اگر تُو نے میرے پیچھے پولیس بھیجی" — حمید نے کہا — "تو یہ سوچ لے کہ ہم فوجی ہیں۔ صبح سے پہلے پہلے اپنی بیرکوں میں پہنچ جائیں گے اور تمہاری اور پولیس کی کوئی نہیں سُنے گا کہ ہم یہاں آئے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تُو نے ہمارے خلاف کوئی بھی انتقامی کارروائی یا میرے گھر والوں کو پریشان کیا تو ہم ملٹری پولیس بھیج کر تجھے گرفتار کرا دیں گے اور ثابت کر دیں گے کہ تُو جاپانیوں کا جاسوس ہے۔ یہ نہ کیا تو یہ ضرور کریں گے کہ تیری اس بیٹی کو جو جوان ہو رہی ہے، اٹھا کر لے جائیں گے اور تجھے قتل کر دیں گے۔ تیرے پاس معلوم نہیں غیبی طاقت ہے یا نہیں لیکن ہمارے پاس دنیا کی جو طاقت ہے، یہ تیرا بیڑہ غرق کر دے گی۔"

اُس نے کراہتی ہوئی آواز میں وعدہ کیا کہ وہ خاموش رہے گا۔

ہم نے اپنی سکیم کے آخری حصے پر عمل کیا۔ وہ یہ تھا کہ اُسے کیکر کے قریبی درخت کے پاس لے گئے اور تنے کے ساتھ اُسے اس طرح کھڑا کیا کہ اُس کا منہ درخت کی طرف اور پیٹھ باہر کی طرف تھی۔ اُس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ ادوائن کی پوری رسی اُس کی ٹانگوں، پیٹھ اور درخت کے تنے کے گرد لپیٹ کر گانٹھ دے دی اور ہم وہاں سے چل پڑے۔

وقت بہت تھوڑا رہ گیا تھا۔ ہم دوڑنے کی رفتار تک تیز چل رہے تھے۔ اگر ہم ناکام رہتے تو ہمارے قدم بوجھل ہوتے۔ ہم نے خلافِ توقع سکیم کے عین مطابق بڑے تھوڑے وقت میں اپنی واردات مکمل کر لی تھی۔

میں اسے آج بھی ایک معجزہ کہتا ہوں۔ معلوم نہیں میں اور حمید نیکی کر رہے تھے یا بدی لیکن اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ شاہ اصل شیطان یا شیطان کا چیلا تھا۔ وہ اللہ کا کلام تعویذوں پر لکھ دیتا، سادہ لوح دیہاتیوں سے پیسے بٹورتا اور کوئی جوان عورت مصیبت کی ماری اس کے پاس چلی جاتی تو اس کے ساتھ بدکاری کرتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ خداوند تعالیٰ نے اسے سزا دینے کے لیے کتے کی آواز پر باہر نکال دیا اور ہمارے حوالے کر دیا تھا۔

اب ہم یہ انتظار کرنے لگے کہ ہم سزا سے بچتے ہیں یا اتنی سنگین واردات دبی رہ جاتی ہے۔

ہمارا علاقہ میدانی نہیں، ٹبلوں، ٹیکریوں، کھڈوں اور برساتی نالوں کی بھرمار ہے۔ اگر علاقہ میدانی ہوتا تو ساڑھے سات میل کا فاصلہ ہم فوجی جوانوں کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہاں تو گھاٹیاں اترتی اور چڑھتی تھیں جو ہم اترتے اور چڑھتے جا رہے تھے۔ ہماری دوڑ تو زندگی اور موت کی دوڑ تھی۔ ریل گاڑی چھوٹ جانے کے نتیجے سے ہم آگاہ تھے۔ ہم صبح بٹالین لائنوں سے غیر حاضر ہوتے۔ دوسری طرف شاہ نے حمید کے پیچھے پولیس بھیج دینی تھی۔ ہمیں پولیس کے حوالے کر دیا جاتا یا کورٹ مارشل ہوتا۔

ہم جب قصبے کے قریب پہنچے تو دور سے ریل گاڑی کے انجن کی روشنی دکھائی دی۔ گاڑی کم و بیش دو میل دور تھی۔ ہم دونوں دوڑ پڑے۔ میرے قصبے کے سٹیشن پر گاڑی صرف دو منٹ رکتی تھی۔ اب دیکھنا تھا کہ ہم سٹیشن پر پہلے پہنچتے ہیں یا گاڑی۔ میں اپنے قصبے کے بند بازار سے دوڑتا گزر رہا تھا۔ چوکیدار نے روکا۔ میں نے رکے بغیر کہا ہٹ جاؤ، گاڑی چھوٹ جائے گی۔

ہم ابھی اسٹیشن کے احاطے میں داخل ہوئے تھے کہ گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچ گئی۔ ہماری تو ٹانگیں شل ہو چکی تھی۔ پھر بھی ہم تیز دوڑے۔ ٹکٹوں والی کھڑکی سے ابھی دور ہی تھے کہ انجن نے روانگی کی وسل بجائی۔ ہم نے ٹکٹ لینے کا خیال چھوڑ دیا۔ دوسری وسل بجی تو گاڑی چل پڑی۔ ہم دوڑ پڑے اور آخری ڈبے کو پکڑ لیا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد گاڑی نے ہمیں ہماری چھاؤنی کے سٹیشن تک پہنچا دیا۔ ہم پلیٹ فارم پر اترنے کی بجائے دوسری طرف اترے اور باہر باہر سے سٹیشن سے نکل گئے۔ ہماری بیرکیں کوئی زیادہ دور نہیں تھیں لیکن بے ٹکٹ ہونے کی وجہ سے ہم اتنے بڑے سٹیشن کی دوسری طرف چلے گئے تھے اس لیے بڑا لمبا چکر کاٹ کر ہمیں اپنی منزل تک پہنچنا

پڑا۔ صبح کے چار بجنے والے تھے۔

▼

صبح اٹھے۔ نہ میری بیرک میں نہ حمید کی بیرک میں کسی کو پتہ چلا کہ ہم ساری رات غیر حاضر رہے ہیں۔ حمید مجھے دوپہر کے وقت ملا تھا۔ اب ہم پولیس کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ شاہ نے تھانے رپورٹ نہ کی ہو اور حمید نام نہ لکھوایا ہو۔

وہ دن گزر گیا۔ اگلا دن بھی گزر گیا اور پھر سات آٹھ دن گزر گئے۔ پولیس نہ آئی۔ ہمیں کچھ یقین سا آنے لگا کہ شاہ نے پولیس کو یہ واردات نہیں بتائی۔ اس سے ہمیں شک ہونے لگا کہ شاہ کسی اور طریقے سے انتقام لے گا۔ یہ ضروری ہو گیا تھا کہ حمید گاؤں جائے اور دیکھ آئے کہ وہاں کیا صورتِ حال ہے۔

تیرہ چودہ دن گزرے تھے تو حمید نے ماں کی بیماری کا بہانہ بنا کر پانچ دنوں کی چھٹی منظور کروا لی اور گاؤں چلا گیا۔ مجھے یہ فکر ہونے لگا تھا کہ حمید گاؤں میں پکڑا جائے گا لیکن وہ چھٹی کاٹ کر واپس آ گیا۔

اس نے بڑی عجیب بات بتائی۔ گھر والوں نے اسے یہ نئی خبر سنائی کہ شاہ جی کو جنات اٹھا کر لے گئے تھے اور ان کی بہت بری حالت کر کے ایک درخت کے ساتھ باندھ گئے۔ چھٹی کے دوران حمید جس کسی سے بھی ملا اس نے اسے یہی واقعہ سنایا۔ حمید نے مجھے یہ بات سنا کر کہا کہ میرے دل میں بار بار یہ ارادہ آتا تھا کہ سارے گاؤں والوں کو اور شاہ کے مریدوں کو اکٹھا کر کے سناؤں کہ شاہ کو جنات نہیں بلکہ ہم دو انسان اٹھا کر لے گئے تھے۔ لیکن میں یہ بات اپنے کسی دوست کے ساتھ بھی نہ کر سکا، کیونکہ لوگ اس واقعے کو سچ مانتے تھے۔ پتہ چلا کہ یہ بات شاہ نے خود مشہور کی تھی۔

لوگوں نے علی الصبح شاہ جی کو کیکر کے تنے کے ساتھ بندھا ہوا دیکھا۔ اس کے جسم پر ایک بھی کپڑا نہیں تھا اور اس کی پیٹھ پر گہری لال لکیروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ بعض لکیروں میں سے خون پھوٹ آیا تھا۔ یہ خبر فوراً ہی گاؤں میں پھیل گئی۔ شاہ پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ لوگوں نے شاہ کو کھولا، اس پر چادر ڈالی اور اٹھا کر اس کے گھر لے گئے۔

گاؤں کے حکیم اور جراح کو بلایا گیا۔ انہوں نے علاج معالجہ شروع کر دیا۔ شاہ سے پوچھا گیا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ شاہ نے بتایا کہ ایک بڑا ہی شیطان جن شیطان کے اکسانے پر اس کے قبضے سے نکل گیا ہے۔ شاہ نے اسے زندہ جلانے کی

کوشش کی تھی لیکن جن بچ گیا اور اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر رات کو شاہ کو اُٹھا کر لے گیا۔ ہر کوئی مان رہا تھا کہ شاہ جو بیان دے رہا ہے بالکل سچ ہے۔ اس واقعہ سے شاہ کی مقبولیت اور اس کا رُعب پہلے سے کہیں زیادہ ہو گیا۔ شاہ کہتا تھا کہ وہ اِن جنّات کو جو اُسے اُٹھا کر لے گئے تھے، حاضر کر کے سارے گاؤں کے سامنے زندہ جلائے گا۔

حمید عائشہ سے ملا۔ عائشہ بھی مان رہی تھی کہ شاہ کے قبضے میں جنّات ہیں اور اُسے جنّات نے ہی مارا پیٹا ہے۔ حمید نے اُسے بتایا کہ وہ جنّات وہ اور اس کا ایک دوست تھے۔

غور اس پر کریں کہ اس واقعہ کے بیس بائیس سال بعد یہ شاہ مر گیا تھا۔ اُس وقت تک اس کی مریدی اور عقیدت کا سلسلہ بہت دُور تک پھیل گیا تھا اور اس کے مرنے کے بعد اُس کے مزار پر آج بھی بڑی شان و شوکت سے عُرس ہوتا ہے اور لوگ اس کی قبر پر بچھی ہوئی چادروں کو ہاتھ لگانے کے لیے دھکّے دیتے اور دھکّے کھاتے ہیں اور وہاں جا کر اپنی مشکلیں اور مرادیں بیان کرتے ہیں۔ لوگوں نے اُس کے مزار کے ساتھ معجزہ نما کرامتیں گڑھ رکھی ہیں۔

آیئے' کچھ دُور میرے ساتھ چلئے۔ بھٹکا ہُوا مسافر آپ کو ان سنگلاخ وادیوں میں لئے چلتا ہے جہاں جا کر وہ سمجھا تھا کہ اور ہی زیادہ بھٹک گیا ہے اور اُس کی قسمت میں گم ہو جانا ہی لکھ دیا گیا ہے لیکن وہیں سے اُسے منزل کے نشاں ملے۔ سوچوں اور خیالوں کا دھارا کسی اور رخ پر چل پڑا۔

پہلے مجھے واجدہ اور آصف کی بات پوری کر لینے دیں۔

اپنے علاقے کے مشہور و معروف اور "بڑی پہنچ والے" شاہ جی کے ساتھ بڑی کامیاب اور خطرناک واردات کر کے میں نے اپنے دل و دماغ میں زلزلے جیسے جھٹکے محسوس کئے جن سے میرے عقیدے تہہ و بالا ہو گئے تھے۔ میں اگر مکمل طور پر نہیں تو بہت حد تک پیروں اور اُن کی کرامات کو مانا کرتا تھا۔ جنّات کے وجود سے تو میں نے کبھی انکار کیا ہی نہیں تھا' اور میں یہ بھی مانتا تھا کہ پیروں اور "شاہ صاحبوں" کے قبضے میں جِنّ ہُوا کرتے ہیں لیکن اس شاہ نے ہم سے پھینٹی کھا کر اس سے بھی فائدہ اٹھا لیا اور مجھے اور حمید کو جن بنا دیا تو میرے عقیدوں کی چولیں ڈھیلی ہو گئیں اور مجھے وہ علم حاصل ہُوا جو عالم موٹی موٹی کتابوں میں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

اس واردات کے بعد مجھ میں عجیب سی جرأت پیدا ہو گئی۔ اسی کو شاید اخلاقی جرأت کہتے ہیں۔ میں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ باطل کا ایک بڑا مضبوط بت توڑا تھا۔ یہ لوگوں کی جہالت' پسماندگی اور بد نصیبی ہے کہ وہ ابھی تک اس باطل کی پوجا کر رہے ہیں لیکن میں جس زنجیر میں جکڑا ہُوا تھا وہ ٹوٹ گئی اور میرا ایمان آزاد ہو گیا۔

لوگوں کی سادگی پر اُس زمانے میں افسوس ہوتا ہی تھا' آج دل کو دُکھ ہوتا ہے کہ تعلیم کی روشنی گھر گھر پہنچ گئی ہے لیکن پیر پرستی کی تاریکی بدستور موجود ہے۔ میں وعظ

نہیں کروں گا نہ میں آیاتِ قرآنی کے حوالے دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کہ پیر پرستی شرک ہے۔ ایک دو واقعات سناؤں گا۔

جنگِ عظیم کے دوران ہمارے دیہاتی علاقے میں پیروں کی منڈی خوب چمکی تھی۔ ہر گھر کا کم از کم ایک جوان تو ضرور ہی فوج میں تھا۔ بعض گھروں کے تین تین چار چار جوان فوج میں تھے۔ ان کی اکثریت محاذوں پر گئی ہوئی تھی۔ محاذ کو فرنٹ کہتے تھے..... برما فرنٹ' اٹلی فرنٹ وغیرہ..... فوجیوں کے باپ' مائیں' بہنیں اور بیویاں دلوں میں آس لے کر پیروں کے آستانوں پر جا ماتھے رگڑتی تھیں کہ ان کا آدمی جہاں کہیں بھی ہے' زندہ اور سلامت رہے۔ بعض لوگ یہ مراد لے کر پیروں کے ہاں جاتے تھے کہ ___ "میرا بیٹا چھاؤنی میں ہے۔ وہ چھاؤنی میں ہی رہے' اُسے سمندر پار یا کسی فرنٹ پر نہ بھیجا جائے"۔

پیروں نے دعاؤں' پھونکوں اور تعویذوں کے ریٹ چڑھا دیئے تھے۔ کوئی پیر اپنے کسی سائل سے نہیں کہتا تھا کہ تمہارا آدمی زخمی ہو جائے گا یا مارا جائے گا۔ ہر پیر کی زبان پر یہ الفاظ چڑھے ہوئے تھے ___ "اللہ خیر کرے گا۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ مجھے نظر آرہا ہے" ___ اس کے ساتھ ہی ہر روز دو تین گھروں میں سرکاری چٹھیاں آتی تھیں کہ آپ کا بیٹا فرنٹ پر مارا گیا ہے یا زخمی ہو گیا یا لاپتہ یا جنگی قیدی ہو گیا ہے۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ لوگ اس حقیقت کو قبول کر کے پیروں سے منہ موڑ لیتے کہ جہاں توپیں چلا کرتی ہیں وہاں تعویذ نہیں چلا کرتے اور جرمنوں اور جاپانیوں کے لڑاکا بمبار ہوائی جہازوں کو پیروں کی پھونکیں نہیں روک سکتیں' لیکن ہوتا یہ تھا کہ کسی گاؤں میں کسی فوجی کے مارے جانے یا زخمی ہو جانے کی سرکاری اطلاع آتی تھی تو اس گاؤں کے فوجیوں کے والدین وغیرہ اپنے پیر کے پاس دوڑے جاتے اور اپنے بیٹوں کی سلامتی کے لئے دعائیں کراتے اور نئے تعویذ لاتے اور پہلے سے زیادہ نذرانہ پیش کرتے تھے۔

ہمارے دیہاتیوں میں عقل کی کمی تھی اور جرات کی بھی۔ انہیں یوں کرنا چاہئے تھا کہ جن کا بیٹا مارا جاتا وہ پیر کے ہاں جاتے اور کہتے' یا سرکار' پیر دستگیر' پیروں کے پیر' ہمارے بیٹے کے گلے سے آپ کا تعویذ بندھا ہوا تھا۔ ایک تعویذ ہم نے اپنے گھر میں بھی رکھا ہوا تھا۔ آپ نے ہمارے بیٹے پر پھونکیں بھی ماری تھیں پھر بھی بیٹا مارا گیا ہے۔ آپ کم از کم ہمارے پیسے ہی واپس کر دیں' لیکن لوگوں کا ردِ عمل اور رویہ کچھ اور ہی ہوتا

تھا۔

میں ایک سو فیصد سچا واقعہ سناتا ہوں۔ یہ ہمارے قصبے کے بالکل ساتھ والے گاؤں کا واقعہ ہے۔ ایک سپاہی برما فرنٹ پہ مارا گیا۔ اُس کا باپ میرے والد صاحب کے ملنے والوں میں سے تھا۔ والد صاحب تعزیت کے لئے گئے۔ انہوں نے سنایا کہ وہاں گاؤں کے کئی آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی نے اُس فوجی کے باپ سے کہا کہ پیر صاحب نے اُس جوان کو گلے میں ڈالنے کے لئے تعویذ دیا تھا پھر بھی وہ مارا گیا۔

"پیر صاحب نے جو کہا تھا وہ سچ نکلا" ___ مرے ہوئے جوان کے باپ نے کہا ___ "انہوں نے کہا تھا کہ تمہارا بیٹا گولی سے نہیں مرے گا۔ وہ گولی سے نہیں مرا۔ اُس کے ایک ساتھی نے بتایا ہے کہ اُس کے مورچے کے قریب بم گرا تھا"۔

اس شخص کا جوان بیٹا مارا گیا لیکن پیر کا وہ بدستور عقیدت مند رہا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ۔

میں ان پیروں کی بے شمار کہانیاں سنا سکتا ہوں۔ ایک سے بڑھ کر ایک دلچسپ' شرمناک اور افسوسناک۔ ان پیروں کے ہاں بے تحاشہ بدکاری ہوتی تھی۔ بعض حاجت مند اور سائل پیروں کے حضور شراب پیش کرتے تھے اور بعض شہر سے خوبصورت طوائفیں لے جاتے تھے۔ گانے اور ناچنے والیاں بھی مجرے کے لئے پیش کی جاتی تھیں مگر ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی سرکاری اطلاعوں کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ جنگ ختم ہوئی تو ہمارے ضلع کے فوجیوں کی ایک چوتھائی سے کچھ زیادہ نفری جنگ کی بھینٹ چڑھ چکی تھی۔

وہ شاہ جسے میں نے اور حمید نے ننگا کر کے اور بید مار مار کر بیہوش کر دیا تھا' معمولی سا "شاہ جی" تھا لیکن جنگِ عظیم میں وہ باقاعدہ پیر بن گیا اور اس کی گدّی کو بہت شہرت ملی۔

○

پیروں کی کہانیاں تو کبھی ختم نہیں ہوں گی۔

آیئے' میں آپ کو اپنے سفر پر لے چلتا ہوں۔

واجدہ کو میں اُس کے کوارٹر میں ملا تھا۔ ایک خوشی تو ملاقات کی تھی۔ یہ روحانی مُسرّت تھی۔ دوسری خوشی یہ کہ اس کا خاوند آگیا تھا اور میں چارپائی کے نیچے چھُپ گیا تھا اور اس کا خاوند چلا گیا اور میں بال بال بچ گیا تھا۔ ایک خوشی اور بھی تھی۔ وہ یہ کہ میں

پہلی بار اتنی خوبصورت لڑکی سے رات کے وقت اور بند کمرے کی تنہائی میں ملا تھا۔ میں بتا چکا ہوں کہ اُس پر میری محبت کی دیوانگی طاری تھی لیکن میں وہاں سے پاک صاف نکل آیا تھا۔ یہ میری بہت بڑی فتح تھی۔ میں نے اپنے نفس کو من مانی نہیں کرنے دی تھی۔

واجدہ نے کہا تھا کہ میں دس دنوں بعد اسے کوارٹروں کے قریب والے جنگلے کے پاس ملوں۔ اس نے مجھے بتانا تھا کہ آصف کی رات کی اگلی ڈیوٹی کب ہوگی۔ ہم شاہ کی مار پٹائی کر آئے تو ایک ہی روز بعد دس دن پورے ہو گئے۔ میں شام سے کچھ دیر پہلے ٹہلتا ٹہلتا جنگلے کے قریب اُس جگہ چلا گیا جہاں سے واجدہ کا کوارٹر نظر آتا تھا۔ اُس نے بھی یقیناً" گن گن کر دن گزارے تھے۔ وہ اپنے کوارٹر کے باہر کھڑی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ میری طرف آہستہ آہستہ چل پڑی۔ فاصلہ خاصا تھا۔ میں نے دائیں طرف دیکھا اور میں پریشان ہو گیا۔ آصف آ رہا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ اپنے کوارٹر کی طرف مُڑا تو اُسے واجدہ اسی طرف آتی دکھائی دی۔ میں بڑی تیزی سے وہاں سے کھسک آیا۔ آصف کم عقل تو نہیں تھا۔ وہ فوراً" سمجھ گیا ہو گا میں واجدہ سے ملنے کے لئے وہاں کھڑا تھا اور واجدہ مجھ سے ملنے جنگلے کی طرف آ رہی تھی۔

میں یہ سوچتا ہُوا اپنی بارک میں آ گیا کہ یہ تو بہت بُرا ہُوا۔ مجھے اپنا کوئی غم نہیں تھا اور مجھے آصف کا بھی کوئی ڈر نہیں تھا۔ میں صرف واجدہ کے لئے پریشان تھا۔ واجدہ نے مجھے بتایا تھا کہ اُس نے آصف کو اپنے رعب میں لے لیا ہے۔ اُس نے آصف کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ مجھے چاہتی ہے۔ اس کے باوجود آصف نے واجدہ کو اپنے گھر آباد کر لیا تھا۔ میں حیران تھا کہ آصف نے واجدہ کی یہ باتیں کس طرح برداشت کر لی تھیں۔ ہمارے علاقے میں تو لوگ صرف شک کی بنا پر ہی قتل کر دیا کرتے تھے لیکن آصف تو واجدہ کا پروانہ بن گیا تھا۔

بے شک آصف نے واجدہ کے آگے ہتھیار ڈال کر اُس کی اطاعت قبول کر لی تھی لیکن سوچنے والی بات یہ تھی کہ اُس نے میری اطاعت تو قبول نہیں کی تھی۔ وہ مجھے معاف نہیں کر سکتا تھا۔ ایک وجہ تو صاف تھی کہ اُس کی بیوی نے اُسے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے چاہتی ہے اور دوسری وجہ یہ کہ وہ اُونچی ذات کا آدمی تھا اور میری ذات اُس سے دو تین درجے کم تھی۔ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ وہ قوموں اور ذاتوں کا زمانہ تھا۔ ہمارے علاقے میں راجے دوسری ذاتوں کے لوگوں کو اپنے غلام سمجھتے تھے۔ ان کے

بولنے کا انداز یہ تھا کہ گردن اکڑا کر سر اونچا کرتے اور جس کے ساتھ بات کرنی ہوتی اُسے ٹیڑھی نظروں سے دیکھتے اور یوں بات کرتے جیسے یہ شخص انتہائی گھٹیا خاندان کا آدمی ہے۔

یہ سب کچھ سوچ کر مجھ پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ آصف کے ساتھ میری ٹکر ہو گی اور ٹکر معمولی نہیں ہو گی۔ میں نے کہا ہے مجھے آصف کا کوئی ڈر نہیں تھا' میری پریشانی یہ تھی کہ آصف واجدہ کے ساتھ نہ جانے کیسے ردِ عمل اور غصے کا اظہار کرے۔ وہ آخر خاوند تھا اور کوئی بزدل اور گھٹیا آدمی بھی نہیں تھا' اُس کی برداشت کی آخر کوئی حد ضرور تھی۔ اُس نے واجدہ کا یہ اعتراف تو قبول کر لیا تھا کہ وہ اُسے صرف خاوند کی حیثیت سے قبول کرتی ہے لیکن اس کی دلی محبت میرے ساتھ ہے' لیکن وہ یہ صورت قبول نہیں کر سکتا تھا کہ میں اُس کی غیر حاضری میں اُس کی بیوی سے ملتا۔

یہ تو میری سوچیں تھیں جو مجھے پریشان ہی کرتی جا رہی تھیں' اس کا کوئی حل نہیں سُوجھ رہا تھا۔ یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ آصف نے واجدہ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ سلوک اچھا نہیں ہو گا لیکن خطرہ یہ تھا کہ واجدہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والی لڑکی تھی۔ یہ تو میں پہلے بتا چکا ہوں کہ عروسی کی رات آصف نے واجدہ کے منہ پر تھپڑ مارا تھا تو ایسا ہی تھپڑ واجدہ نے آصف کے منہ پر مار دیا تھا مگر اب صورت اور تھی۔ اب میں درمیان میں آ گیا تھا۔ مجھے خطرہ یہ نظر آ رہا تھا کہ آصف واجدہ کو قتل ہی نہ کر دے۔ اگر یہ نہ کرے تو اسے طلاق دے کر گھر بھیج دے گا۔

اس معاملے میں میرا رازدار حمید تھا۔ میں اُس کی بارک میں گیا اور اُسے بتایا کہ یہ واقعہ ہو گیا ہے۔ اُس نے پہلی بات یہی کہی کہ یہ اچھا نہیں ہُوا۔ معاملہ بگڑ کر خاندانوں کی دشمنی تک پہنچ سکتا تھا۔ اس صورت میں میرا خاندان آصف اور واجدہ کے خاندانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

میں اور حمید ہر زاویے سے سوچتے رہے لیکن کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ سوال صرف یہ تھا کہ واجدہ سے کس طرح معلوم کیا جائے کہ آصف نے گھر جا کر اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔

○

مَیں نے بتایا ہے کہ آصف کی سگنل بٹالین ہماری لائنوں کے بالکل قریب تھی۔ میں

جب حمید کے ساتھ بات کر کے آیا تو شام رات میں بدل چکی تھی۔ میرے ایک ساتھی نے باہر سے آکر بتایا کہ کوئی آدمی مجھے ملنا چاہتا ہے لیکن اندر نہیں آتا۔ میں باہر گیا تو یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور پریشانی بھی کہ وہ واجدہ کا خاوند آصف تھا۔ میں آگے بڑھ کر اُسے تپاک سے ملا لیکن اُس نے میرے ساتھ ہاتھ نہ ملایا۔ میں نے ہاتھ آگے کیا تھا۔

"اندر آجاؤ آصف بھائی!" ——میں نے ہاتھ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں ہاتھ ملانے نہیں آیا" ——اُس نے کچھ رعونت سے کہا——"اور نہ ہی تمہارا مہمان بن کر آیا ہوں۔ یہ سمجھ لو کہ تم نے میری بات پر توجہ نہ دی تو تم دو دن کے مہمان ہو گے"۔

"تم میری جگہ پر آئے ہو آصف!" ——میں نے بڑے تحمّل سے کہا——"یہ میرا گھر ہے اور تم میرے گھر آئے ہو۔ ماں بہن کی گالی دو گے تو وہ بھی سُن لوں گا"۔

"میں گالیاں دینے نہیں آیا" ——اس نے کہا——"میں تمہیں ایک دو باتیں کہنے آیا ہوں۔ اس کے بعد دیکھوں گا کہ تم میرے کہنے پر عمل کرتے ہو یا نہیں۔ ذرا میرے ساتھ اُدھر چلو"۔

میں خالی ہاتھ تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ آصف کا ارادہ کیا تھا اور نہ ہی یہ معلوم تھا کہ اس کی جیب میں چاقو یا ریوالور ہے یا کچھ بھی نہیں۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور اُس کے ساتھ چل پڑا۔ چلتے چلتے ہم پریڈ گراؤنڈ میں پہنچ گئے۔

یہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ آصف ایک گاؤں کا رہنے والا تھا اور میں واجدہ کے قصبے کا جسے شہر کہا جاتا تھا' باشندہ تھا۔ میں نے آصف کو اپنے شہر میں آتے جاتے دیکھا تھا اور اُس نے مجھے دیکھا تھا اور صرف ایک بار سلام دعا ہوئی تھی۔ اب تو واجدہ نے اُسے بتا دیا تھا کہ اس کی زندگی میں میرا کیا مقام تھا۔ صحیح الفاظ میں یوں کہہ لیں کہ میں اُس کا رقیب اور دشمن تھا۔

"غور سے سن لو' خانی!" ——آصف نے کہا——"میں جو بات آج کہنے آیا ہوں وہ پھر کبھی نہیں کہوں گا۔ اگر تم میں عقل ہے تو تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں کیا بات کہنے آیا ہوں"۔

"پہلے بات تو کرو آصف بھائی!" ——میں نے کہا۔

"میری بیوی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے" ——آصف نے کہا——"اور میں نے

کچھ سوچ کر اُس کی یہ بات قبول کر لی ہے۔ سوچ یہ ہے کہ ہم اُونچی ذات کے لوگ ہیں۔ ایک بیوقوف لڑکی کی بیوقوفی سے میں نہیں چاہتا کہ دو اونچی ذات کے خاندان بدنام ہو جائیں۔ تم چھوٹی ذات کے آدمی ہو۔ ان باتوں کو تم نہیں سمجھ سکو گے۔ یہ مت بھولو کہ میں واجدہ کا خاوند ہوں اور میں بالکل برداشت نہیں کروں گا کہ تم میری بیوی سے ملو۔ میں تمہیں بھائیوں کی طرح نصیحت کرتا ہوں کہ اپنی حیثیت اور اپنی ذات کو پہچانو اور کوشش کرو کہ واجدہ سے دُور ہو جاؤ۔ مخمل میں کمبل کی ٹاکی نہیں لگ سکتی۔ اگر نہیں مانو گے تو اُس کا نتیجہ تمہارے ماں باپ کے لئے بہت بُرا ہو گا"۔

"ایک کام کرنا آصف بھائی!" ——میں نے کہا——"اگر سزا دینی ہے تو مجھے دینا' واجدہ پر ہاتھ نہ اُٹھانا اور اُس کی زندگی برباد نہ کرنا"۔

"تم اُس کے کیا لگتے ہو؟" ——آصف نے کہا——"وہ میری بیوی ہے۔ میں جو سلوک چاہوں گا اس کے ساتھ کروں گا۔ میں تمہیں یہ بتا دیتا ہوں کہ وہ تمہاری عزت صرف اس لئے کرتی ہے کہ تم اُس کے استاد رہے ہو۔ تم نے اسے تعلیم دی ہے لیکن تم اُس کے عاشق بن بیٹھے ہو"۔

"تم یہ نصیحتیں واجدہ کو کیوں نہیں کرتے!" ——میں نے کہا——"وہ تمہاری بیوی ہے۔ کیا تم اُس سے ڈرتے ہو؟"

"میں تمہارے ساتھ بات کر رہا ہوں" ——اُس نے کہا——"یہ میں تمہیں بتاؤں گا کہ کون کس سے ڈرتا ہے۔ میں تم سے درخواست نہیں کر رہا نہ میں عرض کرنے آیا ہوں۔ میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں کہ میرے راستے میں نہ آؤ"۔

"بات ختم کرو آصف!" ——میں نے کہا——"میں تمہارا حکم نہیں مانوں گا۔ یہی بات اگر واجدہ مجھے کہہ دے تو میں اُس کا حکم مان لوں گا۔ تم نے مجھے چھوٹی ذات کا آدمی کہا ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گا"۔

"پھر میرا فیصلہ سن لو" ——آصف نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کے کہا——"تم زندہ رہو گے یا میں"۔

وہ میرا جواب سنے بغیر چلا گیا۔ اُس نے مجھے جو چیلنج دیا تھا یہ کھوکھلی دھمکی نہیں تھی اور نہ ہی اُس نے کسی پنجابی فلم کا مکالمہ بولا تھا۔ اُس نے اپنا فیصلہ سنایا تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ اس پر عمل بھی کرے گا۔ میں نے اپنے آپ کو اس امتحان کے لئے تیار کر لیا۔

○

اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال تھی' شاید اس لئے کہ میری نیّت صاف تھی۔ میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آصف کو راستے سے ہٹانے کے لئے واجدہ کو یہ مشورہ دوں اُسے کسی طرح زہر دے دے پھر ہم شادی کرلیں گے۔ شادی شدہ عورتوں کی محبت کہانیوں میں ایسے واقعات بہت ملتے ہیں کہ عورت نے اپنے آشنا کو ساتھ ملا کر ا خاوند کو زہر دے دیا یا کسی اور طریقے سے قتل کرا دیا۔ میں نے تو یہ بھی سوچ رکھا تھا واجدہ سے کہوں گا کہ اُس کا خاوند اگر اُس کے سامنے جُھک گیا ہے تو وہ مجھے دل سے ا دے اور اپنی ازدواجی زندگی میں کانٹے نہ بکھیرے۔

مین نے یہ جو کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال تھی' یہ بات یوں بنی کہ وہ جنگ زمانہ تھا۔ ہندوستان کی کئی پلٹنیں اور توپ خانے وغیرہ محاذوں پر چلے گئے تھے اور جو فو ملک میں رہ گئی تھی اُس کی ٹریننگ جاری رہتی تھی۔ ایک ٹریننگ تو یہ ہوتی تھی کہ ک بریگیڈ یا کسی یونٹ کو حکم ملتا کہ وہ جنگی حالت میں فوراً" فلاں مقام تک پہنچے' پھر دیکھا جا تھا کہ یہ بریگیڈ یا یونٹ کتنی جلدی بتائے ہوئے مقام پر پہنچتی ہے اور اس مقام پر پہنچ کتنی جلدی مورچے تیار کرتی ہے۔

ایسا ہی حکم ہمارے بریگیڈ کو مل گیا۔ بریگیڈ میں آصف کی سگنل بٹالین بھی شا تھی اور میری بٹالین بھی لیکن میں نے بٹالین کے ساتھ نہیں جانا تھا۔ کچھ شاف نے پیچھے رہنا ہوتا تھا۔

اگلے ہی روز بریگیڈ چلا گیا۔ بریگیڈ کو پنجاب کے ایک پہاڑی علاقے میں پہنچنا تھ یہ ایک ایکسرسائز یعنی جنگی مشق تھی۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ بریگیڈ نے وہاں کتنے دن ر تھا۔ حمید بھی چلا گیا تھا۔ اب میں واجدہ سے مل کر معلوم کر سکتا تھا کہ ان کے گھر میں ہُوا تھا لیکن رات کو نہیں جا سکتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ جب کوئی یونٹ ایکسرسائز کچھ دنوں کے لئے باہر جاتی ہے تو فیملی کوارٹروں پر رات کو پہرہ ہوتا ہے۔ میں واجدہ دن کے وقت ہی مل سکتا تھا لیکن پکڑے جانے کا خطرہ موجود تھا کیونکہ یونٹ کے جو آد پیچھے رہ جاتے تھے وہ کوارٹروں پر نظر رکھتے تھے۔

میں شام چار بجے سے کچھ دیر بعد ٹہلتا ٹہلتا واجدہ کے کوارٹر کی طرف چلا گیا۔ واج نظر آگئی۔ جن عورتوں کے خاوند جنگی مشق کے لئے چلے گئے تھے۔ ان کی غیر حاضر

میں عورتیں فارغ تھیں۔ اُن کا شغل گپ شپ لگانا ہی رہ گیا تھا۔ وہ تین تین چار چار کی ٹولیوں میں باہر بیٹھ جاتی تھیں اور گپ شپ لگاتی تھیں۔

واجدہ نے مجھے دیکھا تو اُٹھ کر آگئی۔ اُس نے عورتوں کو میرے متعلق بتایا تھا کہ میں اُس کا ماموں زاد بھائی ہوں۔ میں نے اُس سے پہلی بات یہ پوچھی کہ اُس روز آصف نے گھر جا کر اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔

"سلوک کیا کرنا تھا!" ۔۔۔ واجدہ نے ہنستے ہوئے کہا ۔۔۔ "پہلے تو اس نے خاوندوں جیسا رعب جھاڑا جو میں اُس کا دل رکھنے کے لئے سنتی رہی۔ آخر میں نے کہا کہ خانی جنگلے کے پاس کھڑا تھا۔ وہ مجھے ملنے نہیں آیا تھا۔ وہ تو سڑک پر جا رہا تھا' اُس نے اِدھر دیکھا تو میں باہر کھڑی تھی' وہ جنگلے کے قریب آگیا اور میں اُس کی طرف چل پڑی۔ اگر میں اُس تک پہنچ بھی جاتی تو ہم کون سی بدی کر لیتے..... آصف نے کہا کہ یہ بدی نہیں تو اور کیا ہے کہ کسی کی بیوی کسی غیر مرد سے ملے۔ میں نے اُسے قسمیں کھا کر کہا کہ خانی تمہاری غیر حاضری میں میرے گھر آجائے گا تو بھی ہم بدی نہیں کریں گے..... اس کے بعد وہ ٹھنڈا ہو گیا لیکن میں نے اس کے چہرے سے اندازہ کیا کہ وہ میری باتیں سن کر صرف چپ ہُوا ہے' اُس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہُوا"۔

"میرے بارے میں کچھ کہتا تھا؟" ۔۔۔ میں نے پوچھا۔

"نہیں!" ۔۔۔ واجدہ نے جواب دیا ۔۔۔ "اُس نے صرف اتنا کہا تھا کہ تم نے چھوٹی ذات کے آدمی کا پیار دل میں بٹھا کر بہت بُرا کیا ہے"۔

"مجھے تو وہ قتل کی دھمکی دے آیا ہے" ۔۔۔ میں نے کہا اور وہ ساری باتیں سنائیں جو میرے اور آصف کے درمیان ہوئی تھیں۔ پھر کہا ۔۔۔ "اگر اس نے تمہیں یہ باتیں نہیں سنائیں تو اُس سے نہ پوچھنا۔ اگر پوچھو گی تو یہ ثبوت ہو گا کہ میری اور تمہاری ملاقات ہوئی ہے..... مجھے اپنا کوئی غم نہیں واجو! میں تو اُس کا پورا مقابلہ کروں گا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ تمہیں تنگ نہ کرے۔ تم نے اُس کے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں کرنی کہ وہ مجھے ملا تھا اور میری اور اُس کی باتیں ہوئی تھیں"۔

"میری ایک بات دل میں رکھ لو خانی!" ۔۔۔ واجدہ نے کہا ۔۔۔ "اس شخص کے آگے جھک نہ جانا۔ اُس کے رعب میں نہیں آنا۔ اگر موقع محل دیکھو تو اُسے سرے سے صاف ہی کر دو۔ خیال صرف یہ رکھنا کہ پکڑے نہ جاؤ۔ یہ تم پر وار کرے گا ضرور۔ یہ ان

کے خاندان کی روایت ہے۔ میں تمہیں اجازت دیتی ہوں کہ اس کا قصہ ہی پاک کر دو۔ اگر تم پکڑے گئے تو دیکھنا میں تمہیں کس طرح چھڑواتی ہوں"۔

یہ تو جذباتی باتیں تھیں جو واجدہ کر رہی تھی۔ کسی کو قتل کرنا آسان نہیں ہوتا...... دراصل کہنا یہ چاہئے کہ قتل کرنا تو بہت ہی آسان کام ہے۔ گولی مار دو' چھری یا چاقو چلا دو' دھوکے سے زہر پلا دو' کوئی اور طریقہ اختیار کر لو' دراصل مشکل کام قتل کو ہضم کرنا اور اپنے اُس جرم کو چھپائے رکھنا ہے۔ یہ اکثر ناممکن ہوتا ہے۔

جہاں تک آصف کا معاملہ تھا' اس میں ذرا سا بھی شک و شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ ہم میں خونی دشمنی پیدا ہو گئی تھی اور اب یہ دیکھنا تھا کہ وہ مجھے قتل کرتا ہے یا میں موقع ملتے ہی اس کا کام تمام کرتا ہوں۔

"رات کو آؤ گے؟" ___ واجدہ نے پوچھا۔

"نہیں واجو!" ___ میں نے کہا ___ "تمہیں شاید معلوم نہیں۔ جب بٹالین باہر چلی جاتی ہے تو فیملی کوارٹروں پر دو سنتریوں کا پہرہ ہوتا ہے جو تین تین گھنٹے بعد بدلتے ہیں اور کوارٹروں کے آگے پیچھے گشت کرتے رہتے ہیں"۔

"پھر نہ آنا" ___ واجدہ نے کہا ___ "اللہ ملائے گا"۔



پانچویں یا چھٹے دن بریگیڈ واپس آ گیا۔ اس دوران واجدہ کے ساتھ ایک اور ملاقات ہوئی۔ یہ بھی جنگلے کی ملاقات تھی۔

تین چار دن ہی گزرے تھے کہ ایک سرکاری حکم نے مجھ میں اور واجدہ میں لمبی جدائی ڈال دی۔ حکم یہ تھا کہ ہماری پلٹن فوراً" بنوں پہنچے۔ بنوں شمال مغربی سرحدی صوبے کی ایک مشہور چھاؤنی ہے۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں بنوں چھاؤنی کو بہت اہمیت حاصل تھی کیونکہ یہ قبائلی علاقے میں واقع تھی۔ یہ وزیرستان کا علاقہ ہے۔

میں نے اس قبائلی علاقے کے پٹھانوں کی بہادری اور جذبۂ حبّ الوطنی کے بہت قصے سُنے تھے۔ میرے قصبے میں دو ریٹائرڈ صوبیدار اور تین ریٹائرڈ جمعدار ہُوا کرتے تھے (پاک آرمی میں جمعدار کو نائب صوبیدار کہتے ہیں)۔ یہ پانچوں فرنٹیئر کے قبائل میں خاصہ عرصہ رہے تھے اور قبائلیوں کے خلاف لڑے تھے۔ وہ قبائلیوں کی لڑائی کی باتیں سنا کرتے تھے۔

میں اپنی بٹالین کے ساتھ بنوں چھاؤنی پہنچا تو وہاں کے پہاڑ دیکھ کر خوشی سی ہوئی۔ میں کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے میرے دل میں ایک مدت سے یہ خواہش پرورش پاتی رہی ہے کہ یہ علاقے دیکھوں۔ میں نے مری کے پہاڑ دیکھے ہیں۔ بہت ہی خوبصورت ہیں۔ دیودار' چیل اور سفیدے کے درختوں سے ڈھکے ہوئے یہ سرسبز پہاڑ دکھی دلوں کو مسرور' مخمور اور تروتازہ کر دیتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں بنّوں کے پہاڑ بلکہ وزیرستان کے پہاڑ بالکل ننگے ہیں۔ ان پر گھاس کی ایک ہری پتی بھی نظر نہیں آتی۔ گرمیوں میں ان میں سے غیرمرئی شعلے اٹھنے لگتے ہیں' لیکن یہ مجھے مری اور کشمیر کے پہاڑوں جیسے اچھے لگے۔

آپ میری کہانی سننے کے لئے بیتاب ہوں گے لیکن میں آپ کو تھوڑی سی تاریخ سنا دوں تو آپ میری کہانی کو زیادہ دلچسپ پائیں گے۔

ہماری آج کی نسل جب اپنے قبائلی علاقے کا نام سنتی ہے تو سب سے پہلی چیز جو ذہن میں آتی ہے وہ ہے ہیروئن' سمگلنگ' اغوا برائے تاوان' غیرقانونی اسلحہ کی خرید و فروخت۔ فرنٹیئر کے قبائلی علاقے کو علاقہ غیر کہتے ہیں۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں بھی اسے علاقہ غیر ہی کہتے تھے لیکن اُس دور میں اُس کا مطلب یہ تھا کہ یہ علاقہ انگریزوں کے لئے غیر ہے اور یہ پٹھانوں کا یعنی مسلمانوں کا آزاد علاقہ ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اسے فخر سے علاقہ غیر کہا کرتے تھے۔ ان میں جذبۂ حریّت بیدار ہو جاتا تھا۔

آج بھی اس علاقے کو علاقہ غیر ہی کہتے ہیں مگر کوئی جذبہ بیدار نہیں ہوتا۔ اس کی بجائے ناپسندیدگی کا گھناؤنا سا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ اب علاقہ غیر کے ساتھ جذبہ نہیں جرم وابستہ ہو گیا ہے۔ پاکستان میں جو کاریں اور موٹر سائیکل چوری ہوتے ہیں' ان میں سے زیادہ تر علاقہ غیر میں چلے جاتے ہیں۔ قاتل اور ڈاکو علاقہ غیر میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ علاقہ غیر سے اب ہیروئن آتی ہے جس نے پاکستان کو اقوامِ عالم میں ذلیل و رُسوا کر دیا ہے۔ علاقہ غیر سے کلاشنکوف اور ریوالور آتے ہیں۔ انگریزوں کے دَور میں ہندوستان کا کوئی حریّت پسند علاقہ غیر میں چلا جاتا اور اسے صرف پناہ ہی نہیں ملتی تھی بلکہ قبائلی پٹھان اُسے سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ آج پاکستان کے مفرور مجرم علاقہ غیر میں جاتے ہیں اور انہیں وہاں پناہ ملتی ہے۔

یہ وہ خطۂ ارض ہے جہاں سید احمد شہیدؒ اپنے مجاہدین کے لشکر کو لے گئے اور

سکھوں کے خلاف لڑے تھے۔

پٹھانوں نے اپنے خون سے حریت کی تاریخ لکھی ہے۔ قبائلی پٹھان پورے ایک سو سال انگریزوں کے خلاف لڑے اور اپنے علاقے کے ایک انچ پر انگریزوں کا قبضہ نہ ہونے دیا۔ انگریزوں نے کہیں کہیں چھوٹی بڑی فوجی پوسٹیں بنالی تھیں لیکن ان کے باہر انگریز کا قانون مفلوج ہو جاتا تھا اور باہر ان کے لئے موت کے سوا کچھ نہ تھا۔

قبائلی پٹھانوں نے 14 اگست 1947ء کے مقدس دن اپنی ایک سو سالہ جنگ کی فائر بندی کی۔ قائدِاعظمؒ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے تو انہوں نے تمام قبائلی علاقوں کی فوجی پوسٹیں خالی کر دی۔ وزیرستان کی آخری چھاؤنی رزمک سے بھی فوج نکال لی۔ قبائلی پٹھان پاکستانی کہلانے لگے مگر قائدِاعظمؒ کے انتقال کے بعد جب پاکستان اقتدار کے پجاریوں' جاگیرداروں' وڈیروں اور کارخانہ داروں کے قبضے میں آگیا تو نہ کسی کو قبائلی پٹھان یاد رہے نہ یہ ضرورت محسوس کی کہ ان کے پسماندہ اور نظرانداز کئے ہوئے علاقے کو ترقی دینی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ قبائلی پٹھان پاکستان سے دُور ہوتے گئے اور قبائلی علاقہ لاقانونیت' ہیروئن فروشی' سمگلنگ اور جرائم کا گڑھ بن گیا۔

○

کہنے کو بہت کچھ ہے۔ کبھی تو جی میں آتی ہے کہ اسی غیور اور حریت پسند قبائلی علاقے کی باتیں لکھتا جاؤں۔ انگریزوں نے اس علاقے میں قبائلیوں سے بہت مار کھائی ہے۔ قبائلی علاقے کی گدھوں' گیدڑوں' بھیڑیوں اور کتوں نے برٹش آرمی اور انگریزوں کی انڈین آرمی کے ہزارہا فوجیوں کی لاشیں کھائی ہیں اور ان کی ہڈیاں سرحد کی خاک میں مل کر خاک ہو گئی ہیں۔

میں نے لاشیں کھانے والی بات ویسے ہی یا جذباتی انداز میں نہیں لکھ دی۔ یہ حقیقت ہے اور میں نے یہ منظر اپنی آنکھوں دیکھے ہیں۔ قبائلیوں کی طرف سے صرف ایک گولی چلتی تھی۔ اِس کے جواب میں اِدھر سے مشین گنوں اور رائفلوں کے منہ کھل جاتے تھے۔ آپ اپنے علاقے میں رائفل یا بندوق کی ایک گولی چلائیں تو چڑیا سے چیل تک ڈر کر اُڑ جائیں گے۔ کوئی گدِھ بھی نہیں ٹھہرے گا لیکن میں نے قبائلی علاقے میں دیکھا تھا کہ جونہی دونوں طرف سے فائرنگ شروع ہوتی تھی' گدِھوں کے غول فضا میں منڈلانے لگتے تھے۔ ان میں چیلیں بھی ہوتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ جب گولیاں چلتی

ہیں تو کھانے کو ملتا ہے۔

لاشیں فوجیوں کی ہی ہوتی تھیں۔ پٹھان ایک گولی فائر کر کے ایک فوجی لے لیتا اور پہاڑی پر ہی اِدھر اُدھر ہو جاتا تھا۔ قبائلی پٹھان بہترین گوریلے اور سنائپر تھے۔ وہ فوجوں کی طرح اندھا دھند فائر نہیں کرتے تھے۔ وہ ایک گولی اُس وقت چلاتے تھے جب انہیں یقین ہوتا تھا کہ گولی ضائع نہیں جائے گی۔ ان کے پاس فوج کی طرح پھونکنے کے لئے ایمونیشن نہیں ہوتا تھا۔

عموماً" یوں ہوتا تھا کہ قبائلی فوجی کی لاش اٹھانے نہیں دیتے تھے۔ لاش کے قریب جو جاتا وہ سنائپر پٹھان کی گولی کا نشانہ بن جاتا تھا۔ انگریزوں کا حکم تھا کہ اپنے ساتھی کی لاش قریب ہے اور اپنے آپ کو محفوظ رکھ کر اٹھائی جاسکتی ہے' تو اٹھائی جائے ورنہ اسے اٹھانے کا خطرہ مول نہ لیا جائے۔ اس حکم سے یہ رُواج ہو گیا تھا کہ اپنے ساتھیوں کی لاشیں پڑی رہنے دو۔

انگریزوں کا اپنا رواج یہ تھا کہ وہ اپنے افسر کی لاش ہر قیمت پر لے لیتے تھے۔ جھڑپ کے بعد جب فوج واپس چلی جاتی تھی تو پٹھان سب سے پہلے یہ دیکھتے تھے کہ ان کا اپنا کوئی ساتھی شہید ہو گیا ہے تو اس کی لاش اٹھا لیتے تھے۔ پھر وہ کسی فوجی کی لاش یا لاشیں ڈھونڈتے تھے۔ سپاہیوں وغیرہ کی لاشوں سے وہ رائفل' ایمونیشن اور اُن کی جیبوں سے جو کچھ برآمد ہو لے لیتے تھے۔ اگر کسی انگریز افسر کی لاش ملتی تو اُسے اٹھا لے جاتے تھے۔

قبائلیوں اور انگریزوں کے درمیان رابطے کے لئے پولیٹیکل ایجنٹ ہُوا کرتا تھا۔ وہ قبائلیوں کے کسی ذمہ دار آدمی سے رابطہ قائم کرتا اور لاش کی واپسی کی بات چیت کرتا تھا۔ پٹھان لاش کا تاوان بتاتے تھے۔ کچھ سودا بازی ہوتی اور تاوان طے ہو جاتا جو پٹھانوں کا کوئی سربراہ (ملک) نقد وصول کر کے لاش پولیٹیکل ایجنٹ کے حوالے کر دیتا تھا۔

پٹھان انگریز افسروں کی لاشیں جس طرح واپس کرتے تھے اس کی صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ 8 پنجاب رجمنٹ کا ایک انگریز افسر میجر فاکنر رزمک سے تھوڑی دور مارا گیا اور اس کی لاش پٹھان لے گئے۔ دو ہزار روپے پر سودا طے ہوا۔ پٹھانوں نے لاش دے دی لیکن لاش کی حالت یہ تھی کہ پٹھانوں نے اس کا پیٹ چاک کر کے اندرونی اعضاء' شکم' انتڑیاں' معدہ' دل' جگر وغیرہ نکال کر پھینک دیئے اور پیٹ میں پتھر بھر کر پیٹ اِس طرح سی دیا تھا جس طرح بوری کا منہ سیبے یا سوتلی سے سِیا جاتا ہے..... یہ ذہن

میں رکھیں کہ اس وقت کا دو ہزار آج کے دو لاکھ کے برابر تھا۔

پٹھان صرف مسلمان فوجیوں کی لاشوں کا احترام کرتے تھے۔ غیر مسلموں کی لاشوں کے ساتھ تو بہت ہی توہین آمیز سلوک کرتے تھے۔

میں پٹھانوں کے جہاد کی پوری تاریخ نہیں لکھ رہا۔ میری یہ آپ بیتی یا زندگی کا سفر نامہ پڑھنے والوں میں بہت سے خواتین و حضرات مجھ سے کہیں زیادہ تعلیم اور علم والے ہوں گے۔ میں تو صرف دس جماعتیں پڑھا ہوا ہوں۔ تاریخ کی تھوڑی سی سُوجھ بُوجھ رکھتا ہوں۔ اُس دَور کی مکمل تاریخ آپ خود پڑھ لیں جب تحریک مجاہدین کے بانی سیّد احمد شہیدؒ نے صوبہ سرحد کو سکھوں کے خلاف میدانِ جنگ بنایا۔ انگریز سکھوں کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ ہندوستان میں مغلیہ بادشاہی کا سورج غروب ہو چکا تھا۔ سیّد احمد شہیدؒ کے جہاد کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں اسلام کا پرچم لہراتا رہے اور ہندوستان اسلامی سلطنت ہی رہے۔

سیّد احمد شہیدؒ بہت سی فتوحات حاصل کر کے بالاکوٹ پہنچے تو اپنے ان چار پانچ ساتھیوں کے ساتھ جنہیں ان کا جانشین بننا تھا' شہید ہو گئے۔ پوری کی پوری ہائی کمان شہید ہو گئی۔ مجاہدین کا لشکر بددل ہو کر بکھر گیا اور تحریکِ مجاہدین دم توڑ گئی۔ سکھ مجاہدین کے ہاتھوں بہت نقصان اٹھا چکے تھے۔ انگریزوں نے انہیں بالکل ہی ختم کر دیا اور ہندوستان پر اپنے قبضے کو مستحکم کرنے لگے۔

ہندوستان میں تو کئی واقعات ہوئے' سرحد میں یوں ہُوا کہ پٹھانوں نے اپنے پہاڑی علاقے کو مورچہ بنا لیا۔ ہر گھر مورچہ بن گیا۔ پہلے پہلے' پچھلی صدی کے وسط میں' پٹھان تلواروں اور خنجروں سے لڑے پھر ان کے پاس توڑے دار رائفلیں آ گئیں جو انہوں نے فوج سے چھینی تھیں۔ رائفلیں آئیں تو رائفلیں بنانے والے کاریگر بھی آ گئے۔ پھر یوں ہُوا کہ فوج کے پاس 303 رائفل آئی تو یہ پٹھانوں کے پاس بھی آ گئی۔ انہیں مشین گن نہ ملی نہ انہوں نے بنانے کی کوشش کی۔

ابتدا میں پٹھان ہجوم کی صورت میں لڑتے تھے۔ وہ ہلّہ بولنے کے انداز سے حملہ کرتے تھے لیکن مورچہ بند فوج رائفلوں اور مشین گنوں سے ان کا بہت نقصان کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ پٹھانوں نے لڑنے کے انداز بدل دیئے اور وہ گوریلا طریقۂ جنگ پر آ گئے۔ یہ طریقہ کامیاب رہا۔ انہوں نے چھاؤنیوں کے اندر جا کر شبخون مارے اور

خانوں سے رائفلیں اور ایمونیشن اٹھا لے گئے۔ وہ فوجی کنوائیوں پر بھی حملے کرتے تھے۔

○

قبائلی پٹھانوں کی داستانِ شجاعت ایسی ولولہ انگیز اور ایمان افروز ہے کہ سناتے چلے جاؤ اور کہیں ختم ہونے میں نہیں آئے گی۔ انگریز جرنیلوں اور وقائع نگاروں نے ان پر کتابیں لکھی ہیں۔ انہوں نے دشمن ہوتے ہوئے پٹھانوں کی حُبّ الوطنی کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں اب اپنی کہانی پر آ جاؤں۔ اسی سے آپ پر قبائلی علاقے کے اسرار و رمُوز معلوم ہوتے جائیں گے۔

میں قبائلی پٹھانوں کے متعلق اس لئے زیادہ باتیں سنا سکتا ہوں کہ میں ان کا قیدی رہ چکا ہوں۔ یہی وہ واقعہ ہے جو میں نے آپ کو سنانا ہے۔

میری بٹالین بنوں پہنچی تو میں نے دیکھا کہ اتنے بڑے شہر اور اتنی بڑی چھاؤنی کے اردگرد کم و بیش دس فٹ اونچا آہنی جنگلہ تھا جو ڈبل تھا یعنی دو جنگلے تھے۔ دونوں کے درمیان چھ سات فٹ فاصلہ تھا۔ اس میں خار دار تاروں کے گچھے پھینکے ہوئے تھے۔ باہر والے جنگلے پر خار دار تاریں چڑھایا ہُوا تھا جیسے دیوار پر بیل چڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ باہر سے کوئی آدمی یہ جنگلہ پھاند کر اندر نہیں آ سکتا تھا۔

یہ حفاظتی انتظام شہر کے چاروں طرف کیا گیا تھا۔ اس میں چار یا پانچ گیٹ تھے جو جنگلہ نما پھاٹک تھے۔ دن کے وقت کھُلے رہتے اور سورج غروب ہوتے ہی بند ہو جاتے تھے۔ ہر دروازے پر پوری پوری گارد پہرے پر ہوتی تھی۔

بنوں انگریزوں کی عملداری میں تھا لیکن جنگلے کے باہر انگریز کا قانون نہیں چلتا تھا۔ باہر علاقہ غیر تھا۔ بنوں کے اِردگِرد اس قدر مضبوط حفاظتی انتظام کی وجہ یہ تھی کہ اس شہر میں تجارتی منڈی تھی اور تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ قبائلی پٹھانوں نے تین چار بار اس شہر پر حملہ کیا اور منڈی سے کپڑوں کے بے شمار تھان' اناج اور ضرورت کی دیگر اشیاء اٹھا لے گئے تھے۔ انہوں نے رات کو اندر آنے کا کیا طریقہ اختیار کیا اور اتنا سامان لے کیسے گئے تھے' ایک الگ داستان ہے۔

بنوں میں ہماری بٹالین کو دو مہینے ہو گئے تھے۔ ایک روز اچانک حکم ملا کہ پورا بریگیڈ تمبرّ جا رہا ہے۔ تمبرّ بنوں سے پندرہ سولہ میل دُور ایک جگہ ہے۔ آج کل شاید یہ جگہ

قصبہ یا بڑا گاؤں بن گئی ہو۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں' اُس وقت لتمبر چھوٹا سا ایک گاؤں تھا۔

بنوں کا بریگیڈ جس میں میری بٹالین بھی شامل تھی' لتمبر پہنچ گیا اور ایک وسیع و عریض میدان میں خیمے نصب کر دیئے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں خیموں کی بستی آباد ہو گئی۔ میں پہلے بٹالین ہیڈ کوارٹر میں ہوتا تھا پھر میں اے کمپنی میں بھیج دیا گیا تھا۔ یہ رائفل کمپنی تھی۔

قبائلی پٹھانوں کے خلاف یہ ایک جوابی جنگی کارروائی تھی۔ ایسی جنگی کارروائیاں ہوتی ہی رہتی تھیں۔ یہ پہلی جنگی کارروائی تھی جس میں میں شریک ہُوا تھا۔ پٹھان بڑا زبردست وار کر گئے تھے۔ اس جگہ راجپوتانہ رائفلز کی ایک بٹالین کچھ عرصے کے لئے رکھی گئی تھی۔ اس بٹالین نے قریبی پہاڑیوں پر پوسٹیں بنائی ہوئی تھیں جن میں تھوڑی تھوڑی نفری رہتی تھی۔ ایک پوسٹ کیمپ سے تقریباً" چار میل دُور ایک ٹیکری پر تھی۔

اس علاقے سے پکی سڑک گزرتی تھی جو کوہاٹ کو بنوں سے ملاتی تھی۔ اس پر کوئی ٹریفک نہیں ہوتی تھی۔ یہ علاقہ غیر تھا۔ ہفتے میں دو بار اس سڑک سے فوجی کنوائے گزرا کرتی تھی جس کی حفاظت کے لئے سڑک کے دائیں بائیں پہاڑوں پر فوج پھیلا دی جاتی تھی۔ باقی دن سڑک بالکل ویران اور سنسان رہتی تھی۔ یہ علاقہ دراصل میدانِ جنگ تھا۔ کوئی شہری اکیلا دکیلا سفر کر ہی نہیں سکتا تھا۔

ایک روز راجپوتانہ رائفلز کی اس پوسٹ کی بدلی ہونی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پوسٹ میں جو جوان ڈیوٹی پر تھے' ان کا ایک ہفتہ پورا ہو گیا تھا۔ ان کی جگہ دوسرے جوان جا رہے تھے۔ چار میل کا فاصلہ تو انفنٹری کے جوان پیدل طے کیا کرتے تھے لیکن جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی اور انفنٹری کو میکنائز کر دیا گیا تھا یعنی ہر بٹالین کو تھوڑے ٹرک بھی دے دیئے گئے تھے۔

راجپوتانہ رائفلز کے ان جوانوں کی نفری سترہ تھی جو پوسٹ پر جا رہے تھے۔ ان میں ایک حوالدار اور دو لانس نائک اور باقی چودہ سپاہی تھے۔ یہ سب ٹرک پر جا رہے تھے۔ ٹرک پر ترپال نہیں تھا۔ کیمپ سے دو میل دُور گئے تو ٹرک کیمپ والوں کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا کیونکہ وہ پہاڑی علاقہ تھا۔ موڑ زیادہ تھے۔

تقریباً" تین میل آگے گئے تو اونچی پہاڑیاں شروع ہو گئیں۔ وہاں نوّے درجے کا ایک موڑ تھا۔ اس موڑ کے ساتھ ذرا آگے سڑک پر چھوٹی سی ایک پُلی تھی۔ اس کے نیچے سے چھوٹا سا خشک نالہ گزرتا تھا۔ میں نے بعد میں یہ پلی دیکھی تھی۔ زیادہ اونچی نہیں تھی۔ جب ٹرک اس پُلی کے قریب آیا تو دائیں طرف سے ایک گولی آئی جو ڈرائیور کی کھوپڑی میں سے گزر گئی۔ حوالدار اگلی سیٹ پر بیٹھا ہُوا تھا۔ ایک گولی سامنے سے اُس کی شہ رگ میں لگی اور گردن کے پیچھے سے نکل گئی۔ دونوں گولیاں قریب سے فائر کی گئی تھیں۔

ڈرائیور تو فوراً" ہلاک ہو گیا ہو گا چونکہ گولی اُس کے دماغ میں سے گزر گئی تھی۔ ٹرک سڑک کے بائیں طرف ہو گیا۔ آگے پتھریلی جگہ اور ایک ٹیکری تھی۔ اس ٹیکری نے ٹرک کو روک لیا۔ ٹرک میں جو جوان بیٹھے ہوئے تھے وہ گاڑی کا رخ مڑنے اور پھر ٹیکری کے ساتھ ٹکرانے سے ایک دوسرے پر لڑھک گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے بہت سے پٹھان جو یقیناً" پُلی کے نیچے چھپے ہوئے تھے ٹرک میں کود آئے اور خنجروں سے ان جوانوں کو ختم کر دیا۔

خنجر زنی میں قبائلی پٹھان خاص مہارت رکھتے تھے۔ پٹھان عورتیں بھی اسی مہارت سے خنجر چلاتی تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ آدمی کو فوراً" ختم کرنے کے لئے خنجر کہاں اور کتنی بار مارا جاتا ہے۔ اس ٹرک کو گھات لگا کر روکا گیا تھا۔ پٹھانوں نے معلوم کر لیا ہو گا کہ اس پوسٹ کی نفری کی بدلی کس دن اور کس وقت ہو گی۔ وقت بڑا خطرناک تھا۔ جب ٹرک پر حملہ ہُوا اُس وقت سورج غروب ہو گیا تھا۔ ایک حکم تھا کہ سورج غروب ہونے کے بعد کیمپ سے یا چھاؤنی سے کسی کی مدد کے لئے کوئی نفری نہ بھیجی جائے۔ جس پوسٹ پر یہ لوگ جا رہے تھے وہ ذرا ہی آگے ایک اونچی ٹیکری پر تھی۔ دو گولیاں فائر ہونے سے پوسٹ الرٹ ہو گئی تھی لیکن پوسٹ والوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس کی بدلی کے لئے آنے والی نفری نیچے کٹ گئی ہے۔

یہاں میں ایک خاص بات بتانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ہے کہ پٹھانوں کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ آج فلاں وقت پوسٹ کی نفری کی بدلی کے لئے جوان آ رہے ہیں۔ یہ پٹھانوں کی جاسوسی کا ایک خفیہ انتظام تھا۔ کیمپ میں اور چھاؤنیوں میں بھی باہر سے پٹھان مختلف کام کرنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ انہیں سرکاری اصطلاح میں قُلی کہا کرتے تھے۔ ان میں

بعض قبائلی ہوتے تھے جو بڑی خوبی سے فوج کی نقل و حرکت کی جاسوسی کرتے تھے۔

قبائلیوں کی جاسوسی کا دوسرا ذریعہ فوج کے مسلمان جوان تھے۔ مسلمان سپاہی سے لے کر مسلمان صوبیدار تک قبائلی پٹھانوں کے حامی تھے۔ جب کبھی بریگیڈ نے یا کسی یونٹ نے باہر جانا ہوتا تھا تو مسلمان ہی قبائلیوں کو یہ خبر دے دیا کرتے تھے۔ ایسے بھی ہوتا تھا کہ کہیں قبائلیوں کے ساتھ آمنے سامنے فائرنگ ہوتی تھی تو مسلمان فوجی اپنی رائفلوں اور مشین گنوں کی نالیاں ذرا سی اونچی رکھتے تھے تاکہ گولیاں پٹھانوں کے اوپر سے گزر جائیں۔ اُس زمانے میں فوجی پگڑیاں باندھتے تھے جو خاکی رنگ کی ہوتی تھیں۔ مسلمانوں کی نشانی یہ تھی کہ ان کی پگڑیوں کے شملے ہوتے تھے۔ قبائلی پٹھان شملے والی پگڑی پر کبھی فائر نہیں کرتے تھے لیکن انگریز بڑی چالاک قوم تھی۔ وہ مسلمانوں کو بعض خاص قسم کی صورت حال میں ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ ملا دیتے تھے۔ اس طرح بعض اوقات مسلمان بھی پٹھانوں کی گولیوں سے مارے جاتے تھے۔



میں اُس ٹرک کی بات کر رہا تھا جس پر حملہ ہُوا تھا۔ سترہ جوانوں میں سے صرف دو زندہ رہے۔ وہ بھی اس طرح کہ وہ اپنے ساتھیوں کے نیچے آ گئے تھے۔ اندھیرا بھی ہو گیا تھا۔ پٹھان جلدی میں بھی تھے۔ انہوں نے تمام رائفلیں، ایمونیشن اکٹھا کیا۔ سب کی پگڑیاں اُتار کر اکٹھی کر لیں اور جو ہاتھ لگا لے گئے۔ اُن کی زیادہ تر دلچسپی رائفلوں اور ایمونیشن کے ساتھ تھی۔ ایک تو وہ ایمونیشن تھا جو ہر جوان کے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ ایمونیشن کے چار پانچ بکس بھرے ہوئے تھے۔

یہ جو دو سپاہی زندہ رہ گئے تھے، ان میں ایک زخمی تھا۔ اُس کے کندھے پر خنجر لگا تھا اور دوسرا بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ پٹھان چلے گئے ہیں اور ہر طرف خاموشی ہو گئی ہے تو وہ وہاں سے نکلے اور ڈرتے کانپتے چل پڑے۔ آخر وہ کیمپ میں پہنچ گئے اور اطلاع دی کہ ساری نفری ماری گئی ہے۔

حکم یہ تھا کہ رات کو کوئی کیمپ سے باہر نہ نکلے لیکن اس بٹالین کا انگریز کمانڈنگ آفیسر کوئی بڑا ہی دلیر آدمی تھا۔ اُس نے دو رائفل کمپنیاں لیں اور خود ان کے ساتھ گیا۔ یہ ساری فورس پیدل گئی تھی۔ کمانڈنگ آفیسر نے دونوں کمپنیوں کو ہر طرف اِرد گرد پہاڑوں پر پھیلا دیا اور اپنے ساتھ ضرورت کے مطابق نفری رکھی جس سے اُس نے ٹرک

کو دھکا لگوا کر سڑک پر کیا۔ ڈرائیور اور حوالدار کی لاشوں کو ٹرک میں ڈالا۔ ٹرک کو سٹارٹ کیا تو وہ سٹارٹ ہو گیا۔ اس طرح لاشوں سے بھرا ہوا ٹرک کیمپ میں لے آئے اور کمپنیاں واپس آ گئیں۔

یہ جو دو سپاہی زندہ بچ رہے تھے، انہوں نے حملے کا پورا واقعہ سنایا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ حملہ آور پٹھانوں میں عورتیں بھی تھیں۔ انہوں نے ان عورتوں کو دیکھا تو نہیں تھا، ان کی آوازیں سنی تھیں۔ قبائلی علاقے میں ایسے ہی کئی اور واقعات ہوئے تھے جن میں پٹھان عورتیں بھی شامل تھیں۔

اس علاقے میں پٹھانوں نے ایک اور پوسٹ پر شب خون مارا تھا۔ وہ کوئی اسلحہ بارود تو نہیں لے جا سکے تھے لیکن جانی نقصان کر گئے تھے۔

جب کسی علاقے میں اس قسم کے دو تین واقعات ہو جاتے تھے تو انگریز اس علاقے پر فوج کشی کرتے تھے جسے PUNITIVE EXPEDITION یعنی تعزیری مہم کہا جاتا تھا۔ یہ ایک بڑی ظالمانہ کارروائی ہوتی تھی۔ فوج کو سارے علاقے میں پھیلا دیا جاتا اور جو گاؤں راستے میں آتا اسے تباہ کر دیا جاتا تھا۔ پٹھانوں کو پہلے پتہ چل جاتا تھا اس لئے وہ گاؤں خالی کر جاتے تھے۔ ان کے گھروں میں کوئی فرنیچر اور زیادہ مال اسباب تو ہوتا نہیں تھا۔ ان کے بیوی بچے ہوتے تھے یا مویشی اور بکریاں۔ انہیں ساتھ لے کر وہ ادھر اُدھر ہو جاتے تھے۔ وہ فوج کے سامنے جا رہے ہوتے تھے لیکن حکم یہ تھا کہ کسی بوڑھے اور بچے کو اور کسی عورت کو گرفتار نہیں کرنا نہ انہیں کسی بھی طریقے سے تنگ کرنا ہے۔ انگریز جانتے تھے کہ ایک پٹھان عورت پر ہاتھ اٹھایا گیا تو پٹھان ایک پوری چھاؤنی پر حملہ کر کے انتقام لیں گے۔ فوج کے لئے حکم تھا کہ کسی گاؤں کو سلامت نہ رہنے دیا جائے۔ آج کل کے متعلق میں نہیں کہہ سکتا کہ وہاں کے گاؤں کیسے ہیں، میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں، اس وقت وہاں کوئی بڑا گاؤں نہیں ہوتا تھا۔ چند ایک مکان ایک جگہ ہوتے اور اس سے خاصے فاصلے پر دو تین اور مکان نظر آ جاتے تھے۔ یہ سب مکان پتھروں اور گارے کے بنے ہوتے تھے۔ انہیں گرا دیا جاتا تھا اور کبھی یوں بھی ہوتا کہ ان پر توپوں کے گولے فائر کئے جاتے تھے۔

یہ ایک بزدلانہ کارروائی ہوتی تھی۔ ویت نام میں امریکہ ایسی ہی انتقامی اور تعزیری کارروائیاں کیا کرتا تھا۔ ذرا سے شک پر پورے کے پورے گاؤں کو نذر آتش کر دیا جاتا

تھا۔ عورتوں اور بچوں کو نیپام بموں سے جلا دیا گیا تھا۔ زہریلی گیس تک استعمال کی گئی تھی۔ آخر امریکہ کو شکست کھا کر وہاں سے بھاگنا پڑا تھا۔ انگریزوں نے بوڑھوں، عورتوں اور بچوں پر تو ہاتھ نہیں اٹھایا تھا لیکن ان کے گھر تباہ کر دینا ان کے فصل روند ڈالنا کچھ کم ظلم نہیں تھا۔

یہ تعزیری کارروائی دو مہینے اور کبھی تین مہینے جاری رہتی تھی۔ پورا بریگیڈ باہر نکل جاتا اور خانہ بدوشوں کی طرح آج یہاں کل وہاں کیمپ لگاتا سارے علاقے میں گھوم پھر جاتا تھا جس طرح سر میں کنگھی پھیری جاتی ہے لیکن لڑنے والا کوئی ایک بھی پٹھان فوج کے ہاتھ نہیں آتا تھا۔

لڑنے والے قبائلی یعنی جوان اور ادھیڑ عمر، اس کارروائی کے دوران پہاڑیوں کے اندر چلے جاتے تھے لیکن وہ رُوپوش ہونے کے لئے نہیں جاتے تھے بلکہ لڑنے کے لئے جاتے تھے۔ فوج ان ہی پہاڑیوں کے اندر جاتی تھی۔ پٹھان ان پہاڑیوں پر موجود ہوتے تھے لیکن دُبکے رہتے اور جب فوج پہاڑیوں کی خاک چھان کر واپس ہوتی تھی تو پٹھان فوج کے پچھلے حصے (ریئر گارڈ) پر فائرنگ شروع کر دیتے تھے۔

میں اپنا واقعہ سناتا ہوں۔



راجپوتانہ رائفلز کے ٹرک پر پٹھانوں نے حملہ کر کے اتنے زیادہ جوانوں کو مار ڈالا اور تمام رائفلیں اور ایمونیشن لے گئے تو بنوں کے بریگیڈ کو اس علاقے میں تعزیری کارروائی کا حکم ملا۔ میری بٹالین بھی اس میں شامل تھی۔ کارروائی آدھی رات کے وقت شروع کی گئی۔ تمبّر سے بنوں کی طرف جاؤ تو دائیں طرف بہت دور تک ریگستانی میدان پھیلا ہوا ہے اور جہاں یہ میدان ختم ہوتا ہے وہاں سے پہاڑیاں شروع ہوتی ہیں۔

رات کو ہم اس میدان سے گزرے۔ ابھی صبح طلوع نہیں ہوئی تھی کہ ہم پہاڑی علاقے میں پہنچ گئے تھے اور ایک پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔ صبح کی روشنی پھوٹی تو ہم پہاڑی کے اوپر تھے۔ میں یہ تفصیلات سنا کر بات کو لمبا نہیں کرنا چاہتا کہ تعزیری کارروائی کس طرح کی گئی اور قبائلیوں نے بھی کچھ کیا تھا یا نہیں۔ میں اتنا ہی بتانا کافی سمجھتا ہوں کہ بریگیڈ ان پہاڑوں میں دور تک پھیل گیا۔ اُس روز توپخانے نے بھی پہاڑیوں پر گولہ باری کی تھی۔ دُور کہیں رائفلوں اور مشین گنوں کی بھی فائرنگ ہوتی رہی تھی۔

میری کمپنی کو ایک پہاڑی کی چوٹی پر پکٹ بنانے کا حکم ملا۔ پکٹ ایک قسم کا مورچہ ہوتا ہے۔ فوراً پتھر اکٹھے کر کے ایک گول دیوار کھڑی کر دی گئی۔ اس میں دو یکشنوں نے رہنا تھا۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ ہم چوبیس جوان تھے اور ایک حوالدار ہارا کمانڈر تھا۔ دیوار کو ہم نے پتھر رکھ رکھ کر کم و بیش پانچ فٹ اونچا کر لیا۔ ہمارے ساتھ دو خچریں بھی تھیں جن پر ایمونیشن کے بکس لدے ہوئے تھے۔ بکس اتار کر خچروں کو بھی پکٹ کے اندر کر لیا۔ ہمارے ساتھ سگنل پلاٹون کے دو جوان بھی تھے۔ اس وقت ھنڈی اور آئینے سے پیغام بھیجے جاتے تھے۔

پہاڑی لڑائی میں، خصوصاً قبائلیوں کے ساتھ لڑائی میں پہاڑیوں پر اس قسم کی پٹیں بنائی جاتی تھیں۔ ان سے نیچے دُور دُور علاقہ نظر آتا تھا۔

دن گزر گیا۔ بریگیڈ پہاڑیوں سے نکلا اور دامن میں ایک وسیع میدان میں رک لیا۔ رات کو بغیر خیموں کے وہیں قیام کرنا تھا۔ اسی لئے پہاڑیوں میں ہماری پکٹ جیسی ن چار اور پکٹیں بنائی گئی تھیں۔ یہ کیمپ کی حفاظت کا انتظام تھا۔

رات خیریت سے گزر گئی۔ دوسرے دن پھر بریگیڈ پہاڑیوں کے اندرونی علاقے ں چلا گیا اور شام کو واپس ہُوا۔ اُس روز بھی توپ خانے کی گولہ باری ہوئی تھی۔ وٹے ہتھیاروں کی بھی فائرنگ ہوئی تھی۔ ہم پکٹ میں رہے۔ ہمیں کچھ خبر نہیں ں کہ یہ گولہ باری یا فائرنگ کہاں ہوئی اور کیوں ہوئی تھی۔ ہماری پکٹ کی ذمہ داری ے علاقے میں کچھ بھی نہیں ہُوا تھا۔ ہم الرٹ رہے۔

شام کو بریگیڈ پھر کیمپ والی جگہ آ گیا۔ ہمیں خچر کے ذریعے کھانا اوپر بھیجا جاتا تھا۔ م کے کھانے کے ساتھ ہمارے حوالدار کے لئے یہ پیغام آیا کہ علی الصبح بریگیڈ واپس ئے گا اور ہم پکٹ اُس وقت چھوڑیں گے جب بریگیڈ کم از کم ایک میل دُور نکل گیا گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پہاڑیوں پر جو چار پانچ پکٹیں تھیں، یہ بریگیڈ کے ریئر کی ظت کریں گے۔

یہ ذہن میں رکھیں کہ پہاڑی کے دامن سے ریگستان شروع ہو جاتا تھا جو کم و بیش یل چوڑا اور اُس سے کچھ زیادہ لمبا تھا اور یہ سڑک تک جاتا تھا۔ اس کے دائیں اور ں ٹیکریاں تھیں۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ مری اور کشمیر جیسے سرسبز پہاڑ نہیں تھے رختوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ یہ بالکل ننگے، پتھریلی زمین جیسے پہاڑ تھے جن پر گھاس

کی ایک ہری پتی بھی نظر نہیں آتی تھی۔ یہ بہت بڑا خطرہ تھا۔

○

صبح ہوئی اور بریگیڈ واپس چل پڑا۔ جہاں بریگیڈ نے کیمپ کیا تھا وہ جگہ ذرا اونچی تھی۔ بریگیڈ ابھی نصف میل ہی گیا ہو گا کہ کم و بیش بیس پٹھان دوڑتے آئے اور کیمپ کی خالی جگہ بکھر کر جہاں آڑ ملی وہاں پوزیشن لے لی اور بریگیڈ پر فائرنگ شروع کر دی۔ بریگیڈ کسی ترتیب میں نہیں جا رہا تھا۔ تقریباً ایک میل دائیں بائیں ہر یونٹ بندہ بندہ ہو کر بکھری ہوئی تھی۔ اس علاقے اور ایسی صورتِ حال میں اسی طرح بے ترتیب ہو کر ایک دوسرے سے دُور دُور پیچھے آتے تھے۔ اگر اکٹھے (کلوز فارمیشن) میں پیچھے آتے تو بغیر شست لئے گولی فائر کرتے تو کسی نہ کسی فوجی کو لگ جاتی۔

وہ پٹھان ہماری پکٹ سے بہت دُور اور نیچے تھے۔ ہماری رائفلوں اور لائٹ مشین گنوں کی گولیاں وہاں تک پہنچ سکتی تھیں لیکن پٹھان پوزیشنیں بدل کر فائر کرتے تھے۔ بریگیڈ کے عقب کو محفوظ رکھنا ہماری ڈیوٹی تھی لیکن پٹھان بریگیڈ کے تعاقب میں رہے تھے اس لئے ہماری ارینج سے نکل گئے تھے۔

ہمارے لئے یہ حکم تھا کہ جب بریگیڈ خاصا آگے نکل جائے تو ہم پکٹ سے اُتر آئیں اور بریگیڈ سے مل جائیں۔ ہمارے حوالدار نے ہمیں حکم دیا کہ پکٹ سے نکلو۔

"یہ سوچ لو جوانو!" — اُس نے کہا — "راستے میں پٹھان ہیں۔ آج ان کے ساتھ دوبدو مقابلہ ہو گا"۔

"نہیں استاد!" — میرے سیکشن کمانڈر نائک نے کہا — "وہ ہمیں پہچان لیں گے۔ ہم ان پر گولی نہیں چلائیں گے"۔

نائک کی بات ابھی مکمل ہوئی تھی کہ ہمارے ایک ساتھی کے منہ سے بڑی سی آواز نکلی — "ہا.....ہا" — ہم نے اُدھر دیکھا۔ ہمارا ایک سپاہی جو ضلع جہلم کسی گاؤں کا رہنے والا تھا، پکٹ کی دیوار سے ایک دو قدم پیچھے ہٹا اور چکرا کر گرا۔ اس کے ماتھے سے چشمے کی طرح خون پھوٹ رہا تھا۔ یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اسے گولی لگی ہے۔ گولی سر کے پیچھے سے نکلی تھی۔ وہاں سے خون اُبل اُبل کر نکل رہا تھا۔ گولی میں جدھر سے نکلتی ہے اُدھر زخم چوڑا ہوتا ہے۔

وہ مر چکا تھا۔

ہمارے جوان رائفلیں دیوار پر رکھ کر فائر کرتے تھے۔ اب ہم فائر نہیں کر رہے تھے۔ اس سپاہی کے گرتے ہی سب نے سر نیچے کر لئے اور اس کے ساتھ ہی ہم پر دو گولیاں اور فائر ہوئیں ..... ہم گھیرے میں آ گئے تھے۔ یہ پٹھانوں کی ایک خاص چال تھی۔ وہ اپریشن ختم ہونے کے بعد اُس وقت کسی ایک پکٹ کو گھیرے میں لے لیا کرتے تھے جب فوج واپس جا رہی ہوتی تھی اور پکٹیں چھوڑ کر نیچے آنے کا حکم ملتا تھا۔ پٹھان اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے تھے کہ پکٹ کو اب کہیں سے مدد نہیں مل سکے گی۔

پکٹ والے اپنے دفاع کے لئے پکٹ ایسی چوٹی پر بناتے تھے جہاں ہر طرف ڈھلان ہوتی تھی۔ حملہ آوروں کو پکٹ تک آنے میں بہت مشکل پیش آتی تھی۔ ہماری پکٹ ایسی جگہ تھی جہاں دو طرف ڈھلان نہیں تھی۔ پٹھان ان دونوں اطراف سے قریب آ رہے تھے۔ اُن کے لئے آڑ بڑی اچھی تھی۔

"بھائیو!" — ہمارے حوالدار نے بلند آواز سے کہا — "ہم سب مسلمان ہیں۔ ہم تم پر فائر نہیں کریں گے"۔

"تم کافر ہے" — اُدھر سے اعلان ہُوا — "تم نے ہمارا بھائی پر فیر کیا۔ ہم تم کو نہیں جانے دے گا"۔

"ہم نے تمہارا نقصان نہیں کیا" — حوالدار نے کہا — "ہم نے تمہارے ساتھیوں پر سیدھا فائر نہیں کیا تھا"۔

"تم رَفل اور ایمونیشن اِدھر چھوڑو اور جاؤ" — پٹھان نے اعلان کیا — "ہم تم کو کچھ نہیں بولے گا"۔

اُس روز پٹھانوں کا مُوڈ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے شاید صرف اُس دن کے لئے یہ اصول توڑ دیا تھا کہ مسلمان فوجیوں پر گولی نہیں چلانی۔ ان کے گھر گرا دیئے گئے تھے۔ ہمارا بریگیڈ یا اپنی بٹالین کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ایسی صورت میں حکم یہ ہوتا تھا کہ ہتھیار اور ایمونیشن اٹھاؤ اور پکٹ سے بھاگو۔

حوالدار نے دیکھنے کی کوشش کی کہ محاصرہ ہر طرف ہے یا کوئی طرف خالی ہے۔ ایک طرف پٹھان زیادہ تھے۔ حوالدار نے ایک گرینیڈ نکالا اور ہمیں کہا کہ جونہی گرینیڈ پھٹے، تین چار جوان اس طرف نکل جاؤ اور پہاڑی سے اُتر جاؤ..... یہ کہہ کر اُس نے

گرینیڈ کی پن نکال کر ایک طرف پھینک دیا۔ بڑے زور کا دھماکہ ہُوا۔

میں تین جوانوں کے ساتھ پکٹ سے نکلا۔ میں آگے تھا۔ میں نے نہیں دیکھا کہ میرے ساتھ نکلنے والے جوان کس طرف نکل گئے۔ میں ایک طرف ڈھلان دیکھ کر کُودتا پھلانگتا نکلا تھا۔ دل اور دماغ پر یہ خوف سوار تھا کہ ابھی کسی پٹھان کی گولی آئے گی اور میں مارا جاؤں گا۔ اس خوف کی وجہ سے اور پہاڑی کی ساخت کی وجہ سے میں پہاڑی کی پچھلی طرف چلا گیا۔ ایک جگہ پاؤں پھسلا اور لڑھکتا ہُوا نیچے چلا گیا۔ بڑی مشکل سے سنبھلا۔ معمولی چوٹیں آئیں تھیں۔

پہاڑی خاصی اونچی تھی۔ میں اترتا چلا گیا' اور نیچے جا پہنچا۔ ادھر ادھر دیکھا تو میرے دل پر ہول طاری ہو گیا۔ میرے سامنے پتھریلی ٹیکریاں اور گہرے سلیٹی رنگ کی نوکیلی چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وحشت تھی اور ہیبت تھی۔ اگر کوئی پرندہ نظر آ جاتا تو میں کہتا کہ میرے علاوہ یہاں کوئی جاندار بھی موجود ہے۔ وہاں تو زندگی کے کوئی آثار ہی نہیں تھے۔ وہ تو جنوں اور بھوتوں کا دیس لگتا تھا۔ کبھی ایسا خوفناک سا احساس ہوتا کہ میں ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔

میرا رشتہ میری دنیا سے کٹ گیا تھا۔

یہ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میں اس اتنی اونچی پہاڑی سے اُترا کس طرح ہوں۔ سمت کا تو کچھ خیال رہا ہی نہیں تھا۔ پہاڑی کے اُس طرف یہ ہنگامہ کہ بریگیڈ واپس جا رہا تھا اور پٹھان اُس کے تعاقب میں تھے' اور پہاڑی کے اِس طرف بھیانک سناٹا تھا۔

○

میں ایک طرف چل پڑا۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ میں موت کی طرف جا رہا تھا یا زندگی کی طرف۔ میرے پاس رائفل تھی' ستر راؤنڈ ایمونیشن پوچوں میں ڈالا ہُوا تھا۔ پٹھانوں کی دلچسپی ان ہی دو چیزوں کے ساتھ تھی جو میں اُن کے حوالے کر کے اپنی جان بچا سکتا تھا لیکن یہ پکی بات نہیں تھی کہ انہوں نے مجھے چھوڑ ہی دینا تھا۔ فوجی کبھی کبھی اُن کے ہاتھ آتا تھا۔ میں نے اِن قبائلی پٹھانوں کے متعلق بڑی خوفناک باتیں سن رکھی تھیں۔ اگر کوئی ہندو یا سکھ فوجی ان کے ہاتھ چڑھ جاتا تو اسے وہ زندہ نہیں چھوڑتے تھے۔ ایک بات مشہور تھی کہ قبائلی پٹھان کسی ہندو یا سکھ فوجی کو پکڑ لیتے ہیں تو ایک جشن مناتے ہیں۔ روایت کے مطابق یہ بات اس طرح بیان کی جاتی تھی کہ تمام قبیلہ اکٹھا ہو جاتا

ہے۔ قیدی کو درمیان میں کھڑا کر لیتے ہیں۔ ایک طرف آگ پر چھوٹا توا رکھا ہوتا ہے جو لال سرخ ہو جاتا ہے۔ ایک آدمی اس توے کو لکڑیوں سے تھام کر اُٹھا لیتا ہے۔ ادھر ایک پٹھان پیچھے سے قیدی کی گردن پر ایسی مہارت سے تلوار چلاتا ہے کہ سر جسم سے الگ ہو جاتا ہے۔ توے والا آدمی فوراً" توا کٹی ہوئی گردن پر رکھ دیتا ہے۔ اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ سر کٹی لاش گرتی نہیں بلکہ ناچنے لگتی ہے۔ اگر گر پڑے تو بھی اس طرح تڑپتی ہے جیسے کٹھ پتلی کو نچایا جا رہا ہو۔ اس دوران پٹھان اس کے اِرد گِرد ڈھول کی تھاپ پر ناچتے ہیں۔

یہ مجھے ان قبائلیوں میں جا کر معلوم ہُوا تھا کہ یہ بات من گھڑت ہے۔ لیکن دو تین پٹھانوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ ایسا کرتے ہیں۔ یہ بات جو میں نے آپ کو سنائی ہے' صحیح تھی یا غلط' یہ بالکل صحیح ہے کہ وہ غیر مسلم فوجی کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتے تھے۔

میں مسلمان تھا۔ یہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ مسلمان کے ساتھ ان کا سلوک ویسا ہی ہوتا تھا جیسا دو مسلمان بھائیوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے لیکن اُس دن ان قبائلیوں کا مُوڈ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ جب ہماری پکٹ کو اُنہوں نے گھیرے میں لیا تو ہمارے حوالدار نے بلند آواز میں کہا تھا کہ ہم مسلمان ہیں۔ ایک پٹھان نے جواب دیا تھا کہ تم کافر ہو' تم نے ہمارے آدمیوں پر فائر کیا ہے۔ اس پٹھان کی اسی بات نے میرے اندر خوف پیدا کر دیا تھا کہ انہوں نے اگر مجھے پکڑ لیا تو میرے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو یہ ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

میرے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ میں جاؤں کہاں۔ چھُپنے کے لئے تو وہ علاقہ بہت ہی موزوں تھا۔ میں کہیں بھی بیٹھ جاتا تو خُدا کے سوا مجھے کوئی بھی نہ دیکھ سکتا لیکن کب تک وہاں بیٹھا رہتا؟ زندہ کیسے رہتا۔ وہ علاقہ ایسا تھا جہاں سے کبھی کوئی انسان نہیں گزرا ہو گا۔ دوسرا خطرہ سانپوں اور بچھوؤں کا تھا۔ یہ میں جانتا تھا کہ صحرا اور پتھریلے علاقے کے سانپ اور بچھو اتنے زہریلے ہوتے ہیں کہ ڈس لیں تو چند منٹوں میں آدمی مر جاتا ہے۔

مجھے قریب ہی توپوں کے گولے پھٹنے کے دھماکے سنائی دیئے۔ ان ننگے اور خشک پہاڑوں میں ایک بات یہ بھی تھی کہ ایک گولی فائر ہوتی یا دُور سے توپ کا فائر کیا ہوا گولہ پہاڑوں کے اندر پھٹتا تو اُس کی گونج وادیوں کے اندر کچھ دیر تک گھومتی رہتی تھی۔ یہ گونج بڑی ہی ڈراؤنی ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے توپ کا گولہ پہاڑوں کے درمیان اُڑتا پھر رہا ہے اور اسے جو بھی آدمی نظر آئے گا اس کے جسم کے پرخچے اُڑا دے گا۔ ہرے

بھرے اور درختوں والے پہاڑوں میں ایسا نہیں ہوتا۔

میں نے دھماکے سنے جو اوپر تھے اور قریب ہی تھے۔ میں جان گیا کہ ہماری پکٹ ملاپ اپنی بٹالین یا بریگیڈ سے ہو گیا ہے اور انہیں پکٹ سے نکالنے کے لئے پکٹ ارد گرد گولے فائر کئے جا رہے ہیں۔ اُس طرف اب کچھ بھی ہوتا' وہ میرے کام نہیں آسکتا تھا۔ میں اب اُن تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ایک ہی ذریعہ تھا کہ میں پھر اُس پہاڑی چڑھ جاتا' دوسری طرف اتر جاتا اور چھپتا چھپاتا اُدھر کو بھاگ اٹھتا جدھر بریگیڈ گیا تھا۔ میں نے یوں کرنے کا ارادہ کیا بھی لیکن اس خیال سے یہ ارادہ دل سے نکال دیا کہ اوپر مجھے پٹھان دیکھ سکتے ہیں جنہوں نے ہماری پکٹ کو گھیرے میں لیا تھا۔ انہوں نے تو مجھے چھوڑنا ہی نہیں تھا کیونکہ توپوں کی گولہ باری سے ان کا جانی نقصان ہُوا ہو گا۔ انہوں تو مجھے دیکھتے ہی گولی مار دینی تھی یا اٹھا کر پہاڑی سے نیچے پھینک دینا تھا۔ میں جانتا تھا پٹھان خون کا بدلہ خون سے لینا اپنا فرض سمجھتا ہے اور جب تک وہ بدلہ نہیں لے لیتا اپنے آپ کو بے غیرت سمجھتا رہتا ہے۔

خوف اور دہشت نے میری جسمانی اور روحانی توانائی بہت ہی کمزور کر دی تھی اس کے ساتھ ہی پیاس نے مجھے بے حال کرنا شروع کر دیا۔ میں منہ بند کرتا تھا تو میں کانٹے چبھنے کا احساس ہوتا تھا۔ میں جوان آدمی تھا' برداشت کرتا رہا اور آہستہ آہستہ چلتا گیا۔ میں نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ میں بڑی تیزی سے بے جان ہوتا جا ہوں اور میری سوچنے کی صلاحیت بھی کمزور ہو رہی ہے۔ اگر ان پہاڑوں پر گھاس جھاڑیاں اور درخت ہوتے تو اس ہریالی کا بڑا اچھا اثر ہوتا اور اگر پانی نہ ملتا تو میں سے شبنم کے قطرے چوس لیتا لیکن وہ پہاڑ ایسے تھے جن پر خدا کا قہر برس رہا تھا۔ سو سر پر آگیا تھا۔ اس کی گرمی تو تھی ہی' دوسری تپش خشک چٹانوں کی تھی جو دھوپ تپنے لگی تھیں۔

میں ایک چٹان سے دائیں طرف مُڑ گیا۔ ادھر بھی ایسی ہی چٹانیں تھیں۔ جہاں جہاں سے ان چٹانوں نے رستہ دیا' میں ادھر مُڑتا گیا اور پھر میں ایک جگہ رک گیا۔ مجھے بھیانک خیال آیا کہ میں اتنا زیادہ مُڑ مُڑ کر کہیں اُسی جگہ ہی تو نہیں پہنچ گیا جہاں سے تھا؟ لیکن میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ کچھ سوچ کر میں ایک چٹان کے اوپر گیا اور ہر طرف دیکھا۔ ایک طرف تو وہ پہاڑ کھڑا تھا جس پر میری پکٹ تھی اور اس

دامن میں چٹانوں کا ایک سلسلہ تھا۔ میں نے یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ میں کہاں ہوں اور مجھے کس طرف جانا چاہئے۔ کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ یہ کچھ کچھ پتہ چلتا تھا کہ میں چٹانوں کی ان دہشتناک بھول بھلیوں سے نکل جاؤں تو آگے میدانی علاقہ مل جائے گا یا وہاں چھوٹی بڑی ٹیکریاں ہوں گی اور شاید وہاں پانی بھی مل جائے گا جو بظاہر ناممکن نظر آتا تھا۔ اس طرف ڈیڑھ دو میل دور ایک اور پہاڑ تھا۔

میں اس چٹان سے اُترا۔ یہ دراصل سلوں والی چٹانیں تھیں۔ سنبھل کر پاؤں رکھنا پڑتا تھا۔ ایک جگہ میرا پاؤں ٹھیک نہ پڑا۔ ایسا پھسلا کہ میں قلابازیاں کھاتا نیچے آپڑا۔ رائفل ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ میں گر کر اٹھ رہا تھا تو رائفل میرے پیچھے پیچھے آرہی تھی جو میں دیکھ اور سمجھ نہ سکا۔ اس کے گرنے کی آوازوں سے میں بدک گیا کہ مجھے پکڑنے کے لئے قبائلی دوڑے آرہے ہیں۔ اتنے میں رائفل میرے قدموں میں آگری اور میں نے اٹھالی۔

میرا سر چکرانے لگا۔ ایک بار تو یوں محسوس ہُوا جیسے خوفناک پہاڑوں اور دہشتناک چٹانوں کی یہ دنیا میرے ارد گرد ایک دائرے میں گھوم رہی ہو۔ میں بیٹھ گیا۔ اُس وقت صرف ایک خواہش اور ضرورت دل میں رہ گئی تھی کہ پانی کے دو گھونٹ مل جائیں۔ مجھے یاد نہیں آرہا کہ میں بے ہوش ہو گیا تھا یا آنکھ لگ گئی تھی۔ اتنا یاد ہے کہ وہاں کچھ وقت گزر گیا تھا اور میں اپنے آپ میں ہی کہیں گم ہو گیا تھا۔

میں اُٹھنے لگا تو میں نے محسوس کیا کہ میں تندرست جوانوں کی طرح نہیں اُٹھ سکوں گا۔ میں رائفل کے سہارے اٹھا اور ارد گرد دیکھا۔ سامنے بڑے پہاڑ کی چوٹی نظر آرہی تھی۔ یوں نظر آیا جیسے پہاڑ آہستہ آہستہ جھُول رہا ہو۔ پھر ان چٹانوں کو دیکھا جن کے درمیان میں کھڑا تھا۔ یوں لگا جیسے آگے اور پیچھے والی چٹانیں میری طرف بڑھ رہی ہوں اور یہ مجھے چکی کے دو پاٹوں کے درمیان آتے ہوئے دانے کی طرح پیس ڈالیں گی۔ میرے منہ سے اپنے آپ ہی چیخ نکل گئی۔

"اللہ ..... یا اللہ!" ــــ میں نے رائفل پھینک کر دونوں ہاتھ آسمان کی طرف کر کے بلند آواز سے کہا ــــ "تیری ذاتِ باری ہر چیز پر قادر ہے۔ تُو نے حضرت یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ سے نکالا تھا' اپنے اس گنہگار بندے کو ان خوفناک چٹانوں کے پیٹ سے نکال دے"۔

مجھے دھچکا سا لگا۔ صاف طور پر محسوس ہُوا کہ کسی نظر نہ آنے والی طاقت نے مجھے دھکا دیا ہے۔ مجھے خیال آگیا کہ یونسؑ تو پیغمبر تھے اور میں گناہگار انسان ہوں۔ میں اس طرح بیٹھ گیا جیسے مجھ میں پاؤں پر کھڑا رہنے کی طاقت نہ رہی ہو۔ یہ شاید میرے دماغ کی خرابی تھی یا میرے تصوّروں کا سلسلہ اُلٹ ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا۔ میں وردی میں نہیں بلکہ اُن عام سے کپڑوں میں تھا جو میں گھر پہنا کرتا تھا۔ یہ میری شبیہہ تھی جو تین چار سیکنڈ میرے سامنے رہی اور غائب ہو گئی۔ میں نے اپنے سر کو زور زور سے دائیں بائیں جھٹکا۔ میں نفسیات اور ڈاکٹری کے علوم سے بالکل ہی واقف نہیں تھا۔ اپنی شبیہہ دیکھ کر مجھے یہ خیال آیا کہ خدا نے مجھے میرا اصلی روپ دکھایا ہے اور شاید یہ اشارہ دیا ہے کہ مجھے میرے گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔

یہ تو انسان کی سرشت ہے کہ اُس پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو وہ گناہوں سے توبہ کرتا اور خدا کو یاد کرتا ہے اور جب اسے خدا مال و دولت اور تندرستی جیسی نعمت عطا کرتا ہے تو وہ سب سے پہلے خدا کو دل سے نکالتا اور اپنے آپ کو اور سب کو یہ تاثر دیتا ہے کہ مجھ سا اور کوئی نہیں۔

مجھے اپنے گناہ یاد آنے لگے۔ سب سے پہلے واجدہ یاد آئی۔ اُس کے باپ نے اُسے میرے حوالے کیا تھا کہ میں اُسے تعلیم دوں لیکن میرا اس کے ساتھ عشق بازی کا ڈرامہ چل پڑا۔ یہ صحیح ہے کہ محبت کا اظہار اُس نے کیا تھا لیکن میں اُس کا استاد تھا۔ یہ میرا فرض تھا کہ اسے ان فضول باتوں سے روک دیتا اور اُسے کہتا کہ پہلے اپنے خیالوں کو تعلیم سے آراستہ کرو اس کے بعد سوچنا کہ تمہیں کون اچھا اور کون بُرا لگتا ہے مگر میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور خود بھی اُس کے ساتھ اُس راستے پر چل پڑا۔

پھر مجھے وہ رات یاد آئی جب میں اس کے گھر اُسے اُس کے خاوند کی غیر حاضری میں ملنے گیا تھا۔ یہ ایک کبیرہ گناہ تھا کہ میں اُس کی ازدواجی زندگی میں زہر گھول رہا تھا۔ میں عملی طور پر اس کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ بے وفائی کرے اور میری ہو کے رہے۔ پھر میں نے واجدہ کی اتنی زیادہ حوصلہ افزائی کی کہ اُس نے یہاں تک کہہ دیا کہ موقع ملے تو آصف کو قتل کر دو۔ میں نے اُسے کہا کہ میں آصف کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

پھر مجھے عائشہ یاد آئی۔ میرے جسم نے بڑی زور سے جُھرجُھری لی۔ وہ ہمارے

مزارعوں کی بیٹی تھی، غریب تھی اور اُس نے میری ذات میں پناہ لی تھی لیکن میں نے اُس کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھایا اور اُسے عیش و لذّت کا ذریعہ بنا لیا اور پھر اُس نے اپنے سسرال اور اپنے ماں باپ کے ساتھ اتنا بڑا فراڈ کھیلا کہ فراڈیے پیروں تک نے اسے سچ مان لیا۔ میں نے اُس کی حوصلہ افزائی کی۔ اس سے بڑا گناہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

"اللہ ..... یا اللہ!" ___ میں نے انتہائی بلند آواز میں منہ آسمان کی طرف کر کے کہا ___ "میری توبہ ..... میرے یہ گناہ بخش دے پھر میں باقی عمر تیری عبادت اور تیرے دینِ اسلام کی تبلیغ میں گزاروں گا"۔

میں نے کچھ سکون سا محسوس کیا اور یہ بھی کہ میری توانائی واپس آ رہی ہے۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ پانی کی بوتل تو میرے جسم کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ میں نے بڑی تیزی سے بوتل نکالی لیکن یہ ہلکی پھلکی تھی۔ ڈھکنا کھول کر منہ سے لگائی تو پورے دو گھونٹ بھی پانی نہ نکلا۔ اُس سے اتنا ہُوا کہ زبان اور حلق ذرا تر ہو گئے اور حلق میں کانٹے چبھنے کا جو احساس تھا وہ ختم ہو گیا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہُوا کہ پیاس اور بڑھ گئی۔



میں اُٹھا۔ شاید یہ گناہوں سے توبہ کا اثر تھا کہ میں رائفل کے سہارے اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہ امید افزا خیال بھی آیا کہ خدا نے میرے گناہ معاف کر دیئے ہیں اور اب جو بھی ہو گا وہ میرے لئے بہتر ہو گا لیکن میں جب چلنے لگا تو میں نے محسوس کیا کہ میری ٹانگیں جسم کا بوجھ نہیں اٹھا سکیں گی۔ میں جسم کا بوجھ ہلکا کر سکتا تھا۔ میں نے ستّر راؤنڈ ایمونیشن اور ایک رائفل اٹھا رکھی تھی۔ جھولے میں بھی کچھ سامان تھا۔ میں سب کچھ اتار کر پھینک دیتا تو بیس بائیس سیر وزن سے آزاد ہو سکتا تھا لیکن رائفل اور ایمونیشن کی یہ ضرورت تھی کہ یہ دونوں چیزیں پٹھانوں کو پیش کر کے میں اُن کی دوستی حاصل کر سکتا تھا۔ یہ سب کچھ سوچ کر میں نے اپنی کسی بھی چیز سے دستبردار ہونے کی نہ سوچی۔

جسم پر چوٹیں بھی آئی تھیں۔ پہلے میں پہاڑی سے گرا اور پھر اس چٹان سے پھسلا تھا۔ سر کو بھی ضرب لگی تھی۔ ان چوٹوں کے اثرات بھی تھے۔ پھر بھی میں چل پڑا۔ اب کے میں نشانیاں دیکھتا گیا کہ یہاں سے مُڑا تھا۔ کچھ دُور جا کر مجھے بڑی پہاڑی کا دامن نظر آیا اور میں چٹانی بھول بھلیوں سے نکل کر پہاڑی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

سورج کچھ آگے چلا گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ رات کا اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے مجھے کہیں پناہ ملنی چاہیئے خواہ یہ قید ہی ہو۔ پیاس کے ساتھ بھوک نے بھی اپنا ظالمانہ اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ میں سیدھا چلتا گیا۔ جسم ذرا گرم ہوا تو چوٹوں کا درد بھی ذرا کم ہو گیا۔ چلنے کی رفتار کچھ تیز ہو گئی۔ تقریبا" آدھا میل آگے جا کر چٹانیں یکلخت ختم ہو گئیں اور کھُلا سا علاقہ آگیا جو پتھریلا بھی تھا اور ریگستانی بھی۔ مجھے ایک اور سوچ آئی۔ میری رائفل کی میگزین میں دس راؤنڈ تھے۔ میں نے رائفل سیدھی کی' بولٹ پیچھے کر کے آگے کیا' ایک راؤنڈ چیمبر میں چلا گیا اور میں نے رائفل کا بٹ کندھے کے اوپر رکھا اور نالی آسمان کی طرف کر کے ایک راؤنڈ فائر کیا۔ رائفل نیچے کر کے پھر ایک راؤنڈ چیمبر میں دھکیلا اور پہلے کی طرح رائفل اوپر کر کے ہوا میں فائر کیا۔

میں نے یہ دو راؤنڈ اس اُمید پر چلائے تھے کہ پٹھان کہیں قریب ہوئے یا جہاں کہیں بھی ہوئے وہ فائر کی آوازیں سُن کر ادھر آجائیں گے اور میں اپنے آپ کو اُن کے حوالے کر دوں گا اور کہوں گا کہ میں مسلمان ہوں۔ اچانک میرا ہاتھ سر پر گیا تو میں کانپ اٹھا۔ میرے سر پر پگڑی نہیں تھی۔ یہ مسلمان کی نشانی تھی۔ یہ فکر والی بات تو نہیں تھی۔ میں پٹھانوں کو منوا سکتا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ خطرہ یہ تھا کہ دُور سے کسی پٹھان

نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو وہ مجھے ہندو سمجھ کر دُور سے ہی گولی مار دے گا۔ یہ ایک نیا
ف تھا جس نے میرے دل کو گرفت میں لے لیا۔

بھوک اور پیاس نے دماغ پر اثر کرنا شروع کر دیا۔ آپ نے صحرا کا سراب سنا ہوگا
ن دیکھا کبھی نہیں ہوگا۔ وہ میں نے دیکھا ہے۔ یہ میں آج کہہ رہا ہوں کہ وہ سراب
لیکن اُس وقت اُسے میں حقیقت سمجھتا تھا۔ تقریبا" ایک میل دور مجھے ویسے پکّے
ان نظر آئے جیسے قصبوں میں ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے ایک کنوّاں تھا جس میں سے
ر پانچ عورتیں پانی نکال کر اپنے گھڑے بھر رہی تھیں۔

"اللہ نے میری سن لی ہے" —— میں نے نعرہ لگایا اور دوڑ پڑا۔ ان عورتوں نے جو
پڑے پہن رکھے تھے وہ پنجاب کا لباس تھا۔ میں دوڑا تو ضرور لیکن جلدی تھک گیا۔
ں دوڑ نہیں سکتا تھا۔ میں نے چلنا شروع کر دیا۔ کچھ آگے جا کر دیکھا تو مکان غائب تھے'
رتیں بھی نہیں تھیں اور نہ ہی کنوّاں تھا۔ ان کی بجائے تین چار ایک دوسرے کے
ریب گھنے درخت کھڑے تھے۔ ان کے نیچے پانی نظر آرہا تھا۔ میں تیز چلنے کی کوشش
رنے لگا۔

○

پھر نہ جانے کیا ہُوا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ اس طرح کی نیم تاریکی چھا گئی تھی جس طرح
الی گھٹائیں چھا جاتی ہیں اور ان کے ساتھ گرد و غبار کی آندھی آتی ہے۔

میرے پہلو میں اور میرے کولہوں پر کوئی پاؤں کی ٹھوکریں مار رہا تھا اور میں آہستہ
آہستہ بیدار ہو رہا تھا۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ یہ سورج کی چمک تھی۔ میں نے
آنکھیں ملیں اور پھر کھولیں۔ میں ہوش میں آچکا تھا اور مجھے عورتوں کی آوازیں سنائی
ینے لگیں۔ مجھے پھر پہلو میں زور سے ٹھوکر لگی۔ میں اٹھ بیٹھا۔

پہلی چیز جو مجھے نظر آئی وہ رائفل کی نالی تھی جو میرے منہ سے چند انچ ہی دور
تھی۔ میں نے آہستہ آہستہ اوپر دیکھا۔ ایک پٹھان عورت میرے سامنے کھڑی تھی۔ وہ
جوان تھی۔ اُس کے چہرے کا رنگ سفید اور گلابی تھا اور وہ بڑی ہی خوبصورت عورت
تھی لیکن میں اُس کے حسن کو اس طرح نہیں دیکھ رہا تھا جس طرح مجھ جیسے جوان آدمی
خوبصورت عورتوں کو دیکھا کرتے ہیں۔ اس عورت کے حسن میں جلالی سی کیفیت. تھی
اور تقدّس کا تاثر بڑا صاف تھا۔ اُس وقت اُس کے چہرے پر غصے کا اور حقارت کا تاثر تھا۔

اُس کے دائیں بائیں دو اور عورتیں کھڑی تھیں۔ وہ بھی جوانی کی عمر میں تھیں اور وہ ہنس رہی تھیں۔ میں نے اپنے بائیں طرف اور ذرا پیچھے دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر عورت کھڑی تھی۔ میں پشتو بالکل ہی نہیں جانتا تھا۔ ان کی باتوں سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بہت خوش تھیں کہ انہوں نے ایک فوجی کو پکڑا ہے۔

"مسلمان!" —— میں نے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہا —— "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ..... لاالہ الااللہ محمد الرسول اللہ"۔

"کافر!" —— ادھیڑ عمر پٹھانی نے میرے سر پر ہاتھ مار کر کہا۔

میں نے پھر بسم اللہ شریف پڑھ کر پوری الحمد شریف، قل شریف اور پھر پورا درود شریف نماز والا پڑھ ڈالا اور ایک بار پھر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا 'مسلمان' پھر اپنے ایک ہاتھ کا چُلّو بنا کر منہ سے لگایا اور کہا 'پانی'۔ ان چاروں نے آپس میں کچھ باتیں کیں۔ میں بیتابی سے اُن کے فیصلے کا منتظر تھا۔ میں شاید چلتے چلتے گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا تھا یا شاید سو گیا تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر میری رائفل اٹھالی اور مجھے جگایا۔

آخر اُدھیڑ عمر عورت نے اشارہ کیا کہ میں ان کے آگے آگے چلوں۔ میں چل پڑا۔ وہ چاروں میرے پیچھے پیچھے آرہی تھیں۔ مجھے یہ تسکین ہوئی کہ میرا وہ سفر ختم ہُوا جس نے مجھے بے جان کر دیا تھا اور یہ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میں جا کہاں رہا ہوں۔ اب یہ تو معلوم تھا کہ میں ان عورتوں کا قیدی ہوں اور یہ مجھے اپنے ٹھکانے پر لے جا رہی ہیں۔ مجھے یہ اطمینان بھی ہُوا کہ خدا نے میری توبہ قبول کر لی ہے اور نجات کا راستہ بھی مل جائے گا۔

وہ علاقہ ایسا تھا کہ یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ ایک فرلانگ آگے کیسی زمین آئے گی۔ کیونکہ کہیں ذرا اونچی ٹیکری تھی، اس کے ساتھ سلوں والی چٹان تھی، کہیں کھڈ تھے اور کہیں سے زمین ویسے ہی اُبھری ہوئی تھی اور یہ ساری زمین پانی کی بُوند بُوند کو ترس رہی تھی۔

ان نشیب و فراز سے گزرتے اور ایک خاصی اونچی اور لمبی چٹان کے پہلو سے دائیں کو مُڑے تو ایک وسیع میدان نظر آیا۔ تین ساڑھے تین سو گز دور پانچ چھ کچے مکان تھے جن کی منڈیروں پر قلعوں جیسی بُرجیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ عورتیں مجھے وہاں لے گئیں۔ ان مکانوں کے قریب کیکر کے دو درخت تھے۔ وہاں پہنچے تو چارپائی پر ایک سفید

ریش ضعیف العمر آدمی بیٹھا ملا۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھا۔ اس کے منہ سے پہلا لفظ نکلا —— "کافر؟" —— میں نے نفی میں سر ہلایا اور السلام علیکم کہا پھر کلمہ شریف پڑھا۔ مختصر یہ کہ اسے بھی میں نے پوری نماز پڑھ کر سنائی۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور کمرے میں لے گیا۔ واپس لا کر اس نے مجھے چارپائی پر بٹھایا اور اُن عورتوں سے کچھ کہا۔ ایک عورت گئی اور میرے لئے پانی لے آئی۔ میں نے مٹی کا پیالہ منہ سے لگایا اُسے میں ایک ہی سانس میں ختم کر دینا چاہتا تھا لیکن بوڑھے نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پیالہ میرے منہ سے ہٹا دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ اردو بولتا اور سمجھتا تھا۔

"آہستہ" —— اُس نے کہا —— "تھوڑا تھوڑا" —— اُس نے پیالہ میرے منہ سے لگا دیا اور اپنے ہاتھوں پیالہ ہٹا ہٹا کر تھوڑا تھوڑا پانی پلایا۔

"بابا جان!" —— میں نے پوچھا —— "اب کیا ہو گا؟"

"ہمارا بیٹا آئے گا" —— اُس نے کہا —— "ہمارا دو بیٹا ..... ایک ہمارے بھائی کا بیٹا ... وہ آئے گا ..... وہ جو بولے گا وہ ہو گا"۔

میں اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ اس کے بیٹوں کے ساتھ میرے لئے موت آئے گی یا ایک نئی زندگی!

میں کہوں کہ میں نے جاہلوں سے عقل لی اور اَن پڑھوں سے علم حاصل ک
ہے۔ تو میری کہانی پڑھنے والے کئی ایک لوگوں کے ہونٹوں پر ایک
مسکراہٹ آجائے گی جس میں طنز ہو گی اور جن کے پاس کالجوں کی ڈگریاں ہیں' ان کے
ماتھوں پر شکنیں پڑ جائیں گی۔ وہ کہیں گے پرانے زمانے کا میٹریکولیٹ بڑھاپے میں آکر
اپنے آپ کو دانش مند سمجھ رہا ہے۔

میری مشکل یہ ہے کہ میں نے زندگی کا عملی پہلو دیکھا ہے' اور میں حرکت میں ر
ہوں۔ حرکت زبان کی نہیں' حرکت جسم کی اور حرکت دماغ کی۔ میں کتابوں کی زنجیروں
سے آزاد رہا ہوں۔ کاغذوں پر چھپے ہوئے کالے الفاظ کو راستے کے کانٹے سمجھ کر راستہ
بدل بدل کر چلتا رہا ہوں۔

میں نے ہمیشہ عمل کیا ہے۔ عمل سے ہی زندگی بنتی ہے..... جنت بھی جہنم بھی!
میری زندگی کبھی جنت بنی کبھی جہنم بنی' کہیں دوسروں کا تماشہ دیکھا کہیں خود تماشہ
بنا..... اور شب و روز میرے آگے تماشہ ہوتا رہا اور ہو رہا ہے۔ اب تو اپنے لیڈروں کی
سیاست ایسے تماشے دکھا رہی ہے کہ ہم پر ساری دنیا کی انگلیاں اٹھ رہی ہیں۔

اب تو یہی دعا سینے سے ہُوک بن کر نکلتی ہے ——"اللہ' اب اٹھا لے"—— اپنے
زمانے میں پیار' خلوص اور وقار دیکھا تھا۔ اب تو بندہ بندے کو کھا رہا ہے۔ لُوٹ کھسُوٹ
ہے۔ خون خرابہ ہے۔

قیصر و کسریٰ جیسی ہیبت ناک جنگی طاقتوں کو خون میں ڈبو دینے اور خاک میں ملا
دینے والی قوم آج اپنے ہی خون میں ڈوب رہی ہے اور قرآن کی اس سرزمین پر خاک اُڑ
رہی ہے۔

میں نے جاہلوں سے عقل اور اَن پڑھوں سے علم حاصل کرنے کی بات کی ہے۔
ں وقت میرے ذہن میں وہ ضعیف العمر پٹھان ہے جس کا میں قیدی تھا۔ میرا جسم ٹوٹ
وٹ گیا تھا۔ مجھے اتنا سا اطمینان تو تھا ہی کہ میں مسلمان تھا اور پٹھان میرے ساتھ وہ
لوک نہیں کریں گے جو وہ غیر مسلموں کے ساتھ کرتے ہیں۔ میری جسمانی حالت
یک نہیں تھی۔ تھکان نے جسم توڑ دیا تھا۔ ایسی غنودگی طاری ہوئی کہ میں بیٹھے بیٹھے
ارپائی پر لڑھک گیا اور نیند نے مجھے اٹھنے نہ دیا۔

میں نے گھر کے خواب دیکھے۔ واجدہ کے خواب دیکھے اور جب آنکھ کھلی تو سیاہ کالی
قیقت نے میرے دل پر دہشت طاری کر دی۔ میرے اوپر کمبل پڑا ہُوا تھا۔ مجھے یاد آگیا
کہ میں سو گیا تھا اور یہاں ایک بوڑھا پٹھان تھا۔ تین چار عورتیں تھیں۔ دو نوجوان
ڑکیاں بھی تھیں۔ ان لوگوں نے مجھے جگانے کی بجائے مجھ پر کمبل ڈال دیا تھا۔

میں گھبرا کر اٹھا۔ اس مکان کے آگے صحن نہیں تھا۔ اس کے آگے جتنی زمین تھی
ہ اس مکان کا اور دوسرے چار پانچ مکانوں کا صحن تھا جو دو اڑھائی فرلانگ آگے ایک
ٹان تک چلا گیا تھا۔ چٹان کے پیچھے ننگا پہاڑ کھڑا تھا۔ اس پر ہریالی کا نام و نشان نہ تھا۔
مکان کے اندر لالٹین جل رہی تھی اور باتوں کی آواز آ رہی تھی۔

○

میں اُٹھا۔ رات سرد اور تاریک تھی۔ میں دروازے پر جا کھڑا ہُوا۔ اندر وہی بوڑھا
چارپائی پر بیٹھا ہُوا تھا۔ اُس کے سامنے فرش پر تین آدمی بیٹھے تھے۔ دو جوان اور ایک
ادھیڑ عمر تھا۔ ان کے درمیان حقہ رکھا تھا۔ تین عورتیں الگ بیٹھی تھیں۔ ان میں ایک
نوجوان تھی اور خاصی خوبصورت۔ ان سب نے میری طرف دیکھا۔

"تم اٹھا" —— بوڑھے نے کہا —— "آجا..... آ"۔

میں اندر جا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ بوڑھے نے پشتو میں عورتوں سے کچھ کہا۔ دو تین
منٹ بعد میرے آگے ایک چنگیر آگئی جس میں مکئی کی روٹیاں تھیں اور پلیٹ میں چنے کی
دال تھی۔ میں تو بھوک سے مرا جا رہا تھا۔ میں نے سب کی طرف باری باری دیکھا۔

"ہم نے کایا" —— بوڑھے نے کہا —— "تم کاؤ"۔

میں نے بہت کوشش کی کہ تمیز سے کھاؤں لیکن بھوک اتنی لگی ہوئی تھی کہ جی
چاہتا تھا کہ مکئی کی یہ موٹی موٹی دو روٹیاں ایک ہی بار نگل لوں۔ میں چپڑ چپڑ کرتا دونوں

روٹیاں کھا گیا۔ دال کا ایک دانہ نہ چھوڑا' پھر مٹی کے دو پیالے پانی پی کر ڈکار مارا۔ میں نے اتنی لمبی عمر میں بڑے ہی اچھے اور مرغن کھانے کھائے ہیں۔ آج کل کے ولیمے تو بہت ہی پُر تکلف ہوتے ہیں۔ روسٹ گوشت' روسٹ مرغی' کباب' چکن پلاؤ اور ایک سے بڑھ کر ایک کھانے کھائے ہیں لیکن میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ جو لذت مکئی کی اُن دو روٹیوں اور چنے کی دال میں تھی وہ مجھے کسی اور کھانے میں نہیں ملی' حالانکہ میں نے وہ روٹیاں اور دال دہشت زدگی کی کیفیت میں اور ہیجانی کیفیت میں کھائی تھیں۔

بوڑھے پٹھان نے مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میں نے نام بتایا تو اُس نے پوچھا میں کہاں کا رہنے والا ہوں۔ یہ بتایا تو اس نے پوچھا میں فوج میں کیوں بھرتی ہوا ہوں۔ میں نے اپنی عقل کے مطابق اس سوال کا جواب بھی دیا۔

میں نے اُسے جواب دیا تھا کہ یہ ہمارے علاقے کی روایت ہے۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ہمارے علاقے کی اونچی ذاتوں کے لوگ بھی فوج میں سپاہی بھرتی ہُوا کرتے تھے' حالانکہ ان کی زمینیں اتنی زیادہ ہوتی تھیں کہ انہیں نوکری کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔

میں صحیح بات بتاتا ہوں' اور یہ میں اپنے متعلق بتا رہا ہوں' کہ میں جس وقت فوج میں بھرتی ہُوا تھا اس وقت میرے ذہن میں آزادی کا تصوّر ہی نہیں تھا۔ ہم لوگ سمجھتے تھے کہ بادشاہی صرف انگریز کر سکتے ہیں اور بادشاہی کا حق صرف انگریزوں کو حاصل ہے۔ ہم کہتے تھے کہ پہلے مغلوں کے خاندان نے ہندوستان پر بادشاہی کی تھی۔ انگریزوں نے آ کر مغلوں سے بادشاہی چھینی اور بادشاہ بن گئے۔ جنگِ عظیم شروع ہوئی تو ہم کہتے تھے کہ اب ہندوستان پر جرمنوں یا جاپانیوں کی بادشاہی ہو گی۔

اس کے علاوہ میں نے ان پٹھانوں کو اپنے بھرتی ہونے کی اصل وجہ بھی بتا دی۔ یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ یہ تھی واجدہ کی محبت' اُس کے باپ کی دھمکیاں۔ میں نے انہیں یہ بھی سنایا کہ میں نے واجدہ کے باپ کے غنڈے کو کس طرح مارا پیٹا تھا۔ یہ بھی سنایا کہ میں نے اپنے ایک دوست حمید کے ساتھ ایک بدکار پیر کو کس طرح سزا دی تھی اور رات ہی رات اپنی چھاؤنی میں واپس آ گئے تھے۔

میں نے دیکھا کہ یہ سارے پٹھان میری بات دلچسپی سے سن رہے ہیں اور لطف اٹھا رہے ہیں تو میں نے اس واقعہ میں کچھ مبالغہ آمیزی کر کے دلچسپی میں اضافہ کر دیا۔

"بابا جان!" ـــ میں نے کہا ـــ "میں نے فوج میں بھرتی نہیں ہونا تھا۔ میں اس لڑکی کے باپ سے نہیں ڈرتا لیکن میرے ماں باپ ڈرتے تھے کہ لڑکی کا باپ مجھے مروا دے گا۔ میں ان کی خاطر بھرتی ہُوا ہوں۔ آپ کے ساتھ میری کوئی دشمنی نہیں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مسلمان فوجی رائفلیں اور مشین گنیں ذرا اوپر کر کے فائر کیا کرتے ہیں کہ گولی کسی پٹھان کو نہ لگ جائے"۔

میں نے جھوٹ بولا ـــ "آج کی لڑائی میں آپ کے آدمیوں نے ہماری پکٹ کو گھیرے میں لے کر ہمارے ایک آدمی کو گولی مار دی تو میں نے دو پٹھانوں کو دیکھ لیا۔ میں بڑی آسانی سے دونوں کو مار سکتا تھا لیکن مسلمان اپنے بھائی کو نہیں مارا کرتا"۔

بوڑھا پٹھان اردو بولتا تھا تو گریمر سے اسی طرح آزاد ہو کر بولتا تھا جس طرح وہ انگریزوں سے آزاد تھے لیکن وہ اپنا مطلب واضح کر لیتا تھا۔ وہاں اُس کے جو بیٹے اور بھتیجا بیٹھے ہوئے تھے' وہ اردو سمجھتے تھے لیکن بول نہیں سکتے تھے۔ ادھیڑ عمر پٹھان چند ایک الفاظ جوڑ کر بات کر لیتا تھا۔

ان لوگوں کے ساتھ گپ شپ چلتی رہی اور پھر بوڑھا سنجیدہ ہونے لگا۔ میں اس کی باتیں اُس کی ٹوٹی پھوٹی اور گریمر سے آزاد اردو میں نہیں ذرا سلیس اردو میں سناؤں گا۔

"تم فرنگی کو اچھا سمجھتے ہو؟" ـــ اُس نے پوچھا۔

"میں کافر فرنگی پر لعنت بھیجتا ہوں" ـــ میں نے کہا ـــ "میں نے آپ کو مجبوری بتائی ہے کہ میں کیوں بھرتی ہوا تھا"۔

"نہیں!" ـــ اس نے کہا ـــ "تم میری بات نہیں سمجھتے۔ میں تم سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم ہماری طرح آزاد نہیں رہنا چاہتے؟" ـــ میرا جواب سنے بغیر اُس نے کہا ـــ "نہیں۔ تم آزاد نہیں رہنا چاہتے۔ تم ہمیں دیکھ کر سوچتے ہو گے کہ یہ لوگ تو غریب ہیں۔ پہاڑوں میں رہتے ہیں۔ انہیں دنیا کی کوئی نعمت میسّر نہیں۔ پہاڑی بھیڑوں اور بکریوں جیسی زندگی بسر کرتے ہیں' لیکن تم یہ نہیں سوچتے کہ ہم پر کافر کا قانون نہیں چلتا۔ یہاں اللہ کا قانون چلتا ہے۔ اِدھر کوئی جرم نہیں ہوتا۔ اگر ہو جائے تو مجرم کو پوری سزا ملتی ہے۔ یہاں ہم دروازے کھلے چھوڑ کر کہیں چلے جائیں' صندوقوں میں زیور ہو' رائفل اور گولیاں بھی ہوں تو انہیں کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ سب اللہ کے قانون سے ڈرتے ہیں....

"تم نہیں جانتے کہ مسلمان کافر کا غلام ہو جائے تو مسلمان کا ایمان برباد ہو جاتا ہے۔ وہ مسلمان نہیں رہتا۔ تمہاری نماز قبول نہیں ہوگی۔ تمہارا روزہ قبول نہیں ہوگا۔ یہ مت سوچو تمہیں پیسہ کدھر سے ملتا ہے۔ یہ سوچو کہ تمہارا ایمان کس طرح ٹھیک رہتا ہے۔ میں جانتا ہوں کافروں نے ہمارے خلاف یہ مشہور کیا ہوا ہے کہ قبائلی پٹھان ڈاکو ہیں۔ کنوائیوں کو لوٹتے ہیں' بنوں شہر' کوہاٹ اور پشاور شہر میں ڈاکے ڈالتے ہیں۔ اگر ہم ڈاکو ہوتے تو ہمارا رہن سہن یہ ہوتا؟ ہم شہروں جیسے مکان نہ بناتے؟ ہم اچھے کپڑے نہ پہنتے؟ ہم اچھی اچھی چیزیں نہ کھاتے؟"

"میں آپ کو ڈاکو نہیں سمجھتا" —— میں نے کہا —— "آپ مجاہد ہیں"۔

"تم جھوٹ بولتے ہو" —— اُس نے کہا —— "تم نے یہ بات مجھے خوش کرنے کے لئے کہی ہے کیونکہ تم ہمارے قیدی ہو..... خوشامد غلام کیا کرتے ہیں"۔

مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس بوڑھے نے میرے جسم کی ساری طاقت سلب کر لی ہو۔ اُس کی داڑھی دودھ جیسی سفید تھی۔ چہرے کا رنگ سپیدی مائل تھا اور اُس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کی نظریں میری آنکھوں کے راستے میرے وجود میں اُتر رہی ہوں اور میرے وجود کے اندر سویا ہوا ایک انسان بیدار ہو رہا ہو۔

یہ بزرگ پٹھان شاید اسی انسان کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم خوبصورت جوان ہو" —— اُس نے کہا —— "فرنگی نے تمہیں بہت سستا خرید لیا ہے..... میری عمر اسی سال سے اوپر ہو گئی ہے۔ میں پچھلی صدی میں پیدا ہوا تھا۔ میرا باپ سکھوں کے خلاف لڑا تھا پھر انگریزوں کے خلاف لڑا۔ میں ابھی چار پانچ سال کا تھا کہ اُس نے میرے ہاتھ میں خنجر دے دیا تھا۔ نو دس سال کی عمر میں اُس نے مجھے رائفل چلانی سکھا دی تھی۔ اُس وقت رائفل آج والی نہیں ہوتی تھی۔ اُس زمانے کی رائفل میں سامنے سے نالی میں بارود ڈالا جاتا اور پھر چھرّے یا ایک موٹا چھرّا ڈالا جاتا تھا.....

"میری عمر چودہ پندرہ سال تھی جب میرے باپ کو دو گولیاں لگیں۔ اُسے اٹھا کر لے آئے۔ میرا ایک بڑا بھائی تھا۔ باپ نے مجھے کہا کہ تمہارا بھائی زندہ ہے۔ اس کی بات ماننا تمہارا فرض ہے..... اور یاد رکھو' یہ زمین تمہاری ہے۔ یہ پہاڑ تمہارے ہیں فرنگی نے ہندوستان میں اپنی بادشاہی قائم کر لی ہے۔ فرنگی اِدھر نہ آئے۔ غریب رہنا

لیکن آزاد رہنا۔ امیر بننے کے لئے فرنگی کا غلام نہ بن جانا.....

"وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا اور فوت ہو گیا..... میں نے آٹھ دس سال پہلے لڑنا چھوڑا ہے۔ اب پہاڑوں پر نہیں چڑھ سکتا اور دوڑ نہیں سکتا۔ اب میرے یہ بیٹے فرنگی کا راستہ روکے ہوئے ہیں۔ میں نے ان کو اللہ کے نام پر قربان کر دیا ہے"۔

بہت بعد کی بات ہے۔ میں نے ایک جگہ پڑھا کہ جب قائداعظم پاکستان کے لئے جدوجہد کر رہے تھے تو ایک انگریز صحافی نے اُن سے پوچھا کہ اگر آپ کو پاکستان مل گیا تو اس ملک کو چلانے کے لئے روپیہ پیسہ کہاں سے لائیں گے؟ آپ کا ملک تو بہت غریب ہو گا۔ قائداعظم نے اُس سے پوچھا —— "کیا آپ وہ امیر برطانیہ پسند کریں گے جو جرمنی کا غلام ہو یا وہ غریب برطانیہ جو آزاد ہو؟"

"یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے والی بات ہے؟" —— انگریز صحافی نے جواب دیا —— "ہم آزاد برطانیہ پسند کریں گے خواہ غریب ہی ہو"۔

میں نے جب یہ مکالمہ پڑھا تو مجھے وہ بوڑھا پٹھان یاد آیا تھا جسے باپ نے وصیّت کی تھی کہ غریب رہنا لیکن آزاد رہنا۔

"میری بات سمجھو" —— بوڑھا پٹھان جو بالکل ہی اَن پڑھ تھا' کہہ رہا تھا —— "تم لوگ دعائیں کیا کرتے ہو' یا اللہ ترقی دے۔ یا اللہ دولت دے۔ یا اللہ بہت بڑا مکان دے۔ ..... ہم لوگ اللہ کو تنگ نہیں کیا کرتے۔ ہم ایک دعا یہ کیا کرتے ہیں' یا اللہ بیٹا دے' اور دوسری یہ کہ یا اللہ میرا بیٹا غدار نہ ہو"۔

بوڑھے نے بہت باتیں کیں اور اُس کی باتیں میری روح میں اُترتی جا رہی تھیں اور میرے خیالات بدلتے جا رہے تھے۔ مجھے بالکل ہی محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ میں ان لوگوں کا قیدی ہوں اور یہ چاہیں تو مجھے گولی بھی مار سکتے ہیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے یہ بوڑھا پٹھان میرا پیر استاد ہے اور مجھے پروقار زندگی بسر کرنے کا وہ سبق دے رہا ہے جو میں نے پہلے کہیں سے بھی نہیں حاصل کیا تھا۔

"اگر آپ لوگ مجھ پر اعتبار کریں تو میں آپ کے پاس ہی رہ جاتا ہوں" —— میں نے کہا۔

بوڑھا تو کچھ نہ بولا' دوسروں نے پشتو میں کچھ کھسر پھسر کی جو میں نہیں سمجھ سکتا تھا۔

"نہیں!" ۔۔۔ بوڑھے نے اپنے بیٹوں سے بات کر کے کہا ۔۔۔ "ہم تم پر اعتبار کر سکتے ہیں لیکن تمہیں اپنے ساتھ نہیں رکھیں گے۔ تم اس وقت یہ بات جوانی کے جوش میں کر رہے ہو لیکن تم یہ نہیں سوچ رہے کہ تمہارے ماں باپ کا کیا حال ہو گا۔ تم اگر ہمارے ساتھ رہ گئے تو پھر ساری عمر اپنے گھر نہیں جا سکو گے اور پولیس دن رات تمہارے گھر والوں کو پریشان کرتی رہے گی۔ تمہارے ملک کے تین چار فوجی اُدھر سے بھاگ کر ہمارے پاس آئے ہیں۔ تمہارا فیصلہ جرگہ کرے گا کہ تمہیں چھوڑ دیا جائے یا کیا کیا جائے۔ اگر تمہیں جرگے نے چھوڑ دیا تو واپس اپنی پلٹن میں چلے جاؤ گے۔ وہاں جا کر سوچنا کہ تمہیں اِدھر آنا چاہیئے یا نہیں۔ اگر تمہارا دل مان لے تو بھاگ آنا"۔

اس بزرگ پٹھان نے جن فوجیوں کا ذکر کیا تھا کہ وہ فوج سے بھاگ کر پٹھانوں سے جا ملے تھے' ان میں سے ایک کو میں جانتا تھا۔ اُس کا نام محمد سرور تھا لیکن قبائلی علاقے میں وہ سرور پنجابی کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ وہ آٹھ پنجاب رجمنٹ میں سگنیلر تھا۔ وہ 1940ء میں بھاگا تھا اور پھر بڑے ہی سنسنی خیز اور ڈرامائی واقعات ہوئے۔ آخر وہ پکڑا گیا اور اسے بنوں جیل میں پھانسی دے دی گئی تھی۔

میں نے بڑی عمر میں آ کر جب اخبار رسالے پڑھنے شروع کئے تھے تو سرور پنجابی کی پوری کہانی "حکایت" میں پڑھی تھی۔ میں تو اُسی وقت سے سوچ رہا تھا کہ اپنی زندگی کی داستان لکھوں لیکن کوئی لکھنے لکھانے والا نہیں مل رہا تھا۔ اب اللہ نے کرم کیا ہے اور مجھے یہ تعاون حاصل ہو گیا ہے اور میں ایسی داستان سنا رہا ہوں جس سے ہمارے نوجوانوں کو کچھ روشنی ملے گی۔

میں نے جرگے کا نام سنا تو میں کچھ گھبرایا۔ جرگے میں چار پانچ بزرگ بیٹھ کر فیصلہ کیا کرتے تھے کہ ملزم کو سزا دی جائے یا یہ بے قصور ہے۔ ان لوگوں کے ہاں کوئی تحریری قانون نہیں تھا نہ ان کی کوئی پولیس تھی۔ جرگہ کتنی ہی سخت سزا کیوں نہ دے دیتا' سب اسے قبول کرتے تھے۔ ایسے کوئی بھی نہیں کہتا تھا کہ ہم نہیں مانتے' دیکھی جائے گی' ہمارا کوئی کیا بگاڑ لیتا ہے۔ میں نے اپنا آپ اللہ کے حوالے کر دیا۔

سب کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ عورتیں کسی اور کمرے میں چلی گئی تھیں۔ ہم سب مرد اسی کمرے میں رہے اور سو گئے۔ ان پٹھانوں نے مجھے ایسی وارننگ نہ دی کہ بھاگنے کی کوشش کرو گے تو مارے جاؤ گے۔ انہیں مجھ پر بھروسہ تھا یا انہیں یہ یقین تھا کہ

میں بھاگا بھی تو جاؤں گا کہاں۔ اس پتھریلے پہاڑی علاقے کی بھول بھلیوں سے نکلنا ممکن ہی نہیں تھا۔ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور بنوں یا ٹمبر کتنی دُور ہیں۔

○

صبح آنکھ کھلی۔ دھوپ کمرے میں آ رہی تھی۔ وہاں صرف بوڑھا تھا یا عورتیں تھیں۔ میں پھر بوڑھے کے پاس بیٹھ گیا اور اُس کی باتیں سنتا رہا۔

وہ دن گزر گیا پھر رات بھی گزر گئی۔ مجھے ایک اور خیال پریشان کرنے لگا۔ وہ یہ تھا کہ میرے متعلق یہ رائے نہ قائم کر لی جائے کہ میں بھاگ کر پٹھانوں کے پاس چلا گیا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس صورت میں میرے گھر پر پولیس کو چڑھا دیا جائے گا۔ پھر یہ خطرہ بھی نظر آنے لگا کہ ان پٹھانوں نے مجھے چھوڑ دیا تو بھی میرے انگریز افسر شائد نہ مانیں کہ میں جان بُوجھ کر پٹھانوں کے پاس نہیں گیا تھا۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ ایسا نہ ہو کہ میرے گھر یہ سرکاری اطلاع دے دی جائے کہ میں لڑائی میں مارا گیا ہوں۔

دو دن اور اسی ذہنی کیفیت میں گزر گئے۔ میں نے کئی بار بُوڑھے پٹھان سے پوچھا کہ میرا کیا بنے گا۔

"خدا کو یاد کرو" ۔۔۔ آخر بوڑھے نے میرے اس سوال سے تنگ آ کر کہا ۔۔۔ "اگر تم ہندو یا سکھ ہوتے تو ہم پہلے دن ہی تمہارا فیصلہ کر دیتے۔ جرگے کی ضرورت ہی نہیں تھی لیکن تم مسلمان ہو اس لئے ہم اپنی مرضی سے تمہیں نہیں چھوڑ سکتے۔ مسلمان فوجی کا فیصلہ جرگہ کیا کرتا ہے۔ تم ہمارے پاس مہمان ہو"۔

اگلے ہی روز جرگے کی اطلاع آ گئی۔ دوسرے دن وہاں پہنچنا تھا۔

اگلے روز علی الصبح منہ اندھیرے مجھے جگایا گیا۔ بوڑھا اور اس کے دو بیٹے میرے ساتھ چل پڑے۔ میری رائفل اور ایمونیشن انہوں نے اٹھا رکھا تھا۔ تین ساڑھے تین گھنٹے کا پہاڑی سفر کر کے ہم ایک گاؤں میں پہنچے۔ یہ پتھریلی وادیاں تھیں۔ مجھے یاد نہیں کہ ان میں سے کتنی بار ہم دائیں اور بائیں مُڑے اور ایک کشادہ وادی میں پہنچے جہاں یہ گاؤں تھا۔ مجھے اس گاؤں کا نام معلوم نہیں۔ اسے میں صرف اس لئے گاؤں کہہ رہا ہوں کہ وہاں دس بارہ گھر تھے۔ گاؤں کے باہر بہت سے پٹھان موجود تھے۔

اس گاؤں کے قریب شاید پانی تھا۔ اس پانی کی وجہ سے ہی وہاں چند ایک ہرے

بھرے درخت نظر آ رہے تھے اور تھوڑا سا سبزہ بھی تھا۔ باہر چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ پٹھان ان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ زمین پر ہی بیٹھ گئے تھے۔ ہم وہاں پہنچے تو سب اٹھ کھڑے ہوئے اور بوڑھے پٹھان کے ساتھ سب نے باری باری ہاتھ ملایا۔

ان میں سے کئی ایک نے میرے ساتھ بھی ہاتھ ملایا اور بعض نے میرے ساتھ ہاتھ ملانا ضروری نہ سمجھا۔ اس کی وجہ شائد یہ تھی کہ انہیں ابھی معلوم نہیں تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ میں ان سب کے لئے تماشہ بن گیا تھا۔ مجھے آوازیں سنائی دیں ــــ "مسلمان..... مسلمان" ــــ مجھے ایک طرف بٹھا دیا گیا۔ سب مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

دو بڑی اچھی قسم کی چارپائیاں سامنے رکھی ہوئی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد پانچ چھ بزرگ سے پٹھان آئے۔ سب ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ میں نے خاص طور پر دیکھا کہ ان کا لباس دوسروں سے بہت مختلف تھا۔ اس لباس سے وہ بہت ہی معزّز لگتے تھے۔ وہ دراصل مختلف قبیلوں کے سردار تھے جنہیں ملک کہا جاتا تھا۔ یہ سب ان دو چارپائیوں پر بیٹھ گئے جنہیں میں نے اچھی قسم کی چارپائیاں کہا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ جرگہ میرا فیصلہ کرنے کے لئے بیٹھا ہے۔ میں حیران بھی ہو رہا تھا کہ میں اتنا اہم قیدی ہوں کہ میرے لئے اتنے بڑے جرگے کا اہتمام کیا گیا ہے لیکن میری یہ خوش فہمی جلدی رفع ہو گئی۔ وہ اس طرح کہ ایک ادھیڑ عمر پٹھان کو اس طرح جرگے کے سامنے لایا گیا کہ اُس کے دونوں ہاتھ پیٹھ پیچھے رسّی کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ اسے جرگے کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔

یہ ساری کارروائی پشتو میں ہو رہی تھی اس لئے میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ ملزم نے بڑی آہستہ آہستہ اور دبی زبان میں اپنا بیان دیا۔ جرگے کا کوئی نہ کوئی ممبر تھوڑی دیر بعد بڑے غصے کے عالم میں اُسے کچھ کہتا تھا۔ چار گواہوں کے بیان بھی ہوئے۔

اس کے بعد پھر ملزم سے کچھ سوال کئے گئے۔ اب اُس نے ذرا جاندار آواز میں جواب دیا۔ جرگے کے بزرگوں نے آپس میں کھُسر پھُسر کی اور ایک آدمی کو آواز دے کر کچھ کہا۔ وہ آدمی دوڑا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد واپس آیا۔ اُس کے ہاتھ میں غلاف میں لپٹا ہُوا قرآن پاک تھا۔ جرگے کے حکم سے ملزم کے ہاتھ کھول دیئے گئے اور قرآن اُس کے آگے کر دیا گیا۔ یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں تھا کہ ملزم سے قرآن پر قسم لی جا رہی تھی۔

پاکستان کی کچہریوں میں اکثر حلفیہ بیان لئے جاتے ہیں۔ لوگ بڑی ڈھٹائی سے اللہ کو حاضر ناظر جان کر جھوٹا حلف اٹھاتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں۔ قرآن کی قسم کھانا تو لوگ معمولی سی بات سمجھتے ہیں۔ قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر بھی قسم کھا لیتے ہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم پر خدا نے حکمران بھی جھوٹی قسمیں کھانے والوں جیسے مسلط کر دیے ہیں اور مہنگائی نے ہمارا جینا حرام کر دیا ہے۔ یہ سب جھوٹی قسموں کی سزا ہے۔ جو روز بروز بڑھتی جائے گی اور وہ دن بھی آ جائے گا جب اللہ اپنے فرمان کے مطابق ہم پر کسی غیر قوم کو مسلط کر دے گا۔

میں نے اُس پٹھان کو دیکھا۔ اُسے کہا گیا کہ قرآن پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہو کہ تم بے گناہ ہو۔ یہ اُس کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ وہ ایسے کر سکتا تھا کہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا لیتا اور اپنی جان بچا لیتا لیکن اُس کا رویّہ یہ دیکھا کہ اُس نے قرآن پاک کو دیکھا پھر جرگے کے ملکوں کی طرف دیکھا پھر تمام تماشائیوں پر نظر گھمائی اور آخر اُس نے سر ہلا کر کہا کہ وہ قسم نہیں کھائے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجرم تھا۔

جھوٹی قسم نہ کھانے کا نتیجہ میں نے یہ دیکھا کہ جرگے کے حکم سے اُس کے ہاتھ پھر پیٹھ پیچھے باندھ دیے گئے۔ جرگے کے سب سے زیادہ معمّر بزرگ نے بلند آواز سے تماشائیوں سے مخاطب ہو کر اپنا فیصلہ سنایا جو میں نہ سمجھ سکا۔ جب تماشائیوں نے ہاتھ کھڑے کر کے بلند آواز سے کچھ کہا تو میں سمجھ گیا کہ ان سب نے جرگے کے فیصلے کی تائید کی ہے۔

اس بزرگ کے اشارے سے ملزم کو چار آدمی ایک طرف لے گئے۔ کچھ آگے زمین نیچے چلی جاتی تھی۔ نیچے خشک نالہ تھا۔ وہ سب وہاں سے نیچے گئے تو نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ دو تین منٹ ہی گذرے ہوں گے کہ چار رائفلیں فائر ہوئیں۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ چاروں رائفلیں اکٹھی فائر ہوئی ہیں۔

وہ چاروں آدمی اوپر آئے۔ مجرم ان کے ساتھ نہیں تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اُسے سزائے موت دے دی گئی ہے۔ جب وہ چاروں آدمی جرگے کے سامنے آئے تو ان میں سے ایک نے جرگے کے ساتھ کوئی بات کی۔ میرا خیال ہے انہوں نے جرگے کو یہ اطلاع دی تھی کہ مجرم کو سزائے موت دے دی گئی ہے۔ جرگے نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ تمام تماشائیوں نے' میں نے بھی ہاتھ اٹھائے۔ جسے سزائے موت دی گئی تھی وہ

آخر مسلمان تھا اور پٹھان تھا اس لئے فاتحہ لازمی تھی۔

○

اس کے بعد جرگے کے سامنے پیش ہونے کی میری باری تھی۔ میرے مقدمے کی کارروائی سننے کی بجائے آپ یہ ضرور جاننا چاہیں گے کہ اس پٹھان کا جرم کیا تھا جسے گولی ماردی گئی تھی۔ میں پہلے آپ کو اس کا مقدمہ سنا دیتا ہوں۔

وہ خاصہ دار تھا۔ انگریزوں نے ایک تو پٹھان رجمنٹیں الگ بنائی تھیں جن میں پٹھانوں کو بھرتی کیا جاتا تھا۔ پٹھانوں کی انہوں نے ایک فورس اور بنائی تھی جسے سکاؤٹ کہا جاتا تھا۔ ان کی الگ الگ پلٹنیں بنا کر ان کے مختلف نام رکھ دیئے گئے تھے مثلاً" ٹوچی سکاؤٹس وغیرہ۔ یہ لوگ سرحد میں ہی رہتے تھے اور انہیں قبائلی پٹھانوں کے خلاف استعمال کیا جاتا تھا۔ انگریزوں نے ایک فورس اور بنائی تھی جنہیں خاصہ دار کہا جاتا تھا۔ یہ نیم فوجی تنظیم تھی۔ انہیں رائفلیں دی جاتی تھیں اور تھوڑی تھوڑی تنخواہ بھی دی جاتی تھی۔ قبائلی علاقے میں کہیں کہیں ان کی پوسٹیں بھی تھیں لیکن انہیں فوج کی طرح استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔

اُس زمانے میں یہ مشہور تھا کہ خاصہ دار مخبری کرتے ہیں۔ وہ قبائلی علاقے میں بھی جاتے تھے اور شہروں میں بھی آتے تھے۔ ان میں بعض دوغلی مخبری کرتے تھے یعنی انگریزوں کی خبریں قبائلی پٹھانوں تک پہنچاتے اور قبائلیوں کی مخبری انگریزوں کے آگے کرتے تھے۔ ان میں کوئی ایسا بھی نکل آتا تھا جو مکمل طور پر انگریزوں کا جاسوس بن جاتا اور انعام واکرام کے لالچ میں اپنے بھائیوں سے غداری کرتا تھا۔ دراصل انگریز بھی ان پر کوئی زیادہ بھروسہ نہیں کرتے تھے پھر بھی یہ لوگ انگریزوں کی فوج کے کام آتے تھے۔ بعض اوقات فوج کو کسی دُور دراز قبائلی علاقے میں کسی خاص جگہ بھیجنا ہوتا تو خاصہ دار گائیڈ کے طور پر ان کے ساتھ ہوتے تھے۔

میں جس اپریشن میں اپنی پوسٹ سے اُترتے بھٹک گیا اور پٹھانوں کا قیدی ہو گیا تھا' یہ بہت بڑا فوجی اپریشن تھا۔ پٹھانوں نے بھی جم کر مقابلہ کیا تھا۔ دونوں طرف نقصان ہُوا تھا۔ میں نے بعد میں اپنے میزبانوں سے پوچھا تھا کہ جس پٹھان کو گولی ماردی گئی ہے اُس کا قصور کیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ایک جگہ دس بارہ قبائلی اکٹھے ہوئے۔ انہوں نے ایک فوجی پوسٹ پر حملہ کرنا تھا جس طرح ہماری پوسٹ پر حملہ ہُوا تھا۔

یہ خاصہ دار ان قبائلیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے اپنے قریب کی فوجی پوسٹ کو بتا دیا کہ فلاں جگہ دس بارہ پٹھان اکٹھے کھڑے ہیں اور ان کا یہ پروگرام ہے۔ کسی انگریز لیفٹیننٹ یا کیپٹن نے اپنے کچھ فوجی ساتھ لئے اور اُس ٹیکری تک پہنچ گیا جس کے دوسری طرف پٹھان کھڑے شائد اپنے کچھ اور ساتھیوں کا انتظار کر رہے تھے۔

اس انگریز افسر نے خود یا اُس کے حکم سے اُس کے فوجیوں نے صرف دو گرینیڈ پھینکے۔ پٹھانوں میں سے صرف ایک آدمی وہاں سے زندہ نکلا باقی سب مارے گئے۔ وہ جو زندہ نکلا تھا' اُس کی ٹانگیں زخمی تھیں لیکن وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ اُس نے سب کو بتایا کہ یہ خاصہ دار ان کے قریب سے گزرا تھا یا کہیں سے اس نے دیکھ لیا تھا اور ان کی نشاندہی کی تھی۔

میں آپ کو صحیح بتاتا ہوں کہ فوج کبھی بھی اتنی خوش قسمت نہیں ہوئی تھی کہ اُسے اتنے زیادہ پٹھان ایک ہی جگہ مل جاتے اور انہیں صرف دو گرینیڈوں سے ختم کر دیا جاتا۔ یہ اُسی صورت میں ممکن تھا کہ کہیں پٹھان اکٹھے ہوتے اور کوئی مخبری کر دیتا۔ قبائلی پٹھانوں کا انداز یہ ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے دُور دُور اکیلے اکیلے رہتے تھے۔ ایک پٹھان ایک گولی فائر کر کے فوراً" اُس جگہ سے بھاگ جاتا تھا۔

یہ ان قبائلیوں کا کمال تھا کہ انہوں نے اس خاصہ دار کو ایک دو دنوں میں ہی پکڑ لیا اور اُسے بہلا پھُسلا کر ساتھ لے آئے۔ جونہی وہ ٹیکریوں کے پیچھے آیا تو پٹھانوں نے اسے پکڑ کر اٹھا لیا اور اس گاؤں میں لے آئے جہاں جرگہ بیٹھا تھا۔

میں حیران ہوں کہ اس شخص کو معلوم تھا کہ اس کے خلاف غداری کا جرم ثابت ہو گیا تو اسے گولی ماردی جائے گی۔ گواہوں کے بیانات کے باوجود وہ اپنا جرم تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ آخر اُس کے آگے قرآن پاک رکھا گیا تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ قسم کھا کر بچ سکتا ہے' اُس نے جھوٹی قسم نہ کھائی اور سزائے موت قبول کر لی۔

یہ اُس دَور کے قبائلی پٹھانوں کا کردار تھا۔ اسی کردار کی برکت تھی کہ یہ لوگ پوری ایک صدی انگریزوں کے خلاف لڑتے رہے اور اپنی زمین کا ایک انچ بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ آج ان مجاہدین کے کارنامے محض افسانے لگتے ہیں کیونکہ آج قبائلی علاقے کا چہرہ ہی مسخ ہو گیا ہے اور وہ روح رہی ہی نہیں جو کبھی ہُوا کرتی تھی۔

○

غداری کا مقدمہ چلا اور فیصلہ ہُوا اور فیصلے پر فوراً ہی عمل در آمد ہو گیا تو میری باری آئی۔ مجھے جرگے کے سامنے کھڑا کیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ جرگے کے سارے ممبر اردو بولتے اور سمجھتے تھے۔

"اوئے تم کیوں کافر کا نوکری کرتا ہے؟" ـــــ جرگے کے بزرگ نے کہا ـــــ "تھوڑی سی تنخواہ اور راشن کے لئے تم اپنی جانیں انگریزوں کے حوالے کر دیتے ہو"۔

میں نے انہیں بھی وہی جواب دیا جو میں اپنے بوڑھے میزبان کو پہلے دے چکا تھا۔ میں جواب دے چکا تو میرے بوڑھے میزبان نے جرگے کے ساتھ کوئی بات کی۔

"تم اِدھر رہنا چاہتے ہو؟" ـــــ جرگے کے بزرگ نے پوچھا۔

"ہاں بابا جان" ـــــ میں نے پُرجوش لہجے میں کہا ـــــ "یہاں آکر میری غیرت جاگی ہے۔ میں آپ کی طرح آزاد رہنا چاہتا ہوں اور میرا ایمان کہتا ہے کہ فرنگی کے خلاف لڑو"۔

"تم ابھی بچے ہو" ـــــ بزرگ نے کہا ـــــ "جوش میں آکر بات نہ کرو۔ جس روز تم فوج سے بھاگ کر ہمارے پاس آؤ گے تو ہم تمہیں اپنا بیٹا بنا لیں گے"۔

مجھ سے کچھ اور سوال پوچھے گئے۔ میرا بوڑھا میزبان اور اُس کے بیٹے باری باری جرگے سے کچھ کہتے تھے۔ وہ دراصل میری سفارش کر رہے تھے۔

"تم مسلمان ہو" ـــــ جرگے کے بزرگ نے فیصلہ سنا دیا ـــــ "ہم کسی مسلمان کو سزا نہیں دے سکتے۔ ہم تمہیں واپس بھیج دیں گے لیکن تمہاری رائفل اور تمہارا ایمونیشن نہیں دیں گے۔ ہمارا ایک آدمی تمہارے ساتھ جائے گا اور بنوں میں داخل کر کے واپس آجائے گا"۔

"بابا جان!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "اگر آپ میری رائفل اور ایمونیشن یہاں رکھنا چاہتے ہیں تو پھر مجھے بھی یہیں رکھیں۔ انگریزوں کو ہماری اتنی فکر نہیں ہوتی جتنی رائفل اور ایمونیشن کی ہوتی ہے۔ میں اگر بغیر رائفل اور ایمونیشن کے واپس گیا تو وہ اس جرم میں میرا کورٹ مارشل کر دیں گے کہ میں پٹھانوں کے پاس خود ہی چلا گیا تھا اور بدنیتی سے اپنی رائفل اور ایمونیشن پٹھانوں کو دے آیا ہوں۔ اس کی کم سے کم سزا جو مجھے ملے گی وہ دو سال ہو گی۔ اس سے تو آپ اچھے ہیں جو مجھے بغیر کسی شرط کے آزاد کر رہے ہیں۔ آپ نے مجھ پر اتنا رحم کیا ہے تو یہ رحم بھی کریں کہ میری رائفل اور

ایمونیشن مجھے دے دیں ورنہ میں مارا جاؤں گا"۔

جرگے کے ملکوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا اور مجھے اجازت دے دی کہ میں رائفل اور ایمونیشن ساتھ لے لوں۔

اُس روز بہت دیر ہو گئی تھی اس لئے مجھے میرے میزبانوں کے ساتھ رات گزارنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ اگلے روز علی الصبح مجھے جگا لیا گیا۔ بوڑھے پٹھان کا بھتیجا جو ادھیڑ عمر تھا میرے ساتھ چل پڑا۔ یقین کریں کہ میرے اندر کوئی ایسی قوت بیدار ہو گئی تھی جو مجھے وہاں سے نہیں آنے دے رہی تھی۔ میں جب وہاں سے چلا تو میرے آنسو نکل آئے تھے۔ میں وہاں سے جو تحفہ لے کر آیا وہ یہ تھا کہ میرے اندر آزادی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔

مجھے اندازہ نہیں کہ ہم نے کتنا فاصلہ طے کیا تھا کیونکہ زیادہ تر سفر پہاڑی تھا۔ ہم جب بنوں کے دروازے پر پہنچے تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ شہر کے دروازے ابھی کھلے ہوئے تھے۔ میرا میزبان باہر سے ہی واپس چلا گیا۔ میری بٹالین عارضی طور پر بنوں آئی تھی۔ میں پیدل چلتا وہاں گیا تو اپنی پلٹن کو وہیں پایا۔ جب میں اپنی پلٹن میں پہنچا تو جس جس نے مجھے دیکھا وہ یوں دوڑا آیا جیسے میں اگلے جہان سے واپس مُڑا ہوں۔

صوبیدار میجر کو اطلاع دی گئی تو اُس نے حکم دیا کہ اسے کوارٹر گارد میں بند کر دیا جائے۔ مجھ سے رائفل اور ایمونیشن لے کر کوارٹر گارد میں بند کر دیا گیا۔ اگلے روز پہلے میری پیشی کمپنی کمانڈر کے سامنے ہوئی۔ اُسے میں نے ساری بات سنائی کہ میں کہاں چلا گیا تھا۔ پھر مجھے کمانڈنگ آفیسر کے سامنے لے جایا گیا۔ وہاں پھر مجھے وہی کہانی سنانی پڑی۔ مجھ پر بہت جرح ہوئی' آخر اللہ نے کرم کیا کہ مجھے بری کر دیا گیا۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ میرا انگریز کمانڈنگ آفیسر اس بات پر بہت خوش ہُوا تھا کہ میں اپنی رائفل اور ایمونیشن ساتھ لے آیا ہوں۔



ہماری بٹالین عارضی طور پر بنوں گئی تھی۔ مجھے واجدہ یاد آنے لگی تھی۔ میں دعائیں کرتا تھا کہ بٹالین جلدی اپنی چھاؤنی میں واپس جائے اور میں واجدہ کو دیکھوں۔ اُس سے ملنا تو آسان نہیں تھا' اتنا ہی کافی تھا کہ جنگلے سے اُسے دُور سے دیکھ لیتا' لیکن حکم آ گیا کہ ہماری بٹالین اب بنوں میں ہی رہے گی۔ ہمیں قلعے کے اندر بھیج دیا گیا۔

اس قلعے کا نام فورٹ ایڈورڈ ہے۔ اس میں ایک پلٹن کے رہنے کے لئے جگہ تھی۔ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر بھی قلعے کے اندر ہی تھا۔ معلوم نہیں اب یہ قلعہ کیسا ہے۔ اُس زمانے میں اس کی دیواریں کچی اور اوپر سے اتنی چوڑی ہُوا کرتی تھیں کہ ایک بیل گاڑی ان پر چل سکتی تھی۔

میں واجدہ کی یاد میں بے قرار رہا۔ یہ خیال بھی آتا تھا کہ آصف نہ جانے اُس کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہو گا۔ میں نے اپنے دوست صداقت کو خط لکھا کہ واجدہ کبھی گھر آئے تو اُسے میرا سلام کہے اور اُس سے خط لکھوا کر میرے بنوں کے ایڈریس پر پوسٹ کر دے۔

دس گیارہ دنوں بعد صداقت کا جواب آیا۔ اس لفافے میں واجدہ کا خط بھی تھا۔ آصف اُن دنوں دس دنوں کی چھٹی گیا ہُوا تھا۔ وہ اپنے گاؤں چلا گیا تھا اور واجدہ اپنے ماں باپ کے پاس آئی ہوئی تھی۔ مَیں نے پہلے لکھا ہے کہ صداقت واجدہ کے قریبی رشتہ داروں میں تھا اور وہ بلا روک ٹوک اُس کے گھر جاتا اور اُس کے پاس الگ بیٹھتا بھی تھا۔ صداقت رشتہ داری کے علاوہ بڑا بھلا لڑکا تھا۔ اُس پر کسی قسم کا شک نہیں کیا جاتا تھا۔ اُس نے اپنے خط میں لکھا کہ اُس نے واجدہ تک میرا سلام پہنچا دیا تھا اور واجدہ سلام کے جواب میں خط لکھ رہی ہے۔

واجدہ نے بڑا جذباتی خط لکھا تھا۔ جس طرح میں اُسے دیکھنے کو بیتاب اور بے قرار تھا اسی طرح وہ بھی میرے لئے تڑپ رہی تھی۔ آصف کے رویّے کے متعلق اُس نے لکھا کہ اب اس میں کچھ تبدیلی آتی جا رہی ہے۔ یہ تبدیلی کوئی اچھی نہیں تھی۔ اُس نے اب واجدہ پر ہلکا ہلکا رعب جھاڑنا شروع کر دیا تھا۔ یہ تبدیلی اُس دن کے بعد آنی شروع ہوئی تھی جس دن اُس نے مجھے اپنے فیملی کوارٹروں کے قریب جنگلے کے پاس کھڑا دیکھ لیا تھا اور پھر اسی رات وہ میرے پاس آیا تھا اور اُس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں پھر واجدہ سے ملا تو وہ مجھے غائب کر دے گا۔ میں نے اُس کا چیلنج قبول کر لیا تھا۔

واجدہ نے لکھا کہ آصف اسے کہتا ہے کہ اس نیچ ذات کے آدمی سے تعلق توڑ لو ورنہ وہ میرے ہاتھوں قتل ہو جائے گا یا میں بالکل ہی اسے غائب کر دوں گا۔ واجدہ اُس سے کہتی تھی کہ ایسی غلطی نہ کرنا ورنہ میرے پیار سے محروم ہو جاؤ گے اور میں بتا نہیں سکتی کہ میں اور کیا کر بیٹھوں..... اس خط سے یہ صورت سامنے آئی کہ آصف اور واجدہ

میں کشمکش یا چپقلش شروع ہو گئی تھی۔ واجدہ نے لکھا تھا کہ وہ اس شخص سے دب کر نہیں رہے گی۔ اُس نے یہ خطرناک بات بھی لکھی کہ آصف کا رویّہ صحیح نہ ہُوا یا مزید بگڑ گیا تو وہ مجھے یہی مشورہ دے گی کہ اس شخص کو باہر ہی کہیں قتل کرا دو۔ اگر اسے باہر قتل نہ کرایا جا سکا تو واجدہ خود اُسے ایسے طریقے سے زہر پلائے گی کہ کسی کو واجدہ پر شک نہیں ہو گا۔

میں نے اُسی روز صداقت کو خط لکھا جس میں بڑے پُرزور طریقے سے لکھا کہ وہ واجدہ کو سختی سے سمجھا دے کہ جو باتیں اُس نے آصف کو راستے سے ہٹانے کی لکھی ہیں وہ نہ لکھا کرے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خط کسی اور کے ہاتھ لگ جائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔

○

مجھے واجدہ تو نہ ملی لیکن میرے دوست حمید کو عائشہ مل گئی۔ یہ ایک معجزہ تھا۔ میں سنا چکا ہوں کہ عائشہ مزارعوں کی بیٹی تھی اور وہ طلاق یافتہ بھی تھی اور اُس کے ساتھ بہت بڑا خطرہ یہ وابستہ تھا کہ اُس پر جنّ آتا تھا جو یہ ظاہر کرتا تھا کہ اُسے عائشہ کے ساتھ اتنی محبت ہے کہ وہ برداشت نہیں کر سکتا کہ عائشہ کسی اور کی بیوی بنے۔

یہ تو میں پہلے ہی تفصیل سے لکھ چکا ہوں کہ عائشہ کے اس جنّ کی حقیقت کیا تھی۔ یہ ایک ناٹک تھا جو کھیل کر اُس نے اپنے پہلے خاوند سے طلاق لی تھی لیکن گاؤں میں اُس نے اپنے دل میں حمید کی محبت بٹھالی تھی اور حمید اُس کی محبت میں دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ ان کی شادی ناممکن تھی۔

ایک تو ذات میں فرق تھا اور سوشل سٹیٹس میں تو زمین و آسمان کا فرق تھا۔

وہ واقعہ یاد کریں جو میں تفصیل سے سنا چکا ہوں کہ ان کے گاؤں کا شاہ عائشہ کے پیچھے پڑ گیا تھا اور عائشہ کے ماں باپ شاہ کے مطالبے کے مطابق اسے مجبور کرتے تھے کہ وہ اکیلی شاہ کے گھر جائے۔ عائشہ تو اُس کے گھر نہ گئی۔ اس کی بجائے میں اور حمید ایک رات شاہ کے گھر پہنچ گئے اور پھر کس طرح ہم دونوں نے اُسے مارا پیٹا اور ایک درخت کے ساتھ باندھ کر آ گئے تھے۔ ہم نے یہ ظاہر کیا تھا کہ ہم اسے ابھی قتل کریں گے لیکن وہ بلبلا اُٹھا۔ حمید نے اُسے کہا تھا کہ وہ عائشہ کے ماں باپ سے کہے کہ وہ اس کی شادی حمید کے ساتھ کریں اور پھر حمید کے ماں باپ سے کہے کہ وہ اس کی شادی عائشہ کے ساتھ

کریں۔ اگر ان کی شادیاں اِدھر اُدھر ہو گئیں تو دونوں کی جانیں خطرے میں پڑ جائیں گی۔

میں نے یہ بھی لکھا ہے کہ گاؤں کے لوگوں نے شاہ کو درخت کے ساتھ بندھا ہُوا دیکھا تو شاہ نے یہ مشہور کر دیا کہ رات کو اُسے جنّات اٹھا لائے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ صرف گاؤں میں ہی نہیں بلکہ ارد گرد کے دیہات میں بھی شاہ مشہور ہو گیا کہ اس کے قبضے میں جنّات ہیں جن میں بعض جنّ شیطان فطرت ہیں۔ ان میں سے ایک جنّ کسی طرح شاہ کے قبضے سے نکل گیا اور شاہ کو درخت کے ساتھ باندھ کر بھاگ گیا تھا۔

حمید نے مجھے بتایا کہ جب کچھ زیادہ عرصہ ہو گیا اور شاہ نے عائشہ کی اس کے ساتھ شادی کی بات نہ چلائی تو حمید نے گاؤں میں اپنے ایک بد معاش قسم کے دوست کو خط لکھا کہ شاہ کو میرا یہ پیغام پہنچا دے کہ تم نے ابھی تک میرا کام نہیں کیا' اگر تم نے تھوڑا ہی عرصہ اور میرا کام نہ کیا تو تم پر دوسرا حملہ پہلے سے زیادہ خطرناک ہو گا۔

شاہ جو لوگوں کی نظروں میں پہلے سے زیادہ برگزیدہ اور مقبول ہو گیا تھا' حمید سے اتنا خوفزدہ تھا کہ اُس نے حمید کے دوست سے کہا کہ حمید کو تسلی دے دو کہ تمہارا کام جلدی ہو جائے گا۔ شاہ نے یہ بھی کہا تھا کہ کام مشکل ہے اور وہ اس کے لئے زمین ہموار کر رہا ہے۔ ایک روز حمید میرے پاس بیرک میں آیا۔ وہ اتنا زیادہ خوش تھا کہ اس کے منہ سے صحیح بات بھی نہیں نکلتی تھی۔ اُس نے اپنے والد صاحب کا خط دکھایا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ شاہ صاحب نے کہا ہے کہ حمید کو فوراً" بلاؤ اگر اُس نے دیر کر دی تو اس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ اُس کے والد صاحب نے بات بالکل صاف لکھ دی تھی کہ اُس کی شادی عائشہ کے ساتھ کرانی ہے۔

حمید کو شادی کے لئے ایک ہفتے کی چھٹی مل گئی۔ میں نے بھی ایک معقول بہانہ تراش کر پانچ دنوں کی چھٹی لے لی۔ حمید کہتا تھا کہ تمہارے بغیر میری شادی مکمل نہیں ہو گی۔

میں اپنے گھر پہنچ گیا اور حمید مجھے یہ کہہ کر اپنے گاؤں چلا گیا کہ شادی کا جو دن مقرّر ہو گا وہ مجھے بتا دے گا۔ اگلے ہی روز حمید کے گاؤں سے ایک آدمی یہ پیغام لے کر آیا کہ دو روز بعد حمید کی شادی ہے۔ شادی کا دن بہت ہی جلدی مقرر کیا گیا تھا۔ دیہات میں ایسا نہیں ہُوا کرتا۔ میں یہ سننے کے لئے بیتاب تھا کہ شاہ نے یہ چکر کس طرح چلا لیا ہے۔ میں

نے لکھا ہے کہ یہ شادی ناممکنات میں سے تھی۔

میں حمید کے گاؤں ایک دن پہلے ہی جا پہنچا۔ وہ تو سوائے ہنسنے کے کوئی بات ہی نہیں کرتا تھا۔ اُس نے مجھے سنایا کہ شاہ نے ناممکن کو ممکن کس طرح کر دکھایا ہے۔ میری یہ داستان پڑھنے والے خواتین و حضرات غور کریں کہ ہمارے دیہاتی (اور شہری) معاشرے پر پیروں اور شاہ صاحبوں کی گرفت کتنی سخت ہے کہ وہ جو چاہیں لوگوں سے کروا سکتے ہیں۔

حمید نے چھٹی آ کر عائشہ سے ملاقات کی اور اُس سے پوچھا کہ یہ چکر کس طرح چلا ہے۔ عائشہ نے اُسے بتایا' پھر وہ شاہ سے ملا۔ شاہ نے بھی اُسے اپنا یہ کمال سنایا۔ یہ بات اس طرح بنی کہ عائشہ کی ماں بھی اور باپ بھی شاہ کے ہاں جاتے رہتے تھے۔ ان کی ایک ہی مراد تھی کہ عائشہ کی کہیں شادی ہو جائے۔ شاہ کہتا تھا کہ عائشہ اُس کے پاس اکیلی آئے لیکن عائشہ نہیں جاتی تھی۔ ماں باپ کو یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ عائشہ جوان ہے' خوبصورت ہے اور بڑی شوخ اور چنچل ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کے ساتھ در پردہ دوستی لگا لے۔ عائشہ کے رشتے کے لئے تو کوئی آتا ہی نہیں تھا۔ دُور دُور مشہور ہو گیا تھا کہ عائشہ پر بڑا ہی خطرناک جن آتا ہے۔

عائشہ ایک بات نہیں سمجھ رہی تھی۔ پہلے شاہ اسے بدنیتی سے بلاتا تھا لیکن اب اُس کا مطلب کچھ اور تھا۔ اُس نے مجھ سے اور حمید سے جو بُری مار کھائی تھی اور پھر حمید نے اُسے جو دھمکی دی تھی اس کے مطابق وہ حمید کو خوش کرنے کی فکر میں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عائشہ ایک بار آ جائے تو اُسے وہ سمجھا دے کہ اب اُس نے کیا ناٹک کھیلنا ہے لیکن عائشہ کے دل میں اُس کے لئے ایسی نفرت بیٹھ گئی تھی کہ وہ شاہ کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔

شاہ کسی کی زبانی اسے یہ پیغام نہیں بھیج سکتا تھا کہ اُس نے عائشہ سے ڈرامہ کرانا ہے۔ یہ ایسا راز تھا جو وہ کسی کو نہیں دے سکتا تھا۔ ایک روز شاہ نے عائشہ کو کھیتوں کی طرف جاتے دیکھ لیا۔ شاہ دُور کا چکر کاٹ کر کھیتوں میں گیا اور عائشہ کے راستے میں آ گیا۔

"شاہ جی!" ــــ عائشہ نے طنزیہ لہجے میں کہا ــــ "آپ کے قبضے میں بہت جن ہوں گے لیکن میں ایسی شیطان جن ہوں جو کبھی بھی آپ کے قبضے میں نہیں آؤں گی۔ میں آپ کی حقیقت سے واقف ہوں۔ میرے راستے میں نہ آئیں"۔

"بیوقوف لڑکی!" ــــ شاہ نے کہا ــــ "میں نے تم سے کوئی اور کام کروانا ہے اور تم

سے لینا کچھ بھی نہیں..... آج ہی رات یا کل دن کو وہی تماشا دکھادو"۔

"کون سا تماشا؟"

"وہی جن والا تماشا" —— شاہ نے کہا —— "میں نے حمید کے ساتھ جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کرنا ہے۔ تم نے اُسی طرح کرنا ہے جیسے پہلے شہر میں کیا تھا۔ تمہارے ماں باپ میرے پاس ہی آئیں گے۔ آگے میں سنبھال لوں گا۔ میں نے تمہاری شادی حمید کے ساتھ کرانی ہے"۔

عائشہ حمید کا نام سن کر مان گئی۔ اُسی شام گاؤں والوں نے دیکھا کہ عائشہ کا باپ شاہ کے گھر کی طرف دوڑا جا رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا کہ عائشہ کو جن پڑ گیا ہے۔ وہ سخت گھبرایا ہُوا تھا۔ یہ سن کر کئی عورتیں عائشہ کے گھر کی طرف دوڑ پڑیں۔ انہوں نے دیکھا کہ عائشہ کسی کے ہاتھ نہیں آ رہی۔ وہ چارپائی پر لیٹے لیٹے اُچھلتی تھی۔ وہ آخر جوان تھی۔ اُس کے جسم میں طاقت تھی۔ عورتوں کے قابو میں تو وہ آ ہی نہیں رہی تھی۔ ہر ایک کی زبان پر یہی الفاظ تھے کہ شاہ جی کو بلاؤ۔

شاہ بھی آ گیا اور اُس نے آتے ہی اپنا ناٹک دکھانا شروع کر دیا۔ اُس نے پہلے تو جن کو گالیاں دیں پھر کہا کہ وہ اسے زندہ جلا دے گا۔ عائشہ نے یہ ڈرامہ پہلے کھیلا ہُوا تھا اور اس میں کامیاب بھی رہی تھی اس لئے وہ بڑی خوش اسلوبی سے ایکٹنگ کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جن کسی پر آتا ہے تو وہ کس طرح بولتا ہے۔

شاہ نے "جن" کے ساتھ باتیں شروع کر دیں۔ پہلے تو دونوں ایک دوسرے کو دھمکیاں دیتے رہے پھر شاہ دوستانہ باتوں پر آ گیا۔ اس کمرے میں گاؤں کی بہت سی عورتیں تھیں اور کچھ آدمی بھی آ گئے تھے۔ شاہ نے کسی کو بھی نہ کہا کہ باہر چلے جائیں۔ وہ یہ ناٹک زیادہ سے زیادہ لوگوں کو دکھانا چاہتا تھا۔ آخر "جن" نے ایک حکم دیا۔

"حمید کے ماں باپ کو فوراً بلاؤ" —— عائشہ نے کہا جسے لوگ جن کی آواز سمجھ رہے تھے —— "وہ آئیں گے اور میری بات مانیں گے تو ہی میں رخصت ہوں گا"۔

تماشائیوں میں سے کوئی شاہ کے کہنے پر دوڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد حمید کی ماں اور اُس کا باپ دوڑے آئے۔

"لو بھائی!" —— شاہ نے "جن" سے کہا —— "تمہارے حکم کی تعمیل ہو گئی ہے۔ حمید کے والدین آ گئے ہیں"۔

"دونوں میرے قریب آؤ" —— عائشہ نے جن کی زبان میں کہا۔ دونوں اُس کے قریب ہوئے تو عائشہ نے کہا —— "مجھے اس لڑکی کے ساتھ اتنی زیادہ محبت ہے کہ میں

اس کی شادی اُس لڑکے کے ساتھ کراؤں گا جو مجھے پسند ہے۔ اس کا پہلا خاوند مجھے پسند نہیں تھا اس لئے میں نے اُس سے اسے آزاد کرا لیا تھا۔ میرے پیر استاد نے کہا ہے کہ اس کی شادی حمید کے ساتھ کراؤ۔ اب تم دونوں بیٹے کی شادی اس لڑکی سے کرا دو۔ اگر نہیں کراؤ گے تو میں تمہارے بیٹے کو اُسی دن مار ڈالوں گا جس دن تم اس کی شادی کسی اور لڑکی کے ساتھ کرو گے۔ ان کی شادی جلدی کرا دو۔ میں اس لڑکی کو پھر کبھی تنگ نہیں کروں گا۔ میں ان دونوں کی قسمت چمکا دوں گا"۔

حمید کے والدین تو بُت بن گئے۔ انہیں یہ جوڑ بالکل پسند نہیں تھا۔

"مت سوچو" —— جن نے کہا —— "میں نے اس لڑکی کو نہیں چھوڑنا تھا۔ میں نے اس کو بھی اور حمید کو بھی غائب کر دینا تھا لیکن میں ان شاہ جی کا حکم نہیں ٹال سکتا"۔

"تم اب چلے جاؤ" —— شاہ نے کہا —— "میں ان کی شادی کرا دوں گا"۔

شاہ نے ویسے ہی کچھ دیر ہونٹ ہلائے جیسے کچھ پڑھ رہا ہو، پھر اُس نے عائشہ کے سر سے پاؤں تک پھونک ماری۔ اُس نے عائشہ کو آنکھ کا اور ایک انگلی کا اشارہ دے دیا تھا۔ عائشہ نے ایسی انگڑائی لی جیسے اپنی ہڈیاں توڑ دے گی۔ پھر اٹھ بیٹھی اور حیرت زدہ نظروں سے ہر طرف دیکھنے لگی۔

"مجھے کیا ہُوا تھا؟" —— اُس نے خوفزدگی کے عالم میں پوچھا۔

"کچھ نہیں عائشہ!" —— شاہ نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا۔

"میرا جسم دُکھ رہا ہے" —— عائشہ نے رونے جیسی آواز بنا کر کہا۔

شاہ نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر عائشہ پر پھونک ماری۔

"اب؟"

"اب کچھ آرام آیا ہے" —— عائشہ نے کہا۔

شاہ نے عائشہ اور حمید کے ماں باپ کو ساتھ لیا اور دوسرے کمرے میں جا بیٹھا۔ ل نے انہیں اس جن سے ڈرایا اور حمید کے ماں باپ سے کہا کہ حمید کی شادی عائشہ لے ساتھ کر دیں ورنہ جوان بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

حمید کے ماں باپ کے لئے مسئلہ پیدا ہو گیا۔ شاہ نے انہیں اور زیادہ ڈرایا اور حوصلہ زائی بھی کی۔ انہوں نے اپنے رشتہ داروں اور گاؤں کے بڑوں سے بات کی۔ سب نے ا کہا کہ بیٹے کی شادی عائشہ کے ساتھ کر دو۔ اونچ نیچ نہ دیکھو۔

یہ ناٹک کامیاب رہا اور حمید اور عائشہ کی شادی ہو گئی۔

میں ماضی بعید کی باتیں سنا رہا ہوں۔ ان وقتوں کے کچھ لوگ ابھی باقی ہیں
میرا خیال ہے میری باتیں ان ہی پرانے لوگوں کو اچھی لگتی ہوں گی
نئے دور کے لوگ بیزار ہوتے ہوں گے کہ ماضی کی دلدل میں پھنسا ہوا یہ بوڑھائی نس
کو پیچھے کو لے جانے کے جتن کر رہا ہے۔

میں نے پہلے بھی کہا ہے' اب بھی کہتا ہوں کہ میں عالم فاضل نہیں' نفسیات ا
عمرانیات کا ریٹائرڈ پروفیسر نہیں اور میں فلسفے اور منطق سے بھی واقف نہیں' میں
اچھے برے' بہت ہی اچھے اور بہت ہی برے انسانوں کو پڑھا ہے۔ میں نے ان حالات
مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے جو خود ہی پیدا ہو کر انسان کو بے حال اور بے بس کر دیا کرتے
اور ان حالات کا بھی جو انسان اپنی حماقتوں اور اپنی لغزشوں سے خود پیدا کیا کرتا ہے۔

تجربہ اسے نہیں کہتے کہ حالات نے انسان کے ساتھ کیا سلوک کیا بلکہ صحیح تجر
ہوتا ہے کہ انسان نے حالات کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

کہنے والے ٹھیک کہتے ہیں کہ زندگی ایک سفر ہے۔ اس سے وہی انسان کچھ سیکھ
اور دوسروں کو بھی سکھا سکتا ہے جو گردو پیش کو دیکھتا جائے اور یہ کیوں اور وہ کیسے
جواب اور جواز ڈھونڈتا جائے۔ کہیں ٹھوکر کھائے تو اپنے آپ کو سمجھائے کہ سفر
آنکھیں اور دل و دماغ کے دریچے کھلے رکھنے چاہئیں۔

میں پٹھانوں کا قیدی ہوا تو مجھے خوفزدہ ہو کر کڑھنا اور پریشان ہونا چاہئے تھا کہ یہ
گولی مار دیں گے یا ہمیشہ کے لئے قید میں رکھیں گے لیکن میں نے دماغ کو حاضر ر
اس کے نتیجے میں مجھے ان مجاہد اور غیور پٹھانوں سے وہ خزانہ ملا جو قارون کے پاس
نہیں تھا۔

میں نے کہیں بڑے پتے کی بات پڑھی تھی۔ ایک انگریز مفکر نے لکھا تھا کہ ز
ایک ڈرامہ ہے لیکن اس میں ہیرو جوکر کے رول میں نظر آتے ہیں اور جوکر ہیرو کا
ادا کر جاتے ہیں۔

پاکستان کے آج کے معاشرے میں تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہیرو کون' ولن کون
جوکر کون ہے.... سیاست میں دیکھ لیجئے' مذہب میں دیکھ لیجئے۔

معلوم نہیں میں اپنا نکتہ نظر واضح کر سکا ہوں یا نہیں۔ آج کی نسل اپنے آ
ترقی یافتہ سمجھتی ہے کیونکہ گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں زیادہ ہو گئی ہیں۔ یہ بھی ترقی ک

نشانی ہے کہ یہاں امریکہ جیسے جرائم شروع ہو گئے۔ پہلے ہم بنک ڈکیتیوں کی کہانیاں باہر
کے انگریزی رسالوں میں پڑھا کرتے تھے اور ان کے ترجمے ہمارے اردو رسالوں میں
شائع ہوا کرتے تھے۔ اب اللہ کے فضل و کرم سے پاکستان میں آئے دن بنک ڈکیتی کی
خبریں آتی ہیں۔

ترقی تو بہت ہوئی ہے۔ سہیلی اب فرینڈ کہلاتی ہے۔ اس لڑکی کو پسماندہ کہتے ہیں
جس کا بوائے فرینڈ نہ ہو۔ حجام کی دکان اب ہیئر کٹنگ سیلون کہلاتی ہے۔

جی ہاں! ترقی بہت ہوئی ہے لیکن ذہن کرپٹ ہو گیا ہے۔

ترقی زمانے نے کی ہے ذہن نے نہیں!

پسماندگی کے دور میں ہمارے ذہن ترقی یافتہ ہوئے تو ہم نے غلامی کی زنجیریں توڑ کر
اپنا آزاد ملک بنا لیا۔

ترقی یافتہ دور میں ہماری اگلی نسلوں کے ذہن ترقی کر گئے تو ملک کے دو ٹکڑے ہو
گئے۔ حکمرانوں نے ملک کو امریکہ کا غلام بنا دیا اور نوجوان ذہن مغرب کے کلچر کے غلام
ہو گئے۔

میں اپنی اس تحریر میں اپنے آپ کو ہیرو نہیں بنا رہا۔ اپنے آپ کو دانشمند ثابت
نہیں کر رہا۔ میں نے جو دیکھا وہ بیان کر رہا ہوں۔ اس پر غور کریں۔ کچھ باتیں کام کی
ہیں۔

○

حمید اور عائشہ کی شادی ہو گئی۔ یہ تو تفصیل سے سنایا ہے کہ یہ شادی کس طرح
ہوئی تھی۔ جس شاہ نے یہ شادی کرائی تھی' اسے میری اور حمید کی چھینٹی ایسی راس آئی
کہ آج اس کا ہر سال عرس ہوتا ہے اور اس کی گدی پر اس کا بیٹا بیٹھا اپنے علاقے کے
لوگوں پر حکومت کر رہا ہے۔ اس گدی کے متعلق مشہور ہے کہ جنات بھی سلام کو آتے
ہیں۔

اگر کسی کا یہ خیال ہے اس شاہ کو دیہات کے پسماندہ لوگ ہی پیر مانتے اور اپنی
مرادیں پوری کرانے اس کے ہاں جاتے ہوں گے تو وہ شخص بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا
ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ڈگری یافتہ لوگ اس پیر کے مرید ہیں اور یہی تعلیم یافتہ
لوگ اس پیر کی کرامات اور معجزے نشر کرتے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں۔

حمید کو فوت ہوئے چار سال گزر گئے ہیں۔ عائشہ زندہ ہے۔ میری طرح بہت بوڑھی ہو گئی ہے۔ کبھی کبھار اس کے گاؤں جاتا ہوں۔ ہمارا پیار آج بھی ترو تازہ ہے۔ ڈیڑھ دو مہینے گزرے، میں اپنے قصبے کے بازار سے کچھ لینے گیا تو وہاں عائشہ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اپنی ایک پوتی کی شادی کے کپڑے لینے آئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا۔ میں انہیں اپنے گھر لے آیا۔

"خانی!" ــــ عائشہ نے ادھر ادھر کی باتیں کر کے مجھے کہا ــــ "ان پڑھے لکھے لوگوں سے تو ہم ان پڑھ اور گنوار اچھے تھے۔ اس پیر کے مزار پر جو عرس ہوتا ہے، کبھی وہ دیکھنے ہمارے گاؤں آنا۔ بعض مرید کاروں میں آتے ہیں۔ لوگوں کو میں نے اس شاہ کے مزار پر سجدے کرتے دیکھا ہے جسے تم نے اور حمید نے درخت کے ساتھ باندھ کر بیدوں سے پیٹا تھا..... میں دوسروں کی کیا کہوں، میری اپنی اولاد پڑھ لکھ کر بھی اس پیر کی مرید ہے۔ میری ایک بہو ہر نئے چاند کی پہلی جمعرات مزار پر دیا جلاتی ہے۔ میں نے انہیں صرف ایک بار کہا تھا کہ اس گدی کی اصلیت کیا ہے۔ سب نے کہا، تم تو پیروں کی بددعائی ہوئی ہو"۔

"انہیں سنا دینا تھا کہ حمید کے ساتھ تمہاری شادی کس طرح ہوئی تھی" ــــ میں نے کہا۔

"نہ خانی!" ــــ اس نے ہنستے ہوئے کہا ــــ "یہ بات تو میں کسی کو بھی نہیں سنا سکتی۔ میں تو اللہ کو یاد کرتی ہوں۔ وہی دینے والا ہے، وہی لینے والا ہے۔ مجھے حمید اللہ نے دیا تھا لیکن یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ اللہ نے ہمیں پاکستان دیا تو میں کہتی تھی کہ اب لوگ اللہ کو ہی حکمران سمجھیں گے لیکن یہاں تو پیروں کی حکمرانی ہے"۔

"لوگوں کو انہی کے حال پر چھوڑ دے عائشہ!" ــــ میں نے کہا ــــ "ہر کسی نے اپنی قبر میں جانا ہے۔ تم اپنی قبر کی ٹھنڈک کا سامان کرو"۔

عائشہ جب بھی ملتی ہے ہم ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہیں۔

○

آیئے، میں آپ کو جوانی کے وقتوں میں لے چلتا ہوں جہاں سے میرا یہ سفر شروع ہوا تھا۔

میں تو یہ سمجھا تھا کہ دنیا واجدہ پر جا کر ختم ہو جاتی ہے اور یہی میری منزل ہے۔ میں

اس کی خاطر جان تک کا خطرہ مول لینے کو تیار ہو گیا تھا اور میں نے اپنے آپ کو خطروں میں ڈالا بھی تھا۔ میں نے فوجی نوکری کیا کرنی تھی، یہ تو ایک مجبوری تھی کہ میں فوج میں چلا گیا اور واجدہ مجھ سے چھن گئی۔ میں نے اس کو زندگی کا سب سے بڑا چیلنج سمجھ لیا اور تہیہ کر لیا کہ واجدہ کو حاصل کر کے ہی رہوں گا۔ یہ تو میں سنا چکا ہوں کہ میں نے واجدہ کے خاوند کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

پھر مجھے دوست ملا تو حمید ملا۔ وہ عائشہ کو چاہتا تھا اور اسی کو زندگی کا مقصد سمجھتا تھا۔

میں جب قبائلی پٹھانوں کے خلاف لڑنے کے لئے گیا تھا تو دل پر یہ خوف طاری تھا کہ میں مارا جاؤں گا۔ میں پٹھانوں کا قیدی ہو گیا تو میں سمجھا کہ بس زندگی یہیں پر ختم ہو گئی ہے لیکن میں اس بوڑھے پٹھان کے سامنے بیٹھا اور اس کی باتیں سنیں تو میں نے محسوس کیا کہ زندگی تو یہاں سے شروع ہوئی ہے۔ یہ نہ سمجھیں کہ میں بدمعاش تھا یا ڈاکو اور چور اچکا تھا اور میں یک لخت مومن بن گیا۔ آپ نے ایسی کہانیاں پڑھی ہوں گی کہ ایک ڈاکو ڈاکہ ڈال کر جنگل میں جا رہا تھا تو اسے کوئی صوفی یا درویش مل گیا۔ اس نے ڈاکو کے ساتھ ایسی باتیں کیں کہ ڈاکو متاثر ہو گیا اور اس نے اسی وقت توبہ کر لی اور گھر جا کر تسبیح ہاتھ میں لی اور اللہ اللہ کرنے بیٹھ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بزرگ قبائلی پٹھان سے متاثر ہو گیا تھا لیکن میں اپنے اندر ایک تبدیلی محسوس کرتے ہوئے بھی زندگی کا یہ چیلنج نہیں بھولا تھا کہ میں نے واجدہ تک پہنچنا ہے۔

ہاں، البتہ یہ ضرور ہوا کہ میں جب قید سے رہائی پا کر واپس اپنی بٹالین میں آیا تو میں نے یوں محسوس کیا کہ میں اب قید ہوا ہوں، پٹھانوں کے ہاں تو میں آزاد تھا۔ میں نے اپنے اندر گھٹن سی محسوس کی۔ میں اس گھٹن کو سمجھتا بھی تھا لیکن مجھ میں اتنی عقل نہیں تھی کہ میں کچھ سوچ سکوں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ دوسری طرف یہ حال تھا یا دل کی یہ کیفیت تھی کہ واپس آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اپنے دوست صداقت کو خط لکھا کہ وہ واجدہ کے متعلق کچھ جانتا ہے تو مجھے لکھے۔ یہ تو میں سنا چکا ہوں کہ واجدہ کا خط آیا جس میں اس نے صاف لکھا تھا کہ وہ چاہتی ہے کہ اس کے خاوند نے اس کے ساتھ اپنا رویہ درست نہ کیا تو وہ اسے صاف کرا دے گی۔ اس نے مجھے بھی یہی کہا تھا کہ مجھے جہاں کہیں موقع ملے میں آصف کو قتل کر دوں۔

میں دراصل دو حصوں میں بٹتا جا رہا تھا۔ ایک طرف مجھے قبائلی پٹھان یاد آتے تھے

جنہیں میں نے لڑتے دیکھا تھا اور ان کی باتیں سنی تھیں دوسری طرف واجدہ تھی جس ک
یاد آتی تو میں تڑپ اٹھتا اور میرے ذہن سے نکل ہی جاتا کہ میں انگریزوں کا غلام ہوا
اور مجھے قبائلی پٹھانوں جیسا غیرت مند ہونا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ میں اپنا ہی غلام ہو گیا تھا۔ اسے خواہشوں کی غلامی کہتے ہیں۔ ہ
لوگ انگریزوں کی غلامی میں خوش تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزوں نے ہمارے دلوا
میں خواہشیں پیدا کر دی تھیں۔ ایک خواہش یہ کہ افسر مجھ پر خوش رہیں اور مجھے تر
ملتی رہے۔ دوسری خواہش یہ کہ میری جیب میں اتنے پیسے ہوں کہ میں باعزت زندگی بر
کر سکوں اور میرے خاندان کا وقار بڑھے۔ انگریز نے ہماری ان خواہشات کی تکمیل
ہمیں یہ طریقہ ذہن نشین کرا دیا کہ اپنے سے اوپر والے کی خوشامد کرو اور افسروں کو جھک
کر سلام کرو تو سب کچھ پا لو گے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ ہمارے ہندوستانی لوگ خصوصا
فوج میں عہدیدار اور جمعدار' صوبیدار وغیرہ انگریزوں کی خوشامد کس قدر ذلیل طری
سے کیا کرتے تھے۔ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہو
کہ انگریز نے ذہنی طور پر بلکہ میں تو کہوں گا کہ رُوحانی طور پر ہمیں غلام بنا لیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ انگریز بڑی ہی عیار اور مکار قوم ہے اور اتنی زیادہ عقلمند کہ انہو
نے باتوں باتوں میں ہندوستان پر قبضہ کر لیا تھا۔ میرا خیال کچھ اور ہے۔ انگریزوں۔
تہیہ کر لیا تھا اور وہ یہ عزم لے کر آئے تھے کہ ہندوستان پر قبضہ کرنا اور اسے اپنی سلطن
میں شامل کرنا ہے۔ دوسری طرف ہم نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ ہم نے انگریز کو اپنا بادشاہ
ہے۔ اگر کسی کو میری یہ بات سمجھ میں نہ آئے تو پاکستان کی جو موجودہ کیفیت ہے وہ د
لیں۔ کیا ہمارے حکمرانوں اور سیاسی لیڈروں نے امریکہ کو اپنا ان داتا اور اپنا بادشاہ تسل
نہیں کر لیا؟ پھر اپنی ابھرتی ہوئی نسلوں کی اخلاقی حالت دیکھ لیں۔ انہوں نے امریکہ۔
کلچر کو اپنا لیا ہے اور اپنے کلچر کو بیکار اور دقیانوسی سمجھ کر الگ پھینک دیا ہے۔ یہ انقلا
اپنے آپ ہی نہیں آیا' یہ امریکہ بڑے ہی پیارے اور پرکشش طریقوں سے لایا اور را
کیا ہے۔ اسے کہتے ہیں ذہنی غلامی۔ امریکہ نے اپنے پاکستانی ایجنٹوں کے ذریعے اور
اور طریقوں سے ہم لوگوں کے دلوں میں خواہشات پیدا کیں۔ دولت اکٹھی کرنے
خواہش' اچھی سے اچھی عورت سے دوستی لگانے کی خواہش اور اپنے آپ کو دوسرو
سے اعلیٰ اور برتر سمجھنے کی خواہش۔

یہ ساری باتیں کہنے سے میری مراد یہ ہے کہ ہم لوگ ذہنی طور پر غلام ہو گئے تھے۔
میں پٹھانوں سے ایک تاثر لے کر واپس اپنے ملک اور اپنے ساتھیوں میں آیا تو میرا ذہن پھر آہستہ آہستہ واپس اسی مقام پر آنے لگا جہاں سے میں اسے قبائلی علاقے کے میدان جنگ میں لے گیا تھا۔ میں پھر خواہشوں کا غلام بننے لگا مثلاً" حمید کی شادی عائشہ کے ساتھ ہو گئی تو میں نے از سر نو عہد کر لیا کہ میں واجدہ کو حاصل کر کے ہی رہوں گا۔



پھر اچانک پیام اجل آ گیا۔ اسے میں پیام اجل ہی کہوں گا۔ وہ یہ تھا کہ حکم آیا کہ بٹالین فوری طور پر کلکتہ پہنچے۔ ہم سمجھ گئے کہ ہمیں برما فرنٹ پر بھیجا جا رہا ہے۔ اس وقت برما کا محاذ بڑا ہی گرم تھا۔ جاپانیوں نے پورے برما پر قبضہ کر لیا تھا اور جاپان کے بمبار طیارے کلکتہ کی بندرگاہ تک بمباری کر رہے تھے۔ بنگال کے بڑے بڑے تاجر اور سیٹھ وغیرہ وہاں سے ہندوستان کی طرف بھاگ گئے تھے۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ کو تھوڑی سی تاریخ بھی سنا دوں۔ یہی وہ موڑ تھا جہاں سے ہندوستانیوں میں کچھ بیداری پیدا ہوئی۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا کہ ہندوستان کے لیڈروں نے انگریزوں کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستان کی آزادی کی باتیں شروع کر دی تھیں۔ اس وقت انگریزوں کی حالت یہ تھی کہ جاپانیوں نے آج کے انڈونیشیا' سنگاپور' ملایا اور برما پر قبضہ کر لیا تھا۔ انگریزوں کی فوجیں جن میں انڈین آرمی خاص طور پر شامل تھی' برما سے بہت ہی بری حالت میں پسپا ہوئیں بلکہ بے طرح بھاگی تھیں۔ سنگاپور اور ملایا میں تو پوری پلٹنیں ان کے جرنیلوں سمیت جنگی قیدی بن گئی تھیں۔ یہ ممکن ہی نظر نہیں آتا تھا کہ انگریز جاپانیوں سے ہندوستان کو بچا لیں گے۔

میں آپ کو کچھ دلچسپ باتیں سنانا چاہتا ہوں۔ جاپان نے جنگ میں جو کامیابیاں حاصل کی تھیں وہ جاسوسوں کی مدد کے بغیر ممکن نہیں تھیں۔ برما' ملایا' سنگاپور اور انڈونیشیا کے تمام علاقوں میں جاپان کے جاسوس موجود تھے جو جنگ کے دوران جاسوس نہیں بنے تھے بلکہ بہت عرصہ پہلے سے وہاں موجود تھے۔ جاپان کی فوجیں جو بحری جہازوں میں آئی تھیں' ان کی راہنمائی ان کے جاسوسوں نے کی تھی جو جاپانی نہیں بلکہ مقامی لوگ تھے۔

ان جاسوسوں کی بعض کارروائیاں افسانوی سی لگتی ہیں۔ شاید کچھ انہیں حقیقی تسلیم

نہ کریں لیکن ہم فوجی اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ بالکل سچی تھیں۔ مثلاً" جاپانی فوجیوں نے فرض کیا ملایا پر حملہ کیا اور اس کے ساتھ جاپان کے لڑاکا بمبار طیارے آتے تو جاسوسوں نے ان کی راہنمائی اس طرح کی کہ آپ نے کھیتوں میں دیکھا ہو گا کہ ایک مصنوعی انسان بنا کر کھڑا کیا ہوا ہوتا ہے۔ ایک بانس زمین میں گاڑا ہوا ہوتا ہے اس کے اوپر صلیب کی طرح ایک چھوٹا بانس باندھ کر اس پر قمیض چڑھا دی جاتی ہے اور اوپر ہانڈی رکھ دی جاتی ہے۔

کوے یا دانے چگنے والے پرندے اسے انسان سمجھتے ہیں اور قریب نہیں آتے۔ ملایا میں ایسے ہی مصنوعی انسان کھیتوں میں گاڑے ہوئے تھے۔ جاپان کے بمبار طیارے آتے تھے تو ان مصنوعی انسانوں میں سے ایک یا دو اپنے ایک طرف کے بازو نیچے گرا دیتے تھے۔ ایک ایک بازو باہر یعنی کندھے کی لائن میں پھیلا ہوا ہوتا تھا۔ بمبار پائلٹ اس بازو کو دیکھتے اور سمجھ جاتے تھے کہ ان کا ٹارگیٹ اس سمت کو ہے۔ یہ اشارے دینے والے انسان مصنوعی نہیں ہوتے تھے بلکہ یہ اصلی انسان تھے جو جاپانیوں کے جاسوس تھے۔ وہ جاپانی بمبار ہوا بازوں کی راہنمائی اس طریقے سے کرتے تھے۔ کسی کو ان پر شک نہیں ہوتا تھا۔

ہمیں معلوم ہوا کہ جاپانی ہوا بازوں اور شاید ان کی فوج کے لئے بھی کچھ اور اشارے بھی مقرر تھے۔ مثلاً" ان علاقوں میں کیلا' ناریل اور پپیتہ زیادہ ہوتا تھا۔ کسی سڑک پر کیلے کے درخت کے پتے بکھرے ہوئے ہوتے تو کسی کو خیال نہیں آسکتا تھا کہ ان پتوں کا اس کے سوا کوئی اور مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی پھینک گیا ہے۔ یہ جاپانی فوج کے بڑے افسر جانتے تھے کہ کیلے کے ان بکھرے ہوئے پتوں کا مطلب کیا ہے۔ یہ ایک اشارہ ہوتا تھا کہ یہاں قریب ہی کوئی اہم فوجی ٹھکانہ ہے۔

آج کل جاسوسی کے ایسے سائنسی آلات بنائے جا چکے ہیں کہ جاسوس اپنے کمرے میں بیٹھا سمندر پار پیغام بھیج سکتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی اور برطانیہ نے سائنسی طریقے اختیار کئے تھے۔ مثلاً" ایک عام سی تحریر کا خط کوئی آدمی اپنے کسی دوست کو لکھتا ہے اور یہ خط ٹائپ کیا ہوا ہے۔ اس میں جو فل سٹاپ دیئے گئے ہوتے ان میں پورے پورے پیغام چھپے ہوتے تھے۔ جہاں یہ خط جاتا وہاں تمام فل سٹاپ اس طرح بڑے کئے جاتے جس طرح کوئی فوٹو اس نیگیٹو سے بڑا یعنی انلارج کیا جاتا ہے۔ اس میں

جاسوس کا پیغام ہوتا تھا۔ جاپان نے ان علاقوں میں جہاں اس نے قبضہ کر لیا تھا جاسوس پہلے سے ہی بھیج دیئے تھے لیکن اس کے پاس ابھی تک کوئی سائنسی طریقہ نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے جاسوس کچھ اور ہی قسم کے اشارے دیتے تھے۔

البتہ ہندوستان میں جاپان کے جو جاسوس تھے' ان کے طور طریقے کچھ اور تھے۔ جاسوسی اور تخریب کاری ایک الگ موضوع ہے جس پر میں بہت کچھ لکھ سکتا ہوں لیکن یہ تحریر بڑی لمبی ہو جائے گی۔ میں اتنی ہی بات کروں گا جتنی عام قاری کے لئے دلچسپ ہو گی۔ میں چونکہ حوالدار کلرک تھا اس لئے میرا رابطہ افسروں کے ساتھ رہتا تھا۔ G.H.Q نے ایک خفیہ پمفلٹ لکھا تھا جو صرف افسروں تک پہنچایا گیا تھا۔ اس پمفلٹ میں وہ سارے طریقے لکھے گئے تھے جو جاپان کے مقامی ایجنٹوں اور جاسوسوں نے سنگاپور' ملایا اور برما میں استعمال کئے تھے۔ یہ بڑا ہی دلچسپ پمفلٹ تھا۔

جاپانیوں نے ایک اور طریقہ اختیار کیا تھا جو جاپان کے لئے بہت ہی فائدہ مند تھا۔ آپ نے اکثر ایک نام سنا ہو گا۔ یہ ہے انڈین نیشنل آرمی اس طرح بنی تھی کہ کانگرس کا ایک بنگالی لیڈر سبھاش چندر بوس بنگال سے فرار ہو کر جاپان چلا گیا تھا۔ اسے دراصل مہاتما گاندھی اور کانگرس کے پنڈت جواہرلال نہرو جیسے لیڈروں نے اس پیغام اور پلان کے ساتھ بھیجا تھا کہ جاپان ہندوستان پر حملہ کرے تو کانگرس جو خالصتاً" ہندوؤں کی جماعت تھی' جاپانی فوج کی پوری پوری مدد اور راہنمائی کرے گی۔ اس پلان کے مطابق جاپان کی حکومت نے یہ کارروائی کی کہ اس نے انڈین آرمی کے افسروں اور سپاہیوں وغیرہ کی ایک الگ فوج بنائی جسے انڈین نیشنل آرمی کا نام دیا گیا۔

یہ ہندوستانی افسر اور جوان جاپان کے پاس موجود تھے اور ان کی تعداد سینکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں تھی۔ یہ وہ جنگی قیدی تھے جو سنگاپور' ملایا اور برما سے جاپانی فوج کے ہاتھ لگے تھے۔ یقین کریں کہ جاپانی فوج نے ہندوستانی فوج کی پوری پوری پلٹنیں پکڑ لیں اور ان سے ہتھیار ڈلوا کر انہیں جنگی قیدی بنا لیا۔

مثلاً" میں ایک بٹالین کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ یہ تھی آٹھویں پنجاب رجمنٹ کی فرسٹ بٹالین۔ اسے جاپانیوں نے ایک راؤنڈ بھی فائر کرنے کی مہلت نہیں دی تھی۔ پوری کی پوری بٹالین سے ہتھیار ڈلوا کر ساری نفری کو جنگی قیدی بنا لیا تھا۔ ہمارے ہاں یعنی ہندوستان میں جو فوج تھی' اس میں ایک مذاق مشہور ہو گیا تھا کہ انگریزوں نے

انڈین آرمی کی دو پلٹنیں سنگاپور اور ملایا کمک کے طور پر بھیجیں تو جاپانیوں نے انگریزوں کو یہ پیغام بھیجا کہ آپ کی دونوں پلٹنیں بخیروخوبی وصول پائیں، آپ کا شکریہ۔

نقشے میں دیکھیں جاپان کتنی دور ملک ہے۔ اس کی فوجیں آج کے انڈونیشیا کے جزائر پر قبضہ کرنے کے لئے آتی ہیں۔ جاپانی حکومت کو معلوم تھا کہ یہ انگریزوں کی سلطنت ہے اور وہاں فوج موجود ہے۔ یہ علاقے جو دراصل چھوٹے بڑے ہزارہا جزیروں کا مجموعہ ہے، جاپانی فوج کے لئے اجنبی علاقے تھے۔ اگر یہ ایک ہی ملک ہوتا اور یہ ساری خشکی ہوتی تو اور بات تھی لیکن یہ جزیرے ہی جزیرے تھے جن میں جاپانی اجنبی تھے لیکن جاپانی فوجیں اس طرح آئیں اور ان تمام جزیروں پر اس طرح پھیل گئیں اور انگریزوں کی فوج سے ہتھیار ڈلوا کر قابض ہو گئیں جیسے وہ ان ہزارہا چھوٹے بڑے جزیروں کے ایک ایک انچ سے واقف تھیں۔ میں آپ کو حقیقت بتا چکا ہوں۔ یہ ان مقامی لوگوں کا کمال تھا جو جنگ سے بہت عرصہ پہلے سے جاپان کے جاسوس بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے جس طرح جاپانیوں کی راہ نمائی کی وہ میں نے مختصراً" بیان کر دی ہے۔

○

بات ہو رہی تھی آئی این اے کی۔ جاپانیوں نے جنگی قیدیوں کے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا۔ ان سے اتنی زیادہ مشقت لی جاتی تھی جو انسانی جسم کے لئے قابل برداشت نہیں ہوتی تھی۔ خوراک اتنی کم اور ایسی خراب دی جاتی تھی کہ قیدیوں کے جسم کمزور ہوتے گئے۔ ان میں جو بیمار ہو جاتا یا زیادہ مشقت اور کم غذا کی وجہ سے بہت کمزور ہو جاتا، اسے گولی مار دی جاتی تھی۔ یہاں تک سنا تھا کہ جاپانی سپاہی جنگی قیدیوں کو درختوں کے ساتھ باندھ کر یا باندھے بغیر اپنے سامنے کھڑا کر کے ان پر سنگین بازی کی مشق کیا کرتے تھے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ رائفل کے آگے سنگین چڑھی ہوتی ہے۔ سنگین بازی کی الگ تھلگ ٹریننگ دی جاتی ہے۔ اس میں بوریوں میں بھوسہ بھر کر دشمن کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اسے ڈمی کہتے ہیں۔ جاپانی فوج زندہ قیدیوں کو ڈمی کے طور پر استعمال کرتی۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ ان زندہ فوجیوں کے جسم کس طرح چھلنی ہوتے ہوں گے بلکہ کس طرح چیرے پھاڑے جاتے ہوں گے۔

جب ہندو کانگرس کے لیڈر سبھاش چندر بوس نے جاپان کے بادشاہ ہیروہیٹو کے ساتھ معاملہ طے کر لیا اور ملایا برما وغیرہ میں انڈین نیشنل آرمی کی بنیاد رکھ دی۔ انڈین

آرمی کے جو ہزارہا جنگی قیدی جاپان کے پاس تھے انہیں کہا گیا کہ اس طرح ایک فوج خالصتاً" ہندوستانیوں کی بنائی گئی ہے اور یہ فوج ہندوستان کو آزاد کرائے گی اور پھر انگریز بھاگ جائیں گے اور ہندوستان پر ہندوستانیوں کی اپنی حکومت ہو گی۔ جنگی قیدیوں کو اس فوج میں شامل ہونے کے لئے کہنے والوں میں ایک تو سبھاش چندر بوس تھا اور اس کے ساتھ ہندوستانی فوج کے چند ایک ہندوستانی افسر تھے جو جنگی قیدی تھے۔ ظاہر ہے کہ انڈین آرمی کے ان افسروں اور جوانوں کو سبز باغ دکھائے گئے تھے اور انہیں سب سے بڑی سہولت تو یہ نظر آئی کہ وہ جنگی قیدی نہیں رہیں گے بلکہ ایک فوج کے باقاعدہ فوجی بن کر جاپانیوں کے مہمان ہوں گے۔ جنگ کے بعد اس انڈین نیشنل آرمی کے جو جوان مجھے ملے، انہوں نے بتایا کہ وہ اس مشقت اور کم اور ناقص غذا سے بچنے کے لئے جو جنگی قیدیوں کی قسمت میں لکھی گئی تھی، آئی این اے میں شامل ہوئے تھے۔

آئی این اے کے سلسلے میں تین نام بہت مشہور ہوئے تھے۔ ان میں ایک مسلمان تھا۔ اس کا نام کیپٹن شاہنواز تھا۔ ایک ہندو تھا اور ایک سکھ۔ ان دونوں کے نام مجھے یاد نہیں رہے اور مجھے یہ بھی شک ہے کہ تیسرا کیپٹن بھی ہندو تھا یا سکھ تھا۔ ان تینوں کو آئی این اے میں بڑے عہدے دیئے گئے تھے۔ اس کا یعنی اس فوج کا کمانڈر انچیف سبھاش چندر بوس تھا۔ میں نے بہت بعد میں انگریزی کی ایک کتاب دیکھی تھی جس میں سبھاش چندر بوس کی فوٹو تھی۔ اس نے جرنیلی وردی پہنی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ دو جوان اور خوبصورت ہندو عورتیں تھیں۔ یہ عورتیں بھی فوجی وردی میں تھیں۔ پتہ چلا کہ سبھاش چندر بوس خوبصورت عورتوں کا رسیا تھا اور ان دو عورتوں کو ہر جگہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ ملایا سنگاپور وغیرہ کے علاقوں میں ہی رہتا تھا جس پر جاپانیوں کا قبضہ تھا۔

بعد میں یہ انکشاف بھی ہوا کہ یہ جو تین کپتان آئی این اے کے کمانڈر بنائے گئے تھے وہ جب اکٹھے بیٹھتے تو ہندوستان کو آپس میں بانٹتے رہتے تھے۔ ایک کہتا کہ اتنا ملک اور فلاں فلاں علاقے میرے ہوں گے، دوسرے دو اپنے اپنے علاقے الگ کرتے تھے۔ انہیں سو فیصد یقین تھا کہ جاپان کی فوجی مدد سے وہ ہندوستان کو فتح کر لیں گے اور آپس میں بانٹ لیں گے۔

تاثر یہ دیا جاتا تھا کہ آئی این اے کسی ایک مذہب یا قوم کی فوج نہیں بلکہ یہ تمام

ہندوستانیوں کی فوج ہے اور جب یہ فوج ہندوستان کو آزاد کرا لے گی تو ہندوستانیوں کی حکومت ہو گی' یہ حکومت نہ ہندوؤں کی ہو گی نہ سکھوں اور نہ مسلمانوں کی بلکہ آزاد ہندوستان میں ہندوستانی بھائی بھائی ہوں گے۔ حقیقت یہ تھی کہ یہ فوج ہندو کانگرس نے بنوائی تھی اور اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستان کو انگریزی راج سے آزاد کرا کے یہاں ہندو راج قائم کیا جائے۔ یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں تھا۔ اتنی سی بات تو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ سبھاش چندر بوس کانگرسی لیڈر تھا اور اسے جاپان بھیجنے والے کانگرس کے ہی کرتا دھرتا لیڈر تھے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد یہ تینوں کپتان پکڑے گئے تھے اور دلی کے لال قلعے میں ان کا کورٹ مارشل ہوا تھا اور ان کا وکیل پنڈت جواہر لال نہرو تھا جس نے تینوں کو چھڑوا لیا تھا۔ سبھاش چندر بوس جنگ کے دوران ہی جاپان میں ایک ہوائی جہاز میں سفر کر رہا تھا اور ہوائی جہاز ایک اڈے پر اترتے ہوئے کریش کر گیا اور سبھاش چندر بوس مارا گیا تھا۔ یہاں میں آپ کو ایک اور دلچسپ بات بھی بتا دوں۔ سبھاش چندر بوس مہاتما گاندھی کے سخت خلاف تھا حالانکہ ہندو گاندھی کو اپنا روحانی باپ تسلیم کرتے تھے۔ سبھاش چندر بوس نے ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس نے مہاتما گاندھی کے دوغلے پن اور دیگر عیاریوں کو بے نقاب کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ سبھاش چندر بوس خود کانگرس کا اتنا ہی بڑا لیڈر بننا چاہتا تھا جتنا بڑا گاندھی یا پنڈت نہرو تھا۔

قارئین سوچتے ہوں گے کہ میں اپنی کہانی سے ہٹ کر سیاسی باتوں پر آ گیا ہوں۔ آپ سے میری یہ گزارش ہے کہ میں آپ کو ایک باب اس ملک کی تاریخ کا سنا رہا ہوں جو ہماری ان نسلوں کے لئے ضروری ہے جنہوں نے ہندو کو قریب سے نہیں دیکھا اور وہ ہندو کو دوست سمجھتے ہیں اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ہندو اتنا ہی اچھا اور خوبصورت ہے جتنا انڈیا کی فلمیں اور اس کی ایکٹرسیں خوبصورت ہیں۔ میں آپ کو تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ بتا رہا ہوں کہ ہندو لیڈروں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنا غلام بنانے کے لئے کیا کیا جتن کئے۔ ان میں آئی این اے ایک بڑا ہی خوفناک پلان تھا۔ اگر جاپان کی فوج ہندوستان داخل ہو جاتی تو ہندوستان پر ہندوؤں کی حکومت ہوتی اور آج ہم سب مسلمان ہندو کے غلام ہوتے' ہمارا مذہب ہندو کا غلام ہوتا اور یہاں کوئی مسجد سلامت نہ ہوتی۔



برما پر جب جاپان کا قبضہ ہو گیا تو سارے ہندوستان میں آئی این اے کا اتنا زیادہ پروپیگنڈہ ہوا کہ بچے بچے کی زبان پر آئی این اے چڑھ گیا تھا۔ یہ پروپیگنڈہ نہ ریڈیو سے ہوا تھا اور نہ ہی اخباروں سے۔ یہ زبانی زبانی پروپیگنڈہ ہوا اور پروپیگنڈہ کرنے والے جاپان کے جاسوس تھے جو زیادہ تر ہندو تھے۔

پھر دیکھئے کہ آئی این اے یا دوسرے لفظوں میں جاپانیوں کے پروپیگنڈے کے انتظامات کتنے موثر تھے۔ برما پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا تو انگریزوں نے امریکہ کی فوج کی مدد سے برما پر جوابی حملہ کیا۔ جنگ میں فتح یا شکست تو ہوتی ہی ہے۔ اصل شکست خوردہ اسے کہتے ہیں جو شکست کو تسلیم کر کے الگ بیٹھ جائے۔ ہم نے یعنی ہم پاکستانیوں نے مشرقی پاکستان میں کیا کیا تھا۔ سیاست کی بددیانتی کی وجہ سے ہمیں وہاں شکست کا سامنا ہوا تو ہماری آنے والی حکومت نے بجائے اس کے کہ فوج کی حوصلہ افزائی کرتی کہ فوج اپنی شکست کا انتقام لے' یہ کیا کہ گھٹیا پروپیگنڈے کے ذریعے فوج کو رسوا کر دیا اور اتنی بڑی شکست کو جس میں آدھا ملک ہاتھ سے نکل گیا' ہضم کر کے آپس میں اقتدار کی جنگ شروع کر دی۔ انگریز زندہ قوم تھی اور زندہ رہنا چاہتی تھی اس لئے اس نے برما سے انتہائی ذلیل پسپائی کے بعد اپنی فوجوں میں نئی روح پھونکی' ادھر امریکہ کو ساتھ ملایا اور برما پر جوابی حملہ کر دیا۔ یہ جنگ عظیم کا بڑا ہی خونریز محاذ تھا۔ ظاہر ہے کہ جاپانیوں نے برما سے پسپا نہیں ہونا تھا لیکن ادھر انگریزوں نے اپنی پسپائی کو فتح میں بدلنے کا عزم کر رکھا تھا اس لئے دونوں قوموں نے برما میں اپنے زیادہ سے زیادہ فوجی قربان کر دیئے۔ ادھر آئی این اے بن گئی تھی۔ اس کے لئے مزید نفری کی ضرورت تھی۔ جاپانیوں نے میدان جنگ میں یہاں تک معلوم کر لیا کہ محاذ کے کس حصے میں انڈین آرمی کی کون کون سی یونٹ لڑ رہی ہے۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ برما کا محاذ میدانی نہیں تھا بلکہ وہ سارا علاقہ پہاڑی اور جنگلاتی ہے۔ بڑا ہی دشوار گزار علاقہ ہے۔ ایک ایک ٹیکری پر بڑی ہی خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ ان لڑائیوں میں سے کچھ میں ہمارے فوجی جاپان کے ہاتھ جنگی قیدی ہو جاتے تھے۔ جاپانی فوجی ان کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کرتے تھے کیونکہ انہیں انہوں نے آئی این اے میں شامل کرنے کے لئے تیار کرنا ہوتا تھا۔ ان سے پوچھ لیتے تھے کہ وہ کون سی یونٹ کے ہیں۔

پھر یوں ہوتا کہ جنگ جاری ہے اور جاپانیوں کے مورچوں سے لاؤڈ سپیکروں سے

اس طرح آوازیں آ رہی ہیں کہ کوئی ایک جوان بڑی بلند آواز سے ادھر کی کسی یونٹ کے جوان کا نام لے کر پکار رہا ہے اور اسے کہہ رہا ہے کہ انگریزوں کی غلامی چھوڑو اور اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لئے ہماری طرف آ جاؤ۔ مثلاً" یہ یوں ہوتا تھا:

"راجپوتانہ رائفل کی اے کمپنی کے لانس نائک محمد خاں! السلام علیکم۔ میں تمہاری کمپنی کا سپاہی نور احمد بول رہا ہوں۔ تم میرے گرائیں ہو۔ انگریزوں کی غلامی چھوڑو اور پکے مسلمانوں کی طرح آزاد ہو جاؤ۔ فوراً" ادھر ہمارے پاس پہنچ جاؤ اور دیکھو ہم کتنی عیش کر رہے ہیں۔ تم بھی آؤ اور ہم سب مل جل کر ہندوستان کو آزاد کرائیں"۔

میں نے یہ مختصر سے الفاظ بطور نمونہ پیش کیے ہیں۔ یہ آوازیں رات کو جب محاذ پر ذرا خاموشی ہوتی تھی' بہت آتی تھیں۔ ان آوازوں کا اثر یہ ہوا کہ ہماری طرف سے جوان بھاگنے لگے اور اس طرف پہنچ گئے۔ یہاں یہ بھی ہوا کہ اس زمانے کی فوج کا سپاہی اتنا بیدار مغز نہیں تھا کہ آزادی اور غلامی کا فرق سمجھ سکتا۔ مثلاً" میرا علاقہ جو فوجی علاقہ کہلاتا ہے' ایک طرح کا غلاموں کا علاقہ تھا کیونکہ لوگ انگریزوں کی انڈین آرمی میں فخریہ انداز میں بھرتی ہوتے تھے اور ترقی حاصل کرنے کے لئے خوشامد کو ذریعہ بناتے تھے۔ خوشامد کے علاوہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر بہادری کے کارنامے بھی کر دکھاتے تھے۔ ان میں سے جو عہدیدار یا سپاہی ادھر بھاگ کر چلے گئے وہ ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے نہیں گئے تھے۔ وہ جانیں بچانے یا زخمی ہو کر ہمیشہ کے لئے اپاہج ہونے سے بچنے کے لئے ادھر چلے گئے تھے۔

برما کی زمین میں نے بیان کی ہے۔ پہاڑی اور جنگلاتی زمین تھی۔ زیادہ تر مورچے ٹیکریوں پر اور بلندیوں پر تھے۔ وہاں سے بھاگ نکلنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ رات کے اندھیرے میں اپنے مورچے سے نکل کر ٹیکری سے اتر جانا یا درختوں کی اوٹ میں غائب ہو جانا بڑا آسان تھا۔ اس طرح انڈین آرمی کی جو یونٹیں وہاں لڑ رہی تھیں' ان کے سپاہیوں میں سے بھگوڑا ہونے کی خبریں آنے لگیں۔ جو یونٹیں ابھی پیچھے تھیں' انہیں اس قسم کے لیکچر دیئے جاتے تھے کہ تم لوگ جب آگے جاؤ گے تو تمہیں اس قسم کی آوازیں سنائی دیں گی۔ ان آوازوں کی طرف توجہ نہ دینا۔ یہ جاپانیوں کا دھوکا ہے۔ وہ ہندوستان کے جنگی قیدیوں کو مار ڈالنے کی دھمکی دے کر انہیں کہتے ہیں کہ اپنی اپنی یونٹ

کے دوستوں کو پکارو اور انہیں کہو کہ ادھر آ جائیں۔ اس لیکچر میں ہندوستانی فوجیوں کو بتایا جاتا تھا کہ جاپانی اس طرح دھوکے سے تمہیں بلاتے ہیں اور جو ان کے مورچوں میں چلا جاتا ہے اسے مار کر اس کا گوشت کھاتے ہیں اور اگر وہ قیدیوں کو زندہ رکھیں تو ان سے اتنی مشقت لیتے ہیں کہ قیدی کام کرتے کرتے مر جاتے ہیں۔ قیدیوں کو چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار ایک روٹی دیتے ہیں۔

مطلب یہ تھا کہ جاپانی ہمارے فوجیوں کو سبز باغ دکھاتے اور اپنی طرف بڑے پیار اور احترام سے بلاتے تھے اور ادھر انگریز اپنے فوجیوں کو ڈراتے تھے اور انہیں بڑی ہی خوفناک باتیں سناتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو ہندوستانی فوجی ادھر چلا جاتا تھا اسے جاپانی ہاتھوں ہاتھ لیتے اور پوری عزت سے اسے پیچھے اس جگہ بھیج دیتے جہاں انڈین نیشنل آرمی کو تیار اور منظم کیا جا رہا تھا۔ اس میں زیادہ تر ہندو تھے۔

○

اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ غلامی کیا ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہندوستانیوں نے غلامی کا وہ ذائقہ تو چکھا ہی نہیں تھا جو انگریزوں نے بنگالیوں کو چکھایا تھا۔ یہ ایک زہر تھا جو بنگالیوں کو دیا گیا تھا۔ آپ نے ایک اصطلاح سنی ہو گی ---- "بھوکا بنگالی" ---- مجھے یاد ہے کہ یہ اصطلاح ہمارے گاؤں تک بھی پہنچی۔ جب بنگالی کا نام آتا تھا تو جب تک بھوکا نہ کہا جاتا' اس نام کو نامکمل سمجھا جاتا تھا۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ اصطلاح چلی کس طرح تھی۔ اس زمانے کے فوجی ابھی زندہ ہیں جو بنگال میں رہے تھے۔ وہ جانتے ہیں کہ انگریزوں نے بنگالیوں کو کس طرح بھوکا مارا تھا۔ یہ میں اپنی اس داستان میں اس لئے شامل کر رہا ہوں کہ ہمارے وہ نوجوان جو سمجھتے ہی نہیں کہ آزادی کیا ہے' انہیں پتہ چلے کہ جب خداوند تعالیٰ کی یہ بات یا یہ فرمان الٰہی پورا ہو جاتا ہے کہ تم اگر اپنے اخلاق اور کردار کو نہیں سنوارو گے یا قرآن کے مطابق نہیں کرو گے تو ہم تم پر ایک اور قوم کو مسلط کر دیں گے۔ تو یہ قوم جو کسی بدکار اور بدعہد قوم پر مسلط ہوتی ہے تو وہ محکوم قوم کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔

بنگالی لڑنے والی قوم ہے۔ خصوصاً" مسلمان جنگجو ہیں اور جنگجو چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ سبھاش چندر بوس جو بنگالی تھا جاپان کے پاس چلا گیا ہے اور جاپان کی مدد سے ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتا ہے تو بنگالیوں نے فوج میں بھرتی ہونا چھوڑ دیا۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بنگالی بزدل تھے اس لئے فوج میں بھرتی نہیں ہوتے تھے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ میں نے بنگالیوں کو قریب سے دیکھا ہے۔ مسلمان بنگالی کی شجاعت پر کسی کو شک نہیں تھا۔ ستمبر 1965ء میں لاہور کے محاذ پر اور بیدیاں سیکٹر میں بنگالی رجمنٹیں لڑ رہی تھیں۔ ان کی شجاعت نے مغربی پاکستان کو بچالیا تھا۔ کہیں سے بھی کوئی ایسی خبر نہیں ملی تھی کہ کسی بنگالی نے بزدلی کا مظاہرہ کیا ہو یا دھوکا دیا ہو۔ 1971ء میں بنگالیوں نے طے کرلیا کہ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانا ہے تو دسمبر 1971ء کی جنگ میں لاہور کے محاذ سے بنگالیوں کی پوری کی پوری بٹالین بھاگ کر دشمن کے پاس چلی گئی تھی۔ مشرقی پاکستان میں بھی بنگال رجمنٹ کے بنگالیوں نے ایسے ہی کیا تھا۔ اسے ہم غداری کہتے ہیں لیکن ان کی نظر میں یہ بہادری تھی۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ بنگالی بزدل تھا۔ میں نے آپ کو وجہ بتائی ہے کہ بنگالیوں نے کیوں انگریزوں کی انڈین آرمی میں بھرتی ہونے سے انکار کردیا تھا۔ ایک وجہ اور ہوئی۔ وہ یہ کہ بنگال چاول پیدا کرتا تھا۔ چاول کے تاجروں نے تمام چاول کسانوں سے خرید کر غائب کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس میں ان کا کاروباری فائدہ بھی تھا اور یہ ہندو کانگرس کی کارروائی بھی تھی۔

اب وجہ کو آپ چھوڑیں' انگریز نے جب اپنا شاہانہ حکم چلایا تو سارے بنگال کی پیداوار اپنے قبضے میں اس طرح کرلی کہ عام لوگ سمجھ ہی نہ سکے اور ہوا یہ کہ ملک میں قحط پڑ گیا۔ یہ مصنوعی قحط ایسا پڑا کہ چاول کا کہیں ایک دانہ نظر نہیں آتا تھا۔ لوگوں کے احتجاج کو کون سنتا۔ وہ جمہوریت نہیں تھی بلکہ انگریزوں کی بادشاہی تھی۔ یہ بادشاہی فرعونیت میں بدل گئی اور بنگالی بھوک سے مرنے لگے۔ میں ان دنوں اپنی بٹالین کے ساتھ کلکتہ میں تھا پھر ہماری بٹالین کو ڈھاکہ بھیجا گیا۔ اللہ میری توبہ..... میں نے وہاں جو منظر دیکھے ہیں' آج بھی یاد کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بڑے ہوٹلوں میں جہاں فوجی اور افسر جاتے تھے' چاول پکتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ہوٹل کے برتن دھلنے اور جو پانی نالی سے باہر آتا تھا وہاں بنگالی بچے ایک دوسرے پر گر گر کر' ایک دوسرے کو دھکے دے دے کر اس پانی میں ہاتھ ڈالتے تھے کیونکہ اس پانی میں چاولوں کے دانے باہر آتے تھے۔ گندی پلیٹیں دھلنے سے کچھ دانے باہر آجاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہوٹلوں کی نالیوں میں سے چاولوں کا ایک ایک دانہ اٹھا کر منہ میں ڈالتے تھے۔

فوجیوں کو شہر میں جانے کی اجازت تھی۔ فوجی جب شہر میں گھوم پھر کر آتے تو ایسی

باتیں سناتے تھے کہ ہاتھ اپنے آپ ہی کانوں تک پہنچ جاتے اور زبان پر بے اختیار اللہ اللہ آ جاتا تھا۔ اس میں کوئی جھوٹ نہیں کہ بیشتر بنگالیوں نے اپنے بچے بیچ ڈالے تھے۔ دس دس بارہ بارہ سال کی بچیاں ہوس کار آدمیوں کے حوالے کر دیتے تھے۔ کوئی عورت بچے کو جنم دیتی تو نوزائیدہ بچے کو اٹھا کر باہر پھینک دیتے تھے۔ میں ایک روز شہر گیا۔ میرا دوست حمید میرے ساتھ تھا۔ ایک ادھیڑ عمر بنگالی نے میں روک لیا۔ بنگال کے بڑے بڑے شہروں میں عصمت فروشی تو بہت ہی زیادہ تھی۔ خصوصاً" کلکتہ تو فوج کا شہر بن گیا تھا۔ محاذ سے جو یونٹیں واپس آتی تھی وہ کلکتہ میں رکتی تھیں اور ان کی جگہ جو یونٹیں آگے بھیجی جاتی تھیں وہ کلکتہ ہی میں رکی ہوئی ہوتی تھیں۔ انگریزوں کی فوجیں بھی تھیں جنہیں ہم گورا رجمنٹیں کہا کرتے تھے اور امریکی فوج بھی تھی۔ اس کے علاوہ آسٹریلیا کی اور کچھ دوسرے ملکوں کی فوجیں بھی تھیں۔ افریقہ کے حبشیوں کی رجمنٹیں بھی تھیں۔ آپ جانتے ہیں کہ فوجی جب فرنٹ سے آتا ہے تو وہ یوں سمجھتا ہے جیسے موت کے منہ میں سے نکل کر آیا ہو۔ میں پاکستان آرمی کی بات نہیں کر رہا۔ میں جنگ عظیم کے دور کی بات کر رہا ہوں۔ فرنٹ سے آئے ہوئے فوجی سب سے پہلے عصمت فروشوں کے ہاں پہنچتے تھے۔ کلکتہ میں تو یہ عالم تھا کہ ایک آدمی دو دو تین تین عورتیں ساتھ لئے پھرتا تھا۔ فوجی اپنی وردی میں ہوتے تھے۔ سویلین کپڑے پہننے کی اجازت نہیں تھی۔ جہاں کہیں فوجی رک جاتا' عصمت فروش اسے گھیر لیتے اور اپنی اپنی عورتیں انہیں دکھاتے تھے۔ یہ دھندہ کھلے بندوں چلتا تھا۔ پولیس کی کوئی چیکنگ یا پابندی نہیں تھی۔

میں ڈھاکہ شہر کی بات کر رہا تھا۔ حمید میرے ساتھ تھا۔ ہمیں ایک ادھیڑ عمر آدمی نے روک لیا۔ فٹ پاتھ پر ساتھ ہی دو نوجوان لڑکیاں کھڑی تھیں۔ ان لڑکیوں کا انداز طوائفوں والا تھا ہی نہیں۔ انہوں نے میلے کچیلے کپڑے پہن رکھے تھے اور ان کے سانولے چہروں پر اداسی تھی۔

"صاحب بی بی؟" ـــ اس آدمی نے پوچھا۔

ہر فوجی کو یہ الفاظ ـــ "صاحب بی بی؟" ـــ ہر دس پندرہ قدم پر سننے پڑتے تھے۔ اس شخص نے ہمیں روکا اور یہی سوال کیا تو میں نے لڑکیوں کو دیکھا اور مجھے کچھ شک ہوا۔

"تم کون ہو؟" ـــ میں نے آہستہ سے پوچھا ـــ "مسلمان ہو یا ہندو؟"

"مسلمان ہوں صاحب!" — اس نے کہا — "لڑکی دیکھیں"۔

"کیا یہ تمہارا پیشہ ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"نہیں صاحب!" — اس نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے آنسو نکل آئے اور بولا — "پیسہ مت دو' ایک ٹائم کا چاول دے دو۔ روٹی کھلا دو"۔

میں یہ نہیں کہہ رہا کہ میں کوئی شریف آدمی تھا۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ میں اپنے آپ کو ہیرو ثابت نہیں کر رہا۔ میں اسی قسم کا فوجی تھا جس قسم کے فوجی اس وقت ہوا کرتے تھے۔ اگر وہ پیشہ ور عصمت فروش ہوتا تو میں اس کے ساتھ سودا بازی کرتا اور پھر اس کے ساتھ چل پڑتا لیکن اس نے جب یہ کہا کہ وہ مسلمان ہے اور یہ اس کا پیشہ نہیں تو میرے خون میں ایسا ابال آیا کہ پہلے یہ جی میں آئی کہ اس آدمی کا گلا گھونٹ دوں لیکن میں بے بس تھا اور یہ شخص مجبور تھا۔ بھوک نے اس کے دماغ پر سیاہ کالا پردہ ڈال دیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے کتنے بچے ہیں۔ اس نے آٹھ بچے بتائے۔ یہ دو لڑکیاں بڑی تھیں۔ ان میں سے ایک کی عمر چودہ اور دوسری کی سولہ سال ہوگی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کی بیوی ایک اور بچہ پیدا کرتے مر گئی ہے۔ اس کے بچے گھر میں بھوک سے تڑپ رہے تھے۔ میں نے حمید کے ساتھ بات کی اور ہم دونوں نے طے کر لیا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ یہیں کھڑا رہے اور کسی گاہک کو پھانسنے کی کوشش نہ کرے۔

میں اور حمید وہیں سے واپس اپنے کیمپ میں آئے۔ میں چونکہ دفتر میں کام کرتا تھا اس لئے میرا کچھ رسوخ چلتا تھا۔ فوج میں راشن کی کوئی کمی نہیں تھی۔ میں نے ایک حوالدار کو بلایا اور اس کے ساتھ بات کی۔ اس نے کہا کہ تم کس کس مسلمان بنگالی کا پیٹ بھرو گے۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے جس نے اپنی کمسن بیٹیاں پیش کی ہیں' میں کم از کم اس کا ایک وقت کے لئے تو پیٹ بھر دوں۔

بہرحال کچھ بحث مباحثے کے بعد تھوڑے سے راشن کا بندوبست ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ دو سیر چاول ہوں گے اور اتنی سی ہی دال تھی اور کچھ اتنا ہی آٹا باندھ کر میں اور حمید پھر وہاں گئے جہاں وہ شخص ہمیں ملا تھا۔ کیمپ سے یہ راشن نکالنا مشکل تھا کیونکہ سنتری گھومتے رہتے تھے لیکن ہم دونوں ادھر ادھر سے نکل گئے۔ وہ شخص وہیں کھڑا تھا۔ ہم نے یہ راشن اس کے حوالے کیا تو اس نے اپنی بیٹیوں کی طرف دیکھا پھر اس نے

ہماری طرف دیکھا۔

"اپنے ساتھ لے جائے گا؟" — اس نے پوچھا — "میرے گھر جائے گا؟"

وہ پوچھ رہا تھا کہ ہم لڑکیوں کو کہاں لے جائیں گے۔

"ہم تمہاری بیٹیوں کو کہیں بھی نہیں لے جائیں گے" — میں نے کہا — "ہم مسلمان ہیں' ہم یہ راشن تمہارے بچوں کے لئے لائے ہیں۔ یہ بھی اور اپنی بیٹیوں کو بھی واپس لے جاؤ"۔

اس نے میری طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حمید نے اس کے کندھے پر تھپکی دی اور اسے گھر جانے کو کہا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ وہ مسلمان ہو کر اپنی بیٹیوں کی عزت اس طرح نہ بیچے۔

"کب تک!" — اس نے روتے ہوئے کہا — "آپ ہر روز تو مجھے یہ چیزیں نہیں دے سکتے۔ بچوں کے پیٹ بھرنے کے لئے کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ آپ کو کیا معلوم کہ ہمارے ملک میں کیا ہو رہا ہے"۔

میں نے حمید کو بازو سے پکڑا اور اسے کہا آؤ چلیں۔ میری عقل تو جیسے بیکار ہو گئی تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آتی تھی۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا' یہ ہے غلامی' یہ ہے غلامی۔

.... حمید کو بازو سے پکڑے ہوئے میں واپس آ رہا تھا۔ بے شمار ننھے منے ہاتھ ہمارے آگے پھیلتے چلے جا رہے تھے۔ ان لوگوں کی کھیتیاں بنجر نہیں ہوئی تھیں' بانجھ بھی نہیں ہوئی تھیں۔ ہوا صرف یہ تھا کہ ان کی کھیتیوں پر انگریز قابض ہو گیا تھا۔ اس رات مجھے وہ بزرگ قبائلی پٹھان بہت یاد آیا۔ اس کی باتیں یاد آئیں۔ اس نے کہا تھا کہ تم نہیں جانتے کہ مسلمان کافر کا غلام ہو جائے تو مسلمان کا ایمان برباد ہو جاتا ہے۔ وہ مسلمان نہیں رہتا۔ اس کا روزہ قبول نہیں ہوتا اور اس کی نماز بھی قبول نہیں ہوتی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ مت سوچو کہ تمہیں پیسہ کدھر سے ملتا ہے۔ یہ سوچو کہ تمہارا ایمان کس طرح ٹھیک رہتا ہے اور اس بزرگ پٹھان نے یہ بھی کہا تھا کہ فرنگی نے تمہیں بہت سستا خرید لیا ہے۔

مجھ میں اتنی عقل نہیں تھی کہ میں سوچتا کہ انگریزوں سے کس طرح آزاد ہوا جا سکتا ہے۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اس ادھیڑ عمر مسلمان کو میں کس طرح ہر روز راشن پہنچا سکتا ہوں۔ ناممکن تھا۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے وہاں کے صرف مسلمانوں کا

خیال آ رہا تھا۔ میں عقل سے نہیں جذبات سے مغلوب ہو کر سوچ رہا تھا۔

مجھے آئی این اے کا خیال آیا۔ میں آئی این اے کے متعلق یا اس کے پس منظر اور اصلیت کے متعلق جو باتیں پہلے سنائی ہیں وہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔ اس وقت تک جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں' میں آئی این اے کو بالکل جائز سمجھتا تھا اور جس روز میں نے اس مسلماں بنگالی کو دیکھا اس روز میں آئی این اے کو ضروری سمجھنے لگا۔ یہاں سے مجھے ذرا سکون ملا۔ میں نے اسی رات طے کر لیا کہ میری بٹالین جب فرنٹ پر جائے گی تو میں ادھر سے بھگوڑا ہو کر جاپانیوں کے پاس چلا جاؤں گا اور پھر میں آئی این اے کے ساتھ ہندوستان میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوں گا۔ مجھے نیند آنے لگی اور میں سو گیا۔

○

میں نے غلامی کی انتہا دیکھی ہے۔ یہ انتہا نہیں تو اور کیا تھا۔ انگریز فرعون بنا دیکھ رہا تھا کہ بنگالی بھوکے مر رہے ہیں' اپنی بیٹیوں کو بیچ رہے ہیں اور اپنے دودھ پیتے بچوں کو پھینک رہے ہیں۔ ایسی خبریں بھی سنی تھیں کہ کچھ بنگالیوں نے اپنے مرے ہوئے بچوں کا یا گھر کے کسی بڑے مرے ہوئے فرد کا گوشت بھی کھایا ہے۔ انگریز یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن وہ بادشاہ تھا۔ وہ اپنی رعایا کو اسی مقام پر لانا چاہتا تھا۔ بنگالیوں نے فوج میں بھرتی ہونا شروع کر دیا۔

اسی رات ہمیں جگایا گیا۔ تیاری کا حکم ملا۔ ٹرک آ گئے۔ وہاں تو ہم تیاری کی حالت میں ہی رہتے تھے۔ ہم ٹرکوں میں بیٹھے اور ٹرک چل پڑے۔ ہم جانتے تھے کہ ہم ہندوستان کو واپس نہیں بلکہ برما کے محاذ پر جا رہے ہیں۔

صبح ہوئی تو میں بتا نہیں سکتا ہم کہاں تھے۔ ٹرک چلتے رہے۔ کہیں کھانے کے لئے رکے اور پھر چل پڑے..... اور کچھ دنوں کی مسافت کے بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے جو میدان جنگ نہیں بلکہ قیامت کا میدان تھا۔ دھماکے دور سے سنائی دے رہے تھے۔

حکم ملنے پر ہم کود کر ٹرکوں سے اترے۔ میں اپنے کمپنی کمانڈر کے ساتھ تھا۔ ہم آگے ہی آگے دوڑتے جا رہے تھے۔ اب ہم فرنٹ پر تھے جہاں موت کی چیخیں اور زناٹے سنائی دے رہے تھے۔ میں آفیسر تو تھا نہیں کہ مجھے معلوم ہوتا کہ ہماری پوزیشنیں کہاں ہیں اور ہماری بٹالین کس سکیم کے تحت ان پوزیشنوں میں جا رہی ہے۔ ہم اب

کم کے پابند تھے اور وہاں کا ماحول اور دھماکے صاف بتا رہے تھے کہ اب ہم موت کے وش بدوش چل رہے ہیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد فضا میں بڑی زبردست گھن گرج سنائی دی۔ اوپر دیکھا' آٹھ نو ہوائی جہاز تھے۔ مجھے کچھ پتہ نہ چلا کہ یہ ہوائی جہاز انگریزوں کے ہیں یا جاپانیوں کے پتہ س وقت چلا جب ایک جہاز غوطے میں آیا اور ہماری پوزیشنوں پر مشین گن کا فائر کرتا گے نکل گیا۔ مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ اس فائرنگ نے ہماری بٹالین کے کتنے جوان مار الے ہیں یا کچھ بچت ہو گئی ہے۔ اب تو یہ عالم تھا کہ اپنے آپ کو بچانا تھا۔ صرف یہ یکھنا تھا کہ میں زندہ ہوں یا نہیں۔ نفسا نفسی شاید اسی کو کہتے ہیں۔

چار یا پانچ ہوائی جہاز ہمارے اوپر سے گزر گئے۔ ان کی مشین گنیں گولیاں اگل رہی ہیں۔ ہمارے مشین گنروں نے اس پر فائرنگ کی اور ایک جہاز کو مار لیا۔ اس ہوائی جہاز ں سے پہلے دھواں نکلا پھر یہ دھماکے سے پھٹا اور اس کے ٹکڑے فضا میں بکھر گئے۔ سرے جاپانی ہوابازوں نے اسی وقت انتقام لے لیا۔ میں نے ایک بلند ٹیکری سے پیچھے و دیکھا۔ ہم جن ٹرکوں سے اترے تھے' وہ مجھے نظر آ رہے تھے۔ وہ جہاں کے کھڑے ھے' وہ کوئی وسیع و عریض میدان نہیں تھا۔ وہ اڑھائی تین سو گز چوڑی جگہ تھی۔ اس ے تین طرف ٹیکریاں تھیں۔ جگہ کم ہونے کی وجہ سے ٹرک ایک دوسرے کے ساتھ لگے ہوئے کھڑے تھے۔ میدان جنگ میں ٹرکوں کو اس طرح اکٹھا نہیں رکھا جاتا لیکن ان لوں میں سے سامان اتارا جا رہا تھا۔ اس سامان میں ہماری بٹالین کا ریزرو ایمونیشن تھا ں میں گرینیڈ بھی تھے اور بٹالین کا دوسرا سامان بھی تھا۔ ہیڈ کوارٹر کمپنی کے کچھ جوان یہ امان ٹرکوں میں سے اتار رہے تھے۔ ایک جاپانی ہواباز نے اپنے ہوائی جہاز کو غوطے میں ل کر ان ٹرکوں پر مشین گنیں فائر کیں اور آگے نکل گیا۔ اس کے پیچھے دوسرا ہوائی باز آیا۔ اس کے پروں کے نیچے سے دو بم نکلے جو ٹرکوں کے جھرمٹ کے وسط میں رے۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بم ایمونیشن کے بکسوں پر گرے ہیں۔ بڑی ہی زور کا دھماکہ وا اور اس کے ساتھ ہی کئی ایک ٹرکوں سے آگ کے شعلے نکلنے لگے۔ یہ اندازہ کرنا شکل تھا کہ ہیڈ کوارٹر کمپنی کے کتنے آدمی مارے گئے ہیں لیکن جہاں اتنی زور کا دھماکہ ہوا ر اتنا زیادہ ایمونیشن پھٹا وہاں شاید ہی کوئی بندہ بچا ہو گا۔

وہاں تو اب ایسے ہی دھماکے تھے۔ اپنا توپ خانہ ہمارے پیچھے تھا۔ اپنی توپوں کے

گولے ہمارے اوپر سے گزر کر آگے جاتے تھے۔ توپ کے گولے کی چیخیں بڑی خوفناک ہوتی ہیں۔ جاپانیوں کے توپ خانے کی گولہ باری بھی ہو رہی تھی۔ مجھے کمپنی کمانڈر سے اتنا پتہ چلا تھا کہ جاپانی بڑا ہی سخت مقابلہ کر رہے ہیں لیکن وہ پیچھے بھی ہٹ رہے ہیں۔ ہمیں بار بار ایڈوانس کا حکم ملتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جاپانی پیچھے ہٹ رہے ہیں۔

ہم پورا ایک دن کسی ایک پوزیشن میں نہیں رہتے تھے۔ دن کہیں اور رات کہیں اور ہوتی تھی۔ ایک روز ہمیں پھر ایڈوانس کا حکم ملا۔ اس روز تو یہ عالم تھا کہ جاپانیوں کی مشین گنوں اور رائفلوں کا فائر صحیح معنوں میں بارش کی طرح آ رہا تھا۔ ان کی توپوں کے گولے ہماری پوزیشنوں کے قریب قریب پھٹ رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اطلاع آتی تھی کہ ہماری کمپنی کے اتنے جوان زخمی ہو گئے ہیں اور اتنے مارے گئے ہیں۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ جاپانی جم کر مقابلہ کر رہے ہیں۔ میں پہلی بار اس خوف میں مبتلا ہوا کہ میں آج نہیں تو کل مارا جاؤں گا۔ مجھے بار بار اپنے دوست حمید کا خیال آ رہا تھا۔ وہ بٹالین کی ایک اور رائفل کمپنی میں تھا۔ میں نے اپنے انگریز کمپنی کمانڈر کو بھی گھبراہٹ کے عالم میں دیکھا۔

لڑائی کی صورت کچھ اس طرح تھی کہ ہماری پوزیشنیں ایک لمبوتری ٹیکری پر تھیں اور جاپانی سامنے والی ٹیکریوں پر مورچہ بند تھے۔ یہ محاذ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ پورے بریگیڈ کا محاذ تھا۔

میں اس لڑائی کی شدت اور خونریزی کو پوری طرح بیان نہیں کر رہا کیونکہ بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ اتنا بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری کمپنی کے تقریباً" پندرہ جوان مارے جا چکے تھے اور کچھ اتنے ہی زخمی ہوئے تھے اور زخمی ہوتے جا رہے تھے۔ رات آئی تو یک لخت محاذ خاموش ہو گیا۔ یہ خاموشی خطرناک تھی۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ جاپانی بھاگ گئے ہوں۔ ہم نے تھوڑا تھوڑا کھانا کھایا۔ امید تو یہ تھی کہ رات خیریت سے گزر جائے گی لیکن بارہ بج کر پانچ سات منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ رات کا سکوت دھماکوں سے لرزنے اور کانپنے لگا۔ ہمارے ہر طرف گولے پھٹ رہے تھے۔ بڑی ہی شدید گولہ باری تھی۔ اس گولہ باری کا مطلب یہ تھا کہ جاپانیوں نے جوابی حملہ کیا ہے۔ توپوں کے گولے بڑی ہی زیادہ تعداد میں ہمارے پیچھے بھی، ٹیکری کے اوپر بھی اور ٹیکری کے سامنے بھی گر رہے تھے۔ ان کی چمک سے رات ذرا سی روشن ہوتی اور پھر تاریک

ہو جاتی تھی۔

ایک گولہ ہمارے بہت ہی قریب پھٹا۔ اس وقت میں اپنے کمپنی کمانڈر سے دس بارہ قدم دور ٹیکری پر پوزیشن لئے ہوئے تھا۔ گولہ باری کے دوران کوئی جوابی فائر نہیں کیا تھا۔ جوابی فائر اگر کیا جاتا ہے تو وہ توپ خانہ کیا کرتا ہے۔ ہمارا توپ خانہ گولہ باری کر رہا تھا اور یہ بھی بڑی ہی شدید اور بہت ہی تیز گولہ باری تھی۔ میرے قریب جو گولہ پھٹا وہ جگہ کمپنی کمانڈر کی تھی۔ اس دھماکے سے مجھے یوں لگا جیسے میرے کان بند ہو گئے ہوں لیکن میرے کانوں میں اپنے کمپنی کمانڈر کی ایسی آواز پڑی جیسے وہ زخمی ہو گیا ہو۔ اس کا اردلی اس کے ساتھ تھا اور سگنیلر بھی اس کے قریب ہی تھا۔ ان کی اس قسم کی آوازیں سنائی دیں جیسے بھگدڑ مچ گئی ہو۔ میں اٹھا اور دوڑ کر ان تک پہنچا۔ توپ کے گولے کے دو یا تین ٹکڑے ہمارے کمپنی کمانڈر کو لگ گئے تھے۔ پیٹ پر ہاتھ رکھا تو صاف پتہ چلا کہ ہاتھ پیٹ کے اندر چلا گیا ہے۔ وہ مر چکا تھا۔ اردلی نے ماچس جلا کر دیکھا۔ ایک ٹکڑا اس کے سر میں لگا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی کھوپڑی کٹ گئی تھی۔

کمپنی کمانڈر نے اردلی سے کہا کہ کچھ پتہ نہیں کہ سی او صاحب کہاں ہیں۔ کمپنی کمانڈر کی موت کی اطلاع دینی تھی۔ گولہ باری نے اور زیادہ شدت اختیار کر لی۔ ہماری ٹیکری پر تین چار گولے اور پھٹے تو ہم تینوں ادھر ادھر دوڑ پڑے۔ میں ٹیکری کے پیچھے اتر گیا۔ اس انگریز کے مرنے کا مجھے ذرا سا بھی افسوس نہ ہوا بلکہ خوشی ہوئی کہ ایک انگریز تو کم ہوا۔ اس کے بعد یہی کچھ ہوتا رہا کہ دونوں طرف کے توپ خانے فائر کرتے رہے اور رات گزر گئی۔

رات تو گزر گئی اور توپ خانوں کے گولے بھی کم ہو گئے لیکن مشین گنوں اور رائفلوں کا جو فائر شروع ہوا تو ایک انچ بھی محفوظ نہ رہا۔ میں چھوٹے چھوٹے درختوں کے جھرمٹ میں جا بیٹھا تھا اور کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میری کمپنی کہاں گئی اور بٹالین کو دوسری کمپنیاں کہاں ہیں۔ میں وہاں سے اٹھا اور ایک ٹیکری کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ میں نے فائر سے بچتا تھا۔ چلتے چلتے مجھے دو ٹیکریوں کے درمیان سے نظر آیا کہ میری بٹالین ان پوزیشنوں سے اتر کر اگلی پوزیشنوں میں جا رہی ہے۔ فائرنگ میں کچھ کمی آ گئی تھی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ جاپانی حملہ کرنے کی بجائے پسپا ہو رہے ہیں۔

میں نے اپنی بٹالین کے ساتھ جانا تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ میں اپنی کمپنی میں ہی

جاتا۔ میں ٹیکریوں کے اندر اندر بچتا بچاتا جا رہا تھا۔ کئی جگہوں پر مجھے دائیں یا بائیں مڑنا پڑا اور اس طرح میں ایسی جگہ پہنچ گیا جو ذرا کشادہ تھی۔ مجھے اپنی بٹالین کے دس بارہ جوانوں کی لاشیں نظر آئیں۔ انہیں دیکھ کر میں اور زیادہ خوفزدہ ہو گیا۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ پیچھے ہی رہوں اور آہستہ آہستہ چلوں' بٹالین سے تو میں جا ہی ملوں گا۔

○

دوپہر کا وقت تھا۔ فائرنگ سے پتہ چلتا تھا کہ جاپانی بہت پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ میں ایک کشادہ سی جگہ جا پہنچا۔ اس جگہ بھی درخت بے شمار تھے اور یہ درخت اونچے نہیں تھے بلکہ ان کی ٹہنیاں دائیں بائیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کشادہ جگہ کے اردگرد ٹیکریاں تھیں۔ ان درختوں کے نیچے بھی میں نے چار پانچ لاشیں دیکھیں اور ایک جوان نظر آیا جو ایک درخت کے تنے کے ساتھ پیٹھ لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے وہیں سے نظر آ گیا کہ اس کی پتلون گہری لال ہو گئی ہے۔ وہ زندہ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ اپنا کوئی ساتھی فوجی ہے اور اگر یہ زندہ ہے تو اسے کم از کم پانی تو پلا دوں۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ میں اسے اٹھا کر کہیں پیچھے لے جاتا۔ وہاں تو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے

میں تیز تیز قدم اٹھاتا اس تک پہنچا اور سامنے ہو کر اسے دیکھا۔

میں نے جب اس کا چہرہ دیکھا تو مجھے صاف محسوس ہونے لگا کہ اتنی زیادہ شیلنگ اور فائر اور موت کے خوف سے میرا دماغ ماؤف ہو گیا ہے یا دماغ کی کوئی رگ DAMAGE ہو گئی ہے اس لئے مجھے ایسی چیزیں نظر آنے لگی ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ وہ چہرہ واجدہ کے خاوند آصف کا تھا۔ وہ اب حوالدار ہو گیا تھا۔ میں نے اسے آہستہ سے بلایا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگوں کی ہڈیاں دو تین جگہوں سے ٹوٹ گئی تھیں۔ وہ بھی توپوں کے گولوں کے اڑتے ہوئے ٹکڑوں سے زخمی ہوا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے جسم سے بہت سارا خون بہہ گیا تھا۔

"کیا تم آصف ہی ہو؟" — میں نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آنکھیں اور زیادہ کھول کر مجھے دیکھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے مجھے کمین ذات کا آدمی کہا تھا اور اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں پھر کبھی واجدہ سے ملا تو یہ مجھے قتل کر دے گا۔ اس کی یہ باتیں یاد آئیں تو میرے سارے

وجود میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میرا دشمن اپنی موت خود ہی مر رہا تھا۔ واجدہ اس سے آزاد ہو گئی تھی۔ مجھے واجدہ یاد آئی تو میرے دل میں آصف کی نفرت کا طوفان اٹھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ اسے یہیں مرنے دو۔ میں وہاں سے اٹھنے ہی لگا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ میں رک گیا۔

"تم جیت گئے ہو" — اس نے کہا — "ایک مہربانی کرو۔ میں بڑی سخت اذیت میں مبتلا ہوں۔ میرے سر میں گولی مار دو اور اس اذیت سے نجات دلا دو۔ میں موت کی تلخی سے بچ جاؤں گا اور تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے گا"۔

معلوم نہیں مجھے کیا ہوا کہ میرا ہاتھ اپنی واٹر باٹل پر گیا جو پانی سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے بوتل نکالی اور اس سے کارک ہٹا کر بوتل اس کے منہ کی طرف کی۔ اس نے اپنے منہ کے آگے ہاتھ رکھ لیا۔

"یہ خانی!" — اس نے کہا — "میں تمہارے ہاتھ کا پانی نہیں پیئوں گا"۔

"کیوں آصف!" — میں نے کہا — "کیا تم مجھے اتنا کمین سمجھتے ہو کہ تم مر رہے ہو اور میں تمہیں پانی نہ پلاؤں؟ مجھے یاد ہے کہ تم نے مجھے کمین ذات کا آدمی کہا تھا۔ میں کسی بھی ذات کا آدمی ہو سکتا ہوں لیکن یہ نہ بھولو کہ میں مرد ہوں..... میں تمہیں یہاں نہیں مرنے دوں گا..... لو پانی پیئو"۔

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بوتل میرے ہاتھ سے لے کر پانی پی لیا۔

"میں تمہیں اٹھا کر پیچھے لے چلتا ہوں" — میں نے کہا۔

"نہیں خانی!" — اس نے بڑی اداس اور ہاری ہوئی آواز میں کہا — "تم شاید اپنی بٹالین سے بچھڑ گئے ہو۔ آگے جاؤ' یہاں مت رکو' میں نے تو اب مرنا ہی ہے"۔

"میں تمہیں یہاں مرنے کے لئے چھوڑ کر نہیں جاؤں گا آصف!" — میں نے پرجوش لہجے میں کہا — "تم میری موجودگی میں نہیں مرو گے"۔

میں خدا کی قسم واجدہ کو بالکل ہی بھول گیا اور آصف کو اٹھا کر پیچھے پہنچانے کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا چیلنج سمجھ لیا۔ ساتھ والی ٹیکری کے پیچھے تھوڑی دور شاید سٹریچر بیرر یعنی زخمیوں کو سٹریچر پر اٹھا کر لے جانے والوں کے ملنے کا امکان ہے۔ اس نے کہا اور ایک طرف اشارہ کیا۔ یہاں میں آپ کو ایک اور بات بتانا چاہوں گا۔ وہ یہ کہ برما کی لڑائی

میں ایسی کوئی پابندی نہیں تھی کہ کوئی زخمی ہو جائے تو اسے ضرور ہی اٹھا کر پیچھے لاتا ہے۔ دراصل زخمیوں کو اٹھا کر پیچھے لانے کی کسی کو ہوش ہی نہیں تھی۔

آصف نے جس طرف اشارہ کیا تھا۔ میں دوڑ پڑا۔ اس ٹیکری پر چڑھا اور دوسری طرف اترا تو وہاں کچھ دلدل سی دیکھی۔ دلدل کی وجہ سے وہاں کوئی انسان نہیں تھا۔ میں دوڑتا ہوا ایک اور طرف گیا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہاں ایک عارضی میڈیکل پوسٹ بنی ہوئی تھی۔ یہ کوئی عمارت نہیں تھی نہ وہاں کوئی خیمہ لگا ہوا تھا بلکہ سٹریچروں پر زخمی فوجی پڑے ہوئے تھے اور انہیں فرسٹ ایڈ دی جا رہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا وہاں پہنچا لیکن یہ دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی کہ وہ سب گورے تھے یعنی انگریز تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ خبیث قوم کسی ہندوستانی کو نہیں اٹھائے گی۔ وہاں دو ڈاکٹر تھے۔ میں ان کے سامنے جا کھڑا ہوا اور انگریزی میں انہیں کہا کہ مجھ پر رحم کریں' میرے بھائی کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں اور خون بہنے سے مر رہا ہے۔ ایک ڈاکٹر نے اپنے ساتھ کھڑے دو تین گوروں کی طرف دیکھا لیکن کہا کچھ بھی نہیں۔ ان دو تین گوروں نے بھی میری بات سنی تھی۔

"ہم آپ کے لئے لڑ رہے ہیں" ___ میں التجا کے لہجے میں کہا ___ "کیا آپ میرے بھائی کی جان نہیں بچائیں گے؟"

"کیوں نہیں!" ___ ڈاکٹر نے بڑے اچھے لہجے میں کہا ___ "تمہارا بھائی کتنی دور پڑا ہے؟"

"میں نے اسے بتایا تو اس نے دو گوروں سے کہا کہ وہ دوڑ کر جائیں۔ ان دونوں نے سٹریچر اٹھایا اور میرے ساتھ دوڑ پڑے۔

ہم آصف تک پہنچے اور اسے اٹھا کر سٹریچر پر لٹایا۔ ان دونوں نے سٹریچر اٹھا لیا۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو گیا اور کہا کہ سٹریچر ایک طرف سے مجھے اٹھانے دیں۔ اس طرح میں نے کبھی آگے سے اور کبھی پیچھے سے سٹریچر اٹھایا یعنی ان دونوں سے باری باری سٹریچر لیا اس طرح آصف کو فرسٹ ایڈ پوسٹ تک پہنچا دیا۔

ڈاکٹر نے اسے دیکھا۔ اس کی ایک ٹانگ کی ہڈی گھٹنے اور پاؤں کے درمیان سے ٹوٹی تھی اور دوسری ہڈی جو دوسری ٹانگ کی تھی گھٹنے سے ذرا اوپر سے ٹوٹی تھی۔ میں نے ڈاکٹروں سے کہا کہ یہ میرا بڑا بھائی ہے' اسے بچالیں۔

"تم فکر نہ کرو" ___ ڈاکٹر نے کہا ___ "ہم اس کا خون روک دیں گے اور پیچھے بھیج دیں گے۔ اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں"۔

میں نے دیکھا کہ یہ ڈاکٹر اور اس کا دوسرا سٹاف انگریز نہیں تھے بلکہ آسٹریلیا کی میڈیکل کور کے لوگ تھے۔ بہرحال میں اسے ایک معجزہ سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اتنا کرم کیا کہ آصف کو اتنی توجہ دی۔ انہوں نے اسی وقت سے عارضی طور پر مرہم پٹی کے عمل میں ڈال دیا تھا۔

"خانی!" ___ آصف نے مجھے بلایا۔ میں اس کے قریب گیا تو اس نے کہا ___ "تم اپنی بٹالین کے پیچھے جاؤ۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا"۔

اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اس کے ساتھ ہی میرے آنسو نکل آئے۔

"اللہ تجھے زندگی عطا کرے" ___ میں نے آصف سے کہا۔

"جاؤ خانی بھائی!" ___ اس نے کہا ___ "زندہ رہے تو پھر ملیں گے"۔

میں وہاں سے چل پڑا اور میں نے پکا فیصلہ کر لیا کہ ادھر سے بھاگ کر جاپانیوں کے پاس چلا جاؤں گا۔ میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ بڑے صاف اور آزاد ذہن سے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں ادھر سے بھاگ کر جاپانیوں کے پاس چلا جاؤں گا اور انہیں کہوں گا کہ مجھے انڈین نیشنل آرمی میں شامل کر لیں۔

دل پر صرف ایک بوجھ تھا۔ وہ یہ کہ میں آصف کے متعلق پریشان تھا کہ وہ زندہ نہیں رہے گا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میڈیکل ایڈ کے اور کیا کیا انتظامات ہیں۔ میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ اتنی پیچھے پہنچاتے پہنچاتے آصف زیادہ خون نکل جانے سے مر جائے گا۔ مجھے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ میں کبھی واپس آ کر آصف اور واجدہ سے مل سکوں گا؟

میرے خیالوں میں انقلابی تبدیلی آگئی تھی۔

آصف کا مجھے وہاں مل جانا اور اس حالت میں ملنا کہ وہ مر رہا تھا' آج بھی یوں لگتا ہے جیسے میں خواب دیکھ رہا تھا۔ جنگلوں کا وہ علاقہ خواب کی ہی طرح تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہیبت ناک اور وحشت ناک جنگل تھا۔ آپ نے مری کے جنگلات اور پہاڑ دیکھے ہوں گے۔ سوات بھی آپ گئے ہوں گے اور آپ نے کوئی اور جنگلاتی علاقہ دیکھا ہو گا۔ وہ سب خوبصورت جنگل ہیں لیکن برما کے جنگل کچھ اور ہی قسم کے تھے۔ اونچی پہاڑیاں تھیں' کم اونچی پہاڑیاں بھی تھیں اور ٹیکریاں اور چٹانیں بھی تھیں۔ نیچے سے اوپر تک درخت تھے لیکن یہ چھوٹے اور بہت ہی کم بلند درخت تھے جن کے پتے چوڑے نہیں تھے۔ لمبوترے اور بہت ہی چھوٹے چھوٹے پتے تھے اور ان کی شاخیں زمین سے دو چار گز اوپر جا کر پھیل گئی تھیں۔ ہمارے ملک جیسے لمبے اور بڑے درخت جو بہت پھیل جاتے ہیں اس علاقے میں بہت ہی تھوڑے تھے۔

ان چھوٹے درختوں کا یہ فائدہ تھا کہ اپنے آپ کو چھپایا جا سکتا تھا۔ پہاڑوں اور ٹیکریوں کے درمیان کہیں جگہ خاصی کھلی تھی اور کہیں اتنی تنگ کہ ان کے دامن ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ یہ تو راستوں کی بھول بھلیاں تھیں۔ وہاں چھوٹی بڑی ندیاں بھی تھیں۔

میں اب فوج کا بھگوڑا تھا۔ ایک خوشی یا ایک سرور سا اس بات کا تھا کہ میں نے آصف کو میڈیکل کور کے سپرد کر دیا تھا اور یہ تو اللہ کو ہی معلوم تھا کہ اس نے زندہ رہنا تھا یا وہیں مر جانا تھا۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ اس کے دل سے میری

عداوت نکل گئی تھی۔

دوسری خوشی یہ تھی کہ میں جنگ کے جہنم سے نکل آیا تھا یا نکل کر جا رہا تھا یا یوں کہہ لیں کہ میں جنگ سے بچنے کے لئے بھاگ رہا تھا۔ جو کچھ تھا' مجھے خوشی اس پر ہو رہی تھی کہ میں آزاد تھا۔

میں بھاگ تو رہا تھا لیکن ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ میں زندہ رہوں گا۔ توپوں کے گولے اور ہوائی جہازوں کی مشین گنوں کی گولیاں وہاں بھی پہنچ سکتی تھیں جہاں میں پہنچا ہوا تھا۔ میں نے جب یہ سوچا کہ اس پہاڑی اور جنگلاتی علاقے میں سے نکلوں گا کیسے تو میں کسی صحیح سوچ پر نہ پہنچ سکا۔ اگر آج بھی کوئی پوچھے کہ میں کس مقام پر تھا تو میں نہیں بتا سکوں گا۔ مجھے توپوں کے دھماکے' مشین گنوں اور رائفلوں کے فائر کی بے ہنگم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں ان سے دور ہی دور ہٹتا جا رہا تھا۔ میں جانتا تھا لڑائی کسی اور طرف ہو رہی ہے لیکن مجھے امید تھی کہ جاپانیوں کی کوئی نہ کوئی پوسٹ نظر آ ہی جائے گی۔

میں ٹیکریوں اور چٹانوں کے درمیان چلتا چلا گیا۔ بعض جگہ درخت اتنے چھوٹے تھے کہ مجھے جھک کر آگے بڑھنا پڑتا تھا۔ دوسری مشکل میں نے دیکھی وہ یہ تھی کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مجھے مڑنا پڑتا تھا جس میں خطرہ یہ تھا کہ میں جاپانیوں کی طرف جانے کی بجائے ہندوستان کی طرف بھی آ سکتا تھا۔ میں نے دماغ کو حاضر رکھا اور ہر موڑ کو ذہن میں محفوظ کرتا گیا۔ پھر یہ خیال آیا۔ شام ہونے کو ہے اور میرے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں۔ مجھے یہ دیکھنا تھا کہ ان درختوں سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس خیال سے میں نے درختوں کو دیکھنا شروع کر دیا لیکن ان میں کوئی ایک بھی درخت پھل دار نہیں تھا۔ میں تیز تیز چلنے لگا اور آگے ایک ندی آگئی جس کا پانی کنوؤں کے پانی کی طرح صاف اور شفاف تھا میں نے ندی سے پانی کی بوتل بھر لی۔

میدانی علاقوں میں سورج غروب ہو جاتا ہے تو بھی کچھ دیر روشنی باقی رہتی ہے لیکن اس قسم کے پہاڑی اور جنگلاتی علاقے میں سورج غروب ہونے سے پہلے ہی اندھیرا چھا جاتا ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ سورج ابھی افق سے تھوڑا ہی اوپر ہو گا لیکن وہ جنگل تاریک ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میں ندی کے پار گیا تو کچھ علاقہ ہموار ہونے لگا۔

ہموار کا مطلب یہ ہے کہ پہاڑیاں دور ہٹ گئیں اور ٹیکریوں اور چٹانوں کے درمیان فاصلے بھی زیادہ ہو گئے۔ مجھے ابھی تک کوئی پھل دار درخت نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں جوان آدمی ہوں' ایک رات اور شاید اگلا دن بھی کچھ کھائے پیئے بغیر ہی گزار دوں گا۔

تاریکی سیاہ ہوتی گئی اور میں چلتا گیا۔ یہ بھی خدا کا شکر ادا کیا کہ موسم گرمیوں کا تھا۔ رات کو مجھے پتہ چلا کہ رات تو کچھ ٹھنڈی ہو گئی ہے لیکن مچھر بیدار ہو گئے تھے۔ اس علاقے میں مچھر بہت ہی زیادہ تھے۔ ندیاں بڑی صاف ستھری تھیں یعنی ان کا پانی گدلا نہیں تھا لیکن ان میں ایک خطرہ یہ تھا کہ ان میں باریک اور ذرا لمبوتری جونکیں بڑی زیادہ تھیں اور موٹی جونکیں بھی تھیں۔

میں چلتے چلتے تھک گیا تو سوچا کہ اپنے جسم پر زیادہ ظلم نہ کروں اور اسے مشقت سے بچائے رکھوں تاکہ بھوک زیادہ محسوس نہ ہو۔ میں نے ایک جگہ ذرا اچھی دیکھی اور وہاں لیٹ گیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ مچھر اس انتظار میں تھے کہ میں لیٹ جاؤں۔ مچھروں نے مجھ پر یلغار کر دی۔ میرے جھولے میں جو پیٹھ کے ساتھ بندھا ہوتا تھا اور جسے فوجی زبان میں پٹھو کہتے تھے' ایک چادر پڑی ہوئی تھی میں نے یہ چادر اوپر لے لی۔ تھکان اتنی زیادہ تھی کہ میں گہری نیند سو گیا۔

○

نیند پُرسکون نہیں تھی ایک تو یہ مچھر تھے جو چادر کے اندر بھی آگئے تھے اور زمین بستر کی طرح آرام دہ نہیں ہو سکتی تھی اور تیسرے یہ کہ میں نے جنگی لباس پہن رکھا تھا اور جنگی ساز و سامان بھی میرے جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ اس میں ایمونیشن بھی تھا۔ نیند پرسکون کیسے آتی!

آنکھ کھلی تو سورج پہاڑیوں کے اوپر آگیا تھا۔ میں اٹھا' چادر اٹھائی اور یہ پٹھو میں ڈال کر چل پڑا۔ تین ٹیکریاں آج بھی یاد ہیں راستے میں آئی تھیں۔ میں تیسری ٹیکری کے ساتھ ساتھ چلتا آگے سے مُڑا۔ سامنے کا منظر دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ وسیع و عریض میدان تھا۔ پہاڑیاں دور تھیں۔ چٹان کوئی تھی ہی نہیں نہ ہی کوئی اونچی نیچی ٹیکریاں تھیں۔ درخت بھی ذرا کم تھے۔ یہ ایک کھلا میدان تھا لیکن یہ میدان کی طرح ہموار نہیں تھا۔ کہیں نیچے اور کہیں اوپر۔ گڑھے بھی تھے اور کہیں

ذرا بلند جگہ تھی۔

میں چلتا گیا۔ زمین پر ایسے نشان دیکھے جیسے یہاں توپوں کے یا مارٹر گنوں کے گولے گر کر پھٹے ہیں۔ کچھ اور نشانیاں نظر آئیں جن سے صاف پتہ چلتا تھا کہ یہاں لڑائی ہوئی ہے۔ جسے میں نے وسیع و عریض میدان کہا ہے' یہ ڈیڑھ دو میل چوڑا یا ناپا" اس سے کچھ زیادہ لمبا تھا۔ میں تقریباً" اڑھائی فرلانگ آگے چلا گیا تو اس سے آگے زمین نیچے کی طرف چلی گئی تھی۔ وہاں کچھ درخت ہمارے علاقے کے درختوں کی طرح چوڑے تنوں والے' اونچے اور پھیلے ہوئے تھے اور باقی درخت جھاڑی نما تھے۔ میں ذرا بلندی پر تھا۔ آگے زمین ذرا نیچے تھی۔

وہاں سے زمین پر چند ایک گڑھے نظر آئے جو اندر سے ذرا ذرا کالے تھے۔ ان گڑھوں میں پہنچنا تھا۔ یہ توپوں کے گولوں نے یہاں ہٹ کر کے بنائے تھے۔ میں آگے چل پڑا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہر طرف ایسے گڑھے نظر آئے اور ایک جگہ ایک مورچے کی شکل کا ذرا لمبا اور ذرا چوڑا گڑھا نظر آیا۔ اس کے باہر دو سٹیل ہیلمٹ پڑے ہوئے تھے اور کپڑوں کے ٹکڑے میں اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ یہ فوجی وردی کے ٹکڑے تھے اور یہ سٹیل ہیلمٹ فوجیوں کے تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہاں فوجی مرے ہیں۔ میں اس گڑھے تک گیا تو گڑھے میں انسانی ہڈیاں نظر آئیں۔ کھوپڑی ایک ہی تھی لیکن سینے کے پنجر دو تھے۔ فوجی بوٹ بھی وہاں پڑے ہوئے تھے۔ فوجی جھولے بھی وہاں پڑے ہوئے تھے اور پھٹی ہوئی وردیوں کے ٹکڑے گڑھے میں بھی تھے اور باہر بھی۔

میں آگے چلا گیا تو زمین پر انسانی ہڈیاں بکھری ہوئی نظر آئیں۔ سینے کے پنجر بھی دیکھے اور تین چار کھوپڑیاں بھی وہاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہاں بھی سٹیل ہیلمٹ اور پھٹی ہوئی وردیوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ اب جب میں اس میدان میں گھوما پھرا تو جگہ جگہ انسانی ہڈیاں' سینوں کے پنجر اور کھوپڑیاں نظر آئیں۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ یہاں لڑائی ہوئی اور یہ سب مارے گئے تھے۔

یہ بتانا مشکل تھا کہ یہ فوجی ہندوستانی تھے' گورے تھے یا جاپانی تھے۔ سٹیل ہیلمٹ وہ تھے جو ہمیں انگریزوں نے دیئے تھے۔ یہ جاپانیوں کے نہیں ہو سکتے تھے۔ ان ہڈیوں میں کوئی ہتھیار نظر نہ آیا۔ وہ انہیں ہلاک کرنے والے لے گئے ہوں

گے۔ وہاں توپوں کے گولوں نے جو گڑھے بنائے تھے وہ اتنے زیادہ تھے کہ یہی کہا جا سکتا تھا کہ ان پر توپ خانے کے گولے برسائے گئے تھے۔ ایک جگہ سے مجھے ایک پے بک ملی۔ ہر فوجی کے پاس پے بک ہوتی تھی جس پر یونٹ کا نام نہیں ہوتا تھا' صرف فوجی کا نمبر اور نام اس پر لکھا ہوتا تھا۔ افسروں کے پاس شناختی کارڈ ہوتے تھے۔ مین نے یہ پے بک اٹھا کر کھولی' اس پر ایک سپاہی کا نام لکھا ہُوا تھا۔ نام تھا فضل حسین۔ اس سے پتہ چلا کہ یہ لوگ انڈین آرمی کے تھے۔ میں وہاں رک گیا اور ہر طرف دیکھنے لگا۔

میری جذباتی کیفیت کچھ اور ہی ہو گئی۔ دل ایک گرفت میں آگیا۔ خیال آیا کہ یہ کہاں پیدا ہوئے تھے اور مرے تو کہاں آمرے۔ انہیں کفن بھی نصیب نہ ہُوا' جنازہ بھی نہ پڑھا گیا اور ان کی ہڈیاں رہ گئیں اور گوشت جنگل کے درندے' گدھیں اور کیڑے مکوڑے کھا گئے۔ ایک سوال میرے ذہن میں تڑپنے لگا..... کس لئے؟ انہوں نے اپنی جانیں کس کے لئے دیں؟..... تنخواہ کے لئے؟ راشن اور وردی کے لئے؟ آخر کیوں ان لوگوں نے تھوڑے سے پیسوں پر اپنی جانیں انگریزوں کے حوالے کر دی تھیں؟..... میرے پاس ایک جواب تھا کہ یہ ان کی مجبوری تھی۔ بھرتی نہ ہوتے تو کیا کرتے۔ میں بھی تو بھرتی ہو کر اس وردی میں آگیا تھا۔

اس وقت مجھے یہ خیال نہ آیا کہ ہم لوگ آزاد ہوتے' ہمارا اپنا ملک ہوتا اور یہ اپنی آزادی کے تحفظ کے لئے جانیں قربان کرتے تو سارا ملک انہیں یاد کرتا اور انہیں عظیم کہتا۔ یہ خیال مجھے ستمبر1965ء میں آیا تھا۔ جب میرے گاؤں میں پہلے شہید کی لاش آئی تھی تو مجھے ہڈیوں کے وہ پنجر یاد آگئے تھے جو میں نے برما کے اس ویرانے میں دیکھے تھے۔ میں کہتا ہوں وہ حرام موت مرے تھے۔ وہ کرائے کے سپاہی تھے اور ہمارا لڑکا شہید ہو کر آیا ہے اور اللہ نے بھی اسے عظمت دی ہے اور قرآن نے بھی اس لڑکے کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ شہید ہیں' یہ مرے نہیں' شہید مرا نہیں کرتے۔

مجھے برما کے جنگل میں یہ خیال بھی آیا کہ یہ جن کی ہڈیاں ہیں انہیں صرف اتنا ساحق دیا گیا ہو گا کہ ان کے گھروں کو سرکاری چٹھیاں بھیج دی گئی ہوں گی جن میں صرف اتنا لکھا ہو گا کہ نہایت افسوس کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ آپ کا بیٹا

ں نمبر فلاں فرنٹ پر مارا گیا ہے۔ انگریز نے مرنے والے کے پس ماندگان کو یہ بھی ا ہو گا کہ آپ کا بیٹا بڑا بہادر تھا اور بڑی بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا ہے۔ اس کے انگریز نے۔ فوجیوں کے ناموں پر لکیر پھیر دی ہو گی۔

معلوم نہیں انہیں مرے ہوئے کتنا عرصہ گزر گیا تھا۔ ہڈیاں خشک ہو چکی ں۔ کسی ہڈی پر گوشت کا ایک ذرہ بھی نہیں تھا۔ مجھے بھوک ستا رہی تھی۔ میں سوچا کہ ان کے جھولے اور پٹھو یہیں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کی تلاشی لوں' شاید نے کی کوئی چیز مل جائے مثلاً" بسکٹوں کا ڈبہ مل سکتا تھا۔ چنے یا کوئی اور خشک چیز سکتی تھی لیکن میں نے کسی جھولے وغیرہ کو ہاتھ نہ لگایا۔ اس خیال سے کہ میں نے کی کوئی چیز تلاش کروں' مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ان کا حق مار رہا ہوں یا میں ان کی چوری کر رہا ہوں۔ بکھری ہوئی ان ہڈیوں کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ بہت جلدی جاپانیوں کے پاس پہنچ جانا چاہئے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ توپ کا کوئی ادھر آگرے یا دور سے کوئی مشین گن فائر ہو اور ہڈیوں کے ان بکھرے ہوئے پوں میں ایک اور ڈھانچے کا اضافہ ہو جائے۔ میں نے ایک عہد کیا جو دراصل خواہش تھی کہ میں نے زندہ رہنا ہے۔ میں وہاں سے چل پڑا اور ان بکھری ہڈیوں میں سے گزرتا گیا۔ کوشش کی کہ میرا پاؤں کسی ہڈی پر نہ آئے لیکن یہ نہ تھا۔ بہت بچ بچ کر پاؤں رکھے۔ چند قدم جا کر کوئی نہ کوئی ہڈی پاؤں کے نیچے جاتی تھی۔

میں ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ مجھے ٹھوکر لگی۔ نیچے دیکھا' میرا پاؤں ایک خشک ڑی کے ساتھ ٹکرا گیا تھا۔ اس وقت میرے خیالوں کا رخ کسی اور طرف چلا

پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے خدا یاد آیا۔ جس طرح اُس وقت خدا یاد آیا اس میں نے کبھی خدا کو یاد نہیں کیا تھا۔ میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ میں اخلاقی لحاظ ٹھیک آدمی نہیں تھا۔ کچھ تو آپ نے اندازہ کر لیا ہو گا۔ میں آج بڑھاپے کی عمر میں محسوس کرتا ہوں کہ جب میں ان بے گور و کفن انسانی ڈھانچوں میں سے رہا تھا تو حقیقت یہ تھی کہ میں ایک اور ہی زندگی میں داخل ہو رہا تھا۔

پہلے میں نے کہا ہے کہ میرا دماغ کسی اور طرف چلا گیا تھا' وہ یہ تھا کہ انسان

زندہ ہوتا ہے تو کس طرح اکڑ اکڑ کر چلتا ہے اور جس کے پاس چند ٹکے آجاتے ہیں وہ اپنے ساتھ کے انسان کو انسان ہی نہیں سمجھتا۔ ایسے لوگ وہ منظر دیکھ لیتے جہاں میں کھڑا تھا تو ان کے ہاتھ اپنے کانوں پر اور ان کا دل خدا کی طرف ہو جاتا۔ میں آپ کو وعظ نہیں سنا رہا۔ ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ ذرا اس پر غور کر لیں۔

میں فوجیوں کی باتیں سنا رہا ہوں۔ قدرتی طور پر آپ کے سامنے پاک فوج کے فوجی آگئے ہوں گے۔ یہ واضح کر دیتا ہوں کہ میں جس فوج کی بات کر رہا ہوں وہ پاک فوج سے بالکل ہی مختلف تھی۔ یوں سمجھ لیں کہ پاک فوج سفید اور وہ فوج بالکل ہی سیاہ تھی۔ یہ مبالغہ نہیں کہ پاک فوج اور انگریزوں کی اس انڈین آرمی میں زمین اور آسمان جتنا فرق تھا۔ پاک فوج میں پڑھے لکھے لوگ ہیں اور اب تو پاک فوج کا ہر سپاہی پڑھا لکھا ہوتا ہے بلکہ لانگری بھی پڑھے لکھے مل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ پاک فوج نے پاکستان بننے سے اب تک لڑائیاں بھی لڑیں اور اپنے عوام کی خدمت بھی کی۔ سیلاب آئے۔ زلزلے آئے' پاک فوج مدد کو پہنچی۔ اس طرح پاک فوج نے پاکستانیوں کے دلوں میں محبت اور عظمت پیدا کر لی ہے۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ میں جب فوجیوں کی بات کروں تو آپ پاک فوج کو ذہن میں سے نکال دیں۔ پاکستان میں پیدا ہونے والی ہماری نسلوں نے انڈین آرمی نہیں دیکھی۔ اس میں صوبیدار اور صوبیدار میجروں تک کی اکثریت ان پڑھ ہوتی تھی۔ جوان تو کورے ان پڑھ ہوتے تھے۔

اس زمانے میں فوجی کو صرف فوجی ہی نہیں بلکہ فوجی بے وقوف کہا جاتا تھا۔ دیہات کا ان پڑھ جوان کسی بڑے شہر میں جاتا تو اُس کا دماغ اونچا ہو جاتا تھا اور یہ اس کی بے وقوفی ہوتی تھی۔

وہ اپنے گاؤں کے لوگوں کو پسماندہ اور جاہل سمجھنے لگتا تھا اور اکڑ اکڑ کر چلتا تھا جیسے وہ بادشاہ بن گیا ہو اور پھر برتری جتانے کے لئے کارٹونوں جیسی حرکتیں کرتا تھا۔ جنگِ عظیم کے دوران' جیسا کہ میں اپنی اس داستان میں سنا چکا ہوں' انگریزوں نے فوجیوں کو خوب سر چڑھایا تھا۔ انگریزوں نے ان بے وقوفوں کو لڑانا تھا اور اپنی بادشاہی کا تحفظ کرنا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہندوستان میں فوجی حکومت آگئی ہو۔ جس طرح ہماری پولیس عوام کو پریشان کرتی رہتی ہے اور معمولی سا ایک کانسٹیبل

بھی رعب جماتا ہے اسی طرح جنگ عظیم میں فوجی کرتے تھے۔ یہ بات بڑی ہی لمبی ہے۔ اگر میں آپ کو پوری بات سناؤں تو اس میں بڑے دلچسپ واقعات آتے ہیں لیکن میری اصل داستان زیادہ لمبی ہو جائے گی۔ سڑکوں پر فوجی گاڑیاں بھاگتی دوڑتی نظر آتی تھیں۔ پنجاب کا تو یہ حال تھا کہ ہر چوتھا آدمی فوجی بن گیا تھا۔ فوجی ٹرکوں کے ڈرائیوروں نے ایسی ایسی بدتمیزیاں شروع کر دی تھیں جن سے پبلک کو نقصان بھی ہوا۔ مسافر بسیں جی ٹی روڈ پر چلتی تھیں۔ یہ تو فوجی ڈرائیوروں کا ایک کھیل تھا کہ کوئی مسافر بس کسی فوجی ٹرک کو اوورٹیک کر جاتی تو فوجی ڈرائیور بس کو اوورٹیک کر کے سائیڈ مارتا تھا۔ بسوں کے ڈرائیور اکثر بس روک لیتے تھے۔

ہمارے علاقے میں ایک بار یوں ہوا کہ ایک فوجی ڈرائیور نے اپنے ٹرک سے ایک بس کو سائیڈ ماری تو بس بائیں طرف ہو گئی۔ ساتھ ہی ڈھلان نیچے کو جاتی تھی۔ بس ڈھلان سے نیچے گئی۔ کچھ اس کی سپیڈ تھی اور کچھ ڈھلان تھی۔ بس کچھ اور تیز ہو گئی سامنے شیشم کا ایک درخت آگیا۔ بس درخت کے ساتھ اتنی زور سے ٹکرائی کہ بس کا انجن بس کے اندر چلا گیا اور 36 مسافر موقع پر ہی ہلاک ہو گئے اور فوجی ڈرائیور اور اس کے ساتھی قہقہے لگاتے ہوئے آگے نکل گئے۔

یہ انگریز کا حکم تھا کہ فوجی کا احترام کرو۔ راولپنڈی' لاہور اور اس قسم کے بڑے شہروں کے ریلوے سٹیشنوں پر سرکاری طور پر الگ ٹی سٹال بنا دیے گئے تھے جو صرف فوجیوں کے لئے تھے۔ ان پر انگریز بادشاہ نے لڑکیاں کھڑی کر دی تھیں جو فوجیوں کو مفت چائے پلاتی اور ساتھ کیک اور بسکٹ بھی پیش کرتی تھیں۔ اس طرح فوجی کی ہر جگہ قدر و منزلت سرکاری طور پر ٹھونسی جا رہی تھی۔ فرنٹ پر جانے سے پہلے میں ایک بار ریل گاڑی پر سفر کر رہا تھا۔ ایک سیویلین مسافر نے کہا کہ آج کل دو ہی چیزوں کی عزت اور قدر ہے۔ ایک فوجی کی اور دوسرے سرکاری ڈیری فارم کی گائے کی۔

ایسے فوجیوں کی اکثریت تھی جو چھٹی آتے تو اپنے گھر والوں کے ساتھ بھی فوجی زبان میں بڑے رعب سے بات کیا کرتے تھے۔ تھا تو لطیفہ مگر میں آپ کو بتاتا ہوں یہ حقیقت ہے۔ کہتے ہیں ایک فوجی چھٹی پر گھر آیا۔ اس کی ماں اسے کھانا دینے لگی تو پلیٹ میں چمچے سے ہانڈی میں سے سالن نکال کر پلیٹ میں ڈالنے لگی۔ فوجی جوان

شاید تھوڑا سالن کھانا چاہتا ہو گا۔ اس نے ماں کو یہ کہنے کی بجائے کہ اور سالن نہ ڈالو' یہ کہا "ہالٹ"۔ ماں سالن ڈالتی رہی۔ فوجی نے ماں کو بڑے غصے سے کہا' ایک بار ہالٹ کہنے سے پورا بریگیڈ رک جاتا ہے' میں نے تین بار ہالٹ کہا اور تیرا چمچہ نہیں رکا۔

انگریز اَن پڑھ دیہاتیوں اور شہریوں کو فوج میں بھرتی کر کے کیوں بے وقوف بنا رہا تھا؟..... اُس کا جواب میرے سامنے بکھرا پڑا تھا' خشک ہڈیوں کی صورت میں۔ کوئی ایک بھی انسانی ڈھانچہ یکجا اور سلامت نہیں تھا۔ یہ تو پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ جو کھوپڑی ہے وہ اس ڈھانچے کی یا اس ڈھانے کی۔ میں نے تصور میں دیکھا کہ یہ لوگوں کو اکڑ فوں دکھا دکھا کر یہاں آئے تھے اور یہاں ہوا کیا؟..... توپوں کے گولوں نے ان کے جسموں کو بردہ کر دیا' جسموں کے ٹکڑے کر دیے اور پھر انہیں گِدھوں نے' جنگلی کتوں نے اور بھیڑیوں نے کھا لیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ گردن اونچی کر کے نہ چل کہ تو پہاڑوں سے اُونچا نہیں ہو سکتا اور اکڑ کے نہ چل کہ تو زمین کو پھاڑ نہیں سکتا۔ تجھے آخر ہمارے پاس ہی آنا ہے۔

○

میں اللہ کو یاد کرتا آہستہ آہستہ' قدم دیکھ دیکھ رکھتا ہڈیوں کے اس دیس میں سے گزر گیا۔ خاصا آگے جا کر میں رک گیا۔ وہ جگہ اس زمین سے ذرا اونچی تھی۔ میں نے پیچھے دیکھا۔ سورج اس خطے پر اپنی دھوپ بکھیر چکا تھا۔ سبز گھاس میں سفید ہڈیاں' پنجر اور کھوپڑیاں بڑی صاف نظر آ رہی تھیں۔ میں نے معلوم نہیں کس جذبے کے تحت اونچی آواز میں کہا ـــ "میرے دوستو' میرے ہم وطنو' خدا حافظ"۔

میں آگے کو چل پڑا۔ اب تو بھوک نے کچھ اور ہی رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ میں برداشت کرتا رہا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے چلتا رہا اور ایک ایسے خطے میں پہنچ گیا جہاں کچھ اور ہی قسم کے درخت تھے اور وہاں جھاڑیاں بھی تھیں۔ ان جھاڑیوں میں چھوٹے چھوٹے بیر لگے ہوئے تھے جو سرخ رنگ کے تھے۔ یہ میرے علاقے کے جھاڑی بیر معلوم ہوتے تھے۔ میں نے ایک بیر توڑا اور ڈرتے ڈرتے منہ میں ڈالا۔ اس کا ذائقہ بیروں جیسا ہی تھا۔ اُس کا سائز چنے کے دانے جتنا تھا اور کچھ اس سے ذرا بڑے تھے۔ میں نے یہ بیر توڑ توڑ کر کھانے شروع کر دیے۔ یہ پھل جو کچھ بھی تھا زہریلا

بھی ہو سکتا تھا لیکن میں نے ان سے پیٹ بھرنا شروع کر دیا اور سوچا کہ اگر یہ زہر ہی نکلا تو یہی ہو گا کہ مر جاؤں گا۔ میں موت کو بھی خندہ پیشانی سے قبول کرنے کو تیار تھا۔ ایک ہی خیال دماغ میں سما گیا تھا کہ اب انگریز کی غلامی میں واپس نہیں جاؤں گا۔

میں یہ بیر کھاتا رہا۔ ذائقہ اچھا تھا اور پھر میں آگے چل پڑا۔ جسم میں کچھ جان آ گئی تھی۔ کچھ اور آگے گیا تو چار پانچ بڑے درخت دیکھے۔ ان کے ساتھ انجیر کی قسم کا پھل لگا ہوا تھا۔ اونچا تھا اس لئے میں شاخوں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ درخت پر چڑھنے کے لئے بوٹ اتارنے پڑتے تھے۔ میں نے تین چار پتھر مارے تو یہ پھل جو کچھ بھی تھا' اس کے چند ایک دانے گرے۔ میں نے ایک دانہ اٹھا کر تھوڑا سا منہ میں ڈالا۔ ذائقہ اس کا بھی ٹھیک لگا۔ ذائقہ انجیر جیسا نہیں تھا۔ میٹھا تھا لیکن یہ پھل کچھ اور تھا۔ جو کچھ بھی تھا میں نے پتھر مار مار کر یہ پھل خاصا گرا لیا اور وہیں بیٹھ کر اس سے پیٹ میں کچھ گنجائش اگر جھاڑی بیروں نے جو چھوڑی تھی وہ پُر کر لی۔

میں یہ سفر ذرا مختصر کر کے سناؤں گا کیونکہ یہ میری داستان کا ایسا حصہ ہے جس میں پڑھنے والوں کے لئے کوئی دلچسپی نہیں ہو گی۔ میں ایک عجیب و غریب واقع سنانا چاہتا ہوں جو اس سفر کے تیسرے یا غالباً" چوتھے روز پیش آیا تھا۔ میں میدان جنگ سے دور نکل گیا تھا۔ یہ انداز اس طرح ہوتا تھا کہ توپ خانے کے دھماکے' مشین گنوں اور رائفلوں کے فائر کی آوازیں مدھم ہو گئی تھیں۔ میں نے وہ دن چلتے ہی گزرا اور رات آ گئی۔ ایک ذرا اچھی جگہ دیکھ کر میں لیٹا اور سو گیا۔

یہ رات بھی گزر گئی۔ اگلے روز میں پھر پہاڑی علاقے میں پھنس گیا۔ دو ندیاں پار کرنی پڑیں اور پھر مجھے جھاڑی بیر مل گئے جن سے میں نے پیٹ کی آگ بجھا لی۔ پانی کی کوئی کمی نہیں تھی۔

میں اچھی طرح بتا نہیں سکتا کہ یہ میرے سفر کا تیسرا دن تھا یا چوتھا دن' وقت بارہ بجے کے لگ بھگ کا تھا۔ اس علاقے میں اونچی نیچی ٹیکریاں تھیں۔ پہاڑیاں ذرا پیچھے ہٹ گئی تھیں۔ جھاڑیاں اور گھاس تھی جو ذرا اونچی تھی۔ اس علاقے میں دور دور تک پانی کا نام و نشانہ نہ تھا۔

میں چلا جا رہا تھا۔ اپنے پیچھے اسطرح آوازیں اٹھیں جیسے کتے غرا رہے ہوں۔ میں نے گھوم کے دیکھا۔ وہ بھیڑیئے تھے۔ بھیڑیا اکیلا نہیں ہوتا۔ یہ درندہ گروہوں کی

شکل میں گھومتا پھرتا رہتا ہے اور شکار پر گروہ کی صورت میں حملہ کرتا ہے۔ ان درندوں کا انداز دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ یہ مجھ پر حملہ کریں گے۔ وہ دانت نکال کر آہستہ آہستہ غرا رہے تھے اور دائیں بائیں اس طرح پھیلتے جا رہے تھے جیسے مجھے محاصرے میں لے رہے ہوں۔ ساتھ ساتھ وہ میری طرف بھی آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔ میں نے رائفل کندھے سے لگائی۔ میگزین میں دس راؤنڈ موجود تھے۔ میں نے بولٹ پیچھے کھینچ کر آگے کیا اور ایک راؤنڈ چیمبر میں چلا گیا۔ نیلنگ پوزیشن میں بیٹھ کر یعنی ایک گھٹنا زمین پر ٹکا لیا اور دوسرے گھٹنے پر کہنی رکھ کر رائفل کندھے سے لگائی۔ ایک بھیڑیئے کو شست میں لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ وہ بھیڑیا بڑے زور سے بھونک کر اوپر کو اچھلا اور گر پڑا پھر فوراً اٹھا اور پیچھے کو چلا۔

میں نے بڑی تیزی سے بولٹ پیچھے کر کے ایک اور راؤنڈ چیمبر میں دھکیل کر ایک اور بھیڑیئے کو شست میں لیا۔ پہلے دھماکے سے بھیڑیئے چوکنے ہو کر پیچھے ہٹے تھے۔ جب میں نے دوسرا راؤنڈ فائر کر کے ایک اور بھیڑیئے کو گرا دیا تو باقی بھیڑیئے اس طرح بھاگے جس طرح میری رائفل سے گولی نکلی تھی۔ وہ دو بھیڑیئے اچھلتے کودتے رہے اور ایسے گرے کہ پھر اٹھ نہ سکے۔

اب تو میں اور زیادہ چوکنا ہو گیا تھا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ جس علاقے میں جنگ ہو رہی ہے، وہاں کے تمام درندے بھاگ کر ادھر آ گئے ہوں گے۔ یہ میرے لئے ایک ہولناک خطرہ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ رات کو بھی مجھے چوکنا رہنا تھا۔

میں آگے کو چل پڑا۔

○

شاید ایک اور رات آئی تھی۔ اگلے روز سمجھ لیں یا شاید اس سے اگلے روز کہ میں ایک اور علاقے میں جا رہا تھا۔ وہ علاقہ بھی اسی جیسا تھا اور پرسکون تھا۔ پُرسکون کا مطلب یہ تھا کہ وہاں کوئی لڑائی نہیں ہو رہی تھی اور نہ کوئی ایسے آثار تھے کہ یہاں کبھی لڑائی ہوئی تھی البتہ جنگ کے آثار صرف یہ نظر آتے تھے کہ چند ہوائی جہاز اوپر سے گزر جاتے تھے۔ یہ جاپانیوں کے لڑاکا بمبار جہاز تھے۔ میں ان جہازوں کو پہچانتا نہیں تھا۔ انہیں میں اس لئے جاپانی کہہ رہا ہوں کہ یہ دوسری طرف سے آئے تھے۔ مجھے ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

میں صبح اٹھ کر آگے کو چل پڑا تھا اور خاصا آگے نکل گیا تھا۔ ایک ٹیکری گھوما تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں یہ حقیقت نہیں بلکہ یہ خواب ہے یا خیال ہے۔ ایک درخت کے تنے کے ساتھ پیٹھ لگائے ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے پندرہ بیس قدم دور تھا۔ میں اسے دیکھ کر رک گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ پہلے تو میں سمجھا کہ وہ زندہ نہیں لیکن اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھل رہی تھیں۔ اسے شاید میری موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ برمی نہیں تھا۔ برمیوں کی شکل و شباہت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ آپ نے چینی اور جاپانی دیکھے ہوں گے۔ برمیوں کے چہرے ان سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ آدمی ہندوستان کے کسی علاقے کا معلوم ہوتا تھا۔ وہ یقیناً فوجی تھا کیونکہ اُس نے خاکی پتلون اور خاکی بُشرٹ پہنی ہوئی تھی لیکن اس کے پاؤں میں فوجی بوٹ نہیں تھے۔ وہ لاش لگتا تھا۔ اس کے چہرے کی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ اسے میں نے اپنے جیسا فوجی سمجھا جو جنگ سے بھگوڑا ہو آیا تھا اور راستہ بھول گیا تھا۔ بہرحال وہ ہندوستانی تھا۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

اُس کے قریب بیٹھا تو دیکھا کہ اس کے پیچھے رومال کی طرح کا ایک کپڑا پڑا ہوا تھا جس میں وہی یا اسی قسم کے پہاڑی بیر یا وہ پھل تھا جسے میں نے انجیر کہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ شخص اسی پھل پر اب تک زندہ ہے۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکے گا۔

"کون ہو تم؟" —— میں نے پوچھا —— "بول سکتے ہو؟..... میری زبان سمجھتے ہو؟"۔

اُس نے سر ہلایا یعنی وہ بول بھی سکتا تھا اور میری زبان بھی سمجھتا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ اس نے امرتسر کا نام لیا۔ پھر اس نے میری واٹر باٹل کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اپنی پانی کی بوتل نکال کر اس کا کاک نکالا اور بوتل اس کے ہاتھوں میں دے دی۔ اس نے کم و بیش آدھی بوتل پانی پی لیا اور مجھے دے دی۔ اس نے سکون کا بڑا لمبا سانس لیا۔ پھر وہ بولنے لگا۔

"اب کچھ دیر اور زندہ رہ سکوں گا" —— اُس نے پنجابی زبان میں کہا۔ اُس کی آواز مدھم اور کمزور تھی اور وہ بولنے میں کچھ دقت محسوس کر رہا تھا"۔ اس نے کہا

—"بس پانی کی ضرورت تھی۔ اب چلا نہیں جاتا"۔

اُس نے اپنی دائیں ٹانگ سے جو اس نے آگے کو کر رکھی تھی' پتلون اوپر گھٹنے تک کھینچی۔ جب میں نے اس کی پنڈلی دیکھی تب مجھے پتہ چلا کہ اس شخص سے اتنی بدبو کیوں آ رہی ہے۔ اس کی پنڈلی سوجی ہوئی تھی' اتنی زیادہ کہ اس کی ران سے پنڈلی زیادہ موٹی ہو گئی تھی۔ پنڈلی صرف سوجی ہوئی نہیں تھی بلکہ اس میں ایسا زخم کہ پوری کی پوری پنڈلی کا گوشت ننگا ہو گیا تھا اور اس میں پیپ پڑی ہوئی تھی اور شاید میں نے اس پر چھوٹے چھوٹے کیڑے رینگتے ہوئے بھی دیکھے تھے۔ اس نے مجھے یہ دکھا کر پتلون پھر نیچے کر دی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کیا ہوا ہے..... اب وہ بولا تو اس کی آواز پہلے کی نسبت اچھی خاصی جان دار تھی۔ وہ اونچی آواز میں بول سکتا تھا۔

"میرے دوست!" —اس نے کہا— "معلوم ہوتا ہے تم انسان نہیں فرشتے ہو جو میرے پاس پہنچ گئے ہو۔ میں دیکھ رہا ہوں تم ہندوستانی فوج کے حوالدار ہو"۔

اب مجھے یہی توقع تھی کہ یہ کہے گا کہ مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا لو اور ایسی جگہ لے چلو جہاں میری مرہم پٹی ہو جائے اور میں زندہ رہ سکوں۔ میں نے سوچا کہ میں اسے صاف صاف بتا دوں گا کہ مجھے خود بھی علم نہیں کہ میں کہاں ہوں۔

"دیکھو میرے دوست!" —وہ کہہ رہا تھا— "تمہارے پاس رائفل بھی ہے' ایمونیشن بھی ہے' صرف ایک گولی کی ضرورت ہے۔ خدا کے واسطے میرے سر میں گولی مار دو اور مجھے اس اذیت سے بچا لو۔ میں نے مرنا ہی ہے لیکن موت کی اذیت بڑھتی جا رہی ہے اور موت آتی نہیں۔ مجھے موت دے دو اور یہ میرے لئے بہت بڑا تحفہ ہو گا"۔

"نہیں میرے بھائی!" —میں نے کہا— "میں یہ کام نہیں کر سکوں گا۔ یہ تو بتاؤ کہ تم فوجی ہو یا سیویلین اور جو کچھ بھی ہو' یہاں تک کس طرح پہنچے ہو؟"

اس نے لمبی آہ بھری اور اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آ گئی جس میں خوشی یا مسرت کی ذرا سی بھی جھلک نہیں تھی بلکہ اس میں اداسی تھی' شکست تھی اور غالباً اس میں طنز بھی تھی۔

"ہاں!" —اُس نے کہا— "تم نے یہ ٹھیک پوچھا ہے کہ میں کون ہوں اور

یہاں تک کس طرح پہنچا ہوں..... مجھے یہ کہانی تمہارے سپرد کر دینی چاہئے۔ میرے بھائی' میری اس کہانی کو تم امانت سمجھنا اور تم کبھی اپنے وطن کو واپس چلے گئے تو یہ لوگوں کو سنانا۔ اس کہانی میں عبرت ہے۔ میں تعلیم یافتہ آدمی ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ لوگوں کو قرآن اور حدیثیں سناؤ تو وہ کچھ بھی نہیں سمجھیں گے۔ تم انہیں میری کہانی سناؤ گے تو وہ سمجھ جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ اس سے کوئی شخص سبق حاصل کر لے اور راہ راست پر آ جائے۔ کوئی بات غلط یا جھوٹ نہیں کہوں گا۔ میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے اللہ کی ذات جو گناہ بخشنے والی ہے' مرتے وقت ہی میرے گناہ بخش دے اور میں اگلے جہان کی اذیت سے بچ جاؤں۔ میرے دوست! جو اذیت میں نے اس دنیا میں ہی دیکھ لی ہے جہنم کی اذیت اور کیا ہو گی"۔

اس نے اپنی داستان سنانی شروع کی تو میں نے دیکھا کہ اس کی آواز میں پہلے سے زیادہ جان اور پختگی آتی چلی گئی تھی۔ شاید یہ اقبال جرم کر لینے کا سکون تھا۔ اس کے ضمیر کا بوجھ اترتا چلا گیا اور وہ کچھ اطمینان سا محسوس کرنے لگا تھا۔ میں اس کی یہ کہانی اپنے الفاظ میں سناؤں گا۔



کئی برسوں سے "حکایت" باقاعدگی سے پڑھ رہا ہوں۔ میں نے "حکایت" میں اسی پس منظر میں غالباً" تین یا چار سچی کہانیاں پڑھی ہیں۔ ان کہانیوں کے کردار برما کے دارالحکومت رنگون میں تھے اور وہاں سے ہندوستان کو روانہ ہوئے تھے۔ تھوڑا ہی عرصہ پہلے اسی پس منظر میں "حکایت" میں ایک اور سچی کہانی پڑھی ہے۔ چونکہ میں اس پس منظر میں رہا ہوں اور اس کا عینی شاہد ہوں اس لئے میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں یہ کہانیاں سو فیصد سچی ہیں۔

اس کی کہانی بھی کچھ ویسی ہی ہے لیکن آگے چل کر اس کے ساتھ جو واقعات پیش آئے وہ ذرا مختلف ہیں۔ یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ ایسی بہت سی کہانیاں برما کے جنگلوں میں گم ہو گئی ہیں۔ میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ یا شہادت نہیں کہ میں آپ کو یقین دلا سکوں کہ میں آپ کو اس آدمی کی جو کہانی سنانے لگا ہوں کہ یہ بالکل سچ ہے۔ اس میں عجیب چیز یہ ہے کہ یہ شخص مجھے ملا کیسے اور ملا کہاں!

میں ذرا اس کا تھوڑا سا پس منظر بیان کر دوں۔ رنگون برما کا دارالحکومت تھا۔ بہت ہی بڑا اور خوبصورت شہر تھا۔ اس شہر میں بدھ مت کے پیرو کاروں کے عبادت خانے بنے ہوئے تھے جو اب بھی ہیں۔ میں وہاں گیا تھا۔ بہت خوبصورت عمارتیں ہیں جو تعمیراتی آرٹ کے بہترین نمونے ہیں۔

وہاں کچھ گرجے بھی تھے اور مسجدیں بھی تھیں۔ میں نے رنگون تباہی کی حالت میں دیکھا تھا۔ یہ بہت عرصہ بعد کی بات ہے جب جنگ ختم ہو چکی تھی اور جاپانیوں کا بیڑہ غرق ہو گیا تھا۔ تباہی کی حالت میں بھی اس شہر کی خوبصورتی صاف نظر آ رہی تھی۔

تباہی کچھ یوں تھی کہ شہر میں ٹرامیں چلتی تھیں۔ میں نے دو ٹرامیں دیکھیں جو اپنی پٹڑیوں کے قریب الٹی پڑی تھیں۔ بڑی خوبصورت عمارتیں بمباری سے کھنڈر بنی ہوئی تھیں۔ کئی سڑکیں اس لئے بند تھیں کہ بموں نے وہاں بہت بڑے بڑے گڑھے بنا دیئے تھے۔ ریلوے سٹیشن بھی خاصا خوبصورت لگتا تھا۔ اس کی عمارت بھی بغیر چھت کے تھی کیونکہ اس پر بھی بم گرے تھے۔ میں نے ایک ریلوے انجن پلیٹ فارم پر پہلو کے بل پڑا دیکھا۔

مجھے ایک عجیب چیز نظر آئی۔ وہ یہ کہ بدھوں کے پیگوڈا یعنی ان کی عبادت گاہیں، گرجے اور مسجدیں بالکل محفوظ تھیں لیکن ان کے اردگرد جو آبادی تھی اور جو کئی کئی منزلہ عمارتیں تھیں وہ بمباری سے کھنڈر بنی ہوئی تھیں۔ کیا بم پھینکنے والے ہوا بازوں نے اچھی طرح دیکھ بھال کر بمباری کی تھی کہ کوئی عبادت گاہ تباہ نہ ہو؟ یا کیا یہ خداوند تعالیٰ کا کرشمہ تھا کہ کسی عبادت گاہ کا بال بھی بیکا نہ ہوا؟ بہرحال میں نے یہ عجیب چیز دیکھی اور اللہ کو یاد کیا کہ تیری ذات ہر معجزہ کر سکتی ہے۔

یہ بمباری انگریزوں نے جوابی حملے میں کی تھی۔ ہندوستان کی طرح برما پر بھی انگریزوں کی حکومت تھی۔ جاپانی فوجیوں نے حملہ کیا تو سنگاپور، ملایا اور تمام جزائر کو ختم کرتی ہوئی برما آن پہنچی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے برما پر قبضہ کر لیا۔ معلوم ہوا کہ جاپانی بمبار طیاروں نے رنگون پر یا کسی اور شہر پر ایک بھی بم نہیں گرایا تھا۔ ان کی فوجیں آرام سے رنگون میں داخل ہو گئی تھیں۔ پہلے بتا چکا ہوں کہ جاپان کے جاسوس اور ایجنٹ ان علاقوں میں موجود تھے۔ انہوں نے جاپان کی فتح کے لئے زمین

وار کر رکھی تھی۔ معلوم ہوا کہ برما کے لوگوں نے جاپان کی فوج کا استقبال کیا تھا۔ لوگ انگریزوں سے اس قدر متنفر تھے کہ انہوں نے جاپانیوں کا خیر مقدم کیا۔ ریزوں کو شاید برمیوں پر اعتبار تھا ہی نہیں۔ وہاں کی پولیس میں شاید ہی کوئی برمی گا۔ پولیس کی اکثریت ہندوستان کے لوگوں کی تھی جن میں زیادہ تر پنجاب اور بہ سرحد کے لوگ تھے۔ یہ تو اکثر سننے میں آتا تھا کہ کسی شخص کے متعلق پوچھا کہ کہاں ہے تو جواب ملا کہ وہ برما پولیس میں ہے۔ برما کے لوگوں کو یہ بھی اچھا نہ لگا گا کہ ان پر پنجاب اور سرحد کے جوانوں کو پولیس میں بھرتی کر کے ان پر مسلط کر گیا تھا۔

اس میں بھی کوئی شک و شبہ نہیں کہ برما کے ڈاکو مشہور تھے۔ رنگون شہر کے اروں میں اگر کسی برمی کی کوئی دکان تھی تو وہ چھوٹی سی دکان ہی ہو گی۔ تمام روبار ہندوستان کے لوگوں کے ہاتھ میں تھا۔ ہندوستان کے صوبہ مدراس کے لوگ ں رنگون میں آباد تھے۔ درمیانے درجے کے اور بڑے بڑے ہوٹل مدراسی چلاتے تھے ر یہ ان کی ہی ملکیت تھے۔ جنرل سٹور اور کپڑے کا کاروبار اور کپڑے کی دکانیں ں ہندوستانیوں کی ملکیت تھیں۔ مختصراً یہ سمجھ لیں کہ رنگون میں ہر طرح کا روبار ہندوستان کے لوگوں کے ہاتھ میں تھا۔ ان میں بھی پنجاب کے لوگ خاصی راد میں تھے۔ تمام دولت ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ ظاہر ہے کہ برمیوں کو یہ ورتِ حال اچھی نہیں لگتی تھی۔ یہ بنیادی وجہ تھی کہ غیر برمیوں کو برمی اچھی نظر ے نہیں دیکھتے تھے بلکہ انہیں بھی وہ اسی طرح ناپسند کرتے تھے جس طرح انگریزوں و۔اچانک برما میں خبر پہنچی کہ جاپان کی فوجوں نے سنگاپور ملایا وغیرہ پر یلغار کر دی ہے۔ برمیوں کو موقع مل گیا۔ یہ میں بتا چکا ہوں کہ برما میں جاپان کے جاسوسوں اور بنٹوں نے کیا کام کیا تھا۔ برمیوں کے تیور دیکھ کر غیر برمی تاجر، دکاندار اور دوسرے روباری لوگ وہاں سے بھاگنے لگے۔ انہوں نے بے تحاشا دولت کمائی تھی۔ بڑے لیشان مکان بھی بنائے تھے۔ مجھے پتہ چلا کہ برمیوں نے ان غیر برمی تاجروں وغیرہ ے کہہ دیا تھا کہ بہتر ہے کہ وہ یہاں سے نکل جائیں ورنہ قتل کر دیئے جائیں گے۔ ان بڑی پیاری چیز ہوتی ہے۔ پھر کون یہ خطرہ مول لیتا ہے کہ اس کے چھوٹے موٹے معصوم اور دودھ پیتے بچے قتل کر دیئے جائیں۔ زیادہ فکرمند وہ لوگ تھے

جن کے گھروں میں نوجوان لڑکیاں تھیں۔ برمی کوئی شریف لوگ نہیں تھے۔ ظلم، تشدد اور حق تلفی سے تنگ آیا ہوا آدمی ویسے بھی شریف نہیں رہتا۔ وہ اپنی مظلومیت کا انتقام لیتا ہے۔ بعض برمی ایسے تھے جن کے غیر برمیوں کے ساتھ بڑے اچھے مراسم تھے۔ انہوں نے اپنے غیر برمی دوستوں اور تعلق داروں کو مخلصانہ مشور دیا کہ وہ یہاں سے نکل جائیں پیشتر اس کے کہ جاپان کی فوج یہاں پہنچ جائے۔

جاپان کی فوج کے متعلق ایک بات مشہور ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ جاپانی فوج جہاں بھی جاتی اور قبضہ کرتی ہے وہاں سے تمام نوجوان لڑکیوں کو اکٹھا کر کے اپنے ساتھ مورچوں میں رکھ لیتی ہے۔ تصور کیا جاسکتا ہے کہ ان لڑکیوں کو فوجی اپنے پاس کیوں رکھتے تھے۔ برمیوں نے جب جاپانی فوج کی یہ شہرت سنی تو ان کے سامنے یہی ایک راستہ تھا کہ یہاں سے بھاگ جائیں۔

بھاگنے کے دو راستے تھے۔ ایک راستہ تو سمندری تھا اور دوسرا راستہ خشکی تھا۔ خشکی کا راستہ مسدود تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ خشکی کا کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ بندرگاہ پر بحری جہاز اور لانچیں وغیرہ موجود تھیں۔ روپے پیسے والے جو لوگ سمندری راستے سے نکل سکے، نکل آئے۔ پھر پرائیوٹ بحری جہاز رانوں نے او لانچوں کے مالکوں نے کرایہ اس قدر بڑھا دیا جو کوئی کوئی ہی ادا ہی کر سکتا تھا۔ یوا سمجھ لیں کہ بحری راستہ بھی مسدود ہو گیا۔ ایسے واقعات بھی سنائی دیئے کہ بحر جہازوں اور لانچوں میں جانے والوں کو جہاز ران راستے میں لُوٹ لیتے تھے اور ان عورتوں کو خراب کرتے تھے۔

ایسی صورتِ حال پیدا ہو گئی کہ لوگوں نے بالکل اسی قسم کی ہجرت شروع کر د جس طرح 1947ء میں مشرقی پنجاب سے مسلمانوں نے پاکستان کو کی تھی۔ کچھ دو تک تو ٹیکسیاں اور بسیں جاتی تھیں۔ اس سے آگے کوئی راستہ نہیں تھا۔ جنگل تھے پہاڑ تھے۔ نقشے پر دیکھ لیں۔ رنگون سے چلیں تو سب سے قریبی شہر بنگال کا چٹاگانگ ہے جو وہاں سے پانچ سو میل سے زیادہ دور ہے۔ یہ پانچ سو میل کا فاصلہ ہوائی سفر ہے۔ جنگل میں درندے مل سکتے تھے یا ڈاکو..... جاپانیوں کے لڑاکا بمبار طیارے پر پرواز کر جاتے تھے اور اِکا دُکا بم پھینک جاتے تھے۔ انہوں نے سنگاپور اور ملایا فتح لیا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے برما کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس صورتِ حال میں غ

برمیوں کی بہت زیادہ تعداد اپنے ساتھ قیمتی اشیاء باندھ کر رنگون سے خشکی کے راستے چل پڑی۔

ان کا راستے میں جو حال ہُوا وہ ایک لمبی کہانی ہے۔ کچھ قسمت والے لوگ ہی بنگال تک پہنچے تھے۔ لوگ قافلوں کی یا کئی کئی خاندانوں کی صورت میں آئے تھے۔ ایسے بھی تھے جو تنہا چل پڑے تھے۔

موجودہ صدی کی یہ ایک ایسی ہجرت ہے جس کے متعلق ہندوستان میں بہت کم سنا گیا تھا۔ کسی کو تفصیل سے معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ رنگون اور برما کے دوسرے بڑے شہر مانڈلے سے غیر برمی کس طرح نکل کر آئے اور ان پر کیا بیتی تھی۔ دوسری ہجرت مسلمانوں کی مشرقی پنجاب سے پاکستان تک تھی جو بڑی ہی ہولناک اور درد ناک تھی۔ رنگون سے ہندوستانیوں کی ہجرت نے کئی ایک عبرتناک اور خوفناک کہانیوں کو جنم دیا تھا لیکن یہ کہانیاں کم ہی سنی اور سنائی گئیں۔ میں نے <حکایت> میں اس کی کچھ کہانیاں پڑھی ہیں اور اب میں آپ کو ایک اور کہانی سنا رہا ہوں۔

○

وہ شخص جو مجھے ایک درخت کے تنے کے ساتھ لگا بیٹھا موت کا انتظار کرتا ملا تھا، اُس کا نام صدیق تھا۔ اُس کا باپ خاصے عرصے سے رنگون میں کاروبار کرتا تھا۔ اگر مجھے ٹھیک یاد رہ گیا ہے تو اس کا باپ گورنمنٹ کنٹریکٹر تھا اور صدیق نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دولت مند لوگ تھے۔ ان کا اپنا مکان تھا۔ اُس کا باپ رنگون میں بہت عرصہ پہلے چلا گیا تھا اور جب ٹھیکیداری میں اُس کے قدم جم گئے اور دولت آنے لگی تو وہ اپنے بیوی بچوں کو بھی وہاں لے گیا۔ صدیق نے مجھے سنایا کہ باپ نے اُسے وہاں ایک کالج میں داخل کرا دیا تھا۔

صدیق ماں باپ کا اکلوتہ بیٹا تھا، باقی تین بہنیں تھیں اور ان کے بعد ایک چھوٹا بھائی تھا۔ صدیق کے گھر کے پیچھے شیخوں کی ایک مسلمان فیملی رہتی تھی۔ اس فیملی کا سربراہ کپڑے کی دکان کرتا تھا اور اچھی خاصی دکان تھی۔ صدیق نے بتایا کہ وہ شریف لوگ تھے۔

صدیق کا مکان دو منزلہ تھا۔ اس کی کھڑکیاں پچھواڑے کی طرف بھی تھیں۔ ان کھڑکیوں میں سے پچھلی فیملی کا پورا گھر اندر سے نظر آتا تھا۔ صحن تھا، برآمدہ تھا اور

کچھ کمرے تھے۔ ان کی ایک نوجوان لڑکی تھی جو خاصی خوبصورت تھی۔ وہ پردہ نشین تھی۔ صدیق نے اپنے متعلق بڑی بے تکلفی سے بتایا کہ اُس کا باپ امیر کبیر تھا اور وہ اس کا اکلوتہ بیٹا تھا اس لئے وہ شرافت سے بہت دُور نکل گیا تھا۔ باپ سے وہ جتنے پیسے مانگتا باپ دے دیا کرتا تھا۔ ماں سے مانگتا تو ماں اس کی جیب بھر دیتی۔ باہر اُس نے اپنے جیسے بدکردار لڑکوں کے ساتھ دوستی کرلی۔ کالج تو وہ نام کو ہی جاتا تھا۔ غور کریں کہ اسی عمر میں صدیق نے عصمت فروشوں کے ہاں جانا شروع کر دیا تھا۔ وہ شوقیہ جوا بھی کھیلتا تھا اور شاید ہی کوئی بدی ہو جو اُس میں نہ تھی۔ وہ گھر میں ہوتا تو پچھواڑے کی کھڑکی کھول کر پیچھے رہنے والی فیملی کے گھر تانک جھانک شروع کر دیتا۔ اُس نے ان کی لڑکی کو دیکھ لیا تھا۔ وہ کوئی شیخ فیملی تھی۔ ایک روز اُس نے ایک رُقعہ لڑکی کے نام لکھا اور یہ رقعہ تہہ کر کے ایک کنکری کے ساتھ باندھا اور شیخوں کے صحن میں پھینک دیا۔ رقعہ لڑکی کی ماں نے اٹھایا اور پڑھا۔ اُس نے اوپر دیکھا تو کھڑکی میں صدیق کھڑا مسکرا رہا تھا۔

لڑکی کی ماں یہ رُقعہ اور کنکری اٹھائے صدیق کے گھر آئی اور صدیق کی ماں کو یہ رقعہ دکھایا۔ ماں نے صدیق سے باز پُرس کی تو صدیق نے ماں سے یہ جھوٹ بولا کہ لڑکی خود اسے اشارے کرتی ہے۔ لڑکی کی ماں کو اپنی لڑکی پر بھروسہ تھا۔ اس نے غصے کا اظہار کیا تو صدیق نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کر گھر سے نکال دیا۔ اس کی ماں اسے اس بدتمیزی سے نہ روک سکی نہ اس نے روکنے کی کوشش کی۔

لڑکی کی ماں نے لڑکی کے باپ کو بتایا اور رقعہ دکھایا۔ لڑکی کا باپ صدیق کے باپ سے ملا اور شکایت کی۔ باپ نے صدیق کو بُرا بھلا کہا اور یہ بھی کہا کہ آئندہ اس نے ایسی حرکت کی تو اسے گھر سے کوئی پیسہ نہیں ملے گا۔ یہ تو زبانی بات تھی، عملاً باپ نے بیٹے کو اس بداخلاقی سے نہ روکا۔

صدیق نے مجھے سنایا کہ بدمعاشی تو ایک طرف رہی، یہ لڑکی اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس نے سوچا کہ اس لڑکی کو یوں تنگ نہ کیا جائے بلکہ کسی طرح اس سے ملاقات کر کے کہا جائے کہ میرے دل میں تمہاری محبت پیدا ہو گئی ہے جس کا بدمعاشی کے ساتھ یا بدنیتی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ یوں سوچ کر اس نے یہ حرکت کی کہ کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔ لڑکی نے تو صحن میں نکلنا ہی تھا۔ وہ

نکلی تو صدیق نے ہاتھ جوڑے اور اشارے کئے۔ لڑکی نے منہ پھیر لیا اور کمرے میں چلی گئی۔

صدیق نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ اُس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ ماں نے اس کے باپ کو بتایا۔ باپ نے اسے کہا کہ وہ پہلے بی اے کر لے اور پھر اسے باپ اپنے ساتھ کام میں لگائے گا اور جب وہ اس کام میں چل نکلے گا تب وہ اس کی شادی کرے گا۔ صدیق نے باپ سے کہا کہ وہ ابھی اس کی منگنی اس لڑکی کے ساتھ کرا دیں پھر شادی جب چاہیں کرائیں۔ ماں باپ ٹال مٹول کرتے رہے اور وقت گزرتا رہا۔ لڑکی کی عمر پندرہ سولہ سال تھی۔ اس کے والدین کو اس کی شادی کی کوئی جلدی نہیں تھی۔

صدیق نے اپنے ماں باپ کو اتنا مجبور اور پریشان کر دیا کہ ایک روز صدیق کی ماں اُس لڑکی کی ماں کے پاس اُس کی بیٹی کا رشتہ مانگنے چلی گئی۔ لڑکی کی ماں نے اُسے ٹکا سا جواب دے دیا۔ صدیق کی ماں نے اسے کہا کہ ان کی لڑکی کو شہزادیوں کی طرح رکھا جائے گا۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنی دولت کا گھمنڈ ظاہر کیا۔ لڑکی کی ماں نے اسے کہا کہ انہیں اخلاق، کردار اور شرافت چاہئے، دولت کوئی چیز نہیں اور وہ خود بھوکے ننگے بھی نہیں۔ صدیق کی ماں نے ذرا دبدبے سے بات کی تو لڑکی بول پڑی۔ اس نے جہاں اور بہت سی باتیں کیں وہاں یہ بھی کہہ دیا کہ میں کسی لوفر لفنگے اور اوچھے اور گھٹیا شخص کو قبول نہیں کروں گی۔

ماں نے گھر آکر صدیق کو یہ ساری باتیں سنائیں۔ صدیق بھڑک اٹھا۔ اس نے لڑکی سے انتقام لینے کا ارادہ کر لیا۔ اس کے پاس پیسوں کی کمی نہیں تھی۔ اس نے اپنے جیسی ایک جوان لڑکی کے ساتھ تعلقات پیدا کئے اور اُسے کہا کہ وہ شیخوں کی بیٹی کے ساتھ دوستی کرے اور اُسے کسی طرح اپنے ساتھ باہر لائے۔ صدیق کی اس دوست نے ایسے ہی کیا۔ وہ شیخوں کے گھر جانے لگی لیکن اس گھرانے نے اسے قبول نہ کیا۔ اُس طرح صدیق کو ناکامی ہوئی۔

شیخوں کی یہ کمسن بیٹی تیسرے چوتھے روز اپنے عزیزوں کے ہاں جایا کرتی تھی۔ وہ برقع پہنتی تھی۔ صدیق نے دو مرتبہ اس کا پیچھا کیا اور انتہائی گھٹیا الفاظ استعمال کرتے ہوئے اسے پریشان کیا۔ اس لڑکی کا کوئی بھائی جوان نہیں تھا۔ دو چھوٹے بھائی

تھے۔ اُس نے اپنے عزیزوں کو بتایا کہ فلاں لڑکا اسے یوں پریشان کرتا ہے۔ ان عزیزوں کے ہاں جوان لڑکے تھے۔ ایک روز انہوں نے صدیق کو پکڑ لیا اور اسے مارا پیٹا۔ یہ بات پولیس تک پہنچی۔ اس وقت کی اور وہاں کی پولیس ہماری آج کی پاکستانی پولیس سے بہت مختلف تھی۔ تھانیدار پنجابی تھا اور اس کے سٹاف میں زیادہ تر پنجاب اور سرحد کے رہنے والے آدمی تھے۔ لڑکی کا باپ بھی تھانے پہنچ گیا۔ اس نے صدیق کی تمام حرکتیں بتائیں اور تھانیدار سے کہا کہ وہ چل کر دونوں مکان دیکھے تا کہ اسے پتہ چلے کہ لڑکا کس طرح کھڑکی کھول کر ان کی بے پردگی کرتا ہے۔

تھانیدار موقعہ پر چلا گیا اور اس نے دونوں مکان دیکھے۔ وہ ساری بات سمجھ گیا اور اس نے صدیق کے باپ سے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنے کنٹرول میں رکھے ورنہ اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔

صدیق کی یاری لوفروں لفنگوں کے ساتھ تھی۔ اُس نے اپنی بدمعاشی جاری رکھی۔ یہاں تک کیا کہ لڑکی کے باپ کی دکان میں رات کے وقت چوری کی واردات کروائی۔ وہ اس طرح کہ لڑکی کا باپ صبح دکان پر گیا تو تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ ریشمی کپڑوں کے کئی ایک تھان غائب تھے اور گلے سے پیسے بھی غائب تھے۔ شیخ نے تھانے رپورٹ کی اور صدیق پر شک کا اظہار کیا۔ تھانیدار نے صدیق کو پکڑا اور تھانے بلا لیا لیکن صدیق نے واردات سے لاتعلقی اور لاعلمی کا اظہار کیا۔ تھانیدار نے اسے مارا پیٹا بھی لیکن وہ نہ مانا۔ اصل چور نہ مل سکے۔ تھانیدار نے صدیق کو چھوڑ دیا کیونکہ اس کے خلاف کوئی شہادت نہیں تھی اور کوئی ثبوت بھی نہیں تھا۔

صدیق نے اپنی بدمعاشیاں جاری رکھیں۔ یہ شیخ فیملی صدیق سے اس قدر تنگ آگئی کہ انہوں نے وہ مکان چھوڑ دیا اور شہر میں کہیں اور مکان لے لیا۔ تین چار مہینے گزر گئے۔ صدیق نے اس لڑکی کو ڈھونڈ نکالا۔ اس نے ان کا مکان دیکھ لیا تھا اور پھر ایک بار اس نے لڑکی کو ٹرام میں اپنے عزیزوں کے گھر جاتے دیکھ لیا۔ راستے میں اس نے لڑکی کو چھیڑا۔ لڑکی نے شور شرابہ کیا تو لوگ اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے صدیق کو لعن طعن کی۔

صدیق نے دو اڑھائی سال اس لڑکی کا ناک میں دم کئے رکھا۔ اب لڑکی اٹھارہ سال کی ہو گئی تھی۔ صدیق نے ایک عورت کو بھی لڑکی کے پیچھے ڈالا جو اُسے اس

کے گھر جا کر کان میں کہتی رہی کہ صدیق کے ساتھ شادی پر رضامندی ظاہر کر دے تو ساری عمر شہزادیوں کی طرح گزارے گی اور اگر وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تو صدیق کے ساتھ دوستی کر لے۔ یہ لڑکی شادی تو کرنا ہی نہیں چاہتی تھی اور جہاں تک دوستی کا سوال تھا وہ تو ناممکن تھا کیونکہ وہ پردہ نشین تھی اور اس کے علاوہ صدیق پر لعنت بھیج چکی تھی۔

○

رنگون میں وہ خبریں پہنچنے لگیں جو میں بیان کر چکا ہوں۔ برمیوں نے جہاں غیر برمیوں کو بھاگ جانے کو کہا تھا' وہاں انہوں نے اس لڑکی کے باپ اور صدیق کے باپ کو بھی دوستانہ اور برادرانہ انداز سے کہا کہ وہ بہت جلدی یہاں سے نکل جائیں۔ صدیق کے باپ کے پاس دولت تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ انگریز گئے اور جاپانی آگئے تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ اُس نے وہاں سے نکلنے میں بہت وقت لگا دیا۔ وہ اپنے برمی دوستوں کی یہ بات نہیں سمجھ رہا تھا کہ یہاں بات انگریزوں کی اور جاپانیوں کی نہیں بلکہ برمیوں کی ہے۔ برمی جاپانیوں کے پہنچتے ہی شہر میں لوٹ مار کریں گے اور غیر برمیوں کو لوٹیں گے بھی' انہیں قتل بھی کریں گے اور ان کی لڑکیوں کو بھی اغوا کر لیں گے۔

اب ٹھیکیدار کو مصیبت پڑی۔ صدیق نے مجھے بتایا کہ بندرگاہ پر گئے تو وہاں کوئی جہاز اور کوئی لانچ نہیں تھی۔ لانچ تو اتنی دور کا سفر کر بھی نہیں سکتی تھی۔ پھر بھی بعض لانچیں چٹاگانگ تک چلی گئی تھیں لیکن یہ ایک خطرہ تھا۔ آخر ٹھیکیدار کو خشکی کے راستے جانے کا انتظام کرنا پڑا۔ اُس نے ایک بس کرائے پر لے لی لیکن بس جنگل میں تو نہیں جا سکتی تھی۔ پھر بھی پوری فیملی اس بس میں بیٹھی اور جہاں تک بس ان کو لے جا سکتی تھی وہاں تک پہنچا کر واپس آگئی۔ یہ لوگ وہاں سے اپنی جانیں' زیورات اور نقدی لے کر نکلے تھے۔ نقدی کوئی تھوڑی سی نہیں تھی۔ پھر انہیں کرائے کی خچریں مل گئیں۔ خچروں والوں نے بھی ان کو کچھ دور تک ہی پہنچایا آخر وہ بھی منہ موڑ گئے۔ پھر جس طرح دوسرے لوگ پاپیادہ چلے جا رہے تھے اسی طرح یہ فیملی بھی چل پڑی۔

یہ لوگ دریائے اراوتی تک پہنچ گئے۔ وہاں کوئی روکنے والا تو نہیں تھا۔ بہت

سے لوگ دریا کے پُل سے گذر رہے تھے۔ یہ بھی ان لوگوں میں شامل ہو گئے۔ جوں جوں یہ لوگ آگے بڑھتے جا رہے تھے، بکھرتے جا رہے تھے۔ صدیق نے مجھے سنایا کہ اس کی حالت بہت بری ہوئی جا رہی تھی۔ وہ تو سمجھتا تھا کہ روپے پیسے سے دنیا کی ہر چیز یہاں تک کہ انسان بھی خریدے جاسکتے ہیں لیکن برما کے ان جنگلوں میں اور پہاڑی علاقوں میں اسے زندگی میں پہلی بار محسوس ہُوا کہ روپیہ پیسہ کچھ بھی نہیں۔ جو کچھ ہے وہ اللہ کی ذات ہے لیکن صدیق نے اللہ کو تو کبھی یاد ہی نہیں کیا تھا۔ وہ بار بار پیچھے دیکھتا تھا جیسے اسے توقع تھی کہ کوئی نہ کوئی اس کے پیچھے دوڑ آئے گا اور اسے کہے گا صدیق واپس آجاؤ رنگون میں کوئی خطرہ نہیں۔ وہاں کس نے آنا تھا اسے واپس لے جانے کے لیے کوئی بھی نہ آیا۔

ان کے پاس کھانے پینے کا کچھ سامان تھا۔ دو تین دن گذر گئے تھے۔ مزید تین چار دن گزرے تو کھانے کا سامان ختم ہو گیا اور ایک صبح انہوں نے دیکھا کہ ان کی فیملی اکیلی رہ گئی ہے اور دوسرے لوگ بکھر کر اپنی اپنی راہ لگ گئے ہیں۔

صدیق نے مجھے اتنی زیادہ تفصیلات نہیں سنائی تھیں۔ وہ سنا بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ بولتے بولتے اس کی زبان رک جاتی تھی۔ کچھ دیر وہ اپنی سانسوں کو سنبھالتا تھا، ایک دو لمبی سانسیں لیتا پھر بات آگے سناتا تھا۔ اس نے یہ نہ بتایا کہ وہ اکیلے کس طرح رہ گئے تھے۔

اس کے باپ کے پاس بے شمار رقم تھی لیکن وہ محض بے کار تھی۔ ایک رات وہ سونے کے لیے زمین پر لیٹے تو چار برمی آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں لمبی تلواریں تھی جن کے بلیڈ عام تلواروں جیسے نہیں بلکہ آگے سے چوڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں۔ انہوں نے اپنی زبان میں کہا کہ ہم تمہاری ان جوان لڑکیوں کو کچھ بھی نہیں کہیں گے، تم لوگ رقم اور زیور ہمارے حوالے کر دو۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو ہم تمہیں قتل کر دیں گے اور رقم اور زیور کے ساتھ ان لڑکیوں کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔ ٹھیکیدار نے بڑے آرام سے زیوارت کی پوٹلی اور نقد رقم ان کے حوالے کر دی اور اس طرح اپنی بیٹیوں کی عصمتیں اور جانیں بچالیں۔

○

شاید دو تین یا چار پانچ دن گزرے ہوں گے کہ یہ فیملی دن کے وقت ایک جگہ

رک گئی۔ صدیق ویسے ہی ایک طرف نکل گیا۔ وہ دیکھنے گیا تھا کہ ہو سکتا ہے کوئی راستہ نظر آجائے۔ اُسے کچھ دور جاکر راستہ تو نظر نہ آیا البتہ ایک ایسی چیز نظر آئی جس نے اسے حیرت زدہ کر دیا اور اس کے اندر کوئی اور ہی جذبہ پیدا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک جگہ شیخ فیملی رکی ہوئی ہے اور ان کے ساتھ شیخ کی وہ بیٹی بھی ہے جس کی پیچھے وہ پڑا رہتا تھا۔

ان لوگوں کو وہاں دیکھ لینا کوئی حیران کن بات نہیں تھی۔ جس طرح وہ خود جا رہے تھے اسی طرح یہ شیخ فیملی بھی جا رہی تھی۔ اس مصیبت کے وقت میں بھی جب کوئی امید نہیں تھی کہ یہ لوگ منزل پر پہنچ جائیں گے یا راستے میں مرجائیں گے یا کہیں سے کوئی درندہ آکر انہیں چیر پھاڑ دے گا، صدیق کے دل میں شیطان نے انگڑائی لی۔

اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ پتہ نہیں مرنا ہے یا زندہ رہنا ہے یا نہ جانے کیا ہو جائے، اس لڑکی سے میں انتقام ضرور لوں گا۔ اس نے انتقام لینے کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ رات کو جب اس کی فیملی سو گئی تھی، وہ اٹھا اور اس طرف چل پڑا جدھر شیخ فیملی جا رہی تھی۔ اس شخص نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس کے والدین اور اس کی بہنیں اسے غیر حاضر پائیں گے تو وہ سب کس طرح پریشان ہوں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سفر ملتوی کر کے اسے ڈھونڈنے کے لیے ادھر ادھر چل پڑیں۔

یہ صدیق کا کردار تھا۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ روپے پیسے کے نشے نے اس میں گھٹیا پن پیدا کر دیا تھا۔ اس نے مجھے سنایا کہ وہ رات بھر مارا مارا پھرتا رہا لیکن اسے شیخ فیملی نظر نہ آئی۔ صبح طلوع ہونے سے کچھ دیر پہلے نیند نے اس پر ایسا غلبہ کیا کہ وہ گر پڑا اور گہری نیند سو گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو دن کے تین بج رہے تھے۔ اسے اپنی فیملی کا خیال آیا تو اسے یاد ہی نہ رہا کہ وہ کس طرف سے آیا تھا۔ اگر میدان ہوتا تو وہ سیدھا آتا اور سیدھا واپس چلا جاتا۔ وہاں تو ٹیکریاں، ٹیلے اور چٹانیں تھیں اور کچھ کھڈ بھی تھے۔ وہ ان میں سے گزر کر آیا تھا۔

وہ اٹھا اور ایک اور طرف چل پڑا۔ سورج غروب ہونے کو تھا جب اسے شیخ

فیملی نظر آگئی۔ وہ فیملی جا رہی تھی اور جب سورج غروب ہو گیا تو وہ لوگ رک گئے صدیق بھی رک گیا۔ ان لوگوں نے صدیق کو نہیں دیکھا تھا۔ صدیق وہیں لیٹ گیا اُس نے رات کو اس فیملی پر حملہ کرنا تھا۔ اُس کے پاس لمبا چاقو تھا۔

اُس کے اندازے کے مطابق رات کے دس ساڑھے دس بجے ہوں گے۔ اُسے یقین تھا کہ شیخ فیملی گہری نیند سو رہی ہو گی۔ اُس فیملی میں ایک تو شیخ خود تھا اور اُس کی بیٹی کے بعد دو بیٹے تھے جو چھوٹے تھے۔ فیملی میں یہی مرد تھے اور یہ صدیق سے مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

چاند پورا تھا۔ جنگل کی چاندنی بڑی شفاف ہُوا کرتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اس فیملی کی طرف گیا اور ان تک پہنچ گیا۔ وہ تھکے ماندے بہت ہی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ صدیق نے چاندنی میں لڑکی کو پہچانا۔ وہ درمیان میں نہیں بلکہ ایک طرف سوئی ہوئی تھی۔

صدیق نے آہستہ سے لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے ہلایا۔ لڑکی کروٹ بدل کر جاگ اٹھی۔ صدیق اُس کے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ لڑکی کی آنکھ کھلی تو صدیق نے کھلا ہُوا چاقو اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیا اور سرگوشی میں کہا کہ آواز نہ نکالنا ورنہ شہ رگ کاٹ دوں گا' اٹھو۔

وہ پردہ نشین لڑکی تھی۔ اُس پر تو سکتہ طاری ہو گیا ہو گا۔ صدیق نے مجھے سنایا کہ وہ اس طرح اٹھی جیسے اُس پر جادو کا اثر ہو گیا تھا' چاندنی میں اُس کی آنکھیں یوں نظر آتی تھیں جیسے ٹھہر گئی ہوں۔ صدیق اُسے ایک طرف لے گیا اور اُسے کپڑے اتارنے کو کہا۔ لڑکی سکڑنے سمٹنے لگی اور اُس کے ساتھ ہی اُس نے صدیق سے دُور ہٹنے کی کوشش بھی کی۔ صدیق نے چاقو کی نوک اُس کی شہ رگ پر رکھ دی اور اپنا حکم دوہرایا لیکن لڑکی نہ مانی۔ صدیق نے اُسے بہت ڈرایا دھمکایا لیکن لڑکی نے پھر بھی سوائے رونے کے اور کچھ نہ کیا۔ صدیق نے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ کر گرا لیا اور اُسے برہنہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ پوزیشن ایسی ہو گئی تھی کہ لڑکی پیٹھ کے بل زمین پر پڑی تھی اور صدیق اُس کے اوپر تھا۔

صدیق ذرا سیدھا ہُوا تو لڑکی نے اپنے دونوں پاؤں صدیق کے سینے پر رکھے اور اتنی زور سے پاؤں سے اُسے دھکا دیا کہ صدیق پیچھے جا گرا۔

یہاں سے صدیق کی اصل سزا شروع ہوئی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ جہاں اس نے لڑکی کو گرایا تھا وہ ایک گہرے پتھریلے گڑھے کا کنارہ تھا یا جو میں سمجھا وہ یہ تھا کہ وہ ایک سیدھی کھڑی چٹان تھی جو دس بارہ فٹ یا شاید اس سے بھی زیادہ گہری تھی۔ نیچے جو زمین تھی وہ پتھریلی تھی یا وہ چٹان کا حصہ تھا اور وہ بڑی ہی سخت تھی۔ صدیق کو اتنا یاد رہا کہ وہ لڑکی کے دھکے سے پیچھے کو گرا تو وہ اوپر سے پتھر کی طرح نیچے گیا۔ گرا تو وہ پیٹھ کے بل لیکن اس کے سر کا پچھلا حصہ کسی بڑے پتھر پر لگا اور اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ لڑکی کی نہ صرف عصمت محفوظ رہی بلکہ اسے تو صدیق برہنہ بھی نہیں کر سکا تھا۔ اس کا خدا حامی اور مددگار تھا۔

○

اس سے آگے صدیق نے مجھے جو بات سنائی' اس سے میں نے اندازہ کیا اور یہ رائے قائم کی کہ یہ بلندی سے گرا اور اس کے سر کا پچھلا حصہ پتھر سے ٹکرایا تو یہ بے ہوش ہو گیا۔ ہوش میں آیا تو یہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اسے بالکل یاد نہیں تھا نہ کچھ اندازہ تھا کہ وہ کتنے دن وہیں بھٹکتا پھرا اور وہ کہتا تھا کہ اسے خواب کی طرح یاد ہے کہ اس نے ایک ندی سے پانی پیا اور میری طرح درختوں سے کچھ توڑ کر کھایا تھا' بہرحال وہ زندہ رہا لیکن اسے یہ یاد نہیں تھا کہ وہ کس سمت کو چلتا رہا' کہاں گھومتا پھرتا رہا اور کہاں کہاں سوتا رہا۔ ہوا یہ کہ اُس کی یادداشت آہستہ آہستہ واپس آنے لگی۔ پھر اسے سب کچھ یاد آگیا لیکن یہ یاد نہیں تھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جا رہا تھا۔

ایک روز اسے کچھ آوازیں سی سنائی دیں۔ وہ رک گیا۔ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ آوازیں انسانوں کی لگتی تھیں۔ اسے خوشی سی ہوئی کہ یہ جو کوئی بھی ہوئے انسان ہی ہوں گے اور اس کی کچھ نہ کچھ تو مدد کریں گے یا یہی بتا دیں گے کہ جنگل کو جانا ہے تو فلاں سمت جاؤ۔

آوازیں ایک اونچی ٹیکری کے پیچھے سے آ رہی تھیں۔ وہ ادھر چلا گیا۔ اُس نے کبھی جاپانی نہیں دیکھے تھے۔ اس کے سامنے بیس پچیس فوجی اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے کچھ کر رہے تھے۔ ان کی شکلیں بتاتی تھیں کہ یہ انگریز نہیں اور جاپانی ہی ہو سکتے ہیں۔

صدیق نے جس طرح مجھے سنایا' اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جاپانیوں کی کوئی فوجی سیکشن تھی۔ ایک جاپانی نے اسے دیکھ لیا اور اپنی طرف بلایا۔ تب اس نے دیکھا کہ ان کے ساتھ چار پانچ سویلین تھے جو برمی ہی لگتے تھے لیکن کسی اور علاقے کے رہنے والے تھے۔ جاپانیوں نے انہیں اپنے ساتھ سامان وغیرہ اٹھانے کے لئے رکھا ہُوا تھا۔ انہوں نے صدیق کو دیکھا تو اسے بھی اپنے پاس بلا لیا۔ وہ ڈرتا ڈرتا گیا کہ جاپانی اسے مار ڈالیں گے یا قیدی بنا کر پیچھے بھیج دیں گے لیکن جاپانیوں نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا وہ دشمنوں والا نہیں تھا۔

جاپانی فوجیوں کے ساتھ جو چار پانچ آدمی تھے وہ برما کی زبان بولتے تھے اور صدیق برما کی زبان بڑی اچھی طرح بول اور سمجھ سکتا تھا۔ جاپانیوں نے ان برمیوں کے ذریعے صدیق سے پوچھا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے۔ صدیق نے انہیں بتایا کہ وہ رنگون سے اپنے خاندان کے ساتھ ہندوستان کی طرف جا رہا تھا لیکن اپنے خاندان سے بچھڑ گیا ہے۔ میں یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ جاپانیوں کو برمیوں نے بتا دیا ہو گا کہ غیر برمی لوگ ہندوستان کو بھاگ گئے ہیں۔

ان جاپانیوں نے صدیق کو بھی اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اس سے وہ مزدوروں اور نوکروں کا کام لینا چاہتے تھے۔ صدیق نے انہیں رحمت کے فرشتے سمجھتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا اور ان سے کھانے کو کچھ مانگا۔ اس نے بتایا کہ وہ کتنے دنوں سے جنگل کی چیزیں کھا کھا کر زندہ تھا۔ جاپانیوں نے اسے کھانے کو دیا۔ معلوم نہیں کتنے عرصے بعد اسے ذرا ڈھنگ کا کچھ کھانے کو ملا۔

صدیق فوجی نہیں تھا اس لئے وہ نہیں بتا سکتا تھا کہ جاپانیوں نے وہاں کیا بنایا ہُوا تھا۔ اس نے جو بیان کیا' اس سے میں نے اندازہ کیا کہ انہوں نے وہاں سگنل پوسٹ بنائی تھی۔ وہاں سے وہ برما فرنٹ پر لڑنے والی فوجوں کا رابطہ پیچھے اپنے ہیڈ کوارٹر یا اپنی ہائی کمان سے کراتے تھے اور وہ ہوائی جہازوں کے ساتھ بھی باتیں کر سکتے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ ان کی ایک وائرلیس پوسٹ تھی جسے آپ سگنل پوسٹ کہہ لیں یا کچھ کہہ لیں۔ وہاں انہوں نے اپنا باورچی خانہ بھی بنا لیا۔ صدیق کا اور دوسرے تین چار آدمیوں کا یہ کام تھا کہ وہ جاپانیوں کے برتن قریبی ندی پر دھوتے تھے۔ باورچی خانے میں آگ جلاتے اور جو کام ان کے ذمے ہوتا وہ کرتے تھے۔ کھانا جاپانی خود پکاتے

تھے۔ ان کے بوٹ بھی یہی لوگ صاف کرتے تھے اور ندی سے پانی بھی لاتے تھے۔ یوں سمجھ لیں کہ انہیں جاپانیوں نے روٹی پر نوکر رکھ لیا تھا۔ برمیوں نے صدیق کو بتا دیا تھا کہ وہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرے کیونکہ وہ کہیں بھی نہیں جا سکے گا اور جاپانی اسے پکڑ لائیں گے اور گولی مار دیں گے۔

○

یہ پوسٹ کئی مہینے وہاں رہی اور اس کے بعد یہ پوسٹ یہاں سے اٹھائی گئی اور ڈیڑھ دو میل پیچھے ایک اور زیادہ بلند ٹیکری پر بنائی گئی۔ صدیق ان کے ساتھ رہا۔ اسے بہت ہی کام کرنا پڑا لیکن اسے یہ اطمینان تھا کہ وہ مرے گا نہیں یا کم از کم بھوکا نہیں مرے گا۔ جاپانی اسے بڑی اچھی خوراک کھلا رہے تھے۔ جاپانی جو کچھ خود کھاتے تھے وہ ان سویلین آدمیوں کو بھی کھلاتے تھے۔ وہ ایسا نہیں کرتے تھے کہ بچا کھچا کھانا ان کے آگے پھینک دیتے۔

صدیق نے مجھے سنایا کہ اس کے ذہن سے عیش و عشرت کی وہ زندگی جو اس نے اپنے باپ کی دولت پر گزاری تھی' اتر گئی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اس زندگی کو بھول گیا تھا' مطلب یہ تھا کہ اس اچھے وقت کی یاد اسے تنگ نہیں کرتی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ اسے اپنے گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ وہ اس میں خوش تھا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی سزا نہ صرف ابھی باقی ہے بلکہ بڑی اذیت ناک سزا اسے ملنے والی ہے۔

تین یا چار مہینے پوسٹ وہاں رہی۔ ایک روز ہوائی جہاز آئے اور انہوں نے اس پوسٹ پر دو بم گرائے جو پوسٹ کے دائیں اور بائیں گرے اور ایسے دھماکوں سے پھٹے کہ صدیق کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ اس وقت وہ ندی پر پانی لینے گیا تھا۔ پوسٹ سے وہ بہت دور نہیں تھا۔ وہ وہیں رک گیا۔ پیچھے ایک اور ہوائی جہاز آیا جو پوسٹ پر مشین گنیں فائر کرتا گزر گیا۔ اس کے پیچھے ایک اور ہوائی جہاز آیا جس نے بم گرائے اور یہ بم پوسٹ کے اوپر گرے اور جب یہ پھٹے تو اس نے دو جاپانیوں کو ہوا میں اوپر جاتے اور گرتے دیکھا۔

میں صدیق کی یہ بات سمجھ گیا۔ اس وقت تک برما پر جاپانیوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور جنگ ہندوستان کے دروازے پر چلی آ رہی تھی۔ انگریزوں کی فوج جس میں

انڈین آرمی زیادہ تھی اور گورا فوج بھی تھی، بری طرح برما سے پسپا ہوئی تھی۔ اب انگریزوں نے امریکہ کی مدد سے برما پر جوابی حملہ شروع کر دیا تھا۔ اب جاپانی فوج پسپا ہو رہی تھی۔

میں نے رنگون کی تباہی کا حال بیان کیا ہے۔ جاپانیوں نے رنگون پر کوئی بمباری نہیں کی تھی نہ ہی انہیں بمباری کی ضرورت پڑی تھی۔ برمیوں نے جاپانیوں کا ساتھ دیا تھا اور انگریزوں کی فوج اور پولیس رنگون سے بُری طرح بھاگی تھیں۔ مجھے بعد میں سنایا گیا تھا کہ جاپانی فوج بحری جہازوں کے ذریعے آئی تھی اور ان کے جہاز بندرگاہ سے کچھ دور رک گئے تھے۔ وہاں سے انہوں نے کشتیوں پر رنگون تک آنا تھا۔ ان کے پاس کشتیاں بحری جہازوں میں موجود تھیں لیکن برما کے ماہی گیر اپنی کشتیاں لے کر جاپانیوں کے بحری جہازوں تک جا پہنچے اور ان کشتیوں پر جاپانیوں کو بٹھا کر رنگون کے ساحل پر لے آئے تھے۔

انگریزوں نے جب جوابی حملہ کیا تو ان کے بمبار طیاروں نے رنگون پر بے پناہ بمباری کی تھی۔ رنگون انگریزوں کی بمباری سے تباہ ہُوا تھا۔ یہ انگریزوں کا اپنا شہر تھا۔ انہوں نے اس شہر میں تباہی مچا دی تھی۔

صدیق نے جب دیکھا کہ ہوائی جہاز چلے گئے ہیں تو وہ واپس پوسٹ پر آیا۔ وہاں اب بموں کے بنائے ہوئے گڑھے تھے اور جاپانیوں کی لاشیں تھیں اور پوسٹ کا سامان دور دور بکھر گیا تھا اور کوئی بھی چیز سلامت نہیں رہی تھی۔ ان کے ساتھ جو چار پانچ سویلین برمی تھے وہ بھی مارے گئے تھے۔ کوئی لاش پوری کی پوری نہیں تھی۔ لاشوں کے ٹکڑے ادھر ادھر پڑے ہوئے تھے۔

صدیق پر ایسی ہیبت اور دہشت طاری ہوئی کہ اس کا دماغ ماؤف اور جسم سن ہو گیا۔ وہ تو سمجھ بیٹھا تھا کہ ابھی اُس کی سانسیں رک جائیں گی اور وہ یہیں مر جائے گا لیکن وہ زندہ رہا۔

اب اُسے وہاں سے کسی طرف چلے جانا تھا۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ہندوستان کس طرف ہے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ بکھری ہوئی چیزوں میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ وہ کھانے پینے کا کچھ سامان اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اسے دو ڈبل روٹیاں، جام کی ایک ٹوٹی ہوئی شیشی اور اس طرح کی کچھ اور چیزیں مل گئیں۔

انہیں ایک کپڑے میں سمیٹ کر وہ جدھر کو منہ آیا ادھر کو چل پڑا۔

اُس نے مجھے بتایا کہ اسے اب تو کچھ بھی یاد نہیں رہا کہ وہ کتنے دن بھٹکتا رہا اور کہاں کہاں گھومتا پھرتا رہا تھا۔ کبھی پہاڑیوں کے اندر، کبھی کسی میدان اور کبھی ندی کے کنارے کنارے وہ چلتا رہا، کہیں تھک کر گر پڑا اور سو گیا اور اس طرح اس نے نہ جانے کتنی راتیں اور کتنے دن گزار دیئے۔

ایک رات وہ سویا ہوا تھا۔ پنڈلی میں اسے اس طرح درد ہوا جیسے کسی نے چاقو اس کی پنڈلی میں اتار دیا ہو۔ وہ تیزی سے اٹھا۔ پنڈلی پر ہاتھ پھیرا۔ اسے توقع تھی کہ وہاں زخم ہو گا لیکن وہاں کوئی زخم نہیں تھا۔ اس کا ہاتھ گیلا ہو گیا۔ اب راتیں اندھیری تھیں۔ وہ سمجھ گیا کہ اسے کسی زہریلے کیڑے نے یا بچھو نے ڈس لیا ہے۔ یہ سانپ بھی ہو سکتا تھا۔ اندھیرے میں اسے کچھ نظر تو آتا نہیں تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ پنڈلی میں زخم ہو گا۔ پتلون اوپر کر کے پنڈلی پر ہاتھ پھیرا تو وہاں ویسا زخم نہیں تھا جیسا وہ سمجھا تھا، البتہ اس کا ہاتھ پھر گیلا ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ اس کا خون ہے۔ وہ ایک طرف چل پڑا۔

درد کی شدت اُس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ اونچی آواز میں رونے لگا۔ اس نے صرف یہ علاج کیا کہ کپڑے میں وہ کھانے کی کچھ چیزیں باندھ کر لایا تھا۔ اس کپڑے کو پھاڑا اور یہ پٹی اس جگہ باندھ دی جہاں کسی چیز نے کاٹا تھا۔ جب درد کی شدید ٹیسیں اٹھنے لگیں تو صدیق کو یاد آنے لگا کہ اس نے ایک شریف گھرانے کی پردہ نشین لڑکی کے لئے جینا حرام کر دیا تھا اور اسے انتہائی بیہودہ طریقوں اور بے حیائی کے الفاظ سے پریشان کرتا رہا تھا۔ اسے وہ رات بھی یاد آئی جب اس نے لڑکی کی عزت پر حملہ کیا تھا۔ وہ ناکام تو رہا تھا لیکن اس کا ارادہ اور نیت گناہ ہی کی تھی۔ اسے اب احساس ہونے لگا کہ خدا اسے اسی دنیا میں سزا دینے لگا ہے۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ شیخوں کی بیٹی اسے کہیں مل جائے تو وہ اس کے قدموں میں سر رکھ کر معافی مانگے لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ ویسے ہی ایک طرف چل پڑا۔ اس کا دماغ بیکار ہوتا جا رہا تھا۔ وہ درد کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

وہ خدا سے گناہوں کی بخشش اور فوری موت مانگنے لگا۔ اسے امید یہی تھی کہ یہ زہر اس کے جسم میں پھیل جائے گا تو وہ مر جائے گا۔ اس وقت وہ مرنا ہی چاہتا تھا۔

یہاں پھر وہ بھول گیا تھا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا یا سو گیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کتنے دن چلا' کتنی راتیں سویا یا یہ شاید ایک دو دن پہلے کی بات ہے۔ یوں ہی چلتے اور درد کو برداشت کرتے وقت گزرتا گیا اور اس کی پنڈلی سوجتی چلی گئی اور کھال اکڑتی گئی اور اس طرح پنڈلی پر ایسے زخم بن گئے جیسے کسی نے چاقو سے اس کی کھال چھیل دی ہو۔ زخم میں پیپ پڑ گئی تھی۔

میرا خیال یہ ہے کہ اُسے نہ سانپ نے کاٹا تھا نہ بچھو نے' کسی کیڑے نے کاٹا تھا۔ مگر سانپ یا بچھو اسے ڈستا تو وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ زہر خون میں شامل ہو کر دماغ میں چلا جاتا اور وہ کبھی کا مر چکا ہوتا۔

وہ چند دنوں سے اس علاقے میں گھوم پھر رہا تھا اور درختوں کے وہی پھل کھا رہا تھا جو میں نے کھائے تھے۔ پانی ندی میں سے پی لیتا تھا۔ دو روز سے وہ اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اٹھتا تھا تو زخمی پنڈلی والی ٹانگ جسم کے نیچے کھڑی نہیں ہوتی تھی۔ ذرا دباؤ پڑتا تھا تو زخم سے درد اٹھتا تھا۔ اس کا جسم اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ وہ ٹانگ کی خرابی کے علاوہ بھی چل پھر نہیں سکتا تھا۔ اس نے مجھے بار بار کہا کہ تم زندہ واپس اپنے وطن چلے گئے تو لوگوں کو میری کہانی سنانا۔ ہو سکتا ہے مجھ جیسے لوگ عبرت حاصل کریں۔ وہ کہتا تھا کہ دولت کے نشے سے بچو اور کسی شریف لڑکی پر بری نظر نہ رکھو۔

"میرے دوست!" ___ اس نے مری مری آواز میں کہا ___ "مجھ پر ایک احسان کرو۔ تمہارے پاس رائفل ہے۔ میرے سر میں گولی مار دو تاکہ یہ اذیّت ختم ہو۔ مجھے خدا کے واسطے اس اذیت سے نجات دلا دو"۔

"نہیں بھائی!" ___ میں نے کہا ___ "زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ میں تمہیں گولی مار دوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اللہ کے حکم کے خلاف ایک انسان کی جان لی ہے۔ مجھ سے یہ گناہ نہ کراؤ"۔

اُس نے میرے پاؤں پکڑ لئے۔ پھر وہی منت و سماجت اور اُس کے ساتھ آہ و زاری جیسے وہ موت کی بھیک مانگ رہا ہو۔ میں اُس کی ذرا سی بھی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے پانی مانگا تھا وہ میں نے دے دیا تھا۔ میں نے نہ جانے ابھی کتنی دور آگے جانا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ میں ندی سے اپنی بوتل پانی سے بھر لاتا ہوں اور یہ اس

کے پاس چھوڑ جاؤں گا۔

"نہیں میرے بھائی!" ___ اس نے پھر منت کی ___ "مجھے بوتل نہ دو۔ ایک منٹ کے لئے مجھے رائفل دے دو۔ میں اپنے ہاتھوں اس اذیت سے نجات پا لوں گا"۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسے جھوٹی تسلیاں دیں اور میں چل پڑا۔ وہ بلند آواز سے رونے لگا۔ میں اور تیز چل پڑا۔

"خدا کے لئے رک جاؤ" ___ اس کی آواز سنائی دی ___ "یہ بھی گناہ ہے کہ تم مجھے اس اذیت میں چھوڑے جا رہے ہو"۔

میں نہیں رکا۔ میں چلتا گیا۔

"تم کافر ہو کر مرو گے" ___ اُس نے بڑی ہی بلند آواز میں کہا۔

معلوم نہیں وہ کیا خیال تھا یا کیسا احساس تھا کہ میرے قدم میری مرضی کے خلاف رکنے لگے۔ اس کی دھاڑیں اور فریادیں اور زیادہ بلند ہو گئیں۔ میں پیچھے کو مڑا اور اُس کی طرف دیکھا۔ اس نے مایوس ہو کر سر جھکا لیا تھا۔ اُس کی ٹھوڑی اُس کے سینے کے ساتھ لگ گئی تھی۔ میری طرف اس کا بایاں پہلو تھا۔ مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ کتنی شدید اذیت اور درد کی ظالم ٹیسوں میں مبتلا ہے اور اس کا کوئی علاج نہیں سوائے اس کے کہ وہ برداشت کرتا چلا جائے اور موت کا انتظار کرتا رہے۔

مجھے اُس پر ایسا ترس اور ایسا رحم آیا کہ میں نے رائفل کا بولٹ پیچھے کر کے آگے کیا' ایک راؤنڈ چیمبر میں چلا گیا۔ میں نے رائفل کندھے سے لگائی۔ وہ مجھ سے قریباً چالیس قدم دور تھا۔ میں نے اس کے بائیں طرف سر کو شست میں لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ برما کا جنگل دھماکے سے ذرا سا لرزا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ صدیق ایک پہلو کی طرف گرا اور اُس کا جسم ساکن ہو گیا۔

میں کہہ نہیں سکتا کہ میں نے یہ نیکی کی تھی یا ایک انسان کو قتل کیا تھا۔ میں شاید برما کے جنگلوں کو' ہر وہ جگہ جہاں میں گیا تھا' بھول جاؤں گا لیکن صدیق کو نہیں بھولوں گا جو میری گولی سے مر گیا تھا یا جسے میں نے اذیت سے نجات دلائی تھی۔

صدیق کو یوں جان سے مار کر میں نے اگر نیکی ہی کی تھی تو بھی اس کا مجھ پر کوئی اچھا اثر نہ ہُوا۔ میں کچھ دیر وہیں گُم صُم کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ خیالوں کا ایک ریلا میرے ذہن میں آگیا۔

مجھے صدیق کے ماں باپ کا خیال آیا جن کا وہ لاڈلا اور نوجوان بیٹا تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ صدیق کی یہ فیملی زندہ و سلامت برما سے نکل بھی سکی تھی یا نہیں۔ مجھے شیخوں کی فیملی کا بھی خیال آیا۔ ان کی لڑکی کی آبرو تو بچ گئی تھی لیکن مجھے ایسی کوئی امید نہیں تھی کہ ان کی جانیں بھی بچ گئی ہوں گی۔ یہ دونوں خاندان راستے میں بھوک سے ہی اور تھکن سے بھی مر گئے ہوں گے۔

مجھے جب لڑکی کا خیال آیا تو یقین جانیں کہ میرے دل سے دعا نکلی کہ وہ یہیں کہیں مرجائے تو یہی اس کے لئے بہتر ہو گا۔ جاپانی فوجی کوئی اچھے لوگ نہیں تھے۔ میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ جاپانی جس علاقے پر قبضہ کرتے تھے' وہاں سے جوان لڑکیوں کو اکٹھا کر کے اپنے ساتھ مورچوں میں رکھتے تھے۔ اس لڑکی نے آگے جا کر جاپانی فوجیوں کے ہاتھ چڑھ جانا تھا۔ اس کے بعد اس کی زندگی بڑی ہی اذیت میں گزرنی تھی۔

میں نے ایک بار پھر صدیق کی لاش کو بڑے غور سے دیکھا اور اُس نے اپنے گناہوں کی جو داستان سنائی تھی وہ میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ اُسے اسی دنیا میں گناہوں کی سزا مل گئی تھی۔ میرے لئے وہ عبرت کا نشان تھا۔

جب مجھے یہ خیال آیا کہ اسے اللہ تعالیٰ نے گناہوں کی سزا دی ہے اور اسے بڑی ہی اذیت میں مبتلا کر کے مارا ہے تو میرا جسم کانپ اٹھا۔ مجھے اپنے گناہ یاد آگئے۔ تب مجھے خوف آنے لگا کہ اللہ مجھے بھی یہاں میرے گناہوں کی سزا دینے کے لئے لے آیا ہے۔

میں نے سوچا کہ کہیں پانی دیکھوں' نہا کر اپنے جسم کو پاک کروں' چند ایک نفل پڑھوں اور پھر اللہ کے حضور توبہ کروں اور گناہوں کی بخشش مانگوں لیکن یہ سوچ بھی آئی کہ اس وقت توبہ قبول نہیں ہو گی جب سزا شروع ہو چکی ہے۔ ہم لوگ کرتے بھی یوں ہی ہیں۔ جب دن اچھے ہوتے ہیں' خوشحالی اور ہر طرح کی خوشیاں میسر ہوتی ہیں تو ہم

نہ اور رسولؐ کو بھول جاتے ہیں' اور ہم توبہ اُس وقت کرتے ہیں جب ہم پر عذاب الٰہی
ل ہوتا ہے۔

مجھے واجدہ یاد آئی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کے ساتھ میری محبت پاک تھی لیکن
نے یہ تو نہ سوچا کہ وہ کسی اور کی بیوی بن چکی تھی۔ واجدہ کا یاد آنا تھا کہ مجھے اُس کا
ند آصف یاد آیا۔ میں اُسے قتل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا لیکن جب اسے اپنی آنکھوں
ے سامنے مرتا دیکھا تو میں نے دل سے ساری کدورت نکال کر اس کی جان بچالی.....
مف کو یاد کیا تو میں نے اپنے آپ میں روحانی سا سکون محسوس کیا۔ یوں لگا جیسے مجھے
ب غیبی اشارہ ملا ہو کہ تمہاری اس ایک نیکی کے بدلے اللہ نے تمہارے گناہ بخش دیے
ں۔

میں نے اپنے آپ سے کہا کہ میں توبہ نہیں کروں گا کیونکہ مصیبت کے وقت توبہ
رنا اللہ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ میں نے دل میں ایک عزم پیدا کر لیا کہ
ں آئندہ کوئی گناہ نہیں کروں گا۔

میں نے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے اور آسمان کی طرف دیکھا۔ میں نے بلند
واز سے کہا — "اے پروردگار! مجھے گناہ کرنے کے لئے زندہ نہ رکھنا۔ اگر میری
مت میں کچھ نیکیاں لکھی ہوئی ہیں تو مجھے آگے بڑھنے کی ہمت عطا کر دے۔ اگر آگے
برے لئے گناہ ہیں تو یا اللہ' مجھے یہیں فناہ کر دے"۔

یہ بالکل سچ ہے کہ بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے..... میں کون سی قسم کھا
کر آپ کو یقین دلاؤں کہ مجھے عجیب و غریب سا سکون محسوس ہُوا۔ مجھے ایک دکھ ضرور
تھا' وہ یہ کہ میرے ماں باپ میرے لئے بہت ہی پریشان ہوں گے اور جب انہیں یہ
اطلاع سرکاری طور پر جائے گی کہ آپ کا بیٹا محاذ پر لاپتہ ہو گیا ہے تو میری ماں کا ہارٹ فیل
ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ سکون محسوس ہُوا کہ اگر انہیں فوج کی طرف سے
یہ اطلاع گئی کہ میں لاپتہ ہوں تو میرے گھر والے میری سلامتی کی دعائیں کریں گے۔
ماں کی دعا تو عرش کے کنگرے ہلا دیا کرتی ہے۔ اس میں شرط یہ ہے کہ بیٹا کسی نیک کام
میں گم ہو گیا ہو۔ یہ نہیں کہ بیٹا کسی کی بیٹی کو اغوا کر کے لاپتہ ہو جائے یا چوری ڈکیتی کی
واردات کر کے مفرور ہو جائے تو ماں اس کی سلامتی کی اور پکڑے نہ جانے کی دعائیں
مانگے تو میرا خیال ہے کہ ایسی دعائیں قبول نہیں ہوا کرتیں۔ اس خیال سے ایک اور

خیال نے جنم لیا۔ وہ یہ کہ میں اگر زندہ اور سلامت انسانوں میں پہنچ گیا تو میں کوئی بدی نہیں کروں گا۔

اگر میں اپنے اُس وقت کے تاثرات بیان کرنے لگوں تو یہ تفصیلات کم از کم ایک سو صفحے سیاہ کر دیں گی لیکن میں نہیں سمجھتا کہ پڑھنے والوں کے لئے اس تحریر میں کوئی دلچسپی ہو گی۔ پڑھنے اور سننے والے تو اس انتظار میں ہوں گے کہ میں ایسی خوفناک اور دور افتادہ جگہ پہنچ گیا تھا جہاں زندگی کی نسبت موت زیادہ قریب تھی، وہاں مجھ پر کیا بیتی اور کیا واقعات پیش آئے۔ میں بہتر یہی سمجھتا ہوں کہ واقعات سناؤں۔ میں انشاءاللہ آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ واقعات تو اپنے آپ ہی ظہور پذیر ہوتے چلے گئے۔ میں اپنی زندگی کی یہ داستان سناتے ہوئے پوری کوشش کر رہا ہوں کہ کوئی روکھی پھیکی بات نہ آئے۔ میں یہ کوشش بھی کر رہا ہوں کہ پند و نصیحت یا واعظ شروع نہ کر دوں۔ بڑھاپے میں یہ بہت بڑی خامی ہے کہ انسان خود جوانی میں گناہ کرتا رہے اور ایک سے ایک بڑھ کر ذلیل حرکت کرے لیکن بوڑھا ہو کر وہ نوجوانوں کو اس طرح پند و نصیحت کرتا ہے جیسے وہ بہت بڑا درویش ہے اور اُس نے اپنی جوانی درویشی اور فقیری میں ہی گزاری تھی۔ بڑھاپے میں دوسری خامی یہ ہے کہ بوڑھا آدمی بولنا شروع کر دے تو اُسے یاد ہی نہیں رہتا کہ اُس نے چپ بھی ہونا ہے۔

میں آپ کو فضول باتیں اور بلاوجہ نصیحتیں کر کے بور نہیں کروں گا لیکن ایک بات ضرور کہوں گا۔ میں کوئی عالم فاضل یا فلاسفر تو ہوں نہیں کہ تجزیہ یا تفسیر پیش کروں، میں ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ خدا نے اپنا طریقہ کار کیوں بدل لیا ہے؟

.... میرا یہ سوال پڑھ کر مولوی صاحبان کے ماتھوں پر شکنیں پڑ گئی ہوں گی اور بعض کے منہ سے لاحول بھی نکلی ہو گی لیکن مجھ پر فتویٰ دائر کرنے سے پہلے میری بات سن لیں۔

بات یہ ہے کہ میری نوجوانی کے وقتوں میں یہ دیکھا جاتا تھا کہ کسی نے کسی کا حق مارا یا کوئی ایسا گناہ کیا جس سے دوسرے کو بہت ہی اذیت پہنچی تو گنہگار کو لوگوں کے سامنے سزا ملی۔ ایسے تین چار بندوں کو تو میں بھی جانتا ہوں اور ایسے کئی واقعات اُس وقت بنے بھی تھے۔ میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ بات ذرا لمبی ہو جائے گی لیکن ذرا غور کریں، سوچیں، تفسیریں پڑھیں، علماء سے بھی پوچھیں اور مجھے بھی بتائیں کہ یہ کیا ہے اور اس کے پیچھے خداوند تعالیٰ کی کیا قدرت ہے۔

میں اس وقت لڑکا سا تھا۔ غالباً" ساتویں یا آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ہمارے ے کے تھانے میں ایک تھانیدار آیا۔ ہمارے علاقے میں خاندانی دشمنیوں کی بنا پر قتل ی اتنی زیادہ وارداتیں ہُوا کرتی تھیں کہ قصبے کے سول ہسپتال میں تقریباً" ہر روز ایک ش یا اور بعض اوقات تین تین چار چار لاشیں ایک ہی گھر کی پوسٹ مارٹم کے لئے آیا رتی تھیں۔ یہ دیہاتی علاقے کی وارداتیں ہوتی تھیں۔ جونہی کسی واردات کی رپورٹ انے میں آتی تو تھانیدار گھوڑے پر سوار ہو کر اور اپنے عملے کو ساتھ لے کر فوراً" ردات والے گاؤں پہنچتا تھا۔ تھانیدار تفتیش کیا کرتے ہیں لیکن میں جس تھانیدار کی ت کر رہا ہوں، اس کا وطیرہ یہ تھا کہ مقتول کے گھر جا کر پہلے یہ دیکھتا تھا کہ یہاں سے کیا چھ اٹھا کر لے جا سکتا ہے۔ مثلاً" اس گھر میں اس نے بھینس دیکھی تو پوچھا کہ یہ کتنا دھ دیتی ہے۔ اگر دودھ زیادہ بتایا گیا تو یقین کریں وہ بھینس کھول کر ساتھ لے جاتا تھا۔ ی کے گھر میں ایک بھینس یا گائے دودھ والی موجود رہتی تھی۔ وہ پہلی گائے یا بھینس بیچ تا تھا۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں ہیں کہ وہ کس طرح حرام خوری کرتا تھا۔ اس کی شش یہ ہوتی تھی کہ تفتیش میں زیادہ سے زیادہ عورتوں کو شامل کر لیتا اور انہیں ڈرا مکا کر بلیک کر دیتا تھا۔

وہ انگریزوں کا دَور تھا۔ رشوت چلتی تھی لیکن یوں نہیں جس طرح آج کل پاکستان ں ہو رہا ہے کہ قتل بھی ہضم اور ڈاکے بھی ہضم۔ رشوت چھوٹی موٹی وارداتوں میں ی جاتی تھی لیکن قتل جیسے سنگین کیسوں میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ تھانیدار و رشوت دے کر چھوٹ جائے گا لیکن یہ تھانیدار مقتول کے گھر سے بھی اور جب قاتل ڑا جاتا تھا تو اُس کے گھر سے بھی بے پناہ رشوت لیتا تھا اور ان کے ہاں کوئی چیز اچھی لگتی وہ اٹھوا لاتا تھا۔ اس کی حرام خوری اور ڈھیٹ پن سارے ضلعے میں مشہور ہو گیا تھا۔

اس کے چار بیٹے تھے، بیٹی ایک بھی نہیں تھی۔ اس لحاظ سے لوگ اسے بڑا ہی ش نصیب سمجھتے تھے۔ لوگ اسے بھی اس کی خوش نصیبی کہتے تھے کہ اس قدر حرام ری کر کے بھی وہ پکڑا نہیں جاتا تھا۔ وہ اپنے علاقے کا فرعون بن گیا تھا۔ اس کے اروں بیٹے بڑے ہی خوبصورت تھے۔ غالباً" اس کی نسل کشمیر سے چلی تھی۔ بڑا بیٹا وان تھا لیکن آوارہ۔ میٹرک بھی نہ کر سکا تھا۔ باپ نے اس کی شادی طے کر دی۔ ابھی ادی کا دن مقرر نہیں ہُوا تھا کہ بیٹے کو ٹائی فائیڈ ہو گیا اور جب ٹائی فائیڈ گیا تو بیٹے کی

ٹانگیں بھی ساتھ ہی لے گیا۔ اس کی دونوں ٹانگیں پوری طرح مفلوج تو نہ ہوئیں، وہ چلتا تو تھا لیکن بڑی مشکل سے ایک کے پیچھے دوسرا قدم اٹھاتا تھا اور اس کے گھٹنے ٹکراتے تھے۔ وہ بیکار ہوگیا اور لڑکی والوں نے اسے جواب دے دیا۔

اس کے بعد جو بیٹا تھا وہ اُس وقت سترہ اٹھارہ سال کا تھا۔ پڑھنے میں وہ بھی نکما تھا۔ سکول جاتا تھا۔ میں اسی سکول میں پڑھتا تھا۔ کوئی ماسٹر اس سے کسی بھی شرارت اور کسی بھی بدمعاشی کی بازپُرس کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ ایک روز وہ اپنے گھر کوٹھے پر چڑھا ہوا تھا۔ پکی سیڑھیوں سے اترنے کی بجائے وہ بانس کی سیڑھی سے اترنے لگا تو اوپر کے ڈنڈے سے ہی اس کا پاؤں پھسل گیا۔ سیڑھی کے نیچے والے ڈنڈے کا کیل اس طرح نکلا ہُوا تھا کہ اس کی نوک اوپر کو تھی۔ یہ لڑکا اس طرح گرا کہ اس کا ایک گھٹنا اس کیل پر پڑا۔ کیل کی نوک تیز تھی اور کیل موٹا تھا۔ یہ کیل اس کے گھٹنے میں اُتر گیا اور گھٹنا اس طرح بیکار ہوگیا کہ اس کی وہ ٹانگ علاج معالجے کے بعد ٹیڑھی ہوگئی اور وہیں اکڑ گئی۔ اسے ایک طرف بیساکھی کا سہارا لینا پڑا اور وہ اس بیساکھی پر ہی چلتا تھا۔

اس سے چھوٹا بیٹا سب سے زیادہ خوبصورت تھا۔ اس کی خوبصورتی اور نقش و نگار لڑکیوں جیسے تھے اور اس کی چال ڈھال اور اس کے انداز لڑکیوں جیسے تھے۔ اسے بدکردار قسم کے دوست مل گئے۔ ان دوستوں نے اسے خوب خراب کیا۔ پھر اس کی دوستی ہمارے شہر کے ایک امیرزادے کے ساتھ ہوگئی۔ میں کن الفاظ میں آپ کو بتاؤں کہ یہ دوستی کیسی تھی۔ آپ اس سے اندازہ کرلیں کہ یہ شخص شادی شدہ تھا اور اس کی بیوی اپنے میکے جا بیٹھی تھی اور اس نے طلاق کا کیس کردیا تھا۔

پیچھے چوتھا بیٹا رہ گیا۔ وہ دس گیارہ سال کا تھا۔ ایک روز کوٹھے پر کھیل رہا تھا۔ بھاگتے دوڑتے منڈیر پر چڑھ گیا اور وہاں سے جو اس کا پیر پھسلا تو سر کے بل نیچے آیا اور جب تک اسے اٹھاتے وہ ختم ہو چکا تھا۔ یہ تھانیدار ہمارے تھانے میں ہی تھا جب اس کی ریٹائرمنٹ کے آرڈر آئے اور وہیں سے وہ سروس سے فارغ ہُوا اور اس پر بھی غور کریں کہ اتنی لمبی سروس کرکے وہ انسپکٹر بھی نہ بن سکا، سب انسپکٹری میں اسے پنشن دے دی گئی۔ اس کے بعد اڑھائی تین سال وہ ہمارے قصبے میں ہی کرائے دار کی حیثیت سے رہا۔ مجھے وجہ معلوم نہیں کہ وہ اپنے گھر کیوں نہیں گیا تھا۔ ہمارے قصبے میں جب وہ تھانیدار تھا تو لوگ اس طرح ا... حَک کر سلام کرتے تھے جیسے ہندوستان کا بادشاہ انگریز

نہیں بلکہ یہ شخص ہو۔ پنشن مل گئی تو ہمارے ہی شہر میں یہ حالت ہوگئی تھی کہ وہ لوگوں کو سلام کرتا تھا تو لوگ منہ پھیر لیتے تھے۔

میں ایسے کئی اور واقعات سنا سکتا ہوں۔ مثلاً" میرے شہر کے قریب ہی ایک گاؤں میں ایک اونچی ذات یعنی ایک راجہ صاحب نے ایک غریب آدمی کی نوجوان بیٹی کو پکڑ لیا اور فصل میں لے جاکر اسے خراب کیا۔ لڑکی نے شور شرابہ کیا۔ وہ اس کی دھمکیوں میں نہ آئی۔ اس شخص نے اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور چونکہ وہ نمبردار کے خاندان کا لڑکا تھا اس لئے اس نے دو تین آدمیوں پر شُبہ کراکے ان کو شاملِ تفتیش کرادیا۔ تھانیدار نے انہیں اس قدر اذیتیں دیں اور اتنا مارا پیٹا کہ ایک ایک مہینہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ آخر یہ خود پکڑا گیا۔

پکڑا تو گیا لیکن شہادت بڑی کمزور تھی۔ کیس چلا لیکن شہادت کمزور ہونے کی وجہ سے سیشن جج نے اسے شک کا فائدہ دے کر بری کردیا۔ لوگ جانتے تھے کہ قاتل یہی ہے اور پوسٹمارٹم میں یہ پتہ چل گیا تھا کہ اس نے قتل سے پہلے لڑکی کی آبروریزی کی تھی۔ سیشن جج نے اسے بری کردیا۔ وہ ہنسی خوشی اپنے باپ اور دیگر رشتہ داروں کے ساتھ واپس اپنے گاؤں آرہا تھا کہ راستے میں بارش شروع ہوگئی۔ یہ ایک گھنے درخت کے نیچے رک گئے۔ آسمانی بجلی گری اور گری بھی اسی درخت کے ایک ٹہن پر۔ ٹہن گرا اور ٹہن گرنے سے پہلے بجلی اس شخص پر گری۔ اس کے قریب اس کا ایک بھائی کھڑا تھا وہ بھی بجلی کی زد میں آیا اور پھر اوپر سے اتنا بڑا ٹہن ان پر گرا۔ جن لوگوں نے ان دونوں بھائیوں کی لاشیں دیکھی تھیں، وہ بتاتے تھے کہ لاشیں اس طرح جل کر کالی ہوگئی تھیں جیسے جلے ہوئے شہتیر ہوں۔

اب میں نے آپ کو صدیق کا واقعہ سنایا ہے۔ اس نے اپنے سارے گناہ مجھے سنائے اور پھر میں نے دیکھا کہ خداوند تعالیٰ نے اور خدا کے قانون نے کس طرح حرکت میں آکر اسے کیسی سزا دی۔ اس کے ٹھیکیدار باپ کو جو سزا ملی وہ بھی میں نے سنائی ہے۔ اس کے پاس حرام کی دولت تھی۔ وہ ڈاکو لے گئے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اب اپنے ملک میں دیکھ لیں۔ کون سا وہ گناہ ہے جو ہمارے ملک میں نہیں ہوتا۔ قتل اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں دیکھ لیں۔ جبری آبروریزی کے واقعات آپ سے ڈھکے چھپے نہیں لیکن یہ بھی دیکھا گیا ہے اور آپ یقیناً" مجھ سے اتفاق کریں گے کہ شریف آدمی کا جینا حرام ہوگیا ہے

اور ہر شریف آدمی اپنی عزت، اپنی جان اور اپنے مال کو غیر محفوظ سمجھتا ہے اور جو بھی سرکاری اہلکار شریف ہے اور لوگوں کے کام رشوت کے بغیر کر دیتا ہے وہ سب سے بڑا بے ایمان سمجھا جاتا ہے۔ حرامخور اپنی حرام خوری پر پردہ بھی نہیں ڈالتے، کھلے بندوں لُوٹ مار اور لُوٹ کھسوٹ کرتے ہیں اور اس کا ذکر فخر سے کرتے ہیں اور عیش موج ان کی قسمت میں جیسے لکھ دی گئی ہو۔ نہ انہیں دنیا کا قانون پکڑتا ہے نہ اللہ کا قانون.....ایسا کیوں ہے؟

○

میں وہاں سے چل پڑا۔ میں تو ایک جذبہ لے کر جا رہا تھا۔ جذبہ یہ تھا کہ انگریزوں کی بادشاہی میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میری منزل آئی این اے کا ہیڈ کوارٹر تھا جس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کہاں ہے اور کتنی دُور ہے۔ میں اب یہ دیکھ رہا تھا کہ کوئی جاپانی فوجی یا جاپانیوں کی کوئی پوسٹ نظر آئے تو میں ان کے پاس چلا جاؤں اور انہیں کہوں کہ میں آئی این اے میں شامل ہونے کے لئے آیا ہوں۔ یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس انڈین نیشنل آرمی کی حقیقت کیا ہے۔ اس کے متعلق جو باتیں سنی تھیں وہ میرے دل میں بیٹھ گئی تھیں اور جب انگریزوں کی طرف سے آئی این اے کے خلاف حکم اور ہدایات سنیں تو مجھے آئی این اے زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔

یہ تھا میرا وہ جذبہ جو مجھے اس خوفناک، پراسرار اور عجیب و غریب علاقے میں لے گیا تھا اور میں ہلکا پھلکا ہو کر اور خوش و خرم جا رہا تھا لیکن صدیق میری گولی سے مرا تو میرے ذہن میں اور میری جذباتی دنیا میں کچھ اور ہی تبدیلی آ گئی۔ یہ صحیح ہے کہ انسان کا خون ہضم نہیں ہوتا اور انسانی ضمیر قتل کے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتا۔ صدیق مجھ جیسا جوان تھا۔ اسے مار کر میرے دل پر اور میرے ضمیر پر ایسا بوجھ آ پڑا کہ میں تھکن اور کچھ مایوسی محسوس کرنے لگا۔ اپنے آپ کو بہلانے اور اس بوجھ سے آزاد ہونے کی کوشش شروع کر دی لیکن میں ناکام ہو رہا تھا۔

میں ایسے علاقے میں جا پہنچا تھا جہاں جنگ کا نام و نشان نہ تھا۔ البتہ دور بہت دور لڑاکا بمبار طیارے آتے جاتے نظر آ جاتے تھے لیکن میں اتنی دور آ پہنچا تھا جہاں توپوں کے دھماکے کسی کسی وقت سنائی دیتے تھے لیکن یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہ توپوں کے دھماکے تھے کہ میں فوجی تھا اور ان دھماکوں کو سمجھ سکتا تھا ورنہ یہ ایسے ہی تھا جیسے

کوئی بچہ نہایت آہستہ آہستہ کسی نرم چیز پر ہاتھ مار رہا ہو۔ اگر یہ توپوں کی ہی آوازیں تھیں تو ایک سو میل دور ہوں گی۔ راستے میں بڑے اونچے پہاڑ اور گھنے جنگل حائل تھے۔

جب یہ دیکھا کہ جنگ تو مجھ سے ایک سو میل سے زیادہ دور ہے تو مجھے پریشانی لگ گئی کہ میں جاپانیوں تک کس طرح پہنچوں گا۔ مجھے بہرحال آگے ہی جانا تھا۔ پیچھے آنا خطرناک تھا۔ میں اب بھگوڑا ہو چکا تھا۔ میں اگر واپس چلا جاتا تو کہہ سکتا تھا کہ گھمسان کی ایک لڑائی میں میں راستہ بھول گیا تھا لیکن میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میں آگے چل پڑا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ میں کہاں تھا۔ آج بھی اس عمر میں کبھی کبھی بچوں کی اٹلس کھول کر برما کا نقشہ دیکھا کرتا ہوں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ میں کہاں بھٹکتا رہا تھا، خیر چھوڑیئے ان باتوں کو، آیئے میں آپ کو اپنے ساتھ آگے لے چلتا ہوں۔

اب جو علاقہ میرے سامنے آیا وہ ڈراؤنا تھا۔ جنگل تو ویسا ہی تھا جس میں اب لمبے اور پھیلے ہوئے درخت تھے اور برما کے مخصوص چھوٹے درخت کچھ کم ہو گئے تھے۔ میں اس علاقے کو ڈراؤنا اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہاں جو پہاڑیاں تھیں وہ عام پہاڑیوں جیسی نہیں تھیں، بعض پہاڑیاں دیوار جیسی سیدھی کھڑی اور ان کا رنگ کالا تھا۔ ان پر کوئی ہریالی نہیں تھی۔ ان کے آگے سرسبز ٹیکریاں تھیں اور ان پر درخت بھی تھے۔

کہیں تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں ایک وسیع قلعے کی دیواروں کے نرغے میں چلا جا رہا ہوں۔ زمین ایسی کہ قدم قدم پر کھڈے تھے اور کہیں زمین ذرا اونچی اور کہیں بالکل نیچے چلی جاتی تھی۔ کچھ دور آگے جا کر میں نے محسوس کیا کہ آگے کھڈ زیادہ ہیں اور میں ٹھیک طرح چل نہیں سکوں گا۔ ایک طرف سرسبز ٹیکری تھی۔ میں اس کے ایک طرف سے گھوم کر دوسری طرف چلا گیا۔ توقع تھی کہ ادھر راستہ صاف مل جائے گا۔

ٹیکری کے اس طرف ایسی پہاڑی تھی یا اسے بلند چٹان کہہ لیں جو دیوار کی طرح بالکل سیدھی تھی اور یہ بڑی بڑی سلوں والی یعنی چوڑے پتھروں والی چٹان یا پہاڑی تھی۔ اس کا رنگ اور اس کی شکل و صورت مجھے ڈراؤنی لگی۔ میں اس پہاڑی اور ٹیکری کے درمیان جا رہا تھا تو پہاڑی میں ایک غار نظر آیا۔ میں رک گیا اور معلوم نہیں کیوں میں غار کے دہانے میں جا کھڑا ہوا۔

میں نے محسوس کیا کہ اس غار کے اندر ہلکی ہلکی روشنی موجود ہے۔ میں نے غور کیا

تو پتہ چلا کہ روشنی اس دہانے سے اندر نہیں جا رہی جس دہانے میں میں کھڑا تھا۔ غار اندر سے خاصا کشادہ ہو گیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا اندر چلا گیا۔ مجھے یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہئے تھا۔ اندر کوئی درندہ بھی ہو سکتا تھا۔ بھیڑیے ہو سکتے تھے اور سانپ بھی ہو سکتے تھے لیکن میری ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ میں آگے ہی آگے چلتا گیا۔ کچھ اور آگے گیا تو مجھے نظر آیا کہ جو روشنی میں نے پہلے محسوس کی تھی وہ غار کی دوسری طرف سے آ رہی تھی جس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ غار کا ایک دہانہ دوسری طرف بھی ہے۔ اسے غار کہہ لیں یا سرنگ کہہ لیں۔ ریل گاڑی میں سفر کرتے ہوئے پہاڑی علاقے میں آپ نے ایسی سرنگیں دیکھی ہوں گی جن میں سے ریل گاڑی گزرتی ہے۔ روشنی سے پتہ چلتا تھا کہ اگلا دہانہ بہت دور ہے اور یہ سرنگ آگے جا کر کسی طرف مڑ جاتی ہے۔ میں چلتا گیا۔ غار یا سرنگ کی چھت اتنی اونچی تھی کہ میں سیدھا چل رہا تھا یعنی جھکنے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

میرے اندازے کے مطابق میں سرنگ کے وسط تک پہنچ گیا تھا اور آگے سرنگ فراخ ہوتی چلی جا رہی تھی۔ دونوں طرفوں کے دہانوں سے جو روشنی آ رہی تھی وہ اتنی کافی تھی کہ اندر سب کچھ نظر آتا تھا۔

میں خاصا آگے چلا گیا تو اگلا دہانہ نظر تو نہیں آ رہا تھا لیکن اُدھر سے آتی ہوئی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ کچھ اور آگے یہ سرنگ اور زیادہ فراخ ہو گئی۔ مجھے دور سے ہی کچھ ہڈیاں سی پڑی نظر آئیں۔ میں آگے گیا تو یہ دو انسانی ڈھانچے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ پڑے ہوئے تھے۔ مجھ پر خوف سا طاری ہو گیا۔ پہلے تو یہ خیال آیا کہ یہاں سے بھاگ نکلوں لیکن تجسس ایسا کہ میں رک گیا اور انسان کے انجام کو دیکھنے لگا۔ معلوم نہیں یہ دونوں کب اور کس عمر میں یہاں آئے تھے۔ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ یہاں تک خود چل کر پہنچے تھے یا انہیں مار کر یہاں پہنچایا گیا تھا' کسی صورت میں یہ قتل ہوئے تھے۔

وہاں کوئی کپڑا نہیں تھا۔ ایک دو چیزیں نظر آئیں جن سے یہ ثبوت مل گیا کہ ڈھانچہ عورت کا ہے۔ چاندی کے دو رِنگ پڑے ہُوئے تھے اور چاندی کا ہی ایک کڑا پڑا ہُوا تھا اور کانچ کی چوڑیوں کے ٹکڑے بھی وہاں بکھرے ہوئے تھے۔ انہیں یہاں پڑے ہوئے اتنا زمانہ گزر گیا تھا کہ عورت کے یا مرد کے بال بھی غائب ہو چکے تھے۔ سنا ہے بال

بہت ہی لمبی مدت تک صحیح رہتے ہیں۔

میرا ذہن ان میں الجھ گیا۔ ایک کہانی میرے ذہن میں ابھرنے لگی۔ یہ محبت کی داستان کے کردار تھے۔ یہ یہاں آئے اور دیکھ لئے گئے اور انہیں یہیں قتل کر دیا گیا یا کہیں باہر انہیں قتل کر کے ان کی لاشیں یہاں پھینک دی گئیں۔ یہ خیال بھی آیا کہ یہ یہاں پہنچے اور سانپ یا کسی ایسے ہی زہریلے کیڑے نے انہیں ڈس لیا۔ بہرحال میرے ذہن میں ایک ناول کا جملہ آیا — "انہیں موت بھی جدا نہ کر سکی"۔

میری ذہنی حالت پہلے ہی بگڑ رہی تھی' ہڈیوں کے ان ڈھانچوں کو دیکھ کر ذہن بھٹک گیا۔ مجھے عائشہ یاد آئی اور پھر واجدہ یاد آئی اور میرے آنسو نکل آئے۔ میرے ذہن میں ایک سوچ یہ بھی آئی کہ ایک روز کوئی اس علاقے سے گزرے گا تو اُسے میری ہڈیوں کا پنجر نظر آئے گا اور میری طرح رک کر وہ سوچے گا کہ یہ کون تھا اور یہاں آ کر کیوں مرا!

میں نے محسوس کیا کہ غار میں جو روشنی آ رہی تھی وہ بجھتی جا رہی ہے۔ میں نے آگے اُس طرف دیکھا جس طرف دوسرا دہانہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے غار تاریک ہو گیا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ سورج غروب ہونے میں ابھی خاصا وقت تھا۔ اگر یہ رات کا اندھیرا تھا تو روشنی کو آہستہ آہستہ بجھنا چاہئے تھا یہ تو یک لخت تاریکی چھا گئی تھی۔

اچانک چیخیں سی سنائی دیں اور اس کے بعد یوں آوازیں آنے لگیں جیسے اس سرنگ یا غار کے باہر عورتیں بین کر رہی ہوں اور اونچی آوازوں میں رو رہی ہوں۔ کبھی ان کا رونا بلند ہو جاتا اور کبھی مدہم پڑ جاتا اور فوراً" ہی ان کی چیخ نما آوازیں بہت ہی بلند ہو جاتیں۔ اس کے ساتھ ہی غار میں سردی کی ایک لہر آئی کہ میرا وجود کانپ گیا۔

میں نے ایک آسیب زدہ مکان کی کہانی پڑھی تھی۔ رات کو اس مکان میں بدروحیں آتی تھیں۔ وہ نظر تو نہیں آتی تھیں' ان کی آمد اور موجودگی کا احساس اس مکان میں رہنے والوں کو یوں ہوتا تھا کہ انہیں گرمیوں میں بھی سخت ٹھنڈ محسوس ہونے لگتی تھی اور پھر دروازے کھلنے اور بند ہونے کی اور پھر ان کے رونے کی آوازیں آتی تھیں۔

وہ کہانی یاد آئی تو میں جو ایک نڈر اور دلیر جوان تھا' خوف سے کانپنے لگا۔ میں نے یقین کر لیا کہ یہ ان دونوں کی روحیں یا بدروحیں ہیں اور وہ دو ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ اور بھی بدروحیں آئی ہیں۔ میں نے یہ سنا تھا کہ کسی مظلوم کی موت ظلم و تشدد اور بے انصافی سے ہو جائے تو اُس کی روح اسی طرح بھٹکتی اور راتوں کو روتی پھرتی ہے اور لوگ

اس کی آوازیں سنتے ہیں۔ یہ بھی سنا تھا اور کہانیوں میں پڑھا بھی تھا کہ کوئی زندہ آدمی ان بدروحوں کے ہاتھ چڑھ جائے تو اُسے وہ بہت بُری موت مارتی ہیں۔

میں بدروحوں کے ہاتھوں مرنے کیلئے تیار ہو گیا۔ رائفل محض بیکار تھی۔ روح یا بدروح کو گولی سے نہیں مارا جا سکتا تھا۔

غار میں سفید روشنی دو تین بار چمکی اور پھر تاریکی چھا گئی۔ اس کے فوراً بعد گڑگڑاہٹ اور ایک دو دھماکے سنائی دیئے۔ میرا دھیان جنگ کی طرف چلا گیا لیکن جنگ اتنی تیزی سے اس طرف نہیں آ سکتی تھی۔ چیخیں اور عورتوں کا رونا پہلے جیسا تھا اور اب غار میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے روشنی اس طرح چمک کر آتی جس طرح بجلی چمکتی اور بجھ جاتی ہے۔ یہ چمک دونوں دہانوں کی طرف سے آتی تھی۔ میں نے ارادہ کیا کہ جدھر سے آیا ہوں ادھر کو ہی بھاگ جاؤں۔ میں نے ان ڈھانچوں کی توہین یا بے ادبی تو نہیں کی تھی۔ اس خیال سے میری ڈھارس بندھ جاتی تھی کہ یہ بدروحیں مجھے کچھ نہیں کہیں گی۔ میں یہ بھی فیصلہ نہ کر سکا کہ وہیں رکا رہوں یا وہاں سے نکل جاؤں۔ پھر اس خیال سے میں واپس چل پڑا کہ روحوں کو میرا وہاں کھڑے رہنا اچھا نہیں لگتا ہو گا۔

رونے اور چیخنے کی آوازیں اگلے دہانے سے آ رہی تھیں۔ میں اُس طرف چل پڑا جدھر سے داخل ہُوا تھا۔ اس رستے کو تو میں اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ اُدھر سے ہی آیا تھا۔

میں جب دہانے پر پہنچا تو پتہ چلا کہ بہت ہی تیز اور موسلادھار مینہ برس رہا ہے اور اس کے ساتھ بڑا ہی تیز طوفان چل پڑا ہے۔ یہ طوفان باد و باراں تھا۔ دہانے پر جا کر چیخیں اور زیادہ صاف سنائی دینے لگیں۔ میں نے دہانے سے ذرا آگے ہو کر دیکھا۔ بجلی بار بار چمکتی تھی جس کی چمک میں مجھے درخت نظر آ جاتے تھے۔ طوفان اس قدر تیز و تند تھا کہ درخت دوہرے ہوئے جا رہے تھے۔ تب میں نے سکون کا سانس لیا۔ یہ چیخیں اور یہ رونا تیز طوفان کا تھا۔ ہوا اس چٹانی پہاڑ کے ساتھ ٹکراتی ہوئی گزرتی تھی تو یہ چیخیں پیدا ہوتی تھیں۔

میں دہانے میں بیٹھ گیا۔ قدرت کا یہ کھیل سمجھ جانے کے باوجود میرے دل پر خوف طاری رہا۔ اچانک تیز دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں میرے قریب سے دہانے میں سے گزر کر اندر آنے لگیں۔ اُس وقت بجلی چمکی تو میں ایک بار پھر دہشت میں

مبتلا ہو گیا۔ یہ تو بھیڑیئے تھے جو طوفان باد و باراں سے بھاگ کر اس غار یا سرنگ میں پناہ لینے آئے تھے۔ بھیڑیوں سے میرا ایک مقابلہ ہو چکا تھا۔ اب میں بھیڑیوں کو اس پناہ گاہ میں خوش آمدید کہنے کو تیار نہیں تھا جہاں میں بیٹھا ہُوا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ درندے اگر بھوکے ہوئے تو پھر میری خیر نہیں۔ انہیں تو پناہ کے ساتھ ساتھ پیٹ بھرنے کو خوراک بھی مل جائے گی۔ میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ آگے کیا۔ بولٹ پیچھے کر کے آگے کیا اور ایک راؤنڈ چیمبر میں چلا گیا‘ پھر میں سرنگ کے اندر دیکھنے لگا تاکہ جونہی بھیڑیئے میری طرف آئیں میں گولی چلا سکوں۔ اندھیرا اتنا سیاہ تھا کہ اپنا آپ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

باہر اتنا زبردست طوفان اور اندر اتنے بھیڑیئے جو میں گن نہیں سکا تھا۔ سات آٹھ تو ضرور ہوں گے۔ مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ سورج ابھی ابھی غروب ہُوا ہو گا۔ اس حساب سے مجھے پوری رات ان بھیڑیوں اور دو انسانی ڈھانچوں کے ساتھ گذارنی تھی۔ یہ تو میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ یہ رونے کی آوازیں اور چیخیں بدروحوں کی نہیں تھیں بلکہ تیز و تند طوفان کی تھیں لیکن بھیڑیوں کا میں کیا کرتا۔ ہڈیوں کے ڈھانچوں نے تو مجھ پر حملہ نہیں کرنا تھا۔ مجھے پوری رات رائفل ہاتھ میں لئے تیار رہنا تھا۔

مجھے بھیڑیوں کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جیسے وہ غرغر کی زبان میں آپس میں باتیں کر رہے ہوں۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ یا خدا‘ یہ میرے متعلق گفت و شنید نہ کر رہے ہوں۔ میں نے اِدھر اُدھر زمین پر ہاتھ پھیرا تو مجھے پتھر مل گئے۔ میں نے ایمونیشن بچانے کے خیال سے اندھیرے میں ہاتھ مار مار کر چھوٹے بڑے کئی ایک پتھر اپنے سامنے اکٹھے کر لئے۔ سوچا یہ کہ بھیڑیئے میری طرف آئے تو پہلے تو انہیں پتھروں سے بھگا دوں گا۔ اگر وہ پتھروں سے نہ ڈرے تو گولی چلاؤں گا۔

○

میرے کان غار کے اندر لگے ہوئے تھے اور جب بجلی چمکتی تھی تو میں وہاں تک دیکھ لیتا تھا جہاں تک اس کی روشنی پہنچتی تھی۔ طوفانِ باد و باراں جاری رہا۔ شاید ایک گھنٹہ یا اس سے کچھ کم یا زیادہ وقت گزرا ہو گا تو طوفان کا شدت میں کمی آنے لگی اور اس کے ساتھ ہی تاریکی بھی کم ہونے لگی اور یہ دیکھ کر مجھے کچھ سکون ملا کہ ابھی دن کی یا شام کی کچھ روشنی باقی تھی۔ بجلیوں سے لدی ہوئی گھٹائیں آگے چلی گئیں تو روشنی ہو گئی لیکن

یہ روشنی ویسی تھی جیسی سورج غروب ہونے کے بعد کچھ دیر رہتی ہے۔

میرے لئے یہ فیصلہ کرنا بہت ہی مشکل تھا کہ میں بیٹھا رہوں یا نکل جاؤں لیکن وہاں سے نکل کر جاتا کہاں؟ میرے لئے کوئی اور پناہ نہیں تھی۔ اگر بارش نہ ہوئی ہوتی تو میں باہر کہیں درخت کے نیچے سو جاتا۔ اس غار میں سو جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کچھ بھیڑیئے تو آ گئے تھے، مجھے یہ خطرہ نظر آنے لگا کہ رات کو نہ جانے کتنے درندے اس پناہ میں آ جائیں۔ ان میں شیر بھی ہو سکتا تھا۔ سانپ بھی ہو سکتے تھے اور یہ تو میں نے پہلے بھی سنا تھا کہ برما کے کالے بچھو بڑے ہی زہریلے اور سانپوں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔

میرے لئے کوئی راہِ فرار نہیں تھی۔ مجھے رات وہیں گزارنی تھی۔ باہر نکلنے پر غور کیا تو وہاں یہ خطرہ تھا کہ زمین کھڈوں والی تھی اور یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کھڈے جو پانی سے بھر گئے ہیں، ان میں کون سا گہرا اور کون سا کم گہرا ہے۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ باہر کس طرح جل تھل ہو چکا ہو گا۔ یہ سب کچھ سوچ کر میں اس فیصلے پر پہنچا کہ یہیں بیٹھا رہوں، آنکھ بھی نہ جھپکوں اور رات ایسے ہی گزار دوں۔

شام کا دھندلکا تاریک ہونے لگا اور بارش تھم گئی، ذرا ذرا پھوار سی پڑ رہی تھی اور ہوا کی تیزی بھی کم ہو گئی تھی۔

بھوک نے الگ پریشان کرنا شروع کر دیا لیکن وہاں تو جان کا خطرہ تھا اس لئے بھوک پر قابو پانا کوئی مشکل نہ تھا۔ ذرا ہی دیر بعد طوفان بالکل ہی تھم گیا اور باہر خاموشی چھا گئی۔

تاریکی کچھ زیادہ ہو گئی۔ مجھے اپنے قریب ہلکی ہلکی غراہٹ سنائی دی۔ میں اتنا جانتا تھا کہ ہر درندے کی اپنی اپنی کھچار ہوتی ہے جہاں وہ رات بسر کرتا ہے اور اپنے بچوں کو وہیں رکھتا ہے۔ بھیڑیئے عموماً ایک سے زیادہ ہوتے ہیں اور ان کی ایک کھچار ہوتی ہے۔ مجھے اپنے قریب غراہٹ سی سنائی دی تو خیال آیا کہ یہ بھیڑیئے طوفان سے پناہ لینے کے لئے یہاں آئے تھے اور اب یہ اپنی کھچار میں جانا چاہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ میں چوکنا نہ ہُوا تو یہ مجھے بھی زندہ یا مردہ اپنی کھچار میں لے جائیں گے اور اس طرح ان کے رات کے کھانے کا بندوبست ہو جائے گا۔

میں نے ایک پتھر اٹھایا اور زور سے بھیڑیوں کی طرف پھینکا۔ وہ مجھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایک بھیڑیئے کی چیخیں سنائی دیں جو اس کُتے جیسی تھیں جسے پتھر لگتا ہے۔

میں نے ایک پتھر اور مارا اور اس کے ساتھ ہی مجھے ان کے دوڑتے قدموں کی ہلکی ہلکی آہٹیں سنائی دیں۔ میں نے ایک پتھر اور ان کے پیچھے پھینکا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ دوسرے راستے سے بھاگ گئے ہیں لیکن میں اپنے آپ کو پھر بھی محفوظ نہیں سمجھتا تھا۔

میں چوکنا اور بالکل بیدار رہا۔ سوچتے سوچتے ایک بات یہ بھی میرے ذہن میں آئی کہ اس ملک کے ایک بڑے حصے میں جنگ لڑی جا رہی ہے۔ وہاں کے تمام درندے اُدھر سے بھاگ کر اِس طرف آ گئے ہوں گے۔ بھیڑیوں کو تو میں دو بار دیکھ چکا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ اپنے کسی ساتھی نے بتایا تھا کہ برما کے جنگلوں میں دھاری دار شیر بھی ہوتا ہے۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ بنگال کے جنگلوں میں شیر خاصی تعداد میں پایا جاتا ہے اور اسے بنگال ٹائیگر کا نام دیا گیا ہے۔

میں خدا سے مدد مانگنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بیٹھ بیٹھ کر میں تنگ آ گیا تو اٹھ کھڑا ہُوا۔ کچھ پھرا اور پھر بیٹھ گیا۔ رات اسی طرح گزرتی چلی گئی لیکن میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ رات گذر نہیں رہی اور وقت اس غار کے اس دہانے پر آ کر رک گیا ہے اور یہ رات کبھی نہیں گزرے گی۔

○

رات گزر گئی..... اور یوں گزری جیسے عمر ہی گزر گئی ہو۔

میں نے ساری رات بیدار رہنے کی کوشش کی لیکن جوانی کی عمر تھی اور آپ جانتے ہیں کہ جوانی کی نیند پر قابو پانا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ دو مرتبہ یوں ہُوا کہ بیٹھے بیٹھے میری آنکھ لگ گئی۔ میں بتا نہیں سکتا کہ میں کتنی دیر سویا رہا، یہ بتا سکتا ہوں کہ آنکھ کھلی تو میں ہڑبڑا کر اٹھا، دل پر خوف کی گرفت تھی۔ میں نے غار کے اندر اور باہر دیکھا۔ تاریکی تھی، کچھ نظر نہ آیا۔ تیسری بار میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ رات گزر گئی ہے اور خیریت سے گزر گئی ہے۔

میں اٹھا اور پھر اس غار یا سرنگ کے اندر چلا گیا۔ ہڈیوں کے ڈھانچے اسی طرح پڑے تھے۔ میں ان کے قریب سے گزر گیا۔ آگے سرنگ دائیں کر جاتی تھی اور مزید کشادہ ہو گئی تھی۔ اگلے دہانے سے بھی روشنی آ رہی تھی۔ میں اس راستے باہر نکل گیا۔

میں آگے نہ چل سکا کیونکہ آگے کوئی پندرہ بیس گز دور ایسی ہی ایک سیاہ چٹان قلعے کی دیوار کی طرح کھڑی دور تک چلی گئی تھی اور آگے جا کا یہ دونوں چٹانیں ملی ہوئی

تھیں۔ ان کے درمیان ایک جھیل بنی ہوئی تھی۔ یہ رات کی بارش کا پانی تھا۔ میرے دائیں طرف چٹانیں کھلتی جاتی تھیں اور آگے علاقہ صاف تھا۔

میرا خیال ہے کہ میں ان چٹانوں کی ساخت اور ہیئت بیان نہیں کر سکا۔ یہ کچھ بڑے ہی قدیم قلعے کے کھنڈرات کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ میں پانی سے بچتا بچاتا ایک چٹان کے ساتھ ساتھ چلتا آگے نکل گیا۔

کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں اس سرنگ میں سے کیوں گذرا تھا تو میں کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکوں گا۔ بعض اوقات انسان کسی ایسی صورتِ حال میں آجاتا ہے کہ اس کی سوچنے کی صلاحیت دب جاتی ہے یا وقتی طور پر مرجاتی ہے اور وہ اپنے ذہن کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں ایڈونچر کی خاطر اس سرنگ میں سے گذرا تھا۔ ہو سکتا ہے میں نے شارٹ کٹ کیا ہو۔ بہرحال جو ہوا وہ یہ تھا کہ میں اس سرنگ میں سے گذرا تو ایسی دنیا میں داخل ہو گیا جس کے خدوخال بالکل ہی مختلف تھے۔

تھا تو وہ ہرا بھرا جنگل ہی' اونچے نیچے درخت بھی تھے اور ہری بھری گھاس بھی تھی لیکن اس ہریالی میں سے چٹانیں اُبھری ہوئی تھیں۔ کوئی بہت اونچی' کوئی کم اونچی کوئی گز ڈیڑھ گز ہی اونچی تھی۔ ان میں کوئی کچھ دور تک چلی گئی تھیں اور کچھ ایسی تھیں جو اطراف کو پھیلنے کی بجائے اوپر کو چلی گئی تھیں اور ان کی شکلیں عجیب و غریب تھیں' مثلاً ایک چٹان اس شکل کی تھی جیسے کوئی بوڑھا آدمی کمر دوہری کئے کھڑا ہو۔ چٹانوں کا یہ سلسلہ دور دور تک چلا گیا تھا۔ ان میں بعض سلیٹی رنگ کی تھیں اور بعض کا رنگ سیاہی مائل تھا۔ یہ ڈراؤنے سے رنگ تھے۔ میں جب ان کے درمیان میں سے گذر رہا تھا تو مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے میں چلتے چلتے سو گیا ہوں خواب دیکھ رہا ہوں۔

میں جب ان میں سے گذر رہا تھا تو بار بار یہ سوال میرے ذہن میں اٹھتا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں؟..... میرے ذہن سے صرف سوال اٹھتا تھا' جواب نہیں ملتا تھا۔ میرا دماغ میری اتنی سی راہنمائی کر رہا تھا کہ مسافر' رکنا نہیں' پیچھے کو نہیں مڑنا' آگے اور آگے چلتے چلو۔

میں حیران اس پر ہو رہا تھا کہ میں کتنے ہی دنوں سے اس علاقے میں چل رہا تھا لیکن کوئی ایک بھی گاؤں یا کوئی دو چار گھر کہیں نظر نہیں آئے تھے۔ اب وہاں کی زمین نے مجھے دھوکے دینے شروع کر دیئے۔ میں نے بیان کیا ہے کہ اس علاقے میں کس قسم کی

چٹانیں کھڑی تھیں۔ چٹانوں کا یہ سلسلہ دور دور تک بلکہ جہاں تک میری نظر جاتی تھی' پھیلا ہُوا تھا۔ میں ناک کی سیدھ جانا چاہتا تھا۔ میں نے بتایا ہے کہ بعض چٹانیں خاصی لمبی تھیں۔ میں ان کے درمیان سے گذرتا گیا اور مجھے بہت سے موڑ مُڑنے پڑے۔ کہیں دائیں اور کہیں بائیں۔

جہاں تک مجھے یاد ہے' میں مسلسل دو گھنٹے چلتا رہا۔ ایک جگہ میں نے رک کر دیکھا تو مجھے وہی چٹان اپنے سامنے' خاصی قریب نظر آئی جو میں نے پہلے بتایا ہے کہ ایک بوڑھے آدمی کی شکل کی تھی جس کی کمر دوہری تھی۔ یہ محسوس کر کے میرا دل ڈوبنے لگا کہ دو گھنٹے چل چل کر میں اُسی جگہ پہنچ گیا ہوں جہاں سے چلا تھا۔ میں اس طرح بیٹھ گیا جیسے تھک ہار کر گر پڑا ہوں۔

وہاں میرے دائیں ہاتھ ایک چٹان اس شکل کی تھی کہ ذرا اوپر جا کر اس کی سلیں آگے کو نکل آئی تھیں جیسے برآمدے کی چھت ہوتی ہے۔ نیچے اس کا فرش پتھریلا تھا اور ذرا ہموار بھی تھا۔ میں وہاں چلا گیا اور اس قدرتی فرش پر لیٹ گیا۔ وہ جگہ خشک تھی۔ لیٹنے کے لئے بہترین تو گھاس تھی لیکن بارش نے گھاس کو اتنا گیلا کر ڈالا تھا کہ اس پر بیٹھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

میں رات بھر کا جاگا اور ڈرا ہُوا تھا۔ رات میرے اعصاب کھچے تنے رہے تھے۔ میں سر میں گرانی محسوس کر رہا تھا۔ میں جوں ہی لیٹا' میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے خواب دیکھے لیکن ڈراؤنے۔ کچھ تو یاد ہی نہیں رہے۔ آج نہیں' یہ تو مجھے اگلی صبح بھی یاد نہیں رہا تھا کہ میں نے کیا دیکھا سوائے اس احساس کے کہ رات جو بھی خواب دیکھا وہ ڈرانے والا اور پریشانیوں سے بھرپور تھا۔ اسے آپ ذہنی انتشار کہہ لیں۔ صرف ایک خواب اگلی صبح بھی یاد تھا اور وہ آج بھی یاد ہے۔

خواب یہ تھا کہ آصف اور واجدہ آگے آگے اکٹھے جا رہے ہیں اور میں بہت سارے قدم دور ان کے پیچھے جا رہا ہوں۔ ایک بار آصف پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے اور واجدہ سے کچھ کہتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد واجدہ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہے تو میں اُس کے چہرے پر نفرت اور حقارت کے تاثرات دیکھتا ہوں۔ آصف نے میری طرف دیکھا تھا تو اس کے چہرے پر بھی ایسے ہی تاثرات تھے۔ میں سمجھ جاتا ہوں کہ یہ دونوں مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرے ہاتھوں کے ناخن بڑھ آئے ہیں اور میرے ہاتھ بھیڑیوں

جیسے درندوں کے ہاتھ بن گئے ہیں۔ مجھ میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ میں انسان نہیں بھیڑیا ہوں۔

میں تیز دوڑتا ہوں اور ان دونوں پر اس طرح جھپٹا مارتا ہوں کہ میرے ایک ہاتھ میں آصف کی گردن اور دوسرے ہاتھ میں واجدہ کی گردن آ جاتی ہے۔ وہ تڑپتے ہیں اور میرے ناخن اُن کی گردنوں میں اُترتے جاتے ہیں۔ میں انہیں گھسیٹ کر ایک غار میں پھینک دیتا ہوں اور آصف کو بھیڑیوں کی طرح کھانا شروع کر دیتا ہوں۔ یہاں آ کر خواب اتنا مدھم سا ہو جاتا ہے جیسے یہ منظر الجھ گیا ہو۔ جب میں اپنے آپ میں آتا ہوں تو میرے سامنے ہڈیوں کے دو پنجر پڑے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ دل پر خوف کی ایسی گرفت کہ میں نے اپنی پیشانی پر پسینے کے قطرے محسوس کئے۔ اتنی گہری نیند سو کر مجھے ذہنی اور جسمانی لحاظ سے ترو تازہ ہو جانا چاہئے تھا لیکن یہ خواب بیداری میں بھی میرے سامنے اس طرح موجود رہا جیسے یہ خواب نہیں بلکہ حقیقت ہو۔ میرا دل بیٹھتا اور ڈوبتا ہی چلا گیا۔

میں اتنا زیادہ سویا تھا کہ سورج غروب ہونے کے لئے مغرب کی طرف افق کے قریب چلا گیا تھا۔ میں نے بہتر یہ سمجھا کہ رات یہی گذاری جائے۔ میں نے دو گھنٹے چل کر دیکھ لیا تھا۔ پہلے سنایا ہے کہ دو گھنٹوں کی مسافت کے بعد میں اُسی جگہ آ گیا تھا جہاں سے چلا تھا۔ اب ایک اور رات آ رہی تھی۔ میں جو دن کے وقت بھٹک گیا تھا' رات کو بھی بھٹک جاتا اور صبح تک نہ جانے کہاں جا نکلتا اور کس وقت یا کس دن مجھ پر یہ انکشاف ہوتا کہ میں تو آگے جانے کی بجائے بہت ہی پیچھے آ گیا ہوں۔

اب بھوک قابلِ برداشت نہیں رہی تھی۔ میں اس علاقے کے درختوں کو دیکھنے لگا' شاید کوئی درخت پھل دار ہو۔ کچھ دور تک چلا گیا۔ کوئی ایک بھی درخت ایسا نظر نہ آیا جو میری بھوک کی تسکین کر سکتا۔ جھاڑی بیر بھی نہیں تھے۔ میں نے قوتِ ارادی سے کام لینے کی کوشش اس طرح کی کہ عہد کر لیا کہ بھوک کو مرتے دم تک برداشت کروں گا اور جب دیکھوں گا کہ اب بھوک نے نزع کے عالم تک پہنچا دیا ہے تو درختوں کے پتے اور گھاس کھا لوں گا۔

میں واپس اپنی جگہ کی طرف چل پڑا تو اُس وقت مجھے پرندوں کا خیال آیا۔ وہاں پرندوں کی تو کوئی کمی نہیں تھی لیکن میں بتا نہیں سکتا کہ مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا تھا کہ

پرندہ کھایا جا سکتا ہے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ پرندوں کو درختوں میں چہچہاتے سنا تو میں نے اپنے آپ سے کہا کہ میں کیسا احمق ہوں کہ اللہ نے یہ خوراک میرے لئے درختوں پر بٹھا رکھی ہے اور میں ادھر توجہ ہی نہیں دے رہا۔ میری اصل حماقت تو یہ تھی کہ میں خوش تو ہو گیا کہ پرندے میرے پیٹ کی آگ بجھا سکتے ہیں لیکن میں انہیں کھاؤں گا کیسے؟ میرے پاس ماچس نہیں تھی۔ میں سگریٹ پیتا ہی نہیں تھا۔ بہرحال اُس وقت ایک ہی خیال تھا کہ کوئی موٹا تازہ پرندہ مارو اور کھا جاؤ۔

میں نے درختوں میں منہ اوپر کر کے دیکھنا شروع کر دیا۔ وہاں چھوٹی چھوٹی چڑیاں تھیں۔ ان میں کچھ رنگ برنگی بھی تھیں۔ ایک چڑیا پر ایک راؤنڈ ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں دیکھ یہ رہا تھا کہ کوئی موٹا پرندہ نظر آ جائے۔ ایک درخت پر ایک پرندہ آ بیٹھا۔ معلوم نہیں وہ کبوتر تھا' فاختہ تھی یا ہلکے رنگ کا کوا تھا یا آپ یوں کہہ لیں کہ وہ کوا بھی تھا' فاختہ بھی اور کبوتر بھی تھا۔ میں نے رائفل سیدھی کی اور اس پر گولی چلا دی۔ پرندہ پتھر کی طرح نیچے آ پڑا۔ میں نے دوڑ کر اسے اٹھا لیا۔

میں نے بڑی تیزی سے اس کے پر نوچنے شروع کر دیے۔ تب میرے دماغ میں آئی کہ میں اسے کھاؤں گا کیسے؟ آگ تو ہے نہیں۔ میرے ہاتھ رک گئے اور تیز اور تکلیف دہ ہو گئی تھی۔

میں نے اس کے پر نوچنے کی بجائے اس کی کھال اتارنی شروع کر دی۔ کھال اُتر گئی تو میں نے اس کے سینے پر دانت گاڑ دیے۔ زیادہ گوشت پرندے کے اسی جگہ ہوتا ہے۔ اس کا گوشت ابھی کچھ گرم تھا کیونکہ یہ تازہ تازہ مرا تھا۔ دانت گاڑنے میں مجھے جبڑوں کا پورا زور لگانا پڑا۔ لیکن میں انسان تھا' درندہ تو نہیں تھا کہ آسانی سے گوشت نوچ کر کھا لیتا۔ میرے دانت گوشت میں اُتر تو گئے لیکن بوٹی نوچ نہ سکے۔ میں نے جھولے میں سے چاقو نکالا اور اس سے پرندے کے سینے کی ایک چھوٹی سی بوٹی کاٹی اور منہ میں ڈال کر چبانے لگا۔ چبائی نہیں جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ذائقہ بُرا لگا۔ ابکائی آ گئی۔ میں نے بوٹی منہ سے نکال لی اور سوچنے لگا کہ یہ کھاؤں یا پھینک دوں۔ کوئی اور چارہ کار نہ تھا۔ میں نے چاقو سے اس بوٹی کا اتنا سا ٹکڑا کاٹا جتنا قیمے کا ایک ذرہ ہوتا ہے۔

یہ ذرا جتنا گوشت منہ میں ڈالا اور تھوڑا سا چبا کر نگل لیا۔ پھر اس بوٹی کے اسی طرح کے ٹکڑے کرتے کرتے منہ میں ڈالتا گیا اور چبا چبا کر نگلتا گیا۔ میں اب انسان کم اور

درندہ زیادہ بن گیا تھا۔ جی کڑا کر کے اس کچے گوشت کا ذائقہ برداشت کرتا رہا اور کھاتا رہا۔ میں یہ بھی سوچتا رہا کہ ایسے ہی کروں گا اور آہستہ آہستہ کچے گوشت کا عادی ہو جاؤں گا۔

میں نے پرندے کے ایک طرف کے سینے کا پورا گوشت کھا لیا اور اس طرف کی ٹانگ کا گوشت بھی حلق سے اتار لیا۔ باقی جو پرندہ بچا تھا وہ جھولے میں ڈال لیا۔

یہ میں ہی جانتا ہوں کہ کچے گوشت کو اور اس کے ذائقے کو میں نے کس طرح برداشت کیا تھا۔

میری بھوک پوری طرح تو نہ مٹی لیکن اس کی شدت میں خاصی کمی آ گئی۔ یوں کہہ لیں کہ میرا معدہ مجھے پریشان کرنے کی بجائے یہ گوشت ہضم کرنے میں مصروف ہو گیا۔ مجھے غنودگی محسوس ہونے لگی۔ سو جانے کو جی چاہتا تھا لیکن یہ خیال آ گیا کہ میں نے کچا گوشت کھایا ہے، اگر میں سو گیا تو معدہ اسے ہضم نہیں کر سکے گا۔ میں نے جسم کو متحرک رکھنا ضروری جانا۔ میں نے رائفل وہاں رکھی جہاں میں دن بھر سویا رہا تھا اور فوجیوں کی طرح تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد ٹانگیں تھکنے لگیں اور ادھر سورج غروب ہو گیا تو میں سونے والی جگہ آ گیا اور بیٹھ گیا آپ نے فوجیوں کو کینوس کی بنی ہوئی بیلٹ، ایمونیشن کے پوچ، جھولا اور بوتل وغیرہ پہنے ہوئے دیکھا ہو گا۔ اسے ہم فوجی زبان میں چمڑا کہا کرتے تھے۔ یہ ساری چیزیں ایک دوسری سے ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ میں نے یہ چمڑا اتار کر رکھ دیا اور لیٹ گیا۔ تھکن کا یہ حال کہ لیٹا اور سو گیا۔

معلوم نہیں رات کتنی گذری تھی کہ مجھے اپنے قریب کچھ آوازیں اور آہٹیں سی سنائی دیں جن سے میں جاگ اٹھا۔ ان دنوں راتیں تاریک ہوتی تھیں، چاند رات کے پچھلے پہر اوپر آتا تھا۔

چاند افق سے اٹھ رہا تھا۔ اتنی سی روشنی ہو گئی تھی کہ چند قدموں تک دکھائی دیتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ دو بھیڑیئے یا گیدڑ کچھ گھسیٹ کر لے جا رہے ہیں۔ میں نے ادھر دیکھا جہاں اپنا چمڑا رکھا تھا۔ چمڑا وہاں نہیں تھا۔ اچانک خیال آیا کہ جھولے میں میں نے آدھا پرندہ رکھا تھا۔ انہوں نے اس کی بو سونگھی اور آ کر دیکھا کہ یہاں گوشت ہے۔ گوشت جہاں تھا وہاں سے تو وہ نکال نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے پورے کا پورا چمڑا منہ میں لیا اور گھسیٹ کر لے جا رہے تھے۔ وہ مجھ سے پندرہ بیس قدم دور چلے گئے تھے۔

میں نے ان پر راؤنڈ ضائع نہ کیا بلکہ رائفل اٹھا کر ان کی طرف دوڑ پڑا۔ یہ میری حماقت تھی۔ اگر وہ بھیڑیئے ہوتے تو مجھے اپنے شکار کے قریب نہ آنے دیتے، مجھ پر حملہ کر دیتے لیکن انہوں نے چمڑا وہیں پھینکا اور بڑی ہی تیزی سے بھاگ اٹھے۔ تب میں سمجھا کہ یہ بھیڑیئے نہیں گیدڑ تھے اور گیدڑ میں ایک ہی وصف کام کا ہوتا ہے کہ وہ بھاگ اٹھنے میں بڑا ہی تیز ہوتا ہے۔ سلطان ٹیپو شہید نے ویسے ہی نہیں کہہ دیا تھا کہ گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہوتی ہے۔

مجھے ان گیدڑوں پر غصہ آنا چاہئے تھا۔ غصہ نہیں تو جھنجلاہٹ تو لازمی تھی، لیکن میری ہنسی نکل گئی اور پھر میں نے جو ہنسنا شروع کیا تو ہنستا ہی چلا گیا اور پھر اپنے آپ ہی میرے قہقہے گونجنے لگے۔ ایسا کیوں ہُوا، کیسے ہُوا، میں بتا نہیں سکتا سوائے اس کے کہ میں قہقہے ہی لگاتا رہا اور میں نے عجیب و غریب قسم کا سکون محسوس کیا اور یہ بھی محسوس کیا کہ میرا پیٹ بھر گیا ہے اور اب بھوک مجھے پریشان نہیں کرے گی۔

میں نے پہلے یہ بات کہی تھی کہ میں کوئی عالم فاضل اور فلاسفر نہیں کہ یہ کہانی پڑھنے اور سننے والوں کو پند و نصیحت کروں لیکن میں ایک بات ضرور کہوں گا۔ وہ یہ ہے کہ کتنی ہی مشکل اور مصیبت کیوں نہ آ پڑے، اس کی ہنسی اڑائیں اور منہ بسور کر اور ذہن اور دل پر دکھ اور درد کا بوجھ ڈال کر ماتم کی تصویر نہ بن جائیں بلکہ اس مشکل اور مصیبت کا سامنا کریں، تجزیہ کریں، یہ دیکھیں کہ یہ حالات کیوں پیدا ہوئے ہیں پھر آپ دیکھیں گے کہ آپ کو کوئی نہ کوئی حل مل ہی جائے گا، کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔ بھلا وہ کوئی جگہ تھی جہاں میں نے قہقہے لگانے شروع کر دیئے تھے؟ اگر کوئی اس حالت میں مجھے وہاں دیکھتا تو وہ دور سے ہی پرے چلا جاتا اور کہتا کہ یہ کوئی فوجی پاگل ہو گیا ہے، اس کے قریب نہ جاؤ ورنہ یہ مار ڈالے گا۔ میں آپ کو کس طرح بتاؤں کہ اس ہنسی اور ان قہقہوں نے مجھے اگلے دن کے سفر کے لئے تر و تازہ کر دیا۔

میں نے اپنا چمڑا فولڈ کر کے اپنے نیچے رکھ لیا تاکہ اب گیدڑ اسے گھسیٹ کر نہ لے جا سکیں۔ میں پھر سو گیا۔

○

مجھے سورج کی کرنوں نے جگایا۔ میں اٹھ بیٹھا اور سب سے پہلے یہ جائزہ لیا کہ رات کو میں نے جو کچا گوشت کھایا تھا، اس کا کیا بنا۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ اگر یہ

گوشت ہضم نہ ہُوا ہوتا تو میرے معدے میں درد اٹھتا یا کوئی اور علامت ظاہر ہوتی لیکن کچھ بھی نہ ہُوا۔

میں نے باقی آدھا پرندہ جھولے سے نکالا۔ چاقو بھی نکالا اور کل کی طرح قیمے جیسی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کاٹ کر منہ میں ڈالتا' چباتا اور نگلتا گیا۔ انسان اپنے آپ کو جیسا فریب بھی دینا چاہے دے سکتا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو یہ دھوکہ دیا یا اپنے آپ کو قائل کیا کہ یہ تو بڑا ہی مزے دار گوشت ہے اور میں کبھی انسانوں میں یا گھر میں پہنچ گیا تو وہاں بھی کچا گوشت ہی کھایا کروں گا۔ اس سوچ نے یا اس خود فریبی نے مجھے بہت فائدہ دیا۔ میرے معدے نے سارے کا سارا گوشت بخوشی قبول کر لیا۔

اس پرندے کی ہڈیاں گیدڑوں کے لئے وہیں پھینک کر میں چل پڑا۔ میں وہ مسافر تھا جسے صرف یہ علم تھا کہ اس کے سفر کا مقصد کیا ہے لیکن منزل کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ کیا تھی اس مسافر کی منزل؟ کتنی دور؟ کس سمت؟..... کچھ علم نہیں تھا۔ میں ایک بار پھر ان بکھری ہوئی چٹانوں میں سے گذر رہا تھا۔

میں کسی بستی یا کسی اکیلے دکیلے انسان کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔ میں کسی کو یہ بتا کر کہ میں کہاں جانا چاہتا ہوں' راستہ معلوم کرنا چاہتا تھا' لیکن نہ کوئی اللہ کا بندہ نظر آتا تھا نہ کوئی گاؤں۔

اب کے میں ان چٹانوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکا نہیں' آگے نکل گیا۔ یہ علاقہ بھی عجیب و غریب تھا۔ میں ایسے علاقے کا رہنے والا ہوں جہاں صرف کھیتیاں ہموار ملتی ہیں لیکن وہ بھی کوئی ٹکڑا نیچے کوئی ٹکڑا اوپر لیکن باقی علاقہ ہموار نہیں۔ کھڈ' نالے' گھاٹیاں اور ٹیلے اور کہیں سلوں والی چٹانیں۔ یہ ہے میرا علاقہ لیکن میں برما کے جس علاقے میں جا رہا تھا وہ پُراسرار سا اور خوابوں جیسا علاقہ تھا۔

میں اب ایک ایک دن کی روداد نہیں سناؤں گا' اب میں تین چار دن آگے آپ کو لے چلتا ہوں۔ یہ تین دن یا چار دن' شاید پانچ دن گذر گئے ہوں' ایسے ہی گذرے کہ میں چلتا رہا رکتا رہا اور راتوں کو سوتا رہا اور ایک آدھ پرندہ مار کر کھاتا رہا اور پانی پیتا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں کتنے دن اور کتنی راتیں چلتا رہا تھا۔

میں گھوڑا نہیں تھا اور میں موٹر کار بھی نہیں تھا کہ میں اتنے سارے دنوں میں میل ہا میل مسافت طے کر جاتا۔ میں آگے دیکھتا تھا پھر چلتا تھا اور جوں جوں وقت گذرتا جا رہا

تھا میں ٹانگیں گھسیٹتا تھا اور اس طرح تھکن کی وجہ سے میری رفتار کم ہوتی جا رہی تھی۔ ایسے بھی ہُوا کہ میں چلا کم اور آرام زیادہ کیا۔ اپنے دل کو یہ کہہ کر بہلایا کہ آئی این اے کے ہیڈ کوارٹر تک نہ پہنچ سکا تو یہی کافی ہے کہ میں جنگ سے نکل آیا ہوں اور اب یہ کہنے کے قابل ہو گیا ہوں کہ میں انگریزوں کی خاطر نہیں لڑا تھا۔

اُس وقت تو خواب و خیال میں بھی نہیں آیا تھا کہ ایک دن ہم آزاد ہوں گے اور آزاد بھی یوں کہ اپنی اسلامی مملکت بنا لیں گے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے وہ دن بھی دکھا دیا کہ میں فخر سے کہہ رہا ہوں کہ میں انگریزوں کے لئے نہیں لڑا تھا اور جب میں لڑا تو اپنے مسلمان بھائیوں کی آزادی کے لئے لڑا اور اپنی جان کی بازی لگا کر لڑا۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ میں کون سے مسلمان بھائیوں کی بات کر رہا ہوں؟..... وہ انڈونیشیا کے مسلمان تھے جو اُس وقت ولندیزیوں کے غلام تھے۔ ان مسلمانوں نے جو جنگِ آزادی لڑی' الحمدللہ' اس میں میں بھی شریک تھا..... یہ ولولہ انگیز داستان آگے چل کر سناؤں گا۔

میں ایک صبح جاگا۔ وہ رات بڑ کی قسم کے ایک درخت کے نیچے گذاری تھی۔ میں اٹھا اور حسبِ معمول سمت کا اندازہ کر کے چل پڑا۔ دو روز پہلے ایک خاص قسم کے درخت مل گئے تھے جو پہلے بھی ملے تھے۔ ان کے ساتھ انجیر کی قسم کا پھل لگتا تھا اور اس کا ذائقہ ذرا میٹھا اور ٹھیک ٹھاک تھا۔ میں نے اس پھل سے اپنا جھولا بھر لیا تھا۔ چلتے چلتے یہ پھل کھاتا رہا۔ اب میں خاصی اونچی زمین پر چل رہا تھا جو ڈھلان کی شکل میں دور تک چلی گئی تھی اور مجھے یوں نظر آ رہا تھا کہ جیسے یہ زمین جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے دریا شروع ہوتا ہے یعنی وہاں دریا کا کنارہ تھا۔ درخت اور دیگر سبزا اتنا زیادہ تھا کہ وہاں سے اچھی طرح نظر نہیں آتا تھا کہ وہ دریا ہی ہے یا ویسے ہی تھوڑا سا پانی اکٹھا ہو گیا ہے۔

میں وہاں سے خاصا دور تھا اور میں جس راستے پر جا رہا تھا وہ پھر چھوٹی بڑی چند ایک چٹانوں میں چلا گیا تھا۔ میں اسی طرف سے دریا تک پہنچ سکتا تھا' اگر وہ واقعی وہی دریا تھا۔ میں نے جس سمت جانا تھا اس سمت دریا کا آ جانا میرے لئے اچھا شگون نہیں تھا۔ میں دریا کو عبور نہیں کر سکتا تھا۔ بہرحال میں چلتا گیا اور آگے زمین کی ڈھلان تو ختم ہو گئی لیکن مجھے قدرتی تالاب نظر آنے لگے۔ آگے پھر ایک اونچی ٹیکری آ گئی۔ یہ ٹیکری میرے راستے میں آتی تھی۔ میں اس کے دامن کے ساتھ ساتھ دائیں طرف چل پڑا۔ میں

پچیس گز جا کر اس ٹیکری میں اس طرح شگاف تھا جیسے اسے انسانی ہاتھوں نے توڑا یا کھودا ہے اور راستہ بنایا ہے لیکن یہ شگاف قدرتی تھا۔

میں اس شگاف تک پہنچا اور اس میں سے گزرنے لگا۔ ٹیکری اچھی خاصی چوڑی تھی۔ میں شگاف کے وسط تک گیا ہوں گا کہ مجھے کسی بچے کی یا عورت کی چیخیں سنائی دیں جو قریب نہیں تھیں لیکن کوئی ایسی دور بھی نہیں تھیں۔ مجھے رک کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنا اور کہیں چھپ کر دیکھنا چاہئے تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ یہ میرے لئے خطرناک بھی ہو سکتا تھا لیکن انسانی فطرت کے مطابق یوں ہُوا کہ یکے بعد دیگرے تین چار چیخیں سنائی دیں تو میں اُس طرف دوڑ پڑا۔

میں نے رائفل فائر کے لئے تیار کر لی اور اس شگاف میں سے نکل کر آگے گیا تو ادھر منظر ہی کچھ اور تھا۔ تھوڑی سی جگہ دائرے میں درخت تھے۔ بیلوں جیسے پودے بھی تھے اور ان کے درمیان پانی جمع تھا۔ یہ قدرتی تالاب تھا۔ ایک جگہ سے کنارہ اونچا نہیں بلکہ زمین کے ساتھ ملا ہُوا تھا۔ اس تھوڑی سی جگہ کوئی پودا نہیں تھا بلکہ جگہ کچھ اس طرح خالی تھی جیسے انسانوں نے خود یہ جگہ کسی مقصد کے لئے بنائی ہو۔

اس خالی جگہ میں نے ایک عورت کو دیکھا جو پیٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی' اس کے بازو آگے کو تھے اور وہ گھاس کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے کو پانی کی طرف سرک رہی تھی اور اس کے منہ سے جگر پاش چیخیں نکل رہی تھیں۔

میں سمجھ گیا کہ اسے کوئی آبی جانور یا درندہ پانی میں کھینچ رہا ہے اس کی ایک ٹانگ کنارے پر تھی۔ میں جہاں تھا وہاں سے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اسے کیا چیز گھسیٹ رہی ہے۔ مگرمچھ ہی ہو سکتا تھا لیکن مگرمچھ ہوتا تو اس کا منہ صاف نظر آتا' اور پھر مگرمچھ اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ گائے اور بیل تک کو ٹانگ سے پکڑ کر پانی میں گھسیٹ لیتا ہے' یہ تو کمزور سی عورت تھی۔

میں جتنا تیز دوڑ سکتا تھا دوڑا اور عورت تک پہنچا۔ میں نے ایک عجیب چیز دیکھی' وہ اژدھا تھا جس نے اس عورت کا ایک پاؤں ٹخنے سے اوپر تک منہ میں لے رکھا تھا اور اسے گھسیٹ رہا تھا۔ اژدھا کا سر اور اس کے پیچھے تقریباً دو فٹ یا اڑھائی فٹ جسم پانی سے باہر تھا۔ میں نے رائفل سیدھی کی اور سر کے نیچے نشانہ لے کر گولی چلائی۔ فاصلہ بہت تھوڑا تھا جسے فوجی زبان میں پوائنٹ بلینک رینج کہتے ہیں۔ میں نے تیزی سے

بولٹ پیچھے اور آگے کر کے دوسری گولی چلا دی۔ اژدھا کا منہ کھل گیا اور وہ پانی میں چلا گیا۔

عورت بڑی تیزی سے اٹھی اور چند قدم دوڑ کر بیٹھ گئی اور اپنا دایاں پاؤں دیکھنے لگی۔ اژدھا کے اگلے اور لمبوترے دو دانت اس کی ٹانگ میں اُتر گئے تھے۔

زخمی اژدھا نے پانی میں جو اودھم مچایا وہ دیکھنے والا تھا۔ کبھی تو سر کی طرف سے آدھا اوپر آ جاتا اور وہاں سے گرتا اور کبھی دم کی طرف سے پانی کی سطح پر آتا اور گرتا۔ وہ تڑپ رہا تھا لیکن میں نے اس سے توجہ ہٹا لی اور اس عورت کے پاس چلا گیا۔ اژدھا نے زندہ نہیں رہنا تھا۔

اب اس عورت کو دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ تو پندرہ سولہ سال کی لڑکی ہے۔ اس کے خدوخال بتا رہے تھے کہ وہ برمی ہے۔ رنگ گورا اور اچھی خاصی خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کے ٹخنے کے اوپر ایک جگہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے کندھوں پر دوپٹہ تو نہیں' چوڑا سا ایک رومال تھا جو میں نے تہہ کر کے اس کے زخم پر باندھ دیا اور اس سے اردو میں پوچھا کہ وہ کہاں سے آتی ہے اور اُس کا گھر کہاں ہے۔ یقین جانئے' میں اُسے اس ویرانے میں اور اس پُراسرار علاقے میں خواب و خیال کی کوئی چیز یا کسی مری ہوئی عورت کی بدروح سمجھتا تھا۔ وہاں آبادی تو کوئی تھی نہیں۔

اُس نے میرے منہ کی طرف دیکھا اور سر ہلایا جس کا مطلب غالباً" یہ تھا کہ وہ میری زبان نہیں سمجھتی۔ اس نے اپنی زبان میں کچھ کہا اور ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے ایک بار پھر پانی کی طرف دیکھا۔ وہاں اب خاموشی تھی۔ اژدھا مر گیا ہو گا۔ میں نے لڑکی کو بازو سے پکڑا تو میں نے اُس کے چہرے پر خوف کا تاثر دیکھا۔ ایک خوف تو صاف ظاہر تھا جو اس اژدھا کا تھا لیکن اس کا بدلا ہُوا تاثر صاف بتا رہا تھا کہ وہ مجھ سے ڈر رہی تھی کہ میں فوجی ہوں اور میں اُس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کروں گا۔ میں نے اسے تھپکی دی اور اس طرح کا اشارہ کیا کہ میں تمہیں گھر پہنچا دوں گا۔

وہ اٹھ کر چل تو پڑی لیکن زخمی ٹانگ سے لنگڑا رہی تھی۔ میں نے اسے پوچھے بغیر اٹھایا اور کندھے پر ڈال لیا۔ اس نے اپنی زبان میں کچھ بولنا شروع کر دیا۔ شاید یہ کہہ رہی ہو گی کہ میں اژدھا سے تو بچ نکلی ہوں اور ایک فوجی درندے کے ہاتھ چڑھ گئی ہوں اور شاید وہ میری مِنت سماجت کر رہی تھی کہ میں اُسے چھوڑ دوں۔ میں نے اُس کی ایک

نہ سنی اور کچھ دور جا کر اس سے اشارے میں پوچھا کہ اس کا گھر کہاں ہے۔

وہاں کچھ اونچی ٹیکریاں تھیں۔ اُس نے اشارہ کیا کہ اس طرف چلنا ہے۔ میں نے اُسے نیچے اتار دیا تھا۔ اُس کی مزاحمت کے باوجود میں نے اُسے پھر اٹھا لیا۔ یہ نہ سمجھیں کہ وہ نوجوان اور خوبصورت لڑکی تھی اس لئے میں اسے اٹھاتا پھرتا تھا' وہ زخمی تھی اور اس قدر دہشت کی ماری ہوئی کہ اس کا سارا وجود کانپ رہا تھا' اور اُس کی معذوری یہ کہ اس کی ٹانگ زخمی تھی اور وہ چل نہیں سکتی تھی۔

کچھ آگے گئے تو وہاں ذرا بلند ایک ٹیکری تھی جو کچھ آگے جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ ذرا آگے ایک اور ٹیکری شروع ہو جاتی تھی اور وہ بلندی پر جا کر اچھی خاصی اونچی ہو گئی تھی۔ ان دونوں ٹیکریوں کے درمیان خاصا چوڑا راستہ تھا۔ میں جب وہاں پہنچا اور اس راستے سے اندر دیکھا تو میری عقل دنگ رہ گئی۔

یہ دونوں ٹیکریاں نئے چاند کی شکل کی تھیں۔ ان کے دائیں اور بائیں خاصی دور دور چٹانیں تھیں اور ان کے درمیان خاصا علاقہ ہموار تھا۔ وہاں میں نے جھونپڑوں کی ایک بستی دیکھی۔ یہ تمام جھونپڑے بانسوں کے بنے ہوئے تھے۔ ان کے فرش بھی بانسوں اور لکڑی کے تھے اور ہر جھونپڑے کے نیچے موٹے بانسوں کے ستون تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ ہر جھونپڑا بانسوں کے ستونوں پر کھڑا تھا۔

برما اور اردگرد کے علاقوں میں دیہاتیوں کے جھونپڑے اسی طرح کے ہوا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی بلکہ اب بھی یا بھی یہ وجہ ہے کہ بارشیں زیادہ ہوتی تھیں اور پانی جمع ہو جاتا تھا۔ میں جھونپڑوں کی ساخت وغیرہ کو تو آگے چل کر بیان کروں گا۔ یہ میرے لئے ایک عجیب چیز تھی' ابھی آپ اس لڑکی کی بات سن لیں۔

جھونپڑوں کے باہر کچھ عورتیں' کچھ بچے اور کچھ آدمی گھوم پھر رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے میری طرف دیکھا اور سب کو بتایا۔ تمام لوگ دوڑے آئے اور میرے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ میں نے لڑکی کو اُتارا۔ لڑکی نے انہیں اپنی زبان میں روتے ہوئے بتایا کہ اس کے ساتھ کیا بیتی ہے اور میں اُسے کس طرح بچا کر لے آیا ہوں۔

ایک عورت دوڑتی آگے آئی اور اس لڑکی کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ اس کی ماں تھی۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو میری زبان سمجھ سکے لیکن ایک ایسا نکل ہی آیا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اُردو بولتا تھا جس سے اس کا مطلب واضح ہو جاتا تھا۔ اس نے

ے پوچھا کہ میں کہاں سے آیا ہوں اور کہاں جا رہا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ یہ میں
میں بتاؤں گا' پہلے اس لڑکی کی مرہم پٹی کا کوئی بندوبست کرو۔ زخمی لڑکی کو ایک خوشی
اس کی تھی کہ وہ اژدھا کے منہ سے نکل کر آئی تھی۔ اسے ایک خوشی اور بھی ملی
کہ میں فوجی ہو کر اُسے اُس کے گاؤں میں لے آیا تھا اور اس کے ساتھ وہ
نہیں کیا تھا جس کی اُسے توقع تھی۔

خوشی تو مجھے ملی تھی کہ میں اس جنگل بیابان میں انسانوں میں کھڑا تھا اور مجھے ایک
ل گئی تھی۔ میرے پاس رائفل تھی' ایمونیشن تھا اور میں طاقتور تھا اس لئے میں
لوگوں پر حکم چلا سکتا تھا جو میں نے نہیں چلایا تھا۔ وہ تو میرے آگے بچھے جاتے تھے۔

میں بہت سے لوگوں کے نرغے میں کھڑا تھا۔ وہ سب مجھے حیرت زدگی کی کیفیت میں
رہے تھے کہ میں اتنا بہادر ہوں کہ میں اس لڑکی کو اژدھا کے منہ میں سے نکال لایا
۔ کسی کی آواز آئی جو میں نہ سمجھ سکا۔ اس آواز پر تمام لوگ پیچھے ہٹ گئے اور
وں نے راستہ بنا دیا۔ میں نے پہلے تو یہ سمجھا کہ انہوں نے میرے لئے راستہ بنایا ہے
میں ان کے جھونپڑوں میں چلوں لیکن میں نے دیکھا کہ ایک آدمی چلا آ رہا تھا جس
لمبا چغہ پہن رکھا تھا' اس کے سر پر پگڑی تھی اور پگڑی پر رومال ڈالا ہوا تھا جو
دھوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اُس شخص کی چھوٹی چھوٹی سیاہ داڑھی تھی اور وہ کوئی عالِم
لگتا تھا۔ میں نے دور سے ہی دیکھ لیا کہ یہ شخص برمی نہیں بلکہ پنجابی یا پٹھان ہے'
رہو سکتا ہے ہندوستان کے کسی اور شمالی صوبے کا ہو۔

میں اُس کی طرف بڑھا۔ اس کا احترام میرا فرض تھا۔ میں نے قریب جا کر دونوں
اُس کی طرف بڑھائے تو اُس نے بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے اپنا دایاں
ذرا سا آگے کیا۔ میں نے اُس کا وہ ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ میں نے
ھا کہ اس نے ذرا سی بھی گرمجوشی کا اظہار نہ کیا۔ اس کا ہاتھ یوں تھا جیسے میں نے کوئی
جان چیز پکڑ لی ہو۔

"کون ہو؟" اس نے مجھے کوئی مشکوک آدمی سمجھ کر پوچھا۔ "کہاں سے آئے
؟"

"آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں فوجی ہوں" میں نے کہا۔ "اگر آپ مجھے کہیں بٹھائیں گے تو
کی بات سناؤں گا..... آپ بولتے تو اردو ہیں لیکن لب و لہجہ پنجابی ہے۔ میں بھی

پنجاب کا رہنے والا ہوں"۔

میں نے خاص طور پر محسوس کیا کہ یہ شخص مجھے دیکھ کر خوش نہیں ہُوا اور یہ مجھ پر غالب آنا چاہتا ہے۔ میں آپ کو کچھ باتیں آگے چل کر بتاؤں گا' مثلاً" یہ کہ پانی میں جو اژدھا تھا یہ کیسا تھا اور یہ اژدھا کیسے ہوتے ہیں اور پھر ان جھونپڑوں کی اور اس لڑکی کی کچھ باتیں سنانے والی ہیں' یہ سب آگے چل کر سناؤں گا' اس وقت میں اس شخص کی صرف اتنی سی بات بتاؤں گا کہ اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور سب سے الگ لے گیا۔

"میری بات غور سے سن لو فوجی بھائی!" —— اُس نے ایسے لہجے میں کہا جیسے یہاں کی حکمرانی اسی شخص کے ہاتھ میں ہو —— "تم اگر بھگوڑے فوجی ہو تو ہوش میں رہنا' میں تمہیں کسی بھی وقت اندر کرا سکتا ہوں۔ اگر میرے اشاروں پر چلو گے تو عیش اور موج کرو گے۔ میں آج رات تمہیں اپنے ہاں مہمان رکھوں گا اور ساری بات بتا دوں گا"۔

مجھے یہ شخص بہت ہی برا لگا۔ اُس کے بولنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ مجھے اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور گھور کر دیکھا۔

"میں نے آپ کا احترام کیا ہے" —— میں نے کہا —— "کوشش کریں کہ آپ کا احترام میرے دل میں قائم رہے۔ میں بڑی دور کی منزل کا مسافر ہوں۔ اگر آپ میرے راستے میں آئے تو میں بتا نہیں سکتا کہ میں کیا کر گذروں گا"۔

اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی..... یہ مسکراہٹ مسرت کی نہیں تھی' اس مسکراہٹ کے معنی کچھ اور تھے۔ میں نے اُس کی مسکراہٹ کا چیلنج قبول کر لیا۔

کے اِرد گرد گاؤں والوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔

لڑکی "اتنی گرمی نہ کھاؤ میرے دوست!" —— اُس نے کہا —— "ہم دونوں پردیسی ہیں۔ کیوں نہ ہم دوستوں کی طرح رہیں..... میرے ساتھ آؤ' اس بے چاری لڑکی کا زخم دیکھ لیں اور اس کی مرہم پٹی کا بندوبست کر دیں"۔

اُس نے میرا ایک بازو پکڑا اور اپنے ساتھ لے کر چل پڑا۔ اسے کسی نے آتا دیکھ لیا تو اس نے ہجوم کو بتایا۔ ہجوم نے بڑی تیزی سے اسے راستہ دے دیا۔ لڑکی زمین پر بیٹھی ہوئی تھی اور اُس نے اپنا ٹخنہ پکڑا ہُوا تھا۔ یہ عالم قسم کا آدمی اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کی ٹانگ ذرا اٹھا کر زخم دیکھنے لگا۔ میں نے بھی پہلی بار اس کے زخم کو غور سے دیکھا۔ اژدھا کے دانت چار پانچ جگہوں پر گہرے اتر گئے تھے اور وہاں سے خون نکل رہا تھا۔

اس عالم صورت آدمی نے برمی زبان میں کچھ کہا۔ دو آدمی لڑکی کو اٹھا کر دوڑ پڑے۔ میں جان گیا کہ لڑکی کی مرہم پٹی ہو گی اور ان لوگوں کے پاس اس کا کچھ نہ کچھ انتظام ہو گا۔

میں نے خاص طور پر نوٹ کیا کہ لوگ اس عالم کو یوں دیکھ رہے تھے کہ جیسے وہ کوئی پیر یا پیغمبر ہو اور آسمان سے اُترا ہو۔ اس نے ان لوگوں سے کچھ کہا پھر ان میں سے ایک آدمی کو بلا کر اس کے ساتھ کوئی بات کی اور پھر میری طرف متوجہ ہُوا۔

"آؤ چلیں" —— اُس نے مجھے کہا —— "تم نے کچھ کھایا پیا تو نہیں ہو گا..... میں جانتا ہوں کہ تم بھوکے ہو"۔

"خاک کھایا تھا!" —— میں نے کہا —— "مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ آخری بار ڈھنگ کا کھانا کب کھایا تھا"۔

وہ مجھے اپنے ساتھ ایک جھونپڑے کی طرف لے جا رہا تھا۔

"میں تمہیں کھانا کھلاؤں گا" —— اس نے کہا اور میرا نام پوچھا۔

میں نے اسے اپنا نام بتایا اور یہ بھی بتایا کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں۔ میں نے اس سے اس کا نام پوچھا اور یہ بھی پوچھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔

"میرا نام سمیع اللہ ہے" ___ اس نے کہا ___ "لیکن تم مجھے یاحضرت کہہ کر پکارا کرو گے"۔

اس نے ایک قصبے کا نام بتایا جو پنجاب کا ایک قصبہ ہے۔ وہ اس قصبے کا رہنے والا تھا۔ میں نے اُس کا نام صحیح بتا دیا ہے لیکن اس قصبے کا نام نہیں لکھوں گا کیونکہ اُس میں ایک مصلحت ہے۔

"میں آپ کو یاحضرت کیوں کہوں گا؟" ___ میں نے کہا ___ "اگر میں آپ کو سمیع اللہ صاحب کہہ کر پکاروں تو اس میں کیا خرابی ہو گی؟"

"مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں" ___ اس نے جواب دیا ___ "لیکن یہاں لوگ مجھے یاحضرت ہی کہتے ہیں"۔

ہم اس کے جھونپڑے تک پہنچ چکے تھے۔ یہ جھونپڑا بھی زمین سے کم و بیش ایک گز اونچے لکڑی کے پلیٹ فارم پر بنا ہوا تھا۔ اس کی دیواریں اور چھتیں بانسوں اور لکڑی کی تھیں۔ چھتیں مخروطی تھیں۔ ان پر گھاس پھونس کے اوپر مٹی کا لیپ کیا ہوا تھا۔ وہاں زیادہ تر جھونپڑے اسی قسم کے تھے یعنی سب کی ساخت ایسی ہی تھی۔ لکڑی کی سیڑھیاں تھیں۔ ہم دونوں ان سیڑھیوں پر چڑھ کر کمرے میں داخل ہوئے۔

اندر سے جھونپڑا صاف ستھرا اور اس طرح سجا سجایا تھا کہ دیواروں پر رنگ برنگے کپڑے یعنی چادریں لٹک رہی تھیں۔ اُن پر بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ فرش پر کھجور کے پتوں والی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ دو بان کی چارپائیاں رکھی تھیں۔ ایک ایک دیوار کے ساتھ اور دوسری دوسری دیوار کے ساتھ۔ ان پر بستر بچھے ہوئے تھے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اس کمرے میں رہنے والا آدمی شائستہ ہے اور صاف ستھرا رہنا جانتا ہے۔

اس جھونپڑے کے دو کمرے تھے۔ میں نے خود ہی کواڑ کھول کر دوسرے کمرے میں جھانکا وہاں کوئی چارپائی نہیں تھی' دو بڑے ٹرنک پڑے ہوئے تھے اور ٹین کا ایک سوٹ کیس بھی رکھا تھا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور پہلے کمرے میں آ گیا۔

"رائفل رکھ دو" ___ اس نے ایسے لہجے میں کہا جس میں اپنائیت اور دوستی کا رنگ تھا ___ "یہ بوٹ اتارو۔ میں تمہیں اپنے کپڑے دوں گا۔ ابھی ایک آدمی آتا ہے' میں تمہیں اُس کے ساتھ غسل کے لئے بھیجوں گا۔ پہلے غسل کر لو پھر کھانا کھا لینا"۔

میں نے فوجی بوٹ اتار دیئے' جرابیں بھی اتاریں اور اتنے میں ایک ادھیڑ عمر برمی

اندر آیا۔ سمیع اللہ نے اسے برمی زبان میں کچھ کہا۔ یہ ذرا لمبی ہدایت تھی جو وہ اس آدمی کو دے رہا تھا اور وہ آدمی ذرا سا جھکا ہوا سر ہلا رہا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ میں سمجھ رہا ہوں۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور میں سمیع اللہ کے کہنے پر اٹھا اور اس برمی کے ساتھ باہر نکل گیا۔

وہ مجھے جھونپڑے کی دوسری طرف لے گیا جہاں جھونپڑے کے قریب ہی دو درخت تھے۔ درختوں کے ساتھ ترپال سا بندھا ہوا تھا اور اُسی ترپال کو چاروں طرف تان کر غسل خانہ بنایا گیا تھا۔ وہاں ایک کنستر رکھا تھا جو پانی سے بھرا ہوا تھا۔ صابن بھی رکھا تھا۔ میں نے ترپال کی اوٹ میں یعنی اس غسل خانے کے اندر جا کر وردی اتاری اور نہانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس برمی نے ہاتھ ترپال کے اندر کر کے پانی سے بھرا ہوا ایک اور کنستر اندر رکھ دیا۔ میں جب نہا رہا تھا تو مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری وردی میں سے اور میرے جسم سے بھی بدبو آ رہی ہے۔ اس سے پہلے میں نے یہ بدبُو محسوس نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اس بدبُو کو ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا۔ قبول کرنے کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہ تھا۔ اب پانی ملا اور صابن بھی مل گیا تو میں نے اپنے جسم سے پسینہ مل مل کر دھویا اور میرا جسم ہلکا پھلکا ہو گیا۔ وہ گرمیوں کا موسم تھا۔ اس علاقے میں حبس زیادہ تھا۔

میں نہا چکا تو ایک طرف دیکھا۔ ترپال کی بنی ہوئی دیوار پر کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ یہ کپڑے برمی نے رکھے تھے۔ ان کپڑوں میں تولئے کی قسم کا ایک کپڑا تھا جس سے میں نے جسم پونچھا اور کپڑے پہنے۔ ایک پاجامہ تھا اور ایک قمیض۔ غسل خانے سے نکلا تو باہر ایک چپلی پڑی ہوئی تھی۔

○

مجھے آج تک یاد ہے کہ جب میں نے چپلی پہنی تو اپنی ایک حماقت کا خیال آ گیا۔ وہ یہ کہ میں اپنی رائفل بمعہ ایمونیشن کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ میں بتا چکا ہوں کہ اس شخص سمیع اللہ نے مجھے دھمکی دی تھی اور میں نے دھمکی کا جواب دھمکی سے دیا تھا۔ وہ تو ان لوگوں کا یاحضرت بنا ہوا تھا۔ اگر وہ میری رائفل اور ایمونیشن پر قبضہ کر لیتا تو میں تو مارا ہی گیا تھا۔ میں نہتہ کیا کر سکتا تھا۔ یہ سوچ آتے ہی میں بڑی تیزی سے اس کے

جھونپڑے میں جا پہنچا۔

یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہُوا کہ رائفل اسی جگہ پڑی تھی جہاں میں نے رکھی تھی اور میرا چمڑا ابھی فرش پر پڑا ہُوا تھا۔ میں نے پاؤچ دیکھے' ایمونیشن ان کے اندر پڑا ہُوا تھا' پھر یہ دیکھ کر مجھے اور سکون ملا کہ سمیع اللہ لیٹا ہوا تھا۔

"نہا کر جسم کچھ ہلکا ہُوا یا نہیں!" ــــ سمیع اللہ نے دوستانہ سے لہجے میں کہا۔

میں نے اسے بتایا کہ طبیعت ہلکی پھلکی اور بشاش ہو گئی ہے۔ اس نے کہا کہ کھانا آتا ہی ہو گا۔

تھوڑی ہی دیر بعد کھانا آگیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہُوا کہ تہذیب و تمدن سے اتنی دور جنگل کے اس گاؤں میں میرے لئے جو کھانا آیا وہ بڑی اچھی پلیٹوں میں تھا اور پانی شیشے کے گلاس میں آیا تھا۔ کھانا لانے والے نے پلیٹیں چارپائی پر رکھ دیں۔ کھانا دیکھ کر میری بھوک اور تیز ہو گئی۔ اگر وہاں یا حضرت نہ ہوتا تو میں اس کھانے پر جانوروں کی طرح ٹوٹ پڑتا۔ میں نے اپنے اوپر جبر کر کے شائستگی کا مظاہرہ کیا۔ ایک پلیٹ میں اُبلے ہوئے چاول تھے' دوسری میں تلی ہوئی مچھلی کے دو ٹکڑے تھے اور تیسری میں مچھلی کا سالن تھا۔

چمچ نہیں تھا اس لئے میں نے ہاتھوں سے چاول کھانے شروع کر دیے۔ اس دوران میں سمیع اللہ نے کچھ باتیں کیں لیکن میں کھانے میں اس قدر محو تھا کہ اس کی بات کا خیال ہی نہ کیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مجھے ایک مدت بعد ڈھنگ سلیقے کا کھانا ملا تھا۔ میں نے بڑی تیزی سے پلیٹیں صاف کر ڈالیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے غنودگی آنے لگی۔ سمیع اللہ نے آواز دی تو وہ برمی جو کھانا لایا تھا دوڑتا ہُوا کمرے میں آیا۔ سمیع اللہ کے اشارے پر وہ پلیٹیں اٹھا کر چلا گیا۔

"اب کچھ اپنے بارے میں بتاؤ" ــــ سمیع اللہ نے پوچھا ــــ "مجھے اپنا دشمن نہ سمجھنا اور کوشش کرنا کہ ہم دونوں دوست بن جائیں"۔

"میں اپنے بارے میں سب کچھ بتاؤں گا" ــــ میں نے کہا ــــ "جو کچھ بتاؤں گا وہ سو فیصد سچ ہو گا' ذرا سا بھی جھوٹ نہیں ہو گا..... آپ نے مجھے کہا تھا کہ میں آپ کے اشاروں پر ناچوں تو میں عیش موج کروں گا' آپ نے یہ کہا تھا کہ آپ مجھے اندر کرا سکتے ہیں..... میں اپنے بارے میں ایک ضروری بات پہلے ہی بتا دیتا ہوں کہ میں نے کبھی کسی کا رعب قبول نہیں کیا اور میں نتیجے کی پروا نہیں کیا کرتا۔ اگر آپ کو میری دوستی قبول ہے تو مجھ سے بہتر دوست آپ کو آج تک نہیں ملا ہو گا"۔

میں بول رہا تھا لیکن میں نے محسوس کیا جیسے میں نشے میں ہوں یا مجھ میں بولنے کی طاقت نہیں رہی۔ میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ سونے کا وقت نہیں تھا' ابھی تو سورج بھی غروب نہیں ہُوا تھا۔

"ابھی رہنے دو" ــــ سمیع اللہ نے کہا ــــ "سو جاؤ..... بہت تھکے ہوئے ہو..... جاگو گے تو باتیں کریں گے۔ تم اب میرے ساتھ رہو گے"۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے اس کی پوری بات نہیں سنی تھی' وہ بول ہی رہا تھا کہ میں گہری نیند سو گیا۔ میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ میری رائفل کمرے میں پڑی ہے۔ اگر سوچ بھی لیتا تو بھی بیکار تھا۔ میں رائفل کو کہاں چھپا سکتا تھا۔ بہرحال نیند کا ایسا غلبہ ہُوا کہ مجھے اپنے نفع نقصان کا کچھ ہوش نہ رہا۔



آنکھ کھلی تو کمرے میں دیے کی روشنی تھی۔ یہ دیا ٹین کے ڈبے میں سے بتی نکال کر بنایا گیا تھا۔ سب سے پہلی چیز جو میں نے دیکھی وہ ایک دونالی بندوق تھی جو کمرے کے ایک کونے میں رکھی ہوئی تھی۔ اس کے قریب دیوار کے ساتھ ایک بیلٹ لٹک رہی تھی جس میں بندوق کے کارتوس تھے۔ یہ بندوق میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ بندوق دیکھتے ہی مجھے اپنی رائفل کا خیال آیا۔ سمیع اللہ کمرے میں نہیں تھا۔ میں تیزی سے اٹھا اور اپنی رائفل دیکھی۔ رائفل وہیں پڑی تھی جہاں میں نے رکھی تھی۔

میں نے جب دیکھا کہ رائفل وہیں پڑی ہے تو مجھے یہ خیال آیا کہ سمیع اللہ اگر میرے ساتھ کوئی گڑبڑ یا ہیرا پھیری کرنا چاہتا تو وہ میری رائفل اور ایمونیشن غائب کر دیتا۔ وہ کمرے میں نہیں تھا۔ میں جھونپڑے سے باہر نکل گیا۔ سارے گاؤں پر خاموشی طاری تھی۔ وقت کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ اُس زمانے میں گھڑی کسی کسی فوجی کے پاس ہُوا کرتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق رات آدھی گزر گئی تھی۔ میں اِدھر اُدھر دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ آگیا۔

"جاگ اٹھے؟" ــــ اس نے پوچھا ــــ "اگر بھوک لگی ہے تو کھانا منگوا دیتا ہوں"۔

"نہیں!" — میں نے کہا — "بے وقت کھانا کھایا تھا۔ پیٹ اتنا بھرا ہوا ہے کہ میں اُس میں اور کچھ نہیں ٹھونسنا چاہتا..... معلوم نہیں وقت کیا ہوا ہو گا؟"

ہم کمرے میں چلے گئے۔ اس نے کلائی اوپر کر کے وقت دیکھا۔ اس کے پاس گھڑی تھی۔ رات کے ساڑھے دس کے لگ بھگ وقت تھا۔

"اب بتاؤ تم یہاں تک کس طرح آن پہنچے ہو؟" — اس نے اپنی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے ساری بات سنا دی۔ میں نے جس طرح آصف کو بچایا تھا وہ بھی اسے سُنایا اور یہ بھی کہا کہ آصف اس لڑکی کا خاوند ہے جس کی میرے ساتھ محبت تھی۔ یہ بھی بتایا کہ آصف نے مجھے قتل کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا لیکن میں نے اسے موت کے منہ سے نکال لیا اور زندگی کی طرف بھیج دیا۔

"لیکن اب تم جا کہاں رہے تھے؟" — اس نے پوچھا۔

میں نے اسے وہی جواب دیا جو اب تک لکھ چکا ہوں اور آپ پڑھ چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ میں نے اُسے بتایا کہ میں انگریزوں کی غلامی سے نکل کر اُس جگہ جا رہا ہوں جہاں ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لئے ایک فوج تیار ہو رہی ہے۔

"وہ کیسی فوج ہے؟" — اس نے پوچھا — "اور وہ فوج کون تیار کر رہا ہے؟"

میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ وہ فوج جاپانی تیار کر رہے ہیں اور اس فوج میں وہ ہندوستان کی فوج کے جنگی قیدیوں کو شامل کر رہے ہیں۔ اس نے یہ تفصیل حیرت سے سنی۔ اسے بالکل معلوم نہیں تھا کہ جاپانی انڈین نیشنل آرمی کی ایک فوج بنا رہے ہیں اور انڈین آرمی میں سے مجھ جیسے فوجی بھگوڑے ہو کر اس میں شامل ہو رہے ہیں۔

"ہوش کی بات کرو میرے بھائی!" — سمیع اللہ نے کہا — "لوگ فوجیوں کو جو فوجی بیوقوف کہتے ہیں وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ تم جاپانیوں کو نہیں جانتے۔ تم وہاں جاؤ گے تو جاپانی تمہیں جنگی قیدی بنا لیں گے اور پھر تمہیں محنت اور مشقت کا کام دے کر بھوکا مار ڈالیں گے..... یہ بتاؤ کہ یہ نرالی فوج ہے کہاں؟ کیا تمہیں وہ جگہ معلوم ہے؟"

"وہ جگہ تو مجھے معلوم نہیں" — میں نے جواب دیا — "میں جاپانیوں کے کسی بھی مورچے میں پہنچ گیا تو انہیں بتاؤں گا کہ میں انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہونے کے لئے آیا ہوں، پھر وہ خود ہی مجھے وہاں تک پہنچا دیں گے"۔

"تمہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ تم اس وقت کہاں ہو" — سمیع اللہ نے کہا — "تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ جاپانیوں کے مورچے کہاں ہیں۔ وہ یہاں سے بہت دور ہیں۔ تم پاپیادہ، بھوکے پیاسے وہاں تک زندہ پہنچ ہی نہیں سکو گے۔ یہی ایک خطہ ہے جس میں ہم آرام اور سکون سے رہ رہے ہیں۔ یہ خطہ جنگ سے محفوظ ہے"۔

"پھر مجھے آپ ہی کچھ بتائیں" — میں نے کہا — "میری ذہنی حالت یہ ہو گئی ہے کہ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اپنی پلٹن سے نکلے ہوئے کتنا عرصہ گزر گیا ہے۔ اگر میں واپس جاتا ہوں تو میرا کورٹ مارشل ہو سکتا ہے۔ لڑائی سے بھاگنا ایسا جرم ہے جس کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے اور عمر قید تو ضرور ہی دیں گے"۔

"اگر تم میری بات مان لو تو زندہ رہ سکو گے" — اس نے کہا — "بات اتنی سی ہے کہ میرے پاس رک جاؤ اور جب جنگ ختم ہو جائے گی تو پھر دیکھیں گے کہ تم واپس جاؤ تو بہتر ہے یا یہیں رکے رہو"۔

"آپ کے پاس رک کر کیا کروں گا؟" — میں نے کہا۔

"یہ ہے وہ بات جو میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں" — اس نے کہا — "سب سے پہلے تو تمہیں مجھ سے پوچھنا چاہئے تھا کہ میں کون ہوں اور میں ان لوگوں میں کس طرح آیا ہوں اور کس طرح ان لوگوں کے دلوں پر حکومت کر رہا ہوں"۔

"میرے پوچھے بغیر ہی آپ بتا دیں تو کیا یہ بہتر نہیں ہو گا؟" — میں نے کہا۔

"یہ تو میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں" — سمیع اللہ نے کہا — "میں پندرہ سولہ سال سے رنگون میں رہ رہا تھا۔ وہاں میری اپنی دکان تھی جس میں عورتوں کا سامان رکھا تھا۔ میری دکان کی چوڑیاں مشہور تھیں۔ اُس کے علاوہ عورتوں کی زیب و آرائش اور بناؤ سنگھار کی اشیاء بھی میری دکان سے ملتی تھیں۔ اب میں جو بات بتانے لگا ہوں اس پر یقین کرنا۔ میری بجائے اگر یہ بات تمہیں ان لوگوں میں سے کوئی بتاتا تو زیادہ بہتر تھا۔ میں اپنی زبان سے یہ کہتا اچھا نہیں لگتا کہ میں خدا کا برگزیدہ آدمی ہوں اور خدا نے میرے ہاتھ میں ایسی طاقت دے دی ہے کہ میں سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کر سکتا ہوں"۔

"آپ بات کریں" — میں نے کہا — "مجھے آپ پر اعتماد ہے۔ کسی اور کو درمیان میں لانے کی کیا ضرورت ہے"۔

"بات یہ ہے میرے دوست!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "سات ساڑھے سات سال گزر گئے ہیں۔ ایک رات ایک بزرگ صورت' سفید ریش خواب میں نظر آئے۔ اُن کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو میں نے کبھی کسی انسان کی آنکھوں میں نہیں دیکھی۔ یوں لگتا تھا جیسے دو ستارے چمک رہے ہوں۔ چہرے پر ایسا نور جو مجھے خواب میں بھی محسوس ہو رہا تھا کہ یہ خداوند تعالیٰ کا نور ہے۔ ان کی سفید داڑھی میں بھی کوئی ایسی بات تھی کہ مجھ پر طلسماتی سا اثر ہُوا۔ داڑھی کیا تھی ریشم کے تار تھے۔ میں عجیب و غریب سے جنگل میں جا رہا تھا کہ وہ میرے راستے میں آئے اور مجھے روک کر پوچھا' جانتے ہو میں کون ہوں؟ میں نے کہا' نہیں محترم بزرگ' میں ایک اجنبی صورت کو کیسے جان سکتا ہوں۔ غیب سے آواز آئی' اے خوش قسمت انسان! یہ حضرت شاہ سلیمان علیہ السلام ہیں۔ میں ایسا مرعوب ہُوا کہ ان کے آگے جھک گیا۔ انہوں نے مجھے کندھوں سے تھام کر اٹھایا اور فرمایا' خدا کی ذات کے سوا کسی کے آگے نہ جھک۔ ہم نے تمہیں اپنا خلیفہ منتخب کر لیا ہے۔ تم جانتے ہو کہ تمام جنّات ہمارے مرید ہیں بلکہ ہمارے قبضے میں ہیں۔ ہم نے چار جنّات تمہارے غلام بنا دیے ہیں۔ تم اب لوگوں کی مشکلیں آسان کیا کرو گے لیکن کسی سے تم ایک دانہ بھی صلے کے طور پر قبول نہیں کرو گے..... یہ کہہ کر حضرت شاہ سلیمان علیہ السلام غائب ہو گئے اور میری آنکھ کھل گئی.....

"آنکھ کھلی تو میرا سارا وجود پسینے سے تر تھا اور میری زبان پر کلمہ طیبّہ کا وِرد تھا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں مجھے ایک دیوار پر چھت کے قریب ستارہ چمکتا نظر آیا جس کی کرنیں سیدھی چمکیلی لکیروں کی طرح کمرے میں ہر رخ پر جا رہی تھیں۔ میں فوراً" اٹھا' بتی جلائی' وضو کیا اور دو رکعت نفل نماز پڑھی۔ اس کے بعد مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے یہ میں نہیں ہوں۔ میرا وجود بدل گیا تھا یا اسی وجود میں جو روح تھی وہ بدل گئی تھی"۔

"گستاخی نہ ہو تو میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ خدا کو آپ کی کون سی نیکی اچھی لگی تھی جس کے صلے میں آپ کو خدا نے یہ بشارت دی تھی؟"

"یہ تو میں نہیں بتا سکتا" ـــــ اس نے جواب دیا ـــــ "خدا کے دل کے بھید کوئی نہیں بتا سکتا۔ میں اپنے متعلق اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ حتی الامکان گناہ نہیں کیا۔ میری

کان میں ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت عورت آتی تھی۔ ان میں ہندو بھی ہوتی تھیں' سکھ بھی' عیسائی اور بدھ بھی۔ میری شکل و صورت اور جسم دیکھ لو۔ کیا تم مجھ میں مردانہ حسن اور کشش محسوس نہیں کرتے۔ بعض خوبصورت لڑکیاں مجھ میں ایک تو اس لئے دلچسپی لیتی تھیں کہ میں خوبرو جوان ہوں اور دوسرے اس لئے کہ میرے پاس عورتوں کی ہی زیب و زیبائش کا سامان ہوتا تھا۔ وہ مجھ سے مفت مال کی توقع رکھتی تھیں۔ میں ایسی لڑکیوں کے ساتھ دوستی لگا سکتا تھا لیکن میں نے اپنا دامن پاک رکھا۔ میرا خیال ہے کہ یہی ایک وصف تھا جو خدا نے دیکھا اور مجھے یہ بشارت دی۔ اتنی زیادہ جذباتی اور اتنی زیادہ پُرکشش اور حسین اشتعال انگیزی سے بچنا ناممکن ہوتا ہے لیکن میں نے اپنے کردار اور ایمان کو قائم اور مستحکم رکھا"۔

"یہ میں تسلیم کرتا ہوں" ـــــ میں نے کہا ـــــ "اللہ کی دَین ہے' جِسے چاہے عطا کرے"۔

"تم میری ہر بات نہیں سمجھ سکو گے" ـــــ اس نے کہا ـــــ "حقیقت تو یہ ہے کہ میں خود اس کیفیت کو نہیں سمجھ سکتا جو خواب کے اگلے دن مجھ پر طاری ہو گئی تھی۔ میں اپنے آپ کے لئے ہی اجنبی ہو گیا تھا۔ میں صاف طور پر محسوس کرنے لگا تھا کہ میرے اندر کوئی طاقت آ گئی ہے۔ میری دکان میں ایک عورت آیا کرتی تھی۔ مسلمان تھی اور پنجاب کی رہنے والی تھی۔ اُس کی عمر 35 سال تھی اور ابھی تک بے اولاد تھی۔ امیر کبیر خاوند کی بیوی تھی۔ وہ چونکہ میری مستقل گاہک تھی اس لئے اُس کے ساتھ سلام دعا کی حد تک بے تکلفی ہو گئی تھی۔ میں اس کے متعلق جانتا تھا کہ بے اولاد ہے۔ مجھے جس رات حضرت شاہ سلیمان علیہ السلام نے اپنا خلیفہ مقرر کیا' اس سے تین چار روز بعد وہ میری دکان میں کچھ چیزیں لینے کے لئے آئی.....

میں نے اسے یہ چیزیں دے کر اور پیسے لے کر پوچھا کہ اس نے اپنا ڈاکٹری معائنہ کرا لیا ہے کہ نہیں۔ اس نے بتایا کہ اس کا اپنا بھی اور اس کے خاوند کا بھی میڈیکل ٹسٹ ہو چکا ہے اور دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ میں کوشش کے بغیر ہی مراقبے میں چلا گیا۔ میں نے سنا تھا کہ مراقبہ کیا ہوتا ہے لیکن مراقبے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ سال ہا سال کے ریاض کے بعد انسان کو مراقبے کی کیفیت اپنے اوپر طاری کرنے میں کامیابی حاصل ہوتی ہے لیکن میں نے کوئی کوشش نہ کی اور مجھے یوں محسوس ہُوا کہ دنیا سے میرا

تعلق کٹ گیا ہے اور میں ہوں اور یہ عورت ہے۔ مجھے اشارے سے ملے اور اس کے بعد میں اس دنیا میں واپس آگیا اور مجھے پتہ چلنے لگا کہ میں دکان میں ہوں اور یہ بازار ہے اور یہ عورت میری گاہک ہے.....

"میں نے اس عورت سے کہا کہ ایک سال بعد وہ بچے کو جنم دے گی۔ وہ مسکرائی اور بولی' آپ کی تسلی کا بہت شکریہ' دعا کریں۔ مجھے جو اشارہ ملا تھا وہ میں نے کاغذ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر منتقل کر دیا۔ یہ خانے سے تھے اور معلوم نہیں وہ کیا طاقت تھی جو مجھ سے ہر خانے میں ایک حرف اور کسی خانے میں ایک لفظ لکھاتی گئی۔ یہ ایک تعویذ یا نقش بن گیا۔ میں نے اس عورت سے کہا کہ یہ نقش ایک بوتل میں ڈال لے اور بوتل میں کم از کم ایک پیالی پانی ڈال لے۔ پھر ہر روز صبح نہار منہ بسم اللہ پڑھ کر صرف ایک گھونٹ پانی اس بوتل میں سے ہر روز پیئے۔ وہ مجھ سے یہ کاغذ لے تو گئی لیکن اُس کے چہرے سے بددلی اور مایوسی ٹپکتی تھی.....

"وہ تقریباً" ایک مہینے بعد آئی۔ اب اس کے چہرے پر حیرت تھی۔ اس نے کہا کہ اس میں ماں بننے کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ آتی رہی اور پھر اس کے جسم کو دیکھ کر ہی پتہ چل جاتا تھا کہ یہ ماں بننے والی ہے۔ وہ ایک بیٹے کی ماں بن گئی.....

"اس ایک سال کے دوران میں مَیں نے کچھ اور لوگوں کی مرادیں بھی پوری کیں اور بعض کی مشکلات آسان کر دیں۔ میں کسی سائل سے کچھ بھی نہیں لیتا تھا۔ میرے ذہن میں صرف خدا کی خوشنودی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں میری شہرت دُور دُور تک پہنچ گئی۔ اتنے زیادہ سائل میرے پاس آنے لگے کہ میں ہر کسی کو وقت دے ہی نہیں سکتا تھا۔ میں دکان سے توجہ نہیں ہٹانا چاہتا تھا۔ لوگوں سے کہا کہ وہ شام کے بعد میرے گھر آجایا کریں.....

"میں اس کام سے تنگ بھی آگیا۔ میں اپنا کاروبار نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ میرے ماں باپ اور دو بہنیں پیچھے پنجاب میں تھیں۔ میں اپنی کمائی کا زیادہ حصہ انہیں باقاعدگی سے بھیجتا رہتا تھا۔ ایک بار ارادہ کر لیا کہ اپنا کاروبار نہ چھوڑوں جو مجھے روزی دے رہا ہے' یہ دوسرا کام یعنی روحانیت چھوڑ دوں۔ رات کو حضرت شاہ سلیمانؒ پھر خواب میں آئے اور بولے' کیا تمہیں ہماری خلافت اچھی نہیں لگتی؟ یاد رکھو تمہیں میرا خلیفہ خدا نے بنایا ہے' میں نے نہیں۔ خدا نے تمہارے ذمے

کام کر دیا ہے کہ مایوس اور نامراد انسانوں کا سہارا بنو اور ان کی مشکلات آسان کرو۔ اگر تم نے اس سے منہ پھیرا تو خدا کی ناراضگی اور لعنت تمہارے ماتھے پر لکھ دی جائے گی اور ہم نے جو چار جنات تمہارے غلام بنائے ہیں' وہ تمہیں جینے بھی نہیں دیں گے اور مرنے بھی نہیں دیں گے..... میں نے اگلے روز عہد کر لیا کہ میرا کاروبار تباہ ہوتا ہے تو ہو جائے' میں خدا کو اور حضرت شاہ سلیمانؒ کو ناراض نہیں کروں گا"۔



اگر میں یہ ساری بات سمیع اللہ کی زبان سے سنانے لگا تو کہانی بہت ہی لمبی ہو جائے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اپنے سفر پر آگے ذرا جلدی لے چلوں۔ میں اس کے متعلق باقی بات اپنی زبان میں سناؤں گا۔ ایک تو یہ نوٹ کریں کہ اُس کے بولنے کا انداز ایسا پُراثر تھا کہ مجھے ذرا سا بھی شک نہیں ہوتا تھا کہ وہ غلط بیانی کر رہا ہے۔ اس نے اپنی یہی کرامت نہیں سنائی تھی کہ اس کے تعویذ نے ایک بے اولاد عورت کو اولاد دی بلکہ اس نے اپنے کئی اور معجزے بھی سنائے تھے۔ ہر معجزہ اور ہر کرامت سنا کر وہ یہ ضرور کہتا تھا کہ یہ معجزہ خداوند تعالیٰ کا تھا جو خدا کی ذات باری نے حضرت شاہ سلیمانؒ کے چار جنات سے کروایا تھا جو اس کی غلامی میں دے دیئے گئے تھے۔ اس کی ا[illegible]

میں پوری طرح متاثر ہو گیا تھا۔

یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ میں کوئی عالم فاضل یا بہت ہی اونچی تعلیم والا آدمی نہیں۔ میں ایک پسماندہ علاقے کے ایک قصبے کا رہنے والا تھا۔ ہمارے علاقے میں پیر پرستی زیادہ تھی جو اب بھی ہے۔ لوگ ذرا ذرا سی بات پر پیر یا کسی عامل کے پاس جا پہنچتے۔ میں بھی مانتا تھا کہ روحانی عمل پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر سکتا ہے اور انسان کی ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ سمیع اللہ نے ایسی بامعنی اور پُراثر باتیں کیں کہ میں نے تسلیم کر لیا کہ یہ شخص روحانی علم کا عامل ہے اور اس کے قبضے میں جنات بھی ہیں۔ مجھے خوشی محسوس ہوئی کہ یہ برگزیدہ شخصیت مجھے ایسے وقت مل گئی ہے کہ جب میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ میں زمین پر تھا نہ آسمان پر۔ یہ شخص میری مدد کر سکتا تھا۔

رنگون میں اس کے اپنے بیان کے مطابق' اسے بہت ہی شہرت ملی' یہاں تک کہ بہت سے لوگ اس کے باقاعدہ مرید بن گئے۔ وہ اپنی شہرت کے عروج پر تھا جب رنگون سے غیر ملکیوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ یہ میں پہلے تفصیل سے سنا چکا ہوں کہ وہاں سے لوگ

جاپانیوں کے ڈر سے بلکہ برمیوں کے ڈر سے بھی بھاگ اٹھے تھے۔

برمیوں میں سمیع اللہ کے جو مرید تھے' ان میں ہر مذہب کے لوگ تھے۔ مسلمان' ہندو' عیسائی ذرا کم تھے اور بدھ مت کے پیروکار برمی بھی تھے۔ ان میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ یہ لوگ سمیع اللہ کو وہاں سے نہیں آنے دے رہے تھے۔ وہ اسے کہتے تھے کہ اسے رنگون میں کوئی خطرہ نہیں کیونکہ وہ سب کا پیرو مرشد اور مشکل کشا ہے۔

سمیع اللہ وہیں رکا رہا لیکن جاپانیوں کے متعلق کچھ اور خبریں بھی رنگون پہنچنے لگیں۔ ایک خبر کسی کے لئے بھی اچھی نہیں تھی۔ وہ یہ کہ جاپانی جس علاقے پر قبضہ کر لیتے تھے' اس علاقے میں انہیں جہاں کہیں بھی کوئی خوبصورت اور جوان لڑکی نظر آتی وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتے تھے اور ان لڑکیوں کو وہ اپنے ساتھ مورچوں میں رکھتے تھے۔ میں نے سنایا ہے کہ برمیوں نے جاپانی فوجوں کے لئے جاسوسی بھی کی تھی اور جاپانیوں کا استقبال کیا تھا لیکن جاپانی فوج ابھی رنگون تک نہیں پہنچی تھی جب یہ خبر پہنچ گئی کہ وہ لڑکیوں کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ اس خبر نے کئی برمیوں کو پریشان کر دیا لیکن وہ بھاگ کر جاتے کہاں۔ سمیع اللہ کے مریدوں نے اس سے پوچھا کہ انہیں کیا کرنا چاہئے۔ سمیع اللہ نے مجھے یہ بات سناتے ہوئے اعتراف کیا کہ وہ جان کا خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ وہ وہاں سے نکلنا ہی بہتر سمجھتا تھا۔ اس نے مراقبے میں جا کر اپنے غلام جنّات سے پوچھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ اسے حضرت شاہ سلیمانؒ کی طرف سے اشارہ ملا کہ کئی ایک نبیوں اور پیغمبروں نے بھی ہجرت کی تھی' بہتر ہے کہ سمیع اللہ بھی ہجرت کر جائے اور اس کے جتنے پیروکار اس کے ساتھ جانا چاہیں ساتھ لے جائے۔

جن برمیوں کے گھروں میں نوجوان لڑکیاں تھیں اور جو عزت دار برمی تھے' وہ وہاں سے بھاگ جانا ہی بہتر سمجھتے تھے۔ انہوں نے سمیع اللہ سے رہنمائی لی تو سمیع اللہ نے انہیں بتایا کہ اسے ہجرت کا اشارہ مل گیا ہے۔ اس طرح سمیع اللہ کم و بیش سات سو افراد کے ساتھ رنگون سے نکل آیا۔

یہ ایک قافلہ تھا جس میں کچھ گھوڑے اور خچریں بھی تھیں۔ ان لوگوں نے سامان گھوڑوں اور خچروں پر لادا' کچھ خود اٹھایا اور بہت ہی دنوں کی مسافت کے بعد یہاں پہنچ گئے۔ یہ دراصل ماہی گیروں کی بستی تھی۔ کچھ اور پیشوں کے لوگ بھی یہاں رہتے تھے لیکن جنگ کی خبریں پہنچیں تو بہت سے لوگ اس بستی سے بھاگ گئے۔

یہ میں نے خاص طور پر دیکھا تھا کہ جب زخمی لڑکی کے گرد بستی والوں کا ہجوم اکٹھا ہوا تھا تو اس میں لڑکیوں اور جوان عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ انہی کو جاپانیوں سے بچانے کے لئے ان لوگوں نے اتنا لمبا سفر کیا تھا۔

یہاں میں آپ کی معلومات میں کچھ اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کو جو یہ سنایا ہے کہ جاپانی مفتوحہ علاقوں میں سے جوان لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے' ان لڑکیوں کو COMFORT GIRLS کہتے تھے۔ یہ اصطلاح جاپانی زبان کی تھی جو میں جانا کیا تھی' اس کا انگریزی میں ترجمہ یہی کیا گیا تھا۔ گذشتہ سال یعنی 1994ء کی آخری سہ ماہی میں مَیں نے اخباروں میں پڑھا تھا کہ کچھ ملکوں نے اقوامِ متحدہ میں یہ قرارداد پیش کی تھی کہ جاپانی فوج نے جنگ کے دوران کوریا' جاوا' سماٹرا' بورنیو' سنگاپور' تھائی لینڈ اور برما وغیرہ کی ہزارہا لڑکیوں کو اپنے قبضے میں لے کر اپنے ساتھ مورچوں میں رکھا تھا۔ لہٰذا جاپان اب اقوامِ متحدہ میں معافی مانگے اور ان ملکوں کو معاوضہ ادا کرے جن ملکوں کی لڑکیاں اس کی فوج نے اپنے قبضے میں لی تھیں۔ معلوم ہوا ہے کہ ان میں زیادہ تر لڑکیاں کوریا کی تھیں اور اس کے بعد ان جزائر کی تھیں جو آج انڈونیشیا اور ملائشیا کہلاتے ہیں۔ جاپان نے معافی مانگنے اور معاوضہ دینے سے گریز کیا ہے لیکن یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ نصف صدی پہلے اس کی فوج نے یہ زیادتی کی تھی جس کا حکومت جاپان کو اور آج کے ہر جاپانی کو افسوس ہے۔



آیئے' میں آپ کو آدھی صدی پیچھے برما کے جنگلوں میں ایک بار پھر لے جاتا ہوں جہاں لوگوں نے ایک بستی آباد کر لی تھی۔ میں ان تفصیلات کو نظرانداز کروں گا کہ یہ لوگ یہاں کس طرح آباد ہوئے' کس طرح ان لوگوں نے بانسوں کے جھونپڑوں کے ساتھ ساتھ پتھروں اور گارے کی جھونپڑیاں بھی بنا لی تھیں اور ان لوگوں کو کھانے پینے کے لئے کہاں سے ملتا تھا۔ کچھ موٹی موٹی اور اہم باتیں بتا دیتا ہوں۔ وہاں سے غالباً پچیس میل دور ایک قصبہ تھا جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا' کچھ الٹا سا برمی زبان کا لفظ تھا۔ کچھ لوگ وہاں جاتے اور ضرورت کی اشیاء لے آتے تھے۔

ان کے پاس کوئی کرنسی نہیں تھی۔ جن پہاڑیوں کے بیچ یہ بستی گھری ہوئی تھی ان پہاڑیوں کے پیچھے چاول کے کھیت تھے۔ یہ لوگ چاول کاشت کرتے تھے اور جب فصل

تیار ہو جاتی اور ان کے پاس چاول اکٹھے ہو جاتے تو تمام چاول اس قصبے میں لے جاکر ڈالتے اور اپنی ضرورت کی اشیاء لے آتے تھے۔ دو تین روز بعد جب مجھے کچھ راز باتیں معلوم ہوئیں تو یہ بھی پتہ چلا کہ ان میں چند ایک آدمی ڈکیتی اور چوری کے ما تھے۔ وہ بھی سمیع اللہ کے مریدوں میں سے تھے۔ کبھی کبھار وہ کئی کئی دنوں کے لئے بر سے غائب ہو جاتے تھے اور جب واپس آتے تو لوٹ مار کا سارا سامان اور رقمیں سمیع کے جھونپڑے میں حاضر کر دیتے تھے۔ سمیع اللہ اس رقم سے ضرورت کی اشیاء منگو اور بستی کے ہر گھر کی ضرورت پوری کرتا تھا۔

ہو سکتا ہے میری یہ کہانی پڑھنے والوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جو اس شک اظہار کریں کہ یہ افسانوی دنیا کی بستی ہو گی۔ میں ایسے حضرات کو بتا دیتا ہوں کہ اُس و اس خطے میں کسی کی حکومت نہیں تھی اور نہ کوئی قانون چلتا تھا۔ پہلے وہاں انگریزوں بادشاہی تھی۔ ہر علاقے کا ایک تھانہ تھا اور کہیں پولیس کی چوکی تھی۔ اس طرح یہ تر علاقہ قانون کے تحت آتا تھا لیکن جاپان کی فوج اور اس کے بمبار ہوائی جہاز طوفان طرح آئے اور انگریز پسپا ہو گئے۔ لڑائی کہیں اور لڑی جا رہی تھی لیکن جن علاقوں جنگ کا نام و نشان نہیں تھا وہاں بھی کسی کا قانون نہیں چلتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ میں نے شک رفع کر دیا ہے۔ میں اس کوشش میں ہوں کہ یہ داستان ان چھوٹی چھوٹی تفصیلات اور وضاحتوں میں لمبی نہ ہو۔ میں کچھ اور قسم واقعات سنانا چاہتا ہوں۔

سمیع اللہ میرے ساتھ جو باتیں کر رہا تھا وہ ویسی ہی تھیں جو آج کل کے عامل عملیات وغیرہ کرنے والے شاہ جی وغیرہ کیا کرتے ہیں اور میں اسے پہنچ والا آدمی سمجھ تھا۔ لوگ تو پہلے ہی اس سے متاثر تھے اور اس کے مرید ہو گئے تھے۔ لوگ اپنی بیٹی اور دیگر عورتوں کو بخیر و خوبی رنگون سے اور ارد گرد کے دیہات سے نکال لائے تو ا نے یہ مان لیا کہ یہ یا حضرت سمیع اللہ کی برکت کا نتیجہ ہے۔ ان لوگوں کو تو موت بھوک نظر آ رہی تھی اور یہ بھی کہ ان کی لڑکیاں جاپانیوں کے ہاتھ چڑھ جائیں گی انہیں اچھی خاصی بستی مل گئی اور وہ زندگی کے راستے پر رواں ہو گئے۔

سمیع اللہ کی باتوں سے مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ وہ ان لوگوں کا بے تاج بادشاہ ہے۔ ۔۔ لوگوں کو اپنی مٹھی میں لے کر متحد رکھا اور بستی کا تمام انتظام اپنے ہاتھ میں رکھ

ایک قسم کا ڈسپلن پیدا کر دیا۔

"میں تمہیں کہہ چکا ہوں کہ میرے ساتھ رہو" ـــــ سمیع اللہ نے کہا ـــــ "میں ابھی بتا دیتا ہوں کہ میں تمہیں اپنے ساتھ کیوں رکھنا چاہتا ہوں۔ تم نے اگر نہیں یہ نہیں دیکھا تو کچھ دن رہ کر دیکھ لو کہ یہ لوگ میری عبادت کرتے ہیں۔ میری شہرت ان پہاڑیوں سے باہر بھی چلی گئی ہے۔ مجھے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جو میرا دایاں بازو بن سکے اور میرے لئے قابلِ اعتماد ہو۔ تم سے بہتر اور کوئی ساتھی نہیں ہو سکتا"۔

"آپ کے ساتھ رہ کر میری حیثیت کیا ہو گی؟" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "کیا میں آپ کا باڈی گارڈ ہوں گا یا کوئی اور ڈیوٹی ہو گی"۔

"میں تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں" ـــــ اس نے کہا ـــــ "پہلے تم اپنی آنکھوں دیکھ لینا کہ تم میری اس بادشاہی سے متاثر ہوتے ہو یا نہیں پھر تم خود ہی کہو گے کہ تم میری فلاں ڈیوٹی سنبھال لو گے۔ اگر تم میرے باڈی گارڈ بنتے ہو تو میں تمہیں ملازم یا چوکیدار نہیں سمجھوں گا۔ تم نے پوچھا ہے کہ یہاں تمہاری حیثیت کیا ہو گی۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہاں تمہاری حیثیت مجھ جیسی ہی ہو گی اور لوگ تمہاری منت سماجت کر کے مجھ تک پہنچا کریں گے۔ میں صرف آج کی بات نہیں کر رہا۔ میں اُس وقت کو نظروں میں رکھے ہوئے ہوں جب جنگ ختم ہو جائے گی اور ہم واپس رنگون یا کسی اور شہر چلے جائیں گے۔ یہ لوگ ہمارے ساتھ ہوں گے اور یہی لوگ مجھے دُور دُور تک مشہور کر دیں گے پھر تم دیکھنا کہ تمہارے لئے جنت اسی دنیا میں بن جاتی ہے یا نہیں"۔

"میں ایک بات پوچھنے کی جرأت کرتا ہوں" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "کیا واقعی آپ کے ہاتھ میں کوئی طاقت ہے اور کیا میں مان لوں کہ حضرت شاہ سلیمانؒ نے چار جنات کو آپ کا غلام بنا دیا ہے"۔

"کیا تم پانی پینا چاہو گے؟" ـــــ اس نے پوچھا۔

"میں اُس وقت پیاس محسوس کر رہا تھا لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ بیتاب ہو جاتا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں پانی پینا چاہوں گا تو میں نے اپنے آپ میں حیرت محسوس کی کہ اسے معلوم ہو گیا ہے کہ میں پانی پینا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا کہ میں پانی پیوں گا۔

اس نے اپنا خالی ہاتھ آگے کیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے ہاتھ میں شیشے کا گلاس تھا جو پانی سے بھرا ہُوا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور حیرت زدگی کے عالم میں پانی پی لیا۔ اس نے ہاتھ لمبا کر کے میرے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور بولا — "گلاس لے جاؤ اوئے" — اس نے گلاس ہوا میں اچھالا تو گلاس غائب ہو گیا۔

"تم کچھ منہ سے نکالو" — اس نے کہا — "میرے غلام جنّات وہ چیز حاضر کر دیں گے لیکن میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا کہ تمہاری ہر خواہش جنّات پوری کر دیں۔ میں خود بھی ایسا نہیں کیا کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے خدا نے ان مظلوم لوگوں کی خدمت کے لئے حضرت شاہ سلیمان علیہ السلام کا خلیفہ بنایا ہے۔ میں ایک بات تمہیں بے تکلفی سے بتا دیتا ہوں۔ تم اس بستی کی جس نوجوان یا بڑی عمر یا کسی بھی عمر کی عورت کو بلاؤ گے تو وہ تمہارے پاس آ جائے گی پھر تمہیں یہ سہولت بھی ملے گی کہ جس طرح یہ لوگ میرا کھانا الگ تیار کرتے ہیں اسی طرح تمہیں بھی خاص قسم کا کھانا ملا کرے گا۔ کبھی کبھی یہ لوگ میرے لئے پرندے مار کر یا جال میں پھنسا کر لے آتے اور پکا کر مجھے کھلاتے ہیں۔ مچھلی کی تو یہاں کوئی کمی نہیں"۔

میں اس کے گلاس اور پانی والے کرشمے سے تو بہت ہی متاثر ہُوا اور دل ہی دل میں اس کا مرید بن گیا۔ میرے ذہن میں فوراً واجدہ آ گئی اور اس کے ساتھ ہی آصف بھی یاد آ گیا۔ میں نے سوچا کہ سمیع اللہ سے کہوں گا کہ وہ مجھے واجدہ دلا دے خواہ وہ آصف سے طلاق لے لے یا آصف اس دنیا سے ہی اٹھ جائے۔ پہلے تو ارادہ کیا کہ ابھی اس کے آگے اپنی یہ خواہش رکھ دوں لیکن اس نے کچھ ایسی باتیں کی تھیں کہ میں خاموش رہا اور سوچا کہ اس کے ساتھ پوری طرح بے تکلفی پیدا ہو جائے تو میں اسے اپنی یہ خواہش بتاؤں گا۔

"میں آپ کے پاس رک جاؤں گا" — میں نے کہا — "آپ میرے ذمے جو کام اور جو فرض لگائیں گے وہ انشاء اللہ میں پورا کروں گا"۔

"کل تمہیں ایک الگ جھونپڑا مل جائے گا" — اس نے کہا — "میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ ان لوگوں میں گھومو پھرو لیکن اپنی سطح سے نیچے نہ آنا۔ میں تمہارے متعلق ان لوگوں کو یہ بتاؤں گا کہ تم میرے خلیفہ ہو"۔

"آپ مجھے ہر قسم کی صورت حال میں قابلِ اعتماد پائیں گے" — میں نے کہا —

"مجھے صرف یہ بتا دیں کہ یہاں کیا نہیں کرنا چاہئے اور کس قسم کی احتیاط کی ضرورت ہے"۔

"میں تمہیں کچھ ضروری باتیں ذرا بعد میں بتانا چاہتا تھا" — سمیع اللہ نے کہا — "لیکن مجھے خیال آیا ہے کہ ایک انتہائی ضروری بات ابھی بتا دوں۔ وہ یہ ہے کہ اس بستی میں دو تین آدمی میرے خلاف ہیں۔ ظاہری طور پر وہ میری وفاداری کرتے ہیں اندر سے وہ مجھے اچھا نہیں سمجھتے"۔

"کوئی خاص وجہ؟" — میں نے پوچھا۔

"وجہ صاف ہے" — اس نے جواب دیا — "میں مسلمان ہوں اور بڑا پکا مسلمان ہوں۔ اس بستی میں زیادہ تر لوگ مسلمان ہیں۔ ان میں ہندو بھی ہیں اور بدھ بھی۔ میرے جو مخالفین ہیں وہ بدھ مت کے پیروکار ہیں۔ میرے جاسوسوں نے مجھے بتایا ہے کہ ان لوگوں کو شک ہے کہ میں ہر کسی کو مسلمان بنانا چاہتا ہوں۔ یہ ہے بھی صحیح بات۔ میں نے خود کسی غیر مسلم کو نہیں کہا کہ وہ اسلام قبول کر لے لیکن یہاں سات آٹھ غیر مسلم میرے ہاتھ پر اسلام قبول کر چکے ہیں۔ یہ ہے وجہ میری مخالفت کی۔ یہ تین چار آدمی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں چاہوں تو انہیں غائب کروا سکتا ہوں لیکن میں ایسا کوئی ظلم نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہیں ایک اور بات بھی بتا دوں تو بہتر ہو گا۔ تم نے جس لڑکی کو اژدہا کے منہ سے نکالا ہے' میں اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن یہ لڑکی مان نہیں رہی۔ اس کا باپ میرے پاس آتا ہے تو ایسی باتیں کرتا ہے کہ جیسے وہ مجھے اپنی بیٹی دے دے گا لیکن پتہ چلا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ ہے اور اپنی بیٹی مجھے نہیں دینا چاہتا۔ میں نے باپ بیٹی سے کہا تھا کہ یہ خدائی اشارہ ہے کہ میں اس لڑکی کے ساتھ شادی کروں ورنہ میری اپنی ایسی کوئی خواہش نہیں' اگر انہوں نے انکار کیا تو میں بتا نہیں سکتا کہ ان پر کیسی آفت آ پڑے گی۔ وہ آفت آج پڑی ہے جو ان سب لوگوں نے دیکھ لی ہے۔ تم نے اس لڑکی کو موت کے منہ سے جو نکالا ہے یہ تمہارا اپنا فعل نہیں تھا۔ تمہیں خُدا نے اس طرف بھیج دیا تھا تاکہ تم اس لڑکی کو موت کے منہ سے نکالو اور یہ خُدا کی ایک وارننگ تھی کہ وہ میرے ساتھ شادی کرنے سے انکار نہ کرے ورنہ نتیجہ بڑا بھیانک ہو گا"۔

"کیا آپ ان تین چار آدمیوں سے کوئی خطرہ محسوس کرتے ہیں؟" — میں نے

پوچھا۔

"مجھے ان سے جان کا تو کوئی خطرہ نہیں" ــــ سمیع اللہ نے جواب دیا ــــ "خطرہ یہ ہے کہ یہ لوگ غیر مسلموں کو میرے خلاف کر دیں گے۔ میری مخالفت کا مطلب اسلام کی مخالفت ہے"۔

"مجھے ایک بات بتا دیں" ــــ میں نے پوچھا ــــ "ان لوگوں کے ساتھ میرا سلوک کیسا ہونا چاہیے؟"

"تم ان کی باتیں سنتے رہنا" ــــ سمیع اللہ نے کہا ــــ "اگر یہ کوئی خطرناک بات کریں تو مجھے بتانا پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم نے کیا کرنا ہے"۔

اس مسئلے پر ہم دونوں کے درمیان کچھ اور باتیں ہوئیں۔ اس نے مجھے دوسرے کمرے میں لے جا کر کہا کہ اب سو جاؤ' باقی باتیں کل ہوں گی۔

○

میں اگلی صبح جاگا تو سمیع اللہ کے کمرے میں چلا گیا۔ ہم کچھ کھا پی چکے تو اس نے مجھے کہا کہ میں بستی میں گھوم پھر آؤں اور دریا تک بھی چلا جاؤں۔

میں بستی میں گھومنے پھرنے لگا۔ لوگ مجھے حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ نہ وہ میری زبان سمجھتے تھے نہ میں ان کی سمجھتا تھا۔ بعض مجھے دیکھ کر مسکرائے اور بعض نے جھک کر سلام کیا۔ میں نے دیکھا کہ بستی میں زیادہ تعداد جوان لڑکیوں کی تھی۔ برما کی عورتوں کے نقش و نگار اور جسم کی جلد ایسی ہوتی ہے کہ عمر کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ وہ بہت دیر بعد بوڑھی ہوتی ہیں یا یوں کہہ لیں کہ بہت دیر بعد پتہ چلتا ہے کہ اس عورت کی جوانی ڈھل چکی ہے۔ ان کے رنگ بڑے صاف ہوتے ہیں۔ پیلاہٹ تو ہوتی ہے لیکن سفیدی مائل جس سے ان کی خوبصورتی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مجھے خوشی سی محسوس ہو رہی تھی کہ یہ لڑکیاں جاپانیوں کے وحشی پن سے بچ کر بڑی اچھی پناہ میں پہنچ گئی تھیں۔ میں جھونپڑوں کی دوسری طرف چلا گیا۔ علاقہ بہت ہی خوبصورت تھا۔ تھوڑی ہی دور اونچی ٹیکریاں تھیں جنہیں پہاڑیاں کہہ لیں۔ ان پر سبزہ خاصا زیادہ تھا اور درختوں کی بھی بہتات تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کئی ایک عورتیں جھونپڑوں سے نکل آئی تھیں اور ایک جگہ رک کر مجھے دیکھ رہی تھیں۔ وہ مجھے بہت بہادر سمجھ رہی تھیں جس نے ایک اژدھا کے منہ سے ایک لڑکی کو نکال لیا تھا۔

میرے جی میں آئی کہ اس قدرتی تالاب کی طرف چلوں جس میں میں نے اژدھا کو مارا تھا۔ میں جھونپڑوں کے باہر باہر سے اُس طرف چل پڑا۔ ایک آدمی دوڑتا ہوا میری طرف آیا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی آدمی تھا جو مجھے کل اس وقت ملا تھا جب میں اس لڑکی کو بستی میں لا رہا تھا۔ یہ آدمی ٹوٹی پھوٹی اُردو بول لیتا تھا۔ وہ لفظوں کو جوڑ جاڑ کر اپنی بات واضح کر لیتا تھا اور اردو بڑی اچھی طرح سمجھ لیتا تھا۔

اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور میرا حال احوال پوچھا۔ اس نے یہ بھی پوچھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کہیں بھی نہیں جا رہا اور اب میں ان کے ساتھ ہی رہوں گا۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ یا حضرت نے مجھے حکم دے کر روک لیا ہے۔

"اس لڑکی کا کیا حال ہے؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"زخم اتنا گہرا نہیں" ــــ اس نے اپنی شکستہ سی اردو میں جواب دیا ــــ "وہ اتنی زیادہ ڈری ہوئی ہے کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد گھبرا کر بچوں کی طرح رونے لگ جاتی ہے اور اپنی ماں کو بلا کر اپنے پاس بٹھا لیتی ہے۔ ماں اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیتی ہے تو اسے کچھ سکون آ جاتا ہے"۔

میں نے اسے کہا کہ وہ مجھے اس کے گھر لے چلے۔ وہ میرے ساتھ چل پڑا اور ہم تھوڑی ہی دور ایک جھونپڑے کے دروازے پر جا رکے۔ وہ آدمی اندر گیا اور فوراً ہی واپس آ کر اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

میں نے اندر کمرے میں جا کر دیکھا۔ لڑکی فرش پر بچھے ہوئے بستر پر لیٹی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس کا باپ اور اس کی ماں ہاتھ جوڑ کر میرے آگے کھڑے ہو گئے۔ وہ اکٹھے ہی بول رہے تھے اور بار بار اپنے جڑے ہوئے ہاتھ اپنی پیشانی پر لگاتے اور میری طرف دیکھتے تھے۔ میں نے اس آدمی کی طرف دیکھا جس کے ساتھ میں وہاں گیا تھا۔

"آپ کا شکریہ ادا کر رہے ہیں" ــــ اس نے کہا ــــ "یہ کہتے ہیں کہ آپ دیوتا ہیں۔ کوئی انسان تو اژدھا کو نہیں مار سکتا اور اس کے منہ سے اس کا شکار تو کوئی چھین ہی نہیں سکتا"۔

میں نے اسے کہا کہ انہیں سمجھاؤ کہ میں نے ایک انسانی فرض ادا کیا ہے۔ یہ میرے آگے جھک جھک کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔ اس نے اپنی زبان میں انہیں کچھ کہا اور میں

لڑکی کے پاس اس کے بستر پر بیٹھ گیا۔ لڑکی اس طرح ذرا پرے سرک گئی جیسے میں آسمان کی مخلوق ہوں۔ میری مجبوری یہ تھی کہ میں اسے اس کی زبان میں تسلی نہیں دے سکتا تھا۔

"اس لڑکی کو ایک بات سمجھا دو" ـــ میں نے اس آدمی سے کہا ـــ "اسے کہو کہ میں اسی کی طرح کا ایک انسان ہوں اور جس طرح میں اژدھا سے نہیں ڈرا تھا اسی طرح یہ بھی نہ ڈرے۔ اسے یہ بھی بتاؤ کہ اسے خوش ہونا چاہئے کہ اس کی عمر بہت لمبی ہے اور اسے یہ بھی سمجھاؤ کہ اژدھا کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی کہ جس سے ڈرا جائے"۔

اس آدمی نے اسے اس کی زبان میں سمجھایا۔ لڑکی میرے چہرے پر اس طرح نظریں گاڑے ہوئے تھی جیسے اس نے اس آدمی کی بات سنی ہی نہ ہو۔ میں نے اس وقت لڑکی کے چہرے کو اچھی طرح دیکھا۔ ایک تو اس کی عمر پندرہ سولہ سال تھی، اس کے علاوہ اس کے چہرے کے نقوش بہت ہی اچھے تھے اور رنگ سفیدی مائل تھا۔ وہ تو بہت ہی خوبصورت اور جاذب نظر لڑکی تھی۔ کبھی اس کی نظریں میرے سارے جسم پر گھومنے لگتیں اور پھر اس کی نظریں میرے چہرے پر رک جاتیں۔ برمیوں کے قد چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس لڑکی کا بھی قد چھوٹا تھا اور وہ معصوم سی بچی لگتی تھی۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھے ہی جارہی تھی، بولتی کچھ نہیں تھی۔

مجھے سمیع اللہ کی رات والی بات یاد آگئی کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے اور لڑکی نہیں مانتی۔ یہ خیال آتے ہی میری نظروں کے سامنے سمیع اللہ آگیا۔ اس کی عمر چالیس سال سے میرا خیال ہے کہ تین چار سال کم تھی۔ وہ اس لڑکی سے دگنی عمر کا تھا۔ سمیع اللہ برگزیدہ شخصیت ہو سکتا تھا، یہ بھی میں نے مان لیا تھا کہ چار جنّات اس کے غلام ہیں لیکن میرا دل یہ تسلیم نہیں کرتا تھا کہ یہ لڑکی اس کے ساتھ بیاہی جائے۔

میں نے اس آدمی سے پوچھا کہ ان لوگوں کا مذہب کیا ہے۔ اس نے بدھ مت بتایا۔ یہ آدمی بھی بدھ تھا اور لڑکی کا خاندان بھی بدھ تھا۔

میں نے دیکھا کہ لڑکی کے ماں باپ پھر ہاتھ جوڑ جوڑ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ انہیں منع کرو کہ اس طرح نہ کریں۔ میں نے اسے کہا کہ میں مسلمان ہوں اور مسلمان جب کسی کے ساتھ کوئی نیکی کرتا ہے تو اس سے کوئی صلہ یا اس قسم کی خوشامد قبول نہیں کیا کرتا بلکہ اسے ہمارے مذہب میں گناہ سمجھا جاتا ہے۔

"یہ پوچھ رہے ہیں کہ آپ کی کیا خدمت کی جائے؟" ـــ اس آدمی نے کہا۔

"انہیں منع کرو میرے بھائی!" ـــ میں نے کہا ـــ "مجھے پریشان نہ کریں" ـــ میں جانے کے لئے اٹھا تو لڑکی نے اس آدمی سے کوئی بات کی۔ یہ پہلی بات تھی جو اس لڑکی کے منہ سے نکلی تھی۔

"یہ کہتی ہے کہ آپ پھر بھی ہمارے گھر ضرور آئیں" ـــ اس آدمی نے کہا ـــ "اس نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ کو دیکھ کر اس کے دل سے اژدھا کا خوف نکل گیا ہے"۔

میں نے اس آدمی سے کہا کہ میں اسے دیکھنے پھر بھی آؤں گا۔ پھر میں نے اس آدمی کو ساتھ لیا اور ہم جھونپڑے سے نکل آئے۔



ہم دونوں ٹہلتے ٹہلتے اس تالاب تک پہنچ گئے جہاں سے میں نے اس لڑکی کو موت کے منہ سے نکالا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اژدھا کی دم ایک فٹ یا ڈیڑھ فٹ پانی سے باہر تھی۔ یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اژدھا مرا ہوا تھا۔ اس کی تھوڑی سی دُم باہر تھی اور باقی جسم پانی میں تھا۔ میں نے اس کی دُم پکڑی اور باہر کھینچنے لگا۔ وہ اتنا وزنی تھا کہ مجھ اکیلے سے کھینچا نہیں جارہا تھا۔ میں نے اس آدمی سے کہا کہ وہ بھی دُم پکڑ کر کھینچے۔ وہ ڈرتے ڈرتے آگے آیا اور اژدھا کی دُم پکڑ لی۔ ہم دونوں نے زور لگا کر اسے باہر نکال لیا۔ اس کے سر سے نیچے میری گولیوں کے بنائے ہوئے سوراخ تھے۔

میں نے زندگی میں پہلی بار اژدھا دیکھا تھا۔ ایسے اژدھا کا اس جنگل میں ہونا کوئی عجب بات نہیں تھی۔ اژدھا دراصل سانپ ہی ہوتا ہے لیکن بہت بڑا۔ اس مرے ہوئے اژدھا کی لمبائی پندرہ اور بیس فٹ کے درمیان تھی۔ اس کی موٹائی ایک فٹ کے قریب تھی۔

اژدھا بہت بڑا سانپ ہی ہوتا ہے لیکن اس میں زہر نہیں ہوتا۔ اپنے شکار کو کاٹ سکتا ہے لیکن زہر نہ ہونے کی وجہ سے اس کے کاٹنے کا اثر چھوٹے سانپوں جیسا نہیں ہوتا۔ اسے انگریزی میں Python کہتے ہیں اور اسے Boa Constrictor بھی کہا جاتا ہے۔ یہ اپنے شکار کو نگل لیتا ہے۔ یہ باتیں مجھے بہت عرصہ بعد معلوم ہوئی تھیں۔ یہ اپنے شکار کو سالم نگلتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جس جانور کو پکڑتا ہے، سب سے پہلے اس کا سر اور منہ اپنے منہ میں لیتا ہے تا کہ شکار دم گھٹنے سے وہ مر جائے۔ میں نے

بہت عرصہ بعد ایک انگریزی رسالے میں پڑھا تھا اور پھر کچھ لوگوں سے پوچھا بھی تھا اژدھا بکرے کو' ہرن کو اور خنزیر کو بھی پکڑ لیتا ہے۔ یہ شکار کو نگل لیتا ہے چباتا نہیں نہ ہی چبا سکتا ہے۔ آہستہ آہستہ شکار کو نگل لیتا ہے۔ اس کی موٹائی نو سے بارہ انچ تک ہوتی ہے۔ اس سے کم بھی ہوتی ہے لیکن سالم انسان کو' بکرے' ہرن اور خنزیر جیسے موٹے جانور کو نگل لیتا ہے اور جانور کے جسم کے مطابق اس کا جسم پھولتا جاتا ہے اور شکار اس کے پیٹ میں پہنچ جاتا ہے۔

پیٹ میں جب اتنا بڑا جانور جاتا ہے تو وہاں سے اس کی موٹائی اس جانور جتنی ہو جاتی ہے۔ ایک عجیب چیز بتائی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر وہ ہرن یا سینگوں والے بکرے کو نگل لے تو سینگ اس کے جسم سے باہر نکل آتے ہیں اور اژدھا کوئی تکلیف محسوس نہیں کرتا۔ وہ اپنی جگہ پر جہاں وہ رہتا ہے' جا کر سو جاتا ہے۔ عام طور پر ایک اژدھا ایک مہینے سے لے کر تین مہینے تک سویا رہتا ہے۔ وہ اس وقت جاگتا ہے جب شکار اُس کے پیٹ میں ہضم ہو جاتا ہے اور اس کا جسم نارمل ہو جاتا ہے۔

اژدھا کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک قسم کے اژدھا خشکی پر ہی رہتے ہیں۔ ایک قسم ایسی ہے جو کچھ وقت خشکی پر گزارتے ہیں' زیادہ تر ایسے اژدھا پانی میں رہتے ہیں۔ پانی میں ہوں تو مچھلیوں اور کچھوؤں وغیرہ کو نگل لیتے ہیں۔ اگر انہیں خشکی پر یعنی پانی کے کنارے شکار نظر آجائے تو پانی سے سر نکال کر شکار پکڑ لیتے اور پانی میں گھسیٹ کر لے جاتے ہیں۔ میں نے ایک تو یہ اژدھا دیکھا تھا جو میری رائفل سے مرا تھا اور دوسرا لاہور چڑیا گھر میں دیکھا تھا۔ ستمبر 1965ء کی جنگ ختم ہوئی اور اعلانِ تاشقند کے بعد 1966ء میں فوجیں واپس بارکوں میں آئیں تو میں لاہور گیا تھا اور واہگہ کا سارا میدانِ جنگ گھوم پھر کر دیکھا تھا۔ لگے ہاتھوں چڑیا گھر بھی چلا گیا اور وہاں ایسا ہی اژدھا دیکھا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس کی خوراک ایک خرگوش روزانہ تھی۔ اس کے پنجرے میں خرگوش چھوڑ دیتے تھے اور اژدھا اسے پکڑ کر نگل لیتا تھا۔

میں اپنے ساتھی کے ساتھ دریا تک چلا گیا۔ میں نے اس سے اس کا نام پوچھا۔

"میرا نام یو وانگ ہے" — اُس نے کہا — "آپ مجھے وانگ کہہ لیا کریں"۔

"اور اُس لڑکی کا نام کیا ہے؟"

"وی تان" — اس نے جواب دیا — "ہم سب اسے تانی کہا کرتے ہیں"۔

"سنا ہے یا حضرت تانی کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں" — میں نے کہا۔

اُس نے چونک کر میرے منہ کی طرف دیکھا اور میں نے صاف نوٹ کیا کہ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

"تمہیں شاید معلوم نہیں" — میں نے کہا — "یہ بات پوچھنے سے میرا کوئی خاص مطلب نہیں۔ میں ویسے ہی پوچھ رہا ہوں"۔

اب اس نے سر جھکا لیا اور خاموش رہا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" — میں نے پوچھا۔

اُس نے سر اٹھایا اور پھر میرے منہ پر نظریں جما لیں۔ مجھے کچھ شک سا ہُوا۔ اس آدمی کی خاموشی بلاوجہ اور بے معنی نہیں تھی۔ میں اس کے پیچھے پڑ گیا کہ وہ مجھے بتائے کہ وہ اتنا پریشان اور چُپ کیوں ہو گیا ہے۔

"ہاں' یہ ٹھیک ہے" — وانگ نے کہا — "یا حضرت تانی کو اپنی بیوی بنانا چاہتے ہیں"۔

"لیکن تم تو بہت ہی پریشان ہو گئے ہو" — میں نے کہا — "کیا تم مجھے اپنا دوست نہیں سمجھتے؟"

"میں آپ کو اپنا دوست تو ضرور سمجھتا ہوں" — وانگ نے دبی دبی سی آواز میں کہا — "لیکن آپ بھی یا حضرت کے ملک کے رہنے والے ہیں اور ہو سکتا ہے آپ ایک ہی صوبے میں رہنے والے ہوں۔ قدرتی بات ہے کہ آپ وہ بات پسند نہیں کریں گے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ میں ڈرتا ہوں کہ آپ یہ بات یا حضرت کو بتا دیں گے"۔

"دیکھو وانگ!" — میں نے کہا — "یہ صحیح ہے کہ میں اور یا حضرت ایک ہی صوبے کے رہنے والے ہیں لیکن میں مسافر ہوں۔ یہاں تک بھٹکتا ہُوا پہنچ گیا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے لیکن مجھ پر کسی کی کوئی پابندی نہیں۔ میں جس وقت چاہوں یہاں سے جا سکتا ہوں۔ یا حضرت کے ساتھ میرا کوئی ایسا تعلق نہیں جیسا تم لوگوں نے سمجھ لیا ہے۔ میں انہیں کوئی بات نہیں بتاؤں گا"۔

"لیکن ہم نے انہی کے ساتھ رہنا ہے" — اس نے کہا — "ہم کوئی ایسی بات نہیں کر سکتے جو یا حضرت کے خلاف جاتی ہو۔ کوئی آدمی ایسی جرأت کرے گا تو یا حضرت کے حکم سے اسے قتل کر دیا جائے گا..... یا حضرت تانی کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں

لیکن تانی نہیں مانتی"۔

"اور تانی کے والدین کیا کہتے ہیں؟" ——— میں نے پوچھا۔

"وہ یا حضرت کو بھی ناراض نہیں کر سکتے" ——— وانگ نے کہا ——— "اور وہ اپنی کمسن اور اتنی خوبصورت بیٹی کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتے"۔

سمیع اللہ نے مجھے بتایا تھا بدھ مت کے تین چار پیروکار اس کے خلاف ہیں۔ میں نے وانگ کی باتیں سنیں اور اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھے تو مجھے خیال آیا کہ ان مخالفین میں وانگ بھی شامل ہے۔ میں نے اُس کے ساتھ اس موضوع پر کچھ اور باتیں کیں لیکن میں نے دیکھا کہ وہ ڈر ڈر کر بولتا تھا اور میرے بعض سوال گول کر جاتا تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ کوئی سیدھا سادا اور بدھو سا آدمی نہیں تھا بلکہ اس کے بولنے کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ اس میں عقل بھی ہے اور خود اعتمادی بھی ہے۔

ہم ٹہلتے ٹہلتے دریا تک چلے گئے تھے۔ وہاں بہت سی کشتیاں کنارے سے بندھی ہوئی تھیں۔ ان میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھی تھیں' بڑی اور بہت بڑی بھی۔ تین چار کشتیاں دریا میں تیر رہی تھیں اور ماہی گیر مچھلیاں پکڑنے میں مصروف تھے۔ دریا پورے جوش میں تھا۔ وہ بارشوں کا موسم تھا۔



میں جب واپس اپنے جھونپڑے میں گیا تو سمیع اللہ کو کچھ بھی نہ بتایا کہ وانگ کے ساتھ میری کچھ باتیں ہوئی ہیں۔ میں نے یہ خاموشی اس وجہ سے اختیار کی کہ سمیع اللہ وانگ کو سزا دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ وانگ مجھے بڑا اچھا لگا تھا۔ بڑی پختہ اور عقل کی باتیں کرتا تھا۔ میں نے کھانا سمیع اللہ کے ساتھ کھایا۔ اس نے بتایا کہ میرے لئے ایک جھونپڑا خالی کرا لیا گیا ہے۔

"تم اب اس جھونپڑے میں چلے جاؤ" ——— سمیع اللہ نے کہا ——— "یہی کپڑے پہنے۔ رکھو اپنی رائفل' اپنی وردی اور ایمونیشن وغیرہ ساتھ لے جاؤ۔ بستر وغیرہ کا وہاں بندوبست کر دیا ہے۔ ایک آدمی تمہاری خدمت کے لئے مقرر کر دیا ہے اور ایک عورت تمہیں وہیں کھانا دے گی"۔

"میں نے اس لڑکی کو گھر جا کر دیکھا ہے" ——— میں نے کہا ——— "اس پر اژدھا کی دہشت طاری ہے۔ میں نے اس کی دہشت اتارنے کی کوشش کی ہے۔ میں پھر وہاں

جاؤں گا اور......"

"ایک خیال رکھنا میرے دوست!" ——— سمیع اللہ نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ——— "تم وہاں زیادہ نہ ہی جاؤ تو اچھا ہے۔ وہ لڑکی یقیناً" تم سے متاثر ہو گی۔ میں بات صاف کیا کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ لڑکی تمہارے زیر اثر ہو اور وہ تمہیں یا تم اسے بار بار ملو"۔

"میری اس کے ساتھ ایسی کوئی دلچسپی نہیں" ——— میں نے کہا ——— "میں نے اس کے ساتھ یا یہاں کی کسی اور لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کرنی۔ یہ انسانی ہمدردی کا جذبہ ہے جو مجھے وہاں لے گیا تھا اور پھر بھی لے جائے گا"۔

"اس جذبے کو دبانے کی کوشش کرو" ——— سمیع اللہ نے کہا ——— "یہاں ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت لڑکی موجود ہے۔ جو لڑکی تمہارے دل کو اچھی لگے' مجھے بتانا شام کے بعد وہ تمہارے پاس ہو گی"۔

میں نے دیکھا کہ سمیع اللہ مہاراجوں یا بادشاہوں کی طرح مجھے حکم دے رہا تھا۔ یہ سچ ہے کہ میں اس سے متاثر ہو گیا تھا اور میں نے دل سے اس کی مریدی قبول کر لی تھی لیکن میرا مزاج اس قسم کا تھا کہ میں تحکمانہ انداز برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ بہرحال میں خاموش رہا۔

سمیع اللہ کے کہنے پر میں اپنے جھونپڑے میں جانے کے لئے اٹھا۔ سمیع اللہ نے ایک آدمی کو پکارا تو وہ دوڑتا ہوا آیا۔ سمیع اللہ کے کہنے پر اس آدمی نے میرا سامان اٹھایا اور میں اس کے ساتھ سمیع اللہ کے جھونپڑے سے نکل آیا۔

میرے لئے جو جھونپڑا خالی کرایا تھا' وہ بھی صاف ستھرا تھا البتہ اس کا کمرہ ایک ہی تھا۔ میں جب اس جھونپڑے میں پہنچا تو وانگ وہاں موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ اسے میرا خدمت گار مقرر کیا گیا ہے۔

وانگ کا زیادہ تر وقت میرے ساتھ گزرنے لگا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وانگ میرے ساتھ کھل کر بات کرے اور کسی بھی موضوع پر بات ہوتی تو وہ ٹھیک ٹھاک باتیں کرتا تھا لیکن جب ذکر سمیع اللہ کا آجاتا تو وہ دب سا جاتا اور اس کی کوشش ہوتی کہ یہ موضوع ٹل جائے اور اسے کچھ نہ کہنا پڑے۔

دو یا غالباً تین دن گزر گئے تو ایک روز عصر کے وقت ساری بستی میں ہڑبونگ سی

بپا ہو گئی۔ وانگ نے مجھے بتایا کہ آج یا حضرت بستی کے تمام لوگوں سے خطاب کریں گے۔ اتنے میں ایک آدمی آیا۔ اس نے بتایا کہ سمیع اللہ مجھے بلا رہا ہے۔ میں اس کے جھونپڑے میں گیا۔ میرا جھونپڑا بستی کے ایک اور طرف تھا۔ میرے اور سمیع اللہ کے جھونپڑوں میں اچھا خاصا فاصلہ تھا۔

"میں آج شام ان لوگوں کو اکٹھا کر رہا ہوں" —— سمیع اللہ نے کہا —— "تم بھی وہاں موجود ہو گے۔ تمہارے پاس رائفل ہونی چاہئے اور رائفل میں راؤنڈ پڑے ہوں۔ تم میرے ساتھ کھڑے ہو گے..... جاؤ رائفل تیار کر لو اور پھر میرے پاس آجانا"۔

میں واپس گیا۔ رائفل کی میگزین میں راؤنڈ ڈالے اور رائفل کا سلینگ کندھے پر لٹکا کر سمیع اللہ کے جھونپڑے میں چلا گیا۔



میں سمیع اللہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ تو مہاراجہ بنا ہوا تھا۔ اس کے سر پر لال ٹوپی تھی جیسے ترکی ٹوپی کہا کرتے تھے۔ اس پر اس نے پگڑی کی طرح ریشمی کپڑا لپیٹا ہوا تھا جس کی لمبائی زیادہ نہیں تھی۔ پگڑی کے دونوں طرف اس نے کسی پرندے کے رنگ دار پر اُڑسے ہوئے تھے۔ اس نے جو چغہ پہنا ہوا تھا وہ بھی ریشمی سا تھا اور اس کا رنگ ہلکا سبز تھا۔ اس نے کمر کے گرد ایک کپڑا لپیٹ رکھا تھا اور اس میں تلوار اڑسی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرمہ تھا اور چہرہ دھلا دھلایا تھا۔ اس لباس اور حُلیے میں وہ الف لیلہ کی داستانوں کا افسانوی کردار لگتا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ کوئی رسمی سی بات کی تو اس نے مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے کسی بادشاہ نے بادل ناخواستہ اپنے غلام کی طرف دیکھا ہو۔

میں نے پہلے کہا ہے کہ میں اس شخص سے اتنا متاثر ہو گیا تھا کہ اپنے آپ کو اس کا مرید بنا دیا تھا اور میں نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی طاقت ہے۔ میں نے پہلے یہ بھی کہا ہے کہ اس نے ہاتھ اوپر کیا تھا تو ایک جن نے اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا گلاس دے دیا تھا۔ میں نے وہ جن تو نہیں دیکھا تھا اور میں جانتا تھا کہ جنات نظر نہیں آیا کرتے لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ جن ہی تھا جس نے اس کے ہاتھ میں پانی دیا تھا۔ اس کے باوجود میں جب اس کے چہرے پر اور انداز میں رعونت اور فرعونیت سی دیکھتا تھا تو

میرے اندر کچھ اور ہی اثر ہوتا تھا۔

میں جانتا تھا اور میں نے دیکھا بھی تھا کہ برگزیدہ اور پہنچ والے پیروں یا عالموں کے چہروں پر ایک جلالی سی کیفیت ہوتی ہے اور یہ تاثر ایسا ہوتا ہے کہ ہر کوئی ان کا ادب اور احترام کرنا چاہتا ہے۔ سمیع اللہ کے چہرے پر میں نے جو تاثر دیکھا وہ نورانی بھی نہیں تھا اور جلالی بھی نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے سوچا کہ میں شاید اس شخص کو سمجھ نہیں جو میں سمجھ رہا ہوں وہ غلط ہے۔ میں اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں گناہگار تھا اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ خدا تک اپنی فریاد کس طرح پہنچائی جاتی ہے۔ میں بھی اسی عقیدے کا قائل تھا کہ خدا تک رسائی حاصل کرنے کے لئے سمیع اللہ جیسے کسی عالم یا عامل یا کسی پیر کی ضرورت یا رہنمائی لازمی ہوتی ہے۔ میں یہ بھی مانتا تھا کہ کوئی وظیفہ خواہ اس میں اللہ کا نام ہی کیوں نہ ہو، اپنے آپ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس کا اثر ہوتا ہی نہیں اور بعض اوقات اثر الٹا بھی ہو سکتا ہے۔ وظیفہ کرنے کے لئے کسی بزرگ کی اجازت ضروری ہوتی ہے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اللہ کا نام لینے کے لئے اللہ کا کلام پڑھنے کے لئے اللہ کے کسی بندے کی اجازت ضروری ہوتی ہے۔

کمرے میں چار آدمی داخل ہوئے۔ انہوں نے پتلون نما پاجامے پہن رکھے تھے۔ قمیضیں پاجاموں اُڑسی ہوئی تھیں اور ہر ایک کی کمر کے گرد ایک کپڑا لپٹا ہوا تھا اور ہر ایک نے اس میں تلوار اُڑسی ہوئی تھی۔ یہ تلواریں عام تلواروں جیسی نہیں تھیں جن کی نوکیں ہوتی ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ تلواروں جتنے لمبے چھرے تھے جن کے بلیڈ آگے سے چوڑے تھے اور دستے کے قریب آکر کم چوڑے رہ جاتے تھے۔ ان چاروں آدمیوں نے سروں پر کالے رومال باندھ رکھے تھے۔ ان کے چہرے تھے تو ٹھیک ٹھاک لیکن مجھے آج تک یاد ہے کہ ان چہروں پر کرختگی کا سا تاثر تھا۔ اس تاثر کے ساتھ کالے رومال اور کمربندوں میں اُڑسی ہوئی تلواریں جلاد کا تصور پیش کرتی تھیں۔

"تم سب وہاں چلو" —— سمیع اللہ نے کہا اور میری طرف اشارہ کر کے بولا —— "اسے بھی لے جاؤ"۔

چاروں نے میری طرف دیکھا اور میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ وہ میری زبان نہیں سمجھتے تھے۔ مجھے سمیع اللہ کا یہ افسرانہ انداز اچھا نہ لگا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ اس نے مجھے اپنا دایاں بازو کہا تھا اور ہم ایک ہی صوبے میں رہنے والے تھے اس لئے یہ مجھے ذرا اونچی سطح

پر رکھے گا لیکن اس نے مجھے ان لوگوں کی صف میں شامل کر دیا۔

ہم بستی میں سے گزرے۔ میں نے دیکھا کہ باہر صرف بچے کھیل رہے تھے' بڑی عمر کا کوئی مرد نہ کوئی عورت نظر نہیں آتے تھے۔ میں ان چار آدمیوں کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ ہم بستی میں سے نکل گئے۔ آگے ایک ٹیکری سی تھی۔ اس سے گھوم کر آگے گئے تو مجھے ایک اور ہی منظر نظر آیا۔ وہ یہ تھا کہ تمام لوگ ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے جس طرح لوگ جلسوں میں بیٹھا کرتے ہیں۔ ان کے سامنے ایک چبوترہ بنا ہوا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ ایک ٹیکری تھی جسے اِدھر اُدھر سے تراش کر چبوترہ بنایا گیا تھا۔ اس کی اونچائی ایک گز سے کچھ زیادہ ہوگی۔ لمبائی چوڑائی پندرہ سولہ فٹ سمجھ لیں۔

وہ چاروں آدمی مجھے اپنے ساتھ چبوترے کے پاس لے گئے۔ ان چاروں کو دیکھ کر لوگوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔ اس سے پہلے وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے اور یہ باتیں اچھا خاصا شور و غل بنی ہوئی تھیں۔ ایسی خاموشی چھا گئی جیسے ان لوگوں نے اپنی سانسیں بھی روک لی ہوں۔

سمیع اللہ آیا۔ میں نے اس کی کچھ اور ہی شان دیکھی۔ دو بڑی ہی خوبصورت لڑکیاں اس کے ساتھ تھیں۔ ان کے لباس بڑے ہی اچھے تھے۔ ایک اس کے دائیں طرف اور دوسری بائیں طرف تھی۔ وہ آیا تو تمام لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور سب نے سر جھکا لئے۔ کچھ لوگ تو بالکل ہی جھک گئے۔

سمیع اللہ لڑکیوں سمیت چبوترے پر چڑھ گیا۔ تلواروں والے چاروں آدمی بھی اس کے پیچھے چبوترے پر چڑھے اور ان کے پیچھے میں بھی چبوترے پر چلا گیا۔

لڑکیاں سمیع اللہ کے دائیں بائیں کھڑی رہیں اور ہم پانچوں اس کے پیچھے ایک صف میں کھڑے ہو گئے۔

سمیع اللہ نے معلوم نہیں کیا کہا کہ تمام لوگ سیدھے ہو گئے اور بیٹھ گئے۔ سمیع اللہ نے بری زبان میں لیکچر شروع کیا جو میں بالکل نہ سمجھ سکا۔ اس کے بولنے کا اور بازو لہرانے کا اور ہوا میں مکے مارنے کا انداز بتاتا تھا کہ یہ شخص غصے میں ہے اور ان لوگوں کی کسی غلطی پر انہیں لتاڑ رہا ہے۔

کچھ دیر غصے میں بولنے کے بعد اس نے پیچھے دیکھا اور ان چار آدمیوں سے کچھ کہا۔ ان میں سے دو آدمی سامنے سے چبوترے سے کودے اور لوگوں میں جا کر ایک آدمی کو

پکڑا اور چبوترے پر لے آئے۔ صاف پتہ لگتا تھا کہ اس شخص نے کوئی جرم کیا ہے اور اسے سزا دی جائے گی اور اسے کہا جائے گا کہ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا ہے تو کہے۔

ان آدمیوں نے اسے دھکیلا اور چبوترے پر چڑھا دیا۔ میں اس آدمی سے مل چکا تھا۔ یہ تانی کا باپ تھا۔ وہ ڈر سے کانپ رہا تھا اور سمیع اللہ کے آگے ہاتھ جوڑتا تھا۔ سمیع اللہ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر معلوم نہیں کیا کہا اور پھر اس آدمی سے مخاطب ہو کر کچھ کہا۔ اس آدمی نے رونا شروع کر دیا۔ سمیع اللہ کے اشارے پر دو آدمیوں نے اسے دھکا دیا اور وہ چبوترے سے نیچے جا پڑا۔

لوگوں میں سے اچانک ایک عورت کی چیخ نما آواز سنائی دی۔ میں نے دیکھا وہ تانی تھی جو اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور بڑے غصے میں بول رہی تھی۔ اس کی ماں نے اور ایک اور عورت نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی۔ ماں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور پھر دوسری عورتیں اسے نیچے بٹھانے کی کوشش کرنے لگیں۔ ادھر اس کا باپ اٹھا اور وہ دوڑتا ہوا لوگوں کے ہجوم میں چلا گیا اور بیٹی کو اپنے بازوؤں میں لے کر چپ کرا دیا۔

سمیع اللہ نے مجھے بازو سے پکڑا اور اپنے پہلو میں کھڑا کر لیا۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور دوسرا ہاتھ ہوا میں بلند کر کے کچھ کہا۔

لوگ اٹھ کر خاموشی سے جانے لگے۔ سمیع اللہ میری طرف گھوما۔

"میں نے اعلان کر دیا ہے کہ تم میرے خلیفہ ہو" ـــــ اس نے مجھے پنجابی زبان میں کہا ـــ "اب تمہاری حیثیت ایسی ہو گئی ہے کہ تم ان لوگوں سے اپنی بات منوایا کرو گے ان کی نہیں سنا کرو گے۔ تم انہیں حکم دے سکتے ہو۔ اگر ان میں سے کوئی تمہارے آگے گستاخی کرے یا بدتمیزی کرے تو مجھے بتا کر اسے گولی مار دینا۔ یہاں نہ انگریز کا قانون چلے گا نہ جاپانیوں کا۔ یہاں میرا قانون چلتا ہے۔ جنگ ختم ہونے دو' میں اپنی بادشاہی اور زیادہ پھیلاؤں گا..... اب تم اپنے ٹھکانے پر جا سکتے ہو۔ مجھے جب تمہاری ضرورت محسوس ہو گی تو میں تمہیں بلا لوں گا"۔

میں وہاں سے چل پڑا اور اپنے جھونپڑے میں چلا گیا۔



رات کھانے کے بعد حسبِ معمول وانگ میرے پاس آ گیا۔ وہ پہلے آتا تھا تو میرے پاس بیٹھ جاتا تھا لیکن اُس رات وہ دروازے میں رک گیا' جوتی باہر اتاری پھر رکوع میں

چلا گیا اور شاید میرے اشارے کے انتظار میں اسی پوزیشن میں جھکا رہا۔

"وانگ!" — میں نے اسے کہا — "سیدھے ہو جاؤ اور میرے پاس آکر بیٹھ جاؤ"۔

وہ سیدھا ہو گیا اور آہستہ آہستہ چلتا مجھ تک پہنچا لیکن بیٹھا نہیں۔ میرے کہنے پر وہ بیٹھ گیا۔ میں نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کے لہجے میں کہا کہ وہ میرے آگے آئندہ نہ جھکے۔

"مجھے گناہگار نہ کریں" — اس نے کہا — "آپ یا حضرت کے خلیفہ بن گئے ہیں۔ آپ کا احترام میرا فرض ہے اور اب میں آپ کی برابری نہیں کر سکتا"۔

"میری بات غور سے سنو وانگ!" — میں نے کہا — "یا حضرت کو اگر خلیفہ بنایا ہے تو حضرت شاہ سلیمان علیہ السلام نے بنایا ہے یا وہ خدا کے حکم سے خلیفہ بنا ہے لیکن مجھے یا حضرت نے خلیفہ بنایا ہے۔ یہ خدا کا حکم نہیں۔ میں مسلمان ہوں اور یہ میرا ایمان ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے آگے جھک نہیں سکتا نہ کوئی خدا کا بندہ خدا کے کسی بندے کو اپنے آگے جھکنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ تم میرے دوست ہو اور دوست ہی رہو گے۔ جس طرح پہلے میرے پاس آیا کرتے تھے اسی طرح اب بھی آیا کرو"۔

وہ میری اس بات کا اثر قبول نہیں کر رہا تھا۔ اس نے کچھ دلیل بازی کی لیکن میں نے اسے بہت کچھ کہہ کر قائل کر لیا کہ وہ میرے ساتھ دوستانہ بے تکلفی رکھے گا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آج یا حضرت نے لوگوں سے کیا کہا تھا۔

اس نے بتایا کہ سمیع اللہ نے لوگوں سے کہا تھا کہ تانی اور اس کے باپ نے اس کی شان میں گستاخی کی ہے اور اس کی تانی کو یہ سزا ملی ہے کہ اژدھا نے تانی کو اپنے منہ میں لے لیا تھا۔ سمیع اللہ نے لوگوں سے کہا تھا کہ اُس وقت وہ اپنے جھونپڑے میں سویا ہوا تھا۔ اسے نیند میں اشارہ ملا کہ تانی کو اژدھا نے پکڑ لیا ہے اور اسے پانی میں لے جا رہا ہے۔ سمیع اللہ نے اپنے جنّات کو حکم دیا کہ اس لڑکی کو بچالو۔ جنات نے اس آدمی کو یعنی مجھے وہاں حاضر کر دیا اور میں نے جنّات کی رہنمائی میں وہاں پہنچ کر اژدھا کو گولی ماری اور تانی کو بچالیا۔

سمیع اللہ لوگوں کو یہ باور کرا رہا تھا کہ تانی کو اس کی گستاخی کی سزا ملی ہے اور میں اس کے یعنی سمیع اللہ کے اشارے پر وہاں جا پہنچا تھا..... وانگ نے بتایا کہ پھر سمیع اللہ نے لوگوں کو بتایا کہ تانی کے باپ نے اور خود تانی نے اس کا حکم نہ مانا تو ان پر ایسی آفت

آئے گی کہ تم سب لوگ کانپ جاؤ گے اور کئی دنوں تک تم پر خوف طاری رہے گا۔

وانگ نے بتایا کہ اس کے بعد سمیع اللہ نے تانی کے باپ کو اپنے پاس بلایا اور اسے کہا کہ وہ سات دنوں کے بعد اپنی بیٹی کو اس کے ساتھ بیاہ دے۔ اگر اس نے اب بھی حکم عدولی کی تو اس کی گردن کاٹ دی جائے گی۔ تانی کے باپ کو دھکا دے کر جھونپڑے سے نکال دیا گیا تھا اور تانی نے چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا۔ وانگ نے مجھے بتایا کہ وہ کہہ رہی تھی کہ وہ یا حضرت کے ساتھ شادی نہیں کرے گی اور یا حضرت چاہے اس کے باپ کو اور اس کی ماں کو اور اس کے چھوٹے بھائی کو بھی قتل کر دے۔

میں نے وانگ سے ان دو لڑکیوں کے متعلق پوچھا جو سمیع اللہ کے ساتھ تھیں۔

وانگ نے بتایا کہ ان دو لڑکیوں کو وہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتا ہے اور دونوں لڑکیاں اس کی داشتہ ہیں۔

"مجھے صحیح بات بتاؤ وانگ!" — میں نے اس سے پوچھا — "کیا تمہیں یا حضرت کی یہ باتیں اور یہ دھمکیاں اچھی لگتی ہیں؟"

وانگ چپ رہا۔ میں نے اس سے پھر پوچھا تو عجیب سی کیفیت میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ اسے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں اور یہ تو میں جانتا ہی تھا کہ وانگ بھی سمیع اللہ کے مخالفین میں سے تھا۔

"مجھ سے مت ڈرو وانگ!" — میں نے کہا — "میں یا حضرت جیسا ظالم نہیں ہوں"۔

ظالم کے لفظ پر وانگ چونکا اور اس نے حیرت زدگی کے عالم میں میری طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ تانی میرے جھونپڑے میں داخل ہوئی۔ وہ لنگڑا کر چل رہی تھی۔ وانگ اسے دیکھ کر پریشان ہو گیا اور اٹھ کر اسے دروازے میں ہی روک لیا۔ اس نے تانی کے ساتھ کچھ باتیں کیں وہ میں لفظی طور پر تو نہ سمجھ سکا لیکن یہ سمجھ گیا کہ وہ تانی کو جھونپڑے میں آنے سے روک رہا ہے۔ میں نے اسے ڈانٹا تو وہ تانی کے آگے سے ہٹ گیا اور تانی میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ وہ ذرا لنگڑا کر چل رہی تھی کیونکہ اس کے ایک پاؤں کو اژدھا نے زخمی کر دیا تھا۔

میرے پاس بیٹھتے ہی اس نے احتجاج اور غصے کے لہجے میں بولنا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے آنسو نکل آئے۔ دو تین مرتبہ اس نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ

کر بڑی زور سے جھنجھوڑا اور چیختی چلاتی آواز سے کچھ کہتی رہی۔

میں نے وانگ سے پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہی ہے۔ اس نے تانی کی ساری بات مجھے اپنی خستہ شکستہ اردو میں سنائی جو مختصراً" یہ تھی کہ وہ سمیع اللہ کے خلاف نفرت کا اظہار کر رہی تھی اور اسے خوبصورت لڑکیوں کا شکاری اور شیدائی اور شیطان تک کہہ رہی تھی۔ وانگ نے بتایا کہ کچھ دن پہلے یاحضرت نے تانی کے باپ کی اپنے آدمیوں سے پٹائی کرائی تھی۔ تانی کو اس پر بہت ہی غصہ تھا۔ وانگ نے یہ بھی بتایا کہ تانی مجھے کہہ رہی ہے کہ میں اس شخص کے ساتھ شادی کروں گی جس نے مجھے موت کے منہ سے نکالا ہے اور پھر میرے گھر مجھے دیکھنے بھی آیا تھا۔

"یہ آپ کو دیوتا کہہ رہی ہے" ــــ وانگ نے کہا ــــ "یہ کہتی ہے کہ آپ کے ساتھ شادی کرے گی اور یہ بھی کہتی ہے کہ آپ یہاں نہ رکیں اور اسے اپنے ساتھ لے کر کہیں اور چلے جائیں"۔

تانی نے خاصی لمبی بات کی تھی اور وانگ نے ایک ایک لفظ کا ترجمہ کر کے مجھے سنایا تھا' میں نے اس کا لبِ لباب آپ کو سنایا ہے۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے ریشم کے تاروں کے گچھے پر میں نے ہاتھ رکھ دیا ہے۔ اتنے ملائم بال کہ میں ان کی ملائمت محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ تھی تو بہت ہی خوبصورت لیکن اس کی اصل خوبصورتی یہ تھی کہ اس کے چہرے پر بچپنے کی جھلک ابھی موجود تھی اور پھر اس کے جس وصف نے مجھے متاثر کیا وہ یہ تھا کہ وہ کردار اور اخلاق کی اتنی پکی تھی کہ سمیع اللہ کو قبول نہیں کر رہی تھی' حالانکہ وہ جانتی تھی کہ سمیع اللہ اسے' اس کے باپ' اس کی ماں اور اس کے بھائی کو قتل کروا سکتا ہے۔ مجھے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میں اسے کس طرح تسلی دوں اور کس طرح اسے ٹھنڈا کروں۔

وانگ نے مجھے بتایا کہ یہ کہتی ہے کہ اس کے ماں باپ سو گئے تو یہ دبے پاؤں گھر سے نکل آئی۔ یہ تو سب جانتے تھے کہ رات کے اس وقت سمیع اللہ کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ شراب اور بدکاری میں مگن ہوتا ہے۔

میں نے وانگ سے کہا کہ اسے میری طرف سے تسلی دو اور اسے کہو کہ میں اسے یاحضرت سے بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔ وانگ نے اس کے ساتھ بڑی لمبی بات کی جس سے اس کے چہرے کا کھچاؤ کم ہو گیا۔ اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور

کچھ دیر دیکھتی رہی پھر اس نے میرا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا۔ اس ہاتھ کو اس نے چوما پھر دو آنکھوں سے لگایا اور میرا ہاتھ واپس میرے زانو پر بڑے احترام سے رکھ دیا۔ وہ اٹھی اور میرے جھونپڑے سے نکل گئی۔

وہ تو چلی گئی لیکن مجھے خیالوں اور سوچوں کے کانٹوں پر پھینک گئی۔ کبھی تو میرے سامنے سمیع اللہ آتا جس کا میں معتقد ہو گیا تھا اور تھوڑی ہی دیر بعد یہی سمیع اللہ میری آنکھوں کے آگے ایک فرعون کی حیثیت سے آتا اور میں یہ سوچنے لگتا کہ میں اس شخص کا کیا بگاڑ سکتا ہوں۔ میں اکیلا تھا اور میں نے دیکھ لیا تھا کہ سات آٹھ سو نفوس کی بستی پر وہ کس طرح غالب آیا ہوا تھا۔ وہ یوں بھی کر سکتا تھا کہ بستی والوں کو حکم دیتا کہ اس شخص کو مار ڈالو تو بستی والے مجھ پر ٹوٹ پڑتے اور میرے جسم کی بوٹی بوٹی بکھر جاتی۔

میں نے وانگ سے اس کی صحیح رائے معلوم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ڈر رہا تھا اور کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ میں نے بہت حد تک بہت سی باتیں کر کے اسے اپنے ساتھ بے تکلف تو کر لیا لیکن جہاں سمیع اللہ کا ذکر آجاتا وہ اپنے ہونٹ سی لیتا تھا۔ شاید رات آدھی گزر گئی تھی جب وہ اٹھا اور چلا گیا۔



باتیں بڑی لمبی ہیں۔ اگر میں ایک ایک بات سنانے لگا تو میری کہانی کبھی بھی ختم نہیں ہو گی۔ میں آپ کو بوریت سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن یہ بھی سوچتا ہوں کہ ایک بڑا واقعہ سنا دیا اور اس کی تفصیلات اور اس کا پس منظر نہ سنایا تو آپ کہیں گے' یہ سچ نہیں ہو سکتا' یہ تو من گھڑت بات ہے۔ جب تک جواز اور وجوہات اور دائیں بائیں کی باتیں نہ سنائی جائیں' کسی حیرت انگیز واقعہ پر یقین نہیں آتا لیکن میں درخواست کروں گا کہ مجھے اور اپنے آپ کو طوالت سے بچائیں اور موٹے موٹے واقعات سنیں۔

چار پانچ دن گزر گئے۔ ان دنوں میں میری ملاقاتیں سمیع اللہ سے ہوتی رہیں۔ وہ مجھ پر یہ تاثر پیدا کر رہا تھا کہ اس بستی کے لوگ ہمارے غلام ہیں اور ان کی بیٹیاں ہماری بے نکاحی بیویاں ہیں اور حد یہ کہ ان کی جانیں ہماری مٹھی میں ہیں۔ وہ میری ٹریننگ کر رہا تھا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ کس طرح کا رویہ اختیار کروں۔

ان چار پانچ دنوں میں مَیں نے وانگ کو اپنے ساتھ پوری طرح بے تکلف کر لیا اور

اس نے میری دوستی کو قبول کر لیا۔ ایک رات وہ حسبِ معمول میرے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹین کا ایک ڈبہ تھا جسے میں ٹین کی کُپّی کہوں گا۔ وہ آ کر بیٹھا تو ایک گلاس اٹھا کر اس کپّی میں سے پانی سا گلاس میں ڈالا اور تقریباً" ایک چوتھائی گلاس بھر دیا پھر اس میں پانی ڈالا اور اس نے ایک پیالہ اٹھا کر اس میں کپّی سے پانی ڈالا اور اسے دوسرے پانی سے بھر دیا۔ گلاس مجھے دے کر کہنے لگا کہ یہ پی لیں اور اس نے پیالہ اپنے منہ سے لگا لیا۔

میں نے پانی پیا تو یہ ذرا تُرش سا تھا لیکن ترشی مجھے اچھی لگی۔ گلاس میں سے بُو سی بھی اٹھ رہی تھی۔ میں نے آدھے سے زیادہ گلاس پی لیا اور میری بیوقوفی ملاحظہ فرمائیں کہ میں نے یہ بھی نہ پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ خود بھی یہی چیز پی رہا تھا۔ میں اسے اس علاقے کی کوئی بڑی اچھی چیز یا سوغات سمجھ کر پی گیا۔ میں نے گلاس خالی کر کے رکھا تو اس نے کپّی میں سے اتنا ہی پانی اس میں ڈال کر دوسرا پینے والا پانی بھی اس میں ڈال دیا۔ میں اب یہ پانی آہستہ آہستہ پینے لگا اور وانگ دوسرا پیالہ بھر کر ذرا تیزی سے پی گیا۔

میں نے کچھ سُرور سا محسوس کیا تو مجھے خیال آیا کہ اس شخص نے مجھے شراب ہی تو نہیں پلا دی؟..... میں نے اس سے پوچھا کہ وہ مجھے کیا پلا رہا ہے؟

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" —— اس نے کہا —— "آپ شاید اپنے علاقے کی بڑی اچھی قسم کی شراب پیتے ہوں گے اس لئے آپ کو یہ شراب اتنی گھٹیا لگ رہی ہے کہ آپ کو یہ بھی پتہ نہیں چل رہا کہ یہ شراب ہے۔ یہ میں اُس قصبے سے لایا کرتا ہوں"۔

شراب کے نام پر میں بِدک اُٹھا لیکن سرور اتنا آ رہا تھا کہ میں نے اتنا زیادہ محسوس نہ کیا جتنا کرنا چاہئے تھا۔ میں تو شراب کی بُو تک سے واقف نہ تھا۔ میں اتنی زیادہ پی گیا تھا کہ مجھ پر نشہ اور عجیب سا خمار طاری ہوتا جا رہا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اگر اس دنیا میں کوئی انتہائی مسرور اور خوش قسمت انسان ہے تو وہ میں ہوں۔ وانگ پیئے چلا جا رہا تھا اور اس پر بھی نشہ طاری ہو گیا تھا۔

شراب پینے کا مجھے افسوس تھا یا نہیں، اس مسئلے کو الگ رکھیں، میں آپ کو یہ بتا رہا ہوں کہ اس نشے نے ایک فائدہ دیا وہ یہ کہ میرا بولنے کا انداز بدل گیا اور وانگ بھی نشے میں آ کر بولنے لگا اور اس کے منہ سے وہ باتیں نکلنے لگیں جو میں نکلوانا چاہتا تھا۔ ہم دونوں کا انداز ایسا ہو گیا تھا جیسے ہماری بچپن کی دوستی ہے اور ہم لنگوٹیے یار ہیں۔ ہم نے

ہنس ہنس کر باتیں شروع کر دیں۔

وانگ نے جو انکشاف کئے وہ یہ تھے کہ وہ چار پانچ ہی آدمی نہیں تھے جو سمیع اللہ کی خلافت کے باغی تھے بلکہ ان کی تعداد دس بارہ تھی۔ سمیع اللہ کے ساتھ تلواروں اور کالے رومالوں والے جو آدمی تھے وہ برما کے مشہور ڈاکو اور پیشہ ور قاتل تھے اور ہر کوئی ان سے ڈرتا تھا۔ وانگ نے یہ بھی بتایا کہ مسلمان سمیع اللہ سے اس لئے ڈرتے ہیں کہ وہ واقعی حضرت شاہ سلیمان علیہ السلام کا خلیفہ ہے اور اس کے قبضے میں جنّات ہیں اور یہ اسی کی برکت اور رحمت ہے کہ وہ خیریت سے رنگون سے نکل آئے تھے اور یہاں اچھی زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن جو غیر مسلم تھے ان میں زیادہ تر سمیع اللہ سے نہیں بلکہ ان چار پیشہ ور مجرموں سے ڈرتے تھے پھر ڈر یہ تھا کہ کسی کے متعلق نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ سمیع اللہ کا جاسوس نہیں۔ عورتوں میں بھی ایسی جاسوس تھیں جو بستی کے ہر گھر میں جا کر ہمدردی اور پیار کی باتیں کرتیں اور دیکھتیں تھیں کہ کوئی سمیع اللہ کے خلاف اٹھ تو نہیں رہا۔

وانگ نے بتایا کہ سمیع اللہ رنگون میں دکان کرتا تھا تو وہاں اس کی دوستی ایک جادوگر کے ساتھ ہو گئی تھی۔ جادوگر کا مطلب تھا مسمریزم کے کرتب دکھانے والا۔ سمیع اللہ کی دکان پر زیادہ تر عورتیں آتی تھیں اور سمیع اللہ کسی نہ کسی عورت کو اپنے جال میں پھانس لیتا اور اس جادوگر کو بھی یہ عورت پیش کرتا تھا۔ اس طرح اس نے اس جادوگر سے کچھ شعبدے سیکھ لئے جن میں ایک یہ تھا کہ خالی ہاتھ ہوا میں بلند کرتا تو اس ہاتھ میں پانی کا بھرا ہُوا گلاس آ جاتا تھا۔

وانگ نے سمیع اللہ اور اس کے استاد کی مسمریزم کے کچھ اور شعبدے بھی سنائے۔

وانگ نے بتایا کہ سمیع اللہ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے مقبولِ عام عامل بن گیا اور اس نے لوگوں کو روحانی عملیات بتانے شروع کر دیئے اور چند برسوں میں ہی اس کی چرب زبانی کی بدولت اسے بہت مقبولیت اور شہرت حاصل ہو گئی۔

وانگ نے پوری طرح سمیع اللہ کو بے نقاب کر دیا۔ وہ تو آدھی رات سے ذرا پہلے چلا گیا لیکن میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ وہی کیفیت پھر طاری ہو گئی، کبھی خیال آتا کہ وانگ بدھ ہے اور اس لئے وہ سمیع اللہ کے خلاف ہے۔ کبھی خیال آتا کہ وانگ جو کہہ رہا ہے بالکل صحیح ہے۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے میں سو گیا۔

اگلی صبح میرے اندازے کے مطابق دس بجے کا وقت ہو گا جب وانگ گھبرائے ہوئے سے انداز میں میرے جھونپڑے میں آیا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ کوئی خاص بات یا واقعہ ہو گیا ہے۔

"آج تانی کا باپ مارا جائے گا" ـــ وانگ نے ہکلاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "یاحضرت نے اسے جو سات دنوں کی مہلت دی تھی وہ آج ختم ہو گئی ہے۔ یہ خبر ملی ہے کہ تانی کے باپ کو یاحضرت نے رسّیوں سے باندھ کر اپنے جھونپڑے میں قید کر لیا ہے۔ اُدھر تانی' اس کی ماں اور اس کے چھوٹے بھائی کو بھی رسّیوں میں جکڑ کر ان کے جھونپڑے میں قید کر دیا گیا ہے۔ آج شام اُسی جگہ سب لوگ اکٹھے ہوں گے اور یاحضرت اپنا فیصلہ سنائیں گے۔ تانی کے باپ کے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ اپنی بیٹی سمیع اللہ کے حوالے کر دے۔ اب دیکھتے ہیں کہ شام کو کیا ہوتا ہے"۔

وانگ ابھی میرے پاس ہی تھا اور میں کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک آدمی نے آ کر کہا کہ مجھے یاحضرت بلا رہے ہیں۔ میں سمیع اللہ کے جھونپڑے کی طرف چل پڑا۔ میں سوچ تو بہت کچھ رہا تھا لیکن میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ سمیع اللہ سے کہوں گا کہ ان غریبوں پر ظلم نہ کرنا۔ لڑکی کمسن اور معصوم ہے' اسے پیار سے سمجھاؤ تو سمجھ جائے گی۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے میں سمیع اللہ کے پاس پہنچ گیا۔

"آج شام ہم تمہیں ایک اور تماشا دکھائیں گے" ـــ سمیع اللہ نے کہا ـــ "آج تمہیں صحیح اندازہ ہو گا کہ میری کتنی کچھ طاقت ہے اور میں کیا کر سکتا ہوں..... تمہیں آج پھر رائفل لے کر وہیں پہنچ جانا ہے۔ باقی جو ہو گا وہ اپنی آنکھوں دیکھ لینا"۔

عصر کا وقت تھا جب میں اُس دن کی طرح چبوترے پر کھڑا تھا۔ میرے ساتھ وہی چار آدمی کھڑے تھے جن کے پاس تلواریں تھیں اور سروں پر کالے رومال بندھے ہوئے تھے۔ سمیع اللہ اسی طرح آیا جس طرح اُس روز آیا تھا۔ وہی شاہانہ لباس اور ایک لڑکی دائیں طرف اور دوسری بائیں تھی۔ اُس روز تو اس کی چال بڑی ہی مستانی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ساری دنیا کا شہنشاہ وہی ہے۔ وہ چبوترے پر آ گیا اور لوگوں سے مخاطب ہُوا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ اس نے کیا کہا ہے۔

اس کے حکم کی تعمیل ہوئی تو میں سمجھا کہ وہ یہ حکم دے رہا تھا۔ ایک طرف سے تانی

کے باپ کو دو آدمی اس طرح لا رہے تھے کہ اس کے دونوں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے رسّی سے بندھے تھے۔ ایک آدمی نے اسے ایک بازو سے اور دوسرے نے دوسرے بازو سے پکڑ رکھا تھا۔ تانی کا باپ ٹھیک ٹھاک چلتا آ رہا تھا۔ اسے چبوترے پر لے آئے اور دو زانو بٹھا دیا۔

دوسری طرف سے تانی' اس کی ماں اور اس کے چھوٹے بھائی کو جس کی عمر گیارہ بارہ سال تھی اسی طرح رسّیوں سے بندھا لایا جا رہا تھا۔ ان کے منہ کپڑوں سے بند کر دیئے گئے تھے تاکہ وہ چیخ چلّا نہ سکیں۔ انہیں چبوترے کے قریب لا کر ان کے باپ کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ انہیں چبوترے پر نہ لایا گیا۔

معلوم نہیں مجھے کسی نے کہا تھا یا شاید میں خود ہی وہاں سے اُلٹے قدم چلا اور چبوترے کے ایک کونے پر جا رکا۔ سمیع اللہ نے ایک اور اعلان کیا۔ کالے رومال والے ایک آدمی نے تلوار نکالی اور تانی کے باپ کے دائیں پہلو کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اس کے دوسرے ساتھی نے آگے ہو کر تانی کے باپ کے سر پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے اور اسے اور زیادہ جھکا دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا سر اس کے تن سے جدا کر دیا جائے گا۔ کالے رومالوں والے دوسرے دو آدمی تانی کے باپ کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ اُس وقت میں نے تانی' اس کی ماں اور اس کے معصوم بھائی کی طرف دیکھا۔ ان کے منہ بند تھے اس لئے آواز نہیں نکلتی تھی لیکن ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ کھڑے تڑپ رہے تھے۔

جس نے تلوار نکالی تھی اس نے تلوار پکڑ کر دونوں ہاتھوں میں بلند کی۔ ایک یا دو سیکنڈ بعد تانی کے باپ کا سر تن سے الگ ہو جانا تھا۔ میں نے تانی اور اس کے چھوٹے بھائی کو تڑپتا دیکھا۔ کالے رومال والے جلاد نے بازو اوپر کر کے اور پیچھے کئے تاکہ ایک ہی وار سے گردن کٹ جائے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

میری آنکھیں جیسے کسی طاقت نے کھول دیں اور اسی طاقت نے میرے اندر ایسا زلزلہ بپا کیا کہ میری رائفل اپنے آپ ہی کندھے تک چلی گئی۔ میں نے تلوار والے کی طرف نالی کر کے ٹریگر دبا دیا دھماکہ ہُوا اور اس کی ہوا میں اُٹھی ہوئی تلوار وہیں سے گری اور وہ بھی گر پڑا۔ میں نے بڑی تیزی سے بولٹ پیچھے کر کے آگے کیا' ایک اور راؤنڈ چیمبر میں چلا گیا۔ تانی کے باپ کے پیچھے دو قاتل پہلو بہ پہلو کھڑے تھے۔ انہوں نے

بدک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے دوسرا راؤنڈ ان پر فائر کر دیا۔ فاصلہ دس قدم سے ذرا کم یا زیادہ ہو گا۔ رائفل کا راؤنڈ ایک کے پہلو میں لگا اور دونوں کے پہلوؤں میں سے گذر گیا۔ دونوں گرے۔ چوتھا رہ گیا تھا۔ وہ شاید بھاگنے لگا تھا لیکن میرا تیسرا راؤنڈ چیمبر میں جا چکا تھا۔ میں نے فائر کیا اور وہ بھی گر پڑا۔

میں نے بلند آواز سے وانگ کو بلایا اور کہا کہ فوراً" یہاں آؤ۔ معلوم نہیں وہ کہاں تھا۔ لوگوں پر سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ ایسا شور بھی اٹھا جیسے لوگ بھاگنا چاہتے ہوں۔ وہ میری بات نہیں سمجھ سکتے تھے۔ وانگ دوڑتا آیا۔

"وانگ!" — میں نے بلند اور تیز آواز میں کہا — "لوگوں سے کہو مت بھاگیں، میری بات سن کر جائیں"۔

وانگ نے اپنی زبان میں لوگوں سے کچھ کہا تو سب خاموش ہو گئے اور تماشا دیکھنے لگے۔

سمیع اللہ جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہا۔ اس نے تحکمانہ لہجے میں مجھے کہا کہ یہ کیا کر رہے ہو، لوگ تمہارے جسم کا قیمہ کر دیں گے۔ اس وقت میری رائفل کی نالی اُس کی طرف تھی۔

"وانگ!" — میں نے کہا — "ان لوگوں سے کہو کہ وہ اس شخص کو خدا کا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا خلیفہ مانتے ہیں اور اس کے قبضے میں جنّات ہیں۔ اسے کہیں کہ اپنے جنّات کو حکم دے کہ وہ میرے ہاتھ سے رائفل چھین لیں اور اسے بچا لیں" — میں نے سمیع اللہ سے کہا — "اپنے جنّات کو حاضر کر لے تاکہ تجھے افسوس نہ رہے کہ میں نے تجھے مقابلے کا موقع نہیں دیا تھا"۔

"یہ کیا حماقت کر رہے ہو" — سمیع اللہ نے مجھے کہا — "پھینکو اس رائفل کو اور میرے ساتھ آؤ"۔

اُدھر وانگ اپنی زبان میں لوگوں کو بتا رہا تھا کہ میں نے کیا کہا ہے۔ لوگوں پر تو موت کی خاموشی طاری ہو چکی تھی۔ سمیع اللہ مجھ سے دس بارہ قدم دور کھڑا تھا۔ میں نے اُس کے سر کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ سمیع اللہ پاؤں پر کھڑا رہا لیکن صرف چار یا پانچ سیکنڈ کے لئے۔ پہلے اس کے گھٹنے زمین پر لگے پھر وہ ایک طرف لڑھک گیا۔

میں نے وانگ سے کہا کہ تانی، اس کی ماں اور اس کے بھائی کے ہاتھ کھول دو۔ اِدھر

...نے خود آگے ہو کر تانی کے باپ کے ہاتھ کھول دیئے۔ جو دو لڑکیاں سمیع اللہ کے ...انے آئی تھیں وہ بھاگ گئی تھیں۔

میں نے وانگ سے کہا کہ لوگوں سے کہو کہ یہ لاشیں اٹھا کر دریا میں پھینک آئیں۔

میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ وہ کیا طاقت تھی یا کیا جذبہ تھا جو اچانک میری ذات ...ے اٹھا اور پانچ آدمی ایک ہی بار میرے ہاتھوں مارے گئے۔ میں اپنے آپ کو ہیرو یا بہادر ...ونی نہیں سمجھتا۔ وہاں کوئی قانون تھا ہی نہیں۔ جس کے ہاتھ میں لاٹھی آ گئی بھینس اُسی ...ی تھی۔ سمیع اللہ کے ہاتھ میں چار ڈاکو اور قاتل تھے لہٰذا وہ بادشاہ تھا۔ میرے پاس ...ائفل تھی میں نے سمیع اللہ کا تختہ ہی الٹ کر اسے اس کے اور اس کے محافظوں کو ان ...ے خون میں ڈبو دیا۔

اب مجھے سوچنا تھا کہ میرا اگلا قدم کیا ہو گا۔ ابھی تو یہ حال تھا کہ تانی، اس کا باپ، اور ...ں کی ماں میرے قدموں میں گرے ہوئے تھے اور وہ مجھے دیوتا سمجھ رہے تھے۔

وہ تو مجھے دیوتا سمجھ رہے تھے لیکن یہ چھ سات سو افراد کا جو ہجوم میرے سامنے موجود تھا' اس کے متعلق میں ابھی کچھ نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور ان لوگوں میں کس کا ردِ عمل کیسا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ ان لوگوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو سمیع اللہ کے معتقد اور مرید تھے اور انہیں یقین تھا کہ سمیع اللہ کے ہاتھ میں کوئی غیبی طاقت ہے۔ اگر میرے ہاتھ میں رائفل نہ ہوتی اور میں سمیع اللہ اور اس کے چار محافظوں کو چاقو یا کسی اور ہتھیار سے مار ڈالتا تو یہ لوگ مجھ پر ٹوٹ پڑتے اور میرے جسم کی بوٹی بوٹی کر دیتے۔ میں ان لوگوں کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ جسے پیر و مرشد اور نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہیں' وہ فریب کار اور گنہگار تھا اور وہ ان پر ان چار غنڈوں کے زور پر حکومت کر رہا تھا لیکن میں نے پہلے یہ دیکھنا تھا کہ یہ لوگ میری بات کو قبول کریں گے بھی یا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو مجھے آج تک یاد ہے کہ مجھے خود اپنے متعلق معلوم نہیں تھا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ خیالوں کا ایک ریلا آتا تھا اور ذہن میں سے گزر جاتا تھا۔ میں گناہگار ضرور تھا میں قاتل نہیں تھا۔ زندگی میں پہلا جو قتل کیا تھا وہ صدیق کو گولی ماری تھی۔ یہ پہلے تفصیل سے سنا چکا ہوں کہ صدیق کو میں نے گولی سر میں کیوں اور کن حالات میں ماری تھی۔ میں اسے قتل ہی کہتا ہوں لیکن یہ ایک نیکی بھی تھی۔ میں نے صدیق کو بڑی ہی بری اذیت سے نجات دلائی تھی۔ بہرحال وہ ایک انسان تھا جسے جینے کا حق حاصل تھا لیکن وہ جس حالت میں زندگی کے دن پورے کر رہا تھا وہ حالت دیکھنے والوں کے لئے یا کم از کم میرے لئے قابلِ برداشت نہیں تھی۔ صدیق اُسے کس طرح

برداشت کرنا ہو گا۔

اب میں نے پانچ آدمیوں کو قتل کر ڈالا تھا وہاں ایسا خطرہ بالکل نہیں تھا کہ میں گرفتار ہو جاؤں گا اور عدالت سے مجھے سزائے موت مل جائے گی۔ خطرہ یہ تھا کہ ابھی تو میں جذبات کی گرما گرمی میں تھا' کیا اس کے بعد بھی میں پانچ انسانوں کا خون ہضم کر سکوں گا؟ یہ تھا وہ خطرہ جو میرے سامنے آن کھڑا ہُوا تھا۔ میرے سامنے پانچ لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور خون چبوترے پر پھیل گیا تھا۔

میں نے وانگ کو اپنے پاس بلایا۔ سمیع اللہ اور اس کے چار ساتھیوں کی لاشیں دیکھ کر وانگ کے چہرے پر رونق آگئی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر خوشی سے پھدکتا پھر رہا تھا۔ اسے یہ اطمینان بھی تھا کہ میں نے اُسے اپنا معتمد بنا لیا تھا۔ میں نے تانی اور اُس کے چھوٹے بھائی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ انہیں کہو وہ میرے قدموں سے اٹھے اور ادھر بیٹھ جائیں۔ اس نے انہیں وہاں سے اٹھا دیا اور کہا کہ وہ چبوترے کے ایک کونے پر جا بیٹھیں۔

"میں ایک سوچ میں پڑا ہُوا ہوں وانگ!" — میں نے کہا — "میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ سب لوگ میرے متعلق اور سمیع اللہ کے قتل کے متعلق کیا سوچ رہے ہیں معلوم کرو کہ انہیں سمیع اللہ کا مر جانا اور ان غنڈوں کا مارے جانا اچھا لگا ہے یا بُرا"۔

"میں ابھی معلوم کرتا ہوں" — وانگ نے کہا۔

"ایک کام کرو وانگ" — میں نے کہا — "ان لوگوں سے کہو کہ چپ چاپ بیٹھے رہیں اور شور شرابہ نہ کریں انہیں جو بات کہنی ہے وہ تمہاری معرفت مجھ سے کہیں"۔

وانگ نے لوگوں کی طرف منہ کر کے اپنی زبان میں بات کی۔ اس نے خاموش ہو کر سب پر نظر دوڑائی۔ اتنا بڑا ہجوم جو آپس میں کھُسر پھُسر کر رہا تھا اور بعض آدمی اونچا بھی بول رہے تھے۔ اس ہجوم کا یہ حال ہو گیا کہ جیسے وہاں کوئی انسان ہے ہی نہیں مکمل سناٹا طاری ہو گیا۔ میں سمجھتا تھا کہ وانگ نے انہیں کیا کہا ہے۔ ان لوگوں کی خاموشی دیکھ کر میں یہ بھی سمجھ گیا کہ ان لوگوں پر میرا یا میری رائفل کا خوف طاری ہو گیا ہے۔

"وانگ!" — میں نے کہا — "انہیں کہو کہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر ان میں سے کوئی مجھے بُرا بھلا کہے گا تو میں ذرا سی ناراضگی کا بھی اظہار نہیں کروں گا"۔

وانگ ایک بار پھر لوگوں سے مخاطب ہُوا۔ آخر بوڑھا سا ایک بری اٹھا اور اُس نے کوئی بات شروع کر دی۔ جو خاصی بلند آواز میں بول رہا تھا اور اس کے بولنے کے انداز

میں غصہ بھی تھا اور احتجاج بھی۔

"یہ سمیع اللہ کا کچھ زیادہ ہی معتقد معلوم ہوتا ہے" ——— وانگ نے مجھے بتایا ——— اُس نے کہا ہے کہ یا حضرت ہمارے پیرو مرشد تھے اور یہ ان ہی کی برکت تھی کہ ہم سب رنگون سے یہاں تک بخیرو خوبی پہنچ گئے ہیں اور بڑی اچھی محفوظ زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ یا حضرت کی لعنت ہم سب پر پڑے گی۔ اگر یا حضرت نا ہوتے تو ہم رنگون سے زندہ نہ نکل سکتے اور ہماری بیٹیاں جاپانیوں کے پاس ہوتیں"۔

تین چار اور برمی اٹھ کھڑے ہوئے انہوں نے اکٹھے ہی بولنا شروع کر دیا۔ وہ بھی غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ وانگ نے مجھے بتایا کہ وہ اس بوڑھے کی تائید میں بول رہے ہیں۔

پھر ایک اور برمی اٹھا۔ اس نے بازو لہرا لہرا کر اور بڑے ہی جوش و خروش سے کوئی بات کہی وہ بار بار اس بوڑھے اور اس کی تائید میں بولنے والوں کی طرف اشارے کرتا تھا۔

"یہ آدمی ان کی مخالفت میں بول رہا ہے" ——— وانگ نے مجھے بتایا ——— "یہ آدمی بوڑھے سے کہہ رہا ہے کہ تمہاری ایک بہو کئی بار سمیع اللہ کے پاس گئی ہے اور اس نے رات وہیں گزاری ہے..... پھر یہ آدمی کہتا ہے کہ ان لڑکیوں کو اور جوان عورتوں کو ہم رنگون جاپانیوں سے بچا کر لائے ہیں لیکن ان کی عزت یہاں بھی محفوظ نہیں۔ سمیع اللہ کو جو بھی لڑکی اچھی لگتی تھی اسے سب کے سامنے اپنے ساتھ اپنے جھونپڑے میں لے جاتا تھا اور اس کو صبح واپس بھیجتا تھا۔ پھر اس آدمی نے کہا کہ سمیع اللہ کے یہ چار آدمی جو پیشہ ور ڈاکو اور قاتل تھے۔ اس بستی میں من مانی کر رہے تھے کسی کی بیٹی ان چاروں سے محفوظ نہیں تھی پھر اس آدمی نے کہا کہ سمیع اللہ مارا گیا ہے"۔

پھر یہ حالت ہو گئی کہ ہجوم سے کئی آدمی اٹھے اور وہ اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ بحث کرنے لگے جیسے لڑ رہے ہوں۔ وانگ نے مجھے بتایا کہ ان میں کچھ آدمی سمیع اللہ کے حق میں اور دوسرے اس کے خلاف بول رہے ہیں۔

"صاحب!" ——— وانگ نے مجھے کہا ——— "آپ اپنا حکم چلائیں۔ ان لوگوں کی نہ سنیں۔ یہ ان پڑھ اور پس ماندہ لوگ ہیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ سمیع اللہ اور اس کے ان چار غنڈوں کا مارے جانے کا بہت ہی اچھا واقعہ ہے۔ ان لوگوں کی رائے اور

شورے نہ لیں"۔

میں نے وانگ سے کہا کہ میں ان لوگوں سے مخاطب ہوتا ہوں۔ وہ یوں کرے کہ ں اردو بولوں گا اور جب میرا ایک فقرہ ختم ہو تو وہ اس کا اپنی زبان میں ترجمہ کر کے ان وں کو بتائے کہ میں نے کیا کہا ہے۔

"میرے بزرگو! میرے بھائیو اور دوستو!" ——— میں نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنا روع کیا ——— "تم میں زیادہ تر لوگ مسلمان ہیں میں نے تم میں سے کسی ایک کو بھی نماز ھتے نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ اس یا حضرت نے جس کا اصل نام سمیع اللہ تھا۔ ہیں خدا کے راستے سے ہٹا دیا تھا اور اس نے تمہیں یہ بتایا تھا کہ تم صرف سمیع اللہ کی ات کرو۔ مسلمان کے لئے خدا سے ہٹ کر خدا کے کسی بندے کی عبادت کرنا گناہ یرہ ہے۔ اس شخص نے تمہارے دماغوں میں یہ غلط بات ڈال رکھی تھی کہ اس کے میں چار جن ہیں اور یہ حضرت سلیمانؑ کا خلیفہ ہے۔ میں نے اسے گولی مارنے سے کہا تھا کہ اگر تمہارے قبضے میں جنات ہیں تو انہیں بلا لو کہ وہ تمہیں مجھ سے بچا لیں نے اس کے جنات کا انتظار کیا لیکن یہ شخص مجھ سے ڈرتا رہا اور کہتا رہا کہ رائفل کر لو۔ میں نے اسے تمہارے سامنے گولی مار کر مار ڈالا۔ اگر اس کے قبضے میں جنّات تے تو وہ فوراً اس کی مدد کو پہنچتے لیکن یہ سب جھوٹ تھا اگر اس کے پاس چار جنّات تو وہ یہ ہی غنڈے ڈاکو اور قاتل تھے جنہیں میں نے مار ڈالا ہے ان کی تعداد بھی چار ۔ میں تم لوگوں کو سچ بتاتا ہوں کہ اس نے مجھے کہا تھا کہ تمہارے پاس رائفل ہے' یرے ساتھ یہیں رہو تا کہ تم لوگ اس سے ڈرتے رہو۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ اس ی جس لڑکی پر ہاتھ رکھو گے وہ میرے حکم سے رات کو تمہارے پاس آ جائے گی'"۔

وانگ میری باتیں برمی زبان میں ساتھ ساتھ ان لوگوں کو سناتا جا رہا تھا۔

"میں نے تمہاری عزّت محفوظ کر دی ہے" ——— میں نے کہا ——— "اب تمہاری ں کو کوئی بُری نظر سے نہیں دیکھے گا۔ جتنے مسلمان ہیں وہ خدا کی عبادت شروع کر یہاں بدھ مذہب کے جو لوگ ہیں وہ اپنی عبادت کریں۔ خدا سب کا ایک ہے اگر ب جدا ہو گئے ہیں تو ایک دوسرے کے دشمن نہ بن جاؤ۔ خدا کو یہ دشمنی اچھی نہیں مذہب الگ ہیں تو کوئی بات نہیں تم ایک دوسرے سے الگ نہ ہو جانا۔ اتفاق اور میں برکت ہے۔ تم سب دعا کرو کہ جنگ جلدی ختم ہو جائے۔ یہاں آپس میں پیار

اور محبت سے رہو۔ میں تمہارے ساتھ نہیں رہوں گا مجھے آگے جانا ہے"۔

میں نے اُن لوگوں کو ذرا لمبا لیکچر دیا تھا۔ وانگ نے میرا ہر ایک لفظ اُن کے کانوں تک پہنچا دیا تھا۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ لوگ ٹھنڈے رہے اور کسی نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ صرف ایک آدمی اٹھا اور اُس نے کچھ کہا۔

"صاحب!" ـــ وانگ نے مجھے کہا ـــ "یہ آدمی کہتا ہے کے آپ چلے گئے تو ان کی حفاظت کون کرے گا"۔

میں نے وانگ سے کہا کہ انہیں کہو کہ تم خدا کی عبادت کرو گے اور خدا سے جو کچھ بھی مانگو گے وہ تمہیں مل جائے گا اگر تم ایک دوسرے کے ساتھ پیار اور محبت اور ایک دوسرے کی ہمدردی دل میں رکھ کر رہو گے تو تم دیکھنا خدا کس طرح تمہاری مدد کو پہنچتا ہے..... وانگ نے میری اس بات کا ترجمہ کر کے لوگوں کو سنا دیا۔

سورج پہاڑی کے پیچھے چلا گیا تھا۔ جنگلاتی اور کوہستانی علاقوں میں شام اس وقت شروع ہو جاتی ہے جب سورج افق سے ابھی کچھ اوپر ہوتا ہے' اور جب سورج غروب ہو جاتا ہے تو جنگل میں شام تاریک ہو جاتی ہے۔ میں نے وانگ سے کہا کہ یہ پانچ لاشیں دریا میں پھینکنی ہیں۔ پھر اس سے پوچھا کہ لاشیں دریا تک کس طرح اٹھا کر لے جائی جائیں گی۔ وانگ نے بتایا کے یہاں چارپائی تو ہے ہی نہیں۔ وہ بانس کاٹ لائیں گے اور ان کی سیڑھیاں بنا کر ہر سیڑھی پر ایک لاش رکھیں گے اور دریا میں پھینک آئیں گے۔

بغیر کیلوں کے سیڑھیاں نہیں بنائی جا سکتیں تھیں۔ وانگ نے اعلان کیا کہ یہ پانچ لاشیں دریا میں پھینکنی ہیں۔ کئی آدمی اٹھ کھڑے ہوئے ان میں ہر ایک آدمی ایک لاش کندھے پر اٹھا کر دریا میں پھینکنے کے لئے تیار ہو گیا۔

شام خاصی تاریک ہو چکی تھی جب پانچ آدمی چبوترے پر چڑھے اور ہر ایک نے ایک ایک لاش اس طرح اٹھالی کے اسے کندھے پر ڈالا سر پیچھے کی طرف اور ٹانگیں آگے کی طرف لٹک رہی تھیں۔ جب یہ لاش بردار چبوترے سے اُتر کر دریا کی طرف چلے تو تمام لوگ ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ میں اور وانگ اس جلوس کے آگے آگے تھے۔ تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہو گا کے ایک آدمی بڑے غصے اور بڑی اونچی آواز میں بولنے لگا۔ لاش بردار رک گئے۔ میں نے پیچھے دیکھا اور پھر وانگ کی طرف دیکھا۔

"صاحب!" ـــ وانگ نے کہا ـــ "اس آدمی نے کہا ہے کہ ان گنہگاروں اور

معاشوں کی لاشوں کو اتنے احترام سے اٹھا کر کیوں لے جا رہے ہو۔ انہیں نیچے پھینکو اور ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹ کر دریا تک لے جاؤ"۔

"اس نے ٹھیک کہا ہے" ـــ میں نے کہا ـــ "انہیں کہو کے لاشیں گھسیٹ کر لے جائیں یہ لوگ احترام کے قابل نہیں تھے"۔

پانچوں آدمیوں نے وانگ کے کہنے پر لاشیں پھینک دیں پھر میں نے یہ منظر دیکھا کہ ایک لاش کے ساتھ دو دو آدمی ہو گئے ایک نے ایک ٹخنہ اور دوسرے نے دوسرا ٹخنہ پکڑا اور اس طرح لاشوں کو گھسیٹتے ہوئے دریا تک لے گئے۔

سب میری طرف دیکھ رہے تھے۔ وانگ نے مجھے بتایا کہ یہ لوگ میری اجازت کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے سر سے اشارہ کیا۔ دو دو آدمیوں نے ایک ایک لاش اٹھائی اور دو تین ہلارے دے کر لاش دریا میں پھینک دی۔ اس طرح پانچوں لاشیں دریا میں پھینک دی گئیں اور وہ نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

"دیکھو وانگ!" ـــ میں نے کہا ـــ "تم اب ان لوگوں میں گھومتے پھرتے رہنا۔ ہمارے جو دوست اور ساتھی ہیں انہیں بھی کہنا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور بات چیت کرتے رہیں۔ مجھے معلوم ہونا چاہئے کہ یہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں اور ان کا ردِعمل کیا ہے"۔

"ٹھیک ہے صاحب!" ـــ وانگ نے کہا ـــ "میں آپ کو ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اب آپ یا حضرت سمیع اللہ کی جھونپڑی میں رہا کریں۔ یہ بہت اچھی جھونپڑی ہے۔ یہ لوگ اب آپ کو اپنا مرشد مانیں گے"۔

ہم وہاں سے واپس چل پڑے تھے اور باتیں کرتے آ رہے تھے۔

"میری ایک بات غور سے سن لو وانگ!" ـــ میں نے کہا ـــ "میں مرشد نہیں بننا چاہتا۔ میں ایسا ہی انسان رہنا چاہتا ہوں جیسے یہ انسان ہیں اور جیسے تم ہو۔ میں ان کا حکمران بھی نہیں بنوں گا۔ میں نے آگے جانا ہے۔ میں یہاں رک کر کروں گا بھی کیا؟ میری منزل کچھ اور ہے"۔

"آپ آگے نہ جائیں صاحب!" ـــ وانگ نے کہا ـــ "میں نے آگے کی جو باتیں سنی ہیں' وہ بڑی خطرناک ہیں۔ آگے سوائے موت کے کچھ بھی نہیں اگر آپ کو جنگلیوں نے پکڑ لیا تو وہ آپ کے ساتھ بہت بُرا سلوک کریں گے"۔

میں آج اس وقت کو یاد کرتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے میں نے خواب دیکھا تھا۔ وہاں کا ہر منظر خواب جیسا تھا۔ وہاں کسی کی بادشاہی نہیں تھی۔ وہ چھ سات سو آدمی، عورتیں اور بچے میرے غلام بننے کو تیار تھے۔ میں نے پانچ آدمیوں کو مار ڈالا تھا تو مجھے کوئی پکڑنے والا نہ تھا نہ وہاں کوئی قانون تھا۔ بلکہ لوگ میرے آگے سجدے کرنے کو تیار ہو گئے تھے۔ ایسے منظر خواب میں ہی نظر آیا کرتے ہیں۔

○

شام کھانا کھانے کے بعد وانگ اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ میرے جھونپڑے میں آگیا۔ میں اب سمیع اللہ کے جھونپڑے میں آگیا تھا۔ یہ جو برمی وانگ کے ساتھ میرے پاس آئے تھے، ان میں سے دو وانگ کی طرح بدھ مت کے پیروکار تھے اور دو مسلمان۔ یہ سب میرے بہت ہی مشکور تھے کہ میں نے انہیں سمیع اللہ اور اس کے غنڈوں سے نجات دلا دی تھی۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ میں ان کے ساتھ رہوں اور آگے نہ جاؤں۔

میں انہیں بتا رہا تھا کہ میں رک نہیں سکتا لیکن ان کی ضد ایسی تھی کہ ان کی یہ خواہش ایک تقاضا بن گئی۔ یہ سب لوگ دراصل ڈرے ہوئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں بہتر طریقے سے ان کی حفاظت کر سکتا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں انڈین نیشنل آرمی کے ہیڈ کوارٹر تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس آرمی کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا بھی لیکن انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ اتنا ہی جانتے تھے کہ وہ جاپانیوں سے ڈر کر بھاگ آئے ہیں۔ یوں کہہ لیں کہ وہ ریفیوجی تھے یعنی پناہ گزین۔

میں نے ان سے پوچھا کہ اس سے آگے کا علاقہ کیسا ہے۔ مشکل یہ تھی کہ میں برما سے ناواقف تھا۔ میں انہیں بتا ہی نہیں سکتا تھا کہ میں کس جگہ تک جانا چاہتا ہوں۔ یہ پانچوں آدمی جو میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی وانگ کی طرح اُردو سمجھ لیتے تھے اور کچھ بول بھی لیتے ہیں۔

"ہم آپ کو یہ تو نہیں بتا سکتے کہ جہاں آپ جا رہے ہیں وہ جگہ کتنی دُور ہے اور آپ کس راستے سے جائیں" ــــ وانگ نے کہا ــــ "البتہ ہم آپ کو یہ بتا سکتے ہیں کہ آگے جو علاقہ ہے اس میں کیا کیا خطرے ہیں"۔

"وہ تمام خطرے یہاں بھی موجود ہیں" ــــ ایک اور برمی نے کہا ــــ "یہ نہ

جھیں کہ یہ خطرے بہت دُور سے شروع ہوں گے بلکہ جہاں آپ اس وقت موجود ہیں' وہ خطرے یہاں بھی موجود ہیں"۔

"مجھے یہ خطرے بتاؤ" ــــ میں نے کہا۔

"ایک خطرہ تو آپ نے دیکھ لیا ہے" ــــ وانگ نے کہا ــــ "یہ ہے اژدھا.....

پ نے ایک اژدھا کو تو مار دیا تھا لیکن اس علاقے میں یہ ایک ہی اژدھا نہیں تھا۔ جہاں پ کو اس قسم کا ٹھہرا ہوا پانی نظر آئے' وہاں محتاط ہو کر چلیں۔ اس علاقے میں دُور دُور ں اژدھا ملتے ہیں۔ بعض تو پانی میں ہوتے ہیں اور بعض خشکی پر بھی موجود ہوتے ہیں ین وہ ہری گھاس میں یا جھاڑیوں میں اس طرح چھپے ہوئے ہوتے ہیں کہ نظر نہیں تے۔ آپ نے احتیاط یہ کرنی ہے کہ کبھی پانی کے قریب آرام کرنے کے لئے یا سونے ے لئے نہ رکیں۔ رات کو بھی آپ جہاں رکیں احتیاط کریں۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ں کہ اژدھا درندوں کی طرح کسی کا تعاقب نہیں کیا کرتا۔ اگر اس کی زد میں یا اس کی ‌ ؤ میں کوئی جاندار آجائے تو وہ پکڑ لیتا ہے"۔

میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں نے آج تک کی زندگی میں صرف دو اژدھا دیکھے ۔ ایک وہ جس نے تانی کو پکڑ لیا تھا اور میں نے اسے مار ڈالا تھا۔ دوسرا اژدھا 1965ء لاہور چڑیا گھر میں دیکھا تھا۔ یہ لوگ جب مجھے بتا رہے تھے کہ برما کے جنگلوں میں ھا اکثر پائے جاتے ہیں تو میں نے نہیں مانا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ لوگ مبالغہ ائی کر رہے ہیں۔ میں آپ کو آج سے چھ سات سال پہلے کی بات سناتا ہوں۔ ایک ل نے جس کا نام جنرل سلم تھا اور وہ اس فوج کا کمانڈر تھا جس نے برما پر جوابی حملہ کر جاپانیوں کو پسپا کیا تھا' جنگ کے بہت بعد برما کے متعلق ایک کتاب لکھی تھی۔ مجھے ہ برما کے ساتھ بہت دلچسپی تھی اس لئے میں نے یہ کتاب پڑھی۔ اس نے جنگ کے ت زیادہ لکھے تھے لیکن برما کے جنگلوں کے متعلق بھی اس نے خاصا لکھا تھا۔

اس نے خاص طور پر لکھا تھا کہ برما کے جنگلوں میں دو خطرے ایسے تھے جنہیں نظر ز نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس کے لئے ہمیں الگ انتظامات کرنے پڑے۔ ایک تو اس ان اژدہوں کا ذکر کیا جو جگہ جگہ پائے جاتے تھے۔ اژدھا تو بہت اور بہت ہی بڑا پ ہوتا ہے' جنرل سلم نے جو دوسرا خطرہ اس کتاب میں لکھا وہ بھی سانپ ہی تھا جو ں میں سب سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اس نے لکھا کہ یہ سانپ چھ انچ سے لے کر آٹھ

انچ تک لمبا ہوتا ہے۔ یہ درختوں میں رہتا ہے۔

اس چھوٹے سے سانپ کے متعلق جنرل سلم نے لکھا کہ اس نے ہمارے بہت سے فوجیوں کو ہلاک کر ڈالا تھا۔ یہ سانپ درختوں کے ٹہنوں پر موجود رہتا ہے اور خطرہ یہ کہ اس کا رنگ سبز ہوتا ہے اس لئے درختوں کی شاخوں میں یہ نظر نہیں آتا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ برما کے درخت اونچے نہیں ہوتے۔ بعض درختوں کے نیچے سے ایک اچھے قد کا آدمی بغیر جھکے گزر سکتا ہے اور بعض اتنے کم بلند ہیں کہ ذرا جھک کر چلنا پڑتا ہے۔ اس طرح یہ سانپ درخت کے نیچے سے گزرنے والے آدمی کو ڈس لیتا ہے۔ یہ پیشانی کو کاٹتا اور اپنا زہر داخل کر دیتا ہے۔

اس کتاب کے علاوہ میں نے ایک اور کتاب پڑھی تھی جو ایک پاکستانی ریٹائرڈ میجر نے لکھی تھی۔ وہ برما فرنٹ پر لڑا تھا اور اس وقت وہ انڈین آرمی میں کیپٹن تھا۔ اس نے بھی ان اژدھوں اور درختوں میں رہنے والے ان سبز سانپوں کا ذکر کتاب میں کیا ہے۔ یہ تو آج کی بات سمجھیں، میں اس وقت کی بات سناتا ہوں جب میں ایک بھگوڑے فوجی کی حیثیت سے برمیوں میں جا پہنچا تھا۔ وانگ مجھے ان جنگلوں کے خطرے بتا رہا تھا۔

"آپ نے شاید ایک چیز غور سے نہیں دیکھی" —— وانگ کہہ رہا تھا —— "ہم میں سے کوئی بھی آدمی جب جنگل میں جاتا ہے تو وہ اپنے سر کے گرد کپڑے کی ایک پٹی باندھ لیتا ہے اور اس پٹی پر ایک پٹی چمڑے کی باندھی جاتی ہے۔ یہ ایک بیلٹ سی ہوتی ہے۔ بعض آدمیوں نے چمڑے کے اس ٹکڑے پر چھوٹے چھوٹے کیل یا کانٹے ٹھونکے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ سبز سانپ سے بچاؤ کا انتظام ہے۔ اس سانپ نے صرف ماتھے پر کاٹنا ہوتا ہے۔ اگر آپ نے یہ پٹی یا یہ بیلٹ نہ باندھی تو آپ اس سانپ کا شکار ہو جائیں گے۔ یہ سانپ اتنا زہریلا ہوتا ہے کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر اس کا ڈسا ہوا انسان مر جاتا ہے"۔

میں نے جنرل سلم کی کتاب میں یہ پڑھا تھا کہ اس سانپ نے صرف ان فوجیوں کو ڈسا تھا جو اپنا سٹیل ہیلمٹ اتار کر ان جنگلوں میں سے گزرتے تھے۔ فوجیوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ جب درختوں کے نیچے سے گزریں تو اپنا سٹیل ہیلمٹ اس طرح سر پر رکھیں کہ ان کی پیشانیاں ڈھکی ہوئی ہوں۔

"اور صاحب!" —— وانگ کہہ رہا تھا —— "یہاں سب سے بڑا خطرہ شیروں اور

بھیڑیوں کا ہے۔ یہ درندے پہلے بھی ہوتے تھے لیکن اتنے زیادہ نہیں تھے۔ یہ تمام ملک کے جنگلوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اب چونکہ ہر طرف جنگ لگی ہوئی ہے اس لئے سارے جنگلوں کے درندے اس طرف آگئے ہیں کیونکہ اس طرف انہیں کوئی دھماکہ سنائی نہیں دیتا۔ یہ ہم سب کے لئے خطرہ بن گیا ہے۔ ہماری اس بستی کے ارد گرد بھی یہ درندے موجود ہیں لیکن قریب نہیں آتے"۔

"انہیں شکار مل جاتا ہوگا" —— میں نے کہا —— "میں اتنا جانتا ہوں کہ بھوکا شیر انسانوں سے ڈرا نہیں کرتا۔ وہ انسانوں پر بھی حملہ کر دیتا ہے"۔

"ان کے لئے شکار بہت ہے" —— وانگ نے کہا —— "خرگوش بہت ہیں اور بلّی جتنے بڑے بڑے چوہے بھی ان جنگلوں میں بہت پائے جاتے ہیں۔ بکرے کی نسل کا ایک جانور بھی ان جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ ہرن بھی مل جاتے ہیں۔ ان جنگلوں میں بندر اور لنگور بھی بہت ملتے ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ شیر کو اور کوئی شکار نہ ملے تو وہ بھیڑیے کو ہی پکڑ کر کھا لیتا ہے۔ بندروں اور لنگوروں کو بھی یہ درندے اپنی خوراک بنا لیتے ہیں"۔

"آپ کے پاس رائفل ہے صاحب!" —— ایک اور آدمی بولا —— "آپ اپنی حفاظت کر سکتے ہیں لیکن آپ کو احتیاط کرنی پڑے گی کہ اچانک پیچھے سے کوئی درندہ آپ پر حملہ نہ کر دے"۔

"یہاں قریب سے کوئی سڑک تو گزرتی ہوگی!" —— میں نے کہا۔

"سڑک بہت ہی دور ہے" —— ایک برمی نے جواب دیا —— "اگر آپ اس سڑک تک پہنچ گئے تو آپ کو وہاں شاید اپنے فوجی مل جائیں۔ اگر اپنے فوجی نہ ملے تو جاپانی مل جائیں گے"۔

میں نے سوچا کہ فوجی اپنے ملیں یا جاپان کے، میرے لئے دونوں خطرناک ہوں گے۔ کیونکہ اپنے فوجی ملے تو وہ مجھے اپنے کسی افسر کے سامنے پیش کریں گے اور میں جب اسے بتاؤں گا کہ میں اپنی بٹالین سے بھٹک گیا تھا تو وہ نہیں مانے گا۔ مانے گا یا نہیں، یہ ایک الگ بات تھی، اس نے یہ کارروائی تو ضرور کرنی ہوگی کہ مجھے پیچھے بھیج دے گا البتہ جاپانیوں کے متعلق مجھے خیال آیا کہ میں انہیں بتاؤں گا کہ میں آئی این اے میں جانا چاہتا ہوں اور اسی لئے اپنی فوج سے بھاگ آیا ہوں تو شاید وہ مجھے میری منزل تک پہنچا دیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مجھے جنگی قیدی بنا لیں اور بھوکا پیاسا مار ڈالیں۔ بہر حال میں

ایسی صورتِ حال میں پھنس گیا تھا جس طرح کوئی اُڑتا ہُوا آزاد پرندہ دانے پر اُترتا اور جال میں پھنس جاتا ہے۔

یہ لوگ رات بہت دیر تک میرے پاس بیٹھے رہے۔ انہوں نے مجھے جو معلومات دیں ان سے میں نے یہ اخذ کیا کہ میں پھنس گیا ہوں اور یہاں سے خدا کی ذات ہی مجھے نکال سکتی ہے۔ پھر بھی میں مایوس نہیں تھا' میں نے سوچا کہ چلتا چلوں گا' کہیں تو جا نکلوں گا۔

○

یہ پانچوں چلے گئے تو میں نے دیا بجھا دیا اور لیٹ گیا۔ جوانی کی عمر تھی' لیٹتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔

میں نے دیکھا کہ میں جنگل میں جا رہا ہوں اور جھکے جھکے درختوں کی ٹہنیاں میرے سر کو لگ رہی ہیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ ٹہنیاں میرے بالوں میں سے کنگھی کی طرح گزر رہی ہوں۔ مجھے ان کا اپنے سر سے ٹکرانا بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ میں چلتا گیا اور اچانک میرے ماتھے پر کوئی چیز لگی۔ مجھے فوراً یہ انتہائی خوفناک احساس ہُوا کہ مجھے سبز سانپ نے ڈس لیا ہے۔ میں نے اوپر دیکھا تو ایک سبز سانپ نظر آیا۔ میں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ مجھ پر اس قدر خوف طاری ہو گیا کہ میں منہ سے نہ جانے کیسی آوازیں نکالنے لگا اور اس کے ساتھ ہی تاریکی چھا گئی اور میری آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ میں اپنے ماتھے پر صاف محسوس کر رہا تھا کہ ابھی ابھی یہاں کوئی چیز لگی تھی۔

یہ تو میں نے دیکھ لیا کہ میں ایک ڈراؤنا خواب دیکھتے ہوئے جاگ اٹھا ہوں لیکن دل پر ایسا خوف جیسے میں ابھی مر جاؤں گا۔ دل بڑی تیزی سے اور بڑے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں اٹھ بیٹھا اور اونچی آواز میں کلمہ شریف پڑھنے لگا۔ کمرہ تاریک تھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میرے پاس کوئی بیٹھا ہُوا ہو۔

میں نے اس طرف ہاتھ بڑھایا تو ہاتھ انسانی جسم کو جا لگا۔ میرے منہ سے گھبرائی ہوئی سی آواز نکلی —— "کون ہو تم؟" —— اور میں تیزی سے اٹھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ماچس کہاں رکھی ہے۔ میں نے بڑی تیزی سے ماچس اٹھائی' جلائی اور دیا روشن کیا۔ اس دوران مجھے نسوانی آوازیں سنائی دیں —— "تانی..... تانی"۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تانی میرے بستر کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے

سکون کا سانس لیا۔ میں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور پھر ہاتھ کو دیکھا۔ یہ احساس ابھی تک موجود تھا کہ سبز سانپ نے مجھے پیشانی پر کاٹا ہے۔ میں بستر پر جا بیٹھا۔

"تم اس وقت کیوں آئی ہو؟" —— میں نے تانی سے پوچھا۔

اُس نے اس طرح سر ہلایا جس کا مطلب غالباً یہ تھا کہ وہ میری زبان نہیں سمجھتی تھی۔ اُس نے ہاتھ جوڑ دیئے اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے ایک بار پھر ماتھے پر ہاتھ رکھا اور ہاتھ کو دیکھا۔ تانی شاید سمجھ گئی تھی کہ میں نے اپنے ماتھے پر کسی چیز کا لمس محسوس کیا تھا۔ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا پھر اپنے ہونٹوں پر دو انگلیاں رکھیں اور پھر یہ انگلیاں میرے ماتھے پر رکھیں۔ میں اس کا یہ اشارہ سمجھ گیا۔ میں جب سویا ہُوا تھا تو اس نے میرا ماتھا چُوما تھا۔

وہ میرے قریب سرک آئی۔ اس نے ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔ وہ میرے آگے جھکتے جھکتے اتنی جھک گئی کہ اس کے جڑے ہوئے ہاتھ اور پھر اس کی پیشانی اور ناک میرے پاؤں کو چھُونے لگی۔ میں نے اُس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اُسے اٹھا دیا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر انگلیاں میرے بالوں میں اُلجھا لیں اور پھر میرے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

اگر میری عقل نے صحیح راہنمائی کی تھی تو میں یہ سمجھا کہ میں جب سویا ہُوا تھا تو یہ دبے پاؤں اندر آ کر میرے پاس بیٹھ گئی اور اس نے میرے بالوں پر ہاتھ پھیرا تھا اور نہ جانے کتنی دیر ہاتھ پھیرتی رہی تھی۔ یہاں سے میرا وہ خواب شروع ہُوا تھا کہ میں درختوں کے نیچے سے گزر رہا ہوں اور درختوں کی جھکی ہوئی ٹہنیاں میرے بالوں کو چھو رہی ہیں۔ جب تانی نے میرا ماتھا چوما تو خواب میں مجھے یہ نظر آیا کہ سبز سانپ نے میرے ماتھے پر کاٹ لیا ہے۔

میرے لئے تانی نے اچھی خاصی مشکل پیدا کر دی۔ میں نے سوچا کہ اس کا باپ اسے اپنے جھونپڑے سے غیر حاضر دیکھ کر ادھر آ نکلا تو وہ مجھے بھی سمیع اللہ جیسا بدکار سمجھے گا۔ مشکل یہ تھی کہ تانی میری زبان نہیں سمجھتی تھی اور میں اس کی زبان سمجھنے سے معذور تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر آئی ہے۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ یہ لڑکی میری بہت ہی مشکور اور ممنون ہے۔ میں نے اسے سمیع اللہ سے اور اس کے غنڈوں سے بچا لیا تھا اور اس کے باپ کو موت کے منہ سے

نکالا تھا۔ میں نہ ہوتا تو اس کے باپ کی گردن کٹی ہوئی ہوتی اور یہ لڑکی سمیع اللہ کے جھونپڑے میں ہوتی۔

دوسری مشکل جو اس لڑکی نے میرے لئے پیدا کر دی تھی وہ یہ تھی کہ وہ بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی اور اس کی عمر بمشکل سولہ سال تھی۔ میں فرشتہ نہیں تھا' میں ولی اللہ بھی نہیں اور صوفی بھی نہیں تھا۔ میں فوجی تھا اور جوان تھا۔ یہ حسین اور دلکش لڑکی میرا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔ یہ مجھے بہت ہی طاقتور انسان سمجھتی تھی۔ اس کا چہرہ اور اس کی حرکتیں بتا رہی تھیں کہ یہ میرے اشارے کی منتظر ہے۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس کے بال ریشم سے زیادہ ملائم تھے۔ بالوں کے لمس نے مجھ پر کوئی اور ہی کیفیت طاری کر دی۔

میں نے اشاروں میں اُس سے پوچھا کہ اُس کا باپ اور اس کی ماں کہاں ہیں۔ وہ میرے یہ اشارے سمجھ گئی۔ اُس نے آنکھیں بند کر کے اشارہ کیا کہ وہ گہری نیند سوئے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میرا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور اس ہاتھ کو چومنے لگی۔ یہ تو میں نے سنا تھا کہ شیطان انسان کو ورغلا لیتا ہے لیکن عملی طور پر مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ شیطان جب ورغلانے پر آتا ہے تو انسان کے لئے مزاحمت کس قدر دشوار ہو جاتی ہے۔

میری نظریں تانی کے چہرے پر جم کے رہ گئیں۔ سچ پوچھئے تو میں نے شیطان کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ میں نے اُس کے کندھوں پر بازو رکھا تو وہ سرک کر میرے اور زیادہ قریب ہو گئی۔ میں نے اُسے دونوں بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔ اُس نے میرے منہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں میری آنکھوں میں پڑیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ میں آج بھی نہیں بتا سکتا کہ مجھے ان معصوم آنکھوں میں کیا نظر آیا کہ میں نے اُسے آہستہ آہستہ ذرا پرے کر دیا۔ پھر میں سرک کر اس سے ذرا دُور ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور میں بھی مسکرایا۔ اس نے کچھ کہا جو میں نہ سمجھ سکا۔ میں نے اسے کچھ کہا جو وہ نہ سمجھ سکی۔

میرے سامنے وہ منظر آگیا کہ یہ لڑکی رسیوں میں جکڑی ہوئی تھی اور اس کا منہ بندھا ہُوا تھا۔ اُس کے چھوٹے بھائی کو بھی اسی طرح رسیوں سے باندھ دیا گیا تھا اور اس کا باپ جلاّد کے سامنے بیٹھا تھا۔ مجھے تانی کا اور اس کے چھوٹے بھائی کا اس وقت کا تڑپنا

یاد آگیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ خیال آیا کہ میں نے ایک نیکی کی تھی اور اب میں اس معصوم لڑکی سے اس نیکی کی قیمت وصول کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے اسے اشارہ کیا کہ وہ اٹھے اور چلی جائے۔ وہ نظریں میرے چہرے پر جمائے آہستہ آہستہ اٹھی اور اس طرح مجھے دیکھتے ہوئے دروازے کی طرف چل پڑی۔ دروازے میں جا کر رک گئی۔ اس وقت اس کے چہرے کا تاثر ذرا بدل گیا تھا اور اس کے ہونٹوں پر جو جذباتی مسکراہٹ تھی وہ اداس سی ہو گئی تھی۔ میں اٹھا اور اس کے قریب چلا گیا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ جب میں نے اسے جسم سے الگ کیا تو اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھے اور میرے آگے رکوع کی حالت میں چلی گئی۔ پھر اسی طرح پیچھے ہٹتے ہٹتے وہ میرے جھونپڑے سے نکل گئی۔

میں تو بڑی گہری نیند سو گیا تھا لیکن تانی میری نیند اڑا گئی۔ میں بستر پر کروٹیں بدلنے لگا اور بہت دیر بعد مجھے اونگھ آئی اور میں سو گیا۔ میں اگلی صبح نہیں بلکہ اگلے روز جاگا۔ روز اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جب میری آنکھ کھلی اُس وقت دن آدھا گزر گیا تھا۔ سب سے پہلا جو خیال میرے ذہن میں آیا وہ تانی کا تھا۔ تانی نازک اندام اور پھولوں جیسے ملائم بدن والی لڑکی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی ہے۔ اُس کے چہرے کے تاثرات میری پلکوں میں محفوظ تھے اور اُس نے میرے جسم پر جہاں جہاں ہاتھ لگایا تھا' وہاں وہاں میں اس کے ہاتھوں کا لمس ابھی تک محسوس کر رہا تھا۔ ایک سرور سا تھا جو مجھ پر طاری ہو گیا تھا۔

میں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ تانی کو میں اپنے دل میں کیا مقام دوں۔ میں نے اس داستان میں پیچھے کہیں سنایا ہے کہ انگریزوں کے دَور کے ہندوستانی فوجیوں کا کردار اور اخلاق کیا ہوتا تھا۔ میں بھی انہی فوجیوں میں سے تھا۔ محاذ سے واپس آیا ہوا فوجی جب شہر میں آتا تھا تو وہ سب سے پہلے عصمت فروشوں کے بازار کا رخ کرتا تھا۔ اُس وقت کے فوجی کی نظر میں عورت تفریح اور جسمانی تسکین کا ذریعہ تھی۔ میں جن حالات میں سے گزر رہا تھا اور میں جس صورتِ حال میں جا پھنسا تھا' میرا ذہن فرار کے راستے تلاش کر رہا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں تانی جیسی حسین لڑکی کا مل جانا ایسے ہی تھا جیسے خدا نے آسمان سے بہت بڑی نعمت صرف میرے لئے پھینکی ہو۔

میں بستر پر بیٹھا تانی کے متعلق سوچتا رہا اور تانی کا تصوّر مجھ پر ایک نشہ بن کر طاری

ہوتا چلا گیا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ میرے اندر سے ایک آواز اٹھی تھی کہ یہ لوگ پہلے سمیع اللہ اور اس کے غنڈوں کی وحشت میں مبتلا رہے ہیں اور مجھے یہ اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں اس لئے میرا رویّہ سمیع اللہ جیسا نہیں ہونا چاہئے۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن تانی کا سراپا پھر میرے سامنے آجاتا تھا۔ میں نے اس کے بالوں کی ریشم جیسی ملائمت محسوس کی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے میں نے گلاب کے کھلے ہوئے پھول پر ہاتھ پھیرا ہو۔

میں آج اپنا اُس وقت کی کیفیت کو سامنے رکھ کر تجزیہ کر سکتا ہوں۔ اُس عمر میں میں صرف یہ محسوس کر رہا تھا کہ میرے اندر ایک کشمکش شروع ہو گئی ہے اور جیت آخر تانی کی ہوتی تھی یعنی میرا ذہن تانی پر آکر رک جاتا اور مجھے یہ تاثر دیتا کہ تمہارا مطلوب اور مقصود یہی ہے۔

کچھ دیر بعد میں نہایا اور پھر میرا نوکر کھانا لے آیا۔ کھانے کے دوران بھی میرے تصوّروں میں تانی گھومتی پھرتی رہی۔

میں باہر نکل گیا اور بستی سے کچھ دُور جا کر قدرت کے حُسن کو دیکھا۔ ایسا سبزہ اور ایسے خوبصورت پہاڑ اور درخت میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میری نظریں بار بار بستی کی طرف گھوم جاتی ہیں۔ ان نظروں کو تانی کی تلاش تھی۔ کچھ دیر گھوم پھر کر میں واپس اپنے جھونپڑے میں آگیا۔ ابھی میں بستر پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک نوجوان برمی میرے کمرے میں داخل ہُوا۔ اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر ہاتھ جوڑے، اور ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھ کر رکوع کی پوزیشن میں چلا گیا۔ میں نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

وہ اسی طرح ہاتھ جوڑے ہوئے میرے سامنے بیٹھ گیا پھر جس طرح رات تانی نے ہاتھ جوڑ کر میرے پاؤں پر سجدہ کیا تھا اسی طرح اُس نے بھی کیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کے کندھے تھامے اور اس کو اوپر کیا۔ تب میں نے دیکھا کہ یہ بہت ہی خوبصورت جوان ہے۔

"کہو، کیسے آئے ہو؟" —— میں نے پوچھا۔

وہ چپ چاپ میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا اور اس نے سر دائیں بائیں ہلا کر بتایا کہ وہ میری زبان نہیں سمجھتا۔

وہ میرے سامنے بیٹھا اس طرح کی حرکتیں کرتا رہا جیسے میں بت ہوں اور وہ میری پوجا کر رہا ہو۔ کبھی وہ مسکرانے لگتا اور جب میں مسکراتا تو وہ ہاتھ جوڑ کر ماتھے کے ساتھ لگاتا اور جھک جاتا۔

"تانی!" —— اُس نے کہا —— "تانی....." —— اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور مسکرایا۔

مجھے بالکل ہی سمجھ نہ آئی کہ اس نے تانی کا نام کیوں لیا ہے اور کیا اشارہ کیا ہے۔ مجھے یہ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میں کس طرح کا اشارہ کروں جس سے یہ سمجھ جائے کہ میں پوچھ رہا ہوں کہ اس نے تانی کا نام کیوں لیا ہے۔ میں نے اتنا ہی کیا کہ مسکرا کر سر ہلایا جیسے مجھے اس کی یہ بات پسند آئی ہو۔

وہ کچھ دیر بیٹھا اور پھر میرے آگے سجدہ کر کے چلا گیا۔ میں ان قیاس آرائیوں میں الجھ گیا کہ وہ کیوں آیا تھا اور اشاروں اشاروں میں کیا کہہ گیا ہے۔ ایک تو میں یہ سمجھا کہ یہ مجھے پیر و مرشد یا دیوتا سمجھ کر خراج عقیدت پیش کرنے آیا تھا۔ پھر خیال آتا تھا کہ یہ کمسن لڑکا ہے، اسے خراجِ عقیدت پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی، اور جب یہ خیال آیا کہ اس نے دو بار تانی کا نام لے کر سینے پر ہاتھ رکھا تھا تو میری سوچیں الجھ گئیں۔

شام کو تانی کا باپ آگیا۔ وہ بھی میرے آگے سجدے کرنے لگا۔ وہ اُردو کا کوئی کوئی لفظ جانتا تھا لیکن پوری بات نہیں کر سکتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ اب میں لحہ بہ لحہ اور روز بہ روز کی روداد مختصر کر دوں۔ اگر میں تفصیلات سنانے بیٹھ گیا تو یہ داستان کہیں ختم ہونے میں ہی نہیں آئے گی۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ اگلے تین چار دن میرا یہ معمول بن گیا کہ میں بستی میں اور بستی کے ارد گرد اور ایک بار پہاڑیوں کے پیچھے گیا اور گھوم پھر کر واپس آیا۔ کبھی تانی میرے پاس آکر بیٹھ جاتی۔ اس کا انداز اور رویّہ اور اس کی حرکات ویسی ہی ہوتیں جیسے اس نے پہلی رات کی تھیں۔ وہ مجھے بڑی ہی سخت آزمائش میں ڈال رہی تھی۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ یہی کہتا کہ یہ لڑکی مجھے دعوتِ گناہ دے رہی ہے۔ میں یہی سمجھ سکتا تھا کہ میں نے اس پر جو احسان کیا تھا وہ اس کے صلے میں اپنا آپ پیش کر رہی ہے لیکن میں ایک کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔

تانی میرے کمرے سے نکلتی تو کچھ دیر بعد وہ خوبصورت نوجوان آجاتا اور مجھے بُت

سمجھ کر میری پوجا کرتا اور چلا جاتا۔ اس نے اپنا نام یوون بتایا تھا۔ لڑکا جاتا تو تانی کا باپ اور کبھی اس کی ماں اور ایک دو مرتبہ یوون کا باپ آ گیا۔

میں نے آخر تنگ آ کر وانگ سے ذکر کیا۔ میں پہلے سوچتا ہی رہا تھا کہ وانگ کو تانی کے سلسلے میں اعتماد میں لوں یا نہ لوں لیکن میں مجبور ہو گیا کہ کچھ سمجھنے کے لئے مجھے وانگ کی راہنمائی لینی پڑی۔

"صاحب!" —— وانگ نے کہا —— "مجھے اور میرے دوستوں کو معلوم ہے کہ تانی اور یوون آپ کے پاس آتے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ان دونوں کے باپ بھی آپ کے پاس آتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ تانی اور یوون کی آپس میں ایسی محبت ہے جسے بستی کا ہر فرد اور بچے بھی جانتے ہیں۔ وہ شادی کرنا چاہتے ہیں اور دونوں کے والدین کی بھی یہی خواہش ہے۔ آپ کے پاس وہ اس لئے آتے ہیں کہ آپ کو انہوں نے دیوتا کا درجہ دے دیا ہے۔ وہ پہلے آپ کی پوجا کر کے آپ کو خوش کر رہے ہیں۔ پھر انہوں نے آپ سے اجازت لینی ہے کہ یہ شادی کر لیں۔ دراصل بات یہ ہے صاحب! یا حضرت سمیع اللہ نے ان لوگوں پر اپنا قانون ٹھونسا ہوا تھا۔ اس کی مرضی کے بغیر کوئی شادی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ بھی وہی قانون چلائیں گے۔

سب سے پہلے تو مجھے شدید دھچکا لگا بلکہ یوں سمجھ لیں کہ مجھے صدمہ ہوا کہ تانی مجھے نہیں بلکہ یوون کو چاہتی ہے۔ میں تو سمجھا تھا کہ وہ مجھ پر فریفتہ ہو گئی ہے اور مجھے اپنا آپ پیش کر رہی ہے لیکن بات کچھ اور نکلی۔ میں نے اپنے آپ کو یہ فریب دیا کہ چلو اچھا ہوا کہ راز کی بات معلوم ہو گئی اور میں اس کشمکش سے آزاد ہو گیا جس میں میں نے اپنے آپ کو اُلجھا لیا تھا۔ وانگ کچھ کہہ رہا تھا لیکن اب میرا دھیان اس کی طرف نہیں تھا۔

"میری بات سنو وانگ!" —— "میں نے کہا —— "ان لوگوں سے کہو کہ اب یہاں سمیع اللہ والا قانون نہیں چلے گا۔ انہیں بتا دو کہ یہ سب آزاد ہیں اور صرف اپنے مذہب کے قانون کی پابندی کریں۔ تم یوں کرو کہ تانی اور یوون بدھ ہیں۔ بدھ مذہب میں جس طرح شادی ہوتی ہے اس طرح ان کی شادی کرا دو۔ میری طرف سے اجازت ہے کہ ہر کسی کو جس کام کو وہ جائز سمجھتا ہے کرے"۔

مجھے خیال آیا کہ ان لوگوں کے اوپر کوئی نہ کوئی حاکم یا راہنما ہونا چاہیے جو ان

لوگوں کے مسائل اور امور اور تنازعے سنے اور فیصلے کرے۔ میرے پیش نظر اپنے دیہاتی معاشرے کی پنچایت تھی۔ میں نے وانگ کے ساتھ اس کا ذکر کیا تو اس نے اور اس کے ساتھیوں نے بھی میرا یہ مشورہ پسند کیا۔ اسی رات میں نے چھ سات معمر اور دانشمند آدمیوں کو بلا کر ایک پنچایت بنا دی۔ ان میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اور دو بدھ تھے۔ ساری بستی کو اکٹھا کر کے میں نے وانگ کی معرفت بتایا کہ اب یہ بزرگ تمہارے مسئلوں کے، جھگڑوں کے اور بیاہ شادیوں کے فیصلے کیا کریں گے۔

اس رات تانی میرے کمرے میں آئی تو وہ اس قدر خوش تھی کہ بچوں کی طرح میرے ساتھ حرکتیں کرنے لگی۔ مجھ پر اس کی خوشی کی حقیقت واضح ہو چکی تھی اس لیے صرف میں مسکراتا رہا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے افسوس بھی ہوا کہ میں اس لڑکی کو جو سمجھا تھا وہ بالکل ہی غلط سمجھا تھا تانی میری نہیں تھی، وہ یوون کی تھی، اور اسے ایسے ہی نوجوان کا انتخاب کرنا چاہیے تھا۔



جنگ بہت دُور لڑی جا رہی تھی۔ اتنی دُور کہ جنگ کے ہلکے دھماکے بھی سنائی نہیں دیتے تھے۔ میں تو جنگ کو بھول ہی گیا تھا اور کبھی تو مجھے ایسا خیال بھی آ جاتا تھا کہ میں انہی جنگلوں میں پیدا ہوا تھا اور انہی جنگلوں میں گھومتا بھٹکتا مر جاؤں گا۔ مجھے احساس ہے کہ مجھ پر جو کیفیت طاری ہوتی چلی جا رہی تھی وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکا اور کیفیت بیان کی بھی نہیں جا سکتی۔ بعض احساسات کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالا ہی نہیں جا سکتا۔

میں جنگ کو بھول ہی گیا تھا۔ لیکن ایک روز جنگ اچانک ہی ہماری بستی میں پہنچ گئی۔ دن کا پچھلا پہر تھا۔ میں اپنے کمرے میں وانگ اور اس کے تین چار ساتھیوں کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا۔ اچانک بستی میں شور اٹھا، شور بھی ایسا جیسے بہت بڑی مصیبت نازل ہو گئی ہو۔ میں نے رائفل اٹھائی اور ہم سب اس طرح کمرے سے باہر نکلے جس طرح توپوں کے دھانوں سے گولے نکلتے ہیں۔

باہر یہ منظر تھا کہ بستی کی ساری آبادی ایک جگہ اکٹھی تھی اور ہر کسی کی نظریں آسمان پر لگی ہوئی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے ہلکی ہلکی گونج کمرے میں سنی تھی لیکن توجہ نہیں دی تھی۔ میں نے اوپر دیکھا تو ایک فائیٹر ہوائی جہاز نظر آیا جو ڈول رہا تھا اور

اس میں ہلکا ہلکا سفید دھواں نکل رہا تھا۔

ہوائی جہاز ایک طرف مڑا۔ اس کی بلندی میرے اندازے کے مطابق دس بارہ ہزار فٹ ہو گی۔ ہوائی جہاز میں سے ایسی آوازیں نکلنے لگیں جیسے انجن میں کوئی خرابی ہو۔ ہوائی جہاز نے ایک چکر لگایا۔

میں نے پائلٹ کو ہوائی جہاز میں سے نکلتے دیکھا۔ فائیٹر جہازوں کی سیٹ جسے کاک پٹ کہتے ہیں اوپر ہوتی ہے۔ پائلٹ اوپر کو اٹھا اور اس نے بائیں کو جمپ لی۔ ہوائی جہاز آگے کو نکل گیا اور دو تین منٹ بعد پائلٹ کا پیراشوٹ کھل گیا اور وہ آہستہ آہستہ نیچے آنے لگا۔ ادھر ہوائی جہاز ناک کے بل ہو گیا اور اسے ہم سب نے دریا میں گرتے دیکھا۔

ہم سب کی نظریں پائلٹ کی طرف لگی ہوئی تھیں وہ پیراشوٹ کے نیچے بندھا ہُوا نیچے آ رہا تھا۔ بستی کے تقریباً" تمام آدمی اُس کی طرف دوڑ پڑے۔ مجھے اچانک ایک خیال آ گیا۔ وہ یہ کہ میرے پاس رائفل تھی۔ میں وردی میں تو نہیں تھا لیکن رائفل سے میں پہچانا جا سکتا تھا کہ میں فوجی ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ پائلٹ انگریز ہو گا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ ایئر فورس کے پائلٹ افسر ہوتے ہیں۔

لوگ تو پائلٹ کی طرف دوڑے اور میں اپنے جھونپڑے کی طرف دوڑا۔ رائفل بستر کے نیچے چھپا دی اور میں جھونپڑے سے دوڑتا ہُوا نکلا۔ میں نے سویلین کپڑے پہن رکھے تھے اور میں نے سوچ لیا تھا کہ یہ پائلٹ مجھ سے پوچھے گا کہ میں ہندوستانی ہوں اور ان لوگوں میں کیسے رہ رہا ہوں تو میں کیا جواب دوں گا۔

میں نے دُور سے دیکھ لیا کہ پائلٹ زمین پر اُتر آیا تھا۔ اور وہ اپنا پیراشوٹ لپیٹ رہا تھا۔ میں دوڑتا وہاں پہنچا۔ پائلٹ جب پیراشوٹ لپیٹ چکا تو میں آگے ہوا۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ وجہ صاف تھی کہ میں قد بت اور شکل و صورت سے ہندوستانی لگتا تھا اور باقی سب برمی تھے۔ میری بڑھی ہوئی داڑھی دیکھ کر وہ یہ بھی سمجھ گیا ہو گا کہ میں مسلمان ہوں۔

"میں ہندوستانی ہوں" —— میں نے ہاتھ اس کی طرف بڑھا کر کہا —— "آپ اچھی جگہ گرے ہیں۔ ہم لوگ آپ کی پوری پوری مدد کریں گے"۔

اُس نے مسکرا کر میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اس نے بتایا کہ وہ R.A.F (رائل ایئر

فورس) کا فلائیٹ لیفٹیننٹ ہے۔ آر اے ایف برطانیہ کی ایئر فورس کا نام تھا جو اب بھی ہے۔ میں اس کے ساتھ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ فوج کے انگریز افسر اُردو بول لیتے تھے اور سمجھتے بھی تھے لیکن ایئر فورس اور نیوی کے انگریز افسر اُردو نہیں جانتے تھے۔

میں اُسے اپنے ساتھ لے آیا۔ دو آدمیوں سے کہا کہ وہ اس کا پیراشوٹ اٹھا لیں۔ پیراشوٹ وانگ اور اس کے دو ساتھیوں نے اچھی طرح لپیٹ کر اٹھایا۔ میں وانگ کے پاس گیا اور اسے کہا کہ اس انگریز کو یہ پتہ نہ چلنے دینا کہ میں فوجی ہوں۔

اسے اپنے جھونپڑے میں لانے کی بجائے میں اُسے اُس جھونپڑے میں لے گیا جو مجھے سمیع اللہ نے دیا تھا۔ میرے کہنے پر وہاں فرش پر بستر بچھا دیا گیا اور میں نے پائلٹ کو اس بستر پر بٹھایا۔ وانگ دوڑا گیا وہ کچھ دیر بعد پانی چائے اور کچھ کھانے کے لیے لے آیا۔

مجھے انگریزی بولنے کی مشق نہیں تھی اس لیے میں رک رک کر بولتا تھا۔ انگریزی اس کی مادری زبان تھی اس لیے وہ ذرا تیز بولتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ ذرا آہستہ اور صاف بولے تاکہ میں اس کی بات اچھی طرح سمجھ سکوں۔ وہ زندہ دل آدمی معلوم ہوتا تھا۔ وہ ہنسا اور اس نے کہا کہ وہ آرام آرام سے بولے گا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ یہاں تک کس طرح آ گیا ہے۔ اس نے بتایا کہ جاپانی برما سے پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ انگریزوں اور امریکنوں نے مل کر جوابی حملہ کیا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہاں سے لڑائی کتنی دور لڑی جا رہی ہے۔ اس نے جو فاصلہ بتایا وہ ڈیڑھ سو میل کے لگ بھگ تھا۔ اپنے متعلق اس نے بتایا کہ اس کا فائیٹر سکواڈرن جاپانیوں کے مورچوں پر حملے کے لیے گیا تھا۔ حملے کے لیے جانے والے ہوائی جہازوں کی تعداد چوبیس تھی۔ اُدھر سے تقریباً" اتنی ہی تعداد جاپانی جہازوں کی آ گئی۔ نیچے سے ہوائی جہازوں کو گرانے والی توپیں اور مشین گنیں فائر کر رہی تھیں۔ فضا میں ہوائی جہازوں کی لڑائی ہوئی اور ہوائی جہاز پھیلتے ہی ہٹتے گئے۔ یہ فلائیٹ لیفٹیننٹ کچھ زیادہ ہی دُور نکل آیا۔

اس نے بتایا کہ اس کے پیچھے دو جاپانی ہوائی جہاز لگے ہوئے تھے۔ اس وقت تک یہ فلائیٹ لیفٹیننٹ جاپانیوں کے دو ہوائی جہاز گرا چکا تھا۔ آخر اس فلائیٹ لیفٹیننٹ کی مشین گنوں کا ایمونیشن ختم ہو گیا۔ اس نے اپنے ہوائی جہاز کے بچاؤ کا یہ انتظام کیا کہ اس نے ہوائی جہاز کو غوطے میں ڈال دیا۔ اور درختوں کی بلندی تک پہنچ گیا۔ اسے توقع تھی کہ یہ وادیوں میں چھپتا چھپاتا اُڑے گا اور جاپانی ہوا باز واپس چلے جائیں گے لیکن

جاپانی واپس نہ گئے۔

فلائیٹ لیفٹیننٹ نے جہاز بلندی پر کھینچا تو جاپانی پھر اس کے تعاقب میں آ گئے اور اس کے انجن میں کہیں گولیاں لگ گئیں۔ اس نے مجھے سنایا کہ شاید جاپانیوں کا بھی ایمونیشن ختم ہو گیا تھا اس لیے وہ واپس چلے گئے۔ یہ پائلٹ اتنی دور آ گیا تھا کہ اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ کہاں آن پہنچا ہے۔ گنوں میں ایمونیشن نہیں رہا تھا اور جب اس نے پٹرول دیکھا تو اس کی سوئی بھی خطرناک حد تک نیچے آ گئی تھی۔ اس کے علاوہ جو مشکل اس کے لیے پیدا ہوئی وہ یہ تھی کہ انجن گڑبڑ کرنے لگا تھا۔ کبھی تو انجن بند ہو جاتا اور ایک دو سیکنڈ بعد خود ہی چل پڑتا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ ہوائی جہاز ڈول رہا تھا۔

پھر انجن میں سے سفید دھواں نکلنے لگا۔ اب اس پائلٹ کے لیے یہی ایک چارہ رہ گیا تھا کہ وہ ہوائی جہاز میں سے نکل آئے۔ اس وقت وہ ہماری بستی کے اوپر تھا۔ اس نے کاک پٹ اوپر سے کھولی اور ہوائی جہاز میں سے باہر نکل آیا۔ اس طرح اس کی جان بچ گئی۔

"کیا تم نے یہاں یا اس علاقے میں کہیں بھی کوئی جاپانی فوجی دیکھا ہے؟" — اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں!" — میں نے جواب دیا — "یہ جگہ جنگ سے محفوظ ہے اور جیسا آپ خود بتاتے ہیں کہ یہ جگہ مورچوں سے کم و بیش ڈیڑھ سو میل دُور ہے..... اب آپ واپس کس طرح جائیں گے؟"

"میرا وائرلیس سسٹم بھی خراب ہو گیا تھا" — اس لیے میں اپنے سکواڈرن کمانڈر کو اور اپنے بیس کو بتا نہیں سکا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ میرا بیس کس طرف ہے۔ ایئر فورس فوج کے اگلے مورچوں سے بہت دُور پیچھے ہوتی ہے..... تم کون ہو؟ ان برمیوں میں تم کیا کر رہے ہو؟"

"میں رنگون میں کاروبار کرتا تھا" — میں نے جھوٹ بولا — "یہ سب لوگ رنگون کے رہنے والے ہیں۔ جب جاپانیوں نے حملہ کیا تو ہم سب وہاں سے بڑے اچھے وقت بھاگے اور یہاں پہنچ گئے۔ یہ بستی خالی پڑی تھی۔ ہم نے یہاں ڈیرے ڈال لیے"۔

"میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے تم مل گئے ہو" — اس نے کہا — "میں ان برمیوں پر بھروسا نہیں کر سکتا۔ ہمیں سرکاری طور پر بتایا گیا تھا کہ برما کے لوگ انگریزوں

کی نسبت جاپانیوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور ان برمیوں نے ہی جاپانیوں کے لیے برما پر قبضہ آسان بنایا تھا..... کیا تم واپس ہندوستان نہیں جانا چاہو گے؟"

"کیوں نہیں جانا چاہوں گا!" — میں نے کہا — "میں تو یہاں ان لوگوں میں تنگ آ گیا ہوں۔ میرے لیے مشکل یہ ہے کہ مجھے معلوم ہی نہیں کہ کس سمت کو چلوں اور اگر جاؤں بھی تو کس طرح اتنا لمبا سفر پورا ہو گا"۔

"میں سوچوں گا" — اس نے کہا — "میرے پاس اس علاقے کا نقشہ ہے جہاں ہم حملہ کرنے گئے تھے۔ میں نقشہ دیکھ کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ ہم کہاں ہیں۔ اس کے بعد واپسی کا پروگرام بنائیں گے۔ اگر ہم دونوں اکٹھے چلیں تو سہولت رہے گی۔ ابھی میں خود بھی چاہتا ہوں کہ تین چار روز یہیں رہوں"۔

"مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں" — میں نے کہا — "مجھے آپ جس طرح بھی کہیں گے میں آپ کا ساتھ دوں گا"۔

میں نے صاف طور پر نوٹ کیا کہ یہ آفیسر فوج کے افسروں سے بالکل ہی مختلف تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے مجبوری کے تحت اپنا رویّہ اور انداز دوستانہ کر لیا ہو‘ بہر حال یہ انگریز مجھے اچھا لگنے لگا۔

○

دو دن گزر گئے۔ پائلٹ میرے ساتھ بے تکلف ہو گیا۔ ہم لوگ جو غذا کھاتے تھے وہی وہ کھاتا تھا اور پسند بھی کرتا تھا۔ اس کے لیے ہر کھانے میں مچھلی ضرور رکھی جاتی تھی۔ دریا قریب تھا اور مچھلیاں پکڑنے والے ہم میں موجود تھے‘ وہ مچھلیاں پکڑ لاتے اور ہم کھاتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ یہ گورا بادشاہ بستی کے اندر زیادہ گھومتا تھا۔ دوسرے ہی دن اس نے میرے ساتھ برمی لڑکیوں کی باتیں شروع کر دی تھیں۔ میں نے بھی از راہِ مذاق یا جوانی کے جذبات میں آ کر لڑکیوں کی ہی باتیں کرنی شروع کر دی تھیں۔ وہ کہتا تھا کہ یہاں اس نے کچھ لڑکیاں ایسی دیکھی ہیں جن کے جسم انگریز لڑکیوں سے زیادہ اچھے ہیں۔

وانگ اور اس کے ساتھیوں نے اسے اس علاقے کی بنی ہوئی شراب بھی پلانی شروع کر دی تھی۔ میں نے اسے دو تین بار کہا کہ وہ اپنا نقشہ دیکھے اور معلوم کرے کہ ہم کہاں ہیں اور کس طرح یہاں سے ہندوستان کی طرف جا سکتے ہیں۔ اب اس کا رویّہ

ایسا ہو گیا تھا جیسے وہ یہاں سے جانا ہی نہیں چاہتا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کو یہ جگہ پسند آگئی ہے" ـــ ایک روز میں نے اسے کہا۔ "کیا یہاں آپ کا دل لگ گیا ہے؟"

"ہاں!" ـــ اُس نے ہنستے ہوئے جواب دیا ـــ "میں فضا میں بہت لڑا ہوں۔ میں کچھ دن آرام کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے میرا سکواڈرن کنگ لینڈ میں تھا۔ وہاں میرے سکواڈرن نے جرمنوں کے خلاف بہت لڑائیاں لڑی ہیں۔ پھر ہمیں ادھر بھیج دیا گیا۔ اب مجھے یہ موقع ملا ہے کہ میں اتنی دُور آگرا ہوں تو میں کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھاؤں اور کچھ دن آرام کر کے سوچوں کہ مجھے واپس کس طرح جانا چاہیے"۔

"کیا جاپانیوں نے ہندوستان پر ابھی تک حملہ نہیں کیا؟" ـــ میں نے اُس سے پوچھا۔

"ان کے ہوائی جہازوں نے کلکتہ کے قریب بندرگاہ پر بم گرائے ہیں" ـــ اس نے بتایا ـــ "لیکن اس سے آگے وہ نہیں آسکے۔ اب تو جاپانی حملہ کرنے کی پوزیشن میں رہے ہی نہیں۔ انہیں برما سے پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔ ہم نے آدھا برما ان سے آزاد کرا لیا ہے..... میں تمہیں یہ بتادوں کہ ہندوستان پر ہمارا قبضہ ہمیشہ رہے گا۔ ہندوستان کو ہم کسی قیمت پر نہیں چھوڑیں گے"۔

میں اس کے ساتھ ہندوستان کے موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے دل میں انگریزوں کی نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ اسی لئے میں اپنی بٹالین سے بھاگ آیا تھا۔ اس نے جب کہا کہ انگریز ہندوستان کو کبھی نہیں چھوڑیں گے تو مجھے غصہ سا آگیا اور میں خاموش رہا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ گورا جلدی یہاں سے چلا جائے۔ ابھی میرے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ میں اسے یہیں مار ڈالوں اور لاش دریا میں پھینک دوں۔ مجھے اس گورے کی زندہ دلی اچھی لگتی تھی۔

اگلے ہی روز وہ کچھ زیادہ ہی زندہ دلی پر اتر آیا۔ صبح کے ساڑھے دس یا گیارہ کا وقت ہو گا کہ دو برمی دوڑتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ اٹھوں اور اس پائلٹ کو ساتھ لے کر کسی طرف سیر کے لئے نکل چلیں۔ ان برمیوں نے مجھے جو اطلاع دی اس سے میرا خون کھول اٹھا اور میں دوڑتا ہوا باہر نکلا۔ اُس کا جھونپڑا بستی کی دوسری طرف تھا۔

میں اُدھر جا رہا تھا تو کچھ دُور سے نظر آیا کہ چار پانچ آدمی اس کے جھونپڑے کے باہر کھڑے تھے اور جھونپڑے کا دروازہ بند تھا۔ میں بڑی تیزی سے ان تک پہنچا۔ مجھے اطلاع یہ دی گئی تھی کہ اس گورے نے ایک نوجوان لڑکی کو پکڑ لیا ہے اور اسے اپنے ساتھ جھونپڑے میں لے گیا ہے۔ تین چار آدمیوں نے اس سے لڑکی کو چھڑانے کی کوشش کی تو اس نے ریوالور نکال لیا اور ان آدمیوں کی طرف ریوالور کیا تو وہ سب بھاگ گئے۔ پھر مجھے بتایا گیا کہ لڑکی کو بھی ریوالور سے ڈرا کر وہ جھونپڑے میں لے گیا اور دروازہ بند کر لیا۔

میں جب اس جھونپڑے تک پہنچا تو چھ سات آدمی جھونپڑے کے باہر کھڑے غصے سے کچھ بول رہے تھے۔ وہاں مجھے احساس ہُوا کہ میں خالی ہاتھ آگیا ہوں۔ میں نے اُس گورے سے رائفل چھپا کر رکھی ہوئی تھی تاکہ اسے یہ پتہ نہ چل سکے کہ میں فوجی ہوں۔ ایسے موقع جو اس گورے نے پیدا کر دیا تھا میرے ہاتھ میں رائفل ہونی چاہیے تھی۔

اس گورے پائلٹ کے پاس ریوالور تھا اور لمبا فوجی چاقو بھی تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ پائلٹ جب فضائی لڑائی کے لئے جاتے ہیں تو ہر پائلٹ کے پاس ریوالور اور لمبا چاقو یا گورکھوں والی کوکری ضرور ہوتی ہے۔ کوکری یا ککری گورکھوں کا ایک خاص ہتھیار ہے۔ یہ ایک قسم کا چھُرا ہوتا ہے جو آگے سے چوڑا اور پیچھے سے پتلا ہوتا ہے۔ یہ خاص طریقے سے چلایا جاتا ہے۔

یہ جانتے ہوئے کہ اس گورے کے پاس ریوالور اور چاقو ہے، میں نے پھر بھی یہ نہ کیا کہ واپس اپنے جھونپڑے میں جاتا اور رائفل لے کر آتا۔ میں اسے بدمعاشی کا پورا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو اندر جو منظر مجھے نظر آیا وہ بڑی ہی شرمناک اور میرے لئے اشتعال انگیز تھا۔

یہ گورا پائلٹ بالکل برہنہ تھا اور اس نے لڑکی کو بے بس کر کے اپنے نیچے گرایا ہُوا تھا اور اس کے کپڑے بھی اتار دیے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے ریوالور دکھا کر لڑکی کو ڈرایا اور اسے برہنہ کیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ریوالور اس کے قریب فرش پر پڑا تھا۔

میں نے لپک کر ریوالور اٹھا لیا اور اس کی نالی گورے کی کنپٹی پر رکھ دی۔

"گیٹ اپ!" ـــ میں نے اسے کہا ـــ "اپ..... اپ..... گیٹ اپ!"

اُس پر اُس وقت حیوانیت اور شیطانیت سوار تھی۔ اُس نے مجھے اس طرح دھتکارا جیسے میں اس کا غلام تھا اور میری کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ میں نے اپنے دل میں اسے سزائے موت دے دی تھی لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے سر میں گولی ماروں اور یہ فوراً مر جائے۔ میں نے بڑی تیزی سے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے بڑی ہی اذیت ناک موت ماروں گا۔

میں نے اس کی گردن سامنے سے اس طرح ایک ہاتھ میں پکڑ لی کہ اس کی شہ رگ میرے انگوٹھے اور شہادت اور درمیانی انگلی کے شکنجے میں تھی۔ میں نے اس کا سانس روک دیا اور اوپر کو زور دیا۔ وہ میرے اٹھتے ہوئے ہاتھ کے ساتھ ہی اوپر کو اٹھ گیا۔ وہ بے بس ہو چکا تھا۔ میں اسے اسی حالت میں باہر لے گیا اور اسی ہاتھ سے اسے زور سے دھکا دیا۔ اس وقت تک باہر سات آٹھ کی جگہ پندرہ بیس آدمی جمع ہو گئے تھے۔ میرے دھکے سے گورا ان آدمیوں کے درمیان جا پڑا۔

"اسے پکڑ لو" ــــ میں نے کہا۔

ان سب نے اسے جکڑ لیا۔ وانگ اور اس کے وہ ساتھی جو اردو سمجھتے تھے وہ بھی پہنچ گئے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ اسے کھلے میدان میں لے چلو۔ گورا پہلے تو مجھے دوستوں کی طرح کہتا رہا کہ میں ان لوگوں کی حمایت نہ کروں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ یہ میرا اور اس کے بعد تمہارا حق ہے کہ ان کی جو لڑکی اچھی لگے اسے استعمال کرو۔ میں نے اسے کچھ بھی نہ کہا جیسے میں اس کی کوئی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ جب لوگ اسے گھسیٹ کر لے جا رہے تھے تو اس نے بلند آواز میں مجھے اور ان لوگوں کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ میں اندر جھونپڑے میں چلا گیا۔ لڑکی بیچاری کپڑے پہن چکی تھی اور رو رہی تھی۔ میں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے باہر لے آیا۔ اسے اشارے سے بتایا کہ وہ دیکھو اس گورے کا کیا حال کیا جا رہا ہے۔ لڑکی مجھے رحم طلب نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اور اُس کے چہرے کے تاثرات میں تشکر کی جھلک نمایاں تھی اور وہ میری مشکور تھی کہ میں نے اُسے ایک حیوان سے بچا لیا تھا۔

میں اُس طرف چل پڑا جس طرف اس فرنگی کو لے گئے تھے۔ وہ جگہ خاصی کشادہ تھی اور ہموار بھی تھی۔ بستی کے تقریباً تمام لوگ شور شرابا سن کر آ گئے تھے۔ وہ نہ آتے تو میں انہیں بلا لیتا۔

میرے کہنے پر وہ ایک جگہ رک گئے۔ میں نے وانگ کو بلا کر کہا کہ ان لوگوں سے کہو کہ درختوں کی ٹہنیاں توڑ کر پتے الگ کر لیں۔ میں نے وانگ کو یہ بھی بتا دیا کہ ان ٹہنیوں کا استعمال کیا ہو گا۔

وانگ نے دوڑ کر یہ اعلان کیا۔ تین چار آدمیوں نے گورے پائلٹ کو پکڑے رکھا۔ باقی سب ٹہنیاں توڑنے اور ان کے پتے الگ کرنے لگے۔ اس طرح ہر ایک آدمی کے پاس ایک ایک چھڑی آ گئی۔ اس دوران یہ فرنگی واہی تباہی بکتا رہا۔ گورا برہنہ حالت میں تھا۔ میں نے وانگ کو آواز دے کر بلایا۔ وہ دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔

"اب یہ کام کرو وانگ!" ــــ "لوگوں سے کہو کہ اسے ان چھڑیوں سے پیٹنا شروع کریں۔ یہ مرتا ہے تو مر جائے۔ اسے اسی طرح جان سے مارنا ہے"۔ وانگ نے اپنی زبان میں وہیں کھڑے کھڑے اعلان کیا کہ اسے مارنا شروع کر دو۔ لوگوں نے اسے درختوں کی ٹہنیوں سے پیٹنا جو شروع کیا تو اس کے جسم سے خون پھوٹنے لگا۔ پہلے تو وہ چیخا چلایا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اس کی آواز بند ہو گئی۔ وہ گرا۔ لوگوں نے گرے ہوئے پر ٹہنیاں برسانی شروع کر دیں۔ میں نے دیکھا کہ جو آدمی پیچھے رہ گئے تھے وہ یوں دھکم پیل کر کے آگے جانے کی کوشش کرتے تھے جیسے اس گورے کو مارنا ثواب کا کام ہو۔ میں دُور کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔ میں نے ویسے ہی دائیں طرف دیکھا تو وہ لڑکی جسے یہ فرنگی اپنے ساتھ لے گیا تھا میرے پاس کھڑی تھی۔ میں اُسے دیکھ مسکرایا تو اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

"تقریباً" نصف گھنٹے بعد لوگ پیچھے ہٹنے لگے۔ مزید پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ مجھے یہ گنہگار فرنگی نظر آنے لگا۔ وہ اب انسان نہیں لگتا تھا۔ اس کا جسم خون کے رنگ جیسا ہو گیا تھا۔ میں اس تک پہنچا۔ اس کا چہرہ بھی پہچانا نہیں جاتا تھا۔ سر سے پاؤں تک کھال ادھڑ گئی تھی۔ میں نے اس کی نبض پر انگلیاں رکھیں۔ وہ مر چکا تھا۔

میں نے اُردو سمجھنے والے برمیوں سے کہا کہ جس طرح انہوں نے سمیع اللہ اور اس کے ساتھیوں کی لاشوں کو دریا میں پھینکا تھا' اسی طرح اس کی لاش کو بھی گھسیٹ کر دریا میں پھینک آئیں۔

اُس روز دریائے ریراوتی کی مچھلیوں کو کھانے کے لیے ایک اور انسان مل گیا۔



شام کھانے کے بعد وانگ اور چند اور برمی جو اردو زبان سمجھتے تھے' میرے پاس جایا کرتے اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہُوا کرتی تھیں۔ اس شام بھی وہ سب میرے پاس آئے اور قدرتی طور پر ہمارا موضوع یہی انگریز پائلٹ اور اس کا یہ گھناؤنا جرم تھا۔ میں نے ان برمیوں سے کہا کہ ساری بستی میں اعلان کر دو کہ کوئی بھی شخص کسی دوسرے کی عورت کے ساتھ دست درازی کرے گا' اسے یہی سزا دی جائے گی۔

میرے پاس اب ایک ریوالور بھی آ گیا تھا جس کے ساتھ چوبیس گولیاں تھیں۔ ایک بڑا چاقو بھی مل گیا تھا۔ میں نے اس گورے کی وردی اور شوز ان لوگوں کو دے دیئے اور کہا کہ کسی کو پہنا دینا۔ اس کا پیَراشوٹ لپیٹ کر اپنے پاس رکھ لیا۔

اس گورے پائلٹ کو لوگوں سے مروا کر میں نے اپنے آپ میں عجیب سی تبدیلی محسوس کی۔ مجھے یوں لگا جیسے خدا نے مجھے کوئی ایسی طاقت عطا کر دی ہے جو ہر انسان کو نہیں ملتی۔ میں یوں سمجھنے لگا کہ میں جسے چاہوں قتل کروا بھی سکتا ہوں اور کر بھی سکتا ہوں۔ البتہ میں نے اپنے آپ میں تبدیلی نہ آنے دی کہ میں اپنی اس طاقت پر فخر یا تکبر اور غرور کرتا۔ میں آج سوچتا ہوں کہ میں اگر اس وقت اپنے آپ میں غرور اور تکبر پیدا کر لیتا تو یہ آج تک مجھ میں موجود ہوتا اور میں بڑی ہی فضول زندگی گزار رہا ہوتا۔ میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ وہ فضا اور وہ ماحول اور وہ صورتِ حال تھی ہی ایسی کہ جس کے ہاتھ میں طاقت تھی وہی بادشاہ تھا۔ یہ کیفیت میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔

اگلے روز تانی اور یودن کی شادی ہو گئی۔ بدھ مت کا ایک معمّر پیروکار موجود تھا۔ شادی اس نے کروائی تھی۔ برمیوں کو جشن منانے کا موقع مل گیا۔ میں نے پہلی بار برمیوں کی شادی دیکھی۔ برمی لڑکیاں مل کر بھی ناچیں اور اکیلی لڑکی نے بھی رقص کے کمال دکھائے۔

اگلے روز بھی بستی والوں پر جشن کا موڈ طاری تھا۔ ہر کوئی خوش اور سرگرم نظر آتا تھا۔ تانی اور یودن کے والدین نے مل کر ساری بستی کو خاص کھانا کھلایا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس رات بھی یہ لوگ ناچ گانا کریں گے لیکن دن کے پچھلے پہر خوشیوں کے اس ہنگامے پر موت کی دہشت طاری ہو گئی۔ دو تین آدمی جنگل میں سے دوڑتے ہوئے آئے اور انہوں نے یہ خبر سنائی کہ ایک شیر نے ایک عورت پر حملہ کیا اور اسے اٹھا کر لے گیا ہے۔ عورت جس گھر کی تھی اس گھر میں تو کہرام برپا ہونا ہی تھا' میں نے دیکھا کہ

پوری بستی پر سناٹا اور خوف و ہراس طاری ہو گیا تھا۔

مجھے اطلاع ملی تو میں باہر نکلا۔ لوگ ٹولیوں میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ شیر نے کہاں اور کس طرح حملہ کیا ہے۔

عینی شاہدوں نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے کھیتوں میں جو پہاڑی کے دوسری طرف تھے' گئے تو اچانک جھاڑیوں میں سے ایک شیر نے جست لگائی اور اس عورت کو دبوچ لیا۔ انہوں نے دیکھا کہ شیر نے عورت کی گردن پیچھے سے منہ میں لے لی تھی۔ عورت کی تو آواز بھی نہ نکلی۔ شیر عورت کو گھسیٹتا ہُوا لے گیا۔ یہ جو آدمی دیکھ رہے تھے یہ چھپ چھپ کر بستی کی طرف دَوڑ پڑے۔

میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ شیر کس طرف گیا ہے انہوں نے یہ بھی بتایا کہ شیر دھاریدار ہے۔ اس سے پہلے شیر یا بھیڑیا بستی کے اتنی قریب نہیں آیا تھا۔ کبھی کبھی دور سے شیر کی دھاڑ یا بھیڑیوں کی آواز سنائی دیا کرتی تھی۔

بستی کے لوگ میرے اِرد گِرد اس طرح اکٹھے ہو گئے جیسے شیر کو صرف میں ہی مار سکوں گا۔ اُس دَور میں میں شیروں کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ شیر سے ہم سمجھتے تھے کہ یہ ببر شیر ہے۔ چیتا بھی سنا تھا۔ میں نے بیس بائیس سال بعد ایک آدمخور شیر کی پہلی کہانی پڑھی تھی۔ یہ اُردو کے ایک رسالے میں شائع ہوئی تھی۔ پھر میں نے آدمخور شیروں کی کہانیاں پڑھنی شروع کیں تو مجھے پتہ چلا کہ دھاری دار شیر ببّر شیر نہیں ہوتا بلکہ اسے ٹائیگر کہتے ہیں۔ وہ دھاری دار شیر ٹائیگر تھا جو اس عورت کو پکڑ کر لے گیا تھا۔ یہ تو بہت بعد میں جب میں نے آدم خور شیروں کی کہانیاں پڑھیں تو پتہ چلا کہ آدم خور شیر کو کس طرح مارا جاتا ہے۔ ایک درخت پر مچان بنائی جاتی ہے۔ نیچے بکرا یا بچھڑا باندھا جاتا ہے اور شکاری شام کے وقت مچان پر چڑھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ رات کسی وقت شیر بکرے یا بچھڑے کو پکڑنے کے لیے آتا ہے تو اوپر سے اسے گولی ماری جاتی ہے۔

یہ بہت بعد کی بات ہے کہ مجھے یہ معلومات حاصل ہوئی تھیں لیکن برما کے اس جنگل میں جب مجھے بتایا گیا کہ شیر فلاں طرف گیا ہے تو میں نے لوگوں سے کہا تھا میں رائفل لے کر شیر کے پیچھے جاؤں گا اور اسے مار کر واپس آؤں گا۔ میں نے کہا بھی ایسے تھا۔ رائفل کی میگزین میں راؤنڈ ڈالے' ایک راؤنڈ چیمبر میں کر کے سیفٹی کیچ چڑھا دیا اور باقی ایمونیشن جیب میں ڈال کر میں چل پڑا۔ میرے ساتھ چار آدمی ہو گئے۔ ان کے

پاس تلواریں تھیں۔ میرے پاس اب ریوالور بھی تھا لیکن ان برمیوں میں کوئی ایک بھی آدمی ایسا نہ ملا جو ریوالور چلا سکتا۔

ہم اس جگہ گئے جہاں شیر نے عورت پر حملہ کیا تھا۔ ایک عینی شاہد ہمارے ساتھ تھا۔ اس کی راہنمائی میں ہم اس طرف چل پڑے جدھر شیر عورت کو لے گیا تھا۔ راستے میں دیکھتا گیا تھا۔ خون کے نشان صاف نظر آئے تھے اور جہاں اونچی گھاس تھی وہاں صاف پتہ چلتا تھا کہ شیر عورت کو گھسیٹ کر لے جا رہا ہے۔ تقریباً" ایک میل دور گئے ہوں گے کہ جھاڑیوں میں عورت کی لاش پڑی مل گئی۔ شیر کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ یہ تو مجھے بائیس سال بعد پتہ چلا تھا کہ شیر اپنے شکار کو اسی وقت کھانے نہیں بیٹھ جاتا بلکہ کہیں جھاڑیوں میں چھپا دیتا ہے اور کچھ دیر بعد یا عموماً" رات کے وقت اطمینان سے کھاتا ہے۔

اس وقت ہم یہ دیکھ رہے تھے کہ عورت کی لاش سامنے پڑی ہے اور شیر وہاں موجود نہیں۔ میں نے اپنے ساتھ جانے والے آدمیوں سے کہا کہ لاش اٹھا لیں اور بستی میں لے چلیں۔ ان آدمیوں نے لاش کو اٹھا لیا۔ لاش کے کپڑے خون سے لال ہو گئے تھے۔

ہم سب بستی کی طرف آ رہے تھے کہ ہم سب نے چونک کر پیچھے، دائیں اور بائیں، دیکھا۔ یقیناً" ہم نے شیر کی ہلکی سی آواز سنی تھی۔ وہ غرایا تھا۔ میں نے بڑی تیزی سے رائفل کا سیفٹی کیچ آن کیا اور رائفل کندھے سے لگا کر نظریں ہر طرف دوڑائیں لیکن اونچی گھاس جھاڑیوں اور درختوں میں شیر کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے ان آدمیوں سے کہا کہ وہ تیز چلیں۔ وہ تو ڈر کے مارے بھاگنے کی رفتار سے چل پڑے۔ اور میں زیادہ تر دائیں بائیں اور پیچھے دیکھتا اُلٹے پاؤں چلتا آیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے ایک بار پھر شیر کی ہلکی ہلکی غرانے کی آواز سنی جو زیادہ دُور نہیں تھی۔ میں اور زیادہ چوکس ہو کر اُلٹے پاؤں چلنے لگا۔ شیر نظر نہیں آ رہا تھا۔

آخر ہم بستی میں داخل ہو گئے۔ خطرہ تھا کہ شیر بستی کے قریب آ جائے گا۔ ہم اس کا شکار اُٹھا لائے تھے۔ وہ یقیناً" بھوکا تھا ورنہ اس عورت پر حملہ نہ کرتا۔ ساری بستی عورت کی لاش کے گرد اکٹھی ہو گئی۔

عورت مسلمان تھی۔ اُسے غسل دیا گیا۔ کفن نہیں تھا۔ اُسے چادر میں لپیٹ کر دفن کرنا تھا۔ مجھے پیراشوٹ کا خیال آ گیا۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ میں کفن کا انتظام کرتا ہوں۔ اپنے جھونپڑے میں جا کر میں نے پیراشوٹ میں سے چاقو سے بہت بڑا ٹکڑا

کاٹا اور یہ عورت کے لواحقین کو دے دیا۔ اُنہوں نے اس میں میّت کو لپیٹا اور دفن کرنے کے لیے لے گئے۔ میں بھی اس جنازے میں شریک ہُوا۔

○

رات کو جب حسبِ معمول وانگ اور سات آٹھ آدمی میرے پاس آ کر بیٹھے تو موضوع شیر کا شکار ہونے والی عورت تھی اور شیر تھا۔ اور اس مسئلے پر گفتگو شروع ہو گئی کہ اس شیر کو کس طرح مارا جائے۔

"شیر کو مارنے کا یہ طریقہ نہیں" ـــــ ایک معمّر برمی نے کہا ـــــ "تمہیں لاش وہاں سے نہیں اٹھانی چاہیئے تھی۔ تم رائفل لے کر قریب کے کسی درخت پر چڑھ جاتے اور اپنے آپ کو شاخوں میں چھپا کر رکھتے۔ شیر نے لاش کو کھانے کے لیے آنا ہی تھا۔ جونہی وہ آتا تم اوپر سے اسے گولی مار دیتے"۔

"میں اس شیر کو مار کر ہی دم لوں گا" ـــــ میں کل صبح رائفل لے کر اس کی تلاش میں نکلوں گا"۔

"ایسی بیوقوفی نہ کرنا" ـــــ اس معمّر برمی نے کہا ـــــ "شیر تمہارے سامنے نہیں آئے گا۔ وہ چھپ چھپ کر پیچھے سے تمہارے قریب آئے گا اور اس سے پہلے کہ تم سنبھل سکو وہ تمہیں اپنے پنجوں اور منہ میں دبوچ لے گا۔ میں جوانی میں دو بار انگریز شکاریوں کے ساتھ جنگلوں میں گیا ہوں۔ طریقہ یہ ہے کہ کوئی جانور جنگل میں کہیں باندھ دو۔ جگہ وہی موزوں ہے جہاں عورت کی لاش پڑی تھی۔ خود درخت کی شاخوں میں چھپ جانا۔ شیر اس جانور کو پکڑنے کے لیے آئے گا اسے گولی مار دینا"۔

بستی میں خچریں بھی تھیں، دو گدھے تھے اور تین چار بکریاں بھی تھیں۔ کچھ بحث مباحثے کے بعد یہ طے ہُوا کہ کل اس جگہ جہاں سے لاش ملی تھی ایک بکری کو باندھا جائے گا۔ پھر میں کسی قریبی درخت پر چڑھ کر چھپ جاؤں گا۔ معلوم نہیں میرا ذہن اس طریقے کو کیوں قبول نہیں کر رہا تھا۔ یہ تو سال ہا سال بعد مجھے پتہ چلا تھا کہ شیر کو مارنے کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ میں اس طریقے کو بہتر سمجھتا تھا کہ رائفل لے کر جنگل میں نکل جاؤں گا اور شیر کو مار لوں گا۔

○

یہ لوگ جب رات کو اُٹھ کر چلے گئے اور میں جھونپڑے میں تنہا رہ گیا تو سوچنے لگا

کہ میں شیر کو مار سکوں گا یا نہیں۔ میں یہ نہیں سوچ سکا تھا کہ انسانوں کو مار لینا آسان ہوتا ہے۔ میرے ذہن میں یہ یقین بیٹھ گیا تھا کہ جس طرح دو منٹ میں میں نے پانچ آدمیوں کو گولی مار دی تھی اس طرح میں شیر کو بھی مار لوں گا۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔

میں اگلی صبح حسبِ معمول اس وقت جاگا جب سورج خاصا اُوپر آ گیا تھا۔ میں خدمت گار کو آواز دینے ہی لگا تھا کہ ناشتہ لے آئے' کہ مجھے دوڑتے ہوئے قدموں کی اور کچھ شور شرابے کی آوازیں سنائی دیں۔ دوڑتے قدم میرے جھونپڑے میں داخل ہوئے اور آنے والے آدمیوں دو نے مجھے اطلاع دی کہ شیر ایک لڑکے کو ابھی ابھی اٹھا کر لے گیا ہے۔

میں نے رائفل اٹھائی۔ رائفل میں کل کے راؤنڈ پڑے ہوئے تھے۔ میں ان آدمیوں کے ساتھ دوڑتا باہر نکلا۔ ہم اُس طرف دوڑتے گئے جدھر ہمیں بتایا گیا تھا کہ شیر لڑکے کو پکڑ کر لے گیا ہے۔ راستے میں یہ آدمی مجھے بتاتے گئے کہ تین چار لڑکے بستی سے دُور ٹیکری کے پیچھے چلے گئے تھے اور وہ وہاں بھاگ دوڑ رہے تھے۔ اچانک ایک جھاڑی کے اندر سے شیر نے جست لگائی اور تیرہ چودہ سال عمر کے ایک لڑکے کو منہ میں لے کر اُسی طرف چلا گیا جدھر وہ عورت کو لے گیا تھا۔

ہمارے پیچھے چار پانچ آدمی اور دوڑے آئے۔ ان کے پاس تلواریں تھیں۔ یہ عام قسم کی تلواریں نہیں تھیں بلکہ یہ چوڑے بلیڈوں والی تلواریں تھیں جو برما اور اس سے اگلے علاقوں میں عام طور پر دیکھنے میں آتی تھیں۔ بعض اوقات لاعلمی بہت فائدہ دیتی ہے۔ اُس وقت مجھے غم نہیں تھا کہ شیر کے تعاقب میں جا کر اسے مارنا بے حد خطرناک ہوتا ہے۔ مجھے یہ بھی بہت بعد میں معلوم ہُوا تھا کہ شیر پہلی گولی سے نہیں مرا کرتا۔ پہلی گولی کھا کر وہ گولی چلانے والے پر حملہ کرتا ہے اور عموماً" دوسری گولی چلانے کی مہلت نہیں دیتا۔ اگر شکاری دوسری گولی چلائے بھی تو وہ شیر کو اپنے اوپر آتا دیکھ کر اتنا گھبرا جاتا ہے کہ اس کی گولی خطا جاتی ہے' پھر اُس کا انجام یہی ہوتا ہے کہ شیر اُسے چیر پھاڑ دیتا ہے۔ یہ شیر کا جوابی اور انتقامی حملہ ہوتا ہے۔

میں نے رائفل کے آگے سنگین بھی چڑھا رکھی تھی۔ ہم دوڑتے جا رہے تھے اور راستے میں خون کے نشان اور گھاس پر لاش کے گھسیٹنے کے نشان نظر آ رہے تھے۔ بہت

دور جا کر ہم میں سے ایک آدمی اچانک رک گیا اور اس نے ہمارے آگے اپنے بازو پھیلا دیے۔ وہ ہمیں روک رہا تھا۔

"یہیں رکو" — اس نے کہا — "میں نے شیر کو دیکھ لیا ہے..... چھپ جاؤ اور ذرا آگے جھاڑیوں اور گھاس میں غور سے دیکھو تمہیں شیر بیٹھا ہوا نظر آئے گا۔ مجھے اُس کا تھوڑا سا سر نظر آیا تھا"۔

وہاں گھاس اتنی اونچی تھی کہ اچھے قد کے ایک آدمی کی کمر تک پہنچ جاتی تھی۔ جھاڑیاں بھی بہت زیادہ تھیں اور جھکے جھکے درختوں کی بھی بہتات تھی۔ میرے ساتھی پھیل گئے اور میں سیدھا چلتا رہا۔ اب ہم سب دبے پاؤں آگے بڑھ رہے تھے اور ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتے تھے۔

میں نے بائیں طرف دیکھا۔ ایک ٹیکری نظر آئی جو عام زمین سے تھوڑی سی اونچی تھی۔ میں جھک کر چلتا اس ٹیکری پر چلا گیا اور ایک درخت کے پیچھے چھپ کر ادھر دیکھنے لگا جدھر ہمارے ایک ساتھی نے شیر کا سر دیکھا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے ہم نے عورت کی لاش اٹھائی تھی۔ مجھے شیر نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ دو بھیڑیے نظر آئے جو ایک طرف سے اُدھر جا رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد تین اور بھیڑیے اُدھر سے ہی آتے دکھائی دیے اور وہ تینوں پہلے دو بھیڑیوں سے جا ملے۔ وہاں جھاڑیاں زیادہ بھی تھیں اور گھنی بھی تھیں اس لئے نظر نہیں آتا تھا کہ شیر وہاں ہے یا نہیں۔

پانچوں بھیڑیے رک گئے اور پھر سر نیچے کر کے بہت ہی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ وہ جوں جوں آگے ہوتے جاتے تھے' اونچی گھاس اور جھاڑیوں میں چھپتے جاتے تھے۔ اچانک شیر کے غرّانے کی آواز سنائی اور اس کے ساتھ ہی شیر کا سر اور پیٹھ نظر آئی۔ وہ بھیڑیوں کو بھگانے کے لئے ان کی طرف دوڑا تھا۔ پانچوں بھیڑیے پیچھے ہٹے اور ذرا ہی دیر بعد شیر ایک پہلو سے میرے سامنے آ گیا۔ فاصلہ تقریباً" ایک سو گز تھا۔ رائفل وہاں تک پوری طرح مار کر سکتی تھی۔ بھیڑیے پیچھے ہٹ کر رک گئے اور شیر ان سے تھوڑی دور رک کر غرّانے لگا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ شیر نے لڑکے کی لاش یہاں رکھی ہے اور اسے کھا رہا ہو گا کہ اتنے میں بھیڑیے آ گئے۔ میں نے رائفل کندھے سے لگائی اور درخت کا سہارا لے کر شیر کو شست میں لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ دھماکہ ہُوا اور اس کے ساتھ ہی شیر تھوڑا سا اوپر کو اُچھلا گرا اور پھر اٹھ کھڑا ہُوا۔

شیر شاید یہ سمجھ کر بھیڑیوں کی طرف دوڑا کہ اُنہوں نے اسے گولی ماری ہے بھیڑیے پیچھے کو دوڑے۔ شیر پیچھے کو مُڑا اور بڑی زور سے غرایا۔ میں نے اُسے ایک بار پھر شست میں لیا اور گولی چلا دی۔ وہ پہلے کی طرح اچھلا اور گر پڑا۔ اب وہ مجھے نظر نہیں آتا تھا کیونکہ گھاس اور جھاڑیوں نے اسے چھپا لیا تھا۔

میرے ساتھی جھکے ہوئے چلتے میرے پاس آ گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ شیر کو مار لیا ہے لیکن یہ یقین نہیں کہ وہ مر چکا ہے۔ اس کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اسے غصے سے غرانا چاہئے تھا۔ ہم نے یہ ارادہ کیا کہ ایک یا دو آدمی چھُپ چھُپ کر آگے جائیں اور دیکھیں کہ شیر وہاں موجود بھی ہے یا نہیں اور اگر موجود ہے تو مرا ہُوا ہے یا زندہ ہے۔

میں نے وہاں تک پہنچنے کا ایک محفوظ راستہ دیکھ لیا۔ میں ٹیکری کے دوسری طرف اترا اور اس طرف چل پڑا۔ تلواروں والے دو آدمی میرے ساتھ ہو گئے۔ ہم آہستہ آہستہ چلتے ٹیکری کی اوٹ میں وہاں تک پہنچ گئے۔ وہاں سے سیدھے ہو کر ایک درخت کی اوٹ میں سے دیکھا۔ شیر سامنے پڑا تھا۔ اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا خون بہتا صاف نظر آ رہا تھا۔ میں رائفل آگے کر کے ٹیکری پر چڑھا اور دوسری طرف اُترا۔ دونوں آدمی میرے ساتھ چل رہے تھے۔ انہوں نے تلواریں تان رکھی تھیں۔

ایک آدمی نے مجھے روک لیا۔ اس نے ایک پتھر اٹھایا اور شیر کی طرف پھینکا۔ شیر دُور نہیں تھا پتھر اس کے پیٹ پر لگا۔ شیر نے پھر بھی کوئی حرکت نہ کی۔ ہم تینوں دوڑ کر قریب پہنچے اور شیر کو دیکھا۔ میں نے رائفل کی نالی اس کی طرف کر رکھی تھی۔ میں نے اس کے سر پر سنگین چبھوئی وہ پھر بھی نہ ہلا۔ ہم نے فاتحانہ نعرے بلند کئے۔

میں نے دیکھا کہ میری دونوں گولیاں شیر کے پہلو میں لگی تھیں اور سینے میں سے گزری تھیں۔ ایک آدمی آگے چلا گیا اور اُس نے آواز دے کر بتایا کہ لڑکے کی لاش یہاں پڑی ہوئی ہے۔ میں نے جا کر دیکھا۔ تیرہ چودہ سال کا بچہ خون میں ڈوبا پڑا تھا۔ شیر نے اسے کھانا شروع کر دیا تھا۔ اس کا سینہ کھایا ہوا تھا اور پسلیاں نظر آ رہی تھیں۔

میں نے ایک آدمی کو بستی کی طرف اس کام کے لئے دوڑایا کہ وہ کچھ آدمیوں کو لے آئے جو لڑکے کی لاش اور مرے ہوئے شیر کو اٹھا لے چلیں۔

یہ شیر کا دوسرا شکار تھا۔ لڑکے کی لاش جب بستی پہنچی تو عورتوں نے چیخ چیخ کر اور

اپنے سینوں پر ہاتھ مار مار کر ماتم کیا۔ سب نے مرا ہوا شیر دیکھا۔ دیکھنے والوں میں وہ معمّر بری بھی تھا جس نے مجھے شیر کو مارنے کا صحیح طریقہ بتایا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر شیر کے چاروں پنجے دیکھے پھر اس کے ہونٹ اوپر نیچے کر کے اس کے دانت دیکھے۔

"اس نے تو عورتوں اور بچوں کو ہی کھانا تھا" ــــ اس معمر بری نے کہا ــــ "یہ معلوم نہیں کہاں سے اِدھر آ نکلا ہے۔ اس کے پنجے بڑھاپے کی وجہ سے اتنے گھِس گئے ہیں کہ یہ اب ہرن اور دوسرے تیز دوڑنے والے شکار کو پکڑ نہیں سکتا۔ اس کے دانت بھی کمزور ہو گئے ہیں۔ اس کے لئے اب آسان شکار انسان ہی تھا۔ ایسے ہی شیر آدم خور بن جایا کرتے ہیں۔ ہر شیر ایسا نہیں ہوتا۔ یہ مارا گیا ہے تو سمجھو ہماری بستی محفوظ ہو گئی ہے"۔

اگر میں فلسفہ اور نفسیات پڑھا ہُوا ہوتا تو کہیں کہیں تجزیہ بھی پیش کرتا جاتا۔ اس طرح بیک وقت دو سفرنامے پڑھنے والوں کے سامنے آجاتے۔ ایک یہ سفر جو میرے جسم نے کیا اور دوسرا وہ سفر جو میرے ذہن نے طے کیا۔ جسم کا سفر تو سناتا چلا جا رہا ہوں لیکن ذہن جن کٹھن راہوں اور جن اجنبی منزلوں سے گزرا وہ اپنی ایک اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں دلچسپی بھی ہے اور میرا خیال ہے کہ میں ان تبدیلیوں کا ذکر کروں جو میرے ذہن میں آئیں تو ہو سکتا ہے کہ کوئی بھولا بھالا مسافر صحیح راستے پر آجائے اور اللہ اسے اس کی منزل دکھا دے۔

میرے اس سفرنامے کے ابتدائی باب ایک بار پھر پڑھیں۔ آپ کو یاد آجائے گا کہ میں نے اپنے آپ کو نیک اور صاحبِ کردار کہیں بھی ظاہر نہیں کیا بلکہ صاف لفظوں میں بتایا ہے کہ میں کوئی نیک، شریف اور بااخلاق آدمی نہیں تھا۔ میں بڑے ڈھیلے کردار کا بندہ تھا۔ کسی عورت کے ساتھ ناجائز تعلقات کو جائز سمجھا کرتا تھا لیکن برما کے ان جنگلوں میں میرے سامنے ایک سے ایک بڑھ کر حسین برمی لڑکی تھی۔ یہ لوگ مجھے بڑا ہی طاقتور انسان سمجھتے تھے۔ سمیع اللہ نے اپنی نوسربازی اور چار نامی گرامی غنڈوں کے ذریعے ان لوگوں کو اپنا زر خرید غلام بنا رکھا تھا۔ میں نے سمیع اللہ کو اور اس کے غنڈوں کو مار ڈالا تھا۔ بستی کے لوگ اس وجہ سے بھی مجھ سے مرعوب ہوئے تھے کہ میں نے سمیع اللہ جیسے آدمی کو ختم کر کے اور اس کے غنڈوں کو بھی گولی مار کر بستی والوں کو آزاد کر دیا تھا لیکن میں صاف طور پر سمجھ رہا تھا کہ وہ اس کے بعد مجھ سے متاثر اور مرعوب ہوئے تو میرے اخلاق اور کردار سے متاثر ہوئے۔ وانگ اور اس کے ساتھی بھی کچھ کم

غنڈے نہیں تھے لیکن میں نے ان سب پر قابو پا لیا تھا۔

صرف تانی والا معاملہ سوچیں۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ وہ کس قدر حسین لڑکی تھی۔ اس کے حسن میں کوئی ایسی بات تھی کہ صوم و صلوٰۃ کی سختی سے پابندی کرنے والا بھی کوئی آدمی اسے دیکھ لیتا تو صوم و صلوٰۃ بھول جاتا۔ یہ نوعمر اور دلکش لڑکی رات کے وقت تنہائی میں میرے پاس اس جذباتی کیفیت میں آئی تھی کہ میں اسے جو کہتا وہ مان لیتی۔ میں اسے ساری رات اپنے پاس رکھ سکتا تھا لیکن میں نے اسے کہا کہ وہ چلی جائے۔ وہ جس طرح آئی تھی اسی طرح چلی گئی۔ یہ بات سنانے سے میرا مقصد یہ نہیں کہ آپ میری اور میرے کردار کی پختگی کی تعریف کریں بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ تعریف اُس اللہ کی کریں جس نے ہر انسان کو اتنی قوت عطا کی ہے کہ وہ شیطان کو شکست دے سکتا ہے۔ یہ میرا تجربہ ہے لیکن میں یہ بھی بتا دوں کہ شیطان پر قابو پانے کے لئے اپنے خلاف یعنی اپنے نفس کے خلاف بڑی ہی شدید جدّوجہد کرنی پڑتی ہے۔

یہ تمہید باندھنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کو صرف سنسنی خیز، جذباتی اور چسکے دار کہانیاں ہی نہیں سنانا چاہتا بلکہ میں چاہتا یہ ہوں کہ میرے اس سفرنامے سے کچھ حاصل کریں۔ جذباتی اور چسکے دار کہانیاں تو میں سناؤں گا ہی۔ ایک نہیں کئی سناؤں گا لیکن میرے سفرنامے کے اس پہلو کو بھی سامنے رکھیں جو آپ کی شخصیت اور کردار کو مستحکم بنانے کی طاقت رکھتا ہے۔

اگر میں آپ کو اچھی طرح نہ سمجھا سکوں تو آپ خود ہی تجزیہ کریں، غور کریں کہ میری شخصیت اور میرے کردار میں اور میرے ذہن میں بھی کیسے کیسے طوفانی انقلاب آئے ہوں گے۔ میں نے ایک انگریز کو مروا دیا اور اس کے بعد ایک آدم خور شیر کو بھی مار ڈالا۔ انگریز ہندوستان کا بادشاہ اور شیر جنگل کا بادشاہ تھا۔ شیر کو رائفل سے مار ڈالنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ شکاری شیروں کو مارتے ہی چلے آئے ہیں اور مارتے چلے جائیں گے لیکن اُس دَور میں ایک انگریز افسر کو مار ڈالنا ایسے ہی تھا جیسے کسی نے اپنے اُس دیوتا کو مار ڈالا ہو جس کی لوگ پوجا کرتے ہیں۔

یہ میں اس سفرنامے کے پہلے کسی باب میں بتا چکا ہوں کہ انگریز جب ہندوستان کا بادشاہ تھا تو ہم انتہائی گھٹیا قسم کے گوروں کو بھی آسمان سے اُتری ہوئی مخلوق سمجھا کرتے تھے۔ ہمارے ہاں یہ مشہور تھا کہ کوئی گورا نظر آئے تو اس کی طرف انگلی سے اشارہ نہ

کرنا ورنہ وہ بہت ناراض ہو گا اور معلوم نہیں تمہیں کیسی سزا دے لیکن میں نے ایک گورے افسر کو اس طرح مروا دیا جس طرح لوگ باؤلے کُتے پر حملہ کر کے اسے مار ڈالتے ہیں۔

مختصر یہ کہ یہ فرنگی ہمارے ذہن اور دل پر ہی نہیں بلکہ ہماری روحوں پر بھی غالب آئے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے بادشاہ اور جنگل کے بادشاہ کو مار ڈالا تو بستی والوں پر یہ عالم طاری ہو گیا کہ میں انہیں کہتا کہ مجھے دیوتا سمجھو اور میرے آگے سجدہ کرو تو یہ لوگ روح کی گہرائیوں سے میرے آگے سجدے کرتے لیکن میرے اندر کچھ اور ہی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ وہ یہ کہ میں نے اپنے ذہن میں خیال بٹھا لیا کہ یہ مظلوم لوگ کسمپرسی کی حالت میں مجھے اپنا محافظ سمجھتے ہیں۔ میری اپنی یہ حالت تھی کہ میں خدا کو اپنا حافظ' حامی اور ناصر سمجھتا تھا اور میرے دل سے یہ دعائیں نکلتی تھیں' اے پیدا کرنے والے' میری جان کی حفاظت کرنے والا صرف تُو ہے۔

میرے دماغ میں یہ سوچ آ گئی کہ میں اللہ سے اپنی حفاظت کی بھیک مانگ رہا ہوں اور یہ لوگ مجھے اپنا محافظ سمجھ رہے ہیں۔ اگر میں نے اس ذمہ داری میں کوتاہی یا بددیانتی کی تو اللہ یہیں مجھے سزا دے گا۔ یہ لوگ رنگون سے یا جہاں جہاں سے بھی آئے تھے' اپنی جانیں بچا کر ہی نہیں لائے تھے بلکہ یہ اپنی عورتوں کی عزتیں محفوظ رکھنے کے لئے یہاں اس جنگل میں آ کر آباد ہوئے تھے۔

○

میں چلا تو کسی اور منزل کی طرف تھا لیکن ایسے ماحول میں یا ایسی دنیا میں پہنچ گیا جہاں صرف حادثات کی یا عجیب و غریب واقعات کی ہی توقع رکھی جا سکتی تھی۔ بات آگے چلانے سے پہلے میں بتانا چاہتا ہوں کہ شیر کے مرنے کے بعد لوگوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ میرے بھیجے ہوئے آدمیوں نے جب بستی میں جا کر اطلاع دی کہ میں نے شیر کو مار دیا ہے تو بستی کی ساری آبادی اٹھ دوڑی اور مرے ہوئے شیر کو دیکھنے کے لئے لوگوں نے جو دھکم پیل کی وہ بڑی ہی دلچسپ تھی۔ سب لوگ بہت خوش تھے کہ ایک بہت بڑا خطرہ ختم ہو گیا ہے۔ جو لوگ شیر کو دیکھ لیتے تھے وہ وہاں سے ہٹ کر مجھے حیرانی کی نظروں سے دیکھتے تھے کہ میں نے شیر مارا ہے۔ میری بہادری تو اب مصدقہ اور مسلّمہ ہو چکی تھی۔

لوگ شیر کو گھسیٹ کر بستی میں لے آئے۔ تین چار آدمیوں نے مل کر شیر کی کھال اتاری۔ میں اپنے جھونپڑے میں چلا گیا۔ رات کو مجھے بتایا گیا کہ بہت سے لوگوں نے شیر کو بکرے کی طرح کاٹ کاٹ کر اس کا گوشت آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شیر کا گوشت صرف غیر مسلموں نے ہی کھایا ہو گا لیکن پتہ چلا کہ بعض مسلمانوں نے بھی یہ حرام گوشت کھا لیا تھا۔

"یہ گوشت تو کسی کے لئے بھی جائز نہیں تھا" — میں نے کہا — "کسی بھی مذہب میں درندے کا گوشت جائز نہیں سمجھا جاتا"۔

"تمہیں شاید معلوم نہیں" — پاس بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے برمی نے کہا — "اگر اپنے ہاتھوں مارے ہوئے شیر کا گوشت کھا لیا جائے تو کھانے والے میں شیر جیسی بہادری پیدا ہو جاتی ہے اور دل سے ڈر نکل جاتا ہے"۔

میں نے سوچا کہ اس جنگل میں اور اس قسم کی زندگی میں جیسی یہ لوگ گزار رہے ہیں انہیں سب کچھ ہی جائز ہے۔

وانگ عقلمند آدمی تھا۔ اگر وہ اتنا عقلمند نہیں تھا جتنا میں سمجھتا تھا' تو اس کی یہی خوبی میرے لئے کافی تھی کہ وہ میرا مخلص دوست تھا اور اس سے ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ وہ مجھے کبھی دھوکا دے گا۔ اُس کے چار پانچ ساتھی بھی اُس جیسے تھے۔ میں نے انہیں کئی بار کہا تھا کہ مجھے دریا پار کرا دیں اور منزل تک پہنچا دیں۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ میں جاپانیوں تک پہنچ کر انڈین نیشنل آرمی کے ہیڈ کوارٹر میں جانا چاہتا ہوں۔ ہر بار وانگ اور اس کے ساتھیوں نے میری حوصلہ شکنی کی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ہو سکتا ہے جاپانیوں نے ایک جال بچھایا ہو اور وہ ہندوستان کے فوجیوں کو اس جال میں پھانس کر انہیں جنگی قیدی بنا لیتے ہوں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ کہتے تھے کہ عورتوں کے معاملے میں جاپانی ٹھیک نہیں اور اس قسم کی قوم پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔

شیر کو مارنے کے دو تین دن بعد میں نے وانگ سے پھر کہا کہ وہ مجھے کوئی گائیڈ نہیں دے سکتا تو راستہ ہی بتا دے' میں خود ہی چلا جاؤں گا۔

"ایک بات پر غور کریں صاحب!" — وانگ نے کہا — "آپ کو معلوم ہے کہ میں کل اُس قصبے میں گیا تھا جہاں سے ہم اپنی ضرورت کی چیزیں لایا کرتے ہیں۔ وہاں کل میں یہ خبر پھیلی ہوئی ہے کہ جاپانی برما سے بھاگ رہے ہیں۔ وہ جو خود بھاگ رہے

ہیں وہ ہندوستانیوں کی کیا مدد کریں گے۔ اب آپ جاپانیوں پر اتنا اعتبار نہ کریں صاحب! اگر آپ نے جانا ہی ہے تو کچھ دن اور انتظار کر لیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ جاپانیوں کے ساتھ جا ملیں اور انہیں شکست ہو جائے۔ پھر آپ پکڑے جائیں گے تو انگریز وہیں آپ کو گولی مار دیں گے"۔

"میں نے وانگ کی اس بات کو رد نہ کیا۔ اس انگریز پائلٹ نے بھی جسے میں نے مروا دیا تھا' مجھے بتایا تھا کہ جاپانی پیچھے ہٹ رہے ہیں اور آدھا برما آزاد کرا لیا گیا ہے۔ میں نے اس مسئلے پر بہت غور کیا۔ میری پوزیشن میرے لئے بہت خطرناک تھی۔ جاپانی پسپا ہو رہے تھے یا ایڈوانس کر رہے تھے' میری پوزیشن یہ تھی کہ میں پکڑا جاتا تو فوراً" مجھے پیچھے بھیج دیا جاتا اور میرا کورٹ مارشل ہوتا۔ اگر سزائے موت نہ ملتی تو پانچ چھ سال کی سزائے قید ضرور مل جاتی۔ یہ خیال بھی آیا کہ ہو سکتا ہے جاپانی پیچھے ہٹ کر انڈین نیشنل آرمی کو ساتھ ملا لیں اور پھر حملہ کریں۔ مجھے ابھی معلوم نہیں تھا کہ آئی این اے میں ہندوستانیوں کی کتنی کچھ نفری اکٹھی ہو گئی ہے۔ برما فرنٹ پر آنے سے پہلے ہمیں یہ پتہ چل گیا تھا کہ جاپانیوں نے سنگاپور' ملایا اور سماٹرا وغیرہ میں انگریزوں کی جتنی فوج تھی اس سے ہتھیار ڈلوا لئے ہیں۔ اس فوج میں ہندوستانیوں کی نفری بے شمار تھی۔ اگر یہ ساری نفری جاپانیوں نے آئی این اے میں شامل کر لی تھی تو پھر وہ دوبارہ برما پر زوردار حملہ کر سکتے تھے۔

میرے سامنے ایسا مسئلہ آ پڑا تھا جس کا مجھے کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے اپنا انجام بھی اچھا نظر نہیں آ رہا تھا۔ سزا سے بچنے کی صرف ایک صورت میرے سامنے آتی تھی۔ انگریز برما پر دوبارہ قابض ہو جاتے تو میں نے اس صورت کو سامنے رکھ کر سوچا کہ میں سارے کپڑے اتار کر یا صرف پتلون پہن کر انڈین آرمی کی کسی یونٹ میں جا پہنچوں گا اور کہوں گا کہ مجھے جاپانیوں نے جنگی قیدی بنا لیا تھا اور میں وہاں سے فرار ہو گیا تھا اور راستے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے جنگلوں میں بھٹکتا پھرتا رہا ہوں۔

سوچ سوچ کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ابھی ان لوگوں کے ساتھ ہی رہوں پھر دیکھیں گے کہ کیا کرنا چاہئے۔ میں نے وانگ سے کہا کہ وہ تیسرے چوتھے روز قصبے میں جایا کرے اور جنگ کی تازہ بہ تازہ خبریں لایا کرے۔

○

میں نے اس سفرنامے میں پہلے جاپانیوں کے متعلق یہ بتایا ہے کہ جاپان نے جنگ سے بہت پہلے سنگاپور' ملایا' برما اور ان تمام علاقوں میں جو آج کل انڈونیشیا کہلاتے ہیں' جاسوسوں کا جال بچھا دیا تھا۔ ہندوستان میں بھی جاپان کے جاسوس موجود تھے۔ میں یہ تفصیلات آپ کو سنا چکا ہوں' اب میں آپ کو یہ سنانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جاپانی کس قدر بہادر لوگ تھے اور ان میں جانیں قربان کرنے کا جذبہ کس قدر شدید تھا۔ یہ ساری باتیں مجھے جنگ کے بہت بعد جا کر معلوم ہوئی تھیں۔ مجھے ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں جاپانیوں کی بہادری اور قومی جذبے کی کہانیاں مشہور ہوئی تھیں۔ جاپانیوں کے دشمنوں یعنی برطانیہ' امریکہ اور دوسرے تمام یورپی ممالک نے اپنے اخباروں اور رسالوں میں جاپانیوں کے جذبۂ ایثار کے واقعات اور داستانیں شائع کی تھیں اور خراجِ تحسین بھی پیش کیا تھا۔

میں یہ ساری باتیں پہلے ہی لکھ دیتا ہوں تاکہ ان کے پیش نظر آپ میرا سفرنامہ پڑھیں۔ جاپانیوں کے اُن جذبوں کی تفصیلات میں اپنے پاکستانیوں کو خاص طور پر سنا رہا ہوں۔ یہ جذبہ مسلمانوں میں ہوا کرتا تھا لیکن پاکستانیوں نے معلوم نہیں اس جذبے کو کہاں پھینک دیا ہے۔ آج شدید ضرورت ہے کہ پاکستانی حکمران اور عوام اس جذبے کو از سرِ نو زندہ کریں ورنہ ہندو جیسا بزدل اور عیار دشمن ہمارا نام و نشان مٹا دے گا۔

جاپانی سرنڈر یعنی ہتھیار ڈالنے کے تصور سے ہی نا آشنا تھا۔ میں نے جنگ کے بعد اب تک ایسی بے شمار کتابیں پڑھی ہیں جن میں جاپانیوں کے طریقۂ جنگ کی تفصیلات لکھی ہیں۔ جاپانی فوج برما سے اس خیال سے پیچھے ہٹتی چلی گئی کہ انہیں کمک مل جائے گی اور وہ از سرِ نو تنظیم اور ترتیب میں آ کر پھر حملہ کریں گے۔ برما سے آگے انہوں نے بے شمار علاقے فتح کر رکھے تھے۔ انہیں کہیں سے بھی کمک' سپلائی اور ہر طرح کی مدد مل سکتی تھی۔ بعض جنگی مبصروں نے لکھا ہے کہ جاپانیوں نے دانستہ برما سے پسپائی اختیار کی تھی تاکہ انگریز اور آگے آ جائیں اور پھر ان کے ساتھ حساب کتاب برابر کیا جائے لیکن اب جاپانیوں کو مدد نہیں مل سکتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جاپان کی فوج اپنے ملک سے بہت دور آ پہنچی تھی۔

نقشے پر دیکھیں جاپان کہاں ہے اور برما اور ہندوستان کتنی دور ہیں۔ یہ بحرالکاہل ہے جس میں اتنے زیادہ جزیرے ہیں جن کا کوئی شمار نہیں۔ ان میں بعض جزیرے بہت

چھوٹے ہیں۔ ان میں نہ کوئی آبادی اُس وقت تھی نہ آج ہے' اور کچھ جزیرے بہت ہی بڑے ہیں جن میں فلپائن ایک ملک کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے کم بڑے جزیروں کا بھی کوئی حساب کتاب نہیں۔ بڑے جزیروں میں آبادی اُس وقت بھی تھی اور آج بھی ہے۔

جاپانیوں نے ان تمام جزیروں پر قبضہ کر لیا تھا اور پھر وہ سنگا پور' ملایا اور برما تک پہنچے تھے۔ جاپانی فوج اور نیوی اچانک حملہ آور ہوئی تھیں اور سمندری طوفان کی طرح آئیں اور سارے بحرالکاہل پر چھا گئی تھیں۔ انہوں نے کوریا اور چین کے خاصے علاقے پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔

جاپانیوں کے پاس فوج بھی بہت تھی' ایئر فورس بھی کچھ کم نہ تھی اور اس کی نیوی اتنی مضبوط اور طاقتور تھی کہ اس میں طیارہ بردار بحری جہاز بھی تھے۔ یہ ساری جنگی قوت بڑی ہیبت ناک جنگی قوت تھی لیکن جاپان کی ہائی کمانڈ اور جاپان کے بادشاہ ہیرو ہیٹو نے یہ سوچا ہی نہیں کہ انہوں نے محاذ کو یا دوسرے لفظوں میں میدان جنگ کو اتنا زیادہ پھیلا دیا ہے کہ ہر جگہ تک وہ سپلائی اور کمک نہیں پہنچا سکیں گے۔ اعلیٰ جاپانی کمانڈروں نے یہ بھی نہ سوچا کہ ان کا مقابلہ انگریزوں سے ہے جن کی بادشاہی بلا مبالغہ آدھی دنیا پر پھیلی ہوئی ہے۔ انگریزوں کے پاس ایک تو اپنی فوج تھی' اس کے ساتھ ہندوستان' آسٹریلیا' افریقہ اور ایسے کئی ممالک کی فوجیں تھیں۔ اس کے علاوہ امریکہ انگریزوں کا اتحادی تھا۔ امریکہ کے پاس ذرائع اور وسائل بہت ہی زیادہ تھے۔ امریکہ کی جنگی طاقت انگریزوں سے بھی زیادہ تھی۔

میں جنگ کی تفصیلات سنا کر آپ کو بور نہیں کروں گا۔ میں صرف یہ بتا رہا ہوں کہ جاپان نے محاذ اتنا زیادہ پھیلا کر اپنے لئے ایسے مسائل پیدا کر لئے تھے جن کا کوئی حل اس کے پاس نہیں تھا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ جاپانی فوجوں کی پسپائی شروع ہو گئی تھی۔ امریکہ کی بحری اور فضائی طاقت کا ہی کوئی حساب نہ تھا۔ امریکہ اور برطانیہ کی بحری فوجوں نے مل کر جاپانیوں کو برما سے پسپا کر دیا پھر انہیں جاوا' سماٹرا' ملایا اور سنگاپور سے بھی نکال دیا۔ وہاں یعنی ان جزیروں پر ہوائی جہازوں سے اور بحری جہازوں سے بھی آگ برسائی گئی تھی۔ جاپانی بحرالکاہل کے ہزارہا چھوٹے بڑے جزیروں پر قابض تھے۔ ایک ایک بڑے جزیرے پر حملے کئے گئے تاکہ جاپانیوں کو ہر جزیرے میں ختم کیا جائے۔

یہاں سے جاپانیوں کی حیران کن بہادری اور جانیں قربان کرنے کا جذبہ سامنے آیا۔ میں صرف یہ واقعات مختصراً" پیش کروں گا۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ جاپانیوں کے ہاں ہتھیار ڈالنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ جاپانیوں کا جذبہ یہ بھی تھا کہ کوئی جاپانی جنگی قیدی نہیں بنتا تھا۔ جنگی قیدی بننے کی بجائے جاپانی خُودکشی کر لیتے تھے۔ اس خُودکشی کو جاپانی زبان میں ہارا کیری کہا جاتا تھا اور جاپانی بڑے فخر سے خُودکشی کیا کرتے تھے۔ خُودکشی سے پہلے ہر جاپانی نعرہ لگاتا تھا ــــ "شہنشاہ جاپان کے نام پر" ــــ خُودکشی کو جاپانی مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔

ٹینک کا مقابلہ ٹینک ہی کر سکتا ہے یا ٹینک شکن توپ کا گولہ اثر کرتا ہے۔ ٹینکوں کو روکنے کا ایک طریقہ ٹینک شکن بارودی سرنگ بھی ہے۔ یہ بارودی سرنگیں ٹینکوں کے راستے میں پہلے ہی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بچھا دی جاتی ہیں۔ انہیں زمین میں چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ جب کوئی ٹینک اس سرنگ کے اوپر سے گزرتا ہے تو بارودی سرنگ اس کے وزن سے پھٹ جاتی ہے۔ یہ اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ ٹینک کو تباہ کر دیتی ہے۔

ایسے واقعات جنگ کے بعد فوجیوں نے بھی سنائے تھے اور میں نے انگریزوں کی دو کتابوں میں بھی یہ واقعات پڑھے تھے کہ اچانک ٹینک یا بکتر بند گاڑیاں آ گئیں۔ جاپانیوں کو قبل از وقت پتہ نہ چل سکا۔ وہ دشمن کے ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کے سامنے مورچوں سے نکل کر نہیں آ سکتے تھے کہ بارودی سرنگیں بچھا سکیں۔ بارودی سرنگیں بچھانے کا وقت ہی نہیں رہا تھا۔ جاپانی سپاہیوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایک ایک بارودی سرنگ ہاتھ میں لے لی اور پیٹ کے بل رینگتے ہوئے کسی نہ کسی اوٹ کے پیچھے چھپتے ہوئے ٹینکوں کے راستے میں آ گئے۔ ایک ایک سپاہی ایک ایک ٹینک کے قریب ہو گیا۔ جونہی ٹینک قریب آیا' جاپانی سپاہی نے سرنگ اس کے پٹے کے آگے رکھ دی۔ ٹینک سرنگ کے دھماکے کا شکار ہو گئے اور اس کے آگے سرنگ رکھنے والے جاپانی کے جسم کے بھی پرخچے اُڑ گئے۔

امریکی فوجوں نے بحرالکاہل کے ان بڑے بڑے جزیروں پر حملہ کیا جن پر جاپانی فوج قابض تھی۔ ہر جزیرے میں یہ مظاہرہ دیکھنے میں آیا کہ جاپانی ہار گئے لیکن پسپا نہیں ہو رہے تھے۔ ان کا جانی نقصان بے شمار ہُوا۔ امریکی فوج نے اعلان کئے کہ ہتھیار ڈال دو لیکن جاپانیوں نے ہتھیار نہ ڈالے۔ اس کی بجائے انہوں نے اپنے آپ کو گولیاں مارنی

شروع کر دیں یا رائفلوں سے سنگینیں اتار کر اپنے دلوں میں اتار لیں۔ میں نے ایک انگریزی کتاب میں یہ واقعات پڑھے تھے۔ یہ کتاب ایک امریکی صحافی نے لکھی تھی۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ محاذ پر گیا تھا۔ اس نے لکھا کہ جب ایک جزیرے میں جاپانی فوجیوں نے ہتھیار ڈالنے کی بجائے خُودکشی کرنی شروع کر دی تو ایک جاپانی سپاہی کو دیکھا وہ اپنے مورچے سے باہر نکل آیا۔ امریکی سمجھے کہ وہ ہتھیار ڈال کر ان کی طرف آئے گا لیکن اس جاپانی نے یوں کیا کہ ایک گرینیڈ ہاتھ میں لیا' اُس کی پن نکالی' اپنی سٹیل ہیلمٹ اُتاری اور گرینیڈ اپنے سر پر رکھ کر اوپر سٹیل ہیلمٹ رکھ لی اور بڑے آرام سے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ چند سیکنڈ گزرے تو گرینیڈ ہولناک دھماکے سے پھٹا۔ کوئی دیکھ نہ سکا کہ جاپانی کہاں اڑ گیا ہے۔ اُس کے جسم کے ٹکڑے دُور دُور بکھر گئے تھے۔

ایک جزیرے میں تو اس سے زیادہ حیران کُن منظر دیکھنے میں آیا۔ امریکی فوج نے وہاں بھی جاپانیوں پر غالب آ کر اعلان کیا کہ ہتھیار ڈال دو لیکن جاپانیوں کی طرف سے گولیاں آتی رہیں۔ ان کے فائر سے صاف پتہ چلتا تھا کہ ان کی نفری بہت تھوڑی رہ گئی ہے۔ آخر جاپانیوں کی طرف سے فائر بند ہو گیا۔

امریکی فوجی یہ جانتے ہوئے کہ جاپانیوں کی زیادہ تر نفری ماری گئی ہے اور ان میں لڑنے کی ہمت نہیں رہی' جاپانیوں کے مورچوں کے قریب نہیں جاتے تھے۔ وہ ڈرتے تھے کہ ایک جاپانی مشین گن ہاتھ میں لئے سامنے آ جائے گا اور مشین گن کے فائر سے ہمارے بہت سے آدمیوں کو مار کر ایک گولی اپنے آپ کو مار لے گا۔ ان جاپانی مورچوں میں مکمل طور پر خاموشی طاری ہو گئی تو امریکی فوج نے پیشقدمی کی۔ قریب گئے تو مورچے خالی تھے اور وہاں جتنے بھی جاپانی تھے وہ سب مرے پڑے تھے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ جاپانیوں کی ساری نفری ماری گئی ہو۔ وہ بڑا گھنا جنگل تھا جس میں اونچی اور پھیلی ہوئی جھاڑیاں بھی تھیں اور اونچی نیچی ٹیکریاں بھی تھیں۔

امریکی دوڑتے ہوئے آگے گئے تھے لیکن انہیں کوئی جاپانی فوجی نظر نہیں آ رہا تھا۔ دو تین امریکی اونچی ٹیکریوں پر چڑھ گئے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو اوپر بلایا اور کہا کہ وہ تماشہ دیکھو۔ امریکی دوڑتے ہوئے اوپر گئے۔ انہوں نے سمندر کی طرف دیکھا جو وہاں سے دور نہیں تھا۔ جاپان کے جو فوجی بچ گئے تھے وہ سمندر میں آگے ہی آگے چلے جا رہے تھے۔ وہ پانی میں چلتے گئے اور پانی گھٹنوں سے کمر اور کمر سے اُوپر ہوتا گیا۔ پھر

جاپانیوں کے سر باہر رہ گئے اور پھر سر بھی غائب ہو گئے۔ یہ کم و بیش ڈیڑھ ہزار فوجی تھے جنہوں نے اپنے آپ کو سمندر کے حوالے کر دیا تھا۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی تیرنے کی کوشش نہیں کی نہ پھر ان میں سے کوئی پانی کی سطح پر نمودار ہُوا۔

اب سنیں کہ بٹالین کمانڈر' بریگیڈ کمانڈر اور ڈویژن کمانڈر ہار جانے کی صورت میں کیا کرتے تھے۔ یہ کمانڈر جب دیکھتے تھے کہ اب ان کی شکست یقینی ہو گئی ہے تو وہ تمام افسروں کو اگلے مورچوں سے دور پیچھے کسی غار میں یا کسی ایسی جگہ جہاں انہوں نے اپنے ہیڈ کوارٹر بنائے ہوتے تھے' اکٹھے کر کے باقاعدہ ایک تقریب منعقد کرتے تھے۔ تمام افسر شراب کا ایک ایک یا دو دو گھونٹ پیتے تھے۔ کمانڈر مختصر سی تقریر کرتا تھا جس میں وہ اپنے ان سپاہیوں سے جو مارے جاتے تھے' معافی مانگتا تھا کہ وہ اپنا فرض ادا نہیں کر سکا۔ وہ اپنے شہنشاہ سے معافی مانگتا اور ایک چھوٹے سائز کی تلوار جو ہر بڑے افسر کے پاس ہوتی تھی نکال کر اپنے پیٹ میں اُس مقام پر رکھ کر جہاں پسلیاں ختم ہوتی ہیں' دونوں ہاتھوں سے تلوار اپنے پیٹ میں اتنی زور سے اتار لیتا تھا کہ تلوار کی نوک پیٹھ کی طرف سے باہر آ جاتی تھی۔ اس طرح کئی ایک سینئر کمانڈروں نے جن میں بریگیڈیئر اور جرنیل شامل تھے' نے خُودکُشی کی تھی۔

جاپانی اپنے شہنشاہ کو سورج کا بیٹا کہتے تھے اور اب بھی ان کا عقیدہ یہی ہے کہ ان کا بادشاہ سورج کا بیٹا ہے۔ جنگ عظیم والا بادشاہ ہیروہیٹو تقریباً" دو سال گزرے مر گیا ہے اور اب اس کا بیٹا بادشاہ ہے۔ جاپان میں جمہوریت رائج ہے' اس کے ساتھ انہوں نے انگریزوں کی طرح بادشاہ کو بھی روایتی طور پر ساتھ رکھا ہُوا ہے۔

جاپانیوں نے جنگ کے آخری دنوں میں جذبۂ حُبّ الوطنی کا ایسا مظاہرہ کیا تھا کہ ساری دنیا کو انگشت بدنداں کر دیا تھا۔ امریکہ کا بحری بیڑہ بہت ہی بڑا تھا۔ بحری جنگ میں جاپانی خاص مہارت رکھتے تھے لیکن ان کا بحری بیڑہ امریکہ کے مقابلے میں کم تھا۔ پھر بھی انہوں نے سمندر میں بڑی دلیری سے مقابلہ کیا۔ ان کا بیڑہ جلد ہی تقریباً" ختم ہو گیا۔ اس صورتِ حال میں امریکہ کا بحری بیڑہ بڑی تیزی سے جاپان کی طرف بڑھنے لگا۔ جاپانیوں کے پاس اتنی بحری طاقت رہی ہی نہیں تھی کہ امریکہ کے بحری بیڑے کو روک سکتے۔

ایک روز جاپان کی ائیر فورس کے ایک اعلیٰ افسر نے اپنے چوبیس لڑاکا ہوا بازوں کو بلایا اور انہیں بتایا کہ امریکہ کے بحری جہاز بڑی تیزی سے جاپان کی طرف بڑھتے آ رہے

ہیں اور انہیں روکنے کے لیے جاپان کے پاس بحری بیڑہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس نے کہا کہ اب ایک ہی طریقہ ہے کہ ایک ایک ہوا باز اپنے ہوائی جہاز کو اُڑا لے جائے اور ہر ہوا باز اپنے لیے ایک ایک امریکی بحری جنگی جہاز دیکھ لے اور اس پر غوطے میں جا کر اپنا طیارہ بحری جہاز کی چمنی پر کریش کر دے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میں کسی کو ایسا حکم نہیں دے سکتا' مجھے ایسے رضا کاروں کی ضرورت ہے جو اپنے وطن پر اپنی جان قربان کر دیں۔ اُس نے کہا کہ اِدھر ایک جان جائے گی اور اُدھر امریکہ کا اتنا بڑا جنگی جہاز تباہ ہو جائے گا۔

مجھے ایئر فورس کے اس آفیسر کا نام یاد نہیں رہا۔ وہ ساری دنیا میں مشہور ہُوا تھا اور دنیا بھر کے جنگی وقائع نگاروں نے اسے خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اسے رضا کاروں کی ضرورت ہے لیکن چوبیس کے چوبیس ہوا بازوں نے اپنی جانیں پیش کر دیں۔ کسی ایک نے بھی ہچکچاہٹ کا اظہار نہ کیا۔

میں تفصیل سے یہ طریقۂ جنگ یا دفاع کا یہ حیران کن طریقہ نہیں سنا رہا' مختصری بات کرتا ہوں۔ اگر میں ایک ایک جاپانی ہوا باز کا واقعہ سناؤں کہ وہ کس طرح جوش و خروش سے گئے اور انھوں نے کس طرح امریکی بحری بیڑے کی کمر توڑی' تو آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور آپ خون میں ابال محسوس کریں۔ مختصر یہ کہ ان چوبیس ہوا بازوں نے اپنے اپنے طیارے امریکہ کے بحری جہازوں پر کریش کیے اور امریکی بحری بیڑے کی پیش قدمی رک گئی۔

امریکہ کے بمبار ہوائی جہازوں نے جاپان پر خصوصاً جاپان کے دارالحکومت ٹوکیو پر اتنی زیادہ بمباری کی تھی کہ شہر کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا تھا۔ جاپان کے چند اور بڑے شہروں کا بھی امریکی ایئر فورس نے یہی حال کیا تھا لیکن جاپانیوں کے مورال کو نہ توڑا جا سکا۔ جرمنی بہت بڑی جنگی طاقت تھی۔ یورپ میں جرمنی نے تباہی مچا دی تھی لیکن جرمنی کو آخر ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔ جاپانی شکست تسلیم نہیں کر رہے تھے۔

جاپان نے اتنے زیادہ لڑاکا بمبار طیارے امریکہ کے بحری جہازوں پر کریش کر دیے کہ پیچھے ایئر فورس میں بہت تھوڑے طیارے رہ گئے۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ پہلے چوبیس ہوا باز مارے جا چکے تھے۔ باقی ہوا باز دوڑ دوڑ کر آتے اور اس فہرست میں نام لکھواتے تھے۔ ہر ہوا باز کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اسے انتظار میں نہ رکھا جائے اور فوراً خودکُش مشن پر بھیجا جائے۔

اس طرح ہوائی جہاز ضائع ہوتے چلے گئے اور اُدھر ہوائی جہاز بنانے والے خانے بمباری سے تباہ ہو گئے۔ اس تشویشناک صورتِ حال میں جاپانیوں نے ایک ایسا تیار کر لیا جو بارود سے بھرا ہُوا تھا اور اس میں ایک ہوا باز کے بیٹھنے کی جگہ بھی بنائی گئی گلائیڈر کی طرح اس میں کنٹرول بھی رکھے گئے تھے۔ یہ بم ایک ہوائی جہاز کے نیچے یا جاتا تھا۔ ہوائی جہاز کا ہوا باز سمندر پر جا کر کسی امریکی بحری جہاز کو دیکھ لیتا اور اس اوپر چلا جاتا۔ وہاں وہ بم کو جہاز سے ریلیز یعنی الگ کر دیتا تھا۔ ہوائی جہاز تو واپس چلا اُدھر بم کے اندر بیٹھا ہُوا پائلٹ بم کو جہاز کی چمنی کے اوپر لے جاتا تھا۔ بحری جہاز کا نان بم کو اپنے جہاز کے اوپر آتا دیکھ کر اپنے جہاز کا رخ دائیں بائیں کرنے لگتا تا کہ بم ندر میں جا گرے لیکن بم میں بھی پائلٹ ہوتا تھا جو بم کو دائیں بائیں کرتا تھا۔ آخر بم ی جہاز پر گرتا اور جہاز کو تباہ کر دیتا تھا۔ اس کا پائلٹ بھی بم کے ساتھ ہی ٹکڑے ے ہو جاتا تھا۔

ان خودکُش ہوا بازوں کو جاپانی زبان میں کمی کازے کہا گیا تھا۔

اب جاپان کی جنگی صورتِ حال ایسی ہو گئی تھی کہ وہ ایک دن بھی لڑنے کے قابل ں رہا تھا لیکن جاپانی لڑے رہے تھے۔ انھوں نے خودکُش ہوا بازوں کے ذریعے امریکہ ے بحری بیڑے کو روک لیا تھا۔ آخر امریکہ نے جاپان کے دو بڑے شہروں ہیروشیما اور اساکی پر ایک ایک ایٹم بم گرایا تو جاپان نے شکست تسلیم کر لی تھی۔ جاپان کا بادشاہ اور کمان کبھی شکست تسلیم نہ کرتی لیکن ایٹم بموں نے شہری آبادی کو اور شہروں کو تباہ کر تھا۔ اگر جاپان کی حکومت ہتھیار نہ ڈالتی تو مزید شہروں کی تباہی کا خطرہ تھا۔

اب اس سے بھی زیادہ حیران کن اور انوکھی بات سنیں اور تصور میں لائیں کہ ان پانیوں کا جذبہ کیا تھا۔ اس کا انکشاف 1952ء میں بحرالکاہل کے ایک غیر آباد جزیرے ں ہوا۔ ہوا یہ کہ امریکہ کی نیوی کے کچھ آدمی اس جزیرے میں گئے یا وہ کوئی انجینئر تھے اس جزیرے میں کچھ بنانا چاہتے تھے۔ بہرحال یہ کوئی سرکاری پراجیکٹ تھا۔ جب ان ر ایک آدمیوں نے جزیرے پر قدم رکھا تو سامنے سے ان پر ایک گولی فائر ہوئی۔ سب ر اُدھر ہو گئے۔ ان آدمیوں کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر آگے گئے تو ان پر ایک گولی فائر ہوئی۔ عجیب بات ہے کہ دونوں گولیاں خطا گئیں اور کوئی زخمی بھی ہوا۔

مختصر بات یہ کہ کچھ دیر بعد ایک جاپانی سپاہی رائفل تانے ہوئے سامنے آیا۔ اس نے کہا کہ یہ جزیرہ اس کا ہے اور اس کی ڈیوٹی ہے کہ وہ اس جزیرے کا دفاع کرے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جب تک جنگ ختم نہیں ہو جاتی اور اسے اس جزیرے سے نکلنے کا حکم نہیں ملتا وہ یہاں سے نہیں جائے گا اور کسی کو جزیرے میں داخل نہیں ہونے دے گا۔

اسے بتایا گیا کہ جنگ ختم ہوئے سات سال گزر گئے ہیں تو بھی اس نے یقین نہ کیا۔ یقین کرنے کی بجائے اس نے ان لوگوں کو دھمکی دی کہ وہ اس جزیرے سے نکل جائیں ورنہ وہ ان سب کو گولیاں مار کر ختم کر دے گا۔ وہ مان ہی نہیں رہا تھا کہ جنگ ختم ہو چکی ہے۔

کچھ بحث مباحثے کے بعد اس جاپانی فوجی نے کہا کہ اسے شہنشاہ جاپان کا تحریری حکمنامہ دکھایا جائے تو وہ مان لے گا کہ جنگ ختم ہو گئی ہے۔

وہ لوگ جزیرے سے نکل آئے اور امریکی حکومت کو بتایا کہ اس جزیرے میں ایک جاپانی سپاہی موجود ہے جو کام میں رکاوٹ ڈال رہا ہے۔ امریکی حکومت نے جاپان کی حکومت کو اطلاع دی۔ جاپان کے فوجی ہیڈ کوارٹر کو حکم دیا گیا کہ وہ اس سپاہی کو وہاں سے لے آئیں۔ جاپان کی فوج کے ایک دو افسر وہاں گئے اور انھوں نے اس فوجی کو بتایا کہ جنگ ختم ہو چکی ہے اس لیے وہ واپس چلے۔ تب وہ جزیرے سے نکلا۔ یہ خبر دنیا بھر کے اخباروں میں شائع ہوئی تھی۔

اس واقعہ کو انوکھا اور دلچسپ واقعہ کہا گیا تھا اور اسے اپنی نوعیت کا واحد واقعہ سمجھا گیا تھا لیکن دو سال بعد ایک اور جزیرے سے ایک جاپانی فوجی کی اطلاع آئی کہ وہ ابھی تک جزیرے کے دفاع میں چوکس اور چوکنا ہے اور کسی کو قریب نہیں آنے دے رہا۔ اسے وہاں سے لانے کے لیے جاپان کی فوج کے افسر گئے تو اس نے جزیرہ چھوڑا اور سکون کا سانس لیا کہ آج وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہوا ہے۔

اڑھائی یا تین سال اور گزرے ہوں گے کہ ایک اور چھوٹے جزیرے میں چار پانچ جاپانی فوجی دیکھے گئے جو ابھی تک جزیرے کا دفاع کر رہے تھے۔ جنگ کو ختم ہوئے چودہ سال گزر گئے تھے۔

میں نے ایسا ایک اور واقعہ پڑھا تھا۔ اس سپاہی نے تو اپنی فوج کے افسروں کو بھی پریشان کر دیا تھا۔ اسے بتایا گیا کہ جاپان کو شکست ہوئی ہے تو وہ مانتا ہی نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا

کہ جاپان کو شکست نہیں ہو سکتی۔ وہ مرتے دم تک لڑنا چاہتا تھا اور کہتا تھا کہ اسے اُس محاذ پر بھیجا جائے جہاں لڑائی ہو رہی ہے۔ اسے بڑی مشکل سے قابو میں لایا گیا تھا۔

اب ایسا ہی ایک اور دلچسپ واقعہ سنیں۔ "حکایت" میں میرے اس سفرنامے کی دسویں قسط شمارہ مئی میں شائع ہو چکی تھی تو میرے ایک دوست نے امریکہ کا ایک ہفتہ وار پرچہ "نیوز ویک" دکھایا۔ یہ یکم مئی 1995ء کا شمارہ ہے۔ میرے دوست جانتے ہیں کہ میرے دماغ پر ابھی تک برما کے جنگلات اور پھر اس سے اگلا سفر اور پھر جاپانی سوار ہیں۔ انھیں اس موضوع پر کوئی مضمون یا واقعہ کہیں بھی چھپا ہوا ملتا ہے تو وہ مجھے دکھاتے ہیں۔ "نیوز ویک" امریکہ کا اتنا مشہور پرچہ ہے کہ یہ ساری دنیا میں پڑھا جاتا ہے۔ میرے اس دوست نے یہ پرچہ مجھے دکھایا اور میں نے پڑھا تو خیال آیا کہ میں یہ بھی اپنے سفر نامے میں شامل کر دوں۔ میں نے اپنے اس دوست کو کہا کہ وہ مجھے اس کا ترجمہ اچھی اُردو میں لکھ دے۔ یہ کام اس نے کر دیا اور میں نے یہ اضافہ مدیر "حکایت" کو بھیج دیا کہ یہ بھی میرے سفرنامے میں شامل کر دیں۔ "نیوز ویک" میں ایک جاپانی فوجی کا انٹرویو شائع ہوا ہے جو 1974ء تک فلپائن کے جزیرے لوبانگ میں موجود رہا اور یہ سمجھتا رہا کہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی اور اس کا یہ فرض بھی ختم نہیں ہوا کہ وہ اس جزیرے کا دفاع کرتا رہے

یہ جاپانی اپنے فرض اور اپنے ملک کی آن کے سلسلے میں پاگل پن کی حد تک جذباتی تھا۔ اسے ہر کوئی پاگل پن ہی کہے گا کہ جس وقت اسے یعنی 1974ء میں اس جزیرے میں دیکھا گیا' اُس وقت جنگ کو ختم ہوئے 30 سال گزر گئے تھے۔

اس جاپانی کا نام ہیرو انودا ہے۔ اس وقت وہ برازیل میں اپنے ایک بھائی کے ساتھ رہتا ہے جہاں ان کا بہت بڑا زرعی فارم ہے۔ ہیرو انودا نے اپنے حالیہ انٹرویو میں بتایا کہ اسے 1945ء میں جنگ ختم ہونے سے پہلے فلپائن سے ذرا ہی دور اس جزیرے میں بھیجا گیا تھا۔ اس وقت یہ جزیرہ جاپان کے قبضے میں تھا۔ اسے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اس جزیرے میں اکیلا کس طرح رہ گیا تھا بہرحال اس نے جنگ جاری رکھی۔

اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ جاپان کے دو شہروں پر ایٹم بم گرائے جا چکے ہیں اور جاپان نے اپنی شکست تسلیم کر لی ہے اور جنگ ختم ہو گئی ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کے جزیرے میں سے اسے فلپائن کا ایک ہوائی اڈہ صاف نظر آتا تھا۔ اس اڈے سے لڑاکا

بمبار طیارے اڑتے رہتے تھے اور لینڈنگ بھی کرتے تھے۔ انودا سمجھا کہ جنگ ابھی تک جاری ہے۔

میں قارئین کو بتانا چاہتا ہوں کہ جاپان نے تمام تر فلپائن پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور جب امریکہ کے بحری جہازوں اور بری فوج نے جوابی حملہ کیا تو جاپانیوں کو فلپائن سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔

ہیرو انودا نے اپنے انٹرویو میں کہا کہ اسے معلوم نہیں ہو سکا کہ 1952ء میں کوریا میں جنگ ہوئی تھی۔ اسے ویت نام کی اتنی خوفناک اور طویل جنگ کا بھی پتہ نہ چل سکا۔

1974ء میں ایک جاپانی مہم جو نوریو سوزوکی اس جزیرے میں گیا تو اُس نے ہیرو انودا کو دیکھا۔ سوزوکی نے اسے بتایا کہ جنگ کو ختم ہوئے 30 سال گزر گئے ہیں اور وہ اب واپس چلے۔ ہیرو انودا نے جواب دیا کہ جب تک اسے تحریری حکم نہ ملے گا وہ اس جزیرے سے نہیں نکلے گا کیونکہ اس جزیرے کا دفاع اس کی ذمّہ داری ہے۔

سوزوکی واپس جاپان گیا اور وہاں فوجی ہیڈ کوارٹر میں گیا اور ہیرو انودا کے متعلق بتایا کہ وہ فلاں جزیرے میں ابھی تک پہرہ دے رہا ہے اور وہ واپسی کے لیے تحریری حکم مانگتا ہے۔ فوجی ہیڈ کوارٹر نے اسے تحریری حکمنامہ بھیجا تو وہ واپس جاپان گیا۔

اس نے اس جنگل میں 30 سال جس طرح گزارے اور جس طرح وہ اپنی ڈیوٹی دیتا رہا، یہ بڑی دلچسپ داستان ہے جو میں سنانے لگا تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ اس کا انٹرویو اب اپریل 1995ء کے آخر میں لیا گیا ہے۔ میں آپ کو اس کی دو تین باتیں سناؤں گا۔ ان باتوں پر غور کریں اور دیکھیں کہ اس جذبے کی آج پاکستان کو ضرورت ہے اور کیا لوگوں میں یہ جذبہ موجود ہے؟..... اس سے پوچھا گیا کہ اس نے کیا سوچا تھا کہ وہ ساری عمر اسی جزیرے میں گزار دے گا؟..... اس نے جواب دیا کہ وہ اپنی عمر کا اندازاً" حساب رکھے ہوئے تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ کون سا مہینہ اور کون سا سال ہے۔ اس نے کہا کہ وہ 60 برس کی عمر تک یہ ڈیوٹی دینا چاہتا تھا اور 60 برس سرکاری طور پر ریٹائر ہونے کی عمر ہوتی ہے۔ اس نے کہا کہ 60 برس کی عمر پوری کر کے اس نے اپنے آپ کو گولی مار دینی تھی لیکن واپس جاپان نہیں جانا تھا تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے یہ شخص اپنا جزیرہ خالی چھوڑ آیا ہے۔ یہ ہیرو انودا کی خوش قسمتی تھی کہ اسے 60 برس کی عمر سے ذرا پہلے اس جزیرے سے نکال لیا گیا۔

ہیرو انودا دراصل انٹیلی جنس کا آدمی تھا۔ وہ فوجی ہی تھا اور اسے جاپان کے ایک فوجی انٹیلی جنس کے سکول میں ٹریننگ ملی تھی۔ اس سے پوچھا گیا کہ اس نے اتنا لمبا عرصہ اس گھنے جنگل میں رہنا برداشت کس طرح کیا ہے؟.... اس نے جواب دیا کہ ہمیں انٹیلی جنس ٹریننگ سکول میں یہ پڑھایا گیا تھا کہ تمہیں اپنے ملک پر اپنی جان، اپنی عزت اور اپنا نام قربان کر دینا ہے۔ اس اصول کو اور اس عہد کو کہ اپنے ملک پر سب کچھ قربان کر دینا ہے ہر جاپانی اپنا مذہبی فریضہ سمجھتا ہے۔

انودا سے پوچھا گیا کہ امریکہ کے متعلق اس کی کیا رائے ہے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ سوال مضحکہ خیز ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سوچنا بیکار ہے کہ کون سا ملک اچھا ہے اور کون سا ملک بُرا ہے، میں یہ دیکھتا ہوں کہ میں جاپان میں پیدا ہوا تھا اس لیے جاپان بہت اچھا ملک ہے اور مجھے اس کے لیے قربانیاں دینی چاہئیں۔

میں نے ان سب جاپانیوں کے متعلق جو مختلف جگہوں پر جنگ کے بعد بھی سال ہا سال تک ڈیوٹی دیتے رہے، یہ نہیں بتایا کہ وہ وہاں اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے کیا کرتے رہے اور ڈیوٹی کس طرح ادا کیا کرتے تھے۔ یہ تفصیلات ہیں تو دلچسپ اور حوصلوں کو نئی زندگی دینے والی لیکن میں ایک تو اپنی کہانی کو طول نہیں دینا چاہتا اور دوسرے یہ کہ میں صرف ایک قومی جذبہ قارئین کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

اب میں جاپان کی نئی زندگی کے متعلق مختصر سی بات کروں گا۔ پہلے ذرا اپنی بات ہو جائے۔ مشرقی پاکستان میں ہمارے اقتدار پرست سیاسی لیڈروں نے ایسے حالات پیدا کر لیے تھے کہ ہمارے دشمن کو زمین دوز تخریبی کارروائیاں کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ سیاسی لیڈروں کے پیدا کردہ حالات نے نوبت جنگ تک پہنچا دی جس میں ہماری فوج کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور مشرقی پاکستان ہم سے کٹ گیا۔ اس کے بعد ہونا یہ چاہیے تھا کہ اپنی غلطیوں اور اپنے گناہوں کا سامنا کرتے، اللہ سے معافی مانگتے اور عبرت حاصل کرتے لیکن ہم نے باقی آدھے پاکستان کو بھی تباہی کے دھانے تک پہنچا دیا۔ مشرقی پاکستان کے متعلق ہمارے لیڈروں نے اور بعض سیاسی ذہنیت کے جرنیلوں نے یہ رویّہ اختیار کر لیا کہ شکست کی ذمّہ داری ایک دوسرے پر پھینکنے لگے اور ان سب نے شکست کی بلکہ اپنے سیاسی گناہوں کی ساری سیاہی فوج کے منہ پر مل دی۔ اس طرح قومیں اور ملک تباہ ہو جایا کرتے ہیں۔ میں آپ کو جاپان کی نئی زندگی کی بات سناتا ہوں۔

آج کا جاپان جنگِ عظیم والے جاپان کے ملبے کے نیچے سے اٹھا ہے۔ یوں کہہ لیں کہ جاپان اپنی قبر میں سے نکلا اور از سرِ نو زندہ ہُوا ہے۔ اینٹ سے اینٹ بجا دینا ایک محاورہ ہے۔ امریکہ کے بمبار ہوائی جہازوں نے اور بحری جہازوں کی توپوں نے جاپان کی صحیح معنوں میں اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور دارالحکومت کے علاوہ دیگر بڑے شہروں اور کارخانوں کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا گیا تھا۔ پھر اس ملک پر دو ایٹم بم گرائے گئے۔ جاپان کی صرف زمین رہ گئی تھی اور اس زمین پر چلتے پھرتے کچھ جاپانی رہ گئے تھے۔ امریکہ نے اپنی فوج جاپان میں بھیج دی جو سارے جاپان پر قابض ہو گئی۔ اس فوج کو زبانی حکم دیا گیا کہ جاپان کی عورتوں کی اتنی آبروریزی کی جائے کہ اس قوم میں وقار اور آبرو نام کی کوئی چیز باقی نہ رہے۔ جاپانیوں کی تو اب صرف ایک ضرورت باقی رہ گئی تھی اور یہ تھی دو وقت کی روٹی۔ وہاں تو بھوک اور مفلسی کا غلبہ تھا۔ امریکی فوجیوں نے جاپانی لڑکیوں اور جوان عورتوں کو جبرا" خراب نہ کیا بلکہ انھیں دو وقت کی روٹی کے عوض دوست بنا لیا اور ان کے ذہنوں کو بدلنے کی ترکیبیں کرنے لگے۔ ایک تو انہیں عصمت اور آبرو سے محروم کیا اور اسے محبت کا نام دے کر ان پر امریکی کلچر اور امریکہ کی نام نہاد عظمت طاری کی۔ امریکہ کا مقصد یہ تھا کہ جاپانیوں کا قومی جذبہ کچل دیا جائے اور انہیں ذہنی طور پر امریکہ کا غلام بنا لیا جائے۔

کئی امریکی فوجیوں نے جاپانی لڑکیوں کے ساتھ شادی کرلی۔ ہزارہا جاپانی عورتوں نے امریکی فوجیوں کے ناجائز بچے پیدا کیے۔ ان بچوں میں سے کئی ایک کو امریکہ لے جایا گیا۔ ساری دنیا دیکھ رہی تھی کہ جاپان جسمانی طور پر ہی ختم نہیں ہو گیا بلکہ جاپان کی روح بھی ختم ہو گئی ہے بلکہ اس روح پر امریکہ قابض ہو گیا ہے۔ نظر یہی آ رہا تھا کہ جاپان کا نام و نشان مٹ گیا ہے اور وہ دن دور نہیں جب جاپان امریکہ کی نو آبادی بن جائے گا۔ پھر تھوڑے ہی عرصے بعد جو معجزہ ہُوا وہ بھی ساری دنیا نے دیکھا۔ آج دیکھ لیں، صنعت و حرفت کے لحاظ سے جاپان ساری دنیا پر چھا گیا ہے۔ الیکٹرانک کے آلات صرف جاپان کے ساری دنیا میں مقبول ہیں اور انہیں ہی قابلِ اعتماد اور مستند سمجھا جاتا ہے۔ ساری دنیا میں جاپان کی بنائی ہوئی کاریں اور موٹر سائیکلیں چلتی ہیں۔ امریکہ کو دنیا کا ایک بڑا صنعتی ملک سمجھا جاتا ہے لیکن امریکہ میں بھی جاپان کی مصنوعات مقبول ہیں۔ امریکہ اس قدر پریشان ہو گیا ہے کہ اس نے حال ہی میں جاپان پر کچھ پابندیاں عائد کرنے کا اعلان کیا

ہے۔ امریکی حکومت امریکہ میں یہ مہم چلا رہی ہے کہ لوگ صرف امریکہ کی بنی ہوئی مصنوعات خریدیں اور جاپانی مصنوعات کو منڈی میں پڑا رہنے دیں لیکن لوگ تو اپنے کمائے ہوئے پیسے کے عوض وہ چیز خریدتے ہیں جو پائیدار اور لوگوں کی ضرورت کے مطابق ہو۔

مجھے امریکہ اور جاپان کی صنعت و تجارت کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں نہ میں ان دونوں ملکوں کی تجارتی رقابت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، میں صرف وہ جذبہ آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں جس نے جاپان کو قبر میں سے نکال کر نئی زندگی دی ہے۔ یہ جذبہ وہی ہے جو قرآن اور احادیث نے اہلِ اسلام کو دیا تھا۔ قائدِ اعظمؒ نے یہ جذبہ قوم کو ان الفاظ میں دلایا تھا — "کام، کام، کام" — اور پھر یہ — "اتحاد، یقین، تنظیم" — اگر دینی نظر سے دیکھا جائے تو یہ دو اصول ہمارے دین کے جزو ہیں اور یہی وہ جزو ہیں جن سے ہماری پاکستانی قوم دستبردار ہو گئی ہے اور آج تباہی اور بربادی کے عمل سے گزر رہی ہے۔

جاپانیوں کا بنیادی جذبہ حُبّ الوطنی ہے۔ پھر وہ کام اور اپنی ذمّہ داریوں کو مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔ شاید قارئین کی نظروں سے غیر ملکی پرچوں کے یہ مضمون گزرے ہوں کہ جاپانی جہاں بھی اور جس شعبے میں بھی کام کرتے ہیں، وہ اس قدر کام کرتے ہیں کہ چھٹی کے بعد بھی کام میں جُتے رہتے ہیں۔ اس حد تک کہ وہاں ایک بیماری پیدا ہو گئی ہے جس میں جاپان کے ورکر مبتلا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹروں نے تشویش کا اظہار کیا ہے کہ اس بیماری کا تعلق اعصاب کے ساتھ ہے۔ یہ لوگ اتنا کام کرتے ہیں کہ اعصاب پر برداشت سے زیادہ بوجھ پڑ جاتا ہے اور اکثر ورکر اعصاب زدگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہاں میں پاکستان کی ایک بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ستمبر 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں ہماری فضائیہ کے شاہبازوں نے بھارت کی طاقتور ائیر فورس کا حشر کر دیا تھا۔ اُس وقت کے ائیر فورس کے کمانڈر انچیف ائیر مارشل ریٹائرڈ نُور خان نے جنگ کے بعد ایک پریس کانفرنس میں جس میں غیر ملکی اخبار نویس اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے، کہا تھا — "میرے لئے مسئلہ یہ نہیں تھا کہ اپنے ہوابازوں کو اتنی بڑی ائیر فورس کے مقابلے میں کس طرح بھیجوں بلکہ میرے لیے مشکل یہ پیدا ہو گئی تھی کہ اپنے ہوابازوں کو دشمن پر بڑھ بڑھ کر حملے کرنے سے روکوں کیسے۔"

میں نے اپنی اصل کہانی سے ہٹ کر جذبوں کا قصہ چھیڑ دیا تھا اور بات اتنی لمبی کر دی ہے کہ مجھے شک ہے کہ کچھ خواتین و حضرات نے بوریت محسوس کی ہو گی۔ اگر ایسا ہے تو میں ان خواتین و حضرات سے معافی نہیں مانگوں گا بلکہ یہ کہوں گا کہ ان باتوں میں بوریت محسوس کرنے والے پاکستانی تو ہیں لیکن وہ سچے پاکستانی نہیں۔ ان میں جذبۂ حُبّ الوطنی رہا ہی نہیں۔ ان باتوں میں بوریت محسوس کرنے والے کہتے ہوں گے کہ یہ چند ایک جاپانی پاگل ہو گئے تھے جو جنگ ختم ہو جانے کے برسوں بعد بھی جنگلوں میں پڑے رہے اور بات یہ بنالی کہ وہ حکم کے بغیر یہاں سے نہیں نکلیں گے..... میں ہر ایک پاکستانی سے کہتا ہوں کہ اگر آپ اپنے ملک کو تباہی سے اور اپنے آپ کو کسی دشمن کی غلامی سے بچانا چاہتے ہیں تو آپ کو جذبۂ حُبّ الوطنی اور فرض شناسی کے جذبے کی دیوانگی بلکہ پاگل پن پیدا کرنا پڑے گا۔

اب میں اپنے سفرنامے کی طرف آتا ہوں۔ میں نے بہت بعد کی باتیں اس لئے پہلے ہی آپ کو سنا دی ہیں تاکہ آپ کو پتہ چل جائے کہ جاپانی کیسے لوگ تھے اور امریکہ اور برطانیہ کو کس قوم سے پالا پڑ گیا تھا۔

وانگ اور اس کے ساتھی مجھے روک رہے تھے کہ میں آگے نہ جاؤں اور کچھ دن انتظار کر لوں۔ میں نے بھی یہی بہتر سمجھا..... اس بستی کے لوگ زیادہ تر مچھلی کھاتے تھے۔ یہ غذا انہیں دریائے اراوتی سے مفت مل جاتی تھی۔ اس دریا میں مچھلی کی کمی نہیں تھی۔ کشتیاں موجود تھیں‘ کچھ لوگ دریا میں چلے جاتے اور سب کے لئے مچھلیاں پکڑ لاتے تھے۔ ایک روز وانگ نے مجھے کہا کہ میں کبھی بھی ان کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے نہیں گیا‘ اب چلوں۔ میں نے خوشی کا اظہار کیا کہ اس طرح دریا کی سیر ہو جائے گی اور ایک اچھا شغل بھی مل جائے گا۔

میں وانگ کے ساتھ چل پڑا۔ کشتی کھینے کے لئے دو آدمی ساتھ تھے۔ میں نے رائفل اپنے ساتھ لے لی۔ دریا بالکل قریب تھا۔ ہم وہاں گئے‘ ایک کشتی میں بیٹھے اور کشتی کو دریا کے بہاؤ پر چھوڑنے کی بجائے ملاحوں نے اوپر کی طرف یعنی جس طرف سے دریا آتا تھا کشتی کو کھینا شروع کر دیا۔

تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ بستی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہاں سے دریا مڑتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ پہاڑی علاقہ تھا اور جنگل بہت گھنا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہم کسی اور ہی دنیا میں جا نکلے ہیں۔ ہم خاصی دور اوپر چلے گئے اور ان لوگوں نے مچھلیاں پکڑنی شروع کر دیں۔ ان کے پاس چھوٹا سا جال بھی تھا اور بانسوں کے ساتھ بندھی ہوئی دو کنڈیاں بھی تھیں۔

میرے اندازے کے مطابق بارہ بج چکے تھے جب خاصی تعداد میں مچھلیاں پکڑی گئی تھیں۔ وانگ نے کہا کہ اب واپس چلنا چاہئے۔ کشتی کے چپو الگ رکھ دیئے گئے اور کشتی بہاؤ کے ساتھ بہنے لگی۔ ہم نے واپسی کا تقریباً آدھا سفر طے کیا ہو گا کہ بارہ تیرہ سال عمر کا ایک لڑکا دریا کے کنارے پر دوڑتا آ رہا تھا۔ ہمیں دور سے دیکھ کر اس نے دایاں بازو اوپر کر کے زور زور سے لہرانا شروع کر دیا۔ اس کی رفتار‘ دوڑنے کے انداز اور بازو لہرانے سے ہمیں فکر پیدا ہو گیا کہ بستی میں کوئی واقعہ یا حادثہ ہو گیا ہے۔ دونوں ملاحوں نے کشتی کے چپو مارنے شروع کر دیئے تاکہ کشتی کی رفتار تیز ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے کشتی کو کنارے کے ساتھ کر لیا۔

"کیا ہو گیا ہے؟" —— وانگ نے قریب جا کر لڑکے سے پوچھا —— "کیوں دوڑے آ رہے ہو؟"

کشتی کو کنارے پر روک لیا گیا۔ لڑکے نے بڑی گھبرائی ہوئی آواز میں تیز تیز بولتے ہوئے اپنی زبان میں کچھ کہا۔

"لو بھائیو!" —— وانگ نے اردو میں کہا —— "جاپانی بستی میں بھی پہنچ گئے ہیں"۔

یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی کہ میں جاپانیوں کو ڈھونڈ رہا تھا اور وہ خود ہی ہمارے پاس آ گئے ہیں لیکن وانگ نے آگے جو بات بتائی اس سے میں شش و پنج میں پڑ گیا۔

"یہ کہتا ہے کہ نو جاپانی ہیں" —— وانگ نے لڑکے کی پوری بات سن کر بتایا —— "وہ فوجی ہیں اور ان کے پاس رائفلیں بھی ہیں۔ انہوں نے ساری بستی کی آبادی کو ایک جگہ اکٹھا کر لیا ہے اور ان میں سے جوان عورتوں کو الگ کر کے کھڑا کر دیا ہے۔ لڑکا بتاتا ہے کہ وہ سخت غصے میں بولتے ہیں اور جو آدمی ان کا اشارہ نہ سمجھے یا آہستہ چلے تو اسے وہ رائفلوں کے بٹ مارتے ہیں..... یہ لڑکا اُس وقت جب جاپانی آئے‘ بستی سے ذرا دُور تھا اس نے خود ہی یہ سوچ لیا کہ ہمیں اطلاع دے دے۔ اس نے ہمیں کشتی میں اس طرف آتے دیکھ لیا"۔

میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ میں جاپانیوں کے پاس سیدھا چلا جاؤں اور انہیں کہوں کہ میں بھگوڑا ہو کر آیا ہوں اور آئی این اے میں شامل ہونا چاہتا ہوں یا پہلے چھپ کر دیکھ لوں کہ ان جاپانیوں کا رویہ کیا ہے۔ میں نے وانگ سے بات کی اور اُسے کہا کہ وہ مجھے مشورہ دے۔

"ہوش کی بات کرو صاحب!" —— وانگ نے کہا —— "ان جاپانیوں پر بھروسہ نہ کرنا۔ ان کے متعلق ہم پہلے ہی بہت سی باتیں سن کر رنگون سے بھاگے تھے۔ ہم جس قصبے میں جاتے رہتے ہیں' وہاں کے لوگوں نے بھی ہمیں جاپانیوں کے متعلق بہت سی باتیں بتائی ہیں۔ جاپان کے فوجیوں کو یہ اجازت ہے کہ وہ جس علاقے کو فتح کریں وہاں سے تمام خوبصورت لڑکیاں اکٹھی کر کے اپنے ساتھ رکھ لیں۔ جاپانی فوج میں اسے ہر فوجی کا حق سمجھا جاتا ہے۔ اب یہ سوچو کہ ہم ان سے اپنی عورتوں کی عزت کس طرح محفوظ رکھیں گے..... ذرا سوچو صاحب!"

"ایک بات میری بھی سن لو صاحب!" —— وانگ کے ایک ساتھی نے اردو میں کہا —— "آپ ان کے ساتھ دوستی لگانا چاہتے ہیں اور آپ کی دوستی ہو جانے سے جاپانی ہماری عورتوں کو چھوڑ تو نہیں دیں گے۔ آپ سوچیں کہ آپ ان کے ساتھ دوستی لگائیں اور وہ آپ کے مذہب کی لڑکیوں کو آپ کے سامنے خراب کریں' آپ یہ برداشت کر لیں گے؟"

"ہاں صاحب!" —— وانگ بولا —— "آپ کو یہ سوچنا چاہئے کہ ہمارے اس دوست نے کیا کہا ہے..... لیکن صاحب! میرے دماغ میں ایک بات آتی ہے جو شاید آپ کو پسند نہ آئے..... ہمارے ساتھ اور اس بستی کے مسلمانوں کے ساتھ آپ کا خون کا کوئی رشتہ تو ہے نہیں۔ آپ کہیں گے کہ آپ نے تو جاپانیوں کے پاس ہی جانا تھا' یہ لڑکیوں کے ساتھ عیش موج کرتے ہیں تو کرتے رہیں' اگر یہ مسلمان ہیں تو ہوتے رہیں!"

وانگ کی یہ بات میرے دل میں تیر کی طرح اتر گئی۔ میں نے اپنے خون میں ابال محسوس کیا۔

"یہ بات نہ کہو وانگ!" —— میں نے کہا —— "تمہارے ساتھ اور تمہاری عورتوں کے ساتھ میرا جو رشتہ بن گیا ہے وہ خون کے رشتے سے زیادہ مضبوط اور مقدس ہے۔ باقی رہے مسلمان' تو تم شاید نہیں جانتے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے اجنبی

ہی کیوں نہ ہو ان کا آپس کا رشتہ اسلام کی وجہ سے خون کے رشتے سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے..... میں تمہیں اپنے دل کی بات بتاتا ہوں۔ یہاں جتنی عورتیں ہیں وہ سب میرے خون کے رشتے کی عورتیں ہیں۔ میں نے سمیع اللہ کو اور اس کے غنڈوں کو کیوں قتل کیا تھا؟ صرف اس لئے کہ وہ ان عورتوں کو خراب کرتے تھے۔ انہیں مار کر یہی کام اس رائفل کے زور پر میں بھی کر سکتا تھا اور اب بھی کر سکتا ہوں لیکن نہیں کروں گا"۔

جب نیت صاف ہو اور انسان کے دل میں ایمان کی روشنی ہو تو اللہ سیدھا راستہ دکھا دیا کرتا ہے۔ میں نے وانگ اور دوسرے ساتھیوں سے کہا کہ کشتی یہیں چھوڑ دیتے ہیں اور ہم بستی میں نہیں جائیں گے بلکہ اپنی طرف والی پہاڑی کے اندر چلیں گے اور اوپر جا کر کہیں چھپ جائیں گے اور دیکھیں گے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ میں چونکہ فوجی تھا اس لئے میں نے فوجی انداز میں سوچا۔

مجھے سوچ یہ آئی کہ جاپانی نو ہیں اور ہر ایک کے پاس رائفل ہے۔ نو رائفلوں کے مقابلے میں میری اکیلی رائفل ہے۔ اس کے علاوہ میری کمزوری یہ تھی کہ میرے پاس ایمونیشن بہت تھوڑا تھا۔ انگریز پائلٹ کا ریوالور اور گولیاں میں اپنے جھونپڑے میں چھوڑ آیا تھا۔ بہرحال میں نے پکا عزم کر لیا کہ ان جاپانیوں نے عورتوں کو چھیڑا تو میں ان کا مقابلہ کروں گا اور اپنی جان بھی قربان کر دوں گا۔

○

ہم نے کشتی وہیں کھینچ کر خشکی پر کر لی اور پہاڑیوں کی طرف چل پڑے۔ بستی دور نہیں تھی۔ ہم دریا کے کنارے کنارے چلتے گئے۔ جب دریا کا موڑ مُڑے تو ہم نے دیکھا کہ جہاں بستی کی کشتیوں کا گھاٹ سا بنا ہوا تھا وہاں ایک موٹر بوٹ کھڑی تھی۔ یہ اُن جاپانیوں کی ہی ہو سکتی تھی۔ وہ دریا کے نیچے کی طرف سے یعنی جس طرف کو پانی کا بہاؤ تھا' اس طرف سے آئے تھے۔ یہاں انہوں نے گھاٹ دیکھا تو وہیں رک گئے۔ گھاٹ اس طرح تھا کہ لکڑی کے مضبوط تختوں کا ایک پلیٹ فارم بنا ہوا تھا۔

ہم آگے نہ گئے۔ وہیں سے دائیں طرف پہاڑیوں کے اندر راستہ جاتا تھا۔ یہ باقاعدہ راستہ تو نہیں تھا' دو پہاڑیوں کے درمیان جو جگہ تھی ہم اس میں داخل ہو گئے اور آگے چلتے گئے۔

ہمیں اندازہ تھا کہ بستی کتنی دور ہے۔ پہاڑی کے دوسری طرف بستی تھی۔ ہم

پہاڑی پر چڑھ گئے جو کوئی زیادہ اونچی نہیں تھی۔ اس پہاڑی کے اوپر وہ درخت تھے جو زیادہ اونچے نہیں تھے اور جھاڑیاں بہت گھنی تھیں اور اونچی گھاس خاصی زیادہ تھی۔ وہاں ہم آسانی سے چھپ کر اردگرد دیکھ سکتے تھے۔

اوپر جا کر ہم جھاڑیوں کے پیچھے چھُپ کر دیکھنے لگے۔ ہمیں یہ منظر نظر آیا کہ بستی کے آدمی ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے' ذرا زیادہ عمر کی عورتوں کو الگ بٹھایا ہوا تھا اور جو نوجوان لڑکیاں تھیں انہیں ان جاپانیوں نے الگ بٹھا رکھا تھا۔ بستی کی دوسری طرف ایک ٹیکری تھی۔ چار پانچ جاپانی اس ٹیکری پر چڑھے ہوئے تھے۔ ٹیکری پر چھوٹے چھوٹے دو بکس رکھے ہوئے تھے۔ جاپانی ایک درخت سے قریب کے دوسرے درخت کے ساتھ ذرا بلندی پر ایک تار باندھ رہے تھے۔ اس تار کے درمیان میں ایک اور تار بندھی ہوئی تھی جو نیچے تک آئی ہوئی تھی۔ انہوں نے پانچ چھ آدمی اپنے ساتھ کام پر لگا رکھے تھے۔

انہوں نے بکس کھولے اور اس کے بعد میں تفصیلات سنائے بغیر بتاتا ہوں کہ انہوں نے جو کچھ وہاں کیا وہ یہ تھا کہ ان بکسوں میں وائرلیس سیٹ تھے اور اوپر انہوں نے جو تار باندھی تھی وہ ان سیٹوں کا ایریل تھا۔ میرا خیال صحیح نکلا۔ ایک جاپانی نے ٹیلیفون کے ریسیور کی طرح کا آلہ اپنے کان کے ساتھ لگایا اور کسی کے ساتھ ملاپ کرنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سگنل کور کے فوجی ہیں لیکن میں یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ نو جاپانی ادھر کیسے آ نکلے ہیں۔ دور دور تک ان کی کسی اور فورس کا نام ونشان نہیں ملتا تھا۔ میں نے دماغ پر زور دیا تو یہ سمجھ سکا کہ جاپانی پسپا ہو رہے ہیں اور یہ نو جاپانی ایسی طرف بھاگ نکلے ہیں کہ اپنی فورس سے بہت دور آ گئے ہیں۔

میرے سامنے مسئلہ یہ نہیں تھا کہ یہ کہاں سے آئے ہیں اور کیوں آئے ہیں' اصل مسئلہ یہ تھا کہ انہیں یہاں سے نکالا کس طرح جائے۔ میں نے ان کی حرکتیں دیکھ لیں جن سے میں نے اپنے اس فیصلے کو مضبوط کر لیا کہ انہیں ختم کرنا ہے۔ حرکتیں یہ کہ ایک تو وہ جاپانی تھے جو ٹیکری پر کام کر رہے تھے' دوسرے نیچے کھڑے تھے اور کھڑے بھی وہاں تھے جہاں نوجوان لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ کبھی ایک جاپانی کسی ایک لڑکی کو بازو سے پکڑ کر اٹھاتا اور اُسے اپنے بازوؤں میں لے کر اس کے ساتھ بے ہُودہ حرکتیں کرتا اور کبھی اپنا ہاتھ اس کے کپڑوں کے اندر لے جاتا تھا۔ کبھی دوسرا جاپانی کسی اور لڑکی کو اٹھا کر اس

کے ساتھ ایسی ہی بے ہُودگی کرنے لگتا۔ ایک نے ایک لڑکی کے پاس بیٹھ کر اسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔ مجھے زیادہ بری یہ بات لگ رہی تھی کہ ان لڑکیوں کے ماں باپ اور بھائی وغیرہ قریب بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ میرے دل سے جاپانیوں کی دوستی کا خیال نکل گیا اور ویسی ہی نفرت پیدا ہو گئی جیسی انگریزوں کے لئے تھی۔

ہم وہیں چھُپے ہوئے دیکھتے رہے اور وقت گزرتا چلا گیا۔ سورج غروب ہونے کے لئے پہاڑیوں کے پیچھے چلا گیا۔ جاپانیوں نے اپنا کام روک دیا اور جو ٹیکری پر تھے وہ نیچے آ گئے۔ بستی کے کچھ آدمیوں کو انہوں نے اشارہ کیا تو وہ آدمی دوڑتے ٹیکری پر گئے اور وائرلیس سیٹوں کے بکس اٹھا کر نیچے لے آئے۔

ایک جاپانی وہیں کھڑا رہا' باقی آٹھ نے ایک لڑکی کو اٹھایا اور وہاں سے چل پڑے۔ میں نے دو لڑکیوں کو دیکھا کہ وہ ان کے ساتھ نہیں جا رہی تھیں۔ جاپانیوں نے انہیں مارنا پیٹنا شروع کر دیا اور اپنے ساتھ لے چلے۔ ان کے باپ دوڑ کر ان کے پیچھے گئے تو جاپانیوں نے انہیں بھی ایک ایک دو دو گھونسے مار کر بھگا دیا۔

وہ لڑکیوں کو میرے جھونپڑے میں لے گئے۔ یہ صاف ستھرا بھی تھا اور اس کے دو کمرے تھے۔ مجھے اپنا جھونپڑا صاف نظر آ رہا تھا۔ رائفل تو میں اپنے ساتھ لے آیا تھا لیکن انگریز پائلٹ کا ریوالور میں نے جھونپڑے میں ہی رکھا رہنے دیا تھا۔ جاپانی اندر گئے اور لڑکیوں کو بھی اندر لے گئے تو تھوڑی ہی دیر بعد ایک جاپانی باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں وہ ریوالور تھا جو بیلٹ کے ساتھ ہولسٹر میں بند تھا۔ جاپانی نے بڑی زور سے کچھ کہا اور اشارہ کیا۔ اس کے قریب بستی کے کچھ آدمی کھڑے تھے۔ وہ سب جاپانی کی طرف دوڑے گئے۔

جاپانی ریوالور ان کے سامنے کر کے کچھ کہہ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ ان سے پوچھ رہا تھا کہ یہ ریوالور کس کا ہے۔ بستی کے آدمی ہاتھوں کے اشاروں سے اسے کچھ بتانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہاں یہ مسئلہ بھی تھا کہ جاپانی ان برمیوں کی اور برمی جاپانیوں کی زبان نہیں سمجھتے تھے۔

وہ جاپانی جو وہیں کھڑا رہا تھا جہاں انہوں نے سب کو بٹھا رکھا تھا وہ دراصل ان لوگوں پر سنتری کھڑا کیا گیا تھا۔ اس نے ان لوگوں سے کہا ہو گا کہ سب اپنی اپنی جگہ چلے جائیں۔ سب لوگ' عورتیں اور لڑکیاں بھی اٹھیں اور اپنے اپنے جھونپڑوں کی طرف چلی گئیں۔

یہ جاپانی بستی کے اردگرد ٹہلنے لگا۔ اس کے پاس رائفل تھی۔

سورج غروب ہو گیا اور پھر رات گہری ہونے لگی۔ چاند آدھے سے ذرا زیادہ تھا۔ جنگل کے اوپر فضا بڑی ہی صاف شفاف ہُوا کرتی ہے۔ جب چاند پوری آب و تاب سے چمکنے لگا تو ہر ایک چیز صاف نظر آنے لگی۔ یہ سنتری بستی کے اندر بھی ٹہلتا رہا اور بستی کے اِردگرِد بھی چکر کاٹتا رہا۔ اسے اور ان جاپانیوں کو لوگوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا' میں یہ سمجھ سکا کہ سنتری اس لئے مقرر کیا گیا تھا کہ یہاں سے کوئی بھاگ نہ جائے۔

ہمیں بھوک پریشان کرنے لگی تھی۔ میری نظر اس سنتری پر تھی۔ میں نے ان لوگوں یعنی جاپانیوں میں ایک ڈسپلن دیکھا۔ ایک اور جاپانی آیا اور پہلے سنتری کو آوازیں دینے لگا۔ پہلا سنتری آیا تو دوسرے نے اسے جھونپڑے کے اندر بھیج دیا اور خود اسی طرح ڈیوٹی دینے لگا جس طرح پہلا سنتری بستی کے اندر اور باہر ٹہلتا رہا تھا۔

اس سنتری کو مارنا میرے لئے کوئی مشکل نہیں تھا۔ میں سنگین ہاتھ میں لے کر دبے پاؤں پیچھے چلا جاتا اور جہاں موقع دیکھتا' اس کی گردن پیچھے سے بازو کے گھیرے میں لے کر سنگین اس کے دل میں اتار دیتا۔ ذرا حوصلہ قائم رکھ کر میں یہ کام کر سکتا تھا لیکن میں نے یہ بھی سوچ لیا کہ میں تو اسے مار کر پہاڑی کے اندر چُھپ جاؤں گا لیکن جاپانی اس بستی کے تمام آدمیوں کو ایک جگہ کھڑا کر کے مشین گن سے اُڑا دیں گے اور ان کی لڑکیوں اور دیگر جوان عورتوں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

میں نے یہاں مشین گن کا نام لیا ہے۔ ان جاپانیوں میں سے ایک کے پاس لائٹ مشین گن تھی۔ لائٹ مشین گن ہماری فوج میں بھی تھی جسے V.B گن کہا جاتا تھا اور اس کے اوپر میگزین چڑھائی جاتی تھی لیکن میں نے دور سے دیکھ لیا تھا کہ جاپانیوں کی اس مشین گن کے ساتھ ایمونیشن کا پٹہ چلتا تھا۔ باقی آٹھ جاپانیوں کے پاس رائفلیں تھیں۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ رات اسی پہاڑی پر گزاریں گے اور کل صبح جب جاپانی باہر نکلیں گے تو میں رائفل سے ایک ایک کو مار ڈالوں گا لیکن غور کیا تو مجھے یہ ترکیب بھی ٹھیک نہ لگی۔ وہ اس لئے کہ وہ سب فوجی تھے۔ میں ایک کو گولی مارتا تو باقی سب فوراً اِدھر اُدھر ہو جاتے اور پھر میں فائر کرتا تو انہیں پتہ چل جاتا کہ فائر کہاں سے آ رہا ہے۔ میری کمزوری یہ تھی کہ میرے پاس ایمونیشن بہت تھوڑا تھا۔

○

میں نے وانگ سے کہا کہ کھانے کا کچھ بندوبست ہونا چاہئے۔ ہم نے آپس میں بات چیت کر کے طریقے سوچے کہ بندوبست کیا ہو۔ ایک طریقہ دماغ میں آگیا اور سب اس پر متفق ہو گئے۔ سنتری جب ہماری طرف سے بستی کے باہر باہر گزر گیا تو وانگ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ پہاڑی سے آہستہ آہستہ اتر گیا۔ اس طرف جو جھونپڑا سب سے زیادہ قریب تھا' یہ دونوں اس کے اندر چلے گئے۔ وہاں سے وہ ساتھ والے دو جھونپڑوں میں گئے۔ وانگ باہر نکلا اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ سنتری کسی اور طرف تھا۔ وانگ اور اس کے ساتھی وہاں سے نکلے اور پھر پہاڑی پر چڑھ آئے۔ ان گھروں میں سے انہیں کچھ بچے ہوئے چاول اور مچھلی مل گئی تھی۔ یہ کھانا تھا تو تھوڑا لیکن ہم سب کی بھوک کی شدت کو دبانے کے لئے کافی تھا۔ وانگ نے ایک عقلمندی یہ بھی کی تھی کہ ٹین کے ایک ڈبے میں پانی بھی لے آیا تھا۔ ہم سب نے مل کر یہ کھانا کھایا' پانی پیا اور ہم تر و تازہ ہو گئے۔ پھر ہم سب وہیں سو گئے۔

میری آنکھ خاصی دیر بعد لگی تھی۔ میں جتنی دیر جاگتا رہا جاپانیوں کا شور و غل سنتا رہا۔ وہ میرے جھونپڑے میں ناچ کُود رہے تھے اور گانے بھی گا رہے تھے۔ اس وقت مجھے تانی یاد آئی اور افسوس ہونے لگا کہ وہ معصوم سی لڑکی ان وحشی جاپانیوں کے ہاتھ چڑھ جائے گی اور پھر شاید وہ زندہ بھی نہ رہ سکے۔ مجھے افسوس تو ہو رہا تھا لیکن مجھے یہ بھی یاد آ رہا تھا کہ ان لڑکیوں میں وہ مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ جاپانی جن لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے گئے تھے' ان میں بھی تانی نہیں تھی۔ پھر وہ کہاں تھی؟..... مجھے اس سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ اس کی سلامتی کے لئے میرے منہ سے دعا نکلی۔ اس کے بعد میں سو گیا۔

میں جب جاگا تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ میرے ساتھی بھی جاگ اٹھے تھے۔ وہ لڑکا بھی ہمارے ساتھ تھا جس نے ہمیں اطلاع دی تھی کہ بستی میں جاپانی آ گئے ہیں۔ میں نے بستی کی طرف دیکھا' ایک جاپانی رات کی طرح سنتری کی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ میری نظریں اپنے جھونپڑے پر لگی ہوئی تھیں جہاں آٹھ جاپانی چلے گئے تھے۔ وہاں ابھی خاموشی تھی۔ وہ رات بھر جشن مناتے رہے تھے' انہیں جاگنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔

تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا ہو گا جب پہلا جاپانی جھونپڑے سے باہر نکلا۔ سورج خاصا اوپر آ گیا تھا۔ ایک دو منٹ بعد دو اور جاپانی باہر آ گئے۔ پھر آٹھوں لڑکیاں باہر آئیں۔ دور

سے ہی پتہ چل رہا تھا کہ وہ مغموم اور مظلوم ہیں۔ باہر جو جاپانی کھڑے تھے، ان میں سے ایک نے انہیں کچھ کہا۔ لڑکیاں اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ دو تین اور جاپانی باہر آ گئے۔

وہ اب وردی میں نہیں تھے۔ موسم گرمیوں کا تھا اس لئے انہوں نے لمبے انڈرویئر پہن رکھے تھے۔ وہ سب دریا کی طرف دیکھ رہے تھے جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بستی بلندی پر تھی۔ دریا کی طرف زمین نیچے کو جاتی تھی۔ اس لئے بستی سے دریا صاف نیچے نظر آ رہا تھا۔ باہر کھڑے جاپانیوں نے اندر والوں کو بھی باہر بلا لیا اور دریا کی طرف اشارے کرنے لگے۔ ان میں سے ایک نے سنتری کو آواز دی اور سنتری دوڑتا ہوا وہاں پہنچا۔ پھر یوں ہوا کہ سنتری جھونپڑے سے باہر کھڑا ہو گیا اور آٹھ جاپانی چیختے چلاتے، ہنستے کھیلتے دریا کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ دریا میں نہانے جا رہے تھے۔ وہ پیچھے سنتری اس لئے کھڑا کر گئے تھے کہ جھونپڑے میں ان کی رائفلیں، مشین گن دوسرا سامان پڑا ہوا تھا۔

اللہ کے فضل و کرم سے میرے دماغ میں آسمانی بجلی کی روشنی چمکی اور مجھے وہ موقع نظر آ گیا جس کی مجھے امید تھی اور امید یہ بھی تھی کہ ایسا موقع شاید پھر نہ ہی ملے۔ میں نے فوراً سوچ لیا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے وانگ سے کہا کہ وہ میرے ساتھ چلے شاید مجھے اس کی ضرورت پڑ جائے۔ باقی ساتھیوں سے کہا کہ وہ یہیں چھپے رہیں اور کوئی آدمی کھڑا نہ ہو۔ جاپانی سنتری نے دیکھ لیا تو دور سے ہی گولی مار دے گا۔

میں نے رائفل سنبھالی اور وانگ کو ساتھ لے کر پہاڑی کی پچھلی طرف اتر گیا۔ وہاں سے میں کچھ آگے گیا اور وہاں سے بائیں کو مڑا۔ چونکہ ساون کے دن تھے، بارشیں برستی رہتی تھیں اس لئے ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ اس سبزے میں چھپ چھپ کر چلنا نہایت آسان تھا۔ میں نے وانگ کو چلتے چلتے بتا دیا کہ میں کیا کروں گا۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ میں ناکام بھی ہو سکتا ہوں۔ وانگ کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ میں ناکام ہو گیا اور جاپانی نے مجھے مار ڈالا تو وانگ کیا کرے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وانگ یہ کام کرے گا۔ یہ کام ایک فوجی ہی کر سکتا تھا۔ وانگ کا کاروبار تھا اور اس کی زندگی کچھ اور طرح گزری تھی جس میں شاید اس نے کبھی مکھی بھی نہیں ماری ہو گی۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ میں گولی نہیں چلانا چاہتا تھا۔ اگر یہ جاپانی سنتری اکیلا ہوتا تو میں اسے پہاڑی کے اوپر سے ہی شست میں لے کر مار سکتا تھا لیکن میں اس کے نتیجے سے بھی آگاہ تھا جو میں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ وانگ کو ساتھ لیے میں بستی کے باہر باہر چھپتا

چھپاتا اپنے جھونپڑے کے پچھواڑے تک پہنچ گیا۔ وہاں بھی درخت تھے، گھنی جھاڑیاں اور اونچی گھاس تھی۔ اب میں اپنے جھونپڑے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ میں نے رائفل سے سنگین اتار لی۔ میں جھونپڑے کے قریب پہنچ گیا اور ذرا سا رکا۔ سنتری کے قدموں کی دھمک سنائی دی۔ جس سے میں سمجھ گیا کہ وہ ٹہل رہا ہے۔ میں وانگ کو ساتھ لئے ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ گیا۔ ذرا انتظار کر کے میں آگے بڑھا۔ اب میں جھونپڑے کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ وانگ میرے پیچھے پیچھے تھا۔ میں نے رائفل اسے دے دی تھی اور سنگین اپنے ہاتھ میں تیار رکھی ہوئی تھی۔

میں جھونپڑے کے کونے تک پہنچ گیا۔ جاپانی سنتری دریا کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ اس کے اور میرے درمیان چھ سات قدموں کا فاصلہ تھا۔ میری سکیم یہ تھی کہ پیچھے سے اس کی گردن اپنے بائیں بازو کے گھیرے میں لے کر دبا لوں گا اور سنگین اس کے پیٹ میں ماروں گا۔

میں جونہی اس پر جھپٹنے لگا وہ پیچھے کو مڑا اور اس نے مجھے دیکھ لیا۔ اب یہ میری زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ مجھے چھ سات قدم کا فاصلہ گولی کی طرح طے کرنا تھا جو میں نہیں جانتا تھا کہ ممکن بھی ہے یا نہیں۔ ایک ہی صورت تھی کہ میں پیچھے کو بھاگ اٹھتا لیکن وہ بڑے آرام سے مجھے گولی مار کر گرا سکتا تھا۔ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ رائفل کندھے کے ساتھ لگا کر مجھ پر فائر کرے گا۔ جونہی وہ پیچھے کو مڑا اور اس کی نظر مجھ پر پڑی، میں ایسی تیزی اور پھرتی سے اس پر جھپٹا کہ میں آج بھی حیران ہوں کہ ایسی تیزی مجھ میں کہاں سے آ گئی تھی۔ میرا جسم اس کے ساتھ ٹکرایا اور اس کے ساتھ ہی میں نے پوری طاقت سے سنگین اس کے پیٹ میں اتار دی۔

میرے جسم کی ٹکر سے وہ پیچھے کو پیٹھ کے بل گرا۔ میں نے اس خیال سے کہ یہ منہ سے آواز نہ نکالے، اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا لیکن اس نے اپنا سر زور زور سے ہلایا۔ میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی، درمیان والی انگلی اور اس کے ساتھ والی انگلی اس کے منہ میں دے دیں اور میری انگلیاں اس کے حلق تک پہنچ گئیں۔ اس نے میری انگلیوں میں اپنے دانت اتنی زور سے گاڑ دیئے کہ میں سمجھا کہ میری انگلیاں میرے ہاتھ سے الگ ہو جائیں گی۔ میں نے اس کے پیٹ سے سنگین نکال کر پہلے جیسی طاقت سے اُس کے سینے میں اس جگہ ماری جہاں دل ہوتا ہے۔ اس کا منہ کھل گیا اور میں نے اپنی

انگلیاں اس کے منہ سے نکال لیں۔ میں نے دوبارہ پھر سنگین نکال کر اس کے سینے میں ماری۔ تھوڑی دیر بعد اُس کا تڑپتا ہُوا جسم ساکت ہو گیا۔

میں نے دریا کی طرف دیکھا۔ آٹھ جاپانی گھاٹ کے کنارے کھڑے ہو کر دریا میں غوطے لگاتے، تیرتے اور پھر باہر آ جاتے تھے۔ وہ اپنے شغل میں محو تھے۔ میں جھونپڑے میں گیا۔ وہاں ان کی مشین گن پڑی تھی۔ راؤنڈوں کا پٹہ بھی ساتھ تھا۔ میں اس مشین گن سے واقف نہیں تھا لیکن کوئی ایسی پیچیدگی بھی نہیں تھی کہ سمجھ میں نہ آ سکتی۔

میں نے مشین گن میں پٹہ لگا لیا اور اسے کاک کر لیا۔ وانگ سے کہا کہ وہ پٹہ اٹھا لے۔ مشین گن میں نے اٹھا لی اور ہم دونوں دریا کی طرف چل پڑے۔ ہم درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں جا رہے تھے۔

جُھکے جُھکے چلتے، چُھپتے چُھپاتے ہم اتنا آگے چلے گئے کہ گھاٹ ہم سے صرف پچاس یا پچپن قدم دور رہ گیا۔ وہاں ایک موزوں جگہ دیکھ کر میں نے مشین گن زمین پر رکھی اور اس کے پیچھے لیٹ گیا۔ جاپانیوں کو شست میں لیا لیکن فائر نہ کیا۔ ان میں سے دو تین گھاٹ پر ہوتے تھے اور باقی پانی میں۔ پانی والے باہر آتے تو گھاٹ پر کھڑے پانی میں کود جاتے تھے۔ میں انتظار کرنے لگا کہ یہ سب نہا کر باہر آئیں اور اکٹھے چلیں تو میں فائر کروں۔ میں نے وانگ کو بتا دیا کہ وہ پٹہ اپنے ہاتھوں پر رکھے، اسے پکڑے نہیں اور پیچھے بھی نہ کھینچے۔

ہمیں تقریباً" نصف گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ وہ تیر تیر کر تھک گئے تو دریا سے نکلے۔ سب نے انڈرویئر اتار دیئے اور نچوڑ کر ہاتھوں میں پکڑ لئے۔ اب وہ بالکل برہنہ تھے۔ وہ ہماری طرف چلے۔ میں نے انہیں شست میں لیا اور مشین گن کا ٹریگر دبا دیا۔ میں نے بڑا لمبا برسٹ فائر کیا اور مشین گن کو ذرا دائیں اور بائیں کیا۔ آٹھوں جاپانی گرے، ذرا ذرا سے تڑپے اور ٹھنڈے ہو گئے۔

میں تے مشین گن وہیں رہنے دی اور دریا کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ سب مر گئے تھے۔ ہر ایک کو کئی کئی گولیاں لگی تھیں۔

بستی والوں کو پتہ چلا تو خوشی کا ایسا ہنگامہ برپا ہُوا کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ لوگ دریا کی طرف دوڑ پڑے اور انہوں نے ویسی ہی دھکم پیل کی جیسی مرے ہوئے شیر کو دیکھنے کے لئے کی تھی۔

میں تانی اور اس کے خاوند یوون کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ دونوں کہیں بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ لوگوں نے جاپانیوں کی لاشیں دریا میں پھینک دیں اور پھر واپس بستی میں آئے۔ اس سے خاصی دیر بعد یوون اور تانی آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ جس وقت جاپانی آئے تھے اس وقت وہ دونوں بستی سے باہر دھان کے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ انہوں نے جاپانیوں کو دیکھ لیا تھا اور کہیں جا کر چُھپ گئے تھے۔ اب لوگوں کا ہنگامہ سُن کر اور یہ معلوم کر کے آئے تھے کہ جاپانی مارے گئے ہیں۔ تانی کو محفوظ دیکھ کر مجھے بہت ہی خوشی ہوئی۔ تانی کمسن اور معصوم لڑکی تھی۔ پہلے وہ سمیع اللہ اور اس کے غنڈوں سے بچی تھی، اب خدا نے اسے جاپانیوں سے بچا لیا تھا۔ اگر وہ بستی میں ہوتی تو جاپانی سب سے پہلے اس پر ہاتھ رکھتے۔

میں نے سوچا کہ جاپانیوں کی رائفلیں ان آدمیوں کو دے دوں گا جنہوں نے کبھی رائفل یا بندوق فائر کی ہو، اگر یہ نہیں تو وہ اتنے ذہین ہوں کہ رائفل کا استعمال سمجھ سکیں۔

کون نہیں جانتا کہ جنگ ایک ہولناک اور ہیبت ناک کھیل ہوتا ہے۔ اسے موت کا کھیل کہیں تو موزوں ہو گا۔ ظاہری طور پر تو یہی ہوتا نظر آتا ہے کہ دو ملکوں کی فوجیں آپس میں ٹکراتی ہیں، ایک دوسرے پر آگ برساتی ہیں، فوجی مرتے ہیں، شدید زخمی ہو کر زندہ رہ بھی جائیں تو ساری عمر کے لئے معذور ہو جاتے ہیں اور کچھ جنگی قیدی ہو کر قیدی کیمپوں میں اپنے دشمن کے رحم و کرم پر جا گرتے ہیں۔

یہ جنگ کی تصویر کا وہ پہلو ہے جو اخباری رپورٹر جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور ساری دنیا کو اخباروں، ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے سناتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ جنگ ایسے ہی ہوتی ہے اور جنگ ختم ہونے کے بعد سارا کھیل ختم ہو جاتا ہے لیکن اس بھیانک کھیل کے اندر کچھ اور ڈرامے اور چھوٹے چھوٹے واقعات ہوتے ہیں جو لوگوں کو نظر نہیں آتے۔ پاکستانیوں نے تو 17 دن اور 14 دن کی محدود جنگ دیکھی ہے۔ ہم سے پوچھیں جنہوں نے جنگِ عظیم دوم دیکھی ہے۔ اس جنگ نے آدھے کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس جنگ نے ایسے ڈراموں کو اور ایسے واقعات کو جنم دیا تھا جو دلچسپ بھی ہیں، المناک بھی اور ان میں بعض ناقابلِ یقین ہیں۔ یہ عجیب و غریب واقعات اُن علاقوں میں ہوتے ہیں جو علاقے جنگ کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔

میری کہانی کے پس منظر میں صرف جنگِ عظیم اور اس جنگ کی لپیٹ میں آنے والا صرف ایک وسیع و عریض علاقہ ہے۔ میرے دماغ پر اس جنگ نے اور جو مجھ پر بیتی، اس نے ایسا اثر چھوڑا کہ میں آج تک اس وقت کا کوئی ایک لمحہ بھی نہیں بھولا نہ بھول سکوں گا۔ اس موضوع میں میری دلچسپی اتنی زیادہ بڑھی کہ میں جب واپس آیا تو جنگ پرانی بات

ہو گئی تھی، میں نے صرف وہ لٹریچر پڑھنا شروع کر دیا جو جنگ پر لکھا گیا تھا۔ اب تک یورپی ممالک بے شمار کتابیں لکھ چکے ہیں۔ برما فرنٹ پر تو جرنیلوں نے اور ان سے جونیئر افسروں نے بھی کتابیں لکھی ہیں۔ یہ لٹریچر صرف انگریزی میں ملتا ہے۔ مجھے جہاں کہیں پتہ چلا کہ ایک نئی کتاب آئی ہے تو میں نے وہ حاصل کی اور پڑھی۔ بعض لکھنے والوں نے جنگ کے بڑے بڑے واقعات اور لڑائیاں نہیں لکھیں بلکہ چھوٹے چھوٹے اور بڑے ہی دلچسپ واقعات ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور ان کے کرداروں سے مل کر لکھے ہیں۔

بعض لوگ ایسے واقعات پڑھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ سچے نہیں ہو سکتے۔ میں جانتا ہوں کہ ان سے زیادہ ناقابلِ یقین واقعات بھی سچے ہیں۔ میں برما کے جس خطے میں پھنس گیا تھا، وہاں لڑائی کے کوئی آثار نہیں تھے لیکن وہ خطہ جنگ سے محفوظ بھی نہیں تھا کیونکہ پورے کا پورا برما جنگ کی زد میں تھا۔ یوں کہہ لیں کہ میں وار زون میں تھا جہاں کسی بھی وقت جنگ آ سکتی تھی۔ اپنا یا دشمن کا کوئی ہوائی جہاز غلطی سے وہاں ایک دو بم پھینک سکتا تھا۔ پہلے ایک انگریز پائلٹ ہمارے درمیان آ گرا پھر اکٹھے نو جاپانی آ گئے۔ مجھے تو ہر لحہ توقع تھی کہ کسی بھی وقت پوری کی پوری انفنٹری بٹالین یا بریگیڈ یہاں آ جائے گا۔

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ یہ واقعات جو میں سنا رہا ہوں، کچھ لوگوں کے لیے قابلِ یقین نہیں، وہاں میرے لئے یہ محض اتفاقیہ واقعات تھے اور ایسے ماحول اور پس منظر میں سے ایسے ہی واقعات جنم لیا کرتے ہیں۔ بڑی ہی لمبی مدت کے بعد میری ملاقات چند ایک ایسے فوجیوں کے ساتھ ہوئی تھی جو برما فرنٹ پر لڑے تھے اور برما جاپانیوں سے آزاد کرا کے شہروں اور قصبوں میں گئے تھے۔ انہوں نے ایسے ایسے واقعات سنائے تھے جن پر صرف وہی یقین کر سکتا ہے جس نے اپنی آنکھوں یہ واقعات دیکھے تھے لیکن میں ان واقعات پر یقین کرتا ہوں۔

○

آیئے میں آپ کو اپنے سفر کے اُس مقام پر لے چلوں جہاں میں نے نو جاپانیوں کو مشین گن سے مار ڈالا تھا۔ ان میں سے ایک کو میں نے سنگین سے مارا تھا۔

میں اگر پنجابی فلموں کا ہیرو یا ولن ہوتا تو بازو بلند کر کے ایک ٹانگ پر ناچتا اور بڑھکیں مارتا لیکن میرا ردِعمل یہ تھا جیسے زمین و آسمان گھوم گئے ہوں اور اپنے آپ ہی اپنی اصلی

حالت پر آ گئے ہوں۔ مجھے اپنی اصلیت پر شک سا ہونے لگا جیسے میں وہاں کا رہنے والا نہیں ہوں جہاں میں پیدا ہوا اور جوان ہو کر فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ میں کچھ اس شک میں پڑ گیا تھا جیسے میں اسی جنگل میں پیدا ہوا ہوں اور پُراسرار سی جنگلی مخلوق کا فرد ہوں۔ ماضی سے میرا رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔ ابھی میرے وجود میں اس خوشی کی لہر نہیں آئی تھی کہ میں نے نو دشمنوں کو مار ڈالا ہے بلکہ اسے حیرت کہئے کہ میں چُپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا اور یقین کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ میں نے نو انسانوں کو دو تین منٹوں میں ختم کر دیا ہے۔

اچانک ایک شور و غل نے مجھے اس کیفیت سے بیدار کر دیا۔ میں نے گھوم کے دیکھا۔

یہ شور و غل بستی والوں کا تھا۔ وہ خوشی سے ناچ کُود رہے تھے اور فتح کے نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے انہیں دیکھا اور پھر یہ دیکھا کہ تمام آدمی اُس جھونپڑے کی طرف دوڑ پڑے جس میں جاپانیوں نے رات گذاری تھی۔ یہ میرا جھونپڑا تھا۔ لوگ جاپانیوں کا سامان لُوٹنے کے لئے اُدھر دوڑ پڑے تھے۔ وانگ اور اس کے دو ساتھی مجھ سے تھوڑی ہی دور کھڑے لوگوں کی طرف دیکھ رہے تھے اور وہ ہنس بھی رہے تھے۔

"وانگ' انہیں روکو" —— میں نے اُدھر کو دوڑتے ہوئے کہا —— "انہیں جھونپڑے کے اندر نہ جانے دینا۔ وہاں گرینیڈ بھی ہوں گے۔ کسی آدمی نے گرینیڈ اٹھا لیا تو....."

میں جھونپڑے کی طرف دوڑا۔ وانگ اور اس کے ساتھی مجھ سے پہلے پہنچ گئے۔ ہم نے جھونپڑے کے سامنے کھڑے ہو کر اس ہجوم کو روک لیا۔ مجھے گرینیڈوں کا اتنا خطرہ نہیں تھا جتنا یہ خطرہ نظر آیا تھا کہ ان لوگوں نے لُوٹ مار کی تو یہ آپس میں چِھینا جھپٹی بھی کریں گے اور ایسا نہ ہو کہ آپس میں لڑ پڑیں۔ یہ لوگ بڑے ہی پیار اور قابلِ قدر اتحاد سے رہ رہے تھے۔ پتہ چل جاتا کہ کسی گھر میں آج کھانے کے لئے کچھ نہیں ہے تو دوسرے لوگ انہیں کھانا مہیا کرتے تھے۔

اُس جاپانی کی لاش جسے میں نے سنگین سے مارا تھا' جھونپڑے کے سامنے پڑی تھی۔ دو تین آدمیوں نے اُسے ٹھڈے مارنے شروع کر دیئے۔ دوسروں کی توجہ اس طرف ہوئی تو سب اس لاش پر ٹوٹ پڑے۔ سب نے ایک دوسرے کو دھکے دے دے کر اور آگے ہو کر اسے ٹھڈے بھی مارے اور پاؤں اوپر اٹھا اٹھا کر اس کے منہ پر مارے۔ بعض نے اس کے منہ پر تھوک بھی دیا۔ ایک دو ایسے بھی آئے جن کے ہاتھوں میں ڈنڈے

تھے۔ انہوں نے اس مرے ہوئے جاپانی پر ڈنڈے برسانے شروع کر دیئے۔

ان لوگوں کا غصہ اور جذبۂ انتقام بے معنی نہیں تھا۔ ان جاپانیوں نے بستی کی کچھ لڑکیوں کو ساری رات اپنے پاس رکھا تھا۔ اب بستی کے لوگ اپنا سارا غصہ اس ایک مرے ہوئے جاپانی پر نکال رہے تھے۔

مجھے اچانک جاپانیوں کی موٹر بوٹ کا خیال آ گیا اور اس کے ساتھ یہ خطرہ محسوس ہوا کہ یہ موٹر بوٹ ہمیں پکڑوا سکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ جس طرح یہ نو جاپانی آ گئے تھے' کچھ اور جاپانی بھی ادھر آ سکتے تھے۔ اس صورت میں وہ ہم سے پوچھ سکتے تھے کہ جو جاپانی اس موٹر بوٹ پر آئے تھے وہ کہاں ہیں۔ ان کی رائفلیں اور ایمونیشن ہم سے برآمد ہوتا تو وہ اس بستی کے تمام آدمیوں کو گولی مار دیتے۔

"وانگ!" —— میں نے کہا —— "جتنی جلدی ہو سکے وہ موٹر بوٹ ڈبونی ہے"۔

"کیوں؟" —— وانگ نے حیران ہو کر پوچھا —— "ڈبونی کیوں ہے؟ یہ تو ہمارے کام آئے گی"۔

میں نے اسے بتایا کہ یہ موٹر بوٹ ہمارے لئے کیا خطرہ پیدا کر سکتی ہے۔ وانگ نے کہا کہ یہ موٹر بوٹ دریا میں ہی نہیں پڑی رہے گی' وہ کچھ آدمیوں کو ساتھ لگا کر اسے خشکی پر گھسیٹ لے گا اور ایسے طریقے سے چھپا دے گا کہ قریب کھڑے آدمی کو بھی نظر نہیں آئے گی۔

میں وانگ کی یہ بات ماننے پر آمادہ نہیں تھا لیکن ایک خیال آ گیا کہ میں نے یہاں سے نکلنا اور آگے جانا ہے۔ راستے میں دریا حائل تھا اور دریا میں طغیانی آئی ہوئی تھی۔ چپوؤں والی کشتی مجھے دریا پار نہیں کرا سکتی تھی' صرف یہ موٹر بوٹ میرے کام آ سکتی تھی۔ میں نے وانگ سے کہا کہ وہ جتنی جلدی ہو سکے اس موٹر بوٹ کو چھپا دے۔

"اُدھر جانے سے پہلے ایک اور کام کرو وانگ!" —— میں نے کہا —— "ان لوگوں کو اچھی طرح بتا دو کہ میں نے جھونپڑے کے اندر جانے سے کیوں روکا ہے تاکہ انہیں یہ شک نہ ہو کہ جاپانیوں کا اگر کچھ مال ملا تو اس پر صرف ہم قبضہ کر لیں گے۔ انہیں یہ بھی بتاؤ کہ کھانے پینے کا اور ذاتی ضروریات کا جو بھی سامان ملے گا وہ سب میں تقسیم کر دیا جائے گا"۔

وانگ نے تمام لوگوں کو خاموش کرا کے یہ بات کہہ دی۔

جو آٹھ جاپانی مشین گن سے مارے گئے تھے' ان کی لاشیں تو کچھ آدمی اٹھا کر دریا میں پھینک آئے تھے۔ اس ایک جاپانی کی لاش رہ گئی تھی۔ میں نے کہا ہی تھا کہ اس کو بھی دریا میں پھینک آؤ تو فوراً کئی ایک آدمی اسے گھسیٹتے ہوئے دریا میں پھینک آئے۔ اسی دوران یوون اور تانی بھی آ گئے جن کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔

میں جھونپڑے میں چلا گیا۔ میرے ساتھ وانگ اور اس کے تین ساتھی تھے۔ ایک تو جاپانیوں کی رائفلیں پڑی تھیں اور ایمونیشن کے دو بکس بھی پڑے تھے۔ ایک بکس دیکھا اور کھولا تو اس میں گرینیڈ پڑے تھے۔ مجھے گرینیڈوں کا ہی خطرہ محسوس ہُوا تھا۔ کوئی ناواقف گرینیڈ کی پن نکال دیتا تو ایسا دھماکہ ہوتا کہ اِردگرد کھڑے آدمیوں میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہ رہتا۔ میں نے بہت سوچا کہ ان گرینیڈوں کا کیا کروں۔ ایک خیال یہ آیا کہ پورے کا پورا بکس دریا میں پھینک دوں لیکن یہ خیال بھی آ گیا کہ ان کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔ آخر یہ فیصلہ کیا کہ انہیں سنبھال کر رکھا جائے اور کوئی آدمی اس بکس کو ہاتھ نہ لگائے۔

اس جھونپڑے میں سے جو کام کی چیزیں برآمد ہوئیں' ان میں ایک تو ٹین کے ڈبے تھے جن میں کھانے کی اشیاء پیک تھیں۔ بسکٹوں کے بھی ڈبے تھے اور پورا ایک کریٹ شراب کی بوتلوں کا تھا۔ وہاں کچھ بوتلیں کھلی پڑی تھیں جو جاپانی رات کو پیتے رہے تھے۔ ڈبے بے شمار تھے۔ جاپانیوں کی وردیاں بھی وہیں پڑی تھیں۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے ان کی جیبوں کی تلاشی لی تو ان میں سے کرنسی نوٹ نکلے جو کوئی اتنے زیادہ نہیں تھے۔

وہاں چھوٹا سا ایک اور بکس پڑا ہوا تھا۔ وہ کھولا تو اُس میں سے نوٹوں کی بے شمار گٹھیاں نکلیں۔ یہ پانچ سے لے کر سو روپے تک کے نوٹ تھے۔ برما پر بھی انگریزوں کی حکمرانی تھی اس لئے یہاں کے کرنسی نوٹ بالکل ویسے ہی اور وہی تھے جو ہندوستان میں چلتے تھے۔ ہندوستان اور برما کی کرنسی کو اس طرح الگ کیا گیا تھا کہ برما کے نوٹوں پر کالی سیاہی سے یہ الفاظ پرنٹ کئے ہوتے تھے —— FOR BERMA ONLY
ہم نے یہ نوٹ گنے نہیں۔ یہ تھوڑے بھی نہیں تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک لاکھ کی مالیت کے نہیں تھے تو 90 ہزار کے ضرور ہوں گے۔ مجھے ان نوٹوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے نہ تو ہندوستان میں ٹھہرنا تھا نہ برما میں۔ وانگ اور اس کے

ہوں سے میں نے کہا کہ یہ ساری رقم بستی والوں میں برابر برابر تقسیم کر دیں۔ میں نہیں یہ بھی کہا کہ وہ اگر اپنا حصہ کچھ زیادہ رکھنا چاہیں تو رکھ لیں لیکن اتنا زیادہ بھی کہ سو میں سے اسّی وہ رکھ لیں اور بیس لوگوں میں تقسیم کریں۔

میں موٹر بوٹ کو فوراً غائب کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے وانگ سے کہا کہ یہ نوٹ بعد تقسیم کریں گے' پہلے موٹر بوٹ کا کچھ بندوبست ہو جائے۔ وانگ نے دو قابل اعتماد وں کو جھونپڑے کے دروازے پر کھڑا کر دیا اور کہا کہ کوئی آدمی اس جھونپڑے کے نہ آئے۔ پھر اس نے سب سے کہا کہ زیادہ سے زیادہ آدمی دریا پر پہنچ جائیں۔ ان کی وہاں کوئی اور مصروفیت تو تھی نہیں' وہ سب دریا کی طرف دوڑ پڑے۔ پیچھے ہم بھی وہاں چلے گئے۔

ہم نے جس طرح جھونپڑے کی تلاشی لی تھی اسی طرح موٹر بوٹ میں گئے اور اس میں بھی کھانے کی اشیاء کے ڈبے پڑے ہوئے تھے اور ایک بوری چاولوں کی رکھی تھی۔ یہ کوئی بہت بڑی موٹر بوٹ نہیں تھی' عام کشتی جیسی تھی۔ وانگ اور کے ساتھیوں نے ایک جگہ دیکھ لی جہاں سے دریا کا کنارہ کٹا ہُوا تھا اور اندر کو چلا گیا س کٹاؤ کے کناروں پر جھاڑیاں بھی تھیں اور اونچی گھاس اور درخت بھی تھے۔ یہ عام کشتیوں جیسی تھی' فرق صرف یہ تھا کہ اس میں انجن لگا ہُوا تھا۔ دو آدمی یہ موٹر چلانا جانتے تھے۔ اس میں سے سامان نکال لیا گیا اور اسے چلا کر وہاں تک لے گئے دریا کا کٹاؤ تھا۔ موٹر بوٹ چھپ گئی تھی لیکن میں مطمئن نہیں تھا۔ قریب آ کر اس پڑ سکتی تھی لیکن سب کہتے تھے کہ اتنی کار آمد اور قیمتی موٹر بوٹ کو ضائع نہ کیا

سامان اٹھوا کر ہم جھونپڑے میں آ گئے۔ وہاں مجھے اس وائرلیس اور اُس کے ا کا خیال آیا جو جاپانیوں نے چبوترے پر لگایا اور ایرئیل درختوں کے ساتھ باندھا میرے لئے یہ وائرلیس سیٹ بیکار تھا۔ میں اس کے استعمال سے واقف ہی نہیں تھا۔ ل بھی آ گیا کہ میں اگر اس وائرلیس سیٹ کے ساتھ پکڑا گیا اور یہ پتہ چل گیا کہ میں وں اور بھگوڑا ہوں تو مجھے ایک تو بھگوڑا ہونے کے جرم میں گرفتار کریں گے اور یہ الزام تھوپ دیں گے کہ میں جاپانیوں کا جاسوس بن گیا ہوں' اسی لئے یہ وائرلیس اپنے پاس رکھا ہُوا ہے۔ میں نے چند ایک آدمی ساتھ لئے اور وہاں جا کر ایرئیل

درختوں سے اتارا اور ان آدمیوں سے کہا کہ یہ ایریئل اور وائرلیس سیٹ دریا میں پھینک آئیں۔ البتہ اس کی تار ضائع نہ کی۔ وہ لپیٹ کر اپنے پاس رکھ لی۔ یہ کہیں نہ کہیں کام آنے والی چیز تھی۔



میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میں اپنی اصلیت بھول چکا تھا اور جب میں نے ایک ہی بار نو جاپانی مار ڈالے تو مجھے یوں لگا جیسے میں آسمان کی مخلوق میں سے ہوں۔ میں اپنے آپ میں رہنا چاہتا تھا۔ میری جو منزل تھی' اسے میں اپنے ذہن میں رکھنا چاہتا تھا۔ اپنے آپ کو میں نے سنبھال لیا اور اپنی اصلیت کو ذہن میں بیدار کر لیا لیکن وہاں کے لوگوں نے مجھے کچھ اور ہی بنا دیا اور کچھ اور ہی سمجھ لیا۔ انہوں نے جس طرح میرے ساتھ عقیدت مندی کا اظہار کرنا شروع کر دیا' وہ ویسا ہی تھا جیسا عقیدت مند لوگ اپنے پیر کے آگے کرتے ہیں۔ اگر میں ان لوگوں سے کہتا کہ میرے آگے سجدہ کرو تو وہ انکار نہ کرتے۔

وہ کچھ ایسا یقین کر بیٹھے تھے جیسے مجھ میں کوئی غیبی طاقت ہے جو عام لوگوں میں نہیں ہوتی۔ وانگ اور اس کے دو تین دوست مجھے بتاتے رہتے تھے کہ لوگوں نے میرے متعلق کیا رائے قائم کر لی ہے۔ میں نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ میں ان ہی جیسا انسان ہوں اور مجھ میں کوئی مافوق الفطرت طاقت نہیں لیکن وہ نہیں مانتے تھے۔ وانگ اور اس کے یہ ساتھی اس بستی کے لوگوں کے لیڈر تھے اور لوگ ان کی ہر بات مانتے تھے۔ یہی لیڈر مجھے سطح انسانی سے بالا سمجھنے لگے تھے تو دوسرے لوگ مجھے اتنا بڑا رُتبہ کیوں نہ دیتے!

میں نے جب دیکھا کہ لوگ مجھ سے اتنے زیادہ مرعوب ہو گئے اور میرے آگے جھکنے بھی لگے ہیں تو مجھے ایک اور خیال آ گیا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ سمیع اللہ کی طرح میں بھی ان کا پیر بن جاتا اور عیش کرتا لیکن میں جس صورتِ حال میں پھنس کے رہ گیا تھا' اس سے نکلنے کے لئے مجھے اپنے اللہ کی مدد درکار تھی۔ اللہ گناہگاروں کی مدد نہیں کیا کرتا ..... مجھے نیا خیال یہ آیا کہ یہ محض اتفاقات تھے کہ میں نے انگریز پائلٹ کو ان ہی لوگوں کے ہاتھوں مروا دیا تھا اور اب جاپانیوں کو مار ڈالا تھا' ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے ہی کوئی اور آ جائے یا ایسی صورتِ حال پھر بھی ہو جائے اور میں کچھ بھی نہ کر سکوں بلکہ گرفتار ہو

جاؤں۔ یہ سوچ کر میں نے یہاں سے بھاگ جانا ہی بہتر سمجھا۔

"صاحب!" — ایک روز وانگ نے میرے پاس آ کر کہا — "ہمارے لوگ آپ کو کہیں بھی نہیں جانے دیں گے۔ وہ تو آپ کو اپنی بیٹیاں پیش کر رہے ہیں"۔

"بیٹیاں؟" — میں نے حیرت اور ذرا غصے سے کہا — "کیا تم لوگ یہاں ایک اور سمیع اللہ پیدا کرنا چاہتے ہو؟ کیا تم مجھے بھی....."

"نہیں صاحب!..... نہیں!" — وانگ نے کہا — "دو آدمی ہیں..... دونوں مسلمان ہیں۔ دونوں کی ایک ایک بیٹی جوان ہو گئی ہے۔ دونوں نے الگ الگ مجھے کہا ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں کہ میں ان کی بیٹی کے ساتھ شادی کر لوں۔ ایک نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مسلمان ایک سے زیادہ بیویاں بھی رکھ سکتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو دونوں کے ساتھ شادی کر لیں"۔

میں اس داستان میں بڑے واضح الفاظ میں کہہ چکا ہوں کہ میں انسان تھا فرشتہ نہیں تھا۔ انسان بھی ایسا جو اچھی قسم کا انسان نہیں تھا۔ وانگ نے مجھے بڑے ہی سخت امتحان میں ڈال دیا تھا۔ یہ مت بھولیں کہ میں جوان آدمی تھا اور میری فطرت کے تقاضے اور مطالبے میرے جیسے جوان فوجیوں کی طرح کے تھے۔ میں آج بھی حیران ہوں کہ میں فوراً پھسل کیوں نہ گیا۔ ایک وجہ تو صاف تھی کہ شادی کا نام سن کر ہی مجھے واجدہ یاد آ گئی اور ایک فلم تھی جو میری آنکھوں کے آگے چل پڑی۔

میں نے وانگ سے کہا کہ میں سوچ کر جواب دوں گا۔ تھکن کا بہانہ کر کے میں نے اسے اٹھا دیا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے اپنا گھر یاد آ گیا۔ ایسی بے چینی شروع ہو گئی جو میرے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ میرے آنسو نکل آئے۔ واجدہ ایسی بُری طرح میرے دل و دماغ پر غالب آ گئی کہ جی میں آتی تھی کہ اُڑ کر پہنچ جاؤں لیکن میں مجبور تھا اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اُس کا خاوند زندہ گھر پہنچ گیا تھا یا نہیں' اگر وہ دونوں ٹانگوں کے بغیر گھر پہنچا تھا تو واجدہ نے اسے قبول کر لیا تھا یا نہیں۔

میں مجبور اور بے بس تھا اور ذہن اس قدر پریشان کہ ایک بار سوچ لیا کہ رائفل میرے پاس ہے' ایک راؤنڈ اس میں ڈالوں اور اپنے آپ کو ختم کر لوں۔ میں موت سے ڈر گیا اور میرا ذہن فرار کے راستے ڈھونڈنے لگا۔ اسے فرار کا ایک ذریعہ مل گیا۔ ان دونوں لڑکیوں کو میں نے دیکھا ہُوا تھا بلکہ ہر روز ہی دیکھا کرتا تھا جو مجھے پیش کی جا رہی

تھیں۔ دونوں خوبصورت تھیں اور نوجوان بھی تھیں۔ پریشان حال اور شکست خوردہ ذہن مجھے مجبور کرنے لگا کہ میں ان دونوں میں سے ایک لڑکی کے ساتھ شادی کر لوں۔ میں نے تقریباً فیصلہ کر لیا کہ میں ایسا ہی کروں گا۔ انہی خیالوں اور تصوروں میں میری آنکھ لگ گئی۔

○

میں اگلے روز حسب معمول دیر سے جاگا۔ ذہن خاصا پُرسکون تھا۔ ناشتہ کر کے میں باہر نکلا ہی تھا کہ وانگ آ گیا اور اس نے پہلی بات یہ پوچھی کہ میں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔
میں نے ایک مسکراہٹ کے سوا کوئی اور جواب نہ دیا۔ وانگ میری مسکراہٹ کو شاید رضامندی سمجھا ہو گا لیکن میں کسی اور ہی خیال میں گم ہو گیا تھا۔ اُس وقت میری نظریں ان لوگوں کے جھونپڑوں پر گھوم رہی تھیں۔

میرا جھونپڑا ذرا بلندی پر تھا جہاں سے مجھے یہ ساری بستی بڑی صاف نظر آتی تھی۔ جھونپڑوں کی چھتیں نظر آتی تھیں اور بعض کے صحن بھی میں دیکھ رہا تھا۔ مجھے خیال یہ آ گیا کہ یہ لوگ جنگ سے بھاگ کر یہاں آئے اور آباد ہو گئے۔ یہ خوف و ہراس کے مارے ہوئے اپنے آپ کو اتنا کمزور سمجھ رہے تھے کہ مجھے ہی اپنا محافظ اور نجات دہندہ سمجھ لیا۔ میرا دھیان اللہ کی طرف چلا گیا تو ایک خیال آیا کہ ہر کسی کا محافظ اللہ ہے لیکن ان لوگوں کو وہ اللہ نظر نہیں آ رہا اس لئے انہوں نے مجھے اپنا خدا یا دیوتا بنا لیا ہے۔

"اے گناہگار انسان!" —— میری ذات سے آواز اٹھی —— "کیا تُو اللہ سے برابری کرنے کی سوچ رہا ہے؟ اپنے آپ پر نظر ڈال، تُو ان سے زیادہ کمزور ہے"۔

میرا وجود سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ میں نے دل ہی دل میں اللہ سے معافی مانگی اور مدد بھی۔

"آپ شادی کر لیں صاحب!" —— وانگ نے کہا —— "زیادہ مت سوچیں"۔

"میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں وانگ!" —— میں نے کہا —— "اتفاق سے موٹر بوٹ مل گئی ہے۔ اس میں مجھے دریا کے اگلے کنارے پر چھوڑ آؤ"۔

"کیا آپ دریا کی حالت دیکھ نہیں رہے صاحب!" —— وانگ نے کہا —— "روز بروز طغیانی بڑھ رہی ہے۔ کچھ دنوں بعد یہ دریا کناروں سے باہر آ جائے گا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ روزانہ مینہ برستا ہے۔ مون سون کا موسم شروع ہو گیا ہے۔ کم از کم دو

مہینے آپ یہاں سے نہیں نکل سکیں گے"۔

اس نے جو کہا تھا وہ ٹھیک کہا تھا۔ ساون کی بارشیں شروع ہو گئی تھیں اور دریا چڑھتا جا رہا تھا۔ دریا کے درمیان جو موجیں اٹھتی تھیں وہ روز بروز اونچی اور تیز و تُند ہوتی جا رہی تھیں۔ موٹر بوٹ ان میں سے نہیں گزر سکتی تھی، البتہ الٹ کر ہمیں ڈبو سکتی تھی۔ اس دریا پر دور اوپر پُل تھا اور نیچے کی طرف بھی ایک پُل تھا۔ یہ مجھے انہی لوگوں نے بتایا تھا لیکن دونوں پُل میرے لئے بیکار اور خطرناک تھے۔ دونوں پُلوں پر دونوں طرف فوج کے پہرے کھڑے رہتے تھے۔ میں کسی بھی پُل پر جاتا تو پکڑا جاتا۔

"شادی کی سوچو صاحب!" —— وانگ نے کہا —— "شادی کی سوچو..... ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے"۔

میں ہنس پڑا اور وانگ کے کندھے پر تھپکی دی۔

"کبھی تو ایسا خیال آتا ہے کہ یہاں سے بھاگ جاؤں" —— میں نے وانگ سے کہا —— "دل گھبرا جاتا ہے۔ کبھی ایسے بھی لگتا ہے جیسے میں یہاں قید ہو گیا ہوں"۔

"تو پھر میری ایک بات مانیں" —— وانگ نے کہا —— "ہمارے ساتھ کسی دن قصبے میں چلیں۔ آپ کو وہاں کوئی نہیں پہچان سکے گا۔ آپ کے پاس یہ کپڑے ہیں ان کپڑوں میں آپ کو کوئی بھی نہیں پہچان سکے گا..... اس طرح آپ کے دل کے بہلنے کا ایک ذریعہ مل جائے گا۔ آپ اس قصبے اور وہاں تک جانے والے راستے کو یقیناً پسند کریں گے"۔

وانگ کا یہ مشورہ مجھے اچھا لگا۔ میں تو ایک ہی جگہ قید ہو کر رہ گیا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ قصبے میں جانا میرے لئے خطرے سے خالی نہیں ہو سکتا۔ میں فوجی امور کو سمجھتا تھا۔ قصبے میں ہماری انٹیلی جنس کے آدمیوں اور مخبروں کا ہونا لازمی تھا۔ میں چونکہ برمی نہیں تھا اس لئے میں برمیوں میں پہچانا جا سکتا تھا کہ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں۔ اس کے باوجود میں وانگ کے ساتھ جانے پر تیار ہو گیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کسی نے مجھ سے پوچھا تو میں کہوں گا کہ پنجاب کا رہنے والا ہوں اور رنگون میں میری دکان تھی۔ وانگ اور ان کے ساتھیوں نے یہی گواہی دینی تھی۔

اگلے روز ہم قصبے کو روانہ ہوئے۔ میرے ساتھ وانگ اور اس کے چار ساتھی تھے۔ میں نے سمیع اللہ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ سر پر کپڑے کی ٹوپی تھی اور میری

داڑھی لمبی تھی۔ میں نے کرتے کے نیچے نیفے میں انگریز پائلٹ کا ریوالور اڑسا ہوا تھا۔ اس میں چھ گولیاں بھری ہوئی تھیں اور بارہ گولیاں بیلٹ میں اُڑسی ہوئی تھیں۔ میں نے یہ بیلٹ کرتے کے اندر کمر سے باندھ لی تھی۔ ہم بستی سے نکل کر پہاڑی کے پیچھے چلے گئے۔ پیچھے دھان کے کھیت تھے ان سے آگے پہاڑیاں تھیں۔ وہاں کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔

دیکھنے کو یہ علاقہ بہت ہی خوبصورت اور صحت افزاء تھا۔ سبزہ زار کے نیچے زمین تو نظر ہی نہیں آتی تھی۔ پہاڑیوں کے دامن میں کہیں کہیں ہرے سرکنڈے کھڑے تھے جو اتنے گھنے تھے کہ ان میں سے گزرا نہیں جا سکتا تھا۔ درخت تو بہت ہی زیادہ تھے۔ پہاڑیوں کے اوپر بھی سبزہ اور درخت تھے۔ آسمان پر ساون کے بادل منڈلا رہے تھے۔ سارا ماحول اتنا دلفریب تھا کہ انسان اپنے آپ کو دکھ درد اور مسائل سے آزاد سمجھنے لگتا تھا لیکن جب خیال آتا کہ یہ خطہ جنگ کی زد میں ہے تو دل پر خوف ساطاری ہو جاتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ جنگ اس طرف آ گئی تو توپوں کی گولہ باری اور ہوائی جہازوں کی بمباری اس خطے کے حسن کو جلا کر راکھ کر دے گی اور فوجیں اس سبزہ زار کو پاؤں تلے روند ڈالیں گی۔

ہم بونے درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں میں سے راستہ بناتے چلے جا رہے تھے۔ یہ شاخیں رات کی بارش کے قطروں سے بوجھل تھیں۔ ان شاخوں نے ہمارے کپڑے بھگو دیئے۔ آگے جو پہاڑی تھی اس کے درمیان شگاف تھا۔ ہم اس شگاف میں سے گزرے تو آگے یک لخت زمین نیچے چلی گئی۔ یہ ایک وسیع اور خاصا لمبا کھڈ تھا جس میں بارش کا پانی کنارے تک بھرا ہوُا تھا۔ اس کے دائیں بائیں سے گزرنے کی ذرا سی بھی جگہ نہیں تھی۔ اس کھڈ کے درمیان ایک لمبی چٹان تھی جو ایک کنارے سے سامنے والے کنارے تک چلی گئی تھی لیکن یہ اوپر سے نوکیلی نہیں بلکہ چپٹی تھی۔ ایک آدمی اس کے اوپر چل کر آسانی سے گزر سکتا تھا۔ میرے ساتھیوں نے یہ کھڈ خشک موسم میں خشکی کی حالت میں دیکھا تھا۔ وہ بتاتے تھے کہ یہ اتنا گہرا ہے کہ لمبا تڑنگا ایک آدمی اس میں ڈوب سکتا ہے۔

ہم اس کھڈ کے درمیان کھڑی چٹان پر چلتے گزر گئے۔ آگے پہاڑی بھی کٹی ہوئی تھی۔ ہم اس میں سے بھی گزر گئے۔ آگے جا کر ہمیں دائیں طرف مڑنا پڑا کیونکہ آگے

ایک اونچی ٹیکری کھڑی تھی جس میں سے گزرنے کے لئے کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہم دائیں طرف چلتے کچھ دور تک پہنچ گئے تو یہ ٹیکری ختم ہو گئی اور ہم بائیں کو گھوم کر آگے چلے گئے۔

آگے اسی قسم کی اونچی نیچی کوئی چھوٹی کوئی بڑی، ٹیکریاں تھیں اور نوکیلی چٹانیں بھی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس علاقے میں آنے والے ہم پہلے انسان ہیں۔ جنگل اور گھنا ہو گیا تھا۔ جھاڑیاں بھی بہت تھیں اور گھاس خاصی اونچی تھی۔ کہیں کہیں ہرے سرکنڈے بھی کھڑے نظر آتے تھے۔ وانگ میرا گائیڈ تھا۔ وہ آگے آگے چل رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ کچھ دور آگے ایک باقاعدہ پگڈنڈی آ جاتی ہے۔

○

ہم کچھ اور آگے گئے تو وانگ اچانک رُک گیا اور اُس نے بازو پھیلا دیئے جس کا مطلب یہ تھا کہ سب رُک جاؤ۔ وہ کچھ دیکھ کر رُکا تھا۔ اس نے جو دیکھا تھا وہ مجھے بھی نظر آیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ پچیس تیس قدم آگے اور ذرا بائیں کو صاف نظر آیا کہ کوئی انسان یا کوئی جانور یک لخت جھاڑیوں اور اونچی گھاس کے پیچھے چھُپ گیا ہے۔ وہ کوئی انسان نہیں ہو سکتا تھا۔ انسان ہوتا تو اسے چھُپنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ کوئی درندہ ہی ہو سکتا تھا۔

"شیر نہ ہو!" —— وانگ نے سرگوشی کی۔

"ہو سکتا ہے!" —— میں نے کہا اور نیفے سے ریوالور نکال لیا۔

میں اس علاقے میں ایک شیر مار چکا تھا اور معلوم ہوُا تھا کہ جن جنگلاتی علاقوں میں جنگ لڑی جا رہی ہے، وہاں سے شیر اور بھیڑیئے وغیرہ بھاگ کر اس طرف آ گئے ہیں۔ یہ جو جھاڑیوں اور اونچی گھاس میں چھپ گیا تھا، شیر بھی ہو سکتا تھا اور بھیڑیا بھی لیکن میں نے سوچا کہ یہ کوئی درندہ کوئی اور جانور ہوتا تو وہ کچھ نہ کچھ حرکت ضرور کرتا۔ یوں ایک جگہ بے حس و حرکت نہ ہو جاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہاں کوئی نہ کوئی چیز، انسان یا جانور، ضرور چھپا ہے۔

"خبردار رہنا صاحب!" —— ہمارے ایک ساتھی نے کہا —— "شیر جب حملہ کرنے لگتا ہے تو اسی طرح چھپ کر بیٹھ جاتا ہے اور بڑی ہی تیز رفتاری سے اٹھتا اور جھپٹتا ہے"۔

میں نے دو تین منٹ انتظار کیا۔ میری نظریں اسی جگہ مرکوز تھیں جہاں کوئی چیز چھپی تھی۔ میں نے بائیں طرف دیکھا۔ قریب ہی ایک چٹان تھی۔ میں دبے پاؤں چٹان تک گیا اور اوپر چڑھ گیا۔ بلندی سے دیکھا تو صاف نظر آیا کہ وہ ایک آدمی ہے جس کا کمر سے اوپر جسم ننگا ہے۔ وہ گھٹنوں کے بل ہو گیا تھا اور اس نے سر زمین کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ مجھے یہ بھی صاف دکھائی دیا کہ اس نے نیکر پہن رکھی تھی۔ جو خاکی رنگ کی تھی۔

میں بڑی تیزی سے چٹان سے اترا اور اپنے ساتھیوں کے قریب سے گزر کر آگے چلا گیا۔ میں اس آدمی کے اور قریب جانے کا خطرہ مول نہیں لے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور یا کوئی اور ہتھیار ہو سکتا تھا۔ میری انگلی ریوالور کے ٹریگر پر تھی۔

میں نے یہ سوچ کر کہ یہ کوئی برمی ہی ہو گا' وانگ کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کہا کہ وہ اپنی زبان میں اونچی آواز سے کہے کہ تم جو کوئی بھی ہو سامنے آجاؤ ورنہ ہم گولی چلا دیں گے۔

وانگ نے بلند آواز میں یہ الفاظ کہے لیکن آگے گھاس میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ میں یہ سمجھا کہ یہ آدمی برمی زبان نہیں سمجھتا۔ میں نے اس کی خاکی نیکر دیکھی تھی۔ اس سے مجھے خیال آیا کہ یہ کوئی میری طرح محاذ سے بھاگا ہوا یا بھٹکا ہوا فوجی ہی نہ ہو!

"تم جو کوئی بھی ہو اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ" ——— میں نے بلند آواز سے کہا ——— "اگر تم فوراً" نہ اٹھے تو میں تم پر ریوالور فائر کر دوں گا"۔

"فائر نہ کرنا" ——— اُدھر سے نحیف سی آواز آئی ——— "میں اٹھنے کی کوشش کر رہا ہوں... بہت کمزور ہو گیا ہوں"۔

میں نے ٹریگر میں انگلی رکھے ہوئے ریوالور کی نالی اُدھر ہی کو رکھی اور انتظار کرنے لگا۔ پہلے مجھے اس کی پیٹھ نظر آئی پھر سر ذرا اوپر اٹھا۔ وہ کمر تک گھاس اور جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا' پھر بھی مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ نہایت آہستہ آہستہ سیدھا ہوا۔ وہ قد آور جوان تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور اس کی پسلیاں گنی جا سکتی تھیں۔ وہ واقعی بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس نے ہماری طرف دیکھا تو میں نے کہا کہ دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھ لو اور آگے آجاؤ۔

اُس نے میرے الٹی میٹم کے جواب میں کہا تھا کہ وہ اٹھ رہا ہے تو میں نے نوٹ کیا تھا کہ اُس نے اُردو میں جو جواب دیا تھا اس کا لہجہ پنجابی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہماری

طرف آیا۔ تب میں نے دیکھا کہ وہ چل نہیں سکتا۔ شاید بیمار تھا۔ اس کے پاؤں میں پشاوری چپل تھی۔ اس کے ایک بازو پر کہنی سے اوپر خاکی کپڑا بندھا ہوا تھا اور اسی طرف کی ٹانگ کی پنڈلی پر بھی ایسا ہی کپڑا بندھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی نہیں تھیں۔

میں دوڑ کر اُس تک پہنچا اور اس کے ایک پہلو میں ہو کر اس کا بازو اپنے کندھے پر رکھا اور اس کا کچھ بوجھ اپنے اوپر لے لیا۔ میرے ساتھی بھی دوڑتے پہنچے اور اُسے سہارا دیا۔ وہاں تھوڑی سی جگہ ایسی تھی جہاں گھاس نہیں تھی۔ اسے وہاں بٹھایا اور ہم اس کے پاس بیٹھ گئے۔

"کون ہو تم بھائی؟" ——— "میں نے پوچھا ——— "تم ہو تو ہندوستانی' یہ بتاؤ کس صوبے کے رہنے والے ہو؟"

"میں جہلم کا رہنے والا ہوں" ——— اس نے بڑی ہی کمزور آواز میں آہستہ آہستہ جواب دیا ——— "اور میں فوجی ہوں۔ میرا نام حوالدار فضل داد ہے..... کئی دنوں سے بھوکا ہوں' کچھ کھلا دو۔ صاف ستھرا پانی پلا دو۔ معلوم نہیں کب سے گندہ پانی پی رہا ہوں"۔

وہ میرے اپنے وطن کا آدمی تھا اور فوجی بھی تھا۔ میں اسے مرنے کے لئے وہیں چھوڑ دینا گناہ کبیرہ سمجھتا تھا۔ میں نے وانگ کو سر سے اشارہ کیا کہ چلو واپس چلیں۔ وانگ سیرسپاٹے کے خیال سے آیا تھا۔ اس کے چہرے پر بیزاری کے آثار آگئے۔

"اٹھو وانگ!" ——— میں نے اٹھتے ہوئے کہا ——— "تم لوگ مل کر اسے اٹھاؤ اور اپنے ہاں لے چلو"۔

ہم سب اٹھے۔ میں نے ریوالور اپنے نیفے میں اڑس لیا۔ میں نے اُسے اس طرح اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا کہ اس کا اوپر کا دھڑ میری پیٹھ کے پیچھے لٹک رہا تھا اور کمر سے نیچے یعنی ٹانگیں میرے سامنے تھیں۔ میرے ساتھیوں نے مجھے روکا اور کہا کہ اسے وہ اٹھائیں گے لیکن میں نے ان کی نہ سنی اور چل پڑا۔ کچھ دور آگے آکر میرے ایک ساتھی نے اسے اسی طرح اٹھا لیا جس طرح میں نے اٹھایا تھا۔ اس طرح تھوڑی دور تک باری باری اٹھاتے اسے اس جگہ تک لے آئے جہاں پانی والا لمبا چوڑا گڑھا تھا اور جو پانی سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں سے حوالدار فضل داد کو آگے لے جانا ذرا مشکل نظر

آنے لگا۔ وہاں گزرنے کا راستہ تو تھا جو دیوار جیسا تھا لیکن اس پر ایک آدمی چل سکتا تھا۔ اتنا زیادہ وزن کندھوں پر ڈال کر اس راستے پر سنبھل کر چلنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ یہ مشکل بہرصورت حل کرنی تھی۔ میں نے فضل داد کو زندہ رکھنے کا بڑا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ میرے اس ارادے میں انسانی ہمدردی کا جذبہ بھی تھا اور یہ بھی کہ وہ میری طرح فوجی تھا اور تیسری بات یہ کہ وہ میرے ہی علاقے کا رہنے والا تھا..... اُس وقت وہ میرے کندھے پر تھا۔

میں نے اسے زمین پر کھڑا کر دیا تھا تاکہ میں ذرا سستا لوں۔ میرے جسم کو اللہ تعالیٰ نے دل کھول کر طاقت دی تھی۔ میں نے فضل داد کو پھر اسی طرح ایک کندھے پر ڈال لیا جس طرح پہلے اٹھایا تھا۔ پانی سے بھرے ہوئے وسیع کھڈ کے کنارے پہنچے تو میں نے اللہ کا نام لے کر اس کے درمیان چٹان پر قدم رکھا۔ دوسرا قدم نہایت آہستہ رکھا۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ اس چٹان کی چوٹی چپٹی تھی لیکن یہ میز یا فرش کی طرح چپٹی نہیں تھی۔ کہیں ذرا اونچی اور کہیں ذرا نیچی تھی۔ چونکہ یہ گیلی تھی اس لئے اس سے پاؤں پھسلنے کا خطرہ موجود تھا۔ میں جو قدم اٹھاتا وہ آگے رکھ کر جماتا اور پھر دوسرا قدم اٹھاتا تھا۔ اس طرح میں نصف راستہ طے کر گیا۔

"صاحب جلدی آگے نکلو" ــــ پیچھے سے وانگ کی سخت گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی ــــ "مگرمچھ آ رہا ہے"۔

"کدھر سے؟" ــــ میں نے پوچھا..... میں بھی وانگ کی طرح خوفزدہ ہو گیا تھا۔

"دائیں طرف دیکھو" ــــ وانگ نے کہا۔

میں نے فضل داد کو دائیں کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ ادھر سے مجھے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے اس طرف گھوم کر یعنی پورے جسم کو اُس طرف کر کے دیکھا تو میرا خون خشک ہو گیا۔ ایک مگرمچھ کا سر پانی میں سے باہر نظر آ رہا تھا اور وہ میری طرف تیرتا آ رہا تھا۔ اس سے بچنے کی ایک ہی صورت تھی کہ میں آگے کو دوڑ پڑتا لیکن وہاں تو آہستہ چلنا بھی پُرخطر تھا۔

"یہ چھوٹے والا ہے صاحب!" ــــ مجھے ایک اور ساتھی کی آواز سنائی دی ــــ "پھر بھی خطرناک ہے..... آگے نکلو"۔

ہمارے دو ساتھی جو میرے آگے آگے جا رہے تھے، وہ دوڑ کر آگے نکل گئے اور جو

پیچھے تھے وہ پیچھے کو بھاگ گئے۔ چٹان پانی میں پوری طرح ڈوبی ہوئی نہیں تھی۔ پانی اس کی چوٹی سے ڈیڑھ دو فٹ نیچے تھا۔ مگرمچھ بڑی آسانی سے منہ اوپر کر کے میرے پاؤں یا ٹانگ کو منہ میں لے سکتا تھا۔ یہ تو میں نے بھی دیکھ لیا تھا کہ یہ چھوٹا مگرمچھ ہے۔

مگرمچھوں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو بہت بڑا ہوتا ہے اور اس کی ایک نسل چھوٹی ہوتی ہے۔ اس کے جسم کی لمبائی ایک گز بمشکل ہوتی ہے۔ میں اس کی لمبائی میں اس کی دُم کو شامل نہیں کر رہا۔ میں نے یہ چھوٹے مگرمچھ کراچی منگو پیر کی ایک خانقاہ کے تالاب میں دیکھے تھے۔ یہ بھی بڑے مگرمچھوں کی طرح خطرناک ہوتے ہیں۔ اس چھوٹے مگرمچھ نے مجھے یا فضل داد کو نگل تو نہیں لینا تھا نہ وہ اتنی بڑی چیز کو نگل سکتا تھا، اس نے کرنا یہ تھا کہ میری ٹانگ منہ میں لے کر پانی میں مجھے گھسیٹ لیتا تھا اور ڈبو کر مار ڈالنا تھا۔ اس کے بعد اس نے مجھے اور فضل داد کو کھانا تھا۔

میں نے ریوالور نکال لیا۔ مگرمچھ وہاں سے اوپر آنے کی کوشش کر رہا تھا جہاں میں کھڑا تھا۔ اس کے منہ اور میرے پاؤں کے درمیان مشکل سے ڈیڑھ دو فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ وہ ایک ہی بار منہ کا جھپٹا مار کر میری ٹانگ پکڑ سکتا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ مگرمچھ کی پیٹھ پر گولی اثر نہیں کرتی کیونکہ اس کی کھال پتھر جیسی سخت ہوتی ہے۔ اس مگرمچھ نے ایک بار منہ کھول کر اوپر آنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے منہ کی طرف ریوالور کر کے ٹریگر دبا دیا۔ گولی اس کے حلق میں لگی ہو گی۔ وہ آدھے سے زیادہ پانی سے اوپر کو اُچھلا اور پیچھے کو گرا پھر ایسا تڑپا کہ پانی اُچھل اُچھل کر میرے اوپر گرتا تھا۔ میں وہاں سے ہلا نہیں۔

"اس کے پیٹ میں گولی مارو صاحب!" ــــ میرے ایک ساتھی نے کہا۔

مگرمچھ کبھی پانی میں ڈبکی لگا جاتا اور کبھی زور سے اوپر کو اٹھتا اور پھر پانی میں گر پڑتا۔ مجھے یہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ یہ مجھ پر آخری حملہ کر دے گا جو بڑا ہی خطرناک ہو گا۔ ایک بار وہ اُلٹا ہو گیا اور اس کا پیٹ اوپر کو ہُوا، میں نے اس کے پیٹ میں گولی اتار دی۔ ...زبعد اس کا تڑپنا بند ہو گیا اور وہ مجھے پانی پر تیرتا نظر آنے لگا۔ وہ مر چکا تھا۔ نشانی یہ ...تھی کی پیٹھ نیچے اور پیٹ اوپر تھا۔ میں بڑے اطمینان سے آہستہ آہستہ کھڈ عبور ...با۔ ذرا آگے ہو کر میں نے فضل داد کو کندھے سے اتار دیا۔ پانی کو دیکھا، سرخ ہُوا ...ہا تھا۔

"میرے لئے اتنی مصیبت نہ اٹھاؤ' دوست!" ــــ فضل داد نے مریل سی آواز میں کہا ــــ "میں نے تو مرنا ہی ہے' مجھے یہیں پھینک دو"۔

"تم بری تو نہیں!" ــــ فضل داد نے مجھ سے پوچھا ــــ "ہندوستان کے کون سے علاقے کے رہنے والوں ہو؟"

"پنجاب کا ہی رہنے والا ہوں" ــــ میں نے پہلی بار اسے پنجابی زبان میں کہا اس سے پہلے میں اردو بولتا رہا تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" ــــ اس نے پوچھا۔

"رنگون میں میری دکان تھی" ــــ میں نے جھوٹ بولا ــــ "جاپانیوں نے حملہ کر دیا تو میں اور وہاں کے اور بھی بہت سے بری بھاگ آئے اور یہاں قریب ہی بنے ہوئے جھونپڑے ہمیں مل گئے اور یہاں ٹھکانہ کر لیا"۔

میں اسے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میں فوجی ہوں۔ ابھی تو میں نے دیکھنا تھا اور معلوم کرنا تھا کہ فضل داد یہاں تک کس طرح پہنچا ہے۔

ہم وہاں بیٹھ گئے۔ ہمارا ایک ساتھی اُدھیڑ عمر تھا وہ ملاّح اور ماہی گیر تھا اور آبی جانوروں کے متعلق بہت کچھ جانتا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ کھڈ مگرمچھوں کا ٹھکانہ نہیں بن سکتا کیونکہ بارشوں کا موسم گزر جائے گا تو اس کھڈ میں سے پانی کم ہوتے ہوتے ختم ہو جائے گا۔ مگرمچھ اُس جگہ ہوتے ہیں جہاں پانی ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ مگرمچھ چھوٹے مگرمچھوں کی نسل میں سے نہیں ہو گا بلکہ بچہ ہو گا۔ یہ کھڈ دو پہاڑیوں کے درمیان تھا۔ بارشوں میں پانی بڑی تیزی سے سیلابی حالت میں یہاں سے گزرتا تھا۔ یہ مگرمچھ کہیں دور سے پانی میں بہتا یا تیرتا یہاں تک پہنچ گیا اور اسی کھڈ کو اپنا ٹھکانا بنا لیا۔ اس سے ہمیں یہ خیال آیا کہ یہ بچہ ہی ہو گا۔ بہرحال مگرمچھ تھا اور خطرناک تھا۔ اس کے مارے جانے سے یہ راستہ محفوظ ہو گیا تھا یہ صحیح ہے کہ اُس وقت برما کے جنگلوں میں اژدھا بھی ہوتے تھے اور مگرمچھ بھی لیکن یوں نہیں کہ جدھر جاؤ اُدھر اژدھا اور مگرمچھ ہی تھے۔ ان کے اپنے اپنے ٹھکانے تھے۔ اگر کوئی شخص کسی مگرمچھ یا اژدھا کے ٹھکانے پر خود ہی پہنچ جاتا تو اس کا بچنا ممکن نہیں ہوتا تھا۔

ہم وہاں سے چلنے لگے تو فضل داد نے کہا کہ وہ چلنے کی کوشش کرے گا۔ اسے چلنے نہ دیا اور اسے میرے دو ساتھیوں نے اس طرح اٹھایا کہ دونوں ــ

کندھے جوڑ لئے اور فضل داد ان جڑے ہوئے کندھوں پر بیٹھ گیا۔ مشکل یہ تھی کہ ان بریوں کے قد چھوٹے تھے۔ طاقت تو پوری تھی لیکن اتنی مشقت کے یہ لوگ عادی نہیں تھے۔ کچھ اور آگے جا کر فضل داد کو میں نے اٹھا لیا' پھر دو اور ساتھیوں نے اسے اٹھایا اور اپنے ٹھکانے پر لے آئے۔ میں اسے اپنے جھونپڑے میں لے گیا اور اپنے بستر پر لٹا دیا۔

بستی میں رہنے والے چند ایک لوگوں نے دودھ کے لئے بکریاں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ دودھ گرم کر لائیں۔ وہاں قدرت کی ایک اور نعمت بہ افراط پائی جاتی تھی۔ یہ شہد تھا۔ کئی گھروں میں شہد موجود تھا۔ یہ لوگ شہد کے چھتے توڑ کر شہد نکال لیا کرتے تھے۔ میرے دو ساتھی دوڑے گئے۔

فضل داد کی بات سنانے سے پہلے میں ایک اور بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ مگرمچھ مار دینے سے میرے کارناموں اور معجزوں کے ریکارڈ میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میرے ساتھیوں نے ساری بستی میں مشہور کر دیا تھا کہ صاحب نے ایک مگرمچھ کو مار ڈالا ہے ورنہ یہ مگرمچھ معلوم نہیں کس کس کو کھا جاتا۔ میں نے ایک انگریز پائلٹ کو ان ہی لوگوں سے مروایا تھا پھر نو جاپانیوں کو مارا تھا لیکن ان لوگوں پر میری دھاک اُس وقت بیٹھی تھی جب میں نے ایک شیر مارا تھا۔ اس شیر کا پورا واقعہ پہلے سنا چکا ہوں۔ اس سے پہلے میں نے ایک اژدھا کو مار کر تانی کو اس کے منہ سے نکالا تھا اور یہی واقعہ ان لوگوں کے ساتھ میرے تعارف کا ذریعہ بنا تھا' پھر جس طرح میں نے سمیع اللہ اور اس کے غنڈوں کو مارا تھا وہ پہلے سنا چکا ہوں۔ اب ایک مگرمچھ مار ڈالا تو ان لوگوں نے اپنے اس عقیدے کو اور پختہ کر لیا تھا کہ مجھے خدا نے کوئی مافوق الفطرت طاقت دی ہے۔ میں جو کچھ تھا وہ مجھے معلوم تھا اسی لئے میں وہاں سے بھاگ نکلنے کی سوچ رہا تھا۔

○

فضل داد کی حالت بہت بُری تھی۔ اس کے بازو اور ایک ٹانگ پر جو کپڑے بندھے ہوئے تھے وہ اس کی فوجی قمیض میں سے پھاڑے ہوئے تھے۔ اس نے بتایا کہ یہ دو گہرے زخم ہیں۔ اس کے جسم پر خراشیں بے شمار تھیں۔ یہ خاردار درختوں اور جھاڑیوں کی تھیں۔ ابھی میں اس سے نہیں پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ اس جنگل میں کس طرح آنکلا ہے۔ سب سے پہلے تو اسے کچھ کھلانا پلانا تھا تاکہ اس میں کم از کم بولنے کی طاقت آ جائے۔ وہ

کچھ کہنے لگا تھا لیکن میں نے اُسے روک دیا۔ اسے بٹھا کر پانی دیا اور کہا کہ وہ آہستہ آہستہ ایک ایک گھونٹ پئے۔

میں اس کے زخموں سے کپڑے کھولنے لگا تو دیکھا کہ خون جم گیا تھا اور کپڑا زخموں پر چپکا ہوُا تھا۔ اس کی خوش نصیبی دیکھیں کہ جاپانیوں کے سامان میں فسٹ ایڈ بکس بھی تھا جس میں تمام دوایاں' پٹیاں اور مرہم پٹی کا سارا سامان موجود تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ شخص بہت گندہ ہو گیا ہے' اسے پہلے نہلایا جائے' اس سے یہ بھی فائدہ ہو گا کہ کپڑے جو زخموں پر چپکے ہوئے تھے وہ اتر جائیں گے۔

میری خدمت کے لئے دو آدمی میرے جھونپڑے کے باہر موجود رہتے تھے۔ وہی میرا کھانا پکاتے اور میرے تمام کام کرتے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ پانی کے دو کنستر بھر لائیں۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ جھونپڑے کے پیچھے چادریں وغیرہ تان کر ہم نے غسل خانہ بنا رکھا تھا۔ فضل داد کو میں سہارا دے کر وہاں لے گیا اور اس کی نیکر اتار ڈالی۔ میں نے اپنے کپڑے بدل لئے تھے۔ پانی آیا تو میں نے فضل داد کو اپنے ہاتھوں نہلایا۔ اس کا جسم خشک کیا اور ایک چادر کمر کے ساتھ باندھنے کے لئے دی۔ اسے واپس جھونپڑے میں لے آیا۔

اتنے میں دودھ اور شہد آ گیا تھا۔ یہ شہد دودھ میں ملا کر فضل داد کو دیا کہ وہ آہستہ آہستہ پیتا رہے۔ اس نے بتایا کہ وہ کئی دنوں سے بھوکا تھا۔ ہمیں یہ باتیں بتائی گئی تھیں کہ زیادہ دن پیٹ خالی رہے تو فوراً" کچھ کھانا نہیں چاہئے بلکہ آہستہ آہستہ پہلے کوئی چیز پینی چاہئے جس کے لئے شہد اور دودھ بہترین غذا ہے۔ اس کے بعد کچھ کھانا چاہئے لیکن وہ بھی آہستہ آہستہ!

صرف نہانے سے فضل داد کے چہرے پر رونق آ گئی تھی اور جب اس نے شہد اور دودھ پی لیا تو اس کی آنکھوں میں بھی جوانی کی چمک آ گئی۔ جب دیکھا کہ اس کی جسمانی طاقت بحال ہو رہی ہے تو میں نے اس کے بازو والے زخم سے کپڑا اتارا۔ گیلا ہو جانے کی وجہ سے کپڑا اتر آیا۔ میں زخم دیکھ کر گھبرا گیا۔ یہ کم و بیش چار انچ لمبا اور ایک انچ گہرا تھا۔ اس میں ذرا ذرا سی پیپ نظر آ رہی تھی۔

میں نے فسٹ ایڈ بکس کھولا۔ اس میں جو سامان تھا وہ جاپان کا بنا ہوا تھا لیکن میں مرہم پٹی کی ہر چیز سے واقف تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے اس زخم کی ڈریسنگ کر دی۔

ٹانگ سے کپڑا کھولا۔ یہ زخم ترچھا تھا اور اس کی بھی لمبائی اور گہرائی بازو والے زخم جتنی تھی۔ اس کی بھی ڈریسنگ کر دی۔ میں نے ایک خطرہ مول لے لیا۔ وہ یہ تھا کہ فسٹ ایڈ بکس میں دو شیشیاں رکھی تھیں جن میں گولیاں تھیں۔ میں نے سوچا کہ یہ زہر تو ہو نہیں سکتا' یہ اگر مرہم پٹی کے سامان میں رکھی ہیں تو ان کا استعمال یہی ہو گا کہ ایک ایک گولی زخمی کو دی جائے۔ میں نے ایک گولی ایک شیشی سے اور ایک دوسری شیشی سے نکالی اور فضل داد کو کھلا دی' ساتھ تھوڑا سا پانی پلا دیا۔

فضل داد نے جو دودھ پیا تھا وہ تین پاؤ سے کم نہ تھا اور اس میں شہد بھی اچھا خاصا ڈالا گیا تھا۔ اس دودھ اور شہد نے اسے بھوک کی اذیت سے نجات دلا دی اور اس کے ساتھ اس نے سکون اس سے بھی محسوس کیا ہو گا کہ اس کے زخموں کی صحیح مرہم پٹی ہو گئی تھی جس سے درد رک گیا تھا۔ اس کے جسم پر جو خراشیں ذرا گہری تھیں' میں نے ان پر تھوڑی تھوڑی مرہم لگا دی اور اوپر پاؤڈر چھڑک دیا۔ فضل داد پر غنودگی طاری ہو گئی۔ وہ بیٹھا ہوُا تھا' آہستہ آہستہ پیچھے ہوُا اور اس طرح لیٹ گیا جیسے گر پڑا ہو۔

میں نے سب کو اشارہ کیا کہ یہاں سے چلے جائیں۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ اب کئی گھنٹے سوئے گا۔ اس کے لئے یہی سکون اور اطمینان کچھ کم نہ تھا کہ وہ جنگل کے خطروں سے نکل آیا اور ایک محفوظ پناہ میں پہنچ گیا تھا۔

آدھی رات گزر گئی ہو گی' میں گہری نیند سویا ہوُا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ فضل داد جاگ اٹھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ میں بھی اٹھا اور دیا جلا دیا' پھر فضل داد کے پاس بیٹھ گیا۔ اس سے حال احوال پوچھا تو اس نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اسے نئی زندگی دی ہے۔ میں نے کہا کہ زندگی دینے اور واپس لینے والا صرف اللہ ہے اور وہ اللہ کا ہی شکر ادا کرے۔

"کچھ کھانے کو مل سکتا ہے؟" ___ اُس نے التجا کے لہجے میں پوچھا۔

"کیوں نہیں!" ___ میں نے کہا ___ "تمہارا کھانا الگ رکھا ہوُا ہے"۔

میں اٹھا اور اس کا کھانا لا کر اس کے آگے رکھ دیا۔ وہاں میں اسے کوئی مرغن اور تکلف کھانا تو نہیں کھلا سکتا تھا' چاول تھے اور ان کے ساتھ مچھلی تھی۔ اس کے لئے یہی کھانا بہت بڑی نعمت تھی۔ اس نے میرے کہنے پر آہستہ آہستہ یہ کھانا کھایا اور پانی پیا۔ اسے کچھ عیاشی بھی کرا سکتا تھا۔ جاپانیوں کے خوراک والے ڈبے میرے کمرے میں

ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے۔ ان پر لکھی ہوئی جاپانی زبان تو میں پڑھ نہیں سکتا تھا' ڈبوں پر تصویریں بنی ہوئی تھیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ اس ڈبے میں کیا بند ہے۔ ایک ڈبے کے باہر ناشپاتی کی قسم کے پھلوں کی تصویریں تھی۔ میں نے رائفل کی سنگین سے یہ ڈبہ کھولا اور پلیٹ میں انڈیل دیا۔ یہ ناشپاتی تھی یا جو کچھ بھی تھا' بڑا ہی مزے کا تھا۔ میں نے اور فضل داد نے پورا ڈبہ مل کر کھالیا۔

فضل داد مجھ سے دس گیارہ سال بڑا تھا اس لئے میں نے اسے بھائی جان کہنا بہتر سمجھا۔

"اب بتائیں بھائی جان!" — میں نے پوچھا — "سونا ہے یا باتیں کرنی ہیں!"

"تم سو جاؤ" — فضل داد نے کہا — "میں نے تو سولیا ہے' تمہیں نیند سے اٹھادیا ہے"۔

"میری فکر نہ کریں" — میں نے کہا — "یہاں سونے کے سوا کوئی کام نہیں۔ رات جاگوں گا تو کل دن سو لوں گا..... اگر آپ سونا نہیں چاہتے تو بتائیں کہ یہاں آپ کس طرح پہنچ گئے ہیں"۔

"ہمیں گلائیڈروں سے جاپانیوں کے اگلے مورچوں کے پیچھے اتارا گیا تھا" — فضل داد نے کہا — "ہمارا گلائیڈر شاید غلط جگہ اُتر گیا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ ہمارے گلائیڈر میں چھبیس آدمی تھے جن میں ایک انگریز لیفٹیننٹ' ایک صوبیدار' ہم دو حوالدار تھے اور باقی سب جوان تھے۔ ان میں تین چار نائیک اور لانس نائیک تھے۔ کئی ہزار نفری کی ایک فورس گلائیڈروں سے اتاری گئی تھی۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ جب ہم اُتر کر گلائیڈروں سے نکلیں گے تو ہمارا ملاپ اپنے گروپ کمانڈر کے ساتھ ہو جائے گا۔ ہمارا گلائیڈر تو ٹھیک ٹھاک اُتر گیا تھا اور ہم اس میں سے نکل آئے تھے۔ صبح ہوئی تو ہم پر تین طرفوں سے فائر آنے لگا۔ تب ہمیں پتہ چلا کہ ہماری چھبیس جوانوں کی پلاٹون دشمن کے گھیرے میں آگئی ہے.....

"ہمیں لیفٹیننٹ اور صوبیدار نے بتایا کہ فورس کے ساتھ ہمارا رابطہ نہیں ہو رہا اور شاید ہمیں غلط جگہ اتار دیا گیا ہے۔ اس گورے لیفٹیننٹ نے کہا ہم دشمن کے گھیرے میں ہیں اور اب ہر آدمی اپنی جان بچانے میں آزاد ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ہتھیار نہیں ڈالنے اور جنگی قیدی نہیں بننا۔ اس کے بعد ہم سب بکھر گئے اور جاپانیوں کی

ئرنگ اور تیز ہوگئی۔ ہم سب بڑی اچھی آڑ میں تھے اس لئے چھوٹے ہتھیاروں کا فائر ہارا کوئی نقصان نہیں کر رہا تھا۔ جاپانیوں نے مارٹر گن کی شیلنگ شروع کردی۔ دو تین یل ہمارے گلائیڈر پر گرے اور اس کے پرخچے اڑ گئے۔ پھر ہر طرف سے چیخ وپکار سنائی ینے لگی۔ میں حوالدار تھا اس لئے جوانوں کی حوصلہ افزائی کے لئے للکارتا رہا لیکن وہاں وائے موت کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے گورے لیفٹیننٹ کو دیکھا۔ ایک شیل نے اس کے جسم کی یہ حالت کردی تھی کہ ایک ٹانگ الگ ہوگئی اور سامنے سے اس کا م اڑ گیا تھا۔ پھر میں نے اپنے صوبیدار کو مرتے دیکھا۔ تب میں نے وہاں سے نکلنے کا استہ دیکھنا شروع کردیا.....

"میں نے تمہیں بتایا ہے کہ فائر تین طرفوں سے آرہا تھا۔ شیلنگ صرف ایک رف سے آرہی تھی۔ پیچھے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں گھاس اور جھاڑیوں میں بڑی تیزی ے رینگتا ہوا پیچھے کو چلا گیا اور مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ پیچھے ڈھلوان ہے جو دور نیچے تک چلی ہے۔ میں وہاں سے لڑھکتا ہوا نیچے ہی نیچے آنے لگا۔ ایک درخت کے تنے نے مجھے ک لیا۔ میری کمر کو چوٹ تو لگی لیکن میں نے پروانہ کی۔ میں اٹھا اور کبھی ڈھلوان پر رکتا اور کبھی کسی درخت کو پکڑتا نیچے ہی نیچے اتر آگیا۔ میں سمجھ گیا کہ ہمارا گلائیڈر ا زمین پر اترا تھا وہ بلندی پر تھی.....

"میں نیچے اتر گیا۔ میرے آگے پہاڑیاں تھیں۔ اوپر ابھی تک گولے برس رہے ۔ میں ایک پہاڑی کے کٹاؤ میں سے گزر کر دو پہاڑیوں کے درمیان چلا گیا اور پھر چلتا گیا..... سارا دن گزر گیا لیکن میں رکا نہیں۔ ایک جگہ شفاف پانی کی چھوٹی سی ندی بہہ ا تھی۔ اس سے پانی پیا۔ میرے جھولے میں کھانے کے لئے کافی چیزیں تھیں۔ ٹن کے ڈبے بھی تھے جو امریکہ کی فوج کو دیئے جاتے تھے۔ یہ کھا کر پیٹ کی آگ ا اور میں رات کو بھی چلتا ہی رہا۔ میری کوشش یہ تھی کہ جاپانیوں کی فرنٹ لائن دور نکل جاؤں.....

"صبح ہوئی تو بھی میں میدان جنگ کے قریب ہی تھا۔ مجھے یہ اندازہ اس طرح ہوا کہ ں کی آوازیں زیادہ دور نہیں تھیں۔ مجھے یاد نہیں کہ کتنے دن اور کتنی راتیں گزر یں اور میں چلتا ہی رہا۔ کہیں چند منٹوں کے لئے رک جاتا تھا اور ذرا دم لے کر پھر چل تھا۔ اگر یہ علاقہ میدانی ہوتا تو پھر میں دشمن کو دور سے بھی نظر آجاتا لیکن خدا کا

کرم تھا کہ جنگل بہت ہی گھنا ہے جس نے مجھے چھپائے رکھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کدھر جا رہا ہوں اور میں کہاں ہوں۔ سورج سے اندازہ ہوتا تھا کہ میں ہندوستان ہی کی طرف جا رہا ہوں لیکن جنگل، پہاڑیاں اور ندی نالے ختم ہونے میں ہی نہیں آتے تھے.....

"آگے یہ دریا آگیا۔ اس کا نام میں نے پہلے سنا تھا..... ایراوتی..... آج کل تو اس میں سیلاب آیا ہوا ہے، اس وقت یہ سیلابی نہیں تھا۔ میں بڑا ماہر تیراک ہوں اور بریگیڈ کے مقابلوں میں اول کبھی دوم رہا ہوں۔ میں اللہ کا نام لے کر اس دریا میں اُتر گیا۔ پانی ٹھنڈا تو تھا لیکن بچ نکلنے کی ایک ہی صورت تھی کہ میں یہ دریا تیر کر پار کر جاؤں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس دریا پر پُل ہیں لیکن یہ بھی معلوم تھا کہ ان پُلوں پر فوجی پوسٹیں بنی ہوتی ہیں اور گزرنے والے کو بڑی سختی سے چیک کیا جاتا ہے۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ فلاں پُل پر ہماری فوج کی یا گورا رجمنٹ کی ڈیوٹی ہے تو میں سیدھا وہاں چلا جاتا اور وہ لوگ مجھے پیچھے بھیج دیتے۔ خطرہ یہ تھا کہ وہاں پوسٹ جاپانیوں کی ہوئی تو وہ مجھے دیکھ کر ہی گولی مار دیں گے.....

"میں نے دریا پار کر تو لیا لیکن جب میں اگلے کنارے جا لگا اور دریا سے نکلا تو میرا جسم اکڑ چکا تھا۔ بازوؤں کی یہ حالت تھی جیسے لکڑیوں کے بنے ہوئے ہوں۔ یہی حال ٹانگوں کا تھا۔ میں بڑی ہی مشکل سے قدم گھسیٹتا آگے گیا اور گر پڑا پھر مجھے ہوش نہ رہا۔ معلوم نہیں میں بے ہوش ہو گیا تھا یا سو گیا تھا"۔

میں دیکھ رہا تھا کہ فضل داد بولتے بولتے اونگھنے لگا تھا اور وہ بعض فقرے اس طرح بولتا تھا جیسے نیند میں بول رہا ہو۔ اس میں بولنے کی طاقت کم ہوتی جا رہی تھی۔

"آپ سو جائیں بھائی جان!" ——— میں نے کہا ——— "دماغ پر اتنا زور نہ دیں۔ میں آپ کی باقی باتیں کل سن لوں گا"۔

"ہاں بھائی!" ——— اس نے جمائی لے کر کہا ——— "مجھ میں تو بولنے کی بھی ہمت نہیں رہی۔ اس سے آگے مجھ پر جو گزری اور جہاں میں پہنچ گیا وہ اس قدر خوفناک ہے کہ سنانے کے لئے مجھے اچھی خاصی طاقت کی ضرورت ہو گی۔ وہ ننگے جنگلیوں کا ایک قبیلہ تھا جس نے مجھے اور ایک جوان عورت کو پکڑ لیا تھا..... یہ کل سناؤں گا"۔

وہ لیٹا اور لیٹتے ہی خراٹے لینے لگا۔

اکثر قارئین سوچتے ہوں گے کہ یہ گلائیڈر کیا چیز ہے جو جاپانیوں کے مورچوں کے ے اتارے گئے تھے۔ میں اپنی آپ بیتی سے ہٹ کر آپ کی معلومات میں کچھ اضافہ کرنا ہتا ہوں اور اس اضافے میں آپ کو کام کی کچھ باتیں بھی معلوم ہو جائیں گی۔ آپ کو لچسپ اور فکر انگیز بات معلوم ہو جائے گی کہ یہودیوں نے فلسطین کو اسرائیل بنانے ے لئے کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا اور انہوں نے کیا کیا پاپڑ بیلے تھے.....

الدار فضل داد نے جب مجھے گلائیڈروں کے اترنے کی بات سنائی تھی اس وقت مجھے لوم نہیں تھا کہ یہ گلائیڈر کیا ہوتے ہیں اور یہ برما کے جنگلوں میں جاپانیوں کے پیچھے ں طرح اتارے گئے تھے۔ میں نے پہلے آپ کو بتایا ہے کہ مجھے جنگِ عظیم دوم کے لق تاریخ اور لٹریچر میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ میں جب اپنے گھر آیا تھا تو اس جنگ ے متعلق جو بھی کتاب ملی وہ میں نے پڑھی۔ ان ...یڈروں کے آپریشن کے متعلق بھی ے تفصیلی معلومات ایک کتاب سے حاصل ہوئی تھیں۔ یہ میں آپ کو سناتا ہوں۔ انیاں تو آپ پڑھتے ہی رہتے ہیں۔ اگر کہانی میں کوئی کار آمد یا تاریخی اہمیت کی بات آ ئے تو وہ کہانی کو خراب یا بے مزہ نہیں کرتی بلکہ پڑھنے والے کی معلومات میں اضافہ تا ہے۔

دسمبر 1971ء کے وہ دن یاد کریں جب مشرقی پاکستان ہاتھ سے نکل رہا تھا۔ وہاں اپنی ج بہت ہی تھوڑی تھی اور جو تھی اسے انتہائی ضروری جنگی ساز و سامان بھی میسّر نہیں ا۔ بھارت نے ڈھاکہ کے قرب و جوار میں اپنی کچھ فوج ہیلی کاپٹروں کے ذریعے اتار دی ی جس نے ڈھاکہ کو محاصرے میں لے لیا تھا۔ پھر نوبت ہتھیار ڈالنے تک پہنچی.....

من پر عقب سے حملہ کرنے کا تصوّر بڑا ہی پرانا ہے۔ اسلام کی تاریخ میں خالدؓ بن ولید ر بعد میں صلاح الدین ایوبی نے عقب سے حملہ کرنے کی جنگی چالوں سے بڑی میابیاں حاصل کی تھیں۔

دوسری جنگِ عظیم میں برما فرنٹ پر گلائیڈروں سے جاپانیوں کے عقب میں فوج اری گئی تھی، پھر جب اتحادیوں یعنی امریکیوں اور انگریزوں نے یورپ پر فرانس کے احل سے جرمنوں کے خلاف حملہ کیا تھا تو پیراشوٹوں سے فوج جرمنوں کے عقب میں اری گئی تھی۔ میں برما فرنٹ کی بات کروں گا۔

...ی جنگِ عظیم کے د...ران ہیلی کاپٹر موجود نہیں تھے نہ ابھی ہیلی کاپٹر بنا تھا۔ ہیلی

کاپٹر پہلی دفعہ جنگِ عظیم کے آخری دنوں میں تیار ہُوا اور اس کی پرواز کا تجربہ کیا گیا تھا لیکن ہیلی کاپٹر استعمال نہیں کئے گئے تھے۔ یوں کہہ لیں کہ ہیلی کاپٹر جنگِ عظیم کے بعد بنے اور ان کی باقاعدہ پرواز شروع ہوئی تھی۔

یہ میں پوری تفصیل سے سنا چکا ہوں کہ دوسری جنگِ عظیم میں جاپانی کس طرح حملہ آور ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے برما پر آ قابض ہوئے تھے۔ وہاں سے انگریزوں کی اپنی اور انڈین آرمی کی پسپائی کو ایک تاریخی پسپائی کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد انگریزوں اور امریکیوں نے مل کر برما پر جوابی حملہ کیا لیکن جاپانی جم کر لڑے اور وہ پسپا ہوتے نظر نہیں آ رہے تھے۔

انگریزوں کی فوج میں ایک بریگیڈیئر تھا جس کا نام وِنگیٹ تھا۔ کسی نہ کسی کو خدا کوئی ایسا غیر معمولی وصف دے دیتا ہے جس سے وہ معجزہ نما کارنامے کر کے دکھا دیتا ہے۔ ایسے لوگ ماہرین سے کئی درجے اوپر ہوتے ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم میں انگریزوں نے اپنا ایک فوجی افسر کرنل لارنس عرب کی سرزمین میں بھیجا تھا۔ اس نے دو مسلمان ملکوں، عرب اور ترکی، کو آپس میں ٹکرا دیا تھا جس کے نتیجے میں ترکوں کو شکست ہوئی اور اس کا سارا فائدہ انگریزوں کو پہنچا۔

دوسری جنگِ عظیم میں بریگیڈیئر وِنگیٹ نے اپنی مہارت کے خصوصی جوہر دکھائے۔ وِنگیٹ پہلی جنگِ عظیم کے دوران فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ پیدائشی گوریلا ہے اور اس میں جنگل کی لڑائی کے جوہر پیدائشی طور پر پائے جاتے ہیں۔ وہ ابھی کیپٹن ہی تھا جب یہ سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا کہ وِنگیٹ گوریلا جنگ اور جنگل کی لڑائی کا ماہر ہے اور اس میں یہ وصف خصوصی طور پر پایا جاتا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں جب انگریزوں نے دیکھا کہ جاپانی برما سے پیچھے ہٹ نہیں رہے تو انہوں نے وِنگیٹ سے مشورہ طلب کیا۔ اس وقت وہ بریگیڈیئر تھا۔ اس نے کہا کہ ایک ہی طریقہ ہے کہ فوج جاپانیوں کے عقب میں اتاری جائے۔

جنگ برما کے گھنے جنگلوں اور پہاڑی علاقوں میں لڑی جا رہی تھی۔ بریگیڈیئر وِنگیٹ نے جائزہ لیا تو اس کے دماغ میں یہ سکیم آئی کہ گلائیڈروں کے ذریعے فوج جاپانیوں کے عقب میں اتاری جا سکتی ہے۔ اس نے بتایا کہ گلائیڈر کتنا بڑا بنایا جائے۔

گلائیڈر ایک ہوائی جہاز ہوتا ہے جس میں انجن نہیں ہوتا۔ اسے فضا میں کنٹرول

کرنے کے لئے پورا انتظام موجود ہوتا ہے جس سے اسے کسی بھی طرف موڑا جا سکتا ہے اور اسے اسی طرح لینڈ کیا جا سکتا ہے جس طرح ہوائی جہاز لینڈنگ کرتے ہیں۔ اسے اُڑانے کے لئے ایک بڑی لمبی تار سے ہوائی جہاز کے پیچھے باندھ دیا جاتا ہے۔ ہوائی جہاز جب رن وے پر دوڑتا ہُوا ٹیک آف کرتا ہے تو اس کے پیچھے گلائیڈر ہوا میں چلا جاتا ہے۔ ہوائی جہاز اسے وہاں تک لے جاتا ہے جہاں اسے اتارنا ہوتا ہے۔ گلائیڈر میں ایک ہینڈل سا لگا ہوتا ہے جسے کھینچو تو وہ تار اس سے الگ ہو جاتی ہے جس کا دوسرا سرا ہوائی جہاز کے پیچھے بندھا ہوتا ہے۔ گلائیڈر کے کنٹرول پر ایک آدمی بیٹھا ہوتا ہے جو اسے بڑے آرام سے زمین پر اتار لیتا ہے۔

بریگیڈیئر وِنگیٹ کے پلان کے مطابق بے شمار گلائیڈر تیار کئے گئے۔ یہ ایلومونیم کے بنے ہوئے ہوائی جہازوں جیسے ڈھانچے تھے اور ان ڈھانچوں پر بڑا موٹا کینوس کی طرح کا کپڑا چڑھا ہوا تھا۔ ہر ایک گلائیڈر اتنا بڑا تھا کہ اس میں پچیس اور اس سے بھی کچھ زیادہ فوجی بیٹھ سکتے تھے۔ انہیں فضا میں لے جانے کے لئے ڈکوٹہ طیارے استعمال کئے گئے تھے۔

ڈکوٹہ دوسری جنگ عظیم کا بڑا مشہور طیارہ ہے جو امریکہ نے بنایا تھا۔ اس کا ایک وِنگ اور دو انجن ہوتے ہیں۔ یہ فوجوں کی بار برداری اور فوجیوں کو اِدھر اُدھر لے جانے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ یہ بے شمار سامان اور فوجی اٹھا لے جاتا تھا۔

میں یہ نہیں بتا سکتا کہ کتنے گلائیڈر تیار کئے گئے تھے۔ اس میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ جاپانیوں کے عقب میں کتنے ہزار فوج اتاری گئی تھی۔ بعض نے نفری پچاس ہزار اور بعض نے تیس ہزار لکھی ہے۔ یہ ساری فوج بنگال کے کسی ہوائی اڈے پر اکٹھی کی گئی جہاں ڈکوٹہ طیارے اور سینکڑوں گلائیڈر تیار کھڑے تھے۔ اس فوج کو یوں ہی گلائیڈروں میں بھر کر برما کے جنگلوں میں اتار نہیں دیا گیا تھا بلکہ اس ساری فوج کو بنگال اور آسام کے گھنے جنگلوں میں لے جا کر جنگلوں کی لڑائی کی اور گوریلا لڑائی کی بڑی سخت ٹریننگ دی گئی تھی۔ اس فوج میں جو افسر تھے، انہیں بھی گلائیڈر کو فضا میں کنٹرول کرنے کی اور اتارنے کی ٹریننگ دی گئی تھی۔

ان گلائیڈروں کو برما کے جنگلوں سے واپس لانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ کوئی اتنی قیمتی چیز نہیں تھی۔ بیشتر گلائیڈر زمین پر اتر کر بے کار ہو جاتے تھے۔ یہ

میدانوں پر یا باقاعدہ رن وے پر چڑھائے اور اتارے جائیں تو محفوظ رہتے ہیں۔ گلائیڈر جنگل میں اتارا جائے تو اس کے اتنے بڑے بڑے دِنگ درختوں کے ساتھ ٹکرا کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

آخر ایک رات بریگیڈیئر ونگیٹ نے اس خصوصی فورس کے تمام افسروں کو اکٹھا کیا اور انہیں آخری بریفنگ دی۔ نقشے پر انہیں بتایا کہ وہ گلائیڈر کہاں اتاریں گے۔ یہ تو انہیں ٹریننگ دی جا چکی تھی کہ ان جنگلوں میں اتر کر وہ کس طرح حملے کریں گے اور ان کی دیگر جنگی کارروائیاں کیا ہوں گی۔ اس پوری فوج کو گلائیڈروں پر سوار کر دیا گیا۔ ہر گلائیڈر میں کم از کم پچیس فوجی تھے۔ ان میں انگریزوں کی انڈین آرمی کے منتخب جوان اور افسر بھی شامل تھے۔ ان میں سے بعض کو خصوصی طور پر گوریلا ٹریننگ دی گئی تھی۔ انہوں نے جاپانیوں پر گوریلا طرز کے حملے کرنے اور شبخون مارنے تھے۔ باقی فوج نے ایک فوج کی طرح پیچھے سے حملہ کرنا تھا۔

یہ ساری فورس برما کے جنگلوں میں جاپانیوں کی اگلی پوزیشنوں کے پیچھے اتار دی گئی۔ اسے رات کے وقت اتارا گیا۔ ڈکوٹہ طیارے کچھ گلائیڈروں کو برما لے جا کر چھوڑ دیتے اور واپس آکر مزید گلائیڈروں کو لے جاتے اور اس طرح یہ سلسلہ رات بھر چلتا رہا۔ انگریز اور امریکن پُرامید تھے کہ ان کا یہ آپریشن کامیاب رہے گا لیکن یہ آپریشن بڑی ہی بُری طرح ناکام ہُوا۔ وہ اس طرح کہ بریگیڈیئر ونگیٹ غالباً" برما کے جنگل پوری طرح دیکھ نہیں سکا تھا۔ گلائیڈر اترے اور درختوں سے ٹکرا کر یا چٹانوں کی چوٹیوں سے ٹکرا کر ایسے تباہ ہوئے کہ ان میں بیٹھے ہوئے فوجی بھی زخمی اور ہلاک ہو گئے۔ بہت سے گلائیڈر غلط جگہوں پر جا اترے۔ وہ محفوظ تو رہے لیکن جاپانیوں نے انہیں گھیر کر فوجیوں سے ہتھیار ڈلوا لئے یا جس طرح حوالدار فضل داد کی پلاٹون کے ساتھ ہُوا تھا' بعض پلاٹونوں یا گروپوں کو گھیر کر ایسی فائرنگ اور شیلنگ کی کہ انہیں ختم کر ڈالا۔

یہ برما فرنٹ کی سب سے بڑی ٹریجڈی تھی لیکن انگریزوں نے حوصلہ قائم رکھا اور آخر جاپانی پسپا ہونے لگے لیکن انگریزوں اور امریکیوں کو اس کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔

بریگیڈیئر ونگیٹ کو اپنے آپریشن کی اس ناکامی کا بہت ہی دکھ تھا۔ اُن ہی دنوں اسے ترقی دے کر میجر جنرل بنا دیا گیا تھا۔ وہ عہدے کا نہیں بلکہ فتح کا خواہش مند تھا۔ اس

نے ایک اور گوریلا فوج تیار کی اور خود اس کے ساتھ برما کے جنگلوں میں گیا۔ اس نے جاپانیوں کے پاؤں اکھاڑ دیئے لیکن وہیں مارا گیا۔

میں نے پہلے یہودیوں کا ذکر کیا ہے۔ یہودی مجھے ونگیٹ کے سلسلے میں یاد آ گئے ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم میں ونگیٹ کیپٹن ہو گیا تھا اور ان ہی دنوں وہ گوریلا جنگ کا ماہر تسلیم کیا گیا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے فوراً" بعد انگریزوں نے یہودیوں کی جنگی خدمات کا صلہ دینے کے لئے ان سے وعدہ کیا کہ وہ فلسطین کو ان کا وطن بنا دیں گے۔ 1902ء میں برطانیہ کے سیکرٹری نو آبادیات' چیمبرلین نے افریقہ کے ملک یوگنڈا کا تمام علاقہ یہودیوں کو بطور تحفہ پیش کیا اور کہا تھا کہ اسے اسرائیل بنا لیں لیکن یہودیوں نے بلکہ صیہونیوں نے یوگنڈا کو پسند نہ کیا اور کہا کہ انہیں فلسطین چاہئے۔

صیہونیوں نے فلسطین میں اراضی خریدنی شروع کر دی اور وہاں زرعی فارم بنا لئے۔ یہ ایک بہانہ تھا فلسطین میں آباد ہونے کا۔ یہ داستان بڑی لمبی ہے' میں اختصار سے سناؤں گا۔ یہودی اپنی صیہونی تنظیم کے تحت فلسطین میں داخل ہوتے رہے اور وہاں آباد ہوتے چلے گئے۔ انگریزوں نے کیپٹن ونگیٹ کو فلسطین اس مقصد کے لئے بھیجا کہ وہ صیہونیوں کو گوریلا جنگ کی ٹریننگ دے اور انہیں اس قابل بنا دے کہ وہ اپنے زور بازو سے وہاں اپنی حکومت قائم کر لیں اور انگریز پس منظر ہی میں رہیں۔ ونگیٹ نے ان یہودیوں کو ایسی ٹریننگ دی کہ انہیں دنیا کے مانے ہوئے گوریلے بنا ڈالا۔ اسرائیل کا مشہور جرنیل موشے دایان جو 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اپنی فوج کا کمانڈر انچیف تھا اور بعد میں وزیر دفاع بن گیا تھا' بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ میں ونگیٹ کا شاگرد ہوں اور اسے اپنا پیرو مرشد مانتا ہوں۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ہر اسرائیلی سپاہی ونگیٹ کا شاگرد ہے' اس نے ہمیں فتح کا راستہ دکھایا تھا۔

یہ تھا ونگیٹ جس نے انگریزوں کی اور اسرائیل کی تاریخ میں بڑا اونچا مقام پیدا کیا۔ اس نے برما فرنٹ پر تیس سے پچاس ہزار تک فوج مروا ڈالی اور نہ جانے کتنے گلائیڈر تباہ کرا دیئے تھے لیکن انگریز جاپانیوں کی پسپائی کا سہرا ونگیٹ کے سر باندھتے ہیں کیونکہ اس نے اپنی غلطی کا کفارہ اپنی جان دے کر ادا کیا تھا۔

حوالدار فضل داد ونگیٹ کے آپریشن کا ہی مارا ہُوا تھا اور ابھی تک برما کے جنگلوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ نہ جانے اس جیسے کتنے ہندوستانی اور برطانوی فوجی ان جنگلوں میں

بھٹک بھٹک کر بھوکے پیاسے مر گئے تھے۔

یہاں میں قارئین کی دلچسپی کے لئے ایک اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ مشرقی پاکستان میں جسے مکتی باہنی کہا گیا تھا وہ دراصل انڈین آرمی کی کمانڈو اور گوریلا فورس تھی۔ ایوب خان مرحوم نے اپنے دور حکومت میں اس کی تعداد تیس ہزار بتائی تھی۔ 1971ء میں یہ تعداد 80 ہزار ہو گئی تھی۔ وہ جنگلوں اور ندی نالوں کا علاقہ ہے۔ انڈین آرمی کی اس فورس کو گوریلا ٹریننگ اور جنگل کی لڑائی Jungle War Fare کی ٹریننگ اسرائیلیوں نے دی تھی اور اس کا ایک ماہر اسرائیلی جرنیل' جنرل جیکب انڈین آرمی کی ایسٹرن کمانڈر میں موجود تھا۔

فضل داد کا مسئلہ صرف یہ نہیں تھا کہ وہ ان جنگلوں میں سے زندہ نکل کر پیچھے پہنچ جائے بلکہ وہ ایک اور مصیبت میں جا گرفتار ہوا تھا۔ اس وقت برما اور ہندوستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف چھوٹا سا علاقہ تھا جس میں قدیم جنگلی قبائل آباد تھے۔ ان کی زندگی اور رسم و رواج افریقہ کے حبشیوں سے ملتے جلتے تھے۔ وہ انسانی جانوں کی قربانی اپنے دیوتاؤں کے حضور پیش کرتے تھے اور وہ انسانی کھوپڑی کو بہترین تحفہ سمجھتے تھے۔ فضل داد ایک آسامی عورت کے ساتھ ان کے ہاتھ چڑھ گیا تھا۔ وہاں سے وہ کس طرح نکلا اور اس نے وہاں کیا دیکھا' یہ ایک بڑی ہی خوفناک کہانی ہے جو بظاہر ناقابل یقین لگتی ہے لیکن میں نے بعد میں پڑھا تھا کہ اس علاقے میں اس سے زیادہ خوفناک کہانیاں جنم لیتی رہی ہیں۔ میں آپ کو فضل داد کی پوری کہانی سناؤں گا۔

باب میں آپ کو صرف حوالدار فضل داد کی کہانی ملے گی۔

س انسان چاند تک پہنچ گیا ہے۔ انسان خلا کی سراغرسانی کر رہا ہے۔ پھر انسان یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ زمین کے ہر گوشے اور ہر کونے کھدرے تک پہنچ گیا ہے لیکن کہیں نہ کہیں سے خبر ملتی ہے کہ دنیا کے فلاں ملک کے فلاں علاقے میں عجیب و غریب جانور یا عجیب الخلقت انسان دیکھنے میں آئے ہیں یا یہ کہ انسان تو ہم جیسے ہی ہیں لیکن اُن کی عادات اور اُن کے اطوار درندوں جیسے ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ دنیا میں پتھر کے زمانے کے لوگ آج بھی موجود ہیں جنہیں معلوم ہی نہیں کہ انسان سائنسی ترقی کے کس عروج پر پہنچ چکا ہے۔

ایک برفانی انسان دیکھا گیا ہے جس کا تمام کا تمام جسم سر سے پاؤں تک ریچھوں کی طرح سیاہ کالے بالوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ اُس کا قد چھ فٹ سے کہیں زیادہ ہے اور اُس کے پاؤں کے جو نشان برف پر دیکھے گئے ہیں وہ کم و بیش ایک فٹ لمبے ہیں۔ یہ انسان دو تین ملکوں کے پہاڑی علاقوں کی بلندیوں پر دُور سے دیکھا گیا ہے اور اس کے فوٹو بھی لئے گئے ہیں۔ حال ہی میں بلوچستان میں دُور دراز پہاڑی علاقے میں ایک قبیلہ دریافت ہوا ہے جس کے تمام افراد بونے ہیں۔ سب سے اونچے قد کا آدمی صرف چار فٹ کا ہے۔ میں ایسی چند اور مثالیں دے سکتا ہوں لیکن بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ اس تمہید سے میرا مطلب یہ ہے کہ یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ انسان نے کرۂ ارض کے ہر گوشے کی تحقیق کر لی ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی یہ دنیا بہت ہی وسیع و عریض ہے اور اللہ کی اس زمین پر ابھی بہت سے راز ہیں جو انسان پر بے نقاب نہیں ہوئے۔

حوالدار فضل داد جس وحشی قبیلے کے ہاتھ چڑھ گیا تھا وہ ایسے ہی لوگ تھے جن تک ابھی تہذیب اور سائنس نہیں پہنچی تھی۔ یہ قبیلے کہیں دور دراز سمندر میں کسی جزیرے میں نہیں رہتے تھے بلکہ تہذیب یافتہ ہندوستان اور برما کے درمیان ایک پہاڑی علاقے میں رہتے تھے۔ تہذیب اور جدید تمدن میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود وہ تہذیبِ جدید سے ناواقف تھے یا انہوں نے دیدہ و دانستہ اپنے آپ کو تہذیب سے دور رکھا ہوا تھا۔ یہ ناگے یعنی بالکل برہنہ رہنے والے وحشی لوگ تھے جو پہاڑیوں کی بلندیوں پر رہتے تھے۔

میں یہ داستان بہت پہلے لکھ چکا تھا۔ یکم مئی 1995ء کا امریکی رسالہ "ٹائم" دیکھا۔ اس میں ایک خبر پڑھی جس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ میں اس خبر کا ترجمہ اس باب میں اضافے کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ یہ اس میں ضرور شامل کر لیں۔ یہ خبر پڑھ کر اپنی رائے خود ہی قائم کریں کہ انسان میں انسان خوری تہذیب یافتہ ہونے کے باوجود موجود ہے۔ خبر یہ ہے:

یہ بات افریقہ کے جنگلی حبشیوں کی نہیں بلکہ جنوبی چین کے مہذب لوگوں کی ہے۔ جنوب میں چین کی سرحد جہاں ہانگ کانگ سے ملتی ہے، وہاں چین کا ایک شہر شنزہن آباد ہے۔ امریکہ کے ہفت روزہ رسالے "ٹائم" نے یکم مئی کے شمارے میں خبر دی ہے کہ ہانگ کانگ کے سرحدی علاقے کے لوگوں نے سنا کہ چین کے شہر شنزہن میں ایک خاص یخنی یعنی سوپ پیا جاتا ہے۔ یہ یخنی ان بچوں کے گوشت پوست سے بنائی جاتی ہے جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے ہوتے اور رحمِ مادر میں آٹھ یا نو ہفتے پورے کر چکے ہوئے ہیں۔ اتنے سے بچے کو جنین اور انگریزی میں FETUS کہتے ہیں۔ اسے FOETUS بھی لکھا جاتا ہے۔ تلفظ اور معنی ایک ہی ہیں۔

"ٹائم" لکھتا ہے کہ جنین کی یخنی اس لئے پی جاتی ہے کہ اس سے جسم کی جلد ملائم اور پُرکشش ہو جاتی ہے اور یہ یخنی انسان کو ہمیشہ صحت مند رکھتی ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ چین کے اس شہر کے سرکاری ہسپتال اور ہر پرائیویٹ کلینک سے جنین مل جاتے ہیں۔ قیمت بہت ہی معمولی ہے۔ صرف تین ڈالر فی جنین یعنی تیس بتیس روپے۔

یہ خبر گذشتہ سال ہانگ کانگ زبانی پہنچی تو ہانگ کانگ کے لوگوں نے اسے سچ نہ مانا۔ سچ ماننے والی بات ہی نہیں تھی۔ کوئی مہذب اور ہوش و حواس والا انسان اُس بچے

کی یخنی نہیں پی سکتا جس کی عمر رحمِ مادر میں آٹھ یا نو ہفتے ہو چکی ہوتی ہے بلکہ نوزائیدہ بچے کے ساتھ بھی کوئی انسان ایسا سلوک نہیں کر سکتا لیکن ہانگ کانگ میں یہ بات پھیلتی چلی گئی۔ آخر ہانگ کانگ کے تین چار صحافی سرحد پار کر کے چین کے اس شہر میں گئے اور ایک پرائیویٹ کلینک کے مالک ڈاکٹر سے ملے۔ انہوں نے یہ نہ بتایا کہ وہ صحافی ہیں یا وہ ہانگ کانگ سے آئے ہیں۔ انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ وہ جلدی امراض کے مریض ہیں اور ویسے بھی ان کی صحت گری گری رہتی ہے اور انہوں نے سنا ہے کہ یہاں ایک خاص یخنی پی جاتی ہے جو جلد اور صحت کو ٹھیک رکھتی ہے۔

یہ صحافی حیران رہ گئے کہ اس چینی ڈاکٹر نے بلا جھجک اور بے خوف ہو کر انہیں بتایا کہ یہ یخنی اس کے ہاں مل سکتی ہے لیکن انہیں انتظار کرنا پڑے گا۔ اس نے انہیں بتایا کہ جنین کی یخنی سرکاری ہسپتال اور ہر پرائیویٹ کلینک کے ڈاکٹر خود بھی پیتے ہیں۔ اس نے یخنی بنانے کا طریقہ یہ بتایا کہ جنین کو ماں کے پیٹ سے نکال کر اور صاف کر کے پانی میں ڈالا جاتا ہے اور اسے جوش دیا جاتا ہے۔ اس میں چونکہ ذرا ناگوار سی بو ہوتی ہے اس لئے اس میں ادرک اور لہسن بھی ڈالا جاتا ہے۔

یہ صحافی وہاں کے دو اور ڈاکٹروں سے ملے تو انہوں نے بھی ایسی ہی باتیں کیں اور پردہ ڈالنے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کی..... قدرتی طور پر سوال اٹھا کہ اتنے جنین مل کہاں سے جاتے ہیں۔ اس سوال کا جواب یہ ملا کہ چین میں خاندانی منصوبہ بندی کا قانون بہت ہی سخت ہے۔ شادی شدہ جوڑا صرف ایک بچہ پیدا کر سکتا ہے۔ اگر کسی کے ہاں دوسرا بچہ پیدا ہو جائے تو اس کے باپ کو سزا ملتی ہے۔ اس اتنے سخت قانون کا ایک نتیجہ یہ سامنے آ رہا ہے کہ میاں بیوی ایک بچہ پیدا کرتے ہیں اور وہ لڑکی نکل آتی ہے۔ ہر ماں باپ لڑکا پسند کرتے ہیں لیکن وہ دوسرا بچہ پیدا نہیں کر سکتے۔ وہ نوزائیدہ بچی کو مار کر کہیں غائب کر دیتے ہیں یا زندہ ہی کہیں پھینک آتے ہیں اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ ان کا ابھی کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ وہ پھر کوشش کرتے ہیں کہ ان کی لڑکے کی خواہش پوری ہو جائے۔ چین میں اکثر نوزائیدہ بچیاں باہر پڑی ملتی ہیں۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک عورت نے ایک بچہ پیدا کر لیا اور وہ پھر امید سے ہو گئی۔ ایسی مائیں پرائیویٹ ڈاکٹروں کے پاس جا کر اسقاطِ حمل کرا لیتی ہیں۔ رحمِ مادر میں بچے کی عمر عموماً" آٹھ نو ہفتے ہو چکی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر یہ جنین رحمِ مادر سے نکال کر اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔ بعض عورتیں سرکاری

ہسپتال میں جا کر اسقاط (ابارشن) کرا لیتی ہیں۔ ۰ اس کا مطلب یہ ہے کہ چین کی حکومت نے لوگوں کو اسقاط کی اجازت دے رکھی ہے یعنی پیٹ میں دوسرا بچہ پرورش پانے لگے تو اسے ضائع کر دو۔

یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ وہ کون ڈاکٹر تھا جس نے سب سے پہلے جنین کی یخنی بنائی اور یہ تجربہ کیا کہ اس یخنی کے یہ فوائد ہیں۔ بہرحال یہ بالکل صحیح ہے کہ چین کے اس سرحدی شہر میں یہ یخنی پی جاتی ہے جو مہذب دنیا کا کوئی انسان تصوّر میں نہیں لا سکتا۔ اگر یہ خبر کسی ملک کے محدود سے علاقے میں پڑھے جانے والے معمولی سے اخبار یا رسالے میں چھپی ہوتی تو اس پر کوئی یقین نہ کرتا اور یہ کہا جاتا کہ اس پرچے نے کاروباری مفاد کی خاطر یہ ناقابلِ یقین اور سنسنی خیز خبر گھڑ کر چھاپ دی ہے۔ اس خبر کو ہم اس لئے سچ سمجھتے ہیں کہ یہ نیویارک سے نکلنے والے ہفت روزہ رسالے "ٹائم" میں شائع ہوئی ہے۔ یہ ہفت روزہ رسالہ ساری دنیا میں پڑھا جاتا ہے اور اس کی خبریں اور تبصرے مضامین میں حوالوں کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس لئے میں وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ یہ خبر غلط نہیں ہو سکتی۔

○

اب میں فضل داد کا سفر سناتا ہوں جو اس نے اس جنگل میں طے کیا تھا۔ یہ تو سنا چکا ہوں کہ وہ مجھ تک کیسے پہنچا تھا..... اس کا گلائیڈر تباہ ہو گیا اور پھر اس کا سارا گروپ جاپانیوں کی گولہ باری کی نذر ہو گیا تو وہ وہاں سے بھاگا۔ وہ ڈھلانوں سے گرا، کہیں سنبھل سنبھل کر اترا، اس نے ندیاں اور پھر دریا تیر کر عبور کیا۔ اس کے پاس سٹین گن تھی جو ڈھلان سے گرتے وقت گر پڑی تھی اور معلوم نہیں کہاں تک جا پہنچی تھی۔ فضل داد نے سٹین گن کا ایمونیشن بھی پھینک دیا۔ اس کے پاس چار گرینیڈ تھے۔ اس نے وہ بھی پھینک دیئے۔ اسے یہ خطرہ تو نظر آ رہا تھا کہ کہیں بھی جاپانی اسے دیکھ لیں گے اور پکڑ لیں گے لیکن وہ اکیلا لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے زندہ رہنے کی یہ ترکیب کی کہ اپنے پاس نہ کوئی ہتھیار رہنے دیا نہ ایمونیشن۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جاپانیوں سے آمنا سامنا ہو گیا تو وہ بڑے آرام سے ان کا جنگی قیدی بن جائے گا۔

وہ اور ہی گھنے جنگل میں چلا گیا تھا۔ وہاں سبزے اور درختوں سے لدی ہوئی ٹیکریاں بھی تھیں، ایسی چٹانیں بھی تھیں جن پر گھاس کی ایک پتی بھی نظر نہیں آتی تھی۔ اگر

اس سبزہ زار کو بیان کرنے لگوں تو پڑھنے والے کہیں گے کہ یہ تو کوئی صحت افزا مقام ہیں اور وہ لوگ خوش نصیب تھے جو ایسے روح افزا اور خوبصورت علاقے میں رہتے تھے۔ لیکن مجھ جیسے اور فضل داد جیسے آدمی ہی بتا سکتے ہیں کہ اس خطّے کے حُسن میں ایک دہشت تھی جو دل و دماغ پر مسلط ہو گئی تھی۔ ایک خوف تو یہ تھا کہ وہ علاقہ جنگ کی زد میں تھا، دوسرا خطرہ یہ کہ جاپانی کہیں سے بھی آ نکلتے اور فضل داد کو پکڑ لیتے۔ فضل داد پکڑے جانے کے لئے تو تیار تھا لیکن ہماری فوج میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ جاپانی یوں بھی کرتے ہیں کہ ہندوستانی یا انگریز فوجی کو پکڑ کر اس پر سنگین بازی (بیونٹ فائٹنگ) کی پریکٹس کرتے ہیں یا ہنسی مذاق میں اسے گولی مار دیتے ہیں۔ ان جنگلوں میں ایک خطرہ بھٹک جانے اور کسی درندے کا شکار ہو جانے کا بھی تھا۔ فضل داد دراصل بھٹکا ہُوا ہی تھا۔ اس کی اب یہ کوشش تھی کہ پیچھے آ جائے اور اپنی فوج سے آ ملے۔ وہ پہاڑیوں میں گھر گیا تھا جہاں اُسے سمت کا کوئی خیال نہیں رہا تھا۔ وہ زیادہ تیز نہیں چلتا تھا تا کہ تھکن نہ ہو۔ کچھ فاصلہ چلتا اور پھر بیٹھ جاتا تھا۔ اس کے سفر کا وہ دن پہاڑیوں کے اندر ہی گزر گیا اور تاریکی چھانے لگی۔ وہ سونے کے لئے کوئی موزوں جگہ تلاش کرنے لگا۔ ایک جگہ اُسے نظر آ ہی گئی جہاں سے پہاڑی اوپر جا کر برآمدے کی چھت کی طرح باہر کو آئی ہوئی تھی۔ وہ وہیں لیٹا اور کچھ دیر بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔

رات شاید آدھی گزر گئی ہو گی جب بے ہنگم شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ بالکل اس کے قریب کُتے لڑ رہے تھے۔ فضل داد انہیں کُتے ہی سمجھا لیکن اسے فوراً پتہ چل گیا کہ یہ کتے نہیں اور نہ ہی یہ آپس میں لڑ رہے ہیں بلکہ یہ بھیڑیے ہیں اور انہوں نے اپنا شکار پکڑ لیا ہے اور مل جل کر اسے جھنجھوڑ رہے ہیں۔ فضل داد نے عقلمندی یہ کی دبک کر بیٹھا رہا اور اٹھ کر دوڑ نہیں پڑا۔ وہ یہ نہ دیکھ سکا کہ ان کا شکار خرگوش ہے یا کوئی اور جانور، بہرحال انہوں نے شکار مار لیا تھا جسے گھسیٹتے ہوئے وہ ایک طرف چلے گئے۔ تب فضل داد کو پچھتاوا ہُوا کہ وہ سٹین گن اور ایمونیشن پھینک آیا ہے۔

یہ بھیڑیے تو تقریباً اس کے اوپر چڑھ آئے تھے۔ اس کا دل خوف کے مارے بے طرح دھڑک رہا تھا۔ اس نے حوصلہ مضبوط کیا اور پھر لیٹ گیا۔ اب جو لیٹا تو اس کی آنکھ اس وقت کُھلی جب سورج سر پر آ گیا تھا۔ اس روز اُس کے پاس کھانے کے لئے کچھ چیزیں موجود تھیں۔ یہ امریکہ کے پیک کئے ہوئے راشن کے ڈبے تھے۔ فضل داد نے

تھوڑا سا کھانا کھایا اور اُٹھ کر چل پڑا۔

میں فضل داد کے اس سفر کی پوری رُوداد نہیں سناؤں گا۔ اگر میں نے قدم قدم کی، ایک ایک دن کی باتیں سنانی شروع کر دیں تو یہ میری داستان جیسی لمبی ہو جائیں گی۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ اس کا یہ سفر میرے سفر جیسا ہی تھا۔ وہ اسی روز یا شاید اگلے روز ان پہاڑیوں میں سے نکل گیا۔

آگے ایک وسیع و عریض علاقہ ایسا تھا جو ہموار تو نہیں تھا لیکن اس میں ٹیکریاں اور چٹانیں نہیں تھیں، بہرحال یہ پہاڑیوں اور چٹانوں میں گھرا ہوا میدانی خِطّہ تھا۔ اس نے درختوں کو دیکھنا شروع کیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ان درختوں میں کوئی پھل دینے والا درخت بھی ہے یا نہیں۔ اسے انجیر اور بیریوں جیسے پھل دینے والے کچھ درخت نظر آ گئے۔ اسے احساس تھا کہ وہ چند دنوں میں ہی اس جنگل میں سے نکل نہیں سکے گا اور اس کے پاس جو راشن ہے وہ ایک ہفتے سے زیادہ نہیں چلے گا۔

اس کے پاس پانی کی بوتل تھی اور جھولا (کینوس بیگ) بھی تھا۔ اس نے ان درختوں سے بہت سا پھل توڑ لیا اور جھولے میں ڈال لیا۔ اس علاقے میں پانی کی کوئی کمی نہیں تھی۔ نمناک علاقہ تھا۔ اوس اتنی زیادہ پڑتی تھی کہ درختوں کے پتے چوس لیتے تو انہی سے پیاس بجھ جاتی تھی۔ ویسے ندیاں بھی تھیں اور کہیں کہیں چشمہ بھی نظر آتا تھا۔



فضل داد کو وقت کا احساس اس لئے رہا کہ اُس کے پاس گھڑی تھی۔ پہلے کچھ دن تو اس نے حساب رکھا کہ کتنے دن گزر گئے ہیں لیکن کچھ دنوں بعد اُسے یہ یاد نہ رہا۔ پھر دن راتیں ایک دوسرے کے پیچھے گزرتے چلے گئے۔ فضل داد کبھی گھنے جنگل میں جا رہا ہوتا، کبھی پہاڑیوں کے درمیان اور کبھی میدان میں چلا جا رہا ہوتا اور اس طرح اس کا سفر جاری رہا۔ شام کے بعد کہیں موزوں جگہ دیکھ کر لیٹ جاتا اور صبح ہوتے چل پڑتا۔

راتوں کو وہ بھیڑیوں اور گیدڑوں کی آوازیں سنا کرتا تھا۔ کئی بار اس نے شیر کی گرج بھی سنی تھی اور کئی بار اس نے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنیں جن سے صاف پتہ چلتا تھا کہ شیر یا کوئی درندہ اپنے شکار کا تعاقب کر رہا ہے۔ یہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ ان درندوں سے بچا رہا تھا۔ اس وقت تو مجھے کچھ سمجھ نہیں تھی لیکن بہت بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اس گھنے جنگل میں شیروں اور بھیڑیوں کے لئے شکار بہت تھا۔ میں برما کے جس

جنگلاتی علاقے میں تھا، وہاں میں نے خنزیر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ فضل داد نے بتایا کہ جنگل کے جس حصے میں وہ جا پھنسا تھا، وہاں جنگلی خنزیر خاصی تعداد میں نظر آتے تھے۔ بھُورے رنگ کے خرگوش تو وہاں عام تھے۔ فضل داد نے دور سے چار پانچ ہرن بھی دیکھے تھے۔ اگر درندوں کے لئے یہ شکار نہ ہوتا تو فضل داد کبھی کا بھیڑیوں یا کسی شیر کے پیٹ میں پہنچ چکا ہوتا۔

فضل داد نے سنایا کہ ایک روز وہ چلتے چلتے ایک ٹیکری پر چڑھ گیا۔ ٹیکری بہت اونچی نہیں تھی۔ وہ اگرد گرد کے علاقے کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کو توقع یہ تھی کہ کہیں آبادی نظر آ جائے گی لیکن وہاں آبادی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

فضل داد نے سنایا کہ وہ ٹیکری پر چلا گیا تو آگے اسے پانی کھڑا نظر آیا۔ یہ ایک قدرتی تالاب بنا ہُوا تھا جو کوئی زیادہ لمبا چوڑا نہیں تھا۔ اس تالاب کے ایک طرف خاصی کھلی جگہ تھی جو ہموار تھی اور کچھ پرے ہٹ کر دیوار کی طرح ایک چٹان کھڑی تھی جو اس ٹیکری کے ساتھ آ کر مل جاتی تھی جس پر فضل داد کھڑا تھا۔

فضل داد کو چھ سات خنزیر نظر آئے جو اس تالاب سے پانی پی رہے تھے۔ ایک طرف گھنی جھاڑیاں تھیں جن کے پتے چوڑے تھے۔ فضل داد نے دیکھا کہ ایک اژدھا نے ان جھاڑیوں میں سے منہ نکالا۔ پھر آہستہ آہستہ اژدھا جھاڑیوں سے باہر آنے لگا۔ وہ بہت ہی موٹا اور بڑا ہی لمبا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد پورے کا پورا باہر نکلا۔ فضل داد کا تو جیسے سانس رک گیا ہو۔ اس نے کبھی اژدھا نہیں دیکھا تھا۔ گھاس ذرا اونچی تھی اور اژدھا اس میں رینگتا ہُوا خنزیروں کی طرف جا رہا تھا۔ جب وہ ان کے قریب پہنچا تو خنزیروں نے شاید اس کی مُشک سونگھ لی ہوگی، وہ سب اکٹھے بِدکے اور پیچھے ہٹے۔

اژدھا اس خنزیر پر جھپٹا جو اس کے قریب تھا لیکن اس کا منہ خنزیر تک نہ پہنچ سکا۔ خنزیر بھاگ اٹھے لیکن یہ خنزیر جس پر اژدھا نے حملہ کیا تھا اپنے ساتھیوں کے پیچھے جانے کی بجائے گھبرا کر چٹان کی طرف دوڑ پڑا۔ اژدھا بڑی تیزی سے رینگتا اس کے تعاقب میں گیا۔ خنزیر کا راستہ چٹان نے روک لیا تھا۔ وہ پیچھے کو دوڑا تو اژدھا نے اسے روک لیا۔ خنزیر کے بھاگنے کے لئے جگہ کافی تھی لیکن ایسا لگتا تھا جیسے اس میں بھاگنے کی طاقت ہی نہ رہی ہو۔

خنزیر نے ٹیکری پر چڑھنے کی کوشش کی تو اژدھا اس کے پیچھے گیا۔ خنزیر بہت تیز

دوڑنے والا جانور ہے لیکن اس سے ٹیکری پر نہ چڑھا گیا حالانکہ ڈھلان سیدھی اور کھڑی نہیں تھی بلکہ چڑھنے کے لئے نہایت آسان تھی۔ اس سے تو قدم بھی نہیں اٹھائے جا رہے تھے۔

میں نے یہ تماشا خود دیکھا ہے کہ بلی جب چوہے کے پیچھے دوڑتی ہے تو چوہے سے دوڑا نہیں جاتا' وہ اچھلتا ہے لیکن پوری طرح دوڑ نہیں سکتا۔ سانپ کے آگے بھی چوہے کا یہی حال ہوتا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ بلی یا سانپ چوہے کو ہپناٹائز کر لیتے ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ چوہے پر اتنا خوف طاری ہو جاتا ہے کہ اس کی جسمانی طاقت سلب ہو جاتی ہے۔ ایسی ہی حالت اس خنزیر کی ہو گئی تھی جس کے تعاقب میں اژدھا آ رہا تھا۔

فضل داد نے بتایا کہ خنزیر ڈھلان چڑھتے پھسلنے لگا اس کے پاؤں پھسلتے گئے۔ نیچے سے اژدھا اوپر آ رہا تھا۔ اس نے خنزیر کی پچھلی ٹانگ پکڑ کر نیچے کو گھسیٹ لیا۔ خنزیر نے ایسی خوفناک چیخیں ماریں کہ فضل داد کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اژدھا نے خنزیر کو اس طرح بھبھوڑا کہ خنزیر کا منہ اژدھا کے منہ کی طرف ہو گیا۔ اژدھا نے اس کا منہ اپنے منہ میں لے لیا اور اسے آہستہ آہستہ جھنجھوڑنے لگا۔

بہت عرصے بعد میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ اژدھا جس جانور کو پکڑتا ہے سب سے پہلے اس کا منہ گردن تک اپنے منہ میں لیتا ہے۔ یہ وہ اس لئے کرتا ہے کہ شکار دم گھٹنے سے مر جائے۔ اس اژدھا نے خنزیر کا منہ اپنے منہ میں لے لیا۔ فضل داد نے بتایا کہ خنزیر ٹانگیں زور زور سے مارتا اور تڑپتا رہا۔ آخر اس کا جسم کچھ دیر بعد بے حس و حرکت ہو گیا۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مر گیا ہے۔ فضل داد نے سنایا کہ اسے یہی نظر آ رہا تھا کہ اژدھا اپنے جسم سے کئی گنا زیادہ موٹے تازے خنزیر کو نگل نہیں سکے گا اور اُسے مار کر پھینک دے گا لیکن ہُوا یہ کہ اژدھا نے اُسے آہستہ آہستہ نگلنا شروع کر دیا۔

فضل داد یہ دیکھ کر حیران ہوتا رہا کہ اژدھا کا جسم خنزیر کے جسم کے مطابق پھیلتا جا رہا تھا۔ اژدھا نے آہستہ آہستہ پورے خنزیر کو نگل لیا۔ پھر اس کے اندر کی مشینری ایسی تھی کہ خنزیر اس کے جسم کے اندر پیچھے ہی پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔ وہ اژدھا کے پیٹ میں جا رہا تھا۔ فضل داد حیران ہو رہا تھا کہ خنزیر اژدھا کے پیٹ میں جہاں جا رُکا وہاں سے اژدھا کا جسم خنزیر جتنا موٹا ہو گیا تھا۔

فضل داد نے اس واقعہ اور منظر کا بہت ہی اثر قبول کیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُس پر

تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ اُس نے اژدھا کا نام سنا تھا لیکن کبھی دیکھا نہیں تھا۔ دیکھا بھی تو اس طرح کہ اژدھا نے اپنے جسم کی موٹائی سے کئی گناہ موٹے جانور کو نگل لیا۔ فضل داد تھا تو دلیر آدمی لیکن اس پر یہ خوف طاری ہو گیا کہ کبھی اسے بھی اژدھا مل جائے گا اور اسی طرح نگل لے گا۔ فضل داد نے ٹیکری سے اُتر کر وہ راستہ ہی چھوڑ دیا اور اندھا دُھند ایک اور طرف چل پڑا۔

○

فضل داد کو اس کی گھڑی صرف وقت بتاتی رہی' دن نہیں بتا سکتی تھی کہ کتنے گزر گئے ہیں۔ فضل داد نے مجھے بتایا کہ اس کے اٹکل پچو اندازے کے مطابق جنگل میں بھٹکتے تین مہینے یا چار مہینے گزر گئے تھے۔ جنگل کے تین چار قسم کے درختوں نے اسے بھوکا نہیں رہنے دیا۔ پیاسا مرنے کا تو اسے کوئی خطرہ ہی نہیں تھا۔ اس نے ایک ایسی بات بتائی جس کا میں تجربہ کر چکا تھا۔ وہ یہ کہ اس نے اپنے آپ کو اس جنگل کی مخلوق سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے اسے اپنی بٹالین اور اپنے دوست' گاؤں کے لوگ اور عزیز و اقارب یاد آتے تھے لیکن اسے عجیب تجربہ یہ ہُوا کہ آہستہ آہستہ یہ سب لوگ اُس کے ذہن سے اُتر گئے اور وہ کچھ ایسا محسوس کرنے لگا جیسے وہ اسی جنگل میں پیدا ہُوا تھا اور اسے اسی جنگل میں زندہ رہنا اور یہیں مرنا ہے..... میں خود اس تجربے سے گزر رہا تھا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔

پھر ایک روز ایسے ہُوا کہ اُسے زنانہ چیخوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پہلے تو اسے یہ خیال آیا کہ قریب کوئی گاؤں ہو گا اور یہ عورت اس گاؤں کی ہو گی اور اس پر کسی درندے نے حملہ کر دیا ہو گا۔ یہ بھی خیال آیا کہ اس عورت کو اکیلے دیکھ کر ایک دو آدمیوں نے بری نیت سے پکڑ لیا ہو گا۔

فضل داد کے سامنے ایک اونچی ٹیکری تھی جو کچھ دُور تک چلی گئی تھی۔ یہ چیخیں ٹیکری کی دوسری طرف سے بلند ہو رہی تھیں۔ فضل داد نے پہلے تو یہ سوچا کہ اس عورت کی مدد کو پہنچے۔ اس کے اس ارادے کو اس خیال نے رد کر دیا کہ یہ کوئی درندہ ہی نہ ہو اور اگر وہ انسان ہوئے تو دو تین نہ ہوں اور اس پر بھی حملہ کر دیں گے۔ وہ اپنے آپ کو کسی مصیبت میں ڈالنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اُسے یہ بھی سوجھی کہ یہ عورت اژدھا کے منہ میں ہی نہ آ گئی ہو۔ اب تو وہ بالکل ہی ڈر گیا۔

اتنے عرصے بعد فضل داد کو پہلی بار یاد آیا کہ اس کے جھولے میں فوجی چاقو پڑا ہے جو کمانڈو اور گوریلے اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ یہ چاقو پہلے راشن کے ڈبوں کے نیچے پڑا رہا تھا اور اس کے بعد ان پھلوں کے نیچے رہا جو فضل داد درختوں سے توڑ کر جھولا بھر لیتا تھا۔ اس نے چاقو نکال لیا۔ اس چاقو کے دو تین مختلف قسم کے پھل ہوتے ہیں جن میں ایک خاصا لمبا اور چوڑا ہوتا ہے۔ عورت ابھی تک چیخ رہی تھی لیکن کسی درندے یا کسی اور انسان کی آواز نہ آتی تھی۔ فضل داد اس ٹیکری کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ وہ اس عورت کو نظرانداز کر کے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔

آگے ٹیکری ختم ہو جاتی تھی اور اس سے آگے ایسی ہی ایک اور ٹیکری شروع ہوتی تھی۔ ان کے درمیان سے گزرا جا سکتا تھا۔ فضل داد اس جگہ سے چند قدم پیچھے ہی تھا کہ ایک عورت وہاں سے چیختی چلاتی سامنے آئی اور فضل داد کو دیکھ کر رک بھی گئی اور خاموش بھی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر حیرت زدگی کا تاثر آ گیا۔ ادھر فضل داد جو پہلے ہی ڈرا ڈرا سا تھا خوفزدہ ہو گیا۔

خوفزدگی کی وجہ یہ تھی کہ یہ عورت جوان تھی اور سر سے پاؤں تک بالکل برہنہ تھی۔ اس کے بال لمبے اور بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا رنگ زردی مائل گورا تھا۔ برمی اور آسامی عورتوں کے رنگ کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ تھی تو عورت لیکن فضل داد اسے عورت نہیں سمجھ رہا تھا۔ وہ اگر کپڑے پہنے ہوئے ہوتی تو ڈرنے کی کوئی بات نہیں تھی۔ فضل داد دیہاتی آدمی تھا۔ دیہات میں چڑیلوں کے وجود کو مانا جاتا ہے۔ آج جبکہ دیہات میں تعلیم بھی چلی گئی ہے اور ہمارے زیادہ تر لوگ باہر کے ملکوں میں بھی چلے گئے ہیں، وہ اپنے اس عقیدے پر قائم ہیں کہ چڑیل کا وجود ہے اور وہ عورت کے روپ میں رات کو یا دن کو ویرانے میں کسی نہ کسی آدمی کو روک لیتی ہے۔

فضل داد نے اسے بلاشک و شبہ چڑیل سمجھا۔ اس کے ہاتھ میں فوجی چاقو تھا۔ دیہات میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کوئی چمکتا ہوا ہتھیار پاس ہو تو چڑیل بھاگ جاتی ہے۔ ہتھیار سے مراد کلہاڑی، تلوار، چھری یا چاقو ہے۔ فضل داد نے چاقو کھول کر سامنے کر لیا۔ اس نے دل ہی دل میں کلمہ شریف کا ورد شروع کر دیا۔ عورت منہ کھولے اور آنکھیں کچھ زیادہ کھولے آہستہ آہستہ اس کی طرف آ رہی تھی۔ اس کا منہ دراصل حیرت سے کھل گیا تھا اور آنکھوں کا اتنا زیادہ کھل جانا بھی حیرت کا اظہار تھا۔ فضل داد

نے کلمہ شریف کا ورد اونچا کر دیا اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اسے توقع تھی کہ یہ چڑیل اس کا چاقو دیکھ کر غائب ہو جائے گی۔ تہذیب و تمدن سے دور وہ جنگل چڑیلوں کے لئے ہی موزوں تھا۔ یہ شک بجا تھا کہ مرے ہوئے لوگوں کی روحیں، بدروحیں اور جن بھوت اسی جنگل میں رہتے ہیں۔

عورت آہستہ آہستہ فضل داد کی طرف بڑھ رہی تھی اور فضل داد اسی کی رفتار سے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ وہ بھاگ اٹھنے سے ڈرتا تھا۔ اس نے یہ روایت بھی سن رکھی تھی کہ چڑیل کو دیکھ کر بھاگو تو کلیجہ منہ کے راستے نکال دیتی ہے۔

"تمہیں اللہ اور رسولؐ کا واسطہ ہے، مجھے بخش دو" ـــ فضل داد نے اس سے کہا ـــ "میں بہت دور کا رہنے والا پردیسی ہوں، مجھے جانے دو..... اگر تمہارے دل میں رحم پیدا ہو جائے تو مجھے راستے پر ڈال دو کہ میں اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاؤں"۔

"تم انسان!" ـــ عورت نے کہا ـــ "ہم انسان..... ہم آسامی..... تم ہندوستانی..... ٹھہر جاؤ"۔

فضل داد کو یاد آیا کہ چڑیلوں کے متعلق مشہور ہے کہ ان کے ہاتھ اور پاؤں الٹے ہوتے ہیں۔ اس نے اس عورت کے ہاتھ پاؤں دیکھے وہ قدرتی طور پر سیدھے تھے جیسے انسانوں کے ہوتے ہیں۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ کوئی آدمی ذرا دل مضبوط کر کے چڑیل کو بالوں سے پکڑ لے تو پھر وہ بے بس ہو جاتی ہے۔ فضل داد نے اپنا دل مضبوط کرنا شروع کر دیا اور رک گیا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ یہ قریب آئی تو پینترہ بدل کر اس کے بال مٹھی میں پکڑ لے گا۔

وہ رکا تو عورت اس کے قریب آ گئی۔

"نہیں ڈرو" ـــ عورت نے کہا ـــ "تم کون؟..... مسلمان؟..... ہم مسلمان..... بسم اللہ الرحمٰن الرحیم..... تم ادھر کیوں آیا؟..... ادھر بیٹھو"۔

عورت نے فضل داد کی کلائی پکڑ کر بٹھا لیا اور خود اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

"تم چڑیل ہو" ـــ فضل داد نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ـــ "یہ دیکھو چاقو....."

"میں کیا؟"

"چڑیل!" ـــ فضل داد نے کہا۔

"ہم نہیں معلوم..... کیا بولا؟" ـــ عورت نے پوچھا۔

"چڑیل..... چڑیل" ـــــ فضل داد نے کہا اور اپنا چاقو دکھا کر بولا ـــــ "یہ چاقو دیکھو"۔

"یہ نہیں مارو" ـــــ عورت نے کہا اور وہ زار و قطار رونے لگی۔

وہ ایسی روئی کہ اس کی سسکیاں اور پھر ہچکیاں نکلنے لگیں۔ فضل داد نے مجھے سنایا کہ اس عورت کی شکل صورت بہت اچھی تھی اور اس کا جسم اور ہی زیادہ اچھا لگتا تھا۔ اس کے بال چمکدار اور ملائم تھے۔ فضل داد نے ایک تو اس خیال سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا کہ اس کے بال پکڑ کر کھینچے گا۔ اگر یہ چڑیل ہوئی تو قابو آ جائے گی یا بھاگ جائے گی' اور دوسرے اس نے اس خیال سے بھی اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا کہ یہ دیکھے کہ اس کے بال ریشم کے تو نہیں بنے ہوئے!

فضل داد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس عورت نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ کر اپنے سر پر رکھ دیا اور اپنے ہاتھ جوڑ دیئے جیسے وہ کوئی التجا کرنا چاہتی ہو۔

"ہم اکیلا!" ـــــ عورت نے کہا ـــــ "کوئی نہیں!" ـــــ اُس نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف کر کے کہا ـــــ "اللہ..... صرف اللہ..... تم مسلمان..... ہم مسلمان..... ہمارا نام زہرہ خانم!"

میں پہلے بھی اپنی اس داستان میں لکھ چکا ہوں کہ کئی ایسے واقعات قارئینِ کرام کو ناقابلِ یقین معلوم ہوں گے۔ ناقابلِ یقین واقعات انہونے واقعات اور پُراسرار واقعات انہی کو نظر آتے ہیں جو اس قسم کے ماحول میں چلے جاتے ہیں جہاں ہر کوئی نہیں جا سکتا۔ اگر جنگل میں کسی مسافر کو ایک نوزائیدہ بچہ پڑا ہُوا مل سکتا ہے تو کسی اور کو ایک برہنہ نوجوان عورت بھی مل سکتی ہے۔ کیا آپ نے یہ واقعات نہیں سنے کہ ہندوستان میں ایک بچے کو بھیڑیوں نے پالا تھا۔ ایک بچے کو بندروں نے پالا تھا اور عرب کے ایک علاقے میں دس بارہ سال کا ایک بچہ غزالوں کے غول میں دوڑتا ہُوا دیکھا گیا تھا۔ اسے پکڑ کر بھی لے آئے تھے۔ جنگلوں اور بیابانوں میں ایک سے بڑھ کر ایک ناقابلِ یقین کہانی جنم لیتی ہے۔ یہ عورت جو اپنا نام زہرہ خانم بتاتی تھی' اس کی داستان بھی آپ کو سنائی جا رہی ہے۔

اس عورت اور فضل داد میں اور بھی بہت سی باتیں ہوئیں اور عورت نے کچھ ایسی حرکتیں بھی کیں جن سے فضل داد کو یقین ہو گیا کہ یہ واقعی انسان ہے اور چڑیل نہیں۔

یہ عورت زہرہ خانم ٹوٹی پھوٹی اُردو بول سکتی تھی جس سے اس کا مطلب واضح ہو جاتا تھا۔ اسے یہ یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کب سے اس جنگل میں بھٹک رہی ہے۔ اس کی کہانی یوں تھی:

اس نے فضل داد کو سنایا کہ وہ آسام کی رہنے والی ہے۔ اُس نے اپنے قصبے کا نام بھی بتایا تھا جو فضل داد کو یاد نہیں رہا تھا۔ آسام میں مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی شروع سے ہی چلی آ رہی ہے۔ زہرہ خانم کی عمر گیارہ بارہ سال تھی جب اس کا باپ فوت ہو گیا۔ وہ مڈل کلاس گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس سے چھوٹا اس کا ایک بھائی تھا اور اس سے چھوٹی ایک بہن تھی۔ ایک سال بعد زہرہ خانم کی ماں نے ایک بنگالی مسلمان کے ساتھ شادی کر لی۔ زہرہ خانم نے اردو اس طرح سیکھی تھی کہ اس کا باپ کاروباری آدمی تھا اس لئے وہ اردو بول لیتا تھا۔ زہرہ خانم کی ماں بھی ٹوٹی پھوٹی اردو بول لیتی تھی۔ اس طرح زہرہ خانم نے بھی اردو بولنی سیکھ لی۔

جس بنگالی کے ساتھ زہرہ خانم کی ماں نے شادی کی وہ اچھی خاصی اردو بول سکتا تھا۔ وہ بھی تجارت پیشہ آدمی تھا لیکن اچھا آدمی نہیں تھا۔ اس کے پاس روپیہ پیسہ بہت تھا اور زیادہ تر آسام میں ہی رہتا تھا اور شادی کر کے وہ زہرہ خانم کے گھر میں ہی رہنے لگا۔ وہ کاروبار کے سلسلے میں باہر چلا جاتا تھا اور کبھی چار پانچ روز اور کبھی آٹھ دس روز باہر ہی رہتا تھا۔ واپس آتا تو سب سے پہلے زہرہ خانم کی ماں پر اس شک کا اظہار کرتا کہ اُس نے کسی کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔

زہرہ خانم کی ماں قسمیں کھا کھا کر اسے یقین دلاتی تھی کہ وہ اسے ایسا دھوکا نہیں دے رہی نہ کبھی دے گی۔ زہرہ خانم کو یہ بھی پتہ چل گیا کہ اس کا سوتیلا باپ شراب بھی پیتا ہے اور عیاش آدمی ہے۔ اس نے زہرہ خانم کی ماں سے ایک تو اس وجہ سے شادی کی تھی کہ زہرہ خانم کے باپ کا کاروبار ٹھیک ٹھاک چلتا تھا اور اس پر اس شخص نے قبضہ کر لیا تھا' اور شادی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ زہرہ خانم کی ماں خوبصورت تھی اور ابھی اچھی عمر میں تھی۔

سوتیلا باپ بچوں کے ساتھ کوئی خاص پیار نہیں کرتا تھا اور کوئی سختی بھی نہیں کرتا تھا۔ اگر سختی کرتا تو زہرہ خانم کی ماں کے ساتھ کرتا تھا۔ زہرہ خانم جب چودہ برس کی ہو گئی تو اس کا رنگ روپ نکھرا اور نوجوانی کے آثار بھی نمایاں ہونے لگے۔ سوتیلے باپ نے

زہرہ خانم کے ساتھ کچھ زیادہ ہی پیار جتانا شروع کر دیا اور وہ جب کبھی کچھ دنوں کی غیر حاضری کے بعد گھر آتا تو زہرہ خانم کے لئے نئے کپڑے یا زیور کی کوئی چھوٹی موٹی چیز لے آتا یا کوئی اور تحفہ ضرور لاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے زہرہ خانم کی ماں کے ساتھ اپنا رویہ ٹھیک کر لیا۔

زہرہ خانم نے فضل داد کو سنایا کہ جب اس کی عمر سولہ سال سے کچھ اوپر ہو گئی تو سوتیلے باپ نے اسے اپنے پاس الگ بٹھانا شروع کر دیا اور پیار میں اور زیادہ اضافہ کرنے لگا۔ زہرہ خانم کی ماں کو کچھ شک سا ہُوا۔ اس نے زہرہ خانم سے کہا کہ یہ شخص میرا خاوند تو ہے لیکن تمہارا باپ نہیں اور یہ عیاش اور شرابی کبابی آدمی ہے' اس سے ذرا دُور ہی رہا کرو۔

زہرہ خانم نے ماں کو بتایا کہ یہ شک اسے بھی ہے کہ اس شخص کی نیت ٹھیک نہیں لیکن اس سے دور رہنا ممکن نہ تھا۔ ایک روز زہرہ کی ماں نے اپنے اس دوسرے خاوند کو کہہ ہی دیا کہ لڑکی جوان ہو گئی ہے اس لئے اسے اپنے پاس علیحدگی میں نہ بٹھایا کرو۔ اس بد طینت آدمی نے زہرہ خانم کی ماں کو اس بات پر بہت ہی مارا پیٹا اور پھر زہرہ خانم کو بازو سے پکڑ کر الگ کمرے میں لے گیا۔ اس پر کوئی سختی یا سخت کلامی نہ کی بلکہ بہت ہی پیار اور محبت کا اظہار کیا اور ایسی باتیں کیں کہ زہرہ خانم اس کی باتوں میں آ گئی اور اسے اپنا سگا باپ ہی سمجھنے لگی۔

ان ہی دنوں زہرہ خانم کی ماں کو بخار آنے لگا۔ یہ بخار ذرا لمبا ہو گیا۔ زہرہ خانم کا سوتیلا باپ اس کی ماں کے لئے دوائی لاتا رہا۔ زہرہ خانم نے فضل داد کو بتایا کہ اسے شک ہُوا کہ یہ شخص ایسی دوائی لاتا ہے جس سے اس کی ماں گہری نیند سو جاتی ہے اور چھ سات گھنٹے سوئی رہتی ہے۔ رات کو تو اس کی ماں کو کوئی ہوش نہیں رہتی تھی۔ ایک رات سوتیلا باپ زہرہ خانم کو الگ کمرے میں لے گیا اور پیار پیار میں بڑی بے ہودہ حرکتیں کرنے لگا۔ زہرہ خانم پہلے تو شرماتی اور ہنستی رہی۔ اس کے اس رویّے کو سوتیلا باپ رضامندی سمجھا اور اس نے اپنی نیت کا اظہار صاف لفظوں میں کر دیا۔ زہرہ خانم کو یوں لگا جیسے سوتیلے باپ نے اس کے دل میں خنجر اتار دیا ہو۔ وہ اٹھ کر کمرے سے بھاگنے لگی تو باپ نے اٹھ کر اسے پکڑ لیا اور زبردستی پلنگ پر گرا لیا۔ لڑکی اچھی صحت والی تھی اور جسم میں طاقت بھی تھی' وہ اچھل کر پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سوتیلے باپ نے اسے پھر

گرایا اور جبر کرنا چاہا لیکن لڑکی اس کے ہاتھ نہ آئی۔ ایک بار تو لڑکی نے اس شخص کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ کرسی پر گرا' کرسی الٹ گئی اور وہ فرش پر جا پڑا۔

اس بدکار شخص کے دماغ پر شیطان غالب آ چکا تھا۔ لڑکی کمرے سے نکل رہی تھی کہ اس آدمی نے دوڑ کر پھر اسے پکڑ لیا اور مارنے پیٹنے لگا۔ اس نے آخر لڑکی کو گرا ہی لیا۔ اور لڑکی نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ گھر میں اس کی چیخیں سننے والا کوئی بھی نہ تھا۔ اس کی ماں دوائی لے کر بے ہوشی کی نیند سوئی ہوئی تھی اور چھوٹا بھائی اور اس سے چھوٹی بہن بچپن کی بے فکری کی نیند سو رہے تھے۔

زہرہ خانم نے فضل داد کو بتایا کہ اچانک اس میں اتنی زیادہ طاقت آ گئی کہ اس نے سوتیلے باپ کو پہلے ہاتھوں سے پیچھے دھکا دیا پھر دونوں پاؤں جوڑ کر اس کے سینے میں اتنی زور سے مارے کہ وہ پلنگ کی پائنتی کی طرف پیچھے کو گرا اور فرش پر جا پڑا۔ زہرہ خانم بہت ہی تیزی سے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی لیکن وہ اندر نہ گئی بلکہ باہر والا دروازہ کھول کر باہر کو بھاگی۔ اس کا باپ اس کے پیچھے آیا لیکن اس نے زیادہ تعاقب نہ کیا۔ زہرہ خانم چیختی جا رہی تھی۔

زہرہ خانم نے فضل داد کو اپنی اس وقت کی ذہنی حالت ٹوٹی پھوٹی اردو میں سنائی' اس سے یہ ظاہر ہُوا کہ اس کے دماغ پر کچھ اُلٹا اثر ہو گیا تھا یا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ اسے اتنا ہی یاد تھا کہ اس نے اپنے سوتیلے باپ کو اس شیطانیت میں کامیاب نہیں ہونے دیا تھا لیکن وہ جب اٹھ کر دوڑی تو اس کے جسم پر شلوار نہیں تھی۔ اس نے صرف قمیض پہن رکھی تھی اور وہ ننگے پاؤں تھی۔ اس نے بتایا کہ اسے اپنے دماغ میں اور وجود میں ایک دھماکہ محسوس ہوا تھا جس وقت اس نے اپنے سوتیلے باپ کو دھکا دے کر فرش پر گرایا تھا۔ ان لوگوں کا گھر قصبے کے باہر تھا جہاں سے کھیت شروع ہو جاتے تھے اور اس سے آگے جنگل تھا اور پھر کچھ علاقہ پہاڑیوں اور چٹانوں کا تھا۔ زہرہ خانم کو اتنا ہی یاد رہا کہ وہ قصبے سے نکل آئی ہے۔ اس وقت وہ اپنے سر میں یوں محسوس کر رہی تھی جیسے اس کی کھوپڑی میں چیونٹیاں رینگ رہی ہوں اور اس کے دماغ کو کاٹ بھی رہی ہوں۔ اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں کہ وہ کہاں گئی اور کہاں رہی۔

اس کی باتوں سے فضل داد نے جو مطلب نکالا وہ یہ تھا کہ اس کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا یا یوں کہہ لیں کہ وہ پاگل ہو گئی تھی۔ فضل داد نے اس کی جو باتیں مجھے سنائیں' ان سے

میں نے بھی یہی رائے قائم کی کہ یہ لڑکی پاگل ہو گئی تھی۔ اسے بالکل ہی یاد نہیں تھا کہ وہ کہاں کہاں بھٹکتی پھرتی رہی اور وہ برما کے جنگل میں یہاں کس طرح آن پہنچی۔ برما اور آسام کی سرحد ایک ہے۔

اس نے بتایا کہ مہینہ یا ڈیڑھ مہینہ پہلے اس کا دماغ صاف ہونے لگا اور آہستہ آہستہ اسے پتہ چلا کہ وہ اس گھنے جنگل میں گھوم پھر رہی ہے اور اسے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور وہ اپنے گھر سے کتنی دور ہے۔

○

یہاں سے زہرہ خانم کی یہ کہانی ایسی گھپ تاریکی میں چلی جاتی ہے جس میں نہ فضل داد کو کچھ نظر آیا نہ میں کچھ دیکھ سکا۔ خود زہرہ خانم فضل داد کو کسی بھی سوال کا جواب نہ دے سکی۔ فضل داد نے مجھے بتایا کہ وہ جب بھی اس سے کچھ پوچھتا تھا تو اس کے ماتھے پر شکنیں آجاتی تھیں اور اس کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر آجاتا تھا جیسے وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہو گئی ہو۔ وہ دراصل ذہن پر زور دیتی تھی اور سوچنے کی اور یاد کرنے کی کوشش کرتی تھی کہ وہ کہاں رہی اور کتنا عرصہ گزر گیا جس کا اسے پتہ ہی نہ چلا۔ سوچ سوچ کر وہ اتنا سا ہی جواب دیتی تھی کہ وہ جب یاد کرتی ہے تو اسے ایسے لگتا ہے جیسے وہ کوئی خواب دیکھتی رہی ہے۔ اُس وقت جب میں اور فضل داد جوانی کی عمر میں تھے اور برما کے جنگل کے قیدی بنے ہوئے تھے' اس واقعہ کو تو نہیں البتہ زہرہ خانم کی سنائی ہوئی کہانی کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے بلکہ میں نے فضل داد کے ساتھ کچھ بیہودہ باتیں اس لڑکی کے بارے میں کی تھیں اور فضل داد نے بھی کچھ ایسی ہی اخلاق سے گری ہوئی باتیں سنائی تھیں۔ میں اس کہانی کو آگے چلانے سے پہلے آپ کا ذہن کسی اور طرف لے جانا چاہتا ہوں تاکہ آپ سمجھ سکیں کہ یہ معاملہ کیا تھا۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے وہ وقت دکھایا جب میں واپس اپنے گھر پہنچا۔ اُس وقت میں پختہ عمر میں داخل ہو چکا تھا اور دماغ بہتر طریقے سے بہتر باتیں سوچنے کا عادی ہو چکا تھا۔

پھر جب یہ ارادہ کیا کہ اپنی زندگی کی یہ داستان قلمبند کروں تو میں نے ضرورت محسوس کی کہ ہر بات کا جواز ملنا چاہئے اور میں کوئی واقعہ اس طرح نہ سناؤں جس طرح چنڈال چوکڑیوں میں بیٹھ کر لوگ ایک دوسرے کو سنسنی خیز کہانیاں سنایا کرتے ہیں۔ زہرہ خانم کی کہانی میرے ذہن میں اٹکی ہوئی تھی۔ میں نے مختلف کتابوں کا مطالعہ شروع کر

دیا تھا۔ نفسیات کی کتابیں بھی پڑھیں اور پھر میں تین ڈاکٹروں سے ملا جو ذہنی اور دماغی امراض کے ماہر تھے۔ ڈاکٹر بغیر فیس کے بات نہیں کیا کرتے اور بات بھی وہ کرتے ہیں جو ان کی مرضی اور پسند کی ہوتی ہے۔ میرا تعارف ان ڈاکٹروں سے کرایا گیا تھا اور میں انہیں ان کے گھروں میں جا کر ملا تھا۔ انہوں نے بڑا اچھا تجزیہ کیا تھا۔

تینوں ڈاکٹروں کی رائے تقریباً" ایک جیسی تھی۔ رائے یہ تھی کہ عام فہم زبان میں لڑکی پاگل ہو گئی تھی لیکن ایسی پاگل نہیں کہ اس کے دماغ میں کوئی خرابی آگئی ہو۔ اگر کوئی خرابی آ بھی گئی تھی تو وہ عارضی تھی۔ لڑکی کو سوتیلے باپ نے شدید اور غیر متوقع صدمہ پہنچایا تھا جو اس کی برداشت کے دائرے سے بہت باہر اور دُور تھا۔ وہ وہاں سے بھاگی اور پھر اس کا ذہن بھی مفرور ہو کر اپنی ایک دنیا آباد کر بیٹھا۔ اسے شیزو فرینیا کی ایک خاص قسم کا مرض کہتے ہیں۔

ڈاکٹروں نے ایک بڑی عجیب بات بتائی۔ انہوں نے کہا کہ اس لڑکی کو اگر پاگل خانے میں داخل کر دیا جاتا تو وہ پاگل ہی پاگل ہوتی چلی جاتی اور کبھی ٹھیک نہ ہو سکتی۔ اسے اگر گھر میں رکھ کر ذہنی سکون کی دوائیاں یعنی ٹرانکولائزر دیے جاتے تو بھی یہ ٹھیک نہ ہو سکتی۔ ٹھیک ہونے کی بجائے وہ ان دوائیوں کی عادی اور نشئی ہو جاتی اور ہر وقت غنودگی کی کیفیت میں رہتی۔ پھر ان دوائیوں کا اثر بھی زائل ہونا شروع ہو جاتا اور وہ ان کی مقدار اور طاقت میں اضافہ کیا جاتا۔

ان ڈاکٹروں نے اپنی اصطلاحوں میں یہ تجزیہ کیا تھا۔ مجھے کچھ اصطلاحیں یاد رہ گئی ہیں اور زیادہ تر بھول گیا ہوں' میں قارئین کو اس جھمیلے میں نہیں ڈالنا چاہتا کہ وہ یہ اصطلاحیں سنیں اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایک عام ذہن کو سمجھانے کے لئے یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ لڑکی زہرہ خانم اپنا شعور کھو بیٹھی تھی اور لاشعور میں چلی گئی تھی۔ اس کا جسم اپنی ضروریات لاشعوری طور پر پوری کرتا رہا۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے میں اور فضل داد درختوں سے جو بھی پھل حاصل ہوا کھاتے رہے اور پانی پیتے رہے اور جانوروں کی طرح جہاں جگہ ملی سو گئے۔ ان حالات میں ضروریات جانوروں جیسی ہی رہ گئی تھیں۔ ایک پیٹ بھرنا اور دوسرا اپنے آپ کو خطروں سے بچائے رکھنا۔ اس لڑکی کا احساس زندہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور کدھر جا رہی ہے۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ یہ کوئی عجیب واقعہ نہیں ہے۔ ایک ڈاکٹر نے کہا کہ ہمارے پاس ایسے کیس آتے ہیں کہ ایک نوجوان لڑکا گھر

سے بھاگ گیا اور سال ڈیڑھ سال بعد واپس ایسی حالت میں آیا جیسے اس کا دماغی توازن ٹھیک نہ ہو۔ ایسے کیس اس لڑکی سے ملتے جلتے ہیں۔

اگر مجھے نفسیات کے ان ڈاکٹروں سے یہ تجزیہ نہ ملتا اور وہ یہ نہ کہتے کہ یہ کوئی عجیب اور مافوق الفطرت واقعہ نہیں تو میں اسے اپنی اس داستان میں کبھی شامل نہ کرتا.....

یوں سمجھ لیں کہ یہ لڑکی اپنے ذہن لاشعور کی دنیا میں زندہ رہی' بھٹکتی پھری اور کچھ عرصے بعد اس کا ذہن آہستہ آہستہ حقیقت میں آنے لگا اور جب اس نے فضل داد کے روپ میں ایک انسان کو دیکھا تو اس کا ذہن پوری طرح بیدا ہو گیا اور اسے گئی گزری ساری باتیں یاد آ گئیں۔ وہ جو روئی تھی' اس کا بھی اچھا اثر پڑا تھا۔ اس کے شعور کے دروازے کھل گئے تھے۔ البتہ وہ اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی تھی کہ وہ کتنا عرصہ جنگلوں میں بھٹکتی پھرتی رہی ہے۔ فضل داد نے اس سے پوچھا کہ جب وہ گھر سے نکلی تھی' کیا اس وقت جنگ شروع ہو چکی تھی؟..... اس نے جواب دیا کہ کوئی جنگ شروع نہیں ہوئی تھی اور نہ اسے معلوم ہے کہ کہیں جنگ ہو رہی ہے۔ اس سے فضل داد نے اور میں نے بھی اندازہ اور حساب لگایا تو پتہ چلا کہ وہ پانچ چھ سال ان جنگلوں میں جانوروں کی طرح زندگی گزارتی رہی ہے۔

بہرحال میں یہ مسئلہ ان خواتین و حضرات کی صوابدید پر چھوڑتا ہوں جو نفسیات کے ڈگری یافتہ ہیں اور وہ بھی جو نفسیات کے ماہر اور عالم ہیں۔ میں نے آپ کو واقعہ سنا دیا ہے' تجزیہ اپنا اپنا کر لیں۔



فضل داد نے مجھے سنایا لڑکی جوں جوں بولتی جا رہی تھی' اس کا ذہن صاف ہوتا جا رہا تھا۔ بہت سا بول کر اور آنسو بہا کر وہ بالکل صحیح حالت میں آ گئی اور وہ بازوؤں اور ٹانگوں سے اپنا ستر چھپانے لگی۔

فضل داد دیہاتی تھا اور فوجی بھی تھا۔ میں نے اس داستان میں پیچھے سنایا ہے کہ اس وقت کے فوجیوں کی اخلاقی حالت کتنی پست ہُوا کرتی تھی۔ محاذ سے واپس آنے والے فوجی سب سے پہلے عصمت فروش عورتوں کے بازار کا رخ کرتے تھے۔ فضل داد کے سامنے ایک جوان عورت بالکل برہنہ بیٹھی تھی اور وہ خوبصورت بھی تھی۔ خوبصورت تھی یا نہیں' ایک فوجی کے لئے یہی کافی تھا کہ وہ ایک عورت تھی۔ اس وقت فضل داد کی

ذہنی اور جذباتی حالت حیوانوں جیسی تھی۔ وہ بے قابو ہونے لگا اور اس نے ایک بار پھر زہرہ خانم کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا اور اس کے ساتھ ہی اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اچانک اس کے اندر زلزلے جیسا ایک جھٹکا آیا۔ میں نے کہا ہے کہ وہ دیہاتی بھی تھا۔ دیہاتیوں میں غیرت کا جذبہ بڑا ہی شدید ہوتا ہے۔ فضل داد کے اندر یہ جذبہ بیدار ہو گیا۔ زہرہ خانم ایک مظلوم لڑکی تھی جسے ایک شخص نے باپ بن کر بے آبرو کرنے کی کوشش کی تھی۔ فضل داد نے فوراً" اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کر لئے اور اٹھ کھڑا ہُوا۔ اس نے زہرہ خانم کو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ بیٹھی رہے۔ وہ خود چند قدم پرے گیا اور زہرہ خانم کی طرف پیٹھ کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ یا اللہ! مجھے شیطان کے قبضے سے چھڑا دے اور اتنی ہمت دے کہ اپنے آپ کو قابو میں رکھوں اور اس مظلوم عورت کو ایک پاکیزہ امانت سمجھوں۔

اُس نے نہ کوئی نفل پڑھے نہ کوئی آیت پڑھی' صرف اور صرف اللہ کو پکارا اور روح کی گہرائیوں سے یہ التجا کی۔ یہاں وہی بات ہوئی — بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے — فضل داد کے وجود میں اور اس کی ذات میں ایسی ٹھنڈک سی آ گئی کہ وہ بالکل ہی بدلا ہوا انسان بن گیا۔ اس نے اللہ تبارک و تعالیٰ کو اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔

وہ ایک اونچی جھاڑی کی اوٹ میں چلا گیا۔ اس نے اپنی خاکی پتلون اتاری۔ اس کے نیچے اس نے انڈرویئر پہنا ہُوا تھا۔ یہ فوجی انڈرویئر تھا جو گھٹنوں سے ذرا اُوپر تک لمبا ہوتا ہے اور اس میں ازار بند پڑا ہوتا ہے۔ اس نے یہ انڈرویئر جسے عام زبان میں کچھا کہتے ہیں' اتار لیا اور پھر پتلون پہن لی۔ واپس زہرہ خانم کے پاس آیا اور اسے دے کر کہا کہ یہ پہن لے۔ پھر اس نے اپنی قمیض اتاری اور یہ بھی زہرہ خانم کو پہنا دی۔

زہرہ خانم کا جسم ڈھانپا گیا اور اب فضل داد کے جسم پر بنیان تھی اور پتلون۔ ایک مرد نے زہرہ خانم کا جسم ڈھانپ دیا تو اس پر ایسا اثر ہُوا کہ وہ فضل داد کے ساتھ لپٹ گئی اور ایسی روئی کہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ یہ سکون اور مسرت کا رونا تھا۔ فضل داد پر کوئی اُلٹا اثر نہ ہُوا بلکہ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا اور اس کی پیٹھ تھپتھپاتا رہا۔ وہ بہت دیر روتی رہی اور فضل داد سے الگ ہو گئی۔

یہ میں اپنے الفاظ میں کہہ رہا ہوں کہ اب لڑکی ذہنی طور پر نارمل ہو گئی تھی۔

فضل داد پر بڑی ہی نازک ذمہ داری آپڑی تھی۔ اس ذمہ داری کا اہم پہلو یہ تھا کہ اسے اپنے آپ پر قابو رکھنا تھا اس لئے زہرہ خانم سے پوچھا کہ اس علاقے سے وہ واقف ہے یا نہیں اور یہ علاقہ آسام سے کتنی دُور ہے..... زہرہ خانم کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

○

میں اپنی اس داستان میں وہ تفصیلات پیش نہیں کر رہا کہ دونوں اس جنگل میں کتنا عرصہ اکٹھے رہے اور کس طرح رہے اور انہوں نے اور کتنا سفر طے کر لیا۔ فضل داد نے مجھے بتایا کہ اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر وہ اس جنگل سے نکل کر آسام یا بنگال پہنچ گیا تو وہ زہرہ خانم کو اپنے ساتھ اپنے گاؤں میں لے جائے گا اور اس کی شادی کسی اچھے آدمی سے کرا دے گا۔ وہ خود شادی شدہ تھا۔ زہرہ خانم کو ماں، چھوٹا بھائی اور چھوٹی بہن یاد آتے تھے اور رو بھی پڑتی تھی۔ کہتی تھی کہ اس کی ماں زندہ نہیں ہوگی اور اس کا بھائی اور بہن نہ جانے کہاں دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہوں گے۔ فضل داد اسے جھوٹی سچی تسلیاں دینے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

فضل داد نے بتایا کہ اس کے اندازے کے مطابق وہ ایک مہینے سے زیادہ عرصہ اکٹھے رہے۔ فضل داد نے سورج کو دیکھ کر مشرق، مغرب اور شمال جنوب کا حساب رکھا ہُوا تھا۔ وہ صبح اٹھتے ہی شمال کی طرف چل پڑتے تھے۔

آگے علاقہ کچھ آسان سا آ گیا تھا۔ پہاڑیاں اور ٹیکریاں تو تھیں لیکن ذرا دُور دُور تھیں لیکن باقی علاقہ اتنا غیر ہموار نہیں تھا کہ چلنے میں دشواری ہوتی۔ فضل داد یہ محسوس کرتا رہا تھا کہ زمین اوپر کو اٹھی جا رہی ہے اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بلندی کی طرف جا رہے تھے۔

گرمیوں کا موسم شروع ہو گیا تھا لیکن وہاں اتنی زیادہ گرمی نہیں تھی جتنی میدانی علاقوں میں ہوتی ہے۔ اُس علاقے میں بھی درختوں اور اونچی نیچی گھاس کی اور جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ یہ درخت کچھ اور قسم کے تھے اور جھاڑیاں بھی مختلف تھیں۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ یہ خِطّہ کوئی اور ہے اور شاید یہ برما نہیں۔

ایک شام فضل داد اور زہرہ خانم بڑی خوبصورت جگہ رک گئے چھوٹی چھوٹی گھاس مخمل کی طرح ملائم اور نرم تھی اور اس کے اردگرد گھنے درخت تھے۔ انہوں نے رات

سونے کے لئے یہ جگہ موزوں سمجھی۔ وہ لیٹے اور کچھ دیر باتیں کرتے رہے اور پھر سو گئے۔

○

فضل داد کو اپنے جسم پر تین چار جگہ چبھن محسوس ہوئی اور وہ بیدار ہو گیا اور اس کے ساتھ کچھ آدمیوں کی باتیں سنائی دیں اور پھر اُسے زہرہ خانم کی آواز سنائی دی۔ اس نے اس کا نام لے کر پکارا تھا۔

فضل داد نے آنکھیں کھولیں۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ تیز روشنی نے اس کی آنکھیں نہ کھلنے دیں۔ وہ اٹھ بیٹھا اس نے آنکھیں مل کر دیکھا تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔ اس کے اردگرد چار بالکل برہنہ آدمی کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں سی تھیں جو آگے سے برچھیوں کی طرح تراشی ہوئی تھیں۔ ان برچھیوں کی نوکیں فضل داد کے جسم کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ وہ جب سویا ہُوا تھا تو اس نے انہی نوکوں کی چبھن محسوس کی تھی۔ تب اس نے ہر طرف دیکھا۔ زہرہ خانم اس سے سات آٹھ قدم دور کھڑی تھی اور دو آدمیوں نے اس کے بازو پکڑ رکھے تھے۔ یہ سب آدمی بالکل برہنہ تھے۔ ان کے جسموں کے رنگ گندمی اور بڑے صاف تھے۔ بعض کے بال خاصے لمبے اور بعض کے کٹے ہوئے تھے۔ ان میں ایک کے ہاتھ میں فضل داد کا جھولا تھا۔

فضل داد سمجھ گیا کہ یہ وہی ناگے قبائلی ہیں جن کے بارے میں اس نے پہلے بھی سن رکھا تھا وہ ان کے ہاتھ چڑھ گیا تھا اور اسے یہی نظر آ رہا تھا کہ وہ اسے قتل کر دیں گے اور زہرہ خانم کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ زہرہ خانم رو رہی تھی لیکن فضل داد بے بس ہو گیا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ آپس میں اپنی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ ان میں دو ایک طرف دوڑے ہوئے گئے اور جب وہ واپس آئے تو ان کے ہاتھوں میں پودوں کی لمبی لمبی ٹہنیاں تھیں جو بیلیں معلوم ہوتی تھیں۔ انہوں نے فضل داد کے ہاتھ آگے کر کے ان بیلوں سے باندھ دیئے، پھر اس کے پاؤں بھی باندھ دیئے گئے۔ دو آدمیوں نے اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں اور بندھی ہوئی ٹانگوں کے نیچے سے دو لاٹھیاں جوڑ کر گذاریں اور اس طرح فضل داد کو اٹھا لیا کہ لاٹھیوں کے اگلے سرے ایک آدمی کے کندھے پر اور پچھلے سرے پچھلے آدمی کے کندھے پر تھے۔ اس طرح فضل داد بندھے ہاتھوں اور پاؤں سے لٹک رہا تھا۔ ایک آدمی نے زہرہ خانم کو اپنے کندھے پر ڈال

لیا۔

فضل داد نے موت کو قبول کر لیا۔ اس نے اپنے آپ کو اس طرح تسلی دی کہ جاپانیوں کے ہاتھوں بھی مرنا تھا' وہاں سے بچ نکلے تو جنگل میں کسی درندے کا شکار ہو جاتا تھا' وہ نہ ہوئے تو ان ننگے وحشیوں کے ہاتھوں موت لکھی ہوئی تھی' وہ مل رہی ہے۔ اللہ کو یہی منظور تھا..... فضل داد دائیں بائیں دیکھتا جا رہا تھا۔ سارا علاقہ سرسبز تھا اور درخت تو بہت ہی تھے۔ ہری بھری ٹیکریاں اور اونچی نیچی پہاڑیاں بھی تھیں لیکن یہ علاقہ دشوار گذار نہیں تھا۔ آگے چڑھائی ہی چڑھائی تھی۔ کہیں ذرا سی اترائی آتی تھی اور پھر زمین اوپر کو چلی جاتی تھی۔ فضل داد سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ بلندیوں پر رہتے ہیں۔ فضل داد کے پاس گھڑی تھی جو ان ناگوں نے نہیں اتاری تھی۔ ناگے بہت ہی تیز چل رہے تھے۔ زہرہ خانم کو وہ باری باری اٹھا رہے تھے۔ وہ جسموں سے بہت طاقتور معلوم ہوتے تھے۔

وہ جب رُکے تو فضل داد کو گھڑی نے بتایا کہ چار گھنٹے اور کچھ منٹ گزر گئے ہیں۔ انہوں نے فضل داد کو بڑے آرام سے زمین پر رکھ دیا اور لاٹھیاں جو دراصل ان کی برچھیاں تھیں کھینچ لیں۔ پھر اسے پاؤں پر کھڑا کر دیا۔ اس کے پاؤں کھول دیئے گئے لیکن ہاتھ نہ کھولے گئے۔ فضل داد نے سب سے پہلے زہرہ خانم کو دیکھا۔ اسے بھی انہوں نے کندھوں سے اتار دیا تھا اور وہ رو رہی تھی۔

ہر طرف دیکھا تو یہ جگہ پہاڑیوں سے گھری ہوئی نظر آئی۔ سبزہ زار اور درختوں کی وجہ سے یہ ساری جگہ بہت ہی خوبصورت لگتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ننگے آدمیوں اور عورتوں اور بچوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ بچے تالیاں بجا رہے تھے اور بڑے بھی ہنستے مسکراتے باتیں کر رہے تھے۔ اگر ان کی باتیں سمجھ میں آتیں تو کچھ اندازہ ہو جاتا کہ ان لوگوں کا مقصد کیا ہے۔ وہاں اِدھر اُدھر درختوں کے تھنوں' سرکنڈوں اور گھاس پھونس کے جھونپڑے بنے نظر آ رہے تھے جن میں بعض گول تھے اور باقی چوکور۔

اچانک ہجوم میں ہڑبونگ سی ہوئی اور یکلخت یہ ہڑبونگ خاموشی میں بدل گئی۔ ایک طرف سے ہجوم نے اِدھر اُدھر ہٹ کر راستہ بنا دیا۔ ایک ناگا آ رہا تھا جس کے پیچھے چار ننگے تھے۔ یہ ناگا ان کا سردار معلوم ہوتا تھا وہ پوری طرح ناگا نہیں تھا۔ اس نے کمر کے گرد ایک رسی باندھ رکھی تھی۔ اس رسی سے رنگ دار کپڑوں کے چھوٹے چھوٹے

ٹکڑے لٹک رہے تھے۔ کوئی ٹکڑا ایک بالشت سے زیادہ نہیں تھا۔ اسی رسی میں پھول دار ٹہنیاں بھی اُڑسی ہوئی تھیں۔ اس شخص کے سر کے اردگرد رنگ دار کپڑے کی پٹی بندھی ہوئی تھی جس میں پرندوں کے رنگ دار پر اُڑسے ہوئے تھے اُس کے بال عورتوں کی طرح لمبے تھے۔ وہ چہرے سے ادھیڑ عمر لگتا تھا۔ ادھیڑ عمری کی دو تین لکیریں ظاہر ہو گئی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں تقریباً" دو فٹ لمبا ڈنڈا تھا جس پر رنگ دار کپڑے لپٹے ہوئے تھے اور اس کے آگے والے سرے پر رنگ دار پر لگے ہوئے تھے اور اس کے پچھلے سرے کے ساتھ دو چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

وہ جب آیا تو ہجوم پہ پر سناٹا طاری ہو گیا اور ہر بچہ' عورت اور آدمی دو زانو بیٹھ گئے اور سر جھکا لئے۔ یہ شخص جسے میں سردار ہی کہوں گا' پہلے زہرہ خانم کے پاس گیا اور اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر اس کے اردگرد دو چکر لگائے اور پھر پیٹھ کے پیچھے کھڑے ہو کر بڑے غور سے دیکھا اور پھر اس نے ڈنڈے کا اگلا سرا جہاں پرندوں کے پر اُڑسے ہوئے تھے زہرہ خانم کی پیٹھ کے ساتھ لگا کر منہ سے عجیب سی آواز نکالی۔ اس نے ہجوم کی طرف منہ کر کے کوئی بات ایسے انداز میں کہی جیسے کوئی اعلان کیا ہو۔

ہجوم نے اچھل کود کر اور تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کے سردار نے اعلان کیا ہے کہ ان کے مطلب کی چیز مل گئی ہے۔

پھر یہ سردار فضل داد کے سامنے جا رکا اور اسے بھی اچھی طرح دیکھا۔ اس نے اپنے ساتھ کھڑے ناگوں کو آہستہ سے کچھ کہا۔ ناگے فضل داد کو ایک طرف لے گئے اور ایک درخت کے پاس کھڑا کر کے اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں میں مضبوط رسی ڈال دی اور رسی کا دوسرا سرا درخت کے ساتھ باندھ دیا جیسے کسی جانور کو باندھا جاتا ہے۔ وہ ایسی جگہ تھی جہاں سے فضل داد کو سب کچھ نظر آ رہا تھا۔

شام کے وقت فضل داد کو ایک جھونپڑے میں لے گئے جو پتھروں کا بنا ہوا تھا اور اس کی چھت میں درختوں کے موٹے تنے اور سرکنڈے اور ان پر مٹی ڈالی ہوئی تھی۔ اس جھونپڑے کا ایک ہی دروازہ تھا۔ فضل داد کو اندر بٹھا کر دروازہ بند کر دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اُسے کھانا دیا گیا۔ یہ اُبلے ہوئے چاول تھے اور شوربے والی مچھلی تھی۔ فضل داد نے بڑی ہی لمبی مدت کے بعد صحیح کھانا دیکھا تھا۔ وہ اس کھانے پر ٹوٹ پڑا اور پیٹ بھر کر کھایا۔ اس کے ہاتھ اس جھونپڑے میں داخل کر کے کھول دیئے گئے تھے۔ دو ناگوں نے اسے

نہ جانے کیا کچھ کہا تھا۔ وہ انگلیاں اور ہاتھ اس کی طرف کر کے زور زور سے ہلاتے اور غصے سے بولتے تھے۔ وہ یقیناً" یہی کہتے ہوں گے کہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو تمہیں زندہ نہیں رہنے دیا جائے گا۔

○

فضل داد کی رات اس کمرے میں گزری۔ یہ اس کا قید خانہ تھا۔ اسے اپنا کوئی غم نہیں تھا' وہ زہرہ خانم کے لئے پریشان تھا۔ وہ ایسی توقع رکھ ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ ننگے وحشی اس خوبصورت عورت کے ساتھ کوئی اچھا سلوک کریں گے لیکن وہ اس عورت کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بہت ہی تھکا ہُوا تھا اور اس نے کھانا اتنا زیادہ کھا لیا تھا کہ اس پر غنودگی طاری ہو گئی اور وہ سو گیا۔

اگلے روز دو ننگے اس کے پاس آئے اور اسے کھانے کے لئے کچھ دیا۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ یہ کیا ہے۔ اس نے اشاروں سے ان ننگوں سے پوچھا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ ننگوں نے اس کے اشارے سمجھ لئے اور ان میں ایک نے اپنی گردن پر یوں ہاتھ کا اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ تمہاری گردن کاٹ دی جائے گی۔ اگر وہ ان کی زبان سمجھتا تو ان سے کہتا کہ گردن بہت جلدی کاٹ دو تاکہ میں اس دنیا کے جہنم سے آزاد ہو جاؤں۔

دونوں ننگے وہاں سے نکل گئے اور دروازہ بند کرنے لگے۔ فضل داد نے سوچنا شروع کر دیا کہ مرنا تو ہے ہی لیکن وہ بزدلوں کی طرح نہیں مرے گا یا بکرے کی طرح اپنی گردن نہیں کٹوالے گا بلکہ ایک دفعہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش ضرور کرے گا اور یہ کوشش بھی کرے گا کہ زہرہ خانم کو بھی ساتھ لے جائے۔

حوالدار

فضل داد ان ناگوں کے جنگل میں پھنس گیا تھا۔ ان ناگوں کے متعلق کچھ ضروری باتیں پہلے ہی بتا دوں تو میرا خیال ہے اچھا رہے گا۔ ان ناگوں کی میں پرانی تاریخ تو نہیں جانتا' اور شاید ان کی کوئی تاریخ ہے بھی نہیں۔ جنگِ عظیم کے فوراً" بعد یہ قبائل تاریخ میں نمایاں طور پر ابھر کر آ گئے۔ اب یہ ننگے نہیں بلکہ ناگا قبائل کہلاتے ہیں۔ ان کی اپنی سیاسی قیادت ہے اور یہ قیادت اتنی مخلص اور دیانت دار ہے کہ اس نے آدم خور ناگوں کو ایک باعزت قوم بنا دیا ہے۔

اگر قیادت مخلص اور دیانتدار ہو اور اسکے دل میں اپنے لوگوں کی محبت ہو تو معجزے رونما ہو سکتے ہیں۔ اس کی ایک مثال پاکستان ہے۔ برِصغیر کے مسلمان' خصوصاً" پاکستان میں آنے والے صوبوں کے مسلمان پسماندہ تھے' بے مایہ تھے اور تعلیم سے بھی بے بہرہ تھے۔ ان کی اکثریت مزدور اور کسان تھی۔ قیادت ملی تو اسی قوم نے ایک الگ مملکت بنا لی تھی۔

جنگِ عظیم کے تھوڑا ہی عرصہ بعد اخباروں میں دو قبائل کے نام آنے لگے۔ ایک ناگا اور دوسرے میزو۔ ان قبائل کا علاقہ آسام کے مشرق اور شمال مشرق میں ہے۔ اس سے آگے برما شروع ہو جاتا ہے۔ ناگا اور میزو قبائل کا علاقہ ہندوستان میں آتا ہے یعنی وہاں ہندوستان کی حکومت ہے۔

ناگا قبائل تو بالکل ہی وحشی' اور آدم خور تھے۔ انسانی کھوپڑی ان کے کلچر اور عقیدے کا لازمی حصہ تھا۔ یہ لوگ مادر زاد ننگے رہتے تھے۔ کچھ پہاڑوں کے دامن میں رہتے اور باقی پہاڑوں کی ڈھلوانوں اور بلندیوں پر رہتے تھے۔ یہ وہی ننگے تھے جن کے

ہاتھ فضل داد اور زہرہ خانم چڑھ گئے تھے۔ میزو قبائل ان سے بہتر تھے۔ ان میں ناگوں جیسا وحشی پن نہیں تھا اور درندگی بھی نہیں تھی۔ میزو قبائل کا علاقہ ناگوں کے علاقے کے ساتھ ملتا ہے۔ اکثر میزو قبائل کے لوگ ہی ناگے آدم خوروں کا شکار ہُوا کرتے تھے۔

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ 1950ء سے ذرا پہلے ان ہی ناگوں اور میزو قبائل نے ہندوستان کی حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کر دی اور آزادی کا مطالبہ کیا تھا۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ انہیں الگ مملکت دی جائے جس کا نام ناگالینڈ ہو گا۔ دراصل ناگا اور میزو قبائل متحد ہو گئے تھے۔ وہ آج تک متحد ہیں اور ان میں وہی سیاسی بیداری ہے جو ہر تہذیب یافتہ قوم میں پائی جاتی ہے۔ ان کی مسلح بغاوت کو دبانے کے لئے ہندوستان کو اپنی فوج استعمال کرنی پڑی اور خاصی شدید اور خونریز جنگ لڑی گئی جو کئی سال چلتی رہی۔ یہ جنگِ آزادی ایسی ہی تھی جیسی صوبہ سرحد کے قبائلی پٹھانوں نے اپنے علاقے میں انگریزوں کے خلاف لڑی تھی۔

ہندوستان ناگا اور میزو قبائل کی مسلح بغاوت کو فوجی طاقت سے دبا نہ سکا۔ اس کی خبریں ساری دنیا کے اخباروں اور رسالوں میں آنے لگیں اور یوں مہذب دنیا ناگا اور میزو قبائل اور ان کی جنگِ آزادی سے واقف ہوئی۔ ناگے اور میزو پہاڑیوں میں چلے گئے اور گوریلا قسم کی لڑائی لڑتے رہے۔

یہاں میں آپ کو ایک دلچسپ بات سناتا ہوں جو شاید بہت سے قارئین نے پہلے سنی نہ ہو گی۔ اگر میں کہوں کہ ناگا اور میزو قبائل کا رابطہ ہمارے قبائلی پٹھانوں کے ساتھ تھا تو آپ حیران ہوں گے کہ یہ کیسے ممکن ہُوا۔ یہ رابطہ یا تعلق اس طرح تھا کہ صوبہ سرحد سے چرس اور افیون منوں کے حساب سے سمگل ہو کر کراچی پہنچتی تھی۔ سمگلر وہاں سے بحری جہازوں میں یہ مشرقی پاکستان تک پہنچاتے تھے۔ اس کے عوض وہاں یا کراچی میں ہی بین الاقوامی سمگلر رائفلیں، مشین گنیں، گرینیڈ اور دیگر ایمونیشن فراہم کرتے تھے۔ یہ اسلحہ مشرقی پاکستان سے سمگل ہو کر ناگا اور میزو قبائل تک پہنچتا تھا۔ یہ کاروبار پاکستان اور ہندوستان کے سمگلر کرتے تھے اور اس سے انہوں نے بے تحاشہ دولت کمائی تھی۔ اُدھر برما اڑھائی تین سال میدانِ جنگ بنا رہا تھا۔ جاپانیوں، انگریزوں، امریکیوں اور ہندوستانیوں کے بے انداز افسر اور جوان مارے گئے تھے۔ گھنے جنگلوں میں

پہنچا تو اس کی صورت یہ بن گئی جیسے وہ ناگے انسان نہیں بلکہ جنات یا اس جنگل کے بھوت پریت تھے جو اچانک نمودار ہوئے اور ایک نوجوان مزدور کو اٹھا کر کہیں غائب ہو گئے۔ یہ بھی سنا سنایا گیا کہ دو تین مزدور ان کے تعاقب میں ان تک پہنچ گئے تھے۔ ناگوں نے پیچھے مڑ کر انہیں دیکھا تو یہ سارے مزدور بغیر ہاتھ لگائے چکرا کر گرے اور بے ہوش گئے۔ یہ ایک مبالغہ تھا۔

راستے اور سڑکیں بنانے کے کام کی نگرانی انگریز افسر کر رہے تھے جن کا تعلق انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ تھا۔ انگریز بیدار مغز قوم تھی اور انہوں نے آدھی دنیا پر حکومت جو کی تھی، یہ ان کی دانشمندی کا نتیجہ تھا۔ دانشمندی یہ کہ انگریز جس ملک میں جاتے تھے، وہاں کے ملک کے لوگوں کی نفسیات، نظریات اور ان کے معاشرتی امور کو سمجھ لیتے اور ان کے ساتھ ان کے مطابق سلوک اور برتاؤ کرتے تھے۔ اس طرح وہ اس ملک کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا کر انہیں غلام بنا لیتے تھے۔

انگریز افسروں کو پتہ چلا کہ کچھ ناگے لوگ ایک مزدور کو اٹھا کر لے گئے ہیں تو انہوں نے ان وحشی لوگوں کے خلاف فوج استعمال نہ کی بلکہ ان تک پہنچے۔ میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ ان انگریزوں نے کس طرح ان ناگوں کو رام کیا، میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ انگریزوں نے ان پر کوئی تشدد نہیں کیا تھا۔ یہ دیکھا گیا کہ جب انگریز افسر واپس آئے تو ان کے ساتھ سینکڑوں ناگے تھے۔ انہیں انگریز مزدوری کے لئے ساتھ لے آئے تھے۔

یہ مزدوروں کا ایک الگ لشکر بن گیا جس میں صرف ناگے تھے اور جب انہوں نے کام شروع کیا تو پتہ چلا جیسے یہ انسان نہیں بلکہ مشینیں ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے سڑکوں اور پگڈنڈیوں کے لئے جنگل صاف کر دیئے اور پہاڑیاں کاٹ ڈالیں۔ ان کی خوراک اپنی ہی تھی۔ وہ چھپکلی سے لے کر گیدڑ اور بھیڑیئے تک کو پکڑ کر کھا جاتے تھے۔ ان کی اپنی کچھ شرائط تھیں۔ ان میں سے نہایت دلچسپ شرط یہ تھی کہ وہ نوٹوں کی شکل میں اپنی اُجرت وصول کرتے تھے۔ ان دنوں روپیہ سکّے کی صورت میں زیادہ چلتا تھا لیکن ناگے سکّہ قبول نہیں کرتے تھے۔ وہ پانچ روپے، دس روپے اور سو روپے کا نوٹ لیتے تھے لیکن کوئی نوٹ ذرا سا بھی مُڑا تُڑا ہوتا تو وہ نہیں لیتے تھے۔ کہتے تھے کہ بالکل نئے نوٹ لیں گے۔ لہٰذا ان کے لئے بالکل نئے نوٹ لائے جاتے تھے۔

جس مزدور کو وہ اٹھا کر لے گئے تھے، اسے انہوں نے کھا پی لیا تھا۔ معلوم ہُوا تھا کہ

ہر طرف اسلحہ اور ایمونیشن بکھرا پڑا تھا۔ برما کے ڈاکو مشہور ہُوا کرتے تھے۔ ان لوگوں نے یہ اسلحہ اور ایمونیشن اکٹھا کر کے کہیں چھپالیا تھا۔ جنگ کے بعد انہیں اسلحہ کی منڈی مل گئی۔ یہ تھی ناگا اور میزو قبائل کی جنگِ آزادی۔ اس طرح برما کی طرف سے بھی ان قبائل کو اسلحہ بارود ملتا رہا۔

اب ان قبائل کی مسلح جنگ آزادی رک گئی ہے لیکن سیاسی میدان میں ان کی جنگ جاری ہے اور یہ لوگ ہندوستانی حکومت کے لئے ایک مسلسل مصیبت بنے ہوئے ہیں۔ ان کے نمائندے اسمبلیوں میں بھی پہنچ گئے ہیں۔ ان کا مطالبہ ہے ناگالینڈ کا قیام۔ ان کی دیکھا دیکھی بھوٹان کے لوگوں نے بھی کچھ عرصہ پہلے بغاوت کر دی تھی اور اعلان کیا تھا کہ وہ ہندوستان سے الگ ہو کر اپنی الگ مملکت بنائیں گے جس کا نام گورکھالینڈ ہو گا۔ ہندوستان نے کئی ڈویژن فوج ان علاقوں میں رکھی ہوئی ہے اور وہاں فوجیوں پر فائرنگ کے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔

اب دیکھئے کہ ان وحشی اور آدم خور ناگوں میں بیداری کس طرح پیدا ہوئی۔ میں نے بتایا ہے کہ یہ ناگے دشوار گزار پہاڑی اور جنگلاتی علاقے میں رہتے تھے۔ پہاڑیوں کے دامن میں بھی اور بلندیوں پر بھی۔ جنگِ عظیم برما میں بھی آ گئی تو انگریزوں کو وہاں سب سے بڑی جس دشواری کا سامنا ہُوا وہ وہاں کے جنگل اور پہاڑ تھے۔ ان میں سے پا پیادہ گزرنا بھی محال تھا لیکن اس دشوار گزار علاقے میں سے گاڑیاں گذارنی تھیں اور فوجوں نے نقل و حرکت کرنی تھی۔ اتنے چوڑے راستے بنانے تھے جن پر فوجی ٹرکوں اور ٹینکوں نے چلنا تھا۔ اگر فوجیوں کو اس کام پر لگا دیا جاتا تو لڑنے کے لئے کوئی فوجی نہ رہتا۔ اس کام کے لئے مزدور اکٹھے کئے گئے۔ یہ ایک سویلین فوج تھی جو آسام اور بنگال سے اکٹھی کی گئی تھی۔ اس فوج کے پاس دو ہی ہتھیار تھے۔ گینتی اور بیلچہ۔ ان مزدوروں کے رہنے اور کھانے کا انتظام وہیں جنگلوں میں کر دیا گیا تھا اور وہ دن بھر جنگل کاٹتے اور پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر راستے اور سڑکیں بناتے رہتے تھے۔

ایک روز اس مزدور فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ معلوم ہُوا کہ گھنے جنگل میں سے بالکل ننگ دھڑنگ آدمی نکلے اور ایک نوجوان مزدور کو اٹھا کر لے گئے۔ کچھ مزدوروں نے ان کا پیچھا کیا لیکن وہ ناگے بالکل ہی غائب ہو گئے جیسے فضا میں تحلیل ہو گئے ہوں۔ وہاں ہزار ہا مزدور کام کر رہے تھے۔ ایک مزدور کے اغوا کا واقعہ تمام مزدوروں کے کانوں تک

یہ لوگ اپنے کسی خاص تہوار یا تقریب پر انسانی جان کی قربانی دیتے ہیں اور پھر اسے پکا کر کھا لیتے ہیں..... یہ ناگے مزدوری کرنے آئے تو ان کا تعلق تہذیب یافتہ دنیا کے لوگوں کے ساتھ پیدا ہُوا۔ آسام اور بنگال کے مزدور ان سے ڈرتے تھے لیکن آہستہ آہستہ ان کا خوف ختم ہو گیا۔ ان ناگوں نے آسامیوں اور بنگالیوں کے اثرات قبول کرنے شروع کر دیئے۔ پہلا اثر یہ قبول کیا کہ انہیں یوں برہنہ نہیں رہنا چاہئے۔ انہوں نے پہلا جو لباس پہنا وہ صرف ایک رسّی تھی جو کمر کے گرد باندھ لیتے تھے۔ پھر انہوں نے اس رسّی میں آگے اور پیچھے کپڑے کا ایک ایک ٹکڑا اُڑس لیا اور پھر انہوں نے کمر کے گرد کپڑا باندھنا شروع کر دیا۔ ان کی دیکھا دیکھی جو ناگے پہاڑیوں کی بلندیوں پر رہتے تھے' وہ بھی نیچے آنے لگے لیکن تمام کے تمام قبائل نیچے نہ آئے۔ وہ اپنا رہن سہن اور تمدن جیسا کیسا بھی تھا' چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔

جنگ ختم ہو گئی تو یہ ناگے واپس تو چلے گئے لیکن اب وہ ناگے نہیں رہے تھے۔ وہ اب اپنا ستر ڈھانپ کر رکھتے تھے اور بعض نے تو لباس بھی پہننا شروع کر دیا تھا۔

جنگ عظیم نے کئی پسماندہ قوموں میں سیاسی اور ذہنی بیداری پیدا کر دی اور ان میں آزادی کی تڑپ آ گئی۔ انہیں لیڈر شپ مل گئی۔ جنگ عظیم کے بعد کی تاریخ پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ بے شمار چھوٹے چھوٹے ملک جو استعماری طاقتوں کے قبضے میں ہُوا کرتے تھے' آزاد ہوئے۔ ان میں انڈونیشیا کی جنگ آزادی تاریخ کا ایک بہت ہی بڑا واقعہ ہے۔ پاکستان معرضِ وجود میں آیا اور افریقہ کے چھوٹے چھوٹے ملک بھی آزاد ہوتے چلے گئے۔ میں آگے چل کر آپ کو انڈونیشیا کی جنگ آزادی کی کہانیاں سناؤں گا جو میں اس لئے وثوق کے ساتھ سنا سکتا ہوں کہ میں خود اس جنگ آزادی میں شریک ہُوا تھا۔ انڈونیشیا کے مسلمانوں نے آزادی کے لئے جان و مال کی جو قربانیاں دی تھیں وہ ولولہ انگیز بھی ہیں اور حیران کن بھی۔

ان ناگوں کو بھی لیڈر مل گئے جو ان جیسے پسماندہ اور وحشی نہیں تھے بلکہ ان علاقوں کے رہنے والے پڑھے لکھے لوگ تھے۔ انہوں نے ناگوں کی ذہنی بیداری کو ایسا استعمال کیا کہ ان میں سیاسی بیداری پیدا کر دی۔ انہیں ننگے کی بجائے ناگے کہنے لگے اور ان کا اتحاد میزو قبائل کے ساتھ کر کے انہیں ایک قوم بنا دیا۔ یہ قوم جس طرح جنگِ آزادی کے محاذ پر ڈٹی ہوئی ہے' اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ اپنی آزاد مملکت' ناگالینڈ بنا کے

ہی رہیں گے۔

○

اب آیئے' میں آپ کو آدھی صدی پیچھے لے چلتا ہوں جہاں حوالدار فضل داد ان ناگوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اس وقت ناگے ناگے نہیں تھے بلکہ وحشی اور درندے تھے۔

فضل داد جھونپڑے میں بیٹھا ہُوا تھا۔ دن کا وقت تھا۔ اُس نے فرار ہونے کا ارادہ کر لیا تھا۔ وہ اٹھا اور دروازے کا جائزہ لیا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس نے دروازے کو ہاتھ لگایا اور ذرا سا دھکیلا۔ اس سے اسے اندازہ ہو گیا کہ دروازہ مضبوط نہیں۔ اگر وہ دروازے کو اپنے جسم کے دھکوں سے دھکیلتا تو دروازے کے تختے ٹوٹ سکتے تھے۔ وہ زور زور سے ٹُھڈے مار کر بھی دروازہ توڑ سکتا تھا لیکن اس نے ایسی جُرأت نہ کی۔ اسے معلوم تھا کہ باہر ناگے موجود ہیں وہ اسے فوراً پکڑ لیں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے مار ہی ڈالیں۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ شام کا کھانا تو کوئی لائے گا ہی۔ اگر وہ اکیلا ہُوا تو اس پر قابو پا لے گا اور اس کا گلا گھونٹ کر بھاگ جائے گا۔ اسے اپنا یہ پلان بھی اچھا نہ لگا کیونکہ وہ زہرہ خانم کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اس نے کمانڈو ٹریننگ لی ہوئی تھی۔ وہ اپنا ہر داؤ آزمانا چاہتا تھا اور اس کا یہ ارادہ بہت ہی مضبوط تھا۔

وہ فرار کے طریقے سوچ رہا تھا کہ اسے باہر سے دروازہ کھولنے کی آوازیں آئیں۔ وہ دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ دروازے کا کواڑ بڑی تیزی سے کھلا اور دو ناگے بہت ہی تیزی سے اندر آئے۔ ایک نے فضل داد کا ایک بازو اور دوسرے نے دوسرا بازو پکڑا اور اسے اٹھا لیا۔ اب فضل داد کھڑا تھا اور ایک ناگا اس کے ایک پہلو میں اور دوسرا دوسرے پہلو میں کھڑا ہو گیا تھا۔ دونوں نے اس کے بازو پکڑ رکھے تھے۔ ایک دو منٹ بعد دروازے میں ان کا سردار نمودار ہُوا۔ اس کے ہاتھ میں وہی ڈنڈا تھا جو فضل داد نے پہلے دیکھا تھا۔ یہ دو فٹ لمبا ڈنڈا تھا اور اس پر رنگ دار کپڑے کے ٹکڑے لپٹے ہوئے تھے۔ اس کے ایک سرے پر پرندوں کے رنگ دار پر لگے ہوئے تھے اور دوسرے سرے پر چھوٹی چھوٹی دو گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ زہرہ بھی تھی۔

زہرہ خانم کو زندہ اور سلامت دیکھ کر فضل داد کو اطمینان ہُوا۔ وہ اب اس سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ گزشتہ رات کیا سلوک ہُوا لیکن یہ پوچھنے کی مہلت نہ

دی گئی۔ ہُوا یہ کہ جن دو ناگوں نے اسے پکڑ رکھا تھا' انہوں نے ایک تو اس کے بازو نیچے کو کھینچے جیسے اسے بٹھانا چاہتے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس کے سر اور گردن پر ہاتھ رکھ کر نیچے کو دبایا۔ وہ کچھ کہہ بھی رہے تھے۔ ایک ناگے نے اسے چھوڑ کر سجدہ کیا اور فوراً اٹھ کھڑا ہُوا۔ پھر اس نے فضل داد کو اشارہ کیا کہ وہ بھی سجدہ کرے۔ ان کا سردار زہرہ خانم کے ساتھ دروازے میں ہی رک گیا تھا۔

فضل داد اس کے آگے سجدہ نہیں کر رہا تھا۔ وہاں مسئلہ زبان کا تھا۔ اگر ناگوں کا سردار فضل داد کی زبان سمجھ سکتا تو فضل داد اسے بتاتا کہ ہم ایک اللہ کے سوا کسی کے آگے سجدہ نہیں کیا کرتے۔ کہنے کی بجائے فضل داد نے ہاتھ اوپر کر کے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور نفی میں سر ہلایا۔ اس اشارے سے وہ اپنا مطلب واضح کرنا چاہتا تھا جو نہیں ہو رہا تھا۔ دونوں ناگوں نے اس کا سر پھر نیچے کو دبانا شروع کر دیا۔

سردار دروازے میں ہی کھڑا فضل داد کو چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔ فضل داد نے دیکھا کہ سردار کے ہونٹوں پر تبسّم سا تھا۔ اس کے چہرے پر غصے کا ہلکا سا بھی تاثر نہیں تھا۔

ہم جب فوج میں بھرتی ہوئے تھے تو ہمیں فوجی ٹریننگ دی گئی تھی جو مکمل سمجھی جاتی تھی لیکن جنگ کے دوران اس ٹریننگ میں کچھ اضافے ہوئے تھے۔ ان میں لڑائی کا ایک اور طریقہ بھی شامل تھا۔ اسے Unarmed Combat کہتے تھے۔ مطلب یہ کہ آپ کے پاس کوئی ہتھیار نہیں اور دشمن کے ایک دو فوجی آپ کے سامنے آ جاتے ہیں۔ ان کے پاس رائفلیں ہیں جن پر سنگینیں چڑھی ہوئی ہیں۔ ہمیں داؤ سکھائے گئے تھے کہ خالی ہاتھ مسلح دشمن کے خلاف کیسے لڑنا ہے۔ اسے بے ہتھیار کی لڑائی کہا گیا تھا۔ فضل داد نے ایک تو یہ ٹریننگ لی تھی اور اس کے علاوہ اسے گوریلا اور کمانڈو ٹریننگ بھی دی گئی تھی۔ جھونپڑے میں دو ناگے اس کا سر جھکانے کی کوشش کر رہے تھے۔

فضل داد نے یہ داؤ کھیلا کہ اپنے دونوں بازو آگے کو کئے اور دائیں بازو کی کہنی دائیں والے ناگے کے پیٹ میں اور بائیں بازو کی کہنی بائیں طرف والے ناگے کے پیٹ میں اتنی زور سے ماری کہ دونوں ناگوں نے اس کا سر چھوڑ دیا اور وہ اپنے پیٹوں پر ہاتھ رکھ کر دوہرے ہو گئے۔ فضل داد نے دونوں کی گردنوں پر ہاتھ رکھے اور پہلے انہیں ذرا پیچھے ہٹایا پھر بڑی زور سے اس نے دونوں کو آگے جھٹکا دیا اور ان کے سر آپس میں ٹکرائے۔ دونوں سیدھے ہو گئے اور چکرانے لگے۔ فضل داد نے ایک بار پھر دونوں کی

گردنوں کے پیچھے ہاتھ رکھے اور دونوں کے منہ اور ماتھے آپس میں پہلے کی طرح اور زور سے ٹکرائے۔ دونوں ناگے چکرائے۔ ایک تو گر ہی پڑا اور دوسرا اس طرح ڈولنے ڈگمگانے لگا جیسے کسی نشے میں ہو۔

"نہیں فضل داد!" —— زہرہ خانم نے گھبرا کر کہا —— "یہ لوگ تمہیں مار ڈالیں گے"۔

فضل داد نے ان کے سردار کی طرف دیکھا۔ سردار کے ہونٹوں پر ہلکا سا جو تبسّم تھا وہ اب کھلی ہوئی مسکراہٹ بن گیا تھا۔

سردار اور زہرہ خانم کے پیچھے دو اور ناگے کھڑے تھے جن کے ہاتھوں میں بانسوں کی برچھیاں تھیں۔ جب فضل داد نے اندر والے دونوں ناگوں کے پیٹوں میں کہنیاں ماری تھیں تو باہر کھڑے دونوں ناگے برچھیاں تان کر اندر آنے لگے تھے۔ وہ فضل داد کو برچھیاں مارنا چاہتے تھے یا ان کا ارادہ فضل داد پر قابو پانے کا تھا۔ وہ آگے ہونے لگے تو سردار نے اپنے بازو دائیں اور بائیں پھیلا کر انہیں باہر ہی روک لیا۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے آدمیوں میں کتنی طاقت ہے اور کیا وہ اس آدمی فضل داد کا مقابلہ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اس کے چہرے سے یہ بھی پتہ چلتا تھا جیسے فضل داد نے جو داؤ چلائے تھے' یہ سردار کو بہت اچھے لگے تھے۔

دونوں ناگے سنبھل کر سیدھے ہوئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک نے دوسرے سے کچھ کہا اور دونوں نے یہ حرکت کی کہ ایک جھونپڑے کی ایک طرف کی دیوار تک چلا گیا اور دوسرا سامنے والی دیوار کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ فضل داد جھونپڑے کے وسط میں کھڑا دونوں کو دیکھتا رہا۔ دونوں نے گھونسے تو نہ تانے' یوں کیا کہ اپنے ہاتھ آگے کئے۔ ان کی انگلیاں کھلی ہوئی اور ذرا آگے کو مڑی ہوئی تھیں جیسے وہ دونوں فضل داد کو پنجے مارنا چاہتے ہوں۔ دونوں تیزی سے فضل داد کی طرف دوڑے۔ وہ درندوں کی طرح دانت نکال کر پیس رہے تھے۔ جب وہ فضل داد کے قریب آئے تو فضل داد ایک قدم پیچھے ہٹا' ایک ہاتھ ایک کی گردن پر اور دوسرا ہاتھ دوسرے کی گردن پر رکھ کر اندر کو دبایا۔ دونوں پہلے ہی دوڑے آ رہے تھے' فضل داد کے ہاتھوں نے ان کی رفتار اور تیز کر دی اور وہ آپس میں بڑی زور سے ٹکرائے۔ ایک بار پھر ان کے منہ اور ماتھے ایک دوسرے سے ٹکرائے اور دونوں تیورائے اور ان کے سر ڈولنے لگے۔

وہ دونوں فضل داد کے مقابلے میں یقیناً" طاقتور تھے لیکن انہیں وہ داؤ معلوم نہیں تھے جو فضل داد کھیل رہا تھا۔

وہ دونوں ذرا سنبھلے اور فضل داد کو قہر بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ سردار نے گرج کر ایک ہی لفظ کہا تو دونوں فوراً" پیچھے ہٹ گئے۔ سردار نے فضل داد کو ڈنڈے سے اشارہ کیا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ بیٹھ جاؤ۔

"فضل داد!" —— زہرہ خانم نے کہا —— "گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ جاؤ"۔

فضل داد زمین پر دو زانو ہو گیا۔ سردار آگے بڑھا اور اپنے ڈنڈے کا پروں والا سرا اس کے ایک کندھے سے لگایا پھر دوسرے کندھے سے لگایا اور پھر ڈنڈے کا سرا اس کے سر پر آہستہ سے رکھا۔ اس نے کچھ کہا بھی جو فضل داد نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ اتنا ہی سمجھ سکا کہ سردار غصے میں نہیں اور اس نے اسے شاباش دی ہے۔

اس کے بعد سردار نے اپنا ڈنڈہ درمیان سے پکڑا اور بازو لمبا کر کے ڈنڈہ فضل داد کے سر سے ذرا اوپر لایا اور پھر اس کے ہاتھ بڑی زور سے کانپنے لگے اور ڈنڈے کے دوسرے سرے پر لگی ہوئی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ کچھ دیر بعد سردار نے ڈنڈہ پیچھے کر لیا اور دایاں ہاتھ فضل داد کی طرف بڑھایا۔ فضل داد نے یہ سمجھ کر وہ اس کے ساتھ ہاتھ ملانا چاہتا ہے' اپنا ہاتھ آگے کیا جو سردار نے اپنے ہاتھ میں لے کر عجیب سے طریقے سے مصافحہ کیا۔ پھر اس نے فضل داد کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

"زہرہ!" —— فضل داد نے زہرہ خانم سے پوچھا —— "کیا تم کچھ سمجھ سکتی ہو کہ اس کا مطلب کیا ہے؟"

"میرا خیال ہے میں سمجھ گئی ہوں" —— زہرہ خانم نے جواب دیا —— "میں کل سے اسے اشاروں سے سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ یہ ہمیں زندہ رہنے دیں اور ہم دونوں کو آزاد کر دیں۔ اگر میں اس کے اشارے سمجھ گئی ہوں تو یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ ہمیں آزاد نہیں کرے گا لیکن تمہیں قیدی نہیں رہنے دے گا اور جان سے مارے گا بھی نہیں۔ میں یہ بھی سمجھی ہوں کہ اس شخص نے مجھے کوئی اونچا درجہ دے دیا ہے۔ درجہ یہی ہو سکتا ہے کہ یہ مجھے اپنی بیوی بنا لے گا"۔

"دعا کرو یہ مجھے زندہ رہنے دے"۔ فضل داد نے کہا —— "میں تمہیں یہاں سے نکال لے جانے کی پوری کوشش کروں گا"۔

فضل داد نے مجھے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ وہ جب زہرہ سے ہمکلام تھا تو سردار خاموشی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس سے فضل داد کو یہ اطمینان ہُوا کہ زہرہ خانم کے ساتھ باتیں کرنے پر سردار کو اعتراض نہیں اور یہ بھی کہ وہ بڑے اچھے موڈ میں ہے۔

سردار نے اچھے موڈ کا ایک مظاہرہ یہ بھی کیا کہ اس نے زہرہ خانم کی طرف دیکھا اور مسکرا کر سر کو ہلکی سی اوپر نیچے کو جنبش دی۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ اس نے زہرہ خانم کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی اور شاید اسے یہ کہا تھا کہ تمہارے ساتھی کو اس نے قیدی نہیں رہنے دیا۔ فضل داد نے اپنے دل میں کچھ ایسی امید بھی رکھ لی تھی جیسے سردار اسے رہا کر دے گا لیکن اس کے بعد سردار نے ڈنڈے سے اور سر اور ہاتھوں سے جو اشارے کئے' ان سے پتہ چلتا تھا کہ اسے چھوڑا نہیں جائے گا۔ فضل داد نے سوچا کہ اسے چھوڑا نہ جائے لیکن قید میں نہ رکھا جائے۔ اس طرح اس کا اپنا فرار تو ممکن ہو سکتا تھا لیکن وہ زہرہ خانم کو بھی وہاں سے نکالنا چاہتا تھا۔

سردار وہاں سے چلا گیا اور جھونپڑے کا دروازہ کھلا رہ گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ فضل داد اب قیدی نہیں تھا۔ وہ دونوں ننگے جو فضل داد کے پاس جھونپڑے میں گئے تھے اور اسے سجدہ کرانے کے لئے اس کا سر نیچے کر رہے اور پھر فضل داد سے مار کھائی تھی' وہ فضل داد کو قہر کی نظروں سے دیکھتے ہوئے سردار کے پیچھے چلے گئے۔

فضل داد نے یہ جگہ ایک روز پہلے بھی دیکھی تھی لیکن اُس وقت وہ ایسی حالت میں تھا کہ گردوپیش کی ہر ایک چیز نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے اور اسے ایک مُردہ جانور کی طرح لایا گیا تھا۔ پھر اسے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا گیا اور اس کے بعد اسے جھونپڑے میں قید کر دیا گیا تھا۔ اب وہ ایک آزاد آدمی کی حیثیت سے اس جگہ کا جائزہ لینے لگا۔ وہ دراصل فرار کا راستہ دیکھ رہا تھا۔ یہ تو میں کہہ چکا ہوں کہ وہاں سے فرار کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ کوئی جیل خانہ تو نہیں تھا لیکن اس نے زہرہ خانم کو بھی ساتھ لے جانا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھنا تھا کہ زہرہ خانم کو کہاں رکھا گیا ہے۔

اس نے مجھے سنایا کہ وہ جگہ کسی پہاڑی کی بالائی جگہ تھی اور اس کے ساتھ ہی پیچھے کی طرف اس سے اونچی پہاڑی کھڑی تھی جس جگہ وہ کھڑا تھا وہ کشادہ اور ہموار تھی۔ یوں پتہ چلتا تھا کہ یہ جگہ درخت کاٹ کر ان لوگوں نے خود بنائی ہے۔ ایک طرف ایک

چبوترہ بنا ہُوا تھا۔ اس کے اردگرد اور ہر طرف اونچے نیچے درخت تھے۔ پھولدار پودے بھی تھے۔ دیکھنے کو یہ جگہ بڑی خوشنما اور صحت افزا تھی لیکن فضل داد نے بتایا کہ اس کے دل پر ایک خوف سا بیٹھ گیا تھا۔ خوف اس لئے کہ اس حسین اور دلنشین منظر میں کہیں کہیں کالی کالی اور گول گول چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ ان چٹانوں کی وجہ سے یوں لگتا تھا جیسے وہ کوہ قاف ہے جہاں جن بھوت اور پریاں رہتی ہیں۔

وہ جگہ تو یقیناً" خوبصورت تھی' میں نے ایسی کئی جگہیں دیکھی تھیں جہاں اس طرح کی بدرنگ اور بدصورت چٹانیں بھی ہیں اور ان کے اردگرد سبزہ زار بھی ہیں لیکن فضل داد جو کچھ محسوس کر رہا تھا' یہ اس کی ذہنی حالت تھی۔ وہ ایک تجربہ کار کمانڈو تھا اور وہ اپنے مشن پر آیا تھا لیکن برما کے جنگلوں میں آ کر اُلجھ گیا۔ زہرہ خانم نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ وہ انسان ہے لیکن کسی کسی وقت فضل داد کو پھر بھی شبہ ہونے لگتا تھا کہ یہ عورت انسان نہیں' کوئی اور ہی مخلوق ہے۔ اسے یہ شبہ تھوڑی سی دیر کے لئے ہوتا اور پھر اس ذہن صاف ہو جاتا تھا۔ یہ میرا تجزیہ ہے کہ یہ ننگے اس کے لئے عجیب و غریب مخلوق تھی۔ کبھی تو اسے شک ہوتا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے۔

○

اس نے دیکھا کہ چند ایک ننگے چبوترے پر صفائی کر رہے تھے اور چبوترے کے آگے جو جگہ خالی اور ہموار تھی اس میں بھی کہیں کہیں مٹی یا چھوٹے چھوٹے پتھر ڈال کر ہموار کر رہے تھے۔ ان ننگوں میں عورتیں بھی تھیں۔ وہ بھی برہنہ تھیں۔ فضل داد نے افریقہ کے حبشیوں کی باتیں سنیں تھیں اور ان کی آدم خوری وغیرہ سنی تھی اور اس نے حبشی دیکھے بھی تھے۔ جنگِ عظیم میں حبشیوں کے الگ بریگیڈ تیار کئے گئے تھے۔ کلکتہ میں پہلی بار فضل داد نے حبشی دیکھے تھے۔ وہ تو بہت ہی بھدے اور بدصورت تھے لیکن ان کے مقابلے میں ننگے اتنے سیاہ رنگ کے نہیں بلکہ گندمی رنگت والے تھے اور ان کے چہروں کے نقوش بھی اچھے تھے جیسے ہمارے ہوتے ہیں۔ ان میں بعض عورتیں تو صاف رنگت اور بڑے اچھے نقش و نگار والی تھیں لیکن فضل داد انہیں اس طرح نہیں دیکھتا تھا جس طرح ہم لوگ ایک عورت کو دیکھا کرتے ہیں۔

فضل داد ٹہلتا چلا گیا اور اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ ننگے رک کر اور کام چھوڑ کر اسے دیکھتے' آپس میں کچھ بات کرتے اور کام میں لگ جاتے تھے۔ عورتیں بھی اسے دیکھتی

تھیں، مسکراتیں اور آپس میں تبصرہ کر کے اپنی راہ لگ جاتی تھیں۔ ان کے لئے فضل داد عجیب مخلوق تھا۔

وہ کسی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ ان کا سردار کہاں رہتا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ جہاں سردار ہو گا وہیں زہرہ خانم ہو گی۔ وہ جگہ یا جھونپڑا دیکھ کر اس نے پلان بنانا تھا کہ زہرہ خانم کو وہاں سے کس طرح نکالے..... وہ خراماں خراماں آگے چلا گیا تو یکلخت منظر بدل گیا۔ وہ رک گیا۔ اس نے اپنے آپ کو بلندی پر کھڑا پایا اور اس کے سامنے نیچے ایک وادی تھی جس میں کچھ جھونپڑے بنے ہوئے تھے۔ یہ بکھرے ہوئے جھونپڑے تھے۔ دائیں طرف ایک راستہ نیچے اترتا تھا۔ وہ ایک اور طرف چل پڑا۔ کچھ آگے جا کر اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے جو منظر ہے وہ تو اور ہی زیادہ دل نشین اور خوشنما ہے۔ ذرا بلندی پر ایک جھونپڑا تھا جو دوسرے تمام جھونپڑوں سے زیادہ اچھا تھا۔ اس کے اردگرد بڑے خوشنما درخت تھے جن کی بلندی زیادہ نہیں تھی۔ انہوں نے جھونپڑے کے اوپر جا کر جھونپڑے پر سایہ کر رکھا تھا۔ ایک ناٹا تراشے ہوئے بانس کی برچھی ہاتھ میں لئے ہوئے اس جھونپڑے کے دروازے کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس ناٹگے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ یہاں سنتری کی ڈیوٹی دے رہا ہے۔ سنتری ٹہلتے ٹہلتے جھونپڑے کے ساتھ ساتھ دروازے سے ذرا پرے چلا گیا اور اچانک رک کر پیچھے کو مڑا اور دوڑ کر دروازے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اندر سے کوئی باہر آنے والا ہے۔

دروازہ کھلا تو زہرہ خانم باہر آئی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کا، افسوس کا یا گھبراہٹ کا کوئی تاثر نہیں تھا اور کوئی ایسا تاثر بھی نہیں تھا کہ وہ خوش نظر آتی۔

زہرہ خانم نے نیچے فضل داد کو کھڑے دیکھا تو وہ اندر چلی گئی۔ ذرا ہی دیر بعد وہ واپس آئی اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے فضل داد کو اوپر بلایا۔ اوپر جانے کے لئے اس ٹیکری کو کاٹ کاٹ کر ان لوگوں نے سیڑھیاں سی بنا رکھی تھیں۔ فضل داد بڑی تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گیا اور جب دروازے کے قریب پہنچا تو زہرہ خانم نے اسے کہا کہ سردار اندر بلا رہا ہے۔ فضل داد اندر چلا گیا۔

"یہاں تمہارے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے" ـــــ فضل داد نے زہرہ خانم سے پوچھا ـــــ "سلوک اچھا نہیں ہو گا!"

"وہ سلوک نہیں ہو رہا جس کا مجھے ڈر تھا" ـــــ زہرہ خانم نے کہا ـــــ "یہ تو اس طرح میری عزت کرتے ہیں جیسے میری پوجا کر رہے ہوں۔ انہوں نے شاید مجھے اپنی دیوی بنا لیا ہے"۔

فضل داد وہاں اس کے ساتھ زیادہ باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ زہرہ خانم نے اسے کہا کہ اس سردار کے آگے دو زانو بیٹھ جاؤ۔ سردار فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس نے گردن اکڑا رکھی تھی اور چہرے پر رعب کے تاثرات تھے۔ وہ فضل داد پر یہ تاثر پیدا کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس دنیا کا بادشاہ ہے۔

سردار نے ہاتھوں کے بہت اشارے کئے۔ کبھی وہ زہرہ خانم کی طرف اشارہ کر کے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیتا اور اس نے اس قسم کے اشارے بھی کئے جن سے فضل داد یہ سمجھا کہ زہرہ خانم کے متعلق وہ کہہ رہا ہے کہ یہ عورت اب اس کی ہے اور اسے بڑا اونچا رتبہ دے کر رکھا جائے گا اور تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی اور ہم تمہیں احترام سے رکھیں گے۔

فضل داد کو یہی اطمینان کافی تھا کہ اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ جب سردار کوئی بات اشاروں میں ختم کرتا تو فضل داد زہرہ خانم کے ساتھ ایک آدھ بات کر لیتا تھا۔ وہ زہرہ خانم سے کہتا تھا کہ یہاں سے فرار ہونا ہے اور زہرہ خانم اسے کہتی تھی کہ یہ تمام علاقہ ان لوگوں کا ہے اور یہ لوگ جنگلی جانوروں اور درندوں کی طرح اس سارے جنگل میں پھیلے ہوئے ہیں۔

"ایک بات صاف صاف بتا دو زہرہ!" ـــــ فضل داد نے پوچھا ـــــ "کیا تم یہاں سے نکلنا چاہتی ہو یا ان کی دیوی یا ملکہ بن کر یہیں خوش رہو گی؟"

"اگر ممکن ہو تو مجھے ابھی یہاں سے لے چلو" ـــــ زہرہ خانم نے کہا ـــــ "تم کیا یہ سمجھتے ہو کہ میں ان جنگلیوں کے ساتھ رہنا پسند کروں گی؟"

"میں نے محسوس کیا ہے کہ تم یہاں مطمئن ہو گئی ہو" ـــــ فضل داد نے کہا۔

"میں روؤں گی تو کیا یہ لوگ مجھے چھوڑ دیں گے؟" ـــــ زہرہ خانم نے کہا ـــــ "یہاں آ کر میں بہت روئی تھی، اس سردار کے قدموں میں سجدہ بھی کیا تھا اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر اسے کہا تھا کہ ہم دونوں کو آزاد کر دے لیکن یہ جنگلی پہلے تو میرے سر اور پیٹھ پر تھپکیاں دے دے کر بہلاتا رہا اور جب دیکھا کہ مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تو اس نے تلوار

نکال لی اور مجھے بٹھا کر میرا سر جھکایا اور تلوار میری گردن پر رکھ دی۔ پھر اس نے میرے بال پکڑ کر مجھے اٹھایا اور اس طرح اشارے کئے جیسے میں نے رونا بند نہ کیا تو یہ مجھے بالوں سے درخت کے ساتھ باندھ دے گا اور مجھے برچھیاں ماری جائیں گی..... تم فرار کی ترکیب سوچو پھر مجھے بتا دینا' میں اپنی جان دے دوں گی لیکن ان جنگلیوں میں نہیں رہوں گی"۔

زہرہ خانم نے فضل داد سے کہا کہ سردار کے سامنے غصے کا اظہار نہ کرنا اور چہرے سے یہ ظاہر ہوتا رہے کہ تم نے اس کی غلامی قبول کر لی ہے اور یہاں ہم دونوں خوش ہیں۔

○

فضل داد نے مجھے چھوٹی چھوٹی باتیں بہت سنائی تھیں جو میں نے سنانی شروع کر دیں تو خواہ مخواہ بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ میں آپ کو بڑے واقعات سنانا چاہتا ہوں۔ میں یہ بھی بتا دوں کہ جب فضل داد مجھے یہ باتیں سنا رہا تھا تو کبھی کبھی مجھے شک ہوتا تھا کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ فوجیوں میں یہ ایک خصلت پائی جاتی ہے کہ بارکوں میں تنہائی کی زندگی گزارتے گزارتے کچھ ایسے بور ہونے لگتے ہیں کہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ دل بہلایا جائے۔ اکثر فوجی اپنے عشق و محبت کے من گھڑت قصے سنایا کرتے ہیں۔ مثلاً" معمولی سا ایک سپاہی سناتا ہے کہ اس کے گاؤں کے نمبردار کی بیٹی اس پر مرمٹی تھی۔ پھر وہ اس سے ملاقاتوں کی کہانیاں سناتا ہے۔ فوجیوں اور دیہاتیوں کے ہاں یہ رواج بھی ہے کہ وہ جب کوئی واقعہ سناتے ہیں تو اس میں زیب داستان اور مبالغہ ضرور جاتا ہے اور اسے وہ بہت ہی سنسنی خیز بنا دیتے ہیں۔ ان لوگوں کو من پسند افواہیں بہت اچھی لگتی ہیں پھر ان میں سے ہر ایک بندہ ان افواہوں میں مزید سنسنی خیزی اور اسرار پیدا کر کے آگے سناتا ہے۔

میں کبھی کبھی یہ سمجھتا تھا کہ فضل داد پر اس جنگل نے ایسا اثر کیا ہے کہ یہ شخص تصورات کی دنیا میں چلا گیا ہے۔ صحرا میں ایسے ہی ہوتا ہے کہ تھکا ہارا اور پیاس کا مارا مسافر قدم گھسیٹتا جاتا ہے اور اس کا ذہن اسے نخلستان اور پانی کی جھیلیں دکھاتا ہے۔ پھر یہ مسافر اس سراب کے تعاقب میں چلتا ہی رہتا ہے حتیٰ کہ گرتا اور مرجاتا ہے۔ میں یہ سمجھا تھا کہ فضل داد اپنے ذہن کی دنیا کی باتیں سنا رہا ہے لیکن بہت عرصہ بعد جب میں

واپس اپنے گاؤں آیا تو فوجیوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ پھر گزرے وقتوں میں بہت فوجی ملے جن میں سے بعض برما میں لڑے تھے اور بعض آسام کے ان علاقوں میں بھی گئے تھے جو ان ناگوں کا علاقہ تھا۔ ان فوجیوں میں سے بعض نے مجھے ان ناگوں کے قصے سنائے تھے۔ فضل داد جب اپنی آپ بیتی سنا رہا تھا اور مجھے اس پر شک ہوتا تھا اور مجھے ان فوجیوں کی سنائی ہوئی باتیں یاد آجاتی تھیں اس لئے میرا شک رفع ہو جاتا تھا۔ ان فوجیوں نے ناگوں کو دیکھا تھا اور ان کی درندگی' آدم خوری' کھوپڑی پرستی اور ان کے رہن سہن کی باتیں صرف سنی تھیں۔ اس کے برعکس فضل داد ان کی خوفناک اور پُراسرار دنیا کے اندر چلا گیا تھا یا لے جایا گیا تھا۔ فضل داد نے سردار کے جھونپڑے کے اندر پانچ انسانی کھوپڑیاں دیکھیں جو بڑے قرینے سے رکھی تھیں۔ تین نیچے اور دو ان کے اوپر رکھی ہوئی تھیں۔

فضل داد نے وہ دن کچھ گھومتے پھرتے اور باقی جھونپڑے میں لیٹے اور بیٹھے گزار دیا۔ سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے فضل داد باہر نکلا کیونکہ اسے باہر کوئی بڑی سرگرمی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ بہت سے ناگے چبوترے پر کپڑے بچھا رہے تھے اور اس کے سامنے جو جگہ تھی اسے صاف بھی کر رہے تھے۔ چبوترے سے چند گز دور ایک بڑا وزنی پتھر رکھ دیا گیا تھا جو فضل داد سمجھ نہ سکا کہ یہ کیوں رکھا گیا ہے۔ پہاڑی اور جنگلاتی علاقے سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے ہی تاریک ہو جاتے ہیں کیونکہ سورج بڑے پہاڑوں کے پیچھے چلا جاتا ہے۔

شام ہوتے ہی چبوترے پر اور چبوترے کے سامنے میدان کے چاروں کونوں پر بانس ٹھونک کر ان پر مشعلیں لگا دی گئی تھیں۔ ان پر بندھے ہوئے کپڑوں کو تیل میں بھگویا گیا ہو گا۔ یہ تیل ان کپڑوں کو جلا رہا تھا۔ ایک مشعل اس گول پتھر کے قریب گاڑی گئی تھی جو وہاں رکھا گیا تھا۔ ان کی روشنی اتنی زیادہ تھی کہ رات کو دن بنا دیا گیا تھا۔

ناگے اس کشادہ جگہ کے ارد گرد اکٹھے ہونے لگے تھے اور ان کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی۔ وہ سب آتے اور خاموشی سے بیٹھتے چلے جاتے تھے۔ بعد میں آنے والوں کو جگہ نہ ملی تو وہ بلند جگہوں پر جا بیٹھے اور ان میں سے کچھ درختوں کے مضبوط ٹہنوں پر چڑھ گئے۔ فضل داد سمجھ گیا کہ آج ان کی کوئی خاص تقریب ہے۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔

چار ناگے نقاروں کی طرح کے چار ڈھول یا ڈرم اٹھائے ہوئے آئے اور چبوترے کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی چھڑیاں تھیں جن سے یہ ڈرم بجائے جاتے تھے۔ کسی نے اعلان کے انداز سے دو تین لفظ بلند آواز سے کہے۔ تمام ناگے جو کھڑے تھے یا بیٹھے تھے، بالکل ہی چپ ہو گئے اور یوں لگا جیسے سب مر گئے ہوں۔ انہوں نے سر جھکا لئے۔ اچانک ایک گونج سی سنائی دی جو بلند ہوتی چلی گئی۔ ان تمام ناگوں نے کوئی گیت گانا شروع کر دیا تھا۔ کسی ایک بھی ناگے کی آواز دوسروں سے الگ تھلگ سنائی نہیں دیتی تھی۔

فضل داد نے مجھے اپنے اُس وقت کے تاثرات یوں سنائے کہ اُس نے قوالیاں بھی سنی تھیں اور ایسی قوالیاں سنی تھیں جنہوں نے اس کی جذباتی دنیا میں زلزلے بپا کر دیئے تھے۔ اس نے اپنے ہاں ایک سے ایک سریلی آواز والے گویّوں کے گانے سنے تھے اور پھر فلمی گانے تو اس نے بہت ہی سنے تھے لیکن ان ناگوں کے گیت کی گونج میں کچھ ایسا تاثر تھا کہ اس پر خمار سا طاری ہونے لگا اور اس کا وجود اپنے آپ ہی درخت کی ٹہنیوں کی طرح ہلنے لگا۔ یہ وجد کی کیفیت تھی جو فضل داد پر طاری ہو گئی تھی۔ وہ اپنے جھونپڑے کے سامنے کھڑا تھا۔ چونکہ وہ جگہ بلند تھی اس لئے سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔

ایک طرف سے سردار زہرہ خانم کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا سامنے آیا۔ اس کا حلیہ تو وہی تھا جو فضل داد نے پہلے دیکھا تھا لیکن زہرہ خانم کو دیکھ کر وہ چونکا۔ زہرہ خانم کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں تھا لیکن اُس کا ستر بے پردہ بھی نہیں تھا۔ اس کی کمر سے ایک رسّی یا کسی پودے کی بیل بندھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ پھولدار ٹہنیاں لٹک رہی تھیں جن سے زہرہ خانم بے پردہ نہیں لگتی تھی۔ اس کے گلے میں ایسے ہی پھولوں کے بے شمار ہار پڑے ہوئے تھے جو آگے کو اور پیٹھ کی طرف بھی لٹک رہے تھے۔ ان ہاروں نے زہرہ خانم کا سینہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے بازو ننگے تھے اور اس کے بالوں کا جُوڑا بنا ہُوا تھا جو سکھوں کی طرح سر کے پیچھے نہیں بلکہ سر کے اوپر تھا۔ اس کے سر کے اِردگرد بھی پھولوں کے ہار لپٹے ہوئے تھے۔

فضل داد نے مجھے کہا کہ زہرہ خانم خاصی خوبصورت لڑکی تھی لیکن پھولوں کے اس لباس میں تو وہ پہلے سے بہت ہی زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ اُسے غصہ اس سردار پر آ رہا

تھا جس نے اتنی خوبصورت لڑکی پر قبضہ کر لیا تھا۔ فضل داد کے غصے میں قہر اور عتاب یہ سوچ کر پیدا ہو گیا تھا کہ اس نے اس لڑکی کو بالکل پاک اور شفاف رکھا تھا۔

سردار اور زہرہ خانم چبوترے پر چڑھ گئے اور وسط میں آ کر رک گئے۔ سردار کے ہاتھ میں وہی ڈنڈہ تھا جس پر رنگ دار کپڑے لٹکے ہوئے تھے، اس کے ایک سرے پر پرندوں کے رنگ دار پر اور دوسرے سرے پر چھوٹی گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس نے یہ ڈنڈہ بلند کیا تو ناگوں کی مترنم گونج ختم ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی نقارے بجنے لگے۔ سردار اور زہرہ خانم بیٹھ گئے۔ پہلے تو نقاروں کی آواز ایک شور جیسی تھی لیکن سردار کے بیٹھتے ہی نقارے ایک تال پر بجنے لگے اور ان کی آواز دھیمی ہو گئی۔ تمام ناگوں نے ایک زبان ہو کر کوئی اور گیت گانا شروع کر دیا۔ کوئی ایک بھی آواز الگ تھلگ یا تال سے ٹوٹی ہوئی نہیں لگتی تھی۔

چند منٹ یہ گیت جاری رہا اور جب ختم ہُوا تو سردار نے ڈنڈہ اوپر کر کے کچھ کہا۔ اس کا اشارہ فضل داد کی طرف تھا۔ فضل داد کے آگے اور پیچھے جو ناگے بیٹھے ہوئے تھے ان سب نے پیچھے فضل داد کی طرف دیکھا۔ دوسرے ناگے بھی اس کی طرف دیکھنے لگے۔ چبوترے کے قریب کھڑے ناگوں میں سے دو فضل داد کی طرف آئے اور اس کے قریب آ کر اشارہ کیا کہ وہ ان کے سردار کے پاس چلے۔ فضل داد نے سوچا کہ ان لوگوں کی نیت ٹھیک نہ ہوتی تو وہ اُسے بازوؤں سے پکڑ کر اس طرح گھسیٹتے جس طرح سزائے موت والے قیدی کو پھانسی کے تختے تک لے جایا جاتا ہے۔ انہوں نے احترام سے ذرا جھک کر اسے اشارہ کیا تھا کہ وہ چلے۔ فضل داد نے زہرہ خانم کی طرف دیکھا تو زہرہ خانم نے ہاتھ اوپر کر کے اسے اشارہ کیا کہ وہ آ جائے۔

فضل داد چبوترے پر چلا گیا۔ دو ناگوں نے اس کے جوتے اتروا لئے تھے۔ سردار اٹھا اور فضل داد کو بازو سے پکڑ کر دو زانو بٹھا دیا۔ پھر اس نے اعلان کرنے کے انداز سے کچھ کہا۔ پھر اس نے اپنے ڈنڈے کا پروں والا سرا پہلے فضل داد کے ایک کندھے کے ساتھ اور پھر دوسرے کندھے کے ساتھ لگایا اور پھر یہ سرا کچھ دیر سر کے ساتھ لگائے رکھا اور کچھ کہتا بھی رہا۔ اس نے ناگوں کی طرف منہ کر کے پھر کچھ کہا۔ ناگوں نے نعرہ سا لگایا اور تالیاں بجائیں جس کا مطلب صاف تھا کہ وہ سب اپنے سردار کے فیصلے پر بہت خوش ہیں۔ سردار نے فضل داد کو زہرہ خانم کے پہلو میں بٹھا دیا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ

فضل داد کو بھی سردار نے زہرہ خانم کی طرح اونچا درجہ دے دیا تھا۔ فضل داد کو خیال آیا کہ ان لوگوں نے اسے اپنے ساتھ شامل کر لیا ہے اور اب سردار اسے کہے گا کہ یہ کپڑے اتار دو اور نانگوں کے ساتھ نانگے بن جاؤ۔

فضل داد کا دماغ ایک بار پھر فرار کی ترکیبیں سوچنے لگا لیکن جب اس نے نانگوں کے اس ہجوم کو دیکھا تو وہ ڈر گیا۔ زیادہ تر نانگوں نے برچھیاں اٹھا رکھی تھیں اور کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے کندھوں کے ساتھ کمانیں اور پیٹھ پیچھے تیروں کی ترکشیں لٹکا رکھی تھیں۔ فضل داد نہتا تھا۔ اس کے پاس ایک چاقو تھا جو اس کے جھولے میں پڑا ہوا تھا اور جھولا نانگوں نے لے لیا تھا۔

میں کھوپڑیوں کا ذکر بھول گیا ہوں۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ ان لوگوں میں انسانی کھوپڑی کو خصوصی اہمیت تھی۔ جس چبوترے پر سردار، زہرہ خانم اور فضل داد بیٹھے تھے، اس چبوترے کے چاروں کونوں پر سلیقے سے کھوپڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دو کھوپڑیاں سردار اور زہرہ خانم کے آگے رکھی گئی تھیں۔ جب فضل داد کو زہرہ خانم کے پہلو میں بٹھایا گیا تو ایک نانگا ایک اور کھوپڑی اٹھا کر لایا اور فضل داد کے آگے رکھ کر چلا گیا۔

اس کے بعد دو عورتوں اور دو مردوں نے مل کر ڈانس کیا۔ یہ ڈانس ان کا کوئی اپنا ہی تھا۔ ان کے جسموں کی حرکات کچھ ایسی تھیں جیسے وہ ان حرکات سے کوئی بات سمجھا رہے ہوں۔ اس ڈانس میں کوئی عجیب سا تاثر تھا جو فضل داد نے خاص طور پر محسوس کیا۔

میں نے فضل داد سے پوچھا کہ وہاں مرد بھی ننگے اور عورتیں بھی ننگی تھیں تو ان کا آپس میں رویہ کیا تھا۔ فضل داد نے کہا کہ وہ خود حیران ہے کہ بالکل ننگے ہونے کے باوجود کوئی مرد کسی عورت کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ ان لوگوں میں ڈسپلن ہے اور اس طرح کی بدی نہیں جو ہمارے مہذب معاشرے میں دیکھنے میں آتی ہے۔

یہ ڈانس ختم ہوا تو دونوں مرد اور دونوں عورتیں اپنی اپنی جگہ چلے گئے اور اس کے فوراً بعد بارہ تیرہ آدمی ایک صف میں کھڑے ہو گئے اور ان کے سامنے بارہ تیرہ عورتیں اسی طرح صف میں آن کھڑی ہوئیں۔ یہ سب نوجوان اور جوان عورتیں تھیں۔ انہوں نے نقاروں کی تھاپ پر ڈانس بھی کیا اور کوئی گیت بھی گایا۔ وہ آہستہ آہستہ صفوں میں

ایک دوسرے کے قریب آتے اور اسی طرح واپس ہو جاتے تھے۔ پھر یہ ناچتے ناچتے ایک دائرے میں ہو گئے اور پھر ایک مرد اور ایک عورت الگ الگ ہو کر ایک ہی تھاپ پر ایک ہی قسم کا ڈانس کرتے کرتے پھر الگ ہو گئے اور پہلے کی طرح صفوں میں جا کھڑے ہوئے۔ کچھ دیر بعد یہ ناچ گانا بھی ختم ہو گیا۔



سردار نے جو آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا، اپنا دو فٹ لمبا ڈنڈہ بلند کر کے ہلایا اور کوئی حکم دیا یا اعلان کیا۔ تمام نانگے ایک طرف دیکھنے لگے۔ اس طرف سے تین نانگے ایک جواں سال آدمی کو لا رہے تھے۔ اس کے ہاتھ پیٹھ پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ وہ چل نہیں رہا تھا بلکہ اسے چلایا جا رہا تھا۔ اس آدمی کے چہرے کے نقوش آسامیوں جیسے تھے یا وہ برمی تھا۔ اس کا رنگ سفیدی مائل پیلا تھا وہ بالکل برہنہ تھا۔

اسے اس گول پتھر کے قریب لے جا کر کھڑا کر دیا گیا جو اس جگہ وسط میں رکھا گیا تھا۔ اس وقت فضل داد نے دیکھا کہ اس کے ساتھ جو نانگے تھے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں چوڑے پھل والی تلوار تھی۔ وہ اس آدمی کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس آدمی کو شاید کچھ پلا دیا گیا کیونکہ اس کا چہرہ بے تاثر تھا اور وہ کچھ بھی نہیں بولتا تھا۔ اسے دو نانگوں نے کندھوں سے نیچے کو دبایا تو وہ زمین پر دو زانو بیٹھ گیا۔

سردار اٹھا اور چبوترے سے اتر کر اس آدمی کے پاس جا رکا۔ ایک نانگا ہاتھ میں ایک پیالہ لئے دوڑا آیا اور پیالہ دونوں ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے سردار کے آگے کر دیا۔ سردار نے اس پیالے میں اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں ڈبوئیں اور باہر نکال کر پانی سا اس آدمی کی پیٹھ پر چھڑک دیا۔ سردار نے اپنا ڈنڈہ درمیان سے پکڑا اور بازو لمبا کر کے ڈنڈہ اس آدمی کے جسم سے ذرا اوپر رکھا۔ سردار نے آسمان کی طرف منہ کر کے بڑی بلند آواز میں کچھ کہا اور پھر اس کا ڈنڈے والا ہاتھ بڑی زور سے کانپنے لگا جس طرح مداری ڈگڈگی بجایا کرتا ہے۔ اس حرکت کے مطابق ڈنڈہ بھی ڈگڈگی جیسی حرکت کرنے لگا۔ سردار اس آدمی کے چاروں طرف گھومنے لگا اور پھر سردار کا سارا جسم زور زور سے کانپنے لگا اور یوں لگتا تھا جیسے سردار دماغی توازن کھو بیٹھا ہو یا اسے کوئی دورہ پڑ گیا ہو۔ سردار کا جسم اتنی زور زور سے تھرکنے لگا کہ یوں لگتا تھا جیسے اس کے اعضاء جسم سے الگ ہو کر بکھر جائیں گے۔

جب وہ اور زیادہ جوش میں آیا تو اس کے تھرکنے کی تال پر نقارے بجنے لگے اور باقی ناگوں نے اسی تال پر تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ پھر سردار آہستہ آہستہ نارمل حالت میں آنے کی بجائے یکلخت رک گیا جیسے سوئچ آف کر دیا گیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی نقارے خاموش ہو گئے اور ناگوں کی تالیاں بھی بند ہو گئیں۔ سردار آہستہ آہستہ چلتا اور کچھ بڑبڑاتا پھر چبوترے پر چلا گیا اور ڈنڈے سے اشارہ کر کے بیٹھ گیا۔

ایک ناگا دوڑا آیا۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کا بہت بڑا پرات نما برتن تھا جو اس نے پتھر کے آگے رکھ دیا۔ دو ناگوں نے قیدی کو پکڑ کر پتھر کے قریب اس طرح کیا کہ اس کا سر پتھر کے ذرا آگے تھا اور گردن پتھر پر تھی۔ تلوار والا ناگا اس کے بائیں پہلو پر آیا اور ایک ہی وار میں اس نے قیدی کا سر جسم سے الگ کر دیا۔ سر برتن میں جا پڑا۔ ایک ناگے نے سر فورا" اٹھا لیا اور دوسروں نے اس بد قسمت آدمی کا باقی دھڑ اٹھا کر اس طرح آگے کر دیا کہ اس کا سارا خون پرات میں گرنے لگا۔ زہرہ خانم یہ ہولناک منظر دیکھ رہی تھی۔
جب قیدی کی گردن کٹ گئی تو زہرہ خانم نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ کر ہلکی سی چیخ ماری۔ فضل داد نے اپنا ایک بازو اس کے کندھوں پر رکھا پھر اس کی پیٹھ پر تھپکی دے کر کہا کہ حوصلہ قائم رکھو۔ سردار نے زہرہ خانم کو اس خوفزدگی کی حالت میں دیکھا تو اس نے بھی زہرہ خانم کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا۔ ادھر ناگوں نے وہ شور و غل بپا کیا کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

قیدی کے خون سے مٹی کا برتن بھرتا جا رہا تھا۔ دو ناگے اس کی پیٹھ کو کمر سے لے کر کندھوں تک یوں دبا رہے تھے جیسے مالش کی جاتی ہے۔ اس سے قیدی کے جسم کا خون باہر آ رہا تھا۔ پھر انہوں نے اس کی ٹانگیں بھی دبائیں اور بازو بھی۔

آخر خون نکلنے کی بجائے وہیں جمنے لگا جہاں سے گردن کٹی تھی۔ دو ناگوں نے برتن اٹھایا اور چبوترے پر جا کر سردار کے آگے رکھ دیا۔ سردار نے اس خون میں اپنی انگلی ذرا سی ڈبوئی اور اپنے ماتھے پر لگائی۔ اس نے وہی انگلی پھر خون میں ڈبو کر زہرہ خانم کے ماتھے پر لگائی اور پھر وہی انگلی حوالدار فضل داد کے ماتھے پر مل دی۔

خون والا برتن وہاں سے اٹھا لیا گیا اور چار پانچ ناگے ایک مٹکا اٹھائے ہوئے میدان میں آئے اور وہاں رکھ دیا۔ ایسا ہی ایک اور مٹکا آ گیا۔ ناگوں نے برتن والا خون دونوں مٹکوں میں آدھا آدھا ڈال دیا اور پھر دو ناگوں نے اپنی برچھیاں مٹکوں میں ڈال کر زور

زور سے ہلائیں۔ مٹکوں میں شاید پانی تھا یا نہ جانے کیا چیز تھی جس میں یہ ناگے خون ملا رہے تھے۔ مٹکے بہت بڑے بڑے تھے۔ سردار نے اپنا ڈنڈہ ہوا میں بلند کر کے کچھ کہا تو ناگوں کے ہجوم میں بھگدڑ مچ گئی۔ یوں پتہ چلتا تھا جیسے ان کا مجمع منتشر ہو رہا ہے لیکن وہ پیچھے کو اور اِدھر اُدھر دوڑ کر کچھ دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر وہ اسی ہُلڑبازی کی حالت میں رہے اور جب وہ پُر سکون ہوئے تو کسی کے ہاتھ میں مٹی کا پیالہ' کسی کے ہاتھ میں ٹین کا گول ڈبہ اور کسی کے ہاتھ میں مگ تھا۔ وہ ایک قطار میں مٹکوں کے قریب سے گزرنے لگے۔ ایک ناگا ہر ایک کے برتن میں پانی سا مٹکوں میں سے نکال نکال کر ڈال رہا تھا۔ اس دوران سردار نے اپنا ایک بازو زہرہ خانم کی کمر میں ڈال دیا اور اسے اپنے قریب کر لیا۔
فضل داد جو سمجھا وہ یہ تھا کہ یہ سردار نے زہرہ خانم کے ساتھ شادی کی تھی۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ سردار نے زہرہ خانم کو بیوی بنا لیا تھا۔

○

تمام ناگے اپنی اپنی جگہ پر جا چکے تھے اور وہ مٹکوں میں سے وہ پانی سا پی رہے تھے جس میں ایک انسان کا خون ملایا گیا تھا۔ ایک ناگا ایک پیالہ اٹھائے چبوترے پر آیا اور سردار کے آگے پیش کیا۔ سردار نے فضل داد کی طرف اشارہ کیا۔ پیالہ فضل داد کے آگے گیا تو فضل داد نے جھک کر دیکھا۔ پیالے میں بدرنگ سا پانی تھا جس سے ناقابلِ برداشت بدبُو اُٹھ رہی تھی۔ یہ بدبو خون کی نہیں تھی۔ یہ ان کی اپنی تیار کی ہوئی شراب تھی۔ فضل داد شراب کی بُو سے واقف تھا۔ فضل داد نے نفی میں سر ہلا کر بتایا کہ وہ نہیں پیئے گا۔ سردار نے زہرہ خانم کو یہ شراب پیش نہ کی خود پی۔

میدان خالی ہو چکا تھا۔ ناگے اردگرد بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ بے سر لاش پتھر کے قریب پڑی تھی۔ سردار کے اشارے پر دو ناگے لاش کے قریب گئے۔ ان کے ہاتھوں میں چھریاں تھیں۔ انہوں نے لاش کا پیٹ چاک کیا پھر پسلیوں کے نیچے سے پیٹ میں چھریاں مار کر پورا پیٹ کھول دیا۔ ایک ناگے نے لاش کے سینے میں ہاتھ ڈالا اور کھینچا تو اس کے ہاتھ میں لاش کا دل اور کلیجی تھی۔

اس نے یہ دل اور کلیجی سردار کو پیش کی۔ سردار نے سر سے اشارہ کیا تو کلیجی اور دل ایک ناگا لے گیا۔ پھر چھُریوں سے لاش کے اعضاء الگ کئے گئے۔ یوں پتہ چلتا تھا جیسے قربانی کا بکرا ذبح کر کے کاٹا جا رہا ہو۔ انہوں نے بازو کے دو ٹکڑے کئے۔ اسی طرح دو دو

ٹکڑے ٹانگوں کے بھی کئے اور چار پانچ نانگے یہ سارے اعضاء اٹھا کر لے گئے۔ صاف ظاہر تھا کہ جنہوں نے انسانی خون شراب میں پیا تھا' وہ یہ گوشت بھی کھائیں گے۔ سردار بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

"خدا کے لئے مجھے یہاں سے جلدی نکالو" —— زہرہ خانم نے سرگوشی میں فضل داد سے کہا۔

"میں آج ہی کوشش کروں گا" —— فضل داد نے کہا —— "تم یہ خیال رکھنا کہ سردار کے جھونپڑے کا دروازہ اندر سے پکا بند نہ ہو۔ اگر اس جنگلی نے دروازہ اندر سے بند کر دیا تو تم کسی بہانے' کسی طرح دروازہ کھول دینا"۔

یہ شراب بہت ہی تیز معلوم ہوتی تھی۔ نانگے بہکنے لگے تھے اور بعض نے قہقہے لگانے شروع کر دیئے تھے۔ بعض نے ہلڑبازی بھی کی لیکن وہ وہیں گرتے جا رہے تھے۔ بعض اٹھ کر چل پڑے لیکن ان سے ٹھیک طرح چلا نہیں جاتا تھا۔ کچھ تو میدان میں ہی گر پڑے تھے اور اٹھ نہ سکے۔

عورتوں نے بھی شراب پی تھی۔ ان کی حالت بھی مردوں جیسی ہو گئی تھی۔ بعض عورتوں نے لڑکھڑاتی زبان سے گانا بھی گایا تھا لیکن چند قدم چل کر گریں اور وہیں پڑی رہ گئیں۔ اتنے زیادہ نشے کے باوجود کوئی نانگا آدمی کسی عورت کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ نشے میں انسان ہر قسم کی گھٹیا حرکت کر گزرتا ہے اور گناہ بھی کرتا ہے لیکن ان وحشیوں کے ہاں عورت کے معاملے میں اتنا اچھا اخلاق پایا جاتا تھا کہ کسی نے کسی عورت کو ہاتھ تک نہ لگایا۔

بہت دیر بعد وہاں خاموشی چھا گئی۔ بہت سے نانگے بے سُدھ پڑے تھے اور جو چلے گئے تھے' وہ معلوم نہیں اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچ بھی سکے تھے یا نہیں۔

آخر سردار اٹھا' زہرہ خانم اور فضل داد کو بھی اٹھایا۔ اس نے ڈنڈے کا سر فضل داد کے سینے سے لگا کر ڈنڈے کا اشارہ اس کے جھونپڑے کی طرف کیا اور کچھ کہا جس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ تم اپنے جھونپڑے میں چلے جاؤ۔ پھر سردار نے زہرہ خانم کو اپنے بازوؤں پر اٹھا لیا۔ وہ جب اس تقریب میں آئے تھے تو زہرہ خانم سردار کے ساتھ چلتی آئی تھی لیکن اب سردار نے اسے بازوؤں پر اٹھا لیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اب زہرہ خانم اس کی بیوی تھی۔

فضل داد کے لئے یہ منظر ناقابلِ برداشت تھا کہ زہرہ خانم کو ایک جنگلی اٹھا کر لے جا رہا تھا لیکن اُس نے دل پر پتھر رکھ کر برداشت کیا اور اپنے جھونپڑے کی طرف چل پڑا۔

فضل داد نے دیکھا کہ جب سردار نشے میں مدہوش نانگوں میں سے گزر کر ذرا اوپر گیا تو کم و بیش بیس نانگے کہیں سے نکلے اور اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ یہ غالباً اس کے باڈی گارڈ تھے اور انہوں نے یقیناً شراب نہیں پی تھی کیونکہ اپنے سردار کی حفاظت ان کی ذمہ داری تھی۔

فضل داد رک گیا اور انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے جگہ بدل کر دیکھا کہ سردار بلندی چڑھتا چڑھتا اپنے جھونپڑے تک گیا۔ مشعلوں کی روشنی وہاں تک پہنچ رہی تھی۔ سردار زہرہ خانم کو اٹھائے اندر چلا گیا۔ اس کے باڈی گارڈ وہاں سے ایک طرف چلے گئے اور ایک آدمی جس کے پاس برچھی تھی' دروازے کے باہر کھڑا ہو گیا۔ فضل داد نے سوچا کہ ان لوگوں کی موجودگی اور بیداری میں زہرہ خانم کو اغوا کرنا آسان نہیں ہو گا۔

○

فضل داد اپنے جھونپڑے میں چلا تو گیا لیکن وہ اس قدر بے چینی اور بے قراری محسوس کر رہا تھا کہ جھونپڑے میں اس سے ٹِکا نہیں جا رہا تھا۔ ایک نانگا اس کے لئے کھانا لایا۔ رات آدھی گزر گئی تھی۔ بھوک کی شدت کو وہ محسوس کر رہا تھا لیکن کھانے کو اس کا جی نہیں چاہتا تھا اس نے یہ نہ دیکھا کہ کھانا کیا ہے۔ حلال ہے یا حرام۔ نہ چاہتے ہوئے بھی جو کچھ بھی تھا اس نے جلدی جلدی کھا لیا۔

اس نے دیکھا کہ یہ نانگا پوری طرح ہوش و حواس میں تھا۔ وہ اس نانگے سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے شراب کیوں نہیں پی لیکن اشاروں کے باوجود وہ نانگا کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ وہ صرف ہنستا رہا۔ ویسے بھی یہ نانگا بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ وہ اپنے سردار کے جھونپڑے کی طرف اشارے کر کر کے کچھ کہہ رہا تھا اور ہاتھوں کے اشارے بھی کرتا تھا۔ ہاتھوں کے اشاروں سے جب اس نے عورت کا تصوّر پیدا کیا تو فضل داد سمجھ گیا کہ یہ اسے بتا رہا ہے کہ اس کے سردار کی شادی ہو گئی ہے اور اب سردار موج میلہ کرتا ہو گا۔

یہ نانگا چلا گیا تو فضل داد کو یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ یہاں باڈی گارڈوں کے علاوہ

بھی کچھ لوگ ہوش میں ہیں۔ پہلے تو وہ خوش تھا کہ تمام نانگے شراب پی کر بے ہوشی کی نیند سو رہے ہیں۔ بہرحال اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ آج وہ زہرہ خانم کو سردار سے آزاد کرا ہی لے گا۔ وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔ اُن دنوں چاند آدھی رات کے بعد اوپر آتا تھا۔ چاند ابھی ساتھ والی پہاڑی کے پیچھے تھا لیکن کچھ کچھ روشنی آ رہی تھی۔ فضل داد سردار کے جھونپڑے کی طرف چل پڑا لیکن وہ سیڑھیاں نظرانداز کرنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ان سیڑھیوں سے وہ اوپر گیا تو سردار کے جھونپڑے کا سنتری اسے دیکھ لے گا۔ اس نے سردار کے جھونپڑے کو اچھی طرح دیکھا تھا اور یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ پیچھے کی طرف سے بھی آیا جا سکتا ہے حالانکہ ادھر سے راستہ ہموار نہیں تھا۔ پہلے نیچے جانا تھا پھر پیچھے جا کر پہاڑی کے اوپر چڑھنا تھا پھر کہیں جا کر وہ جھونپڑے کے پچھواڑے پہنچ سکتا تھا۔

وہ دبے پاؤں چلتا گیا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ سردار کے باڈی گارڈ کہاں رہتے ہیں۔ وہ ایک طرف کو نیچے گیا اور ڈھلوان کے ساتھ ساتھ چلتا آگے بڑھتا گیا۔ اسے درختوں کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ پاؤں پھسلنے کا خطرہ موجود تھا۔ وہ آگے ہی آگے بڑھتا گیا اور اس نے اندازہ کیا کہ وہ جھونپڑے سے آگے نکل آیا ہے۔ ایک جگہ سے وہ اوپر چڑھنے لگا۔ وہاں ڈھلوان زیادہ سیدھی تھی۔ ایک بار اس کا پاؤں پھسلا لیکن ایک جھاڑی نے اسے روک لیا اور اس نے ساتھ والے درخت کا تنا پکڑ لیا۔

وہ کمانڈو تھا۔ اٹھا اور درختوں کا سہارا لے کر اوپر چلا گیا۔ اتنے میں چاند پہاڑی کے اوپر آ گیا تھا۔ وہاں درخت زیادہ تھے اس لئے چاندنی درختوں میں سے ہو کر آتی تھی جو فضل داد کے لئے فائدہ مند تھی۔ اس کے لئے پوری طرح چاندنی میں آ جانا خطرناک تھا۔ وہ اوپر گیا اور بائیں طرف دیکھا۔ پچیس تیس قدم دور ڈھلان کے نیچے اسے سردار کا جھونپڑا نظر آ رہا تھا اور صاف دکھائی دیتا تھا کہ جھونپڑے کے اندر روشنی ہے۔ وہ قدم سنبھال سنبھال کر رکھتا یہ ڈھلوان اتر گیا اور جھونپڑے کے پچھواڑے پہنچ گیا۔ اس نے جھونپڑے کے ایک کونے سے ایک آنکھ آگے کر کے دیکھا۔ اسے سنتری نظر نہ آیا۔ اس نے فوراً پیچھے دیکھا کیونکہ اسے خیال آ گیا تھا کہ سنتری جھونپڑے کے اِردگرد چکر بھی لگاتا ہے، کہیں پیچھے سے ہی نہ آ جائے۔

اسے جھونپڑے کے دوسرے پہلو کی طرف سے ہلکے ہلکے قدموں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ سنتری اُدھر سے آ رہا ہے۔ بائیں طرف ایک موٹے

تنے والا درخت تھا۔ فضل داد دبے پاؤں اس تنے کے پیچھے ہو گیا۔ اب وہ سنتری کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔ سنتری جھونپڑے کے پچھواڑے آیا اور آہستہ آہستہ چلتا پہلو کی دیوار کے ساتھ ہو لیا۔ فضل داد میں اور سنتری میں تین چار قدموں کا فاصلہ تھا۔ سنتری دیوار سے ہٹ کر اسی درخت کے قریب آ گیا جس کے پیچھے فضل داد چھپا ہُوا تھا۔ سنتری کے پاس بانس کی برچھی تھی۔ سنتری ایک دو قدم آگے یعنی جھونپڑے کے سامنے جانے کے لئے چلا۔ فضل داد اس پر اس قدر تیزی سے جھپٹا کہ سنتری کو پتہ ہی نہ چلا کہ یہ کون ہے اور اس کے ساتھ کیا ہُوا ہے۔

فضل داد نے اپنا ایک بازو سنتری کے گلے میں اس طرح ڈال لیا تھا کہ اس کی شہ رگ دب گئی تھی۔ سنتری کی آواز نہیں نکل سکتی تھی۔ فضل داد نے بازو کا شکنجہ اور سخت کر دیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کے پیٹ میں زور زور سے مُکّے مارنے شروع کر دیئے۔ فوجیوں کو بغیر ہتھیار کے لڑائی کی جو ٹریننگ دی گئی تھی، اس میں یہ داؤ خاص طور پر سکھایا گیا تھا۔ اس نانگے نے اب دم گھُٹنے سے مرنا تھا۔ اس نے تڑپنے کے انداز سے ٹانگیں ماریں اور پھر اس کا جسم بے حرکت ہو گیا۔ فضل داد نے اس کی نبض پر انگلیاں رکھیں۔ وہ مر چکا تھا۔ اس نے نانگے کو چھوڑ دیا اور اس کی برچھی اٹھا لی۔

وہ دبے پاؤں جھونپڑے کے دروازے تک گیا اور دروازے پر ہاتھ رکھا۔ نہایت آہستہ سے دروازے کو دھکیلا تو دروازہ کھل گیا۔ جھونپڑے میں ایک دیا جل رہا تھا۔ فضل داد نے اندر جو منظر دیکھا اس نے اسے باؤلا کر دیا۔ سردار کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی اور زہرہ خانم کو اس نے اپنے نیچے گرا رکھا تھا۔ زہرہ تڑپ رہی تھی اور اس کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اس جنگلی کو خاوند کی حیثیت سے قبول نہیں کر رہی تھی۔ جنگلی سردار اس قدر بدمست تھا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ موت اس کے پیچھے صرف دو قدموں تک آن پہنچی ہے۔

فضل داد نے پوری طاقت سے برچھی اس کی پیٹھ میں اتار دی۔ سردار کے منہ سے بڑی لمبی ہاہا کی آواز نکلی اور وہ اٹھنے لگا۔ فضل داد نے برچھی اس طرح اس کی پیٹھ سے نکالی کہ پاؤں اس کی پیٹھ پر رکھا اور برچھی کھینچی۔ زہرہ خانم بڑی تیزی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سردار پیٹھ کے بل گرا۔ فضل داد نے پہلے کی طرح پورے زور سے اس کے سینے

میں برچھی ماری جو پسلیاں توڑتی ہوئی دور تک اندر چلی گئی۔ فضل داد نے اس کے پیٹ پر کھڑے ہو کر برچھی نکالی اور زہرہ خانم سے کہا کہ اب رکنا نہیں۔ اس نے زہرہ خانم کا بازو پکڑا اور اسے ساتھ لے کر جھونپڑے سے نکل گیا۔

فضل داد کو راستے کا کچھ علم نہیں تھا۔ وہ ایک طرف اترنے لگا۔ خاصی دور نیچے اترے تو اوپر اسے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے ناگے بیدار ہو کر اپنے سردار کے جھونپڑے میں پہنچ گئے ہوں۔ سردار کے منہ سے بڑی بلند آواز نکلی تھی جو اس کی زندگی کی آخری آواز تھی۔ اس کے محافظ اس آواز پر جاگ اٹھے ہوں گے۔

پہاڑی سے اتر کر وہ ایک طرف کو دوڑ پڑے۔ ایک جگہ پہاڑ کٹا ہُوا تھا۔ وہاں سے وہ مڑے اور آگے چلے گئے۔ یہ جگہ ذرا کشادہ تھی لیکن اس میں جھاڑیاں اور کم بلند درخت ذرا زیادہ تھے جن میں سے تیزی سے گزرنا ممکن نہیں تھا۔ فضل داد نے فوجی چپل پہنچ رکھے تھے لیکن زہرہ خانم ننگے پاؤں تھی۔ اُسے کانٹے بھی چبھ رہے تھے لیکن جان بڑی پیاری چیز ہے اس لئے وہ فضل داد کی رفتار کا ساتھ دے رہی تھی۔

اس سے آگے ٹیکریوں کی بھول بھلیاں شروع ہو گئیں۔ یہاں وہی خطرہ تھا جس میں سے میں بھی کبھی گزرا تھا۔ فضل داد دماغ کو حاضر رکھ کر بھاگا جا رہا تھا۔ وہاں سے نکلے تو آگے پھر ایک پہاڑی آگئی جس کے ساتھ ساتھ وہ دوڑنے لگے۔

"زہرہ!" ـــ فضل داد نے تیز چلتے ہوئے زہرہ خانم سے کہا ـــ "اگر تم ننگے پاؤں نہیں چل سکتیں تو میں تمہیں اٹھالیتا ہوں"۔

"نہیں!" ـــ زہرہ خانم نے جواب دیا ـــ "میری فکر نہ کرو، چلتے چلو۔ میرے پاؤں اگر چھلنی ہو گئے تو بھی پرواہ نہیں کروں گی۔ جان بھی دے دوں گی لیکن اپنی عزت پر کسی کو ہاتھ نہیں ڈالنے دوں گی۔ تم بڑے ٹھیک وقت پر اس جنگلی کے جھونپڑے میں پہنچ گئے تھے"۔

اگر علاقہ میدانی اور ہموار ہوتا تو دونوں اتنی تیز دوڑ سکتے تھے کہ اس وقت تک بہت دور پہنچ چکے ہوتے۔ فضل داد کو خطرہ یہ نظر آ رہا تھا کہ ناگے اس دشوار گزار علاقے سے اچھی طرح واقف تھے اور فضل داد کو پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس سمت میں جا رہا ہے اور کہیں ایسا تو نہیں کہ گھوم پھر کر اور موڑ مڑتے مڑتے وہ واپس ہی چلا جا رہا ہو..... وہ دوڑنے کی رفتار سے چلتا گیا اور زہرہ خانم اس کا بڑا ٹھیک ساتھ دے رہی تھی۔ چاند

اوپر آگیا تھا۔ جنگل کی فضا نمی کی وجہ سے بالکل صاف ہوتی ہے، ذرا سا بھی گرد و غبار نہیں ہوتا۔ اس لئے چاندنی پوری طرح شفاف ہوتی ہے۔ دونوں بھاگے چلے گئے۔ دونوں کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ فضل داد کو اس برچھی کا بھروسہ تھا جس سے اس نے سردار کو قتل کیا تھا وہ برچھی ساتھ لے آیا تھا۔

فضل داد کے اندازے کے مطابق ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ اسے ناگوں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ ناگے قریب پہنچ رہے تھے۔ وہ کچھ اور دور گئے تو ایک سیدھی کھڑی چٹان نے ان کا راستہ روک لیا۔ وہ دائیں بائیں کوئی راستہ دیکھنے لگے۔ آخر انہیں ایک راستہ نظر آگیا۔ فضل داد نے زہرہ خانم کو بازو سے پکڑا اور اسے آگے کیا کہ پہلے وہ اس تنگ سے راستے میں سے گزر جائے لیکن زہرہ خانم پیچھے ہو گئی اور فضل داد کو آگے کیا۔ وہ اس کے پیچھے رہنا ہی شاید محفوظ سمجھتی تھی۔

وہ راستہ قدرتی طور پر چٹان کے درمیان سے بنا ہُوا تھا۔ دو آدمی پہلو بہ پہلو اس میں سے گزر سکتے تھے۔ جونہی فضل داد اس راستے میں داخل ہُوا اسے اپنے پیچھے ہلکی سی دھمک سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی زہرہ خانم کے منہ سے ہائے یا آہ جیسی آواز نکلی۔ فضل داد نے رک کر پیچھے دیکھا۔ زہرہ خانم چٹان کے ساتھ گر پڑی تھی اور ایک برچھی اس کی پیٹھ میں اتری ہوئی تھی۔ فضل داد نے برچھی نکال دی اور دیکھا کہ یہ کم و بیش چار انچ زہرہ خانم کے پھیپھڑوں میں اتر گئی تھی۔ اب اس لڑکی کا زندہ رہنا ممکن نہیں تھا۔

فضل داد نے وہ برچھی وہیں پھینکی اور وہاں سے بھاگ اٹھا۔ اسے یقین تھا کہ ناگوں کو زہرہ خانم کی لاش ہی ملے گی۔ اب چونکہ فضل داد اکیلا تھا اس لئے اسے بھاگنے دوڑنے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ پہلے وہ کچھ دور جا کر رکتا اور زہرہ خانم کو ساتھ لیتا اور آگے چلتا تھا۔

اب وہ تیز دوڑنے لگا لیکن وہ جگہ تیز دوڑنے نہیں دیتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے درخت تھے، گھنی جھاڑیاں تھیں اور کہیں کھڈ آ جاتا اور کہیں چھوٹی بڑی کوئی ٹیکری راستہ روک لیتی تھی۔ فضل داد دو تین مرتبہ گرا بھی لیکن اٹھ کھڑا ہُوا اور پھر دوڑ پڑا۔

وہ اتنا محسوس کر رہا تھا کہ زمین نیچے کو جا رہی ہے۔ وہ بلندی سے اتر رہا تھا۔ اسے ناگوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان سے اس نے نہ جانے کیسے اندازہ کیا کہ ناگے بکھر گئے ہیں۔ وہ تھک گیا تھا۔ ایک جگہ ایک ٹیکری کے ساتھ بڑی گھنی جھاڑیاں تھیں۔

فضل داد ان کے اندر جا کر چھُپ گیا۔ اس نے یہ سوچا تھا کہ اس کے تعاقب میں آنے والے آگے نکل جائیں گے تو وہ کسی اور سمت میں چلا جائے گا۔

تھوڑی ہی دیر بعد دو نانگے انہی جھاڑیوں کے قریب آ کر رک گئے۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ دونوں وہاں بیٹھ گئے۔ وہ بھی تعاقب میں تھک گئے تھے۔ فضل داد یہ نہ دیکھ سکا کہ ان کے پاس ہتھیار کیا ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ برچھیاں ہی ہوں گی۔ وہ نانگے وہاں سے اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ فضل داد کو یہ خطرہ نظر آنے لگا کہ یہ دونوں جھاڑیوں کے اس طرف نہ آ جائیں جہاں وہ چھپا بیٹھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اُٹھا۔ اسے چاندنی میں دونوں نانگے اپنی طرف پشت کئے بیٹھے نظر آئے۔

اُس نے ایک نانگے کی پیٹھ میں اسی طرح اور طاقت سے برچھی ماری جس طرح اس نے ان کے سردار کو ماری تھی۔ وہ نانگا برچھی کھا کر اٹھ نہ سکا لیکن دوسرا اٹھ کر ذرا پرے ہو گیا' تب فضل داد نے دیکھا کہ اس نانگے کے ہاتھ میں چوڑے بلیڈ والی لمبی تلوار تھی۔ اب فضل داد بھاگ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اسے وہاں سے نکلنے کے راستے کا پتہ ہی نہیں تھا اور وہ چھُپ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ جھاڑیوں میں سے سامنے آ گیا۔

فضل داد جب مجھے یہ واقعہ سنا رہا تھا تو اس نے حیرت کا اظہار کیا کہ اس نانگے نے اپنے ساتھیوں کو کیوں نہیں پکارا تھا. اسے شاید یقین تھا کہ وہ فضل داد کو مار لے گا۔ اس نے تلوار لہرائی اور ادھر سے فضل داد نے جمپ لگا کر اس پر برچھی کا وار کیا۔ نانگے نے نہ صرف یہ کہ آگے سے پھرتی سے ہٹ کر وار خطا کر دیا بلکہ تلوار چلا کر اس نے فضل داد کی بانس کی برچھی کو درمیان میں سے کاٹ ڈالا۔ برچھی کا اگلا حصہ پچھلے حصے کے ساتھ لٹک گیا۔ فضل داد نے اگلے حصے کو گرنے سے پہلے پکڑ لیا اور پچھلا حصہ الگ توڑ پھینکا۔ اب نانگا اس پر وار کرنے کے لئے پینترے بدلنے لگا۔ فضل داد برچھی پر تلوار کے وار نہیں لے سکتا تھا کیونکہ برچھی کمزور تھی اور تلوار نے اس باقی نصف برچھی کو بھی کاٹ دینا تھا۔

نانگے نے بڑھ کر وار کیا جو فضل داد بچا گیا۔ دوسری بار نانگے نے پھر وار کیا تو فضل داد بڑی پھرتی سے ایک طرف ہُوا۔ اس نے نہ صرف وار بچایا بلکہ برچھی نانگے کو ماری لیکن یہ چھوٹا سا ٹکڑا تھا جو نانگے کو لگا تو سہی لیکن کارگر وار نہ ہو سکا۔ نانگا ویسے ہی تیز اور پھرتیلا معلوم ہوتا تھا۔ فضل داد کو معلوم تھا کہ جن جھاڑیوں کے پیچھے وہ چھپا ہُوا تھا وہ

جھاڑیاں ذرا گہرے کھڈ میں تھیں۔ اس نے یہ کوشش شروع کر دی کہ نانگے کو ان جھاڑیوں کے پاس لے چلے تاکہ وہ اس کھڈ میں گر پڑے۔ وہ گرتا تو فضل داد اُس پر برچھی کا بڑا ہی کاری وار کر سکتا تھا۔

نانگے نے بڑی تیزی سے تلوار گھمانی شروع کر دی جس سے فضل داد گھبرا گیا۔ اس نے حوصلہ قائم رکھا اور نانگے سے دور ہی دور رہا۔ ایک بار وہ اس کے قریب ہُوا تو نانگے کی تلوار فضل داد کے بازو کو تھوڑا زخمی کر گئی لیکن فضل داد اس زخم کی پرواہ کرنے والا نہیں تھا۔ تلوار نے پٹھہ کاٹا تھا۔ فضل داد ایسے پینترے بدلنے لگا جن سے اس کا مقصد یہ تھا کہ نانگا جھاڑیوں کے قریب ہو جائے۔

آخر فضل داد کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ وہ اس طرح کہ نانگے کی پیٹھ ان جھاڑیوں کی طرف تھی۔ فضل داد نے ایک پتھر اٹھا لیا جو کم و بیش ڈیڑھ کلو وزنی تھا۔ اس سے نانگا کچھ گھبرایا۔ فضل داد نے پوری طاقت سے پتھر نانگے کو مارا۔ نانگا آگے سے ہٹ تو گیا لیکن پتھر اس کے بائیں کندھے پر لگا۔ نانگا تیزی سے پیچھے ہٹا اور اس کھڈ میں گر پڑا جس میں جھاڑیاں تھیں۔ وہ پیٹھ کے بل گرا تھا۔ کھڈ ڈیڑھ پونے دو فٹ ہی گہرا تھا۔ جونہی نانگا اس میں گرا' فضل داد نے برچھی تان کر پوری طاقت سے نانگے کے پیٹ میں اتار دی۔ نانگے نے تلوار گھما کر ماری جو فضل داد کی ٹانگ پر لگی لیکن وار اتنی زور سے نہ پڑا جتنی زور سے نانگے نے کیا تھا۔ اب نانگا اُٹھ نہیں سکتا تھا۔ تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی تھی۔ جو فضل داد نے اٹھا لی۔ نانگا اپنے پیٹ میں اتری ہوئی برچھی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھنے لگا۔ اب تلوار فضل داد کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے نانگے کی گردن پر وار کیا اور اس کی گردن آدھی کٹ گئی۔

فضل داد نے مزید وار کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ وہ تلوار ہاتھ میں لئے وہاں سے چل پڑا۔ اس نے خون روکنے کا جو انتظام کیا تھا وہ میں آپ کو پہلے سنا چکا ہوں۔ وہ چلتا گیا۔ معلوم یہی ہوتا تھا کہ ان دو نانگوں کے ساتھی بکھر کر اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔

فضل داد نے دیکھا کہ وہ ڈھلوان سے اتر رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں ٹیکریاں اور چٹانیں تھیں۔ کچھ اونچی اور کچھ کم بلند اور چھوٹی تھی۔ وہ چلتا گیا اور جہاں ڈھلوان ختم ہو رہی تھی وہاں سے اسے ایسی آواز سنائی دینے لگی جیسے آگے ندی بہہ رہی ہو۔ وہ چھوٹے چھوٹے درختوں میں سے گزرتا جب آگے گیا تو واقعی ایک ندی تھی جو پہاڑی

کے دامن میں بہہ رہی تھی۔

ندی کا پانی گدلا تھا۔ کیونکہ بارشوں کا موسم تھا اس لئے ہر طرف سے پانی بہہ بہہ کر ندی میں آتا تھا۔ فضل داد ندی میں اتر گیا۔ ندی کی گہرائی اس کے گلے تک یعنی کندھوں تک تھی۔ چونکہ یہ پہاڑی ندی تھی اس لئے اس کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ فضل داد نے اپنے آپ کو ندی کے حوالے کر دیا اور اپنے آپ کو پانی سے اوپر رکھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

میں اس کے باقی سفر کی تفصیلات نہیں سناؤں گا۔ صرف یہ سناتا ہوں کہ ندی اسے خطرے کے علاقے سے بہت دور لے گئی اور جب صبح طلوع ہوئی تو وہ ایسے علاقے میں پہنچ چکا تھا جو ناگوں کے علاقے سے بالکل ہی مختلف تھا۔ وہ بڑا ہی جان لیوا اور کٹھن سفر طے کر کے مجھ تک پہنچا تھا۔

فضل داد پر جو بیتی ' وہ اس نے سنا تو دی لیکن اس کا سانس پھول گیا۔ میں نے فضل داد خان کا یہ انوکھا اور ناقابلِ فراموش واقعہ ایک تمہید باندھ کر سنانا شروع کیا تھا۔ میں نے کچھ زندہ مثالیں دے کر واضح کیا تھا کہ انسان میں آدم خوری شروع سے چلی آ رہی ہے اور اب تک انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ اس کی تازہ مثال چین کے جنوبی علاقے میں دیکھنے میں آئی ہے۔ یہ تفصیلات ایک بار پھر پڑھ لیں (شمارہ اگست 1995ء)۔ یہ کوئی حیرت ناک بات نہیں تھی کہ ہندوستان اور برما کی سرحد پر ایک علاقے میں ناگے قبائل رہتے تھے جو انسان کا گوشت کھا لیتے تھے۔

فضل داد لیٹ گیا تھا اور اس کا رنگ کچھ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اسے چکر آنے لگے ہیں۔ میں نے اس کے لئے دودھ منگوایا جس میں شہد ملا ہُوا تھا۔ اس نے تھوڑا سا دودھ پیا اور چھوڑ دیا۔ وہ پھر لیٹ گیا۔

"یہ گاڑی بہت دیر سے پہنچے گی" ــــ فضل داد نے کہا۔ اس کی نظریں چھت پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا ــــ "نہ یار نہ..... چاچے کو دیکھو..... چادر ٹھیک طرح باندھ..... پاگل ہو گیا ہے حرامی!"

اس کے یہ الفاظ مجھے آج تک یاد ہیں۔ میں نے اس کے ماتھے پر پھر سینے پر ہاتھ رکھا۔ اس کا جسم تپ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ بخار بہت تیز ہو گیا ہے اور یہ بخار اس کے دماغ کو چڑھ گیا ہے..... وہ پہلے تو صاف الفاظ میں اوٹ پٹانگ باتیں کرتا تھا پھر اس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑانا شروع کر دیا۔ میں اس کی یہ حالت دیکھ کر گھبرایا لیکن فوج میں کچھ باتیں سیکھ لی تھیں۔ میرے جھونپڑے کے باہر ہر وقت دو آدمی موجود رہتے تھے۔ میں

نے انہیں بلایا اور کہا کہ ایک پیالے میں پانی لے آئیں اور دو چھوٹے چھوٹے کپڑے بھی لیتے آئیں۔

پانی اور کپڑے آ گئے تو میں نے ایک کپڑا بھگو کر فضل داد کے ماتھے پر رکھا اور ان آدمیوں سے کہا کہ وہ اسی طرح باری باری فضل داد کے ماتھے پر پانی کی پٹیاں رکھتے رہیں۔

برما کے جنگلوں کی انتہائی خطرناک بیماری ملیریا تھا۔ وہ جنگل مچھروں کو ہی پالتے تھے جن میں کچھ مچھر بڑے ہی زہریلے تھے۔ میں تو یہی سمجھا کہ فضل داد کو ملیریا ہو گیا ہے لیکن علامات ملیریے والی نہیں تھیں۔ نہ اس نے سردی محسوس کی نہ اسے ابکائیاں آئیں۔ وجہ جو کچھ بھی تھی، بخار بہت ہی تیز تھا۔ میرے پاس جاپانیوں کا فرسٹ ایڈ بکس موجود تھا جس میں مرہم پٹی کے سامان کے علاوہ کچھ اور دوائیاں بھی ملیں۔ یہ معلوم کرنا ممکن نہیں تھا کہ کون سی دوائی کس مرض کے لئے ہے کیونکہ ان پر جو کچھ لکھا تھا وہ جاپانی زبان میں تھا۔ میں نے وانگ کو بلا بھیجا اور خود فرسٹ ایڈ بکس کھول کر دوائیاں دیکھنے لگا۔ ایک شیشی پر جو لیبل لگا ہُوا تھا، اس پر جاپانی زبان چھپی ہوئی تھی لیکن لیبل پر مچھر کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ دوائی ملیریا کی ہے۔

وانگ آیا تو میں نے اسے فضل داد کی حالت بتائی۔ وانگ نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو فضل داد نے اس کی طرف دیکھا۔

"گاڑی میں کتنی دیر ہے؟" ـــ فضل داد نے کہا ـــ "بارش نے گاڑی کو روک لیا ہے"۔

"دیکھا وانگ!" ـــ میں نے کہا ـــ "بخار اتنا تیز ہے کہ یہ دماغ کو چڑھ گیا ہے اور یہ بے معنی باتیں کر رہا ہے"۔

"یہ ٹھنڈی پٹیاں رکھتے رہو" ـــ وانگ نے کہا ـــ "میں ابھی آتا ہوں"۔

میں نے وانگ کے آنے تک اس شیشی میں سے ایک گولی نکالی جس پر مچھر کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ یہ گولی فضل کے منہ میں ڈالی اور اس کے سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر ذرا سا ہلایا اور پانی پلا دیا۔

پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ وانگ ایک بوڑھے برمی کو ساتھ لے آیا۔ میں اس برمی کو جانتا تھا لیکن اسے کبھی اہمیت نہیں دی تھی کیونکہ اسے میں دوسرے برمیوں کی

طرح عام سا اور غریب سا آدمی سمجھتا تھا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اُردو بول لیتا اور سمجھ بھی سکتا تھا۔ اس نے فضل داد کی نبض دیکھی اور ماتھے پر ہاتھ رکھا اور مجھ سے پوچھا کہ اسے کس طرح بخار چڑھا تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ میرے خیال کے مطابق یہ ملیریا نہیں کیونکہ ملیریا میں اتنی زیادہ سردی لگتی ہے کہ تین چار کمبل بھی اس سردی کو روک نہیں سکتے اور اسے ابکائیاں بھی نہیں آئیں..... بوڑھے برمی نے کہا کہ اس کے زخموں سے پٹی اتار دو۔

میں نے فضل داد کی ٹانگ اور بازو سے پٹیاں کھول دیں۔ زخموں کی حالت دیکھ کر میں تو کانپ گیا۔ زخموں میں پیپ پڑی ہوئی تھی اور ان کے اردگرد سرخی آ گئی تھی۔ بوڑھے برمی نے کہا کہ یہ ہے بخار کی اصل وجہ اس نے وانگ سے اپنی زبان میں کچھ کہا اور مجھے اردو میں یہ کہہ کر وانگ کے ساتھ کمرے سے نکل گیا کہ اس کے زخم دوائی سے صاف کر دو، ہم ابھی آتے ہیں۔

میں نے فرسٹ ایڈ بکس میں سے مرہم پٹی والے سامان میں رکھی ہوئی تین چار بوتلیں کھول کر سُونگھا۔ ایک میں سے مجھے سپرٹ کی ہلکی ہلکی بُو آئی۔ میں نے یہ روئی پر ڈال کر فضل داد کے زخم صاف کرنے شروع کئے۔ وہ درد سے تڑپنے لگا۔ میں نے اسے کہا کہ ذرا دل مضبوط کرے۔ وہ فوجی جوان تھا اس لئے اس نے برداشت کیا۔

کوئی نصف گھنٹہ بعد وانگ اور بوڑھا برمی آ گئے۔ وہ اپنے ساتھ دو قسم کے پودوں کے پتے لائے تھے۔ ایک قسم کے پتے زیادہ چوڑے تھے اور دوسرے لمبوترے اور کچھ کم چوڑے تھے۔ بوڑھا برمی باورچی خانے میں چلا گیا۔ اس نے آگ جلا کر پانی گرم ہونے کے لئے رکھا اور ایک قسم کے پتے اس پانی میں صاف کر کے فضل داد کے پاس آ بیٹھا۔ اس نے پتے زخموں پر اس طرح رکھے کہ زخم پوری طرح ڈھک گئے۔ ان پتوں پر ایک اور تہہ پتوں کی رکھ دی اور مجھے کہا کہ اب پٹیاں باندھ دوں۔ میں نے پٹیاں باندھ دیں۔

بوڑھا برمی دوسری قسم کے پتے اُبلتے ہوئے پانی میں ڈال آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ ایک گھنٹہ انہیں اُبالنا ہے۔

اندازاً ایک گھنٹے بعد اس نے پانی چولہے سے اتارا اور باہر کھلی ہوا میں رکھ دیا۔ خاصی دیر بعد اس نے وانگ سے کچھ کہا۔ وانگ باہر نکلا اور جب وہ واپس آیا تو اس کے

ہاتھ میں ایک پیالی تھی۔ اس میں ابلے ہوئے پتوں کا پانی تھا جو اس نے دوسری پیالی میں ڈالا اور اس طرح دونوں پیالیوں میں پانی پھینٹ کر ٹھنڈا کیا اور پھر یہ پانی فضل داد کو اٹھا کر پلا دیا گیا۔ فضل داد کا چہرہ بتا رہا تھا کہ پانی بہت ہی کڑوا ہے۔

بوڑھے برمی نے مجھے کہا کہ تین گھنٹوں کا اندازہ رکھ کر اسے ایک پیالی اس پانی کی اور پلا دینا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس کی پٹیاں کل اسی وقت کھلیں گی۔ میں نے بوڑھے برمی اور وانگ سے پوچھا کہ ان پتوں کا کیا اثر ہو گا۔ برمی نے بتایا کہ ان پتوں کا اپنا ایک اثر تو ہے لیکن اس پانی میں اس نے تھوڑی سی ہلدی بھی ڈالی تھی۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ ہلدی زخموں کے لئے بہت اچھی ہوتی ہے۔ وانگ نے بتایا کہ ان پتوں کا پانی اس کی پیپ اندر ہی اندر خشک کر دے گا اور بخار تھوڑی دیر بعد اُتر جائے گا۔

پندرہ بیس منٹ بعد ہم نے دیکھا کہ فضل داد کا بڑبڑانا کم ہو گیا تھا اور کچھ دیر بعد ختم ہو گیا۔ اسے سکون سا محسوس ہونے لگا جو ہم نے اس طرح محسوس کیا کہ اس کی بے چینی ختم ہو گئی تھی۔ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں جاری رکھی گئیں۔

بوڑھا برمی اور وانگ میرے پاس ڈیڑھ دو گھنٹے موجود رہے اور سورج غروب ہو گیا۔ اس وقت وہ اٹھے اور چلے گئے۔ پانی کی پٹیاں روک دی گئی تھیں۔ بوڑھے برمی نے کہا تھا کہ اسے ویسے شہد دے دینا لیکن دودھ میں نہ دینا کیونکہ زخموں کی صورت میں دودھ پس پیدا کرتا ہے۔

فضل داد نے کھانا ٹھیک طرح کھا لیا لیکن وہ کمزوری محسوس کر رہا تھا یا شاید اتنے تیز بخار کا اثر تھا کہ اس کی شگفتگی اور شگفتہ کلامی بالکل ہی ماند پڑ گئی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ زخموں میں درد بہت کم ہو گیا ہے۔ میں نے کھانے کے بعد اسے پانی کی ایک پیالی اور پلا دی تھی۔

مجھے ایک خطرہ نظر آنے لگا۔ یہ خطرہ گینگرین Gangrene کا تھا۔ اگر زخم کی مرہم پٹی نہ ہو اور یہ پرانا ہو کر خراب ہو جائے تو اس میں ایک زہر پیدا ہو جاتا ہے جو جسم میں پھیلتا اور زخمی کی جان ہی لے لیتا ہے۔ گینگرین عموماً ان جنگلوں میں پیدا ہوتی ہے جن میں نمی زیادہ ہوتی ہے مثلاً بنگال کے جنگل اور برما کے جنگل اور ایسے ہی جنگل جن میں اپنی نمی کے علاوہ سمندر کی ہوا کے ذریعے بھی نمی آتی ہے۔ اگر بازو یا ٹانگ کے زخم میں گینگرین پیدا ہو جائے اور زخمی کو ہسپتال پہنچا دیا جائے تو اس کا ایک ہی علاج کرتے ہیں

کہ متاثرہ بازو یا ٹانگ کاٹ کر جسم سے الگ کر دیتے ہیں۔

میرے دل میں یہ خوف بیٹھ گیا کہ فضل داد کے زخموں میں گینگرین آ گئی تو اس کا لازمی نتیجہ موت ہو گا۔ بوڑھے برمی نے زخموں پر پتے تو بندھوا دیئے تھے لیکن مجھے ان پر بھروسہ نہیں تھا۔ دیہات میں لوگ ایسے ہی ٹوٹکے کیا کرتے ہیں اور زخم خراب ہو جاتے ہیں۔ میری مجبوری یہ تھی کہ میں فضل داد کو کسی ہسپتال میں نہیں لے جا سکتا تھا۔ میں نے ایک علاج اور کیا تھا کہ جب فضل داد کے زخموں کی پہلی مرہم پٹی کی تھی تو دو شیشیوں میں سے ایک ایک گولی اسے کھلا دی تھی۔ یہ شیشیاں مرہم پٹی کے سامان میں رکھی ہوئی تھیں اس لئے مجھے خیال آیا کہ یہ گولیاں زخموں پر اچھا اثر کریں گی۔ اب میں نے اسے ایک ایک گولی اور کھلا دی۔

اب وہ ہوش و حواس کی باتیں نارمل طریقے سے کر رہا تھا۔ باتیں کرتے کرتے اور میری سنتے سنتے وہ سو گیا۔ اس سے مجھے یہ اطمینان ہُوا کہ وہ اب زخموں میں درد محسوس نہیں کر رہا۔

○

اگلی صبح وہ ٹھیک حالت میں اٹھا' باہر گیا اور تھوڑا گھوم پھر کر واپس آیا اور ہم نے اکٹھے ناشتہ کیا۔ اس نے بتایا کہ اب زخموں میں درد اتنا سا ہی رہ گیا ہے جسے وہ آسانی سے برداشت کر سکتا ہے۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے بولنے کے انداز میں افسردگی اور کچھ مایوسی سی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ امید افزا اور حوصلہ بڑھانے والی باتیں کیں لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہُوا اور اس کی افسردگی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ بخار تھا ہی نہیں اور اگر تھا تو بہت ہی کم تھا۔

وہ باتیں کرنے اور سننے کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا۔ وہ ذرا پرے ہٹ کر لیٹ گیا۔ اس کی نظریں چھت پر لگی ہوئی تھیں اور چہرے کا تاثر بتاتا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں کھو گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ اسے آرام ہی کرنے دوں لیکن میں اس وقت چونکا جب اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ میں بڑی تیزی سے سرک کر اس کے قریب ہو گیا اور اس سے پوچھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ اگر آج کی زبان میں بات کروں تو میں کہوں گا کہ اُس پر ڈیپریشن طاری ہو گئی تھی۔ اُس وقت میں ڈیپریشن کے لفظ سے واقف ہی نہیں تھا۔ میرے بار بار پوچھنے پر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اللہ مجھے سزا دے رہا ہے" — اس نے ہاری ہوئی سی آواز میں کہا — "میں نے یہیں کُتوں کی موت مرنا ہے"۔

"بھائی فضل داد!" — میں نے کہا — "تم تو میرا حوصلہ بھی توڑ رہے ہو۔ تم فوجی ہو' حوالدار ہو اور تم اتنے دلیر اور بہادر ہو کہ ناگوں کے جال میں سے لڑ کر نکلے ہو لیکن اب تم نے تو ہمت کا دامن ہی چھوڑ دیا ہے۔ کیا مجھے اپنے عزیز رشتہ دار یاد نہیں آتے ہوں گے؟ لیکن میں نے دل کو سمجھا رکھا ہے کہ جب اللہ کو منظور ہو گا' ہم اپنے گھروں میں پہنچ جائیں گے"۔

"میں خالی ہاتھ چار مسلح آدمیوں کا مقابلہ کر سکتا ہوں" — اُس نے کہا — "درندوں کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ تمہیں ابھی تک صحیح پتہ نہیں چلا کہ میں کتنا زیادہ دلیر اور جرأت والا ہوں لیکن میرے بھائی! میں خدائی طاقت کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا..... مجھے خدا کی طرف سے بڑی سخت سزا مل رہی ہے۔ میں جس گلائیڈر میں یہاں آیا تھا وہ گر کر تباہ ہو گیا اور میں موت سے بچ نکلا۔ پھر جاپانیوں نے گھیر کر آگ برسائی تو میں پھر موت کے منہ سے نکل آیا اور پھر ننگے آدم خوروں سے بھی بچ نکلا۔ یہ خدائی اشارے ہیں جو میں نے سمجھ لئے ہیں۔ میں نے بڑی بری موت مرنا ہے جس کی ایک نشانی یہ ہے کہ میرے زخموں میں پس پڑ گئی ہے اور زخموں کا زہر میرے جسم میں پھیل رہا ہے"۔

"اگر ایسا ہوتا تو تمہارا بخار کم نہ ہوتا" — میں نے اس کا حوصلہ قائم رکھنے کے لئے کہا — "صاف پتہ چل رہا ہے کہ تم بہتر ہو رہے ہو"۔

"میں ویسے ہی نہیں کہہ رہا کہ اللہ مجھے سزا دے رہا ہے" — اُس نے کہا — "میں نے ایک ایسا گناہ کیا ہے جو خدا کبھی معاف نہیں کرے گا"۔

میرے دماغ میں یہی ایک بات آتی تھی کہ فضل داد کے دماغ پر کل کے اتنے تیز بخار کا اثر ہے اور اسی اثر کے تحت یہ اتنا زیادہ افسردہ اور کم حوصلہ ہو گیا ہے۔ میں نے اسے اپنی یہ تشخیص بتائی بھی لیکن اُس نے کوئی اثر قبول نہ کیا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"تم کسی پیر کے مرید تو ضرور ہی ہو گے!" — اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"بالکل نہیں!" — میں نے کہا — "میں صرف اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا پیر مانتا ہوں"۔

"میں دوسرے پیروں کی بات کر رہا ہوں یار!" — فضل داد نے کہا — "یہ جو گدّی نشین ہوتے ہیں' ان میں سے تم نے کسی کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس کے مرید بن گئے ہو گے"۔

میں نے اسے پرانا واقعہ سنایا کہ میں نے اور میرے ایک دوست نے اپنے علاقے کے ایک مشہور اور مقبول پیر کو ننگا کر کے درخت کے ساتھ باندھا اور اسے مار مار کر بے ہوش کر دیا تھا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اس کی ہمیں کوئی غیبی سزا نہیں ملی۔

"پھر تم اس جنگل میں مرو گے" — فضل داد نے کہا — "کیا یہ سزا نہیں کہ تمہارا اتنا اچھا کاروبار رنگون میں تباہ ہو گیا ہے اور اب تمہیں اس جنگل سے نکلنے کا راستہ ہی نہیں مل رہا"۔

میں نے اسے یہی بتایا تھا کہ میری رنگون میں دکان تھی۔ ابھی اسے یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میں فوجی ہوں اور میں کس ارادے سے اپنے مورچوں سے بھاگ آیا تھا۔

"تم مانو نہ مانو' تم پیر کے بددعائے ہوئے ہو" — فضل داد نے کہا۔

"بھائی فضل داد" — میں نے کہا — "میں نے یہاں ایک اژدھا مارا ہے' ایک شیر مارا ہے' جاپانیوں کی ایک پوری سیکشن یہاں آ گئی تھی۔ میں نے پوری سیکشن کو اکیلے ختم کر دیا تھا اور اب تمہیں موت کے منہ سے نکال کر اور ایک مگرمچھ کو گولی مار کر یہاں لے آیا ہوں..... میں بلکہ میری روح محسوس کرتی ہے کہ میرے سر پر اللہ کا ہاتھ ہے"۔

"تم جو جی چاہے کہو" — فضل داد نے کہا — "میں مانتا ہوں کہ مجھے سزا مل رہی ہے"۔

"تم گناہ کیا کر بیٹھے تھے بھائی!" — میں نے پوچھا — "وہ گناہ ہی مجھے بتا دو"۔

"میں نے اپنے پیر کا دل دکھایا ہے" — فضل داد نے کہا — "پہلے تو میں خوش رہا کہ میں نے جو کیا ٹھیک کیا ہے لیکن اس جنگل میں آ کر جو مجھ پر گزری اور گزر رہی ہے' اس سے میں سمجھ گیا کہ مجھے پیر کی بددعا مار رہی ہے"۔

میرے کہنے پر اس نے اپنا یہ گناہ سنایا۔ یہ میں اپنے الفاظ میں پیش کروں گا۔ اس سے پہلے ایک بات کہوں گا' وہ یہ ہے کہ میں ایک ایسی دنیا میں بیٹھا ہُوا تھا' جو آج سوچتا ہوں تو خواب و خیال کی دنیا لگتی ہے۔ وہاں کے لوگ اجنبی' ان کی زبان اجنبی اور وہ جنگل

ایسا جو دنیا بھر کے جنگلوں سے نرالا اور خطرناک تھا۔ ایک بات اور کہوں گا' وہ یہ کہ میں نے کہا ہے کہ وہ لوگ اجنبی تھے لیکن ان میں مسلمان بھی تھے۔ ان کے ساتھ کبھی اٹھنا بیٹھنا یا بولنا چالنا ہوتا تھا تو ایسے لگتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہیں بلکہ ہمارا آپس میں کوئی روحانی تعلق ہے۔ وہ تعلق کوئی راز نہیں تھا بلکہ بالکل صاف ہے کہ یہ اسلام کا تعلق اور رشتہ تھا۔

میں نے یہ بات اس لئے کہی ہے کہ میں اپنے وطن سے دُور دراز ایک گھنے جنگل میں بیٹھا تھا جہاں کی ہر چیز میرے لئے نئی و نرالی تھی لیکن فضل داد جب اپنی کہانی سنا رہا تھا تو مجھے یوں لگا جیسے میں واپس اپنے دیس میں اور کلچر میں آگیا ہوں۔ میں آپ کو کچھ دیر کے لئے برما کے جنگلوں سے واپس اپنے دیس میں لے آتا ہوں جہاں پیروں کی حکمرانی ہے اور کسی نہ کسی پیر کا مرید ہونا یوں سمجھا جاتا ہے جیسے نعوذ باللہ خدا مل گیا ہو۔ فضل داد جس علاقے کا رہنے والا تھا' وہاں دیہات میں کسی کو کوئی دکھ درد ہوتا خواہ کوئی جسمانی بیماری ہی ہوتی' لوگ اللہ کو پکارنے سے پہلے پیر کے دروازے پر جا پہنچتے تھے اور فی الواقع سجدے کرتے تھے۔ میرے اپنے علاقے کی یہی حالت تھی۔ اب بھی پیری مریدی اسی جوش سے چل رہی ہے۔ فضل داد کی کہانی کوئی نئی واردات نہیں لیکن ذرا سا فرق یہ ہے کہ میری طرح فضل داد بھی اپنے پیر کے خلاف باغی ہو گیا تھا۔ اب وہ مصیبت میں گرفتار ہُوا تو اس کے دل پر یہ وہم بیٹھ گیا کہ اسے اپنے پیر کی بددعا لگی ہے۔

یہ وقوعہ یوں ہُوا کہ سات آٹھ سال پہلے فضل داد کی شادی اپنے گاؤں میں ہی ہوئی۔ اس وقت وہ نائیک تھا۔ وہ اپنے علاقے کے ایک بڑے مرتبے کے پیر کا مرید تھا۔ اس کا سارا خاندان اس پیر کو برحق اور برگزیدہ مانتا تھا۔ ایک سال بعد فضل داد حوالدار ہو گیا۔ عقیدتمندی کے اظہار کا ایک دلچسپ طریقہ بھی آپ کو سنا دیتا ہوں۔ یہ میں نے اپنی آنکھوں دیکھا ہے۔ یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں فضل داد کی مثال سنا کر یہ طریقہ واضح کر دیتا ہوں۔

فضل داد جب حوالدار ہُوا تو اس نے اس ترقی کو پیر کا خاص کرم اور خاص نوازش سمجھا۔ وہ چھٹی آیا اور اگلے روز دو میراثیوں کو ساتھ لیا جو ڈھول لائے تھے۔ اس کے اپنے خاندان کا ہر فرد ساتھ تھا اور کچھ رشتے دار بھی ساتھ ہو گئے۔ فضل داد سبز کپڑے کا ایک جھنڈا بنوا کر ساتھ لایا تھا۔ اس پر کلمہ طیبّہ لکھا ہُوا تھا۔ یہ جھنڈا ایک بانس کے ساتھ

لگا ہُوا تھا۔

جھنڈا فضل داد نے اپنے ہاتھ میں لیا اور یہ پورا جلوس پیر صاحب کے گھر کی طرف چل پڑا۔ آگے آگے دونوں میراثی ڈھول بجاتے جا رہے تھے۔ پیر کا گھر دوسرے گاؤں میں تھا جس کا فاصلہ تقریباً" تین میل تھا۔ یہ جلوس پیدل جا رہا تھا۔ دو تین چنگیروں میں بتاشے' پھل فروٹ اور مٹھائی بھی ساتھ تھی۔

پیر صاحب کو پہلے سے اطلاع کر دی گئی تھی کہ ان کا ایک مرید شکرانے کے لئے حاضری دینے آ رہا ہے۔ یہ جلوس پیر کے دروازے پر پہنچا تو انہیں کہا گیا کہ پیر دستگیر اپنے کمرے میں بیٹھے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ فضل داد نے اس کمرے میں جا کر وہ جھنڈا جس پر کلمہ طیبّہ لکھا تھا پیر کے قدموں پر رکھ دیا۔ پھر اس کے پاؤں پر سجدہ کیا۔ چنگیریں پیش کیں اور کچھ نذرانہ نقد پیش کیا۔ پیر نے اسے حوالداری کی ترقی کی مبارک دی اور دعا کی اور پیشین گوئی کی کہ تمہیں ابھی اور ترقی ملے گی۔ جلوس کے ساتھ جو لوگ آئے تھے ان سب نے پیر کے پاؤں پر ماتھا رگڑا اور یہ جلوس ڈھول بجاتا واپس آ گیا۔

ہمارے علاقے میں جب کسی کا بیٹا لڑکپن سے نکل کر جوانی میں داخل ہوتا تھا تو ماں باپ اسے پیر کا مرید بنانے کے لئے اسی طرح ڈھول بجاتے ایک جلوس کو ساتھ لے کر پیر کے حضور حاضری دیتے تھے۔ وہ جب واپس آتے تو لوگ انہیں مبارک دیتے تھے کہ ان کے لڑکے نے پیر کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے۔

اللہ کا کرنا یوں ہُوا کہ تقریباً" چار سال گزر گئے' فضل داد کا کوئی ایک بھی بچہ پیدا نہ ہُوا۔ لڑکی کے سسرال والے یہ توقع رکھا کرتے ہیں کہ ایک سال بعد پہلا بچہ پیدا ہو جانا چاہئے۔ بعض سسرال والے ایک سال کی مزید مہلت دے دیا کرتے ہیں۔ پھر بھی کوئی آثار نظر نہ آئیں تو لڑکی کو شکی نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ پیروں کے پاس جا پہنچتے اور اپنا یہ مسئلہ پیش کرتے ہیں۔ پیر جو کچھ کرتے ہیں اس کی طرف سے یہ لوگ اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ فضل داد کی شادی کو تو چار سال ہونے کو آئے تھے۔ اسے کس طرح معاف کیا جا سکتا تھا؟

فضل داد کو فیملی کوارٹر مل گیا تھا اور اس کی بیوی اس کے ساتھ تھی۔ اس کے دوست اور دیگر ساتھی پوچھتے رہتے تھے کہ بچی بچہ ہُوا یا نہیں۔ فضل داد اب یہ کہتے ہوئے شرماتا تھا کہ کوئی بچہ نہیں ہُوا۔ اسے وہ اپنی مردانگی پر بہت بڑی چوٹ سمجھتا تھا۔ وہ

انگریزوں کا زمانہ تھا۔ اس کا پلاٹون کمانڈر ایک انگریز لیفٹیننٹ تھا۔ کسی طرح اسے پتہ چل گیا کہ فضل داد کا یہ مسئلہ ہے۔ اس انگریز نے اسے اور اس کی بیوی کو سی ایم ایچ (فوجی ہسپتال) کے ایک ڈاکٹر کے پاس معائنے کے لئے بھیج دیا۔ وہ ڈاکٹر بھی انگریز تھا۔ اس نے دونوں کا معائنہ کیا اور کچھ ٹسٹ بھی کئے اور دونوں کے متعلق یہ رپورٹ دی کہ دونوں میں کوئی نقص نہیں۔ اس نے دونوں کو دوائیاں بھی دیں لیکن پانچ چھ مہینے دوائیاں استعمال کرنے کے بعد بھی کوئی اثر نہ ہُوا۔

فضل داد نے ایک بار چھٹی کے دوران راولپنڈی کی ایک لیڈی ڈاکٹر سے بھی اپنی بیوی کا معائنہ کرایا اور اس لیڈی ڈاکٹر کے کہنے پر فضل داد نے اپنا بھی چیک اپ کروایا اور جو ٹسٹ ڈاکٹر نے کیا وہ بھی کروایا۔ اس لیڈی ڈاکٹر اور ڈاکٹر نے بھی یہی رپورٹ لکھی کہ دونوں بالکل ٹھیک ہیں، بچے پیدا کرنے کی قدرتی صلاحیت رکھتے ہیں اور کوئی رکاوٹ نہیں۔ انہوں نے بھی جو دوائیاں لکھ کر دیں وہ ان دونوں میاں بیوی نے کھائیں لیکن نتیجہ صفر رہا۔

فضل داد اور اس کی بیوی کی مائیں بہت ہی پریشان تھیں۔ دونوں مائیں باقاعدگی سے پیر کے ہاں جا کر اس کے آگے ماتھے رگڑ رہی تھیں اور نذرانے بھی پیش کر رہی تھیں۔ پیر نے حسبِ معمول تعویذ بھی دیئے اور جو چکر وہ ہر کسی کے ساتھ چلایا کرتا تھا، وہ سب آزما دیکھے لیکن فضل داد بے اولاد رہا۔

فضل داد کی ماں نے اور اس کے بعد اس کے باپ نے بھی اسے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس کی بیوی نے بچہ پیدا کرنا ہوتا تو اب تک پیدا ہو چکا ہوتا۔ اب یہ بات پکی ہو گئی ہے کہ یہ لڑکی بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں اور اسکا صرف یہ علاج ہے کہ فضل داد دوسری شادی کرے۔ یہ بیوی رہنا چاہتی ہے تو رہے ورنہ اسے طلاق دے دی جائے۔

فضل داد نے مجھے سنایا کہ وہ اس بیوی کو کسی قیمت پر طلاق نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس کی بیوی اپنی اس بد نصیبی پر روتی تھی۔ فضل داد نے اسے اپنا یہ فیصلہ سنا دیا تھا کہ وہ دوسری شادی نہیں کرے گا نہ ہی اسے طلاق دے گا..... فضل داد کے اس فیصلے کی وجہ یہ تھی کہ وہ عام خاوندوں کی طرح بیوی کو اپنی زر خرید لونڈی نہیں سمجھتا تھا بلکہ اس کے دل میں بیوی کی محبت رچ بس گئی تھی۔ اس لئے نہیں کہ بیوی خاص طور پر خوبصورت تھی بلکہ فضل داد اسی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا اور یہی اسے اچھی لگتی تھی اس بیوی

کی عادتیں اور فطرت اس کے حسن سے زیادہ اچھی اور خوبصورت تھیں۔ فضل داد اس چھٹی کے دوران اپنے پیر کے پاس گیا۔ بیوی اس کے ساتھ تھی۔ دونوں نے پیر کے قدموں پر سجدہ کر کے اور آنسو بہا کر عرض کی کہ انہیں ایک بچّہ عنایت فرمادیں۔

پیر نے کہا کہ اسے ایک شک ہو گیا ہے۔ یہ جنّات کی انتقامی کارروائی ہے۔ یہ کاکی کسی ایسی جگہ غلاظت پھینک چکی ہے جو ان جنّات کا ڈیرہ تھا یا اس سے کوئی بد پرہیزی یا کسی بزرگ کی بے ادبی ہو گئی ہے۔ پیر نے کہا کہ وہ اصل وجہ معلوم کرنا چاہتا ہے جس کے لئے ضروری ہے کہ یہ کاکی اس کے پاس اکیلی بیٹھے۔ پیر نے یہ بھی کہا کہ اس کی یا فضل داد کی ماں یا دونوں مائیں ساتھ آسکتی ہیں لیکن دونوں باہر بیٹھیں گی۔ فضل داد اس پیر کا مرید تھا اور دل و جان سے اسے پہنچ والا مانتا تھا۔ اس نے بیوی کو ساتھ واپس لے جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور پیر کے آستانے سے واپس آ کر اپنی ماں اور اپنی ساس کو بتایا کہ پیر صاحب نے یہ حکم دیا ہے۔

یہ پیر ضعیف العمر تھا۔ اس کے ہاتھوں میں رعشہ آ گیا تھا۔ پیر کے دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا بال بچے دار تھا اور دوسرے کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی عمر اکیس بائیس سال ہو گئی تھی اور وہ کتوں اور باز کے شکار کا عادی اور شوقین تھا۔ فضل داد بیوی کو اپنے گھر چھوڑ کر واپس اپنی یونٹ میں چلا گیا۔ اسے بذریعہ خطوط اطلاعیں ملتی رہیں کہ اس کی بیوی کو پیر کے ہاں باقاعدہ لے جایا جا رہا ہے اور پیر صاحب خود کوئی روحانی عمل کر رہے ہیں اور تعویذ بھی دے رہے ہیں۔

ابھی جنگِ عظیم شروع نہیں ہوئی تھی اس لئے لمبی چھٹی مل جاتی تھی۔ جنگ کا خطرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ فضل داد کو ڈیڑھ مہینے کی چھٹی مل گئی۔ یہ اس کا سال میں ایک بار حق بنتا تھا۔ فضل داد گھر آیا اور اپنی بیوی کو پہلے سے زیادہ پریشانی کی حالت میں دیکھا۔ فضل داد نے اسے بہلانے کے لئے کہا کہ اللہ کو منظور ہُوا تو مراد پوری ہو جائے گی اور اس نے یہ بھی کہا کہ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں لیکن بیوی نے جب بات کی تو پتہ چلا کہ بیوی کو ایک اور ہی پریشانی لگ گئی ہے۔

بیوی نے فضل داد کو یہ پریشانی سنائی۔ پیر خود تو ضعیف العمر تھا اور اس کے جسم میں سوائے رعشہ کے کچھ بھی نہیں رہا تھا لیکن اس کا چھوٹا بیٹا جوان تھا اور وہ عورتوں کا شکاری تھا۔ اپنے باپ کی مریدنیوں پر نظر رکھتا اور ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیتا

تھا۔ اس کی یہ کرتوت سب جانتے تھے لیکن کبھی کسی عورت یا جوان لڑکی کی طرف سے یہ شکایت نہیں ملی تھی کہ اس نوجوان لڑکے نے اس پر دست درازی کی ہو۔ یہ بھی سب جانتے تھے کہ جو لڑکی اس پیرزادے کے جال میں آتی ہے وہ خوشی محسوس کرتی ہے کہ پیر کا بیٹا اس پر مہربان ہو گیا ہے۔ وہ کمبخت ویسے بھی بڑا خوبرو اور بڑے گٹھے ہوئے جسم کا جوان تھا۔ فضل داد کی بیوی نے بتایا کہ یہ لڑکا اس کے پیچھے پڑا ہُوا ہے۔ فضل داد کی بیوی بھی دیہاتن تھی لیکن اس کی زندگی میں پہلا اور آخری جو مرد داخل ہُوا وہ فضل داد تھا۔ اس کے دل میں فضل داد کی محبت موجزن تھی۔ وہ تو فضل داد کی پوجا کرنے کو بھی بُرا نہیں سمجھتی تھی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ فضل داد نے اپنے ماں باپ کو ناراض کر کے فیصلہ دے دیا تھا کہ وہ نہ دوسری شادی کرے گا اور نہ بیوی کو طلاق دے گا اور ساری عمر بے اولاد گذار دے گا۔ یہی وجہ تھی کہ فضل داد کی بیوی کے دل میں پیر کے بیٹے کی نفرت پیدا ہو گئی۔

بیوی نے فضل داد کو بتایا کہ چار پانچ مرتبہ یہ لڑکا اسے کھیتوں میں راستے میں آ کر روک چکا ہے اور اپنے غلیظ ارادے کا اظہار بھی اس نے کیا ہے۔ فضل داد کی بیوی نے اسے آخر یہ بھی کہا کہ وہ اپنے باپ کی پیری اور عزت کو خراب نہ کرے لیکن ایک روز اس خوبرو نوجوان نے فضل داد کی بیوی کو فصل کی اوٹ میں بازو سے پکڑ لیا اور اسے فصل میں گھسیٹنے لگا۔ اس غیرت مند بیوی نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا اس کے ساتھ ہی اس کے پیٹ میں ایسی لات ماری کہ وہ اس لڑکی کو چھوڑ کر دوہرا ہو گیا۔ ایک دو دنوں بعد پیرزادے نے فضل داد کی بیوی کو دھمکی دی کہ وہ اسے اغوا کروا کر چکلے میں بٹھا دے گا۔

میں اُس دور کی بات کر رہا ہوں جب لوگوں کے اپنے بھی کچھ کردار ہُوا کرتے تھے۔ فضل داد کا علاقہ 'خصوصاً" دیہاتی علاقہ' غیرت مندی میں مشہور تھا۔ غیرت مندی تو ہر کسی میں تھی لیکن اس علاقے کے دیہات میں غیرت پر خون خرابے اور قتل ہو جایا کرتے تھے۔ فضل داد نے اپنی بیوی سے یہ باتیں سنیں تو اس کا خون اس طرح ابل پڑا کہ غیرت مریدی پر غالب آ گئی۔ فضل داد نے مجھے سنایا کہ پیر تو اس لڑکے کا باپ تھا اور پیری کی ساری کرامات باپ کے ہاتھ میں تھیں۔ بیٹا تو بدکار اور بدمعاش تھا۔

فضل داد کا ایک چچازاد بھائی تھا جس کے ساتھ اس کا تعلق صرف رشتہ داری والا ہی نہیں تھا بلکہ ان میں بڑی گہری دوستی تھی۔ یہ لوگ معمولی قسم کے کسان نہیں بلکہ خوش

حال زمیندار تھے۔ کسی کی محتاجی نہیں تھی بلکہ محتاجوں کو دیا کرتے تھے۔ فضل داد نے اپنے اس چچازاد بھائی کو اپنی بیوی کی بات سنائی۔ چچازاد بھائی طبیعت کا کچھ زیادہ ہی گرم اور تیز تھا۔ اس نے کہا کہ اس پیرزادے کا پتہ ہی کاٹ دیتے ہیں۔ فضل داد نے اسے بتایا کہ اس کے اپنے دل میں بھی یہی ارادہ ہے۔ ان دونوں نے قتل کے طریقوں پر غور کرنا شروع کر دیا۔ غور اس پر کیا جا رہا تھا کہ یہ لڑکا مارا بھی جائے اور قاتل کا کچھ کھرا کھوج نہ ملے۔ سوچ سوچ کر انہوں نے یہ سکیم بنائی کہ فضل داد کی بیوی پیرزادے سے ملے اور اسے رات کو کہیں بلائے اور وہاں پیرزادے کا معاملہ صاف کر دیا جائے۔

○

فضل داد اور اس کے چچازاد بھائی نے فضل داد کی بیوی کو اس سکیم سے آگاہ کیا۔ بیوی بھی کسی گئے گزرے خاندان کی بیٹی نہیں تھی۔ وہ تین گھبرو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور اس کا باپ گاؤں میں رعب داب رکھتا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ پیر کے ہاتھ میں کوئی طاقت نہیں۔ اگر ہوتی تو اتنے عرصے میں اس لڑکی کی گود ہری ہو چکی ہوتی۔ پیر کا گھر تقریباً" تین میل دُور گاؤں میں تھا۔ پیر کا یہ آوارہ بیٹا باز اپنے ہاتھ پر بٹھائے شکار کے بہانے ادھر آ نکلتا تھا۔ فضل داد کی بیوی خوبصورت لڑکی تھی۔ پیرزادہ اسی کے پیچھے آیا کرتا تھا۔ تین دنوں بعد فضل داد کی بیوی کا پیرزادے سے آمنا سامنا ہو گیا۔ سکیم کے مطابق یہ لڑکی باہر کسی نہ کسی بہانے نکل جایا کرتی تھی۔ آخر اسے پیرزادہ مل گیا اور اس نے فضل داد کی بیوی کے ساتھ اپنے مطلب اور نیت کی باتیں شروع کر دیں۔ لڑکی نے شرم اور جھجک کی اداکاری کی اور کہا کہ اس نے کبھی کسی غیر مرد کے ساتھ ایسا تعلق نہیں رکھا۔ وہ بڑی استادی سے اداکاری کرتی رہی اور اس طرح رضامندی کا اظہار کیا کہ پیرزادہ رات کے وقت فلاں جگہ آ جائے اور وہ وہاں پہنچ جائے گی۔

پیر کے بیٹے نے یہ بھی نہ سوچا کہ فضل داد چھٹی آیا ہُوا ہے اور اس کی بیوی کا رات کے وقت باہر نکلنا ممکن نہیں ہو گا۔ اس کے دماغ پر بدی کا بھوت سوار تھا۔ اُس نے اسی جگہ آنے کے لئے کہہ دیا جو اسے اس لڑکی نے بتائی تھی۔ یہ جگہ دراصل فضل داد اور اس کے چچازاد بھائی نے منتخب کی تھی۔ یہ جگہ ایک برساتی نالے کا بلند کنارا تھا جہاں کھڈ تھے اور سرکنڈے بھی۔ اس برساتی نالے کو اس علاقے میں کَس کہا جاتا ہے۔ وہاں سے

یہ نالہ مڑتا تھا اس لئے وہاں پانی گہرا تھا۔ انہوں نے ایک خاص سکیم کے تحت اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔

○

رات کو جب گھر والے سو گئے تو فضل داد نے اپنی بیوی کو گھر سے روانہ کر دیا۔ کچھ دیر بعد فضل داد اپنے چچازاد بھائی کو ساتھ لے کر دوسرے راستے سے اس طرف چلا گیا۔ فضل داد کے ہاتھ میں تقریباً ایک گز لمبی رسّی تھی جو دراصل چارپائی کی ادوائن کا ٹکڑا تھا۔

یہ دونوں چکر کاٹ کر اس جگہ کے قریب پہنچ گئے۔ وہ کسی کو نظر نہیں آ سکتے تھے کیونکہ وہاں کھڈ بھی تھی اور سرکنڈے بھی۔

انہیں صاف نظر آ رہا تھا کہ پیرزادہ وہاں ٹہل رہا تھا اور چند منٹوں بعد فضل داد کی بیوی پہنچ گئی۔ پیرزادے نے لپک کر لڑکی کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ فضل داد کو معلوم تھا کہ ایسا ہی ہو گا لیکن اس نے جب اپنی بیوی کو ایک غیر مرد کے بازوؤں میں دیکھا تو اس کا دماغ جو پہلے ہی خراب ہو چکا تھا۔ بالکل ہی ماؤف ہو گیا اور اس پر پاگل پن سوار ہو گیا۔ اس نے چند قدم کا جو فاصلہ تھا شکار پر حملہ کرنے والے شیر کی طرح ایک لمحے میں طے کیا اور پیشتر اس کے کہ پیر کے اس بدمعاش بیٹے کو پتہ چلتا کہ پیچھے سے کون آیا ہے۔ رسّی اس کے گلے میں پڑ چکی تھی۔

پیر کے بیٹے نے فضل داد کی بیوی کو چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے رسّی کو پکڑنا چاہا لیکن رسّی بڑا سخت پھندہ بن چکی تھی اور فضل داد کے چچازاد بھائی نے پیرزادے کو اس طرح آگے سے جکڑ لیا تھا کہ اس کے بازو بھی گرفت میں آ گئے تھے۔ فضل داد نے رسّی کو بل دے دے کر اس کا پھندہ اتنا تنگ کر دیا کہ اس لڑکے کی سانس رک گئی۔ ادھر فضل داد کے چچازاد بھائی نے اسے اپنی طرف زور زور سے جھٹکے دے کر کھینچنا شروع کر دیا۔ عقب سے فضل داد رسّی کھینچ رہا تھا۔

پیرزادے کا تڑپنا ختم ہو گیا۔ فضل داد نے اس کی نبض پر انگلی رکھی تو نبض کو خاموش پایا۔ پیرزادہ مر چکا تھا۔

دونوں نے پیرزادے کو اسی طرح اٹھا کر اوپر سے نیچے پانی میں پھینک دیا اور فضل داد اپنی بیوی اور چچازاد بھائی کو ساتھ لے کر وہاں سے چل پڑا۔ دیہات میں لوگ شام کا

کھانا کھاتے ہی سو جاتے ہیں اور اس کے بعد یوں پتہ چلتا ہے جیسے اس گاؤں میں کوئی زندہ انسان ہے ہی نہیں۔ تینوں بڑے آرام سے اپنے اپنے گھر پہنچ گئے۔

○

اگلی صبح اس علاقے میں بھونچال آ گیا۔ ہر کسی کی زبان پر یہی الفاظ تھے کہ پیر دستگیر کا چھوٹا بیٹا قتل ہو گیا ہے اور اس کی لاش کَس میں پانی میں پڑی ہے۔ جسے دیکھو وہ اسی طرف دوڑا جا رہا تھا جہاں لاش پڑی ہوئی تھی۔

فضل داد صبح جاگا تو اسے پہلا خیال یہ آیا کہ وہ ساری جگہ کچی مٹی والی ہے جس پر اس کے اور اس کے چچازاد بھائی کے کھُرے موجود ہوں گے اُس کے دل پر خوف بیٹھ گیا۔ اس کے گھر کے افراد بھی موقعۂ واردات کی طرف جا رہے تھے۔ فضل داد اور اس کی بیوی بھی چل پڑے۔

وہاں تو ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ زیادہ تر لوگ پہلے اوپر کنارے پر جاتے اور وہاں سے دیکھ کر نیچے کَس میں اترتے تھے۔ فضل داد کو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ اس کے اور اس کے چچازاد بھائی اور اس کی بیوی کے کھرے لوگوں کے قدموں کے نیچے ختم ہو چکے ہیں۔

پولیس آ گئی تھی۔ تھانیدار نے لاش پانی سے نکلوا کر پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دی۔ ابھی یہ کسی کو بھی پتہ نہیں چلا تھا کہ پیرزادے کو قتل کیا گیا ہے۔ یہ خبر پھیلتی چلی گئی کہ جسم پر زخم یا چوٹ کا کوئی نشان نہیں۔ یہ تو شام کے وقت تھانے سے خبر نکلی تھی کہ پیرزادے کا گلا رسّی سے گھونٹا گیا تھا۔

یہ تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ مقتول کو فضل داد نے قتل کیا ہے۔ پیر کے سامنے فضل داد اور اس جیسے تمام لوگوں کی حیثیت مریدوں سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں تھی۔ فضل داد کی یا اس کے خاندان کی پیر کے ساتھ کوئی دشمنی بھی نہیں تھی۔ پورا خاندان اس پیر کا مرید تھا۔ فضل داد نے مجھے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ اسے ایسا کوئی ڈر نہیں تھا کہ قتل کا شک اس پر کیا جائے گا لیکن اس کے دل پر یہ خوف بیٹھ گیا کہ پیر پہنچ والا ہے اور اس کے ہاتھ میں جنّات بھی ہیں۔ یہ جنّات یا پیر صاحب کی اپنی روح معلوم کرے گی کہ اس کے بیٹے کو فضل داد نے قتل کیا ہے۔ دن پر دن گزرتے چلے گئے اور قاتل کا کوئی سراغ نہ ملا..... میں یہ بات آپ سب کو بتاتا ہوں کہ دیہاتی

علاقے کی اپنی ایک الگ تھلگ سیاست ہوتی ہے۔ علاقے کا تھانیدار، بڑا پیر، مختلف نمبردار اور دیگر سرکاری لوگ یعنی ذیلدار وغیرہ اس سیاست کے کردار ہوتے ہیں۔ یہ جو پیر تھا اس کی سیاست اسی طرح چل رہی تھی۔ اس علاقے کا ایک بہت بڑا زمیندار تھا جس کے ساتھ پیر کی کچھ چپقلش چل رہی تھی۔ اس دور میں ہندو اور سکھ بھی دیہات میں آباد تھے۔ فضل داد کے گاؤں میں ایک ہندو ساہوکار رہتا تھا جس کی آڑھت وسیع پیمانے پر چلتی تھی اور وہ لوگوں کو سود پر قرضے بھی دیتا تھا۔ اس کی اس پیر کے ساتھ کچھ دشمنی تھی۔ پیر نے تھانے میں اس کے اور مسلمان زمیندار کے خلاف شک لکھوا دیا۔ تھانیدار نے ان کی طرف رخ کر لیا۔

اس کے بعد یوں ہُوا کہ اس علاقے میں جو رجسٹرڈ غنڈے اور دیگر جرائم پیشہ لوگ تھے ان کی شامت آ گئی۔ تھانے میں ان پر بے پناہ تشدد کیا جاتا تھا لیکن کوئی بھی اقبالی نہ ہو رہا تھا۔ فضل داد کو پوری تسلی ہو گئی کہ اب تو وہ بالکل بھی نہیں پکڑا جائے گا۔

فضل داد نے مجھے اپنی اُس وقت کی ذہنی کیفیت سنائی وہ اس طرح تھی کہ جب اسے خیال آتا کہ اس نے ایک برگزیدہ پیر کے بیٹے کو قتل کر دیا ہے تو اس کا جسم اندر سے کھوکھلا اور کمزور ہو جاتا اور یہ خوف اس کے دل پر بیٹھ جاتا کہ پیر کی بددعا اسے لگے گی اور اس کے جنّات اس سے بدلہ لیں گے، لیکن اس کے سامنے جب اپنی غیرت آ جاتی تو اسے اپنی بیوی کی باتیں یاد آتیں کہ اس پیرزادے نے اس کی بیوی کے ساتھ کیا کیا حرکتیں کی تھیں تو اس کا دل مضبوط ہو جاتا اور وہ اپنے آپ سے کہتا کہ اس نے جو کیا ٹھیک کیا ہے۔

میں یہ واضح کر دوں کہ فضل داد کے علاقے میں اور میرے علاقے میں بھی غیرت پر کسی کو قتل کر دینا یوں سمجھا جاتا تھا جیسے ایک مکھی مار دی گئی ہو۔ ایسے قتل پر اگر کوئی پکڑا جاتا تھا تو وہ نعرے لگاتا ہُوا پھانسی چڑھتا تھا۔ اس کے گھر والے فخر سے سب کو سناتے تھے کہ ہمارے بیٹے نے غیرت میں آ کر دشمن کو قتل کیا ہے۔ آج کل ان علاقوں کا کلچر اور خیالات کچھ بدل گئے ہیں۔

جب تفتیش عام لوگوں کی سطح سے اوپر چلی گئی، یعنی جب یہ اتنے بڑے دولت مند تاجر اور ساہوکار اور ایک بہت بڑے زمیندار کی سطح پر پہنچ گئی تو فضل داد مطمئن ہو گیا۔ اس نے اپنا دل مضبوط کرنے کی نیّت سے اپنی بیوی اور اپنے چچازاد بھائی کے ساتھ یہ

بات کی کہ پیر کی بددعا ضرور لگے گی۔ چچازاد بھائی اور بیوی نے متفقہ طور پر اسے کہا کہ جنّات ہوتے تو اب تک انتقام لے چکے ہوتے اور پیر کی بددعا لگنی ہوتی تو اس میں دیر نہ لگتی۔ بیوی نے یہ بھی کہا کہ اس پیر کے ہاتھ میں ذرا سی بھی طاقت نہیں۔ اگر ہوتی تو اس کا ایک بچّہ پیدا ہو چکا ہوتا۔

○

قتل والا معاملہ گول ہوتا نظر آ رہا تھا۔ تفتیش ان لوگوں میں چلی گئی تھی جن کے پاس دولت تھی لیکن فضل داد کا اصل مسئلہ جوں کا توں موجود تھا۔ وہ یہ تھا کہ وہ بھی اور اس کی بیوی بھی جسمانی لحاظ سے بالکل ٹھیک تھے لیکن اولاد نہیں ہو رہی تھی۔ اس مسئلے کو مزید پیچیدہ فضل داد کی ماں بنا رہی تھی جو اس پر زور دیتی تھی کہ اولاد کی خاطر دوسری شادی کر لو اور اس بیوی کو طلاق دے دو اور اگر سوتن کو قبول کرے تو بے شک تمہارے ساتھ رہے۔ یہ ایسی صورت حال تھی جسے فضل داد قبول نہیں کر رہا تھا۔ اس نے اب اپنے دوستوں کے مشورے سے مختلف عاملوں اور جوتشیوں وغیرہ کی طرف رخ کر لیا۔ جس کسی نے اسے کسی عامل یا شاہ یا ایسے ہی کسی آدمی کا پتہ دیا تو وہ اس کے ہاں جا پہنچا۔

اُس کی چھٹی پندرہ سولہ دن رہ گئی تھی۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ اس کا یہ مسئلہ انہی پندرہ سولہ دنوں میں حل ہو جائے۔ تین چار دنوں میں وہ دو مختلف عاملوں کے پاس گیا۔ دونوں اس کے گاؤں سے دُور رہتے تھے۔ ایک تو عام قسم کا عامل تھا جس کی باتوں سے بھی فضل داد مایوس ہو گیا اور اس کے پاس پھر کبھی نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ دوسرا عامل شاہ جی کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے پاس فضل داد گیا تو اس شاہ نے اس سے پہلی بات یہ پوچھی کہ نماز روزہ کرتے ہو یا نہیں۔ فضل داد نے صاف بتا دیا کہ وہ نماز پڑھتا ہی نہیں۔ شاہ نے اسے کہا کہ دینے والا صرف اللہ ہے پہلے اس کی عبادت کرو اور ہر نماز کے بعد دعا بھی کرو۔ شاہ نے اسے ایک وظیفہ بھی بتا دیا اور کہا کہ یہ وظیفہ بھی عبادت میں شامل ہے اور اس کے بعد اللہ سے دعا مانگنی ہے کہ مراد پوری ہو جائے۔

فضل داد نے اسی روز نماز شروع کر دی اور وظیفہ بھی پڑھنے لگا۔ اس نے مجھے سنایا کہ جب اس نے تین چار وقت نماز باقاعدگی سے پڑھی اور وظیفہ بھی باقاعدگی سے کیا تو وہ اپنے آپ میں کچھ ایسا سکون محسوس کرنے لگا جیسے اس کا یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس نے اپنی بیوی سے بھی کہا کہ وہ بھی نماز پڑھا کرے۔ بیوی نے بھی باقاعدہ نمازیں پڑھنا

شروع کر دیں۔

اس سے آگے فضل داد کی کہانی سنی تو میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ اللہ کی عبادت کا کرشمہ تھا۔ فضل داد کو بچہ تو نہ ملا لیکن وہ ایک ایسے آدمی کے پاس پہنچ گیا جس نے نشاندہی کر دی کہ اس کا بچہ کیوں پیدا نہیں ہوتا۔ دو یا تین دن میاں بیوی نے باقاعدہ نمازیں پڑھیں تو ایک آدمی نے فضل داد کو بتایا کہ ڈیڑھ دو میل دور ہندوؤں کی ایک سادھی ہے جہاں آج کل ایک جوتشی پنڈت آیا ہُوا ہے وہ صحیح بات بتا دیتا ہے۔ اس آدمی نے اسے یہ بھی بتایا کہ وہ اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے جائے۔

ڈیڑھ دو میل تو کچھ فاصلہ ہی نہ تھا' فضل داد اپنی بیوی کو ساتھ لے کر وہاں پہنچ گیا۔ وہاں پرانے زمانے کا ایک مکان بنا ہُوا تھا جس کے ساتھ سادھی بھی تھی۔ وہیں مرگھٹ بھی تھا جہاں ہندو اپنے مُردے جلایا کرتے تھے۔ پنڈت فضل داد کو مل گیا۔ اس کے پاس چار پانچ آدمی اور ایک دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ سب لوگ چلے گئے تو فضل داد اپنی بیوی کے ساتھ پنڈت کے سامنے جا بیٹھا اور تھوڑے سے پیسے اس کے آگے رکھ کر اور ہاتھ جوڑ کر اپنا مسئلہ بیان کیا۔ پھر یہ کہا کہ پنڈت جی مہاراج جو خدمت کہیں گے وہ کرے گا۔

فضل داد کی کہانی آگے سنانے سے پہلے میں اپنی ایک رائے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کچھ زیادہ تعلیم یافتہ لوگ یا نئی تہذیب کے لوگ کہیں کہ نہیں' یہ بات غلط ہے میں اسے غلط نہیں سمجھتا۔ روحانی علم کا وجود ہے اور اس کے عامل بھی موجود ہیں۔ یہ جو جگہ جگہ عامل' نجومی' جوتشی اور شاہ جی بیٹھے ملتے ہیں یہ سب فریب کاری اور دھوکہ دہی کے بغیر کچھ نہیں جانتے۔ ایسے بزرگ اور صوفی بندے موجود ہیں جو روحانی عملیات سے مشکلیں آسان کر دیتے ہیں۔ اسی طرح کالے جادو کا بھی وجود ہے جو ہزارہا سال پرانا ہے۔ ہمارے ملک میں اور خاص کر فضل داد کے علاقے اور میرے علاقے میں دشمن ایک دوسرے پر کالا جادو چلواتے ہیں اور میں نے ذاتی طور پر کالے جادو کے مارے ہوئے لوگ دیکھے ہیں۔ میں ایسے واقعات سنا کر بات لمبی نہیں کروں گا' صرف یہ کہوں گا کہ کالا جادو چلانے والے عامل موجود ہیں اور وہ اچھی خاصی رقمیں لے کر دوسروں کا بیڑا غرق کر سکتے ہیں۔ ایسے عامل ہر جگہ نہیں ملتے۔ چونکہ یہ شیطانی عمل ہے اور قرآن پاک میں بھی اسے شیطانی عمل کہا گیا ہے اس لئے آپ کالے جادو کے کسی بھی عامل کو دیکھیں تو اس

کے چہرے پر نحوست اور کراہت صاف نظر آئے گی۔ ان کی آنکھیں لال سرخ ہوتی ہیں اور ان کے جسموں سے بدبُو اٹھتی ہے۔ میں نے یہ بھی سنا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ عامل کئی کئی دن بلکہ ایک ایک مہینہ نہاتے ہی نہیں کیونکہ ان کا جسم جس قدر ناپاک ہو گا ان کا عمل اسی قدر کامیاب رہے گا۔ اس شیطانی عمل کے لئے ہندوستان کے پنڈت' جوگی' یوگی اور سنیاسی ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ دوسرے مسلکوں کی کتابوں میں کالے جادو کو ہندوستان کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔

اس پنڈت نے جس کے پاس فضل داد اپنی بیوی کو لے گیا تھا اپنا کچھ حساب کتاب نکالا' سلیٹ پر خانے اور گول دائرے بنائے اور ایسے ہی کچھ پُراسرار عمل کئے پھر اس نے فضل داد کی بیوی کا چہرہ اپنے سامنے کر کے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور اس سے چار پانچ باتیں پوچھیں' پھر اس نے فضل داد کے چہرے اور آنکھوں کا بڑی غور سے معائنہ کیا۔

"بچہ کیسے پیدا ہو گا!" ــــ پنڈت جوتشی نے کہا ــــ "تم دونوں پر جادو چلا ہُوا ہے اور اس کی بندش لگی ہوئی ہے"۔

فضل داد فوراً" مان گیا۔ اس نے ڈاکٹروں سے اپنا اور بیوی کا معائنہ کروایا تھا اور رپورٹ ٹھیک ٹھاک ملی تھی کہ دونوں اولاد پیدا کرنے کے قابل ہیں۔

"پھر اس کا توڑ کر دیں پنڈت جی مہاراج!" ــــ فضل داد نے منت سماجت کی اور کہا ــــ "آپ کی پوری خدمت کروں گا"۔ یہ پنڈت کوئی اچھا اور دیانتدار آدمی تھا وہ چاہتا تو فضل داد کو چکر دے کر اس سے منہ مانگے پیسے بٹور سکتا تھا۔ لیکن اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اسے جب تک یہ پتہ نہ چلے کہ جادو کس طریقے سے کیا گیا ہے' وہ اس کا توڑ نہیں کر سکتا' اس نے کہا کہ یہ معلوم کرنا اس کے بس میں نہیں البتہ وہ یہ نشاندہی کر سکتا ہے کہ یہ عامل کون ہے اور کس طرف رہتا ہے۔

"اگر یہ پتہ چل بھی گیا تو ہم کیا کر سکیں گے؟" ــــ فضل داد نے پوچھا۔

"دو طریقے ہیں" ــــ پنڈت نے کہا ــــ "ایک یہ ہے کہ اسے زیادہ پیسوں کا لالچ دو اور اپنا کام کرواؤ۔ کالا جادو کرنے والوں کا کوئی دین دھرم نہیں ہوتا اور نہ وہ کسی کے ساتھ وفا کرتے ہیں۔ ایک طریقہ اور بھی ہے۔ اگر تم میں ہمت ہے تو یہ آزما لو۔ اس کے گھر دو تین آدمی جا دھمکو اور اسے دھمکیاں دے کر کہو کہ یہ جادو اتار دے ورنہ اس سے پورا انتقام لیا جائے گا"۔

"نہیں پنڈت جی!" ــــ فضل داد نے کہا ــــ "اس طرح وہ ہم پر اپنے جادو سے کوئی خطرناک وار کر دے گا"۔

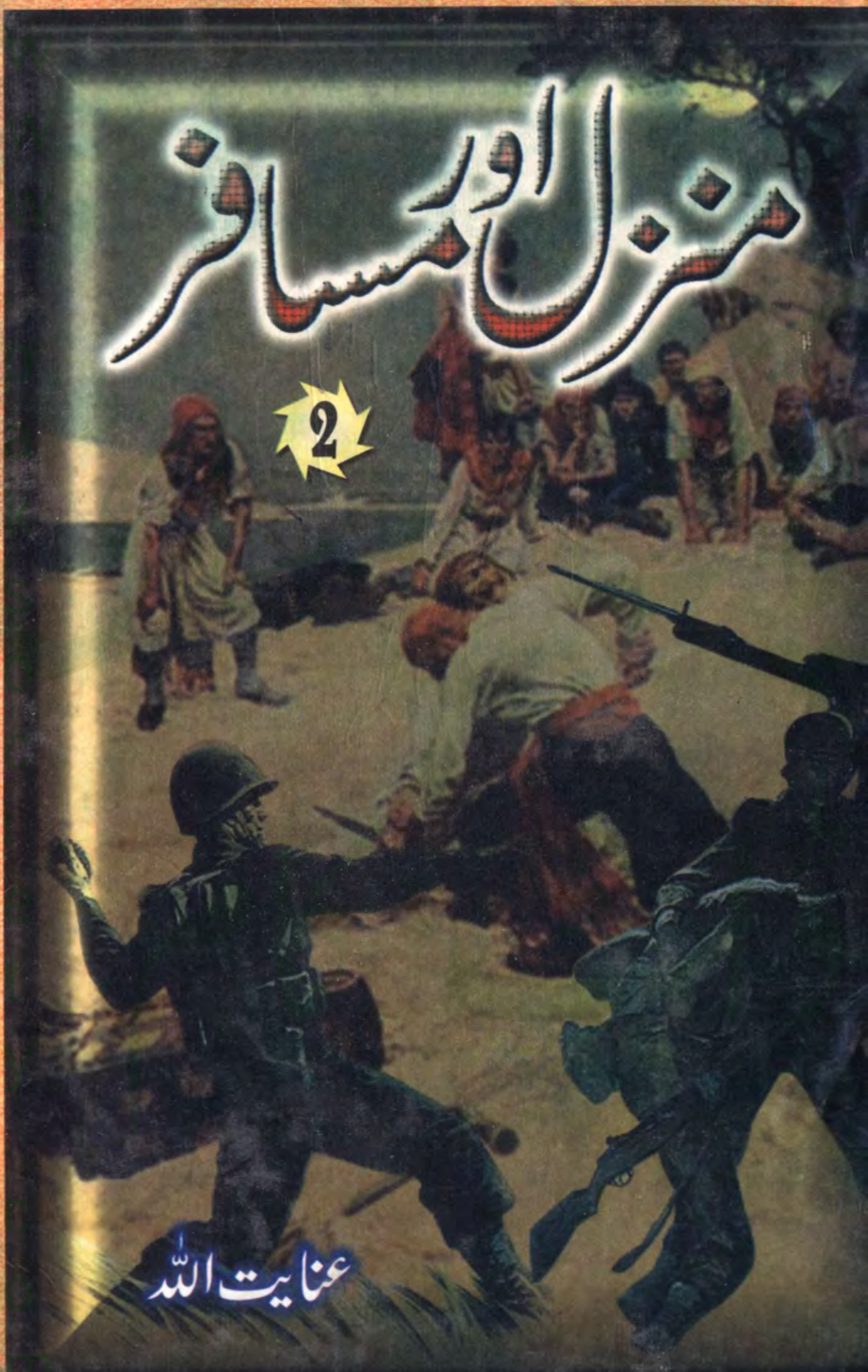
"ایسا نہیں ہو سکتا بھائی!" ــــ پنڈت نے کہا ــــ "یہ جادو اتنا آسان نہیں کہ فوراً" ہو جائے اور اپنا اثر دکھا دے۔ یہ بندوق تو نہیں کہ اس میں گولی ڈال کر گھوڑا دبا دو تو گولی فوراً" چل جائے گی۔ اس کے پاس جاؤ اور بہتر یہی ہے کہ اسے کوئی خطرناک دھمکی دو"۔

ایسی ہی کچھ اور باتیں کر کے پنڈت نے فضل داد کا دل مضبوط کر دیا پھر کوئی اپنا عمل اور حساب کر کے اس کالے عمل والے کی نشاندہی کی۔ اس نے بتایا کہ یہاں سے اڑھائی تین میل دور چھوٹا سا ایک گاؤں ہے' وہ عامل وہاں رہتا ہے۔ اس نے کچھ اور نشانیاں بھی بتائیں۔ ہو سکتا ہے پنڈت نے اپنے علم اور عمل کے زور سے اس کالے عامل کا اتا پتہ معلوم کر لیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پنڈت کو معلوم ہو کہ اس علاقے میں وہی ایک آدمی کالا جادو کرنے والا ہے۔ بہرحال پنڈت نے فضل داد کو اس کارروائی پر تیار کر لیا کہ وہ اس جادوگر کو دھمکیاں دے اور اس سے اپنا کام نکلوائے۔

فضل داد نے اپنی ماں کو بتایا اور اپنے باپ کو بھی۔ اس کی ماں نے تو کوئی خاص بات نہ کہی البتہ اس کا باپ فضل داد کو الگ لے گیا اور اسے بتایا کہ ایسی بات ہے تو یہ فضل داد کی خالہ کی کارستانی ہے۔ باپ نے اسے بتایا کہ اس کی خالہ اپنی بیٹی فضل داد کو دینا چاہتی تھی لیکن باپ بھی نہیں مانتا تھا اور فضل داد بھی۔ تب فضل داد کو یاد آیا کہ اس کی خالہ اس پر ڈورے ڈالتی رہی ہے اور یہ بھی یاد آیا کہ اس کی خالہ بڑی چالاک اور مکار عورت ہے۔ باپ نے فضل داد کو بتایا کہ اسے عاملوں وغیرہ کے پاس جاتے اکثر دیکھا گیا ہے اور اب یاد آتا ہے کہ وہ اس گاؤں بھی گئی ہے جس کی نشاندہی پنڈت نے کی ہے۔ یہ چکر یقیناً" خالہ نے چلایا ہے۔

میں اس بات کو طول نہیں دینا چاہتا۔ ہمارے ہاں لوگ اس قسم کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ آج کل آپ اخباروں میں پڑھتے رہتے ہوں گے کہ ایک لڑکی کا رشتہ مانگنے گئے اور لڑکی والوں نے انکار کر دیا تو رشتہ مانگنے والوں نے لڑکی کے منہ پر تیزاب پھینک دیا یا گولی چلا کر مار ہی ڈالا۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں' اس وقت بعض لوگ خصوصاً" عورتیں' اس قسم کی کارروائیاں کیا کرتی تھیں۔

عنایت اللہ کی ہنگامہ خیز اور سحر انگیز خودنوشت



جب باتِ خالہ کی چل نکلی تو دو تین شہادتیں اس قسم کی مل گئیں کہ خالہ کو جب یہ جواب ملا تھا کہ اس کی بیٹی کو فضل داد اور اس کا باپ قبول نہیں کر رہے تو وہ سخت غصے میں آگئی تھی۔ وہ عورتوں کے ساتھ دھمکیوں کی زبان میں باتیں کرنے لگی تھی۔ یہ دو عورتوں سے بھی پتہ چل گیا کہ خالہ اس گاؤں میں چند مرتبہ گئی تھی جس کی نشاندہی پنڈت نے کی تھی۔ فضل داد بڑا اکھڑ اور انتقام لینے کے معاملے میں بڑا زہری آدمی تھا۔ وہ اپنے چچازاد بھائی کو ساتھ لے کر کالے عامل کے گاؤں گیا۔ وہ چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں نہایت معمولی قسم کے کسانوں کے چند ایک گھر تھے۔ انہی گھروں میں ایک گھر اس کالے عامل کا تھا۔ فضل داد اس کے ساتھ کوئی سودا بازی کرنے نہیں گیا تھا۔ اس نے گاؤں کے ایک دو آدمیوں سے اس کے متعلق پوچھا۔

فضل داد کو اس کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئیں وہ کچھ اس طرح تھیں کہ یہ شخص پیشے کا موچی تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ انتہائی غلیظ رہنے والا آدمی ہے۔ گاؤں میں بہت کم سلام و دعا رکھتا ہے اور یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس کا مذہب کیا ہے۔ یہ گاؤں والوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ الٹے تعویذ اور کالے جادو کے عمل کرتا ہے اور پیسے کما لیتا ہے۔

فضل داد نے یہ خاص طور پر پوچھا کہ اس کے گھر کے افراد کتنے ہیں اور کیا کیا ہیں۔ پتہ چلا کہ اس کے علاوہ اس کی بیوی ہے اور ایک جوان لڑکی ہے جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی اور اس کے بعد ایک لڑکا اور پھر اس کے بعد ایک لڑکی ہے۔

فضل داد نے اس کا گھر دیکھ لیا۔ کچا مکان تھا جس کی صحن کی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ یہ سارے کوائف معلوم کر کے فضل داد اور اس کا چچازاد بھائی واپس آگئے۔

○

اُسی رات آدھی رات سے کچھ پہلے فضل داد اور اس کا چچازاد بھائی پھر اس گاؤں میں جا پہنچے۔ وہاں کوئی چوکیدار نہیں تھا نہ کوئی کتا تھا جو انہیں دیکھ کر بھونکتا۔ فضل داد دیوار کے قریب کھڑا ہو کر اچھلا تو اس کا ہاتھ دیوار کے اوپر چلا گیا۔ وہ فوجی تھا اس کے لئے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ دیوار پر پاؤں جما کر وہ اوپر گیا اور پیٹ کے بل دیوار پر لیٹ گیا۔ اس نے دایاں ہاتھ نیچے لٹکایا تو اس کے چچازاد بھائی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور فضل داد نے اس کو اوپر کھینچا کچھ زور اس نے اپنا لگایا اور اس طرح وہ بھی دیوار پر چلا گیا۔

اُن راتوں کو چاند ذرا دیر سے نکلا کرتا تھا۔ اُس وقت چاند کچھ اُوپر آگیا تھا۔ گھر

والے صحن میں چارپائیاں ڈالے سو رہے تھے اور انہوں نے اوپر کمبل اور کھیس لئے ہوئے تھے۔ فضل داد اور اس کا چچازاد بھائی دیوار سے اترے۔ دونوں کے پاس کلہاڑیاں تھیں۔ انہوں نے چاندنی میں سوئے ہوئے گھر والوں کو دیکھا۔ گھر والوں کو ذرا سی بھی ہوش نہیں تھی۔ فضل داد نے اس شخص کی جوان بیٹی کو جگایا۔

جوں ہی لڑکی کی آنکھ کھلی وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ فضل داد نے کلہاڑی اس کے آگے کر کے کہا کہ اونچا سانس بھی لیا تو سر کھول دوں گا۔ اسے چارپائی سے اٹھا کر اپنے پاس کھڑا کر لیا۔ پھر کالے عامل اور اس کی بیوی کو اٹھایا۔ انہیں بھی یہی دھمکی دی گئی کہ وہ اونچی آواز نہ نکالیں ورنہ مارے جائیں گے۔ فضل داد اور اس کے چچازاد بھائی نے اپنے چہرے چھپائے ہوئے نہیں تھے۔ چھوٹے بہن بھائی سوئے رہے۔

"اندر چل کر دیا جلاؤ" ـــــ فضل داد نے عامل سے کہا۔

عامل دوڑتا اندر گیا اور دیا جلایا۔ فضل داد اس کی بیٹی کو بازو سے پکڑے ہوئے اندر لے گیا۔ لڑکی کی ماں بھی ساتھ تھی۔ عامل نے ہاتھ جوڑ دیئے اور وہ ڈر سے کانپ رہا تھا۔ وہ شاید انہیں ڈاکو سمجھ رہا تھا۔

"ہم غریبوں کے پاس کیا ہے" ـــــ عامل نے ہاتھ جوڑ کر کہا ـــــ "کسی بڑے گھر میں جانا تھا"۔

"ہم ڈاکہ ڈالنے نہیں آئے" ـــــ فضل داد نے کہا ـــــ "اگر تم نے ہماری بات نہ مانی تو ہم تمہارے دونوں بچوں کو قتل کر کے اس لڑکی کو زندہ ساتھ لے جائیں گے۔ تم اپنا جادو چلا کر دیکھ لینا"۔

"اللہ تم دونوں کو لمبی عمر دے" ـــــ عامل کی بیوی نے ہاتھ جوڑ کر کہا ـــــ "تم یہ بتاؤ کہ آئے کیوں ہو اور میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ جو کام کہو گے کریں گے"۔

فضل داد نے اپنی خالہ کا نام لیا اور اپنے گاؤں کا نام بھی بتایا' پھر کہا کہ اس عورت نے تم سے ایک خاوند اور اس کی بیوی پر بندش لگوا رکھی ہے کہ ان کے اولاد نہ ہو۔

"فوراً" بولو" ـــــ فضل داد کے چچازاد بھائی نے کہا ـــــ "یہ بات صحیح ہے یا غلط.... جھوٹ بولو اور اس کا نتیجہ ابھی دیکھ لینا۔ تمہاری عرض رپورٹ تھانے میں بھی کوئی نہیں سنے گا"۔ عامل نے کچھ بھی نہ کہا اور وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"ہاں' میں تمہیں بتاتی ہوں" ـــــ عامل کی بیوی نے کہا ـــــ "وہ عورت یہاں آتی

رہتی ہے اور اس نے یہ کام کروایا ہے"۔

"اوئے تم کیوں نہیں بولتے!" ـــــ فضل داد کے چچازاد بھائی نے عامل کے پہلو میں کلہاڑی کے الٹے دستے کی ٹھوکر مار کر کہا ـــــ "تم اپنی زبان سے بتاؤ اور فوراً" بولو"۔

"ہاں بادشاہو!" ـــــ عامل نے کہا "میری بیوی نے سچی بات بتا دی ہے..... آپ حکم دیں' میں پورا کر دوں گا"۔

"اپنے شیطانی عمل کا توڑ ابھی کرو"۔ فضل داد نے کہا ـــــ "اگر تم نے یہ کہا کہ ابھی نہیں ہو سکتا اور دو تین دنوں بعد ہو گا تو میں تمہاری اس بیٹی کو ساتھ لے جاؤں گا...

"ہو جائے گا حضور!" ـــــ عامل نے کہا ـــــ "ابھی کر دیتا ہوں۔ وہ میں نے ہی بندش لگائی تھی اس لئے اسے توڑنا میرے لئے مشکل نہیں"۔

"پھر جلدی کرو" ـــــ عامل کی بیوی نے اسے کہا ـــــ "اپنی جان اور اپنی عزت بچاؤ"۔

"آپ دونوں میں اس بیوی کا خاوند کون ہے؟" ـــــ عامل نے پوچھا۔

فضل داد نے بتایا کہ میں اس کا خاوند ہوں۔ عامل نے اسے اپنے سامنے بٹھا لیا۔ پہلے تو عامل اپنے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہا اور پھر اس نے ہاتھوں سے اور پھر سر سے اوٹ پٹانگ سے اشارے کئے اور پھر فضل داد کی دونوں آنکھیں اپنی انگلیوں سے پوری طرح کھول کر ان میں پھونکیں ماریں۔ اس کے بعد اس نے میلا سا ایک کاغذ لیا اور پنسل سے اس پر ٹیڑھی میڑھی لکیریں ڈالیں اور ان کے اوپر ہندی کے کچھ الفاظ لکھے اس کاغذ کو تہہ کر کے فضل داد کو دیا اور کہا کہ یہ کاغذ اسی طرح بیوی کے سر کے بالوں کے نیچے رکھ دینا۔ گرے نہیں اور یہ کاغذ تین دن اس کے بالوں کے اندر پڑا رہے۔

"باقی عمل جو کرنے والا ہے وہ میں رات کو کر کے سوؤں گا" ـــــ عامل نے کہا ـــــ "صبح تک بندش ٹوٹی ہوئی ہو گی اور اس کے بعد آپ کی بیوی کا بچہ ہو سکتا ہے"۔

"اور اب میری یہ بات سن لو" ـــــ فضل داد نے کہا ـــــ "اگر وہ عورت پھر تمہارے پاس آئی اور تم نے اس کا کام کیا تو پھر اس کا نتیجہ بہت ہی بُرا ہو گا۔ تمہاری ٹانگیں گھٹنوں سے کاٹ دوں گا اور ساری عمر اپاہج بنے رہو گے"۔

"کیا آپ اسی گاؤں کے رہنے والے ہیں؟" ـــــ عامل نے پوچھا ـــــ "اور کیا یہ عورت آپ کی رشتہ دار ہے؟"

فضل داد نے اسے بتایا کہ وہ کون ہے' اس کی ذات کیا ہے اور اس کی حیثیت کیا ہے اور پھر بتایا کہ وہ فوج میں حوالدار ہے اور اسے گرفتار کرا کے دس سال قید کی سزا دلا سکتا ہے۔ یہ کہہ کر کے فضل داد نے اسے کہا کہ وہ کچھ پیسے لینا چاہتا ہے تو بتائے اور یہ پیسے اسے خوشی سے دیئے جائیں گے۔ عامل اتنا زیادہ ڈر گیا تھا کہ اس نے ہاتھ جوڑ کر پیسے لینے سے انکار کر دیا۔

"جا کا کی!" ——— فضل داد نے عامل کی بیٹی سے کہا ——— "ڈرمت اور جا کے سو جا"۔

"میرے بابا کو تو کچھ نہیں کہو گے نا؟" ——— لڑکی نے ڈرے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں کا کی!" ——— فضل داد نے کہا ——— "لیکن اپنے بابا کو کہہ دو کہ اس نے ہمیں دھوکہ دیا تو پھر نتیجہ بہت بُرا ہو گا"۔

"نہیں حوالدار جی!" ——— عامل نے ہاتھ جوڑ کر کہا ——— "میں آپ کو دھوکہ نہیں دے رہا' میں نے جو کام کیا ہے اس کا نتیجہ آپ کو نظر آ جائے گا"۔

"کیا تم آنے والے وقت کا حال احوال بتا سکتے ہو؟" ——— فضل داد کے چچازاد بھائی نے پوچھا۔

"نہیں راجہ جی!" ——— عامل نے جواب دیا ——— "یہ سفلی عمل ہے اس کا کوئی عامل نہ ہاتھ دیکھ سکتا ہے نہ آنے والے وقت کی کوئی خبر بتا سکتا ہے۔ میرے جیسا کوئی بھی عامل آپ کو آئندہ کی خبر دے یا آپ کو قسمت کا حال بتائے تو کبھی اس کے دھوکے میں نہ آنا۔ اس عمل کے عامل صرف یہ عمل کر سکتے ہیں"۔

فضل داد اور اس کا چچازاد بھائی وہاں سے واپس آنے کے لئے اٹھے۔ فضل داد نے عامل کو پانچ روپے دیئے جو وہ نہیں لے رہا تھا۔ فضل داد نے اسے کہا کہ وہ اپنی خوشی سے یہ پیسے دے رہا ہے۔ پھر عامل نے پانچ روپے رکھ لئے۔ اُس زمانے کے پانچ روپے آج کے پانچ سو روپوں کے برابر تھے۔ اپنے گاؤں میں آ کر فضل داد اپنے گھر اور چچازاد بھائی اپنے گھر چلا گیا۔ فضل داد کی بیوی اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا خاوند اپنے چچازاد بھائی کو ساتھ لے کر کہاں گیا ہے۔ اس پریشانی اور انتظار میں اسے نیند آ ہی نہیں رہی تھی۔ فضل داد نے اسے بتایا کہ وہ کیا کر آیا ہے پھر تہہ کیا ہُوا کاغذ بیوی کے سر میں بالوں کے نیچے چھپا دیا اور اسے کہا کہ تین دن وہ سر میں پانی نہ ڈالے نہ کنگھی کرے تاکہ کاغذ تین دن اور تین راتیں بالوں ہی میں پڑا رہے۔ چوتھے

روز یہ کاغذ بالوں میں سے نکالنا تھا اور اُسے جلا کر اس کی راکھ کوڑے کرکٹ میں یا غلاظت میں پھینک دینی تھی۔

اگلی صبح فضل داد نے اپنے باپ اور اپنی ماں کو الگ بٹھا کر بتایا کہ اسے کس طرح اور کس سے پتہ چلا تھا کہ خالہ نے اس پر اور اس کی بیوی پر کالے جادو کی بندش لگوا دی تھی۔ پھر اس نے انہیں بتایا کہ گزشتہ رات اس نے کس طرح بندش کھلوائی ہے.....

ماں اور باپ نے یہ سنا تو حیرت سے ان کے منہ کھل گئے۔ ماں یہ بات ماننے پر آمادہ نہیں ہو رہی تھی لیکن فضل داد نے اسے منوا لیا اور اپنے چھوٹے بھائی سے کہا کہ وہ خالہ کو بلا لائے۔ ایک ضروری کام ہے۔

خالہ اسی گاؤں میں رہتی تھی اور اس کا گھر تھوڑی ہی دور تھا۔ کچھ دیر بعد خالہ آ گئی۔ فضل داد نے اسے اپنے ماں باپ کے پاس بٹھا لیا۔ فضل داد کی ماں بڑے غصے سے اپنی بہن کے ساتھ بولی لیکن فضل داد نے ماں کو چپ کروا دیا۔

"دیکھو خالہ!" ——— فضل داد نے کہا ——— "تم نے جو کیا تھا' بہت بُرا کیا تھا میں نے تمہارا کیا ہُوا کام ختم کرا دیا ہے"۔

"کون سا کام بیٹا؟" ——— خالہ نے حیران سی ہو کر پوچھا ——— "کیا کہہ رہے ہو؟"

"انجان نہ بنو خالہ!" ——— فضل داد نے کہا ——— "تم نے جو کرتُوت مجھ پر اور میری بیوی پر کی تھی' اس پر تو مردوں کے سر کھل جاتے ہیں۔ مجھ سے سچی بات سننا چاہتی ہو؟ .... تم نے مجھ پر اور میری بیوی پر کالا جادو کروایا تھا۔ اگر میں بدلہ لینا چاہتا تو یہی عمل الٹا کروا کر تمہارا بیڑا غرق کروا سکتا تھا۔ عامل نے مجھے کہا بھی تھا لیکن خالہ! تم میری ماں کی بہن ہو۔ میں نے تمہیں بچا لیا ہے۔ اب اتنی سی بات کہتا ہوں کہ اس شیطان کے پاس پھر نہ جانا ورنہ بہت نقصان اٹھاؤ گی"۔

خالہ بڑی چالاک اور ہوشیار عورت تھی۔ اس نے اپنی بے گناہی ثابت کرنا چاہی تو فضل داد نے کہا کہ وہ نہیں مانتی تو وہ اس عامل کو یہاں بلا لے گا۔

"میں تمہاری کارستانی پر پردہ ڈال رہا ہوں" ——— فضل داد نے کہا ——— "اگر تمہارے دل میں ابھی تک میل ہے تو میں ساری برادری میں تمہاری عزت سے پردہ اٹھا دوں گا اور سارے گاؤں میں تمہاری بدنامی ہو گی"۔

فضل داد کی ماں نے اپنی بہن کو کچھ سخت الفاظ کہنے شروع کر دیئے لیکن فضل داد

نے اسے چپ کروا دیا اور خالہ سے کہا کہ وہ چلی جائے اور بے فکر رہے یہ راز کسی کو معلوم نہیں ہو گا۔

خالہ سر جھکائے ہوئے چلی گئی۔

فضل داد نے مجھے سنایا کہ چوتھی صبح اس نے اپنے ہاتھوں اپنی بیوی کے بالوں میں سے وہ کاغذ نکالا اور اس کی تہیں کھول کر ماچس جلائی اور کاغذ جلا دیا۔ اس کی راکھ مویشیوں کے گوبر کے ڈھیر پر پھینک دی۔

فضل داد کی چھٹی چند دن ہی رہ گئی تھی۔ وہ یہ دن گذار کر واپس اپنی یونٹ میں چلا گیا۔ ایک مہینے کے بعد اسے اپنے باپ کا خط ملا جس میں باپ نے اسے اطلاع دی تھی کہ اس کی بیوی میں ماں بننے کے آثار صاف طور پر پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کی خوشی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس نے مجھے کہا کہ اس کے دل سے اپنے پیر کی مریدی ختم ہو گئی۔ وہ چاہتا تو یہ تھا کہ اپنے گھر والوں سے بھی کہے کہ وہ اس پیر کی مریدی کے جال سے نکل آئیں لیکن اس نے ایسی جرأت نہ کی۔ وہ جانتا تھا کہ پیر کے خلاف بولا تو اس پر فتویٰ لگ جائے گا اور جو کوئی بھی سنے گا وہ اس کے ساتھ قطع تعلق کرے گا۔

پھر اللہ نے فضل داد کو یہ وقت بھی دکھایا کہ اسے تار ملی کہ اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ اُسے صرف چار دنوں کی چھٹی ملی اور وہ گھر گیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس نے اور اس کے گھر والوں نے کس طرح خوشیاں منائیں۔ اس کا باپ اسے پیر کے پاس لے گیا۔ بتاشوں کی پوری چنگیر ساتھ لے گئے تھے اور فضل داد کو نقد نذرانہ بھی پیش کرنا پڑا جو اس نے بادلِ نخواستہ پیش کیا۔

جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ فضل داد کی یونٹ کو ایک اور چھاؤنی میں بھیج دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد اس کی یونٹ ایک اور چھاؤنی میں چلی گئی۔ چونکہ فضل داد جسمانی اور دماغی لحاظ سے خصوصی طور پر پھرتیلا تھا اس لئے اسے کمانڈو اور گوریلا ٹریننگ کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ آخر اسے اس کمانڈو فورس میں شامل کر لیا گیا جنہیں گلائیڈروں کے ذریعے برما میں جاپانیوں کے عقب میں اتارنا تھا۔ اسے کچھ عرصے کلکتہ میں ٹریننگ دی گئی اور ایک رات اسی فورس کو گلائیڈروں میں روانہ کر دیا گیا۔

یہ میں سنا چکا ہوں کہ فضل داد کے ساتھ گلائیڈر نے اور پھر جاپانیوں نے اور پھر ناگوں نے کیا سلوک کیا اور پھر مجھ تک کس طرح پہنچا۔

اگلے روز اس کے زخموں سے پتوں والی پٹی کھولی تو میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ زخموں کی حالت خاصی بہتر تھی۔ میں اسے دوسرے پتوں کا پانی پلا رہا تھا۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ فضل داد کو بخار نہ ہُوا۔ اگر اس کا ٹمپریچر کچھ زیادہ ہُوا بھی تھا تو وہ بہت ہی تھوڑا تھا۔ شکل یہ پیدا ہو گئی کہ اس کی جسمانی حالت تو بہتر ہو رہی تھی مگر ذہنی حالت بگڑتی جا رہی تھی اس کا پیر اس کے دماغ پر سوار ہو گیا تھا۔ میں نے اسے قائل کرنے کے لئے بہت کچھ کیا لیکن اس کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے اس کی ایک بات یاد آ گئی۔

"سنو فضل داد بھائی!" — میں نے کہا — "تم کہتے ہو کہ تمہیں اس گناہ کی سزا مل رہی ہے کہ تم نے پیر کے بیٹے کو قتل کیا تھا۔ اگر تمہیں سزا ہی مل رہی ہے تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ سزا کس گناہ کی مل رہی ہے..... تم نے مجھے سنایا ہے کہ جب تمہیں پیر کا مرید بنانے کے لئے اس کے پاس لے گئے تھے تو تمہارے ہاتھ میں ایک سبز جھنڈا تھا جس پر کلمۂ طیبّہ شریف لکھا ہُوا تھا۔ میں اس رسم کو جانتا ہوں تم نے یہ جھنڈا پیر کے باپ کے مزار پر چڑھانا تھا لیکن تم نے یہ جھنڈا پیر کے قدموں میں رکھ دیا۔ ذرا سوچو فضل داد! کلمہ شریف کتنی مقدّس چیز ہے مگر تم نے یہ مقدّس کلام ایک گناہگار کے قدموں میں رکھ دیا۔ توبہ کرو اور جونہی تم جسمانی لحاظ سے بہتر ہو جاؤ، نماز پڑھنی شروع کر دو..... یہ بھی سوچو کہ ایک پیر نے تمہیں دھوکے میں رکھا اور اس پیر کے پاس اتنی بھی روحانی طاقت نہیں تھی کہ وہ معلوم کر لیتا کہ تمہاری بیوی پر کالا عمل کیا ہُوا ہے۔ یہ بات تمہیں ایک پنڈت نے بتائی اور اس سے تمہاری مراد پوری ہوئی۔ میں تو کہتا ہوں کہ اس پیر سے وہ ہندو پنڈت بہتر تھا۔"

اگر میں یہ سنانا شروع کر دوں کہ میں نے فضل داد سے کیا کیا باتیں کیں اور کیا کیا دلیلیں اور حوالے دیئے تو میری اس کہانی کا یہ حصہ وعظ بن جائے گا۔

دو تین دنوں بعد اس کے زخم اور زیادہ ٹھیک ہو گئے اور سب سے بڑا خطرہ جو ٹل گیا وہ پس کا تھا۔ پس ختم ہو چکی اور زخموں کے اردگرد جو سرخی تھی وہ بھی ختم ہو گئی تھی لیکن فضل داد اپنے ہی خیالوں میں گم صُم رہنے لگا تھا۔ بوڑھا برمی جس کا نام عثمان تھا' باقاعدگی سے اس کے زخموں پر پتے رکھ کر پٹیاں کر رہا تھا۔

ایک روز میں نے بوڑھے عثمان کو بتایا کہ فضل داد کے ذہن میں کیا وہم بیٹھ گیا ہے۔ عثمان پہلے تو سمجھا ہی نہیں کہ پیر کیا ہوتا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے

سمجھایا۔ اس نے بتایا کہ برما کے مسلمانوں میں پیر کا کوئی تصوّر ہی نہیں۔ وہ نماز پڑھتے ہیں یا بالکل ہی نہیں پڑھتے..... عثمان نے جب میرے ساتھ اس موضوع پر بات کی تو مجھے احساس ہوا کہ یہ شخص کچھ علم بھی رکھتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ فضل داد کے ذہن سے پیر کو کس طرح نکالا جائے۔

ایک روز عثمان اس کے پاس بیٹھ گیا اور اسے اللہ کے کرشمے سنانے لگا پھر اسے کہا کہ وہ نماز اس طرح پڑھے کہ زخمی ٹانگ لمبی کر کے بیٹھے اور اشاروں میں نماز پوری کر لیا کرے پھر اُس نے بتایا کہ عشاء کی نماز کے بعد درود شریف پڑھے اور پھر ایک ہزار مرتبہ "اللہ الصمد" کا وِرد کرے اور بعد میں بھی چند مرتبہ درُود شریف پڑھے۔ بوڑھے عثمان نے کہا کہ یہ اللہ کا نام ہے اور اگر پوری توجہ اللہ کی ذات پر رکھ کر یہ وظیفہ کیا جائے تو ہر طرح کی بیماری سے، وہم اور برے خیالوں سے نجات مل جاتی ہے۔

میں نے اسے وضو کروایا اور اس نے نماز پڑھی۔ اس طرح اس نے بیٹھ کر باقاعدہ نمازیں پڑھنا شروع کر دیں اور عشاء کے بعد "اللہ الصمد" کا ورد کرنے لگا۔

اٹھارہ یا اُنیس دن اور گزرے تو فضل داد کے زخم تقریباً" مل گئے اور اب وہ خود وضو کر کے باقاعِدہ رکوع و سجود کرنے لگا۔ میں نے اس کا ایک اثر یہ دیکھا کہ فضل داد جسمانی طور پر بالکل نارمل ہو گیا اور اس کے ذہن سے پیر نکل گیا۔

فضل داد واپس جانا چاہتا تھا۔ اسے وانگ نے بتایا کہ یہاں سے کچھ دور ایک قصبہ ہے۔ وہ اس قصبے میں پہنچ جائے اور وہاں سے اسے پیچھے بھیجنے کا سرکاری انتظام ہو جائے گا۔ ایک روز وہ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ وہ مجھے کہتا تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ چلوں۔ میں نے ابھی تک اسے نہیں بتایا تھا کہ میں فوجی ہوں اور بھگوڑا فوجی ہوں اور واپس نہیں جا سکتا۔ میں نے ایک دو بہانے تراش کر اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

ایک روز وانگ اور ساتھی اسے اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔ شام کو یہ لوگ واپس آئے تو انہوں نے بتایا کہ اس قصبے میں پولیس موجود ہے اور ایک دفتر فوجیوں کا بھی ہے۔ حوالدار فضل داد فوجی دفتر میں چلا گیا۔ وہ بھگوڑا تو تھا نہیں کہ اپنے آپ سے پردہ نہ اٹھاتا وہ واپس جانا چاہتا تھا۔ وانگ نے مجھے بتایا کہ فوجیوں نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا اور اسے کہا تھا کہ اسے واپس کلکتہ بھیج دیا جائے گا۔

فضل داد چلا گیا۔ میرا وہ چین اور سکون بھی ساتھ ہی لے گیا جو میں نے ان اجنبی لوگوں میں ایک دُور افتادہ بستی میں رہ کر حاصل کیا تھا۔ یہ لوگ میرے کچھ بھی نہیں لگتے تھے۔ میں ان میں اجنبی ہی نہیں بلکہ غیر ملکی تھا۔ میں ان کی اور وہ میری زبان بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ہمارے کلچر بھی جدا تھے لیکن ان لوگوں کے ساتھ ایسا تعلق پیدا ہو گیا تھا جیسے یہ سب میرے خون کے رشتہ دار ہوں اور ان کے ساتھ میری روح کا رابطہ ہو۔ میں نے انہیں کوئی دھوکا نہیں دیا تھا اور وہ میرے آگے آنکھیں بچھاتے تھے۔ میں نے اب تک جو کہانی سنائی ہے، اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ وہ کس طرح مجھ پر دل و جان سے فریفتہ تھے۔ میں مزید کوئی رائے نہیں دوں گا۔

اتنا عرصہ ان جنگلوں میں آوارہ بھٹکتے پھرتے اور پھر ان لوگوں میں رہتے رہتے مجھ کو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میرے اندر کوئی ایسا تغیّر آگیا ہے جیسے میں وہ نہیں رہا جو فوج سے بھگوڑا ہونے سے پہلے ہُوا کرتا تھا۔ کبھی یوں بھی لگتا تھا جیسے میں انہی جنگلوں میں پیدا ہوا تھا اور میں انہی لوگوں میں سے تھا اور بھٹکتے بھٹکتے اپنے لوگوں میں پہنچ گیا ہوں۔ مجھے شروع شروع میں گھر یاد آتا تھا، اپنے عزیز و اقارب اور یار دوست یاد آتے تھے لیکن میں گھر کو اور اپنوں کو بھولتا جا رہا تھا۔ اس سے مجھے دلی سکُون حاصل ہو رہا تھا لیکن فضل داد مجھے ملا اور وہ میرے ساتھ رہا تو مجھے گھر بھی یاد آنے لگا اور اپنے پرائے بھی یاد آنے لگے۔ فضل داد جب اپنے علاقے کی باتیں سناتا تھا تو میں یوں محسوس کرتا تھا جیسے میں اپنے گھر یا اپنے علاقے میں پہنچ گیا ہوں۔ اس نے اپنے علاقے کے کچھ واقعات سنائے تھے وہ جب یہ واقعات سناتا تھا تو میں تصوّر میں اپنے علاقے کے نشیب و فراز اور

پگڈنڈیوں کو دیکھنے لگتا تھا۔ فضل داد کی باتوں سے مجھے تسکین سی مل رہی تھی۔ میں نے بڑے عرصے بعد اپنے علاقے کی بات سنی اور زبان بھی بولی ورنہ وہاں تو اپنی زبان بولنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔

فضل داد مجھ سے جب رخصت ہونے لگا تھا تو میرے دل میں ایک بات آئی تھی جو میں نے دل میں ہی رہنے دی تھی۔ بہت سوچا اور سوچ سوچ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اپنی اصلیّت فضل داد کو نہ ہی بتاؤں۔ میں اُسے یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں فلاں گاؤں کا رہنے والا ہوں اور یہ میرے والد صاحب کا نام ہے اور وہ جب پیچھے پہنچ جائے اور کبھی چھٹی جائے تو میرے گھر یہ اطلاع دے دے کہ میں زندہ ہوں اور بالکل خیریت سے ہوں اور انشاء اللہ زندہ واپس آؤں گا لیکن میں نے فضل داد کو اپنا اصل گاؤں نہیں بتایا تھا۔ میں نے خطرہ یہ محسوس کیا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ بات فوج تک پہنچ جائے کہ میں بھگوڑا ہو کر فلاں جگہ پہنچ گیا ہوں۔ خطرہ یہ تھا کہ اس صورت میں فوج اور پولیس نے میرے گھر والوں کو پریشان کئے رکھنا تھا۔ میں نے اپنے اوپر پردہ ڈالے رکھا اور فضل داد چلا گیا۔

○

اُن کے جانے کے بعد میری طبیعت بالکل ہی اُکھڑ گئی۔ میں تو انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہونے کے لئے فوج سے بھاگا تھا لیکن ان لوگوں میں آکر میرا یہ ارادہ ڈانواں ڈول سا ہو گیا تھا لیکن فضل داد چلا گیا تو میں اتنا بے چین ہو گیا کہ آئی این اے میں شامل ہونے کا ارادہ طوفان کی طرح میرے ذہن میں اٹھا اور اگلے ہی روز میں نے وانگ کو بلا کر کہا کہ اب ہمارے پاس جاپانیوں کی موٹر بوٹ بھی ہے‘ اب دریا پار کرنا مشکل نہیں‘ وہ مجھے دریا پار کرا دے۔ وانگ کے چہرے پر ایسا تاثر آ گیا کہ جیسے اسے میری بات بُری لگی ہو۔

"کیا سوچ رہے ہو وانگ؟" ـــ میں نے پوچھا اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا ـــ "تم یہی کہو گے کہ دریا میں طغیانی ہے اور موٹر بوٹ اس طغیانی میں سے پار نہیں جا سکے گی"۔

"جا سکے گی صاحب!" ـــ وانگ نے کہا ـــ "بڑی مضبوط کشتی ہے اور اُس کا انجن زیادہ طاقت والا ہے۔ یہ سیلاب میں سے بھی گزر جائے گی لیکن میرا دل نہیں مانتا کہ آپ یہاں سے چلے جائیں"۔

"دیکھو وانگ!" ـــ میں نے کہا ـــ "میں تم لوگوں کا پیار ہمیشہ یاد رکھوں گا اور زندگی میں ہم پھر بھی ملیں گے لیکن میں جس ارادے سے فوج سے بھاگا تھا وہ میں نے ہر قیمت پر پورا کرنا ہے۔ اس وقت تک نہ جانے کتنے ہزار ہندوستانی فوجی جاپانیوں کی بنائی ہوئی آزاد ہندوستان کی فوج میں شامل ہو چکے ہوں گے۔ میں نے بھی اس فوج میں جانا ہے۔ پھر تم دیکھو گے کہ تمہارا ملک برما بھی آزاد ہو گا اور ہندوستان بھی"۔

وانگ میری بات نہیں سمجھ رہا تھا یا وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ بڑے جذباتی انداز میں مجھے مجبور کر رہا تھا کہ میں اُن کے ساتھ رہوں اور کہیں نہ جاؤں۔ اُس کے اس جذباتی انداز اور باتوں نے مجھے کچھ نہ کچھ متاثر ضرور کر لیا اور آخر مجھے یہ کہنا پڑا کہ اچھا وانگ‘ میں سوچ کر تمہیں بتاؤں گا۔

اُسی رات پانچ چھ آدمیوں کا وفد میرے پاس آ گیا۔ وانگ بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس وفد میں عثمان بھی تھا جس نے فضل داد کے زخموں کا علاج کیا تھا۔ وہ عمر کے لحاظ سے بھی بزرگ تھا اور دانشمندی کے لحاظ سے بھی۔ وہ کچھ پڑھا لکھا بھی تھا لیکن اس نے دنیا اور زمانے کو پڑھا تھا اور اس لحاظ سے وہ کتابوں میں ڈوبے ہوئے عالموں سے زیادہ دانشمند تھا۔

"تم ابھی بچّے ہو صاحب!" ـــ عثمان نے آرام آرام سے کہا ـــ "ایک بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ انگریز بھی بادشاہ ہیں جاپانی بھی بادشاہ ہیں۔ انہیں دوسرے ملکوں کے لوگوں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں۔ ان کی ساری دلچسپی اور غرض دوسرے ملکوں کے ساتھ ہے۔ جاپانیوں نے آج تک اپنا جتنا جانی نقصان کروایا ہے اور جتنے ہوائی جہاز تباہ کروائے ہیں اور جتنے سمندری جہاز انگریزوں کے ہاتھوں ڈبوئے ہیں‘ وہ اس لئے نہیں کہ وہ ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے آئے ہیں بلکہ وہ برما اور ہندوستان انگریزوں سے چھین کر اس پر اپنی بادشاہی قائم کریں گے۔ وہ ہندوستان کے فوجیوں کو اپنی غرض کے لئے استعمال کر رہے ہیں"۔

"میں نے اپنی سمجھ کے مطابق اور جو باتیں جاپانیوں اور آئی این اے کے متعلق سنی تھیں‘ ان کے مطابق عثمان کی بات کا جواب دیا لیکن وہ مسکرایا اور بولا کہ تم سنی سنائی باتوں پر یقین رکھتے ہو۔ اس نے جب اپنی بات کو آگے بڑھایا تو مجھے محسوس ہُوا کہ میرے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں رہا۔ یہ ہے بھی حقیقت کہ میرے پاس صرف ارادہ تھا کہ میں

آئی این اے میں شامل ہو جاؤں گا اور ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کراؤں گا۔

"ایک بات اور سنو صاحب!" ــــ عثمان نے کہا ــــ "جاپانی مسلمان نہیں۔ صرف مسلمان ایک ایسی قوم ہے جو کسی ملک پر حملہ کرتی ہے تو اس ملک میں اپنی بادشاہی قائم کرنے کے لئے حملہ نہیں کرتی بلکہ یہ قوم وہاں کے لوگوں کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔ یہ بھی نہ بھولو صاحب کہ جاپانیوں کی بنائی ہوئی جس فوج میں تم جا رہے ہو' اس میں ہندو زیادہ ہوں گے۔ اگر جاپانیوں نے ہندوستان سے انگریزوں کو نکال دیا اور جاپانیوں نے ہندوستان کو آزاد ہی کر دیا تو تم دیکھنا کہ ہندو کہیں گے کہ اس ملک پر حکومت کرنا ہمارا حق ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ ہندو مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں؟"

میں نے محسوس کیا کہ میں بزرگ عثمان کو قائل کرنے کے قابل نہیں بلکہ اس نے مجھے متاثر کر لیا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں فوج سے بھگوڑا ہو کر آیا ہوں۔ اب میں واپس جاؤں گا تو مجھے گرفتار کر لیا جائے گا اور اس الزام میں میرا کورٹ مارشل ہو گا کہ میں جنگ سے ڈر کر بھاگ گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے دس سال سزائے قید مل جائے۔

"تم جاؤ گے ہی کیوں صاحب!" ــــ عثمان نے کہا ــــ "یہاں ہمارے دو مسلمان بھائی تمہیں اپنی بیٹیاں دے رہے ہیں۔ تمہیں جو لڑکی پسند ہے' اس کے ساتھ شادی کر لو۔ اب ہمارا تمہارا جینا مرنا اکٹھے ہو گا۔ انگریز ہوئے یا جاپانی' ہم ایک روز اپنے گھروں کو واپس جائیں گے۔ تم اب اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھنا چھوڑ دو۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ تم زندہ وہاں تک نہیں پہنچ سکو گے جہاں تم جانا چاہتے ہو۔ جاپانیوں کو تم نے دیکھ لیا ہے۔ برما میں آئے تھے تو انہوں نے وہاں سے ہر وہ جوان لڑکی جو ان کو نظر آئی وہ ساتھ لے گئے۔ یہاں پر تھوڑے سے جاپانی آئے تو انہوں نے پہلا حملہ ہماری لڑکیوں پر کیا۔ کیا تم اُس قوم پر بھروسہ کرو گے؟"

ان آدمیوں میں سے دوسروں نے بھی مجھے قائل کرنے کی کوشش کی کہ میں ان کے ساتھ ہی رہوں۔ وہ بے چارے اپنی حفاظت کے لئے مجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔ پہلے سمیع اللہ کو وہ اپنا محافظ سمجھ بیٹھے تھے اور سمیع اللہ نے ان پر یہ تاثر قائم کر رکھا تھا کہ وہ نہ ہُوا تو یہ لوگ کسی مصیبت میں پکڑے جائیں گے اور تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ سمیع اللہ اور اُس کے غنڈوں کو میں نے ختم کیا تھا۔ اس کے بعد یہ لوگ مجھے اپنا محافظ سمجھنے لگے تھے۔ انہوں نے میرے کارناموں کے علاوہ میرا کردار بھی دیکھ لیا تھا۔ میں نے

جس طرح جاپانیوں کو ایک ہی بار مار ڈالا تھا' اس سے یہ لوگ مجھے کنگ کانگ سمجھنے لگے تھے۔

انہوں نے مجھے جذبات میں ایسا گھیرا کہ میں تو جکڑا ہی گیا۔ عثمان نے کہا کہ آج کے بعد میں اُن کا سردار ہوں اور یہاں میرا حکم چلے گا۔ میں یہ صورت یا اپنی یہ حیثیت قبول کرنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ عثمان بزرگ تھا اور دانشمند تھا اور میں تو اس کے مقابلے میں نادان بچہ تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ میں اس اعزاز کے قابل نہیں۔ وہ اگر کسی کو سردار بنانا ہی چاہتے ہیں تو وہ عثمان ہے لیکن سب نے بیک زبان سرداری کی حیثیت میرے گلے میں ڈال دی۔

وہ تو چلے گئے لیکن میں رات بھر سو نہ سکا۔ اگر میں آگے اپنی منزل کی طرف نکل جاتا تو وہ میرے لئے بہتر تھا۔ راستے میں کتنی ہی دشواریوں کا سامنا ہوتا' مجھے یہ تسلی تو ہوتی کہ میں کسی مقصد کے تحت جا رہا ہوں۔ یہ سوچتے سوچتے گھر یاد آ جاتا اور پھر یہ خیال آتا کہ میں ساری عمر اپنے گھر نہیں جا سکوں گا۔ واجدہ یاد آئی تو دل اور ہی زیادہ بیزار ہو گیا۔ اس بیزاری اور اداسی اور تذبذب کا علاج صرف یہ تھا کہ میں اپنے آپ کو کسی خوبصورت فریب میں مبتلا کر دیتا وہ میں نے یوں کیا کہ ان دو برمی لڑکیوں کو ذہن میں لے آیا جو مجھے پیش کی جا رہی تھیں۔ میں نے اپنے آپ کو اس بات پر تیار کرنا شروع کر دیا کہ میں ان دونوں میں سے فلاں لڑکی کو منتخب کر لوں گا۔ پھر میں نے اس لڑکی کا مقابلہ واجدہ کے ساتھ کیا اور اپنے دل کو یہ یقین دلایا کہ یہ لڑکی واجدہ سے زیادہ خوبصورت اور اچھی ہے۔

میں اپنی یہ آپ بیتی یا سفرنامہ پڑھنے والوں سے درخواست کروں گا کہ وہ یہ نہ بھولیں کہ میں ابھی نوجوانی کی نادان عمر میں تھا اور زندگی کے نشیب و فراز کا مجھے ذرا سا تجربہ نہیں تھا۔ میرے پاس ابھی جذبات تھے' عقل جذبات کے مقابلے میں کچھ کم تھی۔

○

میں رات بھر سو نہیں سکا تھا اس لئے صبح آنکھ نہ کھلی اور کسی نے مجھے جگایا بھی نہیں۔ جب آنکھ کھلی تو دن آدھا گزر چکا تھا۔ سورج سر پر آ گیا تھا۔ میں نہا کر واپس آیا تو میرے آگے ناشتہ رکھا گیا۔

ناشتہ ابھی ختم نہیں کیا تھا کہ باہر سے کچھ شور سنائی دیا۔ دوڑتے قدموں کی آوازیں

بھی آئیں۔ میں نے زیادہ توجہ نہ دی۔ اتنے میں دوڑتے قدموں کی آوازیں میرے جھونپڑے کی طرف آنے لگیں اور وانگ میرے پاس آیا۔ وہ خاصا گھبرایا ہُوا تھا۔

"صاحب!" ـــــ اس نے پھولی ہوئی سانسوں کو سنبھالنے کی کوشش کئے بغیر کہا ـــــ "جلدی اٹھیں، فوجی آ رہے ہیں"۔

میں گیند کی طرح اُچھل کر پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور باہر نکلا۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں، اب پھر بتاتا ہوں کہ ہماری بستی دو پہاڑیوں کے درمیان تھی اور یہ جگہ دریا کی نسبت بلندی پر تھی۔ وہاں سے دریا کو جو راستہ جاتا تھا وہ ڈھلانی تھا یعنی نیچے کو جاتا تھا۔ مطلب یہ کہ ہم لوگ بلندی پر تھے اور درخت اور جھاڑیاں اور گھاس وغیرہ کی اتنی بہتات تھی کہ دریا سے ہمیں کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ فاصلہ کم و بیش اڑھائی فرلانگ تھا یا اس سے کچھ زیادہ ہو گا۔

میں نے ذرا آگے جا کر اور ایک درخت کے تنے کے پیچھے کھڑے ہو کر دیکھا۔ ایک موٹر بوٹ پتن پر رکی ہوئی تھی اور اس میں سے فوجی نکل رہے تھے۔ میں ابھی پہچان نہیں سکا تھا کہ یہ جاپانی ہیں یا گورے ہیں۔ مجھے معلوم تو یہی ہو رہا تھا کہ یہ گورے ہیں لیکن پتن ایسی پوزیشن پر تھا کہ میں اتنی دُور سے اچھی طرح پہچان نہیں سکتا تھا۔

جن جاپانیوں کو میں نے مارا تھا ان میں سے دو کی لاشوں سے دُوربینیں ملی تھیں۔ یہ دونوں دُوربینیں میں نے اپنے جھونپڑے میں رکھی ہوئی تھیں۔ میں جھونپڑے کی طرف دوڑا گیا اور ایک دوربین لے آیا۔ اب دیکھا تو صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ گورے یعنی انگریز فوجی ہیں۔ میں نے تو یہ سوچ لیا تھا کہ یہ جاپانی ہوئے تو ان کے پاس چلا جاؤں گا اور انہیں بتاؤں گا کہ میں ہندوستانی فوج سے بھاگ آیا ہوں اور آئی این اے میں شامل ہونا چاہتا ہوں اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے چلیں لیکن وہ انگریز فوجی نکلے۔

دُوربین نے مجھے صاف طور پر دکھا دیا کہ یہ سب گورے ہیں، ان میں ہندوستانی ایک بھی نہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ گورا رجمنٹ کے فوجی ہیں۔ مجھے یہ اطمینان تو ہو گیا کہ یہ دشمن نہیں لیکن دو خطرے نظر آ رہے تھے۔ ایک یہ کہ میں انڈین آرمی کا بھگوڑا فوجی تھا اور دوسرا یہ کہ گورے فوجی اچھے کردار کے لوگ نہیں ہوتے تھے۔ گورا رجمنٹوں کے سپاہیوں وغیرہ کو ٹامی کہا جاتا تھا اور ہم فوجی زبان میں انہیں حرامی کہا کرتے تھے۔ مشہور بھی یہی تھا کہ گورا رجمنٹوں کے سپاہیوں کو اپنے باپوں کا پتہ ہی

نہیں ہوتا اور سب کے سب ناجائز اولاد ہوتے ہیں۔ خطرہ یہ تھا کہ یہ اس بستی میں آ گئے اور انہوں نے بڑی لڑکیوں کو دیکھ لیا تو ان کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو جاپانیوں نے کیا تھا۔

یہ ٹامی اخلاق کے ایسے ویسے ہُوا کرتے تھے اور ہندوستانیوں سے تو یہ خاص طور پر نفرت کرتے تھے۔ ان سے میں کسی اچھے سلوک کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں چونکہ فوجی تھا اس لئے اُس زمانے کی فوج کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ جو فوجی محاذ پر سال ڈیڑھ سال لڑتے تھے وہ جنگ کے متاثرہ علاقے کی دیہاتی عورتوں کے لئے بڑے ہی خطرناک ہوتے تھے۔ عورت کے معاملے میں وہ دوست دشمن کی ذرا سی بھی تمیز نہیں کرتے تھے۔

میں نے سوچا کہ اپنے دفاع کا انتظام "فوراً" کر لیا جائے۔ اگر ان کی نیت ٹھیک نہ ہوئی تو بستی کا دفاع کروں گا۔ میں تین چار آدمیوں کو ساتھ لے کر جھونپڑی میں گیا۔ مشین گن اور ایمونیشن کے پیٹے اٹھوائے اور تین چار رائفلیں بھی لے لیں اور ان کا ایمونیشن بھی لے لیا۔ یہ جاپانیوں کا اسلحہ اور ایمونیشن تھا۔ میں نے باہر آ کر بڑی اچھی جگہ مشین گن گاڑ لی۔ وہاں آڑ اور چھپاؤ بڑا ہی اچھا تھا۔

وانگ رائفل چلا سکتا تھا۔ ایک رائفل اور خاصا ایمونیشن اُسے دے دیا اور تین اور آدمی نکل آئے جو رائفل فائر کر سکتے تھے۔ ایک ایک رائفل انہیں دی اور ایمونیشن بھی دے دیا۔ پھر انہیں پھیلا کر بڑی اچھی پوزیشنوں میں بٹھا دیا اور میں نے انہیں کہا کہ پہلے میں فائر کروں گا اور جونہی مشین گن کا فائر ہو وہ بھی نشانہ لے کر فائر کریں تاکہ ایک بھی راؤنڈ ضائع نہ ہو۔ ہمیں یہ سہولت حاصل تھی کہ پودے بڑے گھنے تھے، جھاڑیاں گھنی تھیں اور درخت بھی زیادہ تھے۔ ہم گوروں کو نظر نہیں آ سکتے تھے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ ہم بلندی پر تھے اور گوروں نے جدھر سے آنا تھا وہ کشادہ اور صاف راستہ تھا۔ ادھر سے کوئی آڑ یا چھپنے کے لئے کوئی جھاڑی نہیں مل سکتی تھی۔ جھاڑیاں وغیرہ راستے کے کنارے پر تھیں۔

وہ سب موٹر بوٹ میں سے نکل آئے اور بوٹ کو انہوں نے پتن کے ساتھ باندھ دی۔ پھر وہ دریا کے کنارے کنارے ایک طرف چل دیئے اور درختوں اور اونچی جھاڑیوں میں چھپ گئے۔ میرا خیال تھا جو بعد میں ٹھیک نکلا کہ وہ جاپانیوں کی چھوڑی ہوئی موٹر

بوٹ کو دیکھنے کے لئے جا رہے تھے۔ یہ موٹر بوٹ میرے کہنے پر وانگ وغیرہ نے ایک جگہ چھپا دی تھی۔ ان گوروں کو یہ دریا میں سے نظر آ گئی تھی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد وہ سب واپس آئے اور اُن میں سے ایک نے جو یقیناً "افسر تھا" دوربین آنکھوں کے آگے رکھ کر بستی کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو کچھ کہا اور تمام سپاہی وغیرہ دو حصّوں میں تقسیم ہو کر دائیں اور بائیں چلے گئے اور وہاں سے انہوں نے ہماری طرف پیش قدمی شروع کی۔

یہ تھا صحیح فوجی طریقہ کسی مشکوک جگہ کی طرف ایڈوانس کرنے کا..... حکم دینے والا افسر اور ایک آدمی جو بعد میں پتہ چلا کہ سارجنٹ تھا' اوپر آنے والے راستے سے ہٹ کر کنارے کنارے چل پڑے۔ وہ بہت ہی محتاط ہو کر آگے بڑھ رہے تھے۔ انہیں شک ہو گا کہ اس بستی میں جاپانی ہوں گے۔ ان کے فوجی یعنی سپاہی چھُپ چھُپ کر جا رہے تھے۔ میں نے مشین گن پر پٹہ ڈال کر تیار کر لی اور اپنے آدمیوں سے بھی کہا کہ وہ رائفلوں سے سیفٹی کیچ آگے کر کے تیار ہو جائیں۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ انہوں نے اگر پہلے فائر کیا تو میں فائر کروں گا۔

مجھے ڈر یہ تھا کہ جو سپاہی چھُپ چھُپ کر اور پوزیشنیں بدل بدل کر ایڈوانس کر رہے تھے' وہ دونوں طرف سے آ کر بستی کو گھیرے میں لیں گے۔ وہ تربیت یافتہ فوجی تھے اور انہیں محاذ کا تجربہ بھی تھا اس لئے وہ اتنی ہوشمندی سے پوزیشن لیتے اور پھر ایڈوانس کرتے تھے کہ ان کی کوئی حرکت نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے اپنے ایک عقلمند سے آدمی کو درخت پر اس ہدایت کے ساتھ چڑھا دیا کہ وہ پتّوں میں چھُپا رہے اور گوروں کو دیکھتا رہے اور ہمیں بتاتا رہے کہ اسے کیا نظر آ رہا ہے۔

○

گورا افسر اور سارجنٹ قریب آ گئے۔ اب میں ان کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ اُن کے جوان بھی ذرا ذرا سے نظر آنے لگے۔ مجھے اچانک خیال آ گیا کہ ان کی نیّت ٹھیک نہ ہوتی یا یہ اس شک میں ہوتے کہ یہاں جاپانی ہوں گے تو یہ اب تک فائر کھول چکے ہوتے۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں فائر نہیں کروں گا اور میں نے یہ بھی سوچ لیا کہ اپنے متعلق انہیں کیا بتاؤں گا۔

وہ جب اتنا قریب آئے کہ میں ان کی آنکھوں کی سفیدی بھی دیکھ سکتا تھا' میں اپنی

پوزیشن سے اٹھا' مشین گن وہیں رہنے دی اور ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میں نے پیچھے مڑ کر ان آدمیوں کو بھی بلا لیا جن کے پاس رائفلیں تھیں۔ وہ دوڑتے میرے ساتھ آن کھڑے ہوئے۔ دو اور آدمی بھی آ گئے۔ میں نے گورے افسر اور سارجنٹ کو ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا اور مسکرایا۔ اس کا اثر یہ دیکھا کہ دونوں گوروں کے چہروں پر جو کھچاؤ سا تھا وہ ختم ہو گیا اور افسر کے ہونٹوں پر میں نے ہلکا سا تبسم دیکھا۔

میں آگے بڑھا اور افسر کے ساتھ اور سارجنٹ کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ افسر کیپٹن تھا۔

"Speak English?" —— کیپٹن نے پوچھا اور ہم سب کی طرف دیکھا۔

"I speak English." —— میں نے جواب دیا۔

میں آپ کو بتا دوں کہ گورا رجمنٹوں کے انگریز اور دوسرے فوجی اُردو بالکل نہیں جانتے تھے۔ صرف وہ انگریز فوجی افسر اردو بولتے اور سمجھتے تھے جو ہندوستانی پلٹنوں یا دوسری یونٹوں میں آتے تھے۔ سول سروس کے انگریز بھی اردو بولتے تھے۔ ان میں بعض تو اتنی اچھی بلکہ ایسی ادبی اردو بھی بولتے تھے جو ہندوستانی بھی نہیں بول سکتے تھے۔

انگریزوں کے متعلق میں ایک بات اور بھی کہنا چاہوں گا۔ یہ صحیح ہے کہ ہم انگریزوں کے غلام تھے اور انگریز ہمارے بادشاہ بنے ہوئے تھے لیکن ان کی جو خوبیاں تھیں' انہیں خراجِ تحسین پیش کرنا کوئی بری بات نہیں۔ ہندوستان میں صرف اردو ہی نہیں بولی جاتی تھی۔ بے شمار زبانیں تھیں۔ پٹھان رجمنٹوں میں یعنی فرنٹیئر فورس میں جو انگریز جاتے تھے وہ پشتو بولتے تھے اور سمجھتے بھی تھے' گورکھا رجمنٹیں بھی تھیں' ان میں جانے والے انگریز افسر گورکھالی زبان بولتے اور سمجھتے تھے۔ ایسے ہی بنگالی زبان تھی' مدراسی زبان تھی کئی اور زبانیں تھیں' انگریز یہ زبانیں بولتے تھے۔ وہ ہماری صرف زبانوں سے ہی واقف نہیں ہو گئے تھے بلکہ ہندوستان کے ہر خطّے اور ہر مذہب کے لوگوں کی نفسیات اور معاشرت سے بھی پوری طرح واقف ہو گئے تھے اور جو نیا انگریز افسر انگلینڈ سے آتا تھا اسے اس علاقے کی زبان اور نفسیات کے متعلق اچھی طرح ٹریننگ دی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انگریز آدھی دنیا پر حکومت کر رہے تھے۔

اس کے مقابلے میں اپنے حکمرانوں کو دیکھ لیں۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ عوام کس طرح زندگی گذار رہے ہیں اور ان کی جذباتی کیفیت کیسی ہے۔ حکمران طبقے اور عوام کے درمیان ایک وسیع و عریض خلیج حائل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج پاکستان تباہی

اور بربادی کے راستے چل پڑا ہے۔

"کیا یہ سب لوگ یہیں کے رہنے والے ہیں؟" — کیپٹن نے پوچھا۔

"ہاں سر!" — میں نے جواب دیا۔

"تم تو برمی نہیں لگتے" — کیپٹن نے کہا۔

"میں ہندوستانی ہوں" — میں نے کہا — "میں برما میں برما پولیس میں تھا۔ جاپانیوں کا حملہ اتنا اچانک اور شدید تھا کہ ہم سب وہاں سے بھاگ نکلے۔ یہاں آئے تو کچھ جھونپڑے کھڑے دیکھے لیکن کوئی انسان یہاں نہیں تھا۔ ہم یہیں رک گئے اور جنگ ختم ہونے کے انتظار میں یہیں وقت گذار رہے ہیں..... میں پنجاب کا رہنے والا ہوں"۔

"برمی غدار ہیں" — کیپٹن نے کہا — "جاپانیوں نے حملہ کیا تو برمیوں نے اُن کا ساتھ دیا تھا"۔

"یہ غدار نہیں" — میں نے کہا — "یہ سب جاپانیوں سے نفرت کرتے ہیں اور انگریزوں کو بہت اچھا سمجھتے ہیں۔ انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ جاپانی آئے تو انہوں نے ان کی لڑکیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ ان میں ایسے چند ایک آدمی ہیں جن کی نوجوان بیٹیوں کو جاپانی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ یہ سب کہتے ہیں کہ انگریزوں کا اخلاق بہت اچھا ہوتا ہے"۔

میں نے یہ بات ان انگریزوں کو ہوا دینے کے لئے کی تھی۔ میں نے یہ سوچ کر ان کے اخلاق کی تعریف کی تھی کہ وہ یہاں کسی بداخلاقی کا مظاہرہ نہ کریں..... مجھے یہ مشکل پیش آ رہی تھی کہ یہ گورا افسر اور اس کا سارجنٹ اس طرح ٹھیٹھ لہجے میں انگریزی بولتے تھے جس طرح ہمارے دیہاتی اپنی زبان آپس میں بیٹھ کر بولا کرتے ہیں۔ مجھے انگریزی بولنے کی کوئی خاص پریکٹس نہیں تھی۔ ان گوروں کی بات سمجھنے میں مجھے کان کھڑے کرنے پڑتے تھے۔ میں نے آخر انہیں کہہ ہی دیا کہ وہ ذرا آہستہ اور صاف بولیں۔ انہوں نے میری بات سمجھ لی اور مان بھی لی۔

"یہاں قریب کہیں جاپانی ہیں؟" — کیپٹن نے پوچھا۔

"نہیں سر!" — میں نے جواب دیا۔

"وہ موٹربوٹ کس کی ہے؟" — کیپٹن نے پوچھا — "اور وہ وہاں چھپا کر کیوں

رکھی ہوئی ہے؟"

میں اتنا عقلمند تو نہ تھا لیکن میرے دماغ نے یہ سوچ لیا کہ اس گورے کپتان کو زیادہ سے زیادہ خوش کرنا چاہئے تاکہ یہ بستی کے لوگوں کے ساتھ کوئی بدتمیزی اور بداخلاقی نہ کرے۔ اس نے موٹربوٹ کے متعلق پوچھا تو میں نے بات یہاں سے شروع کی کہ یہ موٹربوٹ ثبوت ہے کہ اس بستی کے لوگ جاپانیوں کو اپنا بدترین دشمن اور انگریزوں کو اپنا دوست اور ہمدرد سمجھتے ہیں اور اس جنگ میں انگریزوں کی ہر ممکن مدد کرنے کو تیار ہیں۔ اس کے بعد میں نے اسے سنایا کہ کس طرح اس موٹربوٹ پر جاپانی آئے تھے جن کی تعداد نو تھی اور انہوں نے اس بستی کے لوگوں اور ان کی لڑکیوں کے ساتھ کس طرح تفریح کی اور پھر میں نے ان جاپانیوں کو کس طرح ختم کیا..... میں اگر اس واقعہ میں جو اس کیپٹن کو سنایا تھا' مبالغہ آرائی کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا لیکن میں نے جو ہُوا وہی سنایا اور اُس کا اثر گورے کیپٹن اور سارجنٹ پر ایسا ہُوا کہ دونوں کے چہروں پر چمک آ گئی اور انہوں نے مجھے دل کھول کر داد دی۔ اگر میں انہیں بتا دیتا کہ میں نے ایک انگریز پائلٹ کو ان لوگوں کے ہاتھوں مروا دیا تھا تو یہ گورا کیپٹن مجھے وہیں گولی مار دیتا۔ البتہ انہیں یہ بتایا کہ میں نے ایک اژدھا کو مار کر اس کے منہ سے ایک لڑکی کو آزاد کرایا تھا اور پھر ایک شیر بھی مارا تھا۔

"تم واقعی بہادر آدمی ہو" — سارجنٹ نے کہا — "میں فوجی زندگی کے مقابلے میں اس زندگی کو زیادہ پسند کروں گا جو تم لوگ یہاں گذار رہے ہو۔ یہ زندگی سادہ بھی ہے اور اس میں ایڈونچر بھی ہے"۔

انگریز کیپٹن اور سارجنٹ کو جب تسلّی ہو گئی کہ یہ جگہ' یہ بستی اور یہ لوگ ان کے لئے خطرناک نہیں تو اس نے اپنے ان سپاہیوں کو جو ابھی تک دائیں بائیں پوزیشنیں لئے ہوئے تھے' اپنے پاس بلا لیا۔

میں سمجھتا تھا کہ یہ علاقہ جنگ سے محفوظ ہے لیکن جنگ کبھی جاپانیوں کی صورت میں' کبھی گوروں کی صورت میں اور کبھی جلتے ہوئے لڑاکا ہوائی جہاز میں سے اترے ہوئے انگریز پائلٹ کی صورت میں ہم تک پہنچ رہی تھی۔ جیسے آگ کہیں دور لگی ہوئی ہو اور اس کے شرارے اوپر جا کر ہر طرف گر رہے ہوں۔ جنگِ عظیم یورپ میں' شمالی افریقہ میں اور برما میں لڑی جا رہی تھی لیکن دُور دراز کے ممالک بھی جنگ کے اثرات

سے محفوظ نہیں تھے۔ میں جس علاقے میں تھا' وہاں تو کسی بھی وقت جنگ پہنچ سکتی تھی۔ میں نے تو یہ ان گوروں سے پوچھنا تھا کہ جنگ یہاں سے کتنی دُور لڑی جا رہی ہے۔

"سر!" —— میں نے کیپٹن سے کہا —— "آپ میرے ساتھ آئیں' میں آپ کو جاپانیوں کا اسلحہ اور ایمونیشن تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ جو دُوربین آپ میرے پاس دیکھ رہے ہیں' یہ بھی ایک جاپانی کی لاش سے لی تھی۔ ایسی ایک اور دُوربین میرے جھونپڑے میں پڑی ہوئی ہے"۔

میں نے سب سے پہلے اسے مشین گن دکھائی جس کے ساتھ گولیوں کا پٹہ لگا ہُوا تھا۔

"اس گن کے پیچھے لیٹ کر آپ سامنے فیلڈ آف فائر دیکھیں" —— میں نے کیپٹن سے کہا —— "جب مجھے اطلاع ملی تھی کہ کچھ فوجی موٹر بوٹ سے اتر رہے ہیں تو میں نے اس خیال سے یہ مشین گن اس پوزیشن پر لگا دی تھی کہ جاپانی ہوئے تو میں ان پر دو تین برسٹ فائر کر کے انہیں ختم کر دوں گا۔ میں آپ پر بھی فائر کر سکتا تھا۔ آپ کا کوئی ایک بھی آدمی زندہ نہ رہتا لیکن میں نے دوربین سے دیکھ لیا کہ یہ تو اپنے دوست ہیں..... یہ دیکھئے چار آدمی۔ ان کے پاس رائفلیں ہیں۔ انہیں میں نے بڑی اچھی جگہوں پر کھڑا کر دیا تھا۔ ان کے فائر سے آپ بچ نہیں سکتے تھے"۔

انگریز کیپٹن نے سر ہلا کر اور مسکرا کر میرا شکریہ ادا کیا۔ میں اسے اپنے جھونپڑے میں لے گیا۔ دوسرے کمرے میں جاپانیوں کا اسلحہ اور ایمونیشن جس میں گرینیڈ بھی تھے' اسے دکھایا اور کہا کہ وہ یہ سارا اسلحہ وغیرہ لے جائیں..... میں نے عقل سے کام لیا تھا۔ اپنی رائفل اور انگریز پائلٹ کا ریوالور الگ چھپا کر رکھ دیا تھا۔ یہ اس لئے کہ جس طرح جاپانی اچانک آن دھمکے تھے اسی طرح کوئی اور یا جاپانیوں کی کوئی اور سیکشن یا پلاٹون یہاں آسکتی تھی۔

"میں یہ سارے ہتھیار ایمونیشن آپ کی موٹر بوٹ میں رکھوا دیتا ہوں" —— میں نے کہا —— "بستی کے آدمی وہاں تک پہنچا دیں گے"۔

کیپٹن نے سارجنٹ کے ساتھ بڑی دھیمی آواز میں کوئی بات کی جو میں نہ سُن سکا۔ سارجنٹ نے سر ہلایا۔

"یہ سارے ہتھیار' گرینیڈ اور ایمونیشن تم اپنے پاس رکھو" —— کیپٹن نے کہا —— "اپنے تمام آدمیوں کو اس اسلحہ کا استعمال سکھا دو۔ نہ جانے کس وقت تمہیں اس کی ضرورت آ پڑے..... میں اس ساری بستی کو دیکھنا چاہوں گا۔ یہ میری ڈیوٹی ہے"۔

وہ باہر کو چل پڑا۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے گیا۔ دروازے میں وانگ کھڑا تھا۔ میں نے تیزی سے بولتے ہوئے وانگ سے کہا کہ وہ کسی طرف سے دوڑ کر بستی میں پہنچے اور لوگوں سے کہے کہ جب وہ ان گوروں کو دیکھیں تو تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کریں۔ میں نے وانگ سے یہ بھی کہا کہ وہ جاپانیوں کی چھوڑی ہوئی شراب اگر بچی ہوئی ہو' اور یہاں کی بنی ہوئی شراب تیار رکھے اور پندرہ صاف ستھرے گلاس بھی اکٹھے کر لے۔

میں نے ویسے ہی کیپٹن کو کوئی بات سنانی شروع کر دی جس سے میرا مقصد یہ تھا کہ یہ کچھ دیر اور یہیں کھڑا رہے اور وانگ ساری بستی کے لوگوں تک میرا پیغام پہنچا دے۔ کچھ دیر گزر جانے کے بعد میں کیپٹن کے ساتھ چل پڑا۔ ہم پہلی گلی میں داخل ہوئے تو عورتیں بچے اور آدمی گلی میں دونوں طرف کھڑے تھے۔ انہوں نے بڑے زور سے تالیاں بجائیں اور وہ مسکرائے بھی۔ کیپٹن نے ہاتھ ہلا ہلا کر ان کا شکریہ ادا کیا۔ بعض جھونپڑوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے کیپٹن کسی جھونپڑے کے دروازے کے اندر جھانک لیتا تھا۔

اس طرح اس نے اپنے تمام آدمیوں کے ساتھ ساری بستی دیکھ لی اور میں اسے اس چبوترے تک لے گیا جس پر جاپانیوں نے اپنا وائرلیس کا سامان سیٹ کیا تھا۔ میں نے کیپٹن کو بتایا کہ جاپانیوں نے یہاں کس طرح وائرلیس سیٹ رکھے اور ایریَل کا تار کہاں سے کہاں تک باندھا تھا۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ میں نے تمام وائرلیس سیٹ دریا میں پھینک دیئے تھے۔

"تم خوش قسمت ہو" —— کیپٹن نے کہا —— "بال بال بچ گئے ہو ورنہ اب تک یہاں تم سب [illegible] بکھری ہوئی ہوتیں"۔

میں بھی فوجی ہی تھا لیکن وہ افسر تھا اس لئے مجھ سے زیادہ باتیں جانتا اور سمجھتا تھا اس نے بتایا کہ جاپانیوں نے یہاں وائرلیس سٹیشن قائم کیا تھا جسے فوجی زبان میں Listening Post کہتے ہیں۔ اس پوسٹ نے ہر طرف سے دُور دُور سے پیغام وصول بھی کرنے تھے اور بھیجنے بھی تھے۔ کیپٹن نے مجھے کہا کہ تم نے اس پوسٹ کے پورے کے

پورے نو آدمی مار ڈالے۔ اس پوسٹ کے ہیڈ کوارٹر نے یا ڈویژن ہیڈ کوارٹر نے اُس پوسٹ سے رابطہ کرنا تھا اور جب وہ دیکھتے کہ پوسٹ کے ساتھ رابطہ نہیں ہو رہا تو فوراً دوسرے آدمی بھیجے جاتے جو دیکھتے کہ اس پوسٹ کو کیا ہو گیا ہے۔ یہاں آ کر وہ دیکھتے کہ پوری کی پوری De Tachment غائب ہے تو وہ اس بستی کے ایک بچے کو بھی زندہ نہ چھوڑتے اور جوان لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے جاتے۔

پھر جاپانیوں نے ایسا کیوں نہ کیا؟..... گورے کیپٹن نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کتنے دن پہلے کا واقعہ ہے کہ جاپانی یہاں آئے تھے۔ میں نے یاد کر کے اسے بتایا۔ اس نے بتایا کہ انہی دنوں انگریزوں اور امریکیوں کی فوج نے جاپانیوں پر جوابی حملہ کیا تھا جو بڑا ہی زبردست' اچانک اور شدید تھا۔ اوپر سے لڑاکا بمبار طیارے نے بمباری اور گن فائرنگ بھی کی۔ جاپانی اس زمینی اور فضائی حملے کو برداشت نہ کر سکے اور تباہ بھی ہوئے اور پسپا بھی ہوئے۔ ان کا سگنل ہیڈ کوارٹر تو بری طرح تباہ کر دیا گیا تھا۔ یہ تھی وجہ کہ ہم نے اُس پوسٹ کے نو کے نو جاپانیوں کو مار ڈالا اور انہیں پوچھنے کوئی بھی نہ آیا۔ اگر کوئی آ جاتا تو ہمارا بیڑہ غرق ہو جاتا۔

میں نے کیپٹن سے پوچھا کہ جنگ یہاں سے کتنی دُور ہے۔ اس نے بتایا کہ مورچے تو یہاں سے کم و بیش پچاس میل دور ہیں لیکن اصل گھمسان کی جنگ ایک سو میل دُور ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ جاپانیوں کو دریا کے پار دھکیل دیا گیا ہے اور اس نے مجھے یہ تسلی بھی دی کہ اس طرف جنگ کے آنے کا کوئی خطرہ نہیں رہا۔

"میں آپ سے فوجی راز نہیں لے رہا" ——— میں نے کیپٹن سے پوچھا ——— "اپنی دلچسپی کے لئے پوچھ رہا ہوں کہ آپ اس طرف کیوں آئے ہیں؟"

"ہم گشتی ڈیوٹی پر آئے ہیں" ——— کیپٹن نے جواب دیا ——— "ہم دیکھتے پھر رہے ہیں کہ کوئی جاپانی کہیں چھپا تو نہیں' اگر ہے تو اسے پکڑ لیتا ہے یا مار دیتا ہے' پھر ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ بھاگنے والے جاپانی کہیں اکٹھے تو نہیں ہو رہے"۔

"یہ ڈیوٹی تو میں بھی اور میرے آدمی بھی دے سکتے ہیں" ——— میں نے کیپٹن کو خوش کرنے کے لئے کہا ——— "لیکن ہم کسی جاپانی کو دیکھیں گے تو اسے پکڑیں گے نہیں بلکہ مار ڈالیں گے"۔

"میں بھی تمہیں یہی کہوں گا" ——— کیپٹن نے کہا ——— "کوئی جاپانی نظر آئے تو اسے

زندہ نہ چھوڑو"۔

ہم وہاں کھڑے یہ باتیں کر رہے تھے کہ چار پانچ آدمی شراب کی بوتلیں اور گلاس اٹھائے آ گئے۔ میں نے کیپٹن سے کہا کہ یہ لوگ آپ کو شراب پیش کر رہے ہیں۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ اس میں جاپانی شراب بھی ہے اور یہاں کی بنی ہوئی بھی۔

کیپٹن نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور شراب قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے اپنے رسم و رواج کے مطابق اصرار کیا بلکہ آرزو کی کہ وہ خود نہ پیئے تو اپنے دوسرے آدمیوں کو پینے دے لیکن وہ نہ مانا..... مجھے اچانک اس کے انکار کی وجہ سمجھ آ گئی۔ وہ عقل والا افسر تھا۔ میں نے اس پر اپنا اور اس بستی کے لوگوں کا اعتماد پیدا کر لیا تھا لیکن ہم سب اس کے لئے اجنبی تھے۔ اس نے اگر یہ شک کیا تھا کہ ہم نے شراب میں بے ہوش کرنے والی کوئی چیز ملا دی ہو گی' اس کی عقلمندی تھی۔ ڈیوٹی کے دوران اسے ہماری شراب قبول کرنی ہی نہیں چاہئے تھی اور اس نے قبول نہ کی۔

آخر کیپٹن اپنے اس سیکشن کو ساتھ لے کر اور میرے ساتھ ہاتھ ملا کر چلا گیا۔ میں اور چار پانچ آدمی ان کے پیچھے پیچھے چلے۔ ہم چاہتے تھے کہ پتن تک ان کے ساتھ جائیں لیکن کیپٹن نے روک دیا۔ وہ سب چلے گئے' اپنی موٹر بوٹ میں سوار ہوئے اور موٹر بوٹ چلی گئی۔ کم و بیش دو گھنٹوں بعد ہم نے ان کی موٹر بوٹ واپس جاتے دیکھی۔

جب یہ گورا کیپٹن اپنے گوروں کے ساتھ بستی میں گھوم پھر رہا تھا اُس وقت لڑکیاں بھی باہر نکل آئی تھیں۔ ان میں تانی کے علاوہ چار پانچ لڑکیاں اچھی خاصی خوبصورت تھیں۔ کسی گورے نے اُن کی طرف دیکھ کر کوئی بے ہُودہ اشارہ نہ کیا نہ ہی فضول بات کی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انگریز بڑے اچھے کردار کے لوگ تھے۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ کیپٹن عقل والا تھا۔ اُس نے یقیناً" سوچا ہو گا کہ ان لوگوں کو ناراض نہ کیا جائے کیونکہ جاپانیوں کے واپس آ جانے کی صورت میں ہم لوگ جاپانیوں سے مل کر انگریزوں کو نقصان پہنچا سکتے تھے۔ بہرحال یہ ایک اور مصیبت تھی جو آئی اور ٹل گئی۔

○

بات بڑی پُرانی ہو گئی ہے لیکن وہ رات مجھے آج تک اس طرح یاد ہے جیسے گزری ہوئی رات کا واقعہ ہو۔ اچانک گھٹائیں گرجنے اور چمکنے لگیں اور اس طرح تیز اور موسلادھار بارش شروع ہو گئی جیسے ہمارے جھونپڑے بہا کر اپنے ساتھ دریا میں لے

جائے گی۔ بجلیاں کڑکتی تھیں تو یوں لگتا تھا جیسے جنگ ہم تک پہنچ گئی ہو اور توپیں ہمارے قریب ہی فائر کر رہی ہوں۔ بارش کا شور کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔ اس کے ساتھ جھکڑ بھی تھا جو تیز و تند ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے جھونپڑے میں گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے جھونپڑے کا دروازہ کھول دیا۔ یہ طوفانِ باد و باراں مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ میرے جھونپڑے کے اندر دیا جل رہا تھا۔ میں لیٹ گیا۔

ہر رات کی طرح اُس رات بھی کچھ یادیں اور کچھ باتیں ذہن میں آ رہی تھیں۔ بارش اور طوفان کا شور اتنا زیادہ تھا کہ کوئی ہلکی پھلکی آواز یا آہٹ تو سنائی ہی نہیں دیتی تھی لیکن مجھے یوں محسوس ہوا جیسے جھونپڑے کے اندر کوئی آہٹ ہے جو اس طوفان کی پیدا کردہ نہیں۔ مجھے ہلکی سی غراہٹ بھی سنائی دی۔ پہلے تو میں نے اسے ٹال دیا اور کوئی توجہ نہ دی لیکن غراہٹ ایک بار اتنی اونچی ہوگئی کہ میں نے لیٹے لیٹے سر اوپر کر کے پیچھے دیکھا۔ میرا تو خون ہی خشک ہوگیا..... ایک بھیڑیا جھونپڑے کے اندر آگیا تھا اور وہ میری طرف دیکھ کر آہستہ آہستہ غرا رہا تھا۔

میں نے کوئی حرکت نہ کی۔ اگر میں ڈر کر اٹھ بیٹھتا تو یہ بھیڑیا مجھ پر حملہ کر دیتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ڈر کر بھاگ جاتا لیکن درندے کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ میرے پاس یعنی میرے قریب کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ریوالور اور جاپانیوں کی رائفلیں وغیرہ ساتھ والے کمرے میں تھیں۔ میں سوچنے لگا کہ میں اٹھا اور دوسرے کمرے میں گیا تو بھیڑیا حملہ کر دے گا لیکن یہ خطرہ بھی تھا کہ میں لیٹا رہا تو بھی یہ مجھ پر حملہ کر سکتا ہے۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ بھیڑیا بارش سے بچنے کے لئے اندر آیا ہے لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ بھیڑیا اکیلا نہیں ہُوا کرتا یہ دو نہیں تو چار ضرور ہوں گے اور امکان یہ تھا کہ یہ زیادہ بھی ہو سکتے ہیں اور اس کے باقی ساتھی اس کے پیچھے اندر آ سکتے ہیں۔

دروازہ کھلا ہُوا تھا۔ میرے لئے بڑا ہی خوفناک مسئلہ پیدا ہوگیا۔ بھیڑیا ٹہلتا ٹہلتا آگے چلا گیا اور جھونپڑے کے کونے میں بیٹھ گیا۔ میرے پاس کوئی ایسی چیز بھی نہیں تھی جو اس کی طرف پھینکتا اور وہ بھاگ جاتا۔ وہ تو بڑے آرام سے بیٹھ گیا تھا جیسے یہ جھونپڑہ میرا نہیں اس کا تھا۔ اس کے ساتھ یہ مصیبت آئی کہ طوفان کا ایک ایسا زوردار جھونکا آیا کہ جھونپڑے کا دروازہ ٹھاہ کر کے بند ہوگیا۔ بھیڑیا ذرا سا بدکا اور بیٹھا رہا۔

ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ میں بھیڑیئے سے کہتا کہ لو بھائی، تم بھی رات یہیں گزار لو

لیکن ذرا شریفوں کی طرح، میں سو جاؤں تو تم بھیڑیئے پن پر نہ اتر آنا۔ وہ درندہ میری خواہشات کا تو پابند نہ تھا نہ وہ میری زبان سمجھ سکتا تھا۔

میں دروازے کے قریب تھا اور بھیڑیا سامنے والے کونے میں بیٹھ گیا تھا۔ مجھے یہی ایک صورت نظر آئی کہ میں اٹھ کر دروازہ کھولوں اور باہر نکل جاؤں لیکن ضروری نہیں تھا کہ بھیڑیا بھی باہر نکل جاتا۔ اس میں خطرہ یہ بھی تھا کہ میں اُٹھا تو بھیڑیا مجھ پر آ پڑے گا۔ میں نے پھر دائیں بائیں دیکھا لیکن کوئی ایک بھی ایسی چیز میرے قریب نہیں تھی جو اس پر پھینکتا مگر اب یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ دروازہ بند تھا اور اگر میں اسے چھیڑتا تو وہ اپنے آپ کو قید میں سمجھ کر مجھ پر بڑا ہی زوردار حملہ کرتا..... میں نے اسے دیکھا اس نے اپنا منہ آگے کر کے نیچے رکھ دیا تھا۔ جیسے وہ سونا چاہتا ہو۔ میں نے سوچا کہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔ جونہی اس نے منہ نیچے رکھا میں نے بڑی تیزی سے چادر اپنے اوپر سے ہٹائی اور بہت ہی تیزی سے اٹھا اور ڈائیو کرنے کے انداز سے دروازے کی طرف گیا۔ دروازہ میری ٹکر سے کھُل گیا اور میں باہر جا پڑا۔ بارش ایسی طوفانی کہ باہر کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ سنبھل کر اندر دیکھا بھیڑیا کان کھڑے کر کے غالباً" سوچ رہا تھا یہ کیا ہوا ہے۔ وہ باہر آنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

میں نے باہر سے پتھر اٹھایا اور بڑی زور سے اُسے مارا۔ پتھر اُسے لگا اور وہ کُتے کی طرح چیخا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے ایک اور پتھر مارا' تب وہ دوڑا اور دروازے سے بہت تیزی کے ساتھ نکل کر سیدھا میری طرف آیا۔ مجھے اس کے راستے سے ہٹنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ وہ ڈر کر اور پتھر کھا کر بھاگا تھا۔ اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ وہ میری ٹانگوں سے ٹکرایا تو میری دونوں ٹانگیں میرے نیچے سے نکل گئیں اور میں پیٹھ کے بل گرا اور ٹانگیں اوپر ہو گئیں۔ بھیڑیا اس تصادم سے اور زیادہ ڈرا اور اس کی رفتار اور زیادہ تیز ہو گئی۔ میں اس سے زیادہ تیزی سے تھا' اندر کو بھاگا اور دروازہ بند کر کے اندر سے اس طرح جکڑ دیا کہ کھل نہ سکے۔

ایک تو میں بارش میں بھیگ گیا تھا اور میرے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا' اس کے ساتھ ہی کپڑے کیچڑ سے لت پت ہو گئے تھے۔ بھیڑیا تماشا کر گیا تھا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ بال بال بچ گیا۔ میں نے کپڑے اتار پھینکے اور ایک چادر لپیٹ لی اور دیا بجھا کر سو گیا۔

صبح اٹھ کر باہر دیکھا تو ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ یہ بستی آباد کرنے والے کوئی عقل والے لوگ تھے۔ جہاں جھونپڑے کھڑے کئے گئے تھے وہ زمین ایک طرف سے اونچی اور دوسری طرف سے نیچی تھی۔ وہاں پانی نہیں رک سکتا تھا۔ آگے جہاں زمین ہموار تھی وہاں جھیل بنی ہوئی تھی۔ دریا کی طرف دیکھا تو پتن نظر نہیں آ رہا تھا۔ اوپر کے علاقوں میں بارش ایسی ہی برسی ہوگی جس نے دریا کو سیلابی کر دیا تھا۔ سیلاب بھی ایسا کہ دریا کے کنارے ڈوب گئے تھے۔ میرے جھونپڑے کے آگے تقریباً" ایک گز چوڑا برآمدہ سا بنا ہوا تھا۔ وہاں بہت سی چڑیاں اور چھوٹے چھوٹے پرندے مرے پڑے تھے۔

اگلے روز وانگ اور پانچ چھ دوسرے آدمی میری اور میرے جھونپڑے کی خیریت معلوم کرنے آئے۔ وانگ تو میرا خلیفہ بن گیا تھا۔ ان لوگوں نے بتایا کہ چند ایک جھونپڑوں کی چھتیں اڑ گئی ہیں۔ باتوں باتوں میں وانگ نے کہا کہ اب وہ مجھے کسی دن اس قصبے میں لے جائے گا جہاں سے یہ لوگ اپنی ضرورت کی اشیاء لایا کرتے تھے..... ہم قصبے کو ہی جا رہے تھے کہ راستے میں فضل داد مل گیا اور اسے اٹھا کر ہم واپس آ گئے تھے۔ اس وقت بھی وانگ اور اس کے ساتھی مجھے یہ کہہ کر قصبے کی سیر کے لئے تیار کرتے رہے تھے کہ میں ایک ہی جگہ رہ رہ کر اکتا گیا ہوں اس لئے بار بار کہتا ہوں کہ یہاں سے چلا جاؤں گا' اس کا علاج انہوں نے یہ سوچا تھا کہ مجھے قصبے میں لے جائیں تاکہ میرے ذہن سے گھٹن نکل جائے۔ اب وہ پھر یہی کہہ رہے تھے۔ میں خود محسوس کر رہا تھا کہ مجھے یہاں سے کسی طرف کچھ دیر کے لئے نکلنا چاہئے۔

تین چار دنوں بعد علی الصبح ہم تین چار آدمی قصبے کو روانہ ہوئے لیکن اب ہم پیدل نہیں جا رہے تھے۔ ہم چار آدمی تھے اور چار خچریں تھیں جن پر ہم سوار تھے۔ بستی میں پانچ خچر اور دو گدھے تھے۔ قصبے تک راستہ سیدھا ہوتا تو پندرہ سولہ میل تھا لیکن راستے میں بڑا ہی گھنا جنگل تھا' دلدل والی چھوٹی چھوٹی جھیلیں تھیں' اونچی نیچی ٹیکریاں اور چٹانیں تھیں اور کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ وہاں کوئی آبادی ہی نہیں تھی تو راستہ کون بناتا۔ سولہ سترہ میل کا فاصلہ سو کوس کا فاصلہ لگتا تھا۔

وہاں جنگل کا ایک حصہ دشوار گزار تھا اور درندوں کی وجہ سے خطرناک بھی۔ سب سے بڑا خطرہ اس سانپ کا تھا جو درختوں پر رہتا ہے اور کوئی نیچے سے گزرے تو اسے پیشانی پر کاٹ لیتا ہے۔ پھر زمینی سانپ تھے اور جہاں جھیلیں تھیں وہاں اژدھا اور مگرمچھ

بھی تھے۔ زیادہ خطرہ درخت والے سانپ کا تھا۔ ہماری بستی کے جو لوگ قصبے کو آتے جاتے رہتے تھے' انہوں نے سفر کے لئے قدرے محفوظ علاقہ دیکھ رکھا تھا اور وہ اس میں سے گزرتے تھے لیکن محفوظ وہ بھی نہیں تھا۔

میں رائفل تو ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا کیونکہ وہ فوجی رائفل تھی اور قصبے میں پکڑی جا سکتی تھی۔ وانگ وغیرہ نے مجھے بتایا تھا کہ قصبے میں فوجی دفتر بھی ہے اورع فوجی اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ ان قصبوں اور بڑی آبادیوں میں جو محاذ کے بالکل قریب ہوتی ہیں' انٹیلی جنس کے آدمی وہاں موجود ہوتے ہیں اور ملٹری پولیس کی نفری بھی۔ وہ ہر کسی کو شکی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ سنگاپور' ملایا' برما وغیرہ جاپانیوں کے ہاتھوں گنوا کر انگریزوں کو پتہ چلا تھا کہ جاپانیوں کا جاسوسی کا نظام ان ملکوں کی انتہائی نازک اور اہم رگوں تک پہنچا ہوا ہے۔ ہندوستان میں بھی جاپان کے جاسوس ہندوستانیوں کی صورت میں موجود تھے۔ انگریز اس معاملے میں بہت زیادہ حساس ہو گئے تھے۔

مجھ پر یہ شک نہیں ہو سکتا تھا کہ میں بھگوڑا فوجی ہوں۔ میری داڑھی خاصی لمبی ہو گئی تھی اور میں نے سمیع اللہ کا لمبا چغہ پہن رکھا تھا۔ سر پر مولویوں والی پگڑی تھی اور میں نے کندھے پر رومال ڈال رکھا تھا۔ یہ سارا حلیہ کسی مولانا یا کسی پیرو مرشد کا تھا۔ کسی کو پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ میں نے نیفے میں انگریز پائلٹ کا ریوالور اڑس رکھا ہے جس میں چھ گولیاں ہیں اور اٹھارہ گولیاں بیلٹ میں لگی ہوئی ہیں اور بیلٹ میری کمر سے بندھی ہوئی ہے۔

ہم جنگل میں چلے جا رہے تھے۔ ہم اس جگہ سے گزرے جہاں میں نے ایک چھوٹا مگرمچھ مارا تھا۔ پھر اس جگہ سے بھی آگے نکل گئے جہاں فضل داد ملا تھا۔ ایک آدمی خچر پر سوار آگے آگے جا رہا تھا۔ وہ نیچے کم اور اوپر درختوں کو زیادہ دیکھتا جاتا تھا۔ جس درخت کا ٹہن نیچے کو آیا ہوا ہوتا' اسے تو وہ زیادہ غور سے دیکھتا تھا۔ ایسے ہی ٹہنوں پر وہ سانپ ہوتے تھے جو اوپر سے جھک کر نیچے سے گزرنے والے کے ماتھے پر ڈس لیتے تھے۔ یہ آدمی اسی لئے آگے تھا کہ اسے ان سانپوں کو درختوں کے پتوں میں سے پہچان لینے کا تجربہ تھا۔

آسمان پر ساون کے بادل منڈلا رہے تھے اور ایک طرف سے گھٹا اٹھ رہی تھی۔ ہم گوروں کی باتیں کرتے جا رہے تھے۔ میں بار بار کہتا تھا کہ ان انگریزوں کی غلامی سے

آزاد ہونا ہے لیکن میں نے دیکھا کہ ان لوگوں کو آزادی یا غلامی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اُس جنگل میں شیر کی موجودگی یقینی تھی۔ یہ تو میں بتا چکا ہوں کہ بھیڑیے عام تھے۔ پہلے بھی میں نے یہ بھی بتایا ہے کہ جو علاقے جنگ کی زد میں آ گئے تھے' ان علاقوں کے جنگلوں میں سے درندے بھاگ کر اس طرف آ گئے تھے۔ میرے ساتھی مجھے بتاتے تھے کہ ہم چونکہ زیادہ آدمی ہیں اس لئے کوئی درندہ ہم پر حملہ نہیں کرے گا۔ درندے اکیلے دکیلے آدمی پر حملہ کرتے ہیں۔

○

ہم آدھے سے زیادہ راستہ طے کر چکے تھے۔ اب ہم ایسے علاقے میں جا رہے تھے جس میں درخت کچھ دُور دُور تھے اور ٹیکریاں بھی کچھ پیچھے ہٹ گئی تھیں۔ چلنے کا راستہ آسان ہو گیا تھا۔ ہم ایک ٹیکری کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔ ٹیکری ختم ہو گئی۔ وہ آدمی جو ہمارے آگے جا رہا تھا' دائیں طرف دیکھ کر رک گیا۔ ہم اس تک پہنچ کر رکے تو اُس نے ٹیکری کے پچھلی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اُدھر دیکھا۔ کسی انسان کی ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔

ہمارا گائیڈ اس طرف خچر کو موڑ کر چل پڑا۔ وانگ نے اسے کہا کہ رک کر کیا کرو گے' چلو آگے لیکن اس آدمی نے تو جیسے سنا ہی نہ ہو۔

میں نے اُس طرف دیکھا تو مجھے یوں شک ہُوا جیسے اُن ہڈیوں کے ساتھ دو نالی بندوق پڑی ہوئی ہو۔ کپڑوں کے ٹکڑے تو صاف نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنا خچر ادھر کو موڑ لیا۔ باقی ساتھی بھی وہاں آ گئے۔ واقعی وہاں دو نالی بندوق پڑی ہوئی تھی اور اس سے کچھ دور بیلٹ پڑی ہوئی دیکھی جس میں کارتوس اڑسے ہوئے تھے۔ میں خچر سے اُترا تو باقی سب اتر آئے۔

میں نے بندوق اٹھا کر کھولی۔ اُس میں دو کارتوس پڑے ہوئے تھے لیکن دونوں ہی فائر کئے ہوئے تھے۔ میں نے بندوق اپنے ایک آدمی کو دے دی اور کارتوسوں والی بیلٹ بھی اٹھا لی۔ اس بدقسمت شخص کی ہڈیاں الگ الگ پڑی تھیں۔ پسلیوں کا پنجر ایک طرف' اس سے کچھ دور کھوپڑی تھی جس پر ابھی کھال کچھ باقی تھی اور بال بھی تھے۔ کھوپڑی کے اندر کچھ گوشت تھا اور اسی طرح کسی ہڈی پر ذرا سی کھال چپکی ہوئی تھی اور

کچھ بال بھی تھے۔ مختصر کہ یہ ہڈیوں کی حالت بتاتی تھی کہ اس شخص کو چند دن پہلے ہی کھایا گیا ہو۔ ہڈیاں پرانی نہیں تھیں۔ بندوق سے پتہ چلتا تھا کہ یہ شکاری تھا اور شکار کے لئے آیا تھا۔ ہڈیوں پر کیڑے مکوڑے رینگ رہے تھے۔

ہم سب خچروں پر سوار ہوئے اور وہاں سے چل پڑے۔ میرے دل پر کچھ بُرا ہی اثر ہوا اور میں سوچنے لگا کہ یہ بیچارہ نہ جانے کون تھا اور اس کے گھر والے انتظار کرتے رہے ہوں گے کہ وہ شکار مار کر لائے گا۔

”کوئی بے وقوف آدمی تھا“ —— میرے ایک ساتھی نے کہا —— ”اس جنگل میں اکیلے شکار کے لئے آنا خودکشی کی کوشش ہوتی ہے۔ ان جنگلوں میں انسان تو یوں مارا جاتا ہے جس طرح کیڑا مکوڑا پاؤں تلے آ جاتا ہے“۔

”اس جنگل میں کوئی تجربہ کار شکاری ہی شکار کھیل سکتا ہے“ —— ایک اور ساتھی نے کہا —— ”اسے درندوں نے مارا ہو گا“۔

ایسے ہی باتیں کرتے چلتے گئے۔ دو ساتھیوں نے دو شکاریوں کا ایسا ہی انجام سنایا اور یہی باتیں کرتے کرتے ہم قصبے میں داخل ہوئے۔

اس قصبے کا نام وودون تھا۔ یہ قصبہ نہیں بلکہ یہ ایک بڑا گاؤں تھا۔ ارد گرد بانسوں کے بنے ہوئے بڑے اچھے جھونپڑے تھے اور ان کے آگے کچھ مکان پکے بھی تھے اور کچھ پتھروں اور مٹی کے بنے ہوئے جھونپڑے بھی تھے لیکن محنت اور خوبصورتی سے بنائے گئے تھے۔ میرا خیال تھا یہ ایک گمنام گاؤں ہو گا جسے جنگ نے کچھ اہمیت دے دی تھی۔ میں نے دُور ہی سے دو فوجی ٹرک دیکھے۔ فوج کی وجہ ہی سے اس قصبے کو اہمیت اور رونق ملی تھی۔

قصبے کو اتنا زیادہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں' میں آپ کو ایک خاص بات سنانا چاہتا ہوں۔ یہ سنانے سے پہلے میں یہ بتا دوں کہ اس زمانے میں سمگلنگ کے نام سے شاید بہت کم لوگ واقف ہوں گے لیکن اس قصبے میں کچھ اس طرح کی سمگلنگ ہوتی تھی کہ فوجی راشن سول کے کچھ جرائم پیشہ آدمیوں کے ہاتھ لگ جاتا تھا۔ وہ اسے ضرورت مند لوگوں تک اچھی خاصی قیمت پر پہنچاتے تھے۔ جنگ عظیم کے دوران انگریز سارے ہندوستان کا اناج اور دیگر اشیائے خوردنی محاذوں پر پہنچاتا رہتا تھا۔ فوج کے سپلائی کے محکمے میں وسیع پیمانے پر کرپشن شروع ہو گئی تھی۔ ہماری بستی میں جو راشن جاتا تھا وہ فوج

کاچرایا ہوا راشن ہوتا تھا۔

ہم قصبے میں داخل ہوئے۔ بازار خاصا بارونق تھا۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ لوگ خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ چلتے چلتے وانگ نے ایک آدمی کو آواز دی۔ اُس آدمی نے رُک کر پیچھے دیکھا تو دوڑا آیا۔ وانگ خچر سے کُود کر اترا اور اس کے ساتھ بغلگیر ہو گیا۔

وانگ نے میری طرف اشارہ کیا تو آدمی آہستہ آہستہ میری طرف آیا۔ میں اس کی طرف بڑھا اور اس آدمی نے جھک کر میرے ساتھ مصافحہ کیا اور میرے ہاتھ چُومے۔ میرے دوسرے ساتھی بھی خچروں سے اُتر آئے اور وہ شخص ان سب سے ملا۔

یہ سب اپنی زبان میں باتیں کر رہے تھے اس لئے مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا کہہ اور سُن رہے ہیں۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔ مجھے ملٹری پولیس کے دو گورے نظر آئے جو آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ دو آدمی مجھے بڑی غور سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ آگے گئے اور واپس آ گئے۔ واپسی پر وہ میرے قریب سے گزرے اور مجھے دیکھتے گئے۔ وہ یقیناً ”انٹیلیجنس کے مخبر تھے۔ میں نے ان کی طرف دھیان ہی نہ دیا لیکن میں انہیں دیکھتا رہا۔

وانگ نے میرے ساتھ اردو میں بات کرتے ہوئے بتایا کہ یہ شخص جو اسے ملا ہے‘ اس کا پرانا دوست ہے اور جب بھی وہاں آتا ہے اس کے پاس کچھ وقت گذارتا ہے۔ وانگ نے کہا کہ یہ ہم سب کو اپنے گھر لے جانا چاہتا ہے۔

میں نے وانگ سے پوچھا کہ اُس نے اس آدمی کو میرے متعلق کیا بتایا ہے۔ وانگ نے کہا کہ اس نے یہ بتایا ہے کہ میں رنگون میں دکان کرتا تھا اور ہم اکٹھے وہاں سے بھاگے تھے۔ اس نے میرے متعلق یہ بھی بتایا کہ میں رنگون کی ایک مسجد میں امامت بھی کیا کرتا تھا۔

وہ شخص برما کے ایک اور بڑے شہر مانڈلے کا رہنے والا تھا اور وہاں سے بھاگ کر یہاں آ گیا تھا۔ وانگ نے بعد میں مجھے بتایا تھا کہ یہ کوئی شریف آدمی نہیں بلکہ معزز قسم کے مجرموں میں سے ہے اور یہ فریب کاری اور دھوکہ دہی کا ماہر ہے۔ وانگ نے اس کا نام بتایا تھا جو اتنا مشکل تھا جو میں تھوڑی ہی دیر بعد بھول گیا تھا۔ اس نام کا تلفظ بھی بڑا مشکل تھا۔ آدمی ہنس مکھ اور زندہ دل معلوم ہوتا تھا۔ شکل و صورت کے لحاظ سے بھی وہ

پُرکشش تھا۔ وہ ہمیں اپنے گھر لے گیا۔

اس کا گھر چھوٹا سا لیکن بڑا ہی خوبصورت تھا۔ اس نے ہمیں ایک کمرے میں بٹھایا جس میں بڑی اچھی قسم کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور ایک جوڑی تپائی بھی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ خوشحال آدمی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس کا نوکر چائے لے آیا جس کے ساتھ بسکٹ اور ایک دو اور چیزیں بھی تھیں۔

ہمارا میزبان وانگ سے زیادہ اچھی اردو بولتا تھا۔ اس نے میرے ساتھ کچھ باتیں کیں پھر وہ وانگ اور میرے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ اپنی زبان میں باتیں کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ باتیں کرتے کرتے وانگ اور اُس کے ساتھی چونکے اس سے میں سمجھ گیا کہ اُس نے کوئی نیا انکشاف کیا ہے یا کوئی سنسنی خیز بات کہہ دی ہے۔

”لو صاحب!“ —— وانگ نے مجھے کہا —— ”یہ ہمیں اس آدمی کا واقعہ سنا رہا ہے جس کی ہڈیوں کا پنجر وغیرہ جنگل میں دیکھا تھا۔ میں نے اسے بتایا ہے کہ یہ بندوق اسی کی ہے جو ہم اٹھا لائے ہیں“۔

وانگ نے بندوق اور کارتوسوں والی بیلٹ اسے دکھائی۔

ہمارے میزبان نے اپنی زبان میں بات شروع کی اور وہ بولتا ہی چلا گیا۔ ایک بار اس نے رک کر مجھ سے اردو میں کہا کہ میرے ان مہمانوں میں صرف وانگ اُردو سمجھتا ہے اس لئے میں دوسرے مہمانوں کی خاطر ان کی زبان میں بات کر رہا ہوں۔ اُس نے کہا کہ یہ آپ کو ساری کہانی سناویں گے۔ اس کے بعد وہ پھر اپنی زبان میں ساری بات سنانے لگا۔

میں اپنے ساتھیوں کے چہروں کو دیکھتا رہا۔ اُن کے چہروں پر طرح طرح کے تاثرات آتے اور جاتے تھے۔ یہ کوئی بڑی دلچسپ کہانی معلوم ہوتی تھی..... چائے چلتی رہی اور کہانی بھی چلتی رہی اور خاصا وقت گزر گیا۔ غالباً ڈیڑھ دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ آخر ہم اٹھے اور میزبان سے ہاتھ ملا کر آ گئے۔

وانگ مجھے سیر کرانا چاہتا تھا لیکن میں وانگ سے وہ کہانی سننا چاہتا تھا جو اسے میزبان نے سنائی تھی۔ میں آپ کو زیادہ انتظار میں نہیں رکھوں گا‘ بہتر سمجھتا ہوں آپ کو یہ بات سنا دوں۔

میں نے وانگ سے کہا کہ مجھے وہ پہلے یہ بات سنائے لیکن وانگ نے کہا کہ اس

شخص کی موت کا واقعہ اطمینان سے سنانے والا ہے' جب واپس چلیں گے تو راستے میں سناتا جاؤں گا..... وانگ نے مجھے سارے قصبے میں گھمایا پھرایا۔ اس کا اچھا خاصا اثر و رسوخ بازار میں نظر آیا۔ اکثر دکاندار اسے آواز دے کر بڑے پیار اور محبت سے یا احترام سے سلام کرتے تھے۔

میں اپنے مطلب کی چیزیں دیکھتا پھر رہا تھا۔ ایک دو فوجی نظر آ رہے تھے۔ میں انہیں غور سے دیکھتا تھا۔ یہ سب ہندوستانی تھے اور گورے فوجی جو نظر آتے تھے وہ زیادہ تر ملٹری پولیس کے تھے۔ چلتے چلتے وانگ ایک دکان کے سامنے رُک گیا' دکاندار کے ساتھ اس کی سلام و دعا تھی اور وہ دکاندار کے پاس چلا گیا۔ میں ذرا الگ کھڑا تھا۔ وہی دو آدمی جو میں نے پہلے بتایا ہے مجھے غور سے دیکھ رہے تھے' میرے پاس آ گئے اور مسکرا کر سلام کیا اور ہاتھ ملایا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ میرا تعاقب کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے جب بات کی تو میں نے جانا کہ یہ بنگالی ہیں گہری سانولی رنگت سے تو وہ بنگالی ہی لگتے تھے لیکن ان کا اُردو کا لب و لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ یہ بنگال کے نہیں۔

"آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا" ــــ ان میں سے ایک نے کہا اور پوچھا ــــ "آپ کہاں رہتے ہیں؟"

"یہ تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں ہندوستانی ہوں" ــــ میں نے کہا ــــ "رنگون میں میری دکان تھی۔ بڑی اچھی چل رہی تھی لیکن بیڑہ غرق ان جاپانیوں کا کہ انہوں نے حملہ کر دیا اور وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اب میں جنگل میں ایک چھوٹی سی بستی میں رہتا ہوں۔ یہ سب لوگ میرے ساتھ آئے تھے۔ آگے راستے بند ہو گئے تھے اس لئے ہم وہیں رک گئے"۔

میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ ایک نے کہا وہ سلہٹ کا رہنے والا ہے دوسرے نے بوگرہ کا نام لیا۔ بوگرہ مشرقی بنگال کا ایک شہر ہے۔ میں نے پوچھا کہ وہ یہاں کیا کر رہے ہیں تو انہوں نے بتایا کہ یہاں ان کی سپلائی کا کاروبار ہے اور وہ ایک ٹھیکیدار کے معمولی سے حصّہ دار ہیں۔

وہ میرے ساتھ ہاتھ ملا کر چلے گئے تو وانگ نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے انہیں ایسی ویسی بات تو نہیں بتا دی؟ میں نے وانگ سے پوچھا کہ وہ انہیں جانتا ہے؟ وانگ نے بتایا کہ انہیں وہ اچھی طرح جانتا ہے۔ یہ انگریزوں کے جاسوس ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ انٹیلی

جنس کے مخبر تھے..... میں نے جو حلیہ بنا رکھا تھا اور جس طرح میری داڑھی بڑھی ہوئی تھی یعنی مولویوں جیسی تھی' اس سے لوگوں کو دھوکہ دیا جا سکتا تھا' انٹیلی جنس کے مخبروں کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونکی جا سکتی تھی۔ انٹیلی جنس والے جانتے تھے کہ جاسوس عموماً" میرے والا بھیس بدل لیا کرتے ہیں اور عبادت گاہوں میں بیٹھ کر جاسوسی کیا کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ ان مخبروں نے میری بات صحیح مان لی تھی یا نہیں۔ بہرحال ہم تھوڑی دیر بعد وہاں سے چل پڑے۔ ہمیں شام سے پہلے پہلے اس جنگل سے گزر کر اپنی بستی تک پہنچنا تھا۔ درندے شام کے بعد باہر نکلتے اور اپنا شکار ڈھونڈتے ہیں۔

ہم قصبے سے نکلے اور واپسی کا راستہ اختیار کیا۔ وانگ نے اپنا خچر میرے خچر کے پہلو کے ساتھ رکھا اور اس نے بات شروع کر دی۔ بات یہ تھی کہ جب فوج نے اپنا دفتر اس قصبے میں آکر بنایا تو ایک ادھیڑ عمر آدمی جو آسام کا رہنے والا مسلمان تھا' فوج کے ساتھ ہی یہاں آ گیا۔ وہ فوجی نہیں تھا' سویلین تھا لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کی نوکری اور ڈیوٹی کیا ہے۔ اُس کا نام شجاع الدین تھا۔ وہ کسی دفتر میں تو بیٹھتا نہیں تھا' عموماً" بازار میں اس قصبے کی گلیوں میں آہستہ آہستہ گھومتا پھرتا نظر آتا تھا۔

وہ شکل و صورت سے بڑا ہی پُروقار اور مسکراتا ہُوا لگتا تھا' ہر کسی کے ساتھ سلام و دعا رکھتا اور رُک کر خیر خیریت پوچھتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ یہاں سے غائب ہو جاتا اور کبھی ایک مہینہ اور کبھی دو مہینے لگا کر واپس آتا تھا۔ ہر کوئی اسے عزت سے ملتا کیونکہ اس کا سارا انداز اور ملنے جلنے کا طور طریقہ شریف آدمیوں والا تھا۔ وہ ایک بڑے اچھے مکان میں رہتا تھا جس میں اس کا ایک نوکر تھا' بیوی بچے نہیں تھے۔ یہ تو سب کو پتہ چل گیا تھا کہ وہ شراب پیتا ہے اور پھر یہ بھی دیکھا گیا کہ ایک برمی جواں سال عورت اس کے گھر جانے لگی ہے۔ صاف بات تھی کہ اس عورت کے اس کے تعلقات قابل اعتراض تھے۔ اس کے نوکر سے کوئی پوچھتا کہ تمہارا مالک کیا کرتا ہے یا اس کے گھر کی کوئی اور بات کی جاتی تو نوکر ہنس کر ٹال دیتا یا ویسے ہی بات کو گول کر جاتا۔ یہ تو سب کو پتہ چل گیا تھا کہ یہ فوج کا یا انگریزوں کا خاص قابل اعتماد آدمی ہے اور جسے چاہے انگریزوں سے فائدہ دلوا سکتا ہے اور جسے چاہے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ آدمی پُراسرار تھا۔

اس قصبے سے دو آدمی پکڑے گئے جو یہاں کے رہنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے یہاں آکر یہ بتایا تھا کہ روزگار کی تلاش میں آئے ہیں۔ دونوں آسام کے رہنے والے

ہندو تھے۔ انہیں کوئی روزگار نہ ملا تو ایک دکان کھول لی جس میں انہوں نے سگریٹ وغیرہ رکھ لئے لیکن ایک ہی مہینے بعد وہ لاپتہ ہو گئے۔ آخر پردہ اٹھ گیا اور معلوم ہُوا کہ ان دونوں کو شجاع الدّین نے گرفتار کروایا تھا کیونکہ یہ دونوں جاپانیوں کے جاسوس تھے۔

پھر اس نے تین اور تعلیم یافتہ قسم کے آدمی اس طرح گرفتار کروائے کہ ایک رات ملٹری پولیس نے ان تینوں کے گھروں پر چھاپے مارے اور کچھ لٹریچر برآمد ہوا اور یہ ثبوت مل گیا کہ ان لوگوں کا تعلق اس انڈین نیشنل آرمی کے ساتھ ہے جو جاپانیوں نے تیار کر رکھی ہے۔ یہ کارنامہ بھی شجاع الدین کا تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ شجاع الدین نے اپنے مخبر تیار کر رکھے تھے۔ وہ جو کچھ عرصے کے لئے غائب ہو جاتا تھا' وہ جاسوسی کے سلسلے میں جاتا تھا۔ اسے کئی بار فوجی گاڑی سے قصبے سے جاتے دیکھا گیا تھا۔

اس قصبے میں ایک خاندان تھا جس کا تعلق بدھ مذہب کے ساتھ تھا۔ ان کی دو جوان لڑکیاں تھیں اور دونوں خاصی خوبصورت تھیں۔ ایک رات فوج نے اس گھر پر بھی چھاپہ مارا اور دو جوان آدمیوں کو پکڑ کر لے گئی۔ پتہ چلا کہ یہ چھاپہ بھی شجاع الدین نے مروایا تھا۔

اس خاندان کو سب لوگ جانتے تھے۔ بڑا ہی شریف اور عزت والا بلکہ عظمت والا گھرانہ تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس گھر میں جاسوس بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ لوگوں میں شجاع الدین کے خلاف چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ تین چار دنوں بعد اس خاندان کے یہ دونوں پکڑے ہوئے آدمی گھر آ گئے اور پھر دیکھا کہ اس خاندان کی بڑی لڑکی ایک انگریز میجر کے کوارٹر میں گئی۔ اس کے بعد یہ لڑکی اس میجر کے ساتھ گھومتی پھرتی نظر آنے لگی۔ بات بڑی صاف تھی۔ وہ یہ کہ یہ میجر اس لڑکی کو چاہتا تھا یا شجاع الدّین نے اس میجر کو خوش کرنے کے لئے یہ لڑکی اس کے ساتھ لگا دی تھی اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ اس گھر پر چھاپہ مروایا' لڑکی کے دو بھائیوں کو گرفتار کروایا اور اندر ہی اندر کوئی سودا بازی ہوئی اور لڑکی نے اپنے بھائیوں کی خاطر اس انگریز میجر کے ساتھ دوستی لگا لی۔

یہ بھی سنا گیا کہ آسام سے ایک یا دو آدمی آئے تھے اور انہوں نے شجاع الدین کے متعلق بتایا تھا کہ یہ انگریزوں کا مخبر ہے اور پولیس کو اس نے مخبری کے ذریعے ہاتھ میں لے رکھا ہے اور اس طرح بعض شریف گھروں کی لڑکیوں کو خراب کر چکا ہے۔ انہوں

نے یہ بھی بتایا کہ وہاں اس کے آدمی جس سے چاہیں جگا ٹیکس وصول کر لیتے ہیں۔ یہ اس شخص کی شہرت ہے۔

اس کے پاؤں اس قصبے میں جم گئے تو اس نے جگا ٹیکس یہاں بھی لینا شروع کر دیا تھا لیکن اتنا عام نہیں۔ کسی بڑے دکاندار کے ہاں جا دھمکتا اور اس سے کہتا کہ اتنے پیسے فوراً نکالو ورنہ فوج کو تم پر شبہ ہے کہ تم جاسوس ہو۔ اس کی اس قسم کی حرکتوں نے اسے سارے قصبے میں بدنام کر دیا۔ پہلے لوگ اسے احترام سے سلام کرتے تھے لیکن اب اس کے ساتھ کوئی بات نہیں کرتا تھا لیکن اس شخص کو اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اُس کے پاس انگریزوں کی اتھارٹی تھی اور انگریزوں کا رعب استعمال کرتا تھا۔



اسی قصبے میں ایک مسلمان گھرانہ بھی رہتا تھا۔ مسلمانوں کے چند اور گھر بھی تھے۔ اس مسلمان گھرانے میں ایک بڑی ہی خوبصورت اور کنواری لڑکی تھی۔ وہ بغیر پردے کے باہر نکلا کرتی تھی۔ شجاع الدین کی نظر اس پر پڑ گئی اور وہ اس لڑکی کو پھانسنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے لڑکی کے باپ کے ساتھ میل جول شروع کر دیا اور اس کے گھر بھی جانے لگا۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ ایک بار وہ چاولوں کی بوری اٹھا کر اس مسلمان کے گھر گیا تھا۔ اس سے لوگوں نے یہ رائے قائم کی کہ یہ لڑکی کی خاطر اس گھر کو فوج کا راشن مفت سپلائی کر رہا ہے۔

لڑکی کا باپ عزت و شرافت والا تھا اور اس گھرانے کا شمار شریف گھرانوں میں ہوتا تھا۔ وہ نمازی اور پرہیزگار آدمی تھا۔ ایک روز اس نے اپنے پڑوسیوں کو بتایا کہ شجاع الدین اسے دھمکیاں دیتا ہے کہ اپنی بیٹی کو میرے گھر بھیجا کرو ورنہ تمہیں گرفتار کروا دوں گا۔ یہ بات آہستہ آہستہ قصبے میں پھیل گئی۔ چونکہ وہ بڑا ہی معزز اور شریف گھرانہ تھا اس لئے دو تین معزز اور بزرگ آدمی شجاع الدین کے ہاں گئے اور اسے بتایا کہ وہ کم از کم اس گھرانے کو پلید نہ کرے۔

شجاع الدین نے یہ بات بنائی کہ یہ شخص اسے بلاوجہ بدنام کر رہا ہے۔ اس نے لڑکی کے باپ کے خلاف ایسے ایسے الزامات سنائے کہ سننے والوں نے کانوں میں ہاتھ رکھے اور وہاں سے واپس آ گئے۔ انہوں نے ایک بھی الزام سچا نہیں سمجھا تھا۔ البتہ وہ یہ سمجھ گئے کہ شجاع الدین میں انسانی جذبات ہیں ہی نہیں اور وہ اندر باہر سے شیطان ہے۔ لوگوں

نے یہ بھی سوچنا شروع کر دیا تھا کہ اس شخص کو کس طرح انسان بنایا جائے اور اگر یہ انسانیت کو قبول نہیں کرتا تو اس کا کچھ نہ کچھ بندوبست ضرور کیا جائے لیکن فوج کے انگریز افسر اسے اتنا اچھا سمجھتے تھے کہ سب نے کہا کہ اس کے خلاف کوئی شکایت اس کے افسر نہیں مانیں گے۔ ایک روز لڑکی کے باپ نے روتے ہوئے اپنی جان پہچان کے چند ایک آدمیوں سے کہا کہ رات شجاع الدین اس کے گھر آیا تھا اور یہ کہہ کر چلا گیا ہے کہ ایک ہفتے کے اندر اندر اُس نے اپنی بیٹی کا نکاح شجاع الدین کے ساتھ نہ کیا تو وہ پورے خاندان کے آدمیوں اور عورتوں کو جاسوسی کے الزام میں گرفتار کروا دے گا اور کبھی بھی اس جال سے نکلنے نہیں دے گا۔ لوگوں نے یہ بات سنی تو وہ سوچنے لگے کہ درخواست لکھ کر انگریز افسروں کو دی جائے یا کیا کیا جائے۔ لڑکی کا باپ تو بیچارا رو رو کر آدھا رہ گیا تھا۔

O

شجاع الدین کا ایک مشغلہ شکار تھا۔ اس کے پاس دو نالی بندوق تھی۔ وہ گھوڑے پر شکار کھیلنے جایا کرتا تھا لیکن کبھی کبھی۔ ایسا نہیں کہ ہر روز یا ہر ہفتے جاتا ہو۔ ایک بار وہ ہرن مار کر لایا تھا اور ایک بار وہ موٹا تازہ خنزیر مار لایا تھا۔ اگر اسے بڑا شکار نہیں ملتا تھا تو وہ پرندے مار لاتا تھا۔

جس روز ہم اس قصبے میں گئے تھے، اس سے پانچ چھ روز پہلے شجاع الدین شکار پر نکلا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا اور اس کے ساتھ اپنا ایک آدمی تھا جو اس کے لئے مخبری کیا کرتا تھا۔ وہ بھی اچھا خاصا بدمعاش آدمی تھا۔ وہ شجاع الدین کے ساتھ پیدل جا رہا تھا۔

وہ دونوں صبح کے وقت نکلے تھے۔ بارہ بجے کے بعد شجاع الدین کا یہ آدمی سرپٹ گھوڑا دوڑاتا قصبے میں واپس آیا۔ بہت ہی سخت گھبرایا ہوا تھا۔ خوف اس کے چہرے پر جیسے لکھا ہوا تھا۔ اس نے بازار میں آکر گھوڑا روکا اور پہلے ایک دو آدمی اس کے پاس رکے پھر ہجوم اس کے ارد گرد اکٹھا ہو گیا۔

اس نے ہانپتی کانپتی سانسوں سے خوف زدہ آواز میں لوگوں کو سنایا کہ وہ قصبے میں سے نکلے تو شجاع الدین نے اسے کہا کہ آج میں بڑا شکار کھیلوں گا۔ وہ کہتا تھا کہ آج شیر سامنے آجائے تو مزا ہی آجائے گا۔

وہ چلتے چلے گئے اور چار پانچ میل دور جنگل میں جا پہنچے۔ ایک جگہ شجاع الدین نے

گھوڑا روکا اور اتر آیا۔ اس نے گھوڑا اپنے آدمی کے حوالے کر دیا اور خود دونوں پیدل چلنے لگے۔ کچھ اور آگے گئے تو شجاع الدین نے اپنے اس آدمی سے کہا کہ تم گھوڑے کو پکڑے رکھو اور یہیں ٹھہرو۔ شجاع الدین نے بندوق کی دونوں نالیوں میں کارتوس پہلے ہی ڈال لئے تھے۔ وہ آگے چلتا گیا اور اپنے آدمی سے بیس پچیس قدم دور تک جا پہنچا۔ کسی جانور کے تیز دوڑنے کی آہٹیں سنائیں دیں۔ شجاع الدین رک گیا۔ اس نے بندوق دونوں ہاتھوں میں لے لی تھی۔ اچانک ٹیکری کے پیچھے سے ایک خنزیر سرپٹ دوڑتا نکلا۔ وہ شجاع الدین کی طرف آرہا تھا۔ شجاع الدین نے بندوق کندھے سے لگائی اور دونوں کارتوس یکے بعد دیگرے فائر کر دیئے۔ اس کا نشانہ خطا نہ گیا اور خنزیر سیدھا دوڑتے دوڑتے ایک طرف کو مڑا پھر ایک جگہ رک کر چکر کھانے لگا اور اتنی دیر میں چار یا پانچ بھیڑیئے بڑی تیزی دوڑتے پہنچ گئے۔ یہ بھیڑیئے نہ جانے کہاں سے اور کتنی دُور سے اُس خنزیر کے تعاقب میں آرہے تھے۔

شجاع الدین نے غالباً یہ سوچا ہو گا کہ وہ دوسرے کارتوس ڈال کر فائر کرے گا تو بھیڑیئے بھاگ جائیں گے۔ دراصل اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُس کی موت کا سبب بنا دیا تھا جو یہ تھا کہ اس کی عقل پر پردہ پڑ گیا تھا۔ وہ بڑے شکار کا شوقین تو تھا لیکن اُسے معلوم نہیں تھا کہ درندے اپنا شکار نہیں چھوڑا کرتے۔ بھیڑیئے تو کسی صورت قبول نہیں کرتے کہ کوئی اور ان کا شکار اٹھا کر لے جائے۔

خنزیر ابھی گرا نہیں تھا اور شجاع الدین ابھی بندوق سے فائر کئے ہوئے کارتوس نکال بھی نہیں پایا تھا۔ خنزیر چکر کھاتے کھاتے شجاع الدین کے قدموں کے قریب آکر گرا اور تڑپنے لگا۔ اس کے سارے جسم پر خون ہی خون تھا۔ بھیڑیئے بھی وہاں پہنچ گئے۔ شجاع الدین بندوق کی نالیاں کھول ہی نہ سکا۔ وہ بہت جلدی میں تھا اس لئے گھبراہٹ میں اس سے نالیاں نہ کھلیں۔ بھیڑیوں نے خنزیر پر حملہ کر دیا۔ شجاع الدین کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ اس نے بندوق کی نالیاں پکڑ کر بندوق گھمائی۔ بٹ ایک بھیڑیئے کو لگا۔ وہ بھیڑیا چیختا ہوا پرے چلا گیا اور بڑے غصے سے غراتے ہوئے شجاع الدین کی طرف آیا۔

شجاع الدین کا خیال تھا کہ وہ بھیڑیوں کو بھگا دے گا۔ اس کی بندوق کو دیکھ کر بھیڑیئے ذرا سے پیچھے ہٹے اور ایک چکر میں گھومنے لگے۔ ایک بھیڑیا اس کے پیچھے چلا گیا اور وہاں سے بھیڑیئے نے جست لگائی تو شجاع الدین کے کندھوں پر جا پنجے گاڑے اور

اُس کی گردن پیچھے سے منہ میں لے لی۔ اپنے ساتھی کو دیکھ کر دو اور بھیڑیے شجاع الدین پر حملہ آور ہو گئے۔ وہ جان گئے تھے کہ خنزیر ان کا شکار تھا لیکن شجاع الدین اُس پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ شجاع الدین خنزیر کو اپنا شکار سمجھ رہا تھا لیکن وہ شاید یہ بھول گیا تھا کہ درندے اپنا فیصلہ خود کیا کرتے ہیں اور وہ دوسری پارٹی کا موقف نہیں سنا کرتے۔

شجاع الدین کے ساتھی نے دیکھا کہ سارے بھیڑیے شجاع الدین پر ٹوٹ پڑے اور اسے گرا لیا۔ شجاع الدین کا ساتھی جو بیس پچیس قدم پیچھے تھا وہ بڑی تیزی سے گھوڑے پر سوار ہوا اور ایڑ لگا دی۔ گھوڑا ہوا ہو گیا اور قصبے میں جادم لیا۔

لوگوں نے یہ بات سنی تو کسی ایک نے بھی نہیں کہا کہ بہت افسوس ہے کہ شجاع الدین مارا گیا ہے۔ اگر کسی نے بلند آواز میں نہ کہا تو اپنے پاس کھڑے آدمی کے کان میں یہ سرگوشی ضرور کی کہ چلو یہ شیطان تو ختم ہوا۔ وانگ کو اس کے جس دوست نے میری موجودگی میں یہ کہانی سنائی تھی' اُس نے وانگ کو بتایا کہ اس مسلمان لڑکی کے باپ کو بعض لوگوں نے کہا کہ اللہ کا شکر ادا کرو کہ وہ خبیث مارا گیا ہے اور تمہاری بیٹی کی عزت بچ گئی ہے۔

”میرے منہ سے ایسی بددعا تو نہیں نکلی تھی“ ـــ لڑکی کے باپ نے آہ لے کر کہا ـــ ”میں نے یہ ضرور کیا تھا کہ گزشتہ رات عشاء کی نماز کے بعد نفل پڑھنے شروع کئے تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ حتیٰ کہ میں تھک کر چور ہو گیا' پھر میں نے ہاتھ پھیلا کر اللہ سے التجا کی کہ یا اللہ میری معصوم بیٹی کو محفوظ رکھنے والا تو ہی ہے۔ اس کے بعد میری زبان سے کوئی لفظ نہ نکلا کیونکہ میں اتنا رویا اتنا رویا کہ اپنے آپ پر قابو نہ رہا..... اب میں اللہ کی عظمت کو بسرو چشم سلام کرتا ہوں کہ اس کی ذاتِ باری نے میرے خاندان کی اور میری بیٹی کی عزت بچا لی ہے اور کوئی نہ ہو تو اللہ تو ہے ہی!“

اُمید تھی کہ جس طرح شجاع الدین نے فوج کی خدمت کی تھی' فوجی افسر کسی کو بھیجیں گے کہ جا کر دیکھو' اگر شجاع الدین کی لاش پڑی ہے تو اٹھا کر لے آؤ۔ فوج کی طرف سے ایسی کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ دو آدمی جو شجاع الدین کے اپنے ہی مخبر تھے' گئے تھے لیکن دُور سے ہی واپس آ گئے۔ انہوں نے شجاع الدین کی ہڈیاں دیکھیں' بندوق بھی دیکھی اور دُور سے ہی دیکھ کر واپس آ گئے۔

یہی کچھ ہم نے دیکھا تھا اور بندوق وانگ نے لے لی تھی۔ وہ بندوق بستی میں لے

آیا تھا اور اس کے کارتوس بھی وانگ نے اپنے پاس رکھ لئے تھے۔

میں اُس واقعہ پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ اس پر تبصرہ قرآن مجید میں موجود ہے۔ میں اس بڑھاپے میں ایک روز تلاوت قرآن کر رہا تھا تو میری نظریں پارہ 28 کی سورہ الطلاق کی آیت نمبر9 پر رک گئیں۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتے ہیں ـــ ”انہوں نے اپنے کئے کا مزہ چکھ لیا اور ان کا انجام نقصان والا ہی ہونا تھا“

ہم جب اُس قصبے' سے واپس اپنی بستی میں پہنچے تھے' اُس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ اُس وقت تک میں ہشاش بشاش تھا۔ اس سیر کا طبیعت پر بڑا اچھا اثر پڑا مگر شام کا کھانا کھا کر جب میں تنہا اپنے جھونپڑے میں بیٹھا تھا تو اچانک دل میں ایک بڑی ہی ناگوار گرفت محسوس کی۔ اسے گھبراہٹ کہہ لیں' خفقان کہہ لیں' ہُوا یوں کہ دل بجھ سا گیا اور ساری تازگی جو اتنی اچھی سیر سے حاصل کی تھی' بالکل ہی ختم ہو گئی۔

ایک تو شجاع الدین کا انجام یاد آ گیا۔ ذہن میں اس طرح کے تصورات آنے لگے کہ بھیڑیوں نے اسے کس طرح چیرا پھاڑا ہو گا اور آخری وقت اس شخص نے کیا سوچا ہو گا۔ اسے گناہوں کی سزا ملی تھی لیکن آخر وہ انسان تھا۔ مجھے افسوس سا ہونے لگا اور اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آ گیا کہ میں بھی گناہگار ہوں۔ میں نے اور جو گناہ کئے سو کئے' کسی کو دھوکہ اور فریب نہیں دیا تھا۔ ناجائز دوستی بھی لگائی لیکن کسی عورت کو دھوکہ دے کر نہیں..... تاہم گناہ گناہ ہی ہوتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے مجھے بھی اس جنگل میں اپنے گناہوں کی ایسی سزا ہی ملے گی۔ یہ احساس ایک خوف کی صورت اختیار کرنے لگا۔

بڑی ہی تیزی سے میری ذہنی کیفیت ایسی بگڑی جیسے میں ابھی رو پڑوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ رونے کو جی چاہنے لگا تھا۔ میں اس وقت ڈیپریشن کے لفظ سے واقف نہیں تھا۔ آج کسی کی طبیعت ذرا سی بھی اُکھڑتی ہے یا کوئی شخص ذہن پر ذرا سا بوجھ محسوس کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ مجھے ڈیپریشن ہو گئی ہے۔ میں اُس زمانے میں اس لفظ سے واقف نہیں تھا۔ آج اپنی وہ ذہنی کیفیت تفصیل سے بیان کرنے کی بجائے اتنا ہی بتا دیتا ہوں کہ

مجھ پر ڈیپریشن طاری ہو گئی تھی۔

بہت کوشش کی کہ اپنے آپ کو سنبھال لوں اور مزاج میں شگفتگی پیدا کر لوں لیکن جو بھی خیال آتا تھا وہ یاسیت اور شکست کا احساس لے کر آتا تھا۔ ایسی ذہنی کیفیت میں شاید ایسا ہی ہوتا ہے کہ کوئی امید افزا سوچ آتی ہی نہیں۔ پہلے تو میں سمجھا کہ شجاع الدین کے انجام نے مجھے اداس کر دیا ہے لیکن مجھے وہ دو آدمی یاد آ گئے جو قصبے میں ملے تھے۔ انہوں نے مجھے کہا تھا کہ آپ کو اس سے پہلے قصبے میں نہیں دیکھا۔ قصبے میں ہی مجھے وانگ کے دوست نے بتایا تھا کہ یہ دونوں آدمی انگریزوں کے جاسوس ہیں۔ وہ انٹیلی جنس کے آدمی تھے اور میں پچھلے باب میں سنا چکا ہوں کہ وہ مجھے بڑی ہی گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور انہوں نے میرا تعاقب بھی کیا تھا۔ میں سویلین ہوتا تو ان سے مجھے کوئی ڈر نہیں تھا لیکن میں بھگوڑا فوجی تھا۔ فوج سے بھگوڑا ہونا تو ایک جرم تھا ہی' اصل جرم یہ تھا کہ برما فرنٹ پر جو فوجی بھگوڑے ہوتے تھے' ان کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہ جاپانیوں کے پاس چلے گئے ہیں۔ کوئی بھگوڑا پکڑا جاتا تو اس پر بھگوڑا ہونے کے علاوہ یہ الزام بھی عائد کیا جاتا تھا کہ وہ جاپانیوں کے پاس جانے اور انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہونے کے لئے بھگوڑا ہوا تھا۔

میں نے برسوں بعد واپس گھر آ کر وہ کتابیں پڑھی تھیں جو جاپانیوں کے حملے کے متعلق لکھی گئی تھیں۔ جنرل اسلم نے ایک کتاب برما فرنٹ کے متعلق لکھی تھی۔ اس کا میں پہلے بھی حوالہ دے چکا ہوں۔ اس نے لکھا کہ جنگ کے دوران فوجی بھگوڑے ہوتے ہی رہے ہیں لیکن سب سے زیادہ فوجی برما فرنٹ سے بھگوڑے ہوئے تھے اور یہ انگریزوں کے لئے ٹیڑھا مسئلہ بن گیا تھا۔ ان بھگوڑوں کی زیادہ تر تعداد جاپانیوں کے پاس چلی گئی تھی..... برما فرنٹ کے قریب اور اس علاقے میں جو چھوٹی بڑی آبادیاں تھیں اور جنگ سے محفوظ تھیں' ان میں انٹیلی جنس کے آدمی اور مخبر پھیلا دیئے گئے تھے۔ کسی پر ذرا سا بھی شک ہو جاتا کہ بھگوڑا فوجی ہو سکتا ہے' اسے پکڑ لیا جاتا تھا۔ میں تو تھا ہی غیر برمی اس لئے مجھ پر شک کیا جا سکتا تھا۔

بگڑی ہوئی ذہنی کیفیت میں میرے دل پر یہ خوف بیٹھنے لگا کہ قصبے میں جن دو آدمیوں نے مجھے دیکھا تھا' وہ یہاں آ جائیں گے اور مجھے پکڑ لیں گے۔ امن کے زمانے میں چھاؤنی سے بھگوڑا ہونے کی سزا زیادہ نہیں ہوتی لیکن محاذ سے بھاگنا اور رائفل لو

ایمونیشن ساتھ ہی لے جانا' بڑا ہی سنگین جرم ہوتا ہے جس کی سزا دس سال سے چودہ سال تک ہو سکتی ہے۔ اس وقت بھی یہ سزا اتنی ہی تھی۔

ذہن پر چونکہ یاسیت مسلط ہو گئی تھی اس لئے جو بھی تصوّر آتا تھا وہ یاس انگیز ہوتا تھا۔ مجھے ذہن کی آنکھوں سے یوں نظر آنے لگا جیسے میں پکڑا گیا ہوں اور کورٹ مارشل سے مجھے دس سال سزائے قید مل گئی ہے۔ قید کے تصوّر نے مجھے ریت کی ڈھیری بنا دیا۔ مجھے اپنے والدین اور بہن بھائی یاد آئے اور خیال آیا کہ انہیں کس قدر صدمہ ہو گا۔

گھر والوں کا خیال آیا تو گھر یاد آنے لگا۔ کبھی تو میں اپنے آپ کو کوسنے لگتا کہ میں نے بھگوڑا ہونے کا ارادہ کیا ہی کیوں تھا۔ میں نے اتنا بھی نہ سوچا کہ آئی این اے میں جانا ہی ہے تو وہاں تک پہنچنے کا کوئی راستہ' کوئی وسیلہ پہلے تلاش کر لیتا۔ میں تو بلا سوچے سمجھے محض جذبات کی مصنوعی روشنی میں چل پڑا اور اس روشنی نے کسی نہ کسی مرحلے میں آ کر بجھ جانا تھا۔ وہ اُس رات بجھ گئی۔ مجھے گھر کا ایک ایک فرد یاد آیا۔ واجدہ اور اس کا خاوند بھی یاد آیا۔ میرے تو آنسو نکل آئے۔ پھر سوچ آگئی کہ فوج کی طرف سے میرے گھر والوں کو یہ اطلاع کبھی کی مل چکی ہو گی کہ تمہارا بیٹا محاذ پر لاپتہ ہو گیا ہے۔ گھر والے میرا ماتم کر رہے ہوں گے۔

میں نے سونے کی کوشش کی لیکن صاف پتہ چل رہا تھا کہ میں آج رات سو نہیں سکوں گا..... ایک اور خیال آگیا۔ اس نے تو اور زیادہ ڈرا دیا۔ وہ جاپانیوں کا اسلحہ اور ایمونیشن تھا جو میرے جھونپڑے میں پڑا ہوا تھا۔ پہلے جس طرح جاپان کی ایک پارٹی یہاں آئی تھی اور میں نے ان سب کو مار ڈالا تھا' اسی طرح ایک اور پارٹی آسکتی تھی۔ جنگ میں ایسے خطرے کا امکان موجود تھا۔ مجھے خیال آیا کہ جاپانیوں کی ایک اور پارٹی یہاں آگئی تو وہ اپنے ملک کا یہ اسلحہ دیکھ کر پوچھے گی کہ یہ کہاں سے آیا۔ میں نے سوچا کہ جاپانیوں کو ذرا سا بھی شک ہُوا کہ ہم نے ان کی اس پارٹی کو مار ڈالا تھا تو وہ میرے سمیت بستی کے کسی بچے کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

جاپانیوں کا خیال آیا تو مجھے انگریز کیپٹن یاد آیا جو پیٹرول ڈیوٹی پر ایک سیکشن کے ساتھ ادھر آنکلا تھا۔ وہ کوئی اچھا آدمی تھا جس نے میری ہدایت کو سچ مانا اور بڑی شرافت سے چلا گیا تھا۔ انڈین آرمی کی کوئی سیکشن یا پلاٹون بھی آسکتی تھی۔ میرے پکڑے جانے کا خطرہ موجود تھا۔ میں نے سوچا کہ صبح ہوتے ہی جاپانیوں کا اسلحہ اور ایمونیشن کہیں چھپا

دوں گا اور اپنے پاس صرف رائفل رکھوں گا اور وہ ریوالور اپنے پاس رکھوں گا جو میں نے انگریز پائلٹ سے لیا تھا۔

رات کی خاموشی میں مجھے بادلوں کی ہلکی گرج سنائی دینے لگی جو ابھی بہت دُور تھی۔ وہ برسات کا موسم تھا اور گرجتی کڑکتی گھٹائیں کسی بھی وقت آجایا کرتی تھیں۔ یہ ہلکی ہلکی گرج جو مجھے سنائی دینے لگی تھی' بڑی تیزی سے بلند ہوتی گئی جس کا مطلب یہ تھا کہ پانی سے لدی ہوئی گھٹائیں بڑی تیز رفتاری سے آرہی ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد آسمان میں ایسا دھماکہ ہُوا جیسے میرے جھونپڑے کے قریب ہی توپ فائر ہوئی ہو۔ پھر آسمان میں توپیں فائر ہونے لگیں۔ بارش بہت ہی تیز بلکہ طوفانی تھی۔ ایسی بارش سے مجھے لطف سا محسوس ہُوا کرتا تھا لیکن اُس رات میرا دل دہل گیا۔ ایک بار بجلی اتنے زور سے کڑکی کہ میں لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھا اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک تو خوف میں اضافہ ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی میں نے نمایاں طور پر محسوس کیا کہ میں بزدل ہو گیا ہوں۔

بجلی کی اس کڑک کو میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی وارننگ سمجھنے لگا کہ میرے گناہوں کی سزا کا وقت آگیا ہے۔ میں نے پہلے سنایا ہے کہ کچھ دن پہلے رات ایسی بارش برسی تھی اور ایک بھیڑیا میرے جھونپڑے میں آگیا تھا۔ میں ڈرا نہیں تھا اور اس سے بچنے کا اور اسے جھونپڑے سے نکالنے کا طریقہ سوچ لیا اور میں باہر نکل گیا تھا۔ پھر بھیڑیا بھی بھاگ گیا تھا اور میں جب جھونپڑے میں واپس آیا تھا تو اکیلے ہی ہنسنا شروع کر دیا تھا لیکن اب ویسی ہی بارش برس رہی تھی تو میں نے اپنے اندر اس قسم کی بزدلی محسوس کی جیسے اس جنگل کے سارے بھیڑیئے میرے جھونپڑے میں آجائیں گے اور مجھے چیر پھاڑ کر کھا جائیں گے۔

میں نے اپنے سر کو زور زور سے دائیں بائیں جھٹکے دیئے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ جھونپڑے میں دیا جل رہا تھا۔ میں ہاتھ پیٹھ پیچھے کر کے آہستہ آہستہ جھونپڑے میں ٹہلنے لگا۔ میں اپنا حوصلہ زندہ اور بیدار کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ اچانک یاد آگیا کہ مجھے ان لوگوں نے اپنا سردار بنا لیا ہے۔ میرے متعلق ان لوگوں کا ایک عقیدہ بن گیا تھا کہ میرے ہاتھ میں کوئی غیبی طاقت ہے۔ میں نے ایک اژدھا کے منہ سے ان کی ایک لڑکی کو زندہ نکال لیا اور اژدھا کو مار ڈالا تھا۔ میں نے ایک شیر کو بھی مار ڈالا تھا۔ نو جاپانیوں کو قتل کر دیا تھا۔ ایک انگریز پائلٹ کو ان لوگوں کے ہاتھوں سے

مروادیا تھا اور انگریز کیپٹن کے ساتھ گشتی پارٹی آئی تھی تو میں نے ایسی باتیں کی تھیں اور ایسا رویہ اختیار کیا تھا کہ یہ گورے بڑے اطمینان سے اور کوئی چھیڑ چھاڑ کئے بغیر چلے گئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ اس بستی کی جوان لڑکیاں میرے اشارے کی منتظر رہتی ہیں۔ یہ سوچ کر میرا دھیان گناہ کی طرف چلا گیا۔ میں نے ارادہ کیا کہ جھونپڑے کے باہر کھڑے وانگ کو یا کسی اور کو آواز دے کر بلا لوں اور اسے کہوں کہ شراب بھی لے آؤ اور ایک لڑکی کو بھی ساتھ لے آؤ اور میرے پاس چھوڑ جاؤ۔

مجھے گناہ کا ہی خیال آنا چاہئے تھا۔ میں کوئی شریف آدمی نہیں تھا اور میں انگریزوں کی انڈین آرمی کا فوجی تھا اور پھر ان لوگوں نے مجھے اپنا سردار بنایا تھا۔ مجھے اس سے لطف اٹھانا چاہئے تھا۔ سمیع اللہ خود ہی ان کا سردار اور پیر و مرشد بنا رہا تھا اور ان لوگوں کی عزتوں کے ساتھ کھیلتا رہا تھا۔ میرے دماغ میں یہی الٹی سوچ آئی کہ میں بھی ایک رات کے لئے سمیع اللہ بن جاؤں تو کوئی ہرج نہیں۔ میں اُس وقت کی اس اذیت ناک ذہنی کیفیت سے نجات حاصل کرنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔

جھونپڑے کا دروازہ بند تھا۔ میں دروازے تک گیا اور دروازہ اس ارادے سے کھولنے لگا کہ کسی کو برآمدے میں کھڑے ہو کر آواز دوں گا۔ دروازہ کھولا تو بجلی اس قدر زور سے کڑکی کہ میرے کان بند ہو گئے اور دماغ جیسے سن ہو گیا ہو۔ چمک ایسی کی باہر کا ذرہ ذرہ نظر آ گیا اور اُس کے بعد گھپ اندھیرا..... گھٹائیں اس طرح گرجیں جیسے غصے میں آ گئی ہوں۔ میں فوراً پیچھے ہٹا اور دروازہ بند کر لیا۔ میں اتنا بزدل تو کبھی بھی نہیں ہُوا تھا۔ میں نے اوپر دیکھا اور ہاتھ جوڑ دیئے۔ میرے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے ـــ "یااللہ! میرے گناہ معاف کر دے"۔

○

ان الفاظ نے مجھے کچھ سکون دیا۔ اب جو خیال آیا اس سے میں پریشان نہ ہُوا بلکہ یوں کچھ اطمینان سا لگا جیسے نجات کا ایک راستہ نظر آ گیا ہو۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اللہ کو یاد کئے ایک مدت گزر گئی تھی۔ میں نے کچھ بھی نہ سوچا اور کپڑے اتار کر بالکل برہنہ ہو گیا۔ دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ بارش موسلادھار تھی۔ میں بارش میں جا کھڑا ہُوا اور بارش نے میرے جسم کو دھو ڈالا۔ بارش سے ہی وضو کیا اور میں جھونپڑی میں چلا آیا۔ جسم خشک کیا، کپڑے پہنے اور قبلہ رُو کھڑا ہو گیا۔

عشاء کی نماز پڑھی اور اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں نے کتنے نفل پڑھ ڈالے۔ کبھی نماز پڑھی تھی لیکن ایسے جیسے کوئی آدمی بے دلی سے ایک فرض ادا کر رہا ہو لیکن برہا کی اُس رات میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور میں اللہ کے حضور رکوع و سجود کر رہا تھا۔ یقین جانیں کہ مجھے جو روحانی مسرت ملی اس کا ذائقہ اس سے پہلے کبھی نہیں چکھا تھا۔

میں جب تھک گیا تو دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ میں نے اللہ سے کہا کہ یااللہ میں کہاں تھا اور کہاں آ گیا ہوں' گناہگار ہوں' سزا مل رہی ہے' اب بخش دے میرے اللہ' راستہ دکھا دے اور کچھ نہیں تو مجھے گناہوں سے بچا لے۔

آج مجھے اُس وقت کی کیفیت یاد ہے لیکن وہ الفاظ اچھی طرح یاد نہیں رہے جو میں نے اللہ کے حضور پیش کئے تھے۔ یہ یاد ہے کہ میں نے اللہ سے کہا تھا کہ کم از کم یہاں ان لوگوں میں مَیں نے کوئی گناہ نہیں کیا بلکہ گناہگاروں کو ختم کیا ہے۔ پھر مجھے یہ یاد ہے کہ میں اتنا رویا تھا کہ میری ہچکی بندھ گئی تھی۔

یاد نہیں آدھی رات گزر گئی تھی یا اس سے زیادہ وقت ہو گیا تھا' میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے ایک بڑا ہی واضح اور صاف خواب دیکھا۔ شام کا دھندلکا ہے معلوم نہیں کون سی جگہ ہے۔ کچی دیوار ہے اس کا چاروں طرف احاطہ ہے درمیان میں صحن ہے اور کچے مکان کے کھنڈر ہیں۔ میں اس صحن میں حیران و پریشان کھڑا ہوں اور باہر نکلنے کا راستہ دیکھ رہا ہوں لیکن وہاں کوئی دروازہ نہیں۔ کھنڈر کی طرف منہ کرتا ہوں تو یہ دیکھ کر میرا خون خشک ہو جاتا ہے کہ ایک بہت بڑا سانپ شاید کھنڈر سے نکل کر آیا ہے اور بالکل میرے قریب آن پہنچا ہے۔ اس کا رنگ مجھے آج تک یاد ہے..... کالا' سارے جسم پر چھوٹے چھوٹے سفید اور منحنی سے دائرے..... وہ سر اٹھا کر پھن پھیلا لیتا ہے اور مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میں تجھے ڈسنے کے لئے آیا ہوں اور تو مجھ سے بھاگ نہیں سکے گا۔

میں خوفزدہ ہو کر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا ہوں۔ وہ تیزی سے میرے بالکل قریب آ جاتا ہے اور اُس کا منہ اور اونچا ہو جاتا ہے۔ میں اس خیال سے بائیں طرف کو چل پڑا کہ کھنڈر میں سے بھاگ نکلنے کا راستہ مل جائے گا لیکن سانپ میرے راستے میں آ جاتا ہے۔ پیچھے مڑ کر بھاگنے لگتا ہوں تو سانپ سامنے کھڑا نظر آتا ہے۔ آواز سنائی دیتی ہے کہ

تُو مجھ سے بھاگ نہیں سکے گا' میں نے تجھے ڈسنا ہی ہے۔

میں اتنا خوفزدہ ہو جاتا ہوں کہ میرا جسم کانپنے لگتا ہے۔ میں آسمان کی طرف دیکھ کر دل ہی دل میں اللہ کو پکارتا ہوں۔ سانپ اور قریب آجاتا ہے اور اب مجھے اس کی پھنکار صاف سنائی دے رہی ہے۔ معلوم نہیں ایک جانور کہاں سے نکل آتا ہے۔ میں نے اسے کسی طرف سے آتے نہیں دیکھا۔ اُسے تو جیسے زمین نے اگلا ہو۔ جانور بھی عجیب قسم کا ہے۔ جسم بالکل بِلّی جیسا لیکن منہ نیولے جیسا لمبوترا اور آگے سے نوکیلا ہے۔ وہ پہلے آہستہ آہستہ' دبے پاؤں سانپ کے پیچھے سے اس کی طرف آتا ہے پھر جھپٹ کر اس کی گردن پکڑ لیتا ہے۔ چند لمحوں میں وہ سانپ کو جھنجھوڑ کر اس کا سر اس کے جسم سے الگ کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی سارا ماحول بالکل ہی تاریک ہو جاتا ہے۔

مجھے اس جانور کی آنکھیں نظر آتی ہیں اور ان آنکھوں میں روشنی ہے جیسے چھوٹی چھوٹی دو ٹارچیں روشن ہوں۔ جانور دیوار کی طرف منہ کرتا ہے تو اس کی آنکھوں کی روشنی میں دیوار میں مجھے ایک جگہ شگاف نظر آتا ہے۔ میں بڑی تیزی سے اس شگاف میں سے باہر نکل جاتا ہوں۔ اندھیرا اجالے میں بدل جاتا ہے اور میں اپنے آپ کو ایک بلندی پر کھڑا دیکھ رہا ہوں۔ افق تک ہریالی ہے' درخت اور ٹیکریاں ہیں اور افق پر کئی رنگوں کی شفق ہے اور رنگین بادلوں کے لمبے لمبے ٹکڑے دور تک چلے گئے ہیں اور کچھ بادل ٹیڑھی میڑھی لکیروں جیسے ہیں۔ پھر اندھیرا چھا جاتا ہے اور میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

میں بستر میں سے اٹھ بیٹھا۔ دیا جل رہا تھا۔ میری سانسیں تیز ہو گئی تھیں۔ یہ خواب ایسا حقیقی تھا کہ میں جھونپڑے کی دیواروں کو غور سے دیکھنے لگا کہ یہ مٹی کی کچی دیواریں ہیں اور یہ بدل کیسے گئی ہیں۔ کچھ دیر بعد میرا ذہن بیدار ہوا تو مجھے خیال آیا کہ میں نے خواب دیکھا ہے۔ میں خواب کو یاد کرنے لگا اور میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ خدائی اشارہ ملا تھا۔ مجھے راستہ مل جائے گا اور میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔

ایک بات اور ہے جس پر شاید کچھ حضرات یقین نہ کریں۔ ہو سکتا ہے یہ میرا وہمہ ہی ہو لیکن بتا دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ میری اُس وقت کی ذہنی کیفیت کو سامنے رکھ کر میری یہ بات سنیں۔ میں نے بتایا ہے کہ افق پر بادلوں میں کچھ ایسے بادل تھے جو ذرا چوڑی اور منحنی سی لمبی لکیروں کی طرح تھے۔ آپ نے ایسے بادل دیکھے ہوں گے جو صبح طلوعِ آفتاب کے وقت یا شام غروبِ آفتاب کے وقت افق پر کبھی کبھی نظر آیا کرتے

ہیں۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی آیت آسمان پر لکھی ہوئی تھی۔ آج بھی میں یہی کہتا ہوں کہ چھوٹی سی کوئی آیت تھی یا بادل ان الفاظ کی شکل میں ڈھل گئے تھے۔ زیادہ تر خیال یہ ہے کہ یہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ لکھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب آپ جانتے ہیں —— "تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے ہی مدد مانگتے ہیں" —— میں نے دل میں پہلا عہد یہ کیا کہ اب گناہ کا ذرا سا خیال بھی ذہن میں نہیں آنے دوں گا۔

اب جو میری آنکھ لگی تو اُس وقت کھلی جب اگلے دن کا سورج خاصا اوپر آچکا تھا۔

○

میں باہر نکلا تو وہ آدمی جو میرے کام کاج کیا کرتا اور کھانا پکایا کرتا تھا' باہر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور پوچھا کہ ناشتہ لے آؤں یا میں پہلے غسل کروں گا۔

نہا دھو کر میں نے ناشتہ کیا اور اس آدمی سے کہا کہ وہ وانگ کو بلا لائے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرا ذہن خاصا روشن ہو گیا تھا اور دماغ کچھ بہتر طریقے سے سوچنے کے قابل ہو گیا تھا۔ میں نے وانگ کو اس لئے بلایا تھا کہ اسے کہوں گا کہ کچھ آدمی اپنے ساتھ لے آئے تاکہ میں جاپانیوں کی رائفلیں' مشین گن اور ایمونیشن وغیرہ کسی موزوں جگہ چھپا دوں۔ وانگ کے آنے تک میں یہ سوچتا رہا کہ یہ اسلحہ اور ایمونیشن کہاں چھپایا جا سکتا ہے۔ سیدھی بات تھی کہ یہ سب چیزیں دریا میں پھینک دیتے لیکن فوجی ہونے کی وجہ سے میں اتنا اسلحہ اور ایمونیشن ضائع کرنے سے گھبراتا تھا۔ یہ کسی وقت کام آ سکتا تھا۔

وانگ آیا تو میں نے اسے بتایا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ وہ اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھ رہا تھا کہ اسلحہ چھپا دیا جائے۔ میں نے اسے بتایا کہ جاپانی پھر بھی آ سکتے ہیں اور وہ ہم سب کو مار ڈالیں گے اور یہاں کی عورتوں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ کوئی ایسا انگریز افسر بھی آ نکلے گا جو یہ اسلحہ دیکھ کر ہم پر یہ شک کرے گا کہ ہم جاپانیوں کے حامی ہیں اور جاپانی ہمیں یہ اسلحہ دے گئے ہیں۔ اچھا ہوا کہ وانگ میری بات سمجھ گیا۔

وہ دس بارہ آدمی اپنے ساتھ لے آیا۔ ان کے پاس دو تین کدالیں بھی تھیں۔ میں نے اسلحہ اور ایمونیشن اٹھوایا اور وہاں ان سب کو لے گیا جہاں چبوترہ بنا ہوا تھا۔ اس چبوترے کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ اسی چبوترے پر میں نے سمیع اللہ کو اس کے ساتھیوں کو گولیاں ماری تھیں۔ یہ چبوترہ چار فٹ سے کچھ زیادہ اونچا تھا۔

میں نے اس کے اردگرد گھوم کر ایک جگہ دیکھ لی اور پھر آدمیوں کو بتایا کہ یہاں سے کھدائی کریں۔ کھدائی چبوترے کے پہلو سے اندر کی طرف کی گئی تھی جیسا کہ گُف کھودی جاتی ہے۔ میں نے اس کی کھدائی یوں کرائی کہ زیادہ تر کھدائی زمین میں کی گئی جس طرح کہ قبر کھودی جاتی ہے۔ اس کی لمبائی ایک رائفل کی لمبائی سے فٹ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ رکھوائی۔

جب یہ کھدائی مکمل ہو گئی تو میں نے اس کے فرش پر کنکریاں اور پتھر ڈلوا دیئے تاکہ رائفلوں کو زمین کی نمی کا زنگ نہ چڑھے۔ نو رائفلیں اور ایک مشین گن تھی' یہ اس گڑھے میں رکھوا دیں ایمونیشن بھی رکھوا دیا اور کچھ اور چیزیں تھیں جو اسی کے اندر پھینکیں اور چبوترے کی سائیڈ میں یعنی اس گف کا جو دہانہ تھا وہاں گارے سے پتھر چنوا دیئے اور باہر اور بھی پتھر ڈال کر مٹی کا ڈھیر لگا دیا تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے اور بارش کا پانی بھی اس کے اندر نہ جائے۔

میں نے اپنی رائفل اور کچھ ایمونیشن اپنے پاس رکھا اور اس کے علاوہ انگریز پائلٹ کا ریوالور بھی میرے پاس تھا۔

تین چار دن گزر گئے۔ میں نے پہلے کسی باب میں کہا ہے کہ میں یوں سمجھنے لگا تھا جیسے ان ہی لوگوں میں پیدا ہُوا تھا اور میں اسی جنگل کی مخلوق ہوں لیکن اس رات جو میری ذہنی کیفیت ہو گئی تھی' اس نے میرے ذہن میں ایک تغیر بلکہ ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ میرے اندر یہ سوچیں بیدار ہو گئی تھیں کہ میں اپنی عمر ضائع کر رہا ہوں اور اپنے آپ کو بھی ضائع کر رہا ہوں۔ کبھی خیال آتا کہ مجھے فوج سے یوں بھگوڑا نہیں ہونا چاہئے تھا اور پھر یہ سوچ آتی کہ میں نے جس مقصد کے لئے جس منزل پر پہنچنے کے لئے اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا' اس مقصد اور منزل تک مجھے جلدی پہنچنا چاہئے۔ میں نے وانگ سے پھر یہ کہنا شروع کر دیا کہ مجھے دریا کے پار پہنچا دے اور اب مجھے جانے کی اجازت دے لیکن وہ نہیں مان رہا تھا اور اس کے ساتھی بھی نہیں مانتے تھے۔

چار پانچ دن اسی کشمکش میں گزر گئے۔ اس دوران وانگ ایک بار پھر قصبے میں گیا۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن میں اب وہاں جانے سے کچھ گھبراتا تھا۔

ایک روز وانگ کا وہ دوست آ گیا جو قصبے میں رہتا تھا اور جس کے ہاں ہم جا کر رکے تھے اور اس نے شجاع الدین کی کہانی سنائی تھی۔ وہ وانگ کے گھر ٹھہرا تھا۔ دوپہر کھانے

کے بعد وہ اور وانگ میرے پاس آ گئے اور خوب گپ شپ ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ دونوں پیئے ہوئے تھے لیکن اتنی نہیں کہ ان کی زبانیں لڑکھڑا رہی ہوں۔

"آپ فوج کی کس پلٹن میں تھے؟" ___ وانگ کے دوست نے مجھ سے پوچھا۔

"آپ کو کس نے بتایا ہے کہ میں فوج میں تھا؟" ___ میں نے ہنستے ہوئے پوچھا اور کہا ___ "کیا وانگ نے آپ کو میرے متعلق یہ نہیں بتایا تھا کہ میں رنگون میں دکان کرتا تھا اور ایک مسجد میں امامت بھی کیا کرتا تھا!"

"ہاں' یاد آ گیا ہے" ___ اس نے کہا ___ "آج وانگ نے مجھے کچھ زیادہ ہی پلا دی ہے"۔

"آپ رہنے والے کہاں کے ہیں؟" ___ اس نے پوچھا۔

"میں آگرہ کا رہنے والا ہوں" ___ میں نے جھوٹ بولا اور کہا ___ "آپ نے شاید آگرہ کا نام سنا ہو گا"۔

پھر میں نے دیکھا کہ وہ کوئی اور بات کر کے پھر میرے متعلق کچھ پوچھ لیتا تھا۔ اس کے پوچھنے کا انداز ایسا تھا کہ مجھے کچھ شک ہونے لگا۔ شک یہ تھا کہ وانگ ہی نے بتایا تھا کہ یہ شخص جرائم پیشہ اور معزز قسم کے مجرموں میں سے ہے۔ وانگ نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ شخص فریب کاری اور دھوکہ دہی کا ماہر ہے۔ وہ مانڈلے کا رہنے والا تھا۔ مجھے شک ہونے لگا تھا کہ یہ شخص اگر اونچے درجے کا جرائم پیشہ ہے تو یہ یقیناً انگریزوں کی انٹیلی جنس کا انفارمر یعنی مخبر ہو گا اور یہ میرے متعلق ہی معلومات حاصل کرنے آیا ہو گا۔ یہ میرا وہم بھی ہو سکتا تھا لیکن اس کا انداز ایسا تھا کہ میں اس شک کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔

کچھ دیر اور میرے پاس بیٹھ کر وہ رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے وانگ کو اپنے جھونپڑے میں بٹھا لیا۔ وانگ کے متعلق میں بتا دوں کہ اسے میں نے کبھی بھی نہیں کہا تھا کہ میں فوج سے بھگوڑا ہو کر آیا ہوں لیکن وہ کوئی کم عقل آدمی نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں فوجی ہوں کیونکہ جب اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی تو میں فوج کی وردی میں تھا' میرے پاس فوجی رائفل بھی تھی اور ایمونیشن بھی۔ اس نے کبھی پوچھا بھی نہیں تھا لیکن وہ سمجھ گیا تھا کہ میں فوج سے نکل کر آیا ہوں۔ میرے دل پر یہ بوجھ آ پڑا تھا کہ وانگ کے اس دوست نے آج کیوں کرید کرید کر مجھ سے یہ باتیں پوچھی

ہیں۔

"تم اصل حرامزادے ہو!" — میں نے غصے میں وانگ سے پوچھا — "کیا تم نے اسے بتایا ہے کہ میں فوجی ہوں؟"

"نہیں صاحب!" — وانگ نے جواب دیا — "میں نے اسے آپ کی ساری باتیں سنائی تھیں اور جس طرح آپ نے سمیع اللہ کو اور اس کے ساتھیوں کو مارا تھا اور اژدھا کو بھی اور شیر کو بھی مارا تھا' یہ ساری باتیں سنائی تھیں اور یہ بھی سنایا تھا کہ آپ نے جاپانیوں کو اکیلے مار ڈالا تھا۔ یہ سب سن کر میرے دوست نے کہا کہ یہ شخص فوجی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ فوجی نہیں ہے لیکن یہ نہیں مانتا تھا۔ اسی لئے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ کون سی پلٹن میں تھے"۔

"تم نے انگریز پائلٹ کے متعلق بھی سنایا ہو گا" — میں نے کہا۔

"ہاں صاحب!" — وانگ نے کہا — "میں نے یہ بھی سنایا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ ہمارا یہ ہندوستانی ساتھی رنگون میں دکاندار تھا اور مسجد میں امامت بھی کراتا تھا"۔

میں نے وانگ کو بہت گالیاں دیں اور وہ انجان اور معصوم سا بنا ہُوا سنتا رہا۔

"آپ اتنا ناراض کیوں ہوتے ہیں؟" — وانگ نے کہا — "آپ کو کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ ہم کسی پکڑنے والے کو آپ تک پہنچنے ہی نہیں دیں گے"۔

وانگ کچھ دیر بولتا رہا اور مجھے یقین دلاتا رہا کہ میرے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں اور کوئی ایسا خطرہ نہیں لیکن میں کوئی نہ کوئی خطرہ محسوس کرنے لگا تھا۔ میں صاف محسوس کر رہا تھا کہ میرے دل پر ایک بوجھ سا آپڑا ہے۔ میری ذہنی حالت رات والی تو نہیں تھی لیکن اس کا اثر باقی تھا اور خواب جو میں نے دیکھا تھا' اسے میں بے معنی نہیں سمجھتا تھا۔ میں واضح طور پر محسوس کر رہا تھا کہ یہ خواب کوئی خدائی اشارہ ہے۔

○

اگلی صبح سب سے پہلا جو شخص میرے پاس آیا اس کا نام انگ سون تھا۔ وہ وانگ کا ساتھی تھا اور اسی کی طرح میرا دوست بلکہ مرید بن گیا تھا۔ وانگ باتیں ذرا زیادہ کیا کرتا تھا لیکن انگ سون خاموش طبع تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ کوئی خاص بات ہے۔ پہلے تو میرے منہ کی طرف دیکھتا رہا جیسے سوچ رہا تھا کہ بات کرے یا نہ کرے۔ میں نے آخر اُس سے پوچھا کہ وہ کس سوچ میں پڑا ہُوا ہے۔

"سوچ رہا ہوں صاحب!" — اُس نے کہا — "بات کروں یا نہ کروں۔ وانگ آپ کا دوست ہے اور آپ اس پر بہت اعتبار کرتے ہیں۔ آپ ناراض نہ ہو جائیں"۔

میں تو چونک پڑا اور اسے کہا کہ وہ فوراً بات کرے اور میں بالکل ناراض نہیں ہوں گا اور اس کی کچھ اور حوصلہ افزائی کی۔

"وانگ پر اعتبار کرنا چھوڑ دیں" — انگ سون نے کہا — "یہ شخص بہت ہی خودغرض اور لالچی ہے۔ آپ کا دوست صرف اس لئے ہے کہ آپ نے ہمیں بہت سے خطروں سے بچایا ہے اور آئندہ بھی بچا کر رکھیں گے لیکن اب اس کی نیت خراب ہو گئی ہے"۔

میں نے اسے کہا کہ وہ فوراً اصل بات بتائے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کوئی بہت ہی خاص بات کرنے آیا ہے۔ یہ شک مجھے پہلے ہی تھا کہ کچھ نہ کچھ خفیہ طور پر ہوا ہے یا ہونے والا ہے۔ ہم جب قصبے وون میں گئے تھے تو انگ سون بھی ہمارے ساتھ تھا۔

"ہم وون گئے تھے تو آپ کو دو آدمی ملے" — انگ سون نے کہا — "آپ کو بتایا گیا تھا کہ وہ انگریزوں کے جاسوس ہیں۔ کل وانگ کا دوست یہاں وانگ کے پاس آیا تھا اور دونوں آپ کے پاس بھی آئے تھے۔ میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ اس شخص کو ان دونوں آدمیوں نے بھیجا تھا..... وانگ اور اس کا یہ دوست آپ کو پکڑوا رہے ہیں۔ وانگ کا دوست یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ آپ فوجی ہیں اور فوج سے بھاگ کر جاپانیوں کے پاس جا رہے ہیں"۔

"تم مجھ پر بہت بڑا احسان کر رہے ہو انگ سون!" — میں نے کہا — "تم میرے سچّے اور وفادار دوست ہو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ کیسے پتہ چلا ہے کہ وانگ اور اس کا دوست مجھے پکڑوانا چاہتے ہیں۔ کیا یہ باتیں تمہارے سامنے ہوئی ہیں؟"

اس نے جو بات سنائی' وہ میں اپنے الفاظ میں تحریر کر رہا ہوں..... میں پیچھے ایک نوجوان برمی لڑکی تانی کا ذکر کر آیا ہوں۔ تانی وہ لڑکی تھی جسے میں نے اژدھا کے منہ میں سے نکالا تھا اور اژدھا کو مار ڈالا تھا۔ یہ لڑکی نئی زندگی پا کر میری ایسی مرید ہوئی کہ میرے آگے سجدے کرتی تھی اور جب وہ میرے جھونپڑے میں آتی تھی تو اس کا انداز ایسا ہوتا تھا جیسے وہ مجھے اپنا آپ اور اپنا حسن و جوانی پیش کر رہی ہو۔ وہ معصوم سی لڑکی خاصی خوبصورت تھی۔ اللہ نے مجھے اس گناہ سے بچائے رکھا اور جب پتہ چلا کہ یہ لڑکی ایک

لڑکے کو چاہتی ہے تو میں نے ان کی شادی کرا دی تھی۔ میں اگر سمیع اللہ جیسا ہوتا اور اپنے دین و ایمان سے دستبردار ہو جاتا تو اس لڑکی کو بڑی آسانی سے اپنی بیوی بنا سکتا تھا۔ اسے تو میں خفیہ طور پر داشتہ بھی بنا سکتا تھا لیکن میں آج بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے اسے ایسی نظر سے کبھی بھی نہ دیکھا اور اس کے ساتھ جو نیکی کی تھی وہ اللہ کی خوشنودی کے لئے کی تھی۔

اب مجھے اس نیکی کا اجر مل رہا تھا۔ انگ سون نے مجھے بتایا کہ وانگ کی ایک بہن ہے جو تانی کی بڑی گہری اور رازدار سہیلی ہے۔ وانگ کی یہ بہن خاصی جوان ہو چکی تھی لیکن ابھی تک وانگ نے اس کی شادی کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس لڑکی نے تانی کو بتایا کہ وانگ کا دوست آیا تھا اور دونوں جھونپڑے میں سر جوڑے بیٹھے رہے تھے۔ وانگ کی بیوی اور یہ بہن اپنے کام کاج میں لگی رہیں۔

یہ جھونپڑے کوئی بڑے مکان تو نہیں تھے جن کے کمرے کشادہ اور ذرا دُور دُور ہوتے' وہ تو چھوٹے چھوٹے جھونپڑے تھے جن کے ہر کمرے میں بڑی مشکل سے دو چارپائیاں بچھ سکتی تھیں۔ وانگ کی بہن ساتھ والے کمرے میں تھی تو اسے وانگ اور اس کے دوست کی باتیں سنائی دینے لگیں۔

وانگ کے دوست نے وانگ سے کہا کہ تم یہاں کیوں ذلیل و خوار ہوتے پھر رہے ہو' وہاں میرے پاس آجاؤ' میں تمہیں ایسے کام پر لگا دوں گا جس میں اچھے بھلے پیسے ملیں گے اور میں تمہیں بڑا اچھا مکان بھی دلا دوں گا۔ وانگ نے اس سے پوچھا کہ کام کیا ہے۔

"جاسوسی..... مخبری!" ـــــ دوست نے وانگ کو بتایا ـــــ "تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو وانگ! وہ کون سا جرم ہے جو میں نے نہیں کیا۔ میں اب یہاں نیک آدمی تو نہیں بن گیا۔ یہاں میں انگریزوں کے جاسوسی کے محکمے کا مخبر ہوں اور کچھ اور کام کاج کر لیتا ہوں۔ وہاں سے بہت دور آسام کے اندر جا کر کبھی کبھی ڈکیتی کی واردات کر لیتا ہوں یا اپنے آدمیوں سے واردات کرواتا ہوں۔ تم میرے پاس آجاؤ"۔

"آجاؤں گا" ـــــ وانگ نے کہا ـــــ "لیکن میں نے کبھی جاسوسی اور مخبری نہیں کی۔ تم مجھے بتا دینا کہ یہ کام کیسے کیا جاتا ہے۔ واردات جیسی بھی کہو گے کروں گا لیکن فوجیوں کے لئے کبھی مخبری نہیں کی"۔

"ایک کام کرو" ـــــ دوست نے کہا ـــــ "یہ کام تم آسانی سے کر لو گے۔ یہ میں

فوج کے جاسوسی کے محکمے کو بتاؤں گا تو تمہیں انعام بھی ملے گا اور تمہیں اچھی تنخواہ پر رکھ لیں گے اور تمہاری عزت بن جائے گی..... یہ جو داڑھی والا ہندوستانی یہاں رہتا ہے اور اُس روز تمہارے ساتھ میرے گھر میں آیا تھا' اسے پکڑوا دو"۔

"نہ بھائی!" ـــــ وانگ نے کہا ـــــ "اس شخص کے ہم پر بہت احسان ہیں۔ میں اس کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس نے ہمیں کیسے کیسے خطروں سے بچایا ہے"۔

وانگ نے اسے بتایا کہ میں نے یہاں آ کر کیا کچھ کیا تھا اور میرا کردار ان کی جوان لڑکیوں کے سلسلے میں اچھا رہا ہے اور ان کی جان اور عزت کا محافظ بنا ہُوا ہوں۔

"اگر تمہارے پاس رائفل ہوتی اور رائفل کی گولیاں ہوتیں تو یہ سارے کام تم بھی کر سکتے تھے" ـــــ دوست نے وانگ سے کہا ـــــ "یہ شخص انگریزوں کی فوج سے بھاگا ہُوا ہے۔ تم نے ہی مجھے بتایا تھا کہ یہ جاپانیوں کے پاس جا رہا ہے اور جاپانیوں نے ہندوستان کے فوجیوں کی جو فوج بنائی ہے' یہ اُس میں جائے گا۔ پھر تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس نے ایک انگریز پائلٹ کو تم لوگوں کے ہاتھوں مروایا تھا اور اس کا ریوالور اس کے پاس ہے۔ تم اسے پکڑوا دو گے تو تمہیں میں انعام بھی دلواؤں گا اور بڑی عزت کی نوکری بھی مل جائے گی..... دیکھو وانگ دو دن قصبے میں جو آبادی ہے' اس میں دو تین نہیں بلکہ بہت سے لوگ انگریزوں کے مخبر ہیں۔ وہ اس قصبے میں ہی نہیں رہتے بلکہ دُور دُور چلے جاتے ہیں اور کئی خبریں بھی لے آتے ہیں اور مشکوک لوگوں کو پکڑواتے بھی ہیں۔ آسام اور بنگال میں جاپانیوں کے بے شمار جاسوس موجود ہیں۔ فوج سے جو فوجی بھگوڑے ہوتے ہیں اور ہوتے ہی رہتے ہیں' وہ آسام کی طرف نکل جاتے ہیں اور وہاں سے وہ دریا پار کر کے جاپانیوں کے پاس چلے جاتے ہیں۔ ایسا کوئی آدمی پکڑوا دو تو انگریز افسر بہت خوش ہوتے ہیں اور جھولی بھر کر انعام دیتے ہیں..... یہ شکار تو تمہارے ہاتھ میں ہے"۔

"آ کر اسے پکڑ لو" ـــــ وانگ نے کہا ـــــ "تم یہ کام مجھ سے کیوں کروا رہے ہو؟"

"تم سمجھے نہیں وانگ!" ـــــ دوست نے کہا ـــــ "میری تمہاری دوستی بڑی پرانی ہے اور دو موقعوں پر تم نے میری مدد کی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے اس احسان کا تمہیں صِلہ دوں۔ میں ملٹری پولیس کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ شکار وانگ نے پکڑا ہے"۔

اس شخص نے وانگ کو اس کام کے لئے تیار کر لیا اور وانگ کو ایسے لالچ دیئے کہ

وانگ کی عقل پر پردہ پڑ گیا۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے، میں اسے پکڑوا دوں گا اور اس کی ساری باتیں بتاؤں گا اور کچھ جھوٹ موٹ باتیں اپنی طرف سے بھی شامل کر دوں گا۔ دوست نے اسے بتایا کہ وہ آج واپس جا کر ان آدمیوں کو بتائے گا جو فوجی جاسوس ہیں۔

وانگ کے دوست کا اشارہ ان دو آدمیوں کی طرف تھا جو مجھے قصبے میں ملے تھے اور انہوں نے مجھے کہا تھا کہ انہوں نے پہلے مجھے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ مجھے شکی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ وہ دونوں آدمی میرے ذہن میں ایسے بیٹھے کہ نکل نہیں رہے تھے اور میں انہیں ایک خطرہ سمجھنے لگا تھا۔

اس کے بعد وانگ اپنے اس دوست کے ساتھ میرے جھونپڑے میں آیا تھا۔ اس شخص نے میرے ساتھ جو باتیں کی تھیں وہ میں سنا چکا ہوں..... یہ باتیں مجھ تک اس طرح پہنچیں کہ وانگ کی بہن نے ساتھ والے کمرے میں رک کر یہ ساری باتیں سنی اور تانی کو سنائیں۔ میں چشمِ تصور سے دیکھ سکتا تھا کہ یہ سن کر تانی کس طرح تڑپ اٹھی ہو گی۔ تانی کی نظروں میں میری حیثیت زندگی اور موت دینے والے فرشتے جیسی تھی۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ وہ اپنا آپ مجھ پر قربان کرنے پر تیار رہتی تھی۔ اس نے وانگ کی بہن سے تو کچھ نہ کہا، گھر جا کر اپنے خاوند کو باتیں سنائیں۔ اس کا خاوند میرا مرید اور معتقد تھا۔ میں نے ان کی شادی کروائی تھی۔ میں ان دونوں کے درمیان رکاوٹ بن سکتا تھا لیکن نہ بنا اور ان کی شادی کرا کے مجھے خوشی ہوئی تھی۔

تانی کے خاوند نے یہ باتیں انگ سون کو سنائیں۔ میرا خیال ہے کہ انگ سون کی اس لڑکے کے ساتھ کوئی رشتہ داری بھی تھی۔ اگر رشتہ داری نہیں تھی تو یہ بات ضرور تھی کہ انگ سون دیانت دار اور بہتر قسم کا آدمی تھا۔ پھر یہ عجیب بات بھی سنیں، شام کے بعد وانگ کی بہن تانی کے گھر گئی اور اسے کہا کہ کسی طرح مجھے خبردار کر دیا جائے اور میں اپنے بچاؤ کا کچھ بندوبست کر لوں۔ تانی نے یہ بات بھی اپنے خاوند کو بتائی اور اس کا خاوند رات پھر انگ سون سے ملا اور اس کے کانوں میں یہ بات بھی ڈال دی کہ وانگ کی اپنی بہن مجھے بچانا چاہتی ہے۔ یہ سن کر مجھے حیران نہیں ہونا چاہئے تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس بستی کی تمام عورتیں اور نوجوان لڑکیاں مجھے دیوتا یا کوئی غیبی طاقت والا انسان سمجھتی تھیں۔ انہوں نے سنا تھا اور بعض نے رنگون میں دیکھا بھی تھا کہ جاپانی اچھی اچھی لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ پھر سمیع اللہ اور اس کے غنڈوں نے اس بستی کی

کسی بھی جوان لڑکی کو نہیں بخشا تھا۔ جس لڑکی کو اشارہ کر دیتے، اس کے والدین خود لڑکی کو سمیع اللہ اور اس کے غنڈوں کے پاس بھیج دیتے تھے۔ نو جاپانی آ گئے تھے تو انہوں نے بستی کی کچھ لڑکیوں کو رات اپنے پاس رکھا تھا اور میں نے جب ان جاپانیوں کو مار ڈالا تو عورتیں مجھے دیکھنے کو آتی تھیں اور سر جھکا لیتی تھیں جیسے میری پوجا کر رہی ہوں۔ یہ وجہ تھی کہ وانگ کی بہن بھی چاہتی تھی کہ میں اس کے بھائی اور بھائی کے دوست کے جال میں نہ آؤں اور زندہ و سلامت یہاں سے نکل جاؤں..... حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ چاہتا تھا کہ میں بچ کر یہاں سے نکل جاؤں۔

"آپ شاید نہیں جانتے صاحب!" ــــ انگ سون نے کہا ــــ "بستی کی عورتیں آپ کو دیوتا سمجھتی ہیں۔ دیکھ لیں کہ وانگ کی اپنی بہن چاہتی ہے کہ آپ یہاں سے نکل جائیں..... میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ وانگ اور اس کا دوست اگر فوج کی پولیس کو یا کسی کو بھی یہاں آپ کو پکڑنے کے لئے لے آئے تو اس بستی کی ساری آبادی ان کے مقابلے کے لئے نکل آئے گی اور آپ کو ان کے پاس نہیں جانے دے گی لیکن آپ خود سمجھ سکتے ہیں اس کا نتیجہ کیا ہو گا"۔

"ہاں انگ سون!" ــــ میں نے کہا ــــ "میں سمجھ سکتا ہوں۔ تم لوگ یا ہم سب ان دو چار آدمیوں کو تو مار ڈالیں گے تو پھر یوں ہو گا کہ وہاں سے فوج آ جائے گی اور میرے ساتھ تم سب کو مار ڈالے گی یا پکڑ کر لے جائے گی۔ پھر اس بستی کی جوان لڑکیوں کا خدا ہی حافظ ہو گا..... مجھے بتاؤ کہ کیا کروں!"

"یہاں سے نکل جائیں" ــــ انگ سون نے کہا ــــ "اس بستی کا کوئی شخص، کوئی عورت، کوئی بچہ نہیں چاہتا کہ آپ یہاں سے چلے جائیں لیکن ہمیں آپ کی زندگی درکار ہے۔ آپ کا چلے جانا بھی ہم برداشت نہیں کر سکتے اور ہم یہ بھی برداشت نہیں کر سکیں گے کہ آپ کو یہاں سے قیدی بنا کر فوج لے جائے یا یہاں سے آپ کی لاش اٹھائی جائے..... میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ آپ چلے جائیں گے تو اس وانگ کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ایسے طریقے سے غائب کروں گا کہ نہ اس کے قاتل کا پتہ چلے گا نہ ہی اس کی لاش ملے گی"۔

"مجھے نکل ہی جانا چاہئے" ــــ میں نے کہا ــــ "لیکن میں نے دریا کے پار جانا ہے۔ دریا کس طرح پار کروں گا؟"

"جاپانیوں کی موٹر بوٹ موجود ہے" ــــ انگ سون نے کہا ــــ "موٹر بوٹ لے کر غائب ہو جائیں"۔

"لیکن میں موٹر بوٹ چلانا تو جانتا ہی نہیں" ــــ میں نے کہا ــــ "اور دریا کی حالت دیکھو سیلاب اتر ہی نہیں رہا۔ کنارے ڈوبے ہوئے ہیں۔ دریا کے درمیان میں لہریں دیکھو کتنی اونچی اونچی اٹھ رہی ہیں"۔

"موٹر بوٹ چلانا کوئی مشکل کام نہیں" ــــ انگ سون نے کہا ــــ "میں آپ کو ابھی وہاں لے جا کر بتا دیتا ہوں کہ موٹر بوٹ سٹارٹ کس طرح کی جاتی ہے اور اسے دائیں بائیں کس طرح موڑا جاتا ہے اور روکا بھی کس طرح جا سکتا ہے۔ میں نے یہ موٹر بوٹ بڑی اچھی طرح دیکھی ہے۔ اس میں تیل کی کمی نہیں۔ بہت دور تک چلی جائے گی۔ یہ موٹر بوٹ اتنی طاقت رکھتی ہے کہ ان بڑی بڑی لہروں کو چیرتی ہوئی پار نکل جائے گی"۔

میں جانتا تھا کہ اب میرے لئے تمام راستے بند ہو گئے ہیں اور پکڑے جانے کا خطرہ سر پر آ گیا ہے۔ ایک ہی راستہ رہ گیا تھا لیکن اس راستے میں بہت ہی چوڑا اور سیلابی دریا حائل تھا۔ میں جس علاقے کا رہنے والا ہوں وہاں کوئی دریا نہیں۔ وہاں برساتی نالے ہیں اور برسات کے موسم میں جب بارش برستی ہے تو ان نالوں میں سیلاب آ جاتا ہے جو چند گھنٹوں بعد ختم ہو جاتا ہے۔ میں نے سروس میں آ کر جب باہر کی دنیا دیکھی تو کئی ایک دریا دیکھے لیکن برما کا دریائے ایراوتی بہت ہی چوڑا اور خطرناک دریا تھا لیکن مجھے اسی دریا میں سے نکل کر پار جانا تھا یا اسی میں ڈوب کر مر جانا تھا۔ مر جانے کے خیال سے یہ سوچ آئی کہ پکڑے جانے سے بہتر ہے کہ میں موت کو قبول کر لوں۔ موت کے راستے پر جانے سے یہ امید پیدا ہوتی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ میں زندگی کے اگلے کنارے پر پہنچ جاؤں۔

"ٹھیک ہے انگ سون!" ــــ میں نے کہا ــــ "مجھے موٹر بوٹ چلانا سمجھا دو"۔

"آج ہی!" ــــ انگ سون نے کہا ــــ "بلکہ ابھی..... ان لوگوں کا کچھ پتہ نہیں کس وقت آ جائیں۔ آپ نے جو کچھ کرنا ہے وہ آج کر لیں"۔

"ہم دونوں کو اکٹھے دریا تک نہیں جانا چاہئے" ــــ میں نے کچھ سوچ کر کہا ــــ "میں ٹہلتے ٹہلتے اُس جگہ پہنچ جاؤں گا جہاں موٹر بوٹ چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔ تم کسی اور

طرف سے وہاں پہنچ جانا..... اب تم چلو"۔

○

انگ سنو تو چلا گیا لیکن مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہو گئی جیسے مجھے سیلابی دریا میں پھینک گیا ہو۔ مجھ پر ڈوبنے کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اچانک مجھے گزشتہ رات کا خواب یاد آیا تو میرا حوصلہ ذرا مضبوط ہو گیا۔ خواب یاد نہ آتا تو بھی مجھے اپنا حوصلہ مضبوط کرنا تھا۔ اس کے سوا اب کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ میں نے اللہ کو یاد کیا اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔ میرا ضمیر صاف تھا۔ میں اپنے پیچھے بڑی اچھی یادیں چھوڑ کر جا رہا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اس بستی کے لوگ میرے لئے دعا ہی کریں گے' کوئی یہ نہیں کہے گا کہ چلو اچھا ہُوا' ایک بدکار انسان یہاں سے نکلا..... یہ میرا تجربہ ہے کہ ضمیر اور روح پر کسی گناہ اور بدی کا بوجھ نہ ہو تو انسان کی روحانی قوتیں خطرے کے وقت بیدار ہو جاتی ہیں اور انسان معجزے کر کے دکھا سکتا ہے۔

میں خراماں خراماں دریا کی طرف چلا گیا اور ذرا آگے جا کر راستے سے ہٹ کر جھاڑیوں وغیرہ کی اوٹ میں ہو گیا تاکہ کوئی اور 'خصوصاً' وانگ مجھے دیکھ نہ لے۔ وانگ دیکھ لیتا تو دوڑتا ہُوا میرے پاس آتا اور کہتا تمہارے ساتھ کی خاطر آ گیا ہوں۔ میں اُس جگہ تک اتر گیا جہاں موٹر بوٹ بندھی ہوئی تھی۔ مجھے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ انگ سون جلدی ہی پہنچ گیا۔

میں نے یہ موٹر بوٹ پہلے بھی دیکھی تھی اور ایک دو مرتبہ بعد میں بھی دیکھی تھی لیکن غور سے نہیں' ذرا دُور سے ہی اس پر نظر ڈالی تھی۔ اب انگ سون مجھے اس کے اندر لے گیا تب میں نے دیکھا کہ یہ بڑی ہی مضبوط موٹر بوٹ تھی اور یہ جاپانی فوج کی تھی۔ اس کی ایک سائیڈ پر جاپانی زبان کے دو تین الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ اس سے مجھے یہ تسلی ہو گئی کہ یہ عام قسم کی ماہی گیروں والی بوٹ نہیں۔

"اس میں بڑی طاقت ہے صاحب!" ــــ انگ سون نے کہا ــــ "میرا پکا یقین ہے کہ ان سیلابی موجوں کو یہ کشتی کچھ بھی نہیں سمجھے گی..... یہ دیکھیں' میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اسے کس طرح سٹارٹ کرنا ہے"۔

"انگ سون نے مجھے پہلی بار بتایا کہ وہ ماہی گیر تھا لیکن چھوٹا موٹا ماہی گیر نہیں بلکہ ایسی ہی موٹر بوٹ یا لانچ کرائے پر لے کر سمندر میں دُور تک چلا جاتا اور وسیع پیمانے پر

ماہی گیری کرتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ سوئچ آن کر کے اس طرح انجن سٹارٹ ہوتا ہے۔ اس نے انجن سٹارٹ کر کے دکھایا۔

پھر اس نے بتایا کہ موٹر بوٹ چلائی کیسے جاتی ہے۔ میں غور سے سنتا اور سمجھتا رہا۔ اس کی رفتار تیز کرنا بھی اس نے بتایا اور روکنا بھی بتایا۔ میں نے دیکھا کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

"یہ موٹر بوٹ ہے صاحب!" ___ انگ سون نے کہا ___ "یہ موٹر گاڑی نہیں۔ موٹر گاڑی ہو تو نئے آدمی کے لئے اسے سیدھا چلانا اور سڑک پر ہی رکھنا مشکل ہو جاتا ہے اور کسی درخت سے یا کسی اور چیز سے ٹکرانے کا خطرہ رہتا ہے لیکن یہ پانی پر تیرنے والی کشتی ہے۔ آپ اس پر قابو نہیں رکھ سکیں گے تو یہ بائیں کو چلی جائے گی یا دائیں کو چلی جائے گی تو جانے دیں۔ گھبرائیں نہیں اور اسے سیدھا کر لیں۔ اس نے کسی چیز کے ساتھ نہیں ٹکرانا' دریا بہت چوڑا ہے اور دریا میں نہ کوئی درخت ہے' نہ بجلی کا کوئی کھمبا ہے اور نہ ہی دوسری ٹریفک ہے۔ اگر یہ کنارے کی طرف چلی جائے تو رفتار کم کر دیں اور سنبھال لیں۔ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ گھبرانا نہیں"۔

میرے دل پر جو گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی وہ یہ دیکھ کر ہی ختم ہو گئی کہ موٹر بوٹ کو سٹارٹ کرنا اور چلانا' تیز کرنا اور آہستہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں اور سامنے وسیع دریا ہے جس میں یہ دائیں بائیں ہو بھی گئی تو ٹکرانے کا یا الٹ جانے کا خطرہ نہیں۔ خطرہ صرف یہ نظر آ رہا تھا کہ دریا کے وسط میں موجیں ذرا اونچی اٹھ رہی تھیں اور کہیں کہیں بھنور بھی تھا۔ میں نے انگ سون سے پوچھا کہ بھنور سے بچنا ضروری ہے یا نہیں؟

"بھنور سے بچ ہی جائیں تو بہتر ہے" ___ انگ سون نے کہا ___ "بعض بھنور بڑے بھی ہوتے ہیں اور بڑے تیز و تند بھی۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی بھنور موٹر بوٹ کو اپنے چکر میں لے لے۔ آپ کو چونکہ بھنور سے نکلنے کا کوئی تجربہ نہیں اس لئے آپ بھنور سے دور ہی رہیں۔ اب یہ یاد رکھ لیں کہ جب آپ یہاں سے بوٹ نکالیں گے تو کچھ دور تک کنارے کے ساتھ ساتھ رہنا تاکہ آپ بڑی موجوں سے بچے رہیں۔ دو تین میل آگے جائیں گے تو دیکھیں گے کہ ''در زیادہ چوڑا ہو گیا ہے۔ وہاں آپ موٹر بوٹ کو ذرا بائیں کر کے ترچھا اگلے کنارے کی طرف لے جائیں۔ یاد رکھیں بالکل سیدھا کنارے کی طرف نہیں جانا کیونکہ سیلاب کا زور زیادہ ہے' ایسا نہ ہو کہ پہلو کی طرف سے ایسی لہر

اٹھے کہ بوٹ کو اوپر اٹھا کر پٹخ دے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ ترچھا ہو کر اگلے کنارے تک جائیں۔ دو تین میل دور جا کر کنارے سے لگیں۔ اگر بوٹ لہروں میں سے نہیں نکلتی اور لہریں اسے اپنے ساتھ لے جا رہی ہیں تو بھی گھبرانا نہیں۔ ہو گا یہ کہ بوٹ لہروں کے ساتھ اوپر جائے گی پھر نیچے آئے گی لیکن الٹے گی نہیں۔ آپ نے اسے ذرا سا بائیں طرف موڑنا ہے' بالکل ذرا سا۔ اس طرح یہ موجوں اور بڑی لہروں سے نکلتی جائے گی اور آگے کنارے تک آپ کو کوئی لہر نہیں ملے گی۔ کنارہ قریب آ جائے اور آپ یہ ارادہ کر لیں کہ یہاں سے باہر نکلنا ہے تو رفتار بہت کم کر دیں بلکہ رفتار ختم کر دیں اور بوٹ اپنے آپ کنارے تک پہنچ جائے گی اور زور سے ٹکرائے گی نہیں۔ آپ کود کر باہر نکل جائیں"۔

انگ سون نے مجھے جو سبق دینا تھا' دے لیا۔ ہر ضروری ہدایت دے دی اور میں نے جو کچھ پوچھنا تھا پوچھ لیا' تیل کے متعلق پوچھا تو انگ سون نے دیکھ کر بتایا کہ بہت تیل ہے۔ یہ فوج کی موٹر بوٹ تھی اس لئے تیل کی ٹینکی بھری ہوئی تھی۔

انگ سون جدھر سے آیا تھا اُدھر ہی چلا گیا۔ میں موٹر بوٹ سے نکلا اور واپس چل پڑا۔ اپنے جھونپڑے تک آیا تو وانگ میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ جس طرح ہر صبح مجھے تپاک سے ملا کرتا تھا اسی طرح ملا۔ میرے تو تن بدن میں آگ لگ گئی لیکن میں نے اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس کی ساری سازش کا مجھے علم ہو گیا ہے۔ میں روزمرّہ سے زیادہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے ملا اور ہم دونوں برآمدے میں ہی بیٹھ گئے۔ وہاں بیٹھنے' لیٹنے اور باتیں کرنے کے سوا کوئی کام ہوتا ہی نہیں تھا۔ وانگ نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں چلا گیا تھا۔ میں نے بتایا کہ ذرا سیر سپاٹے کے لئے دریا تک چلا گیا تھا۔ مجھے ایک اور خیال آ گیا۔ میں وانگ کو کچھ دھوکا دینا چاہتا تھا۔

"دون کب جاؤ گے وانگ!" ___ میں نے کہا ___ "تم مجھے ایک بار وہاں لے گئے تھے تو اب جی چاہتا ہے کہ وہاں بار بار جاؤں۔ یہ قصبہ مجھے بہت ہی اچھا لگا ہے"۔

"جب کہیں گے چلے چلیں گے صاحب!" ___ وانگ نے کہا ___ "میرا دوست بھی کہہ گیا تھا کہ مولوی صاحب کو پھر کبھی اپنے ساتھ لے کر آنا"۔

"کل تو نہیں' پرسوں ترسوں چلیں گے" ___ میں نے کہا ___ "تمہارا دوست تو مجھے بہت ہی اچھا لگتا ہے"۔

مختصریات یہ کہ میں نے وانگ کے ساتھ ایسی باتیں کیں جن سے اسے ذرا سا بھی شک نہیں ہو سکتا تھا کہ میں اس کی سکیم سے واقف ہو چکا ہوں۔ وہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھا اور چلا گیا۔

میں جھونپڑے میں چلا گیا اور بستر پر بیٹھ کر یہ سوچنے لگا کہ فوراً یہاں سے نکل جاؤں یا ایک دو دن انتظار کر لوں۔ حقیقت یہ تھی کہ میں دریا سے ڈر رہا تھا اور میرا ذہن فرار اور خود فریبی کی طرف چل پڑا تھا۔ وہ اس طرح کہ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے انگ سون نے میرے آگے جھوٹ بولا ہو۔ جھوٹ بولنے کی یہی وجہ ہو سکتی تھی کہ اس کی وانگ کے ساتھ کوئی دشمنی پیدا ہو گئی ہو اور اسے وہ میری نظروں سے گرانا چاہتا ہو یا اس کا خیال یہ ہو کہ میں کسی وقت بھڑک کر وانگ کو گولی مار دوں۔ میں نے یہ سوچ تو لیا لیکن میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا جس سے تصدیق کرواتا کہ انگ سون نے سچ بولا ہے، اس کی نیت کچھ اور تھی۔

میں ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ تانی اپنے خاوند کے ساتھ جھونپڑے میں داخل ہوئی۔ میں نے چونک کر انہیں دیکھا اور مسکرا کر اشارہ کیا کہ بیٹھ جائیں۔ وہ دونوں میرے سامنے میرے قریب بیٹھ گئے۔ یہ دونوں کبھی کبھی میرے پاس آیا کرتے تھے اور میں دونوں کے چہروں پر شگفتگی اور مسکراہٹیں دیکھا کرتا تھا لیکن اُس روز دونوں کے چہروں پر اداسی تھی اور سنجیدگی ایسی جو اس عمر میں چہروں پر نہیں آیا کرتی۔ تانی نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور میری طرف سرک آئی۔ اس نے اپنا سر اتنا جھکایا کہ اس کا ماتھا میرے پاؤں پر آ لگا۔ سر اٹھا کر اس نے میرا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا، اسے چوما، پھر آنکھوں سے لگا کر چھوڑ دیا۔ اس نے پھر اپنے ہاتھ جوڑ دیئے اور اس کا یہ انداز اور حرکتیں ایسی تھیں جیسے میں کسی دیوتا کا بت تھا اور وہ میری پوجا کر رہی تھی۔ اس کی اتنی خوبصورت آنکھیں سرخ ہو گئیں اور پھر ان آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے سر پر رکھا۔

اس کے خاوند نے بھی ویسے ہی کیا کہ ہاتھ جوڑ کر میرے پاؤں پر سجدہ کیا اور پھر میرا دایاں ہاتھ پکڑ کر چوما اور آنکھوں سے لگا کر چھوڑ دیا۔ مشکل یہ تھی کہ دونوں اردو نہیں جانتے تھے۔ تانی کے خاوند نے اردو کے چند ایک الفاظ کہیں سے سیکھ لئے تھے۔ اس نے یہ الفاظ استعمال کرتے ہوئے اپنی زبان بولی اور ساتھ اشارے کئے جن سے میں یہی سمجھ

سکا کہ یہ مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ انگ سون نے مجھے کچھ بتایا ہے یا نہیں۔ انگ سون کا نام تو اس نے تین چار مرتبہ بولا۔

تانی نے اپنی زبان میں بات کرتے ہوئے ہاتھوں سے اشارے کئے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔ اس نے وانگ کا بھی نام کئی بار لیا۔ اس کا چہرہ بتاتا تھا کہ اس کے دل میں وانگ کے خلاف نفرت بھری ہوئی ہے۔

دو انسانوں کی نیتیں صاف ہوں، دلی اور روحانی وابستگی ہو تو اشارے بھی سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ ان دونوں کے ساتھ میرا کچھ روحانی رشتہ تھا۔ مجھے خاصی دماغ سوزی کرنی پڑی۔ میں نے کچھ اپنی زبان میں کہا اور زیادہ تر اشارے کئے اور تانی کے خاوند نے اردو کے یہ چند ایک الفاظ اپنی زبان میں جوڑ کر اشارے کئے تو مجھ پر واضح ہو گیا کہ انگ سون نے مجھے جو اطلاع دی ہے وہ بالکل صحیح ہے۔

کچھ دیر اور بیٹھ کر تانی اور اس کا خاوند ایک بار پھر میرے پاؤں پر سجدہ کر کے اٹھے اور چلے گئے۔ خاوند پہلے جھونپڑے سے نکلا۔ مجھے آج تک وہ لمحے یاد ہیں۔ تانی دروازے میں سے نکلتے نکلتے رک گئی اور اس نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اداسیوں کا تاثر پہلے سے کہیں زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ میں نے ہاتھ اوپر کر کے ہلایا اور وہ دروازے سے نکل گئی۔



ان کے جانے کے بعد میں پھر اس سوچ میں ڈوب گیا کہ جلدی نکل جاؤں یا ایک دو دن دیکھ لوں۔ انگ سون کہتا تھا کہ میں جلدی نکل جاؤں۔ یہ تو میں فوجی کی حیثیت سے جانتا تھا کہ انٹیلی جنس والوں کو کسی پر شک ہو جائے تو وہ زیادہ انتظار نہیں کیا کرتے تاکہ ان کا مشتبہ اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ آج رات نکل جاؤں گا۔ پھر یہ سوچ آئی کہ وہ لوگ اس سے پہلے بھی آ سکتے ہیں۔ مجھے اس کی پیش بندی کر لینی چاہئے۔

میرے پاس اپنی رائفل تھی اور ایمونیشن بھی تھا جو اب تھوڑا رہ گیا تھا۔ اس کے علاوہ انگریز پائلٹ کا ریوالور بھی میرے پاس تھا۔ وہ پرانے ٹائپ کی رائفل تھی جسے مارک تھری کہا جاتا تھا۔ اس کی میگزین میں عام طور پر پانچ راؤنڈ ڈالے جاتے تھے لیکن میگزین میں دس راؤنڈ بھی سما جاتے تھے اور گیارہواں راؤنڈ چیمبر میں رکھا جاتا تھا۔ میں نے میگزین میں دس راؤنڈ ڈال لئے اور ایک راؤنڈ چیمبر میں ڈالا اور سیفٹی کیچ بند کر دیا۔

یہ رائفل میں نے اپنے بستر میں تکئے کی طرف چھپا دی۔ بستر فرش پر بچھا ہُوا تھا۔ ریوالور میں چھ گولیاں ڈال کر نیفے میں اڑس لیا۔ میری ذہنی کیفیت ایمرجنسی یعنی ہنگامی حالات والی ہو گئی تھی۔ اب مجھے ایک لمحے کے لئے بھی بے خبر نہیں ہونا تھا۔

دوپہر کے وقت میرا خدمتی آدمی کھانا لے آیا جو میں نے ہیجانی سی کیفیت میں کھایا۔

بمشکل ایک یا ڈیڑھ گھنٹہ گزرا ہو گا کہ انگ سون میرے جھونپڑے میں داخل ہُوا۔ میں لیٹا ہُوا تھا اور غنودگی محسوس کر رہا تھا۔ انگ سون کو دیکھ کر میں اٹھ بیٹھا۔

"وہ آگئے ہیں" — انگ سون نے کہا — "وہ وانگ کے جھونپڑے میں ہیں۔ آپ نکل جائیں یا ان کا انتظار کر لیں کہ وہ آپ کے پاس آتے ہیں یا نہیں لیکن یہ سوچ لیں کہ مصیبت آپ کے سر پر آگئی ہے"۔

"تم یہاں نہ ٹھہرو" — میں نے کہا — "کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تم پر شک کریں کہ تم نے مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا"۔

انگ سون چلا گیا اور میں اپنے دفاع کے متعلق سوچنے لگا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ وہ لوگ ابھی وانگ کے گھر میں ہیں۔ میں یہاں سے کھسک جاؤں اور ان کے آنے تک موٹر بوٹ سٹارٹ کر کے دریا میں چلا جاؤں لیکن اس میں یہ خطرہ نظر آیا کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ میں ابھی دریا سے دور ہی ہوں تو وہ مجھے دیکھ لیں یا کوئی مخبر انہیں بتا دے کہ میں دریا کی طرف جا رہا ہوں۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ انٹیلی جنس کے وہ دو آدمی خالی ہاتھ نہیں ہوں گے، ان کے پاس ریوالور ہوں گے جو انہوں نے کپڑوں کے اندر چھپائے ہوں گے۔ وہ جب مجھے بھاگتا دیکھیں گے تو پیچھے سے مجھ پر فائر کھول دیں گے۔ موٹر بوٹ پر سوار ہو جانے کی صورت میں تو میں ان کے لئے بڑا آسان ٹارگیٹ بن سکتا تھا۔ وہ دریا کے کنارے پر آ کر مجھے مار سکتے تھے۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ انہیں آنے دیا جائے۔

انگ سون سے میں نے پوچھ لیا تھا کہ وہ کتنے آدمی ہیں۔ اس نے بتایا کہ دو تو وہ آدمی ہیں جو مجھے قصبے میں ملے تھے۔ وہ تو ڈیل ڈول سے ہی فوجی لگتے تھے۔ وہ تھے ہی ملٹری انٹیلی جنس کے آدمی۔ ان کے ساتھ وانگ کا دوست تھا۔ مجھے تو یہ توقع تھی کہ وہ دو چار ملٹری پولیس کے آدمیوں کو بھی ساتھ لائیں گے لیکن میں سمجھ نہ سکا کہ وہ ملٹری پولیس کو کیوں نہیں لائے تھے۔ وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ میں اکیلا تھا اور مجھے دھوکا دینے کے لئے وانگ ان کے ہاتھوں میں کھیل رہا تھا اور مجھ پر قابو پانے کے لئے وہ خود ہی کافی

تھے۔

میں انہی سوچوں میں الجھا ہُوا لیٹ گیا۔ غنودگی بالکل ہی غائب ہو چکی تھی۔ یہ تو اللہ کی ذات ہی بتا سکتی تھی کہ آنے والا وقت میرے لئے کیا لا رہا ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہو گا اور میں کس انجام کو پہنچوں گا..... وہ وقت اچانک اور فوراً" آگیا جیسے ایک دھماکہ ہوا ہو۔ پہلے مجھے جھونپڑے کے باہر قدموں کی آہٹیں سنائی دیں جو بڑی تیزی سے بڑھتی ہوئی جھونپڑے کے اندر آگئیں۔

آگے وانگ تھا جسے دیکھ کر میں اُٹھ بیٹھا۔ اس کے پیچھے وانگ کا دوست تھا اور اس کے پیچھے وہ دو آدمی تھے جو مجھے قصبے میں ملے تھے اور دونوں انٹیلی جنس کے آدمی تھے۔ میں کھڑا ہو گیا اور ان سب سے ہاتھ ملایا۔ ان چاروں کا انداز ایسا دوستانہ تھا جیسے میرے ساتھ گپ شپ لگانے کے لئے آئے ہوں۔ انٹیلی جنس کے آدمی تو دوستوں کی طرح ہنس رہے تھے۔

"مولانا!" — ان میں سے ایک نے کہا — "آپ سے ملنے کو دل بڑا ہی بے تاب تھا۔ آپ کے اس دوست سے کہا کہ ہمیں اپنے ساتھ لے چلے۔ ہم اس کے مشکور ہیں کہ یہ ہمیں اپنے ساتھ لے آیا ہے"۔

"میں آپ کا بہت مشکور ہوں" — میں نے کہا — "آپ نے میری عزت افزائی کی..... تشریف رکھیں..... میرے پاس چارپائی نہیں، کرسیاں نہیں، آپ کو فرش پر بٹھاتے مجھے شرم سی محسوس ہو رہی ہے"۔

میں نے انہیں یہ نہ کہا میرے بستر پر بیٹھ جائیں کیونکہ میں نے بستر میں تکئے کی طرف رائفل چھپا رکھی تھی۔ وہ چاروں فرش پر ہی بیٹھ گئے۔ مجھ سے خیر خیریت پوچھی اور انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ میری محبت کے مارے یہاں آئے ہیں۔ وہ دونوں باری باری باتیں تو میرے ساتھ کر رہے تھے لیکن ان کی نظریں جھونپڑے میں یوں گھوم پھر رہی تھیں جیسے کچھ تلاش کر رہی ہوں۔

"آپ غالباً" آگرہ کے رہنے والے ہیں" — ان میں سے ایک نے کہا — "جنگ ختم ہو تو کبھی آگرہ تاج محل دیکھنے آئیں گے۔ آپ اپنا وہاں کا ایڈریس دے دیں تو ایک آدھ دن آپ کے ہاں بھی ٹھہریں گے"۔

"بسم اللہ!" — میں نے کہا — "یہ تو میرے لئے ایک اعزاز ہو گا۔ ایڈریس

دے دوں گا۔ آپ آئیں تو سہی"۔

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ چونکہ مجھے معلوم تھا کہ یہ کس سازش کے تحت آئے ہیں۔ اس لئے میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ یہ جو باتیں کر رہے ہیں یہ محض میرے دل کے بہلاوے کے لئے کر رہے ہیں۔ جھونپڑے کا ایک کمرہ اور بھی تھا جو ان کی پیٹھ پیچھے تھا۔ وہ بار بار اس کمرے کی طرف دیکھتے تھے۔

"آپ نے غالباً" رائفل بھی رکھی ہوئی ہے!" ــــ ایک نے کہا۔

"رکھی ہوئی تھی" ــــ میں نے کہا ــــ "دریا میں پھینک دی ہے"۔

"کیوں؟" ــــ اس نے پوچھا ــــ "دریا میں کیوں پھینک دی ہے؟"

"یہاں جاپانیوں کی ایک پارٹی آ چکی ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "پھر گورا رجمنٹ کی ایک پیٹرول پارٹی بھی آئی تھی۔ اس کے بعد مجھے خیال آیا کہ کوئی اور پارٹی آ گئی تو میرے پاس فوجی رائفل دیکھ کر مجھ پر فوجی ہونے کا شبہ نہ کر دے۔ میں نے یہ رائفل رنگون کی ایک گلی سے اٹھائی تھی۔ اپنا ایک فوجی مارا گیا تھا۔ میں نے چونکہ وہاں سے نکلنا تھا اس لئے رائفل اور اس کا ایمونیشن وہاں سے اٹھا لیا۔ اب سوچا کہ میں ایک دکاندار اور پھر امام' میں نے رائفل کو کیا کرنا ہے۔ کچھ دن ہوئے رائفل دریا میں پھینک دی تھی"۔

میں جانتا تھا کہ میں جو بیان دے رہا ہوں اس پر انہیں یقین نہیں آئے گا۔ وانگ نے انہیں میرے متعلق سب کچھ بتا رکھا تھا۔ میرے منہ میں جو کچھ بھی آتا' میں کہہ دیتا تھا لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اپنے دفاع کے لئے کون سی چال چلوں۔ ابھی تو میں دیکھ رہا تھا کہ یہ کیا کارروائی کریں گے۔ میری جوابی کارروائی ان کی کارروائی کے مطابق ہونی تھی۔

"آپ نے دیکھا ان کا جھونپڑا کتنا خوبصورت ہے؟" ــــ وانگ کے دوست نے دوستانہ انداز میں کہا ــــ "ادھر دیکھیں' اس کا دوسرا کمرہ بھی ہے"۔

"آپ دیکھنا چاہیں تو یہ کمرہ بھی دیکھ لیں" ــــ وانگ نے کہا ــــ "یہ کمرہ تو اس سے بھی زیادہ صاف ستھرا اور اچھا ہے"۔

میں سمجھ گیا کہ وانگ اور اس کا دوست انہیں دوسرے کمرے میں لے جانا چاہتے ہیں۔ ابھی ان کا انداز دوستوں جیسا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کچھ دیر بعد یہ ریوالور نکال لیں

گے اور مجھ پر تان کر کہیں گے کہ میں یہ کہہ دوں کہ میں انڈین آرمی کا بھگوڑا ہوں اور اس کے بعد یہ مجھے ساتھ لے جائیں گے۔ وہ شاید میری رائفل ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ تو تلاشی میں بھی رائفل لے سکتے تھے لیکن مجھے جھوٹا ثابت کرنے کے لئے وہ جان گئے تھے کہ میں نے رائفل چھپا رکھی ہے اور کہیں نہ کہیں پڑی مل جائے گی۔

وہ چاروں اٹھے اور ایک دوسرے کے پیچھے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ میں تیزی سے اٹھا' تکئے کی طرف بستر کے نیچے میری رائفل پڑی ہوئی تھی۔ میں نے رائفل نکالی اور دبے پاؤں دوسرے کمرے کے دروازے کی طرف چل پڑا لیکن ایک طرف ہو کر رُک گیا۔ اس کمرے سے مجھے ہلکی سی یعنی سرگوشی کی آواز سنائی دی ــــ "اس کی رائفل دیکھو کہاں ہے"۔

"رائفل یہاں ہے" ــــ میں نے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا ــــ "پیچھے دیکھو.... اچھی طرح دیکھ لو"۔

میں نے سیفٹی کیچ آگے کر کے رائفل کاک کر لی تھی۔ وہ چاروں دوسرے کمرے کی سامنے والی دیوار تک پہنچ گئے تھے۔ چھوٹا سا تو کمرہ تھا۔ میرا خیال ہے بمشکل پانچ گز لمبا ہو گا۔

"چاروں دیوار کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ" ــــ میں نے کہا ــــ "ہاتھوں کو ذرا سی بھی حرکت نہ ہو۔ کسی نے ذرا سی بھی حرکت کی تو رائفل سے گولی نکل جائے گی..... میں فوجی ہوں۔ ایک سیکنڈ میں چار گولیاں ٹھکانے پر فائر کرنا جانتا ہوں"۔

"مولانا!" ــــ انٹیلی جنس والے ایک آدمی نے کہا ــــ "یہ آپ ہمارے ساتھ کیا مذاق کر رہے ہیں؟"

"یہ میرے دوست وانگ سے پوچھیں" ــــ میں نے کہا ــــ "یہ تم سب کے ساتھ ہی جائے گا..... کیوں وانگ! تم تو بڑے عقلمند بنے پھرتے تھے لیکن ذرا سے لالچ اور ان لوگوں کے دھوکے میں آ کر تم دوستی بھی بھول گئے۔ تمہاری کنواری بہن کو میں جب چاہتا اس جھونپڑے میں پوری رات رکھ سکتا تھا لیکن میں نے تم لوگوں کی عزتوں کی حفاظت کی ہے لیکن تم وہی سانپ نکلے جو درختوں پر رہتا ہے اور دھوکے میں ڈس لیتا ہے"۔

"آپ کس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں صاحب؟" ــــ وانگ نے کھسیانہ سا ہو کر کہا

—— "معلوم ہوتا ہے آپ کو کسی نے کوئی غلط خبر سنا دی ہے"۔

میں مخاطب تو وانگ سے تھا لیکن میری نظریں ان چاروں پر لگی ہوئی تھیں۔ رائفل کا بٹ میرے کندھے کے ساتھ اور اس کی نالی ان کی طرف تھی۔ انٹیلی جنس کے ایک آدمی کو میں نے دیکھ لیا۔ وہ نہایت آہستہ آہستہ اپنا دایاں ہاتھ اپنے پیٹ کی طرف لے جا رہا تھا۔ اس نے بلکہ ان دونوں نے ذرا تنگ سے پاجامے پہن رکھے تھے اور ان کے اوپر لمبی قمیضیں تھیں۔ وہ اپنے آپ کو سویلین ظاہر کرتے تھے۔ میں نے اس کا ہاتھ اوپر کو حرکت کرتے دیکھا تو بڑے آرام سے اسے شست میں لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ دھماکے سے جھونپڑا لرز گیا۔ وہ آدمی دو تین سیکنڈ کھڑا رہا۔ اس کے سینے سے خون پھوٹا پھر وہ گھٹنوں کے بل ہوا اور ایک طرف کو لڑھک گیا۔ گولی یقیناً اس کے دل میں لگی تھی۔ اسی لئے اس کی آنکھیں جلدی پتھرا گئی تھیں ورنہ گولی سینے سے پار ہو جائے تو بھی آدمی اتنی جلدی نہیں مرتا۔

باقی تینوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وانگ کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ وہ مجھے دوستی کا واسطہ دے کر زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ میں نے رائفل اس کی طرف کر کے ٹریگر دبایا۔ ایک دھماکہ اور ہُوا۔ فاصلہ پانچ گز بھی نہیں تھا۔ گولی اس کی پیشانی سے داخل ہوئی اور کھوپڑی میں سے نکل گئی۔ وہ گرا، ذرا دیر تڑپا اور ختم ہو گیا۔

باقی وانگ کا دوست اور انٹیلی جنس کا جوان رہ گئے تھے۔ دونوں نے اکٹھے ہی بولنا بلکہ گڑگڑانا شروع کر دیا۔ میرے پاس ایسی کوئی وجہ نہیں تھی کہ ان دونوں کو میں بخش دیتا۔ میں نے تو یہاں اب رہنا ہی نہیں تھا۔

انٹیلی جنس کے جوان نے غالباً یہ سوچا ہو گا کہ مرنا تو ہے ہی، کیوں نہ وہ اپنے دفاع کے لئے کچھ کرے۔ اسے اپنے متعلق غالباً یہ خوش فہمی تھی کہ وہ بڑی تیزی سے ریوالور نکال کر مجھ پر گولی چلا لے گا۔ وہ بڑی ہی تیزی سے ہاتھ قمیض کے اندر لے گیا اور اس کے ساتھ ہی میری رائفل نے ایک گولی اُور اگلی جو اُس کے سینے میں بھی نہ لگی اور سر میں بھی نہ لگی بلکہ درمیان میں ٹھوڑی کے نیچے لگی اور شہ رگ میں سے پار ہو گئی۔ وہ آخر فوجی تھا اور جوان بھی تھا۔ اس نے گولی کھا کر بھی ریوالور نکال لیا۔ میں نے اس کا وہ ہاتھ سیدھا نہ ہونے دیا۔ رائفل ذرا نیچے کر کے اس کے ہاتھ کو شست میں لیا اور گولی چلا دی۔ اس وقت اس کا ہاتھ اس کی ناف کے قریب تھا۔ گولی اس کے ہاتھ میں

سے نکل کر اس کی ناف سے بھی پار ہو گئی۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور گر پڑا اور پھر وہ اپنے ساتھی کی لاش پر گرا۔

اب وانگ کا دوست رہ گیا تھا۔ وہ مولانا مجھے معاف کر دو، کہتا ہُوا میری طرف دوڑا۔ میں نے اس پر گولی نہیں چلائی بلکہ بیونٹ فائٹنگ (سنگین بازی) کے طریقے سے رائفل کا بٹ نیچے کیا اور بٹ کو کہنی کے پیچھے لے گیا۔ وہ شخص ایک قدم میرے قریب آ گیا تھا۔ اُس نے میرے قدموں میں گرنا تھا لیکن میں نے جمپ لے کر بٹ جو میری کہنی کے نیچے تھا، پوری طاقت سے اس کے منہ پر مارا۔ یہ چوٹ کوئی کتنا ہی سخت جان کیوں نہ ہو، برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ شخص چوٹ کھا کر پیچھے ہٹا۔ اس کا سر ڈول رہا تھا۔ مجھے اس پر ایسا غصہ تھا کہ میں نے اسے گولی مارنے کی بجائے پیچھے ہٹ کر اور وہاں سے جمپ لے کر سنگین اس کے سینے میں اتار دی۔ وہ دیوار کے ساتھ لگا پھر گرا۔ میں نے سنگین کھینچی اور پھر جمپ لے کر اس کے سینے میں اتار دی۔ اسی طرح ایک بار اور سنگین اس کے سینے میں اتاری اور کھینچ لی۔

میں نے انٹیلی جنس کے دونوں جوانوں کی قمیضیں سامنے سے ہٹا کر دیکھا، دونوں نے نیفوں میں ریوالور اڑسے ہوئے تھے۔ یہ ریوالور میرے کسی کام نہیں آ سکتے تھے لیکن یہ خیال آ گیا کہ میں جاپانیوں کے پاس جا رہا ہوں، یہ ریوالور ساتھ لے چلوں اور انہیں دے کر کہوں گا کہ یہ میں نے انٹیلی جنس کے دو آدمیوں کو مار کر لئے تھے۔ انگریز پائلٹ کے ریوالور بھی میرے پاس تھا۔

میں نے دونوں کے ریوالور نکال لئے۔ چاروں آدمی جو مجھے پکڑ کر ساتھ لے جانے آئے تھے، مر چکے تھے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں ان سے بچ گیا۔ آج اگر کوئی مجھے کہے کہ میں کسی کو اس طرح مار ڈالوں تو میں اس کے تصوّر سے ہی کانپ اٹھوں گا۔ وہ ماحول کچھ اور تھا۔ وہاں کوئی قانون اور کوئی ضابطہ نہیں تھا۔ قانون اس کا تھا جس کے ہاتھ میں رائفل یا مشین گن تھی۔ چونکہ داؤ میرا چل گیا تھا اس لئے میں نے چاروں کو مار ڈالا۔ وہ کسی غلط فہمی یا اس خوش فہمی میں مارے گئے کہ وہ چار ہیں اور میں اکیلا ہوں اور بے خبر بھی ہوں۔ بہرحال مَیں نے کبھی بھی اپنے آپ کو ہیرو نہیں سمجھا۔ اللہ کا شکر قدم قدم پر ادا کیا ہے جس کی ذاتِ باری نے میری عقل کو روشنی دی اور میں نے دشمن پر قابو پا لیا۔

مجھے اب وہاں زیادہ دیر نہیں رکنا چاہیے تھا۔ انٹیلی جنس کے یہ دو جوان آدمی اپنی مرضی سے میری بستی میں نہیں آئے تھے۔ فوج کا ایک ڈسپلن اور ایک طریقہ کار ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے دفتر میں یہ رپورٹ دی ہوگی کہ وہ فلاں آدمی کے ساتھ فلاں جگہ ایک مشکوک آدمی کو پکڑنے کے لئے جا رہے ہیں۔ انہیں رات تک واپس چلے جانا تھا۔ نہ جانے کی صورت میں ان کے اوپر والوں کو پریشانی لاحق ہونی تھی اور انہوں نے کچھ فوجی یہاں بھیجنے تھے کہ دیکھیں وہ دو آدمی کہاں غائب ہوگئے ہیں۔ یہ سب کچھ سوچ کر میرا بہت جلدی وہاں سے نکل جانا میرے لئے بہتر تھا۔

میں نے سویلین کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ میری فوجی پتلون اور قمیض میرے پاس موجود تھیں۔ میں نے سویلین کپڑے اتار کر وردی پہن لی۔ فوجی چپل جو پشاوری چپل جیسے تھے، پہن لئے۔

میں جب جھونپڑے سے باہر نکلا تو میں نے تین ریوالور پتلون میں اُڑسے ہوئے تھے اور رائفل کندھے سے لٹکا رکھی تھی۔ گولیوں کے دھماکے سن کر بستی کی ساری آبادی باہر نکل آئی تھی۔ جھونپڑے کے سامنے عثمان کھڑا تھا اور اس کے ساتھ انگ سون تھا اور ان کے پیچھے چار پانچ سرکردہ آدمی کھڑے حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے عثمان اور انگ سون کو اشارہ کیا کہ وہ میرے پاس آ جائیں۔ میں ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ انگ سون نے مجھے پہلے سے خبردار کر دیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ وانگ کے رشتہ دار یا دوست انگ سون کے دشمن بن جائیں۔

"کیا ہُوا صاحب؟" — عثمان نے پوچھا — "یہ گولیاں کس نے چلائی تھیں؟ کیوں چلائی تھیں؟"

"یہ لوگ مجھے پکڑنے آئے تھے" — میں نے جواب دیا — "میرا داؤ چل گیا اور میں نے وانگ، اس کے دوست اور ان کے ساتھ آئے ہوئے دو آدمیوں کو گولی مار دی ہے۔ یہ سب انگریزوں کے جاسوس تھے۔ انہیں وانگ اپنے ساتھ لایا تھا۔ مجھے پتہ چل گیا کہ انہوں نے وانگ کو انعام کا لالچ دیا تھا۔ اب میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ میں آپ لوگوں کو ساری عمر نہیں بھولوں گا۔ آپ نے مجھے بہت عزت اور محبت دی ہے لیکن وانگ دھوکا باز نکلا۔ میرا اللہ آپ سب کی حفاظت کرے گا۔ اگر زندگی ہوئی تو ہو سکتا ہے

کہ پھر کبھی ہماری ملاقات ہو"۔

میں نے ان دونوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عثمان اور انگ سون نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ میں بہت جلدی میں تھا۔ ملٹری پولیس کے آنے کا خطرہ تھا۔ عثمان نے کہا کہ میں نہ جاؤں۔ لیکن میں نے اسے صرف اتنا ہی کہا کہ اب میں مجبور ہوگیا ہوں۔ اتنا کہہ کر میں وہاں سے چل پڑا اور وہ لوگ وہیں کھڑے رہے۔

میں راستے سے ہٹ کر جھاڑیوں کی طرف ہوگیا۔ کچھ دُور پہنچ کر پیچھے دیکھا۔ بستی کے لوگ وہیں کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے رک کر اور پیچھے مُڑ کر دونوں بازو بلند کر کے لہرائے۔ سب نے اپنے بازو اسی طرح لہرا کر مجھے الوداع کہا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں سے رخصت ہو کر مجھے اچھا خاصا افسوس ہُوا تھا۔ ان کے ساتھ زندگی کے بہت سے دن بڑے ہی سکون اور پیار سے گزرے تھے۔

یہ زمین جو دریا تک جاتی تھی کچھ ڈھلانی تھی۔ میں کچھ اور آگے گیا اور پیچھے دیکھا تو مجھے سوائے درختوں اور جھاڑیوں کے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بستی اور بستی والے نظروں سے اوجھل ہوگئے تھے۔ میں اور آگے بڑھا تو اچانک ایک جھاڑی کو بڑی زور کی حرکت ہوئی۔ میں چونک کر رک گیا اور کندھے سے رائفل اتارنے لگا لیکن میرا ہاتھ وہیں رک گیا کیونکہ جھاڑی کے پیچھے سے دو لڑکیاں اٹھی تھیں۔ ایک تانی تھی اور دوسری وانگ کی بہن۔

وہ پہلو بہ پہلو چپ چاپ کھڑی مجھے دیکھنے لگیں۔ مجھے گرفتاری سے بچانے والی یہ دو لڑکیاں تھیں۔ وہ میری زبان نہیں سمجھتی تھیں اور میں ان کی نہیں سمجھتا تھا۔ میں بازو پھیلا کر ان کی طرف بڑھا۔ وہ آہستہ آہستہ میری طرف آئیں اور میرے بازوؤں میں سمٹ گئیں۔ میں نے انہیں بڑی زور سے اپنے ساتھ لگا لیا اور کچھ دیر اپنے بازوؤں میں لئے رکھا۔ ان کی جوانی اور ان کا حسن مجھے آج بھی یاد ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اُس وقت میری ذہنی اور جذباتی کیفیت کیا تھی۔ میں نے اُن دونوں کو بازوؤں میں لے کر اپنے گال باری باری ان کے سروں پر رکھے۔ ان کے ریشمی بالوں نے مجھے عجیب سا سکون دیا۔

مجھے محسوس ہُوا کہ دونوں سِسک رہی ہیں۔ میں نے انہیں اپنے بازوؤں سے نکالا، ان کے سروں پر، پھر چہروں پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ ان دونوں نے مجھے نئی زندگی دی ہے

ادر میں ان کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھُول سکوں گا..... وہ چپ چاپ مجھے دیکھ رہی تھیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری زبان سے نکلا ہُوا ایک بھی لفظ نہیں سمجھ سکتیں لیکن میں نے دل کی گہرائیوں سے ان کا شکریہ ادا کیا۔ میں جان گیا تھا کہ یہ کسی اور طرف سے آکر یہاں چھپ گئی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ میں اُن کے آدمیوں کو مار کر موٹر بوٹ تک جاؤں گا۔

انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار زبان سے نہیں آنسوؤں سے کیا۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ میں انہیں سمجھا نہیں سکتا تھا کہ میں جلدی میں ہوں۔ میں نے ایک بار پھر بازو پھیلائے تو وہ مقناطیس کی طرح کھِچی ہوئی میرے ساتھ آلگیں اور پھر میں ان سے رخصت ہُوا۔ دور آگے جا کر میں نے پیچھے دیکھا وہ وہیں کھڑی مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے بازو لہرائے تو انہوں نے بھی بازو لہرا کر مجھے رخصت کیا۔ وہاں سے میں دوڑتا ہُوا نیچے گیا۔ جب میں موٹر بوٹ تک گیا اور اوپر دیکھا تو لڑکیاں مجھے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ میں نے جلدی جلدی موٹر بوٹ کا رسّہ کھولا جو قریب کے ایک درخت کے ساتھ بندھا ہُوا تھا۔ میں نے رسّہ موٹر بوٹ میں پھینکا اور کود کر بوٹ میں چلا گیا۔

○

بوٹ پہلی ہی ٹرائی میں سٹارٹ ہوگئی۔ میں نے بڑی احتیاط سے وہیل کو سنبھالا اور بوٹ کو وہاں سے نکال کر لے آیا جہاں چھپا کر رکھی تھی۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ موٹر بوٹ کے وہیل پر کھڑا ہُوا تھا اور یہ بھی پہلا موقع تھا کہ میں اتنے زیادہ سیلابی اور اتنے زیادہ چوڑے اور منہ زور دریا میں اترا تھا۔ میں نے انگ سون کی ہدایت کے مطابق بوٹ کو دریا کے کنارے کے ساتھ رکھا لیکن اتنا قریب بھی نہیں کہ بے قابو ہو کر کنارے سے ٹکرا جاتی۔ کنارے کے ساتھ ساتھ پانی پُرسکون تھا۔ مجھے فائدہ یہ حاصل تھا کہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ جانا تھا۔ اگر کہیں انجن بند ہو جاتا یا تیل ختم ہو جاتا تو بوٹ نے رکنا نہیں تھا۔

میں نے رفتار تیز کردی۔ بہت دور تک دریا کا کوئی موڑ نہیں تھا۔ میں نے وہیل کو اچھی طرح سنبھالے رکھا اور بوٹ کو دائیں بائیں نہ ہونے دیا۔ مجھے اپنی منزل کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا تھا۔ منزل تو بعد کی بات تھی، میں جب دریا کی طرف دیکھتا تھا تو کچھ گھبراہٹ سی طاری ہو جاتی تھی۔ دریا کے وسط میں ایسی

منہ زور موجیں اٹھ رہی تھیں جنہیں پار کرنا ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ سیلاب کا ایسا شور کہ بوٹ کے انجن کی آواز اس میں دب گئی تھی۔

میرے اندازے کے مطابق میں دو میل سے کچھ زیادہ فاصلہ طے کرچکا تھا۔ آگے معمولی سا موڑ تھا لیکن ایسا نہیں تھا کہ میں گھبرا جاتا یا رفتار کم کرتا۔ یہ موڑ مُڑنے کی بھی ضرورت نہیں تھی کیونکہ دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا۔ میں اس موڑ سے آگے نکل گیا تو مجھے کچھ ایسے محسوس ہونے لگا جیسے کوئی چیز بوٹ کے نیچے لگ رہی ہے اور بوٹ کا پیندا کہیں سے رگڑا جا رہا ہے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ بوٹ کی رفتار اتنی نہیں رہی جتنی میں نے کر رکھی تھی۔ میں نے پیچھے دیکھا تو بوٹ کے پیچھے مجھے کیچڑ سا اُڑتا نظر آیا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ بوٹ کنارے پر چڑھ گئی ہے اور کنارہ دریا میں ڈوبا ہُوا ہے۔ دائیں طرف مجھے کوئی کنارہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بوٹ کا پروپیلر پیچھے سے زمین پر لگ رہا تھا بلکہ اس نے زمین کو کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے وہیل کو فوراً بائیں طرف کیا اور پھر پیچھے دیکھا تو اب کیچڑ نہیں اُڑ رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی بوٹ بہت تیز ہوگئی۔ تب مجھ کو عقل آئی کہ میں تو زمین پر بہت ہی کم گہرے پانی پر بوٹ چلاتا رہا ہوں۔ اب مجھے اور زیادہ محتاط ہونا تھا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ کوئی بڑا پتھر نہیں آگیا تھا ورنہ وہ پروپیلر کا ایک آدھ بلیڈ توڑ دیتا یا تینوں بلیڈوں کو ٹیڑھا کر دیتا۔ میں دراصل دریا کے وسط میں جانے سے گھبرا رہا تھا جہاں پانی کا جوش بڑا ہی ڈراؤنا تھا۔

میں نے اللہ کا نام لیا اور بوٹ کو وسط کی طرف لے گیا اور وہاں سے اس کو سیدھا کر لیا۔ انگ سون نے بتایا تھا کہ آگے جا کر پاٹ بہت چوڑا ہو جائے گا لیکن ہُوا یہ کہ آگے پاٹ اور زیادہ تنگ ہوگیا اور دونوں طرف چٹانیں نظر آنے لگیں۔ وہاں تو پانی کا اس قدر جوش تھا جیسے یہ بوٹ کو نگل ہی لے گا۔ دوسری دشواری یہ تھی کہ وہاں دریا کا موڑ زیادہ تھا۔

میں نے اس جوشیلے اور خطرناک پانی سے نکل جانے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ بوٹ کی رفتار اور تیز کردی۔ چونکہ یہاں پاٹ خاصا تنگ تھا اور کناروں پر چٹانیں دریا کو روکے ہوئے تھیں اس لئے وہاں دائیں سے بائیں تک موجیں اٹھ رہی تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے یہ پانی کی موجیں نہیں بلکہ گدلے پتھروں کی چٹانیں کھڑی ہیں۔ وہاں تو سیلاب کا زور اور زیادہ بلند اور خوفناک ہوگیا تھا۔

میری حالت اب یہ تھی کہ بوٹ بہت ہی تیز تھی اور آگے چٹانوں جیسی موجیں تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے میں خودکشی کرنے کی نیت سے چٹانوں سے ٹکرانے جا رہا ہوں۔ بوٹ جب وہاں تک پہنچی تو اتنی اونچی موج یا لہر کو کاٹ کر نکل جانے کی بجائے اوپر چلی گئی۔ میرے ہاتھ سے وہیل چھوٹ گیا اور میں پیچھے جا گرا۔ پانی اس طرح اوپر سے بوٹ میں آیا جیسے بوٹ پانی کے اندر چلی گئی ہو اور ساری کہانی ہی ختم ہو گئی ہو۔

بوٹ اوپر جا کر نیچے کو گری۔ میں ابھی اٹھ ہی رہا تھا کہ پیچھے سے میں یوں آگے کو پھینکا گیا کہ میرا سینہ وہیل کے ساتھ جا لگا اور پسلیوں پر اچھا خاصہ دباؤ پڑا۔ چند سیکنڈ کے لئے تو میرا دم گھٹ گیا۔ بوٹ ایک بار پھر اسی طرح اوپر گئی اور میں پھر پیچھے جا پڑا۔ پھر وہی عمل دوہرایا گیا کہ میں پیچھے سے جھٹکا کھا کر وہیل پر جا پڑا۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ یہ اچھا ہی ہُوا تھا کہ میں وہیل سے پیچھے جا پڑا تھا' اگر میں وہیل کو مضبوطی سے پکڑے رکھتا تو ہو سکتا تھا کہ وہ دائیں یا بائیں مُڑ جاتا اور بوٹ تیزی سے ایک طرف مڑتے اُلٹ جاتی۔ دریا نے خود ہی بوٹ کو اپنے قابو میں بلکہ اپنے رحم و کرم پر رکھا تھا۔

چار مرتبہ ایسے ہی ہُوا اور میرا جسم اس طرح ہو گیا جیسے کسی بہت بڑی طاقت نے مجھے اٹھا اٹھا کر پتھروں پر پھینکا ہو۔ میرا جوڑ جوڑ درد کرنے لگا۔

کچھ دیر کے لئے تو مجھے نظر ہی کچھ نہ آیا۔ موجوں کا پانی بڑی زور سے میری آنکھوں میں پڑا تھا۔ میں نے آنکھیں ملیں اور اب جو سامنے دیکھا تو دریا بائیں کو مُڑ رہا تھا اور آگے انگ سون کے کہنے کے مطابق پاٹ بہت ہی چوڑا ہو گیا تھا۔

آج بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ بوٹ بڑی ہی تیز رفتاری سے جا رہی تھی اور بمشکل بیس پچیس گز دور مجھے کالی سی کوئی بہت بڑی چیز دریا میں سے ابھرتی ہوئی نظر آئی۔ آپ نے تصویروں میں وہیل مچھلی دیکھی ہو گی۔ بالکل ایسے لگا جیسے یہ وہیل مچھلی ہو۔ بوٹ نے وہاں تک پہنچتے چند سیکنڈ ہی لئے ہوں گے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ تو دریا میں سے ابھری ہوئی چٹان ہے۔ میں اُس چٹان تک پہنچ گیا تھا۔ اگر میں سنبھل نہ جاتا تو اس رفتار سے بوٹ اس چٹان سے ٹکراتی تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی اور میں اس ٹکر سے کبھی زندہ نہ بچ سکتا۔ میری لاش بھی نہ ملتی۔

چٹان میری طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور بڑی ہی بڑی ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے پورا وہیل بائیں طرف گھما دیا۔ بوٹ چٹان کے بالکل قریب جا کر 90 درجے کے زاویے پر جا کر گھومی تو میں سمجھا کہ ٹکر تو بچ گئی ہے لیکن بوٹ اُلٹ جائے گی۔ پھر میں نے وہیل دائیں کو موڑا تو بوٹ سیدھی ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے میری حرکت قلب بند ہو گئی ہے۔ مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ نیچے ابھی اور چٹانیں ہوں گی اور ایسا ہو سکتا ہے بوٹ کا پیندہ کسی چٹان سے رگڑا جائے اور ذرا سا بھی سوراخ ہو گیا تو پانی بوٹ کے اندر آنے لگے گا اور پھر اس کا نتیجہ سوائے ڈوب جانے کے اور کچھ نہیں ہو گا۔

مجھے انگ سون کی وہ بات یاد آئی کہ بہت آگے جا کر بائیں کو ہو جانا لیکن بوٹ کو ترچھا رکھنا ایسا نہ کرنا کہ 90 درجے کے زاویے پر بوٹ کو موڑ کر سمجھو کہ کنارے جا لگو گے۔ میں نے بوٹ کو ذرا سا بائیں طرف موڑ دیا۔ دریا کے وسط میں لہریں تو اٹھ رہی تھیں لیکن پاٹ بہت ہی پھیل جانے کی وجہ سے ان میں وہ زور اور جوش و خروش نہیں رہا تھا جو میں پیچھے دیکھ آیا تھا۔ بوٹ ان لہروں کو چیرنے لگی۔ اب بوٹ لہروں پر غالب آ رہی تھی۔ کچھ دور تک بوٹ لہروں کو چیرتی آگے ہی آگے بڑھتی رہی اور پھر ان سے نکل گئی۔ اب میں اگلے کنارے کے قریب پہنچ رہا تھا اور پانی پُرسکون ہو گیا تھا۔ لیکن خطرہ یہ تھا کہ وہ کنارہ بھی ڈوبا ہُوا تھا اور مجھے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کنارہ ہے کہاں۔

○

میری بڑی ہی سخت آزمائش تو اب شروع ہوئی۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور شام بڑی تیزی سے سیاہ ہوتی جا رہی تھی۔ صرف ایک سہولت حاصل تھی۔ مجھے ویسے ہی خیال آ گیا کہ اس بوٹ کے سامنے دو بتیاں بھی لگی ہوئی ہیں۔ میں نے ان کے سوئچ ڈھونڈنا چاہے تو اندھیرے میں ٹھیک طرح نظر نہیں آ رہے تھے۔ ٹٹول کر ایک سوئچ الگ تھلگ پوزیشن میں محسوس ہُوا جو آف پوزیشن میں تھا۔ میں ڈرا کہ یہ کسی اور چیز کا ہی نہ ہو۔ خطرہ مول لے کر اسے آن کیا تو سامنے کی بتیاں جل اٹھیں۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ ان کی روشنی موٹر گاڑیوں کی طرح تیز اور دور تک پہنچتی تھی۔ روشنی تو مل گئی لیکن میری جسمانی حالت بگڑ رہی تھی۔ میں جس طرح بوٹ کے اندر پٹخا گیا تھا وہ سنا چکا ہوں' اُس سے تو میری ہڈیاں دُکھنے لگی تھیں۔ اس دکھن میں اضافہ اس طرح ہُوا کہ سامنے سے بڑی ہی ٹھنڈی ہوا میرے جسم کے ساتھ ٹکراتی تھی۔ میں ہوا میں کھڑا تھا اور بچاؤ کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس ٹھنڈ نے میرے جسم کو جام کرنا شروع کر دیا۔ اتنی تیز ہوا

میں آنکھیں کھلی رکھنا بھی خاصا مشکل تھا۔ آنکھوں پر زور دیتا رہا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آنکھیں دُکھنے لگیں۔

اچانک سامنے دیکھا تو یوں معلوم ہُوا جیسے بہت بڑا درخت دریا میں کھڑا ہو۔ میں نے رفتار کم کر دی اور بوٹ اس درخت تک پہنچ گئی۔ قریب جا کر میں سمجھا کہ یہ کوئی ٹوٹا ہُوا یا جڑوں سے اُکھڑا ہُوا درخت ہے جو نہ جانے کہاں سے دریا میں بہتا آ رہا ہے۔ میں نے اسی طرح بوٹ کو تقریباً" 90 درجے کے زاویے پر دائیں کو موڑا جس طرح چٹان سے بچنے کے لئے بائیں کو موڑا تھا۔ پھر وہی خطرہ آ گیا کہ بوٹ الٹ جائے گی۔ میں نے فوراً" بوٹ کو بائیں طرف موڑا۔ درخت کے ٹہن بوٹ کے نیچے لگے اور سائیڈ کو بھی لیکن بوٹ آگے نکل گئی۔ اب میں نے اس کی رفتار تیز نہ کی۔

میں نے دریا کے دائیں اور بائیں کا منظر بیان نہیں کیا۔ دونوں طرف ویسا ہی جنگل تھا جیسے جنگل میں میں رہ آیا تھا۔ اِسی طرح چٹانیں تھیں، اونچی نیچی ٹیکریاں تھیں اور درختوں کی اتنی بہتات کہ دُور تک کچھ نظر نہیں آتا تھا..... اندھیرا گہرا ہو گیا تھا دُور، بہت دور مجھے شعلے سے چمکتے اور بُجھتے نظر آ رہے تھے۔ وہ یقیناً" توپ خانے کے جو گولہ باری کر رہے تھے۔ مجھے ہلکی ہلکی دھمک بھی سنائی دینے لگی تھی۔ اس سے میں سمجھا کہ میدانِ جنگ زیادہ دور نہیں۔ میں میدانِ جنگ یعنی اگلے مورچوں کی طرف جا رہا تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہُوا کہ خاصا زیادہ فاصلہ طے کر آیا ہوں۔ اس گورے کیپٹن نے جو پیٹرول پارٹی لے کر اس بستی کی طرف گیا تھا اور جس سے میری ملاقات ہوئی تھی، بتایا تھا کہ جنگ وہاں سے پچاس ساٹھ میل دُور ہے۔ مجھے اب اور آگے نہیں جانا چاہئے تھا۔ میں نے سوچا کہ جاپانیوں کے مورچوں کے پیچھے چلا جاؤں۔

موٹر بوٹ نے ایک جھٹکا سا کھایا اور کچھ آگے چلی گئی۔ ویسا ہی جھٹکا لگا اور انجن بند ہو کر خود ہی چل پڑا لیکن یہ جھٹکے بار بار لگنے لگے اور انجن بالکل ہی بند ہو گیا۔ سامنے والی بتیاں بہت مدھم ہو گئیں۔ میں نے انجن سٹارٹ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن انجن ذرا سا سٹارٹ ہو کر خاموش ہو جاتا تھا۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ تیل ختم ہو گیا تھا۔ اگر تیل ہی ختم ہو گیا تھا تو یہ ثبوت تھا کہ میں کم و بیش چالیس میل کا فاصلہ طے کر آیا ہوں۔ اب تو آگے جانے کا سوال ہی ختم ہو گیا تھا۔ کشتی اب دریا کے زور پر چلی جا رہی تھی۔ میں نے اسے کنارے کی طرف موڑا لیکن کشتی کی رفتار تو تھی نہیں جو

اسے فوراً" موڑ لیتی، یہ کنارے کی طرف ہوتے ہوتے ڈیڑھ دو میل آگے نکل گئی اور آخر کنارے کے ساتھ ٹکرائی۔

بوٹ رک گئی تھی۔ میں نے رائفل اٹھائی اور کندھے سے لٹکا کر بوٹ سے نکلا تو میرے نیچے گھٹنوں تک پانی تھا۔ میں بوٹ کو وہیں چھوڑ کر پانی سے نکل گیا۔ پانی کچھ دُور تک تھا۔ آگے ویسی ہی زمین اور ویسا ہی جنگل تھا جس میں سے میں آیا تھا۔

مجھے یہ یقین تھا کہ دریا کے اس کنارے پر جاپانیوں کے مورچے ہیں۔ میں اندازے سے چلتا ہی گیا۔ برما کے جنگل کا میں عادی ہو چکا تھا۔ گھُپ اندھیرے میں بھی میں نے چلنے میں کوئی دشواری محسوس نہ کی۔ البتہ جسم کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ اگر مجھے گرم کپڑے مل جاتے یا کوئی بند کمرہ مل جاتا تو جسم گرم ہو کر ٹھیک ہو جاتا لیکن جوں جوں رات گزرتی جا رہی تھی، ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی اور میرے جسم نے جو بوٹ میں چوٹیں کھائی تھیں وہ سارے جسم میں درد اور نقاہت پیدا کر رہی تھیں۔ بھوک اور پیاس نے بھی پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ جنگل میں ایک اور خطرہ درندوں کا تھا۔ وہاں شیر بھی ہو سکتا تھا اور بھیڑیئے بھی لیکن ان کا مجھے ڈر نہیں تھا کیونکہ میرے پاس رائفل تھی اور تین ریوالور تھے۔

کچھ وقت بعد ٹانگیں جیسے رہ ہی گئی ہوں۔ وہ تو جوانی کی عمر تھی کہ میں چلتا گیا لیکن کچھ اور آگے جا کر میں نے قدم گھسیٹنے شروع کر دیئے۔ پھر ایسے ہُوا کہ چند قدم چل کر میں کسی درخت کے سہارے کھڑا ہو جاتا اور دو چار منٹ بعد چل پڑتا۔ میں اتنا سمجھتا تھا کہ رکنا ٹھیک نہیں۔ جسم نے ٹھنڈے ہو کر بالکل ہی بے جان ہو جانا تھا لیکن چلتے رہنے سے بھی نوبت وہاں تک پہنچ گئی کہ میں قدم گھسیٹنے کے بھی قابل نہ رہا۔ میں بیٹھ گیا۔

میں نے اللہ کو یاد کیا اور بلند آواز سے اللہ کو پکارا اور اس کے ساتھ ہی میں نے دماغ کو غیر حاضر نہ ہونے دیا نہ ہی خیالوں کو بھٹکنے دیا۔ اس حقیقت کو سامنے رکھا کہ مجھے جاپانیوں تک پہنچنا ہے۔

تقریباً" پندرہ منٹ میں بیٹھا رہا اور میں جب اٹھنے لگا تو پتہ چلا کہ میں ضعیف العمر آدمی کی طرح اٹھنے میں بہت دشواری محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے رائفل کا سہارا لے کر اٹھنے کی کوشش کی اور اٹھ کھڑا ہُوا پھر رائفل کا سہارا لے کر اور کچھ جھک کر اس طرح چلنے لگا جس طرح بہت ہی بوڑھا کوئی آدمی لاٹھی کے سہارے چلتا ہے۔ توپوں کے

دھماکے اب ذرا صاف اور پہلے سے کچھ بلند سنائی دینے لگے تھے اور اس طرف کا آسمان فائر ہوتی توپوں کے شعلوں سے سرخ ہوتا بجھتا اور سرخ ہوتا تھا۔

میں نے یوں محسوس کیا جیسے جنگل کم گھنا ہو گیا ہے اور درختوں کا آپس کا فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ میرے نیچے جو زمین تھی' وہ کچھ ہموار سی ہو گئی تھی۔ کچھ دور تک کوئی ٹیکری یا چٹان راستے میں نہ آئی۔ یہ میری کوئی ڈھکی چھپی قوت تھی جو مجھے چلا رہی تھی ورنہ جسم میں اب ایک قدم بھی اٹھانے کی سکت نہیں رہی تھی۔

پھر یوں ہُوا کہ میرا سر ڈولنے لگا اور غشی کی لہریں آنے لگیں۔ شاید اس طرح ہو رہا تھا کہ میں دو چار سیکنڈ کے لئے غشی میں چلا جاتا اور دماغ خود ہی بیدار ہو جاتا تھا۔ یہ ایسے ہی تھا جس طرح موٹر بوٹ کا تیل ختم ہُوا تو وہ ایک جھٹکا کھاتی' اس کا انجن خاموش ہوتا' پھر خود ہی چل پڑتا اور پھر جھٹکے سے انجن چپ ہو جاتا اور آخر بالکل ہی خاموش ہو گیا۔ میرے ساتھ ایسے ہی ہُوا اور پھر میں ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ کچھ یاد نہیں کہ میں بیٹھ گیا تھا' لیٹ گیا تھا یا گر پڑا تھا۔

میں بیدار ہونے لگا لیکن میرے پہلوؤں پر ٹھوکریں پڑ رہی تھیں۔ آنکھیں کھلیں تو میں نے دیکھا کہ دھوپ نکلی ہوئی ہے اور چار فوجی میرے اِردگرد کھڑے ہیں اور دو مجھے ٹُھڈے مار رہے ہیں۔ میں فوراً" اٹھا۔ تب دیکھا کہ وہ جلپانی تھے۔ معلوم نہیں کہ وہ مجھے گالیاں دے رہے تھے یا مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ میں کون ہوں اور یہاں میں کس طرح پہنچا ہوں۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور ہر رائفل کے آگے سنگین چڑھی ہوئی تھی۔ ایک جلپانی نے سنگین میرے پیٹ کے ساتھ لگا کر معلوم نہیں غصے میں کیا کہا۔

"انڈین!" —— میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا —— "انڈین آرمی..... آئی این اے..... انڈین نیشنل آرمی" —— میں نے اس طرح کے اشارے ہاتھوں سے کئے کہ میں انڈین آرمی سے بھاگ کر آیا ہوں اور اِدھر یعنی اس طرف انڈین نیشنل آرمی میں جانا چاہتا ہوں۔

انہوں نے میری رائفل اٹھا لی تھی اور تینوں ریوالور بھی میری پتلون سے نکال لئے تھے۔ وہ شاید سمجھ گئے تھے ورنہ جلپانیوں سے یہ توقع نہیں رکھ سکتا تھا کہ وہ مجھے زندا رہنے دیں گے۔ میں اشاروں سے انہیں بتا رہا تھا کہ مجھے پیچھے لے چلو۔ ان میں ایک جلپانی نائک یا حوالدار معلوم ہوتا تھا اُس نے فیصلہ کیا کہ مجھے پیچھے لے جائے۔ میرا خیال

ہے وہ اشارے سمجھ گیا تھا۔ یہ چاروں جلپانی غالباً" پیٹرول ڈیوٹی پر تھے۔

وہ مجھے پیچھے لے چلے۔ اب توپوں کے دھماکے اور زیادہ صاف سنائی دینے لگے تھے۔ میں نے اس طرف دیکھا تو مجھے فضا میں بمبار طیّارے اُڑتے نظر آئے۔ وہ بمباری کر رہے تھے۔ میں میدانِ جنگ میں پہنچ گیا تھا۔ مشکل یہی نظر آ رہی تھی کہ یہ جلپانی مجھے اپنے کسی افسر کے پاس لے جا رہے ہیں' اگر وہ بھی میری زبان اور میرے اشارے نہ سمجھا تو مجھے گولی مار دے گا یا اس نے رحم کیا تو جنگلی قیدی بنا کر مجھے پیچھے بھیج دے گا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ مجھے مار ڈالیں گے۔ جلپانی بین الاقوامی قواعد و ضوابط اور ریڈ کراس کی پابندیوں کے قائل نہیں تھے۔ بڑی ظالم قوم تھی۔

ایک میل سے کچھ زیادہ سفر طے کیا تو مجھے اور بھی جلپانی نظر آنے لگے۔ وہاں کوئی خیمہ نہیں تھا نہ ہی فرنٹ پر خیمے لگائے جاتے تھے۔ فوجی خندقیں کھود کر ان میں رہتے تھے۔ مجھے ایک جگہ روکا گیا۔ گہرا کھودا ہُوا کھڈ تھا جس کے اوپر جال بچھا ہُوا تھا اور اس پر درختوں کی ٹہنیاں بکھری ہوئی تھیں۔ میرے سامنے سیڑھیاں سی بنی ہوئی تھیں جو اس کھڈ کے اندر جاتی تھیں۔ وہ جلپانی جو نائک یا حوالدار تھا' مجھے بازو سے پکڑ کر نیچے لے گیا۔ نیچے تو ایک کشادہ کمرہ بنا ہُوا تھا۔ ایک طرف فولڈنگ میز تھی اور فولڈنگ کرسیاں تھیں جن پر تین چار جلپانی بیٹھے ہوئے تھے اور وہ آفیسر تھے۔

مجھے نیچے لے جانے والے جلپانی نے انہیں کچھ کہا اور میری رائفل اور تینوں ریوالور میز پر رکھ دیئے۔ ایک آفیسر نے غصے سے بولتے ہوئے کچھ کہا۔ میں ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا اور یہی رٹ لگاتا رہا —— "انڈین آرمی..... انڈین نیشنل آرمی" —— ایک آفیسر نے اس جلپانی سے کچھ کہا تو وہ دوڑتا ہُوا اوپر چلا گیا۔ پھر یہ جلپانی افسر مجھے سر سے پاؤں تک اور پھر پاؤں سے سر تک دیکھتے اور آپس میں کچھ باتیں کرتے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد وہ جلپانی واپس آیا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی تھا جو جلپانی نہیں لگتا تھا۔ وہ برما کا رہنے والا تھا یا سنگاپور ملایا وغیرہ کا باشندہ تھا۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ ملایا کا باشندہ تھا۔ اس نے آتے ہی میرے ساتھ اردو میں بات کی۔ مجھ سے پوچھا میں کون ہوں۔

میں نے اسے بتایا کہ میں کس طرح اپنی بٹالین سے بھگوڑا ہُوا ہوں اور جنگل میں بھٹک گیا تھا اور ایک جگہ رکا رہا۔ میں نے بتایا کہ میں آئی این اے میں شامل ہونے کے لئے بھگوڑا ہُوا ہوں۔ یہ تو نہ بتایا کہ میں نے نو جلپانیوں کو مار ڈالا تھا البتہ یہ بتایا کہ انگریز

پائلٹ کو قتل کیا تھا۔ پھر میں نے جاپانیوں کے حق میں کچھ باتیں کیں۔ یہ ملائی جاپانی زبان خوب جانتا تھا۔ اس نے میری ساری بات سن کر جاپانی زبان میں جاپانی افسروں کو سنائی۔ افسروں نے کچھ سوال کئے جو اس ملائی باشندے نے مجھ سے اُردو میں پوچھے اور میں جواب دیتا رہا۔ میں آج بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ جاپانی فوج کے افسروں کے دلوں میں رحم کی لہر آگئی اور انہوں نے حکم دیا کہ مجھے پیچھے بھیج دیا جائے۔

ملائی آدمی مجھے اپنے ساتھ لے چلا اور مجھ سے راستے میں پوچھا کہ تم کس مذہب کے آدمی ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ مسلمان ہوں۔ وہ بہت خوش ہُوا اور اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ وہ بھی مسلمان تھا اور اس کا نام عمر تھا۔ وہ مجھے وہاں سے کم و بیش دو فرلانگ دور لے گیا۔ وہاں کچھ جاپانی موجود تھے اور ان میں ایک ہندوستانی فوجی بھی تھا۔ ملائی نے اس ہندوستانی کے ساتھ میرا تعارف کرایا۔ اس کا نام فصیح احمد تھا۔ عمر مجھے اس کے حوالے کر کے چلا گیا۔

فصیح نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں۔ میں نے اسے بتایا اور اپنی بٹالین کا نمبر بھی بتایا۔ فصیح انڈین آرمی کے ایک توپ خانے میں حوالدار کلرک تھا۔ وہ بھی میری طرح بھگوڑا ہو کر اس طرف آگیا تھا۔ اس کے ساتھ باتیں ہوئیں تو معلوم ہُوا کہ اسے یہاں آئے کم و بیش ایک سال ہو گیا ہے۔ وہ جالندھر کا رہنے والا تھا۔

"تم اِدھر کہاں آ نکلے ہو یار!" ـــ فصیح نے مجھے آہستہ سے کہا ـــ "میرا خیال ہے کہ تم میری طرح سنی سنائی باتوں سے جوش میں آگئے تھے"۔

"کیا مطلب ہے تمہارا فصیح بھائی؟" ـــ میں نے حیران سا ہو کر پوچھا۔

"اب تم آ ہی گئے ہو تو کوئی فکر نہ کرو" ـــ فصیح نے کہا ـــ "ذرا آرام کر لو تو ساری بات سناؤں گا۔ ابھی یہ سن لو کہ یہ آئی این اے ہندوؤں کی بنائی ہوئی فوج ہے۔ ان کا پروگرام یہ ہے کہ وہ ہندوستان کو فتح کر کے ہندوؤں کی جھولی میں ڈال دیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کا یہ خواب پورا نہیں ہو سکے گا کیونکہ جاپانیوں کے پاؤں اُکھڑ گئے ہیں اور انہوں نے پسپائی اختیار کر لی ہے۔ مجھے یہی نظر آ رہا ہے کہ جاپانی انگریزوں اور امریکیوں کے سامنے نہیں ٹھہر سکیں گے۔ بہر حال تم خوش قسمت ہو کہ یہاں تک زندہ

اور سلامت پہنچ گئے ہو۔ میں ایک ڈیوٹی پر یہاں آیا ہوں اور اب تمہیں ساتھ لے کر پیچھے جاؤں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کچھ کھایا پیا ہے یا نہیں!"

"بھوک سے مر رہا ہوں" ـــ میں نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ـــ "کچھ کھلا دو بھائی!"

فصیح بڑا پیارا آدمی اور میرا بڑا اچھا دوست ثابت ہُوا تھا۔ وہ فوراً اٹھا اور وہاں سے چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دو پلیٹیں تھیں۔ بہت اچھا کھانا تھا۔ بڑی مدت بعد اتنا اچھا کھانا دیکھا تھا میں کھانے پر ٹوٹ پڑا اور فصیح مجھے آئی این اے کی باتیں سناتا رہا۔

میں ایک نئی دنیا میں داخل ہو گیا تھا۔ اس دنیا میں داخل ہونے کے لئے میں فوج سے بھگوڑا ہُوا تھا۔ میرا مقصد تھا ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا۔ اس کا طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ جاپانیوں کے ساتھ جا ملوں لیکن فصیح احمد نے ایسی بات کہہ دی جو کبھی خواب و خیال میں بھی میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ فصیح کہتا تھا کہ ہندو ہندوستان کے حکمران بننا چاہتے ہیں اور جاپانی انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر یہ ملک ہندوؤں کو دیں گے۔

یہ تو میں جانتا تھا کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی پائی جاتی ہے اور یہ کشیدگی کبھی کبھی دشمنی کا رنگ اختیار کر لیا کرتی ہے لیکن میں سمجھتا تھا اور شاید میں غلط سمجھتا رہا ہوں کہ ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں مخلص ہیں اور وہ مسلمانوں کو ساتھ لے کر چلیں گے۔ میں فصیح کی بات رد نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کوئی اَن پڑھ فوجی نہیں تھا' میٹرک پاس تھا جو اس وقت کے معیار کے مطابق اچھی خاصی تعلیم سمجھی جاتی تھی۔ اُس وقت تعلیم کا یعنی سکولوں اور کالجوں کا یہ بد تر حال نہیں تھا جو آج کل دیکھنے میں آتا ہے۔ ہمارے وقتوں میں استاد اپنا فرض دیانتداری اور جانفشانی سے ادا کرتے تھے۔ آج کا گریجوایٹ ہمارے وقتوں کے میٹرک کولیٹ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس وقت جمعدار (نائب صوبیدار) اور صوبیدار وغیرہ بھی اَن پڑھ ہُوا کرتے تھے۔ جن میں دس جماعتیں پاس بہت ہی زیادہ پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ فصیح کی باتوں میں دانشمندی تھی اور وہ پُراثر انداز سے بولتا تھا۔

"فصیح بھائی!" — میں نے کہا — "تم کہتے ہو کہ جاپانیوں کے پاؤں اُکھڑ گئے ہیں

جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ جاپانی ہندوستان میں داخل نہیں ہو سکیں گے اور ہمارا ملک انگریزوں کے قبضے میں رہے گا"۔

"ہاں بھائی!" — فصیح نے کہا — "میرا مطلب یہی ہے۔ یہ میرا مطلب ہی نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے۔ پورے برما پر جاپانیوں نے قبضہ کر لیا تھا لیکن اب آدھا برما اُن کے قبضے سے نکل گیا ہے"۔

"ہمارا کیا بنے گا؟" — میں نے پریشانی کے عالم میں کہا — "اگر جاپان کی فوج پسپا ہو گئی تو ہم انگریزوں کے جنگی قیدی بن جائیں گے اور ہماری حیثیت جنگی قیدی والی نہیں ہو گی بلکہ ہم بھگوڑے قرار دیئے جائیں گے' ہمارا کورٹ مارشل ہو گا۔ کم از کم چودہ سال سزائے قید ملے گی اور ہو سکتا ہے کہ ہمیں محاذ سے بھاگنے کے جرم میں گولی ہی مار دی جائے.... کبھی تم نے سوچا کہ ہم اس سزا سے بچنے کے لئے کہاں جائیں گے؟"

"نہیں یار!" — فصیح نے کہا — "میں نے اپنا انجام کبھی نہیں سوچا۔ ہو سکتا ہے کہ جاپانی پیچھے ہٹ کر کہیں قدم جما لیں لیکن ہم جس مقصد کے لئے اپنی فوج سے بھاگے تھے' وہ مقصد پورا نہیں ہو سکے گا۔ میں تمہیں پیچھے ملایا لے جا رہا ہوں جہاں جاپانیوں کی بنائی ہوئی انڈین نیشنل آرمی کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ وہاں خود دیکھ لینا کہ ہندوؤں کا رویّہ کیا ہے اور مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہے۔ میں تمہیں یہ بھی بتاتا ہوں کہ آئی این اے میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ابھی اتنا پریشان ہونے کی یا گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ جاپانی ہمیں دھوکہ نہیں دیں گے۔ مجھے پوری امید ہے کہ یہ ہمیں انگریزوں کے حوالے کر کے بھاگ نہیں جائیں گے بلکہ ہمیں اپنے ساتھ جاپان لے جائیں گے .... یہاں میں تمہارے ساتھ اور زیادہ باتیں نہیں کروں گا نہ ہی تم کرنا کیونکہ ہمارے ساتھ تین ہندو ہیں۔ ان کے ساتھ دوستانہ رویّہ رکھنا"۔

"صرف ایک بات بتا دو" — میں نے پوچھا — "تم یہاں کیا ڈیوٹی دے رہے ہو؟"

"انٹیلی جنس!" — فصیح نے جواب دیا — "یہ جاپانیوں کی انٹیلی جنس کی ایک برانچ ہے۔ اس برانچ میں زیادہ تر ہندوستانی رکھے گئے ہیں۔ میں نے یہاں چار پانچ مہینے یہ ڈیوٹی کی ہے۔ ڈیوٹی یہ تھی کہ رات کو ہم لاؤڈ سپیکر دور آگے ہندوستانیوں کے مورچوں کے قریب رکھ آتے تھے اور پیچھے آ کر انگریزوں کے خلاف زہر اُگلتے اور

ہندوستان کی آزادی کی باتیں کرتے تھے۔ ہم ہندوستانی فوجیوں کو پکارتے اور کہتے تھے کہ غلام بن کر نہ لڑو' جاپانیوں کا ساتھ دو' یہ ہندوستان تمہارے حوالے کر دیں گے اور تمہاری غلامی ختم ہو جائے گی وغیرہ وغیرہ.... اب یہ ڈیوٹی ختم ہو گئی ہے کیونکہ جاپان کی فوج تیزی سے پیچھے ہٹ رہی ہے۔ ہم دو تین دنوں تک واپس چلے جائیں گے اور تمہیں بھی ساتھ لے جائیں گے۔ میری ڈیوٹی میں انڈین آرمی کے بھگوڑے فوجیوں کا استقبال بھی تھا"۔

○

فصیح کی ان باتوں سے میری بے چینی کچھ کم تو ہو گئی لیکن ختم نہ ہوئی اور پھر یہ بے چینی پچھتاوے کی صورت اختیار کر گئی۔ بار بار خیال آتا کہ مجھے فوج سے یوں بھگوڑا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ میں تو جاپانیوں کے اس بھروسے پر چلا آیا تھا کہ جس طرح وہ حیران کن تیزی سے ملایا اور برما پر قابض ہو گئے تھے ایسے ہی چند دنوں میں پورے ہندوستان پر چھا جائیں گے اور انگریز بھاگ جائیں گے لیکن اب سنا کہ جاپانیوں نے تو ریورس گیئر لگا لیا ہے تو مجھے خیال آیا کہ انگریزوں کے ساتھ میری کوئی دشمنی تو نہیں تھی۔ یا یہ کہ میں اکیلا ہی انگریزوں کا غلام نہیں تھا۔ پھر دماغ میں یہ آئی کہ میں انہی برمیوں میں اچھا تھا' جو جھونپڑیوں میں رہتے تھے اور مجھے اپنا پیر اور مُرشد سمجھتے تھے مگر وہاں بھی مصیبت آن نازل ہوئی اور بھاگنا پڑا۔ اب تو صبر اور شکر کے بغیر کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میری قسمت جاپان کی فوج کے ساتھ وابستہ ہو گئی تھی۔

میں پچھلے کسی باب میں جاپانیوں کی برق رفتار پیش قدمی اور فتوحات کا ذکر کر چکا ہوں لیکن یہاں تھوڑے سے اضافے کے ساتھ ایک بار پھر اس کا حوالہ دوں گا۔ جاپانیوں میں حب الوطنی کا اور لڑنے کا جذبہ ایسا تھا کہ جو سنتا تھا وہ انگلیاں دانتوں میں دے لیتا اور کچھ دیر حیرت زدہ رہ جاتا تھا۔ میں ان کے اس جذبے کو پہلے تفصیل سے بیان کر آیا ہوں۔ ایک تو یہ جذبہ تھا کہ جاپان کی نیوی اور فوج طوفان کی طرح بحرالکاہل سے آئی اور جاوا' سماٹرا' بورنیو' ملایا اور سنگاپور پر قابض ہو گئیں۔ یہ علاقے آج کے انڈونیشیا اور ملائشیا ہیں۔ ان علاقوں کو مشرقِ بعید بھی کہتے ہیں۔ اس کے بعد جاپان کی فوج دیکھتے ہی دیکھتے پورے برما پر قابض ہو گئی۔ میں نے اس کے تفصیلی ذکر میں یہ بھی تفصیل سے بتایا تھا کہ جاپان کی فوج کو جاپانیوں کے مقامی جاسوسوں کی بہت ہی زیادہ مدد حاصل تھی۔

اب ہُوا یوں کہ جاپانی جتنی تیزی سے آئے تھے اتنی ہی تیزی سے پسپا ہونے لگے تھے۔ برما سے جاپانیوں کی پسپائی کی دو وجوہات تھیں' ان میں ایک یہ تھی کہ انگریزوں اور امریکیوں نے بے پناہ جنگی طاقت سے برما پر جوابی حملہ کیا تھا۔ ان دونوں بڑی طاقتوں نے اپنی ایئر فورس اور نیوی کو اس طرح استعمال کیا کہ جاپانیوں کے قدم اُکھڑ گئے۔

جاپانیوں کی پسپائی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ مشرقِ بعید کے بہت بڑے علاقے پر ان کا قبضہ تھا اور یہ قبضہ مستحکم تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ برما سے پیچھے ہٹ کر وہ ان علاقوں میں قدم جمالیں گے اور اپنی فوج کی اب از سرِنو تنظیم کر کے برما پر جوابی حملہ کریں گے۔ ایک وجہ اور بھی تھی جو جاپانیوں کی کمزوری بن گئی تھی۔ میں فوجی زبان میں بات کر رہا ہوں۔ ان کی سپلائی لائن لمبی ہو گئی تھی۔ ان کی کمک اور رسد بروقت منزل تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اُن کی سپلائی لائن انگریزوں اور امریکیوں کے بمبار طیاروں کی زد میں رہتی تھی۔

یہاں میں یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جاپان کی فوج کو پیچھے ہٹانا کوئی آسان کام بھی نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جاپانی سپاہی اگر کہیں اکیلا رہ جاتا تو وہ بھاگتا نہیں تھا نہ وہ اپنے آپ کو جنگی قیدی کے طور پر پیش کرتا تھا۔ جاپانیوں میں یہ رواج تھا کہ ہتھیار ڈالنے سے بہتر خودکشی کو سمجھتے تھے۔ میں ایسے بے شمار واقعات سنا سکتا ہوں کہ جاپانیوں نے پیچھے ہٹنے یا ہتھیار ڈالنے کی بجائے خودکشی کو بہتر سمجھا اور اپنے ملک اور اپنے بادشاہ کے نام پر بڑے فخر سے خودکشی کر لی۔ جرنیل جس کا ڈویژن شکست کھا جاتا اور وہ اپنے علاقے کا دفاع نہ کر سکتا' وہ افسروں کو اکٹھا کر کے باقاعدہ ایک تقریب منعقد کرتا اور سب سے معافی مانگ کر تلوار اپنے پیٹ پر رکھ کر زور سے دباتا اور تلوار اس کی پیٹھ کی طرف سے باہر نکل آتی۔ جاپانی افسروں کے پاس تقریباً" دو فٹ لمبی تلوار ہوتی تھی۔ برما سے اگر جاپانی پیچھے ہٹ رہے تھے تو وہ باقاعدہ ڈویژنوں' بریگیڈوں یا یونٹوں کی شکل میں پسپا ہو رہے تھے۔ اس وقت تک ان کی پسپائی منظم تھی یعنی وہ باقاعدہ پلان کے تحت پیچھے ہٹ رہے تھے اور صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کہیں نہ کہیں قدم جمالیں گے۔

بہرحال یہ فوجی معاملات ہیں' میں آپ کو اپنی بات سناتا ہوں۔ صورتِ حال یہ تھی کہ تقریباً" آدھا برما جاپانیوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ جاپانیوں کو اس پسپائی کا رنج اور ملال تھا یا نہیں' میں اپنی حالت بتاتا ہوں کہ مجھ پر رنج اور ملال کی اور

پچھتاوے کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ میں اپنے بچاؤ کے لئے جاپانیوں کی فتح کی دعائیں مانگتا تھا۔ بات بڑی صاف تھی' جاپانی قائم تھے تو میں بھی قائم تھا ورنہ پکڑے جانے کی صورت میں عمر قید تھی یا سزائے موت۔

ہم دو دن وہاں رہے۔ فصیح کے ساتھ جو تین ہندوستانی ہندو تھے' وہ بھی فوجی تھے۔ دو رہتک کے رہنے والے اور ایک راجپوتانہ کے کسی گاؤں کا تھا۔ اس پارٹی کے ساتھ ایک جاپانی افسر تھا جس کا عہدہ کیپٹن تھا۔ ایک ترجمان کے ذریعے اس افسر نے میرا باقاعدہ انٹرویو لیا تھا اور میری حوصلہ افزائی کی تھی۔

تیسرے روز علی الصبح ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ ہم فوجی ٹرک میں سوار ہوئے۔ فصیح تھا' میں تھا اور تین ہندو تھے اور ہمارے ساتھ دو جاپانی سپاہی بھی تھے۔ ڈرائیور بھی جاپانی تھا۔ ان کا کیپٹن اگلی سیٹ پر بیٹھا اور ہم سب پیچھے بیٹھ گئے۔ وہاں سے رنگون تقریباً" چار سو میل دور تھا۔ وہ سارا علاقہ گھنا اور جنگلاتی اور کچھ علاقہ پہاڑی اور چٹانی تھا۔ جاپان کی فوج نے درخت کاٹ کاٹ کر باقاعدہ رستے بنا دیئے تھے اور جگہ لکھی اور پکی سڑک بھی مل گئی تھی لیکن ہم رک رک کر رنگون کی طرف جا رہے تھے۔ ہم اگلے مورچوں سے پیچھے پیچھے جا رہے تھے یعنی ہم پچھلے مورچوں میں سے گزر رہے تھے جسے سیکنڈ ایشلان کہا جاتا ہے۔ رک رک کر چلنے کی وجہ یہ تھی کہ امریکیوں کے اور انگریزوں کے بمبار طیارے تمام تر علاقے پر بے پناہ بمباری کر رہے تھے۔ کوئی پتہ نہیں چلتا تھا کہ کس وقت بمبار آنکلیں اور کس جگہ بمباری کر دیں۔ رات کو ہمیں کسی پچھلے مورچے میں رکنا پڑتا تھا۔

ہمیں ایک ایسے سیکنڈ ایشلان میں رکنا پڑا جہاں بہت ہی رونق تھی۔ رونق کا مطلب یہ ہے کہ وہاں فوجیوں کی تعداد زیادہ تھی کہ یہ بہت بڑا سپلائی ڈمپ تھا۔ وہاں تیل پیٹرول کا بھی بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ خیمے بھی لگے ہوئے تھے اور زمین دوز جگہیں بھی بنائی ہوئی تھیں۔ ہمیں رات بھر کے لئے ایک خیمہ دے دیا گیا جو ایک گہرے کھڈ کے اوپر لگا ہوا تھا۔ سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے میں اور فصیح ویسے ہی باہر نکلے۔ ٹرک کے سفر نے جسم توڑ ڈالا تھا۔ ہم ذرا سیر و تفریح کرنا اور کچھ پیدل چلنا چاہتے تھے۔ ہم نے پچھلے مورچوں میں تین چار جگہوں پر جوان لڑکیاں گھومتی پھرتی دیکھی تھیں۔ یہ لڑکیاں ان علاقوں کی تھیں جن پر جاپانی فوج کا قبضہ ہو گیا تھا۔ میں پچھلے ایک باب میں ان لڑکیوں

کے متعلق تفصیلات پیش کر چکا ہوں۔ اس کے بعد ایک تازہ خبر ملی تھی جس کا میں خاص طور پر حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ جاپانی فوج کو یہ اجازت تھی کہ وہ مفتوحہ علاقوں میں سے اپنی پسند کی لڑکیاں اپنے ساتھ تفریح طبع کے لئے رکھ لیں۔ ان لڑکیوں کو آگے تک لے جاتے اور اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ گذشتہ برس یعنی آدھی صدی بعد اقوامِ متحدہ نے جاپان سے کہا تھا کہ اس کی فوج نے جنگ عظیم میں جن لڑکیوں کو تفریح کے لئے اپنے ساتھ رکھا تھا اور انہیں پوری فوج کی داشتائیں بنا دیا تھا' جاپان ان کے لواحقین سے باقاعدہ معافی مانگے اور انہیں معاوضہ ادا کرے۔ پہلے تو جاپان کی حکومت پس و پیش کرتی رہی لیکن جب دنیا بھر کی اقوام نے دباؤ ڈالا تو جاپان کی حکومت نے باقاعدہ معافی مانگ لی اور یہ بھی انکشاف ہوا کہ ایسی بدقسمت لڑکیوں کی تعداد دو لاکھ تھی۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں جو جاپانی فوج کے ساتھ ساتھ رہیں یا رکھی گئیں' ان کے علاوہ وہ بدقسمت لڑکیاں بھی تھیں جن کے ساتھ فوجیوں نے اجتماعی زیادتی کی اور وہ مر گئیں۔ تازہ خبر یہ ہے کہ ان دو لاکھ لڑکیوں میں سے آج ایک ہزار زندہ ہیں یا ایک ہزار کے ایڈریس معلوم کر لئے گئے ہیں۔۔ ۔۔ یہ تو اب ضعیف العمر ہو چکی ہوں گی اور جن کے ایڈریس نہیں ملے وہ نہ جانے کب اور کہاں دنیا سے اٹھ گئی ہوں گی۔ جاپانی جب پسپا ہوئے تھے تو ان لڑکیوں کو جنگلوں میں بھٹکتا چھوڑ گئے تھے۔ ظاہر ہے وہ بھوک اور پیاس سے مر گئی ہوں گی یا درندوں کی خوراک بن گئی ہوں گی یا اگر وہ واپس آئیں بھی تو بعض نے خودکشی کر لی ہو گی اور بعض بیمار ہو کر مر گئی ہوں گی۔

یہاں میں ایک بات اور کہنا چاہوں گا۔ میں نے جاپانیوں کی شجاعت کے' جذبۂ حُبّ الوطنی کے فرض کی لگن کے مظاہرے اپنی آنکھوں دیکھے ہیں۔ جاپانی فوجی تھا یا شہری' وہ اپنے وطن اور اپنے بادشاہ کا روحانی طور پر وفادار تھا۔ وہ وطن اور بادشاہ کے نام پر اپنی جان دینے کو بہت بڑا اعزاز سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ان کی جانیں اپنے وطن اور بادشاہ کی امانت ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے خلفائے راشدین کے زمانے کے مسلمان یاد آ جاتے۔ رومیوں اور ایرانیوں کی ہیبت ناک جنگی طاقت کا دم خم ہمارے مجاہدین نے توڑا اور ان طاقتوں کو نیست و نابود کر دیا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ کفار کے ڈیڑھ لاکھ کے لشکر کو چالیس ہزار اور پچاس ہزار مجاہدین نے شکست دی۔ یہ کیسے ممکن ہوا؟۔۔۔۔ شوقِ شہادت سے۔ اور یہ نظریہ یا عقیدہ کہ ہماری جانیں اللہ کی امانت ہیں اور یہ ہمیں اسلام کے نام پر اللہ کی

راہ میں قربان کرنی ہیں۔ تاریخ اسلام کا وہ باب پڑھ کر دیکھیں۔ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ خالد بن ولیدؓ‘ طارق بن زیاد‘ سعد بن ابی وقاص‘ مثنیٰ بن حارثہ‘ محمد بن قاسم‘ صلاح الدین ایوبی‘ سلطان محمود غزنوی اور ان جیسے بے شمار فرزندانِ توحید کو کفار بھی خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

میں نے وہی جذبہ جاپانی فوجیوں میں دیکھا ہے لیکن کیا وجہ ہوئی کہ جاپانی اس جذبے کے باوجود اور جنگی طاقت ہونے کے باوجود شکست کھا گئے..... صرف اس لئے کہ جو علاقہ انہوں نے فتح کیا‘ وہاں گھر گھر کی تلاشی لے کر نوجوان عورتوں اور خوبصورت لڑکیوں کو اکٹھا کر لیا اور انہیں اپنے ساتھ لے گئے۔ میں جن مجاہدینِ اسلام کا ذکر کر رہا ہوں‘ یہ شیوہ ان کا نہیں تھا۔ انہوں نے تو مفتوحہ علاقے کی عورتوں کو تحفظ دیا اور ان کی عزتوں کی رکھوالی کی۔ کسی کو کوئی لڑکی اچھی لگی تو اس کے وارثوں کی رضامندی سے اس کے ساتھ باقاعدہ نکاح پڑھایا۔ جاپانی اس معاملے میں الٹ نکلے۔ یہ حقیقت ہے کہ جس قوم نے‘ جس فوج نے اور جس انسان نے عورت کو اس طرح تفریح کا ذریعہ بنایا کہ اُڑا لے زبردستی اغوا کر کے کھلونا بنا لیا‘ وہ قوم‘ وہ فوج اور وہ انسان تباہ و برباد ہُوا۔ میں نے جاپانیوں کی پسپائی کی کچھ اور وجوہات پیش کی ہیں لیکن یہ میرا ذاتی خیال ہے کہ جاپانیوں کی شکست کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ عورت کو مالِ غنیمت سمجھ کر اسے کھلونا بنا لیتے اور توڑ پھوڑ کر پھینک دیتے تھے۔

○

میں ذکر کر رہا تھا ایک سیکنڈ ا۔شٹان کا جہاں بہت ہی رونق تھی۔ میں اور فصیح ذرا سیرد تفریح کے لئے شام سے کچھ پہلے باہر نکلے۔ ہر طرف جاپانی فوجی نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے بعض ہمیں دیکھ کر مسکراتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہم ہندوستانی ہیں اور جنگی قیدی نہیں بلکہ آئی این اے میں شامل ہو کر ان کے بھائی بن گئے ہیں۔ ہم نے وہاں لڑکیوں کی تعداد کچھ زیادہ ہی دیکھی۔ ہم پیچھے بھی جہاں جہاں رکے تھے‘ وہاں بھی لڑکیاں دیکھیں۔ ان میں بیشتر ایسی تھیں جن کے چہروں پر اداسی اور مظلومیت کے تاثرات بڑے ہی واضح تھے۔ بعض ایسی بھی دیکھیں جو ہمیں دیکھتی تھیں تو ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ جاتی تھی۔ ان میں زیادہ تر مشرقِ بعید کے مفتوحہ علاقوں کی تھیں۔ برمی ہو یا انڈونیشی یا ملائی‘ ان کے خدوخال تقریباً ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔

ان میں ہم نے تین چار ہندوستانی لڑکیاں دیکھیں۔ انہیں جاپانیوں نے رنگون سے اغوا کیا ہو گا۔ برما میں رنگون ہی ایک شہر تھا جہاں کا کاروبار ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں تھا۔ یہ میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ رنگون میں بے انداز ہندوستانی تھے جن میں پنجابیوں کی تعداد زیادہ تھی۔

دو جواں سال لڑکیاں ایک طرف سے خراماں خراماں چلی آ رہی تھیں۔ وہ شاید ہمیں دیکھ کر مسکرا اٹھی تھیں۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ ہندوستانی ہیں۔ دونوں گورے رنگ کی اور کشش والی لڑکیاں تھیں۔ دونوں کے بال کٹے ہوئے تھے‘ انہوں نے جاپانیوں کی فوجی وردی والی پتلونیں پہن رکھی تھیں اور فوجی قمیضیں پتلون کے اندر کی ہوئی تھیں۔ اس لباس پر تو وہ اور زیادہ اچھی لگتی تھیں۔ ان کے انداز سے اور ان کی مسکراہٹ سے پتہ چلتا تھا کہ یہ جاپانی فوج میں ملازم ہیں اور انہیں کوئی غم اور کوئی فکر نہیں۔ ہمارے قدم سست پڑ گئے کیونکہ ان کے انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہمارے ساتھ بات کرنا چاہتی ہوں۔

"تم دونوں ہمارے گرائیں معلوم ہوتے ہو" ـــــ ایک لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا اور پوچھا ـــــ "کہاں کے رہنے والے ہو؟"

ہم دونوں نے اسے بتایا کہ ہم کہاں کہاں کے رہنے والے ہیں اور پھر اس سے پوچھا کہ وہ کہاں کی رہنے والی ہے۔

"امرتسر!" ـــــ اس نے جواب دیا ـــــ "میں سکھ ہوں"۔

میں نے دوسری سے پوچھا کہ وہ کہاں کی رہنے والی ہے۔

"الٰہ آباد!" ـــــ اس نے جواب دیا ـــــ "میں ہندو ہوں"۔

"تم دونوں کو یہاں دیکھ کر افسوس ہو رہا ہے" ـــــ فصیح نے کہا ـــــ "افسوس اس پر بھی آتا ہے کہ ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے"۔

"اگر ہندوستان قریب ہوتا تو ہم دونوں کو یہاں سے نکال لے جاتے" ـــــ میں نے کہا ـــــ "تم بہت بُرے جال میں پھنسی ہوئی ہو"۔

دونوں ہنس پڑیں۔ دونوں کچھ کچھ نشے میں معلوم ہوتی تھیں۔ نشہ شراب کا ہی ہو سکتا تھا۔

"ہم دونوں کو کوئی افسوس نہیں" ـــــ امرتسر والی نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا

—— "ہم دونوں کو ایک ایک افسر مل گیا ہے۔ ہم پر کوئی ظلم اور کوئی جبر نہیں ہوتا"۔

"کیا تم اس ذلت میں خوش ہو؟" —— میں نے پوچھا اور کہا —— "تم عقل والی لڑکی ہو۔ تم نے اچھا کیا کہ اس ذلت کو قبول کرلیا ہے اور اسی میں خوش ہو"۔

وہ دونوں ہنسی مذاق کے موڈ میں تھیں۔ ان کے انداز سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پکنک پر آئی ہوئی ہوں یا ان کے اپنے خاوند انہیں یہاں سیرو تفریح کے لئے لائے ہوں۔ فصیح بھی زندہ دل آدمی تھا اور میری اپنی فکر بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ہم نے لڑکیوں کے ساتھ بے تکلفی سے ہنسی مذاق شروع کردیا۔ دونوں ہماری باتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں اور میں حیران ہو رہا تھا کہ یہ دونوں جاپانیوں کے پاس اتنی خوش کیوں ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کی باقاعدہ برین واشنگ کی گئی ہو۔

میں آپ کو یہی دکھانا چاہتا ہوں کہ انسان کیا ہے اور انسان ایک گہرے سمندر کی مانند ہے۔ پستی کو قبول کرلے تو پستی ہی میں اُترتا چلا جاتا ہے اور خوش رہتا ہے اور اگر عظمت کی طرف اٹھنے لگے تو ایسی ایسی قربانیاں دے ڈالتا ہے کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں۔ عورت کے متعلق یہ جو کہا جاتا ہے کہ عورت کی فطرت اتنی گہری ہے کہ اس کی تہہ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا' غلط نہیں۔ فصیح نے امرتسر کی اس سکھ لڑکی سے کہا کہ سکھ تو بڑے غیرت والے ہوتے ہیں اور تم ایک جاپانی افسر کی داشتہ بن کر خوش ہو۔

"کون سے جالندھر کے رہنے والے ہو؟" —— سکھنی نے پوچھا —— "تم سکھوں کے علاقے میں رہتے ہوئے شاید نہیں جانتے کہ ایک سکھ شادی کرتا ہے تو اس کے بھائی جتنے بھی ہوں وہ اس کی بیوی کو اپنی بیوی بنا لیتے ہیں۔ ایک بھائی کی بیوی تمام بھائیوں پر جائز ہوتی ہے"۔

ہم دونوں جانتے تھے کہ یہ سکھوں کا رواج ہے کہ ایک بھائی کی بیوی تمام بھائیوں کی بیوی ہوتی ہے۔ تمام بھائی شادی شدہ ہوں تو وہ ایک دوسرے کی بیوی کو اپنے آپ پر حلال سمجھتے ہیں۔ سنا ہے آج کل نئی روشنی کے سکھ اس رواج کو ختم کر رہے ہیں لیکن یہ رواج ختم نہیں ہُوا' سکھوں کے دیہاتی علاقے میں ابھی تک چل رہا ہے۔

"میں تمہاری حیرت ابھی رفع کردیتی ہوں" —— سکھنی نے ٹھیٹ پنجابی زبان میں کہا —— "یہ ایک واقعی حیران ہونے والی بات ہے کہ میں ان جاپانیوں کے ساتھ خوش ہوں لیکن ایک بات پر غور کرو۔ تم مجھے دیکھ رہے ہو۔ کیا میں گوری چٹی خوبصورت لڑکی

نہیں؟.... اگر میں اپنا خاوند تمہارے سامنے کھڑا کردوں تو پھر تم خود کہہ اٹھو گے کہ نہیں تم ان جاپانیوں کے پاس رہو.... میں امرتسر کے ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئی تھی لیکن سکھ مجھے اچھے نہیں لگتے تھے۔ وہ اس لئے کہ سر کے بال لپیٹ کر رکھتے ہیں اور اوپر اتنی بڑی پگڑی باندھی ہوتی ہے۔ کئی کئی دن سر کے بال دھوتے ہی نہیں۔ ان کے بالوں سے بدبُو آتی ہے۔ ان کے جسم سے بھی بدبُو آتی ہے۔ میری شادی جس سکھ کے ساتھ کرائی گئی وہ سانولے نہیں بلکہ کالے رنگ کا ہے۔ اس کی داڑھی آنکھوں کے قریب سے شروع ہوتی ہے اور دور نیچے تک چلی گئی ہے۔ اس کا چہرہ تو نظر آتا ہی نہیں۔ گندا اتنا کہ وہ دو ہفتے سر کے بال نہیں دھوتا اور اس کے سر میں جوئیں پڑی رہتی ہیں اور رکے ہوئے پسینے کی جو بدبو ہے وہ اس کی ماں برداشت کرلیتی ہوگی' میری برداشت سے باہر تھی....

"میرے سسرال کا کاروبار بڑے عرصے سے رنگون میں تھا۔ میرا خاوند مجھے رنگون لے آیا تب مجھے پتہ چلا کہ یہ تو بڑے امیر کبیر لوگ ہیں لیکن مجھے دولت کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ یہاں میرے خاوند کے دو بھائی بھی تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو ایک نے کہا کہ لڑکی تو بڑی پیاری لے آیا ہے۔ میں پہلے ہی غصے اور نفرت سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے صحن میں کھڑے ہو کر اعلان کردیا کہ میں جس کی بیوی ہوں اسی کی بیوی بنوں گی اور کوئی دوسرا میرے قریب نہ آئے ورنہ میں کسی کا سر پھوڑ دوں گی۔ دونوں بھائی ہنس پڑے۔ میں ان کی ہنسی سمجھ گئی۔ وہ میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ میرے خاوند میں دوسری بُری عادت یہ تھی کہ دیسی اور سستی شراب پیتا تھا۔ اس شراب کی بدبُو ایسی تھی کہ مجھے اُبکائیاں آنے لگتی تھیں.... دو تین دنوں بعد میرے خاوند کے بھائیوں نے میرے ساتھ زبردستی شروع کردی۔ میں گالیاں بکتی رہی یا کبھی رو پڑتی لیکن تینوں بھائی میرا مذاق اُڑاتے تھے۔ میری حالت پاگلوں جیسی ہوگئی تھی۔ اس سارے گھر میں مجھے سوائے بدبُو کے اور کچھ نہیں ملتا تھا یا یہ حیوانوں والا سلوک تھا جو میرے ساتھ ہو رہا تھا....

"چھ سات مہینے ہی گزرے تھے کہ یہ خبریں کانوں میں پڑنے لگیں کہ جاپان کی فوج علاقوں پر علاقے فتح کرتی ہوئی بڑی تیزی سے چلی آ رہی ہے.... لوگوں نے رنگون سے بھاگنا شروع کردیا لیکن میرا خاوند اور اس کے بھائی اتنا اچھا کاروبار جو انہیں کھلی دولت دے رہا تھا' چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے یہیں رہنے کا فیصلہ کرلیا اور

ایک روز جاپانی رنگون میں آ گئے۔ رنگون میں رہنے والے بڑی خوش تھے کہ انگریز چلے گئے ہیں اور جاپانی آ گئے ہیں۔ یہاں کے لوگ جاپانیوں کو بہت ہی پسند کرتے تھے۔ ہندوستان کے جو لوگ بھاگ سکے وہ بھاگ گئے اور برمیوں نے ان کے گھروں کو لُوٹ لیا۔

...

"پھر یہ شور اٹھنے لگا کہ جوان لڑکیوں کو گھروں میں چھپا لو کیونکہ جاپان کے فوجی لڑکیوں کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ برمیوں کو یہ غلط فہمی رہی کہ انہوں نے جاپانیوں کی مدد کی ہے اس لئے جاپانی ان کی بہو بیٹیوں پر ہاتھ نہیں ڈالیں گے لیکن جاپانیوں کو جہاں کہیں خوبصورت لڑکی نظر آئی' انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ برمی ہے' ہندوستانی ہے یا کس ملک کی ہے۔ وہ اسے ساتھ لے گئے۔ میرا خاوند اور اس کے بھائی مجھے چھپا کر رکھتے تھے لیکن میرا دماغ ایسا خراب ہُوا کہ جونہی وہ سب باہر جاتے' میں باہر نکل کر گلی میں کھڑی ہو جاتی اور ایک روز جاپانی مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے....

"پہلے پہل تو میں اپنی اس غلطی پر بہت پچھتائی کہ میں کیا کر بیٹھی ہوں۔ قدرت نے مجھے جو خوبصورتی دی تھی اور اتنا اچھا جسم دیا تھا' یہ میرے لئے ایک مصیبت بن گیا۔ آخر ایک روز ایک افسر نے مجھے دیکھ لیا اور وہ اپنے ساتھ لے آیا۔ اب اتنے عرصے سے اس افسر کے ساتھ ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کے ساتھ باقاعدہ شادی نہیں ہوئی لیکن ہم نے ایک دوسرے کو میاں بیوی کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے اور میں بڑے مزے کی زندگی گزار رہی ہوں۔ کھانے کو بہت اچھا ملتا ہے اور جاپان کی بہترین شراب پیتی ہوں"۔

میں اور فصیح بار بار ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے۔ فصیح بھی شاید میری طرح یہی سوچ رہا تھا کہ یہ خوبصورت لڑکی دیکھنے میں انسان لگتی ہے لیکن مکمل حیوان ہے! حیوان بنا دی گئی ہے۔

سکھنی جب اپنی واردات سنا رہی تھی تو اس کی ساتھی الٰہ آباد کی ہندو لڑکی یوں بار بار ہنستی تھی جیسے کوئی بچہ بڑی دلچسپ اور مزاحیہ کہانی سن رہا ہو۔ میں اس سے پوچھنے ہی لگا تھا کہ وہ اتنی خوش کیوں ہے لیکن سکھ لڑکی نے اس کی واردات بھی سنا دی جو اس طرح ہے کہ اس کا باپ ہندوؤں کی طرح پیسے پیسے کا پجاری تھا۔ اس نے ایک بوڑھے ہندو تاجر سے خاصی رقم لے کر اپنی اس خوبصورت اور نوجوان بیٹی کو اس کے ساتھ بیاہ دیا تھا۔ یہ

بوڑھا امیر کبیر تاجر تھا اور اس کا بزنس رنگون تک پہنچا ہُوا تھا۔ کچھ عرصہ رنگون میں گزارا کرتا تھا۔

ان کے ہاں عورت کی حیثیت ایک خریدی ہوئی لونڈی جیسی ہوتی ہے۔ لڑکی نوجوانی میں ہی اگر بیوہ ہو جائے تو وہ دوسری شادی نہیں کر سکتی بلکہ اسے سارے خاندان کے لئے منحوس قرار دے کر الگ پھینک دیا جاتا ہے لیکن ہندو مرد بوڑھا ہی کیوں نہ ہو جائے وہ ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کر سکتا ہے۔ برما پر جاپان کی فوج کے حملے سے چند مہینے پہلے یہ بوڑھا ہندو تاجر رنگون آیا اور اپنی نئی نویلی اور نوجوان دلہن کو بھی لے آیا۔ یہ لڑکی اس بوڑھے کی خدمت خاطر کرتی رہی لیکن اس بوڑھے نے لڑکی کی کوئی خدمت نہ کی بلکہ اسے پیسے پیسے کا محتاج رکھا کیونکہ وہ بہت ہی کنجوس تھا۔ تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ یہ لڑکی کس طرح زندگی کے شب و روز گزارتی رہی ہو گی۔ آخر جاپان کی فوج اس کے لئے نجات کا پیغام لے کر آئی۔

اس ہندو تاجر نے رنگون سے بھاگنے کا ارادہ کیا تھا لیکن اس کی مدد کرنے والا کوئی نہ تھا اور پھر بھاگنے کا وقت گزر گیا۔ ایک روز اس لڑکی کو دو تین جاپانی فوجیوں نے دیکھ لیا اور اسے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ اس کا انداز سکھ لڑکی جیسا نہیں تھا جو خود باہر گلی میں کھڑی ہو جاتی تھی۔ یہ ہندو جب جاپانیوں کے ہاتھ چڑھی تو وہ بہت روئی اور بہت تڑپی۔ اس کے ساتھ جاپانی فوجیوں نے حیوانوں اور وحشیوں جیسا سلوک کیا۔ آخر ایک روز ایک جاپانی افسر نے اسے دیکھا تو اپنے ساتھ لے آیا۔ سکھ لڑکی کی طرح اس جاپانی افسر نے بھی ہندو لڑکی کو بغیر شادی کئے بیوی بنا کر رکھا۔ اس ہندوانی نے ہمیں بتایا کہ اس کا افسر کہتا ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ جاپان لے جائے گا۔

یہ تھی وجہ ان دونوں لڑکیوں کی خوشی کی۔ دونوں ہر طرح مطمئن تھیں اور ایک روز جاپان چلے جانے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔

○

ایک روز ہم رنگون پہنچ گئے۔ ہمارا ٹرک ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے رُکا۔ یہ جاپان کی فوج نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا۔ اسی میں انٹیلی جنس کا دفتر بھی تھا۔ اس عمارت کے پیچھے چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ ہمیں ان کمروں میں بھیج دیا گیا۔ میں اور فصیح ایک کمرے میں چلے گئے جس میں چارپائی اور ایک میز اور دو کرسیاں رکھی تھیں۔

برما کا شہر رنگون جس کی میں نے بہت باتیں سنی تھیں۔ بہت اچھا اور خوبصورت ش
تھا۔ اس میں ٹرامیں چلتی تھیں اور سڑکیں کشادہ تھیں مگر اب اس خوبصورت اور بڑ
بڑے شہر پر قہر برس رہا تھا۔ جاپانیوں نے تو اس شہر پر بمباری اور توپوں کی گولہ باری
بغیر ہی قبضہ کر لیا تھا لیکن اب امریکہ اور برطانیہ کے بمبار جہاز اس پر ظالمانہ بمباری
رہے تھے۔ شہر بُری طرح تباہ ہو رہا تھا۔ جاپانیوں میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔

رنگون میں ہم تین دن رکے رہے لیکن نہ دن کو چین اور نہ رات کو نیند۔ ہر وق
بم گرتے اور پھٹتے رہتے تھے۔ اور یہ خوف ہر لمحہ دل کو گرفت میں لئے رکھتا تھا کہ ا
ایک بم اس عمارت پر گرے گا اور ہم سب اس کے ملبے تلے دب کر مر جائیں گے۔

فصیح مجھے اکیلا چھوڑ کر اپنی ڈیوٹی کے سلسلے میں چلا جایا کرتا تھا۔ ایک صبح وہ حسب
معمول گیا لیکن فوراً" ہی واپس آ گیا۔ اس نے یہ خوشخبری سنائی کہ ہم آج ہی ایک گ
بوٹ کے ذریعے ملایا کے ایک بڑے شہر کوالالمپور یا سنگاپور جا رہے ہیں۔

اس سے تھوڑی ہی دیر بعد ہمارا جاپانی افسر آ گیا اور اس نے کہا کہ فوراً" نکلو
ٹرک میں بیٹھو۔ مجھے جاپانی وردی دی گئی اور ایک رائفل اور ایمونیشن بھی دیا گیا اور
کے علاوہ کچھ اور سامان جو انفنٹری کے ایک سپاہی کے پاس ہوتا تھا' مجھے دیا گیا۔ میں
اپنی وردی اور جوتے وہیں پھینک دیئے اور جاپانی فوج کا باقاعدہ سپاہی بن کر ٹرک
سوار ہو گیا۔ ٹرک ہمیں بندرگاہ پر لے گیا جہاں وہ گن بوٹ کھڑی تھی جس نے ہمیں
لے جانا تھا۔ وہاں تو ہر کام بڑی ہی جلدی میں ہو رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی گن بوٹ وا
نے زبانوں سے اور ہاتھوں کے اشاروں سے کہنا شروع کر دیا کہ فوراً" بوٹ میں سوا
جاؤ' وقت بہت کم ہے۔ ان کی یہ جلد بازی بتا رہی تھی کہ حالات ایمرجنسی والے ہیں
ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا۔

ہم سب گن بوٹ میں چلے گئے۔ گن بوٹ ایک بڑے سائز کی لانچ تھی جس
چاروں طرف مشین گنیں لگی ہوئی تھیں اور ان میں چار اکٹھی مشین گنیں ایک
فٹ کی ہوئی تھیں جو طیارہ شکن گنیں تھیں۔ اس بوٹ میں دو چھوٹے کیبن اور
خاصا کشادہ کیبن تھا جس میں ہمیں سفر کرنا تھا۔

جونہی ہم گن بوٹ میں داخل ہوئے بوٹ چل پڑی۔ میں نے زندگی میں پہلا
سمندر دیکھا۔ میں برساتی نالوں اور ندیوں کے دیس کا رہنے والا تھا۔ بارش برستی

ان ندی نالوں میں سیلاب آتا اور چند گھنٹوں بعد سیلاب اُتر جاتا اور سردیوں کے موسم
میں یہ ندی نالے بالکل خشک رہتے تھے۔ میں نے ہندوستان کے دریا دیکھے تھے اور جو
سب سے بڑا دریا دیکھا وہ برما کا ایراوتی تھا جسے میں نے موٹر بوٹ پر عبور کیا تھا۔ میں سمجھتا
تھا کہ اس سے بڑا دریا کوئی اور نہیں ہو سکتا لیکن جب سمندر کی وسعت دیکھی تو خیال آیا
کہ ایراوتی تو چھوٹی سی ایک ندی ہے۔

گن بوٹ جب کھلے سمندر میں گئی تو میں ہر طرف حیرت سے دیکھنے لگا اور مجھے خدا
یاد آ گیا۔ سمندر میرے تصوروں سے بھی زیادہ وسیع و عریض تھا۔ ایک طرف تو ابھی
تک رنگون کا شہر اور ساحل نظر آ رہا تھا لیکن باقی اطراف سوائے اُفق کے پانی ہی پانی تھا۔
سمندر کا اپنا ایک تاثر ہوتا ہے۔ انسان کا ذہن کھلتا ہے پھر پھیلتا ہی چلا جاتا ہے۔ مجھے وہ
دودھ جیسے سفید پرندے بڑے اچھے لگ رہے تھے جن کی چونچیں سرخ تھیں اور پنجے
بطخوں جیسے تھے۔ یہ گن بوٹ کے اوپر منڈلاتے رہے۔ یہ پرندے اس توقع پر ہمارے
ساتھ ساتھ اُڑ رہے تھے کہ ہم کھانے کے لئے کچھ پھینکیں گے۔ وہ سمندر میں اُترتے
اور بطخوں کی طرح تیرتے تھے۔ پھر اُڑتے اور ہمارے اوپر آ جاتے۔ جب انہوں نے
دیکھا کہ اس بوٹ سے کھانے کو کچھ بھی نہیں مل رہا تو وہ واپس ہونے لگے۔ پھر میں نے
مچھلیاں دیکھیں۔ انہوں نے مجھے اور بھی زیادہ حیران کر دیا۔ ایک مچھلی جس کی لمبائی دو
فٹ یا اس سے ذرا کم ہو گی' پانی سے اُبھرتی اور تین چار فٹ پانی سے اوپر آ کر اڑتی اور پانی
سے اتنا ہی بلند رہتی اور پندرہ بیس گز آگے جا کر پانی میں ڈبکی لگا جاتی۔ میں مچھلیوں کا یہ
کھیل دیکھتا رہا اور اس کے ساتھ ہی سمندر نے اپنا ایک اور اثر دکھانا شروع کر دیا۔ میں
سر میں گرانی سی محسوس کر رہا تھا اور جسم کی کیفیت ایسی ہو گئی تھی جیسے بخار ہو گیا ہو۔
اس کے ساتھ ہی متلی محسوس ہونے لگی۔

میں اُس وقت لانچ کے اوپر کھڑا سمندر دیکھ رہا تھا۔ فصیح ایک ہندو ساتھی کے ساتھ
کیبن سے اوپر آیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔ فصیح نے بتایا کہ ہم
سب کی حالت یہی ہو رہی ہے اور چند گھنٹے یہ ایسی ہی رہے گی۔ اسے Sea Sickness
کہتے ہیں۔ بحری جہاز جب کھلے سمندر میں جاتا ہے تو تمام مسافر اسی بیماری میں مبتلا ہو
جاتے ہیں۔ متلی تو ہر کوئی محسوس کرتا ہے لیکن کچھ مسافر قے بھی کرنے لگتے ہیں۔ بخار
محسوس ہوتا ہے لیکن ہوتا نہیں۔ سر کی گرانی کو بعض مسافر بڑی مشکل سے برداشت

کرتے ہیں۔ اس کا کوئی علاج نہیں اور نہ ہی اس کا علاج کیا جاتا ہے۔ بارہ گھنٹوں کے اندر اندر حالت نارمل ہو جاتی ہے۔ فصیح نے مجھے سمندر کے یہ اثرات سمجھائے تو مجھے یہ اطمینان ہوگیا کہ میں کسی بیماری میں مبتلا نہیں ہُوا اور رات تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔

غروب آفتاب کے منظر کو میں آج تک نہیں بھولا۔ سورج جب غروب ہونے لگا تو یوں نظر آتا تھا جیسے اس طرف سمندر کو آگ لگ گئی ہو۔ سمندر کی حالت یہ تھی جیسے کسی نے سارے سمندر میں سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بکھیرے دیئے ہوں اور وہ چمک رہے ہوں.... پھر سورج سمندر میں ڈوب گیا۔

رنگون سے سنگاپور کم و بیش بارہ سو میل دور ہے۔ ہمیں یہ سارا سفر اس گن بوٹ پر طے کرنا تھا.... میں نے سمندر میں تین رنگ دیکھے۔ بندرگاہ سے ہٹے تو سمندر کا رنگ ہلکا سبز تھا اور دور گئے تو اس کا رنگ گہرا نیلا ہوگیا اور شام سے کچھ دیر پہلے میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سمندر کا رنگ بالکل کالا ہو گیا تھا۔ میں سمجھا کہ سورج غروب ہو رہا ہے اس لئے سمندر کا گہرا نیلا رنگ کالا نظر آتا ہے۔ میں نے فصیح کو بتایا تو اس نے کہا کہ سمندر کا پانی بالکل شفاف ہوتا ہے۔ یہ رنگ سمندر کی گہرائی ظاہر کرتے ہیں۔ جہاں سمندر کا رنگ کالا ہو گیا تھا وہاں سمندر بہت ہی گہرا تھا۔

فصیح نے ایک اور دلچسپ بات بتائی۔ یہ وہ کالا پانی تھا جو ہم اکثر سنا کرتے تھے۔ اس طرح کہ فلاں قاتل کو عمر قید ہو گئی ہے اور اسے کالا پانی بھیج دیا گیا ہے۔ آج بھی کبھی کبھی کالا پانی کا ذکر آتا ہے۔ یہ خلیج بنگال میں جزیروں کا ایک جھرمٹ ہے جسے جزائر انڈیمان کہتے ہیں۔ یہ جزائر رنگون سے کم و بیش 300 میل اور کلکتہ سے تقریباً 00 میل دُور ہیں۔ یہ بھارت کے جزیرے ہیں لیکن اب وہاں وہ قید خانہ نہیں جو انگریزوں کے زمانے میں ہُوا کرتا تھا۔ چونکہ ان جزیروں کے اردگرد پانی بہت ہی گہرا اور اس گہرا کی وجہ سے کالا نظر آتا ہے اس لئے اسے کالا پانی کہتے ہیں۔ جزائر انڈیمان کے متعلق ایک چیز مشہور تھی کہ وہاں سے کوئی قیدی فرار نہیں ہو سکتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ان جزائر کے اردگرد نوکیلی چٹانیں ہیں جو سمندر کے پانی میں چھپی رہتی ہیں یہ چٹانیں ہی آدمی کو زخمی کر کے ڈبو دیتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ ان جزیروں کے ارد شارک مچھلیاں بھی پائی جاتی تھیں یا اب بھی ہوں گی۔ یہ مچھلیاں انسان خور ہوتی ہیں میں نے انگریزی کی ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ صرف ایک آدمی جو وہاں قیدی

فرار ہو کر برما پہنچ گیا تھا۔ وہ برما کا ہی رہنے والا تھا اور اس نے کسی کو قتل کر دیا تھا۔ مجھے اس کا نام تو یاد نہیں رہا' وہ وہاں کے ایک نمبردار کا بیٹا تھا۔ اُس وقت برما پر بھی انگریزوں کی بادشاہی تھی اس لئے وہاں کے قاتلوں کو بھی کالا پانی بھیجا جاتا تھا۔ انگریز نے برما میں نمبرداری سسٹم چلا رکھا تھا۔

بات چونکہ انڈیمان کی ہو رہی ہے یعنی کالا پانی کی تو میں ایک دو باتیں سنانا بے محل نہیں سمجھوں گا۔ جاپانیوں نے جب مشرق بعید کے ممالک پر قبضہ کر لیا تھا تو جزائر انڈیمان پر بے پناہ بمباری کی تھی۔ وہاں جتنے بھی قیدی تھے اور اس قید خانے کے عملے کی نفری تھی' وہ سب کے سب مارے گئے تھے۔ قیدیوں کے علاوہ ان جزائر کے باشندے بھی مارے گئے۔ وہ معصوم لوگ تھے۔ ان لوگوں کی اپنی ایک ثقافت' معاشرت اور تاریخ تھی۔ ایک جزیرے میں تو قیدی رہتے تھے اور دوسرے جزائر میں حبشیوں کی طرح کے لوگ رہتے تھے۔ ان کے قد بہت ہی چھوٹے تھے اور وہ Pigmy کہلاتے تھے۔ ان کا لباس اتنا سا ہی ہوتا کہ کمر کے گرد ایک کپڑا لپیٹ کر رکھتے تھے اور باقی جسم' مردوں کا اور عورتوں کا بھی برہنہ رہتا تھا۔ وہ اس دنیا اور تہذیب سے بہت دور اور لاتعلق رہتے تھے جس دنیا میں ایک دوسرے کے ملکوں پر قبضہ کرنے کے لئے لاکھوں کی تعداد میں بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ معلوم ہُوا تھا کہ ان جزائر کی وہ نسل بالکل ہی ناپید ہو گئی ہے اور اب بھارت نے وہاں نہ جانے کس قسم کی تنصیبات لگا رکھی ہیں اور وہاں بھارتی نیوی کا بھی کوئی سلسلہ ہے۔

جزائر انڈیمان یعنی کالا پانی کے متعلق یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین کے بہت سے لیڈروں کو عمر قید دے کر کالا پانی بھیج دیا گیا تھا۔ تحریکِ مجاہدین کے کچھ مجاہدین کو بھی کالا پانی بھیجا گیا تھا۔ 1857ء میں جب مسلمانوں نے جنگِ آزادی لڑی اور ہار گئے تو انگریزوں نے چند ایک سرکردہ مسلمانوں کو عمر قید دے کر کالا پانی بھیج دیا تھا۔ انہی دنوں وہاں ایک مشہور واقعہ ہُوا۔ ایک پٹھان مجاہد نے انڈیمان کے قید خانے کے انچارج انگریز افسر کو دن دیہاڑے اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر خنجر سے قتل کر دیا تھا۔ اسے وہیں سزائے موت دے دی گئی تھی۔

جب جاپانیوں نے جزائر انڈیمان پر بمباری کی تو کچھ قیدی مارے گئے اور بعض نے سمندر میں کود کر جانیں بچانے کی کوشش کی تھی لیکن کچھ دُور تک ہی پہنچ سکے اور ڈوب

گئے۔ میں نے یہ بھی پڑھا تھا کہ ایک انگریز میجر تھوڑے سے قیدیوں کو یا سٹاف کے آدمیوں کو ایک کشتی میں لے کر ہندوستان کے ساحل تک پہنچ گیا تھا لیکن وہ اکیلا زندہ پہنچا تھا یا غالباً اس کے ساتھ ایک یا دو آدمی تھے۔ باقی سب بھوک اور پیاس سے مر گئے تھے اور ان کی لاشیں سمندر میں پھینک دی گئی تھیں۔ یہ انگریز میجر جس کا تعلق انڈیمان کے قید خانے سے تھا' بہت ہی بُری حالت میں پہنچا تھا۔ یہ دو مثالیں ملتی ہیں کہ ایک برما کا قیدی فرار ہو کر منزل پر پہنچ گیا تھا اور دوسرا یہ میجر تھا۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ وہاں کوئی قید خانہ نہیں تھا۔ قیدی کھلے پھرتے تھے جیسے وہاں کے باشندے ہوں۔ وہ اپنا کام کاج کرتے تھے اور ان میں جن کا چال چلن ٹھیک رہتا اور جنہیں قابلِ اعتماد سمجھا جاتا تھا' انہیں کچھ دنوں کی چھٹی دے کر ان کے گھروں کو بھیج دیا جاتا تھا.... میرے قصبے سے تین میل دور ایک گاؤں ہے جس کے دو سگے بھائی کالا پانی میں تھے۔ انہوں نے ایک بڑے ہی شریف اور معزز آدمی کو قتل کر دیا تھا۔ دونوں کو عمر قید ہوئی اور انہیں کالا پانی بھیج دیا گیا تھا۔ چھ ہی مہینے پہلے وہ دس دس دنوں کی چُھٹی آئے تھے اور واپس چلے گئے تھے۔ پھر جنگِ عظیم کے دوران ان کے گھر سرکاری اطلاع آئی تھی کہ دونوں بھائی بمباری میں مارے گئے ہیں۔

○

"دعا کرتے رہنا دوستو!" —— ہمارے ایک ہندو ساتھی نے کہا —— "گن بوٹ والے بتاتے ہیں کہ بہت ہی خطرہ ہے کیونکہ امریکہ اور برطانیہ کی نیوی کے بحری جنگی جہاز اس سمندر میں پہنچ گئے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دن کے وقت کم ہی سفر کریں گے' رات کو سفر کیا کریں گے اور رفتار تیز رکھنی پڑے گی"۔

نقشے میں دیکھیں۔ برما کے دور نیچے ایک طرف ملایا نظر آتا ہے جو آج کل ملائشیا کہلاتا ہے۔ دوسری طرف سماٹرا ہے۔ ان دونوں کے درمیان تنگ سمندر ہے جو آبنائے ملاکا کہلاتا ہے۔ ہم ابھی اس سے بہت دور کھلے سمندر میں تھے اور کالے پانی میں سے گزر رہے تھے۔ بڑا ہی لمبا سفر تھا۔ اگر حالات امن والے ہوتے تو گن بوٹ کی جو رفتار تھی اس سے ہم جلدی پہنچ سکتے تھے لیکن گن بوٹ سیدھے راستے پر نہیں جا رہی تھی۔

تین چار دنوں بعد بوریت سی محسوس ہونے لگی۔ وہ اس لئے کہ باہر کا منظر ایک ہی جیسا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اُفق کا بڑا ہی وسیع دائرہ ہے جس کے اندر پانی ہے اور اس پانی پر

صرف یہ ایک گن بوٹ ہے جو چلی جا رہی ہے۔ جسم اور دماغ پر سمندر کے جو اثرات ہوئے تھے' رات کو ہی ختم ہو گئے تھے۔ وقت گذارنا محال ہو رہا تھا۔ وہاں ایک ہی کام تھا کہ سارے ساتھی مل کر گپ بازی کرتے اور رات کو میں اور فصیح گن بوٹ کے عرشے پر جا بیٹھتے اور اپنے اپنے گھروں کی باتیں کیا کرتے تھے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ہم اپنے گھروں کو اور گھر والوں کو بھول جائیں۔

"ایک بات بتاؤ" —— ایک رات فصیح نے مجھ سے پوچھا —— "تمہیں یہ خیال کس طرح آیا تھا کہ ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا ہے اور اس کا یہ طریقہ ہے کہ آئی این اے میں شامل ہُوا جائے"۔

"یہ بعد کی بات ہے" —— میں نے کہا —— "پہلے تو یہ پوچھو کہ میں فوج میں بھرتی ہی کیوں ہُوا تھا"۔

"چلو' یہی بتا دو" —— فصیح نے کہا —— "وقت گذارنا ہے' ایک دوسرے کی ایسی ہی باتیں سن لیں تو وقت بڑا ٹھیک گزرتا ہے"۔

میں نے اسے یہ ساری کہانی سنا دی جو آپ کو سنا چکا ہوں کہ میں بھرتی کیوں ہُوا تھا۔ یہ بھی سنایا کہ جعلی پیر کو ہم نے کس طرح مارا پیٹا تھا اور پھر واجدہ کے خاوند آصف کی باتیں بھی سنائیں۔ پھر اسے بتایا کہ مجھے ہندوستان کی آزادی کا خیال کیوں آیا تھا۔ یہ تو میں اسے پہلے ایک دن سنا چکا تھا کہ میں دریائے ایراوتی کے پار جنگلوں میں کہاں کہاں خوار ہوتا پھر رہا تھا اور پھر کس طرح وہاں ایک بستی مل گئی جہاں میں رہا اور پھر یہ بھی کہ مجھے وہاں سے کس طرح نکلنا پڑا۔

"تم قیمتی آدمی ہو" —— فصیح نے کہا —— "تم شریف آدمی نہیں تھے لیکن ان برمیوں کی بستی میں آکر شریف آدمی بن گئے۔ اگر کوئی اور تمہاری جگہ ہوتا' میں ہی ہوتا تو ان برمی لڑکیوں سے جو تمہیں پیرو مُرشد سمجھتی تھیں' پورا پورا لطف اٹھاتا.... میں تمہیں یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تم اپنی قیمت اور اپنی قدر پہچانو' یہ زندگی میں کسی نہ کسی مقام پر تمہارے کام آئے گی۔ گناہوں سے آدمی لطف تو اٹھا سکتا ہے لیکن زندگی میں جو خواری ملتی ہے' اس کے بارے میں نہیں سوچتا۔ ان جاپانی فوجیوں کو دیکھ لو۔ ان کا مورال کتنا ہائی ہے اور یہ کس طرح جانیں قربان کرتے ہیں۔ امریکہ اور انگریزوں نے ان پر جاپانی فوجوں کا اور بمبار جہازوں کا دباؤ ڈالا ہُوا ہے' کوئی اور ہوتا تو کبھی کا بھاگ گیا

ہوتا لیکن جاپانیوں کو پیچھے ہٹانا ان دونوں بادشاہیوں کے لئے ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ ہانگ کانگ، سنگاپور اور ملایا کے ایک ہی حملے سے انگریز وہاں سے بھاگ گئے تھے لیکن ان جاپانیوں کو عورتوں کا جو چسکا ہے، اسی نے انہیں ایک کمزوری بن کر پسپائی پر مجبور کر رہا ہے۔ اگر تم برمیوں کی اس بستی میں ان لڑکیوں کے ساتھ دلچسپی پیدا کر لیتے جو تم نے مجھے بتائی ہیں تو اس وقت تک تم انگریزوں کی انٹیلی جنس کے ہاتھوں گرفتار ہو چکے ہوتے اور جیل میں ساری عمر کے لئے پڑے ہوئے ہوتے"۔

کہانی اتنی لمبی ہو گئی تھی کہ رات آدھی سے زیادہ گزر گئی اور نیند آنے لگی۔ ہم دونوں اٹھے اور نیچے کیبن میں جا کر سو گئے۔

○

اگلی رات کھانا کھا کر ہم دونوں روزمرّہ کی طرح عرشے پر جا کر بیٹھ گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہم اسی گن بوٹ میں پیدا ہوئے تھے اور اسی میں عمر گزر جائے گی اور ہماری لاشیں سمندر میں پھینک دی جائیں گی۔ سوائے سمندر کے یا افق کے اور کوئی چیز اس دنیا کی نظر میں آتی تھی۔ کبھی جاپانیوں کا کوئی بحری جنگی جہاز دور سے گزرتا نظر آ جاتا تھا۔

"فصیح بھائی!" ___ میں نے کہا ___ "تم سے یہ پوچھنا بے کار ہے کہ تمہیں ہندوستان کی آزادی کا خیال کس طرح آیا تھا۔ تمہاری تعلیم میری طرح میٹرک ہی ہے لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کتابیں بہت پڑھی ہیں۔ میں تو آوارہ ہی پھرتا اور بدمعاشیاں کرتا رہا ہوں"۔

فصیح احمد نے پہلے تو آہ بھری پھر سر جھکا لیا اور پھر میری طرف دیکھ کر مسکرایا لیکن اس کی مسکراہٹ میں بھی سنجیدگی سی تھی۔ اس نے کوئی اور ہی واردات سنا دی۔ یہ سنانے سے پہلے میں ایک بات کہنا چاہوں گا۔ میرا خیال ہے کہ ہر انسان ایک کہانی کا کردار ہوتا ہے۔ حوالدار فضل داد برما کے جنگلوں میں مجھے ملا تھا تو اس نے اپنی زندگی کا ایک واقعہ سنایا تھا۔ میں اپنی کہانی آپ کو سنا چکا ہوں۔ ہم لوگ ایک دوسرے کی ذات میں کوئی دلچسپی یا ہمدردی نہیں رکھتے۔ اگر آپ دوسروں کے دکھ بانٹنے کا تہیّہ کر لیں تو میں کہتا ہوں ہر کسی کے ساتھ ایک قصّہ وابستہ ہے اور بعض انسانوں کے قصے تو رونگٹے بھی کھڑے کر دیتے ہیں۔

"میں تمہیں اپنی بات نہیں سنانا چاہتا تھا۔ یہ میری زندگی کا ایک ایسا راز ہے جو کسی

اور کو معلوم نہیں ہونا چاہئے لیکن میں تمہیں یہ راز دیتا ہوں جس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ ہم واپس اپنے وطن کبھی نہیں جا سکیں گے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تم نے مجھے بھائی سمجھ کر اپنی باتیں سنائی ہیں۔ اب میری سنو.... میں انڈین آرمی سے اس لئے بھگوڑا نہیں ہوا کہ آئی این اے میں شامل ہو کر ہندوستان کو آزاد کراؤں گا بلکہ اصل وجہ یہ ہوئی کہ مجھے بھاگنے کا موقع مل گیا اور آگے ایک پناہ موجود تھی۔ یہ تھی انڈین نیشنل آرمی۔ میں نے سوچا چلو اس بہانے ہندوستان کو آزاد کرا لیں گے، اور میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ جاپانیوں نے ہندوستان کو آزاد کرا دیا تو مجھے فوج میں اونچا عہدہ مل جائے گا۔ کوئی اونچا عہدہ نہ سہی 'لیفٹیننٹ یا کیپٹن تو بنا ہی دیں گے"۔

فصیح نے جو بات سنائی وہ میں اپنی زبانی پیش کرتا ہوں.... ہمارے علاقے کے لوگوں کی طرح فصیح کے خاندان کی بھی یہ روایت تھی کہ فوج میں بھرتی ہونا ہے۔ اس کا باپ ریٹائرڈ صوبیدار میجر تھا۔ ایک چچا صوبیدار تھا۔ انگریزوں نے انہیں نہری علاقے میں مربعے دیئے تھے۔ فصیح راجپوت ذات کا تھا۔ چونکہ اس نے دس جماعتیں پاس کر لی تھیں اس لئے اسے حوالدار کلرک بھرتی کیا گیا۔ جنگِ عظیم سے پہلے فوج میں سپاہی کلرک رکھے جاتے تھے۔ جنگِ عظیم کے تیسرے سال ہر سپاہی کلرک کو حوالدار کلرک بنا دیا گیا تھا۔ فصیح کی سروس چار سال ہو چکی تھی۔

اس کی ایک چھوٹی بہن تھی جو شادی کی عمر کو پہنچ گئی تھی اور اس کے رشتے کے پیغام آ رہے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی انہیں پسند نہ آیا۔

فصیح کے والدین کی خواہش تھی کہ کوئی بڑے زمیندارے والا خاندان مل جائے۔ والدین کی عموماً خواہش یہی ہوتی ہے کہ لڑکی اس گھر میں دی جائے جس گھر میں روپیہ پیسہ عام ہو اور آمدنی کے ذرائع لامحدود ہوں۔ یہ خیال خام ہے کہ امیر گھرانے میں لڑکی سکھ چین سے رہتی ہے۔ کچھ ایسا ہی خیال ان لوگوں کا تھا۔ آخر بیس میل دُور کے ایک بڑے گاؤں سے پیغام آ گیا۔ فصیح کے والدین کو اتنا ہی بتایا گیا کہ ان کا زمیندارہ اتنا بڑا ہے کہ گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل لگی رہتی ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ لڑکا خوبصورت جوان ہے اور ذات بھی راجپوت تھی۔ یہ لوگ اس سے زیادہ لڑکے والوں سے واقف نہیں تھے۔ دیکھنا تو یہ بھی چاہئے تھا کہ اخلاق اور کردار کے لحاظ سے اور نیّت کے لحاظ سے وہ لوگ کیسے ہیں۔ اس کی بجائے انہوں نے اس گھر کی زمینداری اور امیری دیکھی۔

دراصل انہوں نے دیکھا کچھ بھی نہیں۔

رشتے کا پیغام وہاں کے رہنے والے ایک میاں بیوی لائے تھے جو فصیح کے والدین کو جانتے تھے۔ یہ صرف سلام و دعا تھی اور انہیں معلوم تھا اس گھر میں ایک لڑکی ہے۔ ان میاں بیوی نے لڑکے والوں کی اتنی زیادہ تعریفیں کیں کہ فصیح کے والدین چکر میں آ گئے۔ وہ ایک روز لڑکے والوں کے ہاں چلے گئے۔ انہوں نے لڑکے کو دیکھا تو باغ باغ ہو گئے۔ لڑکے کی شکل و صورت تو بہت ہی اچھی تھی لیکن جسم کے لحاظ سے وہ مردانہ حسن کا نمونہ تھا۔ گٹھا ہوا جسم اور دراز قد۔ انہیں اس نوجوان میں جو بات سب سے زیادہ اچھی لگی وہ یہ تھی کہ شرمیلا تھا۔ تھوڑی سی دیر کے لئے فصیح کے باپ کے پاس بیٹھا تو سوائے ہنسنے، مسکرانے اور شرمانے کے اس نے کوئی بات نہ کی اور وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

کوئی مجھ سے پوچھے تو میں کہوں گا کہ یہ واقعہ ہی کردار کی خوبی تھی کہ اتنے بڑے زمیندار کا بیٹا ہو کر وہ شرمیلا تھا۔ جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے بیٹے تو اپنے آپ کو شہزادے سمجھتے ہیں اور اپنے اپنے گاؤں کے لوگوں کو اپنی رعایا سمجھتے ہیں۔ ہر طرح کی بدتمیزی اور بے ہودہ حرکتیں کرتے ہیں اور عورت بازی ان کا مشغلہ ہوتا ہے۔ فصیح کے والدین کو بھی لڑکے کی یہ ادا بڑی اچھی لگی اور انہوں نے اپنی بیٹی کا رشتہ انہیں دے دیا۔

فصیح کے باپ نے فصیح کو خط لکھا کہ اس کی بہن کا رشتہ طے ہو گیا ہے اور اب شادی کا دن مقرر کرنا ہے۔ خط میں باپ نے لڑکے کی اور لڑکے کے باپ کی بہت تعریفیں لکھی تھیں۔ اُس وقت فصیح کوہاٹ چھاؤنی میں تھا۔ فصیح نے انہیں لکھا کہ اتنی جلد بازی نہیں کرنی چاہئے تھی، وہ چھٹی آتا اور اچھی طرح ان لوگوں کو دیکھ بھال لیتا اور وہاں کے کچھ لوگوں سے رائے لے لیتا لیکن بات طے ہو چکی تھی اس لئے فصیح نے بھی اسے قبول کر لیا۔ شادی کا دن بھی مقرر ہو گیا۔ فصیح پانچ دنوں کی چھٹی لے کر آیا۔ بارات بڑی شان و شوکت سے آئی اور لڑکی کی ڈولی چلی گئی۔ فصیح نے مجھے بتایا کہ دولہا اسے بھی بہت اچھا لگا تھا۔ پتہ چلتا تھا کہ کوئی مرد ہے۔ خوبرو بھی اور بارعب بھی!

○

جب جنگ شروع ہوئی تھی تو تمام فوج کی چھٹیاں بند کر دی گئی تھیں۔ جنگ نے

جب طول کھینچا تو چھٹیاں کھول دی گئیں۔ چھٹیوں سے مطلب لمبی چھٹی ہے۔ ہر فوجی جنگ سے پہلے ڈیڑھ مہینے کی اکٹھی چھٹی لے سکتا تھا لیکن جنگ میں جب چھٹیاں کھلیں تو یہ معیاد ایک مہینہ کر دی گئی۔ فصیح کی بہن کی شادی کو تین مہینے ہو چکے تھے جب فصیح ایک مہینہ چھٹی لے کر گھر آیا۔ بہن بھائی کو آپس میں پیار ہوتا ہی ہے لیکن فصیح نے بتایا کہ اسے اپنی اس بہن کے ساتھ اور بہن کو اس کے ساتھ غیر معمولی طور پر بہت زیادہ پیار تھا۔ ان دنوں اس کی بہن اپنے میکے آئی ہوئی تھی۔ دیہات کی لڑکیاں اپنی ماؤں اور بہنوں کے ساتھ اپنے دکھ سکھ کی باتیں کیا کرتی ہیں، باپوں اور بھائیوں کے ساتھ نہیں لیکن فصیح اور اس کی بہن کی آپس میں ایسی بے تکلفی تھی کہ بہن نے فصیح کو بتایا کہ ان کے ساتھ بہت بڑا دھوکہ ہوا ہے۔ دھوکہ یہ ہوا کہ لڑکا دیکھنے میں تو خوبرو اور بارعب ہے لیکن ذہنی طور پر وہ ٹھیک نہیں۔ اس میں کوئی دماغی نقص تھا یا نہ جانے کیا تھا۔ فصیح کو بتایا کہ پہلی رات دولہا کو دھکیل کر دلہن کے کمرے میں داخل کیا گیا لیکن اس کے چہرے پر اور حرکتوں میں خوفزدگی کی کیفیت صاف نظر آتی تھی۔ اسے تو جیسے یہ احساس نہیں تھا کہ اس کی شادی ہو گئی ہے اور اب وہ دولہا ہے۔ دلہن نے تنگ آ کر اس کا بازو پکڑا تو وہ بازو چھڑا کر کمرے سے نکل گیا۔

فصیح کی بہن کو پہلے تو یہ صدمہ ہوا کہ اس کا دولہا کسی اور لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا اور اس کی مرضی کے مطابق نہیں اس لئے وہ دلہن کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ دلہن رونے بیٹھ گئی اسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کیا کرے، بھاگ جائے یا اپنی ساس اور سسر سے پوچھے کہ یہ کیا معاملہ ہے اور اگر دُولہا اسے قبول کرنے کو تیار نہیں تو طلاق دے کر رخصت کر دے لیکن ہُوا یوں کہ پہلی رات جب دُولہا کمرے سے نکل گیا تو اس کی ماں اور ایک بہن دلہن کے پاس آئی۔

انہوں نے فصیح کی بہن سے کہا کہ لڑکا بڑا شرمیلا ہے اور دلہن اُسے بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لگا لے لیکن فصیح کی بہن ایسی کم عقل تو نہیں تھی۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ شرمیلے آدمی کس طرح کے ہوتے ہیں۔ دولہا کا تو انداز اور طور طریقہ بھی کچھ اور تھا۔ دلہن نے اپنی ساس اور اس کی بیٹی کو صاف کہہ دیا کہ تمہارے بیٹے نے اسے قبول نہیں کیا اس لئے فوراً" اسے طلاق دے دی جائے۔ دولہا کی ماں کے آنسو نکل آئے۔ دولہا کی بہن کی بھی یہی حالت ہوئی۔ انہوں نے دلہن کا دل پرچانے کی بہت کوشش کی

اور دولہا پر پردہ بھی ڈالا لیکن دلہن کو شک ہو گیا تھا کہ جو کچھ بھی ہے' معاملہ کچھ زیادہ ہی گڑبڑ ہے۔ دولہا کی ماں اور بہن نے دلہن کی منت سماجت شروع کر دی اور کہا کہ وہ ان کی عزت رکھے اور دولہا کو لاڈ پیار سے اپنے ساتھ لگا لے۔

دولہا آدھی رات کے بعد اس کمرے میں آیا۔ دلہن نے اس کے ساتھ باتیں اور پیار و محبت کی حرکتیں کیں تو دولہا احمقوں کی طرح ہنس پڑا اور پھر ایسی باتوں پر بھی ہنستا رہا جن پر ہنسی نہیں آیا کرتی یا آنی نہیں چاہئے۔ ہنستے ہنستے وہ اس طرح سنجیدہ ہو جاتا تھا جیسے جلتے ہوئے بلب کا سوئچ آف کر دیا جائے۔ وہ سو تو گیا لیکن دلہن سے دور ہٹ کر جیسے اس کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ وہ رات اسی طرح گزر گئی۔ اگلے روز دولہا کی ماں اور بہن پھر دلہن کے پاس آ بیٹھیں اور اسے کہا کہ جس طرح اس نے رات کو دولہا کو اس کمرے میں رکھا تھا اسی طرح اسے اپنے ساتھ رکھے اور اس کے ساتھ زیادہ تر لاڈ اور پیار کرے۔

فصیح کی بہن پہلے پھیرے پر اپنے میکے آئی تو اس نے اپنی ماں کو اپنے دولہا کے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا۔ اسے شاید امید تھی کہ وہ دولہا کو اپنے راستے پر لے آئے گی۔ رواج کے مطابق دلہن کے پہلے پھیرے پر دولہا ساتھ تھا اور رواج کے بالکل خلاف اس کی بڑی بہن بھی ساتھ تھی۔ اگلے روز وہ واپس چلے گئے اور دلہن بھی ان کے ساتھ گئی۔ فصیح کے باپ کو ذرا سا شک ہوا کہ دولہا اتنا شرمیلا بھی نہیں ہو سکتا کہ بات ہی نہ کرے۔ بہرحال جہاں تک میرا خیال ہے کہ ان لوگوں نے اپنے آپ کو دھوکہ دیئے رکھا کہ ان کا داماد شریف اور شرمیلا لڑکا ہے۔ بہن نے فصیح کو بتایا کہ اس کے بعد اس کے دولہا کا یہ رویّہ تھا کہ اس کے کمرے میں آ جاتا لیکن ویسے ہی ذرا سی بات پر وہ منہ بسور کر چلا جاتا۔ دلہن اب اس گھر سے واقف بھی ہو چکی تھی اور بے تکلّف بھی۔ وہ اس کے پیچھے جا کر اسے واپس لے آتی تھی۔ دولہا دلہن کے کمرے سے بھاگ کر اپنی ماں کے پاس چلا جاتا تھا۔ فصیح کی بہن اسے وہاں سے اپنے کمرے میں لانے کے لئے جاتی تو اس کا یہ خاوند بچوں کی طرح ماں سے کہتا تھا کہ یہ لڑکی مجھے چھیڑتی ہے اور سونے نہیں دیتی۔ اس کی ماں کبھی تو ہنس پڑتی اور کبھی اسے ڈانٹ دیتی اور کبھی ویسے ہی کوئی بات کہہ کر اسے بہلا لیتی تھی۔

تین مہینے بعد فصیح کی بہن نے اپنی ماں کو بتایا کہ اس کا خاوند نام کا خاوند ہے اور ان

میاں بیوی کا کوئی تعلق قائم نہیں ہوا۔ فصیح کی بہن پردہ نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنے سسرال کے کھیت دیکھنے کے لئے یا سیر سپاٹے کے لئے باہر نکل جاتی تھی۔ ایک دو لڑکیاں اس کے قریب آ گئیں جن کے ساتھ اس نے بے تکلفی پیدا کر لی۔ ان لڑکیوں نے اسے بتایا کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے اور زمیندار کا یہ بیٹا ذہنی لحاظ سے بالکل ٹھیک نہیں اور اپنی برادری تو دور کی بات ہے' اپنے خون کے رشتے داروں نے بھی اسے اپنی بیٹی نہیں دی تھی۔ جہاں سے انہوں نے رشتہ مانگا وہاں سے ٹکا سا جواب مل گیا۔ یہ سن کر فصیح کی بہن تو چکرا گئی اور اسے کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ اس مسئلے کا حل کیا ہو گا۔

فصیح اپنی بہن کی شادی کے تین مہینوں بعد آیا تھا۔ ان تین مہینوں میں بہت کچھ ہوا اور کئی پردے اٹھے تھے۔ فصیح کی بہن پندرہ بیس دنوں سے میکے آئی ہوئی تھی۔ اس کے سسرال سے پیغام آتے تھے کہ لڑکی کو چھوڑ جائیں لیکن فصیح کا باپ جواب بھیجتا تھا کہ ہمارے داماد کو بھیجو' وہ آ کر اپنی بیوی کو لے جائے۔ اُدھر سے کوئی بھی نہیں آتا تھا۔ دراصل فصیح کا باپ داماد کو بلا کر اچھی طرح دیکھنا چاہتا تھا مگر اس کے داماد کے والدین اسے اسی لئے نہیں بھیجتے تھے کہ اس کی یہ دماغی یا ذہنی کمزوری بے نقاب ہو جائے گی۔ لڑکی نے کہہ دیا کہ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ البتہ میرا خاوند آ جائے تو وہ جیسا کیسا بھی ہے' میں چلی جاؤں گی لیکن اس کا خاوند نہیں آ رہا تھا اور اتنے میں فصیح چھٹی آ گیا۔



فصیح نے جب یہ ساری باتیں سنیں تو وہ طیش میں آ گیا۔ اس نے پہلے تو اپنے ماں باپ کو بُرا بھلا کہا جنہوں نے اندھا دھند اپنی بیٹی کا رشتہ وہاں طے کر دیا تھا۔ پھر یہ فیصلہ سنایا کہ اس کی بہن اس وقت تک سسرال نہیں جائے گی جب تک اُدھر سے اسے کوئی لینے نہیں آتا۔

"اُدھر سے کوئی لینے نہیں آئے گا" ——— باپ نے فصیح سے کہا ——— "اس کی ایک وجہ ہے جو میں نے تمہیں ابھی تک نہیں بتائی' اب سن لو۔ میں بیٹی کے سسرال گیا تھا۔ اس کے سُسر نے بڑے رعب سے مجھے کہا کہ بیٹی کو بھیج دو ورنہ پچھتاؤ گے۔ میں نے جب دیکھا کہ وہ رعب میں آیا ہوا ہے تو میں نے بھی رعب سے بات کی اور کہا کہ تم نے ہمیں دھوکہ دیا ہے کہ پہلے یہ نہیں بتایا کہ تمہارا بیٹا ذہنی مریض ہے۔ یہ سن کر وہ اور زیادہ غصے میں آ گیا۔ میں نے اسے کہا کہ میری بیٹی کو طلاق دے دو کیونکہ تمہارا بیٹا کسی

بھی پہلو سے خاوند بننے کے قابل نہیں اور میں اپنی بیٹی کی زندگی تباہ کرنا نہیں چاہتا۔ اس نے کہا کہ ہم طلاق نہیں دیں گے۔ بیٹی کو گھر بٹھائے رکھو..... میں نے کوئی اور بات نہ کی اور واپس آگیا"۔

فصیح نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ بہن کو طلاق دلوائے گا لیکن اس نے یہ بھی سوچ لیا کہ یہ کام رعب سے اور للکارنے سے یا لڑائی جھگڑے سے نہیں ہو گا۔ یہ تو میں نے دیکھا کہ حالات کتنے ہی خطرناک کیوں نہ ہو جاتے وہ بڑے ٹھنڈے دل سے اور دماغ کو اپنے قابو میں رکھ کر سوچتا اور فیصلہ کیا کرتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے اپنی بہن کو طلاق دلوانے کے لئے جذبات اور غصے سے نہیں عقل سے ہی کام لیا ہو گا۔ ایک تو اسے غصہ ان میاں بیوی پر تھا جنہوں نے آکر اس کے والدین کو سبز باغ دکھائے، جھوٹ بولے اور انہیں اتنا متاثر کیا کہ انہوں نے بیٹی کا رشتہ وہاں دے دیا لیکن ان پر غصہ اتارنا بعد کا کام تھا۔ پہلا کام تھا بہن کو طلاق دلوانا۔

اس نے اپنے دو دوستوں کے ساتھ بات کی۔ اس کے دوست بھی اس جیسے عقل والے تھے۔ ان میں سے ایک کے رشتہ دار اس گاؤں میں رہتے تھے جس گاؤں میں فصیح کی بہن بیاہی گئی تھی۔ اس نے فصیح کو بتایا کہ وہ اس گاؤں جا کر پہلے تو یہ پتہ کرے گا کہ اس لڑکے میں کیا نقص ہے۔ اس نے یہ رائے دی تھی کہ ہو سکتا ہے اس میں کوئی ایسا نقص نہ ہو اور کوئی اور وجہ ہو کہ وہ اپنی بیوی کو پسند نہیں کرتا۔ فصیح نے یہ بات مان لی اور دوست سے کہا کہ وہ اسی روز چلا جائے۔ دوست چلا گیا۔

اس دوست نے واپس آکر جو بات سنائی وہ کوئی عجیب نہیں تھی۔ یہ میں مختصراً بتاتا ہوں کہ یہ لڑکا دو بہنوں میں اکلوتا تھا۔ اس کے بعد ان کے ہاں کوئی بیٹا نہ ہُوا۔ ماں باپ نے اس بیٹے کو بڑا ہونے ہی نہیں دیا۔ ہر وقت اٹھائے اٹھائے رکھتے اور اس کی ہر بات مانتے تھے۔ ذرا آنکھوں سے اوجھل ہُوا تو ماں پریشان ہو کر دوڑ پڑی اور جہاں کہیں اسے دیکھا اٹھا کر گھر لے آئی۔ اس عمر میں بھی ماں کا رویہ ویسا ہی تھا جیسے اس کا یہ بیٹا ابھی دودھ پیتا بچہ ہو۔ ماں نے اس میں مردانگی پیدا ہی نہیں ہونے دی۔ یہی رویہ باپ کا تھا۔ امیر کبیر گھرانہ تھا اس لئے نوکروں کی اور بیگار پر کام کرنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ بیٹے کو ماں باپ نے نہ کوئی ذمہ داری دی نہ اسے کوئی ذمہ داری لینے دی۔ وہ اگر مردوں کی طرح خود اعتمادی کے ساتھ بات کرتا تھا تو ماں کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ یہ

بچوں جیسی باتیں کیا کرے۔

یہ رائے اور یہ تجزیہ ایک پڑھے لکھے آدمی نے کیا تھا اور اس نے فصیح کے اس دوست کو بتایا تھا۔ دیہاتی لوگ اسے قسم کا تجزیہ نہیں کر سکتے۔ کسی کا بیٹا اس طرح کا نکل آئے تو وہ نفسیاتی تجزیے نہیں کرایا کرتے بلکہ اپنے پیر کے پاس چلے جاتے ہیں یا انہیں کوئی شاہ جی مل جاتے ہیں اور وہ انہیں بتاتے ہیں کہ بیٹے کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ بچوں کی سی باتیں کرتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس کا دماغ کام ہی نہیں کرتا۔ پھر پیر صاحب یا شاہ جی یہ تشخیص کرتے ہیں کہ اس پر آسیبی اثر ہے یا اس پر سایہ ہے یا یہ کہ کسی دشمن نے اس پر اُلٹے تعویذ کرائے ہیں۔

فصیح کا یہ دوست بھی میٹرک پاس تھا اور عقل رکھتا تھا۔ اس نے دو تین اور آدمیوں سے اور اپنے رشتہ داروں سے بھی رائے لی تھی۔ سب نے یہی رائے دی کہ لڑکا جھلا (پاگل) ہے۔ اس دوست نے فصیح کو یہ بتایا کہ اس لڑکے کے سُدھرنے کا یعنی نارمل ذہنی حالت میں آنے کا کوئی امکان نہیں۔ وہ کہتا تھا کہ اس لڑکے پر ایسا پردہ پڑا ہُوا تھا کہ ہر کسی کو یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ یہ شخص ذہنی طور پر معذور ہے۔ وہ خود تو اتنا زیادہ بولتا ہی نہیں تھا۔ دوسرے کوئی بات کرتے تھے تو مسکرا کر ادھورا سا جواب دیتا اور ہنسنے لگتا تھا۔ ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی جو اسے جھلا سمجھتے تھے۔ بہرحال دوست نے فصیح سے کہا کہ جس طرح بھی ہو، خواہ عدالت میں جانا پڑے، اس سے طلاق لو ورنہ فصیح کی بہن باقی عمر گھر بیٹھی کُڑھتی رہے گی۔

فصیح کے لئے یہ ایسا مسئلہ بن گیا جس کا اسے کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اپنی اس بہن پر اپنی جان بھی قربان کرنے کو تیار تھا۔ اس نے اپنے ان دوستوں کے ساتھ صلاح مشورہ کیا اور پھر اس کے دو اور دوست تھے جو سکھ تھے۔ وہ سکھوں کی اکثریت کا علاقہ تھا۔ سکھ اور مسلمان آپس میں ٹھیک ٹھاک سلوک اور اتفاق سے رہتے تھے۔ یہ تو 1947ء میں سکھ ہندوؤں کی باتوں میں آگئے اور مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے ورنہ مسلمانوں کے ساتھ ان کے تعلقات بڑے اچھے تھے بلکہ ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں کو تو سکھ اپنا دوست اور ہمدرد سمجھتے تھے۔ ان سکھ دوستوں نے بھی فصیح سے کہا کہ طلاق لینے کی کوئی ترکیب سوچیں۔

ان دونوں سکھوں میں ایک فصیح کا زیادہ ہی گہرا دوست تھا۔ اس نے فصیح سے

علیحدگی میں کہا کہ وہ ہر طرح کی مدد کرنے کو تیار ہے اور اگر نوبت لڑائی مار کٹائی تک پہ گئی تو وہ اپنے آدمی ساتھ لے آئے گا اور فصیح کا ساتھ دے گا۔ فصیح لڑائی مار کٹائی قائل نہیں تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ امن پسند تھا اور لڑنے سے ڈرتا تھا بلکہ مطلب یہ کہ وہ لڑنے مرنے کی بجائے استادی سے طلاق حاصل کرنا چاہتا تھا۔

جب فصیح مجھے یہ قصہ سنا رہا تھا تو میں ذرا سا بھی حیران نہیں ہو رہا تھا' اور مجھے امی ہے کہ میری یہ تحریر پڑھنے والے بھی حیران نہیں ہوں گے۔ ہمارے معاشرے میں دستور ہے کہ اپنے بیٹے کو بیاہنا ہے خواہ وہ شادی کے قابل ہے بھی یا نہیں۔ لڑکا نکما ہو نکھٹو ہو' نشئی ہو یا پاگل ہی کیوں نہ ہو' لڑکی والوں کو دھوکے میں رکھا جاتا اور ایک لڑکی زندگی برباد کر دی جاتی ہے۔

یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی نوجوان ذہنی طور پر اس طرح معذور ہے کہ ہر وقت ڈیپریشن میں رہتا ہے اور کوئی کام نہیں کرتا اور نہ ہی کسی کی سنتا ہے تو ڈاکٹر یا حکیم یا کو عامل اس کا یہ علاج بتاتا ہے کہ اس کی شادی کر دی جائے تو یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ ایسے لڑکوں کی شادیاں عموماً" فریب کاری کے ذریعے کرائی جاتی ہیں۔ رشتے کرانے والی مائیاں ایسے رشتے پکے کرانے میں خاص رول ادا کرتی ہیں اور منہ مانگی اُجرت وصول کرتی ہیں۔ ایسے ذہنی مریض لڑکوں کا شادی کے بعد انجام یہ ہوتا ہے کہ پہلے تو وہ اکیلا برباد رہا تھا' اس کے بعد ایک لڑکی بھی اس کے ساتھ بندھی تباہ و برباد ہوتی ہے۔

ہم اس وقت اپنے وطن سے تھوڑی دُور نہیں بلکہ بہت ہی دُور سمندر میں ایک گن بوٹ پر چلے جا رہے تھے۔ میرے اور میرے وطن کے درمیان دو ملک حائل تھے ایک برما اور دوسرا ہندوستان لیکن فصیح مجھے یہ قصہ ایسے پُراثر انداز سے سنا رہا تھا کہ میں اپنے وطن پہنچ گیا اور یوں لگا جیسے میں ایک فلم دیکھ رہا تھا۔ قصہ تو دردناک اور افسوسناک تھا لیکن اس نے مجھے میرے اپنے معاشرے میں پہنچا دیا۔

دوستوں نے فصیح کو یہ مشورہ دیا کہ ایک بار خود اپنی بہن کے سسر سے ملے اور اس کے ساتھ صلح صفائی کے انداز سے بات کرے اور دیکھے کہ اس کا رویہ کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ طلاق دینے پر راضی ہو جائے۔

فصیح کی چھٹی صرف ایک مہینہ تھی اور ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ وہ اگلے ہی روز اپنی بہن کے سُسرال چلا گیا۔

فصیح نے اپنی بہن کے سُسر کے ساتھ برخورداری سے بات کی اور کہا کہ وہ اگر اپنے بیٹے کا کوئی علاج کروا لے تو فصیح خود اپنی بہن کو یہاں چھوڑ جائے گا۔ سُسر نے یہ بات سنی تو وہ غصے میں آ گیا۔ وہ یہ الفاظ تو سنتا ہی نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا ذہنی مریض ہے۔ اس نے فصیح کو ڈانٹا بھی اور دھمکیاں بھی دیں۔ فصیح نے اس کا یہ سلوک برداشت کیا اور اس کی منتیں کیں کہ وہ اس کی بہن کے حال پر رحم کرے اور اسے طلاق دے دے۔

"طلاق تو ہم ساری عمر نہیں دیں گے" —— سُسر نے کہا —— "جاؤ اور اپنی بہن کو گھر بٹھائے رکھو۔ اگر آج کے بعد یہاں طلاق لینے آئے تو تمہاری لاش واپس جائے گی۔ جب تک میرا بیٹا زندہ ہے طلاق نہیں ملے گی"۔

فصیح وہاں سے آ گیا اور اب اس نے محسوس کیا کہ وہ بھی دماغی مریض ہو گیا ہے۔ اپنی بہن کے سُسر نے اس کے ساتھ سلوک ہی ایسا بُرا کیا تھا کہ فصیح کا دماغ کسی اور راستے پر چل پڑا۔ سُسر نے کہا تھا کہ جب تک اس کا بیٹا زندہ ہے طلاق نہیں ملے گی۔ فصیح یہ سوچتا ہُوا گھر آیا کہ ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ اس کا بیٹا زیادہ دن زندہ ہی نہ رہ سکے۔

فصیح نے اپنے مسلمان دوستوں کو تو اتنا ہی بتایا کہ اس کی بہن کے سُسر نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اور طلاق سے صاف جواب دے دیا ہے لیکن اپنے دونوں سکھ دوستوں کو اس نے کوئی اور ہی بات بتائی۔ اس نے انہیں ایک تو اپنی بہن کے سُسر کا سلوک سنایا اور یہ کہا کہ وہ اس کے بیٹے کو زندہ نہیں رہنے دے گا لیکن اسے کوئی ایسا طریقہ نہیں سوجھ رہا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی بچ جائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی بہن کے خاوند کو ایسے طریقے سے مارے کہ کسی کو پتہ نہ چل سکے کہ اس کا قاتل کون ہے۔ فصیح نے یہ باتیں اپنے سکھ دوستوں کے ساتھ اس وجہ سے کی تھیں کہ اس قسم کے خطرناک فیصلے سکھ ہی کر سکتے تھے۔

اس کے سکھ دوستوں نے اسے کہا کہ بات اگر صرف قتل کرنے کی ہوتی تو وہ دوستی کا حق اس طرح ادا کرتے کہ اس شخص کے گاؤں جا کر اسے قتل کر دیتے لیکن طریقہ استادوں والا استعمال کرنا ہے۔ دونوں سکھ اور فصیح طریقے سوچتے رہے۔ تینوں نے کوئی نہ کوئی طریقہ بیان کیا لیکن ایسا کوئی طریقہ سامنے نہیں آ رہا تھا جس سے قاتل کا سراغ نہ

ملتا۔ اچانک ایک سکھ کے دماغ میں ایک طریقہ آگیا۔

"تھوڑی سی رقم لگے گی" ـــــ ایک سکھ دوست نے کہا ـــــ "میں ایک سنیاسی جانتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آج کل وہ کہاں ہے۔ ان لوگوں کے پاس ایسے ز بھی ہوتے ہیں جن کا ایک قطرہ زبان پر رکھو تو آدمی وہیں ڈھیر ہو جاتا ہے لیکن ہمیں ا زہر نہیں چاہئے۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ لاش کا جب پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے تو ما پتہ چل جاتا ہے کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔ پھر قاتل کا سراغ بھی مل جاتا ہے.... سنیاسی میں پوچھوں گا کہ کوئی ایسا زہر دے دے جس کا اثر آہستہ آہستہ ہو خواہ ایک مہینہ ل جائے دو مہینے لگ جائیں، امید ہے کہ ایسا زہر مل جائے گا"۔

فصیح نے اسے کہا کہ ایسا زہر لا دو اور سنیاسی جتنے پیسے مانگے گا وہ دے گا۔

یہ سکھ اسی وقت فصیح کو ساتھ لے کر چل پڑا۔ آج کل تو پاکستان میں رہنے وا سنیاسیوں کو جانتے ہی نہیں، انگریزوں کے وقتوں میں سنیاسی جنگلوں میں رہتے تھے ایسی جڑی بوٹیاں ڈھونڈ نکالتے تھے جن سے عام لوگ واقف نہیں ہوتے۔ وہ دوا بناتے تھے اور ان کے پاس ہر مرض کا علاج ہوتا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ ان سنیاسیوں پاس سانپوں اور بچھوؤں کا زہر بھی ہوتا ہے.... اس سکھ کو معلوم تھا یہ سنیاسی ک ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انہوں نے تین ساڑھے تین میل دور ڈیرے ڈالے ہوئے تھے وہاں جا پہنچے۔

بڑا سنیاسی اس سکھ کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ فصیح کو معلوم نہیں تھا کہ وہ اس دوست کو کیوں اور کس طرح جانتا ہے۔ بہرحال اس سکھ نے سنیاسی سے کہا کہ اسے زہر چاہئے جو آہستہ آہستہ اثر کرے اور ڈاکٹروں کو بھی شک نہ ہو کہ مرنے والے کو دیا گیا تھا۔ سنیاسیوں کی آمدنی کا یہی تو ذریعہ تھا۔ سنیاسی نے کہا کہ اس کے پاس ایسا ہے جو دودھ یا لسی یا چائے میں چند قطرے ڈال کر پلا دو تو پینے والے کو پتہ ہی نہیں اسے زہر دیا گیا ہے۔ سات آٹھ روز بعد اس کا جگر خراب ہونے لگتا ہے اور اس آ یرقان ہو جاتا ہے۔ وہ کسی بھی حکیم یا ڈاکٹر کے پاس چلا جائے، اسے یہی تشخیص ملے کہ یہ یرقان ہے۔ اسے یرقان کی دوائیاں دی جائیں گی جن کا کچھ بھی اثر نہیں ہو پندرہ بیس دنوں تک وہ آدمی مر جائے گا۔

"سنیاسی مہاراج!" ـــــ فصیح نے کہا ـــــ "حکم دیں، کیا خدمت کروں، مجھے

دے دیں"۔

آپ سن کر حیران ہوں گے کہ سنیاسی نے صرف پچاس روپے مانگے جو فصیح نے اسی وقت دے دیئے اور سنیاسی نے تھوڑا سا پوڈر ایک پُڑیا میں لپیٹ کر فصیح کو دے دیا.. میں نے کہا ہے صرف پچاس روپے.... یہ پچاس روپے آج والے نہیں تھے۔ اُس وقت کے پچاس روپے آج کی کرنسی کے مطابق کم و بیش ڈیڑھ ہزار روپے کے برابر تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

فصیح زہر تو لے آیا لیکن ابھی اس نے اور اس کے سکھ دوست نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ یہ زہر فصیح اپنی بہن کے پاگل خاوند کو دے گا کس طرح۔ وہ جب سنیاسی سے زہر لے کر واپس آ رہے تھے تو راستے میں یہی سوچتے آئے کہ یہ زہر اسے کس طرح دیا جائے۔ یہ طریقہ فصیح کے دماغ میں آگیا۔ اس نے یہ طریقہ اپنے دوست کو سنایا تو دوست نے اس کی تائید کر دی اور کہا کہ اب جو ہوتا ہے ہوتا رہے، یہ کام کر گزرو۔

فصیح احمد نے ایک دن کا وقفہ ڈالا اور اس سے اگلے روز گھر والوں کو بتائے بغیر اپنی بہن کے سُسرال چلا گیا اور بہن کے سُسر سے ملا۔ سسر کے چہرے پر پہلے کی طرح بلکہ پہلے سے زیادہ رعونت کے تاثرات آ گئے۔ اس نے پہلی بات فصیح سے یہ پوچھی کہ بہن کو کیوں نہیں لائے۔ فصیح باقاعدہ پلان بنا کر گیا تھا۔ اس کے مطابق وہ سُسر کے آگے اس طرح جھک گیا جیسے اس کا زر خرید غلام ہو اور کوئی بہت بڑی غلطی کر بیٹھا ہو۔

"ہم آپ کی جوتیوں میں بیٹھنے والے لوگ ہیں!" ـــــ فصیح نے کم ترین بن کر کہا ـــــ "ہم نے آپ کے گھر میں اپنی بیٹی دی ہوئی ہے اس لئے ہمارے سر آپ کے آگے جھکے رہنے چاہئیں۔ میں آپ کا ہر حکم بجا لاؤں گا لیکن ایک گذارش میری بھی سُن لیں"۔

فصیح نے اپنی بہن کے سسر کے ساتھ یہی ایک بات نہیں کی تھی بلکہ وہ جب بولتا تھا تو سسر بیچ میں بول پڑتا تھا۔ فصیح فوراً چپ ہو جاتا اور اس طرح توجہ سے چوہدری کی بات سننے لگتا جیسے چوہدری اس ملک کا بادشاہ ہو۔ جب چوہدری اپنی بات ختم کرتا تو فصیح اس سے پوچھتا کہ چوہدری صاحب، مجھے بولنے کی اجازت ہے؟.... فصیح کے اس رویّے اور انداز نے چوہدری کو موم کر دیا لیکن چوہدری اپنی اس ضد پر قائم رہا کہ لڑکی کو میکے سے لانے کے لئے اس کا کوئی آدمی یا عورت نہیں جائے گی بلکہ لڑکی کو فصیح یا اس کی ماں

یا اس کا باپ لے کر آئے گا۔

"چوہدری صاحب!" ــــ فصیح نے عرض کرنے کے لہجے میں کہا ــــ "مجھے سے پہلے آپ کی عزت کا خیال ہے۔ میں ایسا مطالبہ کبھی نہیں کروں گا کہ آپ کے گھر کا کوئی نوکر بھی لڑکی کو لینے جائے۔ میری درخواست صرف یہ ہے کہ میرے باپ کی عزت کا تھوڑا سا خیال کریں۔ اگر آپ منظور کرلیں تو میں ایک عرض کرتا ہوں۔ آپ کا بیٹا ویسے بھی میرے دل کو بہت اچھا لگتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے اپنے ساتھ لے جاؤں اور آپ یہ سمجھیں کہ میں اسے اپنے پیار اور محبت کی خاطر لے جارہا ہوں۔ اسے ایک رات اپنے پاس رکھوں گا اور اگلے دن میں اسے اور اپنی بہن کو ساتھ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاؤں گا۔ اس طرح آپ کا حکم بھی پورا ہوجائے گا اور میرے باپ کی عزت بھی رہ جائے گی"۔

فصیح نے اس بے وقوف چوہدری کو پہلے ہی موم کرلیا تھا۔ پھر فصیح نے غلاموں جیسی جو ایکٹنگ کی تھی، وہ بھی کام کر گئی۔ چوہدری نے اسے اجازت دے دی کہ وہ اس کے بیٹے کو ساتھ لے جائے۔ اس نے بیٹے کو بلایا اور کہا کہ وہ فصیح کے ساتھ اس کے گاؤں چلا جائے۔

جونہی فصیح نے چوہدری کے بیٹے کو یعنی اپنی بہن کے خاوند کو دیکھا تو اُٹھ کر بڑی بے تابی سے اور پیار سے اسے گلے لگا لیا اور کہا کہ وہ تو اسے دن رات یاد آتا رہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ چوہدری کا بیٹا اپنی عادت یا فطرت کے مطابق کچھ جھینپا اور شرمایا لیکن باپ نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور فصیح نے پیار اور محبت کا بڑا شدید مظاہرہ کیا تو بیٹا تیار ہو گیا۔ ....یہاں یہ کہنا پڑتا ہے کہ جس کام نے ہونا ہوتا ہے اُس کے لئے سبب بن جاتے ہیں۔ چوہدری کے بیٹے کا فصیح کے ساتھ چل پڑنا ممکن نظر نہیں آتا تھا لیکن وہ فصیح کے ساتھ چل پڑا۔

○

چوہدری کا بیٹا جب فصیح کے ساتھ اس کے گھر میں داخل ہوا تو سب حیران رہ گئے کہ یہ معجزہ کس طرح ہوگیا ہے۔ اس لڑکے کے نہ آنے کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ وہ شرمیلا تھا یا ذہنی مریض تھا بلکہ بڑی وجہ یہ تھی جو میں نے پہلے بیان کی ہے کہ اس کے باپ نے اعلان کر رکھا تھا کہ فصیح کی بہن کو سسرال لانے کے لئے کوئی نہیں جائے گا۔

فصیح نے گھر والوں کو بتایا ہی نہیں تھا کہ وہ وہاں گیا تھا۔

چوہدری کے بیٹے کی بہت ہی زیادہ خاطر تواضع کی گئی۔ فصیح کی بہن اس کے آگے نوکروں کی طرح پھرتی رہی۔ رات کو فصیح نے چوہدری کے بیٹے کو اپنے کمرے میں سلایا۔ رات سونے سے پہلے چوہدری کے بیٹے کو دودھ پیش کیا گیا۔ فصیح نے نظر بچا کر سنیاسی سے لیا ہُوا زہر تھوڑا سا اس دودھ میں ڈال کر ہلا دیا۔ فصیح نے اپنی ماں اور بہن سے کہا تھا کہ اسے رات کو دودھ ضرور پلانا۔ یہ دونوں عورتیں یہ سمجھی ہوں گی کہ یہ بھی خاطر تواضع کا ایک حصہ ہے۔ چوہدری کے بیٹے نے دودھ پی لیا۔

اگلے ہی روز فصیح نے اپنی بہن کو اور بہن کے خاوند کو ساتھ لیا اور بہن کے سُسرال جا پہنچا۔ سُسرال والے بہت خوش ہوئے کہ چلو یہ مسئلہ حل ہوا۔ فصیح فوراً واپس آنا چاہتا تھا لیکن ان لوگوں نے اسے رات وہیں رکھا اور اگلے روز آنے کی اجازت دی۔

فصیح نے مجھے سنایا کہ اس نے جب اپنے گھر میں بہن سے کہا تھا کہ وہ سسرال چلنے کی تیاری کرے تو بہن بہت ہی حیران اور پریشان ہوگئی تھی کہ اس کا اپنا بھائی اسے گھر سے دھکیل رہا تھا۔ اس بھائی پر تو اسے بہت ہی ناز تھا اور بھائی نے اس کی حوصلہ افزائی اس فیصلے سے کی تھی کہ وہ اسے طلاق دلوائے گا۔ بہن کے آنسو نکل آئے۔

"صرف ایک مہینے کی بات ہے میری بہن!" ــــ فصیح نے بہن کو تسلی دیتے ہوئے کہا ــــ "کسی کو یہ نہ بتانا کہ میں نے تمہیں یہ بات کہی ہے۔ تم ایک مہینہ اس خاوند کو برداشت کرو اور اس جہنم میں پڑی رہو۔ اللہ کرے گا تمہیں رہائی مل جائے گی"۔

بہن نے اس سے پوچھا کہ رہائی کس طرح ملے گی لیکن فصیح نے اسے اصل بات نہ بتائی۔ بہن کو بھائی پر اعتماد تھا اس لئے وہ ساتھ چل پڑی۔

"اب میں تمہیں اصل بات بتاتا ہوں" ــــ فصیح نے مجھے یہ واردات سناتے ہوئے کہا ــــ "میں نے اپنی بہن کے پگلے خاوند کو زہر تو دے دیا لیکن اس سے مجھے اطمینان نہ ہُوا نہ یہ خوشی ہوئی کہ اس آدمی سے جان چھوٹ جائے گی بلکہ ہُوا یہ کہ جب میں وہاں سے واپس اپنے گاؤں کو چلا تو یوں دل گھبرا گیا جیسے کسی چیز نے میرے دل کو اپنی مٹھی میں لے کر دبا لیا ہو۔ مجھ جیسا دلیر اور نڈر آدمی گھبرانے لگا۔ دل اور دماغ میں ایک خوف بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے آپ کو بہت تسلیاں دیں کہ کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ میں نے اپنی بہن کے خاوند کو زہر دیا ہے نہ ہی اس نے فوراً مرجانا تھا۔ سنیاسی نے یقین دلایا

تھا کہ اس زہر کا کسی کو سراغ نہیں ملتا لیکن میرے دل پر خوف کی جو پکڑ آ گئی تھی وہ ڈھیلی نہیں ہو رہی تھی"۔

وہ تو جوانی کا وقت تھا جب فصیح احمد دور سمندر میں مجھے یہ داستان سنا رہا تھا۔ اس وقت نفسیات کی اور انسانی فطرت کی مجھے اور فصیح کو سُوجھ بُوجھ نہیں تھی۔ آج بڑھاپے کی اس عمر میں جب میں کتابوں کے سمندر میں غوطے لگاتا رہتا ہوں' معاشرے کا اور انسانوں کا تجزیہ کر سکتا ہوں.... فصیح نے کہا تھا کہ وہ دلیر اور نڈر تھا۔ انسانی نفسیات کچھ اور کہتی ہے۔ دلیر اور نڈر ہونا کچھ اور بات ہے لیکن کسی انسان کی جان لینا بالکل ہی مختلف عمل ہے جس کا فطری دلیری کے ساتھ ذرا سا بھی تعلق نہیں۔ ایک بزدل آدمی بھی قتل کر سکتا ہے لیکن قتل کے بعد اس کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ وہ دعائیں کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھی قتل کر دے۔ دلیر اور نڈر آدمی کا ردِعمل قتل کے بعد ایسا ہی ہوتا ہے۔ فصیح نے مجھے سنایا کہ روز بروز اس کی بے چینی بڑھتی گئی اور حالت یہاں تک پہنچی کہ رات گہری نیند سے وہ اس طرح جاگ اٹھتا جیسے کسی نے اس کو جگایا ہو۔ وہ اپنی یہ حالت کسی کو بتاتا نہیں تھا۔

چھ سات دن گزرے اس کی بہن کے سسرال سے اطلاع آئی کہ بہن کا خاوند بیمار ہو گیا ہے۔ فصیح' اس کا باپ اور اس کی ماں اسی وقت بیمار پُرسی کے لئے روانہ ہو گئے۔ وہاں جا کر دیکھا تو مریض کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور اسے متلی محسوس ہوتی تھی اور ہلکا ہلکا بخار بھی تھا۔ علاج گاؤں کا ایک ہندو حکیم کر رہا تھا جس کی وہاں بہت شہرت تھی۔

فصیح اپنے باپ اور ماں کے ساتھ اگلے روز واپس آیا.... تین چار دنوں بعد فصیح پھر گھر والوں کو یہ بتا کر کہ وہ بہن کے خاوند کو دیکھنے جا رہا ہے' چلا گیا۔ اسے بتایا گیا کہ حکیم نے یرقان کی تشخیص کی ہے۔ لڑکے کی حالت پہلے سے زیادہ خراب تھی۔ اس کی آنکھیں پیلی پڑ گئی تھیں اور جسم کا رنگ ہلدی جیسا ہو گیا تھا۔ ساری علامات یرقان کی تھیں اور علاج بھی یرقان کا ہو رہا تھا۔ فصیح کو اگر خوش نہیں تو مطمئن ہو جانا چاہئے تھا کہ اس زہر کے متعلق سنیاسی کی بات بالکل صحیح ثابت ہو رہی تھی۔ یرقان تو ایک عام مرض ہے جو نہ جانے کب سے انسانوں کو لاحق ہو رہا ہے لیکن فصیح کے اندر جو بے چینی تھی وہ پہلے سے زیادہ ہو گئی اور خوف کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ اس نے مجھے سنایا کہ وہ کچھ دیر مریض کے پاس بیٹھا اسے تسلیاں دیتا رہا۔ مریض بار بار فصیح کی طرف دیکھتا تھا اور

فصیح یوں ڈر جاتا تھا جیسے مریض اسے کہہ رہا ہو کہ مجھے تم نے بیمار کیا ہے اور تم میرے قاتل ہو۔

فصیح واپس اپنے گھر آ گیا۔ اس کا سکھ دوست اس کا رازدان تھا۔ ویسے بھی ان کا آپس میں بہت پیار تھا۔ فصیح نے اپنے اس دوست کو بتایا کہ اندر سے اس کے دل اور دماغ کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ اس سکھ دوست نے اسے بہت تسلیاں دیں اور یہ بھی کہا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہُوا تھا اور اس نے جو کچھ کیا ہے اپنی بہن کی نجات کے لئے کیا ہے اور یہ بالکل جائز ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ دھوکا دینے والوں کو ایسی ہی سزا ملنی چاہئے۔ فصیح کی کچھ تسلی ہوئی لیکن جب وہ اکیلا بیٹھا تو اس کی حالت پھر بگڑ گئی۔

پھر وہ دن آیا جب اس کی بہن کے سُسرال سے ایک آدمی یہ اطلاع لے کر آیا کہ اس کی بہن کا خاوند فوت ہو گیا ہے۔ فصیح کو یوں لگا جیسے اطلاع لانے والے اس آدمی نے اس کے دل میں خنجر اتار دیا ہو۔ وہ جوان آدمی تھا اس لئے اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا لیکن اس کی حالت کچھ زیادہ ہی غیر ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بہن کے سُسرال گاؤں پہنچا اور کفن دفن وغیرہ کے بعد واپس آ گیا۔ اس نے اپنی بہن کے چہرے پر اطمینان اور کچھ خوشی کے تاثرات دیکھے تھے۔ بہن کے ساتھ اسے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا' بہن کو اس نے ذرا دور سے دیکھا تھا۔ اس کی بہن کو رہائی مل گئی تھی لیکن اس نے ابھی عدت کے تین مہینے سسرال میں ہی گزارنے تھے۔

○

فصیح کی چھُٹی کا صرف ایک دن رہ گیا تھا۔ اس کا کام چھُٹی کے اندر اندر ہی ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے سامنے مقتول کو دفن ہوتے دیکھا تھا اور پھر رواج کے مطابق اس نے اپنے ہاتھوں اس کی قبر میں مٹی ڈالی تھی لیکن اس کے دل کی اور ذہن کی حالت بہتر نہ ہوئی۔ اس کا خوف ذرا سا بھی کم نہ ہُوا اور بے چینی بھی پہلے جیسی رہی۔ وہ اُسی رات کی گاڑی میں سوار ہُوا اور پھر اگلے دن اور اگلی رات کا سفر کر کے کوہاٹ پہنچ گیا۔ فاصلہ اتنا زیادہ تو نہ تھا لیکن لاہور بھی گاڑی بدلنی تھی اور راولپنڈی بھی۔

یہاں سے آگے فصیح نے مجھے جو بات سنائی وہ نفسیات کا علم سمجھنے والوں کے لئے تو قابل فہم ہے لیکن عام لوگوں کے لئے یہ حیران کن قصہ ہے۔ فصیح نے مجھے سنایا کہ اپنی بارک میں ایک رات وہ معمول کے مطابق گہری نیند سویا ہُوا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس نے صاف طور پر محسوس کیا کہ اسے کسی نے جگایا ہے۔ اس نے اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا' اسے کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ وہ بستر سے اٹھا اور بارک کے برآمدے میں چلا گیا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ اس کے دل پر جو خوف بیٹھا رہتا تھا وہ زیادہ ہو گیا اور دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ واپس آ کر لیٹا مگر نیند بہت دیر سے آئی۔

دو تین راتوں بعد پھر ایسے ہی ہُوا۔ وقت تقریباً" آدھی رات کا تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو کوئی شک نہیں تھا کہ اسے کسی نے جھنجھوڑا ہے۔ بارک تاریک تھی۔ اس تاریکی میں اسے اپنی بہن کا مقتول خاوند اپنی چارپائی کے پاس کھڑا نظر آیا اور وہ کچھ دیر فصیح کو دیکھتا رہا پھر اس کے ہونٹ ہلے اور فصیح کو یہ سرگوشی سنائی دی —— "میں تمہیں سونے نہیں دوں گا" —— اور مقتول تاریکی میں تحلیل ہو گیا۔ فصیح کی حالت ایسی بُری ہو گئی کہ اس کا سارا وجود کانپنے لگا اور پسینہ پھوٹ آیا حالانکہ موسم پسینے والا نہیں تھا۔ اسے شدید ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنے دائیں اور بائیں سوئے ہوئے ساتھیوں کو جگائے اور انہیں بتائے کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے لیکن معاملہ قتل کا تھا اس لئے اس نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی کہ ایسا نہ ہو کہ اس کے منہ سے راز کی بات نکل جائے۔

اُن دنوں قبائلی پٹھان انگریزوں کے خلاف خاصے سرگرم تھے۔ میں اپنی اس داستان کے کسی ابتدائی باب میں قبائلی پٹھانوں کے اس جہاد آزادی کی تفصیلات سنا چکا ہوں۔ کوہاٹ چھاؤنی میں جو یونٹیں رہتی تھیں' انہیں کبھی کبھی قبائلی علاقے میں بھیجا جاتا تھا۔ ایک روز فصیح کے توپ خانے کو بھی بنوں کی طرف جانے کا حکم ملا۔ ان کا توپ خانہ فوراً" روانہ ہو گیا۔ پٹھانوں کے خلاف ایک بڑا آپریشن شروع کیا گیا تھا جس میں توپ خانے کی بھی ضرورت تھی۔ میں چونکہ قبائلیوں کے جہاد کی تفصیلات سنا چکا ہوں اس لئے یہاں بات مختصر کروں گا۔ اصل بات تو فصیح کی ہے' میں اسی پر توجہ مرکوز رکھوں گا۔

ان دنوں قبائلی پٹھانوں کے خلاف زیادہ تر آپریشن وزیرستان کے علاقے میں ہوئے تھے۔ ایک بریگیڈ قبائلی علاقے میں پیشقدمی کر رہا تھا اور فصیح کا توپ خانہ کوَرنگ فائر دے رہا تھا۔ میں یہ بھی بتا دوں کہ یہ آپریشن بظاہر قبائلیوں کو کچلنے کے لئے اور دبائے رکھنے کے لئے کیا گیا تھا لیکن انگریزوں کا اصل مقصد فوجیوں کو لڑائی کی ٹریننگ دینا تھا۔ ان دنوں جنگِ عظیم لڑی جا رہی تھی اس لئے فوج کو ٹریننگ دے کر تیار رکھنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔

کوہاٹ کا یہ بریگیڈ قبائلی علاقے میں خیموں میں رہتا تھا۔ فصیح چونکہ حوالدار کلرک تھا اس لئے وہ فیلڈ میں نہیں جاتا تھا۔ ایک روز جب اس کا توپ خانہ آگے گیا تو وہ بھی ساتھ تھا اسے توپوں سے خاصا پیچھے رہنا تھا۔ ادھر گولہ باری شروع ہو گئی اور فصیح تماشا دیکھنے کے لئے ایک توپ کی طرف چل پڑا۔ اس کی بیٹری کی چار توپیں ایک دوسری سے ذرا دُور دُور لگی ہوئی تھیں۔ جس توپ کی طرف وہ جا رہا تھا اس کے راستے میں دو ٹیکریاں پہلو بہ پہلو کھڑی تھیں۔ فصیح کو ان ٹیکریوں میں سے گزرنا تھا۔ ان ٹیکریوں کے درمیان پہنچا تو اسے پیچھے سے آواز آئی —— "اوئے فصیح!" —— فصیح نے رُک کر پیچھے دیکھا۔ پیچھے کوئی بھی نہیں تھا۔ اسے کسی نے پکارا ضرور تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا واپس چل پڑا۔ اسے کوئی نظر نہ آیا۔ اس نے ٹیکریوں کے اوپر بھی دیکھا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ ٹیکریوں سے باہر آ کر دیکھا۔ اسے پکارنے والا نظر نہ آیا۔ اسے اپنی بیٹری کے کچھ جوان پیچھے بیٹھے نظر آئے۔ وہ اسی طرح بیٹھے ہوئے تھے جس طرح وہ انہیں بیٹھا چھوڑ گیا تھا۔

وہ قبائلی علاقہ تھا جس میں ٹیکریاں ہی ٹیکریاں تھیں اور سامنے بڑے اونچے پہاڑ تھے۔ فصیح ابھی دائیں بائیں' آگے پیچھے دیکھ ہی رہا تھا کہ اسے کس نے پکارا ہے کہ اسے ہلکی سی ہنسی کی آواز آئی۔ اس آواز کو اس نے پہچان لیا۔ اس طرح اس کی بہن کا خاوند ہنسا کرتا تھا۔ فصیح پر ایسا خوف طاری ہُوا کہ اس نے صاف طور پر دیکھا کہ وہ باہر سے نہیں تو اندر سے کانپ رہا ہے۔ اس نے اپنے دل کو بہلانے کی بہت کوشش کی اور اپنے آپ کو بہت یقین دلایا کہ اس کی بہن کا خاوند دفن ہو چکا ہے۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا اس نے یہ علاج سوچا کہ ان جوانوں میں جا بیٹھا جن میں وہ پہلے بیٹھا ہُوا تھا۔ وہ جوان دل بہلانے کے لئے گپ شپ لگا رہے تھے۔ ان کا کام گولہ باری کے بعد شروع ہوتا تھا۔

یہاں یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ کیسا میدانِ جنگ تھا جس میں بہت سے جوان فارغ بیٹھے تھے اور فصیح توپوں کی گولہ باری کا تماشہ دیکھنے کے لئے چل پڑا تھا۔ میں نے اس داستان کے شروع شروع میں بتایا ہے کہ قبائلی علاقے کا میدان جنگ ویسا نہیں تھا جیسا دو فوجوں کے درمیان جنگ کا میدان ہوتا تھا۔ پٹھانوں کے پاس توپ خانہ نہیں تھا نہ ان کے پاس لڑاکا بمبار طیارے تھے۔ ان کے پاس تو ہلکی پھلکی مشین گن بھی نہیں

تھی۔ قبائلی اکیلے اکیلے ایک دوسرے سے کہیں دُور چھپ کر فوجیوں پر فائرنگ کرتے تھے پھروہ جگہ بدل کر کسی اور جگہ جا بیٹھتے تھے۔ قبائلیوں کی طرف سے ایک گولی آتی تھی تو ادھر سے انگریز توپوں کے کئی گولے اور رائفلوں اور مشین گنوں کا بے شمار ایمونیشن پھونک ڈالتے تھے۔

فصیح کی اب حالت یہ تھی کہ جہاں کہیں وہ اکیلا ہوتا' مقتول اسے آواز دیتا یا اسے ایک آدھ سیکنڈ کے لئے اس کے سامنے آن کھڑا ہوتا اور پھر غائب ہو جاتا تھا۔ تیسری چوتھی رات اس کی آنکھ کھل جاتی اور اسے مقتول پائنتی کی طرف کھڑا نظر آتا اور پھر غائب ہو جاتا تھا۔ فصیح اپنی یہ ذہنی حالت کسی کو بتاتا نہیں تھا لیکن اس کے دوستوں کو شک ہو گیا تھا کہ فصیح کسی پریشانی میں مبتلا ہے۔ دوست اس سے پوچھتے تھے تو وہ اتنا ہی جواب دیتا تھا کہ اس کی نوجوان بہن بیوہ ہو گئی ہے۔ دوستوں نے اسے کئی بار کہا کہ وہ ابھی نوجوان ہے اس کی دوسری شادی ہو جائے گی۔ فصیح اس بات پر خاموش ہو جایا کرتا تھا لیکن اس کے دوست نہیں جانتے تھے کہ اس خاموشی میں اس نے کیسا طوفان چھپا رکھا ہے اور اس طوفان کا نہ جانے انجام کیا ہو گا۔

پندرہ سولہ دنوں بعد اس کا بریگیڈ واپس کوہاٹ چھاؤنی میں آ گیا۔ فصیح نے اکیلے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا لیکن تیسری چوتھی رات مقتول اسے جگا دیتا تھا اور وہ اسے اپنی چارپائی کی پائنتی کھڑا نظر آتا تھا۔ تقریباً" دو ہفتوں میں ایک رات اس کی دفتر میں ڈیوٹی ہوتی تھی۔ ڈیوٹی یہ تھی کہ اسے ٹیلیفون کے پاس سونا پڑتا تھا۔ اسے ڈیوٹی کلرک کہا کرتے تھے۔ ڈیوٹی کی رات تو مقتول لازما" آتا تھا۔ مقتول کو اس نے اپنے ڈیوٹی روم میں ٹہلتے ہوئے بھی دیکھا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ مقتول تو نظر نہ آتا لیکن اس کی مخصوص آواز سنائی دیا کرتی تھی۔

اس نے اس کا ایک علاج یہ کیا کہ جس رات اس کی ڈیوٹی ہوتی' وہ قرآن مجید اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ جونہی مقتول اسے جگاتا' وہ قرآن کھول کر تلاوت شروع کر دیتا تھا۔ اس نے نماز بھی باقاعدگی سے شروع کر دی تھی لیکن مقتول نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔

آخر اس نے تنگ آ کر اپنے ایک گہرے دوست کو بتایا۔ اسے اصل بات نہ بتائی' صرف یہ کہا کہ اسے ایک آدمی کی شکل نظر آتی ہے اور یہ آدمی اسے رات کو جگا دیتا ہے اور کچھ کہہ کر غائب ہو جاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ دن کے وقت بھی جب وہ اکیلا ہوتا ہے

تو اسے یہ شکل نظر آتی ہے جو کبھی تو خاموش رہتی اور اسے دیکھتی رہتی ہے اور ہنس کر غائب ہو جاتی ہے۔ دوست نے اسے بتایا کہ کوہاٹ کے مضافات میں کہیں ایک مزار ہے' وہ وہاں جا کر فاتحہ پڑھا کرے اور اپنی نجات کے لئے دعا بھی کیا کرے۔

فصیح ایک روز اکیلا ہی وہاں چلا گیا۔ وہ مزار دراصل چھوٹا سا ایک مقبرہ تھا جس کے باہر دو تین مجاور بیٹھے رہتے تھے۔ لوگ وہاں آتے تھے اور مقبرے کے اندر جا کر فاتحہ پڑھ کر چلے جاتے تھے۔ فصیح وہاں گیا اور اندر جا کر فاتحہ پڑھنے لگا تو اسے ہنسی کی آواز آئی۔ فصیح بدک کر پیچھے ہٹا۔ پھر اسے آواز آئی کہ وہ یہاں سے چلا جائے ورنہ اسے یہیں قتل کر دیا جائے گا۔ یہ آواز مقتول کی تھی جسے وہ پہچانتا تھا۔ وہ فاتحہ پڑھ کر وہاں سے اس حالت میں نکلا کہ اس کا سر چکرا رہا تھا اور اس کا دل خوف کی بڑی ظالم گرفت میں تھا۔



فصیح نے مجھے ایک ایک دن اور ایک ایک رات کی واردات سنائی تھی۔ گن بوٹ اپنی رفتار پر چلی جا رہی تھی' رات اندھیری تھی' آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا اور فصیح بول رہا تھا اور میں گم صم سن رہا تھا۔ وہ ہر بات تفصیل سے سناتا تھا۔ یقین کریں کہ میرے دل پر بھی خوف بیٹھنے لگا۔ میں اسے کوئی آسیب یا شرشرار سمجھنے لگا تھا۔ اگر میں یہ ساری تفصیلات سنانے لگوں تو سوسوا سو ورق اسی میں سیاہ ہو جائیں گے۔ یہ راز مجھ پر اس وقت کھلا تھا جب میں نے بڑھاپے کے آغاز میں کتابیں پڑھنی شروع کی تھیں۔

مجھے نفسیات اور عمرانیات (سوشیالوجی) میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اتفاق سے نفسیات کی ایک کتاب مل گئی۔ میں نے اس میں مختلف قاتلوں کے ردِ عمل پڑھے تھے۔ اس میں ایک قاتل کا ردِ عمل بالکل اسی جیسا تھا جیسا فصیح مجھے سنا رہا تھا۔ پھر میں نے بیس اکیس سال پہلے "حکایت" میں مدیر "حکایت" جناب عنایت اللہ کی لکھی ہوئی ایک سچی کہانی پڑھی تھی جس کا عنوان تھا "ضمیر کا انتقام" یہ حیدر آباد کے ایک قاتل کی بیان کی ہوئی آپ بیتی تھی جو اس نے مدیر "حکایت" کو کراچی جیل میں سنائی تھی۔ میں نے جب یہ کہانی پڑھی تھی تو مجھے فصیح بہت ہی یاد آیا تھا۔ چونکہ یہ نفسیاتی معاملہ ہوتا ہے اس لئے حیدر آباد والا قاتل بالکل فصیح احمد لگتا تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ انسان کا ضمیر کسی بھی جرم اور گناہ کو قبول نہیں کیا کرتا پھر بھی

کچھ لوگ جرم کو اپنا باقاعدہ پیشہ بنا لیتے ہیں اور گناہوں سے لذت حاصل کرتے رہتے ہیں۔ بعض انسانوں کے ضمیر اتنے مضبوط ہوتے ہیں یا شاید اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ ان کا ردِعمل بڑا ہی خوفناک ہوتا ہے۔ فصیح کا کیس کچھ ایسا ہی تھا۔

ایک اور بات یاد آتی ہے کہ فصیح نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے خاندان میں اگر زیادہ نہیں تو کچھ نہ کچھ تعلیم ضرور تھی اور ان میں شائستگی بھی تھی۔ مطلب یہ کہ فصیح بالکل دیہاتی اور اَن پڑھ خاندان کا فرد نہیں تھا۔ اس کی بہن نے بھی آٹھ جماعتیں پاس کرلی تھیں جو اس دَور میں لڑکیوں کے لئے بڑی تعلیم سمجھی جاتی تھی۔ اس بہن کے سُسرال والے خالصتاً" اَن پڑھ اور دیہاتی تھے اور وہ اپنے آپ کو دلیر اور عقلمند صرف اس لئے سمجھتے تھے کہ وہ بڑے درجے کے زمیندار تھے اور گھر میں پیسہ تھا..... میں واضح یہ کرنا چاہتا ہوں کہ فصیح کی فطرت میں اور اس کے خاندان میں دیہاتیوں والا خون خرابہ اور لڑائی مار کٹائی اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والا رویّہ نہیں تھا۔ یہی فصیح کی کمزوری بن گئی تھی اور وہ ایک آدمی کو قتل کر کے اتنا کمزور ہو گیا کہ اس خون کو ہضم نہ کر سکا۔ اس نے دینی کتابیں پڑھنی شروع کر دی تھیں اور کچھ اور کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ اس طرح اس نے خاصا علم حاصل کر لیا تھا لیکن مقتول کے آسیب سے وہ پیچھا نہ چھڑا سکا۔

پانچ چھ مہینے اس کیفیت میں گزر گئے اور فصیح خطرناک حد تک ذہنی مریض بن گیا۔ اس دوران خُدا نے اُسے ایک خوشی بھی دی۔ وہ یہ تھی کہ اس کی بیوہ بہن کی عدّت پوری ہوئی تو وہ اپنے گھر آ گئی اور ڈیڑھ دو مہینے بعد اس کی دوسری شادی ہو گئی۔ فصیح اس کی دوسری شادی پر گیا تھا لیکن اس نے مجھے سنایا کہ وہاں مقتول کے واہمے نے اس کا بہت بُرا حال کر دیا۔ وہ کھیتوں کی طرف گیا تو مقتول کو سامنے کھڑا پایا۔

ایک بار وہ قبرستان کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں ایک بزرگ کا مزار تھا۔ اس نے اس مزار پر فاتحہ پڑھنا تھی۔ فصل خاصے اونچے تھے۔ فصیح مینڈھ پر جا رہا تھا تو اچانک مقتول اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ فصیح کو ایسا غصہ آیا کہ اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں اور دانت پیستے ہوئے مقتول کی طرف اس طرح دوڑا جس طرح کوئی درندہ شکار پر جھپٹتا ہے۔ وہ اس لئے مقتول پر جھپٹا تھا کہ اس کی گردن دبوچ کر مار ڈالے گا لیکن وہ قریب پہنچا تو مقتول غائب ہو گیا اور فصیح کو اس کی ہنسی سنائی دی۔

فصیح پانچ دنوں کی چھٹی لے کر گیا تھا۔ اس کی بہن اپنی دوسری شادی پر بہت ہی

خوش تھی۔ گھر بھی بھلا اور لڑکا بھی اچھا مل گیا تھا۔ یہ ان کے دیکھے بھالے ہوئے لوگ تھے۔ فصیح نے مجھے سنایا کہ اپنی بہن کو اتنا خوش دیکھ کر اس کو خیال آتا تھا کہ اس بہن کو کیا خبر کہ اس کی خوشی کی خاطر اس کے بڑے بھائی نے کتنی بڑی قربانی دی ہے اور دیتا چلا جا رہا ہے۔ وہ بڑی بھیانک اذیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔

بہن نے اس سے پوچھا تھا کہ اس نے جب بہن کو سُسرال چلنے پر تیار کیا تھا تو یہ کیوں کہا تھا کہ صرف ایک مہینے کی بات ہے' برداشت کرو اور پھر تمہیں رہائی مل جائے گی..... فصیح نے اسے یہ جواب دیا کہ ایک بزرگ نے اسے کوئی روحانی حساب کتاب کر کے بتایا تھا کہ یہ لڑکا ایک مہینے کے اندر اندر مر جائے گا۔ بہن اس جواب سے مطمئن ہو گئی تھی اور بھائی نے ایک خوفناک راز اپنے دل میں چھپائے رکھا تھا۔

○

فصیح احمد پانچ دنوں کی چھٹی گذار کر واپس اپنے توپ خانہ یونٹ میں پہنچا تو اگلے ہی روز حکم مل گیا کہ یونٹ فوراً" کلکتہ پہنچے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کے توپ خانے کو برما محاذ پر بھیجا جا رہا تھا۔

یہاں میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو گول کر جاتا ہوں اور فصیح کو برما کے محاذ پر پہنچا دیتا ہوں۔ اس کی ذہنی حالت اب یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اس نے خودکشی کے متعلق سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی یونٹ کو برما کے محاذ پر پہنچنے کا حکم ملا تو وہ کچھ خوشی محسوس کرنے لگا کہ اب اسے خودکشی کی ضرورت نہیں پڑے گی محاذ پر ہی مارا جائے گا۔ وہ وقت برما کے محاذ کے عروج کا وقت تھا۔ سارے ہندوستان میں برما کے محاذ کے متعلق بڑی خوفناک خبریں پھیل رہی تھیں۔ یہی ایک بات سننے میں آتی تھی کہ برما میں ہندوستان کی فوج کے فوجی مکھیوں کی طرح مارے جا رہے ہیں۔ اس میں حقیقت اتنی تو نہیں تھی' یہ جاپانیوں کے ففتھ کالم کا کام تھا جس نے سارے ہندوستان میں جاپانیوں کی اور برما فرنٹ کی دہشت پھیلا دی تھی۔ فصیح ڈرنے کی بجائے خوش تھا کہ وہاں جاتے ہی وہ مارا جائے گا۔

اُس وقت اتحادیوں نے یعنی امریکہ اور برطانیہ نے مل کر برما پر جوابی حملہ شروع کر دیا تھا اور جاپان کی فوج بڑی ہی بے جگری سے لڑ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی جاپانی مورچوں کی طرف سے لاؤڈ سپیکروں سے اعلان ہو رہے تھے کہ ہندوستان کے فوجی انڈین نیشنل آرمی میں آ جائیں اور اپنے ملک کو انگریزوں سے آزاد کرائیں۔

توپ خانہ پوزیشن میں آچکا تھا اور مسلسل گولہ باری کر رہا تھا۔ ایک دن جاپانی لڑاکا بمبار طیارے اگلے مورچوں سے پیچھے گن پوزیشنوں پر آ گئے۔ توپ خانے کو تو دشمن سب سے پہلے تباہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کام کے لئے طیارے استعمال کئے جاتے ہیں جو پیچھے آ کر گن پوزیشنوں پر بم بھی گراتے ہیں اور مشین گنیں بھی فائر کرتے ہیں۔ جاپانی لڑاکا بمبار طیارے آئے تو انہوں نے گن پوزیشنوں پر قہر برسانا شروع کر دیا۔ پہلے جو طیارے آئے وہ بم گرا کر آگے نکل گئے۔ توپ خانے کے آدمی اِدھر اُدھر پناہ لینے کو دوڑے تو اور طیارے آ گئے جنہوں نے اس سارے علاقے پر مشین گن فائر کی اور آگے نکل گئے۔ وہ پھر آئے اور اسی طرح بم گرائے۔ دوسرے آنے والے طیاروں نے مشین گنیں فائر کیں۔ وہ تو جیسے گولیوں کا چھڑکاؤ کر رہے تھے۔

جب یہ ہوائی حملہ ختم ہوا تو جو لوگ زندہ تھے اور زخمی نہیں ہوئے تھے وہ اپنے ساتھیوں کو دیکھنے اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ انہیں زمین پر گرے ہوئے زخمی اور لاشوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کئی توپیں ایک پہلو پر یا بالکل اُلٹی پڑی تھیں۔ فصیح بال بال بچ گیا تھا۔ وہ بھی زخمیوں کو اٹھانے کے لئے آگے آیا تو اس کا دم گھٹنے لگا۔ زخمی کراہ رہے تھے اور پانی مانگتے تھے۔ اس نے ایسی لاشیں دیکھیں جن کے بازو یا ٹانگیں یا بازو بھی اور ٹانگیں بھی اُڑ گئی تھیں۔ کہیں جسم سے کٹا ہوا سر پڑا تھا اور کہیں صرف ایک بازو یا ایک ٹانگ پڑی ہوئی نظر آتی تھی۔ جاپانیوں نے ٹھکانے پر بمباری کی تھی۔ بعض زخمیوں کے پیٹ اور سینے کھُل گئے تھے اور صاف نظر آتا تھا کہ ان کے جسم کے اندر کیا ہے۔ ہر طرف خون ہی خون اور لاشیں ہی لاشیں!

فصیح ان سب کو جانتا تھا۔ وہ تو کوہاٹ سے یہاں تک ہنستے کھیلتے، گاتے اور تالیاں بجاتے آئے تھے لیکن اب ان میں سے کئی ایک کے وہ ہاتھ ہی کٹ کر نہ جانے کہاں جا پڑے تھے جن سے وہ تالیاں بجایا کرتے تھے۔ سروں کے بغیر تو لاشیں کئی ایک تھیں۔ فصیح نے اپنے ایک بڑے پیارے دوست کی لاش دیکھی۔ اس لاش کے ساتھ دایاں بازو تھا ہی نہیں بائیں طرف کی پسلیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ فصیح یوں محسوس کرنے لگا جیسے وہ قے کر دے گا اور صرف کھایا پیا ہی نہیں بلکہ اس کی انتڑیاں بھی منہ کے راستے باہر نکل آئیں گی۔

میڈیکل کور کے آدمی آ گئے وہ بھی فوجی تھے ان میں لیفٹیننٹ اور کیپٹن اور میجر ڈاکٹر

بھی تھے نرسنگ اردلی بھی تھے۔ بہت سے سٹریچر آ گئے تھے۔ وہ زخمیوں کو اٹھا اٹھا کر سٹریچر پر ڈالتے اور دوڑتے ہوئے لے جاتے تھے۔ فصیح وہاں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ چلتا پیچھے چلا گیا اور ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا سوچے اور کیا کرے۔

اس کے بعد یہ روزمرہ کا معمول بن گیا کہ جاپانی طیارے آتے اور تباہی مچاتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ فصیح اپنے بمبار طیارے بھی دیکھتا تھا جو اس سے زیادہ بمباری جاپانیوں کے اگلے اور پچھلے مورچوں پر کرتے تھے۔ فصیح کی توپ خانہ رجمنٹ آدھی سے بھی کم رہ گئی تھی۔ پندرہ بیس دنوں بعد اور توپیں آ گئیں اور نفری بھی آ گئی۔ رجمنٹ میں پھر جان پڑ گئی اور گولہ باری شروع ہو گئی۔

فصیح کی رجمنٹ کو آگے جانے کا حکم ملا اور نئی گن پوزیشنیں بتائی گئیں۔ فصیح نے ہر جگہ لاشیں دیکھیں جن میں پرانی لاشوں کی ہڈیوں کے ڈھانچے بھی تھے اور اس نے بکھری ہوئی ہڈیاں بھی دیکھیں۔ آپ کو سنانے والی بات یہ ہے کہ فصیح کی ذات میں ایک انقلاب آ گیا۔ محاذ پر بھی مقتول اسے نظر آتا تھا اور اس پر ہنستا تھا۔ فصیح کی اس ذہنی کیفیت میں ذرا سی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس نے دعا مانگی کہ خدا اسے موت دے دے۔ میدانِ جنگ میں موت ہی ایک چیز تھی جو بڑی جلدی مل جاتی تھی لیکن فصیح کو نہیں مل رہی تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی کٹی پھٹی لاشیں دیکھیں اور ان کے بکھرے ہوئے اعضاء دیکھے تو کئی دن اسے مقتول نظر نہ آیا۔ اس کی رجمنٹ جب نئی پوزیشنوں پر گئی اور اس نے راستے میں پرانی لاشوں کی ہڈیوں کے پنجر اور بکھری ہوئی ہڈیاں اور نئی لاشیں دیکھیں تو مقتول بالکل ہی غائب ہو گیا اور فصیح کو کچھ سکون سا محسوس ہونے لگا لیکن وہ صاف طور پر محسوس کر رہا تھا کہ وہ اب پہلے والا فصیح نہیں رہا اور اس کے اندر کوئی تغیر آ گیا ہے۔ اس تغیر کو وہ نہ سمجھ سکا۔

وہ لاؤڈ سپیکروں سے اعلان سنتا رہتا تھا جو جاپانیوں کے مورچوں کی طرف سے ہوتے تھے۔ فصیح نے ارادہ کر لیا کہ وہ آئی این اے میں چلا جائے گا۔ اس کے دل سے موت کی خواہش نکل گئی تھی۔ دو اڑھائی مہینے اسے مقتول نظر نہ آیا تو فصیح نے محسوس کیا کہ اس کے دل پر خوف کی جو گرفت رہتی تھی وہ خاصی کم ہو گئی ہے۔ اب وہ دل ہی دل میں زندہ رہنے کی دعائیں مانگتا تھا۔

میں بڑی اچھی طرح بیان کر چکا ہوں کہ برما کا جنگل کیسا تھا اور اس میں اونچی نیچی ٹیکریاں' چٹانیں اور پہاڑیاں زیادہ تھیں۔ آدمی ذرا ایک طرف ہو جاتا تھا تو پتہ نہیں چلتا تھا کہ کہاں غائب ہو گیا ہے ایک رات فصیح چپکے سے نکلا اور چلتے چلتے آگے ڈھلان آگئی جو دُور نیچے تک جاتی تھی۔ وہ درختوں کو پکڑ پکڑ کر نیچے ہی نیچے اترتا چلا گیا اور جب نیچے پہنچا تو ایک طرف کو چل پڑا۔ وہ ساری رات چلتا رہا اور اسے کچھ یاد نہ رہا نہ کچھ خیال رہا کہ وہ کتنی بار کس کس طرف مُڑا تھا اور یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ وہ آگے جانے کی بجائے کہیں پیچھے تو نہیں جا رہا!.....وہ چلتا ہی رہا اور صبح طلوع ہوئی۔ اس کے سر کے اوپر سے گولیاں گزرتی رہی تھیں۔ اس نے مجھے سنایا کہ وہ اپنے ہی لئے اجنبی ہو گیا تھا اور یوں محسوس کرتا تھا جیسے کوئی ایک طاقت ہے یا کوئی جن یا چڑیل ہے جو اسے آگے ہی آگے لے جا رہی تھی۔ وہ ٹیکریوں کے درمیان چلتے چلتے دائیں کو مڑا تو آگے اسے کھُلا راستہ مل گیا۔ وہ جگہ کشادہ تھی اس نے وہاں چند ایک جاپانیوں کو دیکھا۔

ایک جاپانی نے اسے اپنی طرف آتا دیکھ لیا اور اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا۔ وہ دس بارہ جاپانی فوجی تھے۔ انہوں نے فصیح کی طرف دیکھا۔ فصیح اپنی رائفل ساتھ لے گیا تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے رائفل اوپر کی اور بایاں ہاتھ اوپر اٹھا لیا۔ اس نے بلند آواز سے کہا — "انڈین نیشنل آرمی"۔

تین چار جاپانیوں نے رائفلیں کندھوں سے لگا کر نالیاں اس کی طرف کر دیں۔ اس نے اپنی رائفل اُن کی طرف پھینک دی اور بڑی تیزی سے چلتا اُن تک پہنچ گیا۔ جاپانی اسے پکڑ کر ایک آفیسر کے سامنے لے گئے۔ میری طرح فصیح بار بار یہی کہتا تھا' انڈین نیشنل آرمی۔ اسے پیچھے بھیج دیا گیا اور اس طرح فصیح انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو گیا۔

"میرے بھائی!" — فصیح نے مجھ سے کہا — "وہ دن اور آج کا دن' چوہدری کا بیٹا مجھے نظر نہیں آیا اور میں پہلے کی طرح کا انسان بن گیا ہوں۔ دل پر کوئی خوف نہیں اور ذہن میں کوئی شک نہیں"۔

گن بوٹ چلی جا رہی تھی' رات شاید ساری ہی گزر گئی تھی اور ہم دونوں ابھی تک عرشے پر بیٹھے تھے۔ ہم وہیں لیٹ گئے اور آنکھ اس وقت کھلی جب دھوپ چمک رہی تھی اور اس کی تپش ہمیں عجیب سا سکون دے رہی تھی۔

دریائے اراوتی کے پار جھونپڑوں کی بستی میں مجھے حوالدار فضل داد نے اپنی زندگی کا ایک واقعہ سنایا تھا۔ وہ میں پچھلے ایک باب میں تحریر کر آیا ہوں۔ وہ جب یہ واقعہ سنا رہا تھا تو میں یوں محسوس کرنے لگا تھا جیسے اپنے دیہاتی معاشرے میں واپس چلا گیا ہوں۔ میں برما کے اس جنگل سے اور جھونپڑوں کی اس بستی سے جیسے نکل ہی گیا تھا یا شاید میں اس ماحول کو بھول گیا اور تصوّروں میں کھو گیا تھا۔

اب فصیح احمد جاپانیوں کی گن بوٹ کے عرشے پر میرے پاس بیٹھا اپنی بہن کی شادی' بربادی اور نجات کی کہانی سنا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ میرے گاؤں کے ایک گھر کی کہانی ہو۔ دراصل یہ ہر گاؤں کی کہانی ہے۔ میں تو جیسے بھول ہی گیا تھا کہ وطن سے دو اڑھائی ہزار میل دُور سمندر کے سینے پر بہا جا رہا ہوں اور دنیا کے اس خطّے میں موت پاگلوں کی طرح ناچ رہی ہے اور قہقہے لگا رہی ہے۔ وہاں آسمان سے آگ برستی تھی اور زمین شعلے اگلتی تھی' رائفلوں اور مشین گنوں کی گولیوں نے جال تان رکھا تھا' سمندر میں ساحل کے ساتھ ساتھ ایک میل یا ڈیڑھ میل کی چوڑائی میں مقناطیسی بارودی سرنگیں بچھی ہوئی تھیں۔ کوئی بھی لمحہ زندگی کا آخری لمحہ ہو سکتا تھا۔ ہم آبنائے ملاکا میں داخل ہو گئے تھے۔ بائیں طرف ملایا اور دائیں طرف سماٹرا تھا۔ نقشے میں ملایا دائیں طرف اور سماٹرا بائیں طرف ہے۔ آبنائے ملاکا کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی اسی میل ہے اور ایک جگہ کم سے کم چوڑائی بیس میل ہے۔

فصیح احمد کے بولنے کے انداز میں ایسا تاثر تھا کہ سننے والے کو جیسے باندھ لیتا تھا۔ وہ بول رہا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے ایک فلم چل رہی تھی۔ میں اپنے دیہات کے

لوگوں کو متحرک اور روز مرّہ زندگی میں سرگرم دیکھ رہا تھا۔ فصیح احمد مجھے اس سمندر سے نکال لے گیا تھا اور اُس نے مجھے دنیا کے اس خِطّے میں پہنچا دیا جہاں پاگل بیٹے کو بیاہنے کے لئے جھوٹ اور فریب کاری کے جال بچھائے جاتے ہیں۔ کسی اچھی بھلی کنواری لڑکی کی زندگی برباد ہوتی ہے اور اس کے جذبات صبح و شام فریب کاری کی چکّی میں پستے ہیں ا پاگل بیٹے والوں کو اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ وہ اپنی ناک اونچی رکھنے کے لئے لوگوں کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ ان کا بیٹا ہوش و حواس میں ہے۔ یہ تو صرف وہ لڑکی جانتی ہے کہ یہ لڑکا نہ جسمانی طور پر اور نہ ذہنی طور پر شادی کے قابل تھا۔ داغدار اور نقص وا بیٹیوں کو ڈولی میں بٹھانے کے لئے اتنا زیادہ اور اتنا قیمتی جہیز دیا جاتا ہے کہ دیکھنے وا حیرت سے چکرا جاتے ہیں اور لڑکے والے صرف جہیز کے لالچ میں اپنے بیٹے کو رسوائی اور جذباتی تباہی میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ سارا پیسہ حرام کا ہوتا ہے یا جائیداد بیچ کر یا قرض لے کر جہیز بنائے جاتے ہیں۔

فصیح احمد کی زبان کا جادو مجھے واپس اُس دنیا میں لے گیا تھا جہاں لوگ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لئے دھونس، دھاندلی اور شو بازی سے کام لیتے ہیں.... جہاں دیانتداری نہیں ظاہرداری ہے، جہاں قانون نیلام ہوتا ہے، جو زیادہ بولی دے آبرو باختہ عورت کی طرح قانون اُسی کا ہو جاتا ہے، جہاں مسجد کا امام خُدائی احکام کا رسمی طور پر اور گاؤں کے چوہدری کے حکم کا دلی طور پر پابند ہوتا ہے اور جہاں شرابی اور زانی پیروں نے لوگوں کی قسمت اپنے ہاتھوں میں لے رکھی ہے اور جہاں بھینس اُسی کی ہوتی ہے جس کے ہاتھ دولت کی یا چوہدراہٹ کی یا غنڈہ گردی کی لاٹھی آجاتی ہے اور جہاں اونچی ذات والے چھوٹی ذات والوں کو اپنی رعایا سمجھتے ہیں اور ان کے دلوں میں اللہ کی ذات کا ذرہ بھی خوف یا احترام نہیں ہوتا۔

میں بھی اسی لاٹھی کے ڈر سے گھر سے بھاگا اور فوج میں پناہ لی تھی۔ فصیح احمد کو میدانِ جنگ کی خونریزی، لاشوں اور ہولناکی نے ذہن کے جہنم سے نکالا تھا۔ اُس نے اپنی بہن کو سسرال کے تنور سے نکالنے کے لئے بہت بڑی قربانی دی تھی۔ اُس نے ایک ما کا اکلوتا اور نوجوان بیٹا زہر سے قتل کر دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اُس نے اپنے ضمیر کا بھی خون کر دیا تھا۔ وہ تو معزّز خاندان کا فرد تھا۔

ہم دونوں مفرور تھے۔ انگریزوں کی فوج کے ہی مفرور نہیں بلکہ اپنے غلط کار او

فریب کار اور فریب خوردہ دیہاتی معاشرے کے بھی مفرور!

فصیح نے بات ختم کی تو میرا ذہن نہایت آہستہ آہستہ واپس گن بوٹ کے عرشے پر آیا۔ ہر طرف سمندر تھا۔ پچھلے پہر کا چاند سمندر سے ابھر کر اوپر آگیا تھا۔ چاندنی نے سمندر پر چاندی بکھیر دی تھی اور گن بوٹ سمندر کی چمکتی ہوئی ہلکی ہلکی لہروں کو چیرتی جا رہی تھی۔

آج سوچتا ہوں، زندگی نے کیا کیا رنگ دکھائے ہیں.... مگر اپنی قوم کے اور اپنے ملک کے جو رنگ دیکھ رہا ہوں، یہ دل پہ کبھی کبھی ہول طاری کر دیتے ہیں۔ شاید بوڑھا ہو گیا ہوں اور برداشت کی قوت نہیں رہی۔ کبھی تو دل زیادہ ہی گھبرا جاتا ہے اور پریشان ہو جاتا ہے اور ایسے میں مجھے وہ سمندر یاد آتا ہے اور جی میں آتی ہے کہ ایک بار پھر وہیں چلا جاؤں، سمندر میں میری کشتی تیرتی چلی جائے، چلی جائے اور مجھے وہاں تک پہنچا دے جہاں رات کے پچھلے پہر کا چاند سمندر سے اُبھرتا ہے۔

آج پھر فرار ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔

اپنے اس سفرنامے سے ہٹ کر ایک بات کہنا چاہتا ہوں.... اسی باب میں بتاؤں گا کہ میں نے جاپانیوں کے جنگی قیدی دیکھے تھے جو انگریز تھے۔ ان کی حالت دیکھی تھی بہت بُری تھی۔ مشقت زیادہ اور خوراک بہت ہی کم۔ کوئی مرتا ہے تو مر جائے.... آج اپنی قوم کو دیکھتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے کسی غیر قوم نے میرے ملک کو فتح کر لیا ہو اور میری قوم کو عوام بنا کر ان عوام کو جنگی قیدی بنا لیا ہو.... مشقت زیادہ، خوراک بہت کم.... آج کا دن زندہ رہے تو کل کا کچھ پتہ نہیں!

اگلے روز ہماری گن بوٹ ایک بندرگاہ پر رکی۔ اُس میں تیل ڈالا گیا اور گن بوٹ والوں نے بہت سا راشن بندرگاہ سے لے کر گن بوٹ میں رکھ لیا اور اڑھائی تین گھنٹوں بعد بوٹ پھر چل پڑی۔

○

تین روز گزر گئے۔ دوپہر کے وقت گن بوٹ ایک بڑی بندرگاہ میں داخل ہوئی اور اندر جا کر ایک برتھ کے ساتھ رُک گئی۔ ہمیں اُترنے کو کہا گیا۔

یہ ملاکا شہر کی بندرگاہ تھی۔ وہاں جاپانیوں کے بحری جنگی جہاز اِدھر اُدھر لنگرانداز تھے۔ میں نے تین چار گن بوٹیں بھی دیکھیں۔ ہر طرف جاپانی ہی جاپانی نظر آتے تھے۔

یہ ملایا کی ایک بڑی بندرگاہ تھی۔

ہمارے ساتھ جو جاپانی افسر تھا' وہ ہمیں اپنے ساتھ لے گیا اور ایک جگہ ٹھہرنے کو کہا۔ وہ خود کسی دفتر میں گیا اور کچھ ہی دیر بعد جاپانی نیوی کی ایک فوجی گاڑی آ گئی۔ ہمارا جاپانی افسر بھی آیا اور ہم سب اس فوجی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ فصیح نے مجھے بتایا کہ ہم کوالالمپور جا رہے ہیں۔

کوالالمپور اُس وقت بھی ملایا کا دارالحکومت تھا اور آج بھی یہی شہر دارالحکومت ہے۔ اب یہ ملایا نہیں بلکہ ملائشیا ہے اور یہ ایک مسلمان ملک ہے۔ ملائشیا میں ہندو بھی آباد ہیں۔ بُدھ مت کے پیروکار بھی اور وہاں چینی باشندوں کی آبادی بھی خاصی زیادہ ہے۔

ملاکا سے کوالالمپور پچھتر میل دُور ہے۔ ہم نے یہ فاصلہ اس فوجی گاڑی میں طے کیا تھا۔ اس اتنے بڑے شہر میں ہم نے جنگ کے یہ آثار دیکھے کہ کئی عمارتیں بمباری سے تباہ ہو گئی تھیں اور بعض مکانوں کی دیواروں پر گولیوں کے نشان صاف نظر آتے تھے لیکن جب ہم اس شہر میں پہنچے وہاں کوئی جنگ نہیں لڑی جا رہی تھی۔ نہ کہیں سے گولی کی آواز آتی تھی نہ اوپر لڑاکا طیارے اُڑتے تھے' جاپانی فوجی تو نظر آتے تھے لیکن ان کے چہروں پر سکون اور اطمینان تھا۔ انہوں نے ملایا انگریزوں سے چھینا تھا۔ سڑکوں پر ہم نے سویلین لوگ گھومتے پھرتے بھی دیکھے۔

ہماری گاڑی شہر سے نکل گئی اور چند میل آگے جا کر گھنے جنگل میں داخل ہو گئی۔ یہ پکّی سڑک تھی اور اس کے ساتھ ریلوے لائن بھی جاتی تھی۔ اس جنگل میں زیادہ درخت ربڑ کے تھے اور اس کے بعد ناریل اور تاڑ کے درخت تھے۔ یہ ملک آج بھی ربڑ پیدا کرتا ہے اور یہ اس کی سب سے بڑی صنعت ہے۔ میں آپ کو کوئی اور ہی منظر دکھانا چاہتا ہوں۔ راستے میں ایک اور سڑک بنائی جا رہی تھی۔ خاکی وردی میں لپٹی ہوئی ایک سفید فام مخلوق تھی جو سڑک پر کام کر رہی تھی۔ وہاں کوئی سویلین مزدور نظر نہیں آتا تھا۔

یہ سفید فام زیادہ تر انگریز تھے اور ان میں آسٹریلیا کے فوجی بھی تھے۔ یہ سب جنگی قیدی تھے جن سے جاپانی فوج نے ہتھیار ڈلوائے تھے۔ ان میں مجھے کوئی ایک بھی سیاہ فام یعنی ہندوستانی فوجی نظر نہ آیا۔ میں آسٹریلیا والوں کو انگریز ہی کہوں گا۔ اگر فصیح نہ بتاتا کہ

ان میں آسٹریلیا کی فوج کے جنگی قیدی بھی ہیں تو میں سب کو انگلینڈ کے باشندے سمجھتا۔ یہ انگریز کہیں سے بڑے بڑے پتھر اٹھا کر لا رہے تھے اور دوسرے انگریز ان پتھروں کو ہتھوڑوں سے توڑ رہے تھے۔

ان انگریز جنگی قیدیوں کی وردیاں پھٹ گئی تھیں اور بہت ہی میلی تھیں۔ ان کے چہرے زیادہ مشقت اور کم خوراک کی وجہ سے سُوکھ گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں اور بازوؤں اور ٹانگوں کی ہڈیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ان میں اگر کوئی نقاہت کی وجہ سے تھک کر بیٹھ جاتا تو جاپانی فوجی جو ان سے مشقت کروا رہے تھے' اُس جنگی قیدی کو مارنا پیٹنا شروع کر دیتے تھے۔

ہماری گاڑی وہاں کچھ دیر کے لئے رُک گئی شاید اس لئے کہ ہمارے جاپانی افسر کو وہاں کوئی اپنا دوست مل گیا تھا اور وہ اس کے پاس جا بیٹھا تھا۔ میں ان جنگی قیدیوں کو دیکھنے لگا۔

ایک جنگی قیدی کو دیکھا۔ وہ کندھے پر کم و بیش پندرہ سیر وزنی پتھر اٹھا کر لا رہا تھا۔ ویسے ہی میری نظریں اُس پر جم گئیں۔ وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ اُس کے لئے قدم اٹھانا دشوار ہو رہا تھا۔ اُس نے چند قدم اور اٹھائے' رُکا اور مُنہ کے بَل گرا۔ پتھر اس کے سر کے قریب تھا۔ اس پتھر نے اُس کا چہرہ بائیں طرف سے لہولہان کر دیا۔ اُس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اُٹھ نہ سکا۔ دو قیدی دوڑ کر اُس تک پہنچے اور اُسے اٹھانے لگے۔

دو جاپانی فوجی دوڑے آئے اور ان دونوں قیدیوں کو رائفلوں کے بٹ مار مار کر پیچھے دھکیل دیا اور اُس گرے ہوئے قیدی کو ٹھڈے مارنے لگے۔ وہ تو پہلے ہی اٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ اُسے اتنی زور کے ٹھڈے پڑے تو وہ بالکل ہی لیٹ گیا۔

ایک جاپانی فوجی کچھ دور کھڑا دیکھ رہا تھا۔ وہ شاید افسر تھا۔ اس نے اپنی زبان میں ان دونوں سپاہیوں سے کچھ کہا۔ ان دونوں سپاہیوں نے اس زخمی انگریز کی ٹانگیں ٹخنوں سے پکڑیں اور پیٹھ کے بل گھسیٹتے ہوئے ذرا دور لے گئے۔ ان میں سے ایک جاپانی نے رائفل کی نالی اس انگریز قیدی کے سر کے قریب کی اور ایک گولی فائر کر دی۔

جاپانی افسر نے اپنے قریب کام کرتے ہوئے چار پانچ قیدیوں کو ٹھڈے مار کر اُٹھایا اور مرے ہوئے قیدی کی طرف اشارہ کر کے انہیں اشارہ کیا کہ اُس تک پہنچیں۔ چار پانچ انگریز قیدی دوڑے گئے اور اپنے مرے ہوئے ساتھی کو اٹھا کر ایک طرف چلے گئے۔

"گڑھا کھود کر اس میں دفن کر آئیں گے" ـــــ مجھے فصیح احمد کی آواز سنائی دی
میرے قریب کھڑا کہہ رہا تھا ـــــ "ان قیدیوں کے ساتھ جاپانی بہت ہی بُرا سلوک کر
ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی بیمار ہو جائے یا اس طرح زخمی ہو جائے یا کمزوری کی وجہ
کام کرنے کے قابل نہ رہے تو اسے اسی طرح گولی مار دیتے ہیں اور اس کے ساتھ
سے کہتے ہیں کہ اسے کہیں گڑھا کھود کر دفن کر دو"۔

یہ تھی وہ قوم جو ہندوستان پر حکومت کر رہی تھی بلکہ اس قوم نے پور
ہندوستان کو غلام بنا رکھا تھا اور یہ قوم ہندوستانیوں سے نفرت کرتی تھی۔

اس قوم نے چالبازیوں اور فریب کاریوں سے ہندوستان پر قبضہ کیا تھا۔ پھر اس
نے غریب اور کمزور ملکوں پر فوج کشی کی' قتل و غارت کی اور ان ملکوں پر قبضہ کرتی
گئی۔ انگریزوں نے آدھی سے زیادہ دنیا پر قبضہ کیا اور اپنی بادشاہی پھیلا دی۔ ان
متعلق یہ جو مشہور تھا کہ انگریزوں کی بادشاہی میں کبھی سورج غروب نہیں ہُوا' غلط
تھا۔ ہندوستان میں تو لوگ انگریزوں کو آسمان سے اُتری ہوئی مخلوق سمجھا کرتے تھ
اُن کا عقیدہ بن گیا تھا کہ حکومت تو صرف انگریز کا حق ہے۔

ہندوستان میں انگریزوں نے جس مکّاری اور عیّاری سے اپنی بادشاہی کے
مضبوط کئے' ان میں ایک یہ حربہ تھا کہ ان انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے خوشا
اور غدار پیدا کئے۔ مسلمانوں میں بھی انہیں ایمان فروش مل گئے۔ انگریزوں نے ا
انعام و اکرام سے نوازا اور انہیں اتنی بڑی بڑی جاگیریں دیں جو یہ لوگ کبھی خواب
نہیں دیکھ سکتے تھے۔

سلطان ٹیپو شہید کو ان انگریزوں نے مسلمان غداروں سے شکست دلوائی اور
ہندوستان پر قبضہ کیا۔

سیّد احمد شہیدؒ کو ان انگریزوں نے مسلمان غدّاروں سے شکست دلوائی اور ا
شہید کروایا۔

1857ء کی جنگِ آزادی میں انگریزوں نے مسلمان غدّاروں سے دِلّی کے دروا
کھلوائے اور دِلّی پر قبضہ کیا اور پھر ان غدّاروں کے ذریعے انہوں نے بہادر شاہ ظ
گرفتار کیا اور مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ ہندوستان میں تو انگریزوں نے غدا
ایمان فروش پیدا کر لئے تھے اور پھر ہندوؤں کو ساتھ ملا کر مسلمانوں کو معاشی اور معا

لحاظ سے پستیوں میں پھینک دیا اور پھر مسلمانوں نے ذات پات کے امتیاز کو مزید پختہ کر
کے ہماری قوم کو دو حصوں میں کاٹ دیا۔ ایک اونچی ذاتیں اور دوسرے پنچ ذاتیں۔ انہیں
جتنے بھی غدار ملے وہ اونچی ذاتوں میں سے ملے۔ انگریزوں نے جاگیریں اور نہری مربعے
ان ہی اونچی ذاتوں والوں کو دیئے اور انہی لوگوں کے بل بوتے پر انگریز ہندوستان کے
بادشاہ بنے رہے لیکن ملایا میں ان کی صورت خاصی مختلف تھی۔

انگریزوں نے ملایا پر 1867ء میں قبضہ کیا تھا اور وہاں اپنی بادشاہی اسی طرح قائم کر
دی تھی جس طرح ہندوستان میں کی تھی۔ جنگِ عظیم شروع ہونے سے بہت پہلے
جاپانیوں نے ملایا میں اپنے جاسوس اور ایجنٹ پیدا کر لئے تھے۔ جونہی جاپانی فوج حملہ آور
ہوئی' برما کی طرح ملایا کے لوگوں نے بھی جاپانی فوج کا استقبال کیا۔ میں نے بہت بعد میں
ایک انگریز کی ہی لکھی ہوئی کتاب میں پڑھا تھا کہ ملایا میں انگریزوں کے جو اپنے جاسوس
تھے' ان میں بیشتر جاپانیوں کے لئے کام کر رہے تھے اور وہ جاپانیوں کے خلاف انگریزوں کو
بالکل غلط اطلاعیں دیتے تھے۔

ملایا کے لوگوں کا یہ رویّہ اور رجحان بھی قابلِ غور ہے کہ وہ فوج میں بھرتی ہوتے ہی
نہیں تھے اور انگریزوں نے یہ بات بنالی کہ ملایا کے لوگ چونکہ جنگجو نہیں اس لئے یہ
فوج کے قابل ہی نہیں۔ ملایا میں جاپانیوں کے حملے کے وقت جو فوج تھی' اس میں انگریز
رجمنٹیں تھیں' آسٹریلیا کے متعدّد بریگیڈ تھے اور باقی تمام فوج انڈین آرمی تھی۔ جنگ
کے وقت ہندوستان کے ان مہاراجوں نے بھی اپنی فوج ملایا بھیج دی تھی جنہوں نے اپنی
اپنی فوجیں بنا رکھی تھیں۔ ان میں گورکھا رجمنٹیں بھی تھیں اور کشمیر کی ڈوگرہ رجمنٹیں
بھی۔

ہندوستان میں انگریزی راج اور اس راج کی مسلم دشمنی کے متعلق میں ادھوری
ادھوری بات کر رہا ہوں۔ اگر میں تفصیل سے لکھنے لگوں تو بڑی موٹی کتاب لکھ ڈالوں۔
اس موضوع پر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ میں صرف ایک حوالہ دوں گا' وہ یہ کہ لارڈ ماؤنٹ
بیٹن ہندوستان کا آخری وائسرائے تھا اور اس کے ہاتھوں ہندوستان تقسیم ہُوا اور پاکستان
معرضِ وجود میں آیا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہماری آزادی کے چند سال بعد ایک کتاب
لکھی تھی جس میں اس نے ہندوستان کی تقسیم کے متعلق لکھا کہ اسے معلوم نہیں تھا
کہ قائدِاعظم ٹی بی کے مریض ہیں۔ میں اس سلسلے میں ایک اور کتاب کا حوالہ دوں گا جو

پاکستان میں چھپی تھی۔ یہ کتاب ڈاکٹر الٰہی بخش مرحوم نے جو قائدِاعظم کے آخری ڈاکٹر کے معالج تھے' نے لکھی تھی۔ انہوں نے انکشاف کیا ہے کہ ایک پارسی ڈاکٹر نے ڈیڑھ دو سال پہلے قائدِاعظم کا ڈاکٹری معائینہ کیا اور ایکسرے وغیرہ بھی لئے اور اس نے قائدِاعظم کو بتایا کہ وہ ٹی بی کے مریض ہیں۔ قائدِاعظم نے اسے بڑی سختی سے کہا کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ میں ٹی بی کا مریض ہوں۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ قائدِاعظم تحریک پاکستان میں ٹی بی کے مریض کی حیثیت سے سرگرم رہے اور مسلمانوں کو پاکستان دلا دیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی کتاب میں لکھا کہ مجھے معلوم ہو جاتا کہ محمد علی جناح ٹی بی کا مریض ہے تو میں دو سال اور ہندوستان تقسیم نہ ہونے دیتا۔ اتنے میں محمد علی جناح ٹی بی کی وجہ سے اس دنیا سے اٹھ جاتا اور پھر کبھی بھی ہندوستان تقسیم نہ ہوتا اور اس دنیا میں پاکستان کا نام و نشان نہ ہوتا۔ ماؤنٹ بیٹن کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو کبھی بھی آزادی نہ ملتی اور مسلمان انگریزوں کے بعد ہندو کے غلام ہوتے۔

انگریزوں اور ہندوؤں کی سازش بھی یہی تھی۔ پھر یہ دونوں قومیں کامیاب کیوں نہ ہو سکیں؟.... اس سوال کا جواب تاریخ پاکستان کا ہی نہیں بلکہ تاریخ اسلام کا ایک درخشاں باب ہے۔ یہ پاکستانی علاقوں کے مسلمانوں کا ہی نہیں بلکہ تمام تر ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک معجزہ نما کارنامہ ہے۔ ہندی مسلمانوں نے یہ کارنامہ تو کر دکھایا لیکن انگریزوں نے پھر بھی اپنی منافقت کا مظاہرہ کر دیا۔ فیروز پور اور گورداسپور کے علاقے جو مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے تھے' ہندوستان میں شامل کر دیئے۔ اُدھر کشمیر کے مہاراجہ کی پشت پناہی کی کہ وہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کر لے اور ہندوستان اپنی فوج کشمیر میں داخل کر دے گا۔ یہ ایسی تقسیم تھی کہ ہندوستان اور پاکستان آج تک برسرِپیکار ہیں اور سرحدی امن کبھی بھی قائم نہیں ہو سکا۔

○

معافی چاہتا ہوں' بات کہیں اور کی کر رہا تھا اور کہیں اور جا نکلا۔ انگریزوں کو جاپانیوں کی قید میں دیکھ کر اور پھر انہیں ذلت و رسوائی میں بھوکے پیاسے مشقت کرتے دیکھ کر یہ یاد آنا قدرتی امر تھا کہ یہی انگریز ہمیں جانوروں سے زیادہ اہمیت نہیں دیا کرتے تھے۔ ہم تو انڈین ہی تھے لیکن جب کوئی گورا کسی ہندوستانی کو انڈین کہہ کر پکارتا تھا تو اس میں

نفرت اور حقارت بھری ہوئی ہوتی تھی۔ میں کس طرح بھول سکتا ہوں کہ انگریزوں کے وقتوں میں لاہور جیسے بڑے ریلوے سٹیشنوں کے اندر فرسٹ کلاس کے مسافروں کے لئے ریستوران بنے ہوئے تھے۔ بعض انگریز اپنے پالتو کتے بھی ریستوران میں لے جاتے تھے۔ ان ریستورانوں کے باہر ایک بورڈ لگا ہوتا تھا جس پر لکھا تھا — "Dogs and Indians not Allowed" — (کتوں اور ہندوستانیوں کا داخلہ ممنوع ہے)۔ یہ ریستوران صرف انگریزوں کے لئے ریزرو ہو کر رہ گئے تھے حالانکہ فرسٹ کلاس میں ہندوستانی بھی سفر کیا کرتے تھے مگر انگریزوں کی نظر میں کتے اور ہندوستانی میں کوئی فرق نہیں تھا۔

میں نے پہلے کہا ہے کہ انگریزوں کی بادشاہی آدھے سے زیادہ کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی تھی۔ سمندروں پر بھی انہی کی حکمرانی تھی۔ یہ الفاظ ایک انگریز امیرالبحر (نیول کمانڈر) کے ہیں کہ دنیا پر وہی بادشاہی کرے گا جس کی بحری قوت بہت ہی زیادہ اور مضبوط ہو گی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ انگریزوں کی بحری قوت بڑی ہی مضبوط اور زیادہ تھی۔ آدھی سے کچھ زیادہ دنیا کی بادشاہی اور بحری طاقت نے انگریزوں کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ دنیا کی کوئی طاقت انہیں چیلنج نہیں کر سکتی تھی۔

میں چونکہ ملایا کی بات کر رہا ہوں اس لئے اب اسی پر توجہ مرکوز رکھوں گا۔ ملایا کے نیچے والے کنارے پر سنگاپور ایک بہت بڑا شہر اور بہت بڑی بندرگاہ ہے۔ انگریزوں نے سنگاپور کو دو نام دے رکھے تھے۔ ایک تھا "ناقابل تسخیر قلعہ" اور دوسرا نام تھا "مشرق بعید کا جبل الطارق"۔ جاپانیوں کا ہدف یہی سنگاپور اور یہی ملایا تھا۔

بحرالکاہل میں امریکہ سے خاصا دُور چھوٹا سا ایک جزیرہ ہے جس کا نام ہے پرل ہاربر۔ جنگِ عظیم جرمنی نے شروع کی تھی اور وہ مہینہ ستمبر 1939ء کا تھا۔ کسی نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ چھوٹا سا ملک جسے جاپان کہتے ہیں' جنگِ عظیم میں شریک ہو جائے گا۔ ایک روز اچانک جاپان جنگ میں شامل ہو گیا اور وہ جرمنی کا دوست بن کر اتحادیوں یعنی امریکہ برطانیہ وغیرہ کے خلاف میدان میں کودا۔ وہ دن 7 دسمبر 1941ء کا تھا جب جاپانی لڑاکا بمبار طیاروں نے پرل ہاربر پر حملہ کر دیا۔ پرل ہاربر جو ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے' اس لئے جاپانیوں کے لئے اہم تھا کہ اسے امریکہ نے اپنا جنگی بحری اڈہ (نیول بیس)

بنا رکھا تھا۔ امریکہ کی زیادہ تر بحری قوت اسی جزیرے میں تھی۔ جاپانیوں کے طیارہ بردار بحری جہاز بڑی خاموشی اور رازداری سے پرل ہاربر کے قریب آئے اور ان کے عرشوں سے لڑاکا بمبار طیارے اُڑے اور ایک ہی دن میں بلکہ چند گھنٹوں میں انہوں نے امریکہ کی بحری قوت کا صفایا کر دیا۔

وہاں سے جاپانیوں نے مشرقِ بعید کا رخ کیا۔ یہ وہ جزیرے ہیں جو آج کل انڈونیشیا اور ملائشیا کہلاتے ہیں۔ ان کے راستے میں فلپائن آتا تھا جو بہت ہی بڑا جزیرہ تھا۔ بحری جہازوں سے جاپانی فوج اتری اور دیکھتے ہی دیکھتے فلپائن پر قبضہ کر کے وہاں کی فوج سے ہتھیار ڈلوا لئے۔

مجھے یاد ہے کہ میں جب اپنی بٹالین میں ہی تھا تو خبر ملی تھی کہ جاپانیوں نے ملایا اور برما پر حملہ کر کے ان ملکوں کو قبضے میں لے لیا ہے۔ ہمارے انگریز کمپنی کمانڈر نے جاپانیوں کو جاپانی چوہے کہا تھا اور یہ بھی کہ جاپانی بہت کمزور قوم ہے اور اسے ہم تباہ و برباد کر دیں گے۔ پھر ہماری بٹالین کے تمام انگریز افسروں نے جاپانیوں کو جاپانی چوہے کہنا شروع کر دیا تھا۔

جنگ کے خاتمے کے پندرہ سال بعد' 1960ء میں' انگلینڈ میں ایک کتاب چھپی تھی — The Fall of Singapore — میں نے یہ کتاب بہت عرصے بعد پڑھی تھی۔ اس کتاب کا مصنف ایک انگریز ہی ہے۔ اس نے بڑی ہی دیانتداری اور بے باکی سے اپنی قوم کی ڈینگوں اور خوش فہمیوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ پتہ چلا کہ جب ملایا اور سنگاپور پر جاپانیوں کے قبضے کی خبر پہنچی تو برطانیہ کی پارلیمنٹ اور اخباری دنیا میں بھونچال آ گیا۔ ان کے لئے اپنی یہ شکست غیر متوقع تھی کیونکہ وہ اپنی حکومت کی طرف سے جاری ہونے والے بیان پڑھا اور سنا کرتے تھے جن میں سنگاپور کو ناقابلِ تسخیر قلعہ اور مشرقِ بعید کا جبل الطارق کہا جاتا تھا اور یہ بھی کہ ملایا کا دفاع اتنا مضبوط ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کے ساحل کے اندر نہیں آ سکتی۔ اخباری دنیا نے اپنی حکومت سے مطالبہ کیا کہ اس شکست کی انکوائری کی جائے اور اس کے جو ذمہ دار ہیں انہیں سزا دی جائے۔

اُس وقت برطانیہ کا وزیرِ اعظم دنیا کا مشہور و معروف مدبر سیاستدان چرچل تھا۔ وہ جنگی امور میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ انکوائری کرائے گا لیکن جنگ کے بعد اس نے کہا تھا کہ وہ انکوائری تو ضرور کراتا لیکن جن انگریز فوجیوں نے ملایا

اور سنگاپور میں جانیں قربان کی ہیں' یہ اُن کی روحوں کی توہین ہوگی۔

جاپانیوں نے جس طرح سنگاپور اور ملایا پر فوج کشی کر کے قبضہ کیا تھا' اگر میں یہ تفصیل سے سنانے لگوں تو بات بہت ہی لمبی ہو جائے گی اور شاید قارئین اس میں بوریت بھی محسوس کریں۔ میں وہی بات کہوں گا جو پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ وہ یہ کہ انگریز اس خوش فہمی بلکہ اس غرور اور تکبر میں مبتلا تھے کہ جس طرح انہوں نے ہندوستان کے لوگوں کو اور دوسرے چھوٹے چھوٹے ملکوں کے لوگوں کو دبا کر اور ان کے گلے گھونٹ کر رکھا ہوا ہے اور جس طرح ان میں سے انہوں نے خوشامدی اور ایمان فروش پیدا کر لئے ہیں ایسے ہی ملایا کے لوگ بھی انہیں دنیا کی بہت بڑی طاقت سمجھتے ہیں اور ان سے ڈرتے ہیں لیکن وہاں معاملہ کچھ اور تھا۔ ملایا میں انگریزوں کو وہ پذیرائی حاصل نہیں تھی جو ہندوستان وغیرہ میں تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہاں کے لوگ انگریزوں کے خلاف کوئی بات زبان سے نہیں نکالتے تھے۔ ان میں جاپانیوں کے جاسوس' ایجنٹ اور حمایتی تھے جو اس قدر خفیہ اور پوشیدہ تھے کہ کسی کو شک تک نہ ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ جاپانیوں نے جب ملایا پر قبضہ کیا تو وہاں کی پبلک کے ساتھ انہوں نے اچھا سلوک کیا۔ اچھے سلوک کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے شہریوں کا قتلِ عام اور ان کے گھروں میں لوٹ مار نہ کی بلکہ ان کے جان و مال کی حفاظت کی۔ البتہ انہوں نے وہاں جو بھی خوبصورت لڑکی دیکھی اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ یہ جاپانی اپنا جائز حق سمجھتے تھے۔

اس کے برعکس ہانگ کانگ میں جاپانیوں کا رویہ بہت ہی ظالمانہ تھا۔ ملایا سے پہلے جاپانیوں نے ہانگ کانگ پر حملہ کیا اور وہاں قبضہ کر لیا تھا۔ وہاں سے بھی انگریز کی فوج بھاگی تھی اور باقی نے ہتھیار ڈال دیئے تھے لیکن شہریوں نے انگریزوں کی فوج کی مدد کی تھی اور جاپانیوں کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ جاپانیوں نے وہاں کی پبلک کے ساتھ بہت ہی برا سلوک کیا۔ قتل و غارت بھی کی' لوٹ مار بھی کی اور وسیع پیمانے پر عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کی آبروریزی کی تھی۔ ملایا میں ان کا سلوک اور برتاؤ خاصا بہتر رہا جس کا اعتراف خود انگریزوں نے کیا تھا۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ انگریزوں نے ملایا میں دنیا بھر کی فوج اکٹھی کر رکھی تھی جس میں ان کی اپنی گورا رجمنٹیں تھیں' آسٹریلیا کے بریگیڈ تھے اور انڈین آرمی کی بے شمار یونٹیں' توپ خانے اور ریاستی فوجیں بھی تھیں اور گورکھا رجمنٹیں بھی تھیں۔ میں

گورکھا رجمنٹوں کا ذکر الگ اس لئے کر رہا ہوں کہ گورکھے سے بڑھ کر کوئی سپاہی وفادا نہیں ہو سکتا۔ گورکھے اپنی جانیں قربان کر دیتے تھے پسپا نہیں ہوتے تھے اور ان کو دھو بھی نہیں دیتے تھے جن سے انہیں تنخواہ اور راشن پانی ملتا تھا۔

○

ملایا میں صورتِ حال یہ بن گئی تھی کہ جاپانی فوج جدھر بھی حملہ کرتی تھی وہاں انگریزوں کی فوج تھوڑے سے مقابلے کے بعد پیچھے ہٹ جاتی تھی۔ انگریزوں کو اپ فرعونیت پر اس قدر بھروسہ تھا کہ انہوں نے وہاں ایئر فورس بھی بہت تھوڑی رکھی ہو تھی اور بحری جنگی جہاز بھی تھوڑے تھے۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ جاپانیوں کی تعدا بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ جاپان چھوٹا سا ایک جزیرہ ہے جہاں سے اسے اتنی زیادہ فو نہیں مل سکتی تھی۔ اس کے مقابلے میں انگریزوں کے پاس اُن دوسرے ملکوں کی فوجیں بھی تھیں جن میں ان کی بادشاہی تھی لیکن اس فوج کے پاؤں کہیں بھی جم نہیں رہے تھے۔

انگریزوں کی فوج کا کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل Percival تھا۔ وہ اپنے سپریم کمانڈر کو ... مشرقِ بعید کی افواج کا سپریم کمانڈر تھا' اپنی پسپائی کی اور جاپانیوں کی پیشقدمی کی اطلاعیں دے رہا تھا۔ سپریم کمانڈر اُس کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا اور غالباً" یہ خبریں برطانیہ بھی پہنچ رہی تھیں لیکن انگریزوں کی پسپائی بتا رہی تھی کہ ملایا کچھ دنوں کا مہمان ہے۔ جاپانیوں نے ملایا پر 9 اور 10 دسمبر کی درمیانی رات حملہ کیا تھا۔

اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ انگریزوں کی بحری طاقت کا جواب نہیں تھا۔ اس بحری طاقت میں دو ایسے بحری جنگی جہاز تھے جن پر انگریزوں کو اور خصوصاً" ان کے وزیرِاعظم چرچل کو بہت ہی ناز تھا۔ ان میں ایک تھا —— Prince of Wales اور دوسرا تھا Repulse۔ چرچل کہا کرتا تھا کہ یہ دو بحری جہاز سمندر پر تیرتے ہوئے دو قلعے ہیں جو ناقابلِ تسخیر ہیں۔

چرچل کو جب ملایا کے سقوط کی اطلاعیں مل رہی تھیں تو اُس نے اپنے سرکاری گھر نمبر 10 ڈاؤننگ سٹریٹ میں اپنی کابینہ کا اجلاس بلایا اور انہیں آگاہ کیا کہ ملایا میں صورتِ حال اتنی مخدوش ہے کہ اب کسی بھی وقت ملایا کے سقوط کی اطلاع آ سکتی ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اب ہمارے ہاتھ میں جو بحری طاقت رہ گئی ہے' وہ دو بحری جہاز پرنس آف

ویلز اور ری پلس ہیں۔ چرچل نے یہ الفاظ بھی کہے کہ ہمیں فخر ہے کہ یہ دو بحری جہاز ہم انگریزی بولنے والی قوموں (امریکہ اور برطانیہ) کو بحرالکاہل میں فتح دلائیں گے۔ امریکہ کا مغربی ساحل اور آسٹریلیا کا شمالی ساحل اور ہماری مشرقِ بعید کی نو آبادیات محفوظ ہو جائیں گے.... چرچل کا مطلب یہ تھا کہ دنیا پر صرف انگریزی بولنے والی قومیں یعنی امریکہ اور برطانیہ حکومت کریں گی۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ دونوں بحری جہاز بہت ہی بڑی بحری طاقت تھے۔ ان جہازوں میں جو گنیں لگی ہوئی تھیں وہ راڈار سے کنٹرول ہوتی تھیں۔ ان دونوں بحری جہازوں کا کمانڈر ایک تھا جس کا نام ایڈمرل سر ٹام فلپس تھا۔ جرمنی نے جب برطانیہ پر حملہ کیا تھا تو اس ایڈمرل نے ان دونوں جہازوں سے جرمنی کی بحری طاقت کو روکے رکھا تھا۔

جرمنی کی نیوی کے خلاف کچھ عرصہ لڑ کر یہ دونوں بحری جہاز غائب ہو گئے تھے۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ جہاز کہاں چلے گئے ہیں۔ دراصل ان کی نقل و حرکت کو خفیہ رکھا گیا تھا اور اس وقت یہ دونوں جہاز ملایا کے مشرقی ساحل پر کوانٹین کی بندرگاہ میں تھے۔ ان دونوں کے کمانڈر ایڈمرل ٹام فلپس کو برطانیہ سے حکم پہنچا کہ فوراً" باہر نکلیں اور جاپانی یلغار کو روکیں۔ جنگی وقائع نگار لکھتے ہیں کہ چرچل نے پورے وثوق سے کہا تھا کہ اب جاپانی بحرالکاہل میں نہیں ٹھہر سکیں گے۔

دونوں بحری جہاز بندرگاہ سے نکلے اور کچھ دور جا کر اُنہوں نے یہ فارمیشن بنا لی کہ ایک دوسرے سے دُور ہو گئے یعنی ایک دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف ہو گیا اور ان کا درمیانی فاصلہ دو تین میل تھا۔ اُس وقت جاپان کے جنگی بحری جہاز اس سمندر میں موجود تھے لیکن کوئی بھی ان کے قریب نہ آیا اور نہ کسی بحری جہاز نے ان پر ایک بھی گولہ فائر کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ جاپانیوں کے بحری جہاز اور دُور ہٹ گئے تھے۔

دونوں جہاز بندرگاہ سے تقریباً" ڈیڑھ سو میل دور نکل گئے تو ری پلس پر جاپانی بمباروں نے حملہ کر دیا۔ وہ 10 دسمبر 1991ء کا دن تھا۔ ریکارڈ کے مطابق اُس وقت دن کے سوا گیارہ بجے تھے جب پہلے جاپانی بمبار آسمان میں نظر آئے۔ ان کی بلندی دس ہزار فٹ تھی اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے۔ اس سے پہلے آسمان بالکل صاف تھا اور کوئی طیارہ نظر نہیں آتا تھا۔ کچھ دیر پہلے کچھ دُور ایک جاپانی لڑاکا طیارہ

نظر آیا تھا جو واپس ساحل کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ دراصل جاسوس طیّارہ تھا اور یہی د
آیا تھا کہ اس وقت انگریزوں کی قوت کہاں ہے۔

یہاں میں پھر کہوں گا کہ یہ ملایا تھا' ہندوستان نہیں تھا جہاں ان انگریزوں نے
پیدا کر کے سلطان ٹیپو کو شہید کیا اور غداروں نے قلعہ سرنگاپٹم کا ایک دروازہ کھول د
انگریزوں کی فوج اندر داخل ہو گئی تھی۔ ملایا کے لوگوں میں ان ہندوستانی غداروں
کوئی غدار نہیں تھا جنہوں نے 1857ء میں دِلّی کا ایک دروازہ کھول کر انگریزوں کی فو
راستہ دے دیا تھا۔ جاپانی ملایا میں اجنبی تھے۔ ان کی کامیابی کی وجہ صرف یہ تھی کہ ا
رہنمائی اور مدد کے لئے وہاں کے لوگ موجود تھے۔ وہ انگریزوں کی منافقت سے
آئے ہوئے تھے۔ انگریزوں کے اتنے بڑے دو بحری جہاز بندرگاہ سے نکلے تو جاپانیو
فوراً" اطلاع مل گئی۔ انہوں نے پہلے ایک ریکی طیّارہ بھیجا اور وہ طیّارہ واپس آیا ت
طیّاروں کا ایک غول بھیج دیا۔

"ری پلس" کی مشین گنوں اور توپوں نے ان بمبار طیاروں پر بے پناہ فائر کھو
لیکن یوں لگتا تھا جیسے جاپانیوں کو اس بے ہنگم فائر کی کچھ پرواہ نہیں۔ طیّارہ شکن تو
کے گولے اوپر جا کر پھٹ رہے تھے اور مشین گنوں نے فضا میں گولیوں کا جال تان
لیکن جاپانی بمبار طیّاروں نے بحری جہاز کے اوپر آ کر بم گرا دیئے۔ زیادہ تر بم ری
کے عرشے پر گرے اور جہاز کے کچھ اہم حصے تباہ کر دیئے۔ بحری جہاز کے گنوں
جاپانیوں کا ایک طیّارہ مار گرایا۔ بمباروں کا یہ غول آگے نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد جاپانی بمبار طیّاروں کا ایک اور غول آیا۔ اب ان بمبار
ہدف "پرنس آف ویلز" تھا۔ اس پر بھی ان طیّاروں نے بم گرائے جو اس کے عر
گرے اور خاصا نقصان ہُوا۔ اس کے ساتھ ہی جاپانیوں کا ایک طیّارہ نیچے آیا اور اس
"پرنس آف ویلز" کے ایک پہلو کی طرف سے آ کر تارپیڈو گرائے۔ یہ دو تارپیڈو
تارپیڈو پہلے سمندر میں جاتا ہے اور پھر سیدھا ہو جاتا ہے۔ اس کی مشینری پانی کے
جاتے ہی چل پڑتی ہے اور تارپیڈو اپنے ہدف پر راکٹ کی طرح بڑی ہی تیز رفتار
ہے۔ یہ سمندر کے اندر اندر بحری جہاز کے پہلو کے ساتھ ٹکراتا اور جب پھٹتا
بحری جہاز کے پہلو میں خاصا بڑا شگاف کر دیتا ہے۔ بحری جہاز کا تمام گولہ بارود نیچے وا
حصے میں رکھا جاتا ہے جسے میگزین کہتے ہیں۔ اگر تارپیڈو میگزین کے پہلو میں پھٹے تو

بحری جہاز کا پورا گولہ بارود پھٹتا ہے اور جہاز کو ایسا تباہ کرتا ہے کہ جہاز فوراً" ڈوب جاتا
ہے۔ اگر بحری جہاز چھوٹا ہو تو یہ دو حصوں میں کٹ جاتا ہے۔ اگر میگزین کی بجائے
تارپیڈو کسی اور حصے میں لگے تو وہاں سے جہاز کا پہلو ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے اور سمندر کا پانی
جہاز کے اندر جا کر جہاز کو ڈبو دیتا ہے۔

"پرنس آف ویلز" کے پہلو میں دو تارپیڈو لگے۔ یہ میگزین میں تو نہ لگے' پچھلے
حصے میں لگے جس سے اس کا پروپیلر ٹوٹ گیا۔ پروپیلر ہی جہاز کو چلاتا ہے۔ اس کے ساتھ
ہی جہاز کو دائیں بائیں کرنے والا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا یعنی اس کا سٹیئرنگ گیئر بیکار ہو گیا۔
اب انگریزوں کا "سمندر میں تیرتا ہُوا قلعہ" چلتے چلتے رک گیا اور جاپانی بمباروں کے لئے
بڑا آسان ٹارگٹ بن گیا۔

اُدھر "ری پلس" کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ پہلی بمباری سے اس میں آگ لگ
گئی۔ آگ کے باوجود یہ بحری جہاز سمندر پر ٹھیک ٹھاک تیرتا رہا اور اس کی مشین گنیں
اور بڑی توپیں جاپانی ہوائی جہازوں پر آگ برساتی رہیں۔ اس میں آگ اتنی جلدی پھیل
نہیں سکتی تھی کیونکہ آگ بجھانے کا انتظام نہایت اچھا تھا اور دوسرے یہ کہ یہ ایک بہت
بڑا جہاز تھا۔ اسے بھی تارپیڈو لگے اور اس نے زخم بھی کھائے لیکن اس کے عملے نے
ہمت نہ ہاری اور بمباروں کا مقابلہ کرتے رہے اور جہاز کو بھی سمندر پر تیرتا رکھا۔

دونوں بحری جہاز بہت نقصان اٹھا چکے تھے۔ ان کی رفتار نہ ہونے کے برابر رہ گئی
تھی۔ "ری پلس" تو بالکل ہی رک گیا تھا۔ جاپانی طیارے نیچے آ گئے اور ان بحری جہازوں
کے طیّارہ شکن فائر کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ان پر لپک لپک کر آگ برسانے لگے۔ میں
نے کبھی ایک بات سنی تھی کہ ایک جاپانی ہواباز نے اوپر سے سیدھی ڈائیو کی اور اپنے
طیّارے کو ایک بحری جہاز کی چمنی میں پھینک دیا تھا۔ بحری جہاز کی چمنی بند ہو جائے تو
جہاز بالکل بے کار ہو جاتا ہے اور اس کے انجن روم میں سیاہ دھواں بھر جاتا ہے۔ میں نے
یہ بات اس لئے صحیح مان لی تھی کہ جاپانیوں کے لئے اپنی جانیں یوں قربان کرنا قابلِ فخر
سمجھا جاتا تھا لیکن ملایا میں کچھ دنوں بعد مجھے پتہ چلا تھا کہ یہ بات غلط ہے اور ایسا کوئی واقعہ
نہیں ہُوا نہ وہاں جاپانیوں کو اس قسم کی خودکش کارروائی کرنے کی ضرورت تھی۔ ہاں
البتہ جاپانی ہوابازوں نے دس ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے آ کر دونوں بحری جہازوں کے
بہت ہی قریب اُڑ کر اس پر آگ برسائی تھی تاکہ یہ جلدی ڈوب جائیں۔

ڈیڑھ بجے کے قریب دونوں بحری جہاز ڈوبنے لگے اور ان کے عملے کے آدمی سمندر میں کودنے لگے۔ انہوں نے لائف بوٹیں سمندر میں پھینکیں اور بعض ویسے ہی سمندر میں کود گئے۔ ان دونوں بحری جہازوں کے ساتھ دو تباہ کن بحری جہاز بھی تھے جو انہیں ایسکارٹ کر رہے تھے اور ان سے دور دور تھے۔ وہ اتنی دور تھے کہ ان کی طیارہ شکن گنیں جاپانی طیاروں تک فائر نہیں پہنچا سکتی تھیں۔ جب دونوں جہاز ڈوبنے لگے اور ان کے آدمی سمندر میں کودنے لگے تو وہ دونوں جہاز ان لوگوں کو سمندر میں سے نکال لے جانے کے لئے آئے۔

یہ بات انگریزوں نے خود لکھی ہے کہ جب جاپانی ہوابازوں نے دیکھا کہ وہ اپنے ٹارگٹ کو مار چکے ہیں اور اس کے عملے کو بچانے کے لئے ان کے دو بحری جہاز آ رہے ہیں تو جاپانی ہوابازوں نے ان پر حملہ نہ کیا اور چلے گئے۔ جاپانی ہواباز چاہتے تو ان دو بحری جہازوں کو بھی مار سکتے تھے۔ انگریزوں نے ان ہوابازوں کو اپنے نقصان کے باوجود خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

ان دو بحری جہازوں میں جو عملہ تھا اس کی کل نفری دو ہزار نو سو اکیس تھی اور جنہیں زندہ بچا لیا گیا ان کی تعداد دو ہزار اکیاسی تھی۔ انہیں دنوں چھوٹے تباہ کن جہازوں میں ڈال کر سنگاپور پہنچا دیا گیا تھا۔ ان دونوں بحری جہازوں کا کمانڈر ایڈمرل ٹام فلپس اُس وقت "پرنس آف ویلز" میں تھا۔ وہ اس بحری جہاز میں سے نکلا ہی نہیں اور ڈوب کر مر گیا۔ دونوں جہازوں کے کیپٹن اپنے اپنے جہاز ساتھ ہی سمندر کی تہہ میں لے گئے لیکن ان میں سے ایک نہ جانے کس طرح زندہ سمندر کی سطح پر آ گیا اور اسے اٹھا لیا گیا۔ جنگ کے بعد اُس نے ان دونوں بحری جہازوں کی تباہی کا حال لکھا تھا۔

بحری جنگوں کی شروع ہی سے ایک روایت چلی آ رہی ہے۔ وہ یہ کہ جو جہاز لڑائی میں ڈوبنے لگتا ہے اس کا باقی عملہ تو سمندر میں کود جاتا ہے لیکن اس کا کیپٹن جہاز سے نہیں نکلتا اور وہ اپنے جہاز کے ساتھ ہی سمندر کی تہہ میں چلا جاتا ہے۔ اسے خودکشی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا اور اس خودکشی کو ہارے ہوئے کیپٹن جائز سمجھتے ہیں کیونکہ وہ لوگوں کا سامنا اس صورت میں نہیں کرنا چاہتے کہ اس کیپٹن کا جہاز لڑائی میں ڈوب گیا تھا اور یہ زندہ باہر گھوم پھر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایڈمرل ٹام فلپس اسی روایت کے مطابق بحری جہاز کے ساتھ ہی ڈوب گیا تھا۔

ابھی ایک عبرت ناک بات بھی سنیں۔ اسی صبح برطانوی وزیرِ اعظم چرچل نے حکم

بھیجا تھا کہ "پرنس آف ویلز" اور "ری پلس" کو کھلے سمندر میں بھیج دیا جائے کہ وہ جاپان کی بحری قوت کو تہس نہس کر دیں۔ اس کے بعد اُس نے اپنی کابینہ کا اجلاس اپنے گھر میں بلایا تھا اور متکبرانہ الفاظ کہے تھے جو میں پہلے تحریر کر چکا ہوں۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ صرف انگریزی بولنے والی دو قومیں دنیا پر بادشاہی کریں گی اور پھر اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ دو بحری جہاز کھلے سمندر میں نکلیں گے تو پورے بحرالکاہل پر انگریزی بولنے والی قوموں کی حکمرانی ہو گی لیکن اس اجلاس کے صرف دو گھنٹوں بعد ملایا سے بذریعہ وائرلیس اطلاع پہنچی کہ اس کی خوفناک بحری قوت سمندر میں ڈوب گئی ہے اور اس کے تیرتے ہوئے بحری قلعوں کا اب کوئی نام و نشان نہیں رہا۔ تاریخ کے مطابق یہ اطلاع یوں ملی تھی۔

"مسٹر چرچل! پرنس آف ویلز اور ری پلس کو جاپانیوں نے تباہ و برباد کر کے ڈبو دیا ہے"۔

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو" ——— چرچل نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا ——— "کیا یہ خبر صحیح بھی ہو سکتی ہے؟"

"ہاں مسٹر چرچل! اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی۔ میں سرکاری حیثیت سے بول رہا ہوں"۔

ایک اخباری رپورٹر نے لکھا تھا کہ اُس وقت چرچل اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ اُس نے یہ نہ پوچھا کہ دونوں جہاز کس طرح ڈوبے ہیں۔ اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے ریسیور رکھ دیا۔ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر اُس کے آنسو پھوٹے اور پھر آنسو بہنے لگے۔ جنگ کے بعد چرچل نے اپنی یہ کیفیت اپنے قلم سے ایک کتاب میں لکھی تھی اور اُس نے یہ الفاظ لکھے ——— "ساری جنگ میں مجھے اس سے زیادہ بڑا صدمہ کبھی نہیں پہنچا تھا"۔

ملایا میں جاپانیوں نے ان انگریزوں کی یہ حالت کر دی تھی کہ ان کی مسلح افواج کا نظم ہی درہم برہم ہو کے رہ گیا تھا۔ یہ دونوں بڑے بحری جہاز جب حملے میں تباہ و برباد ہو رہے تھے تو دونوں جہازوں میں سے کیپٹن ایئر ہیڈ کوارٹر کو وائرلیس کے پیغام بھیجتے رہے کہ اپنے لڑاکا طیارے فوراً بھیجو، جاپانی طیارے ہم پر حملہ کر رہے ہیں لیکن اُدھر سے یا

توجواب ملتا ہی نہیں تھا' اگر جواب ملتا تو یہ ملتا کہ طیارے آ رہے ہیں۔ لباب میں لکھا
ہے کہ کوانٹیشن میں رائل ایئر فورس کہ جو لڑاکا طیارے تھے' انہیں ایک پہلے حکم
کسی اور جگہ منتقل کر دیا گیا تھا اور اس سکوارڈن کے کمانڈر کو یہ حکم بھی دیا گیا تھا کہ
تیار رہیں کیونکہ اس نے اپنا لڑاکا سکواڈرن اپنے بحری بیڑے ایسکارٹ کرنے کے لیے
لے جانا ہے۔ لڑاکا طیاروں کے اس سکوارڈن کو آخر حکم پہنچا کہ وہ فوراً "ٹیک آف کر
اور ساحل سے اتنی دُور' فلاں سمت میں جائیں اور انہیں اپنے دو بڑے بحری جہاز نظر
آئیں گے' انہیں ایسکارٹ کریں۔

طیارے اُڑے اور جب وہ اُس مقام تک پہنچے تو آسمان خالی تھا۔ کوئی ایک بھی جاپا
طیارہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ نیچے دیکھا تو اپنا کوئی بحری جنگی جہاز نظر نہیں آ رہا تھا۔ دونوں
بحری جہاز سمندر کی تہہ میں جا چکے تھے اور جاپانی طیارے اپنا کام کر کے اپنے اڈے پر
بھی چکے تھے۔ انگریزوں کے دو چھوٹے بحری جہاز بڑے بحری جہازوں کے عملے کو سمن
سے اٹھا کر سنگاپور لے جا رہے تھے اور وہ خاصی دور نکل گئے تھے۔ انگریزوں کا یہ فا
سکوارڈن واپس آ گیا۔

میں آپ کو وہ حقائق بتا رہا ہوں جو تاریخ کے ریکارڈ پر ہیں۔ ملایا میں مجھے دوسرا
سے بہت سی باتیں معلوم ہوئی تھیں اور میں نے بعض باتوں کو سچ نہیں سمجھا تھا۔
جب واپس اپنے گھر آیا اور کچھ عرصہ بعد جنگِ عظیم کی کتابیں پڑھنی شروع کیں تو بہ
سی باتوں کی تصدیق ہو گئی اور کئی ایک نئے انکشاف ہوئے۔ جن دنوں انگریزوں کی نیو
کے دو بڑے ہی زبردست بحری جنگی جہاز "پرنس آف ویلز" اور "ری پلس" تباہ ہو
ڈوبے تھے' ان دنوں انگریزوں کی رائل ایئر فورس کا یہ حال تھا کہ اُس کے لڑاکا طیارے
زمین پر ہی مارے جا رہے تھے۔ جاپانی طیارے اس وقت سر پر آن پہنچتے تھے جب
انگریزوں کے لڑاکا طیاروں میں پٹرول ڈالا جا رہا ہوتا تھا یا یہ کہیں حملے کے لئے ٹیک آ
کرنے لگتے تھے۔ جاپانی طیارے اوپر سے غوطے میں آتے اور انہیں زمین پر ہی نذ
آتش کر دیتے تھے۔ جاپانیوں نے جن ہوائی اڈوں پر قبضہ کیا تھا' وہ ان ہوائی اڈوں
بہت دُور تھے جو ابھی انگریزوں کے پاس تھے۔ سوچنے والی بات ہے کہ جاپانیوں کو کو
اطلاع دیتا تھا کہ فلاں اڈے پر طیاروں میں پٹرول ڈالا جا رہا ہے یا طیارے حملے کے
اُڑنے لگے ہیں۔ یہ مخبری اور جاسوسی وہاں کے مقامی لوگ بذریعہ وائرلیس کرتے تھ

میں یہاں ایک انگریز جنگی وقائع نگار کے الفاظ پیش کرتا ہوں ۔۔۔ "جاپانیوں نے ہم سے ملایا کا آسمان چھین لیا تھا"۔

دراصل جنوری 1942ء کے پہلے ہفتے تک انگریز ملایا کی جنگ ہار چکے تھے۔ وہ اب اپنے فوجیوں کو صرف مروا رہے تھے اور پیچھے ہٹتے آ رہے تھے۔ آسمان جاپانیوں کے ہاتھ تھا اور سمندر پر بھی اب جاپانیوں کی حکمرانی تھی۔ زمین پر انگریزوں کی فوج کا یہ حال تھا کہ ہوائی مدد سے محروم ہو گئی تھی۔ اسے آسٹریلیا اور ہندوستان کی فوجوں کی کمک بھیجی گئی لیکن ان دونوں فوجوں کو جنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ بحری جہازوں سے اُترتے ہی انہیں جاپانیوں سے لڑنا پڑا اور پھر وہ بھاگ اٹھے۔

میں نے پہلے کہا ہے کہ ملایا سنگاپور کی جنگ کی کہانی بڑی ہی لمبی داستان ہے۔ اسے میں اب اس طرح سمیٹتا ہوں کہ 15 فروری 1942ء کے روز ملایا کی افواج کے جنرل آفیسر کمانڈنگ لیفٹیننٹ جنرل پرسیول نے سنگاپور میں جاپانیوں کے آگے ہتھیار ڈال کر اپنے سرنڈر کے کاغذات پر غیر مشروط طور پر دستخط کر دیئے اور اپنے آپ کو جاپانیوں کے حوالے کر دیا۔ یہاں سے جاپانی آگے برما کی طرف بڑھے تھے اور برما پر قبضہ کیا تھا۔

میں نے بہت مدت بعد ایک انگریز جنگی مبصر فرینک اوون کی کتاب پڑھی تھی جس میں اُس نے لکھا کہ جاپانیوں کی فتح کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ وہ یہ تھی کہ ملایا میں خصوصاً جنوب میں سنگاپور کے قریب زیادہ تر اراضی جاپانیوں کی ملکیت تھی۔ یہ ان کی ذاتی ملکیت تھی۔ یہ ایسی ہی تھی جیسے ہمارے ہاں مربعے ہوتے ہیں۔ یہاں ربڑ کے درختوں کے وسیع و عریض فارم بھی تھے۔ ان میں سے بھی بعض کے مالک جاپانی تھے۔ یہ تمام جاپانی اپنے ملک میں رہتے تھے اور ان کی زراعت یا ربڑ کی صنعت ان کے منیجر چلاتے تھے جو ملایا کے مقامی لوگ تھے۔ ان منیجروں نے ملایا میں اپنے طور پر سڑکیں بنائی تھیں۔ ملایا میں انگریزوں کی حکومت تھی انگریزوں کو ذرا سا بھی شک نہ گزرا کہ یہ سڑکیں کسی اور مقصد کے لئے بنائی جا رہی ہیں۔ وہ تو خوش ہوئے ہوں گے کہ یہ لوگ اپنے خرچ پر سڑکیں بنا رہے ہیں۔ یہ جنگِ عظیم کے آغاز سے پہلے کے دَور کی بات ہے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز جاپانی بھی جنگ میں کود پڑیں گے اور وہ ملایا پر حملہ کریں گے۔ ان منیجروں نے سڑکیں بھی ایسی بنائیں کہ دُور دُور تک لے گئے اور یہ سڑکیں شمال کی طرف دائیں اور بائیں بندرگاہوں پر پہنچا دیں۔ جب جاپانیوں نے ملایا پر

حملہ کیا تو جاپانی فوج نے یہ سڑکیں استعمال کیں۔ یہ ایک باقاعدہ پلان تھا۔ یہ مصنف لکھتا ہے کہ انگریزوں کی فوج جدھر بھی نقل و حرکت کرتی تھی یا پسپا ہوتی تھی، جاپان کی فوج ان سڑکوں کے ذریعے آگے بڑھ کر انگریزوں کی فوج کے پہلوؤں پر حملے کرتی اور اسے بہت نقصان پہنچاتی تھی۔

○

میرے لئے یہ بتانا ممکن نہیں کہ ملایا اور سنگاپور میں انگریزوں کی فوج کی کُل نفری کتنی تھی۔ میں یہ بتا سکتا ہوں کہ سنگاپور میں جس فوج نے ہتھیار ڈالے اس کی نفری پچاسی ہزار تھی۔ اس پچاسی ہزار میں 45 ہزار ہندوستانی فوجی تھے۔ انگریزوں کی اپنی گورا فوج، آسٹریلیا کی فوج اور ہندوستان کی فوج کا بے شمار جانی نقصان ہُوا تھا۔ یہ پچاسی ہزار نفری وہ تھی جو آخر میں سرنڈر کے وقت زندہ رہ گئی تھی۔

ہتھیار ڈالنے کے دو تین روز بعد جاپانیوں نے ان جنگی قیدیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ انگریزوں کا تھا اور اس میں آسٹریلیا کی فوج بھی شامل تھی، یعنی سفید فام فوج کو الگ کر دیا گیا اور ہندوستانی فوج کو الگ لے گئے۔ ان ہندوستانی جنگی قیدیوں کی وہ ایک فوج بنانا چاہتے تھے جسے انہوں نے انڈین نیشنل آرمی کا نام دیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد سبھاش چندر بوس ان کے پاس پہنچ گیا۔

میں پہلے کسی باب میں سبھاش چندر بوس کا ذکر کر چکا ہوں، یہاں ذرا تفصیل سے اس کا تعارف کراؤں گا۔ سبھاش چندر بوس بنگالی ہندو تھا ور اس نے انگلینڈ میں کیمبرج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہاں سے واپس آیا تو وہ ہندوستان کی آزادی کا جذبہ لے کر اٹھا لیکن وہ دوسرے لیڈروں کی طرح تقریروں اور جلوسوں کے ذریعے ملک کو آزاد کرانے کے حق میں نہیں تھا بلکہ وہ جارحانہ طریقے اختیار کرنے کے حق میں تھا اور وہ دہشت گردی کا قائل تھا۔ اُس کا عقیدہ یہ تھا کہ مسلح بغاوت کے بغیر انگریزوں سے ہندوستان کو آزاد نہیں کرایا جا سکتا۔

سبھاش چندر بوس پکّا کانگریسی تھا لیکن مہاتما گاندھی کا بڑا ہی سخت مخالف تھا۔ اس نے ایک کتاب لکھی تھی جس میں مہاتما گاندھی کو جسے ہندو اپنا روحانی باپ کہتے تھے پوری طرح بے نقاب کیا تھا۔ اس نے مہاتما گاندھی کی منافقت سے ایسا پردہ اُٹھایا کہ اس کی اصل شخصیت اور ذہنیت کو ساری دنیا کے آگے رکھ دیا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو اور

صفِ اوّل کے دوسرے کانگریسی لیڈر سبھاش چندر بوس کے ہم خیال تھے۔

جنگ شروع ہوئی تو سبھاش چندر بوس نے انگریزوں کے خلاف کچھ عملی کارروائیاں کیں لیکن گرفتار ہو گیا۔ ہندوستان میں کانگریس کی طرف سے بڑا سخت احتجاج ہُوا۔ انگریز جنگ کی صورت میں اور اپنی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے، ہندوستانیوں کو ناراض کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے نہ وہ کانگریس کے لیڈروں کو ناراض کرنا چاہتے تھے کیونکہ انہوں نے ہندوستانیوں کو بھرتی کر کے جنگ میں جھونکنا تھا۔ انہوں نے سبھاش چندر بوس کو فوراً" ہی رہا کر دیا۔ سبھاش چندر بوس نہ جانے کس راستے سے کس ذریعے سے جرمنی جا پہنچا اور برلن میں ہٹلر سے ملا جس نے فرانس پر حملہ کر کے جنگِ عظیم کا آغاز کیا تھا۔ جب جاپانیوں نے سنگاپور اور ملایا فتح کر لیا تو سبھاش چندر بوس جرمنی سے ملایا جا پہنچا۔ یہاں میں یہ بھی بتا دوں کہ ملایا میں جرمن جاسوس موجود تھے۔ وہ صرف جاسوس ہی نہیں بلکہ تخریب کار بھی تھے۔

ملایا پہنچ کر اس نے انڈین نیشنل آرمی کی بنیاد رکھی۔ جاپانیوں نے انڈین آرمی کے تمام جنگی قیدیوں کو اسی لئے انگریزوں اور آسٹریلیا کے فوجیوں سے الگ کر لیا تھا۔ میں آپ کو انڈین نیشنل آرمی کی کچھ باتیں سناؤں گا۔

سبھاش چندر بوس نے انڈین آرمی کے تین کپتانوں کو انڈین نیشنل آرمی کے کمانڈر بنایا تھا اور انہیں بڑے بڑے عہدے دیئے تھے۔ ان میں ایک سکھ تھا، ایک ہندو اور ایک مسلمان۔ مسلمان کا نام کیپٹن شاہ نواز تھا۔ جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو کیپٹن شاہ نواز اور اس کا خاندان ہندوستان ہی میں رہے تھے اور اُس کا خاندان اس وقت بھی کانگریسی تھا اور بعد میں بھی کانگریسی رہا۔

سبھاش چندر بوس اس فوج کو منظم کرتا رہا اور میں یہ پہلے بتا چکا ہوں کہ برما کے محاذ سے انہوں نے انڈین آرمی کے فوجیوں کو کس طرح اپنی طرف کھینچا تھا۔ وہ تمام فوجی بھگوڑے ملایا پہنچا دیئے گئے تھے جو جنگی قیدیوں سے ملے اور اس طرح انڈین نیشنل آرمی کی تشہیر ہوئی۔ سبھاش چندر بوس اگست 1945ء میں جاپان کے دارالحکومت ٹوکیو میں اس طیارے کے کریش میں مارا گیا تھا جس میں وہ ٹوکیو گیا تھا۔ ایک دو دن بعد جاپان نے امریکہ کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

انگریزوں کے اندازے کے مطابق انڈین نیشنل آرمی کی نفری پچیس ہزار ہو گئی

تھی لیکن صحیح تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ جاپانیوں نے انڈین آرمی کے جنگی قیدیوں سے کہا تھا کہ وہ انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو جائیں تو انہیں تنخواہیں بھی ملیں گی اور ہر وہ سہولت ملے گی جو ایک فوج کے سپاہیوں کو ملتی ہے۔ بہت سے جنگی قیدیوں نے انکار کر دیا تھا۔ ان سب کے ساتھ جاپانیوں نے بہت ہی بُرا سلوک کیا تھا اور ان میں سے کوئی چند ایک ہی خوش قسمت زندہ رہے ہوں گے۔

ملایا کی شکست کے بعد انگریزوں کو پتہ چلا تھا کہ جاپانیوں نے ایک پلان بنا رکھا تھا اور اسی پلان کے تحت انہوں نے مشرق بعید پر حملہ کیا تھا۔ ان کا پلان یہ تھا کہ وہ جنوب مشرقی ایشیا کو انگریزوں سے آزاد کرائیں گے اور پھر انہیں آزاد ہی رہنے دیں گے۔ یہ بتانا آسان نہیں کہ جاپانی اپنے اس پلان میں کہاں تک مخلص اور سچے تھے۔ البتہ انہوں نے جنوب مشرقی ایشیا کے لوگوں کو یہی تاثر دے رکھا تھا کہ وہ انہیں انگریزوں سے آزاد کرانے آئے ہیں۔ یہ ایک بڑی وجہ تھی کہ برما ملایا کے لوگ جنگ سے پہلے ہی ان کے حامی اور معاون بن گئے تھے۔

پڑھنے والوں کی دلچسپی کے لئے میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ برطانیہ اور آسٹریلیا کے جنگی قیدیوں کے ساتھ جاپانیوں نے کیا سلوک کیا تھا۔ ان کی نفری چالیس ہزار تھی۔ ہتھیار ڈالنے کے بعد جاپانیوں نے ان سفید فام قیدیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ سنگاپور کے قریب ہی چھوٹا سا ایک جزیرہ تھا جس میں بارکیں بنی ہوئی تھیں۔ ایک حصے کی نفری کو جاپانیوں نے اس جزیرے میں بھیج دیا اور دوسرے حصے کو ایک اور کیمپ میں رکھا۔ اس آدھی نفری میں سے وہ مزدور پارٹیاں مختلف جگہوں پر کام کرنے کے لئے بھیجتے تھے۔ ان میں سے وقتاً فوقتاً قیدی فرار ہونے کی کوشش کرتے تھے لیکن جاتے کہاں؟ اُسی روز یا چند دنوں بعد پکڑے جاتے۔ انہیں جنگی قیدیوں کے سامنے گولی مار دی جاتی تھی یا کھڑا کر کے ان پر سنگینوں سے حملہ کیا جاتا اور ان کے جسموں کو چھلنی کر کے الگ پھینک دیا جاتا تھا۔

جزیرے میں جن سفید فام جنگی قیدیوں کو رکھا گیا تھا وہ آرام میں نہیں تھے۔ ان کے ساتھ درندوں جیسا سلوک ہوتا تھا۔ انہیں بارکوں اور کمروں میں انسان سمجھ کر نہیں بے جان چیزیں سمجھ کر یوں پھینکا جاتا جیسے یہ کوئی گودام ہو۔ جنگی قیدی مختلف بیماریوں سے مرتے رہتے تھے لیکن ان کا علاج نہیں ہوتا تھا۔ ملایا کے شمالی حصوں میں بھی فوجیوں

نے ہتھیار ڈالے تھے اور پھر جب جاپانی فوج نے برما سے انگریزوں کو بھگایا تو وہاں سے بھی انہیں بہت سے جنگی قیدی ملے تھے۔ ان میں جو سفید فام تھے انہیں جاپانیوں نے انہی قیدی کیمپوں میں بھیج دیا تھا جو ملایا میں قائم کئے گئے تھے۔ ان کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوتا تھا جو ملایا کے جنگی قیدیوں کے ساتھ ہو رہا تھا۔

جاپانیوں نے برما بھی لے لیا تو انہوں نے ملایا کے جنگی قیدیوں کو برما اور اس کے جنوبی علاقوں میں سڑکیں بنانے اور دیگر کام کرنے کے لئے بھیجا۔ انہیں ایک ریل گاڑی پر لے جایا گیا تھا اور اس ریل گاڑی کو انگریزوں نے جنگ کے بعد موت کی ریل گاڑی کا نام دیا تھا۔ وہ اس لئے کہ اتنے لمبے سفر میں جاپانیوں نے جنگی قیدیوں کو بہت کم کھانے پینے دیا اور ان کی صحت کا ذرا سا بھی خیال نہ کیا اور قیدی ریل گاڑی میں مرتے رہے۔ جو مرجاتا اُس کی لاش گاڑی کے باہر پھینک دی جاتی تھی۔ ایک امریکی مصنف نے لکھا تھا کہ ملایا کی جنگ میں اتنے سفید فام فوجی نہیں مرے تھے جتنے قیدی کیمپوں میں مرے۔ ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچی تھی۔

میں جب کوالالمپور اپنے ساتھی فصیح احمد کے ساتھ جا رہا تھا تو راستے میں سفید فام جنگی قیدیوں کو ایک سڑک بناتے دیکھا تھا۔ یہ سب جنگی قیدی کیمپوں سے آئے تھے اور ان کے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا وہ میں سنا چکا ہوں.... کہا جا سکتا ہے کہ جاپانیوں کا یہ سلوک غیر انسانی تھا اور حقوق انسانی کی صریحاً خلاف ورزی تھی۔ اس طرح انہیں بیماری کی اذیت' زیادہ مشقت کی اذیت' کم خوراک کی اذیت اور غیر انسانی سلوک کی اذیت سے تڑپا تڑپا کر مارنے کی بجائے ان سب کو ایک ہی بار گولی مار دی جاتی تاکہ انہیں نجات مل جاتی لیکن جن لوگوں نے انگریزوں کی غلامی دیکھی ہے اور جن مسلمانوں نے انگریزوں کی مُسلم کُشی اور اسلام دشمنی دیکھی ہے وہ یہی کہیں گے کہ اس قوم کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہئے تھا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد ان انگریزوں نے مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کر درختوں کے ساتھ پھانسی دی تھی۔ انہوں نے سینکڑوں مسلمانوں کو توپوں کے منہ کے آگے رسّیوں سے باندھ کر گولے داغے تھے اور جو انگریز یہ تماشا دیکھتے تھے' وہ قہقہے لگاتے اور تالیاں بجاتے تھے۔ ان انگریزوں نے اپنی اُس وقت کی ایک پلٹن نمبر 26 پنجابی کے دو سو پچاس مسلمان سپاہیوں کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کر کے یوں سزائے موت دی تھی کہ ایک مسلمان سپاہی کو مَیدان میں کھڑا کرتے اور ہندو اور سکھ سپاہی

اسے رائفلوں کے آگے سنگینیں فکس کر کے اس طرح مارتے کہ اس کا جسم سنگینوں سے چھلنی ہو جاتا تھا۔ اس طرح انہوں نے اڑھائی سو مسلمان سپاہیوں کو ہندو اور سکھ سپاہیوں سے مروایا تھا اور ان سب کی لاشیں ایک کنوئیں میں پھینک کر کنواں بھروایا تھا۔ یہ واقعہ پنجاب کے ایک مقام اجنالہ کا ہے۔ ان انگریزوں نے 1857ء میں جس طرح دِلّی کو لُوٹا تھا اور جس طرح انہوں نے پردہ نشین عورتوں کو بھاگ جانے پر مجبور کیا تھا' اس کی تفصیلات پڑھیں یا سنیں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور خون کھولنے لگتا ہے۔

شاید ان انگریزوں کو جاپانی اسی جرم کی سزا دے رہے تھے کہ وہ اپنے آپ کو سب سے برتر اور بالاتر مخلوق سمجھتے تھے اور اپنے قبضے میں لئے ہوئے ملکوں کے لوگوں کو انہوں نے اپنا زر خرید غلام بنا رکھا تھا' یا جاپانی اس قوم کا تکبّر غرور توڑ رہے تھے اور انہیں یہ بتا رہے تھے کہ تم منافق اور گھٹیا قوم ہو اور تم اسی سلوک کے حق دار ہو جو تم اپنی نو آبادیوں میں وہاں کے لوگوں کو اَن پڑھ اور پسماندہ رکھ کر کرتے رہے ہو۔

جاپانیوں کی نیّت جو کچھ بھی تھی' میں اپنی ذاتی رائے دیتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان انگریزوں کو پتھر توڑتے اور سڑکوں پر کام کرتے جاپانیوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی تھی.... اسرائیلیوں نے آج تک شور بپا کر رکھا ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران جرمنی کے ہٹلر نے یہودیوں کے قتلِ عام کا حکم دیا تھا۔ وہاں لاکھوں یہودی عورتوں کو بڑے ہی ظالمانہ طریقوں سے ختم کیا گیا تھا۔ گیس چیمبر بنا دیئے گئے تھے جن میں اتنے زیادہ یہودیوں کو ٹھونس دیا جاتا کہ بعض دم گھٹنے سے مر جاتے تھے۔ دروازے بند کر کے اس کمرے میں زہریلی گیس کھول دی جاتی تھی۔ وہ سب مر جاتے تو ان کی لاشیں وہاں سے نکال کر اتنے ہی اور یہودی اس چیمبر میں داخل کر دیئے جاتے اور اس طرح بے انداز یہودیوں کو زہریلی گیس سے مارا گیا۔ دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا گیا تھا کہ بڑا ہی لمبا چوڑا اور گہرا گڑھا کھودا جاتا اور کچھ یہودیوں کو اُس کے کنارے کھڑا کر کے پیچھے سے مشین گنیں فائر کی جاتیں اور ان کی لاشیں گڑھے میں گر پڑتیں تھیں۔ اسی طرح یہودیوں کو گڑھے کے کنارے اسی طرح مار دیا جاتا اور یوں یہ عمل جاری رکھا جاتا حتیٰ کہ گڑھا بھر جاتا اور اس پر مٹی ڈال دی جاتی تھی۔ ان یہودیوں میں سے بہت سے ان قیدی کیمپوں میں بیمار ہو کر مر جاتے تھے جہاں انہیں پکڑ پکڑ کر لایا اور بند کیا جاتا تھا۔ جرمنوں نے یہودیوں کے چھوٹے چھوٹے بچّوں کو بھی نہ بخشا۔

یہ انسان کُشی بہت بڑا جرم اور گناہ ہے لیکن اس کا پس منظر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہٹلر نے انہیں بلا جواز نہیں مارا تھا۔ یہ تو قرآن میں بھی آیا ہے کہ یہودی کینہ پرور قوم ہے اور جہاں بھی یہ قوم جاتی ہے وہاں درپردہ فتنہ پیدا کرتی اور وہاں کا نظام درہم برہم کر دیتی ہے۔ یہودیوں نے ہٹلر کو متاثر کر لیا تھا اور اسے جنگ پر اکسایا تھا۔ جب جرمنی جنگ میں الجھ گیا تو انہی یہودیوں نے اس کی پیٹھ پیچھے سے اس پر وار کرنا چاہا۔ اب وہ جرمنی سے اپنا مفاد پورا کرنا چاہتے تھے جس کی خاطر انہوں نے پس منظر میں رہ کر جنگ شروع کروائی تھی۔ ہٹلر کو کسی طرح پتہ چل گیا کہ یہ تو اسے ہی تباہ کرنے کا پلان بنائے ہوئے ہیں۔ ہٹلر نے ان کے قتلِ عام کا ایسا حکم دیا کہ ان کی نسل ہی باقی نہ رہے۔

اسرائیل چونکہ ایک ملک بن گیا ہے جس کی اپنی حکومت اور اپنے ذرائع ہیں اور امریکہ' برطانیہ' فرانس وغیرہ اس کی مُٹھی میں ہیں اس لئے اسرائیل کا یہ پروپیگنڈہ ساری دنیا میں پہنچا ہُوا ہے کہ جنگِ عظیم میں ہٹلر نے ان کی نسل کُشی کی تھی۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے بھی کچھ لوگ کم از کم اس معاملے میں یہودیوں کے ہمدرد بنے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان بے چاروں پر بہت ظلم ہُوا تھا لیکن جو لوگ جانتے ہیں کہ یہودی کیا ہے' وہ یہی کہتے ہیں کہ ہٹلر نے اُن کی نسل کُشی بلا جواز نہیں کی تھی۔

آپ نے "حکایت" میں پڑھا ہو گا اور شاید کہیں اور بھی پڑھا ہو گا کہ 1969ء میں اسرائیل کے اُس وقت کے وزیرِاعظم بن گورین نے انگلینڈ میں کہا تھا کہ پاکستان اسرائیل کا دشمن نمبر ایک ہے اور ہم یعنی اسرائیلی بھارت کو اپنا اڈہ بنا کر پاکستان کو تباہ کریں گے۔

یہ تو بعد کی باتیں ہیں جب پاکستان بھی وجود میں آ گیا تھا اور اسرائیل بھی۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں' اس وقت نہ پاکستان کا وجود تھا نہ اسرائیل کا۔ میں نے کبھی پاکستان کا نام بھی نہیں سنا تھا' میں صرف یہ جانتا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ یہ تو بہت بعد کی بات ہے جب میرے ذہن میں آج والی پختگی پیدا ہوئی تھی۔ یہ اُس وقت ہوئی جب میں نے سمندر دیکھا اور سمندر کے پار کے ملک دیکھے اور ابھی آگے چل کے آپ کو بتاؤں گا کہ میں نے اور کیا کچھ دیکھا اور وہ کون سے واقعات تھے اور کیسا ماحول تھا جس نے مجھے برائے نام مسلمان نہ رہنے دیا بلکہ مردِ مومن بنا دیا۔

میں انگریزوں کو مشقّت کرتے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ اتنے میں ہمارا جاپانی افسر آ گیا

اور ہماری فوجی گاڑی اپنی منزل کی طرف چل پڑی۔

○

ہماری گاڑی جنگل میں سے گزرتی ہوئی سڑک پر بڑی تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ یہ جنگل کس قسم کے تھے اور یہ بڑے جنگل سے بہت مختلف تھے۔ میں نے ایک دو اور جگہوں پر بھی انگریز جنگی قیدیوں کو کام کرتے دیکھا۔ وہاں بھی جاپانیوں کا ان قیدیوں کے ساتھ وہی سلوک تھا جو میں پہلے دیکھ آیا تھا۔

"فصیح!" — میں نے کہا — "اب یہ انگریز ہندوستان پر حکومت کرنے کے قابل نہیں رہے۔ میری یہ امید پکّی ہو گئی ہے کہ اب ہم ہندوستان میں آزاد ہندوستانیوں کی طرح داخل ہوں گے"۔

فصیح احمد نے تینوں ہندو ساتھیوں کی طرف دیکھا جو ہم سے ہٹ کر الگ بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

"نہ بھائی!" — فصیح احمد نے میرے کان کے قریب اپنا منہ کر کے ذرا بلند سرگوشی میں کہا — "آزادی کے متعلق میری امیدیں تو خاک میں ملتی نظر آتی ہیں۔ تمہیں ابھی معلوم نہیں کہ جاپانی پسپا ہو رہے ہیں۔ میں نے یہاں کے جاپانی افسروں سے پوچھا تھا۔ وہ خاصے گھبرائے ہوئے تھے۔ میں نے تمہیں پہلے بتایا ہے کہ برما پر جوابی حملہ اکیلے انگریزوں نے نہیں کیا‘ ان کے ساتھ امریکہ بھی شامل ہے.... یہ بھی ذہن سے نکال دو کہ ہم مسلمان کبھی آزاد ہوں گے۔ آزادی ملی بھی تو ہندوؤں کو ملے گی اور ہم ان کے غلام ہو جائیں گے"۔

"تو پھر اس کا علاج کیا ہو گا؟" — میں نے پوچھا۔

"میرے بھائی!" — فصیح نے جواب دیا — "میں سیاست کو نہیں سمجھتا اور میں ہندوستان کے لیڈروں کی طرح نہ سوچ سکتا ہوں نہ بات کر سکتا ہوں۔ تمہاری طرح میں بھی فوجی ہوں۔ مجھے ایک ہی علاج سمجھ میں آتا ہے اور یہ ہے کہ ہمیں ہندوؤں کے خلاف لڑنا پڑے گا جسے خانہ جنگی کہتے ہیں.... بہتر ہے کہ ایسی باتیں یہاں نہ کرو‘ یہ تین کافر ہمارے ساتھ ہیں‘ انہیں معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ ہم ان کے خلاف باتیں کر رہے ہیں"۔

ہم نے یہ موضوع الگ رکھ دیا اور کچھ دیر بعد ہماری گاڑی کوالالمپور میں داخل

ہوئی۔ خاصا بڑا شہر تھا اور وہاں جنگ کے اثرات صاف نظر آ رہے تھے۔ کچھ عمارتوں کے تھوڑے تھوڑے حصے گرے ہوئے تھے۔ ان پر بم گرے تھے یا توپ خانے کے گولوں سے یہ عمارتیں گری تھیں۔ سفید فام جنگی قیدی وہاں سے ملبہ اٹھا اٹھا کر فوجی ٹرکوں میں پھینک رہے تھے۔

ہمیں چھاؤنی کے علاقے میں لے جا کر گاڑی سے اتار دیا گیا۔ میں نے اتر کر دیکھا تو یوں لگا کہ جیسے میں ہندوستان کی کسی چھاؤنی میں پہنچ گیا ہوں۔ ہر طرف ہندوستانی نظر آ رہے تھے۔ یہ انڈین نیشنل آرمی کے جوان تھے۔ بعض برآمدوں میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے اور بعض باہر کوئی نہ کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔ فصیح احمد مجھے ایک حوالدار کے پاس لے گیا۔ وہ مسلمان حوالدار تھا جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ فصیح نے اسے بتایا کہ میں نیا ہوں اور میں بھگوڑا ہو کر ادھر آیا تھا۔

اس حوالدار نے مجھ سے میری یونٹ پوچھی اور پھر میرا نام اور رجمنٹل نمبر لکھا۔ میرے باپ کا اور گاؤں کا نام بھی لکھا اور مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ فصیح احمد میرے ساتھ رہا۔ اس کمرے میں ہم تینوں تھے۔

"میری ایک دو باتیں ذرا غور سے سن لو" — حوالدار نے کہا — "مجھے اس وقت حوالدار نہیں بلکہ اپنا مسلمان بھائی سمجھنا۔ فصیح مجھے جانتا ہے۔ اگر تم یہ جذبہ لے کر یہاں آئے ہو کہ ہندوستان کو آزاد کراؤ گے تو یہ جذبہ دل سے نکال دو۔ صرف یہ جذبہ رکھو کہ مسلمان نہ انگریز کا غلام رہ سکتا ہے نہ ہندو کا.... اب یہ بتاؤ کہ تم کس ارادے اور کس خیال سے بھگوڑے ہوئے تھے؟"

"یہ بات دراصل میرے گاؤں سے شروع ہوتی ہے" — میں نے اسے اپنی پوری کہانی سنانے کے ارادے سے کہا۔

"مجھے سٹوریاں مت سناؤ" — حوالدار نے کہا — "میں نے یہ پوچھا ہے کہ تمہاری نیت اور تمہارا ارادہ کیا تھا!"

میں نے اسے بڑے ہی مختصر الفاظ میں بتایا کہ میں نے یہ جذبہ قبائلی پٹھانوں سے لیا ہے اور یہ بھی بتایا کہ میں ان کا قیدی ہو گیا تھا۔

"تمہاری یہ بات مجھے اچھی لگی ہے" — حوالدار نے کہا — "ہر مسلمان میں قبائلی پٹھانوں والا ہی جذبہ ہو سکتا ہے لیکن یہ سن لو کہ اس جذبے کی تسکین کا موقع

تمہیں یہاں نہیں ملے گا۔ میں جنگی قیدی تھا اور جب ہمیں کہا گیا کہ آئی این اے میں شامل ہو جاؤ تو تم آزاد ہندوستانی ہو گے تو میں فوراً" اس فوج میں شامل ہو گیا اور سچّی بات یہ ہے کہ میں جاپانیوں کی یہ بات نہ مانتا تو اب تک زندہ نہ ہوتا۔ یہ مجھ سے مشقت کرا کرا کے اور بھوکا پیاسا رکھ کر مار ڈالتے۔ پہلے پہل میں بھی یہی سمجھا تھا کہ ہم انگریزوں سے آزاد ہو جائیں گے لیکن جب سبھاش چندر بوس نے دیکھا کہ جاپانیوں نے تو برما تک کو فتح کر لیا ہے اور اب ہندوستان بھی ان کی جھولی میں آیا کے آیا تو ان ہندوؤں نے اپنی نیت کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ ہندو بڑی عیّار اور اوچھی قوم ہے۔ میں تمہیں مسلمان بھائی سمجھ کر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہاں اپنے دل کی اور مسلمان کی حیثیت سے اپنے جذبے کی بات نہ کرنا نہ ہی کسی ہندو کے خلاف بات کرنا اور کسی کو یہ پتہ نہ چلے کہ میں نے تمہیں یہ نصیحت کی ہے۔ یہاں ہندو افسر بھی ہیں۔ تمہیں ایک ہندو لیفٹیننٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا' وہ تمہارے دل کی بات معلوم کرنے کی کوشش کرے گا۔ تم نے صرف یہ کہنا ہے کہ میں ہندوستان کی آزادی چاہتا ہوں اور ہندو مسلم بھائی بھائی ہیں۔ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ تم صرف مسلمان ہو اور ہندو کو اچھا نہیں چاہتے تو یہ لوگ تمہیں مروا ڈالیں گے"۔

ایسی ہی باتیں فصیح نے میرے ساتھ کی تھیں اور وہی باتیں حوالدار نے کیں تو مجھے پچھتاوا ہونے لگا کہ میں نے اپنی فوجی زندگی کیوں چھوڑی تھی۔ تھوڑا عرصہ اور سروس کر کے مجھے ترقی مل جانی تھی۔ میں نے یہ سوچا کہ جاپانیوں کو شکست ہو گئی تو کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکل کر قبائلی پٹھانوں کے پاس چلا جاؤں گا۔ یہ بات تو بڑی صاف تھی کہ انگریزوں کو ہندوستان میں شکست نہ ہوئی تو میں ان کا بھگوڑا ہوں گا اور بھگوڑا بھی ایسا جو ان کے دشمن سے جا ملا تھا۔ میرا کورٹ مارشل ہو گا اور مجھے گولی مار دی جائے گی۔ میں نے سوچا کہ مرنا ہی ہے تو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے مروں گا۔

مجھے ایک نوجوان لیفٹیننٹ کے سامنے جا کھڑا کیا گیا۔ وہ ہندو تھا۔ حوالدار ساتھ تھا۔ اس نے میرے متعلق جو معلومات لکھی تھیں وہ اس لیفٹیننٹ کے آگے رکھ دیں اور حوالدار باہر نکل گیا۔

"شاباش جوان!" —— ہندو لیفٹیننٹ نے کہا —— "تم نے بہت اچھا کیا کہ انگریزوں کی فوج سے بھگوڑے ہو کر یہاں آ گئے ہو۔ اب ہم ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد

کرائیں گے۔ یاد رکھو جب تک تم انڈین نیشنل آرمی میں ہو' تمہارا دین اور دھرم یہ ہو گا کہ ہندو مسلم بھائی بھائی ہیں۔ یہ بھی یاد رکھو کہ ہندو تمہارا بڑا بھائی ہے کیونکہ ہندوستان میں ہندوؤں کی آبادی سب سے زیادہ ہے اور ملک کا سارا انتظام ہندو چلاتے ہیں۔ ایک بات کا خیال رکھو کہ یہاں کسی نے پروپیگنڈہ کیا ہے کہ ہندو مسلمان کو ہندوستان میں اپنا غلام بنا لیں گے۔ ایسا پروپیگنڈہ مت سننا۔ جب ہندوستان میں ہندو راج قائم ہو جائے گا تو تمہیں پتہ چلے گا کہ آزادی کیا ہوتی ہے۔ تمہاری کایا پلٹ جائے گی اور تم ایک معمولی فوجی جوان نہیں ہو گے بلکہ تمہاری حیثیت اور اونچی ہو جائے گی"۔

اس لیفٹیننٹ نے فصیح احمد اور حوالدار کے خدشوں کی تصدیق کر دی۔ میرا خون تو بہت کھولا لیکن میں خاموش رہا۔ اگر مجھے وہاں آزادی حاصل ہوتی تو میں اس دُبلے پتلے ہندو لیفٹیننٹ کا گلا گھونٹ دیتا لیکن وہاں وہ افسر تھا اور میں اس کے ماتحت تھا۔ میں نے اس کی باتیں زہر سمجھ کر پی لیں۔ اُس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی اور میں اُسے بادلِ نخواستہ سیلوٹ کر کے باہر نکل آیا۔

باہر نکلا تو حوالدار اور فصیح احمد کچھ دور کھڑے تھے۔ میں ان کے پاس چلا گیا۔ انہوں نے پوچھا کہ لیفٹیننٹ نے کیا کہا ہے۔ میں نے انہیں لیفٹیننٹ کا ایک ایک لفظ سنایا اور یہ بھی کہا کہ میں تو اس لیفٹیننٹ کا گلا دبانے لگا تھا لیکن اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھا۔ حوالدار اور فصیح احمد ہنس پڑے اور بولے کہ اپنے آپ کو کنٹرول میں ہی رکھو.... یہ حوالدار اُس زمانے کے فوجیوں کی طرح اَن پڑھ یا بہت تھوڑا پڑھا لکھا نہیں تھا بلکہ اُس نے بھی دس جماعتیں پاس کی تھیں اور وہ سگنل کور کا تھا جس میں پڑھے لکھے فوجی ہی رکھے جاتے تھے۔ ویسے بھی وہ عقل اور ہوش کی باتیں کرتا تھا۔

"راز کی بات سنو میرے دوست!" —— حوالدار نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا —— "ہندوستان کی آزادی کے خواب دیکھنے والوں کی امیدیں خاک میں مل رہی ہیں کیونکہ جاپانیوں کا ایڈوانس یہ نہیں کہ رک گیا ہے بلکہ ایڈوانس پسپائی میں بدل گیا ہے۔ دو تین دن پہلے کی خبر یہ ہے کہ انگریزوں اور امریکیوں نے پورا برما جاپانیوں سے واپس لے لیا ہے اور یہاں جو جاپانی ہیں ان پر قیامت ٹوٹ رہی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ بھی یہاں سے پھر ایڈوانس کریں اور جوابی حملہ کریں لیکن ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اب یہ سوچو

کہ جاپانی ملایا سے بھاگ گئے تو ہمارا کیا بنے گا"۔

یہ تو ایسا سوال تھا جس کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ساری کی ساری آئی این اے کوالالپور میں نہیں تھی یہاں تو اس کی تھوڑی سی نفری تھی' باقی مختلف شہروں میں بٹی ہوئی تھی اور اس کا ہیڈ کوارٹر سنگاپور میں بنایا گیا تھا۔

یہاں میں یہ بھی بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جب بڑے ہی لمبے عرصے بعد واپس اپنے وطن پہنچا تھا تو آئی این اے کے تین چار آدمیوں سے وقتاً" فوقتاً" ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ان میں سے دو آدمی آئی این اے کی اور سبھاش چندر بوس کی بہت تعریفیں کرتے تھے۔ یہ وہ آدمی تھے جو ہندوؤں میں رہے تھے اور ہندوؤں کی فریب کاری اور عیاری کے جال میں آ گئے تھے۔ مجھے انگریزوں کی انڈین نیوی کا ایک چیف پٹی آفیسر بھی ملا تھا۔ وہ تو ہندوؤں کا مرید ہو گیا تھا۔ ان لوگوں کو ہندوؤں نے نہ جانے کیسے کیسے لالچ دیئے تھے۔

ایک مہینہ اور کچھ دن گزر گئے۔ آئی این اے اور اس کے لوگوں کی باتیں تو بہت ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ باتیں یہاں بے محل ہوں گی۔ موٹی اور بنیادی بات آپ کو بتا دی ہے کہ آئی این اے دراصل ہندوؤں کی ایک سکیم تھی جو میں پہلے واضح کر چکا ہوں۔ اس ایک مہینے میں میرے ذہن میں اگر کوئی شک تھا تو وہ بھی صاف ہو گیا۔ میں نے ہندوؤں کو دیکھا' ان میں سے اکثر ایسے تھے جو بڑے تکبّر بلکہ رعونت سے بات کرتے تھے جیسے انہیں ہندوستان کی بادشاہی مل گئی ہو.... ایک روز آئی این اے کی جو نفری وہاں تھی' اس میں ہڑبونگ بپا ہو گئی اور فوراً" سب کو فال اِن کر کے یہ بتایا گیا کہ کل دس بجے سبھاش چندر بوس آ رہا ہے۔ ہمیں ویسے ہی ہدایات دی گئیں جیسی کسی جرنیل کے دورے سے پہلے فوجیوں کو دی جاتی ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ سبھاش چندر بوس کو بھی دیکھ لوں گا۔

وہاں سارا ماحول فوجی تھا۔ فوجی ہی ہونا تھا کیونکہ وہاں کوئی سویلین تو تھا نہیں' سب فوجی تھے اور پوری کی پوری تنظیم فوجی تھی۔ اس میں عہدے دار' سردار اور کمیشنڈ آفیسر بھی تھے۔ اگلی صبح ہمیں فال اِن کر کے پریڈ گراؤنڈ میں لے جایا گیا۔ ہمیں ایک چھوٹے سے بنائے ہوئے سٹیج کے سامنے کھڑا کیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد دو فوجی جیپیں آئیں۔ اگلی جیپ پر جاپان کا چھوٹا سا جھنڈا لگا ہُوا تھا۔ اس جیپ میں سے سبھاش

چندر بوس دو جواں سال لڑکیوں کے ساتھ باہر نکلا۔ دوسری جیپ میں سے دو جاپانی افسر باہر آئے۔ اُس وقت سبھاش چندر بوس پورا جرنیل بنا ہُوا تھا۔ اس نے خاکی وردی پہنی ہوئی تھی۔ وہ سٹیج پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک لڑکی اس کی دائیں طرف اور دوسری بائیں طرف کھڑی ہو گئی۔ یہ دونوں لڑکیاں بھی خاکی وردی میں تھیں۔ جاپانی افسران لڑکیوں کے پیچھے کھڑے ہوئے۔

ہم نے سبھاش چندر بوس کو رائفلوں کی سلامی دی جس طرح فوجی پریڈ میں دیا کرتے ہیں۔ اس کے بعد سبھاش چندر بوس نے ہمارا معائنہ کیا اور پھر سٹیج پر جا کھڑا ہُوا۔ اُس نے اُردو زبان میں مختصر سی تقریر کی۔ اُس کا لب و لہجہ بنگالیوں والا تھا۔ میں اُس کی تقریر کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ لفظ بہ لفظ آپ کو سناؤں۔ وہ فوجی وردی پہن کر سمجھا ہو گا کہ وہ واقعی فوجی بن گیا ہے اور آئی این اے کا جرنیل ہے لیکن مجھے تو وہ فوجی لگتا ہی نہیں تھا۔ اُس نے نظر والی عینک چڑھا رکھی تھی۔ اُس کا چہرہ تو بھرا بھرا تھا لیکن صاف پتہ چلتا تھا کہ اندر باہر سے ہندو ہے اور اس کی ذہنیت ہندوؤں سے بہتر نہیں۔ اس نے جب تقریر کی تو کوئی شک نہ رہنے دیا۔

اُس نے وہی باتیں کیں جو ہندو لیڈر کرتے رہتے تھے یعنی یہ کہ ہندو مُسلم بھائی بھائی ہیں اور کانگرس سارے ہندوستانیوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ پھر اُس نے یہ خوش خبری سنائی کہ جاپانیوں کو بہت جلد ہندوستان پر بھی فتح حاصل ہو گی اور پھر ہندوستان آزاد ہو جائے گا اور وہاں ہماری اپنی حکومت قائم ہو جائے گی.... اُس کے بولنے کا انداز بڑا ہی جوشیلا اور جذباتی تھا۔ اگر میں نے اس کے متعلق اور ہندوؤں کے متعلق پہلے باتیں نہ سنی ہوتیں تو میں سبھاش چندر بوس سے بہت ہی متاثر ہوتا۔ میں حیران اس پر ہُوا کہ اس نے یہ دو لڑکیاں اپنے ساتھ کیوں رکھی ہوئی ہیں۔ شکل و صورت سے دونوں بنگالی معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے اپنے گاؤں واپس آ کر کچھ عرصہ بعد کسی انگریز کی لکھی ہوئی کتاب پڑھی تھی جو آئی این اے کے متعلق تھی۔ اس میں سبھاش چندر بوس کا ایک فوٹو دیا گیا تھا جب وہ جاپانیوں کے پاس تھا اور آئی این اے کی نفری کو خطاب کر رہا تھا۔ اس فوٹو میں بھی وہ دونوں لڑکیاں اس کے دائیں اور بائیں کھڑی تھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ کتاب کوئی دوست لے گیا اور آج تک واپس نہیں دی ورنہ میں وہ فوٹو یہاں پیش کرتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سبھاش چندر بوس مہاتما گاندھی کے بہت ہی خلاف تھا

لیکن اس کی ذہنیت اور دیگر باتیں مہاتما گاندھی جیسی ہی تھیں۔ مہاتما گاندھی بھی دو نوجوان لڑکیوں کو ساتھ رکھتا تھا اور جب باہر نکلتا تو اس کا ایک ہاتھ ایک لڑکی کے کندھے پر اور دوسرا دوسری لڑکی کے کندھے پر ہوتا تھا۔ سبھاش چندر بوس نے بھی اپنے ساتھ دو لڑکیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک تو یہ ہندووانہ ذہنیت کا مظاہرہ تھا اور میرا خیال ہے کہ جاپانیوں نے اسے کہا ہو گا کہ جنگ و جدل میں نوجوان لڑکیوں کا ساتھ ہونا بڑا ہی ضروری ہوتا ہے۔

○

میں نے کہا ہے کہ وہاں مجھے ایک مہینہ اور کچھ دن ہو گئے تھے۔ میں اُن دنوں کی دو چار باتیں آپ کو سنانا چاہتا ہوں اور یہ بھی دیکھیں کہ انسان زندہ رہیں تو ایسی جگہوں پر بھی بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں جہاں وہم و گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہاں بھی کبھی ملاقات ہو سکے گی.... وہاں آئی این اے کی جو نفری تھی' ان میں سارے ہی ہندوستان کے صوبوں کے جوان موجود تھے۔ ان میں پنجاب کے فوجیوں کی اکثریت تھی۔ ان میں میرے علاقے کے چند ایک جوان بھی تھے۔ میں نے یہ خاص طور پر دیکھا کہ یہ پلان تو ہندوؤں کا تھا لیکن آئی این اے میں اکثریت مسلمان فوجیوں کی تھی۔ ہندو تو بہت ہی تھوڑے تھے۔

میں اب آپ کو ملایا سے واپس اپنے علاقے میں لے آتا ہوں جہاں میں پیدا ہُوا اور جہاں سے میں فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ ایک روز ایک مسلمان لانس نائک ہسپتال سے فارغ ہو کر بارکوں میں آیا۔ میں جب سے یہاں آیا تھا وہ ہسپتال میں تھا۔ اسے ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا۔ اُس سے ملاقات ہوئی تو میں یہ سُن کر حیران رہ گیا کہ وہ ہمارے ہی علاقے کا رہنے والا تھا اور اس کا گاؤں وہی تھا جہاں واجدہ بیاہی گئی تھی یعنی وہ واجدہ کے خاوند آصف کا گاؤں تھا۔ میں نے اُسے اپنا گاؤں بتایا تو وہ بہت زیادہ پیار سے ملا۔ بخدا یوں لگا جیسے بچھڑے ہوئے دو سگے بھائی ملے ہوں۔ یہ کسی اور یونٹ میں تھا اور جنگی قیدی ہو گیا تھا۔ حوالدار کی طرح اُس نے بھی جاپانیوں کے ٹارچر سے بچنے کے لئے آئی این اے میں آ جانا بہتر سمجھا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اس سے یہ پوچھا کہ اس کے گاؤں کا آصف کس حال میں ہے۔ میں نے اسے یہ نہ بتایا کہ آصف کو میں نے بچایا اور میڈیکل کور کے حوالے کیا تھا۔

"وہ تو بے چارہ گھر میں معذور پڑا ہے" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "اُس کی دونوں ٹانگیں کٹ گئی تھیں اور جب ٹانگوں کے زخم ٹھیک ہوئے تو اسے گھر بھیج دیا گیا۔ میں اُس وقت چھٹی پر تھا جب آصف کو گھر لایا گیا تھا۔ اُسے دو فوجی گھر چھوڑنے آئے تھے۔ میری چھٹی پُوری ہوئی تو میں واپس گیا۔ مجھے برما فرنٹ پر بھیج دیا گیا تھا"۔

"آصف نے ہمارے گاؤں سے شادی کی تھی" ـــــ میں نے کہا ـــــ "اُس کی بیوی کس حال میں ہے؟"

میں قصبے کا رہنے والا تھا جو آج اچھا خاصا شہر بن گیا ہے لیکن اُسے میں قصبے کو گاؤں بتاتا رہا کیونکہ فوج میں زیادہ تر گاؤں کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اُس نے ایک بار پھر بڑی حیرت سے میرا نام اور میرے قصبے کا نام پوچھا اور میں نے اُسے دونوں نام بتائے۔ وہ کچھ دیر حیرت زدگی کی حالت میں مجھے دیکھتا رہا اور میں حیران کہ یہ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے۔

"یار!" ـــــ آخر اُس نے کہا ـــــ "تم یہاں بیٹھے ہوئے ہو اور آصف نے اور اُس کی بیوی نے تمہیں وہاں ہیرو بنایا ہُوا ہے۔ میری ایک بہن آصف کی بیوی کی بڑی گہری سہیلی ہے اور وہ آپس میں رازونیاز کی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ آصف کی بیوی کا نام واجدہ ہے جو تم تو جانتے ہی ہو"۔

مجھ پر کچھ عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی جس میں حیرت بھی تھی اور جذباتیت بھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے ایک باب میں تفصیل سے سنایا ہے کہ آصف کو میں نے محاذ پر کس طرح اتفاق سے زخمی حالت میں دیکھ لیا تھا اور اسے بچا بھی لیا تھا۔ اگر اسے میں نہ دیکھ سکتا تو میڈیکل کور کے جوان اُس تک کبھی نہ پہنچتے اور وہ خون بہہ جانے سے وہیں مر جاتا۔ وہ باب ایک بار پھر پڑھ لیں تاکہ آپ کی یاد تازہ ہو جائے۔ اس کے بعد میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ آصف کا انجام کیا ہُوا ہو گا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ زندہ پیچھے پہنچا ہو گا۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ ہسپتال میں اس کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے اوپر یا نیچے سے کاٹ دی جائیں گی۔ اس کی ٹانگوں کی ہڈیاں چُور چُور ہو گئی تھیں جن کے جُڑنے کی اُمید ہی ختم ہو گئی تھی۔ اُس روز ایک مدت بعد میں نے آصف اور واجدہ کا نام سنا اور ایسے آدمی کی زبان سے سنا جو سب کچھ بتا سکتا تھا۔ میں نے اسے بڑی بیتابی سے کہا کہ وہ مجھے آصف اور واجدہ کی پوری بات سنائے۔

میں اُس کی سنائی ہوئی بات کو مکالموں میں پیش کرنے کی بجائے اپنی زبان میں سیدھے طریقے سے سنا دیتا ہوں۔ اس نے یہ ساری باتیں آصف کی زبان سے سُنی تھیں اور واجدہ کی باتیں اس کی بہن نے اس سے سُنی تھیں اور اُن دونوں کی آپس میں رازداری تھی۔ اس لئے ان دونوں کی سنائی ہوئی ساری بات بالکل صحیح اور مستند تھی....

مختصراً" بات یہ بنی کہ آصف کو برما فرنٹ سے پیچھے لے جا کر بذریعہ ہوائی جہاز کلکتے پہنچایا گیا تھا۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ برما فرنٹ پر ایک انجن والے چھوٹے جہاز استعمال کئے گئے تھے جو شدید زخمیوں کو پیچھے ڈھاکہ یا کلکتہ تک پہنچاتے تھے۔ یہ چھوٹے جہاز جنگ کے دوران یا شاید بعد میں توپ خانے کو دے دیئے گئے تھے اور ان میں او پی اُڑ کر دشمن کی پوزیشنیں دیکھتے اور اپنے توپ خانے کو فائر آرڈر دیتے تھے۔ بہرحال جیسے بھی ہُوا آصف کو زندہ کلکتہ کے فوجی ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں' جیسا کہ توقع تھی' اس کی دو ٹانگیں گھٹنوں سے کاٹ دی گئیں۔ ایک ٹانگ گھٹنے کے نیچے سے کٹی اور دوسری گھٹنے کے ذرا اوپر سے۔ تین مہینے بعد اسے فوج نے اپنے انتظام کے تحت اس کے گھر پہنچا دیا۔

اس کے گھر والوں کو پہلے ہی اطلاع دے دی گئی تھی کہ آصف محاذ پر زخمی ہو گیا ہے' زندہ ہے اور ٹھیک ہونے پر گھر پہنچا دیا جائے گا۔ وہ خوشحال گھرانہ تھا اس لئے اس کا باپ اور بھائی کلکتہ تک سفر کر سکتے تھے جو انہوں نے کیا اور آصف کو دیکھنے کلکتہ ہسپتال تک گئے۔ وہ جب گھر پہنچا تو اس کی حالت افسوسناک ہی تھی لیکن اس کے گھر والوں کو یہ خوشی تھی کہ وہ زندہ ہے۔ اس کے لئے روزگار کا اور ذریعۂ معاش کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ان کی زمین اچھی خاصی تھی جو سال بھر کا اناج اور کچھ پیسے بھی دے دیتی تھی۔

آصف نے گاؤں پہنچ کر میرا نام لیا اور ہر کسی کو بتایا کہ میں نہ ہوتا تو وہ زندہ گھر نہیں پہنچ سکتا تھا اور اسے وہاں جنگل میں ہی برما کے درندے اور گِدھیں کھا جاتے۔ اُس نے ہر کسی کے ساتھ میرا ذکر ایسے کیا جیسے میں اس کے لئے رحمت کا فرشتہ تھا اور اسے نئی زندگی خدا نے نہیں بلکہ میں نے دی ہے۔ واجدہ چونکہ میرے قصبے کی رہنے والی تھی اور میرے ساتھ اس کا جو جذباتی تعلق تھا' وہ میں سنا چکا ہوں۔ اس نے جب آصف کی زبانی میرا یہ کارنامہ سنا تو اس نے میرے گھر جا اطلاع دی۔ اس دن سے کچھ پہلے بلکہ زیادہ پہلے میرے گھر والوں کو سرکاری اطلاع پہنچ گئی تھی کہ تمہارا بیٹا برما فرنٹ پر لاپتہ ہو گیا ہے۔ لاپتہ ہونا ایک سرکاری اصطلاح تھی۔ اس کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ تمہارا بیٹا

مارا گیا ہے اور اس کی لاش نہیں ملی۔ آصف نے جا کر یہ خبر سنائی کہ میں تو زندہ ہوں۔ میرے والدین دوڑے ہوئے آصف کے گھر پہنچے اور آصف نے میرے باپ اور میری ماں کو بڑے ہی جذباتی انداز میں سنایا کہ میں نے اسے کس طرح بچایا ہے۔ میرے والدین اُس سے بار بار پوچھتے تھے کہ اس نے مجھے کہاں دیکھا تھا' کس حال میں دیکھا تھا اور کیا میرے زندہ رہنے کا امکان ہے یا نہیں۔ آصف نے انہیں یہ الفاظ کہے ـــــ "جس نے مجھے زندگی دی ہے اُسے اللہ زندہ رکھے گا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تمہارا بیٹا زندہ ہے اور زندہ واپس آئے گا"۔

جب میرا یہ آئی این اے کا ساتھی مجھے آصف کے الفاظ سنا رہا تھا تو میں اتنا جذباتی ہو گیا کہ میرے آنسو بہہ نکلے۔ ان الفاظ کا مجھ پر ایسا اثر ہُوا کہ جیسے خداوند تعالیٰ نے مجھے مژدہ سنایا ہو کہ تم زندہ واپس پہنچو گے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے زندہ واپس پہنچنے کی ذرا سی بھی امید نہیں تھی۔ میں کہتا تھا کہ یہیں کہیں مارا جاؤں گا یا پکڑا جاؤں گا اور کورٹ مارشل میں مجھے گولی مار دی جائے گی۔

میرے اس ساتھی نے آصف کی بہت سی باتیں سنائی تھیں جنہیں میں ان الفاظ میں سمیٹ دیتا ہوں کہ وہ گاؤں میں میرے ہی نام کی تسبیح کرتا رہتا تھا۔ کوئی آ کر اس کے پاس بیٹھتا تو وہ سب سے پہلے میرا نام لیتا اور کہتا کہ وہ تو رحمت کا فرشتہ تھا جو اس جنگل میں آسمان سے اترا اور مجھے اٹھا کر نئی زندگی میں داخل کر دیا۔ یہ تو میں آپ کو پہلے سنا چکا ہوں کہ آصف تو میرا اتنا بڑا دشمن تھا کہ اس نے مجھے قتل کروا دینا تھا۔ اب مجھے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ اس کے دل کی گہرائیوں سے میرے لئے دعائیں نکل رہی تھیں اور مجھے پوری امید تھی کہ اللہ قبول فرمائے گا۔

یہ بات تو تھی آصف کی' میرے ملایا والے اس ساتھی نے واجدہ کی جو بات سنائی' اس نے میری کچھ اور ہی حالت کر دی۔ واجدہ نے اپنے دل کی یہ ساری باتیں میرے اس ساتھی کی بہن کے ساتھ کی تھیں اور بہن نے یہ باتیں اپنے گھر والوں کو سنائی تھیں۔ واجدہ کو جب پتہ چلا تھا کہ آصف زخمی ہو کر کلکتہ کے ہسپتال میں پڑا ہے تو اس کے دل کو خوشی سی ہوئی تھی کہ آصف سے اسے آزادی مل جائے گی۔ اُس نے تو یہ دعا بھی کی تھی کہ آصف زندہ گھر نہ پہنچے۔ یہ میری محبت کا اثر تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اُسے اپنے خاوند کی موت کی دعا کرنی چاہیئے تھی یا نہیں' میں یہ بتا رہا ہوں کہ میری محبت اُس

کے دل میں کتنی گہری اُتری ہوئی تھی۔ اُس وقت واجدہ اپنے ماں باپ کے گھر میں تھی۔ اس نے آصف سے یہ بات منوا رکھی تھی کہ جب وہ گھر نہیں ہُوا کرے گا یعنی سروس میں ہُوا کرے گا تو واجدہ اپنے ماں باپ کے گھر میں رہا کرے گی۔ آصف کے والدین نے بھی اسے یہ اجازت دے دی تھی۔

آصف جب ٹھیک ہو کر گاؤں پہنچا تو واجدہ دل پر بوجھ لے کر اپنے سسرال گئی۔ آصف نے اسے بھی میرے متعلق اس طرح سنایا جیسے میں نہ ہوتا تو آصف زندہ ہی نہ رہتا۔ زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن آصف کچھ زیادہ ہی مجھ سے متاثر ہو گیا تھا۔ واجدہ نے اپنی سہیلی کو بتایا کہ آصف نے اسے صاف لفظوں میں کہا تھا کہ واجدہ میں ساری عمر کے لئے معذور ہو گیا ہوں۔ اگر تم مجھ سے پلّہ چھڑوانا چاہتی ہو تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا اور اگر خانی زندہ واپس آ گیا تو اس کے ساتھ شادی کر لینا۔ یہ بات کہہ کر آصف کے آنسو نکل آئے اور وہ بہت رویا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مجھ جیسے اپاہج آدمی کو کون قبول کرتا ہے' یہ تو خدا کی طرف سے آئی تھی اور بندوں کا یہ حال ہے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔

آصف کے یہ الفاظ واجدہ کو ایسے لگے جیسے اُس کے دل میں تیر اُتر گیا ہو۔ اُس نے آصف سے کہا کہ میں نے تمہارے ساتھ اللہ اور رسول کا کلمہ پڑھ کر نکاح پڑھوایا تھا۔ تمہیں اللہ نے معذور کیا ہے تو میں اللہ کے حکم کے خلاف چلنے کا گناہ کبھی نہیں کروں گی۔ میں باقی عمر تمہاری خدمت میں گذار دوں گی۔

میرے ساتھی کی بہن نے اسے بتایا کہ واجدہ بالکل ہی بدل گئی اور اس نے صحیح معنوں میں اپنی زندگی اور اپنا آرام و سکون آصف کے لئے وقف کر دیا۔ واجدہ نے اپنی سہیلی کو یہ بھی بتایا تھا کہ اسے مجھ سے محبت ہے اور وہ مجھے دل سے اتار نہیں سکتی لیکن آصف کے آنسو دیکھ کر اور یہ دیکھ کر کہ اتنا جری اور جابر اور خوبرو جوان معذور ہو کر ایک عورت کے آگے سر جھکا رہا ہے۔ واجدہ نے اسے کہا کہ تم میرے خاوند ہو اور میں تمہاری عزت ہوں۔ میں تمہارا سر کبھی نیچے نہیں ہونے دوں گی.... واجدہ نے اپنے سُسرال کو حیران کر کے رکھ دیا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ آصف کی عبادت کرتی ہے۔

مجھ سے اب یہ نہ پوچھیں کہ میری جذباتی حالت کیا ہوئی۔ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ یہ بتا سکتا ہوں کہ کبھی افسوس ہوتا کہ واجدہ نے مجھے دھوکا دیا ہے اور مجھے دل

سے اتار دیا ہے۔ کبھی میرا دل خوش ہو جاتا کہ واجدہ نے بہت بڑی نیکی کی ہے کہ اپنے معذور خاوند کو سینے سے لگا لیا ہے اور اپنی عاقبت سنوار لی ہے۔ کچھ ایسی ہی کشمکش تھی جس نے مجھے کسی ایک خیال پر ٹکنے نہ دیا اور میں اس خیال میں کھو گیا کہ میں زندہ واپس چلا گیا اور وہاں بھی زندہ رہا تو واجدہ کا میرے ساتھ اور میرا واجدہ کے ساتھ کیا سلوک ہو گا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ واجدہ سے ملوں گا ہی نہیں.... لیکن یہ تو خواب و خیال کی باتیں تھیں' ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ کبھی زندہ واپس جاؤں گا۔

(جاری ہے)

فصیح احمد کا تعلق انٹیلی جنس کے ساتھ تھا اس لئے کوئی ایسی راز کی بات ہوتی جو ہندوستانیوں تک پہنچانے والی نہ ہوتی' فصیح احمد کو معلوم ہو جاتی تھی۔ جاپانی اتنے کچے نہیں تھے کہ ایک ہندوستانی کو راز کی باتیں بتا دیتے لیکن فصیح احمد بڑا ذہین اور ہوشیار جوان تھا' وہ کچھ نہ کچھ بُو سونگھ لیتا تھا۔

"لوخانی بھائی!" ـــــ ایک روز فصیح نے دفتر سے آکر مجھے بتایا ـــــ "اب اپنا اچھا برا سوچ لو"۔

اُس کی اتنی سی بات سے بھی میرا خون خشک ہو گیا۔ میرا چہرہ یقیناً" پیلا پڑ گیا ہو گا۔ میں نے اُس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"جاپانی فوج کو برما سے نکال دیا گیا ہے" ـــــ فصیح نے کہا ـــــ "ایک بات پہلے ہی سُن لو۔ یہ میں صرف تمہیں بتا رہا ہوں۔ کسی اور کے ساتھ بات نہ کرنا۔ جاپانی بری طرح برما سے پسپا ہوئے ہیں اور بڑی زبردست لڑائی لڑی گئی ہے۔ جاپانیوں کا جانی نقصان بہت زیادہ ہوا ہے پھر بھی انہوں نے کچھ اور ہندوستانی قیدی پکڑ لئے ہیں"۔

"مجھے یہ بتاؤ فصیح!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "تم نے کہا ہے کہ اپنا اچھا برا سوچ لو۔ یہ کیوں کہا ہے؟"

"ہم پکڑے جا سکتے ہیں" ـــــ فصیح نے کہا ـــــ "پہلے تو یہ امید ہے کہ جاپانی فوج ملایا میں جم کر مقابلہ کرے گی۔ ملایا کے شمالی علاقوں میں جاپانی بڑی زبردست مورچہ بندی کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی نیوی بھی اِدھر ہی اکٹھی کر لی ہے لیکن امریکیوں اور انگریزوں نے اتنا طاقتور حملہ کیا ہے کہ ملایا میں بڑی ہی خونریز جنگ ہو گی۔ ہو سکتا ہے

جاپانی ملایا سے بھی بھاگ جائیں۔ اس صورت میں ہم انگریزوں کی فوج کے ہاتھ چڑھ سکتے ہیں اس لئے میں نے کہا ہے کہ اپنا اچھا بُرا سوچ لو۔ اگر ہم پکڑے گئے تو ہم پر بھگوڑا ہونے کا اور باغی ہونے کا الزام لگے گا"۔

اتنے میں میرا دوست شفیع بھی ہمارے پاس آ بیٹھا۔ شفیع اس جوان کا نام تھا جو واجدہ کے سسرال گاؤں کا رہنے والا تھا اور اُس نے مجھے واجدہ اور اُس کے خاوند آصف کی پوری خبریں سنائی تھیں۔ وہ ہم دونوں کا پکّا دوست بن گیا تھا اور وہ تھا ہی دوستی کے قابل۔ فصیح نے اُسے بھی جاپانیوں کی برما سے پسپائی کی خبر سنا دی اور ہم دونوں نے اُسے کہا کہ وہ کسی اور کو نہ بتائے۔ ہم تینوں دوست سوچنے لگے اور آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے کہ جاپانی فوج ملایا سے بھی بھاگ گئی اور ہم یہیں رہ گئے تو کیا کریں گے۔ ہم جانتے تھے کہ ہمیں فوج سے فرار اور دشمن کے ساتھ مل جانے کے جرم میں گولی مار دی جائے گی۔

"میرے دماغ میں ایک بات آتی ہے" ـــــ فصیح احمد نے کہا ـــــ "اگر ہم پکڑے گئے تو یہ بیان دیں گے کہ ہم تو جنگی قیدی ہو گئے تھے اور جاپانیوں نے ہم سے جانوروں جیسا کام کرانا شروع کر دیا اور اتنا بھُوکا رکھا کہ ہمیں موت صاف نظر آنے لگی تھی۔ انہوں نے زبردستی ہمیں آئی این اے میں شامل کر لیا اور ہم اب خود ہی پیچھے رہ گئے ہیں تاکہ اپنی فوج میں واپس چلے جائیں۔ اب تم دونوں سوچ لو کہ کہاں کہاں سے بھاگے تھے' اس کے مطابق اپنا کچھ نہ کچھ بیان تیار کر لو"۔

"میں تو بھگوڑا نہیں ہُوا تھا" ـــــ شفیع نے کہا ـــــ "میری بٹالین والوں کو بھی یقین ہو گا کہ میں جنگی قیدی ہو گیا تھا"۔

میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ میں کس طرح یہ ثابت کروں گا کہ میں بھگوڑا نہیں ہُوا تھا بلکہ میں جنگی قیدی ہو گیا تھا۔ بہرحال ہمارے لئے یہ مسئلہ زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا تھا۔ امید کی صرف ایک کرن نظر آتی تھی جو یہ تھی کہ جاپانی ملایا میں جم کر مقابلہ کریں گے اور انگریزوں اور امریکیوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ جاپانی جس جذبے سے لڑتے تھے' اس جذبے کو دیکھتے ہوئے میری یہ امید اور زیادہ روشن ہو جاتی تھی کہ جاپانی کم از کم ملایا سے نہیں بھاگیں گے اور ہو سکتا ہے جاپانیوں نے محاذ کو کنٹرول کرنے کے لئے ہی برما چھوڑ دیا ہو۔

"دیکھ لیں گے یار، کیا ہوتا ہے!" ـــ فصیح احمد نے کہا ـــ "جیسے حالات ہوں گے ویسے ہی اپنا روّیہ بنالیں گے۔ صرف خیال رکھنا کہ ہمت اور عقل کو اپنے قابو میں رکھنا"۔

○

دن گزرتے جارہے تھے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ انڈین نیشنل آرمی کے ہندوستانی فوجیوں تک یہ خبر نہیں پہنچی کہ جاپانی فوج برما سے پسپا ہو آئی ہے اور پسپا ہی ہوتی چلی آ رہی ہے۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آئی این اے میں جو ہندو عہدیدار اور جوان تھے، اُن کا روّیہ بالکل ہی بدلتا جارہا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کے حاکم سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ تفصیلات میں پہلے ہی سنا چکا ہوں۔ یہ بھی سنایا ہے کہ آئی این اے میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی بلکہ اکثریت مسلمانوں کی تھی لیکن ہندوؤں نے مسلمان فوجیوں کو اپنے ماتحت سمجھنا شروع کر دیا تھا۔

ایک روز ایک مسلمان حوالدار اور ایک ہندو حوالدار کے درمیان سیاسی بحث چل نکلی۔ ہمارے لئے حکم یہ تھا کہ سیاست بازی میں نہیں اُلجھنا اور اپنا اتحاد اور اتفاق نہیں چھوڑنا۔ ہمیں ہندو مسلم بھائی بھائی کا اصول اور نعرہ دیا گیا تھا۔ ان دونوں حوالداروں میں بات تو کچھ اور چلی تھی لیکن ہندو حوالدار نے باتوں باتوں میں یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ وہ برتر اور اعلیٰ کلاس کا فرد ہے اور مسلمان اس سے نیچے درجے کے لوگ ہیں۔

مسلمان حوالدار برداشت کرتا رہا اور ہندو حوالدار سے یہی کہتا رہا کہ ہندوستان کی تمام قومیں ایک جیسی ہیں اور اُن میں کوئی اونچا اور کوئی نیچا نہیں۔ ہندو حوالدار نے آخر یہ الفاظ کہہ دیئے کہ تم ہندوستان میں ہمارے غلام ہو گے اور تم میرے بوٹ صاف کیا کرو گے۔ مسلمان حوالدار ہنس پڑا اور اُس نے طنزیہ اس حوالدار سے کہا، لالہ جی! وہ وقت آنے دیں، پھر دیکھیں گے کون کس کے بوٹ صاف کرتا ہے۔

"وہ وقت آیا ہی سمجھو!" ـــ ہندو حوالدار نے کہا ـــ "ہم تمہاری صرف وہ مسجدیں کھڑی رہنے دیں گے جو ہم چاہیں گے، باقی مسجدیں ہم گرا دیں گے یا کسی کے حوالے کر دیں گے کہ وہ اس میں رہائش اختیار کر لیں"۔

مسلمان حوالدار نے اس کا جواب ہندو حوالدار کو یہ دیا کہ اُس کے منہ پر پوری طاقت سے گھونسا مارا۔ ہم دیکھ رہے تھے۔ ہندو حوالدار اٹھا تو مسلمان حوالدار نے

گھونسوں، تھپڑوں اور ٹھڈوں سے اس ہندو حوالدار کا حلیہ بگاڑ دیا۔

پھر ہم مسلمان حوالدار کو پکڑ نہ لیتے تو وہ اُس ہندو حوالدار کو شاید جان سے ہی مار ڈالتا۔ ہم سب نے اور ہندوؤں نے بھی ہندو حوالدار کو بچا لیا اور کوشش یہ کی کہ یہ معاملہ یہیں رفع دفع ہو جائے لیکن ہندو حوالدار اتنی پٹائی کے بعد ایک مسلمان کو بخشنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ دوڑا گیا اور جا رپورٹ کی کہ ایک مسلمان نے اسے مارا پیٹا ہے۔ اس کے نتیجے میں مسلمان حوالدار کو دفتر بلایا گیا اور کچھ دیر بعد ہمیں پتہ چلا کہ اسے پندرہ دنوں کے لئے لیبر کیمپ میں بھیج دیا گیا ہے۔ لیبر کیمپ میں ویسی ہی مشقت کرائی جاتی تھی جیسی میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ جو انگریز جنگی قیدیوں سے لی جارہی تھی۔

مسلمان حوالدار کو تو اُدھر سے ہی لیبر کیمپ میں لے گئے اور ادھر ہم سب کو فال اِن کر کے ایک ہندو لیفٹیننٹ نے لیکچر دیا۔ وہ دراصل کہہ تو یہ رہا تھا کہ ہندوستان کی تمام قوموں کے افراد ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں اور ہندوستان کی ملکیت اور حکومت میں سب شامل ہوں گے لیکن کوئی کوئی بات وہ ایسی کہہ دیتا تھا جس سے ہم سمجھ لیتے تھے کہ وہ کہنا یہ چاہتا ہے کہ ہندوستان پر ہندوؤں کی حکومت ہو گی اور مسلمان ان کے آگے سر جھکا کر رہیں۔ آخر میں اُس نے یہ کہا کہ آئندہ کسی اور نے ایسی حرکت کی تو اسے ہمیشہ کے لئے لیبر کیمپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔

کسی مسلمان فوجی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ اس ہندو حوالدار نے مسلمان حوالدار کو کیسی کیسی باتیں کہی تھیں جو کوئی بھی مسلمان برداشت نہیں کر سکتا چاہئے تو یہ تھا کہ ہندو حوالدار کی رپورٹ کے بعد ان فوجیوں کی گواہی لی جاتی جنہوں نے ان دونوں حوالداروں کا بحث و مباحثہ سنا تھا اور پھر لڑائی بھی دیکھی تھی لیکن وہاں برتری ہندوؤں کو حاصل تھی اس لئے مسلمان حوالدار کو صفائی پیش کرنے کا موقعہ ہی نہ دیا گیا۔ اس سے مسلمان فوجیوں میں بددلی پھیلنے لگی۔

برما کے جنگلوں میں اور پھر ملایا میں آ کر واجدہ مجھے کبھی کبھی یاد آیا کرتی تھی اور اس کے ساتھ اس کے خاوند آصف کا خیال آتا کہ وہ زندہ واپس پہنچ سکا تھا یا نہیں۔ کبھی یہ خیال بھی آ جاتا کہ آصف اگر مر گیا ہے تو شاید میں زندہ واپس چلا گیا تو واجدہ کے ساتھ شادی کر لوں گا۔ واجدہ کے ساتھ میری شادی ممکن نہیں تھی کیونکہ ذات پات کا فرق تھا۔ کبھی تو میں خیالی پلاؤ پکانے لگتا کہ واجدہ کو ساتھ لے کر کہیں بھاگ جاؤں گا۔

یہ یادیں میرے ذہن اور دل سے کم ہونے لگی تھیں۔ حالات ایسے ہو گئے تھے کہ غیر یقینی سی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی جس کے زیرِ اثر واجدہ اور آصف کی یادیں آہستہ آہستہ محو ہونے لگی تھیں لیکن شفیع نے آکر ان یادوں کو پھر تازہ کر دیا۔ میں نے ذہن سے یہ اُتار دیا کہ واجدہ اب کبھی میری بن جائے گی۔ اُس نے اپنی زندگی آصف کے لئے وقف کر دی تھی‘ پھر بھی میں کبھی شفیع کو اپنے پاس بٹھا لیتا اور اس سے واجدہ اور آصف کی باتیں سنا کرتا تھا۔ اس سے مجھے ذرا تسکین سی ہو جاتی تھی۔

کوالالمپور اچھا خاصا بڑا شہر تھا۔ اس کی زیادہ تر شہری آبادی بھاگ گئی تھی اور کچھ لوگ شہر میں ہی رہ گئے تھے۔ بھاگنے والے جاتے کہاں‘ ہر طرف جاپانی فوج پھیل گئی تھی۔ بھاگنے والے جنگلوں میں خجل خوار ہوتے رہے اور کچھ اُن شہروں کی طرف چل پڑے جن کے متعلق انہیں امید تھی کہ محفوظ ہوں گے لیکن پورے ملایا پر جاپانی فوج قابض ہو چکی تھی۔ لوگ آہستہ آہستہ واپس آنے لگے۔ یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ کتنے لوگ بھوک پیاس اور بیماریوں سے مر ہی گئے تھے۔ جاپانیوں نے ملایا سے بھی خوبصورت لڑکیاں اٹھا لیں اور اپنے قبضے میں رکھ لی تھیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہاں کے شہریوں کو کوئی اور پریشانی نہ دی۔

ایک روز اڑھائی تین بجے کا وقت ہو گا کہ میں‘ فصیح اور شفیع ویسے ہی ٹہلتے ٹہلتے شہر سے باہر نکل گئے۔ شہر کے ساتھ ہی تھوڑے سے فاصلے پر سات آٹھ گھروں کی ایک آبادی تھی اور اس میں ایک مسجد بھی تھی۔ ہم اُدھر جا نکلے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم نے کبھی نماز پڑھی تھی یا نہیں‘ لیکن کسی بھی مسجد کو دیکھ کر ہمارے دل باغ باغ ہو جاتے تھے اور اس کے ساتھ یہ احساس بیدار ہوتا تھا کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان ایک عظیم قوم ہے۔

فصیح احمد نے کہا کہ ان چند ایک گھروں میں مسجد ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سارے گھر مسلمانوں کے ہوں گے‘ چلو اس آبادی میں چلتے ہیں۔ چلنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ان میں سے کسی گھر میں جا گھسیں گے بلکہ اس آبادی میں سے گزریں گے اور مسلمانوں کو دیکھیں گے۔

ہم ان گھروں سے پچاس ساٹھ قدم دور ہوں گے کہ ایک عجیب منظر نظر آیا۔ پہلے ایک عورت کی چیخ و پکار سنائی دی پھر وہ عورت سامنے آ گئی لیکن اس حالت میں کہ ایک

سکھ نائیک نے اور ایک ہندو لانس نائیک نے اُس کے بازو پکڑے ہوئے تھے اور اُسے گھسیٹ کر ایک طرف لے جا رہے تھے۔

"میرے دوستو!" ___ فصیح احمد نے کہا ___ "اگر یہ عورت مسلمان ہوئی تو میں اس سکھ اور اس ہندو کو زندہ نہیں چھوڑوں گا"۔

اس علاقے پر فوج کا قبضہ تھا۔ فوجی ایسی حرکتیں کرتے ہی رہتے تھے۔ ایسی حرکتیں کرنے والے فوجیوں کو ان کے ساتھی فوجی نہیں روکتے تھے بلکہ لطف اٹھایا کرتے اور مذاق بھی کیا کرتے تھے۔ ہم تینوں نے آپس میں طے کر لیا کہ آگے چل کر دیکھتے ہیں یہ عورت کس مذہب کی ہے۔ اگر مسلمان ہوئی تو ہم اسے ان فوجیوں سے چھڑا لیں گے۔ اس ارادے سے ہم نے اپنے قدم ذرا تیز کر لئے۔

ہم تینوں نے اپنے آپ کو لڑائی کے لئے تیار کر لیا۔ یہ تو بعد کی بات تھی کہ یہ عورت کس مذہب کی تھی‘ اس سکھ اور ہندو نے ایک ایسی حرکت کی کہ ہمارے دماغ خراب ہو گئے۔ حرکت یہ کی کہ اس عورت کو مسجد کے اندر لے گئے۔ ہم تینوں دوڑ پڑے۔ یہ اب ایک عورت کی نہیں بلکہ ایک مسجد کی بے حُرمتی تھی۔ ہم جب مسجد کے دروازے پر پہنچے تو ہندو اور سکھ عورت کو جُوتیوں سمیت مسجد کے اندر لے گئے تھے۔

یہ چھوٹی سی مسجد تھی جو زمین سے ذرا اوپر بنائی گئی تھی۔ اس کے دروازے کی تین یا چار سیڑھیاں تھیں۔ آگے چھوٹا سا صحن تھا پھر آگے چھوٹا سا برآمدہ اور آگے کمرہ تھا اس کے تین چار یا شاید دو تین دروازے تھے۔ برآمدے اور اندر والے کمرے میں صفیں اور چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔

ہم جب مسجد کے دروازے پر جا رکے تو مسجد سے ایک بزرگ صورت آدمی جس کی سفید داڑھی تھی‘ نکلا اور فوجیوں کو روکنے لگا کہ وہ اس عورت کے ساتھ یہ بدتمیزی نہ کریں یا کم از کم مسجد کی بے ادبی نہ کریں۔ سکھ نے عورت کا بازو چھوڑ کر اس بزرگ صورت انسان کا بازو پکڑا اور اسے اتنی زور سے باہر کو دھکا دیا کہ وہ صحن سے دروازے میں منہ کے بل آ گرا اور یوں اٹھنے کی کوشش کرنے لگا جیسے وہ اٹھ ہی نہیں سکے گا۔ یہ بزرگ مسجد کے اندر کہیں بیٹھا ہُوا تھا۔ اس کی داڑھی اور اس کا لباس اور اس کے سر پر ٹوپی بتاتی تھی کہ یہ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ کوئی عالم ہے اور مذہبی پیشوا ہے۔

ہم سے یہ برداشت نہ ہُوا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس بزرگ کو اٹھایا اور پھر ہم

تینوں بھوکے بھیڑیوں کی طرح اس سکھ نائیک اور ہندو لانس نائیک پر جا پڑے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہم نے پہلے اپنے جوتے اُتارے تھے۔ اس وقت تک وہ اُس عورت کو مسجد کے برآمدے میں لے گئے تھے۔

فصیح احمد عقل والا جوان تھا۔ اُس نے لڑائی جھگڑا روکنے کے لئے مجھے اور شفیع کو اپنے بازو سے پیچھے کر دیا ہم دونوں رک گئے۔ میں نے عورت کو دیکھا۔ وہ جوان عورت تھی اور اچھی شکل صورت والی تھی۔ شکل صورت کو چھوڑیں' وہاں فوجیوں کو صرف عورت کی ضرورت ہوتی تھی۔ یہ عورت بُری طرح رو رہی تھی اور ان دو کافروں نے اُسے بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا۔

"تم مسلمان ہو؟" —— فصیح احمد نے عورت سے پوچھا۔

عورت نے اپنا سر زور زور سے اوپر نیچے ہلاتے ہوئے کہا —— "مسلمان ہاں مسلمان...."

صحن سے اُس بوڑھے کی آواز اٹی جسے سکھ نے دھکا دے کر باہر پھینک دیا تھا۔

"یہ مسلمان ہے" —— بزرگ نے کہا —— "میں مسجد میں ایسا نہیں ہونے دوں گا"۔

اُس بزرگ نے اتنی صاف اردو نہیں بولی تھی۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ غصے سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ وہ اندر آگیا۔ ملایا کے لوگ اُردو نہیں بول سکتے تھے۔ مجھے یہ اطمینان ہُوا کہ کم از کم یہ بوڑھا کچھ نہ کچھ اُردو کے الفاظ تو جانتا ہے۔

سکھ یہ سمجھا کہ ہم بھی اسی جیسے فوجی ہیں اور ہم اس عورت میں حصہ وصول کرنے کے لئے آئے ہیں۔ اُس نے کہا کہ یہ شکار ہمارا ہے' پہلے ہم اور پھر اسے ہم تمہارے حوالے کر کے چلے جائیں گے.... یہ باتیں پنجابی میں ہو رہی تھیں۔

"یہ کسی کا بھی شکار نہیں" —— فصیح نے سکھ سے کہا —— "اسے چھوڑ دو اور دوسری بات یہ دیکھو کہ تم نے مسجد کی بے ادبی کی ہے۔ جوتوں سمیت مسجد میں آگئے ہو اور پھر مسجد میں تم بدکاری کرنا چاہتے ہو۔ ہم مسلمان ہیں اور یہ ہم برداشت نہیں کریں گے' تم ہمارے فوجی بھائی ہو اس لئے تمہیں ایک موقع ضرور دیں گے"۔

"جا اوئے نس جا ایتھوں!" —— سکھ نے دو گالیاں دے کر اپنی دو آبے والی پنجابی

زبان میں کہا —— "تُسی کتھے دے مسلے ایتھے آوڑے او۔ وڈے آئے مسیت والے!" —(جاؤ اوئے' یہاں سے بھاگ جاؤ۔ تم کہاں کے مسلمان یہاں آگئے ہو۔ بڑے آئے مسجد والے)۔

عورت ان دونوں کافروں کے ہاتھوں میں آزاد ہونے کو تڑپ رہی تھی اور سفید ریش بزرگ الگ کھڑا پیچ و تاب کھا رہا تھا اور کچھ نہ کچھ کہہ رہا تھا۔ شفیع سکھ کے بائیں پہلو کی طرف کھڑا تھا۔ سکھ کی یہ بےہُودہ بات اس کے منہ سے نکلی ہی تھی کہ شفیع نے اس کے منہ پر بائیں طرف سے بڑی زور سے گھونسا جما دیا۔ سکھ کی گرفت عورت پر ڈھیلی ہو گئی اور وہ دائیں طرف کو گرنے لگا۔ فصیح نے عورت کو کندھوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور چھوڑ دیا۔ عورت ہندو کے ہاتھوں سے بھی آزاد ہو گئی۔

فصیح نے بڑی پھرتی سے سکھ کے منہ پر سیدھا گھونسا مارا اور سکھ دو تین قدم پیچھے گرا۔ ہندو باہر کو دوڑا لیکن میں نے اپنی ٹانگ کا اُسے ایسا اڑنگا دیا کہ وہ منہ کے بل گرا۔ وہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل اٹھ رہا تھا کہ میں نے اُس کے پہلو میں بڑی زور سے کک ماری۔ وہ پیٹھ کے بل پیچھے جا پڑا۔ میں نے اس کے دوسرے پہلو میں اسی طرح ایک اور کک ماری۔ مجھے معلوم تھا کہ اب یہ آسانی سے اُٹھ نہیں سکے گا۔ میرا خون ایسی بُری طرح اُبل رہا تھا کہ یہ خون میرے دماغ کو چڑھ گیا۔ ہندو میرے سامنے پیٹھ کے بل پڑا ہُوا تھا اور اس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کتنی تکلیف میں ہے۔ میں نے اپنا دایاں پاؤں اس کی شہہ رگ پر رکھ کر اوپر پورے جسم کا وزن ڈال دیا۔ وہ تڑپنے لگا اور دونوں ہاتھوں سے میرا پاؤں پکڑ کر ہٹانے لگا لیکن میں نے اور زیادہ زور سے پاؤں دبایا۔ میں نے نہیں دیکھا کہ عورت ابھی مسجد میں ہے یا بھاگ گئی ہے' نہ میں نے یہ دیکھا کہ میرے دونوں دوست کیا کر رہے ہیں' البتہ آوازیں ایسی سنائی دے رہی تھیں کہ وہ سکھ نائیک کی بڑی اچھی مرمّت کر رہے ہیں۔

"مت چھوڑو.... کافر.... مت چھوڑو.... کافر!" —— یہ آواز بزرگ ملائی کی تھی —— "مار دو ان کو.... مت چھوڑو کافر کو!"

ہندو میرے پاؤں کے نیچے تڑپ رہا تھا اور میں پاؤں کا دباؤ بڑھاتا ہی چلا جا رہا تھا حتیٰ کہ ہندو کا تڑپنا ختم ہو گیا اور جن ہاتھوں سے اُس نے میرا پاؤں پکڑا ہُوا تھا وہ ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے اور نیچے کو گر پڑے۔ اس کی آنکھیں پوری سے بھی زیادہ کھلی ہوئی تھیں اور اس کا

منہ اس طرح کھل گیا تھا کہ دانت نظر آرہے تھے اور زبان تھوڑی سی باہر نکل آئی تھی۔ اُس سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ مر گیا ہے۔ میں نے پاؤں اُس کی شہہ رگ سے ہٹایا تو اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ کھلی ہوئی آنکھوں میں اور کھلے ہوئے ہونٹوں میں اب کوئی حرکت نہیں تھی۔

اُس وقت میں نے دیکھا۔ میرے دونوں دوستوں نے سکھ کو اس قدر مارا پیٹا تھا کہ وہ بے ہوش ہو گیا تھا اور بے سُدھ فرش پر پڑا تھا۔ میں ابھی تک دیوانگی کی کیفیت میں تھا۔ میں تو بالکل ہی وحشی بلکہ درندہ بن گیا تھا۔ میرے دوستوں نے دیکھا کہ سکھ بے ہوش اور بے سُدھ ہو گیا ہے تو انہوں نے اُسے ٹھڈ مارنے چھوڑ دیئے اور میری طرف دیکھا۔ دونوں کے چہروں پر اور آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ اس وقت ہم تینوں دوست پکے مسلمان تھے۔

"دوسرا کہاں ہے؟" —— فصیح نے مجھ سے ہندو لانس نائیک کے متعلق پوچھا۔

"وہ تو مر گیا ہے" —— میں نے جواب دیا اور بتایا کہ میں نے اُسے کس طرح ختم کیا ہے۔

"پھر اسے بھی ختم کرو" —— شفیع نے کہا —— "اسے چھوڑ دیا تو یہ رپورٹ کرے گا پھر سوچ لو ہمارا انجام کیا ہو گا"۔

فصیح نے کوئی بات منہ سے نہ نکالی۔ بے ہوش سکھ کے پاس گھٹنوں کے بل ہو گیا اور اُس کی گردن اپنے دائیں ہاتھ میں اس طرح لے لی کہ اُس کی شہہ رگ کو دبا لیا۔ سکھ بے ہوشی میں بھی تڑپا کیونکہ اُس کی سانسیں رک گئی تھیں لیکن ہندو جتنا نہ تڑپ سکا اور جلدی ہی مر گیا۔

○

دونوں کو ختم کر کے ہم نے دیکھا کہ مسجد میں اللہ اور اس بزرگ کے علاوہ اور کون آگیا ہے۔ چار اور آدمی آگئے تھے جو شکل و صورت اور لباس سے مسلمان لگتے تھے۔ وہ عورت کی آہ و پکار سُن کر دوڑے آئے تھے۔

"مار دیا!" —— بزرگ نے ہم سے کہا —— "ٹھیک کیا.... بہت ٹھیک کیا" —— اس نے ان چار آدمیوں کی طرف دیکھ کر اپنی زبان میں کچھ کہا۔

اُن میں سے ایک آدمی دوڑا گیا اور اُس نے مسجد کا دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی

چڑھا دی۔

○

وہ جو کہتے ہیں کہ قتل ایک لمحے کا پاگل پن ہوتا ہے' وہ سو فیصد ٹھیک کہتے ہیں۔ غصے میں آدمی پاگل پن کے قریب پہنچ جاتا ہے اور بعض انسانوں پر غصہ اس قدر غالب آ جاتا ہے کہ اُن کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے اور چند لمحوں کے لئے ان پر پاگل پن طاری ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ اپنی جان لے لیتے ہیں یا کسی کو قتل کر دیتے ہیں۔ ہم پر جو پاگل پن طاری ہُوا تھا' اس میں ہم اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے تھے۔ اللہ کے گھر کی بے حرمتی اور اس کے ساتھ ہی ایک مسلمان خاتون کی بے حُرمتی کوئی بُزدل مسلمان بھی برداشت نہیں کر سکتا لیکن ہم نارمل ذہنی حالت میں آئے تو کچھ پریشان ہو گئے۔ میں آپ کو اپنا ردِ عمل بتاتا ہوں۔ وہ یہ تھا کہ ہم تینوں نے دو فوجیوں کو قتل کر دیا تھا اور اب ہمیں اس کی سزا مل سکتی تھی۔

"ان لاشوں کو ہم یہاں تو نہیں چھوڑ سکتے" —— فصیح نے کہا —— "اگر ہم انہیں یہیں چھوڑ کر چلے گئے تو یہ مسلمان بے چارے مارے جائیں گے"۔

میں نے فصیح کی تائید میں کچھ کہا اور شفیع بھی کہنے لگا کہ اب سوچنا چاہئے کہ ان لاشوں کو کہاں غائب کریں۔ بزرگ ملائی سمجھ گیا تھا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں اور یہ بات کتنی ضروری ہے۔ وہ ہمارے قریب آگیا۔

"مسجد میں کنوآں ہے" —— بزرگ نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا —— "دونوں کو اٹھا کر کنوئیں میں پھینک دیتے ہیں"۔

"پھر آپ پانی کہاں سے لیں گے؟" —— فصیح نے کہا —— "کنوآں ناپاک ہو جائے گا"۔

ہم نے مسجد کے اُس کونے کی طرف دیکھا جس طرف اس بزرگ نے اشارہ کیا تھا۔ وہاں ہینڈ پمپ لگا ہُوا تھا اور اس کے ساتھ لکڑی کے تختے تھے۔ ان تختوں کے نیچے کنوآں تھا۔ پانی ہینڈ پمپ سے نکالا جاتا تھا۔ بات تو ٹھیک تھی کہ لاشوں کو کنوئیں میں پھینک کر اوپر پھر تختے جما دیئے جاتے لیکن یہ کنوآں ان لوگوں کے لئے بالکل ہی بے کار ہو جاتا۔ یہ بات بھی سوچنے والی تھی کہ لاشوں نے تھوڑے ہی عرصے بعد بدبو پیدا کرنی تھی جو ان لوگوں کو پکڑوا سکتی تھی۔ یہ تو بڑا ہی خطرناک مسئلہ تھا جس کا حل فوری طور پر سوچنا تھا۔

ہم زیادہ دیر وہاں رک بھی نہیں سکتے تھے۔ ہمیں واپس بھی جانا تھا اور اس طرح جانا تھا کہ ہمیں کوئی دیکھ نہ سکے کہ ہم کس طرف سے آئے ہیں۔

بزرگ ملائی کا یہ حال تھا کہ ہمارے ساتھ اردو کے الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہمارے ساتھ بات کرتا اور پھر اپنے چار آدمیوں کے ساتھ اپنی زبان میں بات کرتا تھا۔ ان سے مشورے لے رہا تھا کہ لاشیں کہاں پھینکی جائیں۔ ان میں سے دو آدمی کہتے تھے کہ رات کو آبادی سے کچھ دُور جا کر ایک گڑھا کھودیں گے اور لاشیں ان میں دبا دیں گے۔ ہم نے اس مشورے کو قبول نہ کیا کیونکہ رات کو جاپانیوں کی پٹرول پارٹی (گشتی پہرہ) گھومتی پھرتی رہتی تھی اس لئے پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔

وہ چار آدمی جو تجویز یا مشورہ پیش کرتے تھے' ان کا ترجمہ بزرگ ہمیں سناتا تھا۔ کئی تجویزیں سامنے آئیں اور اچانک بزرگ کے چہرے پر چمک سی آگئی اور وہ تھوڑا سا مسکرایا۔ اس نے بتایا کہ اس بستی میں دو گھر غیر مُسلموں کے ہیں اور دونوں خاندان یہاں سے چلے گئے تھے اور ان کے مکان خالی پڑے ہیں۔ اُس نے کہا کہ ایک مکان میں اسی طرح کا چھوٹا سا کنوآں ہے جیسا مسجد میں ہے' اس پر تختے لگے ہوئے ہیں اور پانی نکالنے کے لئے ہینڈ پمپ استعمال ہوتا ہے۔ رات کو لاشیں اس کنوئیں میں پھینکی جا سکتی ہیں۔

یہ ایک ایسی تجویز تھی جو ہمیں اچھی اور بے خطر لگی.... آج کل آپ نے دیکھا ہوگا کہ کہیں پانی نکالنے کے لئے ہینڈ پمپ لگانا پڑے تو وہاں زمین میں بور کیا جاتا ہے اور جب پانی نکل آتا ہے تو ہینڈ پمپ کا پائپ وہاں ڈال دیتے ہیں اور ہینڈ پمپ پانی نکالنے لگتا ہے۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں' اُس وقت کنوآں کھودا جاتا تھا اور اس میں ہینڈ پمپ بھی لگا دیا جاتا تھا۔ بعض لوگ کنوئیں میں سے ڈول سے بھی پانی نکالتے تھے اور ہینڈ پمپ سے بھی اور بعض لوگ کنوئیں کے اوپر پھٹے لگا دیتے تھے اور صرف ہینڈ پمپ استعمال کرتے تھے۔ وہاں بھی ہم نے یہی سسٹم دیکھا۔

طے یہ ہُوا کہ لاشیں مسجد میں پڑی رہیں اور ہم تینوں دوست رات کو آئیں گے اور لاشیں اٹھا کر اُس مکان میں لے جائیں گے اور کنوئیں میں پھینک دیں گے۔ بزرگ نے کہا کہ ہم اگر نہ بھی آئیں تو وہ خود ہی یہ کام کر دیں گے لیکن ہم نے مناسب نہ سمجھا کہ ایسا خطرناک کام ان کے سپرد کیا جائے۔ وہ بھلے سے لوگ تھے اور انہوں نے مرنے

مارنے کا اور لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا کبھی کام نہیں کیا تھا۔ ہم انہیں کسی مشکل میں ڈالنے سے گریز کر رہے تھے۔ آخر یہی طے ہُوا کہ ہم رات کو پہنچ جائیں گے اور انہیں اندازاً وقت بتا دیا۔

لاشوں کو وہیں پڑے نہیں رہنے دینا تھا۔ ہم نے لاشوں کو گھسیٹا اور مسجد کے کمرے میں لے گئے اور ان کے اوپر صفیں اور چٹائیاں پھینک دیں۔ پھر دیکھا تو ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوتا تھا کہ ان چٹائیوں وغیرہ کے نیچے لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ ان لوگوں نے کمرے کے دروازے بند کر دیئے۔ بزرگ نے بتایا کہ نماز صحن میں پڑھا کرتے ہیں۔ وہ سردیوں کے دن نہیں تھے۔

اب ایک بات رہ گئی تھی جو فصیح کے دماغ میں آئی تھی۔ اُس نے بزرگ ملائی سے کہا کہ ان دونوں کی تلاش میں اگر کوئی فوجی ادھر آ نکلے اور پوچھے کہ دو فوجی ادھر آئے تھے تو وہ صاف انکار کر دیں اور کہیں کہ وہ زیادہ تر گھروں کے اندر رہتے ہیں اس لئے انہیں پتہ ہی نہیں چلتا کون آیا تھا اور کون گزر گیا ہے۔ اس طرح کی کچھ باتیں بزرگ کو بتا کر ہم مسجد سے نکلنے لگے تو ان چار آدمیوں میں سے ایک نے ہم تینوں کے ساتھ باری باری ہاتھ ملایا اور ہم تینوں کے ہاتھ چومے اور پھر وہ زار و قطار رونے لگا۔ پتہ چلا کہ یہ عورت اس کی بیوی تھی۔ وہ کسی کام سے باہر نکلی تو آگے سے یہ دو کافر آ رہے تھے۔ انہوں نے اس عورت کو پکڑ لیا۔ اس کا خاوند ہمیں فرشتے سمجھ رہا تھا جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس کی بیوی کی عزت بچانے کے لئے آسمان سے اتارا تھا۔ ہم نے اس کی بہت دل جوئی کی اور کہا کہ مسلمان کی حیثیت سے ہمارا یہ فرض تھا کہ ایک مسلمان عورت کی عزت کو بچائیں۔

ہم ان سے رخصت ہوئے اور وہیں سے شہر کی طرف آنے کی بجائے دوسری طرف نکل گئے اور خاصا چکر کاٹ کر واپس بارکوں میں آئے۔ یہاں میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ وہاں ہم رائفل یا کوئی ہتھیار اپنے پاس نہیں رکھا کرتے تھے۔ رائفلیں وغیرہ کوتوں میں بند ہوتی تھیں۔

ہم اپنی بارک میں پہنچے تو تین چار ساتھیوں نے پوچھا کہ ہم کہاں کی سیر کر کے آئے ہیں؟ ہم نے انہیں کوئی اور ہی جگہ اور سمت بتائی اور جھوٹ موٹ کی کچھ باتیں سنا کر انہیں مطمئن کر دیا۔ اب ہمیں رات کو بارک سے نکلنا تھا لیکن اُس وقت جب سب

سوئے ہوئے ہوں گے۔

ہو سکتا ہے میری یہ کہانی پڑھنے والے کچھ حضرات یہ شبہ کریں کہ میں من گھڑت قصے سنا رہا ہوں۔ میں آپ سب سے یہ بات کہنا چاہوں گا کہ یہ واقعہ اور ایسے کچھ اور واقعات پڑھنے سے پہلے ذہن سے شہری اور اپنے گاؤں کا ماحول نکال دیں اور ذہن میں دو تین باتیں رکھ لیں۔ پہلی بات یہ کہ ہم کچھ زیادہ ہی دلیر اور نڈر تھے۔ میں نے شروع میں آپ کو سنایا ہے کہ اپنے ایک دوست کے ساتھ کس طرح ایک پیر کو مار اپیٹا تھا۔ دوسری بات یہ کہ میں جہاں کا واقعہ سنا رہا ہوں وہاں کے ماحول اور فضا کو تصور میں لانے کی کوشش کریں۔ اُس ماحول میں موت کی حکمرانی تھی۔ وہاں سوائے کُشت و خون کے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہاں تو یہ حال تھا کہ اس خیال سے کشت و خون کرتے چلے جاتے تھے کہ کسی بھی لمحے ہمارا اپنا خون ہو جائے گا۔ وہاں ہمارا اپنا قانون چلتا تھا۔ اپنے قانون سے مطلب یہ نہیں کہ ہم آزاد تھے' ہمارے اوپر جاپانی تھے جو ظالم قوم تھی۔

میں آج اُن دنوں کو یاد کرتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور میں سوچتا ہوں کہ اس سکھ نائیک اور ہندو لانس نائیک کو قتل کرنے سے پہلے میں برما کے جنگل میں کچھ آدمیوں کو قتل کر آیا تھا۔ آج وہ ہمت مجھ میں آ نہیں سکتی۔ یہ بھی سوچیں کہ مسجد کی بے حُرمتی کون مسلمان برداشت کر سکتا ہے۔ آج میرے جسم میں وہ طاقت نہیں رہی جو جوانی میں ہُوا کرتی تھی لیکن آج بھی کسی مسجد کی بے حُرمتی کی بات سنتا ہوں تو خون میں وہی ابال اٹھتا ہے جو کوالمپور کی اس مسجد کی بے حُرمتی کو دیکھ کر اٹھا تھا۔ کشمیر' بوسنیا اور فلسطین وغیرہ میں مسلمانوں کے قتلِ عام اور مسجدوں کی بے حُرمتی کی خبریں تو دل میں مرنے مارنے کا جذبہ بیدار کر دیتی ہیں لیکن خون پی کے رہ جاتا ہوں۔

○

ذہن میں ایک کشمکش شروع ہو گئی۔ کبھی تو میں خوش اور مطمئن ہو جاتا تھا کہ میں نے اللہ کی راہ میں بہت بڑی نیکی کی ہے۔ کچھ دیر بعد اطمینان اور مسرت کی اس کیفیت میں زلزلہ سا آ جاتا اور یہ سوچ آ جاتی کہ کسی نے ہمارے مقتولوں کو آبادی میں جاتے دیکھ لیا ہو گا اور جب پتہ چلے گا کہ دونوں لاپتہ ہیں تو ان کی تلاش میں فوجی وہاں تک پہنچ جائیں گے اور اس بزرگ کو اور اس بستی کے مسلمانوں کو ایسی اذیتیں دیں گے کہ وہ بتا دیں گے کہ ان دونوں کو کس نے قتل کیا ہے۔ یہ سوچ مجھے پریشان کر دیتی اور

دل پر بوجھ سا آ پڑتا لیکن میں اپنے آپ کو یوں تسلی دیتا کہ مر ہی جاؤں تو بہتر ہے۔ اپنے مستقبل کے متعلق تو کچھ پتہ ہی نہیں تھا کیسا ہو گا اور میں کس انجام کی طرف بڑھا چلا جا رہا ہوں۔

میں نے اپنے دوستوں کو نہ بتایا کہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔ شام کو ہم تینوں نے اکٹھے کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران ہم سرگوشیوں میں یہی باتیں کرتے رہے۔ میرا خیال ہے کہ فصیح اور شفیع بھی میری طرح کچھ گھبرائے گھبرائے تھے۔

ہمارے دونوں مقتول ہماری ہی بٹالین کے تھے۔ صرف کمپنیاں الگ الگ تھیں۔ رات ساڑھے آٹھ بجے گنتی ہُوا کرتی تھی۔ تمام کمپنیاں الگ الگ ہوتی تھیں اور دیکھا جاتا تھا کہ کوئی غیر حاضر تو نہیں۔ اگلے روز کے احکام اور پروگرام گنتی کے بعد بتائے جاتے تھے۔

گنتی کا وقت ہو گیا اور جب گنتی سے ہمیں ڈسمس کیا گیا تو اس کے تھوڑی دیر بعد یہ خبر ہماری کمپنی تک بھی پہنچ گئی کہ فلاں سکھ نائیک اور ہندو لانس نائیک لاپتہ ہیں۔ پہلے تو یہ خیال گزرا کہ وہ گنتی سے غیر حاضر ہیں۔ ایسا ہو نہیں سکتا تھا کیونکہ گنتی سے غیر حاضری فوجی قانون کے تحت جرم تھا۔ گنتی کے بعد ہم بارک میں آ گئے اور سوچنے لگے کہ سب سو جائیں تو ہم اپنے کام کے لئے نکلیں۔

تقریباً" ایک گھنٹے بعد سکھ نائیک کی کمپنی کا ایک حوالدار ہماری بارک میں آیا اور اُس نے اعلان کے انداز سے کہا کہ فلاں نائیک اور لانس نائیک لاپتہ ہیں' اگر کسی نے انہیں دیکھا ہو تو بتائے کہاں دیکھا تھا۔ ہمارے زیادہ تر ساتھیوں نے کہا کہ انہوں نے نہیں دیکھا۔ فصیح کے دماغ میں بڑی اچھی بات آ گئی۔

فصیح نے اس حوالدار کو یہ جھوٹی اطلاع دی کہ اس نے ان دونوں کو فلاں طرف جاتے دیکھا تھا.... فصیح نے جس علاقے کا نام لیا تھا وہ اس شہر کا ایک محلّہ تھا جو بدنام علاقہ تھا۔ وہ طوائفوں کا علاقہ تھا جہاں فوجیوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن حکم کے باوجود کوئی کوئی فوجی وہاں جا پہنچتا تھا۔ سنا تھا کہ اچھی اچھی طوائفوں کو جاپانی اپنے ساتھ لے گئے ہیں پھر بھی وہاں کچھ طوائفیں موجود تھیں۔

میں نے بھی آگے بڑھ کر سکھ حوالدار کو بتایا کہ میں بھی فصیح کے ساتھ تھا اور ہم نے اُنہیں اُس طرف جاتے دیکھا تھا۔ حوالدار نے بڑی پریشانی کا اظہار کیا۔ دو فوجیوں کا لاپتہ ہو جانا

معمولی سی بات نہیں تھی۔ فصیح نے حوالدار سے کہا کہ وہ ہمیں اجازت لے دے تو ہم اُس علاقے میں جا کر ان دونوں کو ڈھونڈیں گے اور امید ہے وہ کسی نہ کسی گھر سے مل جائیں گے اور یہ بھی خیال ہے کہ وہ شراب زیادہ پی گئے ہوں گے اور کسی طوائف کے گھر میں یا کسی گلی میں بے سُدھ پڑے ہوئے ہوں گے۔

یہ حوالدار خود بھی سکھ تھا۔ ہم سمجھ گئے کہ وہ اس کوشش میں ہے کہ یہ سکھ نائیک کہیں مل جائے اور اسے سزا سے بچالے۔ سکھ ہو کر وہ اس سکھ کو سزا سے بچانا چاہتا تھا۔ میں نے اور فصیح نے اُسے کہا کہ ہم چلے جاتے ہیں اور اسے کہیں تلاش کرتے ہیں۔ اس طرح میں، فصیح اور شفیع اس سکھ حوالدار کو تسلی دے کر چلے گئے۔

ہم بارکوں میں سے نکلے اور اس بدنام علاقے کی طرف جانے کی بجائے دوسری طرف کا رُخ کر لیا جدھر مسلمانوں کے وہ چند ایک گھر تھے.... وہ آبادی دُور نہیں تھی۔ ہم وہاں جا پہنچے اور بزرگ ملائی کے دروازے پر دستک دی۔ پتہ چلا کہ وہ مسجد میں ہے۔

ہم تینوں مسجد میں گئے اور جوتے اتار کر اندر گئے تو وہاں بزرگ بھی موجود تھا اور چار کی بجائے اب پانچ آدمی اندر بیٹھے ہوئے تھے۔ رات کو بلیک آؤٹ ہوتا تھا اس لئے مسجد میں کوئی روشنی نہیں تھی۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہم بہت جلدی میں ہیں اس لئے یہ کام فوراً ہو جانا چاہئے۔

بزرگ نے بتایا کہ وہ اُس مکان میں جا کر کنوئیں کے اوپر سے تختے اکھاڑ چکے ہیں۔ اب صرف یہ کرنا ہے کہ لاشیں اٹھا کر کنوئیں میں پھینکنی ہیں اور اوپر تختے جما دینے ہیں... ہم فوراً لاشوں تک پہنچے اور ہم سب نے مل کر لاشیں اٹھا لیں اور مسجد سے نکل گئے۔ ڈر یہ تھا کہ جاپانی نہ دیکھ لیں۔

کنوئیں والا گھر دُور نہیں تھا۔ مسجد سے پچیس تیس قدم دُور تھا۔ ہم بڑے اطمینان سے لاشوں کو اٹھائے اس گھر میں جا داخل ہوئے۔ ان آدمیوں نے آواز نکالے بغیر تختے ایک طرف کر دیئے اور ہم نے دونوں لاشیں کنوئیں میں پھینک دیں۔ کنوئیں سے بڑی زور کی آواز اٹھی جس سے ہم ڈر گئے۔ ہم ڈرتے اس لئے تھے کہ یہ آواز کچھ دور تک پہنچی ہو گی اور کوئی نہ کوئی اس آواز پر اِدھر آ جائے گا لیکن اللہ نے مہربانی کی کہ کوئی بھی نہ آیا۔

ان سب آدمیوں نے مل کر تختے کنوئیں پر پھر رکھ دیئے۔ لاشیں ٹھکانے لگ چکی تھیں۔ ہم نے سکون کا سانس لیا۔ مجھے یہ ملائی بزرگ معلوم نہیں کیوں بڑا ہی اچھا لگا تھا۔ اس کا

انداز ایسا تھا جو متاثر کرتا تھا۔ وہ یقیناً عالم اور دانشمند تھا۔ اُس نے ہمیں کہا کہ ہم کچھ دیر کے لئے اُس کے گھر چلیں لیکن ہم جلدی میں تھے۔ میں دِلی طور پر اس کے گھر جانا چاہتا تھا یا اس کے پاس بیٹھ کر کچھ باتیں کرنا اور کچھ باتیں سننا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ ہم کل یا کسی بھی دن اُس کے پاس ضرور آئیں گے۔ اُن سب نے ہمارے ساتھ ہاتھ ملائے اور ہم وہاں سے چل پڑے۔ ہم بہت تیز چل رہے تھے۔

راستے میں ہم تینوں نے بیان ملا لئے کہ سکھ حوالدار کو کیا بتائیں گے۔ اپنی بارک میں جانے کی بجائے ہم اُس کے پاس چلے گئے اور بتایا کہ ہم اس علاقے میں گھوم پھر رہے تھے کہ ایک گلی میں سے اچانک دو جاپانی فوجی سامنے آ گئے۔ انہوں نے ہمیں بڑے غصے میں کہا جو ہم نہ سمجھ سکے۔ وہ یقیناً یہی کہہ رہے تھے کہ ہم فوراً وہاں سے بھاگ جائیں اور گندی گلیوں میں نہ گھومیں پھریں۔ اس طرح ہم وہاں سے آ گئے۔

اس حوالدار کو ذرا سا بھی شک نہ ہُوا کہ ہم کتنا بڑا جھوٹ بول رہے ہیں۔ ہم خوش تھے کہ اصل کام کر آئے تھے۔ اب ہمیں کوئی نہیں پکڑ سکتا تھا۔ اگلے روز یہ خبر ہر کسی تک پہنچ گئی کہ فلاں سکھ نائیک اور فلاں ہندو لانس نائیک لاپتہ ہیں اور وہ طوائفوں کے محلے میں گئے تھے۔ ہمیں خبریں ملتی رہیں کہ جاپانی فوج کی ملٹری پولیس کو اطلاع دی گئی تھی اور طوائفوں کے گھروں کی تلاشی بھی ہوئی تھی لیکن اس سکھ اور ہندو کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ہر کوئی اپنا اپنا خیال ظاہر کر رہا تھا۔ کوئی کہتا کہ وہ بھاگ گئے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا تھا کہ وہ بھاگ کر گئے کہاں ہوں گے۔ آخر اس پر سب نے اتفاق کیا کہ کسی بات پر جاپانیوں نے انہیں گولی مار دی ہے۔ ہم تینوں دوستوں نے افواہیں پھیلانی شروع کر دیں اور مشہور یہ کیا کہ وہ دونوں طوائفوں کے محلے میں گئے تھے اور وہاں جاپانی فوجیوں کے ساتھ ان کا جھگڑا ہو گیا تھا اور جاپانیوں نے انہیں کہیں لے جا کر گولی مار دی ہے۔

○

اسلام کا جذبہ بھی کیا جذبہ ہے۔ میں کتابوں کی باتیں نہیں بلکہ اپنے تجربے اور مشاہدے کی بات کر رہا ہوں۔ اسلامی جذبہ جسے میں جذبۂ جہاد کہوں گا، کچھ وقت کے لئے دب سکتا ہے، مر نہیں سکتا۔ میری اُس زندگی پر غور کریں۔ میں کیا تھا؟.... ایک آوارہ اور بھگوڑا.... میں نے اپنی داستان کے آغاز میں صاف الفاظ میں بتایا ہے کہ میں کوئی شریف آدمی نہیں تھا۔ میں ایک نہیں متعدد انسانوں کا قاتل بھی بن چکا تھا لیکن جہاں اسلام پر ایک مسجد کی بے

حُرمتی اور ایک مسلمان خاتون کی بے حُرمتی کی صورت میں زد پڑی' میں یکسر بدل گیا اور میرے اندر وہ مسلمان بیدار ہو گیا جس میں اسلام کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہُوا تھا۔ میں ایک عقیدے کے طور پر مانتا ہوں کہ ہر مسلمان میں یہ جذبہ اللہ تبارک تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سمویا ہے۔ جس مسلمان میں یہ جذبہ نہیں وہ مسلمان بھی نہیں۔

یہ تو تھی اسلامی جذبے کی بات' اب دیکھئے اسلام کا رشتہ بھی کیا رشتہ ہے۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ وہ بزرگ جو ہمیں مسجد میں ملا تھا' میری روح پر غالب آ گیا تھا۔ اس کے ساتھ میرا کوئی اور تعلق نہیں تھا نہ کوئی لالچ تھا لیکن میں اسے ایک بار پھر ملنے کے لئے بے تاب ہُوا جا رہا تھا۔ صرف اس لئے کہ وہ مسلمان تھا اور وہ مجھے عالم اور دانشور لگتا تھا۔ مسجد میں جو چار پانچ ملائی آئے تھے اور جنہوں نے لاش کو ٹھکانے لگانے میں ہماری مدد کی تھی' مجھے یوں لگتا تھا جیسے ان کے ساتھ میرا گہرا تعلق یا رشتہ ہے۔ اسلام کے سوا اور کیا رشتہ ہو سکتا تھا!

کچھ دنوں بعد میں اپنے دونوں دوستوں کے ساتھ پھر اسی چھوٹی سی بستی میں جا پہنچا جہاں وہ بزرگ ملا تھا۔ اُس کا گھر ہم نے اس شام دیکھ لیا تھا۔ اُس کے دروازے پر دستک دی تو اسی نے دروازہ کھولا اور ہمیں اندر لے گیا۔ گھر تو غریبانہ سا تھا لیکن اتنی صفائی اور ایسا سلیقہ کہ کمرے میں بیٹھ کر بڑا ہی پیارا سا سکون محسوس کیا۔ اس کی ایک وجہ تو اس بزرگ کا تقدس تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ میں بڑی ہی لمبی مدت بعد ایک گھر میں داخل ہُوا تھا۔ مجھے تو یوں لگتا تھا جیسے ساری عمر جنگلوں میں جنگلی جانوروں کی طرح گزار دی ہے۔ جب کسی کو قتل کرنے کی نوبت آتی تھی تو میں درندہ بن جاتا تھا۔ اس گھر میں بیٹھ کر مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہو گئی کہ میں کوشش نہ کرتا تو میرے آنسو نکل آتے۔ یہ جذبات کی انتہا تھی۔ اس بزرگ کی بیوی بھی تھی جو اسی جیسی بوڑھی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر نوکرانی تھی۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس نے اُردو کہاں سے سیکھی ہے۔ اُس نے بتایا ملایا میں ہندوستان کے کچھ لوگ بھی آباد تھے۔ ان میں مسلمان بھی تھے' ہندو' سکھ اور عیسائی بھی تھے۔ وہ زیادہ تر وہاں تجارت پیشہ تھے یا عام قسم کے دکاندار۔ کچھ ملازم بھی تھے۔ اُس بزرگ نے کچھ کچھ اُردو ان لوگوں سے سیکھ لی تھی لیکن زیادہ تر اردو اس نے بنگال اور ہندوستان میں سیکھی تھی۔ اُس نے بتایا کہ اُردو لکھنے میں اُسے دشواری ہوتی ہے لیکن

سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی' البتہ بولتے وقت الفاظ ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔

اُس وقت تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ زندگی میں وہ وقت بھی آئے گا کہ میں اپنا یہ سارا سفرنامہ یا یہ داستان قلمبند کروں گا۔ اگر اُس وقت یہ سوچا ہوتا تو میں ہر بندے کا اور ہر جگہ اور مقام کا نام لکھ لیتا۔ بہت سے نام ذہن سے اُتر گئے ہیں۔ وہ ماحول اور وہ فضا یاد رہ گئی ہے۔ یہ بزرگ اس حد تک متاثر کر رہا تھا کہ اس کا نام میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا۔ اس کا نام فیض الحق تھا اور اس کے آگے بھی وہ کچھ لکھتا تھا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ وہ ملائی زبان کا لفظ ہو گا۔ ماشیر تھا یا ماسیر' اسی قسم کا کوئی لفظ تھا۔ مجھے فیض الحق اچھی طرح یاد رہ گیا ہے.... فیض الحق کا باپ عالم دین تھا اور اسی نے فیض الحق کو دین یا دینی تعلیم کے راستے پر ڈالا تھا۔ جوانی کی عمر میں فیض الحق بنگال گیا اور ڈھاکہ میں ایک سال کسی دینی مدرسے میں رہا اور وہاں کے عالموں سے فیض حاصل کیا۔ انگریزوں کے دور میں بھی ڈھاکہ مسجدوں کا شہر کہلاتا تھا۔ بنگال' خصوصاً" مشرقی بنگال جو بعد میں مشرقی پاکستان بنا اور اب بنگلہ دیش ہے' مجاہدین کا ملک چلا آ رہا ہے۔ اس خطے نے سراج الدّولہ اور ٹیپو میر جیسے مجاہدین پیدا کیے ہیں۔

علم کی جستجو میں فیض الحق دلی تک گیا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب فیض الحق کی جوانی پرانی بات ہو گئی تھی۔ وہ بنگال سے واپس کوالالمپور آ گیا تھا اور کچھ برسوں بعد پھر نکل کھڑا ہوا اور ہندوستان کے چند ایک شہروں میں قیام کرتا دلی چلا گیا اور وہاں سے دیوبند بھی گیا اور اُس کا یہ سارا وقت علمائے دین سے علم حاصل کرتے گزرا۔ اُس نے کئی علمائے دین کے نام لئے تھے جن میں سے مجھے ایک بھی یاد نہیں رہا۔ اس وقت مجھے اسلام کے ساتھ روحانی دلچسپی تھی' علماء سے میں ناواقف تھا۔ البتہ اپنے قصبے کی تینوں مسجدوں کے مولویوں کے نام جانتا تھا یا جس مولوی نے ہمیں دینیات پڑھائی تھی' اس کا نام یاد رہا اور اب بھی یاد ہے۔ فیض الحق نے چائے سے ہماری تواضع کی۔ ہم جانتے تھے کہ جو شہری یہاں رہتے ہیں' انہیں راشن پانی کی تنگی ہے۔ ہم نے فیض الحق سے پوچھا کہ اُسے اگر کھانے پینے کی اشیاء کی تنگی ہو تو ہمیں بتائے' ہم اُسے چاول وغیرہ دے سکتے ہیں۔ اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اسے کوئی تنگی نہیں اور وہ صبر اور شکر سے زندگی گزارنے والا انسان ہے.... ہمارے پاس کوئی راشن نہیں تھا جو ہم اسے دیتے۔ پکا پکایا کھانا لنگر سے ملتا تھا۔ ہم اگر کسی کو کچھ دیتے تو وہ چوری یا ہیرا پھیری کر کے حاصل

کرتے اور پھر دیتے۔ فیض الحق کے لئے تو میں بہت بڑا جرم کرنے کو بھی تیار تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا اور میں نوٹ کر رہا تھا کہ وہ الفاظ ڈھونڈ رہا ہے اور انہیں جوڑ جاڑ کر بولتا ہے۔ میں اس کی باتیں صاف اردو میں لکھوں گا۔

"ان تمام علاقوں پر یہ آفت نازل ہونی ہی تھی" ـــ فیض الحق نے کہا ـــ "جاپانی فوج ایک آسمانی آفت تھی جو نازل ہوئی اور برما تک پہنچ گئی۔ لوگ کہتے ہیں جاپانی فوج ہندوستان پر بھی قابض ہو جائے گی لیکن یہ صحیح نہیں اور ایسا نہیں ہو گا۔ جاپانی فوج جہاں تک چلی گئی ہے وہاں سے واپس آجائے گی، آگے نہیں بڑھے گی"۔

"کیا آپ کو جنگ کی تازہ بہ تازہ خبریں ملتی رہتی ہیں؟" ـــ میں نے پوچھا۔

"مجھے جو خبریں ملتی ہیں وہ اللہ کی طرف سے ملتی ہیں" ـــ فیض الحق نے جواب دیا ـــ "ہمارے پاس نہ تو ریڈیو ہے نہ کوئی اخبار ملتا ہے، اب تو یہاں کوئی اخبار چھپتا ہی نہیں"۔

"پھر آپ کو شہر کے لوگوں سے خبریں مل جاتی ہوں گی!" ـــ فصیح احمد نے کہا۔

"شہر کے لوگوں کو کچھ بھی معلوم نہیں آگے کیا ہو رہا ہے" ـــ فیض الحق نے کہا ـــ "آپ خود فوجی ہیں، آپ جانتے ہیں کہ شہریوں کو فوج کی صحیح خبریں نہیں دی جایا کرتیں.... میں تمہیں ایک خبر دیتا ہوں جو مجھے پوری امید ہے بالکل صحیح ہو گی۔ اگر آپ کو معلوم نہیں تو اپنے فوجی ذرائع سے معلوم کر لیں.... جاپان کی فوج برما سے بھاگ آئی ہے اور برما پر پھر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا ہے"۔

یہ تو فصیح احمد مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ جاپانی برما سے پسپا ہو آئے ہیں لیکن یہ بزرگ فیض الحق یہ دعویٰ کر رہا تھا کہ اُسے اللہ کی طرف سے خبریں ملتی ہیں۔ میں اس سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اللہ سے وہ کس طرح خبریں حاصل کرتا ہے۔ میں یہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا کہ یہ بزرگ جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔

"کیا جاپانی ملایا میں جم کر لڑیں گے؟" ـــ میں نے پوچھا۔

"نہیں!" ـــ فیض الحق نے جواب دیا ـــ "میں دیکھ چکا ہوں کہ جاپانی فوج جس طرح آسمانی آفت بن کر آئی تھی اسی طرح یہ فوج تباہ ہو گی جیسے اس پر کوئی آسمانی آفت گری ہو۔ مجھے بہت بڑا انقلاب نظر آ رہا ہے جو ملایا میں آئے گا، دنیا ہی بدل جائے گی"۔

فیض الحق میرے لئے پُراسرار سی شخصیت بنتا جا رہا تھا۔ اُس کے ساتھ ہماری جو

باتیں ہوئیں اور جو باتیں اس نے کیں، اس سے مجھے یہ تاثر ملا کہ اس کے پاس روحانی علم یا کشف کی طاقت ہے جس سے یہ ہر بات معلوم کر لیتا ہے۔ آپ نے روحانی عامل، جوتشی، پیر اور شاہ جی دیکھے ہوں گے اور ان میں سے کسی کے ساتھ آپ کا واسطہ بھی پڑا ہو گا۔ آپ کو تجربہ ہُوا ہو گا کہ یہ لوگ بڑے لمبے چوڑے دعوے کیا کرتے ہیں اور بڑ ہانکنے کے انداز سے بات کرتے ہیں۔ وہ اپنے سائلوں کو متاثر کرنے کے لئے اپنی کرامات بڑھ چڑھ کر بیان کرتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ انہیں غیب کی ہر بات معلوم ہو جاتی ہے لیکن فیض الحق کا انداز کچھ اور ہی تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسّم تھا جس میں مجھے تقدّس نظر آ رہا تھا اور وہ پُراعتماد لہجے میں بات کرتا تھا۔

"کیا آپ کو کشف ہوتا ہے؟" ـــ میں نے پوچھا ـــ "کوئی روحانی علم یا عمل آپ کے ہاتھ میں ہے؟"

"آپ کے ملک ہندوستان میں ایک شہر الٰہ آباد نام کا ہے" ـــ فیض الحق نے کہا ـــ "میں نے وہاں کچھ عرصہ گذارا ہے اور یہ عرصہ ایک بزرگ عالم کے سائے میں گزرا تھا۔ میں نے ان کی بہت خدمت کی تھی اور وہ شاید میری نیّت اور میری روح کا راز سمجھ گئے تھے، انہوں نے مجھے اپنے فیض سے کچھ حصہ عطا کر دیا اور میرا رشتہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ براہِ راست قائم کر دیا۔ انہوں نے مجھ سے وظیفے بھی کروائے، چلے بھی کروائے اور ریاض بھی کروایا اور میرے آگے ڈھکے چھپے طبق بے نقاب ہو گئے"۔

"اللہ تعالیٰ نے آپ کو غیبی طاقت دی ہے" ـــ فصیح احمد نے کہا ـــ "کیا آپ اس طاقت سے ملایا کی تباہی کو روک نہیں سکتے تھے؟ اگر آپ چاہتے تو ہو سکتا تھا جاپانیوں کی فوج ساحل سے دُور ہی رہتی اور وہیں سے واپس چلی جاتی"۔

"میں آپ کو ایک بات سمجھانے کی کوشش کروں گا" ـــ فیض الحق نے کہا ـــ "اللہ جس کام کا حکم دیتا ہے اسے بندہ روک نہیں سکتا۔ میں دیکھ چکا ہوں، سب کچھ نظر آ گیا ہے۔ اللہ اس خطّے میں جو خونی انقلاب لایا ہے یہ اسلام کے حق میں ہو گا۔ اگر آپ لوگ پڑھے لکھے ہیں اور اس علاقے کا نقشہ دیکھا ہے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس سارے خطّے میں جزیرے ہی جزیرے ہیں۔ کچھ چھوٹے ہیں کوئی بہت ہی چھوٹے ہیں، کوئی بڑے ہیں اور کوئی بہت ہی بڑے ہیں۔ ملایا پر اور اس کے ساتھ والے جزیروں پر انگریزوں کا قبضہ تھا اور یہاں ان ہی کی بادشاہی تھی۔ اس سے نیچے اور آگے جو چھوٹے

بڑے جزیرے ہیں ان پر یورپ کی ایک قوم کی حکومت تھی جسے ڈچ کہتے ہیں اور اُردو میں اسے ولندیزی کہا جاتا ہے۔ جاپان کی فوج ان دونوں قوموں کے لئے آسمانی آفت بن کر نازل ہوئی تھی اور ان سب کو یہاں سے بھگا دیا اور ان کی فوجوں کو قتل بھی کیا اور قید بھی کر لیا۔ اب جاپان کی فوج کا وہی انجام ہو گا اور یہاں پھر وہی دونوں قومیں واپس آئیں گی لیکن اب پہلے کی طرح یہاں بادشاہی قائم نہیں کر سکیں گی۔ ابھی اس خطے میں اور زیادہ خون بہے گا اور آخر میں دنیا دیکھے گی کہ یہ سارا خطہ ایک مسلمان ملک بن گیا ہے اور ہو سکتا ہے یہ دو مسلمان ملک بن جائیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جاپانیوں کو اسی لئے بھیجا تھا کہ پرانے بادشاہوں کے تختے اُلٹ جائیں اور پھر یہاں اسلام کا جھنڈا بلند ہو۔ میں پھر کہتا ہوں کہ یہ سارا خطہ مسلمانوں کا خطہ بن جائے گا لیکن خون خرابہ بہت ہو گا"۔

میں نے فیض الحق کی اس بات پر زیادہ توجہ نہ دی اور نہ ہی اسے اہمیت دی۔ یہ تو مانا جا سکتا تھا کہ جاپانی شکست کھا جائیں گے لیکن یہ تسلیم کرنا خاصا مشکل تھا کہ انگریز اور ولندیزی ان ملکوں سے نکل جائیں گے اور یہاں مسلمانوں کی حکمرانی قائم ہو گی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ ملایا اور اس سے آگے والے جزیرے جو آج انڈونیشیا کہلاتے ہیں' ان میں مسلمان غالب اکثریت میں آباد تھے لیکن یہ تمام مسلمان محکوم اور غلام تھے' ان کے پاس کوئی فوجی طاقت نہیں تھی۔ اگر ان میں کوئی دم خم تھا تو وہ جاپانی فوج نے ختم کر ڈالا تھا۔ انہیں بے گھر کر دیا گیا اور ان کی عزتیں بھی لوٹ لی تھیں۔ یہ تو اٹھنے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔

یہ تو میرے اُس وقت کے تاثرات ہیں جب میں اس بزرگ کے گھر میں بیٹھا اس کی باتیں سن رہا تھا لیکن جنگ کے کچھ ہی عرصہ بعد دو مسلمان ملک دنیا کے نقشے پر ابھرے.... ایک ملائیشیا اور دوسرا انڈونیشیا.... آج فیض الحق مجھے بہت یاد آ رہا ہے۔ اُس کے پاس روحانیت کا علم تھا اور وہ کشف کی طاقت بھی رکھتا تھا۔ اُس وقت اُس نے ایک اور بات بھی کہی تھی اور میں بے اختیار ہنس پڑا تھا کیونکہ وہ خواب و خیال کی بات لگتی تھی۔

"تم اس انقلاب کو اپنے ملک ہندوستان میں بھی دیکھو گے" ــــ فیض الحق نے کہا ــــ "وہاں بھی انگریزوں کا تختہ اُلٹ جائے گا اور ایک یا دو مسلمان ملک وجود میں آئیں

گے"۔

کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ہندوستان میں پاکستان کے وجود کا ظہور ہو گا اور پاکستان دو حصوں میں ہو گا اور پھر اگر پاکستان آدھا رہ بھی گیا تو ایک اور مسلمان ملک وجود میں آئے گا جس کا نام مشرقی پاکستان کی بجائے بنگلہ دیش ہو گا۔

"محترم بزرگ!" ــــ میں نے کہا ــــ "ہمیں کچھ بتائیں کہ ہماری منزل کیا ہے اور ہم کس انجام کو پہنچ رہے ہیں؟"

فیض الحق نے ہم تینوں کے چہروں کو باری باری بڑے غور سے دیکھا اور آنکھیں بند کر کے اوپر کو مُنہ کر لیا اور پھر سر جھکا لیا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے جیسے وہ دل ہی دل میں کچھ پڑھ رہا ہو۔ دو تین منٹ وہ اسی کیفیت میں رہا پھر اُس نے سر اٹھا کر باری باری ہم تینوں کو دیکھا۔

"کون کب مرے گا' یہ راز صرف اللہ جانتا ہے" ــــ فیض الحق نے انگلی آسمان کی طرف کر کے کہا ــــ "مجھے جو کچھ نظر آیا ہے وہ ظاہری طور پر ٹھیک نظر نہیں آتا لیکن جو بھی طوفان تم تینوں کے لئے آ رہا ہے' وہ تمہیں اِدھر اُدھر اڑاتا' گراتا اور اُٹھاتا گزر جائے گا اور پھر پوری امید ہے کہ تم اپنی زندگی کے ٹھیک راستے پر چل پڑو گے.... کچھ اور خون نظر آتا ہے"۔

میں نے اُسے کہا کہ وہ ہمیں کوئی روحانی عمل یا کوئی وظیفہ بتا دے جو ہم باقاعدگی سے کرتے رہیں تاکہ ہماری مشکلیں آسان ہو جائیں اور ہمارا انجام بھی اچھا ہو۔

"نہیں میرے عزیز!" ــــ فیض الحق نے کہا ــــ "میں تمہیں کوئی وظیفہ نہیں بتاؤں گا۔ وجہ یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو پاک صاف نہیں رکھ سکو گے اور نہ ہی پانچ وقت کی نماز باقاعدگی سے پڑھ سکو گے۔ تم ایسے ماحول میں ہو جہاں شراب بھی چلتی ہے اور خنزیر بھی کھایا جاتا ہے اور وہ کون سی بدی ہے جو فوجی نہیں کرتے۔ وظیفوں کا اثر دیکھنا ہو تو اپنی روح کو بدی سے پاک کر لو۔ وظیفہ اللہ کا کلام ہوتا ہے۔ اس کی بے حُرمتی الٹ اثر کر جاتی ہے.... میں تمہیں ایک بات بتا دیتا ہوں۔ یہ تو بتا دیا ہے کہ اپنی روح کو بدی سے پاک رکھو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے سے کمزور آدمی پر ہاتھ نہیں اٹھانا۔ کسی پر فتح حاصل کر لو تو اسے اپنا محکوم یا غلام نہیں بنانا۔ ہر اُس چیز سے بچنا جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔ تم نے یہ بہت بڑی نیکی کی ہے کہ ایک مسلمان عورت کی آبرو کو کافروں

سے بچایا ہے اور انہیں اللہ کے گھر کی بے حُرمتی کرنے کی سزادی ہے۔ اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا اور ضرور دے گا۔ میں تمہیں یہ بتا رہا ہوں کہ تم بھی روحانی طاقت حاصل کر سکتے ہو۔ راز کی بات میں نے تمہیں بتادی ہے"۔

"اب ایک اور بات بتائیں" — میں نے پوچھا — "آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ جاپانیوں نے انڈین نیشنل آرمی کے نام سے ہندوستان کے فوجیوں کی ایک فوج بنائی ہے۔ اس کا انجام کیا ہو گا!"

"بکھر جائے گی" — فیض الحق نے جواب دیا — "تمہاری یہ فوج کچھ بھی نہیں کر سکے گی"۔

"ہم اسی فوج میں ہیں" — فصیح نے پوچھا — "اگر انگریزوں کی فوج آگئی تو کیا ہمیں اس کے خلاف لڑنا چاہیے؟؟"

"وہاں تک شاید نوبت ہی نہیں آئے گی" — فیض الحق نے جواب دیا — "اگر انگریزوں کی فوج آگئی تو اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینا۔ تمہیں کوئی سزا نہیں ملے گی"۔

ہمیں وہاں بیٹھے بہت ہی وقت گزر چکا تھا۔ ہم اتنی دیر تک غیر حاضر نہیں رہ سکتے تھے۔ ہم وہاں سے اٹھے اور جب باہر نکلے تو میں ایک کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ فیض الحق نے مجھے متاثر کیا تھا لیکن اس کی کچھ باتیں اور پیشگوئیاں ایسی تھیں جو مجھے قابلِ اعتبار نہیں لگتی تھیں۔ کبھی خیال آتا کہ یہ بزرگ بے بنیاد باتیں کرتا ہے اور کبھی یہ خیال آتا کہ یہ شخص عالمِ دین ہے اور جو کچھ کہہ رہا ہے وہ صحیح ثابت ہو گا.... ہم تینوں دوست اس کی باتوں کے متعلق باتیں کرتے واپس اپنی بارک میں آگئے۔

○

فیض الحق اللہ کے ان چند ایک بندوں میں سے تھا جنہیں میں باقی عمر بھُول نہیں سکوں گا۔ ملایا میں میرا ارادہ تھا کہ میں اس کے پاس جاتا رہا کروں گا اور اس سے دینی تعلیم لوں گا۔ دینی تعلیم سے میری مراد وہ تعلیم نہیں جو مسجدوں کے مولوی لیا کرتے ہیں اور سمجھتے کچھ بھی نہیں، میرا مقصد یہ تھا کہ اس سے روحانیت کے کچھ سبق لوں گا۔ روحانیت سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں روحانی عامل بننا چاہتا تھا، میرا مقصد روح کی تسکین تھا اور اصل مقصد یہ تھا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ میرا رابطہ قائم ہو جائے

لیکن میں ایک ہی بار جا سکا کیونکہ ملایا کے حالات اچانک پلٹا کھا گئے۔

فیض الحق کی ایک پیشگوئی فوراً ہی پوری ہو گئی۔ اُس نے کہا تھا کہ جس طرح جاپانی فوج آسمانی آفت بن کر انگریزوں اور ولندیزیوں پر گری تھی اسی طرح جاپانی فوج پر بھی ایسی آفت گرے گی کہ وہ اسے آسمانی آفت سمجھیں گے۔

اب جاپانی برما سے اپنی پسپائی کو ہم سے نہیں چھپا سکتے تھے۔ کوالالمپور میں جاپانیوں کی جو فوج تھی اس میں ہمیں بھگدڑ سی مچی نظر آنے لگی تھی۔ ایک یا دو یونٹیں تھوڑے سے نوٹس پر تیار ہوتیں اور انہیں ریل گاڑی پر سوار کر دیا جاتا تھا۔ اسی روز یا اگلے روز ایک دو یونٹیں نئی وہاں پہنچ جاتی تھیں۔ جاپانی افسروں کو میں نے ایمرجنسی کی حالت میں بھاگتے دوڑتے دیکھا۔ فصیح نے مجھے اندر کی خبریں سنائی تھی کہ جاپانی بہت زیادہ نقصان اٹھا کر برما سے پسپا ہوئے ہیں اور ملایا میں قدم جمانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ان کی یہ کوشش کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی۔ ایک خبر یہ بھی سنی کہ امریکہ، برطانیہ اور آسٹریلیا کی نیوی کے بحری جنگی جہاز بڑی تیزی سے برما کی طرف سے ملایا اور سماٹرا کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ معلوم نہیں یہ افواہ تھی یا صحیح خبر کہ ان بحری جہازوں نے ساحل سے گولہ باری بھی شروع کر دی تھی۔

میں نے پچھلے باب میں تفصیل سے سنایا ہے کہ جاپانیوں نے ملایا اور سنگاپور کس طرح فتح کئے تھے اور انگریزوں کی فوج نے کس طرح ہتھیار ڈالے تھے۔ اب اگر میں تفصیل سے سنانے لگوں کہ اتحادیوں نے یعنی امریکہ اور برطانیہ نے کس طرح جوابی حملہ کیا اور وہ کس طرح ملایا تک پہنچے تھے تو بات بہت ہی لمبی ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے کچھ قارئینِ کرام اس میں بوریت محسوس کریں۔ میں اس جوابی حملے کی بات مختصر کروں گا۔

میں یہ نہیں بتا سکتا کہ انڈین نیشنل آرمی جس کی نفری 25 ہزار بتائی گئی تھی، کہاں کہاں بکھری پڑی تھی اور اس سے کیا کام لیا جا رہا تھا۔ میں صرف اپنی بٹالین کا ذکر کروں گا کیونکہ بات وہی اچھی لگتی ہے جو اپنی آنکھوں دیکھی ہوئی ہو.... ایک روز جاپانی افسروں نے ہم میں سے تقریباً" ایک سو جوان منتخب کر کے الگ کر لئے۔ ان میں مجھے اور فصیح احمد کو بھی شامل کر لیا گیا۔ ہمیں کچھ دور لے جا کر الگ بارکوں میں رکھا گیا اور ہمیں وہاں بتایا گیا کہ ہمیں کمانڈو ٹریننگ دی جائے گی اور ہم دشمن یعنی انگریزوں اور امریکیوں کی

فوج کے مورچوں کے پیچھے جا کر حملے کیا کریں گے۔ عام فہم زبان میں یوں کہہ لیں کہ ہمیں شب خون اور چھاپے مارنے کی ٹریننگ دینی تھی۔ آئی این اے کو جنگ میں یوں جھونکنے کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی تھی کہ جاپانیوں کی حالت کچھ زیادہ ہی پتلی ہو گئی تھی اور انہیں کمک نہیں مل رہی تھی۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ جاپانیوں نے آئی این اے کی 25 ہزار نفری کو دو اڑھائی سال راشن کھلایا تھا اور اس کی ٹہل سیوا کی تھی۔ اب جاپانی اس سے اپنا حق وصول کرنا چاہتے تھے۔

جنگ کے بہت بعد جب میں نے جنگِ عظیم کی کتابیں پڑھنی شروع کی تھیں تو مجھے پتہ چلا تھا کہ جاپانیوں کی حالت کیا ہو گئی تھی۔ بحرالکاہل میں بے انداز جزیرے تھے جن میں کچھ چھوٹے تھے اور بعض ذرا بڑے تھے اور کچھ بہت ہی وسیع و عریض تھے۔ ان میں فلپائن بھی ایک جزیرہ ہے جو ایک ملک ہے۔ ایسے بے شمار جزیرے بحرالکاہل میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جاپان نے اپنی نیوی سے اور نیوی کے طیارہ بردار بحری جہازوں سے اس قدر اچانک اور تیز حملہ کیا تھا کہ راستے میں آنے والا ہر جزیرہ جاپان کی جھولی میں گرتا چلا گیا۔ جاپانی نیوی اور فوج نے پورے کا پورا فلپائن بھی لے لیا اور اس پر باقاعدہ قابض ہو گئی۔ اس طرح سارے جزیروں پر قابض ہوتے ہوئے جاپانی نیوی ملایا اور پھر برما تک پہنچ گئی تھی۔

ادھر انگریزوں نے امریکی فوج کی مدد سے برما پر جوابی حملہ کیا اور برما سے جاپانی فوج کو بھگا دیا' اُدھر امریکہ نے اپنی تمام تر نیوی بحرالکاہل میں پھیلا دی اور ایک طرف سے جزیروں پر حملے شروع کر دیئے اور خونریز لڑائیوں کے بعد جاپانیوں سے جزیرے چھین لئے۔ امریکیوں نے فلپائن پر حملہ کر کے وہاں جاپانیوں کو شکست دی اور ان سے ہتھیار ڈلوا لئے۔

یہاں میں آپ کو ایک دلچسپ بات سناتا ہوں جسے آپ قدرت کا کھیل کہہ سکتے ہیں۔ میں نے پچھلے باب میں بتایا ہے کہ سنگاپور اور ملایا میں انگریزوں کی جو فوج تھی اس کا کمانڈر جنرل پرسیول تھا۔ اس نے جاپانیوں کے آگے ہتھیار ڈالے اور جنگی قیدی بن گیا تھا۔ اس کی 85 ہزار فوج جاپانیوں کے ہاتھ جنگی قیدی بنی تھی۔ امریکیوں نے جوابی حملہ کر کے فلپائن پر قبضہ کر لیا اور وہاں جو جاپانی فوج تھی اس سے ہتھیار ڈلوا لئے۔ ایک جاپانی جرنیل نے سرینڈر کے کاغذات پر دستخط کئے تھے۔ معلوم ہوا کہ ملایا اور سنگاپور والا

انگریز جنرل پرسیول فلپائن میں ہی ایک قیدی کیمپ میں تھا۔ اُسے قیدی کیمپ سے نکال کر جاپانیوں کے سرینڈر کی تقریب میں شامل کیا گیا اور اس نے جاپانی جرنیل سے سرینڈر کے کاغذات پر دستخط کروائے تھے' یعنی ایک جنگی قیدی نے فاتح فوج کے جرنیل سے ہتھیار ڈلوانے کی رسم پر اُس کے دستخط کروائے۔

○

بحرالکاہل میں جب امریکہ نے حملہ کیا تو امریکہ کی نیوی اور جاپان کی نیوی کے درمیان جو بحری جنگ لڑی گئی تھی' وہ جنگوں کی تاریخ کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ ہولناک جنگ تھی۔ جاپان کی فوج اتنی زیادہ نہیں تھی جتنی زیادہ اس نے نیوی تیار کر رکھی تھی۔ اس میں کئی ایک طیارہ بردار بحری جہاز تھے۔ امریکہ کی نیوی بھی کچھ کم نہ تھی۔ اس میں بھی طیارہ بردار جنگی جہاز تھے۔ اگر آپ اس بحری جنگ کی تفصیلات پڑھیں تو اس میں آپ کو کچھ دلچسپیاں بھی ملیں گی۔ بحری جہاز بہت دُور دُور سے ایک دوسرے پر گولے برساتے ہیں۔ اتنی دُور سے کہ اکثر اوقات پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ جس بحری جہاز پر گولے فائر کر رہے ہیں وہ کہیں اپنا ہی نہ ہو۔ امریکہ کی نیوی کے بعض جہاز رات بھر گولے برساتے رہے اور اس گولہ باری میں ایک دو جہاز اِدھر کے اور ایک دو اُدھر کے تباہ ہو گئے۔ صبح معلوم ہُوا کہ ادھر بھی امریکہ ہی کے بحری جہاز تھے۔ وہ ایک دوسرے کو جاپانی سمجھ کر گولہ باری کرتے رہے اور اپنے ہی جہازوں کو تباہ کر کے ڈبوتے رہے۔

دونوں طرف بحری جنگی جہازوں میں فوج بھی ہوتی تھی۔ جب جزیرے پر حملہ کیا جاتا وہاں پہلے نیوی ساحل کے قریب جا کر گولہ باری کرتی تھی اور پھر جہازوں میں سے فوج کو اتار دیا جاتا تھا جو جزیرے میں جا کر جنگ لڑتی تھی۔ چونکہ امریکہ کی نیوی سارے بحرالکاہل میں پھیل گئی تھی اور امریکی فوج نے جسے میرین کہا جاتا ہے' کئی ایک جزیرے لے لئے تھے اس لئے جاپان کے لئے مشرقِ بعید یعنی ملایا برما کو کمک دینا ناممکن ہو گیا تھا۔ یہ وجہ تھی کہ جاپانیوں کو برما سے پسپا ہونا پڑا اور ملایا میں جم کر لڑنا بھی ان کے لئے آسان نہیں رہ گیا تھا کیونکہ ان کے پاس نفری کی بھی کمی ہو گئی تھی اور رسد کی بھی۔ انہیں ایمونیشن بھی کم پڑتا نظر آ رہا تھا۔ رسد کے تمام راستے بند ہو گئے تھے۔

امریکیوں نے جو جزیرے جاپان سے چھین لئے تھے وہ آسانی سے امریکہ کے ہاتھ

نہیں آئے تھے۔ جاپانیوں نے ہر جزیرے میں ایسا جم کر مقابلہ کیا کہ امریکہ کی جس نفری نے حملہ کیا تھا وہ آدھی سے بھی کم رہ گئی۔ امریکہ کو یہ سہولت حاصل تھی کہ اُس کے پاس بمبار طیارے خاصے زیادہ تھے۔ وہ اتنی زیادہ بمباری کرتے تھے کہ یوں لگتا تھا کہ یہ پورا جزیرہ سمندر میں ڈوب جائے گا۔ یہاں میں صرف ایک بڑے جزیرے کی تھوڑی سی بات سناؤں گا۔

اس جزیرے کا نام گواڈل کینال ہے۔ اس پر امریکیوں نے یوں حملہ کیا کہ اس کے بحری جہازوں نے ساحل کے قریب آکر جزیرے پر گولہ باری کی اور اوپر سے بمبار طیاروں نے بے پناہ بمباری کی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس جزیرے میں کوئی انسان، کوئی حیوان اور کوئی پرندہ بھی زندہ نہیں رہ گیا ہو گا۔ تب بحری جہازوں سے فوج کو ساحل پر اتارا گیا۔

فوج جنگی انداز اور ترتیب سے جزیرے کے جنگلات میں داخل ہوئی اور اس توقع پر داخل ہوئی کہ ایک بھی جاپانی سپاہی زندہ نہیں ہو گا، پتہ چلا کہ جاپان کی فوج کا ہر جوان زندہ و بیدار ہے اور وہ کسی امریکی کو اس جزیرے میں زندہ نہیں رہنے دے گا۔ جاپانی فوج نے ایسی بے جگری سے اور ایسے شدید جذبے سے حملہ روکا کہ امریکی فوج کو بے طرح جانی نقصان ہونے لگا۔ تھوڑے سے وقت میں امریکی فوج کی حالت ایسے ہو گئی جیسے جاپانیوں نے اس کا قتل عام کیا ہو۔

امریکہ کے اخباری رپورٹر اور فوٹو گرافر اپنی فوج کے ساتھ تھے۔ زندہ قومیں جو زندہ رہنا چاہتی ہیں، اپنے عوام کو دھوکے میں نہیں رکھا کرتیں اس لئے ان کے اخباروں اور اخباری رپورٹروں پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی نہ وہ دستورِ زبان بندی کے پابند ہوتے ہیں۔ رپورٹروں نے اپنے اپنے اخباروں کو اس حملے کی صحیح خبریں بھیجیں تو امریکہ کے اخبار اور عوام تڑپ اٹھے۔ جنگی مبصروں نے اس حملے کے جرنیل پر شدید نکتہ چینی کی اور اخباروں نے اڈیٹوریل لکھے کہ حملہ بڑے ہی ناقص طریقے سے کیا گیا تھا اور اس کے نتیجے میں اپنی فوج کو مروایا گیا ہے۔ کسی نے لکھا کہ طیاروں سے بمباری بہت تھوڑی کی گئی یا غلط جگہوں پر کی گئی اور کسی نے لکھا کہ نیوی نے گولہ باری صحیح طرح اور پوری تعداد میں نہیں کی وغیرہ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ اتنے زیادہ جانی نقصان پر امریکہ میں اپنے جرنیلوں اور ہائی کمانڈ کے خلاف بہت ہی احتجاج کیا گیا۔

وہاں کی کمانڈ میں رد و بدل کیا گیا اور کمک بھیجی گئی۔ از سرِ نو بمبار طیاروں سے بمباری اور بحری جہازوں سے گولہ باری کی گئی اور پہلے سے زیادہ جنگی طاقت سے فوج نے حملہ کیا۔ جاپانیوں نے اس حملے کا بھی مقابلہ پہلے کی طرح کیا اور اب دونوں طرف بے انداز جانی نقصان ہُوا۔ امریکی فوج کو ایسی مشکلات کا سامنا ہُوا جیسے وہ اس جزیرے سے جاپانیوں کو نکال نہیں سکے گی۔

اڑھائی تین مہینوں کی بڑی ہی خونریز لڑائی کے بعد جاپانی ہمت ہار بیٹھے جس کی وجہ تھی کہ اُن کا جانی نقصان بہت زیادہ ہو گیا تھا اور انہیں کہیں سے بھی کمک نہیں مل رہی تھی۔ یہاں تک کہ اُن کے پاس راشن بھی نہیں رہا تھا لیکن جاپانیوں نے ہتھیار نہ ڈالے۔ اس کی بجائے انہوں نے خودکشی شروع کر دی۔

میں نے واپس آکر ایک امریکی جنگی وقائع نگار کی کتاب پڑھی تھی جس میں اُس نے اس جزیرے کی لڑائی کا آنکھوں دیکھا حال پوری تفصیل سے لکھا تھا۔ یہ وقائع نگار امریکہ کی حملہ آور فوج کے ساتھ اس جزیرے میں گیا تھا۔ اُس نے لکھا کہ امریکہ کی فوج آگے بڑھتی گئی اور جاپانیوں کے دفاعی مورچوں سے فائر آتا رہا جو آہستہ آہستہ کم ہونے لگا اور کچھ دیر بعد فائر اتنا کم ہو گیا کہ اِکی دُکی گولی فائر ہوتی تھی۔ امریکی فوجی جن جاپانی مورچوں میں جاتے وہاں انہیں جاپانیوں کی لاشیں ہی ملتی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر تو گولیوں سے مرے تھے اور جنہیں گولی نہیں لگی تھی انہوں نے اپنی سنگینیں رائفلوں سے اتار کر اپنے اپنے دل میں اتار لی تھیں۔ ہتھیار ڈالنے کی بجائے انہوں نے خودکشی کر لی تھی۔

صرف وہ چند ایک جاپانی جنگی قیدی بنائے گئے جو شدید زخمی حالت میں بے ہوش پڑے تھے۔ ان سے کچھ باتیں معلوم ہوئیں کہ ان کی فوج نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ شکست کی صورت میں زندہ رہنے والے خودکشی کر لیں گے۔

امریکی دستے آگے بڑھتے گئے۔ اب آگے سے ایک بھی گولی نہیں آرہی تھی۔ ایک جاپانی سپاہی ایک مورچے سے نکلا۔ اُس کے ہاتھ میں رائفل یا مشین گن نہیں تھی۔ مورچے کے آگے مٹی کا ایک ڈھیر تھا۔ یہ جاپانی اس ڈھیر کے اوپر چڑھ گیا۔ تب دیکھا کہ اُس کے ایک ہاتھ میں گرینیڈ تھا۔ اُس نے اپنی سٹیل ہیلمٹ اتاری اور گرینیڈ سے پن نکال کر گرینیڈ اپنے سر پر رکھا۔ پھر سٹیل ہیلمٹ سر پر رکھ لی۔ چار پانچ سیکنڈ بعد گرینیڈ

پھٹا اور یوں معلوم ہوا جیسے یہ جاپانی سپاہی ہوا میں تحلیل ہو گیا ہو۔ اس کے جسم ٹکڑے اوپر کو بھی گئے اور دائیں بائیں اور آگے پیچھے کو بھی۔

آگے ایک زمین دوز جگہ بنائی گئی تھی۔ یہ ایک کمرہ سا تھا جو اس ڈویژن کے جر کا ہیڈ کوارٹر تھا جو جزیرے کے دفاع میں وہاں موجود تھا۔ معلوم ہوا کہ جرنیل نے ج دیکھا کہ اب حملہ آور کو روکا نہیں جا سکتا اور ہتھیار ڈالنے پڑیں گے تو اس نے اپنے افسروں کو بلایا اور باقاعدہ تقریب منعقد کر کے ایک لمبا خنجر اپنے دل میں اتار لیا۔ اس بعد تمام افسروں نے اپنے اپنے خنجر اپنے دلوں میں اتار لئے۔ یہ دراصل خنجر نہیں ب چھوٹی سی تلوار ہوتی تھی جسے سیبر کہتے ہیں۔

جب امریکی فوج جزیرے کے آگے والے ساحل تک پہنچے تو ایک عجیب منظر نظ آیا۔ جاپانی فوجی جو زندہ رہ گئے تھے وہ سمندر میں اُتر گئے تھے لیکن ان میں سے ایک ب تیرنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ اس جنگی وقائع نگار نے اپنی آنکھوں دیکھا کہ سینکڑ جاپانی سپاہی چلتے چلتے سمندر میں داخل ہوئے اور چلتے گئے اور پانی اوپر ہی اوپر آتا گیا کہ پانی ان کے منہ تک آ پہنچا اور پھر وہ سب سمندر میں غائب ہو گئے۔ یہ انہوں احتجاجی خودکشی کی تھی۔

میں نے پچھلے کسی باب میں بتایا ہے کہ جاپان کے فوجی بڑے فخر سے خودکشی ک کرتے تھے اور خودکشی کرتے وقت اپنے بادشاہ کا نام لیتے تھے یعنی یہ کہ میں شہنشاہ جاپا کے نام پر اپنی جان دے رہا ہوں۔



اس طرح چار پانچ اور بڑے جزیروں میں جرنیلوں نے اور بریگیڈ کمانڈروں نے او یونٹ کمانڈروں نے بھی خودکشی کی تھی۔ فوج نے بھی اجتماعی خودکشی کی۔ جو جوان خودکشی کرتے تھے، ان کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی کیونکہ اتنی بے جگری سے لڑتے تھے کہ لڑتے ہوئے ہی مارے جاتے تھے۔ یوں خودکشی کر لینے سے یہ ظاہر ہوتا ہے ک ان لوگوں میں اپنے ملک کی بے پناہ محبت تھی اور وہ قومی خودداری اور قومی وقار پر اپنی جانیں قربان کرنا معمولی سی بات سمجھتے تھے۔ جہاں تک اس جذبے کا تعلق ہے، وہ تو قابلِ داد ہے لیکن یہ فوجی نکتہ نگاہ سے ایک احمقانہ فعل ہے۔ اس کا نتیجہ جاپانیوں نے جنگ میں ہی دیکھ لیا۔ وہ اس طرح کہ ان کی فوج کی نفری بڑی تیزی سے کم ہوتی گئی اور نوبت

یہاں تک پہنچی کہ کمک کا سوال ہی ختم ہو گیا۔

اُس کی سب سے بڑی سزا ان جاپانی فوجیوں کو ملی جو ملایا، سماٹرا، جاوا وغیرہ کے علاقوں میں لڑ رہے تھے۔ وہ تو اب دفاعی جنگ لڑ رہے تھے اور ان کی شکست یقینی ہو گئی تھی کیونکہ انہیں کمک نہیں مل رہی تھی اور رسد تک سے محروم ہو گئے تھے۔ ایک طرف سے امریکہ کی نیوی دندناتی چلی آ رہی تھی اور دوسری طرف سے برطانیہ اور آسٹریلیا کی نیوی ساحلوں تک آ گئی تھیں اور ان کی توپوں کے گولے ملک کے اندر گر رہے تھے۔

اب میں اپنی بات سناتا ہوں۔ میں بتا رہا تھا کہ ہمیں جاپانیوں نے کمانڈو ٹریننگ دینی شروع کر دی۔ یہ ٹریننگ بڑی ہی سخت تھی۔ راتوں کو سونے بھی نہیں دیتے تھے۔ راتوں کو جاگنا، بھوکا اور پیاسا رہنا بھی ہماری ٹریننگ میں شامل تھا۔ ہاتھوں میں رائفل یا کوئی گن پکڑ کے کہنیوں اور پیٹ کے بل ایک ایک میل روزانہ رینگنا ایک معمول بن گیا تھا۔ ہمیں پتھروں پر اور کانٹوں پر بھی رینگنے کی مشق کروائی جاتی تھی۔ درختوں پر بندروں کی طرح چڑھنے کی اور درختوں سے کودنے کی ٹریننگ بھی دی گئی تھی۔ سات آٹھ قدم لمبائی چوڑائی میں آگ جلا کر ہمیں کہا جاتا تھا کہ اس میں سے دوڑ کر گزرو۔ دلدل میں سے گزرنا بھی ہماری ٹریننگ میں شامل تھا۔

پندرہ بیس روز گزر گئے تو مجھے اپنے متعلق یہ شک ہونے لگا کہ میں انسان نہیں جنگل کا جانور بن گیا ہوں۔ اپنا جسم اپنا نہیں لگتا تھا۔ کبھی تو یوں محسوس ہوتا جیسے دماغ اور جسم کا رشتہ ٹوٹ گیا ہو۔ جسمانی طور پر میں نے اپنے آپ میں یہ تبدیلی دیکھی کہ جسم پھرتیلا ہو گیا تھا اور فارغ رہ رہ کر جسم پر جو چربی چڑھتی جا رہی تھی وہ ختم ہو گئی تھی۔

یہ تو جسم کی بات تھی۔ کبھی اپنا جسم دیکھ کر تھوڑی سی خوشی ہوتی تھی کہ میں جسمانی طور پر سمارٹ ہو گیا ہوں لیکن ذہنی طور پر میں ٹھیک نہیں تھا اور میرا دوست فصیح احمد بھی ذہنی طور پر پریشان تھا۔ اس پریشانی کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اب یہ پریشانی اس لئے بڑھ گئی تھی کہ ہمیں اپنی ہی فوج کے خلاف جاپانیوں نے لڑانا تھا اور صورتِ حال یہ تھی کہ جاپانیوں کے مقدر میں شکست لکھ دی گئی تھی۔ میں اور فصیح کہیں فارغ بیٹھتے تو اکثر اس مسئلے پر باتیں کیا کرتے تھے۔ ہمیں نظر یہ آ رہا تھا کہ ہم انڈین آرمی کے خلاف لڑتے ہوئے پکڑے جائیں گے تو ہمیں سیدھی سزائے موت ملے گی.... ہمارے پاس اس مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا نہ ہم پیش گوئی کر سکتے تھے کہ کیا ہو گا۔ آخر ہم اپنے آپ

کو اور اپنی قسمت کو اللہ کے حوالے کر کے دل ہی دل میں دعا کیا کرتے تھے کہ جو ہو ہماری بہتری کے لئے ہو۔

ڈیڑھ پونے دو مہینوں بعد ہمیں ایک روز ٹرکوں میں بٹھایا گیا' ہمارے ساتھ مختصر سا سامان تھا' مثلاً" تین تین کمبل' ہتھیار اور ایمونیشن۔ ایمونیشن کا اچھا خاصا ذخیرہ دو ٹرکوں پر لادا گیا تھا۔ ہم جو ہندوستانی تھے' ہماری تعداد ایک سو تھی اور ہمارے ساتھ ایک سو جاپانی فوجی تھے۔ وہ بھی شاید کمانڈو تھے۔ ٹرک چل پڑے اور شہر سے نکل گئے۔ میں ان علاقوں سے تو واقف تھا ہی نہیں کہ آج بتا سکتا کہ ہمیں کہاں سے کہاں لے جایا گیا۔ میں اتنا بتا سکتا ہوں کہ ہم شمال مغرب کی طرف جا رہے تھے اور اُس طرف برما تھا اور راستے میں سیام آتا تھا جو آج کل تھائی لینڈ کہلاتا ہے۔

ڈیڑھ دو بجے کا وقت ہو گا۔ ہم گھنے جنگل میں جا رہے تھے۔ ایک جگہ یہ کانوائے رُک گیا اور ہمیں ڈبوں کا راشن کھانے کو دیا گیا۔ معلوم نہیں یہ کیا کیا تھا۔ بھوک لگی ہوئی تھی اس لئے جو کچھ بھی تھا کھا لیا۔ یہاں میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ جاپانی فوج راشن کی شدید قلّت محسوس کرنے لگی تھی۔ سپاہیوں کے لنگر میں کبھی ایک وقت کے لئے کھانا بھی نہیں پکتا تھا اور اس صورت میں سپاہیوں کو امیر جنسی راشن دیا جاتا تھا۔

ہمیں بھی راستے میں یہی ایمرجنسی راشن دیا گیا۔ یہ جاپانی تو شاید شوق سے کھاتے ہوں گے' ہم ہندوستانیوں نے یہ اس لئے کھا لیا کہ بھوک لگی ہوئی تھی اور پیٹ میں کچھ نہ کچھ ڈالنا ہی تھا.... ہمارا کانوائے پھر چل پڑا اور شام گہری ہو گئی تو چھوٹی سی ایک چھاؤنی میں جا رُکا۔ ہمیں ٹرکوں سے اُتار گیا اور رات اس چھاؤنی میں گزری۔ رات کو بھی ہمیں ایمرجنسی راشن دیا گیا۔

صبح جاگے ہی تھے کہ ہوائی جہازوں کی گونج سنائی دینے لگی جو آگے ہی آگے بڑھتی آئی اور گرج کی صورت اختیار کر گئی۔ فوراً" ہی بعد اس قدر زوردار دھماکے ہوئے کہ ہماری بارک ہل گئی اور زمین کانپ اٹھی۔ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ہوائی جہاز بمباری کر رہے ہیں۔ زمین سے مشین گنیں ان پر آگ اگلنے لگیں۔ باہر اس قدر بھاگ دوڑ برپا ہو گئی جیسے قیامت آ گئی ہو۔ ہم سب بارک سے نکل کر باہر چلے گئے اور جہاں کہیں کھدی ہوئی خندق نظر آئی گھس گئے لیکن وہاں کوئی محفوظ پناہ نہیں تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ ہوائی جہاز اتحادیوں کے یعنی امریکیوں اور انگریزوں کے ہیں۔ خندق سے مجھے آسمان کا

منظر نظر آ رہا تھا۔ بمبار ہوائی جہاز گھوم گھوم کر آتے اور بم گراتے تھے۔ ان پر طیارہ شکن مشین گنیں اور توپیں فائر کر رہی تھیں۔ توپوں کے گولے اوپر جا کر پھٹتے تھے لیکن اس اتنے زیادہ فائر کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہوائی جہاز بم گرا رہے تھے۔

میرا خیال ہے کہ آدھا گھنٹہ بمباری ہوتی ہو گی اور پھر میں نے بمبار ہوائی جہازوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ وہاں ایک جگہ ایمونیشن سٹور کیا ہُوا تھا۔ اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ ایک بم عین اس کے اوپر گرا اور پھر جو دھماکہ ہُوا تو یوں لگا جیسے میں اس جہان سے اٹھ کر اگلے جہان میں پہنچ گیا ہوں۔ اس ذخیرے میں توپوں اور ٹینکوں کے گولے بھی تھے جو مسلسل پھٹ رہے تھے۔ یہ دھماکوں کا ایسا سلسلہ تھا جو ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ گولے ذرا اُوپر جا کر پھٹتے اور ان کے ٹکڑے دُور دُور تک پھیلتے اور گرتے تھے۔

ہوائی حملہ ختم ہُوا تو ایک اور بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ بعض جگہوں پر آگ لگ گئی تھی۔ اس آگ پر قابو پانا تھا اور پھر زخمیوں کو اُٹھانا تھا۔ ہم سب جو اس حملے میں ٹھیک ٹھاک رہے تھے' اُٹھ کر جاپانیوں کے ساتھ بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ میں پہلی بار جنگ کی یہ قیامت دیکھ رہا تھا۔ برما فرنٹ پر ایک جھلک دیکھی تھی لیکن ایسی نہیں۔ وہاں سے تو میں بھگوڑا ہو آیا تھا لیکن یہاں سے بھگوڑا ہونا ممکن نہیں تھا۔ اگر ہو بھی جاتا تو کہاں جاتا؟

اس بمباری میں جاپانیوں کا بے تحاشا نقصان ہُوا تھا۔ اتحادی ہوا بازوں نے بالکل ٹھکانے پر بمباری کی تھی۔ میں نے بعض جاپانی دیکھے جن کے جسم آدھے آدھے رہ گئے تھے۔ کسی کی ٹانگ نہیں تھی اور کسی کا بازو نہیں۔ میں نے ایسی لاشیں بھی دیکھیں جن کے سر غائب ہو گئے تھے یا گردنیں ذرا ذرا سی جسموں کے ساتھ جڑی رہ گئی تھیں۔ پیٹ چاک بھی دیکھے جن سے انتڑیاں باہر نکل کر بکھر گئی تھیں۔ بے شمار زخمی بے ہوشی کی حالت میں تھے۔ جنہیں ذرا کم زخم آئے تھے اور وہ ہوش میں تھے' وہ اپنے آپ کو دہشت زدگی کے عالم میں گھسیٹ رہے تھے۔ ہم جو زندہ اور ٹھیک ٹھاک تھے' ان کٹی پھٹی لاشوں کو اور بے ہوش زخمیوں کو اُٹھا اُٹھا کر ایک جگہ اکٹھا کرنے لگے۔ میری وردی خون سے لال ہو گئی۔ ذہن اور دل پر جو اثر ہوا وہ الگ تھا۔ کبھی تصوّر میں بھی نہیں آتا تھا کہ میں یہ کام بھی کروں گا۔ یہ مجبوراً" اور حکماً" کرنا پڑا۔ اس کے ساتھ یہ خیال بھی آتا تھا کہ ایک روز میرا جسم بھی اس پردیسی زمین پر پڑا ہو گا اور نہ جانے یہ کتنے ٹکڑوں میں

کٹ چکا ہو گا۔

دل پر ایسی گرفت آئی کہ مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ میں فصیح احمد کو ڈھونڈنے لگا۔ اتنا تو مجھے یقین تھا کہ وہ زندہ اور سلامت ہے لیکن معلوم نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ مجھے نظر آیا اور میں دوڑ کر اُس تک پہنچا۔ میں جو اتنا دلیر جوان تھا' دہشت سے بزدل بن گیا تھا۔ میری اُس وقت یہ ضرورت تھی کہ فصیح احمد میری دلجوئی کرے لیکن وہ خود میری طرح دہشت زدہ اور جذباتی ہو گیا تھا۔

جہاں چھوٹی سی یہ چھاؤنی تھی اور جاپانی فوجیوں کی گہما گہمی تھی اور یہاں ہر طرف زندگی رواں دواں تھی' سپاہی ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہے تھے اور ہم جو تھوڑی دیر پہلے جاگے تھے اور سوچ رہے تھے کہ آج کا دن نہ جانے کیسا ہو اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اچانک موت یوں ہم پر جھپٹ پڑے گی۔ جہاں کچھ دیر پہلے زندگی سرگرم عمل تھی وہاں اب خون ہی خون تھا اور کچی زمین اس خون کو خشک کر رہی تھی۔ وہ زمین تو یوں لگتا تھا جیسے انسانوں کے خون کی پیاسی ہو۔

یہ دراصل جاپانیوں کے پچھلے مورچے تھے۔ یہاں سے اگلے مورچوں کو کمک بھیجی جاتی تھی لیکن جاپانیوں کے دشمن نے اس کمک کو اور پچھلے مورچوں کو تباہ و برباد کر دیا جس سے اگلے مورچوں کی کمر ہی ٹوٹ گئی۔ یہ اس محاذ کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ دفاعی محاذ یا یہ دفاعی مورچے دُور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر اتحادی بمباروں نے اس حصے کو تباہی تک پہنچا دیا تھا تو انہوں نے تمام تر مورچوں کا یہی حشر کیا ہو گا۔

ہم اگلے مورچوں سے زیادہ دُور نہیں تھے۔ رات کو ہمیں توپوں کی دُور کی دھم دھم سنائی دیتی رہی تھی۔ یہ دھماکے جاپانی توپوں کے بھی تھے اور اتحادی توپوں کے بھی۔

○

غالباً" تین بج رہے تھے جب ہمارے جاپانی افسر دوڑے آئے اور انہوں نے ہمارے حوالداروں کو جاپانی زبان میں کہا کہ تمام کمانڈو اور جوانوں کو گاڑیوں میں بٹھاؤ اور اس سے پہلے یہ اپنی وردیاں اتار کر دوسری پہن لیں۔ ہمارے یہ دونوں حوالدار کچھ زیادہ عرصے سے جاپانیوں کے ساتھ تھے' وہ ان کی زبان سمجھ لیتے تھے۔ ہمیں حکم ملا تو ہم نے بڑی تیزی سے خون آلود وردیاں اتاریں اور ایک جوڑا وردی کا جو ہمارے ساتھ تھا' وہ پہن لیا۔ ہمیں نہ کھانے کو کچھ دیا گیا نہ ہمیں ہاتھ منہ دھونے دیا گیا' سامان لپیٹا' ہتھیار

اٹھائے اور دوڑ کر ٹرکوں میں بیٹھ گئے۔ اب ہمیں ٹرکوں میں اس طرح نہ بٹھایا گیا جس طرح یہاں تک پہنچے تھے۔ ایک ایک ٹرک میں پندرہ سے بیس تک جوانوں کو بٹھایا گیا تھا۔ بڑی کھلی جگہ تھی لیکن اب ایک ایک ٹرک میں تیس سے چالیس تک جوان بھر دیئے گئے کیونکہ ہمارے کانوائے کے کچھ ٹرک بمباری سے تباہ ہو گئے تھے اور یہی تین چار ٹرک باقی رہ گئے تھے۔ پتہ چلا کہ چار پانچ کمانڈو بھی بمباری میں مارے گئے ہیں۔ ہمارا یہ چھوٹا سا کانوائے چل پڑا۔

○

اب ہمارے ٹرکوں کے نیچے کوئی باقاعدہ سڑک نہیں تھی۔ کچی سی ایک پگڈنڈی تھی جو چند میل آگے جا کر کسی اور طرف مُڑ گئی اور ہمارے ٹرک دوسری طرف مڑے۔ ہمارے نیچے پتھر تھے اور گھنا جنگل تھا جو ہمیں گھیرے ہوئے تھا۔ ٹرک آہستہ آہستہ چلتے اس جنگل میں راستہ بنا رہے تھے۔ کچھ حصہ ایسا آیا جہاں درخت بہت کم تھے اور زمین بھی کچھ ہموار تھی۔

وہاں پہنچے اور ٹرک ذرا تیز ہوئے تو ہوائی جہاز آ گئے۔ ہم نے اوپر دیکھا۔ یہ لڑاکا طیارے تھے۔ ہمارے ڈرائیوروں نے بڑی تیزی سے ٹرک درختوں کے نیچے لے جا کر روک لئے اور ہم سب کود کر اِدھر اُدھر جا پناہ گزین ہوئے۔

ہوائی جہازوں نے ہمارے اوپر خاصی نیچے پرواز کرتے ہوئے ایک دو چکر کاٹے اور چلے گئے۔ وہ جاپانیوں کے پچھلے مورچوں کی طرف گئے تھے۔ ذرا ہی دیر گزری تھی کہ ہمیں فضا میں مشین گنیں چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہم نے اُس طرف اوپر دیکھا تو ہوائی جہاز آپس میں لڑ رہے تھے۔ اِدھر سے جاپانی ہوائی جہاز آ گئے تھے اور فضائی معرکہ لڑا جا رہا تھا۔

میں نے تین ہوائی جہاز فضا میں پھٹتے اور شعلے بنتے دیکھے۔ پھر ایک ہوائی جہاز میں سے دھوآں نکلنے لگا اور اس کا ہواباز پیراشوٹ کے ذریعے جہاز سے نکل گیا۔ یہ معرکہ ہم سے کچھ دُور پیچھے لڑا جا رہا تھا۔ یہ بتانا مشکل تھا کہ کس کے ہوائی جہاز زیادہ گرے۔ اس کے بعد یہ معرکہ اس طرح ختم ہُوا کہ جاپانی ہوائی جہاز جو بچ گئے تھے' واپس چلے گئے اور اتحادیوں کے ہوائی جہاز ایک بار پھر ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئے۔ ہمیں ٹرکوں میں بیٹھنے کا حکم ملا۔ ہم دوڑ کر سوار ہوئے اور ٹرک پھر چل پڑے۔

سورج غروب ہونے کے ایک یا ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم ایک جگہ جا رُکے۔ یہ جاپانیوں کی کوئی بڑی پوسٹ تھی۔ ہمیں حکم اپنے دونوں ہندوستانی حوالداروں سے ملتے تھے۔ وہاں ہمیں وہی ایمرجنسی راشن دیا گیا جو ہم نے زہر مار کیا اور پھر یہ بتایا کہ ہم آج رات آرام کریں گے۔ ذرا اس آرام پر غور کریں۔ ہمیں کہا گیا کہ کہیں بھی زمین پر کمبل بچھاؤ اور سو جاؤ۔ میں نے فصیح کو ساتھ لیا اور ایک درخت کے نیچے جا کر کمبل بچھائے اور لیٹ گئے۔ ہمارے جسموں کا حال یہ تھا جیسے ہم اتنا لمبا سفر پیدل چل کر آئے ہوں۔ جسم ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ جسم کا یہ حال ٹرک نے پتھروں اور ناہموار زمین پر اُچھل اُچھل کر کیا تھا۔

میرے ذہن پر عجیب سا بوجھ تھا۔ اگر میں آج کی عام زبان میں بات کروں تو کہوں گا کہ مجھے ڈیپریشن محسوس ہو رہی تھی۔ اس میں کچھ خوف تھا اور یہ تاثر بھی کہ نہ جانے اب کیا ہونے والا ہے۔ وہاں ہم کوئی خوشگوار توقع یا امید اپنے دل میں پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ وہاں تو موت ہی موت تھی اور ہم نہیں جانتے تھے کہ موت سے کیسے بچا جائے۔ فصیح نے جب باتیں شروع کیں تو معلوم ہُوا کہ اُس کا بھی یہی حال ہے۔ ہمارے ساتھ دوسرے ساتھی بھی تھے جن میں چار سکھ تھے اور چند ایک ہندو تھے اور اکثریت سلمانوں کی تھی۔ سکھ اچھے تھے جو ایک دوسرے کو ننگی گالیاں دے کر دل خوش کر رہے تھے۔

وہ رات کچھ تڑپتے اور کچھ سوچتے اور کچھ سوتے گزر گئی اور جب صبح طلوع ہوئی تو ہم اٹھے اور دیکھا کہ ہم کہاں ہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہم کہیں بھی نہیں۔ کوئی آبادی نہیں تھی۔ ہر طرف جنگل تھا اور کہیں چٹانیں اور کہیں ہری بھری ٹیکریاں تھیں اور کچھ دور اونچے پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ یہ اگلے مورچے تھے۔

درختوں کا ایک جھنڈ تھا جس کے نیچے ایک جاپانی افسر نے جو شاید بریگیڈ کا کمانڈر تھا' اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا ہُوا تھا' باقی جو کچھ بھی تھا وہ زمین کے نیچے تھا۔ مورچے کھُدے ہوئے تھے اور افسروں نے گڑھے کھود کر ان کے اندر اپنے دفتر بنائے ہوئے تھے۔ ان گڑھوں کے اوپر درختوں کے ٹہن کاٹ کر رکھے گئے تھے۔ مطلب یہ کہ یہ سارے کا سارا ماحول کیموفلاج کیا ہُوا تھا.... ہمیں چائے دی گئی۔ اس کے ساتھ ڈبل روٹی کے چار چار پیس تھے اور ان پر ذرا سا جام لگا ہُوا تھا۔

ہم چائے پی چکے تو سب کو ایک جگہ اکٹھا کیا گیا اور ہمارے دونوں حوالدار سامنے

کھڑے ہو گئے۔ جاپان کے تین چار افسر آئے اور انہوں نے ہمارے حوالداروں کے ساتھ کچھ باتیں کیں۔ حوالداروں نے ہماری طرف منہ کر لیا اور انہوں نے آپس میں کوئی بات چیت کی۔ پھر ایک حوالدار ہم سے مخاطب ہُوا۔

"آزاد ہند کے جوانو!" —— حوالدار نے کہا —— "اب اپنے دیش کی آزادی کے لئے قربانیاں دینے کا وقت آ گیا ہے۔ تم جانتے ہو یہاں کیوں آئے تھے۔ ہندوستان کی فوج جو دراصل انگریزوں کی غلام فوج ہے' ہمارے مقابلے کے لئے آ گئی ہے۔ تمہیں اس لئے کمانڈو ٹریننگ دی گئی ہے کہ ہمارے پاس اتنی نفری نہیں کہ بٹالین کا مقابلہ بٹالین کر سکے۔ تم میں سے ایک ایک جوان پوری ایک کمپنی کو ختم کر سکتا ہے بشرطیکہ تم دل میں وہ جذبہ زندہ رکھو جو تمہیں یہاں لایا تھا۔ تم جانتے ہو فوج میں لیکچر نہیں دیئے جاتے بلکہ حکم دیئے جاتے ہیں اور یہ بتایا جاتا ہے کہ کیا کارروائی کرنی ہے۔ یہ میں تمہیں ابھی بتاؤں گا۔ تمہیں اپنے آپ میں یہ جذبہ پیدا کرنا ہے کہ جو حکم تمہیں دیا جائے گا اس پر اپنی جان قربان کرنی پڑے تو کر دو گے"۔

حوالدار نے ہمیں فوجی زبان میں جو کمانڈو مشن بتایا' وہ یہ تھا کہ ہمارے سامنے انڈین آرمی کی ایک بٹالین کے مورچے تھے۔ ان مورچوں کے پیچھے ایک گڑھا تھا جسے آپ ایک خاصا کشادہ کھڈ کہہ لیں' اس میں ہر طرح کا ایمونیشن رکھا ہُوا تھا اور اس پر درختوں کے ٹہن وغیرہ ڈال کر کیموفلاج کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے یہ ذخیرہ اس بٹالین کے لئے تھا۔ کام یہ تھا کہ ہم نے دُور کا چکر کاٹ کر اس بٹالین کے مورچوں کے پیچھے جانا تھا اور اس ایمونیشن کے ذخیرے کو دو تین گرینیڈ پھینک کر تباہ کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہمارے مشن میں شامل تھا کہ جب دھماکہ ہو گا تو بٹالین کے جوان اس طرف کو دوڑے آئیں گے یا کوئی بھی وہ حرکت کریں' ہم نے ان پر فائر کرنا تھا تاکہ انہیں زیادہ سے زیادہ جانی نقصان پہنچایا جا سکے۔

یہ ایک طرح کا شب خون تھا جو ہم نے انڈین آرمی کی اس بٹالین کے مورچوں پر مارنا تھا اور اس سے پیشتر اس کا ایمونیشن تباہ کرنا تھا.... یہ سوچ کر مجھ پر ہیجانی سی کیفیت طاری ہو گئی کہ اگر مجھے اس کمانڈو پارٹی میں بھیجا گیا تو میں اپنے ہی بھائیوں پر شب خون ماروں گا اور کیا میرا یہ فعل جائز ہو گا یا نہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ ہمارے سامنے میری ہی بٹالین ہو جس سے میں بھگوڑا ہُوا تھا۔ میری بٹالین بھی تو آخر برما فرنٹ پر آئی تھی۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ اس صورت میں اس بٹالین کے جوانوں پر فائر کرنا چاہئے یا نہیں۔

میں اس مسئلے پر فصیح احمد کے ساتھ بات کرنا چاہتا تھا لیکن ابھی حوالدار ہمیں مشن کی بریفنگ دے رہا تھا۔ جب وہ بریفنگ دے چکا تو اس نے آٹھ آدمیوں کی ایک پارٹی الگ کر لی اور ان آٹھ جوانوں میں مجھے بھی شامل کر لیا گیا۔ پہلے ہی کمانڈو آپریشن میں میرا نام آ گیا اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں کتنا دلیر ہوا کرتا تھا مگر میرا دل کانپنے لگا اور میں نے دل میں یہ دعا بھی کی کہ کوئی ایسی آفت آ پڑے یا کوئی ایسی وجہ پیدا ہو جائے کہ میں اس مشن سے نکل جاؤں لیکن حکم بڑا ہی اٹل تھا اور حوالدار نے ہم آٹھوں جوانوں کو الگ کر کے تفصیل سے بتانا شروع کر دیا کہ ہمارا راستہ کون سا ہو گا اور ہمارا عمل کیا ہو گا اور اگر فلاں صورتِ حال پیدا ہو جائے تو یوں کرنا اور اگر یوں ہو جائے تو پھر اس طرح کرنا وغیرہ وغیرہ۔

آخر احکام اور ہدایات کا سلسلہ ختم ہوا اور ہمیں یہ حکم ملا کہ دن کو آرام کر لو شام کے بعد جب اندھیرا ذرا گہرا ہو گا تو ہماری روانگی ہو گی۔ وہاں سے ہٹے تو میں فصیح کے قریب چلا گیا اور اُس کے ساتھ بات کی کہ میں اپنے ہی فوجیوں پر کس طرح فائر کھولوں گا اور اگر وہ جوان مسلمان ہوئے تو مشکل پیدا ہو جائے گی کیونکہ میں ان پر فائر نہیں کر سکوں گا۔ فصیح نے کچھ سوچ کر اور کچھ سمجھ کر مجھے بتایا کہ تمہاری جان خطرے میں آ جائے تو پھر کسی کی پرواہ نہ کرنا۔ اس کے علاوہ اُس نے مجھے کام کی باتیں بتائیں۔



سورج غروب ہونے کے بعد ہمیں کھانا دیا گیا۔ یہ بھی ایمرجنسی راشن تھا لیکن پہلے سے یہ بہتر تھا۔ پتہ چلا کہ یہ افسروں کو دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہماری خاطر تواضع کی جا رہی تھی۔ ہمیں ایک جگہ اکٹھا کیا گیا۔ ہم آٹھ جوان تھے۔ ان میں ایک نائیک تھا اور اس پارٹی کا کمانڈر ایک جاپانی سارجنٹ تھا۔ وہ ہماری زبان نہیں سمجھتا تھا۔ ہم اُس کی نہیں سمجھتے تھے لیکن مشن میں کوئی بات نہیں کی جاتی' اشاروں سے باتیں ہوتی ہیں اور اشارے سمجھ لئے جاتے ہیں۔ ہمارے حوالدار نے ہمیں آخری ہدایات دیں اور ہم چل پڑے۔

میں قدم قدم کی تفصیل نہیں سناؤں گا' اتنی سی بات سمجھ لیں کہ ہمیں سامنے والی انڈین بٹالین کے مورچوں کے بائیں طرف سے گزر کر پیچھے جانا تھا۔ ہماری طرف سے

بائیں سائیڈ تھی اور اس بٹالین کی طرف سے دائیں سائیڈ تھی۔ ہم جاپانی سارجنٹ کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ اُسے پوری طرح معلوم تھا کہاں جا کر مُڑنا ہے اور کس طرح اور کس راستے سے اس بٹالین کے ایمونیشن ڈمپ پر پہنچنا ہے۔ ہمیں مکمل خاموشی اختیار کرنی تھی۔ کوئی راستہ نہیں تھا۔ زمین اونچی نیچی تھی۔ درخت کہیں بہت ہی زیادہ تھے اور کہیں بہت ہی کم۔ ہم اندھیرے میں چلے جا رہے تھے۔ میں نے اتنا محسوس کیا کہ زمین نیچے کو جا رہی ہے۔ آگے کھڈ آ گئے جس میں ہم سب باری باری گرے اور اٹھ کر چل پڑے۔ کوئی کسی کے ساتھ بات نہیں کر رہا تھا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جا رہے تھے' میرے دل و دماغ پر ہیجانی کیفیت بڑھتی جا رہی تھی۔

ہم کم و بیش دو گھنٹے چلتے رہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ ہم بہت نیچے چلے گئے تھے اور وہاں سے جب ہم ذرا دائیں کو مُڑے تو زمین اوپر کو جا رہی تھی۔ اُسے آپ پہاڑی کہہ لیں یا زمین کی بلندی کہہ لیں۔ یہ پہاڑ جیسی ڈھلان نہیں تھی بلکہ زمین تھوڑی اوپر کو اُٹھ رہی تھی۔ ہم ذرا بائیں کو مُڑے اور ایک ٹیکری کے پیچھے چلے گئے۔ ہمارے سروں کے اوپر سے توپوں کے گولے گزر رہے تھے۔ دونوں طرف کے توپ خانے ایک دوسرے پر آگ برسا رہے تھے۔ کبھی تو یوں لگتا جیسے یہ گولوں کی چیخیں نہیں بلکہ ایک ویرانے میں چڑیلیں اور بدروحیں چیختی چلاتی ایک دوسری پر جھپٹ رہی ہوں۔ توپ کا فائر کیا ہوا گولہ جب سر کے اوپر سے گزرتا ہے تو اس کی آواز چیخوں جیسی ہوتی ہے۔ کچھ اور آگے جا کر جاپانی سارجنٹ نے ہمیں روک لیا۔ وہ صرف یہ اشارہ کر رہا تھا کہ ہم بیٹھ جائیں۔ وہ شاید ہمیں کچھ دیر کے لئے آرام دینا چاہتا تھا۔

دس پندرہ منٹ بعد اُس نے ہمیں اٹھایا اور ہمارے آگے آگے چل پڑا۔ صاف ظاہر ہے کہ کسی مخبر نے اطلاع دی ہو گی کہ ایمونیشن ڈمپ کہاں ہے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور ہم آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ چونکہ زمین اوپر کو اُٹھ رہی تھی اس لئے ہماری رفتار کم ہو گئی تھی۔ چلتے ہوئے آگے کو جھکنا پڑتا تھا۔ رفتار کم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ زمین کھڈوں والی تھی۔

اس پارٹی کا ہر جوان کئی کئی بار گرا تھا اور میں تین بار گرا تھا اور ایک بار دائیں گھٹنے پر خاصی چوٹ آئی تھی۔ میں ذرا لنگڑا کر چلنے لگا۔ ہم جب ٹارگٹ پر پہنچے تو میرا خیال ہے رات آدھی گزر گئی تھی۔ دو ٹیکریاں تھیں جن میں سے ایک تو ذرا اونچی تھی اور دوسری

ذرا نیچے یعنی اس کی بلندی کوئی خاص نہیں تھی۔ جاپانی سارجنٹ نے ہمیں وہاں روک لیا اور اشاروں میں بتانے لگا کہ ٹارگٹ کہاں ہے اور پھر اس نے اشاروں میں ہمیں یہ بھی سمجھا دیا کہ جب اس بٹالین کے جوان مورچوں سے باہر آئیں تو اُن پر فائر کھول دینا۔ اس نے ہم سب کو بکھیر دیا۔ ہم نے یہ کارروائی اکٹھے رہ کر نہیں کرنی تھی۔

یہ تو ہمیں حوالدار نے بریفنگ میں بتایا تھا کہ ہم جائیں گے اکٹھے لیکن ہماری واپسی اکیلے اکیلے ہوگی۔ اُس نے کہا تھا کہ ہر جوان اپنی جان کا خود ذمہ دار ہوگا۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ تمہارا کوئی ساتھی زخمی ہو جائے تو اُسے اٹھانے کی اور ساتھ لانے کی کوشش نہیں کرنی ورنہ اُس کے ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ جہاں کہیں چھپنے کی جگہ مل جائے چھپ جانا اور اگر سات آٹھ دن گزر جائیں تو پرواہ نہیں، اپنے آپ کو بچا کر واپس لانا ہے۔

جاپانی نے ہمیں بکھیر دیا۔ ایمونیشن والے کھڈ میں گرینیڈ اس جاپانی نے ہی پھینکنے تھے۔ میں اس ٹارگٹ سے کچھ دُور چلا گیا۔ مجھے بتا دیا گیا تھا کہ انڈین آرمی کے مورچے کہاں ہیں اور ان کے جوان کدھر سے آئیں گے۔ میرے ہاتھ میں جاپان کی بنی ہوئی سٹین گن تھی جو انڈین آرمی سٹین گن سے خاصی مختلف تھی۔

○

ایک گھنٹہ گزرا ہوگا کہ مجھ سے تقریباً" پچاس گز دُور بڑا ہی خوفناک دھماکہ ہوا اور یکے بعد دیگرے تین دھماکے ہوئے جو گرینیڈوں کے تھے اور خوفناک دھماکہ ایمونیشن ڈمپ کا تھا جو یکبارگی پھٹ گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہاں مارٹر گنوں کے گولے بھی تھے۔ بٹالین میں عام طور پر رائفلوں اور مشین گنوں کا ایمونیشن ہوتا ہے۔ ایک شعلہ کچھ دُور اوپر گیا اور اس کے بعد پھٹتے ایمونیشن کے دھماکے سنائی دینے لگے۔ میں اب اس انتظار میں تھا کہ مورچوں میں سے ہندوستانی جوان نکلیں گے۔

اچانک آسمان روشن ہوگیا۔ ایک روشنی تو اس دھماکے کی تھی اور پھر ایمونیشن کے بکس جل اٹھے تھے، اس آگ کی روشنی بھی تھی اور وہاں جو بٹالین مورچوں میں تھی اُس نے روشنی راؤنڈ فائر کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ایک ہی بار چھ چھ سات سات اور آٹھ آٹھ روشنی راؤنڈ فائر ہوتے تھے۔ وہ بجھتے تو اور فائر کئے جاتے تھے۔ ان کی روشنی اتنی زیادہ تھی کہ درختوں کے پتے بھی نظر آسکتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہر طرف سے

مشین گنیں اور رائفلیں فائر ہونے لگیں۔ گولیاں میرے سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔

اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے نیچے تقریباً" پچاس گز دور اپنی انڈین آرمی کے جوان نظر آئے اور وہ پھیل گئے۔ میں نے سٹین گن سیدھی کی کہ ان پر فائر کروں لیکن معلوم نہیں کیا وجہ تھی کہ میں نے ایک بھی گولی فائر نہ کی۔ میں اس کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا جو اُس وقت مجھ پر طاری ہوگئی تھی۔ میں نے اتنا بھی نہ سوچا کہ یہ فوجی اب اس سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیں گے اور ہم لوگ پکڑے جائیں گے۔ میں تو جیسے سُن ہو کے رہ گیا تھا۔

آسمان پر روشنی راؤنڈ روشن ہو رہے تھے اور زمین پر اتنا زیادہ فائر کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی اور سر کے اوپر سے گولیاں سیٹیاں بجاتی گزر رہی تھیں۔ میں ذرا بلندی پر تھا۔ میں نے پیچھے کو سرکنا شروع کر دیا۔ مجھے اب یہ سوچنا تھا کہ کس طرف سے نکلوں اور [illegible] کا رستہ اختیار کروں۔ ایک خیال آگیا۔ وہ یہ تھا کہ میں نے ایک بھی راؤنڈ فائر نہیں کیا تھا۔ میں نے واپس جا کر بتانا تھا کہ میں اپنا تمام ایمونیشن فائر کر آیا ہوں اور جھوٹ بولنا تھا کہ میرے سامنے میرے فائر سے اتنے جوان مرے تھے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے سٹین گن ہوا میں فائر کرنی شروع کر دی اور وہاں سے پیچھے ہی پیچھے ہٹتا رہا۔

پیچھے کا مطلب یہ ہے کہ میں ایک طرف کو سرکتا گیا تاکہ اس قیامت سے نکل جاؤں۔ مجھے امید تو تھی کہ میں نکل جاؤں گا لیکن کچھ دُور جا کر میری اُمید خاک میں مل گئی کیونکہ اس طرف بھی روشنی راؤنڈ فائر ہونے لگے اور اُدھر سے مشین گنوں کا فائر بھی آنے لگا۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ رات کے وقت جب کوئی نظر نہیں آتا تو مشین گن دائیں بائیں گھما کر فائرنگ کی جاتی ہے جیسے پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے۔ اندھیرے میں بھاگنے والے اس فائر کی زد میں آ ہی جاتے ہیں۔ میں اب جنگل کا کیڑا مکوڑا بن گیا تھا۔ آڑ دیکھ دیکھ کر میں رینگتا تھا اور اس فائر سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہیں ذرا اونچی ٹیکری آ جاتی تو میں اٹھ کر جھکا جھکا دوڑ پڑتا مگر مجھے یہ احساس رہا ہی نہیں کہ میں کس سمت کو جا رہا ہوں۔ کہیں اونچی ٹیکری آجاتی اور کہیں بالکل ہی ہموار زمین آجاتی اور کہیں کھڈ آجاتا۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ میں کدھر سے آیا تھا اور کدھر جا رہا ہوں۔

تھکن کا یہ عالم کہ اب ٹانگیں گھسیٹنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ اگر مجھ میں لڑنے کا اور

مرنے مارنے کا جذبہ ہوتا تو میں جوش و خروش میں ہوتا اور تھکا ہوا جسم بھی تر و تازہ رہتا۔ وہاں تو میری اندرونی کیفیت ہی کچھ اور ہو گئی تھی۔ میرے تو اعصاب جواب دے گئے اور میں ایک ایسی جگہ جا کر رک گیا جہاں ذرا بلندی تھی اور جھاڑیاں بڑی گھنی تھیں اور گھاس بھی تھی۔ یقین کریں کہ میں نے وہاں یہ دعا بھی کی کہ ایک گولی آئے اور میرے سینے سے پار ہو جائے اور یہی میری نجات کا ذریعہ ہے۔

جسم سے جان نکل گئی اور میں وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ سامنے جو کوئی بھی آئے فائر کر دوں لیکن میرے اندر سے آواز آتی تھی کہ چپ کر کے بیٹھے رہو۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا بیٹھے رہنا بھی کوئی ارادی فعل نہیں تھا۔ مجھ میں ذرا سی بھی ہمت نہیں رہی تھی۔ ایک خیال ذہن پر غالب تھا کہ ہو سکتا ہے اس بٹالین میں میرے علاقے کے نوجوان ہوں اور وہ مارے جائیں اور ایسا بھی ہو گا کہ میرے ہاتھوں میرے مسلمان بھائی مارے جائیں گے۔ بہرحال میں بیٹھا رہا اور شاید مجھے اونگھ بھی آئی تھی اور پھر میں سر جھٹک کر بیدار بھی ہُوا تھا اور اس طرح وقت گزر تا گیا' گزر تا گیا اور پو پھٹنے لگی۔ اب یہ فکر لگ گیا کہ اب کہاں چھپوں گا۔ اب تو پکڑے جانا لازمی اور یقینی ہو گیا تھا۔

مجھے اپنے قریب ہی کسی کی باتوں کی آواز آئی اور قدموں کی آہٹ بھی سنائی دینے لگی۔ میں نے جھاڑی کے پتے ایک طرف کر کے دیکھا تو مجھے ایک حوالدار نظر آیا جو مجھ سے بمشکل دس قدم دُور سے گزر رہا تھا اور وہ میری طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں سٹین گن تھی۔ اُس کی چال اور اس کا دائیں بائیں دیکھنا صاف بتا رہا تھا کہ وہ کچھ تلاش کر رہا ہے۔ ظاہر ہے وہ ہمیں ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ میں نے اسے پہچاننے کی کوشش ہی نہ کی۔

میں نے جھاڑی کے پتے چھوڑ دیئے تاکہ پوری طرح چھپا رہوں لیکن جھاڑی سے سرسراہٹ سی اٹھی۔ وہ حوالدار چونک کر رک گیا اور اُس نے میری طرف دیکھا۔ تب مجھے شک ہُوا کہ یہ چہرہ جانا پہچانا ہے۔ اس کے سر پر سٹیل ہیلمٹ تھی میں پیچھے ہٹنے لگا تو جھاڑی میں اور حرکت ہوئی۔ حوالدار نے ایک دو قدم میری طرف اٹھائے اور سٹین گن ہپ کے ساتھ لگا کر بلند آواز سے کہا کہ جو کوئی بھی ہو باہر آ جاؤ ورنہ گولی چلا دوں گا۔ تب میں نے اُسے پہچان لیا۔

وہ حوالدار میری ہی بٹالین کا تھا اور میں جب بھگوڑا ہُوا تھا' اس وقت وہ نائیک تھا۔ وہ اتنا دلیر تھا کہ اُسے یہ بھی ڈر نہ تھا کہ جھاڑی میں جو کوئی بھی چھپا ہُوا ہے وہ اُس پر فائر کرے گا۔ میں نے اسے قریب آنے دیا۔ وہ مجھ سے چار پانچ قدم دور رہ گیا۔ میں ذرا بلندی پر تھا جسے آپ چھوٹی سی ٹیکری کہہ سکتے ہیں۔

"حوالدار امیر خان!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "بے خوف ہو کر آگے آ جاؤ اور مجھے دیکھ لو"۔

"ہو کون تم؟" ـــــ امیر خان نے پوچھا اور آگے بڑھتا آیا۔

جب وہ میرے سر پر آ گیا تو میں جھاڑیوں سے اٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس نے چونک کر حیرت زدگی کے عالم میں مجھے دیکھا اور بولا ـــــ "خانی؟.... تم؟"

میں نے اُس کا بازو پکڑ لیا اور اپنی طرف کھینچ کر اُسے جھاڑی کی اوٹ میں بٹھا لیا۔ میرے آنسو نکل آئے۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں کہاں غائب ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے انتہائی مختصر الفاظ میں بتایا کہ میں جاپانیوں کی ایک پٹرول پارٹی کے ہاتھ چڑھ گیا تھا اور انہوں نے مجھے جنگی قیدی بنا لیا تھا۔ پھر میں نے اُسے بتایا کہ جنگی قید میں میں تو مشقت اور بھوک سے مرنے والا ہو گیا تھا۔ جاپانیوں نے مجھے کہا کہ میں انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو جاؤں تو ٹھیک ہے ورنہ مجھے گولی مار دیں گے۔ میں نے اپنی جان بچانے کے لئے رضامندی ظاہر کر دی اور اس طرح زندہ رہا۔ اب یہاں چھپا بیٹھا ہوں اور بیٹھے رہنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اپنا آدمی آئے اور مجھے اپنی یونٹ میں لے جائے۔

"فکر نہ کر گرائیں!" ـــــ حوالدار امیر خان نے کہا ـــــ "اپنا یہی بیان رکھنا۔ میں تمہیں اپنے کمپنی صوبیدار اشرف صاحب تک لے چلوں گا.... تم انہیں جانتے ہو.... اپنے ہی گرائیں ہیں۔ وہ تمہیں بچالیں گے"۔

یہ حوالدار میری تحصیل کا رہنے والا تھا اور جس صوبیدار کا اُس نے نام لیا تھا وہ بھی ہماری تحصیل کا تھا۔ میں جس وقت بھگوڑا ہُوا تھا اس وقت وہ جمعدار (نائب صوبیدار) ہُوا کرتا تھا۔ حوالدار امیر خان نے میرے جسم میں روح پھونک دی اور میں اُٹھ کھڑا ہُوا اور اُس کے ساتھ چل پڑا۔

وہ چھاؤنی نہیں تھی' نہ بارکیں تھیں وہ جنگ کا محاذ تھا۔ مورچوں کا وسیع علاقہ تھا جہاں خیمہ کوئی بھی نظر نہیں آتا تھا۔ وہاں پوری بٹالین مورچوں میں تھی اور دُور دُور تک بکھری ہوئی تھی۔ یہ بڑا ہی گرم محاذ تھا اور یہاں خونریز لڑائیاں لڑی گئی تھیں۔ گذشتہ رات اس بٹالین پر کمانڈو ریڈ ہُوا تھا جسے شب خون کہہ لیں۔

حوالدار امیر خان مجھے صوبیدار اشرف کے پاس لے جا رہا تھا۔ یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ صوبیدار اشرف کہاں ہے۔ وہاں تو کھلبلی مچی ہوئی تھی اور ہر کوئی بھاگ دوڑ رہا تھا۔ ہماری کمانڈو پارٹی کا یہ شب خون کامیاب رہا تھا۔ حوالدار امیر خان مجھے ساتھ لئے چلا جا رہا تھا اور یہ بھی بتا رہا تھا کہ رات کو بٹالین کا کتنا نقصان ہُوا ہے۔ ایک تو اس بٹالین کا جو دراصل میری بٹالین تھی' پورے کا پورا ایمونیشن ڈمپ اُڑ گیا تھا۔ اس میں گرینیڈوں کے بکس بھی تھے اور مارٹر گنوں کے گولے بھی۔ چھوٹے ایمونیشن کا کوئی حساب کتاب ہی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ہماری پارٹی نے جس کا انچارج ایک جاپانی افسر تھا' اس بٹالین کو جانی نقصان بہت پہنچایا تھا۔ ایمونیشن کے دھماکے کے ساتھ ہی بٹالین جب مورچوں سے نکلی تو میری پارٹی نے سٹین گنوں اور سب مشین گنوں سے ایسا ظالمانہ فائر کیا تھا کہ بہت سے جوان مارے گئے اور زخمی بھی بہت ہوئے تھے۔

حوالدار امیر خان نے مجھے بتایا کہ انہیں رات کو ہی پتہ چل گیا تھا کہ یہ کسی جاپانی بٹالین یا بریگیڈ کا حملہ نہیں بلکہ یہ اُن کا کمانڈو آپریشن ہے۔ اسی لئے بٹالین کے مورچوں سے بے طرح روشنی راؤنڈ فائر ہونے لگے تھے۔ بٹالین نے ہماری کمانڈو پارٹی کو گھیرے میں لینے کی بہت کوشش کی تھی لیکن کسی کو زندہ نہ پکڑ سکے۔ بٹالین کی طرف سے بھی

ولیوں کا جو چھڑکاؤ ہُوا تھا' اس سے میری پارٹی کے کئی جوان مارے گئے تھے۔ اب بٹالین تمام نفری سارے علاقے کی تلاشی لے رہی تھی کہ کمانڈو پارٹی کا کوئی زخمی مل جائے۔ نہیں ابھی تک کوئی زخمی زندہ نہیں ملا تھا۔ جو کمانڈو بھی ملا وہ مرا ہوا تھا۔ تلاش ابھی ک جاری تھی۔ تقریباً" ساری بٹالین اس تلاشی میں سارے علاقے میں بکھر گئی تھی۔ یری طرف کوئی دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ ہر کوئی بھاگ دوڑ رہا تھا۔ یہ تو کسی کو توقع ہی نہیں تھی کہ میں دو سال لمبی غیر حاضری کے بعد واپس آ جاؤں گا۔ حوالدار امیر خان نے مجھے یا تھا کہ سرکاری طور پر تو مجھے لاپتہ قرار دیا گیا تھا لیکن سب کہتے تھے کہ میں مارا جا چکا وں۔

اس علاقے کو میں پہلے بیان کر چکا ہوں' گھنے جنگل کا علاقہ تھا جس میں ٹیکریاں بھی ہیں اور ذرا ہٹ کر پہاڑیاں بھی تھیں اور یہ ٹیکریاں بھی اور پہاڑیاں بھی درختوں سے' ھاڑیوں اور اونچی گھاس سے لدی ہوئی تھی۔ وہاں سے کسی آدمی کو تلاش کرنا آسان یں تھا۔ حوالدار امیر خان مجھے ساتھ لئے بڑا ہی تیز تیز اِدھر اُدھر گھوم پھر رہا تھا۔ وبیدار اشرف کمپنی صوبیدار تھا اس لئے میں سمجھتا تھا کہ اس کمانڈو شب خون کے بعد کتنا مصروف اور کتنا فکرمند ہو گا۔ آخر صوبیدار اشرف ایک نشیب میں اترتا نظر آ گیا۔ ہاں میں یہ بھی بتا دوں کہ مجھے صوبیدار اشرف کے پاس لے جانا فوجی قاعدے قانون کے مطابق نہیں تھا۔ مجھے سب سے پہلے صوبیدار میجر کے پاس لے جانا چاہئے تھا اور وبیدار میجر نے مجھے ایجوٹنٹ کے پاس اور ایجوٹنٹ نے مجھے کمانڈنگ آفیسر کے پاس لے جانا تھا۔ اُس وقت میری حیثیت ایک بھگوڑے کی تھی اور اس کے ساتھ ہی میں نگریزوں کے ساتھ مل جانے کا اور شب خون مارنے کا مجرم بھی تھا لیکن حوالدار امیر خان مجھے صوبیدار اشرف کے پاس اس لئے لے جا رہا تھا کہ وہ میری بات سن کر مجھے بچانے کا کوئی طریقہ یا ذریعہ سوچ لے گا۔

اگر میری داڑھی اسی طرح لمبی ہوتی جس طرح برما کے جنگلوں میں تھی تو مجھے اپنی لٹن کا کوئی بھی فرد پہچان نہ سکتا لیکن جاپانیوں کے پاس آ کر میں نے داڑھی بہت چھوٹی کروالی تھی جس سے میرا چہرہ قابلِ شناخت ہو گیا تھا۔ حوالدار امیر خان نے مجھے صوبیدار اشرف کے سامنے جا کھڑا کیا تو صوبیدار اشرف نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ میں اُس وقت جاپانی فوج کی وردی پہنے ہوئے تھا۔ غصے سے صوبیدار اشرف کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ

مجھے آئی این اے کا کوئی ہندوستانی فوجی سمجھا اور یہ تو اسے سمجھنے میں ذرا سی بھی دیر نہ لگی کہ گذشتہ رات کی کمانڈو پارٹی میں ایک جوان میں بھی تھا لیکن حوالدار امیر خان ہنس پڑا۔

"ہنستے کیوں ہو!" ــــ صوبیدار اشرف نے امیر خان سے کہا اور مجھے گالی دے کر بولا ــــ "مارو گولی اسے اور یہیں ختم کر دو۔ دیکھو انہوں نے کتنا نقصان کیا ہے۔ ہندوستانی ہو کر ہندوستانیوں کا نقصان کیا ہے"۔

صوبیدار اشرف بولتے بولتے چپ ہو گیا اور اس کی نظریں میرے چہرے پر جم گئیں۔ میرے ہونٹوں پر شاید مسکراہٹ آ گئی تھی۔ صوبیدار اشرف نے آگے ہو کر مجھے اور غور سے دیکھا۔

"اپنا گرائیں ہے صوبیدار صاحب!" ــــ حوالدار امیر خان نے کہا اور میرا نام لیا پھر بولا ــــ "یہ رات دشمن کی پارٹی کے ساتھ آ گیا تھا لیکن ایک جگہ چھپ گیا تھا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی اور صبح اس نے خود مجھے آواز دے کر بلایا اور کہا کہ وہ اپنی بٹالین میں واپس آنا چاہتا ہے"۔

یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ صوبیدار اشرف میرے ساتھ فوراً "بغل گیر ہو جاتا اور پیار و محبت کی باتیں شروع کر دیتا۔ وہ انڈین آرمی کا صوبیدار تھا اور اپنی ذمہ داریوں سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ اُس کی کمپنی کا باقی بٹالین کی نسبت زیادہ نقصان ہُوا تھا کیونکہ جس طرف میری پارٹی نے شب خون مارا تھا اس طرف اسی کمپنی کے مورچے تھے۔

"اب تو اُس نے یہی بیان دینا ہے" ــــ صوبیدار اشرف نے کہا ــــ "پکڑا جو گیا ہے۔ نیشنل آرمی میں تمہیں کیا ملتا ہے جو اپنی آرمی میں نہیں ملتا تھا" ــــ اُس نے حوالدار امیر خان سے پوچھا ــــ "اسے میرے پاس کیوں لے آئے ہو؟ لے جاؤ اسے صوبیدار میجر کے پاس۔ میں یہ بتا دیتا ہوں کہ اسے کسی نے جنگی قیدی نہیں بنانا۔ سی او صاحب کہیں گے کہ اسے گولی مار دو"۔

"پہلے تو آپ اس کی بات سن لیں صوبیدار صاحب!" ــــ حوالدار امیر خان نے کہا ــــ "اپنا گرائیں ہے اور اس پر جاپانیوں نے پہلے ہی بہت ظلم کیا ہے۔ یہ تو جنگی قیدی تھا لیکن انہوں نے اسے اتنا زیادہ مارا پیٹا کہ یہ مجبوراً "آئی این اے میں شامل ہو گیا"۔

میں نے جو جھوٹ بولا تھا' وہ بولا۔ میں نے جھوٹ جوڑ جوڑ کر ذرا لمبا بیان دیا جس کا

مطلب یہ تھا کہ مجھے جاپانیوں کی ایک پٹرول پارٹی نے پکڑ لیا اور یہاں لے آئے تھے۔ پھر میں نے کہا کہ قیدی کیمپ میں ہم سے اتنی مشقت کرائی جاتی تھی جو گدھا بھی مشکل سے کر سکے لیکن کھانے کو بہت ہی تھوڑا دیا جاتا تھا جس سے آپ یہ سمجھ لیں کہ فاقے کرنے پڑتے تھے۔ میں تو ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا اور میں نے تین چار دنوں بعد مرجانا تھا۔ میرے دوسرے ساتھیوں کا بھی یہی حال کر دیا گیا تھا۔ میں نے جھوٹ پر جھوٹ بولتے ہوئے کہا کہ ہم جب پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ رہے اور موت صاف نظر آنے لگی تو جاپانیوں نے کہا کہ نیشنل آرمی میں شامل ہو جاؤ ورنہ آج سے تمہارا پانی بھی بند کر دیا جائے گا۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ ہم نیم غشی کی حالت میں نیشنل آرمی میں شامل ہوئے تھے۔

صوبیدار اشرف نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے جاپانیوں نے کس مقام سے پکڑا تھا۔ میں نے ایک اور جھوٹ بولا اور اُسے ایک جگہ بتا دی۔

"کس کے ساتھ بات کر رہے ہو؟" ــــ صوبیدار اشرف نے کہا ــــ "میں صوبیدار ہوں کمپنی کا لانگری نہیں ہوں۔ وہاں تک جاپانیوں کی ہوا بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میں بھی اُسی پوزیشن میں تھا.... دیکھ بھائی میاں! سچی بات بتا دو اور میں پردہ ڈالنے کی پوری کوشش کروں گا"۔

"اسی لئے تو اسے آپ کے پاس لایا ہوں صوبیدار صاحب!" ــــ حوالدار امیر خان نے کہا ــــ "اس کی بات پر میں نے بھی یقین نہیں کیا تھا۔ آخر اپنا گرائیں ہے' اگر ہم نے اسے آگے کر دیا تو اس کا کورٹ مارشل ہو جائے گا اور اس کو سزائے موت ملے گی۔ اس کے ماں باپ پر رحم کریں صوبیدار صاحب اور اسے بچانے کا کوئی ذریعہ سوچیں"۔

صوبیدار اشرف نے میرے ہاتھ سے سٹین گن چھین لی اور اس کی نالی دیکھی۔

"دیکھو اس کی گن!" ــــ اس نے حوالدار امیر خان سے کہا ــــ "معلوم نہیں اس نے اس سٹین گن سے کتنی میگزینیں خالی کر دی ہوں گی"۔

"مجھ سے کوئی قسم لے لیں صوبیدار صاحب!" ــــ میں نے کہا ــــ "میں نے تھوڑے سے راؤنڈ ہوائی فائر کئے تھے کہ میرا پارٹی کمانڈر یہ نہ کہے کہ میں نے ایک بھی گولی فائر نہیں کی۔ یہ تو مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ میں جس پلٹن پر ریڈ کرنے آیا ہوں یہ میری اپنی پلٹن ہے۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ میرے ہاتھوں کوئی میرا ہندوستانی بھائی نہ

مرے۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ یہیں چھپا رہوں گا اور صبح اپنا یہ ہتھیار پلٹن کے حوالے کر دوں گا پھر میرے ساتھ جو بھی سلوک کرتے ہیں کرتے رہیں"۔

"میں یہ مان لیتا ہوں" —— صوبیدار اشرف نے کہا —— "تم دس جماعتیں پڑھے ہوئے ہو اور میں نے صرف چار جماعتیں پڑھی تھیں لیکن میری عقل کا مقابلہ تمہاری عقل نہیں کر سکتی.... تم صاف کہہ دو کہ بھگوڑے ہوئے تھے۔ تم جنگی قیدی نہیں ہوئے تھے"۔

حوالدار امیر خان نے بھی مجھے یہی بات کہی اور میں نے سچ بول دیا۔

"یہ تمہارا قصور نہیں" —— صوبیدار اشرف نے کہا —— "یہ تعلیم کا قصور ہے۔ اگر تم مجھ سے کسی ان پڑھ آدمی سے مشورہ لے لیتے تو وہ تمہیں یہی مشورہ دیتا کہ انگریزوں کے پاس بہت بڑی طاقت ہے اور تم ان سے آزاد نہیں ہو سکتے"۔

حوالدار امیر خان نے اور میں نے مل کر اس کی منت ساجت کی تو اس نے کہا کہ چونکہ تم نے اب سچ بول دیا ہے اور میں اپنا یہ وعدہ پورا کروں گا کہ تمہیں بچالوں گا لیکن تم وہی جھوٹ بولنا جو میرے آگے بولا تھا.... اس نے مجھے ایک بیان زبانی یاد کرا دیا اور مجھے ساتھ لے کر ایک اور طرف چلا گیا۔ وہ مجھے صوبیدار میجر کے پاس لے جا رہا تھا۔ پہلا صوبیدار میجر مسلمان تھا۔ پتہ چلا کہ وہ برما میں مارا گیا ہے۔ اب ایک سکھ صوبیدار میجر تھا۔

صوبیدار اشرف اور حوالدار امیر خان نے اس سکھ صوبیدار میجر سے کہا کہ میں رات کو ہی خود ہی پہنچ گیا تھا اور میں نے اپنی سٹین گن سے ایک راؤنڈ بھی فائر نہیں کیا تھا۔ انہوں نے ہی میری جگہ بیان دیا کہ میں جنگی قیدی تھا اور بھوکا پیاسا رکھ کر زبردستی آئی این اے میں شامل کر لیا گیا اور اب مجھے موقع ملا اور میں واپس آ گیا ہوں۔

صوبیدار میجر نے مجھے ایجوٹنٹ کے پیش کیا وہاں میں نے وہی بیان دیا جو صوبیدار اشرف نے بتایا تھا۔ پھر مجھے کمانڈنگ آفیسر کے پیش کیا گیا۔ اس کے آگے بھی میں نے یہی بیان دیا۔ صوبیدار اشرف نے اور صوبیدار میجر نے بھی میری سفارش کی اور مجھے بے گناہ سمجھ کر بری کر دیا گیا۔

اگر یہ کوئی چھاؤنی ہوتی اور جنگ نہ ہوتی اور میں اس طرح بھگوڑا ہو کر واپس آتا تو کسی نے میرے جھوٹ پر اعتبار نہیں کرنا تھا۔ میرا کورٹ مارشل ہوتا اور اس کی مجھے

انتہائی سزا ملتی لیکن وہ میدانِ جنگ تھا اور وہ گرم میدان جنگ تھا جہاں ایک ایک آدمی کی ضرورت تھی اور حالات بالکل ہی نارمل نہیں تھے۔ اس لئے مجھے چھوڑ دیا گیا اور کمانڈنگ آفیسر نے فیصلہ دیا کہ میں اپنی کمپنی میں چلا جاؤں۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس روز بٹالین بہت ہی مصروف تھی اس لئے انگریز افسروں نے میرے جھوٹے بیان پر اعتبار کر لیا اور مجھ پر کوئی جرح نہ کی۔ دو روز بعد مجھے کمانڈنگ آفیسر نے بلایا۔ اس کے پاس ایک انگریز میجر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے انہوں نے اپنے پاس بٹھا لیا۔ معلوم ہوا کہ یہ میجر انٹیلی جنس آفیسر ہے اور مجھ سے آئی این کے متعلق معلومات لینے آیا ہے۔ اس میجر کا تعلق ڈویژن یا بریگیڈ ہی سے ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے آئی این اے کے متعلق تمام باتیں بتائیں اور ان دونوں انگریز افسروں کو خوش کرنے کے لئے کچھ ایسے جھوٹ بھی بولے جو آئی این اے کے خلاف جاتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آئی این اے کی تنظیم' ڈسپلن اور مورال کیسا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ آئی این اے میں زیادہ تر وہ جوان ہیں جو جنگی قیدی ہو گئے تھے اور ان میں لڑنے کا مورال خاصا کمزور ہے۔ میں نے یہ بھی بتا دیا کہ آئی این اے کے ہندوؤں نے اپنے آپ کو ہندوستان کا بادشاہ کہنا شروع کر دیا ہے۔ اس طرح وہ جو کچھ پوچھتے رہے میں بتاتا رہا اور یہ بھی بتایا کہ ہمیں کوالالمپور میں کمانڈو ٹریننگ دی گئی تھی اور وہی ان کا یعنی جاپانیوں کا ہیڈ کوارٹر ہے۔

"اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دو" —— میرے کمانڈنگ آفیسر نے پوچھا —— "اگر ہم کوالالمپور میں ریڈ کرنے کے لئے کمانڈو پارٹی بھیجیں تو کیا تم اس پارٹی کو ٹھیک طرح گائیڈ کر سکو گے؟"

"ہاں صاحب!" —— میں نے جواب دیا —— "صرف گائیڈ ہی نہیں کر سکوں گا بلکہ اس جگہ خود ریڈ کروں گا جہاں بھرپور وار کرنے سے جاپانیوں کی کمر ٹوٹ جائے گی"۔

کچھ اور باتیں پوچھ کر مجھے فارغ کر دیا اور یہ بھی کہا کہ تیار رہنا۔

○

میری کمانڈو پارٹی کی تیرہ لاشیں ملی تھیں جو ایک جگہ اکٹھی کی گئی تھیں۔ میں نے یہ لاشیں خاص طور پر جا کر دیکھی تھیں۔ میں دراصل یہ دیکھ رہا تھا کہ فصیح احمد زندہ نکل گیا تھا یا مارا گیا ہے۔ وہ زندہ نکل گیا ہو گا' اس کی لاش لاشوں میں نہیں تھی۔ پارٹی کمانڈر جو

جاپانی تھا وہ بھی مارا گیا تھا۔

برما فرنٹ سے لے کر ملایا کے ان مورچوں میں پہنچنے تک میری بٹالین کی آدھی نفری ماری جاچکی تھی۔ اس نفری میں تین انگریز افسر بھی تھے جنہیں میں جانتا تھا اور جن کے ساتھ میری سلام دعا تھی' وہ مارے گئے تھے۔ پرانے لوگ موجود تھے جنہوں نے مجھے دیکھا تو بہت ہی حیران ہوئے۔

مجھے ایک کمپنی میں شامل کر لیا گیا۔ صوبیدار اشرف اسی کمپنی کا صوبیدار تھا اور حوالدار امیر خان بھی اسی کمپنی کی ایک پلاٹون میں تھا۔ دو روز بعد بریگیڈ نے کوالالمپور کی طرف ایڈوانس کیا.... اب میں اگر یہ سنانا شروع کر دوں کہ ہم نے ایڈوانس کیا تو راستے میں جاپانیوں نے مزاحمت کی یا نہ کی یا ہم کہاں جا پہنچے اور وہاں جو لڑائی ہوئی وہ کس طرح ہوئی اور پھر وہاں سے ہم کدھر گئے تو یہ بات بڑی ہی لمبی ہو جائے گی۔ یہ جنگ کی تفصیلات ہوں گی جن کے ساتھ آپ کو اتنی دلچسپی نہیں ہو گی اور ہونی بھی نہیں چاہئے۔ میں اتنا ہی بتانا کافی سمجھتا ہوں کہ جاپانیوں کے قدم اکھڑ چکے تھے اور اب یہ قدم جم نہیں رہے تھے۔ یہ میں پہلے تفصیل سے سنا چکا ہوں کہ جاپانیوں کی سپلائی لائن اور کمک کٹ چکی تھی۔ انگریزوں کا اور امریکیوں کا حملہ بڑا ہی زوردار اور زبردست طاقت والا تھا۔ اب جاپانی کہیں گھات لگا کر انگریزوں کی بڑھتی ہوئی فوج پر فائرنگ کر سکتے تھے لیکن کہیں جم کر لڑنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

میں اُس جنگ کی بات کروں گا جو میرے اندر شروع ہو گئی تھی۔ میں تو انگریزوں سے آزاد ہونے چلا تھا لیکن اللہ نے مجھے ایسے جنگلوں میں پھینک دیا جو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں نے بڑا ہی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔ وہ جنگل اور وہاں کی زندگی خواب کی طرح یاد آنے لگی لیکن یہ سوچتے سوچتے کہ وہ زندگی بڑی ڈراؤنی تھی' یہ خیال بھی آ جاتا کہ وہ تو بڑی پیاری اور بے فکری کی زندگی تھی' اگر میں جنگ ختم ہونے تک وہیں رہتا یا وہیں کا ہو کے رہ جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔

دراصل میرے اندر ایک انقلاب آ گیا تھا۔ میں اسی بٹالین سے بھاگا تھا اور کئی بار خیال آیا تھا کہ پکڑا گیا تو میرا مستقبل تاریک ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے سزائے موت ہی مل جائے لیکن میں واپس بٹالین میں ہی آ گیا اور خیریت گزری۔ مجھے مطمئن ہو جانا چاہئے تھا لیکن میرے اندر تلخیاں سی پیدا ہونے لگیں۔ بار بار یہ خیال آتا کہ ایسا ہُوا کیوں؟ کیا

اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی گناہ کی سزا دی تھی؟ کیا اللہ تعالیٰ نے مجھے جسمانی اور روحانی طور پر پختہ کرنے کا یہ سبب بنایا تھا کہ مجھے جنگلوں میں پھینک دیا؟ اگر ایسا ہی تھا تو پھر میں اللہ کے حضور سرخرُو تھا۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ خوبصورت اور نوجوان لڑکیوں نے مجھے اپنے جسم پیش کئے تھے جو میں نے قبول نہ کئے بلکہ ان کی عزتیں بچائیں۔

پھر مجھے اس انقلاب سے یہ فائدہ ملا کہ ہندوؤں کو میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ کس ذہنیت کے لوگ ہیں۔ یہ ہندو انگریزوں کے بعد ہم مسلمانوں کو اپنا غلام بنانا چاہتے تھے۔ آئی این اے میں جو ہندو تھے انہوں نے تو ہمیں اپنا غلام سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ میں پہلے سنا چکا ہوں۔

ایسا خیال فوج میں بھرتی ہونے تک مجھے کبھی نہیں آیا تھا ــــ "کیا مسلمان ہمیشہ غلام رہیں گے؟" ــــ مجھ میں آزادی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ پہلے تو میں کہا کرتا تھا کہ انگریزوں سے آزاد ہونا ہے لیکن ہندوؤں نے میرے اس جذبے کو اور مضبوط کر دیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ مل کر آزاد نہیں ہونا چاہئے ورنہ یہ بہت بڑا دھوکہ ہو گا۔ میں ان چند ایک سیدھے سادے بلکہ کم عقل مسلمانوں میں سے تھا جو "ہندو مسلم بھائی بھائی" میں یقین رکھتے تھے۔ میں ہندو مسلم اتحاد کا قائل تھا اور یہی سوچ کر میں آئی این اے میں شامل ہوا تھا۔ میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے معاملے میں ہندو مسلمانوں کے ساتھ ہیں لیکن آئی این اے میں جا کر ہندوؤں نے میری آنکھیں کھول دیں اور اس کے بعد کچھ اور واقعات بھی ہوئے جن میں ہندوؤں نے اپنا آپ اور زیادہ واضح کر کے دکھا دیا' مثلاً "انڈونیشیا کی جنگ آزادی... آگے چل کر میں انڈونیشیا کی جنگ آزادی کی کچھ تفصیلات سناؤں گا۔

بریگیڈ جب ایڈوانس کر رہا تھا تو میں اپنے ان خیالوں میں کھویا ہُوا تھا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ انٹیلی جنس کے انگریز میجر نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کوالالمپور پر یعنی جاپانیوں اور آئی این اے کے ہیڈ کوارٹر پر کمانڈو ریڈ کیا جائے تو کیا میں گائیڈ کروں گا۔ میں نے کہا تھا کہ ضرور گائیڈ کروں گا۔ اب مجھے خیال آنے لگا کہ اللہ کرے ان انگریزوں کو یہ ضرورت محسوس ہو کہ کوالالمپور پر شب خون مارا جائے اور مجھے ساتھ لے جائیں' پھر میں آئی این اے کے کسی بھی ہندو کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

میں دراصل بتانا یہ چاہتا ہوں کہ میرے اندر ایک کشمکش شروع ہو گئی تھی اور یہ

بھی محسوس کر رہا تھا کہ میرے خیالوں اور میری سوچوں میں کوئی اور ہی رنگ پیدا ہو رہا ہے اور میرا دماغ کچھ پختہ ہونا شروع ہو گیا ہے۔ فوج سے بھگوڑا ہو کر برما کے جنگلوں میں جانے تک میں اچھے کردار کا آدمی نہیں تھا۔ اگر آپ کو یاد ہے تو میں نے اپنی اس داستان کے آغاز میں بتایا ہے کہ میں فوج میں کیوں بھرتی ہُوا تھا۔ میں ذریعۂ معاش کے خیال سے فوج میں نہیں آیا تھا۔ وہ کچھ اور ہی مجبوری تھی۔ آپ کو یہ بھی یاد ہو گا کہ میں نے اپنے دوست حمید کے ساتھ مل کر ایک پیر کو کس طرح چھینٹی لگائی تھی۔ یہ شریف لوگوں کا کام نہیں تھا جو میں نے حمید کے ساتھ مل کر کیا تھا۔ پھر جس طرح میں کوہاٹ چھاؤنی میں واجدہ سے ملتا رہا' وہ بھی کوئی شرافت نہیں تھی لیکن اب میرے خیالات کچھ اور ہو گئے تھے اور ان سوچوں میں گم ہو کر مجھے کوالالمپور والا فیض الحق یاد آنے لگا۔ اس کی شخصیت نے مجھے بہت ہی متاثر کیا تھا۔ میں تو علم و فضل کے حصول کی خاطر اس کی شاگردی میں بیٹھنا چاہتا تھا لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ اب میں دل ہی دل میں اللہ سے دعا مانگنے لگا کہ فیض الحق سے ملنے کا ایک اور موقع پیدا ہو جائے اور میں اس سے پوچھوں کہ میرے اندر یہ جو کشمکش پیدا ہو گئی ہے' یہ کیا ہے اور میں کس طرح اس پر قابو پا سکتا ہوں۔

فیض الحق کی یہ بات مجھے یاد آنے لگی کہ دنیا دیکھے گی کہ یہ سارا خطّہ یعنی ملایا وغیرہ ایک مسلمان ملک بن گیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ دو مسلمان ملک بن جائیں۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں تو کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جاپانیوں کو اسی لئے بھیجا تھا کہ پرانے بادشاہوں کے تختے اُلٹ جائیں اور پھر یہاں اسلام کا جھنڈا بلند ہو۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہندوستان میں بھی انگریزوں کا تختہ اُلٹ جائے گا اور ایک یا دو مسلمان ملک وجود میں آئیں گے.... میں اُس سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ خطّہ اپنے آپ ہی مسلمان ملک بن جائے گا اور کیا ہندوستان میں بھی بغیر کسی کوشش کے ایک یا دو مسلمان ملک وجود میں آئیں گے؟ کوشش کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہُوا کرتا۔ اس کے لئے' خصوصاً" آزادی حاصل کرنے کے لئے' جان کے نذرانے دینے پڑتے ہیں۔ میں فیض الحق سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ میں کم عقل ہوں اور آپ دانشمند ہیں' مجھے بتائیں کہ یہ ملک کس طرح وجود میں آئیں گے اور اگر انہیں وجود میں لانا ہے تو میرا فرض کیا ہو گا۔

آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ میں اُس وقت کے جن خیالات کا اظہار کر رہا ہوں' وہ

ادھورے ادھورے اور کچے کچے سے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کہیں کہ ان کا کوئی سر پیر نہیں۔ یہی تو میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ اُس وقت میری عقل خام تھی لیکن میرے اندر ایک روشنی جل اٹھی تھی جو مجھے کوئی اور راستہ دکھا رہی تھی اور میں ابھی اس راستے کو سمجھنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ میں نے اپنی بٹالین میں واپس آ کر غلطی کی ہے۔ مجھے وہ قبائلی پٹھان یاد آ گئے جن کا میں قیدی ہو گیا تھا۔ میری نظروں کے سامنے وہ بوڑھا پٹھان آ گیا جس نے مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی اور میں سمجھ گیا تھا۔ میرے اندر آزادی کی تڑپ اسی بوڑھے پٹھان نے اور اسی گھر کی عورتوں نے پیدا کی تھی۔ میں پھر انگریزوں کی آرمی میں آ گیا تو میں یوں محسوس کرنے لگا جیسے میں نے اس حریّت پسند قبائلی پٹھان کے ساتھ وعدہ خلافی ہی نہیں غداری کی ہے۔

قبائلی پٹھان یاد آئے تو ان کی جنگ آزادی بھی یاد آ گئی۔ میں اپنے آپ میں ایسی شرمساری محسوس کرنے لگا جیسے اپنے آپ سے نفرت سی ہو گئی ہو۔ خیال آیا کہ میں انہی کے پاس رہ جاتا تو زیادہ اچھا تھا۔ اب میں ان تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ سوچتے سوچتے دماغ میں یہ آئی کہ ایک بار پھر کوالالمپور جانے کا اتفاق ہُوا تو میں فیض الحق کے پاس پہنچ جاؤں گا اور اسے کہوں گا کہ باقی عمر اُس کے ساتھ گذاروں گا اور فوج میں واپس نہیں جاؤں گا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے مجھے روحانی اطمینان فیض الحق کے ہاں ہی سے ملے گا۔

○

دن کا ایک بج رہا تھا جب بریگیڈ رک گیا اور حکم ملا کہ گاڑیوں سے اُتر آؤ اور کھانا کھا لو۔ میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا اور میرے اندر کی کشمکش کچھ نرم پڑ گئی۔

کھانے کا نام سنا تو بھوک محسوس ہونے لگی۔ ہم گاڑیوں سے اتر ہی رہے تھے کہ اچانک ہمارے درمیان اور پیچھے اور ہر طرف توپوں کے گولے پھٹنے لگے۔ جاپانیوں نے ہمارا راستہ روک لیا تھا۔ ان کے توپ خانے بے پناہ گولہ باری کر رہے تھے۔ ہم سب بھاگم بھاگ جہاں آڑ ملی وہاں جا چھپے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہمارے بریگیڈ کا توپ خانہ ایکشن میں آ گیا اور ادھر سے بھی گولہ باری شروع ہو گئی۔

مجھے بڑی قسم کا ایک درخت نظر آیا جس کا تنا بہت ہی پھیلا ہُوا تھا۔ میں دوڑ کر اُس

درخت کے تنے کی اوٹ میں ہو گیا۔ میں نے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ توپ کے گولے کا دھماکہ کوئی غیر فوجی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس سے کانوں کے پردے تو سُن ہو ہی جاتے ہیں' مسلسل دھماکوں سے بعض فوجیوں کا دماغ جواب دے جاتا ہے اور وہ پاگلوں کی سی حرکتیں کرنے لگتے ہیں لیکن ہماری بٹالین میں کوئی ایسا کیس نہ ہوا کیونکہ یہ بٹالین دو سال سے یہ دھماکے برداشت کر رہی تھی اور اُس کے افسر اور جوان اتنے پختہ ہو گئے تھے کہ اب یہ دھماکے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

میں نے اس گولہ باری میں جو کچھ دیکھا وہ آج تک نہیں بھولا اور مرتے دم تک نہیں بھول سکوں گا۔ ہماری بٹالین کی B کمپنی کا ایک سکھ حوالدار ایک آڑ سے اٹھ کر معلوم نہیں کیوں ایک طرف کو دوڑ پڑا شاید اسے کسی افسر نے بلایا ہو گا۔ وہ ابھی راستے میں ہی تھا کہ توپ کا ایک گولہ اس سے تین چار قدم آگے اور دوسرا گولہ اس کے بالکل قریب پیچھے پھٹا۔ ان دونوں گولوں کا اُڑایا ہوا گرد و غبار صاف ہوا تو یوں پتہ لگتا تھا جیسے سکھ ہوا میں تحلیل ہو گیا ہو۔ اس کے جسم کے ٹکڑے دُور دُور تک جا گرے۔ میں فوجی تھا وہاں ایسے کئی منظر دیکھے تھے اس لئے اس سکھ حوالدار کے اُڑ جانے کا بلکہ اس دنیا سے غائب ہونے کا میرے دل پر ذرا سا بھی اثر نہ ہوا۔

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ دنیا' یہ زمین اور آسمان مسلسل ایک دھماکہ بن گئے ہوں۔ گرد و غبار اتنا کہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اپنے توپ خانے کے گولے سروں کے اوپر سے چیختے چلاتے گزر کر جا رہے تھے۔ ہمارے علاقے میں پھٹتے گولوں کے ٹکڑے اُڑ رہے تھے۔ اس قدر بارود کی بدبُو پھیل گئی اور اس قدر گرد نتھنوں میں داخل ہونے لگی کہ دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے کسی کے چیخنے چلانے اور دوڑنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ گرد و غبار میں سے ایک ہندو سپاہی دوڑتا نکلا اور میرے سامنے آ کر گر پڑا۔ مجھے تو یہ توقع تھی کہ یہ زخمی ہو گا لیکن وہ زخمی نہیں تھا وہ کانوں پر ہاتھ رکھے چیخ چلا رہا تھا۔ کبھی وہ کھڑا ہو جاتا اور کھڑے کھڑے زور سے گرتا اور تڑپنے لگتا۔

اگر وہ ذرا سا بھی زخمی ہوتا تو اس کی وردی وہاں سے سُرخ ہوتی لیکن وہ ذرا سا بھی زخمی نہیں تھا۔ دھماکوں نے اس کے دماغ پر اثر کر دیا تھا۔ میں نے اُسے پکڑنے یا سنبھالنے کی یا اسے تسلی دلاسہ دینے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کی۔ وہ بھی جیسے میری موجودگی سے ناواقف تھا۔ دو تین مرتبہ وہ میرے بالکل سامنے' قریب آ کر گرا تو بھی اس

نے میری طرف نہ دیکھا۔ آخر وہ اٹھا اور ایک طرف دوڑ پڑا۔

اسے Shell Shock کہتے ہیں۔ اگر یہ معمولی سا ہو تو متاثرہ شخص کچھ دیر بعد نارمل حالت میں آ جاتا ہے لیکن یہ شدید ہو تو پھر نوبت مینٹل وارڈ میں داخل کرنے تک پہنچ جاتی ہے اور اکثر شدید کیس ٹھیک بھی نہیں ہُوا کرتے.... میں اس ہندو جوان کو جانتا تھا۔ یہ میری بٹالین کا پرانا سپاہی تھا' بعد میں پتہ چلا تھا کہ وہ لاپتہ ہی ہو گیا تھا۔ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ مارا گیا تھا یا اسے کیا ہُوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ پاگل پن میں دوڑتا گیا اور کہیں دور جنگل بیابان میں نکل گیا ہو گا اور اُدھر ہی مر گیا ہو گا یا درندوں کی خوراک بن گیا ہو گا۔

ہماری گاڑیاں سڑک کے کنارے کھڑی تھیں۔ دو گاڑیاں تو بالکل ہی اُڑ گئیں تھیں اور دو تین گاڑیوں کو آگ لگ گئی۔ ڈرائیوروں کو حکم ملا کہ گاڑیوں کو آگے لے جا کر بکھیر دیں۔ مطلب یہ تھا کہ گاڑیاں جاپانیوں کے گولوں کی زد سے آگے لے جائیں۔

جاپانیوں نے جس شدت سے گولہ باری شروع کی تھی' اس کے فوراً بعد انفنٹری اور ٹینکوں سے حملہ کیا جاتا ہے۔ بریگیڈ کو آرڈر مل گیا تھا کہ سب اپنی اپنی پوزیشن لے لیں چونکہ حملہ آ رہا ہے۔ کچھ دیر تک حملہ نہ آیا تو بریگیڈ کو حملہ کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ گاڑیاں وہیں رہ گئیں اور بریگیڈ نے ایڈوانس شروع کر دیا۔

توقع تو یہ تھی کہ اُدھر سے جاپانی فوج آ رہی ہو گی' اِدھر سے ہمارا بریگیڈ ایڈوانس کر رہا تھا اور بڑی شدید اور خونریز لڑائی لڑائی جائے گی لیکن جاپانیوں کی طرف سے حملہ نہ آیا' اس کی بجائے ہمارا بریگیڈ جاپانیوں کے مورچوں تک جا پہنچا' تب جاپانیوں نے حملہ روکنے کی کوشش کی لیکن جاپانیوں کے پاس اب اتنی جنگی طاقت نہیں رہی تھی کہ وہ بریگیڈ کا حملہ روک سکتے۔

تھوڑی سی دیر بعد جاپانیوں کا توپ خانہ خاموش ہو گیا اور اُس کی فوج کچھ تو ماری گئی اور باقی پسپا ہو گئی۔ ہماری بٹالین کو پیچھے رکھا گیا تھا جسے ریئر گارڈ کہا جاتا ہے۔ آخر ہماری بٹالین کو بھی ایڈوانس کا حکم ملا۔

اب ہم پیدل جنگل میں جا رہے تھے۔ چھوٹے ہتھیاروں کی فائرنگ ہم سے بہت آگے ہو رہی تھی۔ چار پانچ میل کا فاصلہ طے کر کے ہم ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ہر طرف جاپانیوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ میں نے اپنے بریگیڈ کی لاشیں نہیں دیکھی تھیں'

البتہ مجھے یقین تھا کہ ہمارا بریگیڈ بھی اسی طرح اپنی لاشیں پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ جاپانیوں کی گولہ باری تھی ہی قیامت خیز جس میں سینکڑوں اموات متوقع تھیں۔

ہمیں وہیں رکنے کا حکم ملا۔ شام کے غالباً چار بج رہے تھے۔ جنگ کی بھیانک اور ہولناک آوازیں اور دھماکے خاموش ہو چکے تھے۔ موت نہ جانے کتنے سو جانیں لے کر چلی گئی تھی۔ وہ دن لڑائی کے بعد کی مختلف مصروفیات میں گزر گیا اور ہم نے رات آسمان تلے گذار دی۔

صبح ہوئی تو ہمیں ناشتہ دیا گیا۔ جب دن کی روشنی پھیلی تو ہم نے دیکھا کہ چند فرلانگ دُور چھوٹی سی ایک بستی تھی۔ ایسی ہی دو اور بستیاں کچھ دور نظر آ رہی تھیں۔ ہمیں پتہ چلا کہ جاپان کے جن ٹروپس نے مزاحمت کی تھی' انہیں بالکل ختم کر دیا گیا ہے اور جو جاپانی بچ گئے تھے وہ بھاگ گئے ہیں۔ جاپانیوں کا توپ خانہ دور تھا اس لئے وہ اپنی توپیں لے گئے تھے۔ اُس روز ہمارے کرنے کا کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے اپنے ایک کلرک دوست کو ساتھ لیا اور اس بستی میں چلا گیا جو قریب ہی نظر آ رہی تھی۔

یہ بستی اس علاقے میں تھی جو ہماری بٹالین کی ذمہ داری میں تھا۔ میں نے اپنی بٹالین کے چند ایک جوان اس بستی میں جاتے اور کچھ جوان بستی میں سے نکلتے دیکھے۔ یہ سب لوٹ مار کے لئے وہاں گئے تھے لیکن پتہ چلا کہ بستی خالی ہے اور یہاں کے رہنے والے مدت ہوئی یہاں سے بھاگ گئے تھے۔ میں اپنے ساتھی کے ساتھ ویسے ہی ٹہلتا ٹہلتا بستی کے اندر چلا گیا۔ میری نیت لُوٹ مار کی نہیں تھی۔

اپنی بٹالین کا ایک مسلمان لانس نائیک ملا۔ اس نے بتایا کہ اس بستی میں جاپانی فوجیوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا جو وہ خالی کر کے بھاگ گئے تھے.... یہ پندرہ بیس گھروں کی بستی تھی۔ مکان چھوٹے چھوٹے تھے اور معمولی قسم کے تھے لیکن باہر سے صاف ستھرے لگتے تھے۔ بستی بالکل خاموش تھی۔

ہم دونوں دوست آہستہ آہستہ چلتے ایک گلی میں جا رہے تھے۔ جاپانیوں کا یہاں اگر بریگیڈ تھا یا جو ٹروپس تھے' ان کے ہیڈ کوارٹر کے لئے یہ بستی موزوں تھی۔ ہم دونوں ساتھیوں نے سوچا بھی نہیں کہ ان مکانوں کے اندر جا کر دیکھیں' شاید کوئی قیمتی یا کام کی چیز ہاتھ آ جائے۔

ہم ایک مکان کے سامنے سے گزرے۔ اُس کا باہر والا دروازہ کھلا تھا۔ ہم نے اندر

ایک لاش پڑی دیکھی جو کسی فوجی کی نہیں تھی۔ ہم رک گئے اور اس گھر کے دروازے میں جا کھڑے ہوئے۔ وہ ایک عورت کی لاش تھی جس کا خون فرش پر بہہ بہہ کر جم گیا تھا۔ عورت کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ نقش و نگار سے وہ ملائی یا برمی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ وہ جوان لڑکی ہی تھی۔ خون اس کے سر سے بہتا رہا تھا۔ گولی کا سوراخ کنپٹی پر صاف نظر آ رہا تھا۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ کس طرح مری تھی۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ جاپانیوں نے یہ ذلیل حرکت کی تھی کہ وہ جہاں بھی جاتے تھے وہاں کی نوجوان لڑکیوں کو اپنے ساتھ رکھ لیتے تھے۔ یہ ان ہی لڑکیوں میں سے ایک ہوگی اور جب جاپانیوں کو یہاں سے بھاگنا پڑا تو اس کی کنپٹی پر ریوالور یا رائفل رکھ کر گولی مار گئے۔

ہم وہاں سے چل پڑے اور جاپانیوں کی اس حرکت کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ آگے جا کر ہم ایک اور گلی میں مُڑ گئے۔ ایک مکان کے اندر سے کرب ناک چیخیں سنائی دینے لگیں۔ ہم رک گئے۔ کبھی یہ چیخیں بلند ہو جاتیں اور پھر یہ ہائے ہائے جیسی آوازوں میں بدل جاتیں۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کچھ کہے سنے بغیر دونوں اندر چلے گئے۔ جس کمرے سے یہ کرب ناک آوازیں آ رہی تھیں اس کے دروازے میں جا رکے۔ ہمارے سامنے ایسا منظر تھا جو کبھی دیکھا تھا نہ کبھی دیکھوں گا۔ فرش پر کمبل بچھے ہوئے تھے اور ایک عورت بچے کو جنم دے رہی تھی۔ وہاں اور کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اکیلی تھی۔ جنگ کی ڈسی ہوئی دنیا میں جہاں موت کی حکمرانی تھی' ایک انسان جنم لے رہا تھا۔

ہم اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے نہ ہمیں معلوم تھا کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ یہ عورت جوان تھی اور ملایا کی ہی رہنے والی تھی۔ اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ جس بچے کو وہ جنم دے رہی ہے وہ اس کے خاوند کا نہیں۔ اس عورت کو بھی جاپانیوں نے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہو گا۔ خود تو بھاگ گئے اور اسے اس مصیبت میں چھوڑ گئے۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ اپنے میڈیکل آفیسر کو جا کر بتاتے ہیں۔

"وہ نہیں آئے گا" ـــــ میرے ساتھی نے کہا ـــــ "وہ آ بھی گیا تو کیا کر لے گا.... چلو چلیں"۔

میرے دل پر ایسا بوجھ آ پڑا کہ مجھ پر رقت طاری ہو گئی۔ میں اس عورت کی مدد کرنا

چاہتا تھا لیکن میں مجبور اور بے بس تھا۔ ہم وہاں سے چلنے لگے تو اس عورت نے ہاتھ جوڑے اور پھر دائیں ہاتھ کی انگلیاں اکٹھی کر کے منہ کے ساتھ لگائیں جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کچھ کھانے پینے کو مانگ رہی تھی۔ میں نے اپنے ساتھی کا بازو پکڑا اور بڑی تیزی سے باہر نکل آئے۔ اپنے ساتھی سے کہا اور کچھ نہیں تو اسے کھانے پینے کے لئے ہی کچھ لا دیتے ہیں۔ میں دوڑ پڑا اور میرا ساتھی بھی میرے ساتھ دوڑنے لگا۔ دوڑتے دوڑتے ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچے اور میں نے جلدی جلدی سے کھانے کی کچھ چیزیں اکٹھی کر لیں۔

فیلڈ یعنی محاذ پر ہمیں نہایت اچھا راشن ملا کرتا تھا جسے اُس وقت کی فوجی زبان میں ڈبل راشن کہا کرتے تھے۔ میں نے پانی کی بوتل بھی اٹھا لی۔ میرے ساتھی نے بھی میری طرح کچھ چیزیں کھانے کے لئے اکٹھی کر لی تھیں۔ ہم وہاں سے چلنے ہی لگے تھے کہ دور سے ہوائی جہازوں کی گھن گرج سنائی دینے لگی۔

یہ گھن گرج فوراً ہی ہمارے سروں پر پہنچ گئی اور اس کے ساتھ ہی ہم پر مشین گنوں کی گولیوں کی بوچھاڑیں پڑنے لگیں۔ نیچے سے طیارہ شکن مشین گنیں ان پر فائر کرنے لگیں۔ یہ جاپانیوں کے لڑاکا بمبار طیارے تھے۔ انہوں نے دو تین جگہوں پر بم بھی گرائے جن کے دھماکے بڑے ہی زوردار تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔

ہم اُس عورت اور نوزائیدہ بچے کو تو بھول ہی گئے اور اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔

جاپانی ہواباز بڑے ہی نڈر اور دلیر تھے۔ وہ اتنی کم بلندی پر آ کر مشین گن فائرنگ کرتے تھے کہ یوں لگتا تھا یہ ہوائی جہاز درختوں سے ٹکرا جائیں گے۔ میں نے چار ہوائی جہاز دھواں چھوڑتے ہوئے گرتے دیکھے۔ یہ ہوائی جہاز ہمارے بریگیڈ کا راستہ روکنے کے لئے بھیجے گئے تھے۔

میں گن نہیں سکا' یہ ہوائی جہاز کتنے تھے۔ اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ بے شمار تھے۔ دراصل جاپان کی ہائی کمانڈ آخری بازی لگا رہی تھی.... میں آپ کو جاپانیوں کی دلیری کی دلچسپ بات سناتا ہوں۔ ہر ملک کی ایئرفورس کے پائلٹ جب لڑاکا بمبار طیاروں کو اُڑاتے ہیں تو ان کے ساتھ پیراشوٹ لازماً ہوتے ہیں۔ پائلٹ کے لئے یہ حکم ہوتا ہے کہ جہاز کے اندر فضا میں ذرا سی بھی خرابی پیدا ہو جائے یا انجن سے ہلکا ہلکا سا دھواں نکلنے لگے تو فوراً جہاز سے نکل آئے اور پیراشوٹ کے ذریعے زمین پر اُتر آئے۔ میں نے جنگ کے بعد پڑھا تھا کہ جاپان واحد ملک ہے جس کے لڑاکا بمبار پائلٹ بغیر پیراشوٹ کے

اُڑتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تمہارا ہوائی جہاز فضا میں بگڑ جائے یا اسے گولیاں لگ جائیں تو اس کے ساتھ ہی جاؤ اور مر جاؤ۔ یہ دلیری نہیں حماقت تھی۔ ہوائی جہاز کی نسبت پائلٹ کو زیادہ قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ ہوائی جہاز کو پائلٹ نے اُڑانا ہوتا ہے اور اسی نے دشمن کو نقصان پہنچانا ہوتا ہے۔ اگر اپنے بگڑے ہوئے اور مجروح ہوائی جہاز سے پائلٹ نکل آئے گا اور زمین پر خیریت سے پہنچ جائے گا تو وہ دوسرا ہوائی جہاز لے کر فضا میں چلا جائے گا۔ ذرا غور کریں' ہوائی اڈے پر ایک ہزار لڑاکا ہوائی جہاز تیار کھڑے ہوں اور پائلٹ ایک بھی نہ ہو تو یہ سارے ہوائی جہاز محض بے کار ہوں گے اور زمین پر کھڑے کھڑے دشمن کا بڑا ہی آسان نشانہ بنیں گے۔

یہ تو ہم نے دیکھا تھا کہ جاپانی پائلٹ جب حملہ کرنے آتے تھے تو بہت ہی نیچے آ جاتے جیسے انہیں اپنی جان کا ذرا سا بھی خیال نہ ہو۔ یہ بھی جاپان کی ایک کمزوری تھی کہ اس نے اپنے تجربہ کار پائلٹ ضائع کر دیئے تھے۔ میں نے جنگ کے کچھ عرصہ بعد امریکہ کے ایک جنگی وقائع نگار کی لکھی ہوئی کتاب پڑھی تھی جس میں اس نے لکھا تھا کہ جاپانی فائٹر بمبار پائلٹ بغیر پیراشوٹ کے اُڑا کرتے تھے۔ میں نے اس بات کو صحیح تسلیم نہیں کیا تھا کیونکہ کوئی بھی ملک تجربہ کار ہوابازوں کو ایسے خطرے میں نہیں ڈال سکتا اور نہ ہی ڈالنا چاہتا ہے کہ اس کے ہواباز بغیر پیراشوٹ کے اُڑیں۔ آخر جاپانی ایئرفورس کے ایک سابق لڑاکا پائلٹ سبورو سکائی کی لکھی ہوئی ایک کتاب پڑھی جس میں اس نے اپنے ملک کے اس احمقانہ اور ظالمانہ حکم پر کڑی نکتہ چینی کی تھی کہ ہوابازوں کو بغیر پیراشوٹ کے جنگی مشن پر بھیجا جاتا تھا۔ پھر مجھے یقین آیا۔

میں اُس عورت کی بات کر رہا تھا جو جنگ کے محاذ پر بچے کو جنم دے رہی تھی۔ ہوائی حملہ ختم ہُوا تو مجھے اس عورت کا خیال ہی نہیں رہا کیونکہ ہر طرف چیخ و پکار اور بھاگ دوڑ ہو رہی تھی۔ ان حالات میں میں اس بستی میں نہیں جا سکتا تھا۔ فوجی کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ اِدھر اُدھر دیکھتا کہ اپنے ساتھی زخمی پڑے ہوں گے اور انہیں مدد کی ضرورت ہو گی اور انہیں اٹھا اٹھا کر ایک جگہ اکٹھا کرنا ہے۔ اس غرض کے علاوہ میرے اندر کچھ جذبات بھی تھے جن کے تحت میں اپنے قریبی اور عزیز دوستوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں بھی ادھر اُدھر دوڑنے بھاگنے لگا۔ وہاں تو ہر طرف خون ہی خون تھا۔ وہ جنگل تھا اور وہاں کوئی زمین دوز پناہ گاہ نہیں تھی۔ ہم نے درختوں کے نیچے پناہ لی تھی

مگر درختوں کی شاخیں ہوائی جہازوں کی فائر کی ہوئی گولیوں کو نہیں روک سکتی تھیں۔ مختصر یہ کہ ہماری بٹالین کو اچھا خاصا جانی نقصان پہنچا تھا۔

یہ تو جنگ کی قیامت خیزی تھی جس کی تفصیلات نہ ہی سناؤں تو اچھا ہے' میں آج اس وقت کو یاد کرتا ہوں تو میرے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ مختصریات یہ کہ ہم موت کے پروں کے نیچے زندگی گذار رہے تھے۔ انہی پروں کے نیچے ہمیں پناہ ملتی تھی اور اسی موت کے پنجے کسی بھی وقت جسے چاہتے دبوچ کر زندگی سے اٹھا کر اس جہان میں پھینک دیتے تھے جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آیا۔

وہ رات آئی اور گزر گئی۔ اگلے روز دن کے پچھلے پہر ذرا مہلت ملی تو میں اسی ساتھی کو جو ایک روز پہلے میرے ساتھ بستی میں گیا تھا' ساتھ لے کر بستی کی طرف چل پڑا۔ وہ بستی تو ہمیں کیمپ سے ہی نظر آجاتی تھی لیکن اس روز نظر نہیں آرہی تھی۔ ہم اپنے اس عارضی کیمپ سے نکل گئے تو بھی ہمیں وہ بستی نظر نہ آئی۔ میں نے حیرت زدگی کے عالم میں اپنے ساتھی سے پوچھا کہ بستی کہاں گئی؟ میرا ساتھی ادھر ہی دیکھ رہا تھا جدھر بستی تھی۔

کچھ اور آگے گئے تو بستی نظر آگئی لیکن اب وہ مکان نہیں تھے بلکہ کھنڈر تھے۔ چند ایک دیواریں کھڑی نظر آتی تھیں باقی سب ملبے کے ڈھیر تھے۔ ہم سمجھ گئے کہ جاپانی ہوائی جہازوں نے بستی پر بم گرائے ہیں۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ بستی میں اب کچھ نہیں رہا' ہم دونوں ساتھی کھانے کی چیزیں اور پانی کی دو بوتلیں اٹھائے بستی کی طرف چلتے ہی گئے اور اس طرف گئے جہاں اس عورت کا گھر تھا۔ اس طرف کوئی ایک دو مکان سلامت کھڑے تھے باقی گر پڑے تھے۔ اس مکان والی گلی میں ملبہ بکھرا ہوا تھا جس پر سنبھل سنبھل کر چلتے ہم اس عورت کے مکان تک پہنچ گئے لیکن اس مکان کا بھی کھنڈر رہ گیا تھا۔ گلی کی طرف والی دیوار کھڑی تھی اس میں دروازہ بھی محفوظ تھا اور کھلا ہوا تھا۔ اس میں سے دیکھا مکان کا باقی حصہ تباہ ہو چکا تھا۔ ہم دونوں ملبے پر چڑھ گئے اور صحن دیکھا۔

ایک تو وہ منظر دیکھا تھا کہ تن تنہا عورت بچے کو جنم دے رہی تھی جسے دیکھ کر مجھ پر نیم غشی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی لیکن اب صحن میں جو مجھے نظر آیا وہ معلوم نہیں میں نے کس طرح برداشت کیا۔ نوزائیدہ بچے کا ذرا جتنا ایک بازو کندھا اور سر صحن میں پڑے

ہوئے تھے۔ اس کے باقی جسم کا کچھ پتہ نہیں تھا کہاں غائب ہو گیا ہے۔ اس کے قریب اس بدقسمت بچے کی ماں کا جسم اس حالت میں پڑا ہُوا تھا کہ اُس کا پیٹ اور سینہ بالکل ہی پھٹ گئے تھے اور ان کے اندر کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

"اچھا ہُوا" — میں نے اس طرح کہا کہ جیسے اپنے آپ کے ساتھ بات کی ہو — "اللہ کو ان پر رحم آگیا اور انہیں دنیا سے اٹھا لیا ہے"۔

میرے ہاتھ میں کھانے کا جو سامان تھا وہ اسی صحن میں پھینک دیا اور پانی کی بوتل جو میں اس بچے کی ماں کے لئے لایا تھا وہ بھی پھینک دی۔ میرے دوست نے بھی ایسے ہی کیا اور ہم دونوں سر جھکائے ہوئے ملبے سے اُترے اور پھر بستی میں سے نکل آئے۔ کچھ دُور تک ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔

"یہ ہے جنگ!" — میرے ساتھی نے کہا — "ہم تو فوجی ہیں' مرنے کے لئے ہی محاذ پر آئے ہیں لیکن سوچو یار! ان معصوموں کو کن گناہ کی سزا ملی ہے؟"

"میں کچھ اور سوچ رہا ہوں" — میں نے کہا — "یہ خطّہ نہ انگریزوں کا ہے نہ امریکیوں کا اور نہ جاپانیوں کا لیکن وہ اس خطّے پر یہاں آکر لڑ رہے ہیں اور معصوم جانیں تباہ ہو رہی ہیں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ کیوں لڑ رہے ہیں؟.... صرف اس لئے کہ ہر کوئی ماں بچے کو جنم دے تو وہ ان کا غلام ہو جن کے پاس ایک دوسرے کو قتل کرنے کی طاقت ہے"۔

یہ جنگ کی ہولناکی کے دو تین بھیانک واقعات ہیں جو آپ کو سنائے ہیں۔ میں نے محاذ پر جو منظر دیکھے' اگر وہ سب سناؤں تو آپ کے اعصاب جواب دے جائیں۔ ذرا تصور میں لائیں کہ آپ کا ایک دوست تھا جو رات کو آپ کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا اور آپ سب ہنس کھیل رہے تھے۔ ہنستے کھیلتے آپ سو جاتے ہیں اور آپ کا دوست اگلے روز ایک ڈیوٹی پر بھیجا جاتا ہے۔ دن کے پچھلے پہر آپ دیکھتے ہیں کہ اس دوست کا ایک بازو ایک گیدڑ اٹھائے بھاگا جا رہا ہے اور آپ کے دوست کا باقی جسم گِدھ کھا رہے ہیں۔

اب میں آپ کو آگے لے جانا چاہتا ہوں' صرف یہ بتا دیتا ہوں کہ اُس روز اپنے جتنے [illegible] مارے گئے تھے ان کی لاشیں اکٹھی کی گئیں۔ ان میں جو مسلمان تھے ان کی لاشیں ایک جگہ رکھ کر ہم نے جنازہ پڑھا اور ایک ہی گڑھا کھود کر اُن سب کو اُس گڑھے میں رکھا اور مٹی ڈال دی۔ اسی طرح ہندوؤں اور سکھوں نے اپنے ساتھیوں کی لاشوں

کی آخری رسوم ادا کیں اور انہیں جلا ڈالا۔

ان سب کی جانیں صرف اس لئے گئیں کہ ہندوستان پر انگریزوں کے پنجے اور زیادہ مضبوط ہو جائیں اور ہم غلامی کی زنجیروں سے کبھی بھی نہ نکل سکیں۔

○

اُس روز بہت سے امریکہ اور برطانیہ کے بمبار ہوائی جہاز سروں کے اوپر سے گزر گئے۔ وہ جاپانیوں پر جوابی ہوائی حملہ کرنے جا رہے تھے۔ ہمارا بریگیڈ وہاں سے ایڈوانس کر گیا۔ ہمیں بہت دُور کے دھماکے سنائی دینے لگے۔ یہ بمبار طیارے بم گرا رہے تھے۔ کم و بیش دو گھنٹوں بعد بمبار طیارے واپس آئے اور ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئے۔

ایک روز ہم کوالالمپور میں داخل ہو گئے۔ میں زیادہ تفصیلات میں نہیں جاؤں گا اتنا ہی بتانا کافی ہو گا کہ جاپانیوں نے کوالالمپور کا دفاع کرنے کی کوشش کی لیکن دفاع اس قدر کمزور تھا کہ وہ دو دن بھی نہ ٹھہر سکے اور شہر خالی کر گئے۔

یہاں میں ایک واقعہ سنانا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہماری بٹالین میں ایک لانس نائیک ہُوا کرتا تھا جو گجرات شہر کا یا اس شہر کے ساتھ والے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ایک حوالدار بھی تھا جو اس کا رشتہ دار تھا۔ اس لانس نائیک کی شادی برما فرنٹ پر جانے سے سال یا ڈیڑھ سال پہلے ہوئی تھی۔ اس کا رشتہ دار حوالدار ہمیں سنایا کرتا تھا کہ یہ لانس نائیک ایسا زن مرید ہُوا کہ اس نے اپنے ماں باپ کے ساتھ بدتمیزی شروع کر دی۔ لڑکی بڑی ہی چالاک اور بدطینت تھی۔ اُس نے اس شخص پر ایسا قبضہ کیا کہ اسے مالِ غنیمت کے طور پر اپنے والدین کے حوالے کر دیا۔

لڑکی کے والدین نے لڑکے پر صرف قبضہ ہی نہ کیا بلکہ اس کے دماغ میں اس کے والدین کے خلاف باتیں ڈالتے رہتے اور وہ بغیر تحقیقات کے جا اپنے والدین کی بے عزتی کرتا۔ اس کی بیوی نے اس کے والدین کو اپنے نوکر سمجھ لیا۔ گھر میں اس لڑکی کی بادشاہی بن گئی۔ گھر میں وہی ہوتا تھا جو یہ لڑکی چاہتی تھی۔ یہ لانس نائیک جب چھٹی جاتا تو اس کی بیوی اُس کے پاس آتی تھی ورنہ وہ اپنے ماں باپ کے گھر رہتی تھی۔ جب چاہتی سسرال میں آ جاتی اور وہاں اپنا حکم چلاتی اور ان بوڑھوں کی بے عزتی کرتی اور پھر جب چاہتی اپنے ماں باپ کے پاس چلی جاتی تھی۔

حوالدار نے ہمیں بتایا کہ اس لانس نائیک کی ماں اور اس کا باپ بیچارے سوائے رونے دھونے کے اور کچھ نہیں کر سکتے یا وہ پیروں فقیروں کے ہاں جا کر ان کے آگے ہاتھ رگڑتے رہتے ہیں۔ یہ پیر فقیر انہیں بتاتے ہیں کہ تمہارے بیٹے پر اس کی بیوی اور بیوی کی ماں نے جادو چلا رکھا ہے۔ اس طرح یہ ماں باپ بے چارے لُٹتے ہیں اور پھر جہاں کوئی انہیں بتاتا ہے کہ جائیں اور ان کی مراد پوری ہو گی تو وہ اُدھر کو اُٹھ دوڑتے ہیں اور نذرانے دے دے کر اور رو رو کر زندگی گذار رہے ہیں۔

مجھے زیادہ تفصیل سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ نے اپنے معاشرے میں اس قسم کے بہت سے بیٹے دیکھے ہوں گے جو شادی ہوتے ہی ماں باپ اور بہن بھائیوں سے نظریں پھیر لیتے ہیں اور بیوی کو وہ آسمان سے اُتری ہوئی مخلوق سمجھتے ہیں اور شاید یہ بھی ان کا عقیدہ بن جاتا ہے کہ بیوی ناراض ہو گئی تو قیامت آ جائے گی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ایسے ناخلف اور نافرمان بیٹے دیکھے ہوں گے۔ یہ لانس نائیک ان ہی بیٹوں میں سے تھا جس نے اپنی بیوی کو دیوی بنا لیا تھا اور خود اس کا پجاری بن گیا تھا۔ اس بیٹے نے اپنے ماں باپ، دو بہنوں اور دو بھائیوں کے لئے یہ مسئلہ بھی کھڑا کر دیا تھا کہ جائیداد میں سے اس کا حصہ دیا جائے۔ ان کی اراضی خاصی زیادہ تھی اور اس کے دوسرے بھائی یہ جائیداد تقسیم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ حوالدار نے ہمیں بتایا کہ یہ پتہ چل گیا تھا کہ اُس کی بیوی اور بیوی کے والدین اسے مجبور کر رہے ہیں کہ وہ اپنا حصہ الگ کر لے اور اس کے بعد یہ زمین اپنی بیوی کے نام رجسٹری کرا دے۔ اس مسئلے پر اس لانس نائیک نے اپنے باپ کی بہت بے عزتی کی تھی اور اپنی بہنوں کو بھی گالی گلوچ کی تھی اور کہا تھا کہ ان کا کوئی حصہ نہیں بنتا۔

برما فرنٹ پر آنے سے پہلے یہ لانس نائیک پانچ سات دنوں کی چھٹی پر گھر گیا تھا۔ چھٹی ختم کر کے جب رخصت ہُوا تو ماں باپ سے دعائیں لے کر رخصت ہونے کی بجائے انہیں الٹی میٹم دیا کہ وہ اب چھٹی آئے گا تو اپنا حصہ الگ کر لے گا۔ اگر اس کی بات نہ مانی گئی تو پھر وہ بتائے گا کہ وہ کیا کر سکتا ہے اور گھر والے ساری عمر پچھتاتے رہیں گے۔ اس طرح یہ اپنے ماں باپ، بھائیوں اور بہنوں کو روتا چھوڑ کر بڑے فخر اور غرور سے آیا تھا۔

ماں باپ اپنی اولاد کو بددعا نہیں دیا کرتے، اولاد خواہ کتنی ہی ناخلف ہو اور ماں باپ کو خواہ سولی پر کھڑا کئے رکھے لیکن اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے جو خود ہی حرکت میں آتا ہے

اور مظلوم کو اس کا حق مل جاتا ہے.... میں نے جاپانی توپ خانے کی گولہ باری کا ذکر کیا ہے۔ اس نے ہمارے بریگیڈ کو خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ گولہ باری ختم ہونے کے بعد ہمیں زخمیوں اور لاشوں کو اُٹھانے کا حکم ملا۔ ہم سب جو صحیح اور سلامت تھے' اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگے اور جہاں کوئی زخمی نظر آیا اسے فوراً" اٹھایا اور وہاں تک لے گئے جہاں مرہم پٹی کا انتظام تھا۔ ہماری وردیاں خون سے لال ہو گئی تھیں۔ ہم نے خون میں نہائی ہوئی لاشیں بھی اٹھائی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ میرے دو ساتھی میرے ہاتھوں میں مر گئے تھے۔

میرے ساتھ میرا وہی ساتھی تھا جو بستی میں میرے ساتھ گیا تھا۔ ہم نے ایک زخمی کو دیکھا جو چیخ اور چِلّا رہا تھا۔ ہم دونوں دوڑتے اس تک پہنچے۔ اُدھر سے دو اور جوان آ گئے۔ دیکھا تو یہ وہی لانس نائیک تھا جس نے اپنے ماں باپ کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ وہ بیٹھا ہُوا تھا۔ اس کی ٹانگیں آگے کو تھیں۔ سامنے سے اس کی قمیض پھٹی ہوئی تھی اور اس کی انتڑیاں اور پیٹ باہر نکل آیا تھا اور یہ اندر کے اعضاء اس کی ٹانگوں پر بکھر گئے۔ وہ ابھی زندہ ہی نہیں بلکہ ہوش میں بھی تھا۔ ہم سمجھ گئے کہ کسی گولے کا ٹکڑا اس کا پیٹ ایک طرف سے دوسری طرف تک کاٹ گیا ہے۔ اس کا بچنا ممکن نہیں تھا۔ انتڑیاں یقیناً" کٹ گئی ہوں گی۔ پھر بھی ہم اسے تسلّی دینے لگے کہ اس کا یہ زخم ٹھیک ہو جائے گا اور ڈاکٹر انتڑیاں اور پیٹ اپنی جگہ بٹھا دے گا۔

"مت جھوٹ بولو" ___ وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ___ "جھوٹ مت بولو' میں مر رہا ہوں۔ خدا کے لئے میرے باپ کو اور میری ماں کو' میرے بھائیوں اور میری بہنوں کو کہنا کہ مجھے بخش دیں' میں نے انہیں بہت تکلیفیں پہنچائی ہیں اور میں نے ان کی بے عزتی کی ہے' اللہ کا واسطہ ہے' انہیں کہنا مجھے بخش دیں" ___ اس نے اپنے ایک رشتہ دار حوالدار کا نام لیا اور کہا ___ "خدا کے واسطے اسے بلاؤ' وہ میرا گرائیں ہے اور میرا رشتہ دار بھی ہے۔ وہ مجھے میرے ماں باپ سے بخشوا دے گا.... میں نے دنیا میں ہی جہنم دیکھ لیا ہے"۔

وہ کبھی لیٹ جاتا کبھی بیٹھ جاتا اور اسی طرح بولتا ہی چلا گیا۔ وہ رو رو کر یہی کہہ رہا تھا کہ میرے ماں باپ کو' میرے بھائیوں اور بہنوں کو کہنا مجھے بخش دیں' میں ان کا گناہگار

ہوں.... اسی طرح بولتے بولتے وہ ایک طرف کو لڑھک گیا اور ہم سمجھے کہ ابھی اس کی آخری سانس بھی نکل جائے گی لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ ابھی اسے اور اذیت دینا چاہتے تھے۔ وہ پھر اٹھا لیکن کھڑا نہیں ہُوا۔ جس پوزیشن میں بیٹھا تھا اسی پوزیشن میں بیٹھ گیا۔ اس کی انتڑیاں وغیرہ اور آگے نکل آئیں اور بکھر گئیں۔ وہ بار بار جُھک کر انہیں دیکھتا تھا اور پھر ہمیں رحم طلب نظروں سے دیکھنے لگتا۔ کبھی تو اُس کی زبان بالکل ہی بند ہو جاتی اور کبھی وہ یکلخت انتہائی بلند آواز سے بولنے لگتا۔ پھر اس نے اپنے باپ کو اور پھر ماں کو پکارنا شروع کر دیا۔ دو مرتبہ وہ پیچھے کو گرا لیکن دونوں بار پھر سیدھا ہو گیا۔

مجھے برما کا جنگل یاد آیا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے ایک آدمی کو اذیت سے نجات دلانے کے لئے اُس کے سر میں گولی مار دی تھی۔ اس لانس نائیک کو ایسی تکلیف وہ نزع کی حالت میں دیکھ تو مجھے یہی طریقہ سُوجھا کہ اس کے سر میں گولی مار دوں لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ حاضر سروس تھی۔ میں اسے اس جہنم سے نکال نہیں سکتا تھا۔ اس نے اگلے جہان جہنم میں ہی جانا تھا لیکن اس کی جو حالت تھی وہ عبرت ناک تھی۔ ہم نے اسے اٹھایا تو اس کی انتڑیاں زمین پر گر پڑیں۔ ہم نے دیکھا کہ اس کا سر ڈھلک گیا تھا اور اس کی سانسوں کا سلسلہ رک گیا تھا۔ ہم نے اسے بلکہ اس کی لاش کو اٹھایا۔ اس کی انتڑیاں اور پیٹ کے اعضاء وہیں رہ گئے اور ہم اسے وہاں رکھ آئے جہاں لاشیں اکٹھی کی جا رہی تھیں۔

میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ ہر مسلمان کو صرف یہ یاد دلاؤں گا کہ والدین' خصوصاً" ماں کے احترام کے متعلق اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایک بار نہیں کئی بار حکم دیا ہے۔ وہ ضرور دیکھ لیں البتہ ایک بات کہنے والی ہے جو میں کہوں گا۔ انسان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ بے صبر ہے اور ناشکرا ہے۔ گناہگار انسان اپنے جیسوں کا انجام دیکھ کر بھی اس خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ اس انجام کو نہیں پہنچے گا۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ کم عقل تھے جو بُرے انجام کو پہنچے۔ اپنے آپ کو وہ دانش مند سمجھتا ہے۔



کوالالمپور اتحادیوں کے قبضے میں آ چکا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ پورے کا پورا ملایا جاپانیوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی لیکن جاپان کی فوج کا مورال نہیں

توڑا جا سکا تھا۔ میں پہلے سنا چکا ہوں کہ جاپانی سپاہی ہتھیار ڈالنے کی بجائے جان دینے کو ترجیح دیتا تھا۔ یہ ایسا جذبہ تھا جو ان جاپانیوں نے ملایا میں شکست کھا کر بھی زندہ رکھا۔ وہ ایک فوج کی حیثیت سے ختم ہو گئے تھے لیکن اب وہ انفرادی جنگ لڑ رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اب انہیں ہتھیار ڈالنے پڑیں گے لیکن وہ لڑتے ہوئے مرنا چاہتے تھے۔ وہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں اور بعض اکیلے جنگلوں میں چلے گئے اور انہوں نے اپنی ہی جنگ شروع کر دی۔ وہ دُور سے کسی انگریز، امریکی یا ہندوستانی فوجی کو آتا دیکھتے تو اس پر فائر کھول دیتے تھے۔ وہ ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے تھے۔ اس طرح اتنی بڑی جنگ جیتی نہیں جا سکتی البتہ جاپانیوں کا جذبہ قابلِ تعریف تھا۔

ہم ریڈیو سے خبریں سنا کرتے تھے۔ بحرالکاہل میں سمندری جنگ لڑی جا رہی تھی لیکن جاپانی وہ جنگ بھی ہار رہے تھے اس لئے انہوں نے خُودکُش ہوا باز بھیجنے شروع کر دیئے تھے۔ یہ تفصیل پہلے سنا چکا ہوں۔ ایک ہوا باز اپنے طیارے کے ساتھ بم باندھ کر کسی امریکی بحری جہاز کے اوپر جا کریش کرتا تھا۔ اس کی ایک جان جاتی تھی لیکن وہ اتنے بڑے بحری جہاز کو تباہ کر دیتا تھا لیکن جاپان کا یہ طریقہ بھی ناکام ہو گیا۔ امریکہ کے بحری بیڑے نے جاپان کو تقریباً گھیرے میں لے لیا تھا اور امریکہ کے ہوائی بیڑے نے جاپان کے بڑے شہروں خصوصاً ٹوکیو کو ملبے کے ڈھیر بنا ڈالا تھا۔ آخر اگست 1945ء میں امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر دو ایٹم بم گرا کر جنگ کا بالکل ہی خاتمہ کر دیا۔

جب جنگ ختم ہو گئی تو میں ایک روز اپنے دوست حمید کے ساتھ فیض الحق کے گھر چلا گیا۔ وہ گھر میں موجود تھا۔ اُس نے اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ کہنے لگا کہ میں نے تمہارے لئے بہت دعائیں کی تھیں۔ اللہ نے میری دعائیں سن لیں اور تم خیریت سے واپس آگئے ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اب انڈین نیشنل آرمی میں نہیں بلکہ اپنی اسی پلٹن میں واپس چلا گیا ہوں جہاں سے بھگوڑا ہوا تھا۔

"میرے عزیز!" ـــ عالم فاضل فیض الحق نے کہا ـــ "تمہیں دراصل اُس عورت کی دعاؤں نے بچایا ہے جس کی تم نے عزت بچائی تھی"۔

میں نے خوشی کا اظہار کیا کہ اُس کی دعاؤں سے میں اُس سزا سے بھی بچ گیا ہوں جس کی مجھے ہر لحظہ توقع تھی۔ ایک تو میں بھگوڑا تھا اور اس سے بڑا جرم یہ کہ میں انگریزوں کے دشمن سے جا ملا تھا۔ اب میں واپس اپنے گھر جا سکوں گا.... میں ابھی کچھ

اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن فیض الحق نے آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں اور اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ اُس کا یہ تاثر ایسا تھا کہ میں چپ ہو گیا۔ وہ کچھ دیر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا پھر اُس نے سر جھکا لیا۔

"ابھی نہیں" ـــ اُس نے سر اٹھا کر کہا ـــ "مجھے ایک اور جنگ نظر آ رہی ہے جس میں تم بھی شامل ہو گے لیکن ایک خیال رکھنا.... کسی مسلمان پر گولی نہ چلانا۔ اپنی جان دے دینا لیکن کسی مسلمان کی جان نہ لینا"۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ میرے چہرے پر یقیناً حیرت زدگی کا تاثر تھا۔ ایک سوال میری آنکھوں میں چمک رہا ہو گا جسے فیض الحق سمجھ گیا۔

"تمہیں اس سے زیادہ حیران ہونا چاہئے" ـــ فیض الحق نے کہا ـــ "ابھی میں تمہیں ساری بات نہیں بتا سکوں گا۔ تم انگریز کے فوجی ہو۔ میں اشارے اشارے سے تمہیں یہ ذرا سی بات بتا رہا ہوں، یہ اس لئے بتا رہا ہوں کہ میں نے تم میں ایک جذبہ دیکھا ہے۔ ابھی میں اتنا ہی کہوں گا کہ اس جذبے کو مرنے نہ دینا"۔

"محترم بزرگ!" ـــ میں نے کہا ـــ "مجھے کچھ تو بتا دیں تاکہ میں ذہنی طور پر تیار رہوں"۔

اس نے آج کے انڈونیشیا کے جزیروں کے نام لئے اور کہا کہ یہ سارا ملک مسلمانوں کا ہے جس پر یورپ کی ایک قوم، ولندیزی، حکومت کرتی رہی ہے۔ اس نے بتایا کہ جاپانیوں نے یہ ملک فتح کر لیا تو مسلمانوں کی حکومت بنا دی لیکن اس پر اپنا کنٹرول رکھا۔ اب جاپانی وہاں سے پسپا ہو گئے ہیں اور وہاں کے مسلمان آزادی کی جنگ لڑیں گے تو بڑی خونریز جنگ ہو گی۔ ابھی میں تمہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں تمہیں بڑی بات کہہ دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ ابھی مجھے تم پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ تم انگریز کے ساتھی ہو۔ تم کیونکہ مسلمان ہو اس لئے میں نے اپنا فرض سمجھا کر تمہیں پہلے ہی بتا دوں کہ مسلمان کا فرض کیا ہے اور اس کا جذبہ کیا ہونا چاہئے.... اُس نے اس سے زیادہ کچھ نہ بتایا اور اُس نے جہاد کی باتیں شروع کر دیں۔

جب یہ عالم دین، فیض الحق، جہاد کی باتیں کر رہا تھا اس وقت مجھے وہ قبائلی بوڑھا یاد آ رہا تھا جس کے گھر میں مجھے قید کیا گیا تھا۔ وہ پسماندہ اور بالکل اَن پڑھ آدمی تھا لیکن اُس نے میرے خیالات بدل ڈالے اور میرے ایمان میں تازگی پیدا کر دی تھی۔ میں اُسی کی

باتوں کے زیرِ اثر فوج سے بھگوڑا ہُوا تھا اور اب ایک عالم فاضل بزرگ اسی طرح کی باتیں کر رہا تھا اور میں اپنے اندر ایک نئی روح محسوس کرنے لگا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ یہ بزرگ بولتا چلا جائے اور میں سنتا رہوں۔ میرا خیال تھا کہ اس کے پاس روحانی طاقت ہے اور کشف کی طاقت بھی۔ وہ تو یقیناً" تھی لیکن میں نے اس ملاقات میں محسوس کیا کہ وہ دانشمند انسان تھا اور اس کی عقل مستقبل کے پردے چاک کر سکتی تھی۔ وہ اپنے تجربے اور مشاہدے کی باتیں کر رہا تھا اور یہ تو کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ کس قدر ایماندار اور دیندار آدمی تھا۔

میں اُس روز بہت دیر اُس کے پاس بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا اور میں نے اُس سے کئی ایک باتیں پوچھیں اور اس نے میرے کچھ شکوک و شبہات رفع کر دیئے۔ میں وہاں سے بادلِ نخواستہ اٹھا۔

میں اُس کے پاس پھر جانا چاہتا تھا لیکن اگلے ہی روز حکم ملا کہ کوئی آدمی باہر نہ جائے اور ہر وقت تیاری کی حالت میں رہے۔ ہم سمجھ گئے کہ ہمیں یعنی ہماری بٹالین کو کہیں اور بھیجا جا رہا ہے.... ہمیں زیادہ دن انتظار نہ کرنا پڑا۔ صرف دو دن گزرے تو ہمیں ٹرکوں پر بٹھا کر ساحل پر لے گئے اور نیوی کے ایک جہاز میں سوار کرا دیا۔ ایک رات اس بحری جہاز میں گزری۔ اگلے روز علی الصبح بحری جہاز چل پڑا۔ ہمیں اپنی منزل کا کچھ پتہ نہ تھا۔

ہم ملاکا کی بندرگاہ سے روانہ ہوئے تھے۔

ہم تین دن اس بحری جہاز میں سوار رہے اور چوتھے دن جہاز ایک بندرگاہ میں جا کر رکا اور اس میں لنگر ڈال دیئے۔ ہمیں جہاز سے اترنے کا حکم ملا تو ہمیں پتہ چلا کہ یہ جکارتہ ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ جکارتہ انڈونیشیا کا دارالحکومت ہے۔ اُس وقت انڈونیشیا کا وجود نہیں تھا اور یہ نام کبھی کسی نے سنا بھی نہیں تھا۔

جکارتہ سے ہمیں ریل کے ذریعے ایک اور جگہ لے جایا گیا جس کا نام سیمارانگ تھا۔ یہ ہماری منزل تھی۔ وہاں عارضی سی بارکیں بنی ہوئی تھیں۔ ہمیں وہاں پہنچا دیا گیا۔ ہمیں یہ نہ بتایا گیا کہ یہاں ہمیں کیوں لایا گیا ہے۔ بظاہر کوئی خاص کام نہیں تھا۔

یہ چھوٹی سی ایک چھاؤنی تھی جس میں ہماری بٹالین کے علاوہ ایک بٹالین راجپوتانہ رائفلز کی بھی تھی۔ یہ اچھا خاصا شہر تھا اور ہمیں اجازت مل گئی تھی کہ ہم شہر میں گھوم پھر

سکتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ ان علاقوں پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور ان کی شکست کے بعد یہ علاقے واپس لے لئے گئے ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ یہ علاقے پہلے بھی انگریزوں کے تھے اور اب پھر ان کے ہو گئے ہیں لیکن کچھ دنوں بعد پتہ چلا کہ وہاں ولندیزیوں کی حکومت تھی اور اب پھر یہاں ولندیزی آ جائیں گے۔

ہماری بٹالین کو دراصل یہاں Occupation Force کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا۔ اس فورس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو ملک فتح کر لیا جاتا ہے اس کے بڑے شہروں میں اپنی فوج رکھی جاتی ہے تاکہ قبضہ برقرار رہے اور وہاں کے لوگ فاتح فوج سے واقف ہو جائیں۔ میں یہ دیکھ کر کچھ حیران ہُوا کہ ہمیں کھلی چھٹی دے دی گئی تھی کہ ہم شہر میں گھومیں پھریں اور لوگوں سے ملیں ملائیں۔ فوج کا ڈسپلن بڑا ہی سخت ہوتا ہے لیکن وہاں ڈسپلن میں بھی نرمی کر دی گئی تھی۔ ہماری روزمرّہ کی جو ڈیوٹی ہوتی تھی وہ ہم پوری کرتے تھے' اس کے بعد ہم پر کوئی خاص پابندی نہیں تھی۔

یہ میں کچھ عرصے بعد سمجھا کہ فوجیوں کو اس طرح کھلا کیوں چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہ بالکل وہی انداز تھا جو پرانے زمانے کے بادشاہ اختیار کیا کرتے تھے۔ ہم کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں کہ فلاں بادشاہ نے فلاں ملک فتح کر لیا تو اس کی فوج نے وہاں کے لوگوں کے گھروں میں داخل ہو کر ان کی عورتوں کو بے آبرو کیا۔ وہاں کی خوبصورت لڑکیاں بادشاہ کو اور بڑے حاکموں کو پیش کی جاتی تھیں۔ لوٹ مار الگ ہوتی تھی۔ اس کا مطلب ایک تو اپنے لشکر کو انعام دینا ہوتا تھا اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ مفتوحہ ملک کے لوگوں کا قومی تشخص اور وقار بالکل ختم کر دیا جائے تاکہ کسی بھی وقت یہ بغاوت نہ کر سکیں۔ ہوتا ایسے ہی تھا کہ مفتوحہ ملک کو ہر پہلو سے تنگ دست اور پریشان کر دیا جاتا تھا۔ مثلاً" خوراک کے ذرائع محدود کر دیئے جاتے تھے تاکہ لوگ روٹی کے نوالے کو ترسیں اور اپنے فاتحین کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔ پھر ان کی عورتوں کو اس قدر ذلیل اور بے آبرو بنا دیا جاتا تھا کہ ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہتی تھی اور ان کے مرد اپنا خون پینے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے اور آہستہ آہستہ مرد بھی اس بے عزتی کو قبول کر کے اپنے قومی کردار سے محروم ہو جاتے تھے۔ یہ صرف مسلمان تھے جنہوں نے مفتوحہ ملکوں میں ظلم اور کردار کشی کی بجائے حقوق العباد کا رواج ڈالا تھا اور مفتوحین کو یہ احساس دلایا تھا کہ وہ فاتحین سے حقیر نہیں بلکہ ان کے بھی مساوی حقوق ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام بڑی تیزی سے پھیل گیا

تھا۔

جنگِ عظیم ختم ہوئی تو امریکہ اور برطانیہ نے اپنی فوجوں کو اسی طرح کھلا چھوڑ دیا تھا۔ مقصد مفتوحین کی کردار کشی تھا۔ میں اپنی بات سنانے سے پہلے جاپان کی بات سناتا ہوں۔ جاپان پر امریکہ کا قبضہ ہو گیا تو امریکی فوج وہاں جا کر مقیم ہو گئی۔ میں نے جنگ کے بہت بعد کتابیں پڑھنی شروع کیں تو مجھے امریکی فوجیوں کے متعلق بہت سا مواد پڑھنے کو ملا۔

چونکہ زمانہ بدل چکا تھا اور اب جدید تہذیب شروع ہو گئی تھی اس لئے قدیم بادشاہوں والا طریقہ اختیار نہ کیا گیا کہ مفتوحہ لوگوں کے گھروں میں داخل ہو کر ان کی عورتوں کو بے آبرو کرو اور سرِعام برہنہ کر کے انہیں نچاؤ۔ اب مہذب طریقہ اختیار کیا گیا جس کا اصل مقصد بادشاہوں والا ہی تھا۔ طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ امریکی فوجیوں نے جاپان کی لڑکیوں کے ساتھ دوستیاں لگانی شروع کر دیں اور انہیں عشق و محبت کے جال میں الجھا لیا۔ جاپان تباہ و برباد ہو گیا تھا اور وہاں راشن پانی کی بہت ہی تنگی ہو گئی تھی۔ امریکی فوجی وہاں کی لڑکیوں کو اپنے ساتھ لگا کر انہیں کھانے پینے کا سامان دیتے رہے اور یہ لڑکیاں اپنے گھر والوں کی ضروریات پوری کرتی رہیں۔

جاپان نے آگ اُگلتی توپوں اور مشین گنوں کے سامنے بھی اپنا قومی کردار زندہ رکھا تھا لیکن ان کے اپنے ملک کی تباہی اور بھوک نے ان کا کردار اس طرح تباہ کیا کہ ان کی لڑکیوں نے امریکی فوجیوں کو قبول کر لیا اور اپنا آپ ان کے حوالے کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ جاپانی لڑکیوں کے ناجائز بچے پیدا ہونے شروع ہو گئے۔

امریکہ کی فوج کوئی زیادہ عرصہ جاپان میں نہیں رہی تھی۔ جاپان کے ساتھ ایک معاہدہ کر کے امریکی فوج واپس چلی گئی تھی۔ امریکی فوجیوں نے جن جاپانی لڑکیوں کے ساتھ دوستیاں لگائی تھیں، انہیں انہوں نے کہہ رکھا تھا کہ وہ انہیں امریکہ لے جائیں گے لیکن یہ فوجی انہیں بتائے بغیر واپس چلے گئے۔ بعض فوجیوں کے دلوں میں سچی محبت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنی دوست لڑکیوں کو ساتھ لے گئے اور باقاعدہ شادی کر لی۔ امریکہ میں آج بھی ایسے آدمی اور عورتیں نظر آتی ہیں جن کے چہروں کے نقش و نگار جاپانی ہیں۔ یہ امریکہ اور جاپان کی ملی جلی نسل ہے لیکن جو لڑکیاں پیچھے رہ گئی تھیں ان کا وہی حال ہوا کہ گھر کی رہیں نہ گھاٹ کی۔

میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ امریکہ کے فوجی واپس چلے گئے تو صرف ٹوکیو میں آٹھ ہزار ناجائز بچے پیدا ہوئے جن کا کوئی پُرسانِ حال نہ تھا اور ان بچوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ان کے باپ کون ہیں اور کہاں ہیں۔ امریکہ کے اخباروں نے اور سیاسی حلقوں نے بھی اپنی حکومت پر تنقید کی تھی اور مطالبہ کیا تھا کہ ان معصوم بچوں کا کیا قصور ہے۔ جنگ ان بچوں نے یا ان کی ماؤں نے تو نہیں لڑی تھی۔

مختصر بات یہ کہ امریکہ کے فوجی جاپان کا قومی کردار اور وقار تباہ و برباد کر آئے تھے۔ وہاں یوں بھی ہوا کہ جوان بیویاں اپنے خاوندوں کو چھوڑ کر امریکی فوجیوں کی دوست بن گئیں اور انہیں امریکیوں نے یہ سبز باغ دکھائے کہ وہ انہیں امریکہ لے جائیں گے۔ امریکی فوجی ان کے بغیر امریکہ چلے گئے اور پیچھے ان کے لئے سوائے ذلت اور رسوائی کے کچھ بھی نہ رہا۔ ان کے خاوندوں نے بھی انہیں دھتکار دیا تھا۔

○

اب میں انڈونیشیا کی بات کروں گا۔ یہ ذہن میں رکھ لیں کہ ابھی انڈونیشیا کا کوئی وجود نہیں تھا اور نہ ہی یہ نام کبھی کسی کی زبان سے سنا تھا۔ میں انڈونیشیا اس لئے کہہ رہا ہوں کہ یہ بات سناتے ہوئے مجھے بہت سے جزیروں کے نام لینے پڑتے ہیں جس میں خاص دشواری ہوتی ہے۔ بہتر یہ سمجھا کہ اس سارے علاقے کو انڈونیشیا کہنا شروع کر دوں کہ مجھے بات کرنے میں اور آپ کو بات سمجھنے میں آسانی رہے۔

ایک اور بات ابھی سے کہہ دیتا ہوں، وہ یہ ہے کہ انڈونیشیا کے متعدد شہروں اور قصبوں میں ہماری بٹالین گئی تھی۔ میں ہر مقام کا ذکر نہیں کروں گا، آپ یوں سمجھیں کہ میں اس سارے خطے کی بات کر رہا ہوں۔ میں وہاں کے بڑے شہروں کا نام پہلے ہی بتا دیتا ہوں ــــ جکارتہ، بنڈونگ، جوگ، سوراباجا، سیمارانگ ــــ ان شہروں کے کچھ مشاہدات تو میرے اپنے ہیں اور باقی دوسری یونٹوں کے فوجیوں نے مجھے سنائے تھے۔ اس طرح میں اس خطے کی جنگ کے فوراً بعد کی صحیح تصویر پیش کروں گا۔

یہ تو میں چند مرتبہ پہلے بتا چکا ہوں کہ اس خطے پر ولندیزیوں کی حکومت تھی جو دو سو سال سے چلی آ رہی تھی۔ یہاں کی آبادی کی غالب اکثریت مسلمانوں کی تھی جو اب بھی ہے بلکہ اب زیادہ ہے۔ جاپانیوں نے یلغار کی تو ڈچ یعنی ولندیزی وہاں سے بھاگ گئے اور انگریز ان کی کوئی مدد نہ کر سکے۔ جاپانیوں نے یہ چال چلی کہ وہاں مسلمانوں کی حکومت

قائم کر دی لیکن اسے اپنے کنٹرول میں رکھا۔ مسلمانوں سے یہ کہا کہ اب یہاں انہی کی حکومت رہے گی لیکن یہ صریحاً فریب تھا۔ جاپانیوں کا مقصد یہ تھا کہ یہاں کے مسلمان جو جنگجو معلوم ہوتے ہیں' ان کے خلاف نہ اُٹھ کھڑے ہوں۔

پھر میں سنا چکا ہوں کہ جاپانیوں کو شکست ہو گئی تو انگریزوں نے اپنی فوج یہاں لا کر چھوڑ دی جس طرح جاپانیوں نے انڈونیشیا کے مسلمانوں کو دھوکا دیا تھا کہ اب یہاں ہمیشہ ان کی حکومت رہے گی اسی طرح انگریزوں نے ولندیزیوں کو جھانسہ دیا کہ وہ ان کی حکومت بحال کر دیں گے لیکن میں نے خود دیکھا کہ انگریزوں نے ولندیزیوں کی کردار کُشی شروع کر دی اور انہیں حقارت کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ ولندیزیوں کی فوج تو برائے نام تھی جو جاپانیوں کی قید میں چلی گئی تھی لیکن ولندیزی باشندے کہیں بھی نہ جا سکے اور وہ وہیں رہے۔

ولندیزی یورپ کی قوم ہے' رنگ گورے ہیں اور نقش و نگار بھی اچھے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ولندیزی بڑے خوبصورت لوگ تھے۔ انگریزوں نے ان کے راشن پانی کا کوئی بندوبست نہ کیا۔ فاتح فوج کو اگر اپنی رعایا سے ہمدردی اور دلچسپی ہو تو وہ سب سے پہلے اس کے کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہے لیکن ولندیزیوں کو بلکہ وہاں کے مسلمانوں کو بھی ہر پہلو سے تنگدست اور پریشان رکھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستانی فوج کو کھلی چُھٹی دے دی گئی کہ وہ یہاں کے لوگوں کی بہو بیٹیوں کے ساتھ دوستیاں لگائیں۔

اب یہاں مسلمان اور کافر کا فرق دیکھیں۔ مسلمان الگ تھلگ نظر آتے تھے اور ان کی لڑکیاں جو خاصی خوبصورت تھیں' ایک خاص وقار سے گھومتی پھرتی تھیں۔ اس کے مقابلے میں ولندیزی لڑکیاں فوجیوں کو پھانستی پھرتی تھیں۔ فوجیوں کو بڑا ہی اچھا راشن ملنا شروع ہو گیا تھا۔ ہندوستان میں فوج کا راشن زیادہ تر دال روٹی تھا یا بڑا گوشت۔ یہ بھی مسلمانوں کے لئے۔ ہندو اور سکھ دال اور سبزیاں کھاتے تھے لیکن میدانِ جنگ میں' اور جنگ کے بعد مفتوحہ علاقے میں ہندوستانی فوجیوں کو پھل فروٹ کے ڈبے' بسکٹوں کے ڈبے اور اس طرح کا اور یورپی راشن بھی ملنے لگا تھا۔ سگریٹ مفت ملتے تھے۔ یقین جانیئے کہ وہاں سگریٹ یا بسکٹ کے ایک پیکٹ کے عوض نہایت خوبصورت لڑکی دوست بن جاتی تھی۔ میں نے بڑے شریف قسم کے فوجیوں کو دیکھا کہ وہ ولندیزی لڑکیاں ساتھ لئے پھرتے تھے۔

وہاں سینما ہال بھی چل پڑے تھے بلکہ چلا دیئے گئے تھے۔ میرے فوجی بھائی کبھی اکیلے فلم دیکھنے نہیں جاتے تھے' ایک ایک ولندیزی لڑکی ان کے ساتھ ہوتی تھی۔

یہاں میں آپ کو ایک دلچسپ بات سناتا ہوں جس سے آپ کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ وہاں ولندیزی لڑکیوں کی اخلاقی حالت کیا تھی اور ہماری اپنی فوج کی اخلاقی حالت کیا ہو گئی تھی۔ ہماری بٹالین میں ایک صوبیدار صاحب ہُوا کرتے تھے جن کی شرافت اور اسلام پسندی ضرب المثل بنی ہوئی تھی۔ میں ان کا نام نہ ہی لوں تو اچھا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خود تو اس دنیا میں نہ ہوں لیکن ان کی آل اولاد تو ضرور ہو گی۔ یہ جمعدار' صوبیدار اور صوبیدار میجر جنہیں آج کل جے سی او کہا جاتا ہے' اُس وقت وی سی او کہا جاتا تھا۔ بٹالین کی لائنوں میں یہ VCO الگ الگ کمروں میں رہتے تھے۔

ایک روز مجھے اس صوبیدار کے ساتھ ایک کام پڑ گیا جو سرکاری کام تھا۔ میں کلرک تھا اس لئے میں جس کے پاس بھی جانا چاہتا چلا جاتا تھا اور کلرکوں کو خصوصی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ صوبیدار کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازے پر دستک نہ دی نہ ہی ہم لوگوں میں اتنا اخلاق و آداب ہُوا کرتا تھا۔ میں نے کواڑ پر ہاتھ رکھا تو دروازہ کھل گیا اور میں اندر چلا گیا اور دیکھا صوبیدار صاحب ٹانگیں نیچے لٹکائے چارپائی پر بیٹھے ہیں اور ان کی گود میں ایک فرسٹ کلاس جوان ولندیزی لڑکی بیٹھی ہوئی ہے اور چونچلے ہو رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر لڑکی پر تو کچھ بھی اثر نہ ہُوا بلکہ وہ پہلے کی طرح ہنستی ہی رہی لیکن صوبیدار صاحب کا یہ حال کہ بُری طرح چونکے اور بدک کر لڑکی کو گود سے دھکیلنے لگے۔

"یار؟" — اچھا ہُوا تم آ گئے — "صوبیدار صاحب نے مجھے کہا — "اس کھچری کو یہاں سے نکالو۔ دیکھو زبردستی آ کر میری گود میں بیٹھ گئی ہے۔ میرا نماز کا ٹائم ہو رہا ہے.... یار اسے اپنے ساتھ لے جاؤ' یہ جان ہی نہیں چھوڑتی"۔

صوبیدار صاحب کو سہولت یہ حاصل تھی کہ ہم لوگ ولندیزیوں کی زبان نہیں سمجھتے تھے اور ولندیزی ہماری نہیں سمجھتے تھے۔ اگر یہ ولندیزی لڑکی پنجابی سمجھ سکتی تو وہ فوراً بتا دیتی کہ کون کس کی جان نہیں چھوڑ رہا۔ میں ہنس پڑا اور آہستہ سے کہا' کوئی بات نہیں صوبیدار صاحب' سب عیش موج کر رہے ہیں' نمازیں واپس ہندوستان میں جا کر پڑھ لینا۔ صوبیدار صاحب نے کھوکھلا سا قہقہہ لگایا اور لڑکی کو گود سے نکال کر چارپائی پر بٹھا لیا اور میری بات سننے لگے۔

یہ صحیح ہے کہ ہم ولندیزیوں کی زبان نہیں سمجھتے تھے اور وہ ہماری نہیں سمجھتے تھے لیکن بدکاری اور بداخلاقی کی اپنی ایک زبان ہے جو دنیا کے ایک کونے کا گناہگار دوسرے کونے کے گناہگار کی بھی سمجھ لیتا ہے۔ اس میں زبان کو حرکت دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ میں نے اس صوبیدار کی مثال صرف اس لئے دی ہے کہ مجھے زیادہ تفصیلات نہ سنانی پڑیں اور آپ سمجھ جائیں کہ وہاں کیا صورتِ حال بن گئی تھی۔ ہمارے فوجی بھائیوں نے وہاں بھی حقے بنا لئے تھے۔ خود حقہ پیتے تھے اور سرکاری راشن کے سگریٹ ولندیزی لڑکیوں کو دے کر انہیں جہاں چاہے لے جاتے تھے۔

معلوم نہیں آپ یقین کریں گے یا نہیں، میں خدا کو حاضر ناظر جان کر یہ حقیقت بیان کر رہا ہوں کہ اس خطے کی مسلمان عورتوں کا کردار ولندیزی عورتوں سے بالکل الٹ تھا۔ وہ اپنے سروں پر بڑا رومال باندھ کر رکھتی تھیں اور ہندوستانی فوجیوں کو حقارت کی نظروں سے دیکھتی تھیں۔ ہمارے بعض فوجیوں نے مسلمان عورتوں پر بھی طبع آزمائی کی کوشش کی تھی اور بعض کی تو وہاں کے مسلمانوں نے ایسی پٹائی کی کہ ان کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ ہم جو مسلمان فوجی تھے، ہمیں مسلمانوں کا کردار پتہ چل گیا۔ ویسے بھی مسلمان ہوتے ہوئے ہم مسلمانوں کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ بڑی جلدی ساری فوج میں مشہور ہو گیا کہ یہاں کی کسی مسلمان عورت کو میلی آنکھ سے بھی نہ دیکھنا۔ مسلمان فوجیوں نے یہ رویہ اختیار کر لیا کہ وہاں کی مسلمان عورتوں کی عزت کے محافظ بن گئے۔ انہوں نے ہندو اور سکھ فوجیوں کو بھی خبردار کر دیا کہ کسی مسلمان عورت کی عزت پر ہاتھ نہ ڈالنا ورنہ ہم اس کا انتقام لیں گے۔ ہندو سکھ اور مسلمان فوجیوں میں اس مسئلے پر کچھ کھچاؤ سا پیدا ہو گیا تھا لیکن ولندیزی عورتیں اتنی زیادہ تھیں کہ یہ کھچاؤ جلدی ختم ہو گیا۔

یہ نہ سمجھئے کہ یہ ولندیزی لڑکیاں غریب یا متوسط گھرانوں کی تھیں، حقیقت یہ ہے کہ ان میں اونچے گھرانوں کی لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ ان میں ایک کلاس وہ تھی جسے حکمرانوں کی کلاس یا حاکموں کی کلاس کہہ لیں۔ وہ اپر کلاس تھی۔ اس کلاس کی لڑکیوں نے انگریز اور ہندوستانی افسروں کے ساتھ دوستیاں لگالی تھیں بلکہ ان میں اکثر افسروں کے ساتھ ہی راتیں بسر کرتی تھیں۔ دوسرے فوجیوں کو اتنی کھلی اجازت مل گئی تھی کہ بعض فوجی پوری پوری رات ان عورتوں کو بیرکوں میں ساتھ رکھتے تھے۔ اب ان فوجیوں

نے بھی شراب پینی شروع کر دی تھی جو شراب کی بُو سے بھی بھاگا کرتے تھے۔

اب میں آپ کے سامنے قدرت کے نظام کا اور انتقام کا ایک پہلو رکھتا ہوں۔ میں تفصیل سے سنا چکا ہوں کہ جاپانی فوج نے مفتوحہ علاقوں سے نوجوان اور خوبصورت لڑکیاں اٹھا کر اپنے ساتھ مورچوں میں رکھ لی تھیں۔ پھر ان کے ساتھ انہوں نے جو سلوک کیا، اس کی دو مثالیں پیش کر چکا ہوں۔ ایک یہ کہ ایک عورت کو ہم نے دیکھا جس کے سر میں گولی لگی ہوئی تھی اور ایک عورت ایک بچے کو جنم دے رہی تھی۔ جاپانی فوج جب بھاگی تو ان بدنصیب لڑکیوں کو یونہی بھٹکتا چھوڑ گئی تھی۔ جاپانی فوج کا قومی کردار اور جذبہ قابل تعریف ہی سہی لیکن مفتوحہ علاقوں کی عزت کے ساتھ وہ جس طرح کھیلے وہ قابل نفرت تھا۔ قدرت نے یعنی اللہ تعالیٰ کے نظام نے یہ انتقام لیا کہ جاپان کی نوجوان لڑکیوں کے ساتھ امریکی فوجیوں نے بالکل وہی سلوک کیا اور ناجائز بچے پیدا کر کے خود امریکہ چلے گئے۔

انڈونیشیا کے کوئی کوئی مسلمان ٹوٹی پھوٹی اردو بول اور سمجھ سکتے تھے۔ یہ دکاندار اور تاجر لوگ تھے اور ان میں ہندوستان کے دینی مدرسوں کے پڑھے ہوئے آدمی بھی تھے۔ ان کے ساتھ ہماری راہ و رسم چل پڑی تھی جس کی تفصیلات آگے چل کر سناؤں گا۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ جنگ سے پہلے جب وہاں ولندیزیوں کی حکومت تھی تو وہ مسلمانوں کو غالب اکثریت میں ہونے کے باوجود سیکنڈ کلاس نہیں بلکہ تھرڈ کلاس شہری سمجھتے تھے اور انہیں اپنی انتہائی گھٹیا رعایا بنا کر رکھتے تھے۔ یورپ کے دل میں اسلام دشمنی تو بڑی پرانی ہے، یہ اسلام دشمنی ولندیزیوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اللہ نے ان سے یہ انتقام لیا کہ انہیں بھوکا اور محتاج بنا دیا اور اس قوم کی عورتوں نے خود فوجیوں کو پھانسا اور اپنا آپ پیش کرنا شروع کر دیا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ معزز گھرانوں کی ولندیزی لڑکیاں باقاعدہ طوائفیں بن گئی تھیں۔ ان کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ راشن پانی دے دو اور پورے گھر کے لئے دو۔ بعض ہندوستانی فوجی سٹوروں میں چوریاں کر کے بھی ان کے گھروں کی ضروریات پوری کرتے تھے۔

کچھ عرصے بعد ایک اور بھیانک صورت پیدا ہو گئی۔ وہاں کی طوائفیں بھی معزز گھرانوں کی عورتیں بن کر فوجیوں کے پاس آنے لگیں۔ میں اس صورتِ حال کی ساری وجوہات کھل کر بیان نہیں کر سکوں گا کیونکہ یہ بڑی شرمناک بات ہے۔ فوجی اس بے

حیائی کی وجہ سے مختلف بیماریوں میں مبتلا ہونے لگے تھے۔

میں ان بیماریوں کے نام لکھ دیتا ہوں۔ ان میں ایک ہے آتشک دوسری ہے سوزاک۔ یہ بیماریاں اتنی عام نہیں ہوئی تھیں لیکن فوجی ان بیماریوں میں مبتلا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ فوجی کا ان دونوں میں سے کسی ایک بیماری میں مبتلا ہو جانا جرم سمجھا جاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ غلیظ عورتوں کے پاس جاتا رہا ہے۔ اُس کی اسے سزا ملتی تھی۔ عام طور پر فوجی یہ بیماریاں چھپا لیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بیماری جڑ پکڑ لیتی اور لاعلاج کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ دو ہندوستانی فوجیوں نے ان بیماریوں سے تنگ آ کر خودکشی کر لی تھی۔ اسے بدکاری کی سزا کہا جائے تو زیادہ صحیح ہو گا۔

میں وہاں مبصر یا جنگی وقائع نگار کی حیثیت سے نہیں گیا تھا کہ مجھے ہر ایک بات کا علم ہوتا رہتا یا میں خود وہاں کی ہائی کمانڈ سے ملتا اور اندر کی باتیں معلوم کر سکتا۔ میں حوالدار کلرک تھا۔ کچھ باتیں اپنی آنکھوں دیکھیں اور چونکہ میرا زیادہ تر رابطہ اپنی بٹالین کے افسروں کے ساتھ رہتا تھا اس لئے وہ باتیں مجھے معلوم ہو جاتی تھیں جو دوسروں کو معلوم نہیں ہو سکتی تھیں۔ ظاہر یہ کیا جا رہا تھا کہ اس خطے میں ولندیزیوں کی حکومت تھی اس لئے انگریزوں نے اپنی فوج یہاں اس لئے رکھی ہے کہ پھر ولندیزیوں کی حکومت قائم کر کے اسے پختہ اور مستحکم کر دیا جائے۔ سوچنے والی بات یہ تھی کہ انگریزوں اور امریکیوں کو ولندیزیوں کے ساتھ اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی تھی؟.... یہ میں بتا چکا ہوں کہ ولندیزی مسلمانوں کو حقیر سمجھتے تھے۔ یہ پوری کی پوری دنیائے صلیب کا رویہ ہے جو صلیبی جنگوں سے اب تک چلا آ رہا ہے۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا تھا کہ انگریز خود یہاں کے حکمران بننے کا پروگرام بنائے ہوئے تھے اور وہ ولندیزیوں کو آگے کر کے مروانا چاہتے تھے۔ بہرحال اس خطے میں اُس وقت تین اتحادی تھے۔ انگریز، امریکی اور ولندیزی۔ حکومت کسی کی بھی قائم ہو جاتی، تینوں کا ایک مقصد تو مشترک تھا وہ یہ کہ یہاں مسلمانوں کی حکومت قائم نہ ہو۔

پھر اچانک ہی فوج میں نقل و حرکت شروع ہو گئی اور صاف پتہ چلنے لگا کہ کوئی اور ہی ایمرجنسی پیدا ہو گئی تھی۔ میری بٹالین کو وہاں سے کہیں اور بھیج دیا گیا اور دوسری یونٹوں کو بھی اِدھر اُدھر کر کے نئی یونٹیں آ گئیں اور یوں سمجھیں ایک نئی تنظیم ہونے لگی اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ان اتحادیوں پر کوئی مصیبت آن پڑی ہے۔ ہمیں جلد ہی

پتہ چل گیا کہ یہ نئی مصیبت کیا آن پڑی ہے.... وہاں کے مسلمانوں نے باقاعدہ جنگِ آزادی شروع کر دی تھی۔ یہ جلسے اور جلوسوں والی جنگِ آزادی نہیں تھی بلکہ مسلمانوں نے ان تینوں اتحادی طاقتوں کو جنگ کا الٹی میٹم دے کر جنگ شروع کر دی تھی۔ وہاں کے مسلمانوں نے جنگی ٹریننگ جاپانیوں سے لی تھی۔

جاپانیوں نے مسلمانوں کو جو ٹریننگ دی تھی، اس کا پس منظر یہ ہے کہ جاپانیوں نے اس خطے پر قبضہ کیا اور برما تک جا پہنچے تو انہیں ہر لحہ توقع تھی کہ امریکہ اور برطانیہ جوابی حملہ کریں گے۔ جاپان کی ہائی کمانڈ نے یہ تو یقیناً سوچا ہو گا کہ اپنے ملک سے اتنی دور جا کر جو محاذ کھولا ہے، اسے طاقتور بنانے کے لئے جاپان سے مزید فوجیں بھیجنی ایک دشوار کام تھا۔ جاپانیوں نے اس کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس خطے کے مسلمان عوام کا تعاون اور اعتماد حاصل کر لیا۔ یہ اس طرح حاصل کیا کہ ان کی ایک آزاد حکومت بنا دی جس کا سربراہ احمد سوئیکارنو تھا۔ احمد سوئیکارنو ایک انقلابی لیڈر تھا۔

جاپانیوں نے مسلمانوں کی جو حکومت بنائی تھی یہ کچھ اس طرح تھی جس طرح انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں اسمبلیاں بنائی تھیں اور ظاہر یہ کیا تھا کہ ہندوستان کے لوگ اپنے فیصلے خود کرتے ہیں، حالانکہ یہ محض ایک دکھاوا تھا۔ ایسے ہی جاپانیوں نے مسلمانوں کی جو حکومت بنائی اس کا نام وہاں کی زبان میں جو رکھا اس کا مطلب تھا "مرکزی عوامی تنظیم" اس میں وہاں کے مقامی لوگوں کو رکھا گیا اور احمد سوئیکارنو کو سربراہ تو بنا دیا گیا لیکن اس تنظیم میں اکثریت جاپانیوں کی تھی لیکن انہوں نے یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ اہم امور اور مسائل کے متعلق فیصلے کرنے سے پہلے مسلمان ممبروں کی رضامندی لازمی طور پر حاصل کی جائے۔ جاپانیوں نے اس حکومت کے بڑے بڑے عہدے انڈونیشیا کے مسلمانوں کو دیئے اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے وہاں کے مسلمانوں کی ایک الگ فوج بنا دی۔

اس فوج کو جاپانیوں نے اسلحہ اور بارود دیا اور بڑی محنت سے انہیں جنگی ٹریننگ دی۔ صرف اس فوج کو ہی نہیں بلکہ شہریوں کو جن میں نوجوانوں کو خاص طور پر شامل کیا گیا تھا، فوجی اور جنگی ٹریننگ دے دی گئی۔ اس طرح یہ ساری قوم باقاعدہ فوجی بن کر جنگ کے لئے تیار ہو گئی تھی۔ یہ حیران ہونے والی بات نہیں کہ وہاں کی مسلمان لڑکیاں بھی اسلحہ بارود استعمال کرنے کی ٹریننگ میں پیش پیش تھیں اور انہوں نے فوجیوں کی

طرح باقی فوجی ٹریننگ بھی حاصل کی تھی۔ میں نے ان لڑکیوں کو بعد میں گوریلا جنگ لڑتے اپنی آنکھوں دیکھا تھا۔

جس وقت جاپانی برما سے پسپا ہو رہے تھے اور ان کے کہیں بھی پاؤں جم نہیں رہے تھے اُس وقت انڈونیشیا کے مسلمانوں کی یہ فوج جو جاپانیوں نے تیار کی تھی، ایک لاکھ بیس ہزار نفری تک پہنچ گئی تھی۔ جاپانی پوری طرح مطمئن تھے کہ وہ اس فوج کو انگریزوں اور امریکیوں کے خلاف لڑائیں گے اور مشرق بعید میں ان کے پاؤں جمے رہیں گے لیکن وہاں کے مسلمان کچھ اور ہی پلان بنائے ہوئے تھے۔ وہاں کے لیڈروں کا لیڈر احمد سوئیکارنو تھا اور دوسرے کا نام ہاتا تھا۔ وہ بھی مسلمان تھا۔ اس کے علاوہ بھی لیڈر تھے جنہوں نے یوں کیا کہ ظاہری طور پر جاپانیوں کے ساتھ لگے رہے اور انہیں یقین دلائے رکھا کہ وہ اتحادیوں کے خلاف ان کی جنگ لڑیں گے لیکن انہوں نے جاپان کی غلامی کو قبول نہیں کیا تھا۔ وہ بڑے ہی دانشمند اور دُور اندیش تھے۔ انہوں نے جاپانیوں سے صرف جنگی تربیت حاصل ہی نہیں کی تھی بلکہ ملک کے سرکاری انتظام چلانے کے طور طریقے بھی سیکھ لئے تھے۔ انہوں نے عزم کر رکھا تھا کہ اب وہ کسی کے بھی غلام نہیں رہیں گے۔ وہ صرف موقعے کی تلاش میں تھے۔

وہ پکے مسلمان تھے۔ ہم وہاں کی مسجدیں دیکھا کرتے تو ہماری روحیں بھی خوش ہو جایا کرتی تھیں۔ بڑی خوبصورت مسجدیں تھیں اور انہیں وہ لوگ دل و جان سے صاف سُتھرا رکھتے تھے.... ان لیڈروں نے جب دیکھا کہ برما سے جاپانیوں کے پاؤں اُکھڑ گئے ہیں اور ان کی پسپائی شروع ہو گئی ہے تو انہوں نے یہ دیکھنے کے لئے انتظار کیا کہ ملایا میں جاپانی کیا کرتے ہیں۔ جب دیکھا کہ ملایا میں بھی جاپانیوں کے مورچے جم نہیں رہے اور وہ پیچھے ہی ہٹتے آ رہے ہیں تو ان انڈونیشی مسلمانوں نے جاپانیوں کے اسلحہ بارود کے گوداموں، سٹوروں اور اسلحہ خانوں پر قبضہ کر لیا لیکن یہ چھوٹے ہتھیار تھے یعنی رائفلیں اور مشین گنیں وغیرہ۔ جاپانیوں کو توقع تھی کہ وہ ان مسلمانوں کو فوراً ٹھکانے لگا دیں گے۔ اس توقع پر انہوں نے مسلمانوں پر ہلہ بولا لیکن مسلمان ایسی بے جگری سے لڑے کہ جاپانیوں نے پسپا ہو جانا ہی بہتر سمجھا۔ اس سے اندازہ کریں کہ وہاں کے مسلمانوں کا جذبہ کتنا مستحکم تھا۔ یہ وہی جاپانی فوج تھی جس نے امریکہ اور برطانیہ جیسی طاقتوں کو بحرالکاہل اور مشرقِ بعید سے بے دخل کر دیا تھا لیکن انڈونیشی مسلمانوں نے

چھوٹے ہتھیاروں سے جاپانیوں کو شکست دے دی۔

اس کا فائدہ امریکہ اور برطانیہ کو ملا کیونکہ مسلمانوں نے جاپانیوں کے لئے اس خطے کی زمین تنگ کر دی تھی اور انہیں خاصا کمزور بھی کر دیا تھا۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ جاپانیوں کو وہاں سے بڑی تیزی سے پسپا ہونا پڑا۔

جاپانی پسپا ہو گئے تو ولندیزی پھر آن پہنچے۔ وہاں کے مسلمانوں نے انہیں بتایا کہ اب یہاں ان کی حکومت ہے اور وہ ایک آزاد قوم ہیں۔ ولندیزی تو انڈونیشیا کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھتے تھے۔ انہوں نے ان مسلمانوں کو ابھی تک وہی مسلمان سمجھا جنہیں وہ حقارت کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے اور وہ ان کی رعایا تھے لیکن اب انڈونیشیا کے مسلمان باقاعدہ فوج بلکہ ایک جنگی طاقت بن چکے تھے۔ انہوں نے ولندیزیوں کو ایک ہی ہلے میں گھٹنوں بٹھا دیا۔ ہمیں جب ملایا سے یہاں بھیجا گیا تھا' اُس وقت ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہاں کیوں بھیجا گیا ہے' واپس ہندوستان کیوں نہیں بھیجا گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ انڈونیشیا کے مسلمان گوریلا قسم کی جنگِ آزادی شروع کر چکے تھے۔ پہلے ہمیں اس کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اب انڈین آرمی کی یونٹوں کو انڈونیشی مسلمان گوریلوں کے خلاف لڑنے کے لئے استعمال کیا جانے لگا تھا۔

انڈونیشی مسلمانوں کی یہ جنگِ آزادی اس قدر منظم اور ان کے وار اور ضربیں اس قدر کاری تھیں کہ امریکہ اور برطانیہ چونک اٹھے اور انہوں نے دیکھ لیا کہ اس اُبھرتی ہوئی طاقت کو دبایا نہ گیا تو یہاں مسلمان حکومت مضبوط ہو جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے مزید فوجیں اس خطے میں اتار دیں۔ ایک تو یہ فوج تھی جس میں ہماری بٹالین بھی تھی' اس کے بعد آسٹریلیا کی فوج بھی بلا لی گئی اور انڈین آرمی کی مزید یونٹیں ہندوستان سے بلائی گئیں اور پھر امریکہ سے بھی فوج آ گئی اور پھر امریکہ اور برطانیہ کے فضائی بیڑوں نے بھی اس خطے میں آ ڈیرے ڈالے۔ اس طرح انڈونیشیا میدانِ جنگ بن گیا۔ اتنی بڑی طاقت کے سامنے جس کے پاس ٹینک بھی تھے' لڑاکا بمبار طیارے بھی تھے اور توپ خانوں کا کوئی حساب کتاب ہی نہ تھا' انڈونیشی مسلمانوں کے پاس مشین گنیں اور رائفلیں تھیں۔ یہ رائفلیں اور مشین گنیں جاپانی ساخت کی تھیں۔ ان کا ایمونیشن ختم ہو گیا۔ مسلمانوں نے ولندیزیوں سے جو ایمونیشن چھینا تھا وہ جاپانی ہتھیاروں میں استعمال نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بہت بڑی دشواری تھی۔ مسلمانوں نے اتحادیوں کے ٹھکانوں پر شب

خون مارنے شروع کر دیئے اور خاصا اسلحہ اور ایمونیشن اکٹھا کر لیا۔ تب اتحادیوں کو پتہ چلا کہ انڈونیشی مسلمان تو ایک باقاعدہ فوج کی طرح منظم ہے اور اس تنظیم کو توڑنا آسان کام نہیں۔

انڈونیشی مسلمانوں کی اس جنگ آزادی کو عالمی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس پر کتابیں لکھی گئی تھیں۔ ایک کتابیں وہ تھیں جو عام لوگوں کے پڑھنے کے لئے ہیں، ان کے علاوہ فوجی اور جنگی امور کے ماہرین نے الگ کتابیں لکھی تھیں جن میں ان حریت پسندوں کے طریقہ جنگ کو ٹیکنیکی لحاظ سے پیش کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شمالی ویت نامیوں نے امریکہ کو اور 1954ء میں شمالی کوریا والوں نے بھی گوریلا جنگ کے ذریعے شکست دی تھی لیکن ویت نامیوں کو بھی اور کوریا والوں کو بھی روس اور چین کی بھرپور مدد حاصل تھی۔ انڈونیشیا کے حریت پسندوں کو سوائے اللہ تعالیٰ کے کہیں سے بھی کوئی مدد حاصل نہیں ہوئی تھی۔

امریکہ اور برطانیہ والے پہلے تو یہ سمجھتے رہے کہ ان مسلمانوں کے پاس پلے کچھ بھی نہیں، انہیں تو فوراً" زیر کر لیا جائے گا لیکن ان اتحادیوں کو جب انڈونیشیا کے حریت پسندوں کے ہیڈ کوارٹر کے آپریشن آرڈروں کی کچھ کاپیاں ملیں تو ان کے ہوش ٹھکانے آئے اور تب انہیں پتہ چلا کہ ان کا سامنا معمولی سے اور غیر منظم سے گوریلوں کے ساتھ نہیں۔ میں ایسے ایک آپریشن آرڈر کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں۔ یہ انڈونیشی مسلمانوں کے ہیڈ کوارٹر سے جاری ہوا تھا جس پر ان کے ایک کمانڈر ناسوشن کے دستخط تھے۔ ملاحظہ فرمائیں:

"…. ہر گوریلا ٹولی کا کمانڈر اپنے بالائی کمانڈر کے ساتھ رابطہ رکھنے کی پوری پوری کوشش کرے۔ ہر کمانڈر اپنے گوریلا جوانوں کو یہ سمجھائے کہ ہم متحرک (موبائل) جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہمارے نہ اگلے مورچے ہیں نہ پچھلے۔ ہمارا کوئی فلیک نہیں، ہمارے لئے پیش قدمی اور پسپائی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ دشمن پر حملہ کرو اور دیکھو کہ دشمن کی نفری زیادہ ہوگئی ہے اور تم گھیرے میں آجاؤ گے تو فوراً" وہاں سے پیچھے آجاؤ اور بکھر جاؤ۔ اکیلے اکیلے ہو جاؤ تاکہ دشمن بھی تمہاری تلاش میں بکھر جائے۔ دشمن بکھر گیا تو سمجھو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا…. فتح ہماری ہوگی۔ آزادی یا موت"۔

اس کے نیچے کمانڈر ناسوشن کے دستخط تھے۔

گوریلا فورس کے پاس ایمونیشن کی کمی ہوگئی تو ان کے ہیڈ کوارٹر سے ایک آپریشن آرڈر جاری ہوا جس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"…. رائفلوں اور مشین گنوں کے ایمونیشن کی کمی واقع ہوگئی ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے دشمن کی کنوائیوں پر شب خون پہلے سے زیادہ مارو اور ایمونیشن اکٹھا کرو۔ ہر پارٹی کا کمانڈر اپنے جوانوں کو سختی سے بتائے کہ ایمونیشن احتیاط سے استعمال کرے۔ پتہ چلا ہے کہ بعض جوان اندھا دھند فائر کر دیتے ہیں۔ اس طرح ایمونیشن ضائع ہوتا ہے۔ ہر گوریلا جوان اس اصول پر عمل کرے کہ ایک گولی ایک دشمن…. ایک بھی گولی ضائع نہ ہو…. آزادی یا موت"۔

میں زیادہ دلچسپ، سنسنی خیز اور ایمان افروز تفصیلات سنانے سے پہلے اتحادیوں کے ہیڈ کوارٹر کا ایک آپریشن آرڈر پیش کر رہا ہوں۔ اس آرڈر میں فوجی اصطلاحیں استعمال کی گئی تھیں، میں انہیں عام فہم زبان میں پیش کرتا ہوں۔ یہ چھوٹا سا ایک اقتباس ہے:

"اس آپریشن کا مقصد ہے ایک گوریلا گروہ کا خاتمہ…. فوج اس طرح حملہ کرے گی — مغربی سمت سے تین بٹالین، مشرقی سمت سے دو بٹالین اور ایئر فورس کے لڑاکا طیارے، جنوب سے چار پلاٹونیں، شمال سے ایک بٹالین ایڈوانس کرے گی۔ اس حملے کو توپ خانے کی سپورٹ حاصل ہوگی۔ فضا میں دیکھ بھال کے لئے ایک آسٹر طیارہ ہوگا…. جس یونٹ کمانڈر کو ضرورت محسوس ہو وہ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کر کے رائل ایئر فورس سے لڑاکا ہوائی جہاز بلوا سکتا ہے…. توپ خانہ یونٹ کمانڈروں کے دیئے ہوئے ٹارگٹ پر فائر کرے گا"۔

یہ جنگی طاقت جو اس آپریشن آرڈر میں بیان کی گئی ہے دو بریگیڈوں جتنی ہے۔ دو بریگیڈوں کو استعمال کیا گیا کس کے خلاف؟…. صرف ایک گوریلا گروہ کے خاتمے کے لئے۔

یہ ساری دنیا نے دیکھا کہ انڈونیشی مسلمانوں کے ایک بھی گوریلا گروہ کا خاتمہ نہیں کیا جا سکا تھا۔

میں انڈونیشی مسلمانوں کا ایک واقعہ سناتا ہوں جو ناقابل یقین لگتا ہے لیکن اس کے گواہ برطانیہ کے دو اخبار ہیں اور ہندوستان کے انگریزی اخباروں میں بھی یہ تصویر چھپی تھی۔ بعد میں مَیں نے ایک کتاب میں یہ واقعہ پڑھا تھا اور اس کتاب کا مصنف ایک

امریکی وقائع نگار تھا.... ہوائی جہازوں کی لڑائیاں فضا میں ہوتی ہیں۔ ہوائی جہاز کو ہوائی جہاز ہی گرا سکتا ہے یا طیّارہ شکن گنیں ہوائی جہاز کو مار سکتی ہیں لیکن کون مان سکتا ہے کہ انڈونیشیا کے جنگلی نے برچھی سے ایک لڑاکا طیارہ گرا لیا تھا۔ یہ لڑاکا ہوائی جہاز انگریزوں کی ایئرفورس کا اس وقت کا تیز رفتار ہوائی جہاز تھا جسے Spitfire کہتے تھے۔

انڈونیشیا کے گوریلے جنگلوں میں ہی رہتے تھے۔ اُس وقت انڈونیشیا کے جنگل بڑے ہی گھنے اور دشوار گذار تھے۔ وہاں کسی کو ڈھونڈ نکالنا آسان کام نہیں تھا۔ اتحاریوں نے گوریلوں کے خلاف اپنے لڑاکا بمبار طیارے استعمال کئے تھے۔ برطانیہ کی ایئرفورس جسے رائل ایئرفورس کہا جاتا تھا' کا ایک لڑاکا ہوائی جہاز وہاں کے ایک جنگل کے اوپر بہت کم بلندی پر اُڑ رہا تھا۔ ایئرفورس کی زبان میں اُسے درختوں کی بلندی پر اڑنا کہتے ہیں۔ اس ہوائی جہاز کے پائلٹ کو ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ نیچے سے اس پر طیارہ شکن گنیں فائر ہوں گی اس لئے وہ اتنی خطرناک کم بلندی پر اڑ رہا تھا۔ نیچے ایک انڈونیشی برچھی ہاتھ میں لئے کہیں جا رہا تھا۔ اُس نے ہوائی جہاز کو اتنا نیچے اُڑتے دیکھا تو وہ ایک اونچی ٹیکری پر چڑھ گیا۔

ایک بار یہ ہوائی جہاز اُس کے اوپر آ گیا۔ ہوا باز نے تو اس کی طرف توجہ ہی نہ دی ہو گی لیکن یہ جنگلی سا انڈونیشی ہوائی جہاز کو دیکھتا رہا۔ کچھ دُور جا کر ہوائی جہاز پھر اس کی طرف آیا۔ اب کے اس کی بلندی اور زیادہ کم ہو گئی تھی۔ ادھر یہ انڈونیشی بلند ٹیکری پر کھڑا تھا۔

جب طیّارہ اُس کے قریب آیا تو اُس نے یہ برچھی اس طرح ہاتھوں میں تان لی جس طرح وہ شیر پر پھینکا کرتا تھا۔ ہوائی جہاز اُس کے اوپر سے گزرنے لگا تو اس نے پوری طاقت سے برچھی پھینکی۔ اس جنگلی انڈونیشی کو یقیناً" پتہ نہیں ہو گا کہ ہوائی جہاز کا نازک حصہ کون سا ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز کی باڈی ایک پتلی سی دھات کی بنی ہوئی ہوتی ہے جو ایلومینیم سے بھی پتلی ہوتی ہے لیکن اس میں ہوا کا انتہائی تیز دباؤ برداشت کرنے کی مضبوطی ہوتی ہے لیکن یہ دھات ذرا سی بھی ضرب سے برداشت نہیں کر سکتی اور گولی اس میں سے نہایت آسانی سے گزر جاتی ہے۔ اس جنگلی کی برچھی ہوائی جہاز میں ایسی جگہ اُتر گئی جہاں آگے غالباً" پٹرول کی نالی تھی یا ہو سکتا ہے یہ پٹرول کی ٹینکی میں لگی ہو۔ ہوائی جہاز کی پٹرول کی ٹینکیاں اس کے پروں میں ہوتی ہیں۔ بہرحال ہُوا یہ کہ ہوائی جہاز

کے انجن کا پٹرول رکنے لگا اور اُس کی پرواز ڈانواں ڈول ہو گئی۔ پائلٹ کے بیان کے مطابق 'اسے ذرا سا بھی شک نہ ہُوا کہ اس کے طیارے کے نیچے برچھی لگی ہوئی ہے جو ابھی تک طیارے میں ہی ہے۔

ہوائی جہاز سے پٹرول زیادہ بہہ رہا تھا اور انجن کو کم مل رہا تھا۔ انجن رُکتا اور خود ہی چل پڑتا تھا۔ اس صورتِ حال میں پائلٹ نے اپنے اڈے کا رخ کر لیا۔

وہ اپنے اڈے پر پہنچ تو گیا لیکن ہوائی جہاز اس کے قابو سے نکلا جا رہا تھا۔ نیچے سب نے دیکھا اس کے طیارے کے نیچے ایک بانس سا لٹک رہا ہے۔ سب حیران ہوئے کہ یہ کیا ہو سکتا ہے۔ اتفاق سے ہوائی اڈے پر ایک اخباری رپورٹر اور فوٹو گرافر بھی موجود تھا۔ یہ لوگ گوریلا آپریشن اور اس کے خلاف کارروائیوں کی خبریں لینے آیا کرتے تھے۔ فوٹو گرافر نے اس ہوائی جہاز کی تصویر لے لی۔ یہ تصویر ساری دنیا میں مشہور ہوئی۔

جب پائلٹ طیارہ اُتار رہا تھا یعنی لینڈنگ کے لئے رن وے پر آیا تو اس کا پٹرول بالکل ہی ختم ہو گیا۔ ہوائی جہاز رن وے پر ٹھیک طرح اترنے کی بجائے بڑی زور سے گرا اور اسے بہت بڑا نقصان پہنچا۔ پائلٹ تو بچ گیا لیکن ہوائی جہاز وقتی طور پر یا شاید ہمیشہ کے لئے بے کار ہو گیا۔ پائلٹ نے بیان دیا کہ اب اسے یاد آتا ہے کہ اس نے ایک آدمی کو بلند جگہ کھڑے دیکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں برچھی تھی لیکن اس کی طرف اس نے ایسی توجہ نہیں دی تھی جیسی کسی مشکوک آدمی کو دی جاتی ہے۔ بعد میں یہ پتہ چل گیا تھا کہ وہ ایک جنگلی آدمی تھا جو برچھی سے شکار کھیلا کرتا تھا۔ یہ سمجھنا اور یقین کرنا مشکل نہیں کہ برچھی ہوائی جہاز کی باڈی یا ونگ میں کس طرح اتر گئی تھی۔ ہوائی جہاز کی رفتار بہت تیز تھی اور ادھر سے اس شخص نے برچھی پوری طاقت سے ماری تھی۔ اس طرح ہوائی جہاز کی رفتار اور برچھی پھینکنے والے کی طاقت نے برچھی کا کام آسان کر دیا اور برچھی ہوائی جہاز میں اُتر گئی۔

اس واقعہ کے بعد رائل ایئرفورس نے ایک حکم جاری کیا تھا کہ جنگل کے اوپر اُڑتے ہوئے کوئی پائلٹ پانچ سو فٹ کی بلندی سے نیچے نہ اُڑے۔



اب انڈین آرمی کو انڈونیشی حریت پسند گوریلوں کے خلاف استعمال کیا جانے لگا۔

میری بٹالین بھی کمپنی کمپنی اور پلاٹونوں پلاٹون ہو کر بکھر گئی۔ ہر کمپنی اور ہر پلاٹون کو الگ الگ ٹاسک اور مشن دے دیا گیا۔ بٹالین ہیڈ کوارٹر ایک قصبے میں رہا۔ میں بٹالین ہیڈ کوارٹر میں تھا۔ آگے میرا کوئی کام نہ تھا۔ جب انڈین آرمی گوریلوں کے خلاف ایکشن میں آئی تو ایک اور ہی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ وہ یہ کہ انڈین آرمی کے مسلمان افراد ادھر سے بھاگ کر انڈونیشی گوریلوں سے ملنے لگے۔ حریت پسندوں کا نعرہ —— "مرڈیکا" —— ہر طرف مشہور ہو گیا تھا۔ مرڈیکا کے معنی ہیں آزادی۔ جب انڈین آرمی کے مسلمان ادھر سے بھاگ کر گوریلوں کے پاس جانے لگے تو ایک اور نعرہ مشہور ہو گیا —— "مسلم سمہ سمہ" .... اس کا مطلب ہے —— "مسلمان ایک ہیں" —— یہی نعرہ تھا جو ایک روز مجھے بھی انڈونیشی حریت پسندوں کے پاس لے گیا اور میں نے ان کے پاس خاصا عرصہ گذارا۔ یہ بات سنانے سے پہلے میں ایک بڑا ہی جذباتی اور ولولہ انگیز واقعہ سنانا ضروری سمجھتا ہوں۔

یہ واقعہ تمام تر ہندوستانی یونٹوں میں مشہور ہو گیا تھا۔ یہ غالباً "بنڈونگ کے علاقے کا واقعہ ہے۔ میں نے یہ واقعہ سنا تھا اور جس کا یہ کارنامہ ہے وہ میرے ہی علاقے کا رہنے والا تھا۔ وہ آٹھ پنجاب کی بٹالین کا حوالدار تھا اور اس کا نام حوالدار اکبر تھا۔ اتفاق سے میں نے اسے دو تین مرتبہ دیکھا بھی تھا۔ چھ فٹ کا بڑا خوبرو جوان تھا۔ یہ تو میں سنا چکا ہوں کہ ولندیزی عورتوں کا کردار کس قدر گھٹیا اور شرمناک تھا۔ وہ فوجیوں کے ساتھ راشن پانی کے لئے اور بسکٹوں اور سگریٹوں کے ڈبوں کے لئے اور شراب اور بیئر کے لئے دوستی لگاتی تھی لیکن ایک ولندیزی لڑکی حوالدار اکبر پر ایسی فریفتہ ہوئی کہ اسی کی ہو کے رہ گئی۔ حالانکہ ولندیزی لڑکیوں کا وطیرہ یہ تھا کہ وہ اُس کی ہوتی تھیں جن سے انہیں راشن ملتا تھا۔ آج کسی کے ساتھ اور کل کسی اور کے ساتھ لیکن یہ لڑکی اپنے دل میں حوالدار اکبر کی محبت لے بیٹھی۔

یہ بھی پتہ چلا کہ یہ لڑکی اکبر کو عیسائی ہو جانے کی ترغیب دیتی رہتی تھی لیکن اکبر ایک لڑکی کی خاطر اپنا مذہب چھوڑنے پر رضامند نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی یہ محبت قائم رہی۔ اکبر نے لڑکی سے کہہ دیا تھا کہ محبت مذہب نہیں دیکھا کرتی۔ اگر مذہب کو ہی دیکھنا ہے اور تم میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہو تو تمہیں اپنا مذہب چھوڑنا پڑے گا۔ لڑکی اس کے پاس آتی رہی اور دونوں اکٹھے گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ یہ گواہی ہر کوئی دیتا تھا

کہ اس ولندیزی لڑکی نے کسی دوسرے فوجی کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

ایک روز حوالدار اکبر کی کمپنی یا پلاٹون گوریلوں کے خلاف ایک مشن پر گئی۔ اطلاع ملی تھی کہ گوریلوں کا ایک گروہ فلاں جگہ موجود ہے۔ کمپنی وہاں تک پہنچی تو گوریلوں نے فائر کھول دیا۔ ادھر کمپنی بھی پوزیشن میں ہو گئی اور دونوں طرف سے بے پناہ فائر ہونے لگا۔ کمپنی کی نفری زیادہ تھی۔ نظر یہی آرہا تھا کہ کمپنی ان گوریلوں کو گھیرے میں لے کر پکڑ لے گی یا سب کو ختم کر دے گی۔

گوریلوں کی طرف سے نعرہ بلند ہوا —— "مرڈیکا" —— پھر دوسرا نعرہ بلند ہوا —— "مسلم سمہ سمہ" —— حوالدار اکبر اچانک اپنی پوزیشن سے اٹھا اور اس نے بڑی ہی بلند آواز سے نعرہ لگایا —— "مرڈیکا" —— اور گوریلوں کی طرف دوڑ پڑا اور پھر اس نے دوڑتے دوڑتے دوسرا نعرہ لگایا —— "مسلم سمہ سمہ" —— وہ گوریلوں سے جا ملنے کے لئے دوڑا جا رہا تھا۔ وہ مرڈیکا مرڈیکا کے نعرے لگاتا جا رہا تھا۔

کمپنی کمانڈر ایک انگریز کیپٹن تھا۔ اس بدبخت نے پیچھے سے حوالدار اکبر پر فائر کر دیا اور اکبر گوریلوں اور اپنی کمپنی کے درمیان گر پڑا۔ اس کی لاش اٹھانے کے لئے گئے تو گوریلوں نے فائر بہت زیادہ کر دیا۔ اس فائر سے دو تین جوان مارے گئے۔

حوالدار اکبر گوریلوں تک نہ پہنچ سکا اور گوریلے کمپنی کے گھیرے سے نکل گئے۔ اکبر کو وہیں کہیں یا غالباً "بنڈونگ میں دفن کر دیا گیا۔

وہ لڑکی اُسے ملنے آئی تو اُسے بتایا گیا کہ اکبر اس طرح مارا گیا ہے۔ اُسے اکبر کی قبر بھی دکھائی گئی۔ لڑکی کا تو یہ عالم تھا جیسے اُس کا دماغ ماؤف ہو گیا ہو۔ وہ زیادہ تر اکبر کی قبر پر ہاتھ پھیرتی اور دھاڑیں مار مار کر روتی رہتی تھی۔ گھر والے اسے وہاں سے اٹھانے آتے تو وہ کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ آخر ایک روز اُس نے چلّا کر نعرہ لگایا —— "مرڈیکا .... مرڈیکا" —— اور جنگل کی طرف دوڑ پڑی۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ وہ واپس نہیں آئی تھی اور اسے انڈونیشی گوریلوں کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ ایک خبر یہ بھی سنی تھی کہ وہ مسلمان ہو گئی تھی لیکن میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

انڈونیشی حریت پسندوں کی جنگِ آزادی نے ایسی کئی ایک ولولہ انگیز اور ایمان افروز کہانیوں کو جنم دیا تھا۔ یہ تو تمہید ہے جو میں نے باندھی ہے' آگے جا کر تفصیلات پیش کروں گا اور آپ ایک روز مجھے بھی اور انڈین آرمی کے بے شمار مسلمانوں کو بھی انڈونیشی گوریلوں کے ساتھ مرڈیکا کا نعرہ لگاتے دیکھیں گے۔ (جاری ہے)

میری یہ روئیداد انڈونیشیا میں داخل ہو گئی ہے اور اس نے میرے لئے ایک مشکل پیدا کر دی ہے۔ مشکل یہ کہ میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا کون سی بات حذف کروں اور کون سی سناؤں۔ وہاں گذارا ہُوا ایک ایک لمحہ میری آنکھوں کے سامنے آگیا ہے۔ جی چاہتا ہے ہر لمحے کی بات سناؤں لیکن یہ ممکن نہیں۔ ممکن تو یہ بھی نہیں کہ میں بعض باتیں حذف کر دوں۔ بہرحال چیدہ چیدہ باتیں ضرور سناؤں گا۔

برما کے جنگل کی بات کچھ اور تھی۔ وہ تو پُراسرار اور خطرناک جگہ تھی جہاں کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا اور ہُوا بھی لیکن وہاں میں اپنی ذات کو اور اپنے دین و ایمان کو بھی بھول گیا تھا' البتہ اپنے کردار کو جسے آپ ایمان کہہ لیں' کچھ کہہ لیں' قائم رکھا تھا۔ وہاں مجھ پر جو گزری اور میں نے وہاں جو دیکھا' وہ الف لیلیٰ کی داستانیں لگتی ہیں لیکن انڈونیشیا میں آکر ایک ہی بات ذہن اور دل میں بیٹھ گئی کہ یہ ایک مسلمان قوم ہے' حریت پسند ہے اور میں بھی مسلمان ہوں۔ میں ایک بار پھر کہہ دیتا ہوں کہ اُس وقت دنیا کے اس خطے کو انڈونیشیا نہیں کہتے تھے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان جزیروں کے جھرمٹ کو انڈونیشیا کا نام دیا جائے گا اور ایک دن یہ اسلامی مملکت ہو گی۔ میں نے کفر کے خلاف جہاد دیکھا ہے تو انڈونیشیا میں دیکھا ہے۔

اس سے پہلے جہاد شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلی علاقے میں دیکھا تھا۔ میں دو تین بار کہہ چکا ہوں کہ میرا ایمان وہیں بیدار ہُوا تھا۔ میں نے ملایا میں جب اپنی یونٹ میں جانے کا فیصلہ کیا تھا تو وہ مایوسی کے عالم میں کیا تھا۔ میں کچھ بھٹک سا گیا تھا۔ میرے دل نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ یہ تو جنگل خوار ہونے والی بات ہے' بہتر ہے انگریزوں کی

فوج میں واپس چلے چلو لیکن انڈونیشیا میں ہمیں جب وہاں کے حریت پسند مسلمانوں کے خلاف مورچہ بند کیا گیا تو میرا ایمان پہلے سے زیادہ بیدار ہو گیا اور میں اپنے آپ کو پکا مسلمان سمجھنے لگا۔

میں نے انڈونیشیا میں جو دیکھا اور جو کیا' وہ تو سناؤں گا ہی لیکن میں بہتر سمجھتا ہوں کہ انڈونیشی حریت پسندوں کے متعلق غیروں نے بعد میں جو لکھا تھا' اس کی تھوڑی سی جھلک پہلے ہی دکھا دوں۔ اگر میں نے ان کی تعریفوں کے پُل باندھنے شروع کر دیئے تو آپ کہیں گے کہ یہ شخص مبالغہ آرائی کر رہا ہے اس لئے پہلے میں آپ کو غیروں کی رائے سناتا ہوں۔

انڈونیشیا کا زیادہ تر علاقہ جنگلاتی ہے اور جنگل اتنے گھنے ہیں کہ بعض جگہوں پر تو آسمان بھی نظر نہیں آتا۔ بہت سے علاقے پہاڑیوں اور چٹانوں والے ہیں اور جزیرے تو بے شمار ہیں۔ میں اگر فوجی نقطۂ نظر سے بات کروں تو یہی کہوں گا کہ یہ علاقہ گوریلا جنگ کے لئے موزوں تھا لیکن علاقے کا موزوں ہونا ہی کافی نہیں ہُوا کرتا' لڑنے والوں میں جذبہ نہ ہو تو قدرت کی عطا کی ہوئی ان سہولتوں سے اور نہایت اچھے ہتھیاروں سے بھی وہ کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ انڈونیشی مسلمانوں نے منظم گوریلا جنگ لڑی اور زمین کے خدوخال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس کی تعریف امریکہ' برطانیہ اور دوسرے ملکوں نے بھی کی تھی کہ جس طرح انڈونیشی مسلمان لڑے ہیں اس طرح کوئی اور قوم جنگِ آزادی نہیں لڑ سکی۔

امریکہ سے ایک ماہانہ پرچہ نکلتا ہے جس سے آپ یقیناً" واقف ہوں گے۔ اس کا نام "ریڈرز ڈائجسٹ" ہے۔ انگریزی کا یہ پرچہ ساری دنیا میں جاتا ہے اور لوگ اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس پرچے میں چھپا ہوا ایک ایک لفظ حقیقت ہوتا ہے اور یہ پرچہ مبالغہ آرائی سے پاک ہوتا ہے۔ میں جب مدت بعد اپنے وطن واپس آیا تھا تو میں نے دیکھا کہ "ریڈرز ڈائجسٹ" ہمارے ہاں اتنا زیادہ مقبول ہے جتنا اپنا اُردو کا کوئی پرچہ نہیں ہوتا۔

ایک بار میں نے اس پرچے میں انڈونیشی مسلمانوں کی جنگِ آزادی کے متعلق تفصیلی مضمون پڑھا۔ چونکہ میں نے یہ جنگ ابتدا سے فتح تک دیکھی تھی' میں انڈونیشی مسلمانوں کے دوش بدوش کفّار کے خلاف لڑا بھی تھا' اس لئے میں نے یہ مضمون بڑے

شوق سے پڑھا۔ مضمون اُس اخباری رپورٹر نے لکھا تھا جس نے یہ ساری جنگِ آزادی اپنی آنکھوں دیکھی تھی۔ اُس نے امریکہ کی ایئرفورس کے ہوابازوں کو بہت خراجِ تحسین پیش کیا تھا کہ وہ اتنی کم بلندی پر جا کر انڈونیشی مجاہدین پر بمباری اور فائرنگ وغیرہ کرتے تھے جہاں درختوں اور پہاڑیوں سے ٹکرا کر تباہ ہو جانے کا خطرہ ہوتا تھا۔ اُس نے انڈونیشی مسلمانوں کے جذبے کی اور ان کے قربانیاں دینے کے انداز کی بھی تعریف کی لیکن اپنی ایئرفورس کی بات اس طرح کر رہا تھا جیسے اس کے ملک کے ہواباز دنیا کی ایک بہت بڑی طاقت کے خلاف لڑ رہے تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انڈونیشی مجاہدین کس شدت سے لڑے تھے اور انہوں نے دنیا کی اُس وقت کی بڑی طاقتوں کو بے حال کر دیا تھا۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ تین ملکوں کی فوجیں انڈونیشی مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کے لئے لڑ رہی تھیں.... امریکہ' برطانیہ' ولندیزی اور آسٹریلیا اور ہندوستان کی افواج جو انگریز کے ماتحت تھیں.... امریکہ اور برطانیہ کے ہوائی بیڑے بھی انڈونیشی حریّت پسندوں پر آگ برسا رہے تھے۔ ان کے بحری جنگی جہاز بھی آگ اگلتے رہتے تھے۔

"ریڈرز ڈائجسٹ" کے مضمون میں مصنف نے لکھا کہ امریکہ کے ہوائی جہاز بہت کم بلندی پر جا کر جنگلوں میں بمباری اور فائرنگ وغیرہ کرتے تھے اور خیال یہ ہوتا تھا کہ اتنی زیادہ بمباری سے اس جنگل میں کوئی جاندار زندہ نہیں رہا ہو گا لیکن نیچے سے انڈونیشی مجاہدین ہوائی جہازوں پر رائفلوں اور مشین گنوں سے فائرنگ کرتے تھے۔ انہوں نے چند ایک ہوائی جہاز گرا بھی لئے تھے۔

امریکی ایئرفورس کے ہوائی جہاز آگ برسا کر چلے جاتے تو برطانیہ کی رائل ایئرفورس کے ہوائی جہاز آ جاتے تھے۔ ان دونوں ملکوں کے جاسوس انڈونیشیا میں موجود تھے۔ وہ اکثر اوقات صحیح نشاندہی کرتے تھے کہ فلاں جنگل میں فلاں جگہ گوریلوں کا ایک گروہ اس وقت موجود ہے یا فلاں جگہ گوریلوں کا کمانڈر کانفرنس کر رہا ہے اور وہاں گوریلوں کا اچھا خاصا جمگھٹا ہے۔ ہوائی جہاز فوراً وہاں پہنچتے اور عین اُس مقام پر بمباری کرتے لیکن دشمن کے جاسوس جب خبریں بھیجتے کہ گوریلوں کا کتنا نقصان ہُوا ہے تو وہ صفر ہُوا کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں کے گوریلا کمانڈروں نے بلندیوں پر دیکھ بھال کی پوسٹیں بنا رکھی تھیں جو دور سے ہوائی جہاز آتے دیکھ کر ہر کسی کو خبردار کر دیتی تھیں۔

"ریڈرز ڈائجسٹ" کے اس مضمون میں انڈونیشی حریّت پسندوں کی بہادری کی جہاں تعریفیں کی گئی تھیں' وہاں ان کے خلاف بھی بہت کچھ لکھا گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ امریکیوں کو یہ بالکل پسند نہیں کہ مسلمان آزادی کی جدوجہد کریں۔ اس مضمون کے مصنف نے مسلمانوں کا ذکر اس طرح کیا جیسے کوئی گھٹیا سے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے جن کا قطعاً "حق نہیں تھا کہ انہیں آزادی دی جاتی بلکہ یہ لوگ غلام ہی رکھے جانے کے قابل تھے۔ مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کو دبا کر تہہِ تیغ کر کے رکھا جائے اور کہیں کوئی نئی اسلامی مملکت وجود میں نہ آئے۔ صحیح الفاظ میں یوں کہہ لیں کہ امریکہ' برطانیہ اور ہالینڈ نے انڈونیشیا کی جنگِ آزادی کو صلیبی جنگ قرار دے دیا تھا اور وہ تمام تر دنیائے صلیب کو مدعو کر رہے تھے کہ وہ انڈونیشی مسلمانوں کو تہہِ تیغ کرنے کے لئے تعاون کرے۔

○

پھر کچھ عرصہ بعد میرے ہاتھ میں انگریزی کا ہی ایک اور پرچہ آ گیا تھا۔ مجھے اس پرچے کا نام یاد نہیں رہا' یہی یاد رہ گیا ہے کہ یہ ہفت روزہ پرچہ تھا اور امریکہ سے نکلتا تھا۔ اس پرچے میں بھی انڈونیشی مسلمانوں کی جنگِ آزادی کے متعلق ایک مضمون تھا۔ اس مضمون میں تو انڈونیشی مسلمانوں کو لٹیرے اور قزاق کہا گیا تھا لیکن جس جذبے سے انڈونیشی لڑے' اس کی اس نے تعریف کی تھی۔ تعریف کا انداز یہ نہیں تھا کہ اس نے لکھا ہو کہ انڈونیشی ایک قوم ہیں اور آزادی چاہتے ہیں بلکہ اس نے تعریف اس طرح کی تھی جیسے ڈاکوؤں کے کسی گروہ کی دلیری کی بات کر رہا ہو۔

تعصب کے باوجود اُس نے امریکی ایئرفورس کے ایک ہواباز کی کہانی لکھی۔ اس نے لکھا کہ یہ ہواباز کئی بار انڈونیشی گوریلوں کے ٹھکانوں پر اور اُن کے جمگھٹوں پر بمباری اور مشین گن فائرنگ کے لئے گیا اور اس نے ہر بار صحیح بمباری کی۔ ایک بار وہ دو ہوائی جہازوں کے ساتھ گیا' یعنی تین لڑاکا بمبار ہوائی جہاز گئے جن میں ایک اس پائلٹ کا تھا۔ مضمون میں اس کا نام بھی لکھا تھا جو میرے ذہن سے نکل گیا ہے۔ ان تینوں ہوابازوں نے اس جنگل پر جس کی نشاندہی کی گئی تھی' درختوں کی بلندی پر اُڑتے ہوئے وہ تمام بم جگہ جگہ گرائے جو وہ لے گئے تھے اور اس کے بعد مشین گنیں اس طرح فائر کیں جس طرح فوارے سے پودوں کو پانی دیا جاتا ہے۔

پھر ہُوا یہ کہ ان تین میں سے دو ہواباز واپس آئے اور انہوں نے بتایا کہ ان کا تیسرا

ساتھی غوطے میں گیا اور پھر اٹھا نہیں۔ انہوں نے اس ہوائی جہاز میں سے دھواں نکلتے نہیں دیکھا تھا جس سے یہ کہا جا سکتا کہ اُسے یعنی اُس کے انجن میں گولیاں لگ گئی تھیں اور وہ اوپر اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ان ہوابازوں نے اپنے تیسرے ساتھی کے ہوائی جہاز کو کسی درخت یا پہاڑی سے ٹکراتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔

ان دونوں نے بیان دیا کہ جب ان کا یہ ساتھی اوپر نہ اٹھا تو یہ سمجھ لیا گیا کہ وہ ہٹ ہو گیا اور کریش کر گیا ہے۔ دونوں ہوابازوں نے بڑی کم بلندی پر جا کر نیچے دیکھا اور بہت دیر وہیں نیچے نیچے پرواز کرتے رہے۔ آخر انہوں نے جنگل کے ایک نشیب میں سے دھواں اٹھتا دیکھا۔ یہ سیاہ دھواں تھا جو یقیناً" اُس ہوائی جہاز کا تھا جو گر پڑا تھا۔ یہی کہا جا سکتا تھا کہ اس کا ہواباز مارا گیا ہے۔ امریکہ کی ایئر فورس یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ ان کا یہ ہواباز مارا گیا ہے یا کہیں اور گر کر زندہ ہے تو کیا وہ جنگی قیدی بنا لیا گیا ہے؟.... امریکی ایئر فورس نے ریڈ کراس والوں سے کہا کہ وہ اس پائلٹ کے متعلق معلوم کر دیں۔

میں نے پچھلے باب میں بتایا ہے کہ انڈونیشی مسلمانوں کی جنگِ آزادی ایک باقاعدہ اور منظم گوریلا جنگ تھی۔ ان کی باقاعدہ ہائی کمانڈ تھی اور اس کے نیچے دوسرے ہیڈ کوارٹر تھے جو سارے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے اور ان ہیڈ کوارٹروں کے تحت گوریلا گروہ تھے جنہیں باقاعدہ ایک سکیم اور پلاننگ کے تحت آپریشن آرڈر ملتے تھے اور وہ لڑتے تھے۔ ریڈ کراس والوں نے انڈونیشی کمانڈ سے رابطہ قائم کیا تو وہاں سے فوری طور پر کوئی جواب نہ ملا اور یہ کہا گیا کہ ایک امریکہ ہواباز کو مار گرایا گیا ہے اور وہ زندہ بھی ہے لیکن اس کے متعلق ابھی وہ کچھ بھی نہیں بتا سکتے۔ ریڈ کراس کے نمائندے بہت حیران ہوئے کہ یہ کیا بات ہوئی۔ کہہ دیا جاتا کہ اُسے مار گرایا گیا تھا اور وہ زندہ ہے یا ہوائی جہاز کریش ہُوا تو وہ مر گیا تھا۔

ڈیڑھ دو مہینے بعد ریڈ کراس والوں کو بتایا گیا کہ امریکہ کا وہ لڑاکا ہواباز زندہ ہے اور ریڈ کراس اپنے نمائندے کو ہائی کمانڈ میں بھیج دے.... یہ عالمی ریڈ کراس تھی جسے قیدی کیمپ دیکھنے کا بھی حق حاصل تھا۔ اس کے دو تین نمائندے انڈونیشی گوریلوں کے ہائی کمانڈ کے ہیڈ کوارٹر میں گئے تو انہیں بتایا گیا کہ یہ امریکی ہواباز اپنی مرضی سے جنگل میں ذرا جگہ دیکھ کر اُتر آیا تھا اور اُس کا ہوائی جہاز اُتر تو گیا لیکن آگے جگہ تھوڑی تھی اس لئے درخت سے ٹکرا گیا لیکن رفتار اتنی کم تھی کہ جہاز تو بے کار ہو گیا لیکن ہواباز صحیح

سلامت باہر نکل آیا۔

وہ انڈونیشی گوریلوں کا جنگی قیدی تھا اور اسے قیدی بنا بھی لیا گیا لیکن اُس نے کہا کہ وہ اپنی مرضی سے اُترا ہے اور وہ انڈونیشی گوریلوں کے ساتھ رہے گا.... ریڈ کراس کے نمائندوں نے یہ بات سنی تو وہ مسکرائے جیسے انڈونیشی ہائی کمانڈ والوں نے ان کے آگے جھوٹ بولا ہو۔ یہ لگتا ہی جھوٹ تھا۔ کون مان سکتا تھا کہ ایک امریکی ہواباز جنگل میں اُتر گیا ہو اور ان گوریلوں سے ملا ہو جن پر اسے بمباری کے لئے بھیجا گیا تھا۔ ریڈ کراس والے نہ مانے۔

ہائی کمانڈ سے انہیں کہا گیا کہ انہیں کسی کا کوئی ڈر نہیں۔ اگر یہ امریکی ہواباز جنگی قیدی ہے تو وہ جنگی قیدی ہی ہے۔ اگر آپ لوگ اُسے دیکھنا چاہتے ہیں تو اسے بلا لیا جائے گا اور آپ اُسے الگ بٹھا کر پوچھ سکتے ہیں۔ ہائی کمانڈ کے افسر نے یہ بھی کہا کہ ڈیڑھ دو مہینے بعد اس لئے انہیں یہ بات بتائی گئی ہے کہ اتنا عرصہ وہ اس امریکی ہواباز کی جانچ پڑتال کرتے رہے تھے کہ وہ کہاں تک سچ بول رہا ہے کہ وہ انڈونیشی گوریلوں کے ساتھ آن ملا ہے۔ انڈونیشی اُسے جھوٹا اور فریب کار سمجھتے تھے' آخر انہیں ڈیڑھ دو مہینے بعد اعتبار آ گیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں جس پرچے کا حوالہ دے رہا ہوں' اس میں لکھا تھا کہ ہواباز کو بلایا گیا اور اسے ریڈ کراس کے نمائندوں کے حوالے کر دیا گیا۔ اس ہواباز نے کہا کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر انڈونیشیا میں اُترا ہے۔ ریڈ کراس والوں کو شک تھا کہ اس کی کسی نہ کسی طریقے سے برین واشنگ کی گئی ہے یا اسے ایسی دوائیاں پلائی گئی ہیں جنہوں نے اس کے ذہن سے اس کا ماضی نکال دیا ہے اور یہ انہی گوریلوں کا ہو کے رہ گیا ہے۔

امریکی ہواباز نے اس کی تردید کی اور کہا کہ وہ بھی ڈاکٹر کو یا کسی ماہر نفسیات کو یا جو کوئی پوری چھان بین کر سکتا ہے اور اس کے سامنے جانے کو تیار ہے اور وہ پوری طرح اس کا چیک اپ کر لے۔ اُس نے کہا کہ اسے پتہ چلا کہ جن پر وہ بمباری اور گن فائرنگ کرتا ہے' وہ کوئی باقاعدہ فوج نہیں اور وہ اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔

اُس نے یہ بھی کہا کہ پہلے ان لوگوں پر ولندیزی اس طرح حکومت کرتے رہے کہ انہیں زر خرید غلام بنائے رکھا اور یہ لوگ اپنے حقوق سے محروم رہے۔ پھر جاپانی آ گئے اور انہوں نے انہیں اور ہی مشکلات اور پریشانیوں میں ڈال دیا۔ یہ صحیح ہے کہ جاپانیوں

نے ان کی اپنی حکومت بنا دی تھی لیکن یہ جاپانیوں کی ایک فریب کارانہ چال تھی۔ انہوں نے ان لوگوں کو دوستی اور محبت کا جھانسہ دے کر دوست بنالیا تھااور یہ دوستی ایک اور ہی قسم کی غلامی تھی۔ اب یہ لوگ اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں توانہیں آزاد کیوں نہیں کیا جاتا۔ امریکہ اور برطانیہ کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ اتنے غیور اور پُروقار لوگوں کو اپنا غلام بنالیں اور ان کی زمین پر قبضہ کرلیں۔

ریڈ کراس کے یہ نمائندے امریکہ اور برطانیہ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے انہوں نے اس امریکی ہواباز سے کہا کہ اس کی سوچ بہت ہی غلط ہے اور یہ لوگ جو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں' یہ کسی اور مذہب کے لوگ ہیں۔ ریڈ کراس کو یہ بات نہیں کہنی چاہئے تھی کیونکہ ریڈ کراس کے ہاں دوست اور دشمن کا کوئی تصوّر نہیں ہوتا۔ یہ تنظیم لڑنے والے دونوں ملکوں کی یکساں طور پر خیر خواہ ہوتی ہے لیکن اس تنظیم کے یہ نمائندے برداشت نہیں کرسکے تھے کہ ایک امریکی مسلمانوں سے جا ملے۔

انڈونیشی ہائی کمانڈ نے اس امریکی ہواباز کے فوٹو لے کر ریڈ کراس کے نمائندوں کو دیئے اور کہا کہ یہ ساری دنیا کو دکھاؤ اور دنیا کے آگے سچ بولو کہ جن لوگوں کا ضمیر پاک اور صاف ہے' دیکھو وہ کس کے ساتھ ہیں۔ ریڈ کراس کے نمائندوں نے بڑی مایوسی کے عالم میں یہ فوٹو لئے اور چلے گئے۔

انڈونیشی ہائی کمانڈ کو اس امریکی ہواباز پر یہ شک تھا کہ ان کے ساتھ رہ کر جاسوسی کرے گا اور انہیں دھوکہ دے گا لیکن اُس نے ایسی کوئی حرکت نہ کی اور وہ ہائی کمانڈ میں ان کا ایڈوائزر بن گیا۔ وہ افسوس کا اظہار کرتا تھا کہ انڈونیشی مسلمانوں کے پاس ہوائی جہاز نہیں ورنہ وہ ان ہوائی جہازوں کو امریکہ اور برطانیہ کے خلاف استعمال کرتا۔

امریکہ والوں نے اس ہواباز کی خبر کا بلیک آؤٹ کیا تاکہ کسی اور کو پتہ نہ چل سکے ورنہ اس جیسے اور کئی فوجی اِدھر سے بھاگ کر اُدھر انڈونیشی گوریلوں کے پاس چلے جائیں گے۔ ظاہر ہے امریکہ نے اس ہواباز کو جنگی قیدی قرار دے دیا ہو گا۔ اس کے بعد اتنا پتہ چلا کہ یہ امریکی ہواباز انڈونیشیا میں ہی رہا تھا' اس نے یہیں شادی کرلی تھی اور پھر معلوم نہیں وہ کہاں رہا' البتہ یہ مصدقہ اطلاع تھی کہ وہ اپنے ملک واپس نہیں گیا تھا۔ اس رسالے میں یہ تو نہیں لکھا تھا کہ اُس نے اپنا مذہب چھوڑ دیا تھا یا نہیں' یہ میں کہتا ہوں کہ اُس نے یقیناً" اسلام قبول کرلیا ہو گا۔

اب ایک اور عجیب و غریب واقعہ سنئے۔ یہ میں نے انڈونیشیا میں بھی سنا تھا لیکن اتنا مختصر سا سنا تھا کہ میں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ یہ اُس وقت کا ہے... لور ...نے سنا تھا جب برسوں بعد انڈونیشیا کے حریّت پسندوں نے امریکہ اور برطانیہ کو ...ت دے کر آزادی حاصل کرلی تھی اور میں وہیں رکا رہا تھا۔

...میں جب مدت بعد پاکستان واپس آیا تو "ریڈرز ڈائجسٹ" ہی کا ایک اور پرچہ ہاتھ ...یہ پرچہ مجھے اتنا اچھا لگنے لگا تھا کہ میں کوشش کرتا تھا کہ ہر مہینے مجھے ملے اور میں پڑھا ...وں۔ بہرحال ایک اور پرچہ ہاتھ لگا تو اس میں وہی واقعہ تفصیل سے لکھا ہُوا تھا جس کا ...نے ابھی ذکر کیا ہے۔

انڈونیشیا میں یہ واقعہ سنا تو ایک تو یہ بہت ہی مختصر اور بغیر کسی ثبوت اور شہادت کے ...کیا تھا اور میں نے ایک اور وجہ سے بھی اسے قابلِ قبول نہ سمجھا کہ یہ بات جذبات ...آکر ویسے ہی گھڑ لی گئی ہے لیکن "ریڈرز ڈائجسٹ" میں ایک امریکی سارجنٹ کا لکھا ...ہی واقعہ پڑھا تو مجھے یقین آیا کہ یہ تو بالکل سچ ہے۔

یہ سارجنٹ امریکہ کی فوج کا سارجنٹ تھا اور وہ انڈونیشیا کے حریت پسندوں کے ...کئی سال لڑا تھا۔ اُس نے انڈونیشیا کے ایک آدمی کا ذکر کیا ہے جس کا نام یوسف تھا ...وہ امریکی فوج کا مخبر بن گیا تھا۔ اُسے امریکہ کے افسروں نے باقاعدہ امریکہ کی فوج میں ...کرلیا تھا اور اُسے کارپورل کا عہدہ دیا تھا۔ کارپورل ہماری فوج کے نائیک کے برابر ...ہے۔

یہ کوئی حیرت والی بات نہیں کہ ایک انڈونیشی مسلمان امریکہ کی فوج کا وفادار بن گیا ...صرف یوسف ہی نہیں' کئی اور انڈونیشی مسلمان انگریزوں اور امریکیوں کی فوج کے ...بن گئے تھے اور اپنے ہی بھائیوں کے خلاف مُخبری کرتے تھے۔ اگر کسی کے متعلق پتہ ...جاتا کہ یہ شخص جو ہمارے ساتھ اتنے پیار سے اٹھتا بیٹھتا ہے' یہ تو ہمارے دشمن کا ...ہے تو اُسے وہیں گولی مار دی جاتی تھی۔ میں نے ایسے تین مسلمان مُخبروں کو دیکھا تھا ...ہیں میرے سامنے گولی ماری گئی تھی۔

اس امریکی سارجنٹ نے اپنی کہانی میں لکھا کہ وہ انڈونیشی گوریلوں کے خلاف کئی ...لیا اور اُس نے خونریز جھڑپیں لڑیں۔ پھر لکھا کہ انڈونیشی گوریلوں کو مارنا اور پکڑنا بڑا ...مشکل اور خطرناک کام تھا کیونکہ ان کا جاسوسی کا نظام اتنا تیز اور مضبوط تھا کہ انہیں

پہلے ہی پتہ چل جاتا تھا کہ فلاں طرف سے دشمن کی فوج آ رہی ہے۔ وہ اس فوج کی
نہ کسی دستے کو گھات لگا کر مار ڈالتے یا بھگا دیتے تھے۔ انڈونیشیا کے حریت پسند فو
ترتیب میں تو لڑتے ہی نہیں تھے۔ وہ گوریلا گروہوں کی صورت میں شب خون ما
مارتے اور غائب ہو جاتے تھے۔ یہ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ انہیں کون خبر دیتا تھ
فلاں طرف سے فوج کا ایک دستہ یا اتنی نفری آ رہی ہے۔

اس امریکی سارجنٹ نے لکھا کہ کارپورل یوسف اس قدر وفادار آدمی تھا ک
سارجنٹ ہر کارروائی میں اسی کو اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ سارجنٹ نے کچھ حیرت
انداز سے لکھا کہ انڈونیشیا کا مسلمان ہو کر وہ امریکہ کا وفادار کیونکر ہو گیا تھا اور وفادار
ایسا کہ جان تک قربان کرنے کو تیار رہتا تھا۔

سارجنٹ نے تین چار واقعات لکھے۔ ہر ایک واقعہ ایک ہی جیسا تھا' مثلاً "وا
کی فوج کی ایک پلاٹون یعنی چالیس پچاس آدمیوں کے ساتھ گوریلوں کے کسی گرو
خلاف گیا۔ گوریلے بیدار ہو گئے یا انہیں پہلے ہی پتہ تھا' انہوں نے اس پلاٹون کو گھ
میں لے لیا۔ کارپورل یوسف ہر بار غائب ہو گیا اور سارجنٹ یہ سمجھا کہ وہ مارا گیا
لیکن ہر بار وہ واپس آ گیا اور پتہ چلا کہ وہ گوریلوں میں جا گھسا تھا اور دست بدست ا
میں اس نے دو تین گوریلوں کو مار ڈالا اور دو دفعہ وہ خود بھی زخمی حالت میں واپس
تھا۔

سارجنٹ نے لکھا کہ کارپورل یوسف کی بہادری کے بعض کارنامے ایسے نا
یقین تھے جیسے اس نے معجزہ کر دکھایا ہو۔ وہ ایسی صورتِ حال سے بھی نکل آتا تھا
میں یہ یقین ہو جاتا تھا کہ آج وہ واپس نہیں آئے گا۔ صرف یہ سارجنٹ ہی نہیں
اس کمپنی کے افسر بھی اس کی تعریف کرتے تھے۔ ایک روز اس سارجنٹ نے اسے ک
وہ اتنی دلیری نہ دکھایا کرے ورنہ وہ مارا جائے گا۔

یوسف نے مسکرا کر کہا کہ وہ کبھی بھی نہیں مارا جائے گا اور جب وہ مرے گا تو
اور ہی موت مرے گا' لڑائی میں نہیں مرے گا.... سارجنٹ ہنس پڑا۔ وہ سمجھا ک
شخص امریکہ کی وفاداری میں اتنا جذباتی ہے کہ سوچ سمجھ کر کچھ بھی نہیں کر رہا بلکہ ج
کچھ کرتا ہے جذبات سے مغلوب ہو کر کرتا ہے۔ سارجنٹ نے اسے کہا کہ وہ اپنے

کو تجوری میں رکھا کرے۔

یوسف نے کہا کہ اس کے خنجر کے دستے میں ایک تعویز پڑا ہوا ہے۔ جب تک یہ
تعویز اس کے پاس رہے گا وہ لڑائی میں نہیں مارا جائے گا۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے خنجر کا
دستہ اوپر کھینچا تو دستہ خنجر سے الگ ہو گیا۔ اس خنجر میں اس نے سرخ کپڑے میں بندھا
ہوا کاغذ کا تہہ کیا ہوا چھوٹا سا ٹکڑا دکھایا اور کہا کہ یہ تعویز اسے ایک بزرگ نے دیا تھا اور
کہا تھا کہ یہ تعویز اس کی زندگی کا ضامن ہے اور وہ لڑائی میں نہیں مرے گا.... یہ کہہ کر
اس نے یہ تعویز دستے میں ڈالا اور دستہ پھر خنجر پر چڑھا لیا۔

خنجروں کے بلیڈ بالکل سیدھے ہوا کرتے ہیں لیکن انڈونیشیا والوں کے خنجروں کے
بلیڈ سیدھے نہیں ہوتے تھے بلکہ سانپ کی شکل کے تھے۔ یعنی زگ زیگ تھے۔ یہ خنجر
زیادہ خطرناک زخم دیتا تھا۔ کسی کے جسم میں یہ خنجر اترتا اور جب نکلتا تو وہاں سے گوشت
کھینچ کر باہر لے آتا تھا۔

سارجنٹ نے اپنی کہانی میں لکھا کہ اس نے یوسف کی یہ بات سنی تو وہ سمجھ گیا کہ یہ
شخص اندھی عقیدت رکھنے والا ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کاغذ کا چھوٹا سا ٹکڑا اس
کی زندگی کا ضامن بن جائے۔ اس نے اپنے مضمون میں لکھا کہ مسلمان ان توہمات کو
سچ مانتے ہیں۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ اسے کارپورل یوسف پر رحم بھی آیا کہ یہ شخص
اپنے کسی بزرگ کے جھانسے میں آ کر ضرورت سے زیادہ دلیری اور بہادری کے
مظاہرے کرتا ہے اور کسی روز یہ بہت بری موت مرے گا۔ اس نے یوسف سے یہ بات
کہہ ہی دی اور کہا کہ یہ محض توہم پرستی ہے اور وہ جذباتی عقیدت کو نہیں بلکہ حقیقت
کو سامنے رکھا کرے۔

یوسف نے مسکراتے ہوئے سارجنٹ سے کہا کہ ایک روز میں یہ بھی ثابت کر دوں
گا کہ یہ تعویز جس کے پاس بھی ہو وہ لڑائی میں نہیں مرے گا۔ سارجنٹ نے اسے کہا کہ
اگر کسی روز یہ تعویز مجھے دے دینا' میں تمہاری طرح گوریلوں میں جا گھسوں گا اور دیکھنا
ول میں زندہ واپس آتا ہوں یا نہیں۔ سارجنٹ نے لکھا کہ یہ بات سن کر یوسف ہنس پڑا
اور سارجنٹ سمجھ گیا کہ یہ تعویز کسی قیمت پر کسی کو نہیں دے گا۔

○

سارجنٹ نے اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو بتایا کہ دیکھو یہ مسلمان کیسی چیزوں کو

مانتے ہیں اور یہ صریحاً توہم پرستی ہے۔ سارجنٹ بعض اوقات افسوس سے کہا کرتا کہ کارپورل یوسف کتنا اچھا اور کتنا دلیر آدمی ہے لیکن توہم پرستی اس کی ایک کمزوری بن ہوئی ہے اور یہ ایک حماقت ہے۔

آگے چل کر سارجنٹ نے اپنی کہانی یوں لکھی کہ ایک روز اس کی پلاٹون کو حکم ملا کہ فلاں علاقے میں گوریلوں کا ایک گروہ موجود ہے اور اس گروہ کو گھیرے میں لے کر ایسا شدید حملہ کرنا ہے کہ ایک بھی بچ کر نہ نکل سکے۔ ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ اس گروہ کی نفری کچھ زیادہ ہے۔

سارجنٹ کی تحریر کے مطابق گوریلوں پر ان حملوں کا تسلسل روزمرہ کا معمول تھا اور سارجنٹ اس کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کی بٹالین کی دوسری کمپنیاں بھی گوریلوں کے خلاف جنگل کے مختلف حصوں میں لڑ رہی تھی۔ سارجنٹ اس گوریلا گروہ کے خلاف کارروائی ویسی ہی کارروائی سمجھا جیسے وہ پہلے کرتا آیا تھا۔ اُس نے اپنی پلاٹون کو تیار کیا اور معمول کے مطابق پلاٹون کو ہدایات دیں اور چل پڑے۔

پلاٹون اُس مقام تک پہنچ گئی جہاں اسے بتایا گیا تھا کہ یہ گوریلا گروہ موجود ہوگا لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ سارجنٹ نے اپنی پلاٹون کو پھیلا دیا اور چند سپاہیوں کو اپنے ہراول کے طور پر لگا دیا۔ معلوم یہی ہوتا تھا کہ گوریلوں کا یہ گروہ کچھ دیر پہلے وہاں سے چلا گیا ہے۔ جنگل مکمل خاموش تھا اور کسی خطرے کا ذرا سا بھی اشارہ نہیں مل رہا تھا۔

سارجنٹ نے اور زیادہ محتاط ہو کر کمپنی کو ایک خاص ترتیب میں کر لیا۔ وہ کم و بیش ایک میل آگے چلے گئے اور ایسی جگہ آ گئی جہاں دائیں اور بائیں دو اونچی ٹیکریاں تھیں اور یہ ٹیکریاں درختوں سے بھرپور تھیں۔ گھاس اور قدرتی پودے بھی بے شمار تھے۔ ان چٹانوں کے درمیان جگہ کشادہ تھی۔

آگے گئے تو ٹیکریاں اور زیادہ پیچھے ہٹتی گئیں۔ سامنے ایک اور ایسی ٹیکری تھی جس نے راستہ روک رکھا تھا۔ یوں سمجھیں کہ ایک کشادہ میدان تھا جسے ٹیکریوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

جوں ہی پلاٹون اس کشادہ جگہ پہنچی تین اطراف سے اس قدر زیادہ فائر اچانک کھل گیا جیسے مینہ برستا ہے۔ ایک ہی بار رائفلوں اور مشین گنوں نے آگ اگلنی شروع کر دی۔ سارجنٹ کے اندازے کے مطابق اس کی آدھی پلاٹون تو وہیں ختم ہو گئی تھی

سارجنٹ نے چلا چلا کر اپنی پلاٹون کو ہدایات دیں اور جو بچ گئے تھے انہوں نے اِدھر اُدھر آڑ لے لی اور جوابی فائر کرنے لگے۔ سارجنٹ اپنے جوانوں کو بار بار للکارتا تھا اور کہتا تھا کہ پسپا نہیں ہونا' یہ گوریلے زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتے۔

کارپورل یوسف بھی حسبِ معمول اس کے ساتھ تھا۔ وہ پانچ چھ سپاہی ساتھ لے کر ایک اور طرف چلا گیا تاکہ گوریلوں پر پیچھے سے فائر کر سکے۔ وہ گوریلوں کے عقب میں جانے میں کامیاب ہو گیا اور ایسا کارگر فائر کیا کہ ایک طرف کی ٹیکری پر جو گوریلے تھے انہیں مار ڈالا اور جو بچے وہ بھاگ گئے۔

سارجنٹ جانتا تھا کہ جو بچ گئے ہیں وہ گوریلے بھاگے نہیں بلکہ دوسری ٹیکریوں پر چلے گئے ہوں گے۔ سارجنٹ نے تو جیسے قسم کھالی تھی کہ آخری سپاہی اور آخری دم تک لڑنا ہے۔ سپاہی بھی دلیری سے پوزیشنیں بدل بدل کر لڑ رہے تھے۔

کارپورل یوسف نے پھر چند ایک سپاہی ساتھ لئے اور دوسری ٹیکری کے عقب میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

مختصر بات یوں ہے کہ سارجنٹ کے پاس سپاہی کم رہ گئے تھے لیکن اُس نے ایسے جذبے سے ان سپاہیوں کو لڑایا کہ گوریلے پیچھے ہٹنے لگے اور پھر وہ نکل گئے لیکن نقصان بے انداز کر گئے۔

جب گوریلوں کی طرف سے فائر بالکل ہی رک گیا تو سارجنٹ اپنی پوزیشن سے اٹھا اور اپنے سپاہیوں کو دیکھنے لگا۔ اُسے بیشتر سپاہی مرے ہوئے یا شدید زخمی حالت میں ملے۔ چند ایک ہی صحیح اور سلامت تھے۔ اُس نے کارپورل یوسف کو ڈھونڈنا شروع کیا' اسے آوازیں بھی دیں لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔

آخر اسے ایک جگہ یوسف پڑا مل گیا۔ وہ دوڑتا ہوا یوسف تک پہنچا۔ یوسف کی وردی خون سے لال ہو چکی تھی اور گولیاں ایسی لگی تھیں کہ اس کے زندہ رہنے کی کوئی صورت تھی ہی نہیں۔ سارجنٹ لکھتا ہے یوسف اسے دیکھ کر مسکرایا اور اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ سارجنٹ نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے تسلی دی کہ وہ اُسے کیمپ تک لے جائے گا اور وہ بچ جائے گا۔

کارپورل یوسف نے مسکرا کر کہا کہ وہ نہیں بچ سکے گا اور وہ یہاں سے نکلنے کی سوچ کرے نہیں۔ سارجنٹ نے دیکھا کہ یوسف کی زندگی چند لمحے ہی رہ گئی ہے۔

"یوسف!" ــــ سارجنٹ نے افسوس کے لہجے میں کہا ــــ "آج تمہارا سرخ تعویذ تمہیں دھوکہ دے گیا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ان چیزوں پر اتنا عقیدہ نہیں ہونا چاہئے"۔

"آج میرے خنجر میں وہ تعویذ ہے ہی نہیں" ــــ یوسف نے کہا ــــ "میں نے آج صبح وہ تعویذ تمہارے خنجر کے دستے میں ڈال دیا تھا.... دیکھ لو"۔

یہ کارپورل یوسف کے آخری الفاظ تھے اور اُس کے ساتھ اس کا سر ڈھلک گیا اور وہ مر گیا۔

سارجنٹ کے پاس بھی ویسا ہی خنجر تھا۔ گوریلا آپریشن میں چاقو اور خنجر ساتھ رکھے جاتے ہیں۔ سارجنٹ نے فوراً اپنا خنجر بیلٹ میں سے کھینچ کر نکالا اور پھر اس کا دستہ اوپر کو کھینچا تو اس میں سے سرخ کپڑے میں لپٹا ہُوا وہ تعویذ گرا جو یوسف نے کچھ روز پہلے اپنے خنجر سے نکال کر دکھایا تھا۔ سارجنٹ نے یوسف کی لاش سے خنجر کھینچا اور اس کا دستہ دیکھا۔ اُس میں تعویذ نہیں تھا۔ تعویذ معلوم نہیں کس وقت یوسف نے سارجنٹ کے خنجر میں ڈال دیا تھا۔

سارجنٹ نے آخر میں لکھا کہ میں آج بھی نہیں سمجھ سکا کہ یہ اُس تعویذ کی کرامت تھی کہ یوسف کے پاس نہ رہا تو وہ مر گیا اور یہ میرے پاس تھا اور میں اتنے خوفناک فائر اور معرکے میں بچ نکلا۔ اُس نے لکھا کہ تین چار مرتبہ گوریلوں کی کسی مشین گن کی پوری بوچھاڑ میرے قریب زمین پر لگی اور میں سمجھتا کہ ابھی ایسی ایک اور بوچھاڑ آئے گی اور میرے جسم کو چیرتی پھاڑتی گزر جائے گی لیکن یہ معجزہ تھا کہ میں زندہ رہا۔

آخر میں اُس نے لکھا کہ یہ خنجر اور تعویذ آج بھی میرے پاس ہے اور میں اسے اکثر دیکھتا ہوں تو کارپورل یوسف یاد آجاتا ہے۔ میرے آنسو نکل آتے ہیں اور میں اُس کے سرخ تعویذ کو بڑے پیار اور احترام سے اپنے خنجر کے دستے میں ڈال کر رکھتا ہوں۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ یہ کہانی "ریڈرز ڈائجسٹ" میں پڑھی تھی۔ "ریڈرز ڈائجسٹ" یہودیوں کا پرچہ ہے۔ یہودیوں نے یہ کہانی شائع نہیں کرنی تھی۔ کر دی تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ یقیناً اس تعویذ سے متاثر ہوئے ہوں گے اور یہی سمجھ کر چھاپی ہو گی کہ یہ کہانی بالکل سچی ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس تعویذ میں اتنی کرامات تھی یا نہیں لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ انڈونیشیا میں کچھ صوفی اور اولیاء اللہ بھی ہو گزرے ہیں۔ وہاں ضرور کوئی نہ کوئی ایسا بزرگ ہو گا جس نے یہ تعویذ یوسف کو دیا ہو گا۔

○

یہ تو بہت بعد کی باتیں ہیں جو مجھے امریکہ کے پرچوں میں سے معلوم ہوئی تھیں۔ میں اب آپ کو واپس جنگِ آزادی کے میدان میں لئے چلتا ہوں۔ میں نے شاید پہلے بھی کہا ہے کہ انڈونیشی مسلمانوں کی یہ مسلح جنگِ آزادی کوئی معمولی جنگ نہیں تھی۔ اس پر کتابیں لکھی گئی تھیں اور امریکہ اور برطانیہ کی فوج نے انڈونیشی مسلمانوں کی اس گوریلا جنگ سے ایسے سبق حاصل کئے تھے کہ انہوں نے کچھ پمفلٹ اور کتابیں بھی لکھیں اور اپنی فوج میں تقسیم کی تھیں۔

اب میں بہت پیچھے سے بات شروع کروں گا' یعنی جب ہمیں یہاں لایا گیا تھا۔ میں اپنی بٹالین کی بات کروں گا کیونکہ اس کا میں عینی شاہد ہوں۔ اس لئے ہر بات سچّی ہو گی۔ باتیں تو باقی بھی سچّی ہیں لیکن وہ میں نے دوسری یونٹوں کے لوگوں سے سنی تھیں.... ہمیں تو بتایا ہی نہیں گیا تھا کہ ہمیں انڈونیشی مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لئے لایا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ابھی معلوم ہی نہیں تھا کہ ان جزیروں' جاوا سماٹرا وغیرہ کے لوگوں نے جنگ آزادی کی ابتدا کر دی ہے۔ ہم یہی جانتے تھے کہ ان علاقوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ میں مختلف جگہوں اور مقامات کے نام نہیں لکھوں گا کیونکہ یہ دو چار نہیں بے شمار تھے جن میں سے زیادہ تر کے نام میرے ذہن سے اُتر گئے ہیں۔ نام بھی ایسے تھے جن کا تلفظ بھی اُلٹا سا تھا۔ تاہم یاد نہ رہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اُس وقت سوچا بھی نہ تھا کہ عمر کے کسی حصے میں جا کر یہ داستان لکھوں گا۔ فوجیوں کا لکھنے لکھانے کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

ہماری بٹالین کو چھوٹے سے ایک قصبے سے تقریباً ایک میل دور کیمپ میں رکھا گیا۔ ہم نے وہاں خیمے لگا لئے اور اب اگلے حکم کا انتظار کرنے لگے۔ اگلا حکم یہی ہو سکتا تھا کہ ان جنگلوں میں جو جاپانی چھپے ہوئے رہ گئے ہیں' انہیں پکڑنا ہے۔ یہ تو بتا چکا ہوں کہ ایٹم بموں نے جنگ کا خاتمہ کر دیا تھا۔

میں نے یہ بھی بتایا ہے کہ جاپانی ہتھیار ڈالنا تو جانتے ہی نہیں تھے۔ ہتھیار دینے سے پہلے وہ اپنی جان دے دیا کرتے تھے۔ ہماری بٹالین میں عام خیال یہی تھا کہ اِدھر اُدھر چھپے ہوئے جاپانیوں کو ڈھونڈنا اور پکڑنا ہے۔ ہمارے اس خیال کی تصدیق اس طرح بھی ہوئی کہ پہلے روز ہی ہماری ایک پٹرول پارٹی (گشتی پارٹی) کیمپ سے کچھ دُور گئی۔ اس پر فائرنگ ہوئی اور دو جوان مارے گئے۔ اس پارٹی کی نفری پندرہ سولہ تھی۔ اُنہوں نے اس جگہ کو گھیرے میں لے لیا جدھر سے فائر آیا تھا۔ کچھ دیر گولیوں کا تبادلہ ہُوا۔ دشمن کی طرف سے آنے والا فائر کچھ زیادہ نہیں تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ تین چار رائفلیں ہیں جو فائر کر رہی ہیں۔ آخر یہ رائفلیں بھی خاموش ہو گئیں۔ گھیرا تنگ کر کے قریب پہنچے تو وہاں دو جاپانی سپاہی مرے پڑے تھے۔ یہ فائر انہوں نے ہی کیا تھا۔

یہ پٹرول پارٹی جب واپس آئی تو اس نے اپنے دو جوانوں کی لاشیں اٹھا رکھی تھیں اور جاپانیوں کی دو رائفلیں بھی تھیں اور انہوں نے بتایا کہ دو جاپانی فوجیوں نے ان پر فائر کیا تھا اور اُنہیں مار دیا گیا ہے۔ اس طرح ہمارا یہ خیال پکا ہو گیا کہ اب ہمیں جنگلوں میں پھیلا دیا جائے گا اور ہم جاپانیوں کو ڈھونڈتے رہیں گے۔

ہُوا بھی ایسے ہی۔ اُس روز کے بعد زیادہ نفری کی پٹرول پارٹیاں اِردگِرد کے جنگل میں، کچھ دُور دُور تک بھیجی گئیں۔ کوئی اور جاپانی نہ ملا لیکن پٹرول پارٹیوں کو روزانہ بھیجا جانے لگا اور رات کو بھی پٹرول پارٹیاں باہر بھیجی جاتی تھیں۔



ایک روز ہماری ایک کمپنی کی پچیس آدمیوں کی پٹرول پارٹی رات کو بھیجی گئی۔ اس کا کمانڈر ایک جمعدار (نائب صوبیدار) تھا۔ اُس کے ساتھ ایک حوالدار اور دو نائیک بھی تھے۔ یہ ہماری بٹالین کی بی کمپنی تھی جو ہندوؤں کی کمپنی تھی۔ اس میں ایک بھی مسلمان یا سکھ نہ تھا۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ بٹالین میں دو مسلمان کمپنیاں ہوتی تھیں، ایک ہندو اور ایک سکھ کمپنی۔

ہندو کمپنی کی پچیس نفری کی پٹرول پارٹی رات کو نکلی اور ڈیڑھ دو گھنٹے گزرے ہوں گے کہ ہمیں کمپنی سے تقریباً" تین میل دُور فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ مجھے وہ رات اچھی طرح یاد ہے۔ ساری بٹالین جاگ اٹھی تھی۔ تین میل خاصا فاصلہ ہوتا ہے جہاں سے فائر کی آواز کم ہی آنی چاہئے تھی لیکن وہ کوئی شہر نہیں تھا، جنگل بیابان تھا۔

رات خاموش تھی اور اس خاموشی میں تین میل دور کے دھماکے ہمیں سنائی دے رہے تھے۔ ہم فوجی تھے اس لئے ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ اچھی خاصی جھڑپ ہو رہی ہے۔ مشین گنیں بھی فائر کر رہی تھیں۔ یہ مشین گنیں بھی تھیں، سٹین گنیں اور ٹامی گنیں بھی جنہیں سب مشین گن کہا جاتا تھا۔

بٹالین کیمپ میں رہتی تھی۔ افسروں کے خیمے بھی کیمپ میں تھے۔ ہمارا کمانڈنگ آفیسر جاگا اور وہ کیمپ میں یعنی جوانوں کے خیموں کے علاقے میں آ گیا۔ اُس کے ساتھ صوبیدار میجر بھی تھا اور دو تین انگریز افسر بھی۔ پوری پلٹن کو تیاری کا حکم مل گیا۔

میں تو یہ نہیں بتا سکتا کہ کمانڈنگ آفیسر نے کیا کارروائی کرنی تھی، یہ پتہ چلتا تھا کہ بٹالین کو اس طرف ایڈوانس کرنا پڑے گا جدھر سے گولیوں کی آواز آ رہی تھی۔ انگریز افسر تو جانتے ہی ہوں گے کہ یہ کیا ہو رہا ہے، ہم نہیں جانتے تھے۔ اگر ہم کچھ جانتے بھی تھے تو اتنا ہی تھا کہ چھُپے ہوئے جاپانی ہوں گے اور ان کی تعداد زیادہ ہو گی اور انہوں نے ہماری پٹرول پر فائر کھول دیا ہے۔

چونکہ بٹالین کو تیاری کا حکم ملا تھا اس لئے کیمپ میں ہڑبونگ سی مچ گئی۔ اب اس کیمپ کے شور شرابے میں دُور کی فائرنگ کی آواز کم سنائی دینے لگی۔ کچھ دیر بعد ہماری ایک مسلمان کمپنی کو حکم ملا کہ وہ ایڈوانس کرے اور اُس جگہ پہنچے جہاں فائر ہو رہا ہے۔

یہ میری کمپنی تھی.... اے کمپنی.... میں اس کمپنی کے ساتھ نہیں گیا تھا کیونکہ میں حوالدار کلرک تھا۔ صوبیدار محمد اشرف اور حوالدار امیر خان اسی کمپنی میں تھے۔ جب یہ کمپنی روانہ ہوئی تو ہمارے کان ابھی تک فائرنگ کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ کیمپ کے شور کی وجہ سے آوازیں تو دب گئی تھیں لیکن ہم یہ محسوس کر رہے تھے کہ فائر کم ہوتا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوتا جا رہا تھا کہ فائرنگ کچھ قریب آ گئی ہے یا آتی جا رہی ہے۔

ہماری مسلمان کمپنی چلتے ہوئے نہیں بلکہ دوڑتے ہوئے روانہ ہوئی تھی۔ تقریباً" ایک گھنٹے بعدِ ایک بار پھر بے ہنگم فائر ہونے لگا اور اب یہ فائر خاصا قریب تھا۔ ہم نے روشنی راؤنڈ فائر ہوتے بھی دیکھے۔ ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ جو کچھ بھی ہے، کیمپ سے کوئی زیادہ دُور نہیں۔ روشنی راؤنڈوں کی روشنی ہمیں صاف دکھائی دیتی تھی۔

رات کے غالباً" تین بج رہے ہوں گے کہ فائر بالکل ہی خاموش ہو گیا اور ہماری

اگلی صبح پوری بٹالین کو ایڈوانس کا حکم ملا۔ اُس روز میں بھی بٹالین کے ساتھ گیا۔ قریب ہی سے بڑا گھنا جنگل اور پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ پہاڑیاں اونچی نہیں تھیں بلکہ انہیں ٹیکریاں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔

جنگل میں جا کر بٹالین کو جنگی ترتیب میں پھیلا دیا گیا تھا۔ ہراول کمپنی آگے نکل گئی تھی اور ریئر گارڈ پیچھے تھی۔ مختصر یہ کہ کمپنی جنگی ترتیب میں جا رہی تھی۔ جنگل میں جا کر ہر طرف دیکھا گیا یعنی تلاشی لی گئی' وہاں کچھ بھی نظر نہ آیا سوائے چند ایک انسانی ہڈیوں کے ڈھانچوں کے۔ یہ پہلی لڑائیوں میں مارے ہوئے جاپانی یا ہندوستانی سپاہیوں کے ڈھانچے تھے۔ کمپنی شام کے وقت واپس آ گئی۔

○

دو روز بعد پوری بٹالین کو فال اِن کیا گیا اور ہمارے انگریز کرنل نے تقریر کی۔ یہ لوگ اردو بڑی اچھی طرح بول سکتے تھے۔ ہمارے کرنل نے پوری بٹالین کو بتایا کہ یہ کیا قصہ ہے۔ یہ تو میں پہلے ہی آپ کو بتا چکا ہوں کہ یہ قصہ کیا تھا۔ سرکاری طور پر ہمیں کیمپ میں یہ بتایا گیا کہ یہ انڈونیشیا کے لوگ ہیں۔ اور وہ ہمارے خلاف لڑ رہے ہیں۔

کرنل نے یہ تو نہ کہا کہ وہ آزاد رہنا چاہتے ہیں' اُس نے کچھ اس قسم کے الفاظ کہے جیسے یہ لوگ ڈاکو اور لٹیرے ہیں اور کسی کی حکومت پسند نہیں کرتے' اور اگر انہیں کھلی چھٹی دی گئی تو یہ فوج کے گوداموں میں سے راشن اور ایمونیشن اور ہتھیار بھی اٹھا کر لے جائیں گے۔

یہ یاد آیا کہ قبائلی پٹھانوں کے متعلق بھی انگریز اسی قسم کی باتیں کیا کرتے تھے کہ یہ لوگ لٹیرے ہیں جو حملے کر کے رائفلیں اور ایمونیشن اٹھا کر لے جاتے اور اِدھر اُدھر فروخت کرتے ہیں۔ یہ تو ہم مسلمان جانتے تھے کہ قبائلی پٹھان فرنگی کی حکومت کو قبول نہیں کرتے تھے۔ ہم انگریز کرنل کی بات سمجھ گئے اور پتہ چل گیا کہ انڈونیشیا کے مسلمان اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ فوج کا ڈسپلن بڑا ہی سخت ہوتا ہے جس میں ایک حکم یہ ہوتا ہے کہ فوجی اب شہروں' قصبوں یا دوسری آبادیوں میں گھوم پھر نہیں سکتے لیکن ان علاقوں میں جا کر انگریزوں نے فوجیوں کو کھلی چھٹی دے دی تھی کہ وہ شہروں میں جا کر لوگوں سے ملیں ملائیں اور ان میں گھومیں پھریں۔ میں نے یہ بھی بتایا ہے کہ بعد میں پتہ

چلا کہ فوجیوں کو کھلی چھٹی کیوں دی گئی تھی۔ وہ اس لئے کہ فوجی ان مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کا اخلاق تباہ و برباد کر دیں اور ان کی عزت اور آبرو کو کچل اور مَسل کر رکھ دیں۔ میں دوبارہ تفصیلات سنانا نہیں چاہتا' صرف یہ یاد دلاؤں گا کہ ولندیزی عورتوں نے اپنی عزت اور آبرو صرف راشن پانی' سگریٹ اور شراب کی خاطر فوجیوں کے حوالے کر دی تھی لیکن مسلمان لڑکیوں کا کردار الگ تھلگ تھا اور وہ پوری طرح اپنے وقار میں رہتی تھیں۔

میں نے یہ بات اس لئے دہرائی ہے کہ ایک طرف ہماری پیٹرول پارٹی پر مقامی لوگوں نے حملہ کیا اور دوسری طرف ہمیں اجازت دے دی گئی کہ ہم قریبی قصبے میں جایا کریں اور ان لوگوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کریں۔ انگریز دراصل بڑی ہی خونریز جنگ لڑ چکے تھے اور اب وہ یہ طریقہ آزمانا چاہتے تھے کہ فوج وہاں کے شہریوں کو دوست بنائے اور دشمنی ختم ہو جائے اور وہاں کے مسلمان آزادی سے دستبردار ہو جائیں۔

کچھ ہی دنوں بعد عید الفطر آ گئی۔ ہمیں توقع تھی کہ ہمیں نماز کیمپ میں ہی پڑھنی پڑے گی اور ہم قصبے میں نہیں جا سکیں گے لیکن انگریز کرنل نے بڑی ہی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا اور کہا کہ مسلمان قصبے میں جا کر نماز پڑھیں اور عید منائیں۔

ہم تمام مسلمان عید کی صبح نہا دھو کر قصبے میں چلے گئے۔ ہمارے پاس کوئی سویلین کپڑا نہیں تھا' وردیاں دھو لی تھیں اور وہی پہن کر چلے گئے تھے۔ قصبے میں وہاں کے لوگ ہمیں مسکرا مسکرا کر دیکھتے تھے اور آگے بڑھ کر ہاتھ ملاتے تھے۔ وہ اپنی زبان میں ہمیں عید مبارک کہتے تھے لیکن ہم نے دیکھا کہ ان میں سے کچھ لوگ جھجکتے تھے اور ہمارے قریب نہیں آتے تھے۔ غالباً" وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہم مسلمان نہیں اور سیر سپاٹے کے لئے قصبے میں آئے ہیں لیکن انہوں نے جب دیکھا کہ ہم سب مسجد میں داخل ہو گئے ہیں تو انہیں معلوم ہُوا کہ ہم تو مسلمان ہیں۔

ان میں چند ایک انڈونیشی ایسے تھے جو ٹوٹی پھوٹی اردو بول سکتے تھے۔ وہ خوشی کا اظہار کرتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں۔

اسلام کا رشتہ بھی کتنا پیارا اور کتنا مضبوط ہے۔ نماز بالکل اسی طرح پڑھی گئی جس طرح ہم اپنے گاؤں میں پڑھا کرتے تھے۔ یوں لگا جیسے میرے گاؤں اور اس قصبے کے درمیان ایک انچ کا فاصلہ نہیں۔

امام نے خطبہ پڑھا اور پھر اُس نے اپنی زبان میں وعظ شروع کر دیا جس کا ایک لفظ بھی ہم نہ سمجھ سکے۔ صرف ایک لفظ سمجھ میں آتا تھا اور یہ تھا مردیکا۔ ہم یہ خطبہ تبرک سمجھ کر سنتے رہے۔

امام منبر سے ہٹ گیا اور اس نے اگلی صف میں بیٹھے ہوئے ایک آدمی سے کوئی اور اشارہ کیا۔ وہ آدمی ادھیڑ عمر تھا اور انڈونیشی تھا۔ وہ منبر پر چڑھنے کی بجائے منبر کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور اُس نے اُردو میں تقریر شروع کر دی۔ وہ اپنے لب و لہجے میں بولتا تھا اور کہیں کہیں وہ بولنے میں دشواری سی محسوس کرتا تھا۔ وہ زیادہ تر ہم سے یعنی فوجیوں سے مخاطب تھا۔

اس نے وہی باتیں کہیں جو میں پہلے آپ کو تمہید کے طور پر سنا چکا ہوں۔ اُس نے لوگوں کو اپنی تاریخ سنائی اور کہا کہ ولندیزیوں نے انہیں کس طرح غلام بنا کر رکھا تھا اور جاپانیوں نے ان پر یہ کرم کیا کہ انہیں ہتھیار بھی دیئے اور جنگی ٹریننگ بھی دی اور اب جب کہ جاپانیوں کو شکست ہو گئی ہے تو یہ کفار یعنی امریکہ' برطانیہ اور ولندیزی ان کی زمین پر قبضہ کر کے انہیں غلام بنانا چاہتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان کسی کا غلام نہیں ہو سکتا اور مسلمان کسی کو غلام بنایا بھی نہیں کرتا۔

اُس نے اعلانیہ کہا کہ کچھ دن پہلے ہمارے مجاہدین نے اس پلٹن کی ایک پارٹی پر شب خون مارا ہے جو ہمارے قصبے کے ساتھ کیمپ لگائے ہوئے ہے۔ اُس نے اس شب خون کے شہیدوں کو خراجِ تحسین پیش کیا اور کہا کہ تمام انڈونیشی روایت کو زندہ رکھیں اور ان کے نقشِ قدم پر چلیں۔

پھر اس نے کہا کہ ہمیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ اس پلٹن میں مسلمان بھی ہیں اور آج وہ مسلمان اس مسجد میں اللہ کے حضور سجدہ کرنے آئے ہیں۔ اُس نے بڑے ہی پُراثر اور خوبصورت الفاظ کہے۔ اُس نے کہا کہ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ ہمارا اللہ ایک ہے اور ہم سب اُسی کے آگے سجدہ کرتے ہیں اور ہمارا قرآن بھی ایک ہے جس پر ہم سب مل کر عمل کرتے ہیں اور پھر اللہ نے جو رسولؐ ہماری رہنمائی کے لئے اتارا تھا وہ بھی ہم سب کے لئے ایک ہے۔ اسی طرح ہمارا جذبہ اور مقصد بھی ایک ہونا چاہئے۔

یہ آدمی جو تقریر کر رہا تھا' بعد میں پتہ چلا کہ امام کے خطبے کی ترجمانی کر رہا تھا اور وہ امام کا خطبہ ہمیں یعنی فوجیوں کو سنا رہا تھا۔ پھر کہا' آپ لوگ یعنی ہم ہندوستانی' انگریزوں

کے غلام ہیں اور انگریز ہمیں یہاں مسلمان بھائیوں کے خلاف لڑنے کے لئے لایا ہے۔ اُس نے کہا کہ مسلمان قرآن کی رُو سے بھائی بھائی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھاتے اور جو مسلمان اپنے بھائی کے خلاف ہتھیار اٹھاتا ہے وہ جہنمی ہوتا ہے۔ اس موقع پر تقریر کرنے والے نے قرآن پاک کی ایک آیت پڑھی اور پھر تین احادیث بھی سنائیں۔

اُس نے کہا کہ انہیں پہلی دفعہ پتہ چلا ہے کہ اس پلٹن میں مسلمان بھی ہیں۔ اُس نے کہا' ہم آپ سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ ہمارے دوش بدوش آ کر لڑیں لیکن اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام پر یہ توقع رکھیں گے کہ جہاں کہیں آپ لوگ ہمارے مجاہدین کے آگے آ جائیں تو ایک دوسرے پر گولی نہ چلائیں۔

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے آدمی آپ پر گولی نہیں چلائیں گے' آگے آپ کا اپنا دین ایمان ہے کہ ہمارے مجاہدین کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔

ہمارے ایک سپاہی نے اچانک بڑی زور سے بلکہ پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر نعرہ لگایا' نعرۂ تکبیر۔ ہم تمام فوجیوں نے توپوں کے دھماکوں کی طرح اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ جس نے یہ نعرہ لگایا تھا وہ سفید اَن پڑھ تھا۔ وہ جذبہ تو مسلمانوں والا رکھتا تھا' یہی وہ بات تھی جو اس کے پلّے پڑ گئی تو وہ بم کی طرح پھٹا۔ اس نعرے سے وہاں جتنے انڈونیشی مسلمان تھے' چونک اٹھے۔

امام اپنی زبان میں جب خطبہ دے رہا تھا تو وہ بار بار مردیکا کہتا تھا۔ اُس کے خطبے کی ترجمانی کرنے والے اس ادھیڑ عمر انڈونیشی نے بتایا کہ ان کا نعرہ ہے مردیکا جس کا مطلب ہے آزادی اور پھر ان کا دوسرا نعرہ ہے ——— "مسلم سمہ سمہ" ——— جس کا مطلب ہے کہ مسلمان ایک ہیں۔

اس انڈونیشی حریت پسند کی تقریر خاصی لمبی تھی۔ میں نے اس کا لبِ لباب سنایا ہے۔ اس نے جب اپنی تقریر ختم کی تو ہم جو فوجی تھے ان میں کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ صوبیدار محمد اشرف نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا کہ ہمارا فرض ہے کہ ان لوگوں کو یقین دلائیں کہ ہم ان پر گولی نہیں چلائیں گے لیکن اپنی ڈیوٹی پوری کریں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم گولی تو چلائیں گے لیکن نشانے نہیں باندھیں گے اور ہماری گولیاں درختوں سے گزریں گی۔ صوبیدار اشرف نے میرے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی چونکہ تم تعلیم یافتہ ہوں

اس لئے منبر کے پاس جا کر ان لوگوں کو یقین دلاؤ کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں لیکن ہماری
مجبوری یہ ہے کہ ہم فوج سے بھاگ کر ان کے پاس نہیں آ سکتے۔

میں نے کبھی تقریر نہیں کی تھی لیکن اس وقت جذبات میں ایسا تاثر پیدا ہو گیا تو
میں اٹھا اور منبر کے پاس جا کھڑا ہُوا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں اتنے بڑے مجمعے سے خطاب
کرنے لگا تھا۔ میری تو زبان ہکلانے لگی تھی لیکن جذبہ ایسا بیدار ہُوا کہ میں نے بولنا
شروع کر دی۔ میں ضروری نہیں سمجھتا کہ اپنی ساری تقریر بیان کروں، صرف یہ
ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے انڈونیشی مسلمانوں سے کہا کہ ہم اسلام کے رشتے کی
پوری طرح لاج رکھیں گے اور ان کی جس قدر مدد کر سکتے ہیں کریں گے، جانیں بھی
قربان کر دیں گے۔ اس طرح کچھ باتیں کر کے میں ایک نہایت ضروری بات پر آیا۔ میں
نے انہیں کہا کہ ہم انگریزوں کے ملازم ہیں اور ان کے بنائے ہوئے قانون کے پابند
ہیں۔ میں یہ جو باتیں کر رہا ہوں یہ اپنے ان تمام بھائیوں کی طرف سے کر رہا ہوں۔ میں
آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ کسی کو اس کا پتہ نہ چلے کہ ہم نے آپ کے ساتھ
باتیں کی ہیں۔ اگر ہندوؤں اور سکھوں تک یہ بات پہنچ گئی تو وہ افسروں کو بتا دیں گے
پھر ہمیں سزا ملے یا نہ ملے یہ ضرور ہو گا کہ ہم پر پابندیاں عائد کر دی جائیں گی۔ آپ کے
ساتھ ہمارے وعدے اللہ اور اللہ کے اس گھر کے نام پر ہیں۔

میں مختصر سی تقریر کر کے بیٹھ گیا تو وہی ادھیڑ عمر انڈونیشی پھر اٹھا جس نے اُردو میں
امام کا خطبہ ہمیں سنایا تھا۔ اُس نے انڈونیشی زبان میں لوگوں سے کچھ بات کی۔ ہم سمجھ
گئے کہ وہ انڈونیشی مسلمانوں کو میری باتیں سنا رہا ہے۔ اُس نے بات ختم کی تو مسجد میں
انڈونیشی جیسے ہم پر ٹوٹ پڑے ہوں۔ بڑے ہی جذباتی انداز سے وہ ہمیں گلے لگاتے اور
خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ ہم جب مسجد سے نکلے تو ایک ایک آدمی کو تین تین چار
انڈونیشی اپنے گھروں کو لے جانے کے لئے گھسیٹ رہے تھے لیکن ہم میں سے کوئی بھی
کسی کے ساتھ نہیں جا رہا تھا۔ ہم ڈرتے تھے کہ ان لوگوں کے ساتھ ہمارے بھائی
چارے کی خبر انگریز افسروں تک پہنچ گئی تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ ہمیں انگریز
افسروں نے ہی اجازت دی تھی لیکن ہمیں ضرورت سے زیادہ محتاط ہونا چاہئے تھا۔

میں نے بعد میں سنا تھا کہ ایک اور شہر میں بھی مسلمانوں کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ
عید کی نماز جامعہ مسجد میں پڑھ سکتے ہیں۔ وہ شہر غالباً "سوکابومی" تھا۔ وہاں بھی انڈین آرمی

...پلٹنیں تھیں۔ میں نے سنا تھا کہ اُس علاقے کے انڈونیشی گورنر
...انفنٹری
...یا کسی بڑے افسر نے مسجد میں تقریر کی تھی اور اُس نے آزادی کے جذبے اور
...کے بھائی چارے کے موضوع پر تقریر کی تھی۔ اُس نے ایسی بات نہیں کی تھی
...آرمی کے مسلمان ان کی مدد کریں لیکن اُس کی تقریر سے انڈین آرمی کے
...جو اس مسجد میں گئے تھے اتنے زیادہ متاثر ہوئے تھے کہ انہوں نے طے کر لیا تھا
...انڈونیشی حریت پسندوں کی ہر طرح سے مدد کریں گے۔
...نے کہا ہے کہ جامعہ مسجد میں تقریر کرنے والا گورنر تھا یا کوئی بڑا افسر، اس سے
...سمجھ لیں کہ انڈونیشیا کے عوام صرف جنگِ آزادی ہی نہیں لڑ رہے تھے بلکہ انہوں
...باقاعدہ حکومت قائم کر رکھی تھی جس میں گورنر بھی تھے اور ان سے چھوٹے افسر
...یعنی وہ ایک منظم اور باقاعدہ حکومت تھی جو ہر ترقی یافتہ ملک کی طرح چلائی جا رہی
...یہ امریکہ اور برطانیہ کی دھاندلی تھی کہ وہ ان لوگوں کی آزادی سلب کرنا چاہتے

...ہم مسجد سے کچھ دُور نکل آئے تو ہمارے جمعداروں اور صوبیداروں نے ہم سب
...کہا کہ ہم مسجد میں بیٹھے تھے اور یہ لوگ اللہ اور رسولؐ کا نام لے رہے تھے۔ ہم بھی
...مسلمان ہیں اس لئے ہمیں یہی کہنا اور کرنا چاہئے تھے جو ہم نے مسجد میں کیا لیکن
...لوگ احتیاط کرنا کہ بیرکوں میں بیٹھ کر ڈھینگیں نہ مارنا کہ ہم پکے مسلمان ہیں اور
...نیشی مسلمانوں کے خلاف نہیں لڑیں گے۔ ہمارے ایک صوبیدار نے چلتے چلتے اس
...موضوع پر تقریر کر ڈالی۔
...فوج میں ایک خرابی تھی جو آج کل بھی موجود ہے۔ یہ ہے خوشامد اور غیبت۔
...روں کو خوش کرنے کے لئے بعض عہدیدار اور جے سی او صاحبان ان کی خوشامد کرتے
...اور دوسروں کے خلاف غیبت کا ارتکاب بھی کرتے ہیں۔ انگریزوں کے زمانے میں
...یہ خامی بعض فوجیوں میں موجود تھی۔ زیادہ تر خوشامدی جمعدار، صوبیدار اور
...بیدار میجر ہُوا کرتے تھے۔ حوالدار وغیرہ ان جمعداروں صوبیداروں کی چاپلوسی میں
...رہتے تھے۔ یہ خوشامد ترقی کی خاطر ہُوا کرتی تھی۔ پھر جیسا کہ آپ جانتے ہیں،
...مسلمانوں میں غداری کے جراثیم موجود ہیں۔ ہمارے جوانوں میں زیادہ نہیں تو تھوڑے
...ایسے ضرور تھے جو مخبری کر کے اوپر والوں کی خوشنودی حاصل کرتے تھے۔

"میری ایک بات کان کھول کر سب سن لو" — صوبیدار محمد اشرف نے
"میں جانتا ہوں ہم میں غدار بھی موجود ہیں جو مخبری کریں گے۔ میں ان لوگوں کو
دیتا ہوں کہ کسی کے متعلق پتہ چل گیا کہ اس نے مخبری کی ہے تو اسے غائب کر
گا یا جب کبھی ہم گوریلوں کے خلاف باہر نکلے تو اسے گولی مار دی جائے گی"۔

"ایسے نہیں!" — ڈی کمپنی کے صوبیدار نذر شاہ نے رک کر کہا۔
یہیں رک جاؤ اور اللہ کو حاضر ناظر جان کر حلف اٹھاؤ کہ ایک دوسرے کے خلاف
نہیں کریں گے اور اوپر والوں تک یہ بات نہیں پہنچنے دیں گے"۔

سب سے پہلے صوبیدار نذر شاہ نے بلند آواز سے حلف اٹھایا اور پھر سب
وہ آنکھیں بند کر کے دھیان میں اللہ تعالیٰ کو رکھ کر یہ حلف اٹھائیں۔ سب نے
کہنے پر عمل کیا۔ اس کے بعد صوبیدار نذر شاہ نے کہا کہ تم لوگ غداری کر
کے قانون سے تو بچ جاؤ گے لیکن اللہ کی بے آواز لاٹھی سے نہیں بچ سکو گے۔

آج کل کے فوجی میری ان باتوں پر حیران ہو رہے ہوں گے اور ہو سکتا ہے
باتوں کو سچ ہی نہ مانیں کیونکہ اس طرح کی باتیں کرنا اور دشمن کے ساتھ درپردہ
کرلینا ایک سنگین جرم ہے جس کی کم از کم سزا دس سال ہے اور عمر قید بھی ہو سکتی
انگریزوں کے زمانے میں یہی سزا تھی۔ انڈونیشی مسلمان ہمارے بھائی تھے۔ یہ
جذبات کی آواز تھی لیکن انگریز انہیں دشمن کہتے تھے اور ہمارے لئے انڈونیشی
سرکاری طور پر دشمن تھے۔ ہم نے اپنے دشمن کے ساتھ جس طرح سمجھوتہ کیا
اسے جس مدد کا یقین دلایا تھا' یہ سنگین جرم نہیں تو اور کیا تھا۔ یہ غداری تھی۔
جانے کی صورت میں کورٹ مارشل تو ہونا ہی تھا۔

میں بتا رہا تھا کہ ہم ابتدا میں سمجھے کہ ہمیں جنگلوں کی تلاشی لینے کے لئے یہاں
گیا ہے تاکہ چھپے ہوئے جاپانیوں کو پکڑا جائے لیکن اب بالکل واضح ہو گیا کہ
انڈونیشی مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لئے یہاں لایا گیا ہے۔ میں آج بھی حیران
کہ انگریز افسروں نے ہمیں انڈونیشی مسلمانوں کے ساتھ ملنے ملانے کی اجازت
دے دی تھی۔ انگریز تو مسلمانوں کے معاملے میں خاصا حساس تھا۔ میرا خیال ہے
انڈونیشیا میں جا کر انگریز افسروں نے یہی غلطی کی جس کا انہیں خمیازہ بھگتنا پڑا۔

○

ب میں آپ کو کچھ واقعات سناتا ہوں۔ اس عید کے آٹھ دس روز بعد ہم نے
خبر ملی کہ جس جنگل میں انڈونیشی حریت پسندوں نے ہماری بٹالین کی پٹرول پارٹی پر
کہیں انہوں نے ایک گورا رجمنٹ کی کمپنی یا پلاٹون پر ایسا ہی حملہ کیا اور
بہت نقصان کر دیا تھا۔ وہ جگہ ہمارے کیمپ سے دس بارہ میل دُور تھی۔ یہ تو ایک خبر
جو ہم تک پہنچی۔ ایک دو روز بعد اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ وہ اس طرح کہ ہماری
کو حکم ملا کہ کل اس جنگل میں ایڈوانس ہو گا اور دوسری طرف سے گورا رجمنٹ
ہی۔

ہم سمجھ گئے کہ اس جنگل کو گھیرے میں لے کر فوج آگے بڑھے گی اور جنگل کی
لے گی۔ خیال تھا کہ انڈونیشی گوریلوں نے یہاں اپنا کوئی ٹھکانہ یا اڈہ بنا رکھا تھا۔
چونکہ دفتر میں کام کرتا تھا اس لئے میں نے بریگیڈ یا غالباً" ڈویژن ہیڈ کوارٹر کا آپریشن
دیکھ لیا۔ ایسے آرڈر خفیہ ہُوا کرتے تھے۔ میں نے ہی نہیں بلکہ دوسرے حوالدار
اس نے بھی یہ آرڈر دیکھا۔

میں نے صوبیدار محمد اشرف کو بتایا کہ ہماری بٹالین جس آپریشن پر جا رہی ہے یہ تو
بڑا آپریشن ہے اور اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ رائل ایئر فورس کے لڑاکا ہوائی جہاز
اس جنگل پر بمباری کریں گے۔ اس آپریشن کے لئے ہمیں تین چار روز جنگل میں
رہنا تھا۔

صوبیدار محمد اشرف نے کہا کہ یہ اطلاع شام سے پہلے پہلے اس قصبے میں پہنچ جانی
ہے تاکہ گوریلوں کا اگر وہاں کوئی اڈہ ہے تو وہ وہاں سے غائب ہو جائیں۔ اب سوال یہ
یہ اطلاع پہنچانے کے لئے کون جائے۔ میں نے کہا کہ میں جاؤں گا۔ قصبے میں
پر کوئی پابندی تھی ہی نہیں۔

میں دن کے پچھلے پہر قصبے میں چلا گیا اور مسجد میں جا عصر کی نماز پڑھی۔ مجھے مسجد
امام سے ملنا تھا یا اُس شخص سے جس نے عید کے روز امام کا خطبہ اُردو میں سنایا تھا۔
امام تھوڑی ہی دیر پہلے عصر کی نماز پڑھا کر جا چکا تھا۔ پانچ چھ انڈونیشی مسجد میں
تھے جنہوں نے بازو پھیلا کر میرا استقبال کیا تھا۔ ان میں کوئی ایک بھی میری زبان
سمجھتا تھا۔ میں نے اشاروں میں انہیں بتایا کہ میں امام سے ملنا چاہتا ہوں۔ ایک
میرے اشارے سمجھ گیا اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر چل پڑا۔

امام گھر پر مل گیا۔ میں اُس سے پہلی بار ذرا آزادی سے مل رہا تھا۔ مسجد م
روز اُس کے ساتھ جو ملاقات ہوئی تھی وہ عید ملنے تک ہی تھی۔ مجھے پتہ چلا
تھوڑی اردو جانتا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اُسے سمجھایا کہ میں اس شخ
چاہتا ہوں جو اُس روز مسجد میں اس کا ترجمان بنا تھا۔

امام نے اپنے چھوٹے بیٹے سے کہا تو وہ بچہ دوڑ پڑا اور پندرہ بیس منٹ
مطلوبہ شخص آ گیا۔ ان لوگوں نے میری بڑی ہی خاطر تواضع کی۔ میں نے اُ
بتایا کہ کل سے اس جنگل میں یہ آپریشن ہو رہا ہے اور رات ہی رات اپنے
اطلاع بھیج دیں کہ وہاں سے نکل جائیں۔

میں بس اتنا سا پیغام دے کر وہاں سے آ گیا۔

اصل آپریشن تو گورا رجمنٹ نے کرنا تھا کیونکہ گوریلوں کے متعلق جو اطلا
وہ اسی رجمنٹ کو ملی تھی۔ لڑاکا بمبار طیاروں کو گورا رجمنٹ نے ہی راہنمائی د
بمباری کرائی تھی۔ ہماری بٹالین کا کام یہ تھا کہ اپنی طرف سے اس جنگل کو گ
لے کر بھاگنے والے گوریلوں کا راستہ روکیں گے اور جس طرح گورا رجمنٹ
کے مطابق کوئی بھی کارروائی ضروری سمجھی گئی تو ہماری بٹالین کرے گی۔

چونکہ پوری بٹالین جا رہی تھی اس لئے میں بھی اپنی کمپنی کے ساتھ گیا۔
کمپنی کمانڈر کے ساتھ رہنا تھا۔

میں یہ سارا فوجی آپریشن بیان نہیں کروں گا۔ اس میں آپ کی دلچسپی کی
بات نہیں۔ سارا فوجی معاملہ تھا۔ میں نے ایسے آپریشن فرنٹیئر کے قبائلی علا
دیکھے تھے اور شامل بھی ہُوا تھا۔ وہاں تین چار بریگیڈ چھاؤنیوں سے نکلتے
عریض پہاڑی علاقے میں پھیل جاتے اور دُور تک نکل جاتے تھے۔ راستے میں
نظر آتا، اسے پکڑ لیتے یا گولی مار دیتے تھے لیکن قبائلی پٹھان کم ہی نظر آیا کر
وہاں انگریز یہ ظلم بھی کرتے تھے کہ جہاں کہیں قبائلیوں کی کھڑی فصل نظر آتی
کر دیتے تھے اور ان کے چھوٹے چھوٹے گاؤں تباہ بھی کر دیا کرتے تھے۔

انڈونیشیا میں فرنٹیئر والی بے آب و گیاہ پہاڑیاں تو نہیں تھیں، گھنا جنگل
آپریشن بھی اسی نوعیت کا تھا اور مجھے یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ یہ لوگ انڈونیشی
بستیاں اُجاڑ دیں گے۔ میں سوچتا تھا کہ انہوں نے یہاں بھی فرنٹیئر والی سکیم چلا

مسلمان ہیں، ان کا ردِ عمل کیا ہو گا۔

اگلے روز ہماری بٹالین جنگل میں پہنچ گئی اور جنگی ترتیب میں گئی۔ معلوم ہُوا کہ
دوسری طرف سے گورا رجمنٹ اور شاید کوئی اور بٹالین بھی گورا رجمنٹ کے ساتھ تھی۔
ساڑھے نو دس بجے تو چھ سات لڑاکا بمبار ہوائی جہاز آ گئے۔ انہیں گورا رجمنٹ نے
وائرلیس پر ٹارگیٹ بتایا ہو گا۔ ان ہوائی جہازوں نے فضا میں ایک چکر کاٹا اور ایک
دوسرے کے پیچھے غوطے میں آئے اور بم گرا کر آگے نکل گئے۔ جب سارے جہاز بم
گرا چکے تو وہ پھر غوطے میں آ کر مشین گنیں فائر کرتے آگے نکل گئے۔ اس طرح انہوں
نے اس جنگل میں اتنی آگ برسائی کہ وہاں کسی انسان کا زندہ رہنا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔

سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے ہماری بٹالین اور گورا رجمنٹ آمنے سامنے آ
گئیں۔ ان پلٹنوں نے پورا جنگل چھان مارا تھا اور یہ پورے جنگل میں پھیلی ہوئی تھیں۔
انہیں کوئی انڈونیشی گوریلا وہاں سے بھاگتا یا کہیں پوزیشن میں بیٹھا نظر نہ آیا۔

میں نے خود اپنی آنکھوں دیکھا کہ جہاں بم گرے تھے وہاں گہرے گڑھے پڑ گئے تھے
اور درخت جڑوں سے اُکھڑ گئے تھے۔ ایک بھیڑیا مرا ہُوا دیکھا اور ایک جگہ ایک جانور مرا
پڑا تھا جو میں نے دُور سے دیکھا وہ بکری جیسا لگتا تھا۔ بات مختصر یہ ہے کہ اس جنگل میں
سے اتنی بڑی فوج کو کچھ بھی نہ ملا۔ میں افسر تو نہیں تھا کہ مجھے راز کی باتیں بھی معلوم ہو
جائیں۔ یہ چار پانچ دنوں بعد معلوم ہوئیں۔ بات یہ تھی کہ اس جنگل میں واقعی انڈونیشی
گوریلوں نے اپنا اڈہ بنا رکھا تھا اور یہاں سے گوریلے گروہوں میں نکل کر مختلف
کارروائیاں کرنے جاتے تھے لیکن اُس روز وہاں ایک بھی گوریلا نہیں تھا۔ یہ بھی معلوم
ہوا کہ کچھ ایسے آثار اور نشانات ملے تھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ یہاں ان کا اڈہ تھا۔

سات آٹھ دن بعد میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ساتھ والے قصبے میں گیا اور پھر
مسجد کے امام اور اُس آدمی سے ملا۔ انہوں نے میرا شکریہ اس طرح ادا کیا جیسے میں کوئی
پیر و مُرشد تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ میں انہیں پہلے اطلاع نہ دے دیتا تو ان کے کم و
بیش دو سو تربیت یافتہ گوریلے مارے جاتے اور اُس رات چار پانچ کمانڈر بھی وہاں موجود
تھے جنہیں گوریلا جنگ لڑنے کا اور لڑانے کا بھی بھرپور تجربہ تھا۔ میری مخبری پر ان
گوریلوں کو بروقت اطلاع پہنچا دی گئی تھی کہ رات کو ہی وہاں سے نکل جائیں۔ چنانچہ وہ
صبح ہونے سے پہلے پہلے وہاں سے نکل گئے تھے۔ انگریزوں کا اتنا بڑا آپریشن ناکام رہا۔

○

سات دن گزر گئے تو ایک رات ہمارے کیمپ پر گوریلوں نے حملہ کر دیا۔ ہم جو مسلمان تھے بہت پریشان ہوئے کہ ان گوریلوں نے ہمیں پہلے نہ بتایا اور اچانک حملہ کر دیا ہے۔ ہمارے لئے اپنے دفاع میں لڑنا ضروری ہو گیا تھا لیکن لڑنے کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے مسجد میں ان کے امام سے جو وعدہ کیا تھا' اس کی خلاف ورزی ہوتی تھی اور پھر ہم نے حلف بھی اٹھایا تھا۔

حملہ ایسا نہیں تھا کہ گوریلے فائرنگ کر رہے تھے بلکہ وہ کیمپ میں گھس آئے تھے اور انہوں نے کیمپ کے اندر آ کر فائرنگ شروع کی تھی۔ ہم یہ دیکھ کر کچھ حیران ہوئے کہ گوریلے صرف ہندو اور سکھ کمپنی پر شب خون مار کر چلے گئے۔ مسلمان کمپنیوں کو بھی حکم ملا تھا کہ وہ گوریلوں کو گھیرا ڈال کر پکڑنے کی کوشش کریں۔ مسلمان کمپنیاں فوراً اُٹھی تھیں اور انہوں نے گھیرا ڈالنے کی کوشش کی بھی تھی لیکن گوریلے آدھا گھنٹہ بھی نہ ٹھہرے اور غائب ہو گئے۔ جتنی دیر وہ کیمپ میں رہے ان کا نعرہ "مردیکا" سنائی دیتا رہا۔

صبح معلوم ہُوا کہ ہماری بی کمپنی کے اکیس جوان مارے گئے ہیں اور تیس یا بتیس رائفلیں غائب ہو گئی ہیں۔ رات کو ہم لوگ رائفلیں اور سٹین گنیں اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ سکھوں کی کمپنی کے صرف سات جوان اور ایک نائیک مارا گیا تھا۔ ان دونوں کمپنیوں کے زخمیوں کی تعداد بھی خاصی زیادہ تھی۔ سکھوں کی کمپنی سے بھی دس بارہ رائفلیں غائب ہو گئی تھیں اور کچھ اور سامان بھی چلا گیا تھا۔

اس سے ہم نے اندازہ کیا کہ انڈونیشی گوریلے کس قدر دلیر اور بہادر ہیں اور کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ میں کہا کرتا تھا کہ انڈونیشی حریت پسندوں نے یہ شب خون ہمارے کیمپ پر مار کر ہمارے سر فخر سے اونچے کر دیئے ہیں۔ دونوں مسلمان کمپنیوں کے خیموں کی طرف انہوں نے دیکھا بھی نہیں۔

اس شب خون نے ایک مسئلہ کھڑا کر دیا۔ اس پر آپ بھی غور کریں۔ ہمارے کیمپ کی ترتیب یہ تھی کہ پہلے یعنی ایک طرف بی کمپنی کے خیمے تھے۔ یہ ہندوؤں کی کمپنی تھی۔ اس کے آگے ہماری یعنی اے کمپنی تھی۔ یہ مسلمان کمپنی کے خیمے تھے۔ اس سے آگے سی کمپنی کے خیمے تھے اور یہ کمپنی سکھوں کی تھی۔ اس سے آگے مسلمانوں کی ڈی کمپنی کے خیمے اور اس سے آگے بٹالین ہیڈ کوارٹر کے خیمے تھے۔ افسروں

کے خیمے اس کیمپ سے ذرا ہٹ کر تھے۔

انڈونیشی گوریلوں نے شب خون اس طرح مارا کہ بی کمپنی کے خیموں پر حملہ کیا اور پھر آگے مسلمانوں کی اے کمپنی کے خیموں کو چھوڑ دیا اور اس سے آگے سکھوں کی کمپنی کے خیموں پر ہلّہ بولا اور اس سے آگے مسلمانوں کی کمپنی کے خیموں کی طرف جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ گوریلوں نے مسلمانوں کو دانستہ چھوڑ دیا تھا اور ہندوؤں اور سکھوں پر حملہ کیا۔ ایک مسئلہ یہ بھی سامنے آیا کہ مسلمانوں کی دونوں کمپنیاں شور شرابہ سنتے ہی بیدار ہو گئی تھیں لیکن یوں لگتا جیسے انہوں نے دانستہ گوریلوں کے خلاف کارروائی نہیں کی۔ یہ دونوں کمپنیاں تیزی سے اٹھ کر کیمپ کو گھیرے میں لے سکتی تھیں تاکہ کوئی گوریلا نکل کر نہ جا سکے۔ روشنی راؤنڈ بے شمار فائر ہوئے تھے جن کی روشنی نے رات کو دن بنا دیا تھا۔ گوریلے صاف نظر آتے تھے لیکن ان پر فائر اس لئے نہیں کیا تھا کہ اپنے جوان اپنے ہی جوانوں کی گولیوں سے مارے جائیں گے۔

شب خون بڑی خطرناک کارروائی ہوتی ہے۔ کھلبلی مچ جاتی ہے اور جن پر شب خون مارا جاتا ہے' وہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ کیا کریں۔ اگر ایک گوریلا سامنے نظر آتا ہے تو اس پر سٹین گن فائر کی جائے تو اسے چھلنی کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے پیچھے اور دائیں بائیں اپنے جوان ہوتے ہیں جو اس فائر کی زد میں آ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ ہماری بٹالین پر پہلی بار اس قسم کا حملہ ہُوا تھا اور بٹالین کو ایسا حملہ روکنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ بہرحال یہ بات افسروں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ گوریلوں نے ہندوؤں اور سکھوں پر حملہ کیا اور مسلمانوں نے وہ جوابی کارروائی نہ کی جو انہیں کرنی چاہیئے تھی۔

ہم سمجھ گئے کہ گوریلوں کو کسی مسلمان نے پہلے بتا رکھا تھا کہ کیمپ میں ہم لوگ کس ترتیب میں رہتے ہیں۔ یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ انہیں یہ ترتیب کس نے بتائی تھی۔ اس کا پتہ چلانا ضروری بھی نہیں تھا اور پتہ چلانا چاہیئے بھی نہیں تھا کیونکہ بات جو منہ سے نکل جاتی ہے وہ غیروں تک بھی پہنچ جایا کرتی ہے.... میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ یہ کارنامہ کس کا تھا۔ بٹالین ہیڈ کوارٹر میں تحصیل چکوال کے کسی گاؤں کا رہنے والا ایک حوالدار غلام نبی ہُوا کرتا تھا۔ وہ چونکہ پڑھا لکھا تھا اس لئے اسے انٹیلی جنس سیکشن میں

رکھا گیا تھا۔ وہ ایک بار ساتھ والے قصبے میں گیا اور اس نے گوریلوں کو کیمپ کی ترتیب بتائی تھی اور انہیں کچھ اور باتیں بھی بتائی تھیں۔ یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ حوالدار غلام نبی نے ہی انہیں کہا تھا کہ وہ اس طرح شب خون ماریں۔ افسروں کو معلوم نہیں تھا کہ یہ کام حوالدار غلام نبی کا ہے۔

اگلے روز پوری بٹالین کو فال اِن کیا گیا اور ہمارے کمانڈنگ آفیسر نے ایک لیکچر دیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ بٹالین کے عہدیدار اور جوان اسلام کے رشتے کو استعمال کرنے کی کوشش نہ کریں۔ یہ ایک جرم ہے جس کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے۔ ہمارے کرنل نے صاف الفاظ میں تو نہ کہا کہ مسلمان انڈونیشی گوریلوں کے ساتھ خفیہ رابطہ رکھتے ہیں' اس کا مقصد اور مطلب یہی تھا۔ اُس نے مسلمانوں کا نام لئے بغیر دھمکی آمیز لیکچر دیا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ ایسا واقعہ پھر کبھی ہُوا تو بٹالین پر یہ پابندی عائد کر دی جائے گی کہ کوئی جوان کیمپ سے باہر نہیں جا سکتا۔ مسلمان قصبے کی مسجد میں جا کر نماز نہیں پڑھ سکیں گے۔

اس شب خون کا دوسرا اثر یہ ہُوا کہ بٹالین کے ہندو اور سکھ مسلمانوں کے خلاف ہو گئے اور وہ انڈونیشی مسلمانوں کو گالیاں دیتے تھے۔ خصوصاً" سکھ دھمکیاں دیتے تھے کہ وہ ان مسلمانوں سے اپنے جوانوں کے خون کا انتقام لیں گے۔ ہندو کمپنی میں بھی ایسا ہی غم و غصہ پیدا ہو گیا۔ بعض سکھ جوان مسلمان جوانوں سے کہتے تھے کہ اپنے ان مسلمان بھائیوں کو سمجھا دو ورنہ ہم ان کے قصبے پر حملہ کر دیں گے اور ان کی لڑکیوں کو اٹھا لائیں گے۔ مسلمان عام طور پر سکھوں کی یہ دھمکی سن کر ہنس پڑتے تھے۔

ظاہری طور پر تو ہم ہنس پڑتے تھے لیکن اندر سے ہم جل اٹھتے اور ہمارا خون کھولنے لگتا تھا۔ ہم اپنے غصے کا اظہار اس لئے نہیں کرتے تھے کہ ہم پر یہ شک نہ ہو جائے کہ ہمارے دلوں میں انڈونیشی مسلمانوں کی ذرا سی بھی ہمدردی ہے۔ ہم ہی جانتے ہیں کہ سکھوں کی یہ گالیاں جو وہ انڈونیشی مسلمانوں کو دیتے تھے' ہم کس طرح برداشت کرتے تھے۔ آخر ایک واقعہ ہو ہی گیا۔ وہ اس طرح کہ اس سکھ نائیک نے ایک روز انڈونیشی مسلمانوں کے خلاف ایسی ہی بات کہہ ڈالی۔ ہم چار پانچ آدمی وہاں کھڑے تھے۔ ایک میں تھا' دو اور جوان کھڑے تھے اور ایک یہی حوالدار غلام نبی تھا جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔ اس سکھ نائیک نے انڈونیشیا کی مسلمان عورتوں کے متعلق

ایسی ہی گندی بات کہی جو ولندیزی عورتوں کے متعلق مشہور تھی۔ یہ تو میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ ولندیزی عورتوں کا کردار کیا تھا اور وہ کس طرح اپنی عزت اور آبرو راشن' سگریٹ اور شراب کے چند گھونٹوں کے لئے پیش کر دیا کرتی تھی۔ اس سکھ نائیک نے کہا کہ یہاں کی مسلمان عورتیں بھی ایسی ہی ہیں۔ سکھ ہر بات بڑے ہی گندے الفاظ میں کیا کرتے تھے۔ اس سکھ نے مسلمان عورتوں کے متعلق بھی ایسے ہی ننگے الفاظ استعمال کئے۔ ہم حسبِ معمول ہنس پڑے لیکن میں نے دیکھا کہ حوالدار غلام نبی کے ہونٹوں پر جو ذرا سی مسکراہٹ تھی' وہ بھی غائب ہو گئی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا۔

اگلی صبح پتہ چلا کہ یہ سکھ نائیک لاپتہ ہے۔ رات کو وہ اپنے خیمے میں موجود تھا۔ آدھی رات کے وقت بھی اُسے دیکھا گیا تھا۔ فوج میں سورج نکلنے سے بہت پہلے پوری بٹالین جاگ اٹھتی تھی۔ اس وقت یہ سکھ خیمے میں نہیں تھا۔ اسے ہر طرف دیکھا گیا لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔

دن کے دو بج رہے تھے جب بٹالین کے دفتر میں یہ اطلاع پہنچی کہ سکھ نائیک کی لاش کیمپ سے تقریباً" ایک میل دور ایک کھڈ میں پڑی ہے۔ سکھوں کی کمپنی کا صوبیدار اور دو تین اور سکھ دوڑے گئے اور واپس آئے تو انہوں نے اس سکھ نائیک کی لاش اٹھا رکھی تھی۔ میں نے یہ لاش دیکھی تھی۔ اس کا پیٹ دائیں سے بائیں تک چاک کیا ہُوا تھا اور اس کی انتڑیاں وغیرہ باہر نکل آئی تھیں جنہیں ہاتھوں سے اٹھا کر پیٹ میں رکھا گیا تھا۔ پیٹ پر اُسی کی پگڑی باندھ دی گئی تھی تاکہ پیٹ کے اندرونی اعضاء پیٹ میں ہی رہیں۔

یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اسے کہاں مارا گیا اور اس کی لاش اتنی دور کیوں پھینکی گئی۔ اگر اسے کسی انڈونیشی حریّت پسند نے مارا ہوتا تو اس کی لاش کیمپ کے قریب ہی پڑی ہونی چاہئے تھی۔ اس سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا کہ یہ سکھ اتنی دور کیا کرنے گیا تھا کہ کسی انڈونیشی مسلمان کا شکار ہو گیا۔ باقاعدہ انکوائری ہو رہی تھی۔

اگلے روز کسی سپاہی کے منہ سے یہ بات نکل گئی کہ اُس نے اس نائیک کو حوالدار غلام نبی کے ساتھ رات کو فلاں جگہ کھڑے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ غلام نبی سے پوچھا گیا تو اُس نے صاف انکار کر دیا لیکن شک اُسی کے خلاف پکا ہو تا گیا۔ مجھے اب اچھی طرح یاد نہیں کہ اور کیسی شہادت اور سراغ ملے تھے جن سے یہ ظاہر ہو گیا کہ اس سکھ نائیک کو

حوالدار غلام نبی نے قتل کیا ہے۔

حوالدار غلام نبی کو باقاعدہ حراست میں لے لیا گیا۔ اب اُس کا کورٹ مارشل ہونا تھا اور ظاہر ہے کہ اُسے سزائے موت ملنی تھی۔ سزائے موت نہیں تو عمر قید تو کہیں نہیں گئی تھی۔ فوج میں کوئی سپاہی جرم کرے تو اسے کوارٹر گارڈ میں بند کر دیا جاتا ہے لیکن کوئی حوالدار ایسا جرم کرے کہ اسے گرفتار کرنا پڑے تو اسے بند نہیں کیا جاتا بلکہ ایک حوالدار اس کے ساتھ ا۔سکارٹ کے طور پر مقرر کر دیا جاتا ہے۔ اُس وقت اسے پیٹی قید کہا کرتے تھے' شاید آج کل بھی یہی کہتے ہوں۔ پیٹی قید کا مطلب یہ تھا کہ حراست کے دوران یہ حوالدار بیلٹ نہیں باندھ سکتا تھا۔

غلام نبی پر بھی ا۔سکارٹ مقرر کر دیا گیا۔ وہ ہر وقت خیمے میں رہتا تھا اور ایک حوالدار پر ڈیوٹی دیتا تھا۔ اگلے روز ایک اور حوالدار کو مقرر کر دیا جاتا تھا۔ کورٹ مارشل کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ابھی ابتدائی کارروائی کرنی تھی اور یہ کاغذات بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو جانے تھے جہاں سے کورٹ مارشل کے احکام ملنے تھے۔

پہلے دو دن جن حوالداروں نے غلام نبی پر ا۔سکارٹ ڈیوٹی دی' وہ مسلمان تھے۔ تیسرے روز ایک ہندو حوالدار کی ڈیوٹی لگی۔ اس حوالدار نے رات کو بھی غلام نبی کے ساتھ رہنا تھا۔ یہ چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی ہُوا کرتی تھی۔

صبح دیکھا کہ اس ہندو حوالدار کی لاش خیمے میں پڑی ہے اور غلام نبی لاپتہ ہے۔ غلام نبی دو سٹین گنیں اور جتنا ایمونیشن اس کے ہاتھ لگا' اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اب تو صاف پتہ چل گیا کہ سکھ نائیک کو بھی اُسی نے قتل کیا تھا اور اپنے ا۔سکارٹ حوالدار کو بھی قتل کر کے وہ بھاگ گیا ہے۔ سب جانتے تھے کہ وہ کہاں چلا گیا ہے۔ قتل کر کے یا کوئی اور سنگین جرم کر کے کوئی اس طرح فرار ہو جائے تو اس کے کہیں بھی پاؤں نہیں لگتے۔ ہر وقت اور ہر جگہ مخبری کا اور گرفتاری کا خطرہ لگا رہتا ہے اور آدمی بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ میں جس ملک کی بات کر رہا ہوں اور جو حالات پہلے سنائے ہیں' اس ملک اور ان حالات میں بھاگنے والے مسلمانوں کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ انڈونیشی مسلمان ایسے مسلمان فوجیوں کو جو اُن کے پاس پہنچ جاتے تھے' سر آنکھوں پر بٹھاتے اور دلی طور پر عزت اور احترام کرتے تھے۔

انگریز ایسا جرم بخشنے والی قوم نہیں تھی۔ غلام نبی ایک سکھ اور ایک ہندو کو قتل کر

کے بھاگا تھا۔ انگریز افسر جانتے تھے وہ کہاں گیا ہے۔ علی الصبح ہندو کی لاش خیمے میں دیکھ لی گئی تھی اور یہ بھی کہ غلام نبی لاپتہ ہے۔ اُسی وقت ہندو اور سکھ دونوں کمپنیوں کو فوری تیاری کا حکم ملا اور ان کمپنیوں کو قریبی قصبے کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ ہم نے دیکھا کہ قصبے کو دونوں کمپنیوں نے محاصرے میں لے لیا۔ وہ کوئی اتنا بڑا قصبہ نہیں تھا' یوں سمجھ لیں کہ ایک ذرا بڑا گاؤں تھا۔ چونکہ وہاں ساری آبادی مسلمانوں کی تھی اس لئے وہ صاف ستھرے رہنے والے لوگ تھے اور اپنی ہر حرکت سے تہذیب یافتہ لگتے تھے۔ تہذیب یافتہ نہ لگتے تو بھی وہ اپنا وقار قائم رکھنے والے اور وقار پر مر مٹنے والے لوگ تھے۔

شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلی پٹھان جب انگریزوں کے خلاف کبھی نہ ختم ہونے والی لڑائی لڑ رہے تھے تو ان کے ساتھ انگریزوں کا رابطہ رہتا تھا۔ وہاں پولیٹیکل ایجنٹ ہوتا تھا۔ اُس کے آدمی انگریزوں اور قبائلیوں کا رابطہ کرا دیتے تھے۔ اس رابطے کی ضرورت اس وقت پڑتی تھی جب کوئی انگریز افسر مارا جاتا اور اُس کی لاش پٹھان اٹھا لے جاتے تھے۔ انگریز قبائلیوں کے ساتھ رابطہ کرتے اور لاش اس طرح واپس لیتے تھے کہ پٹھان اس لاش کی نقد قیمت وصول کرتے تھے۔

بالکل ایسے ہی انڈونیشیا میں گوریلوں کے ساتھ انگریزوں اور امریکیوں کا رابطہ ہو جاتا تھا۔ ہماری دو کمپنیوں نے قصبے کو محاصرے میں لیا تو فوراً" حملہ نہیں کر دیا گیا یا یوں نہیں کہ قصبے میں داخل ہو کر ہر گھر کی تلاشی لی جاتی۔ خیال یہی تھا کہ حوالدار غلام نبی اسی قصبے میں ہے اور ابھی ابھی صبح ہوئی ہے اور وہ یہیں ہو گا۔ انگریز افسر خاصے محتاط تھے۔ انہوں نے قصبے کے بزرگوں کو باہر بلایا اور وہ آ گئے۔

بعد میں یہ باتیں ہمیں معلوم ہوئیں۔ انگریز افسروں نے اپنے آدمیوں کی معرفت بزرگوں کو بتایا کہ ایک حوالدار اس طرح دو آدمیوں کو قتل کر کے اس قصبے میں رُوپوش ہو گیا ہے۔ انہیں ہمارے افسروں نے کہا کہ اس حوالدار کو وہ خود ہی باہر نکال دیں ورنہ ہر گھر کی تلاشی لی جائے گی۔

انڈونیشی بزرگوں نے انگریز افسروں سے کہا کہ ہم اگر اتنے بزدل ہوتے تو آپ کے آگے آ کر غلاموں کی طرح سر جھکاتے اور آپ کو اپنا حاکم سمجھ کر خود ہی اپنے گھروں میں لے جاتے اور کہتے ہمارے گھروں کی تلاشی لے لو لیکن ہم ایک آزاد قوم ہیں اور

مسلمان بھی ہیں۔ اگر ہمارے پاس کوئی مسلمان پناہ لینے کے لئے آتا ہے تو ہم اسے اپنے اللہ کی امانت اور اپنا مہمان سمجھتے ہیں۔ ہم اپنی جانیں دے دیں گے لیکن وہ آدمی نہیں دیں گے جس نے یہاں پناہ لی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ انہیں معلوم نہیں کہ ان کا حوالدار اس قصبے میں آیا ہے لیکن وہ یہ بات صاف طور پر کہہ رہے ہیں کہ قصبے کی تلاشی کا خطرہ مول نہ لیں۔

انگریز بھی تو کوئی بزدل قوم نہیں تھی۔ انہوں نے پانچ سال جنگِ آزادی لڑی تھی اور جرمنی اور جاپان کو شکست دی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ امریکہ ان کے ساتھ نہ آملتا تو وہ فاتح نہ کہلا سکتے لیکن اب وہ فاتح تھے اور اس کے علاوہ وہ آدھی دنیا کے بادشاہ تھے۔ ہندوستان، برما، ملایا اور انڈونیشیا جیسے ملکوں کے لوگوں کو تو وہ پیدائشی غلام سمجھا کرتے تھے۔ وہ بھلا کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ اس قصبے کے لوگ انہیں اس طرح کا چیلنج دے رہے تھے کہ ان کا حوالدار یہاں ہے یا نہیں، وہ گھروں کی تلاشی نہیں لینے دیں گے۔

ایک تو انگریزوں کی یہ شاہانہ ذہنیت اور پھر جلتی پر تیل ڈالنے والا ایک انگریز میجر بھی تھا۔ وہ بی کمپنی یعنی ہندوؤں کی کمپنی کا کمپنی کمانڈر تھا۔ وہ طبعاً" بڑا ہی غصیلا آدمی تھا۔ اتفاق سے اس کا نام دیکھئے کیا تھا۔ نام تھا پِگ.... آر ڈبلیو پِگ.... یہ تو آپ جانتے ہیں کہ پِگ کا مطلب ہوتا ہے خنزیر۔ وہ غصے کا خنزیر ہی تھا۔ وہ جب غصے میں بات کیا کرتا تھا تو اس کے منہ سے تھوک اڑا کرتا تھا۔ اس نے جب انڈونیشی مسلمانوں کے بزرگوں کی یہ چیلنج نما بات سنی تو اُس کے غصے میں دھماکہ پیدا ہُوا اور وہ ان بزرگوں کو بڑی بے عزتی کے انداز میں ڈانٹنے لگا اور اُس نے یہاں تک حرکت کی کہ ایک بزرگ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے زور سے پیچھے دھکیلا اور وہ بزرگ پیچھے کو گر پڑا۔ یوں لگا جیسے بارود کے ڈھیر کو چنگاری دکھا دی ہو۔

ایک تو پانچ سات انڈونیشی جواں سال آدمی ساتھ تھے جن کے پاس جاپانی ساخت کی سٹین گنیں بھی تھیں اور رائفلیں بھی۔ ان میں سے کچھ نے اس انگریز میجر پر ہتھیار تان لئے اور دو تین نے اپنے نیفوں سے خنجر نکال لئے۔ ادھر قریبی مکانوں کی منڈیروں پر اچانک اس طرح آدمی اور عورتیں کھڑی نظر آئیں جیسے وہ سب جنّات تھے جو اچانک ظاہر ہو گئے تھے۔ ان سب نے منڈیروں کے پیچھے پوزیشنیں لی ہوئی تھیں۔ کسی نے انہیں للکار کر بتایا کہ ایک انگریز افسر نے ہمارے بزرگ کی بے عزتی کی ہے۔ وہ سب

اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان میں کم سن لڑکیوں سے لے کر بڑی عمر کی عورتیں تک بھی تھیں اور باقی سب مرد تھے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی بغیر ہتھیار کے نہیں تھا۔ میں آج بھی حیران ہوں کہ ان لوگوں نے انگریزوں پر فائر نہیں کھولا تھا۔ انڈونیشی ان انگریزوں اور امریکیوں کو تو برداشت ہی نہیں کرتے تھے۔ انگریزوں اور ہماری ان دو کمپنیوں کی خوش قسمتی تھی کہ جن لوگوں نے انگریز افسروں اور انڈونیشی بزرگوں کا رابطہ کرایا تھا، وہ درمیان میں آگئے اور خون خرابہ نہ ہُوا۔

اس قصبے کے بزرگوں نے ہمارے انگریز افسروں سے کہا کہ آبادی کو توپوں سے اُڑا دو اور یہاں کے بچے بچے کو مار ڈالو، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ فوج سے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب چکایا جائے گا۔ یہاں نہیں تو کہیں اور.... ہمارا کمانڈنگ آفیسر بھی ساتھ تھا۔ اُس نے اپنے کمپنی کمانڈر میجر پِگ کو ڈانٹ پلائی اور پیچھے ہٹا دیا۔ یہ اس انگریز کی ڈپلومیسی تھی۔ اگر وہ بھی غصے میں آجاتا تو وہاں صورت حال کچھ اور ہو جاتی۔ ہماری کمپنیاں ناکام واپس آگئیں۔

ہمیں اب یہ توقع تھی کہ قصبے میں جانے کی جو کھلی اجازت تھی وہ منسوخ کر دی جائے گی لیکن ایسا نہ ہُوا۔ یہ انگریز افسروں کی دانشمندی تھی اور یہ ان کی ڈپلومیسی تھی۔ غالباً" انہوں نے سوچا ہو گا کہ مسلمان جوانوں کو قصبے میں جانے سے روکا گیا تو ان کے دلوں میں تلخی پیدا ہو گی اور انڈونیشی مسلمانوں کی ہمدردی میں اضافہ ہو جائے گا۔ دراصل انگریز کسی اور ذہنیت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ یہ اس شیطان اور مُسلم کُش کی ایک بڑی گہری چال تھی۔ اس کا علم ہمیں یوں ہُوا کہ ہم لوگ اس قصبے میں جب بھی جاتے تو نماز کا وقت ہوتا تو نماز پڑھا کرتے تھے۔ وہاں نماز پڑھنے سے ہمیں دو فائدے ہوتے تھے۔ ایک تو وہ باقاعدہ مسجد تھی اور ہم سمجھتے تھے کہ مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب زیادہ ملتا ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ وہاں انڈونیشی مسلمانوں کے ساتھ ملاقات ہوتی تھی تو ہمیں بخدا روحانی خوشی میسر آتی تھی۔ ان میں جو اردو نہیں بولتے اور سمجھتے تھے وہ اشاروں میں اپنے جذبات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ دین کا رشتہ زبان کا پابند نہیں ہوتا۔ یہ ایسا رشتہ ہے جو الفاظ میں اور زبان سے بیان کیا ہی نہیں جا سکتا۔ دل سے دل مل جاتے ہیں اور پھر مسکراہٹیں اور آنکھیں اپنا مدعا بیان کرتی ہیں۔ مجھ پر یہی کیفیت وہاں جا کر طاری ہو جایا کرتی تھی۔

ایک روز عصر کے وقت میں اور حوالدار امیر خان اور ایک انڈونیشی ہمارے ساتھ تھا' قصبے کی مسجد میں گئے اور عصر کی نماز وہاں پڑھی۔ اتفاق سے وہاں وہ آدمی مل گیا جس نے عید کے روز امام کا خطبہ ہمیں اردو میں سنایا تھا۔ وہ ہم تینوں کو مسجد کے اندر لے گیا۔ اندر کا مطلب ہے اندرونی کمرے میں۔ اُس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کوئی راز کی بات کرے گا۔

بات واقعی راز کی تھی اور بڑی ہی خطرناک بات تھی۔ اُس نے کہا کہ وہ میرے ہی انتظار میں تھا۔ مجھے وہ اس لئے قابلِ اعتماد اور معزز سمجھتا تھا کہ میں نے عید کے روز مسجد میں تقریر کی تھی۔ یہ بات تو وہ کسی اور کو بھی بتا سکتا تھا لیکن احتیاط کو لازم سمجھتا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہاں دو تین آدمی ایسے ہیں جو ہیں تو اس قصبے کے مسلمان ہی لیکن ان کے متعلق شک کیا جا رہا ہے کہ وہ درپردہ انگریزوں کے جاسوس اور مخبر ہیں۔ ان لوگوں نے بڑی استادی سے قصبے میں یہ افواہ پھیلا دی ہے کہ ہماری بٹالین کے جو مسلمان ہیں وہ اس قصبے کے مسلمانوں کے خلاف ہو گئے ہیں اور کسی بھی روز یہ بٹالین مسلمان کمپنیوں سے قصبے پر حملہ کروائے گی۔ پروپیگنڈے میں یہ بھی کہا گیا کہ امریکیوں اور ولندیزیوں نے مسلمانوں کی ان کمپنیوں کو بہت پیسہ دیا ہے اور اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ یہاں کے لوگوں نے اس بات کو سچ مان لیا ہے؟.... اُس نے بتایا کہ زیادہ تر لوگوں نے اسے سچ نہیں مانا لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جو اسے سچ سمجھتے ہیں۔ اُس نے خطرے کا اظہار کیا کہ یہ لوگ جو اسے سچ سمجھتے ہیں دوسروں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

میں نے اسے بتایا کہ ہم مسجد میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مسجد میں کوئی مسلمان جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اگر بولے گا تو اسے دنیا میں ہی سزا ملے گی۔ میں نے اور پھر حوالدار امیر خان نے اسے کہا کہ وہ تمام آبادی سے کہہ دے کہ تم لوگ انگریزوں کو نہیں جانتے۔ یہ بڑی چالباز قوم ہے اور اس قوم نے آدھی دنیا پر اپنی بادشاہی جو قائم کر رکھی ہے' یہ سب اس کی چالبازی کا نتیجہ ہے۔ اس انڈونیشی معزز آدمی نے کہا کہ وہ تعلیم یافتہ ہے اور انگریزوں کی فطرت سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ تب میں نے اسے کہا کہ پھر اسے یقین کر لینا چاہئے کہ انگریز یہ ایک چال چل رہے ہیں جس سے وہ یہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں کہ اس بٹالین کے مسلمانوں اور اس قصبے کی آبادی کے درمیان عداوت پیدا ہو جائے۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ تب میں نے اُسے کہا کہ وہ ان آدمیوں کو جانتا ہے جن پر شک ہے کہ وہ انگریز کے ایجنٹ ہیں تو انہیں آبادی سے نکال کیوں نہیں دیتے۔ ایسے لوگ تو غدار ہوتے ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ کام بھی کر دیا جائے گا لیکن تھوڑی سی دشواری یہ ہے کہ وہ ذرا اونچی حیثیت کے لوگ ہیں اس لئے ان کے خلاف سوچ سمجھ کر کارروائی کریں گے۔ میں نے اسے کہا کہ کارروائی کریں یا نہ کریں' لوگوں کو یہ بتا دیں کہ ہماری بٹالین کا کوئی ایک بھی مسلمان ایسا نہیں جس کے دل میں انڈونیشی مسلمانوں کے خلاف کوئی وہم یا شک ہو۔

اللہ کا شکر ہے کہ یہ غلط فہمی پیدا ہوتے ہوتے رہ گئی۔



کیمپ میں واپس آ کر ہم نے یہ بات اپنے دو تین صوبیداروں کو بتائی اور پھر یہ بات حوالدار میجروں اور حوالداروں تک پہنچی اور طے کیا گیا کہ زبانی کلامی اپنے تمام مسلمان جوانوں کو بتا دیا جائے کہ انگریز اس ساتھ والی آبادی میں یہ پروپیگنڈہ کر رہا ہے۔ کچھ دن اور گزر گئے تو میں اپنے تین چار ساتھیوں کے ساتھ ایک روز پھر قصبے میں گیا اور مسجد میں جا کر نماز پڑھی۔ نماز پڑھ چکا تو ایک جوان سال انڈونیشی میرے ساتھ لگ کر آ بیٹھا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا تو اُس نے مسکرا کر سر سے اشارہ کیا کہ میں اُس کے ساتھ چلوں۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے؟ اُس کی مسکراہٹ اور زیادہ پھیل گئی اور اُس نے سر ہلایا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اردو نہیں سمجھتا۔ اُس نے اپنا ایک ہاتھ میرے زانو پر رکھ کر ذرا دبایا اور پھر سر سے اشارہ کیا کہ میں اس کے ساتھ چلوں۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ یہ انڈونیشی مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ ساتھیوں نے کہا کہ جانے میں کوئی حرج نہیں' ذرا محتاط رہنا' ہم تمہارا یہیں انتظار کریں گے۔

میں کسی انڈونیشی مسلمان سے دھوکے اور فریب کی توقع رکھتا ہی نہیں تھا۔ میں اٹھا اور اُس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے چھوٹی چھوٹی تین چار گلیوں میں گھماتا ایک گھر میں لے گیا۔ وہ بڑا اچھا اور صاف ستھرا گھر تھا۔ ایک صحن میں سے گذار کر ایک کمرے میں لے گیا۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا.... میرے سامنے حوالدار غلام نبی چارپائی پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھا اور بازو پھیلا کر میری طرف آیا۔ دوسرے لمحے ہم ایک دوسرے کے بازوؤں میں تھے۔

اس نے مجھے اپنا ہم راز بنانے کے قابل سمجھا تھا کہ ہم دونوں ہم خیال تھے۔ اُسے معلوم تھا کہ میں برما فرنٹ پر بھگوڑا ہُوا تھا اور میں نے آئی این اے میں جانا تھا۔ میں جب بٹالین میں واپس آیا تھا تو حوالدار غلام نبی بڑے پیار سے ملا تھا۔ میں نے اسے صاف الفاظ میں بتا دیا تھا کہ میں نے آئی این اے میں جانا تھا اور میں اس لئے آئی این اے سے متنفر ہُوا کہ میں نے ہندوؤں کی ذہنیت دیکھ لی تھی۔ پھر میں نے اسے برما کے جنگل کی ساری داستان سنائی تھی۔ غلام نبی تو میٹرک بھی پاس نہیں تھا لیکن اُس کی تعلیم اتنی سی ضرور تھی کہ فوج میں آ کر اس نے تعلیمی ٹیسٹ بھی پاس کئے تھے جس سے وہ میٹرک سے زیادہ تعلیم یافتہ ہو گیا تھا۔ یہ وجہ تھی کہ اسے انٹیلی جنس سیکشن میں رکھا گیا تھا۔ اس کے بعد ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔

میں بہت خوش ہُوا کہ اُس نے مجھے بلایا تھا اور اپنا ہم راز بنایا تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ مجھے یہی بتانا چاہتا تھا کہ وہ یہاں ہے اور اُس کی باقی زندگی انڈونیشیا میں ہی گزرے گی اور وہ ان لوگوں کی جنگِ آزادی لڑے گا۔ پھر اُس نے مجھے اکسانا شروع کر دیا کہ میں بھی بھگوڑا ہو کر اس کے پاس آ جاؤں۔ میں نے اسے بتایا کہ ارادہ یہی ہے اور میں کسی بھی وقت اِدھر سے اُدھر آ جاؤں گا۔

اس نے مجھ سے وہ ساری باتیں پوچھیں جو اُس کے فرار کے بعد بٹالین میں ہوئی تھیں۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اس نے اس سکھ نائیک کو کس طرح قتل کیا تھا۔

اس نے بتایا کہ وہ رات اس نے جاگتے گذاری تھی۔ اُس نے قسم کھائی تھی کہ وہ اس نائیک کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس سکھ نے انڈونیشی عورتوں کی جس طرح زبانی توہین کی تھی' اسے وہ برداشت نہیں کر سکا تھا۔ اس سے آپ اندازہ کریں کہ اس کے دل میں انڈونیشی مسلمانوں کی کتنی زیادہ محبت تھی۔ وہ رات کو کئی بار اپنے خیمے میں سے اس توقع پر نکلا کہ یہ نائیک کسی وقت تو پیشاب وغیرہ کے لئے باہر آئے گا۔ غلام نبی جب مجھے یہ واقعہ سنا رہا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیا کم عقل آدمی ہے۔ یہ ضروری تو نہیں تھا کہ نائیک نے رات ضرور اٹھنا تھا لیکن اس سکھ کی موت اسی طرح لکھی ہوئی تھی اس لئے وہ آدھی رات کے وقت خیمے سے نکلا۔

اِدھر سے غلام نبی عین اُسی وقت اس کے خیمے کی طرف گیا۔ یہ کوئی فوجی ہی جانتا ہے کہ غلام نبی کو کیسی دشواری پیش آئی ہو گی۔ دشواری یہ تھی کہ رات کو ہر کمپنی کا

ایک سنتری تین گھنٹے کے لئے چل پھر کر پہرہ دیتا تھا۔ غلام نبی ان سنتریوں سے بچتا بچاتا باہر نکلا تھا۔ اُس نے دیکھ لیا کہ اُس کا شکار آخر باہر آ گیا ہے۔ وہ آگے بڑھا اور سکھ کے قریب جا کر یقین کر لیا کہ یہ اس کا شکار ہی ہے۔

سکھ نے اُسے پہچان کر آنے کا پوچھا۔ غلام نبی نے یہ قتل بڑی اچھی طرح پلان کیا ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کپڑا تھا۔ اُس نے بڑی پُھرتی سے یہ کپڑا سکھ کے منہ میں ڈال کر پیچھے گانٹھ دے دی۔ غلام نبی بڑا گٹھا ہُوا طاقتور جوان تھا۔ اس کے مقابلے میں سکھ نائیک کچھ دبلا پتلا تھا۔ غلام نبی نے فوراً اسے ایک کندھے پر ڈال لیا۔ سکھ کی ٹانگیں غلام نبی کے آگے تھیں اور اوپر والا دھڑ پیٹھ کی طرف تھا۔ یہ واردات بڑی ہی دلیری اور جرأت والی واردات تھی۔ غلام نبی ایک طرف چل پڑا۔

وہاں سہولت یہ حاصل تھی کہ وہ کھلا میدان نہیں تھا۔ وہاں درخت بہت زیادہ تھے۔ بڑی خوبصورت سرسبز جگہ تھی۔ غلام نبی بڑی تیز تیز چلتا گیا اور اس جگہ جا پہنچا جہاں اس سکھ کی لاش پڑی ہوئی ملی تھی۔

غلام نبی نے وہاں جا کر سکھ کو کندھے سے نیچے گرایا۔ سکھ پیٹھ کے بل گرا۔ غلام نبی نے بڑی پُھرتی سے چاقو نکالا' کھولا اور پیشتر اس کے کہ سکھ نائیک اٹھتا' غلام نبی نے چاقو اس کے پیٹ میں اتار کر ایک طرف زور سے کھینچا اور سکھ کا پیٹ چاک کر دیا۔

پیٹ چاک ہوتے ہی آدمی مر نہیں جاتا وہ ہوش میں رہتا ہے اور یکدم اٹھتا ہے اور چلنے کی یا بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ سکھ بھی اٹھا اور وہ جونہی اٹھا اس کی انتڑیاں باہر آ گئیں۔ غلام نبی اسے دیکھتا رہا اور سکھ اس کے ساتھ آ لگا اس طرح خون غلام نبی کی وردی کے ساتھ بھی لگ گیا۔ آخر سکھ گر پڑا۔ غلام نبی نے اس کے منہ سے کپڑا اتار کر اپنے پاس رکھ لیا اور واپس آ گیا۔ اپنے خیمے میں آ کر اُس نے کپڑے تبدیل کئے اور اس طرح آرام اور سکون سے سو گیا جیسے بڑا ہی ضروری کام ختم کر لیا ہو۔

حوالدار غلام نبی کے ساتھ ایسی اور بھی بہت سی باتیں ہوئیں۔ اُس نے مجھے اس لئے بلایا تھا کہ مجھے یہ پتہ چل جائے کہ وہ یہاں ہے اور مجھے اپنے جذبات اور ارادوں سے آگاہ کرنا چاہتا تھا اور پھر وہ بٹالین کے مسلمانوں کو یہ پیغام دینا چاہتا تھا کہ ایک ایک کر کے سب اُسی کی طرح اُدھر سے بھاگ کر اِدھر اپنے انڈونیشی بھائیوں کے پاس آ جائیں۔ اُس نے بتایا کہ انڈونیشی اسے بہت اونچی حیثیت دے رہے ہیں جو اسے پسند نہیں۔ وہ ان

کے ساتھ مل کر ان کی جنگِ آزادی لڑنا چاہتا تھا اور اتنے دنوں میں وہ ایک گوریلا کارروائی میں شامل ہو بھی چکا تھا۔ وہ تو تربیت یافتہ فوجی تھا اور حوالدار تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ منجھا ہُوا تجربہ کار حوالدار ہے۔ اُس نے برما فرنٹ پر لڑائی بھی لڑی تھی۔

میں نے ایک خاص بات نوٹ کی۔ وہ یہ کہ انڈونیشی لوگوں کے قد ذرا چھوٹے تھے اور ان کے درمیان غلام نبی کا قد چھ فٹ تھا اور جسم پہلوانوں جیسا۔ اس کے ساتھ انڈونیشی چھوٹے چھوٹے لگتے تھے۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ وہ دو انڈونیشی مسلمانوں کو اٹھا کر بڑے آرام سے چل پھر سکتا ہے۔

اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ ایک خاص کام کرنا چاہتا ہے جو اسے کرنے نہیں دیا جارہا۔ وہ چاہتا یہ تھا کہ رات کو کہیں ہمارے کیمپ کے اِردگِرد کسی درخت پر بیٹھ جایا کرے یا کہیں پوزیشن لے لیا کرے اور ہر روز ایک دو فوجیوں کو گولی کا نشانہ بنالیا کرے۔ وہ ہندو اور سکھ صوبیداروں وغیرہ کو مارنا چاہتا تھا اور پھر وہ انگریز افسروں کو نشانہ بنانے کا ارادہ کئے ہوئے تھا۔ اس کام کو فوجی زبان میں Sniping کہتے ہیں لیکن انڈونیشی مسلمان ایک منظم گوریلا جنگ لڑ رہے تھے اور وہ وہی کارروائیاں کرتے تھے جن کا انہیں اپنے اپنے ہیڈ کوارٹر سے آپریشن آرڈر ملتا تھا۔ کوئی حریّت پسند اپنے طور پر کوئی کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔ غلام نبی کو بھی انہوں نے اپنا پابند کر لیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ایسی کارروائی کا تصوّر نہ کرے جس کا اوپر سے حکم نہ آیا ہو۔

میں غلام نبی کی کمزوری سمجھتا تھا۔ وہ جذبات میں آیا ہوا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ ایسی لڑائیاں عقل سے لڑی جاتی ہیں جذبات سے نہیں.... ہماری بہت باتیں ہوئیں اور پھر میں وہاں سے آگیا۔

○

اللہ نے کرم کیا کہ مجھے ترقی مل گئی۔ میں اب فرسٹ گریڈ کا کلرک بن گیا تھا۔ ہر کلرک کا عہدہ حوالدار ہی ہوتا تھا لیکن تین گریڈ تھے۔ تھرڈ، سیکنڈ اور آخری گریڈ تھا فرسٹ۔ یہ ترقی ملتے ہی مجھے ایجوٹنٹ آفس میں لگا دیا گیا۔ اس سے مجھے یہ سہولت حاصل ہو گئی کہ میں انتہائی گہرے راز کے خطوط بھی پڑھ لیا کرتا تھا۔ آپریشن آرڈر تو ہوتے ہی سیکرٹ تھے۔ ان تک میری رسائی اور زیادہ آسان ہو گئی۔

ملاقات کے آٹھ دس روز بعد بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے ایک اور آپریشن آرڈر آ

گیا۔ اس میں صرف ہماری بٹالین کا کام تھا۔ ایک خاص ایریا دیا گیا تھا۔ ہماری بٹالین کو اس ایریے میں پہنچنا اور وہاں سے کمپنیوں کو مختلف اطراف میں روانہ کرنا تھا۔ اس علاقے میں انڈونیشی گوریلوں نے کوئی خاص کارروائی کرنی تھی اور وہاں اکٹھے ہو کر انہوں نے مختلف اطراف کو جانا تھا۔ انگریزوں اور امریکیوں کا جاسوسی کا نظام بڑا اچھا تھا۔ یہ تو ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ ولندیزی لڑکیاں خاص طور پر جاسوسی کا کام کرتی تھیں اور کچھ ولندیزی جن کے خدوخال انڈونیشی مسلمانوں سے ملتے جلتے تھے، وہ مسلمانوں کے روپ میں انڈونیشی گوریلوں میں شامل ہو گئے تھے۔

ولندیزی تو یورپ کی قوم تھی جن کے خدوخال اور رنگ بالکل الگ تھے لیکن ان میں کچھ ایسے تھے جو انڈونیشیا کے ہی علاقوں میں آباد ہو گئے اور یہیں پیدا ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض کی مائیں انڈونیشی تھیں۔ اس طرح ان کے خدوخال انڈونیشیا کے لوگوں جیسے ہو گئے تھے۔ ان میں سے انگریزوں اور امریکیوں کو جاسوسی یعنی انٹیلی جنس کا کام کرنے والے آدمی مل گئے تھے۔ ولندیزی لڑکیاں تو خاص طور پر بہت ہی خوبصورت تھیں۔ وہ جاسوسی کے میدان میں بڑی کامیاب تھیں۔ جاسوسی کا یہ نظام ایسا تھا کہ انڈونیشی گوریلوں کی بعض کارروائیوں کی اطلاع قبل از وقت فوج کو مل جاتی تھی۔

جس آپریشن میں ہماری بٹالین جارہی تھی، یہ بھی جاسوسوں کی بدولت جارہی تھی جاسوسوں نے ہی اطلاع دی ہو گی کہ انڈونیشی گوریلے فلاں جگہ اکٹھے ہو رہے ہیں اور ان کا پلان یہ ہے۔

آپریشن آرڈر آیا تو وہ میں نے بھی پڑھا۔ میں اب اس موقع کی انتظار میں تھا کہ یہ آرڈر میرے ہاتھ چڑھ جائے اور میں اس کی نقل کر کے حوالدار غلام نبی کو پہنچا دوں۔ بڑی کوشش کے باوجود میں اس کی نقل نہ کر سکا البتہ اس کے نہایت ضروری حصے، آپریشن کا دن اور وقت وغیرہ زبانی یاد کر لئے اور الگ بیٹھ کر ایک کاغذ پر لکھ لئے۔ آپریشن تین دنوں بعد شروع ہونا تھا یعنی ہماری بٹالین کو تین دنوں بعد اس ایریے کی طرف روانہ ہونا تھا۔

میں اُسی روز قصبے میں گیا اور سیدھا اُس گھر میں گیا جہاں غلام نبی سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ معلوم کر کے مجھے مایوسی ہوئی کہ غلام نبی دو تین روز پہلے کسی گوریلا آپریشن میں شریک ہونے کے لئے چلا گیا تھا۔ گھر میں اس گھر کا سربراہ موجود تھا اور وہ کوئی ایسا ویسا

آدمی نہیں تھا بلکہ اس کی ایک خاص حیثیت تھی۔ میں نے اُسے آپریشن آرڈر کے اہم نکات جو لکھے ہوئے تھے' دے دیئے اور کہا کہ یہ بہت جلدی جس تک پہنچانے ہیں پہنچا دے۔

اس انڈونیشی نے مجھے بتایا کہ غلام نبی اسی گوریلا آپریشن میں شریک ہونے کے لئے گیا ہے۔ اُسے ایک پارٹی دی جائے گی اور اس پارٹی کا ایک خاص مشن ہے جو اس نے غلام نبی کی کمانڈ میں پورا کرنا ہے۔ اس شخص نے مسکراتے ہوئے مجھے بتایا کہ میں اسے اپنی بٹالین کا جو آپریشن آرڈر دے چلا ہوں یہ گذشتہ شام اُس کے پاس پہنچ چکا ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ اُس کے پاس کس طرح پہنچا ہے' اُس نے بتایا کہ تمہارے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے اس کی نقل ہمارے گوریلا ہیڈ کوارٹر میں پہنچ گئی تھی۔ یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ انڈین آرمی کے مسلمان بہت بڑا کام کر رہے ہیں اور یہ کام اللہ کی راہ میں کیا جا رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اس آپریشن آرڈر کے پیشِ نظر اپنا پلان ملتوی کر دیں گے؟

"نہیں!" —— اُس نے جواب دیا —— "ہمارا پلان ملتوی نہیں ہو گا بلکہ اس کی صورت بدل دی گئی ہے۔ چونکہ پہلے اطلاع مل گئی ہے کہ ایک بٹالین آ رہی ہے تو اب پلان یہ بن گیا ہے کہ پیشتر اس کے کہ یہ بٹالین ہمارے گوریلوں کو گھیرے میں لے گوریلے بٹالین کو گھات میں لے لیں گے"۔

ہو سکتا ہے میرے فوجی بھائی جو میری یہ بات پڑھیں گے' کہیں گے کہ یہ شخص بڑا ہی غیر ذمہ دار تھا جس نے گوریلوں کا پلان بتا دیا لیکن مجھ پر ان لوگوں کو مکمل اعتماد تھا۔ میں انہیں اتنی گہری راز کی بات بتا رہا تھا تو وہ مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپا رہے تھے۔

تین دن گزر گئے اور ہماری پوری بٹالین اس آپریشن آرڈر کے مطابق بتائے ہوئے ایریے کی طرف چل پڑی۔ میں بھی ساتھ تھا۔ بٹالین کو ایک خاص جگہ پہنچنا تھا اور وہاں سے کمپنیوں کو آپریشن آرڈر کے مطابق مختلف اطراف روانہ کرنا تھا۔ جگہ دُور تھی اور کوئی پکی سڑک نہیں تھی اس لئے بٹالین پیدل جا رہی تھی۔ اُس مقام تک پہنچتے شام ہو گئی۔

رات وہیں گذارنی تھی۔ ہمارے کمانڈنگ آفیسر نے تمام کمپنی کمانڈروں کو بلا کر بریفنگ دی اور انہیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ ان کے ذمے کیا کیا کام ہے۔ اس کے بعد

وہیں بغیر خیموں کے کیمپ کر لیا گیا۔ ہم دن بھر پیدل چلتے رہے تھے۔ راستے میں چار جگہوں پر پندرہ پندرہ منٹ کے لئے رُکے تھے۔ تھکن اتنی زیادہ کہ ٹانگیں دُکھ رہی تھیں۔ ہم نے زمین پر کمبل ڈالے اور لیٹتے ہی سو گئے۔

رات کے دس بجنے والے ہوں گے کہ اچانک بٹالین پر ہر طرف سے فائر کھل گیا۔ بٹالین میں ہڑبونگ بپا ہو گئی اور سب آڑ اور پوزیشنیں ڈھونڈنے لگے۔ "مردیکا" کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔

انڈونیشی مسلمان "مردیکا" کا نعرہ لگایا کرتے تھے تو صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ انڈونیشی ہیں۔ ان کا لہجہ اپنا اور آواز مختلف ہوتی لیکن اُس دن ہماری بٹالین پر فائر آیا تو "مردیکا" میں ایک آواز بڑی ہی بلند' دبنگ اور گرجدار تھی۔ یہ کسی انڈونیشی کی آواز نہیں تھی۔

یہ آواز غلام نبی کی تھی لیکن غلام نبی اس آپریشن میں شدید زخمی ہو گیا۔

(جاری ہے)

بات آگے چلانے سے پہلے ایک وضاحت پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں پہلے یہ لکھتا آیا ہوں کہ اُس وقت انڈونیشیا کا وجود نہیں تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ انڈونیشیا کے لوگ اس ملک کے لئے جس کے لئے وہ جنگِ آزادی لڑ رہے تھے 'انڈونیشیا ہی کہتے تھے اور انہوں نے اس ملک میں باقاعدہ حکومت بھی قائم کر رکھی تھی۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ حکومت باقاعدہ طور پر چل رہی تھی اور گوریلا جنگ بھی ایک باقاعدہ ہیڈ کوارٹر کے تحت پلان اور سکیموں کے مطابق لڑی جا رہی تھی۔ یہ جو میں کہتا آیا ہوں کہ انڈونیشیا اُس وقت کوئی ملک نہ تھا' اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ انڈونیشیا کو بحیثیت ایک آزاد ملک اقوامِ متحدہ نے تسلیم کیا تھا نہ انگریزوں نے نہ امریکیوں نے اور نہ ہی ولندیزیوں نے۔

اب میں آپ کو اُس میدانِ جنگ میں لئے چلتا ہوں جہاں انڈونیشی گوریلوں نے ہماری بٹالین پر اُس وقت شب خون مارا تھا جب بٹالین دن بھر پیدل چلتے چلتے تھک کر گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ اگلے روز بٹالین نے اُس مقام تک پہنچنا تھا جو آپریشن آرڈر میں بتایا گیا تھا۔ یہ تو ایک پڑاؤ پہلے ہی ہم پر حملہ ہو گیا تھا۔

خیمے نہیں تھے۔ خیموں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ دو دنوں کے آپریشن کے بعد واپس اپنے کیمپ میں آ جانا تھا۔ رات چاندنی تھی لیکن درخت اتنے زیادہ تھے کہ چاندنی ہمارے کسی کام نہیں آ سکتی تھی۔ اردگرد ٹیکریاں تھیں اور یہ سب ٹیکریاں سرسبز تھیں اور ان پر بھی درخت تھے۔ ساری بٹالین کے سو جانے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سبھی بے خبر سو گئے تھے۔ کیمپ کی حفاظت کے لئے اردگرد ذرا دور دور کئی ٹیکریوں پر پوسٹیں بنا دی گئی تھیں۔ پوسٹوں کا مطلب یہ تھا کہ وہاں ایک ایک سیکشن یعنی آٹھ آٹھ نو نو یا اس

سے دو چار زیادہ جوان مورچہ بند ہو گئے تھے۔

ہر پوسٹ میں ایک سنتری بیدار تھا۔ کیمپ کے اندر ہر کمپنی کا ایک سنتری تین تین گھنٹے گھوم پھر کر ڈیوٹی دیتا تھا۔ رائفلیں، سٹین گنیں، مشین گنیں ہمیں اپنے پاس رکھنے کا حکم ملا تھا۔

حملہ اس طرح ہُوا کہ ہر طرف سے بٹالین پر سٹین گنوں' ٹامی گنوں اور رائفلوں کا بے تحاشا فائر آنے لگا۔ پوری بٹالین جاگ اٹھی۔ کیمپ کی اردگرد کی تمام پوسٹوں میں سے روشنی راؤنڈ فائر ہونے لگے جنہوں نے رات کو دن بنا ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی ہر پوسٹ میں سے مشین گنیں اور رائفلیں اندھا دھند جوابی فائر کرنے لگیں۔ فوجی ٹریننگ کے مطابق تمام پلٹنیں اٹھ کر کیمپ کے اردگرد مورچہ بند ہو گئی۔ کمانڈنگ آفیسر اور کمپنی کمانڈر وغیرہ فوراً "آگئے اور چلا چلا کر حکم اور ہدایات دینے لگے۔

بٹالین کے پاس اس قدر زیادہ ایمونیشن تھا جس کے ختم ہونے کا امکان نہیں تھا اس لئے فوجی یوں فائر کر رہے تھے جیسے پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے۔ یہ تو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ دشمن کہاں ہے۔ ویسے بھی رات کے وقت اسی طرح فائر کیا جاتا ہے۔ مشین گنیں دائیں بائیں پھیر پھیر کر مسلسل فائر کی جاتی ہیں۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ دشمن جہاں کہیں بھی ہو' اس کی زد میں آ جاتا ہے۔

یہ تو ہم جانتے تھے کہ گوریلوں نے پہلا حملہ پوسٹوں پر کیا ہو گا۔ پھر کوئی بعید نہیں تھا کہ گوریلے بٹالین کی حدود کے اندر بھی آ گئے ہوں۔ انڈونیشی مسلمانوں کی جرأت اور شجاعت کو ہم اچھی طرح جانتے تھے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ بٹالین کے مسلمان سیدھا فائر نہیں کر رہے ہوں گے بلکہ ہتھیاروں کی نالیاں ذرا اوپر کر کے ایمونیشن پھونک رہے ہوں گے۔ ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ یہ کسی باقاعدہ فوج کا حملہ نہیں بلکہ یہ گوریلے ہیں جو زیادہ سے زیادہ نصف گھنٹہ ٹھہریں گے اور واپس چلے جائیں گے۔

ہُوا بھی ایسے ہی' گوریلے بگولے کی طرح آئے اور گئے۔ ہم لوگ یہی کچھ کر سکتے تھے کہ اندھا دھند گولیاں چلائیں اور اپنی جانیں بچانے کے لئے آڑ میں رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری بٹالین جو بھی جوابی کارروائی کر رہی تھی' وہ بوکھلاہٹ کا مظاہرہ تھا اور بٹالین کے اندر نفسانفسی کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ یہ تو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ یہ جو قیامت کا فائر ہو رہا ہے' اس میں گوریلوں کا فائر کتنا ہے اور کیا ان کا فائر بند ہو چکا ہے یا نہیں۔ کمپنی

کمانڈروں اور کمپنی صوبیداروں وغیرہ نے اپنی اپنی کمپنیوں کو اپنی کمانڈ میں لے لیا تھا۔

پھر جس طرح اچانک فائر شروع ہُوا تھا اسی طرح اچانک بند ہو گیا۔ غالباً "دو یا تین کمپنیوں کو کیمپ سے دُور بھیجا گیا کہ وہ گوریلوں کا تعاقب کریں اور ان میں سے جو زخمی ہیں انہیں اٹھا کر کیمپ میں لے آئیں۔ میں صرف آپ کو اے کمپنی کی بات سناؤں گا۔ اے کمپنی مسلمانوں کی کمپنی تھی۔ میں اس کمپنی کی کارگزاری صرف اس لئے سنانا چاہتا ہوں کہ پہلے میں بتا چکا ہوں کہ حوالدار غلام نبی جو گوریلوں میں جا ملا تھا' زخمی ہو گیا تھا۔ میں نے آپ کو یہ بتانا ہے کہ ہمیں کس طرح پتہ چلا کہ غلام نبی زخمی ہو گیا تھا اور پھر اس پر کیا بیتی۔ یہ تو میں پچھلے باب میں سنا چکا ہوں کہ غلام نبی انڈونیشی مسلمانوں کے پاس چلا گیا تھا اور وہاں اُس نے بڑی اچھی پوزیشن حاصل کر لی تھی۔ وہ تجربہ کار حوالدار تھا اور میں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ہماری بٹالین جس آپریشن پر جا رہی تھی وہ گوریلوں کے اجتماع کے خلاف تھا اور گوریلوں نے کوئی بڑی زبردست کارروائی کرنی تھی اور یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ اُن کی اس کارروائی میں غلام نبی کی حیثیت ایک کمانڈر جیسی ہے۔

باقی رات جاگتے گزر گئی۔ ہمارے سٹریچر بیئرر زخمیوں کو اٹھا اٹھا کر ایک جگہ لاتے رہے۔ بٹالین کے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی تھا جس کا عہدہ کیپٹن تھا اور اس کے ساتھ اس کا عملہ بھی تھا۔ ابتدائی مرہم پٹی وغیرہ کا پورا انتظام تھا۔

یہ تو صرف میں جانتا تھا کہ گوریلوں نے ہماری بٹالین پر راستے میں ہی کیوں حملہ کر دیا ہے۔ ہماری بٹالین جس آپریشن آرڈر کے مطابق جا رہی تھی وہ آپریشن آرڈر انڈونیشی گوریلوں تک پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ میں بہت خوش تھا کہ گوریلوں کے ایک خاص مقام پر ہم نے حملہ کرنا تھا لیکن اس کی بجائے گوریلوں نے راستے میں ہی ہم پر حملہ کر دیا۔ مجھے توقع یہ تھی کہ ہم ہدف کے مقام پر پہنچ جائیں گے تو وہاں ہمیں کچھ بھی نہیں ملے گا اور رات کو ہم پر گوریلوں کا حملہ ہو گا یعنی شکاری نے خود شکار ہونا تھا لیکن انڈونیشی گوریلوں نے ہماری بٹالین کو ہدف کے مقام تک پہنچنے ہی نہ دیا۔

صبح ہوئی تو پتہ چلا کہ ہماری بٹالین کے بیالیس جوان مارے گئے ہیں اور ایک سو اکیس شدید زخمی ہوئے ہیں اور معمولی زخموں والوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ یہ بھی پتہ چلا کہ انڈونیشی گوریلوں کی صرف چار لاشیں ملی ہیں اور زخمی ایک بھی نہیں ملا۔ "وہ لوگ زخمی کو کسی حالت میں پیچھے چھوڑ کر نہیں جایا کرتے تھے۔ ایک زخمی کو اٹھانے پر دو دو تین تین آدمی قربان کر دیا کرتے تھے۔

○

اے کمپنی کے جو چار پانچ جوان مارے گئے تھے ان میں ایک لاش نائیک نُور عالم کی تھی۔ سپاہی محمد شفیع بھی اس کے ساتھ تھا لیکن وہ بچ گیا تھا۔ سپاہی شفیع نے یہ عجیب بات سنائی کہ لانس نائیک نُور عالم بی کمپنی کے ایک نائیک کی گولیوں سے مرا ہے۔ بی کمپنی ہندوؤں کی کمپنی تھی۔ ان کی ایک سیکشن بٹالین کیمپ سے ذرا دُور ایک ٹیکری پر اپنی پوسٹ قائم کئے ہوئے تھی۔ اس میں آٹھ جوان تھے جن کا کمانڈر ایک نائیک تھا۔ سپاہی شفیع نے یہ تو سب کو بتایا کہ لانس نائیک نور عالم اس ہندو نائیک کی مشین گن کی گولیوں سے مرا ہے لیکن اصل جو بات تھی وہ ہر کسی کو بتانے والی نہیں تھی۔ میں آپ کو وہ بات سنا رہا ہوں۔ دراصل یہی بات سننے والی ہے۔

شفیع نے یہ بات مجھے اور حوالدار امیر خان کو الگ بٹھا کر سنائی تھی۔ اُسے کسی طرح پتہ چل گیا تھا کہ ہمارا رابطہ انڈونیشی مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ شفیع کی جذباتی حالت یہ تھی کہ وہ نُور عالم کی موت پر روتا تھا اور آہیں بھرتا تھا۔ میں کہتا ہوں اتنا دکھ اپنے بھائی کی موت پر ہی ہو سکتا ہے۔ شفیع نے ہمیں رازداری کے لہجے میں یہ بات یوں سنائی کہ ان کی کمپنی کو حکم ملا کہ وہ فلاں طرف نکل جائے اور گوریلوں کو تلاش کرے۔

کمپنی جنگی ترتیب کے مطابق پھیلتی جا رہی تھی۔ علاقہ ٹیکریوں اور چٹانوں والا تھا اور جوں جوں وہ آگے بڑھتے جاتے تھے' جنگل گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ یوں ہُوا کہ لانس نائیک نُور عالم اور سپاہی شفیع اپنی کمپنی سے کچھ الگ ہو گئے۔ یہ کوئی غلطی نہیں تھی نہ یہ کوئی غیر فوجی کارروائی تھی۔ البتہ اتنا ضرور ہُوا کہ ان دونوں کو محسوس ہی نہ ہُوا کہ وہ کمپنی سے کچھ زیادہ ہی دُور ہو گئے ہیں۔ دونوں کو معلوم تھا کہ انہیں ایک فوجی رسم پوری کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی گوریلا ان کے ہاتھ چڑھ جاتا۔

دونوں جا رہے تھے تو ایک گھنی جھاڑی کے پیچھے سے کسی کے کراہنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ دونوں رک گئے۔ چاندنی اور زیادہ صاف ہو گئی تھی۔ چونکہ وہ جنگلاتی علاقہ تھا اس لئے چاندنی میدانی علاقوں کی نسبت زیادہ شفاف اور چمکدار ہوتی تھی۔ نُور عالم کے پاس سٹین گن تھی اور شفیع کے پاس رائفل تھی۔ دونوں اپنے ہتھیاروں کی نالیاں جھاڑی کی طرف کر کے آہستہ آہستہ آگے بڑھے اور پوچھا کون ہے؟

کراہنے کی آوازوں کے ساتھ یہ آواز آئی — "آگے آ جاؤ" — آواز بڑی ہی کمزور تھی اور لہجہ کراہنے والا ہی تھا۔ یہ الفاظ اُردو میں بولے گئے تھے اس لئے کوئی شک و شبہ نہیں تھا کہ یہ کوئی اپنا ہی آدمی ہے۔ دونوں اکٹھے ذرا تیز قدم اٹھاتے وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک آدمی جس کی وردی انڈین آرمی والی نہیں تھی' پیٹھ کے بل پڑا تھا اور اُس کے ہاتھ میں ٹامی گن تھی جو اُس نے ان دونوں پر تان کر رکھی ہوئی تھی یعنی اس کی نالی ان دونوں کی طرف تھی۔

"دونوں اپنے ہتھیار نیچے رکھ دو" — اس آدمی نے کہا — "میری انگلی ٹریگر میں ہے...."

"تم حوالدار غلام نبی تو نہیں؟" — لانس نائیک نُور عالم نے اُس کے قریب گھٹنوں کے بل ہو کر کہا۔

"نور عالم ہو؟" — اس آدمی نے پوچھا اور بولا — "میں غلام نبی ہی ہوں۔ میں اتنا زیادہ زخمی ہوں کہ بیٹھ بھی نہیں سکتا.... میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟ یہ مت بھولنا کہ تم بھی مسلمان ہو"۔

شفیع نے ہمیں سنایا کہ حوالدار غلام نبی سے اچھی طرح بولا نہیں جاتا تھا۔ نُور عالم اور شفیع کو معلوم تھا کہ غلام نبی انڈونیشی گوریلوں کے پاس چلا گیا ہے۔

"یہ تم بتاؤ ہم تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں" — نُور عالم نے کہا — "جہاں کہو گے اٹھا کر وہاں تک لے جائیں گے"۔

غلام نبی نے پانی مانگا۔ ہر فوجی کے پاس پانی کی بوتل ہُوا کرتی تھی۔ نُور عالم اور شفیع نے بیک وقت اپنی اپنی بوتل کھولی اور غلام نبی نے ہاتھ بڑھا کر نُور عالم سے بوتل لے لی اور پانی پی لیا۔ اُس نے انہیں کہا کہ وہ اُسے یہاں سے اُٹھا کر کچھ دُور تک پہنچا دیں اور خود واپس آ جائیں۔ وہ کہتا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ اس کا مطلب تھا انڈونیشی گوریلے۔ اس نے کہا کہ اب تو وہ چلے گئے ہیں لیکن اُس کی تلاش میں ضرور آئیں گے اور اُسے اٹھا کر لے جائیں گے۔

"اگر انگریزوں سے ترقی لینے کے لالچ میں مجھے اٹھا کر بٹالین میں لے جانا چاہتے ہو تو یہیں پڑا رہنے دو" — غلام نبی نے کراہتی ہوئی آواز میں کہا۔

"لعنت ہے ہم پر اگر تمہیں ایسا دھوکہ دیں" — نُور عالم نے کہا — "زخم کہاں

کہاں ہیں؟"

غلام نبی نے انہیں بتایا کہ اُس کی بائیں ٹانگ پر مشین گن کی چار پانچ گولیاں لگی ہیں اور شاید ہڈی بچ گئی ہے۔ بائیں بازو پر بھی دو یا تین گولیاں لگی تھیں اور وہ کہتا تھا کہ بازو کی ہڈی بھی شاید بچ گئی ہے اور گولیوں نے پٹھے کاٹ دیئے ہیں۔ اُس کا خون بڑی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ نُور عالم اور شفیع نے کہا کہ ان کے پاس فیلڈ پٹیاں ہیں' وہ ٹانگ اور بازو پر باندھ دیں گے لیکن غلام نبی نے کہا کہ یہ پٹیاں کافی نہیں ہوں گی اور وہ ان دونوں کو زیادہ دیر تک وہاں روکنا بھی نہیں چاہتا۔

نُور عالم اور شفیع نے بہت بڑا خطرہ مول لے لیا تھا۔ خطرہ یہ کہ وہ اپنی کمپنی سے الگ ہو گئے تھے اور انہیں فکر ہی نہیں تھا کہ کمپنی کہاں جا نکلی ہو گی۔ انہوں نے غلام نبی کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے کا ارادہ کر لیا۔

○

سپاہی محمد شفیع نے ہمیں سنایا کہ یہ غلام نبی کی ہی ہمت اور برداشت تھی کہ وہ بے ہوش نہیں ہُوا تھا' ویسے اس کی حالت بہت ہی بری تھی۔ ان دونوں نے اُسے مل کر اُٹھا لیا۔ غلام نبی چھ فٹ قد کا گٹھے ہوئے جسم والا جوان تھا اور اللہ نے اُسے بڑی جسمانی طاقت دی تھی۔ اصل طاقت تو اُس کا ایمان تھا۔ نُور عالم اور شفیع بھی کوئی کمزور آدمی نہیں تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ غلام نبی کی زخمی ٹانگ اور زخمی بازو کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ کوئی اور ذرا کمزور آدمی ہوتا تو وہ ان زخموں سے مر ہی چکا ہوتا۔

غلام نبی بار بار پانی مانگتا تھا اور یہ دونوں اُسے پانی پلاتے رہے۔ غلام نبی نے کراہتے ہوئے انہیں بتایا کہ اس گوریلا حملے کا کمانڈر وہ خود تھا۔ وہ کیمپ کے اندر چلا گیا تھا اور اسے یقین تھا کہ اُس نے دس بارہ فوجی تو مار لئے تھے اور کئی ایک کو زخمی کیا تھا اور نکل بھی آیا تھا۔ گوریلے زیادہ دیر نہیں ٹھہرا کرتے۔ غلام نبی جب کیمپ سے دُور نکل آیا تو پیچھے سے اس پر مشین گن فائر ہوئی تھی۔

تقریباً" ایک میل دُور گئے ہوں گے کہ غلام نبی نے انہیں روک دیا اور کہا کہ اُسے زمین پر لٹا دیں۔ میرا خیال ہے فاصلہ ایک میل سے کچھ زیادہ کم تھا۔ ٹیکریاں اور چٹانیں اتنی زیادہ تھیں کہ چند قدموں پر مڑنا پڑتا تھا۔ بہرحال غلام نبی محفوظ جگہ پہنچ گیا تھا۔

"اب ایک کام کرو" — غلام نبی نے نُور عالم اور شفیع سے کہا — "گیدڑ کی

آوازیں نکالو پھر چپ ہو جانا"۔

شہروں کے لوگ شاید گیدڑ کی اس آواز سے واقف نہ ہوں جو رات کو گیدڑ اکٹھے ہو کر نکالا کرتے ہیں۔ دیہات کے لوگ ان آوازوں سے بڑی اچھی طرح واقف ہیں۔ پہلے ایک گیدڑ بولتا ہے اور پھر جتنے گیدڑ وہاں موجود ہوتے ہیں یا جن گیدڑوں تک یہ آواز پہنچتی ہے وہ مل کر بولتے ہیں اور پھر سب اکٹھے ہی خاموش ہو جاتے ہیں۔ میں اس آواز کو الفاظ میں لکھ نہیں سکتا' اس آواز سے میں واقف ہوں کیونکہ میں دیہات کا رہنے والا ہوں۔

نُور عالم اور شفیع نے گیدڑوں جیسی آوازیں نکالیں اور چپ ہو گئے.... ایک دو منٹ گزرے ہوں گے کہ غلام نبی کے کہنے پر انہوں نے پھر ایسی ہی آوازیں نکالیں۔ ان کی آوازیں بالکل گیدڑوں جیسی تھیں۔ انہیں یہ آوازیں تین بار نکالنی پڑیں اور کچھ دُور سے ایسی ہی آوازیں سنائی دیں جیسے ایک گیدڑ بول رہا ہو۔ اب غلام نبی نے انہیں کہا کہ بس' تم اب نہ بولنا۔

"اب اگر چلے جاؤ تو اچھا ہے" ـــ غلام نبی نے کہا ـــ "تمہیں اتنی دیر کمپنی سے الگ نہیں رہنا چاہئے' کہیں پکڑے ہی نہ جاؤ"۔

"ہم تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جائیں گے" ـــ شفیع نے کہا ـــ "پکڑے گئے تو بھاگ کر ہم بھی انڈونیشیوں کے پاس چلے جائیں گے"۔

لانس نائیک نور عالم نے بھی یہی بات پرجوش لہجے میں کہی۔ غلام نبی نے انہیں کہا کہ ایک بار پھر گیدڑوں کی طرح بولو۔ دونوں پھر گیدڑوں کے انداز سے چیخے تو قریب سے ہی گیدڑ کی آواز آئی۔

چند منٹ ہی گزرے تھے کہ تین آدمی آتے نظر آئے۔ غلام نبی نے نُور عالم اور شفیع سے کہا کہ وہ بیٹھ جائیں تاکہ آنے والوں کو کوئی شک نہ ہو اور اگر انہیں شک ہو گیا تو وہ فوراً گولی چلا کر دونوں کو ختم کر دیں گے۔

اتنے میں تین انڈونیشی آئے اور غلام نبی نے اُن کی زبان میں کچھ کہا اور وہ دوڑ کر غلام نبی تک پہنچے اور جب انہوں نے نُور عالم اور شفیع کو دیکھا تو کچھ حیران ہوئے۔ غلام نبی کچھ اشاروں میں اور کچھ انڈونیشی الفاظ میں ان کے ساتھ بات کرتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی انڈونیشی زبان میں اپنا مطلب بیان نہیں کر سکتا۔ تین انڈونیشیوں نے ان

دونوں کی طرف دیکھا لیکن صرف دو نے ان دونوں کو باری باری گلے لگایا اور کہا ـــ "مسلم سمہ سمہ" ـــ لیکن تیسرا انڈونیشی پیچھے ہی کھڑا مسکراتا رہا۔ غلام نبی نے انہیں بتایا کہ یہ جوان لڑکی ہے اس لئے یہ انہیں ان دونوں کی طرح نہیں ملی۔

"اچھا دوستو!" ـــ غلام نبی نے لیٹے لیٹے ہاتھ اوپر کیا اور کہا ـــ "تم دونوں چلے جاؤ' میرے ساتھی پہنچ گئے ہیں' تم نے یہ جو نیکی کی ہے اس کا اجر تمہیں اللہ سے ملے گا"۔

دونوں نے غلام نبی کے ساتھ ہاتھ ملائے پھر انڈونیشیوں کے ساتھ ہاتھ ملائے اور وہاں سے چل پڑے۔ ان دونوں کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ انہیں گیدڑوں کی طرح کیوں بلوایا گیا تھا۔ یہ اشارہ تھا جس سے گوریلے ایک دوسرے کو بتاتے تھے کہ وہ کہاں ہیں یا وہ ایک دوسرے کو مدد کے لئے بلاتے تھے۔ میں آپ کو یہی بتا دیتا ہوں کہ ایسی آوازیں ہر روز یا ہر ایکشن میں نہیں نہیں نکالی جاتی تھیں بلکہ ہر بار کوئی اور ہی آواز مقرر کی جاتی تھی۔



سپاہی محمد شفیع نے ہمیں سنایا کہ وہ وہاں سے چل پڑے اور پھر دوڑنے لگے۔ شفیع کہتا تھا کہ غلام نبی نے ان کا ایمان تازہ کر دیا تھا۔ وہ بادلِ نخواستہ وہاں سے آئے۔ یہ غلام نبی کی عقلمندی تھی کہ اُس نے دونوں کو چلے جانے کو کہا تھا۔ اگر یہ دونوں اپنے جذبات کی پیروی کرتے تو ان انڈونیشیوں کے ساتھ ہی چلے جاتے لیکن غلام نبی جذبات میں آنے والا بندہ نہیں تھا۔

یہ دونوں دوڑتے ہوئے آئے اور کچھ دُور آ کر ذرا آہستہ چلنے لگے اور آپس میں یہ صلح مشورہ کرنے لگے کہ کمپنی سے الگ ہونے کی کیا وجہ بتائیں گے۔ شفیع نے ایک بات سوچی' ایک بات نُور عالم نے سوچی لیکن دونوں کے بہانے کوئی اتنے قابل قبول نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے لئے ایک مسئلہ یہ بھی پیدا کر لیا تھا کہ غلام نبی کا خون اُن دونوں کی وردیوں پر لگ گیا تھا اور یہ خون کوئی تھوڑا سا نہیں تھا جسے یہ چھپا لیتے۔ اس کا علاج انہوں نے یہ سوچا کہ اپنی بٹالین کا کوئی زخمی یا کوئی لاش تو ضرور ملے گی۔ اسے اٹھا لیں گے اور کیمپ میں لے جا کر پھینک دیں گے اور کہیں گے کہ یہ تو زخمی تھا اس لئے اسے اٹھا لیا تھا اور راستے میں مر گیا ہے۔

وہ کیمپ سے ابھی کچھ دور تھے کہ نور عالم کو ٹھوکر لگی اور وہ آگے کو گر پڑا۔ اُٹھ کر دیکھا اور شفیع نے تو پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ وہ لاش تھی۔ چاندنی میں ٹھیک نظر آ رہا تھا کہ وہ مرا ہُوا انڈونیشی گوریلا تھا۔ اس کی ٹامی گن اُس کے قریب ہی پڑی ہوئی تھی۔

"لو نُور بھائی!" —— شفیع نے کہا —— "ہمارا تو کام ہی بن گیا ہے۔ اللہ سبب بنانے والا ہے۔ اس کے ہتھیار سنبھالو اور بیان یہ دیں گے کہ اسے ہم نے مارا ہے اور یہ بھاگ رہا تھا اور ہم اسے اٹھا کر لا رہے تھے تو یہ یہاں آ کر مر گیا اور اسے ہم نے وہیں پھینک دیا"۔

نُور عالم کو یہ بات بہت اچھی لگی۔ اس نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا کہ اُس کی ذات باری نے ان کے بچنے کی صورت پیدا کر دی تھی.... انہوں نے اس انڈونیشی کی ٹامی گن اٹھالی، میگزینیں بھی لے لیں اور اُس کی بیلٹ میں سے اُس کا خنجر بھی نکال لیا۔

شفیع نے ہمیں سنایا کہ نُور عالم نے کہا کہ فائرنگ بہت دیر سے بند ہو چکی ہے اس لئے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ہم نے اس انڈونیشی گوریلے پر فائر کیا تھا، رائفلوں سے کچھ راؤنڈ فائر کر دیتے ہیں۔ یہ بات بھی ٹھیک تھی۔ دونوں نے ہوا میں تین تین راؤنڈ فائر کر دیئے اور وہاں سے چل پڑے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ تھوڑی ہی دُور ایک ٹیکری پر اپنی ایک پوسٹ ہے۔

دونوں اس پوسٹ سے تھوڑی ہی دور رہ گئے تو پوسٹ سے ایک لائٹ مشین گن فائر ہوئی جس کے تین چار راؤنڈ نُور عالم کے سینے میں لگے اور پار ہو گئے۔ اُس وقت شفیع اس سے تھوڑی ہی دُور تھا۔ وہ تجربہ کار سپاہی تھا۔ اس نے جنگِ عظیم لڑی تھی۔ اس نے قریبی درخت کی طرف ڈائیو لگائی اور درخت کے تنے کے پیچھے پیٹ کے بل گرا۔ مشین گن دائیں سے بائیں فائر کرتی آ رہی تھی۔ گولیاں شفیع کے اوپر سے گزر گئیں۔ اُس نے نہایت گندی گالیاں دے کر بڑی ہی بلند آواز سے کہا کہ ہم اے کمپنی کے جوان ہیں، فائر مت کرو لیکن یہ فائر اپنا کام کر گیا تھا۔ شفیع اُٹھ کر نُور عالم کے پاس گیا تو وہ مر چکا تھا۔

شفیع نے انڈونیشی کی ٹامی گن اور خنجر اور میگزینیں اٹھائیں اور نُور عالم کی لاش کو دوسرے کندھے پر ڈال لیا۔ وہ روتا اور گالیاں دیتا ہُوا وہاں سے چل پڑا۔ وہ مدد کے لئے بھی پکار رہا تھا لیکن جس پوسٹ سے مشین گن فائر ہوئی تھی، وہاں سے کوئی بھی اُس کی

مدد کو نہ آیا۔ وہ نُور عالم کی لاش بھی اٹھائے ہوئے تھا اور اس کی سٹین گن بھی اور اُس کے پاس اپنی رائفل بھی تھی، انڈونیشی کی ٹامی گن اور میگزینیں بھی تھیں، اس کا چلنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اس نے نور عالم کی لاش وہیں زمین پر رکھ دی۔

وہ دوڑ پڑا اور بڑی بلند آواز سے کہتا گیا کہ وہ دیکھو بی کمپنی کے کسی گنر نے لانس نائیک نُور عالم کو مار ڈالا ہے۔

اُس کی یہ پکار سن کر بٹالین کے کئی جوان اور صوبیدار وغیرہ اس کے پاس آ گئے اور پوچھا کہ اس نے یہ کیا شور مچا رکھا ہے۔ اُس نے بڑے غصے اور غم کی حالت میں انہیں بتایا کہ کیا ہوا ہے۔

انگریز افسروں تک یہ بات پہنچی اور شفیع کو بلا کر پوچھا۔ شفیع نے روتے ہوئے بتایا کہ وہ دونوں اپنی کمپنی سے الگ ہو گئے تھے اور انہیں ایسا شک ہُوا کہ ایک گوریلا چھپ چُھپ کر بھاگ رہا ہے۔ انہوں نے اس کا تعاقب کیا اور وہ کہیں غائب ہو گیا۔ اس کی تلاش میں وہ دونوں کمپنی سے الگ ہو گئے، آخر وہ انہیں نظر آ گیا اور اس پر اتنے راؤنڈ فائر کئے گئے کہ اس کا جسم چھلنی ہو گیا۔

شفیع نے اپنے بیان میں کہا کہ یہ انڈونیشی ابھی زندہ تھا۔ نور عالم نے اسے اٹھا لیا اور ہم دونوں کیمپ کی طرف آ رہے تھے کہ بی کمپنی کی ایک پوسٹ سے مشین گن فائر ہوئی اور اس سے نوُر عالم وہیں مر گیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ نوُر عالم کی لاش اٹھا کر لا رہا تھا لیکن ان ہتھیاروں کی وجہ سے وہ لاش کو راستے میں ہی رکھ آیا ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ یہ ہتھیار انڈونیشی گوریلے کے ہیں اور اُس کی لاش فلاں جگہ پڑی ہے۔

اتنے میں شفیع کی کمپنی واپس آ گئی۔ اس کمپنی کے کمپنی کمانڈر کو بھی اطلاع مل گئی کہ اس کی کمپنی کا ایک لانس نائیک بی کمپنی کے ایک گنر نے مار ڈالا ہے۔ اے اور بی کمپنی کے کمانڈر جو دونوں انگریز اور میجر تھے، شفیع کو ساتھ لے کر اُس طرف چل پڑے جہاں ایک جگہ نوُر عالم کی لاش پڑی تھی اور کچھ آگے انڈونیشی کی لاش تھی۔ ان انگریز افسروں نے اس پوسٹ پر چڑھ کر دیکھا جہاں سے مشین گن فائر ہوئی تھی۔ معلوم ہُوا کہ اس گنر نے اس سیکشن کمانڈر ہندو نائیک کے حکم پر گن فائر کی تھی۔

انگریز افسروں نے نائیک سے پوچھا کہ گوریلے کبھی کے چلے گئے ہیں اور فائر بند ہو چکا ہے تو پھر اس نے مشین گن فائر کیوں کروائی؟ اُس کے پاس یہی ایک جواب تھا کہ

اُسے شک ہُوا تھا کہ یہ گوریلے ہیں۔ انگریز افسر اس کی یہ بات نہ مانے۔ انہوں نے دو جوانوں سے کہا کہ وہ اس جگہ چلے جائیں جہاں پوسٹ سے نورُ عالم اور شفیع پر مشین گن فائر کی گئی تھی.... دونوں جوان وہاں گئے تو اس کے کمپنی کمانڈر نے اسے کہا کہ یہ دیکھو صاف پتہ چل جاتا ہے کہ وہ جوان اپنے آدمی ہیں۔

"کیا انڈونیشی گوریلوں کی وَردی ایسی ہی ہوتی ہے؟" — بی کمپنی کمانڈر نے پوچھا۔

نائیک کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ہندو تھا اور یہ پوری کمپنی ہندوؤں کی تھی۔ میں واضح کر دوں کہ یہ ہندو رہتک حصار اور کرنال وغیرہ کے علاقوں کے رہنے والے تھے۔ دوسرے ہندوؤں کو فوج میں بھرتی نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ انگریزوں کا خیال تھا کہ ہندو تجارتی اور کاروباری لوگ ہوتے ہیں۔ رہتک حصار کے ہندو جنگجو تسلیم کئے جاتے تھے اس لئے ان علاقوں سے فوج میں بھرتی ہوتی تھی۔

یہ ہندو جنگجو تھے یا نہیں' ان کی خصلتیں اپنی ہی قسم کی ہوتی تھیں۔ لڑائی میں اگر جم گئے تو سب جم گئے ورنہ ان میں سے کوئی ایک بھاگ اٹھتا تو پوری کمپنی بھاگ اٹھتی تھی۔ مسلمانوں اور سکھوں کے مقابلے میں یہ ہندو خاص لڑاکے نہیں تھے۔ بات دراصل یہ تھی کہ انڈونیشی گوریلوں نے شب خون مارا تو ان کا پہلا حملہ اس پوسٹ پر آیا۔ اس نائیک کی سیکشن کے چار جوان مارے گئے اور دو بُری طرح زخمی ہوئے تھے۔ یہ نائیک تو یوں سمجھیں چھاچھ کو پھونک پھونک کر پی رہا تھا۔ اُس پر گوریلوں کی ایسی دہشت طاری ہو گئی تھی کہ اُسے اپنے دو جوان آتے نظر آئے تو ان پر مشین گن کا فائر کروا دیا۔

○

یہ تھی لانس نائیک نور عالم کی موت کی اصل کہانی جس کے پس منظر سے صرف میں اور حوالدار امیر خان واقف تھے۔

سپاہی محمد شفیع نے ایسی عقلمندی سے یہ بیان دیا کہ کسی آفیسر کو شک بھی نہ ہُوا کہ یہ انڈونیشی گوریلوں سے بھی مل آیا ہے اور بٹالین کے ایک بھگوڑے حوالدار غلام نبی کو اٹھا کر انڈونیشی گوریلوں کے حوالے کر آیا ہے۔

اس کے بعد جو کچھ ہُوا وہ میں نے اپنی آنکھوں دیکھا اور میں وہ آپ کو سناتا ہوں... میں بھی وہیں تھا جب سپاہی شفیع چیختا چلّاتا کیمپ میں آیا تھا۔ اُس نے جب یہ کہا کہ

اُس نے اور نورُ عالم نے ایک انڈونیشی گوریلے کو کو مارا ہے اور اس کے ہتھیار لے آئے ہیں تو میرے بس میں ہوتا تو میں آگے بڑھ کر شفیع کے منہ پر تھوک دیتا۔ انڈونیشی مسلمانوں کے ساتھ ہم نے مسجد میں بیٹھ کر بھائی چارے کا جو وعدہ کیا تھا' شفیع نے وہ توڑ دیا تھا۔ یہ ایک گناہ تھا۔ ہمیں تو اُس نے تیسرے روز اصل بات بتائی تھی۔ میں آپ کو اُس رات کی بات سناتا ہوں نورُ عالم مارا گیا تھا۔ رات کو انگریز افسروں نے اس معاملے کو اتنا سنجیدہ یا سنگین نہ سمجھا۔ جنگ میں ایسے ہو ہی جاتا ہے کہ اپنے آدمی اپنے ہی کسی آدمی کی فائر کی زد میں آجاتے ہیں لیکن اگلی صبح بٹالین میں کوئی اور ہی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔

صورتِ حال یہ پیدا ہوئی کہ بٹالین کے مسلمانوں نے کھسر پھسر شروع کر دی تھی کہ اس ہندو نائیک نے مسلمان لانس نائیک کو دانستہ مارا ہے اور اس لئے مارا ہے کہ فوج کے مسلمان انڈونیشی مسلمانوں کے دوست بنے ہوئے ہیں اور مسلمان فوج سے نکل کر انڈونیشی مسلمانوں کے پاس جا رہے ہیں۔

جس طرح مجھے شفیع پر غصّہ تھا کہ اُس نے ایک انڈونیشی کو مارا ہے اسی طرح اے اور ڈی کمپنی کے جوانوں اور عہدیداروں میں غصے کی لہر پیدا ہو گئی کہ ہندو نائیک نے نورُ عالم کو دانستہ مارا ہے۔ یہ کھسر پھسر ان دونوں مسلمان کمپنیوں کے صوبیداروں تک پہنچی۔ ان میں ایک صوبیدار محمد اشرف تھا اور دوسرا صوبیدار نذر شاہ تھا۔ یہ دونوں بھی انڈونیشی مسلمانوں کو اپنا بھائی اور ان پر فائر کرنے کو گناہ سمجھتے تھے۔ ان دونوں صوبیداروں نے کمپنی کمانڈر کو بتایا کہ بٹالین کے مسلمانوں میں ہندوؤں کے خلاف احتجاج پیدا ہو گیا ہے جو خطرناک صورت اختیار کر سکتا ہے۔ یہ تو ہم دیکھ رہے تھے کہ ہندو اور سکھ انڈونیشی مسلمانوں کو گالیاں دیا کرتے تھے اور انہیں انگریزوں اور امریکیوں کا نہیں بلکہ اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ بہرحال غم وغصے کی لہر بٹالین کے مسلمانوں میں پھیل گئی اور ان صوبیداروں نے انگریز افسروں کو خبردار کر دیا۔

فوج میں اس قسم کی فرقہ وارانہ باتیں کرنا سنگین جرم سمجھا جاتا ہے۔ فوج میں تو یہ اصول بلکہ حکم تھا کہ کسی کا کوئی مذہب نہیں۔ سب فوجی ہیں' آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ان بھائیوں کو آپس میں نہیں لڑنا چاہئے۔ فرقہ وارانہ باتیں کرنے کو جرم سمجھا جاتا تھا لیکن وہاں مسئلہ کچھ اور تھا۔ انگریز افسر اچھی طرح جانتے اور سمجھتے تھے کہ آرمی کے

مسلمان انڈونیشی مسلمانوں کے حمایتی ہیں اور ہندو اور سکھ انہیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ ہمارا انگریز کمانڈنگ آفیسر اس مسئلے کو صرف ایک حکم سے دبا سکتا تھا کہ کوئی جوان یا کوئی افسر اس طرح کی فرقہ وارانہ بات کرے گا تو اُس کا کورٹ مارشل کیا جائے گا لیکن یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ آرمی کے مسلمان انڈونیشی مسلمانوں کے پاس بھگوڑے ہو کر جا رہے تھے۔ اس سلسلے کو روکنے کے لئے آرمی کے مسلمانوں کو مطمئن رکھنا بہت ہی ضروری تھا۔

ایک دن اور گزرا تو بٹالین کے مسلمان ذرا اونچی آواز سے احتجاج کرنے لگے۔ انگریز افسروں کو لحہ بہ لحہ رپورٹیں مل رہی تھیں۔ صوبیدار محمد اشرف اور صوبیدار نذر شاہ تو زیادہ ہی بھڑک اُٹھے تھے۔ اس زمانے کی فوج میں جمعدار اور صوبیدار وغیرہ انگریز افسروں کی خوشامد ایسے گھٹیا طریقے سے کیا کرتے تھے جیسے ان کے زر خرید غلام ہوں لیکن صوبیدار اشرف اور صوبیدار نذر شاہ خوشامد اور چاپلوسی کو بھول گئے اور انہوں نے انگریز افسروں کو خبردار کرنا شروع کر دیا اور یہ مشورہ دیا کہ اس نائیک کے خلاف کچھ نہ کچھ کارروائی ضرور ہونی چاہئے ورنہ مسلمان باغی ہو جائیں گے۔

انگریز بڑی ہی دانشمند اور دُور اندیش قوم تھی۔ وہ جانتے تھے کہ یہ جنگِ عظیم جیسی جنگ نہیں جہاں ذرا سی بات پر کورٹ مارشل کر کے سزا دی جا سکتی تھی۔ انہیں پورا پورا اندازہ تھا کہ یہ کچھ اور ہی قسم کی لڑائی ہے اور ان کے دشمن مسلمان ہیں اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مسلمان مسلمان کے خلاف ہتھیار اٹھانا گناہ سمجھتے ہیں۔ ہمارے کمانڈنگ آفیسر کو یقیناً معلوم ہو گا کہ پہلی جنگِ عظیم میں عراق کے محاذ پر ایک مسلمان رسالے کے تمام سواروں نے ترکوں کے خلاف لڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ بھی ہمارا کمانڈنگ آفیسر جانتا ہو گا کہ اُدھر محاذ پر ایک رسالے نے لڑنے سے انکار کیا اور اِدھر ہندوستان میں جھانسی کی چھاؤنی میں ایک اور مسلمان رسالے نے ترکوں کے خلاف جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس جھانسی کے رسالے کو محاذ پر جانے کا حکم ملا تھا۔ اس رسالے کو پتا چل گیا تھا کہ محاذ پر ایک مسلمان رسالے نے بغاوت کر دی ہے اور اس رسالے کو ان کی جگہ بھیجا جا رہا ہے تو ان تمام سواروں نے یہیں انکار کر دیا۔

جھانسی کے رسالے نے تو باقاعدہ مسلح بغاوت کر دی تھی۔ رسالے کے گھڑسواروں نے دو انگریز افسروں کو جان ہی سے مار ڈالا تھا اور باقی انگریز افسروں کے بنگلوں پر جا حملہ کیا تھا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ رسالہ گھڑسوار فوج کو کہتے ہیں۔ اب بھی اسے رسالہ

یعنی کیولری کہتے ہیں لیکن گھوڑوں کی جگہ ٹینک آ گئے ہیں۔

میں جب اُدھر سے ایک مدت بعد واپس اپنے گھر آیا تھا اور میں نے جنگی لٹریچر پڑھنا شروع کیا تھا تو ان دونوں رسالوں کی بغاوت کی پوری تفصیل "حکایت" میں پڑھی تھی جو مدیر "حکایت" نے لکھی تھی۔

انگریز افسروں کو یہ بھی معلوم تھا کہ شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلی پٹھان جب انگریزوں کے خلاف لڑ رہے تھے تو مسلمان نشانہ لے کر فائر نہیں کرتے تھے بلکہ ہتھیار کی نالیاں ذرا اوپر کر کے گولیاں چلاتے تھے۔ وہاں بھی ایسے واقعات ہوئے تھے کہ آرمی کے کچھ لوگ بھاگ کر پٹھانوں کے پاس چلے گئے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت آٹھ پنجاب کی پانچوں بٹالین کے غلام سرور سگنیلر نے حاصل کی تھی جو تمام تر قبائلی علاقے میں سرور پنجابی کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ وہ آخر پکڑا گیا اور بنوں جیل میں اُسے پھانسی چڑھایا گیا تھا۔ یہ تفصیلی کہانی بھی مدیر "حکایت" نے لکھی تھی۔

اب انڈونیشیا میں ایک ہندو نائیک کے حکم سے مشین گن فائر ہوئی اور ایک مسلمان لانس نائیک مارا گیا تو بٹالین میں ہندو مسلم کشیدگی پیدا ہو گئی۔ انگریز افسروں نے اس کشیدگی کو فوجی قانون کی روشنی میں نہ دیکھا بلکہ یہ دیکھا کہ ان کے دشمن انڈونیشی مسلمان ہیں اور اس صورت میں آرمی کے مسلمانوں کی دل آزاری نہیں ہونی چاہئے ورنہ اس سے دشمن کو تقویت پہنچے گی۔

یہ سب کچھ سوچ کر ہمارے کمانڈنگ آفیسر نے اس ہندو نائیک کے خلاف چارج شیٹ بنوائی اور بریگیڈ ہیڈکوارٹر میں بھیج دی۔ میرا خیال ہے کمانڈنگ آفیسر بریگیڈ کمانڈر سے ملا تھا اور اس کے ساتھ زبانی بات کی تھی۔ بریگیڈ ہیڈکوارٹر سے حکم آیا کہ اس نائیک کا کورٹ مارشل کیا جائے۔ کورٹ مارشل ہُوا اور اس نائیک کو سپاہی بنا دیا گیا۔ اس سے مسلمان خوش ہو گئے۔ سپاہی محمد شفیع کی جذباتی حالت یہ تھی کہ اُس نے عہد کر لیا تھا کہ وہ اس نائیک سے لانس نائیک نُورِ عالم کے خون کا بدلہ ضرور لے گا لیکن ایسے نہیں کہ وہ پکڑا جائے۔ وہ کہتا تھا کہ کسی آپریشن میں وہ موقع نکال کر اس نائیک کو گولی مار دے گا۔

میں کوئی ایسا عالم فاضل یا مفکر اور سیاستدان تو نہیں کہ اپنی عالمانہ رائے کا اظہار

کروں لیکن میں نے جو دیکھا اور جو محسوس کیا اور جو آج دیکھ رہا ہوں، اس کا تھوڑا سا ذکر ضرور کروں گا۔ اپنے قبائلی جب انگریزوں کے خلاف لڑ رہے تھے تو ہمارا ان کے ساتھ یہ خاموش معاہدہ تھا کہ ہم ان پر فائر نہیں کریں گے اور وہ ہم پر گولی نہیں چلائیں گے۔

انڈونیشیا کی جنگ آزادی میں انڈین آرمی کے مسلمانوں نے جس طرح ان کی مدد کی اور خطرے مول لے کر بھگوڑے ہوئے اور ان کے شانہ بشانہ لڑے، یہ ساری تفصیلات میں نے پیش کر دی ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم میں ہندوستانی فوجیوں کا ترکوں کے خلاف نہ لڑنا اور ایسے ہی کئی اور واقعات یہی بتاتے ہیں کہ اُمتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایک اُمت ہے اور مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔

میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں کسی عالم دین نے ایسا وعظ نہیں سنایا تھا کہ ہمیں مسلمانوں کے خلاف نہیں لڑنا چاہئے۔ اگر میں کچھ تھوڑا بہت پڑھا لکھا تھا تو ان سپاہیوں کے متعلق سوچیں جو چٹے اَن پڑھ تھے لیکن وہ انڈونیشی مسلمانوں سے جا ملے تھے۔ آخر یہ کیا جذبہ تھا جو انہیں اُس طرف لے گیا تھا؟.... یہ وہی جذبہ تھا جو چودہ سو سال پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں پیدا کیا تھا۔ وہی جذبہ آج بھی ہمارے خون میں چلا آ رہا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جسے آج کفار مسلمانوں کے دلوں سے نکال پھینکنا چاہتے ہیں۔ ساری دنیا پر نگاہ ڈالیں۔ مسلمانوں کے لئے کہیں بھی امن و امان نہیں، ان کے اپنے ملکوں میں بھی امن و امان نہیں اور مسلمان آپس میں خون خرابے میں لگے ہوئے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھیں، اس آپس کی خونریزی میں یہودی اور صلیبی کا ہاتھ نظر آئے گا۔

برطانوی کرنل لارنس کے متعلق تو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہوں گے۔ وہ عرب میں جاسوس بن کر گیا تھا اور اکثر لوگ اسے جاسوس ہی سمجھتے چلے آ رہے ہیں لیکن وہ صرف جاسوس نہیں تھا۔ وہ بہت بڑی نظریاتی تخریب کاری کے لئے وہاں بھیجا گیا تھا۔ اُس وقت عراق اور چند اور علاقوں پر ترکوں کی حکومت تھی۔ کرنل لارنس نے عربوں کا ہمدرد بن کر ان کی اس طرح برین واشنگ کی کہ تم عرب ہو اور وہ یعنی ترک غیر ملکی ہیں اور تم پر حکومت کر رہے ہیں۔ اُس نے مسلمانوں پر ترک اور عرب کا لیبل لگا کر انہیں دو حصوں میں کاٹ دیا اور اسلام کا رشتہ توڑ دیا۔

ہندوستان میں آزادی سے پہلے ہندوؤں کے روحانی پیشوا مہاتما گاندھی نے ایک فتنہ پیدا کیا تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے لوگ پہلے ہندوستانی ہیں اور اس کے بعد وہ مسلمان، ہندو، سکھ اور عیسائی وغیرہ ہیں۔ اُس کا مطلب یہ تھا کہ مذہب ثانوی حیثیت رکھتا ہے اور مذہب کی بنیاد پر کوئی رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔ اصل رشتہ وطن کے ساتھ ہوتا ہے۔ بظاہر اُس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کے لوگ اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھیں اور مذہب کو کوئی اہمیت نہ دیں۔

یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ مہاتما گاندھی اپنے ہندو مذہب کو اہمیت نہ دیتا، اس کا درپردہ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے دلوں سے اسلامی رشتہ اور جذبہ نکال دیا جائے۔ اُس نے ہندوانہ عیاری اور مکاری سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کے علماء دین کو بھی اپنے جال میں لے لیا تھا اور ان پر نیشنلسٹ علماء کا لیبل لگا دیا تھا۔ افسوسناک بلکہ انتہائی شرمناک حقیقت یہ ہے کہ علماء مہاتما گاندھی کے ہمنوا بن گئے اور اس طرح ہندوستان کے مسلمان نظریاتی طور پر دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک حصہ تو وہ تھا جس نے اپنے الگ اسلامی وطن کا مطالبہ کیا اور اس کے لئے جنگِ آزادی لڑی اور دوسرا حصہ وہ تھا جو اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھتا اور ہندوستان کی آزادی کے لئے ہندو کے ساتھ ہندو ہو گیا تھا، لیکن اسلامی جذبہ مرا نہیں کرتا۔ انہی وطن پرستوں سے مسلمان الگ ہونے لگے اور تحریکِ پاکستان میں شامل ہو گئے۔

ہندوؤں، یہودیوں اور اہلِ صلیب کی یہ کوششیں جاری رہیں اور انہوں نے طرح طرح کے ہتھکنڈے اور پُرکشش طریقے استعمال کر کر کے مسلمانوں کو مصری، عراقی، ایرانی، شامی، عربی اور ترک وغیرہ میں تقسیم کر دیا اور اب ساری دنیا میں مسلمان بٹ کر اس قدر کمزور ہو گئے ہیں کہ وہ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے اور اہلِ صلیب کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں۔

میں کوئی نئی بات نہیں کہہ رہا۔ آپ سب دیکھ رہے ہیں کہ ساری دنیا میں مسلمانوں کا خون بہہ رہا ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت کو یاد کریں جب مسلمانوں کی سلطنت دُور دُور تک پھیل گئی تھی لیکن وہ سب مسلمان کہلاتے تھے۔ ان کے ملک الگ الگ نہیں تھے۔ وہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت تھے۔ فرقہ بازی یعنی فرقہ بندی ایک الگ موضوع ہے، میں ملکوں کی بات کر رہا ہوں۔ اُس

وقت مسلمانوں کے درمیان سفارتی تعلقات نہیں تھے بلکہ سب اسلامی رشتے میں منسلک تھے۔ تسبیح کے دانوں کی طرح ایک ہی ڈوری میں پروئے ہوئے تھے۔ یہود و نصاریٰ نے بڑی کامیابی سے تسبیح کے ان دانوں کو بکھیرا اور دنیا کی اس عظیم طاقت کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ اپنے ملک میں دیکھ لیں۔ ایک ملک کے باشندے ہو کر اور ایک دین کے پیروکار ہو کر ہم ایک نہیں رہے۔ ہم ایک طرف مذہبی فرقوں میں اور دوسری طرف سیاسی جماعتوں میں بٹ گئے ہیں اور ایک دوسرے کے منہ نوچ رہے ہیں۔ پھر بھی میں کہتا ہوں کہ اخوت و اتحاد کا جذبہ مسلمانوں کے خون میں چلا آرہا ہے۔ اسے وقتی طور پر دبایا جا سکتا ہے ہمیشہ کے لئے نہیں۔ قباحت یہ پیدا ہو گئی ہے یا ہمارے لیڈروں نے ہم میں پیدا کر دی ہے کہ ہم لوگ دنیاوی مفادات کو عزیز سمجھنے لگے ہیں اور اسلام کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔

میں یہ بات بعد میں لکھنا چاہتا تھا لیکن ذکر اسلامی رشتے کا آگیا ہے تو میں اس کا مختصر سا ذکر یہیں کر دیتا ہوں۔ انڈونیشیا کی جنگِ آزادی میں انڈین آرمی کے مسلمان فوجی انڈونیشی مسلمانوں کے ساتھ جا ملے تھے' ان کی تعداد کوئی معمولی سی نہیں تھی۔ اس وقت ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ ایک روز ہم آزاد ہوں گے اور ہندوستانی کی بجائے پاکستانی کہلائیں گے۔ یہ تو ہمیں بالکل معلوم نہیں تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے الگ وطن کے لئے آزادی کا جہاد شروع کر دیا ہے جو بعد میں تحریک پاکستان کے نام سے مشہور ہوا۔ ہم نے انڈونیشی مسلمانوں کا ساتھ دیا تو وہ اسلامی جذبے کے تحت اور اللہ کے حکم سے دیا تھا لیکن انڈونیشیا والوں نے اس وقت ہمارا ساتھ دیا جب ہم پر ایک وقت آن پڑا تھا۔

یہ تھی ستمبر 1965ء کی پاک بھارت جنگ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ جذبے کے زور پر لڑے تھے ویسے ہندوستان کی جنگی طاقت کے سامنے ہماری کوئی جنگی طاقت نہیں تھی۔ ہندوستان نے اکیس ڈویژنوں سے حملہ کیا تھا جسے ہمارے پانچ ڈویژنوں نے روکا تھا۔ ہمارے ڈویژن پورے پانچ نہیں تھے۔ ایک ڈویژن ادھورا تھا۔ صرف ایک مثال دیتا ہوں۔ چونڈہ میں ٹینکوں کی جنگ ہوئی تھی۔ اس میں چھ سو سے ایک ہزار ٹینک ہندوستان کے تھے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے پاس صرف ڈیڑھ سو ٹینک تھے۔ انسانی نفری کا حساب یہ تھا کہ انڈین آرمی کی نفری پچاس ہزار تھی اور ادھر ہماری کل نو ہزار

نفری تھی۔ تمام محاذوں پر دونوں طرف جنگی طاقت کی اور نفری کی نسبت تناسب ایسے ہی تھی۔

مسلمان ممالک نے کچھ نہ کچھ ہماری مدد کی تھی لیکن جو مدد انڈونیشیا نے کی تھی' وہ کن ہے اور ایک بڑا ہی اہم اور تاریخی واقعہ ہے۔ اُس وقت انڈونیشیا کا صدر احمد جرنل سوئیکارنو مرحوم تھا۔ انڈونیشیا کی جنگِ آزادی کا لیڈر بھی وہی تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ انڈین آرمی کے جو مسلمان اس کی جنگ آزادی میں اس کے ساتھ جا ملے تھے وہ سب پاکستان میں آنے والے علاقوں کے تھے۔ اب وقت آگیا تھا کہ وہ دوستی کا حق ادا کر دے۔

ہمارے ایئرفورس کے سابق کمانڈر انچیف ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خان جو ستمبر 65ء میں ریٹائر ہو چکے تھے' مدد کے لئے انڈونیشیا گئے اور سوئیکارنو مرحوم سے ملے۔

سوئیکارنو مرحوم نے حکم دے دیا کہ پاکستان جو کچھ بھی مانگتا ہے اُسے دے دیا جائے۔ اصغر خان کا بیان ہے کہ ان کے لئے وہاں اسلحہ خانے اور بارود خانے کے سٹور کھول دیئے گئے اور کہا جو چاہئے اور جتنا چاہئے لے جاؤ۔

سوئیکارنو مرحوم نے ایک اور ہی بات کہہ دی جس کی توقع نہیں تھی۔ خلیج بنگال میں انڈیمان کے نام سے جزیروں کا ایک جھرمٹ ہے جو کسی وقت کالا پانی کہلاتا تھا۔ ان جزائر پر ہندوستان کا قبضہ ہے اور یہ جزائر ہندوستان کو انگریز دے گئے تھے۔ سوئیکارنو مرحوم نے ایئر مارشل اصغر خان سے کہا کہ وہ اپنی افواج کو حکم دے دے گا کہ جا کر جزائر انڈیمان پر قبضہ کر لو کیونکہ یہ جزائر ہمارے ہیں' ہندوستان کے نہیں۔ سوئیکارنو کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح وہ ہندوستان کی توجہ انڈیمان کی طرف کر لیں گے اور پاکستان کی سرحدوں پر ہندوستان کی فوجی پوزیشن کمزور ہو جائے گی۔

ایئر مارشل اصغر خان نے یہ تجویز قبول نہ کی اور کہا کہ وہ اپنے مفاد کی خاطر انڈونیشیا کو اتنا زیادہ نہیں الجھانا چاہتے۔ سوئیکارنو مرحوم نے اپنی ایئرفورس کو حکم دے دیا کہ دو سو مگ لڑاکا بمبار طیارے ہوابازوں سمیت تیار رہیں اور اشارہ ملنے پر مشرقی پاکستان پہنچ جائیں۔

یہ کوئی معمولی سی مدد نہیں تھی۔ اُس وقت مگ طیارے کو فضا کی دہشت کہا کرتے تھے۔ سوئیکارنو مرحوم کو روس نے مگ طیارے دیئے تھے۔ سوئیکارنو وہ طیارے اپنے

ہوابازوں سمیت مشرقی پاکستان بھیج رہے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ وہ تیار تھے کہ ہندوستان نے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا تو انڈونیشیا کے یہ لڑاکا ہوا باز مگ طیارے لے کر پہنچ جائیں گے۔ اس اتنی بڑی مدد میں ایک آبدوز بھی شامل تھی جو انڈونیشیا سے کراچی پہنچ گئی تھی اور پھر وہ خلیج بنگال میں زیر آب گشت کرتی رہی۔ میں پورے وثوق کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا لیکن یہ بھی مشہور ہو گیا تھا کہ سوئیکارنو مرحوم نے اپنی نیوی خلیج بنگال کی طرف بھیج دی تھی اور کہا تھا کہ مشرقی پاکستان سے ذرا دور دور رہیں اور جوں ہی کال ملے مشرقی پاکستان کے ساحل پر پہنچ جائیں۔

آپ کو یاد ہو گا کہ ہندوستان نے ستمبر 1965ء میں مشرقی پاکستان پر حملہ نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہندوستانیوں کو پتہ چل گیا تھا کہ انڈونیشیا کی نیوی اور ایئر فورس مشرقی پاکستان کے دفاع کے لئے تیار ہے۔ مختصر یہ کہ انڈونیشیا نے پاکستان کی جنگ کو اپنی جنگ سمجھ لیا تھا۔

یہ تو انڈونیشیا کی سرکاری مدد تھی۔ انڈونیشیا کے شہریوں کا جذبہ دیکھیں۔ انہیں خبر ملی کہ ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے تو انہوں نے جکارتا میں جو انڈونیشیا کا دارالحکومت ہے' ہندوستانی سفارت خانے پر حملہ کر دیا۔ انڈونیشیا کے بڑے بڑے شہروں میں ہندوستانی تاجر اور دکاندار اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ انڈونیشی مسلمانوں نے ان کی دکانوں اور ان کے تجارتی اداروں پر حملے شروع کر دیئے اور لوگوں سے کہا کہ ان سے یعنی ہندو دکانداروں سے کوئی چیز نہ خریدیں۔ اس وقت کے اخبار گواہ ہیں کہ انڈونیشیا سے بے شمار ہندو تاجر اور دکاندار بھاگ کر ہندوستان آ گئے تھے۔

یہ کیا تھا؟..... یہ اسلامی رشتے کی کرامات تھی۔ ایک ہی سال بعد امریکہ اور ہندوستان نے جس طرح سوئیکارنو مرحوم کو اس کی سزا دی تھی' وہ میں آگے چل کر سناؤں گا۔

O

اب وہیں واپس آ جائیں جہاں ہماری بٹالین پر انڈونیشی گوریلوں نے شب خون مارا تھا۔ اُسی روز بٹالین اپنے زخمیوں کو اٹھا کر واپس آ گئی۔ ہندو اور سکھ جو وہاں مارے گئے تھے' اُن کی لاشیں ہندوؤں اور سکھوں نے جلا دی تھیں اور مسلمانوں کو الگ الگ قبروں میں دفن کر دیا گیا تھا۔ ہم نے سب کا مشترکہ جنازہ پڑھا تھا۔ یہ ہماری بٹالین کی بڑی

شرمناک شکست تھی۔ انڈونیشی گوریلوں نے بٹالین کو آپریشن آرڈر میں بتائے ہوئے مقام تک پہنچنے ہی نہیں دیا تھا۔

اس کے ایک مہینہ بعد یا اسی عرصے کے لگ بھگ اس ہندو نائیک کا کورٹ مارشل ہوا اور اُسے سپاہی بنا دیا گیا تھا۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ سپاہی محمد شفیع اس سزا سے مطمئن نہیں تھا جو اس ہندو نائیک کو دی گئی تھی۔ ایک نائیک کا عہدہ چھن جانا کوئی معمولی سزا نہیں تھی۔ وہ تو سیکشن کمانڈر تھا لیکن سپاہی بنا دیا گیا۔ شفیع کہتا تھا کہ وہ اس سے نُور عالم کے خون کا بدلہ لے گا تو ہم سمجھتے تھے کہ یہ محض جذباتی باتیں کر رہا ہے۔ میرا اس کے ساتھ کبھی کبھی آمنا سامنا ہوتا تھا۔ وہ نُور عالم کو بہت ہی یاد کرتا تھا اور یہ تو ضرور ہی کہتا تھا کہ وہ اس کے خون کا بدلہ لے گا۔ میں نے اسے ہر بار کہا کہ وہ یہ ارادہ دل سے نکال دے ورنہ باقی عمر اُسے جیل میں گذارنی پڑے گی۔ میں اُسے یہ بات زور دے کر نہیں کہا کرتا تھا کیونکہ میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ اس بات میں کوئی ایسا سنجیدہ نہیں اور دیہاتیوں اور سپاہیوں والی بات کر رہا ہے۔

کمانڈنگ آفیسر نے ایک نئی چال چلی۔ راتوں کو پٹرول پارٹیاں کیمپ سے دُور جنگل میں جایا کرتی تھیں۔ ان میں عام طور پر نفری آٹھ دس جوانوں کی ہوتی تھی اور ان کا کمانڈر نائیک یا حوالدار ہوتا تھا۔ کبھی کبھی پٹرول پارٹی یعنی گشتی پارٹی زیادہ نفری کی بھیجی جاتی تھی۔ ایسی پارٹی کی نفری بیس اور اس سے کچھ اوپر بھی ہُوا کرتی تھی۔ تمام کمپنیاں باری باری پٹرول پارٹیاں بھیجتی تھیں۔ ہوتا یہ تھا کہ مسلمان کمپنی کی پٹرول پارٹی جاتی تو اس میں سارے ہی مسلمان ہوتے تھے۔ اسی طرح ہندوؤں کی کمپنی تھی اور سکھوں کی بھی۔

نیا حکم یہ دیا کہ آئندہ زیادہ نفری کی پٹرول پارٹی جائے تو اس میں صرف ایک مذہب کے لوگ نہ ہوں بلکہ تینوں مذہبوں کے جوان شامل ہوں۔ مثلاً" بیس یا پچیس جوانوں کی پارٹی بھیجنی ہوتی تو اس میں کچھ مسلمان' کچھ ہندو اور کچھ سکھ شامل کئے جاتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمان الگ تھلگ نہ جایا کریں کیونکہ ان کا رابطہ انڈونیشی گوریلوں کے ساتھ ہو جاتا ہے اور پھر یہ مسلمان جوان اپنی ڈیوٹی کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ یہ تو عام طور پر دیکھا گیا کہ کسی ہندو یا سکھ پٹرول پارٹی پر گوریلوں نے فائرنگ کی اور دو تین آدمی مار ڈالے۔

کبھی کبھار ایسی فائرنگ ہو ہی جاتی تھی لیکن یہ دیکھا گیا کہ جب مسلمان پٹرول پارٹی جاتی تھی تو اس پر کبھی فائرنگ نہیں ہوئی تھی نہ کبھی ان کا کوئی جوان زخمی ہوا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اور پھر ہندو مسلم کشیدگی دیکھ کر کمانڈنگ آفیسر نے یہ نیا طریقہ رائج کر دیا کہ زیادہ نفری کی پٹرول پارٹی کی نفری تینوں قوموں کی ملی جلی ہو۔

اس ہندو نائیک کا کورٹ مارشل ہو چکا تھا جس کی پوسٹ سے مشین گن فائر ہوئی اور لانس نائیک نُور عالم مارا گیا تھا۔ وہ اب نائیک سے سپاہی بن گیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے' اس کے آٹھ دس روز بعد سولہ جوانوں کی ایک پٹرول پارٹی بھیجنے کا حکم ملا۔ جمعدار ایجوٹنٹ نے جو پارٹی بنائی اس میں چاروں کمپنیوں کے چار چار جوان شامل کئے گئے۔ اس طرح اس پارٹی میں چار ہندو' چار سکھ اور آٹھ مسلمان ہو گئے۔ آٹھ مسلمان اس لئے کہ دو کمپنیاں مسلمانوں کی تھیں۔ ان کا کمانڈر ایک سکھ حوالدار تھا۔ اس پارٹی نے رات دس بجے روانہ ہونا اور چار بجے واپس آنا تھا۔

یہ پارٹی بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے ایک حکم کے تحت بھیجی جا رہی تھی۔ میں نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا یہ آرڈر پڑھا تھا۔ ہماری بٹالین کے کیمپ سے تقریباً" دو میل دُور سے ایک پگڈنڈی گزرتی تھی۔ ایک خاص ایریا بتایا گیا تھا جس میں اس پگڈنڈی کے دونوں طرف چھُپ کر گشت کرنی تھی۔ انٹیلی جنس نے کچھ اس قسم کی اطلاع دی تھی کہ انڈونیشی گوریلوں کی ایک پارٹی' پیدل یا گاڑی میں اس علاقے میں سے رات کو کسی بھی وقت گزرے گی۔ اس گوریلا پارٹی کو وہیں ختم کرنا تھا اور ایک دو گوریلوں کو زندہ پکڑ کر لانا تھا۔

میں یہ نہیں بتا سکتا کہ اس گوریلا پارٹی میں کیا خاص بات تھی کہ اسے گھات میں لینا اور اس میں سے ایک دو آدمیوں کو زندہ لانا تھا۔ یہ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا پلان تھا اور مجھے اس پلان کی بیک گراؤنڈ کا کچھ بھی علم نہ تھا۔ میں اتنا ہی جانتا تھا کہ ہماری بٹالین سے سولہ جوانوں کی پارٹی جانی ہے اور کہیں گھات لگانی ہے اور اس ایریے کی دیکھ بھال کرنی ہے۔

رات کو مقررہ وقت پر یہ پارٹی چلی گئی۔ یہ تو آئے دن کا معمول تھا کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ میں نے بھی کوئی توجہ نہ دی۔ میں اپنی توجہ کی بات اس لئے کر رہا ہوں کہ جب بھی بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے کوئی آپریشن آرڈر یا کوئی خاص آرڈر آتا تھا تو میں یہ ضرور دیکھتا تھا۔ دیکھنے سے میرا مقصد یہ ہوتا تھا کہ کوئی ایسا آرڈر ہو جو پہلے انڈونیشیوں

تک پہنچانے والا ہو تو میں اس کا بندوبست کر دوں۔ اب میں نے اور میرے چند ایک ساتھیوں نے ایک پکا بندوبست کر لیا تھا جس کے تحت کوئی ضروری اطلاع دینی ہوتی تو وہ ساتھ والی آبادی میں پہنچا دی جاتی تھی۔ اس پٹرول پارٹی کی اطلاع پہنچانا ضروری نہیں تھا۔

صبح اٹھے تو میں اپنے دفتر چلا گیا۔ دفتر ایک بڑے سائز کے چوکور خیمے میں بنایا گیا تھا۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ صبح صبح ہی بڑی دلچسپ رپورٹ آئی۔ انگریز افسروں کو میں نے بھاگتے دوڑتے دیکھا۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ کوئی خاص گڑبڑ ہو گئی ہے۔

گڑبڑ جو ہوئی تھی وہ خاصی دلچسپ تھی۔ ہوا یہ تھا کہ یہ پٹرول پارٹی اُس ایریے میں پہنچ گئی جو اُسے دکھایا گیا تھا۔ سکھ حوالدار نے اس پارٹی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ آٹھ جوان پگڈنڈی سے ذرا ہی دُور ایک طرف اور آٹھ دوسری طرف آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ حوالدار نے جوانوں کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ اپنے آپ کو چھپا کر رکھنا ہے اور کسی قسم کی آواز پیدا نہیں کرنی۔ چھپانا بھی اس طرح ہے کہ پگڈنڈی نظر آتی رہے۔

حوالدار نے جوانوں کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ گوریلوں کی ایک پارٹی پیدل یا گاڑی میں گزرے گی اور گاڑی فوجی ہو گی۔ اس گاڑی پر فائر کرنا ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھاگ کر نہ جائے اور ان میں سے ایک دو کو زندہ پکڑنا ہے۔

○

یہ سکھ حوالدار اور تمام جوان پٹرول پارٹیوں کے عادی ہو چکے تھے۔ گھات لگانا' دشمن کی کسی پارٹی کو گھیرے میں لینا اور اس پر اس طرح حملہ کرنا کہ وہ نکل نہ سکے اور جوابی کارروائی بھی نہ کر سکے' ان کے تجربے میں تھا اور ان سب کو بہت تجربہ ہو چکا تھا۔ انہیں اتنا زیادہ سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔

تقریباً" دو گھنٹوں کی گشت کے بعد دُور سے ایک گاڑی کی آواز آنے لگی۔ وہ جنگل تھا' کوئی شہر تو نہیں تھا جہاں رات کو بھی گاڑیاں چلتی رہتی ہیں۔ وہ سارا علاقہ یوں سمجھیں کہ فوجی علاقہ تھا اور وہاں جنگ لڑی جا رہی تھی لیکن یہ عام جنگ نہیں "گوریلا جنگ تھی جس میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کس وقت کیا ہو جائے۔

گاڑی آ رہی تھی۔ پگڈنڈی خاصی چوڑی تھی اور کچھ اونچی نیچی بھی تھی۔ اس ایریے میں بھی ٹیکریاں اور چٹانیں تھیں اور جنگل گھنا تھا۔ پگڈنڈی سیدھی نہیں تھی

بلکہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مُڑتی تھی۔

حوالدار نے بڑی تیزی سے پگڈنڈی کے دونوں طرف اپنی پارٹی کو پوزیشن میں کر دیا اور کہا کہ پہلا فائر وہ خود کرے گا اور اُس کا ٹارگیٹ گاڑی کا ڈرائیور ہو گا۔ جوان تیار ہو گئے۔ حوالدار کے خیال کے مطابق گھات بڑی صحیح اور مکمل تھی۔

گاڑی جب پچیس تیس گز دور رہ گئی تو اس کے انجن کی آواز بند ہو گئی اور وہ ویسے ہی چلتی آئی۔ حوالدار کے بیان کے مطابق گاڑی کا انجن رک گیا تھا اور ایسی آوازیں آنے لگی تھیں جیسے ڈرائیور گاڑی کو سٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں ایسی آواز کو پہچاننا کوئی مشکل نہیں تھا۔ کچھ اور قریب آ کر گاڑی رک گئی۔

سکھ حوالدار نے رائفل سے پہلا فائر کیا اور اس کے ساتھ ہی دونوں طرف سے پارٹی نے فائر کھول دیا۔ اب ہونا یہ چاہئے تھا کہ اس گاڑی میں سے گوریلے کود کود کر اُترتے اور اس فائرنگ کی زد میں آتے اور جو اس زد سے ٹھیک نکل جاتے وہ بھاگ جاتے یا کہیں پوزیشن لے کر جوابی فائر کرتے لیکن کوئی ایسی حرکت نظر نہ آئی۔ گاڑی ایسی جگہ رکی تھی جہاں ایک جُھنڈ چار پانچ بڑے اونچے اور گھنے درختوں کا تھا۔ چاندنی تو ٹھیک ٹھاک تھی لیکن چاند گھرے بادلوں کے پیچھے چھُپ گیا تھا۔

یہ گاڑی بڑا فوجی ٹرک تھا جسے ہم تین ٹن ٹرک کہا کرتے تھے۔ اس پر ترپال چڑھا ہُوا تھا۔ اس گاڑی کی طرف سے ایک گولی بھی فائر نہ ہوئی۔ سکھ حوالدار نے فائر بند کرا دیا اور جوانوں کو اشارہ کیا کہ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھیں اور ٹرک کو ہر طرف سے گھیر کر قریب جائیں۔

جوان آہستہ آہستہ اپنی پوزیشنوں سے سرکتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ جب وہ کچھ قریب پہنچ گئے تو سکھ حوالدار نے کسی جوان کو بلند آواز میں کوئی بات کہی۔ گھات میں یہ خیال رکھا جاتا تھا کہ ذرا سی بھی اونچی آواز نہ نکلے لیکن کوئی ایسی بات ہو گئی کہ سکھ حوالدار کے منہ سے بڑی بلند آواز نکل گئی۔ ظاہر ہے اُس نے اپنی ٹھیٹھ پنجابی میں کچھ کہا ہو گا۔

"کون ہو تم لوگ!" ـــــ ٹرک کے قریب سے آواز اٹھی ـــــ "اپنی گاڑی پر فائر کرتے ہو؟.... آگے آؤ اور ہم کو پہچانو"۔

سکھ حوالدار دوڑ کر آگے گیا۔ وہ جب آگے جا رہا تھا تو اُس نے دیکھا کہ ٹرک کے

دائیں طرف سے ایک آدمی اٹھا اور ایک آدمی ٹرک کے نیچے سے نکل رہا تھا۔ سکھ حوالدار نے قریب جا کر دیکھا تو وہ اپنے ہی فوجی تھے۔ ان میں ایک نائیک تھا اور ایک سپاہی۔ بات ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ فرنٹیئر فورس کے جوان ہیں۔ فرنٹیئر فورس ہم سے کوئی چھ سات میل دُور مقیم تھی اور اُس کی ذمہ داری کا ایریا دوسری طرف تھا۔

اس ٹرک میں کچھ سامان تھا جو رات ہی رات کہیں پہنچانا تھا۔ گاڑی کو سامنے سے دیکھا، سامنے والی سکرین میں سے سکھ حوالدار کی فائر کی ہوئی گولی گزری تھی اور سکرین میں سوراخ ہو گیا تھا اور اس میں لمبی لمبی لکیریں پڑ گئی تھیں یعنی سکرین ٹوٹ گئی تھی۔ سکھ حیران تھا کہ اُس کی گولی بالکل ڈرائیور کی سیدھ میں لگی تھی پھر ڈرائیور بچ کس طرح گیا تھا۔ ہُوا یہ تھا کہ گولی سکرین میں لگنے سے چند سیکنڈ پہلے ڈرائیور گاڑی میں سے نکل گیا تھا۔ جب پارٹی نے فائر کھولا تو دونوں ٹرک کے نیچے چھُپ گئے تھے۔ وہ بھی فوجی تھے اور اس قسم کے اچانک فائر سے بچنے کا تجربہ رکھتے تھے۔

وہ دونوں پٹھان تھے اور ان کے ٹرک پر فائر ہُوا تھا، وہ تو سخت غصے میں آ گئے اور واہی تباہی بکنے لگے۔ ہمارا سکھ حوالدار سخت پریشان ہو گیا کہ انہیں کس طرح راضی کرے لیکن ٹرک کی سکرین ٹوٹ گئی تھی اور ٹرک پر اتنی گولیاں لگی تھیں کہ ترپال چھلنی ہو گیا تھا۔ ٹرک پر جو سامان لدا ہُوا تھا وہ کوئی خاص اہم اور قیمتی نہیں تھا۔ سکھ حوالدار نے اُن سے معافی مانگی اور بتایا کہ اسے کیا مشن دیا گیا تھا اور اس کے مطابق وہ اس ٹرک کو گوریلوں کا ٹرک سمجھا تھا۔

اتنے میں ایک اور گاڑی کی آواز آنے لگی۔ سکھ حوالدار نے کہا کہ یہ ہو سکتی ہے وہ گاڑی جسے گھات میں لینا تھا، اس میں انڈونیشی گوریلے ہوں گے۔

"تم سکھ ہے!" ـــــ پٹھان نائیک نے کہا ـــــ "وہ بھی ہمارا گاڑی ہے۔ اس میں چودہ پندرہ جوان آ رہے ہیں۔ وہ ہمارا ایسکارٹ ہے۔ شاید ان کا گاڑی بھی خراب ہو گیا تھا"۔

اتنے میں وہ گاڑی بھی قریب آ کر رکی اور اس میں سے فرنٹیئر فورس کا ایک حوالدار اُترا اور پوچھنے لگا کیا بات ہے؟ اُسے بات سنائی گئی اور جب اُس نے سامان والا ٹرک دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ یہ پٹھان تو اس سکھ کو معاف کر سکتے تھے لیکن گاڑی کو جو نقصان پہنچا تھا اسے چھپانا ممکن نہیں تھا۔ اس واقعہ کی رپورٹ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو جانی ہی تھی۔

اس علاقے میں رات کے وقت کوئی فوجی ٹرک خصوصاً" وہ ٹرک جس میں سامان ہوتا' اکیلا نہیں جا سکتا تھا۔ اس ٹرک کے ساتھ ایک ٹرک میں اس کے لئے حفاظتی دستہ آ رہا تھا لیکن جس طرح سامان والی گاڑی کا انجن رک گیا تھا' اسی طرح اس پچھلی گاڑی میں بھی کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔ یہ گاڑی پیچھے رک گئی اور سامان والی گاڑی والوں کو پتہ ہی نہ چلا۔ اتفاق سے سامان والی گاڑی یہاں آ کر فیل ہو گئی۔ پوری جنگِ عظیم میں یہ گاڑیاں استعمال ہوئی تھیں اور استعمال بھی سڑکوں پر نہ ہوئیں بلکہ جنگلوں پہاڑوں اور اسی قسم کے دشوار گذار راستوں میں استعمال ہوتی رہیں۔ ان گاڑیوں کا تو بُرا ہی حال ہو گیا تھا۔ اکثر گاڑیاں اسی طرح راستے میں رک جاتی تھیں۔

یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ پچھلی گاڑی دور ہی رُک گئی تھی۔ اگر دونوں گاڑیاں اکٹھی آ رہی ہوتیں تو یوں ہوتا کہ سامان والی گاڑی رکتی تو پچھلی گاڑی بھی رک جاتی جس میں حفاظتی دستہ تھا۔ ان پر فائرنگ ہوتی تو جانی نقصان ہوتا اور وہ بھی آخر فوجی تھے' جوابی فائر کر کے پٹرول پارٹی کو اچھا خاصا نقصان پہنچا سکتے تھے۔ ایک بڑا ہی خوفناک حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

اگر اگلی گاڑی کو نقصان نہ پہنچا ہوتا تو سکھ حوالدار اور پٹھان حوالدار آپس میں تصفیہ کر سکتے تھے لیکن اب یہ معاملہ دونوں کے بس کا نہیں رہا تھا۔ سکھ حوالدار نے پٹھان حوالدار سے کہا کہ وہ اُس کا نام' نمبر اور یونٹ لکھ لے اور وہ بالکل ایسا ہی بیان دے گا جیسے یہ واقعہ ہُوا ہے۔ پٹھان حوالدار نے سکھ کا نام نمبر اور یونٹ وغیرہ لکھ لی اور پٹھان اگلی گاڑی کو دیکھنے لگے کہ اسے کیا ہو گیا ہے اور سکھ حوالدار اپنی پٹرول پارٹی سے کہنے لگا کہ اب واپس چلو۔

سکھ حوالدار نے اپنی پارٹی سے یہ کہہ تو دیا لیکن اُس نے وقت دیکھا تو ابھی دو بجے تھے۔ اسے چار بجے واپس ہونا تھا۔ اسے جو ٹارگیٹ دیا گیا تھا وہ تو اُس کے سامنے آیا ہی نہیں تھا۔ اب تو سکھ کا دماغ حاضر ہی نہیں رہا تھا۔ میں بھی بعد میں اس سے ملا تھا۔ اس پر خوف یہ طاری ہو گیا تھا کہ کچھ ہی دن پہلے ایک ہندو نائیک کا کورٹ مارشل اسی جرم میں ہُوا تھا کہ اس نے بغیر دیکھے فائرنگ کرا کے اپنا ہی لانس نائیک مروا ڈالا تھا۔ سکھ کو یہ ڈر تھا کہ اُس کا بھی کورٹ مارشل ہو گا اور اُسے بھی سپاہی بنا دیا جائے گا۔

اس سکھ حوالدار کی اس غلطی پر اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی تھی۔

وائیوں میں ایسی غلطیاں ہو ہی جایا کرتی ہیں۔ میں نے پچھلے کسی باب میں لکھا ہے کہ بحرالکاہل میں امریکہ اور جاپان کے بحری جہازوں کے مابین تاریخ کی سب سے بڑی بحری جنگ ہوئی تھی۔ بحری جہاز ایک دوسرے کے اتنا قریب کم ہی آتے ہیں کہ ایک دوسرے کو دیکھ اور پہچان سکیں۔ وہ بہت ہی دُور دُور رہتے ہیں اور اُن کی توپیں دور مار ہوتی ہیں۔ بحرالکاہل کی بحری جنگ میں امریکہ کی نیوی کے کئی بحری جہاز ایک دوسرے کو جاپانی جہاز سمجھ کر گولہ باری کرنے لگے اور ایک دوسرے کو بے تحاشہ نقصان پہنچایا۔ اس قسم کی غلطیوں کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔

میں ویسے ہی آپ کی دلچسپی کی خاطر صوبہ سرحد کے علاقے کی لڑائیوں کی ایک بات سناتا ہوں۔ وہاں جب فوج پھیل کر ایڈوانس کرتی تھی تو اس کی حفاظت کے لئے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر پوسٹیں بنائی جاتی تھیں جنہیں پکٹ کہتے تھے۔ سپاہی بڑی تیزی سے پتھر اٹھا کر لاتے اور گولائی میں دیوار کھڑی کر لیتے تھے اور اُس میں مورچہ بند ہو جاتے تھے۔

میری بٹالین میں ایک بار یوں ہُوا تھا کہ رات کے پچھلے پہر بنوں سے پہاڑی علاقے کی طرف ایڈوانس کیا گیا۔ یہ پورا بریگیڈ تھا۔ جس کمپنی نے کسی چوٹی پر پکٹ بنانی ہوتی تھی اس کے کمپنی کمانڈر کو وہ چوٹی دکھا دی جاتی تھی۔ چوٹی دکھانے کا ایک خاص طریقہ تھا۔ وہ کمپنی ایک عہدیدار اور چند ایک جوان مقرر کر کے بھیج دیتی اور وہ اس چوٹی پر جا کر مورچہ بند ہو جاتے تھے۔ اُس رات ایڈوانس ہُوا تو سحری کے وقت پہاڑیوں کے اوپر بے تحاشہ فائر شروع ہو گیا۔ بے تحاشہ فائر تو ہم کیا کرتے تھے' پٹھان ایک گولی چلاتے اور ہمارا ایک آدمی لے لیتے تھے۔ مطلب یہ کہ وہ بے ہنگم فائر نہیں کرتے تھے لیکن یہ تو بے ہنگم فائر تھا جو اچانک شروع ہُوا اور پندرہ بیس منٹ بعد اچانک ہی بند ہو گیا۔

رپورٹ ملی کہ جب ایک پکٹ پر ایک کمپنی کے جوان جا رہے تھے تو اوپر سے ان پر فائر آیا۔ اُنہوں نے فوراً" اِدھر اُدھر پوزیشنیں لے لیں اور جوابی فائر کر دیا۔ وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ چوٹی پر پٹھان پہنچے ہوئے ہیں اور یہ فائر انہوں نے کیا ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ ایک اور کمپنی کو کسی چوٹی پر پکٹ بنانی تھی اور اس کے کمپنی کمانڈر کو چوٹی دکھا دی گئی تھی یا اس نے چوٹی سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ بہرحال ہُوا یہ کہ اس کمپنی کے جوان پہلے پہنچ گئے اور غلط چوٹی پر پکٹ قائم کر لی۔ کچھ دیر بعد اس کمپنی کے

جوان اوپر جانے لگے جنہیں وہاں پکٹ بنانی تھی۔ اوپر والے یہ سمجھے کہ نیچے سے پٹھان آ رہے ہیں اور نیچے والے یہ سمجھے کہ اوپر پٹھان پہلے سے موجود ہیں۔ فائر اس طرح ہوا کہ ایک پکٹ کے حوالدار نے بلند آواز سے اپنے جوانوں کو حوصلہ افزائی کے لئے للکارا۔ تب نیچے سے اوپر جانے والوں کو پتہ چلا کہ یہ تو اپنے آدمی ہیں۔ پھر فائر بند ہوا اور بڑا اچھا اتفاق یہ ہوا کہ دونوں طرف کوئی جوان زخمی بھی نہ ہوا۔ دونوں حوالداروں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی تھی۔

انڈونیشیا میں اس ہندو نائیک کا کورٹ مارشل صرف اس لئے کیا گیا تھا کہ بٹالین میں ہندو مسلم دشمنی پیدا ہو گئی تھی اور پھر نائیک کی غلطی یہ تھی کہ اُس نے اُس وقت مشین گن فائر کروائی جب گوریلے بہت پہلے کے غائب ہو چکے تھے۔ اُسے اُس کی بزدلی کہا گیا تھا۔

○

یہ سکھ حوالدار اسی علاقے میں اپنی پٹرول پارٹی کو لئے گھومتا پھرتا رہا لیکن بڑی ہی سخت پریشانی کے عالم میں۔ اس کی پٹرول پارٹی اب اس طرح چل رہی تھی کہ ایک قطار پگڈنڈی کے دائیں اور دوسری قطار بائیں تھی۔ اس ترتیب کو فوج میں سنگل فائل کہا جاتا ہے۔ جوان ایک دوسرے کے پیچھے کچھ فاصلہ رکھ کر چلے جا رہے تھے۔ وہ ایسے علاقے میں جا پہنچے جہاں گہرے کھڈ بھی تھے اور ٹیکریاں بھی۔ اس زمین پر جوانوں کا درمیانی فاصلہ کچھ زیادہ ہو گیا۔

آخر واپسی کا وقت ہو گیا۔ گوریلوں کی کوئی پارٹی پیدل یا گاڑی میں آتی نظر نہ آئی۔ ہو سکتا ہے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے کسی مسلمان نے انہیں پہلے ہی خبردار کر دیا ہو کہ آج رات نہ جائیں' راستہ صاف نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اُس رات اپنا پروگرام ملتوی کر دیا ہو۔ بہر حال سکھ کو اپنا ٹارگیٹ نہ ملا۔ بہت آگے جا کر اُس نے اپنی پارٹی کو اکٹھا ہونے کے لئے پکارا۔

پارٹی اکٹھی ہو گئی اور فوجی دستور کے مطابق حوالدار نے گنتی کی تو دو جوان کم تھے۔ اُس نے معلوم کر لیا کہ کون کون سے جوان ابھی نہیں پہنچے اور پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس نے وہیں سے انہیں بلند آواز سے پکارنا شروع کیا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔

ان غیر حاضر جوانوں میں ایک تو سپاہی محمد شفیع تھا اور دوسرا وہ ہندو نائیک تھا جس

نے نُور عالم پر فائر کیا تھا اور اب وہ سپاہی تھا۔ سکھ حوالدار کو یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ محمد شفیع نے عہد اور عزم کر رکھا تھا کہ وہ اس ہندو سے نُور عالم کے خون کا بدلہ لے گا۔ سکھ حوالدار اتنا ہی جانتا تھا کہ پارٹی کے دو جوان غیر حاضر ہیں۔ وہ انہیں چھوڑ کر تو نہیں جا سکتا تھا۔ اُس نے اپنی پارٹی کو حکم دیا کہ واپس چلو اور ان دونوں کو تلاش کرو۔ ایسا کبھی ہوا نہیں تھا کہ اچھے بھلے جوان اس طرح لاپتہ ہو جائیں۔ وہاں کوئی ایسی گہری کھائی بھی نہیں تھی جس میں دونوں پاؤں پھسلنے سے گر پڑے ہوں۔

صبح کے چار بج رہے تھے اور یہ پارٹی پیچھے کو جا رہی تھی۔ جوان باری باری ان دونوں کے نام لے لے کر پکار رہے تھے لیکن کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ جوان اونچی اور گھنی جھاڑیوں کے پیچھے اور ٹیکریوں کے اردگرد اپنے ان دو ساتھیوں کو ڈھونڈتے جا رہے تھے۔

تقریباً ایک میل پیچھے گئے ہوں گے کہ ایک جوان کی گھبرائی ہوئی سی آواز آئی —— "ادھر آؤ اوئے.... دوڑ کر آؤ" —— سب دوڑتے ہوئے وہاں پہنچے۔ دیکھا' وہاں وہی ہندو مرا پڑا تھا جسے شفیع مار کر انتقام لینا چاہتا تھا۔ شفیع وہاں نہیں تھا۔ لاش کے ایک پہلو سے بھی خون نکل رہا تھا اور شہ رگ سے بھی۔ اب اس پارٹی نے شفیع کو پکارنا اور ڈھونڈنا شروع کر دیا لیکن شفیع کہیں بھی نہ ملا۔ اس ہندو کی رائفل بھی غائب تھی۔

تھک ہار کر سکھ حوالدار نے واپسی کا راستہ اختیار کیا۔ ہندو کی لاش کو جوانوں نے باری باری اٹھایا اور کیمپ میں لے آئے۔ چونکہ لاش دفتر والے خیمے کے سامنے رکھی گئی تھی اس لئے میں نے بھی اسے دیکھا۔

سکھ حوالدار نے کمانڈنگ آفیسر کو یہ بیان دیا کہ پہلے اُس نے غلط سمجھ کر فرنٹیر والوں کی گاڑی پر فائر کھول دیا تھا۔ وہ واقعہ تفصیل سے بیان کرنے کے بعد بتایا کہ اُسے کیسے پتہ چلا کہ دو جوان غیر حاضر ہیں اور ہندو اُسے کہاں اور کس حالت میں پڑا ملا۔ یہ رپورٹ بھی دی گئی کہ سپاہی محمد شفیع لاپتہ ہے۔

یہ تو میں جانتا تھا کہ اب اس بٹالین کو سپاہی محمد شفیع نہیں ملے گا۔ یقینی بات تھی کہ اس ہندو کو شفیع نے قتل کیا تھا اور وہ بھاگ گیا تھا۔ اُس وقت وہ انڈونیشی مسلمانوں تک پہنچ چکا ہو گا۔ انگریز افسر کہتے تھے کہ اس سپاہی کو انڈونیشی گوریلوں نے مارا ہے اور شفیع کو بھی انہوں نے مار ڈالا ہے اور کسی کھڈ نالے میں پھینک گئے ہوں گے۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ ہماری بٹالین میں ایک کیپٹن ڈاکٹر تھا۔ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر م بھی ایک ڈاکٹر تھا اور مرہم پٹی کا نہایت اچھا انتظام تھا۔ اس ہندو سپاہی کی لاش بریگیڈ ہیڈ کوارٹر بھیج دی گئی اور ہماری بٹالین کا ڈاکٹر ساتھ گیا۔ شام کو پتہ چلا کہ اس ہندو سپاہی کے ایک پہلو میں گہرا زخم تھا جو خنجر کا معلوم ہوتا تھا اور دوسرا زخم شہ رگ میں تھا۔ شہ رگ دائیں بائیں کو نہیں کاٹی گئی تھی بلکہ اوپر نیچے کی طرف کاٹی گئی تھی اور جس ہتھیار سے کاٹی گئی تھی وہ اس کی گردن کے پیچھے سے باہر نکل گیا تھا۔

میں نے اپنے ہمراز دوستوں کو بتایا جن میں نمایاں حوالدار امیر خان' صوبیدار م اشرف اور صوبیدار نذر شاہ تھے۔ انہوں نے ہندو کی لاش نہیں دیکھی تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ زخم کہاں تھے اور کیسے تھے۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ صوبیدار نذر شاہ نے بڑی صحیح قیاس آرائی کی تھی۔ اس میں تو کسی شک و شبے کی گنجائش ہی نہیں تھی کہ ا ہندو کو شفیع نے قتل کیا ہے۔ صوبیدار نذر شاہ نے کہا کہ شفیع نے اس کے پہلو میں سنگ ماری ہو گی اور یہ پیٹھ کے بل گر پڑا ہو گا۔ پھر شفیع نے پہلو سے سنگین نکال کر اس کی رگ میں ماری ہو گی اور شہ رگ چیر دی ہو گی۔ یہ سنگین ہی تھی جو اُس کی گردن پچھلی طرف نکل گئی تھی۔

ہم دعائیں کرنے لگے کہ شفیع خیریت سے انڈونیشی گوریلوں تک پہنچ جائے۔

اس سکھ حوالدار کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی اس غلطی کو ن انداز کر دیا گیا تھا کہ اُس نے فرنٹیر فورس کی گاڑی پر فائر کروا دیا تھا۔ وہ لڑائی اس نوع کی تھی کہ ایسی غلطیوں کا امکان موجود تھا۔

○

یہ تو میری بٹالین کے کچھ واقعات ہیں اور کچھ آگے چل کر سناؤں گا' وہاں م میری بٹالین ہی نہیں تھی' انڈین آرمی کی بے شمار یونٹیں تمام تر انڈونیشیا میں پھیلی تھیں۔ میں نے کئی ایک عجیب و غریب اور بعض بڑے ہی جذباتی واقعات دوسری یو کے سنے تھے۔ وہ بھی سناؤں گا۔ بیشتر واقعات ایسے ہیں کہ ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ ایم انڈونیشی مسلمانوں کو اپنی آزادی کے لئے لڑتے دیکھ کر ہی تازہ ہو جاتا تھا۔

میں آپ کو دوسرا پہلو بھی دکھا دیتا ہوں.... یہ نہ سمجھیں کہ وہاں انڈین آرمی ک مسلمان ویسا ہی دیندار اور حریت پسند تھا جیسوں کی میں کہانیاں سنا رہا ہوں۔ کچھ ایسے

جو دل میں خواہش رکھتے تھے کہ انڈونیشی مسلمانوں کے ساتھ جا ملیں لیکن کچھ سوچ کر چُپ ہو رہتے تھے اور ان کے لئے صرف دعا کرتے تھے۔ ایسے بھی تھے جو نام کے مسلمان تھے اور ان کے دلوں میں عیش موج تھی یعنی شیطانیت۔ اس کا میں ایک واقعہ پیش کرتا ہوں اور دیکھیں اللہ تعالیٰ کس طرح ایسے لوگوں کو دنیا میں ہی سزا دیتا ہے۔

میں نے پہلے تفصیل سے بتایا ہے کہ وہاں ولندیزیوں کی لڑکیاں اور جوان عورتیں موجود تھیں۔ یہ عورتیں اتنی تندرست اور صحت مند تھیں کہ ان میں جو ادھیڑ عمر تھیں وہ بھی جوان لگتی تھیں۔ اگر شکل و صورت سے نہیں تو اپنی ابلیسی حرکتوں سے جوان لگتی تھیں۔ ان کی اتنی ہی خوبصورتی کافی تھی کہ ان کے رنگ گورے تھے' بال کُھلے رکھتی تھیں اور لباس ایسا پہنتی تھیں جو گھروں سے دُور فوجیوں کو مشتعل کرتا تھا۔ ملبوس ہو کر بھی لگتا تھا وہ برہنہ ہیں۔ ہم میں سے جو ان کے چکر میں آ گئے تھے' وہ تو اپنا دین دھرم بھی بھول گئے تھے۔

ہمارا ایک حوالدار میجر تھا۔ وہ سب کے سامنے شراب پیتا تھا۔ ایسے اور بھی تھے لیکن میں اس کا ذکر کروں گا۔ وہ میرے ہی علاقے کا رہنے والا تھا اور اس کا نام عبدالعزیز تھا۔ اُس کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ خاندانی خوشامدی اور چاپلوس تھا۔ ہم تو اُسے افسروں کی جُوتیاں چاٹنے والا کہا کرتے تھے۔ بظاہر خوش طبع اور ملنسار تھا۔ باتیں ایسی کرتا کہ سُننے والا اُسے اپنا بے تکلف دوست سمجھ لیتا تھا۔ پیار اور محبت سے وہ راز لے لیتا اور کمپنی صوبیدار اور کمپنی کمانڈر کو مرچ مسالہ لگا کر یہ باتیں سناتا تھا۔ یوں کہہ لیں کہ وہ بڑا خوبصورت سانپ تھا جو آستین میں بیٹھ کر ڈستا تھا۔

ساتھ والی بستی میں ولندیزی بھی آباد تھے اور انہوں نے اپنی عورتوں کو کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ عبدالعزیز کی زندگی ان عورتوں کے ساتھ گناہوں میں گزر رہی تھی۔ کچھ دن وہ ایک عورت کے ساتھ یارانہ لگا کر رکھتا اور اُسے راشن اور دیگر اشیاء دیتا رہتا تھا۔ ان عورتوں پر کوئی ایسی پابندی نہیں تھی کہ وہ کیمپ میں نہیں آ سکتیں۔ افسروں کے ساتھ بھی ان عورتوں کے یارانے تھے۔ اونچے خاندانوں کی ولندیزی لڑکیاں افسروں کے MESS میں آتیں اور کھاتی پیتی اور راتیں وہیں گزارتی تھیں۔ انہیں ایسا کوئی خیال نہیں ہوتا تھا کہ یہ افسر ہے اور وہ صرف افسر کے ساتھ ہی یارانہ رکھیں۔ کسی جمعدار صوبیدار یا اس سے بھی نیچے عہدے کے فوجی کے ساتھ بات چیت ہو جاتی تو وہ اُسی کی ہو

جاتی تھیں۔ سکھوں کو شراب ملتی تھی۔ شراب کی خاطر یہ عورتیں سکھوں کے پاس آ جاتی تھیں۔

حوالدار میجر عبدالعزیز ان ہی عورتوں میں گم ہو گیا تھا۔ ایک بار ایسے ہُوا کہ وہ کیمپ سے نکلا اور غالباً" اُس بستی کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں تک راستہ سیدھا نہیں جاتا تھا۔ سارے علاقے کی طرح وہاں بھی اونچی نیچی ٹیکریاں اور چٹانیں تھیں اور یہ سارا علاقہ جنگل تھا۔

ہمارے تین چار سپاہی جن میں ایک نائیک بھی تھا، بستی کی طرف سے واپس کیمپ میں آ رہے تھے۔ وہ فوجیوں کی طرح ہنستے کھیلتے، ایک دسرے کے ساتھ مذاق کرتے چلے آ رہے تھے کہ ایک سپاہی نے رک کر کہا کہ اِدھر دیکھو، کیا ہو رہا ہے۔ سب نے اُدھر دیکھا تو عجیب سا منظر نظر آیا۔

حوالدار میجر عبدالعزیز ایک لڑکی کے ساتھ الجھا ہُوا تھا اور لڑکی جو خاصی جوان تھی اس سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہاں ولندیزی لڑکی اور مسلمان لڑکی فوراً" پہچانی جاتی تھی۔ ایک تو ان کے چہرے مختلف تھے اور دوسرا فرق یہ تھا کہ مسلمان لڑکیاں اگر بال کُھلے رکھتی یا کٹواتی بھی تھیں تو سر پر رومال ضرور باندھتی تھیں جسے سکارف کہتے ہیں۔ یہ بڑا رومال تھا جو وہ سر پر رکھ کر ٹھوڑی کے نیچے گانٹھ دے لیتی تھیں یا ویسے ہی کھلا چھوڑ کر گردن ڈھانپ لیتی تھیں۔ مطلب یہ کہ وہ اپنا سر ننگا نہیں رکھتی تھیں۔

یہ جو لڑکی عبدالعزیز سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی، یقیناً مسلمان لڑکی تھی۔ اگر ولندیزی ہوتی تو وہ یوں مزاحمت نہ کرتی بلکہ اپنا آپ عبدالعزیز کو پیش کرتی اور عبدالعزیز اس سے جان چھڑا رہا ہوتا۔

وہ انڈونیشی مسلمان لڑکی تھی جسے عبدالعزیز پکڑنے کی اور پکڑ کر گرانے کی کوشش کرتا تھا لیکن ایک بار لڑکی نے ایسا داؤ کھیلا کہ عبدالعزیز کو پیٹھ کے بل گرا دیا لیکن وہ بھاگی نہیں، وہیں کھڑی رہی۔ عبدالعزیز نے چھوٹے سے ایک درخت کی شاخ توڑ لی جس سے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ اس سے وہ لڑکی کو مارنا پیٹنا چاہتا تھا۔

ایک سپاہی نے کہا، چلو یار، کرنے دو اسے جو کرتا ہے، آخر حوالدار میجر ہے لیکن جو نائیک تھا وہ بڑی دلیر اور بڑی ہی ظالم چیز تھی۔ اختر حسین اس کا نام تھا اور وہ بٹالین کی کبڈی ٹیم کا بڑا ہی زبردست کھلاڑی تھا۔ اُس میں مسلمانی بھڑک اُٹھی۔ وہ کچھ بھی نہ بولا اور تیز دوڑ کر عبدالعزیز اور لڑکی تک پہنچا۔

عبدالعزیز نے اُس شاخ کے پتے توڑ ڈالے تھے اور لڑکی کو مارنے لگا تھا۔ لڑکی بھاگی نہیں تھی کہ اختر پہنچ گیا۔ اس نے جاتے ہی حوالدار میجر کی گردن پر ایسا گھونسہ مارا کہ حوالدار میجر عبدالعزیز لڑکھڑاتا ہوا ایک درخت کے ساتھ ٹکرایا اور اس کا سر تنے کے ساتھ لگا۔

اختر نے مجھے یہ بات سناتے ہوئے کہا کہ عبدالعزیز کا سر تنے کے ساتھ لگا تو ڈول گیا۔ اختر نے اسے ننگی گالیاں دیں اور دوسرا گھونسہ اس کے پیٹ میں مارا اور کہا کہ تم مسلمان ہو اور مسلمان لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈال رہے ہو۔ اس گھونسے سے عبدالعزیز دوہرا ہو گیا تو اختر نے اُسے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ وہ انڈونیشی لڑکی وہیں کھڑی رہی۔

عبدالعزیز نے شراب پی پی کر اور ولندیزی عورتوں کے ساتھ جھک مار مار کر اپنے جسم میں طاقت رہنے ہی نہیں دی تھی۔ اُس سے اُٹھا ہی نہیں جا رہا تھا البتہ گالیاں بک رہا تھا اور دھمکیاں دیتا تھا کہ میں تمہارا کورٹ مارشل کروا دوں گا۔ سپاہیوں نے درمیان میں آ کر عبدالعزیز کو پرے گھسیٹ لیا اور عبدالعزیز بڑی تیزی سے اور غصے سے وہاں سے چل پڑا۔ اختر نے انڈونیشی لڑکی سے پوچھا کہ وہ مسلمان ہے؟ اختر نے صرف اتنا کہا تھا — "مسلم؟" — لڑکی نے سر ہلا کر جواب دیا کہ وہ مسلمان ہے۔ غصے سے اُس کا چہرہ لال سرخ ہو گیا تھا اور وہ قہر بھری نظروں سے عبدالعزیز کو دیکھ رہی تھی جو وہاں سے کھسک گیا تھا۔

اختر نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھا اور اشارہ کیا کہ وہ چلی جائے۔ لڑکی نے جھک کر اختر کا شکریہ ادا کیا اور اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی اور بولی — "السلام علیکم" — اور وہاں سے چل پڑی۔ اختر اور سپاہیوں نے مل کر وعلیکم السلام کہی۔

میں آپ کو فوج کی بات سناتا ہوں۔ حوالدار میجر کے سامنے ایک نائیک کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ نائیک حوالدار میجر کے ماتحت اور اُس کے حکم کا پابند ہوتا ہے۔ عبدالعزیز اور اختر میں ایک فرق یہ بھی تھا کہ عبدالعزیز خوشامدی اور چاپلوس تھا اور اختر کا نقصان تھا۔ ایک تو عہدے کی وجہ سے اور دوسرے چاپلوسی کے زور پر عبدالعزیز اختر کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔

○

یہ واقعہ مجھے اسی شام معلوم ہو گیا تھا۔ اگلے روز عبدالعزیز نے ڈنک مار دیا۔ اُس نے اپنے کمپنی صوبیدار کی معرفت کمپنی کمانڈر کو یہ شکایت پیش کی کہ فلاں کمپنی کا نائیک اختر حسین انڈونیشیوں کی بستی میں جاتا ہے اور وہاں راز کی فوجی باتیں انہیں بتاتا ہے اور اسے ثبوت ملا ہے کہ اس کا رابطہ انڈونیشی گوریلوں کے ساتھ ہے۔ یہ تو مختصر سی چارج شیٹ تھی جو اُس نے اپنے انگریز کمپنی کمانڈر تک پہنچائی اور کہا کہ اس کے پاس ثبوت بھی موجود ہیں۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُسی روز اُس نے ایک ولندیزی عورت پیش کر دی جس نے کمپنی کمانڈر کو یہ بیان دیا کہ نائیک اختر حسین بستی کے مشکوک انڈونیشی مسلمانوں کے گھروں میں جاتا ہے اور اُن تک خبریں پہنچاتا ہے۔

میں آپ کو یہ بات بڑی مختصر کر کے سنا رہا ہوں۔ اصل بات یہ تھی کہ عبدالعزیز نے خوشامد اور چاپلوسی کے ذریعے اور چرب زبانی سے اختر حسین کے خلاف بڑا سنگین کیس بنا دیا تھا اور گواہوں کے طور پر اِس ولندیزی عورت کے علاوہ اپنی کمپنی کے تین جوان بھی پیش کر دیئے تھے۔ اختر حسین دوسری کمپنی میں تھا۔ اُس کمپنی کمانڈر تک یہ چارج شیٹ پہنچی اور اختر حسین کو ملزم کی حیثیت سے کمپنی کمانڈر کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ اختر حسین نے اپنا صحیح بیان دیا اور یہ بھی کہا کہ وہ تین چار جوانوں کو پیش کر سکتا ہے اور انڈونیشی بستی میں وہ اس لڑکی کو بھی ڈھونڈ سکتا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس لڑکی کا گھر کون سا تھا۔

انگریز انصاف کرنے والی قوم تھی۔ انہوں نے اُن تین چار جوانوں کو بلایا جو نائیک اختر حسین کے ساتھ تھے۔ انہوں نے بالکل صحیح گواہی دی اور پھر اختر حسین نے یہ بھی کہا کہ صاحب بہادر، اُس موقعہ پر چلو اور وہاں کی زمین دیکھو جس پر ہماری لڑائی کے نشان موجود ہوں گے۔

کمپنی کمانڈر نے اُسے کچھ ڈانٹ ڈپٹ کی اور اُسے جھوٹا ثابت کرنے کی بھی کوشش کی تاکہ سچی بات سامنے آجائے۔ اختر حسین نے بڑی دلیری سے کہا کہ صاحب بہادر، میں نے سچ بول دیا ہے اور اگر مجھے سزا دی گئی تو پھر میں انڈونیشی گوریلوں کے ساتھ ہو جاؤں گا اور اپنی اس بٹالین پر لعنت بھیجوں گا۔

یہ حقیقت ہے کہ انگریز سچ کو بہت پسند کرتے تھے۔ انہیں ایک بار پتہ چل جاتا کہ کسی نے ان کے آگے جھوٹ بولا ہے اور اپنا مطلب نکالا ہے تو پھر وہ اُسے انتہائی سزا دیتے تھے۔ بہرحال عبدالعزیز تو بڑا ہی چالاک اور کایاں آدمی تھا۔ اُس نے یہ کیس کمانڈنگ آفیسر تک پہنچا دیا۔ اُس کی اپنی اتنی اتھارٹی نہیں تھی کہ خود انگریز کمانڈنگ آفیسر تک پہنچ جاتا، کمپنی کمانڈروں کے ذریعے یہ کیس کرنل تک پہنچ گیا اور کرنل نے باقاعدہ انکوائری کا حکم دے دیا۔ آخر فیصلہ اختر حسین کے حق میں ہو گیا لیکن اسے یہ بھی کہا گیا کہ آئندہ اُس نے کسی سینئر عہدے کے آدمی پر ہاتھ اٹھایا تو اس کا کورٹ مارشل کیا جائے گا۔ ہمیں تو یہ توقع تھی کہ اختر حسین کا کورٹ مارشل ہو جائے گا اور اگر نہ ہوا تو کمانڈنگ آفیسر تو اُسے کچھ نہ کچھ سزا دے گا لیکن بچ بچاؤ ہو گیا۔

عبدالعزیز کی یہ بہت بڑی شکست تھی۔ اُس نے اختر کو دھمکیاں دینی شروع کر دیں کہ اب وہ اُس کو نہیں چھوڑے گا۔ اس کی ایک دھمکی یہ تھی کہ وہ اُسے گولی مارے گا یا مروا دے گا۔ وہاں کسی کو گولی مارنا یا مروانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں آپ کو ایسے واقعات سنا چکا ہوں۔ عبدالعزیز نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ نائیک اختر حسین پر ایسا کیس بنوائے گا کہ اسے سروس سے ڈسچارج نہ کیا گیا تو اس کی نائیکی بھی نہیں رہنے دوں گا۔

عبدالعزیز کو اپنے عہدے پر ناز تھا اور اُس کی اصل طاقت تو یہ تھی کہ پکا بے غیرت تھا اور افسروں کی جُوتیاں چاٹتا تھا۔ اگر آپ فوجی سروس کے ماحول کو نہیں جانتے تو آپ سمجھ نہیں سکتے کہ ایک درجہ اوپر عہدے والا آدمی نیچے درجے کے عہدے والے کو کتنا اور کس طرح نقصان پہنچا سکتا ہے۔ انگریز افسر سچے آدمی کو پسند کرتے تھے یا نہیں، اوپر اللہ کی ذات تھی جو جھوٹے اور بدکار کو ایک نہ ایک دن ضرور پکڑتا ہے۔

میں نے پچھلے ایک باب میں بتایا ہے کہ ولندیزی عورتوں میں پیشہ ور طوائفیں بھی شامل ہو گئی تھیں جن کے اندر بڑی خطرناک بیماریاں بھی تھیں۔ میں نے ایسی دو بیماریوں کے نام بھی لکھے تھے۔ ایک ہے آتشک اور دوسری ہے سوزاک۔ یہ بیماریاں کچھ فوجیوں میں پیدا ہو گئی تھیں۔ یہ اُن ہی فوجیوں کو لگی تھیں جو عبدالعزیز کی طرح بدکاری کے عادی ہو گئے تھے۔ جس فوجی کو یہ بیماری لگتی تھی یہ اُس کا جرم تصوّر کیا جاتا تھا جس کا مطلب یہ لیا جاتا کہ وہ غلیظ عورتوں کے پاس جاتا ہے۔ اُس کا علاج تو ہوتا تھا لیکن اس کی کچھ سزا بھی مقرر تھی۔ اسے Self-Inflicted Injury (خود پیدا کردہ زخم یا بیماری) کہتے تھے۔

یہی بیماری عبدالعزیز کو لگ گئی یہ تھی سوزاک۔ پہلے تو وہ اس بیماری کو چھپاتا رہا۔ جو

فوجی اس بیماری میں مبتلا ہوتے تھے وہ اسی طرح کرتے تھے۔ بیماری کو چھپا لیتے تھے اور چوری چھپے علاج کرانے کی کوشش کرتے تھے جو نہیں ہوتا تھا۔ عبدالعزیز تو حوالدار میجر تھا اس لئے اُسے اپنی عزت کا اور عہدے کا زیادہ خیال تھا لیکن بیماری کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس شخص کا عہدہ کیا ہے۔ چھپانے کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بیماری اندر ہی اندر پھیل گئی اور جڑ پکڑ گئی۔ عبدالعزیز شراب کا عادی بھی تھا۔ یہ بیماری اندر ہی اندر رہتی ہے۔ شراب نے اور اس بیماری نے عبدالعزیز کو گرا دیا پھر بھی اُس نے بیماری کو چھپانے کی کوشش کی۔

عبدالعزیز روز بروز کمزور ہی ہوتا چلا گیا اور چند دنوں میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ ایک روز چلتے چلتے گر پڑا تب سب کو پتہ چلا کہ اس کا اندر سے کیا حشر ہو رہا ہے۔ اُسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور ڈاکٹر نے جب اُس کی حالت دیکھی تو عبدالعزیز سے کہا کہ تم اب کسی قابل نہیں رہے اور یہ بیماری لاعلاج حد تک پہنچ چکی ہے۔ ڈاکٹر نے اسے یہ کہا کہ اگر تم اپنے وطن اور اپنے گھر پہنچ گئے تو اپنی بیوی اور بچوں سے دور رہنا ورنہ وہ بھی اس مرض میں مبتلا ہو جائیں گے۔

پھر دیکھئے اللہ نے اُسے کیا سزا دی۔ میں تو کہتا ہوں کہ بدکار عورتوں کے پاس جانا اور ان کے ساتھ تعلقات رکھنا تو گناہ تھا ہی لیکن عبدالعزیز کا اصل گناہ یہ تھا کہ اُس نے ایک مسلمان لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا اور لڑکی بھی وہ جو اللہ کے نام پر کافروں کے خلاف لڑنے والی تھی۔ ایک روز پتہ چلا کہ عبدالعزیز کے سارے جسم پر پھنسیاں سی پھوٹ آئی ہیں اور اُس کے قریب جاؤ تو بدبُو آتی ہے۔

میں نے ایک روز اُسے ہسپتال کے خیمے میں جا کر دیکھا تو وہ لاش بنا ہُوا تھا اور اُس کے چہرے پر بھی موٹی موٹی پھنسیاں نکل آئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اُس کے آنسو بہہ نکلے۔ اُس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کے ہونٹ ہلے اور آواز نہ نکلی۔ میں واپس آیا تو تین گھنٹوں بعد اطلاع ملی کہ عبدالعزیز تڑپ تڑپ کر مر گیا ہے۔

اُسے وہیں کیمپ سے ذرا دُور دفن کیا گیا تھا۔ نماز جنازہ کا اعلان ہُوا تھا لیکن بٹالین کے کئی مسلمان اُس کا جنازہ پڑھنے نہیں گئے تھے۔ کوئی سپاہی مرجاتا تھا تو بٹالین کے تمام مسلمان نماز جنازہ پڑھا کرتے تھے اور ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو تو ضرور ہی ہوتے تھے۔ وطن سے دُور پردیس کی موت سب کے لئے بڑی دردناک ہوتی تھی لیکن عبدالعزیز کا جنازہ بٹالین کے بمشکل آدھے مسلمانوں نے پڑھا ہو گا۔ (جاری ہے)

انڈونیشی مسلمانوں کی جنگِ آزادی عروج پر پہنچ گئی تھی۔ انڈین آرمی کے علاوہ امریکہ اور برطانیہ کی افواج وہاں پہلے ہی موجود تھیں اور اس اسلامی جنگِ آزادی کو دبانے کی انتہا درجہ تک کوشش کر رہی تھیں لیکن انڈونیشی مجاہدین نے ایسی صورتِ حال پیدا کر دی تھی کہ امریکہ نے اپنی ایک خاص فوج جسے بحری فوج کہا جائے تو ٹھیک ہو گا انڈونیشیا میں بھیج دی۔ یہ تھی اس کی میرین فورس جسے امریکہ والے کریک فورس کہتے ہیں۔

فضائی حملوں کا تو یہ عالم ہو گیا تھا کہ ہمیں فضا میں لڑاکا بمبار طیارے جاتے اور آتے نظر آتے رہتے تھے اور دُور دُور سے بموں کے دھماکوں کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ انڈونیشی مسلمانوں کی جنگِ آزادی کا پس منظر کیا تھا لیکن یہاں مزید معلومات پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں.... پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ صلیبی طاقتیں کسی قیمت پر اس صورتِ حال کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھیں کہ ایک اور اسلامی ملک معرضِ وجود میں آ جائے۔ اینگلو امریکی بلاک کو ولندیزیوں کے ساتھ اور کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایک تو وہ مسلمانوں کی جنگ آزادی کو کچلنا چاہتے تھے اور اسی بہانے وہ مسلمانوں کی نسل کُشی بھی کر رہے تھے کہ یہ خطّہ مسلمانوں کا خطّہ نہ رہ سکے۔

کون نہیں جانتا کہ عرب ممالک کے تیل پر پہلے انگریز قابض تھے اور پھر امریکی کمپنیوں نے تیل کے اس سمندر پر جا قبضہ کیا اور اب یہ حالت ہے کہ عرب ممالک امریکہ کے غلام بن چکے ہیں۔ ان دونوں صلیبی ملکوں کی شروع سے ہی یہی کوشش رہی ہے کہ جہاں کہیں زمین خزانے اگلتی ہے وہاں جا کر اس زمین پر قبضہ کر لیا جائے۔ یہ

دونوں ملک ان کوششوں میں کامیاب چلے آ رہے ہیں۔

نقشے پر انڈونیشیا کی جغرافیائی اور زمینی کیفیت دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ایسے ملک پر حکومت کس طرح کی جاتی ہے اور شہری انتظامات کس طرح رواں دواں رکھے جاسکتے ہیں۔ یہ ملک 17 ہزار چھوٹے بڑے جزیروں پر مشتمل ہے۔ ان میں جاوا' ساٹرا' بورنیو جیسے بڑے جزیرے بھی ہیں اور اتنے چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی جو نقشے پر نظر نہیں آتے لیکن یہ خطہ جو 17 ہزار جزیروں میں منقسم اور کٹا ہُوا ہے' معدنی دولت سے مالا مال ہے۔ یہاں سے تیل' پٹرول اور قدرتی گیس بے انداز نکلتی ہے اور یہ اشیاء غیر ممالک کو برآمد بھی کی جاتی ہیں۔ دنیا بھر میں سب سے زیادہ پلائی وُوڈ انڈونیشیا میں ہوتا ہے۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ انڈونیشیا کا یہ سارا ملک دو تہائی جنگلات ہے اور ایک تہائی کسی حد تک میدانی۔ بہت سے علاقے پہاڑی بھی ہیں۔ ان جنگلات سے جو لکڑی حاصل ہوتی ہے اس میں پلائی وُوڈ کے علاوہ صندل' دیودار اور دیگر عمارتی لکڑی کی بہتات ہے۔ یہ تمام لکڑی برآمد ہوتی ہے۔ انڈونیشیا میں سونے کے ذخائر بھی ہیں اور پیتل' جست' ربڑ اور ٹین کا تو کوئی شمار اور حساب ہی نہیں۔ یہ تمام معدنیات برآمد کی جاتی ہیں۔

یہ ہے وہ زمین کی دولت جسے امریکہ اور برطانیہ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ان کا مسئلہ یہ تھا کہ اسلامی ملک بن گیا تو یہ ساری دولت مسلمانوں کے کام آئے گی اور انڈونیشیا عرب ممالک کی طرح ایک اور انتہائی امیر مسلمان ملک ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت کے لحاظ سے انڈونیشیا عرب ممالک سے زیادہ امیر ملک ہے۔ انڈونیشیا کی جنگ آزادی کے لیڈر احمد سوئیکارنو وغیرہ اس دولت سے واقف تھے اور ان میں اسلامی جذبہ تو تھا ہی۔ وہ اس کوشش میں تھے کہ جیتے جی اپنی زمین کی یہ دولت صلیبیوں کے حوالے نہیں کریں گے۔

میں جانتا ہوں کہ میرے قارئین پُراسرار' چسکے دار اور سنسنی خیز واقعات اور کہانیاں سننا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو یہ کہانیاں سنا بھی چکا ہوں اور آگے چل کے سناؤں گا بھی لیکن انڈونیشیا کی جنگِ آزادی کی داستان کوئی چسکے دار کہانی نہیں کہ اس سے الف لیلیٰ کی کہانیوں جیسا لطف اٹھایا جائے۔ یہ اُسی جہاد کی اور اُسی جذبے کی روئیداد ہے جو اسلام نے ہمیں عطا کیا ہے اور مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس جذبۂ جہاد کو زندہ رکھے۔

ایک بات جو آگے چل کر کہنی چاہئے تھی' میں یہیں کہہ دیتا ہوں۔ میں نے پچھلے باب

میں تفصیل سے بتایا ہے کہ جنگِ ستمبر 1965ء میں انڈونیشیا نے ہماری مدد کس طرح کی تھی۔ اب یہ سنیں کہ امریکہ نے اسے جرم قرار دے کر احمد سوئیکارنو مرحوم کو اور انڈونیشی مسلمانوں کو کیا سزا دی تھی۔

انڈونیشیا کے پہلے صدر احمد سوئیکارنو مرحوم بنے تھے۔ بڑے ہی جابر اور مردِ مومن انسان تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کا رجحان روس کی طرف تھا اور روس نے انہیں بہت ہی جنگی سازوسامان دیا تھا جس میں مگ لڑاکا بمبار جدید طیارے بھی تھے۔ جنگِ ستمبر 1965ء میں احمد سوئیکارنو مرحوم نے حکم دے دیا تھا کہ یہ لڑاکا بمبار طیارے بالکل تیار رہیں اور جوں ہی مشرقی پاکستان سے کال آئے' وہاں پہنچ جائیں۔

انڈونیشیا والوں کا دوسرا جرم یہ تھا کہ یہ واحد ملک تھا جس نے یو این او سے علیحدگی اختیار کرلی تھی اور یو این او کی سیکیورٹی کونسل میں انڈونیشی نمائندے نے جو آخری تقریر کی تھی وہ ایک لعن طعن تھی جو امریکہ اور دیگر بڑی طاقتوں کے منہ پر ماری گئی تھی اور اس میں کہا گیا تھا کہ یہ بڑی طاقتیں چھوٹے ملکوں کو اپنا غلام بنا رہی ہیں اور ان کی دلچسپیوں اور ان کے مفادات کا کوئی خیال نہیں۔ اس طرح انڈونیشیا نے یو این او یعنی اقوامِ متحدہ سے قطع تعلق کرلیا تھا۔ پھر یہ ملک بالکل آزاد ملک بن گیا تھا۔

1966ء میں اچانک انڈونیشیا کے بڑے شہروں خصوصاً جکارتہ میں کچھ لوگ اٹھے اور انہوں نے لوگوں کے گھروں پر حملے شروع کر دیئے اور قتلِ عام شروع کر دیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان لوگوں کو معلوم تھا کہ کون کون سے خاندان اسلام پسند ہیں اور انہیں ختم کرنا ہے۔ اس قدر خونریزی ہوئی کہ شہروں کی گلیوں میں خون بہنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں مسلمان اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ کٹ گئے۔ ان فسادیوں نے لوگوں کے گھروں میں گرینیڈ پھینکے۔ لاکھوں مسلمان مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔

حکومت تو جیسے سمجھ نہ سکی ہو کہ یہ اچانک ہُوا کیا ہے۔ اس خونریزی کا لیڈر سوہارتو تھا جو آج تک انڈونیشیا کا صدر چلا آ رہا ہے۔ احمد سوئیکارنو کو گرفتار کر کے گمنامی میں پھینک دیا گیا اور یہ فسادی لیڈر حکومت پر قابض ہو گیا۔ انکشاف ہُوا کہ یہ خونریزی امریکہ نے بدنام زمانہ تنظیم سی آئی اے سے کرائی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ احمد سوئیکارنو کی حکومت ختم کر کے وہاں امریکہ اپنی کٹھ پتلی حکومت قائم کرے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس خونریزی کے دوران آل انڈیا ریڈیو سے میں نے

خبرنامے میں یہ الفاظ سنے کہ احمد سوئیکارنو کا ایک جرم یہ بھی تھا کہ ستمبر 1965ء میں اس نے پاکستان کی بہت ہی مدد کی تھی جو امریکہ کو پسند نہیں تھا۔

امریکہ نے انڈونیشیا کے دارالحکومت اور بڑے بڑے شہروں کو مسلمانوں کے خون میں ڈبو کر اپنی کٹھ پتلی حکومت قائم کر دی اور سوہارتو کو صدر بنا دیا۔ غور فرمائیں، سوہارتو مارچ 1967ء میں صدر بنا تھا اور آج تک وہ صدر بنا چلا آ رہا ہے۔ گزرے ہوئے تیس برسوں میں الیکشن ہوتے چلے آئے ہیں لیکن سوہارتو ہی صدر منتخب ہوتا رہا۔ کوئی جرأت نہیں کر سکتا کہ اس کے خلاف ووٹ دے۔ گذشتہ سال سوہارتو نے اپنے ملک کے تین صفحۂ اول کے اخبار رسالے اس جرم میں بند کر دیئے تھے کہ انہوں نے لکھا تھا کہ ملک میں کرپشن اور سیاسی مفاد پرستی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ انڈونیشیا جیسے امیر ملک کے عوام روٹی کو ترس رہے ہیں۔

یہ ہے سوہارتو کی ڈکٹیٹر شپ جسے امریکہ کی پشت پناہی حاصل ہے۔ یہیں پر اکتفا نہ کی گئی کہ احمد سوئیکارنو کو نظر بند کر دیا گیا بلکہ انتہائی گھٹیا طریقوں سے اس کی اور اس کے خاندان کی کردار کشی کی گئی۔ اسے شرابی، زانی کہا گیا جب کہ حقیقت یہ تھی کہ اُس وقت انڈونیشیا ایک جنگی طاقت بن گیا تھا اور معدنیات کی بدولت امیر سے امیر تر ہوتا چلا جا رہا تھا اور اس ملک کے عوام خوش حال تھے مگر اب وہاں یہ عالم ہے، یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زبان میری!

پاکستان میں بھی ایسے ہی ہُوا ہے۔ جنگِ آزادی بے مایہ اور مفلس مسلمانوں نے ایک مخلص قیادت میں لڑی، جان و مال کی قربانیاں دیں اور پھر اپنے گھربار اور جائدادیں لٹوا کر پاکستان آ گئے لیکن پاکستان وجود میں آیا تو اس پر انگریزوں کے پرُوردہ جاگیردار اور وڈیرے قابض ہو گئے جنہوں نے آہستہ آہستہ امریکہ نوازی شروع کر دی اور امریکہ کی دولت کی چکاچوند نے ان کی عقل پر ایسا پردہ ڈالا کہ ملک اور اپنے لوگ امریکہ کے غلام بنا ڈالے۔ بالکل یہی حال امریکہ نے انڈونیشیا میں کیا اور آج وہ انڈونیشیا جس کی زمین سے شہیدوں کے لہو کی خوشبو اٹھتی ہے، امریکہ کا غلام ہے۔

○

آیئے اب میں آپ کو جنگِ آزادی کے ہنگامے میں لے چلتا ہوں.... ہماری بٹالین کو دُور کے ایک چھوٹے سے قصبے موجوکرتو میں بھیج دیا گیا۔ وہاں گئے تو بٹالین کو دو

حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اے اور سی کمپنی کو موجوکرتو میں رہنے دیا گیا اور بی اور ڈی کمپنی کو دس گیارہ میل دُور ایک اور مقام جو مبنگ بھیج دیا گیا۔ ہیڈ کوارٹر موجوکرتو میں رہا۔ میں چونکہ ہیڈ کوارٹر کے دفتر میں سینئر کلرک تھا اس لئے میں موجوکرتو میں رہا۔ صورت یوں بنی کہ اے کمپنی میں مسلمان تھے اور سی کمپنی سکھوں کی تھی۔ مسلمان اور سکھ موجوکرتو میں رہے اور بی کمپنی ہندوؤں کی تھی اور ڈی کمپنی مسلمانوں کی۔ اس طرح ہندو اور مسلمان جو مبنگ چلے گئے۔

موجوکرتو میں ہماری ان کمپنیوں کے علاوہ ایک لیبر فورس تھی جس میں زیادہ تر انڈونیشی عیسائی اور جنگلی سے لوگ تھے جن کا کوئی مذہب تھا ہی نہیں۔ کچھ امریکی فوجی بھی تھے اور کچھ انگریز فوجی بھی تھے لیکن ان کی کوئی باقاعدہ یونٹ وہاں نہیں تھی۔ یہاں ان کے دفاتر تھے۔ چھوٹی سی ایک سیکیورٹی فورس بھی تھی جس میں مسلمانوں کی نفری بہت ہی تھوڑی تھی باقی سب عیسائی تھے۔

یہ دونوں قصبے موجوکرتو اور جو مبنگ ایک بڑے شہر سورابایا سے تقریباً" بیس میل دُور تھے۔ ہمیں ایک پرانے سکول میں جگہ دی گئی تھی۔ قصبے کے اردگرد ہماری کمپنیوں کی پوسٹیں بنا دی گئی تھیں۔ یہ اس طرح بنائی جاتی تھیں کہ ریت سے بھری ہوئی بوریاں گول دیوار کی صورت میں رکھی جاتی تھیں اور ان میں سے مشین گنوں اور رائفلوں کے لئے سوراخ رکھ دیئے جاتے تھے۔ ان پر چھت کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ہر پوسٹ میں آٹھ دس اور کسی میں زیادہ جوان رہتے تھے۔ ہم قصبے کے بازار میں گھوم پھر سکتے تھے لیکن شام کے بعد باہر جانے کی پابندی تھی۔ ہمیں خاص طور پر کہا گیا تھا کہ ان شہریوں سے ہوشیار رہنا۔ یہ حکم بٹالین آرڈر میں بھی شامل کیا گیا تھا۔ بٹالین آرڈر بھی میرے ہاتھوں سے نکلتے تھے۔ اس آرڈر میں پوری بٹالین کو خبردار کیا گیا تھا کہ انڈونیشی گوریلے ہتھیاروں اور ایمونیشن میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں اس لئے اپنی جان سے زیادہ اپنے ہتھیار یعنی اسلحہ اور ایمونیشن کی حفاظت کرو۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ انڈونیشی گوریلوں کے ساتھ ہمارا رابطہ کس طرح ہُوا کرتا تھا، اب رابطے کا ایک طریقہ پیش کرتا ہوں جو میں نے اپنی آنکھوں دیکھا.... ایک روز چار بجے کے لگ بھگ میرے آفیسر دفتر سے اٹھ گئے تو میں ٹہلتا ٹہلتا ایک پوسٹ تک پہنچ گیا جس میں مسلمان کمپنی کے دس بارہ جوان ڈیوٹی پر تھے۔ ان کا کمانڈر ضلع اور

تحصیل جہلم کے ایک گاؤں کا رہنے والا نائیک عبدالمجید تھا جو میرا دوست تھا اور میں اس کے جذبے سے بھی واقف تھا۔ میں اس پوسٹ میں جا بیٹھا۔

نائیک مجید باتیں کرتے کرتے اُٹھ کھڑا ہُوا اور سینڈ بیگوں کی دیوار کے ساتھ جا رکا۔ اوپر سے باہر سب کچھ نظر آتا تھا۔ مطلب یہ کہ یہ دیوار ایک اچھے جوان کے کندھوں تک اونچی تھی۔ میں نے ویسے ہی دیکھا کہ نائیک مجید اپنے ایک ہاتھ میں ایک کاغذ کو مروڑ مروڑ کر گولی بنا رہا تھا۔ میں بھی اس کے پاس جا کھڑا ہُوا اور باہر دیکھنے لگا۔

ویسے ہی میری نظر باہر کے مناظر دیکھتے دیکھتے ایک انڈونیشی لڑکے پر رُک گئی۔ اس کی عمر تیرہ چودہ سال ہو گی۔ اُس نے پتلون کی شکل کا ذرا تنگ سا پاجامہ پہنا ہُوا تھا اور اوپر قمیض نہیں بلکہ صرف بنیان تھی۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔ اُس کا رنگ زردی مائل گورا تھا اور لڑکا بڑا ہی بھولا بھالا اور بڑی اچھی شکل والا تھا۔ وہ اس طرح چلا آ رہا تھا کہ کنکریوں کو ٹھوکریں مارتا اور کچھ اچھلتا کودتا بھی تھا جیسے اس عمر کے لڑکے کیا کرتے ہیں۔

وہ جب کچھ قریب آگیا تو اُس نے ہماری طرف دیکھا۔ وہ پوسٹ سے کچھ دُور تھا لیکن اسی طرح ٹھوکریں مارتا ہمارے قریب آگیا اور ہماری طرف اس کی جیسے توجہ نہیں تھی۔ نائیک مجید نے کاغذ کی گولی جو بنائی تھی' وہ اپنے ہونٹوں میں لے لی اور پیچھے سے بڑی زور سے پھونک ماری تو گولی دُور جا گری۔

وہ لڑکا گولی تک پہنچا اور اسے بھی اسی طرح ٹھوکریں مارتا آگے لے گیا جس طرح وہ ہر چیز کو ٹھوکریں مارتا اور کھیلتا چلا آ رہا تھا۔ مجید اسے دیکھتا رہا اور میری نظریں بھی اسی پر لگی رہیں۔ ذرا آگے جا کر اُس نے معلوم نہیں کس طرح گولی کو پاؤں سے یا غالباً" پاؤں کے انگوٹھے سے اوپر کو اچھالا کہ گولی اس کے سر تک چلی گئی۔ اُس نے منہ اوپر کر کے منہ کھول دیا اور گولی منہ میں پکڑ لی اور پھر وہ دوڑ پڑا۔

نائیک مجید نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا۔ پھر اُس نے کہا' اللہ کا شکر ہے' پیغام پہنچ جائے گا۔

نائیک مجید نے بتایا کہ وہ اسی طرح ضروری پیغام انڈونیشی گوریلوں کے کمانڈر تک پہنچاتے ہیں۔ میں نے پہلے سنا تھا کہ اس طریقے سے مسلمان فوجی گوریلوں کو پہلے ہی خبردار کر دیتے ہیں کہ فلاں دن فلاں وقت فوج فلاں آپریشن کے لئے نکل رہی ہے اور وہ اپنا بندوبست کر لیں.... یہ میں آپ کو پہلے تفصیل سے سنا چکا ہوں لیکن ہم جس جگہ

ے آئے تھے وہاں یہ سہولت تھی کہ ہم خود قصبے میں جا سکتے تھے اور ضروری باتیں نیں زبانی بتا دیتے تھے یا میں آپریشن آرڈر کی نقل ان کے حوالے کر آتا تھا۔ یہ ولت ہر آبادی میں نہیں تھی۔

میں نے اُس روز وہ طریقہ اپنی آنکھوں دیکھا جو پہلے صرف سنا تھا۔ اسی طرح بظاہر ئی غریب اور کھلنڈرا سا لڑکا کسی پوسٹ کے سامنے سے اُچھلتا کودتا گزرتا تھا اور پوسٹ سلمان کمانڈر پیغام لکھ کر اس کی گولی بناتا اور اس کی طرف منہ سے اُچھال دیتا تھا۔ لڑکا ی طرح اس گولی کے ساتھ کھیلتا آگے چلا جاتا اور پیغام اٹھا لیتا یا اچھال کر منہ میں لے لیتا ا۔

ایک طریقہ اور بھی تھا۔ کوئی لڑکا یا لڑکی یا کوئی بوڑھا سا آدمی چھابڑی اٹھائے سٹوں کے قریب سے گزرتا تھا۔ چھابڑی میں اُس علاقے کا پھل فروٹ یا کوئی ایسی ہی ہوتی تھی۔ پوسٹ کا مسلمان کمانڈر پیغام لکھ کر اس کی گولی بنا لیتا یا تہہ کر کے تعویذ سا لیتا اور چھابڑی کے قریب جا کر ایسی حرکتیں اور باتیں کرتا کہ دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ ہ خرید رہا ہے لیکن وہ چیز لے کر کاغذ چھابڑی میں رکھ کر آ جاتا تھا۔ یہ پیغام گوریلوں ے کمانڈر تک پہنچ جاتا تھا۔

عموماً" کمپنی کمانڈر' کمپنی صوبیدار اور حوالدار میجر کو پورے ہفتے کا پروگرام دے دیا تے تھے کہ فلاں فلاں دن اور فلاں وقت اتنی نفری کی ایک پٹرول' (گشت پارٹی) فلاں یلے میں جائے گی اور وہ وہاں کیا کرے گی اور کس وقت واپس آنا ہے.... نائیک مجید ے ایک روز بعد کا پروگرام مختصراً" اردو میں لکھ کر لڑکے کے ذریعے بھیج دیا تھا۔ ونیشی مسلمانوں کے پاس اُردو پڑھنے والے لوگ موجود تھے۔ اس وقت تک تو انڈین ی کے بہت سے مسلمان فوجی اُن کے پاس پہنچ گئے تھے۔

○

دو روز بعد دن کے دو بجے دونوں کمپنیاں پٹرول کے لئے نکلیں۔ ان کا مقصد اور گرام نہ جانے کیا تھا لیکن میں اسے پٹرول یا گشت کہوں گا۔ میں اتنا جانتا تھا کہ کیمپ ے دونوں کمپنیوں کو اکٹھے نکلنا تھا اور قصبے سے دور جا کر سکھ کمپنی کو ایک طرف اور سلمان کمپنی کو دوسری طرف چلے جانا تھا' یعنی دونوں کمپنیوں کو الگ الگ ایریا دیا گیا تھا۔ انہیں اس سارے علاقے کی تلاشی لینی تھی اور کوئی چھوٹا موٹا گاؤں دیکھ کر اس کو بھی

اچھی طرح دیکھنا تھا اور ضرورت کے مطابق تلاشی تک نوبت آئے تو وہ بھی لی جاتی تھی۔ وہاں اسی قسم کے ٹاسک ہُوا کرتے تھے۔

شام کو جب کمپنیاں اپنے اپنے ٹاسک سے فارغ ہو کر ایک جگہ اکٹھی ہوئیں اور کیمپ میں آئیں تو ہمیں پتہ چلا کہ تین سکھ مارے گئے ہیں اور چند ایک زخمی ہوئے ہیں۔ یہ کمپنی گوریلوں کی زد میں آگئی تھی اور گوریلے فائرنگ کر کے بھاگ گئے تھے۔ اُدھر مسلمان کمپنی پر ایک بھی راؤنڈ فائر نہیں ہُوا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ اُس روز نائیک عبدالمجید نے اس لڑکے کے آگے کیا پیغام پھینکا تھا۔ گوریلوں کو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ مسلمان کمپنی فلاں ایریے میں جائے گی اور فلاں ایریے میں سکھوں کی کمپنی جائے گی۔ گوریلے سکھوں کے علاقے میں چلے گئے اور تین سکھوں کو ہلاک اور چند ایک کو زخمی کر کے غائب ہو گئے۔

انگریز آفیسران باتوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اب یہ راز نہیں رہ گیا تھا کہ انڈین آرمی کے مسلمان فوجی گوریلوں کی مدد کرتے ہیں اور ان کے ساتھ تعاون بھی کرتے ہیں۔ اب ہمارے افسروں نے دیکھا کہ سکھ مارے گئے ہیں اور مسلمانوں کی طرف گوریلوں نے دیکھا ہی نہیں تو افسروں نے یہ آرڈر جاری کر دیا کہ آئندہ گشتی پارٹی ایک کمپنی کی نہیں ہُوا کرے گی بلکہ آدھے مسلمان اور آدھے سکھ اکٹھے جایا کریں گے.... انگریزوں نے یہ حکم تو دے دیا لیکن یہ نہ سوچا کہ سکھ پھر بھی دُور سے پہچانے جاتے ہیں۔ اس حکم کے بعد دو مرتبہ ایسے ہُوا کہ دس گیارہ مسلمان اور دس گیارہ سکھ اکٹھے کسی ٹاسک پر بھیجے گئے لیکن مارے گئے تو صرف سکھ مارے گئے۔ اس علاقے کے گوریلوں کو معلوم تھا کہ سکھوں کے ساتھ جو دوسرے فوجی ہیں وہ مسلمان ہیں۔

○

دیگر واقعات سنانے سے پہلے ایک بڑی دلچسپ بات سناتا ہوں۔ یہ ایک واقعہ ہے جس کا تعلق امریکہ کی میرین فورس کے ساتھ ہے۔ پہلے یہ خبر میں نے زبانی سنی تھی پھر پندرہ سولہ دنوں بعد میں نے اپنے انگریز ایجوٹنٹ کی میز پر ایک انگریزی اخبار پڑا دیکھا اور اس میں یہ خبر پوری تفصیل کے ساتھ چھپی ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ امریکہ کا اخبار "نیویارک ٹائمز" تھا۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ انڈونیشیا 17 ہزار چھوٹے بڑے جزائر کا مجموعہ ہے۔ ان

جزیروں میں عجیب و غریب جنگلی جانور پائے جاتے ہیں۔ یہ بھی بتا چکا ہوں کہ انڈونیشیا کا ...ثانی رقبہ جنگلات ہے باقی ایک حصہ ذرا میدانی ہے۔ ان جنگلات میں شیر بھی پائے جاتے ہیں، ہاتھی بھی، درختوں پر رہنے والے اژدہا بھی بہت ہیں جنہیں GREEN TREE PYTHON کہتے ہیں۔ ان کا رنگ سبزی مائل ہوتا ہے اور ایک عجیب جانور ہے جو ہے تو کنگرو لیکن یہ درختوں پر رہتا ہے۔ بندر اور بن مانس کی نسل کے ایسے جانور ملتے ہیں جو دنیا کے کسی اور خطّے میں نہیں ہوتے۔

وہاں ایک جزیرہ ہے جس کا نام KOMODO ہے۔ یہ جزیرہ ہمارے موجود کیمپ سے پانچ سو میل کے لگ بھگ دُور تھا۔ یہ جزیرہ ہمیشہ غیر آباد چلا آ رہا تھا۔

یہ علاقے یعنی یہ کچھ جزیرے جنگِ عظیم سے محفوظ رہے تھے۔ دوسرے علاقوں ...میں جنگ کے دھماکے ہوتے رہے۔ وہاں کے درندے اور جنگلی جانور بھاگ کر ان ...جزیروں میں چلے گئے جو جنگ سے محفوظ تھے۔ خبر یہ ملی کہ جنگِ آزادی کو کچلنے کے لئے ...امریکہ نے اپنی نیوی کا بھی استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ امریکن نیوی کی ایک گن بوٹ ...میں کم و بیش پندرہ فوجی یا نیوی کے آدمی تھے، جزیرہ KOMODO میں جا اترے۔ ...شاید رَیکی کے لئے وہاں گئے تھے یعنی یہ دیکھنے کے لئے کہ اس جزیرے میں کیا ہے۔ ...کا مقصد بہرحال فوجی تھا۔ ان کے ساتھ ایک لیفٹیننٹ تھا۔

انہیں بڑی عجیب اور خوفناک آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ آوازیں شیر کی ...ج اور ہاتھی کی چنگھاڑ جیسی ملی جلی آوازیں تھیں۔ یہ تو کہا جا سکتا تھا کہ یہ آوازیں ...جانور یا درندے کی ہیں لیکن ان امریکیوں نے ایسا درندہ کبھی دیکھا نہ تھا۔ وہ آگے ...بڑھتے گئے اور ایسا منظر ان کی آنکھوں کے سامنے آگیا جس پر وہ دیکھنے کے باوجود یقین نہ ...کر سکے۔ چھپکلی یا سانڈے کی شکل کے دو عفریت آپس میں لڑ رہے تھے۔ ان امریکیوں ...سے وہ تقریباً 60 یا 70 گز دُور تھے۔ اس عفریت کی لمبائی آٹھ گز سے دس گز تک ...تھی۔ ان کے پنجوں کے ناخن خنجروں جیسے تھے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو لہولہان ...کر رہے تھے۔

لیفٹیننٹ نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ رائفلیں تیار کر لو، ہم انہیں قریب سے ...دیکھیں گے اور اگر انہوں نے ہم پر حملہ کیا تو سب مل کر فائر کریں گے۔ ...وہ آگے بڑھتے چلے گئے اور ایسی جگہ آگئی جہاں جنگل گھنا نہیں تھا، درخت ایک

دوسرے سے دُور دُور ہو گئے تھے اور زمین سے چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ جب وہ ذرا آگے چلے گئے تو وہ دو عفریت لڑتے لڑتے ایک چٹان کے پیچھے ہو گئے۔ اچانک ان امریکیوں کو اپنے عقب میں ایسی ہی آواز سنائی دی جو ان عفریتوں جیسی تھی۔ انہوں نے پیچھے دیکھا تو مارے خوف کے ان کا بُرا حال ہو گیا۔ ایسے ہی تین عفریت ان کی طرف دوڑے آ رہے تھے۔

انہوں نے دوڑ کر اِدھر اُدھر پوزیشنیں لے لیں اور ان پر فائر کرنے لگے لیکن یہ عفریت ڈرنے کی بجائے اور تیز دوڑے اور اس کے ساتھ ہی پانچ چھ ایسے ہی عفریت مختلف سمتوں سے آ گئے اور یہ سب بلائیں ان امریکیوں پر ٹوٹ پڑیں۔

ان آدمیوں میں سے صرف دو بھاگ کر زندہ اور سلامت گن بوٹ میں پہنچ گئے لیکن وہ ہکلاتے تھے اور منہ سے کوئی لفظ صحیح نہیں نکلتا تھا۔ آخر انہیں شراب پلائی گئی تو انہوں نے بتایا کہ اس جزیرے میں انہوں نے کیا دیکھا ہے اور وہاں کیا حادثہ ہُوا ہے۔ ان کے وہ ساتھی جو گن بوٹ میں ہی رہے تھے اور جزیرے میں داخل نہیں ہوئے تھے، وہ مانتے ہی نہیں تھے کہ آج کے دَور میں لاکھوں سال پہلے والے عفریت موجود ہوں گے۔ بچ کر نکل آنے والے دونوں آدمیوں نے انہیں کہا کہ ہمیں جھوٹا کہہ لو لیکن اس جزیرے میں داخل نہ ہونا۔

اس جزیرے میں پھر کوئی داخل نہ ہُوا اور اوپر رپورٹ بھیجی گئی۔ ابھی ہیلی کاپٹر نہیں بنے تھے۔ چھوٹے ہوائی جہاز کے ذریعے اس جنگل میں دیکھا گیا۔ یہ ہوائی جہاز درختوں کی بلندی پر اُڑا کر ویسے بھی اور دُوربینوں سے بھی دیکھا تو یہ عفریت نظر آئے۔ ان کی تعداد صحیح طور پر معلوم نہیں، اچھی خاصی تھی۔ امریکہ والوں نے اپنے تمام اگلے فوجی ہیڈ کوارٹروں کو خبردار کر دیا کہ KOMODO جزیرے کے قریب نہ جائیں۔ یہاں میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ جب انڈونیشیا آزاد ہو گیا اور اس کی باقاعدہ حکومت کام کرنے لگی تو اس حکومت نے KOMODO جزیرے کو ایک محفوظ پارک کی حیثیت دے دی اور اسے صرف سیاحوں کے لئے ریزرو کر دیا۔ آج بھی یہ عفریت وہاں موجود ہیں اور سیاح وہاں جاتے ہیں اور دُور دُور سے ان عفریتوں کو دیکھتے ہیں۔ کسی شخص کو رائفل یا ریوالور یا کوئی ہتھیار جزیرے میں لے جانے کی اجازت نہیں۔ ان چند ایک امریکیوں نے غالباً دو یا تین عفریت رائفلوں سے مار ڈالے تھے، اس کے بعد وہ طبعی

موت مرتے رہے اور اس کے ساتھ ہی ان کی اگلی نسلیں پیدا ہوتی رہیں۔ اس عفریت کو KOMODO DRAGON کا نام دیا گیا ہے اور یہ ساری دنیا میں مشہور ہیں۔

ایک اور امریکی گن بوٹ ایسے ہی ایک اور ویران جزیرے کے ساحل پر جا لگی اور اس میں سے دس بارہ فوجی اترے اور جزیرے کے اندر آگے چلے گئے۔ وہ جب اور زیادہ چلے گئے تو اچانک دو تین دھاری دار شیروں نے ان پر حملہ کر دیا۔ ان فوجیوں کو ان پر فائر کرنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ یہ دھاری دار شیر تھے جنہیں ٹائیگر کہتے ہیں۔ چار فوجی شیروں کا شکار ہو گئے اور باقی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور گن بوٹ تک پہنچ گئے۔۔

۔۔خبر میں لکھا تھا کہ ان دونوں گن بوٹوں کو کوئی اور جزیرے بتائے گئے تھے جن میں انسان آباد تھے اور اس قسم کے درندوں وغیرہ کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ گن بوٹیں غلط جزیروں پر جا رکی تھیں۔



میں نے جب یہ خبر سنی اور پھر اخبار میں پڑھی تو میرے دل سے ایک آواز اٹھی کہ انڈونیشی مجاہدین کے سروں پر اللہ تبارک و تعالیٰ کا ہاتھ ہے اور اس جنگل کے درندے بھی انہی کا ساتھ دے رہے ہیں۔

میں تیرہ چودہ سال کے اُس بھولے بھالے لڑکے کی بات کر رہا تھا جو نائیک عبدالمجید کا بھیجا ہُوا پیغام لے گیا تھا۔ یہ لڑکا ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہنے لگا۔ یوں کہہ لیں کہ وہ میرے ذہن میں کبھی نہ مٹنے والا ایک نقش بن گیا۔ یہ تو اُس کے ہنسنے کھیلنے کی عمر تھی لیکن وہ کس طرح خطرہ مول لے کر اپنی قوم اور اپنے ملک کی جنگِ آزادی میں اپنا رول ادا کر رہا تھا۔ وہ اکیلا ہی نہیں تھا بلکہ اُس جیسے بے شمار لڑکے اور لڑکیاں یہ رول ادا کر رہی تھیں۔۔۔۔ ایک رات یہ لڑکا اس طرح میرے ذہن اور دل پر حاوی ہو گیا کہ میں پوری رات تک سو بھی نہ سکا۔

"تم بزدل ہو" ـــــ یوں آواز سنائی دی جیسے اُس لڑکے نے مجھے طعنہ دیا ہو۔

"تم اس لئے مسلمان نہیں کہلا سکتے کہ تمہارا نام مسلمانوں جیسا ہے"۔

"تم ہندوؤں کی کھڑی کی ہوئی انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہونے کے لئے دوڑے ہوئے تھے لیکن اپنی قوم کے لئے تمہارا خون سرد ہو گیا ہے"۔

"انگریزوں سے تمہیں راشن وردی اور چند روپوں سے زیادہ کچھ نہیں مل سکتا۔

اجر لینا ہے تو اللہ سے لو"۔

"اٹھو.... یہ صلیبی جنگ ہے.... آگے بڑھو اور اپنا فرض ادا کرو"۔

مجھے یقین کی حد تک محسوس ہونے لگا کہ میرے تاریک کمرے میں وہ لڑکا موجود ہے اور وہ میرا خون گرم کر کے مجھے بھڑکا رہا ہے۔ میں اپنے آپ میں شرمساری سی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اپنے پچھلے کیمپ میں انڈونیشی مجاہدین کی بہت مدد کی تھی۔ بڑے ہی خفیہ آپریشن آرڈر بھی ان تک پہنچائے تھے لیکن یہ شاید میرے ضمیر کی' میری روح کی یا میرے ایمان کی آوازیں تھیں کہ مجھے اس سے زیادہ جہاد کرنا چاہئے۔ کرنا یہ تھا کہ مجھے انڈونیشی مجاہدین کے پاس چلے جانا چاہئے اور ان کے دوش بدوش لڑنا چاہئے۔

مجھے حوالدار غلام نبی یاد آنے لگا اور پھر مجھے لانس نائیک نور عالم اور سپاہی شفیع یاد آئے۔ میں تو تھوڑا بہت تعلیم یافتہ تھا اور کچھ کتابیں بھی پڑھی تھیں لیکن نورِ عالم اور شفیع بالکل ہی اَن پڑھ تھے۔ انہوں نے اللہ کی نگاہ میں بہت اونچا مقام حاصل کر لیا تھا۔ نور عالم تو شہید تھا۔ میں صاف طور پر محسوس کرنے لگا کہ نور عالم مرا نہیں' وہ میرے دل میں زندہ ہے۔

مجھے یہ خیال بھی آیا کہ میں بالکل تنہا آدمی ہوں' بیوی نہیں' بچے بھی نہیں' انسان کی سب سے بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ میں اس ذمہ داری سے آزاد تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ ایک بار پھر بھگوڑا ہو کر انڈونیشی مسلمانوں کے پاس چلا جاؤں گا۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی مجھے ایسا سکون اور اطمینان ہونے لگا جس سے میں ہمیشہ نا آشنا رہا تھا۔



اُدھر جو ہنگ میں ہماری بی اور ڈی کمپنیاں تھیں۔ بی ہندوؤں کی اور ڈی مسلمانوں کی کمپنی تھی۔ ایک روز ہمارا کمانڈنگ آفیسر' ایجوٹنٹ اور صوبیدار میجر جو سکھ تھا' بڑی عجلت میں جو ہنگ روانہ ہو گئے۔ میں اتنا ہی محسوس کر سکا کہ وہاں کوئی ایمرجنسی ہو گئی ہے۔ ایک فون آیا تھا جو کمانڈنگ آفیسر نے سنا اور سنتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ایجوٹنٹ اور صوبیدار میجر کو بلا کر فوراً" جیپ میں بیٹھا اور یہ لوگ روانہ ہو گئے۔

وہ شام کو واپس آئے۔ میں نے صوبیدار میجر سے پوچھا اور اُس نے بتایا کہ جو ہنگ میں دو گورا رجمنٹ کی کمپنیاں بھی ہیں۔ وہاں ایسا آپریشن شروع کر دیا گیا ہے کہ ہر گاؤں اور چھوٹی سے چھوٹی بستی کے گھروں کی بھی تلاشی ہوتی ہے اور گرفتاریاں بڑی عام ہو

لیکن زیادہ تر نوجوان لڑکیوں اور جوان عورتوں کو پکڑا جاتا ہے۔ صوبیدار میجر نے
تایا ہیں
یا کہ گورا رجمنٹ نے کھلے میدان میں تھوڑی سی جگہ چاروں طرف خاردار تار لگا دی
ہے اور اس میں قیدیوں کو رکھتے ہیں۔ قیدیوں میں زیادہ تر مستورات ہیں۔

صوبیدار میجر نے بتایا کہ ڈی کمپنی کے کمپنی صوبیدار نے اپنے کمپنی کمانڈر سے جو
ریز تھا' کہا کہ ان عورتوں کو رہا کرائیں یا انہیں گورا رجمنٹ کی قید میں نہ رکھا جائے۔
بیدار نے وجہ یہ بتائی کہ گورے ان عورتوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور بدتمیزی کریں
، اور اگر ہمیں اس کی اطلاع مل گئی تو پھر ہم برداشت نہیں کریں گے اور ان گوروں پر
مدہ حملہ کر دیں گے۔

کمپنی کمانڈر انگریز میجر تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو بادشاہ سمجھ کر صوبیدار کو ڈانٹ پلا
اور کہا کہ وہ فوجی معاملات میں اس طرح دخل اندازی نہ کرے۔ صوبیدار نے اسے
کہ اس مطالبے اور احتجاج میں وہ اکیلا نہیں بلکہ پوری کمپنی ہے اور کمپنی کے جوانوں
مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں آپ تک یہ مطالبہ پہنچا دوں ورنہ اس کے نتائج اچھے
ہوں گے۔

اس انگریز کمپنی کمانڈر نے پوری کمپنی کو فال اِن کیا اور کمپنی پر رعب اور غصہ جھاڑا
ہا کہ یہ عورتیں گورا رجمنٹ نے پکڑی ہیں اور ہم انہیں آزاد نہیں کروا سکتے۔

جوان بول پڑے۔ انہوں نے کہا کہ ہم مسلمان ہیں اور ہم کسی مسلمان عورت کی
رُمتی برداشت نہیں کر سکیں گے۔ بہتر ہے ان عورتوں کو جیل میں بھیج دیا جائے اور
انہ رکھا جائے ورنہ ہم خود ان عورتوں کو رہا کروا لیں گے۔

جو حضرات فوج کے ڈسپلن اور دیگر امور سے واقف ہیں' وہ تو کبھی تسلیم نہیں
ہا گے کہ جوانوں نے اپنے انگریز کمپنی کمانڈر سے یہ مطالبہ کیا ہو گا اور یہ دھمکی بھی
دی۔ یہ سوچنے والے حضرات اپنی جگہ حق بجانب ہیں لیکن وہاں کی صورتِ حال
اور تھی۔ میں بار بار ایک بات کہہ رہا ہوں کہ اُس وقت تک انڈین آرمی کی مختلف
ہاے کئی مسلمان انڈونیشی مجاہدین کے پاس چلے گئے تھے۔ کمپنی صوبیدار اور کمپنی
لدیدار اور جوان انگریزوں کی اس کمزوری سے واقف تھے۔ وہاں مسلمانوں میں
ی کچھ ایسا بیدار ہو گیا تھا کہ وہ نتائج سے بے پرواہ ہو گئے تھے۔

کمپنی کمانڈر نے کمپنی کا یہ عزم اور یہ مطالبہ اور یہ دھمکی دیکھ کر موجو کر تو کمانڈنگ

آفیسر کو بذریعہ فون اطلاع دی۔ یہ تو بتانا ممکن نہیں کہ اُس نے کمانڈنگ آفیسر سے کیا کہا تھا اور کیا رائے دی تھی' میں نے یہ دیکھا کہ کمانڈنگ آفیسر اسی وقت اُٹھ دوڑا تھا۔

صوبیدار میجر نے یہ بھی بتایا کہ کمانڈنگ آفیسر نے کمپنی کو بڑے اچھے الفاظ میں یقین دلایا تھا کہ ان عورتوں کے ساتھ گورے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کریں گے اور وہ کوشش کرے گا کہ ان عورتوں کو یہاں سے جیل میں منتقل کر دیا جائے.... کمانڈنگ آفیسر' ایجوٹنٹ اور کمپنی کمانڈر گورا رجمنٹ کے افسروں کے پاس گئے اور نہ جانے وہاں کیا گفت و شنید ہوئی۔ ہمارے آفیسر واپس آئے تو انہوں نے یہ مژدہ سنایا کہ کل صبح عورتوں کو یہاں سے نکال دیا جائے گا۔

چار پانچ روز بعد وہاں سے اطلاع آئی تھی کہ اگلے ہی روز عورتوں کو فوجی حراست سے نکال کر لے گئے تھے لیکن یہ پتہ نہیں چلا کہ وہ انہیں کہاں لے گئے۔ بہرحال یہ ڈی کمپنی کے مسلمانوں کی بہت بڑی فتح تھی لیکن انگریز افسروں نے ڈی کمپنی کو یوں سزا دی کہ کمپنی پر پابندیاں عائد کر دیں کہ کوئی جوان کیمپ سے باہر نہیں جا سکتا اور کسی انڈونیشی سویلین کے ساتھ بات نہیں کر سکتا۔

ایک روز اچانک یوں ہُوا جیسے انڈونیشیا کے جنگلات اور بستیوں پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ یہ ایسا وسیع پیمانے پر آپریشن شروع کیا گیا تھا جس طرح جھاڑو دیا جاتا ہے۔ امریکہ سے تازہ دم کریک فورس آگئی تھی اور برٹش آرمی کی بھی بہت سی یونٹیں تھیں اور باقی یونٹیں انڈین آرمی کی تھیں۔ اس تمام فوج کو کئی میلوں میں پھیلا کر اس طرح ایڈوانس کیا گیا کہ اوپر سے لڑاکا بمبار طیارے آتے تھے جو کم بلندی پر جا کر بم پھینکتے تھے۔ اس کے ساتھ توپ خانے بے انداز گولہ باری کرتے تھے۔ انفنٹری کی امریکی' انگریز اور ہندوستانی یونٹیں پیش قدمی کرتی تھیں اور راستے میں کوئی چھوٹی موٹی بستی نظر آجاتی تو اس کے بچّے سے بوڑھے تک کو باہر نکال کر ذلیل و خوار کیا جاتا اور گھروں کی تلاشی لی جاتی تھی۔ جس گھر پر شک ہوتا کہ اس گھر کا خواہ ایک ہی جوان گوریلوں میں ہے تو اس گھر کو آگ لگا دی جاتی تھی۔ ان ملیبیوں کو توقع تھی کہ یہ غریب اور مفلس لوگ ڈر جائیں گے اور اپنی گوریلا فورس کی مدد نہیں کریں گے لیکن انہیں سخت مایوسی ہوئی کہ ادھر آپریشن ہوتا اور شام کو یونٹیں واپس اپنے اپنے کیمپ میں پہنچ جاتیں تو گوریلے کسی نہ کسی کیمپ پر گرینیڈ پھینکتے اور مشین گنوں اور ٹامی گنوں کا فائر چھڑکاؤ کی طرح کرکے

غائب ہو جاتے تھے۔

اس دوران انڈونیشی مجاہدین نے دس بارہ گاڑیوں کی ایک کنوائے کو لُوٹا۔ اس میں زیادہ تر راشن تھا اور تھوڑا اسلحہ بارود بھی تھا۔

بعض چھوٹی چھوٹی بستیاں تو بالکل ہی خالی ملتی تھیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ ان کے رہنے والے کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ وہ اپنے گوریلا شبخونوں اور کارروائیوں سے انگریزوں اور امریکیوں کو احساس دلاتے رہتے تھے کہ ہم یہیں ہیں' کہیں بھاگ نہیں گئے۔ حیرت اس پر ہوتی تھی کہ انڈونیشی مجاہدین کی گوریلا کارروائیاں اس ظالمانہ آپریشن میں پہلے سے زیادہ ہو گئی تھیں اور اتحادی فوج کا نقصان بھی پہلے سے زیادہ ہوتا تھا۔



میں امریکیوں اور انگریزوں کے یہ آپریشن اور ان کے جواب میں انڈونیشی مجاہدین کی جوابی گوریلا کارروائیاں پوری تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کروں گا۔ اگر میں ان تفصیلات میں الجھ گیا تو پھر کوئی دوسری بات نہیں کر سکوں گا۔ عرصے بعد میں جب گھر واپس آیا تھا تو ایک امریکی نامہ نگار کی لکھی ہوئی کتاب پڑھی تھی اور پھر امریکہ کے ایک مشہور ماہنامہ "ریڈرز ڈائجسٹ" میں ایک مضمون انڈونیشی مجاہدین کی جنگ آزادی کے بارے میں پڑھا تھا۔ میں اس کتاب اور "ریڈرز ڈائجسٹ" کے حوالے ہی کافی سمجھوں گا۔

امریکی نامہ نگار نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ اتحادیوں یعنی امریکیوں اور انگریزوں کے بمبار ہوائی جہاز اور توپ خانے جنگلوں پر اس قدر بم اور گولے برساتے تھے کہ گمان ہوتا تھا کہ کوئی درخت اور کوئی ذی روح سلامت نہیں رہا ہو گا لیکن جب ہوائی جہاز' توپ خانے اور انفنٹریاں واپس چلی جاتی تھیں تو اُسی رات گوریلے کہیں نہ کہیں شب خون مار کر اتحادیوں کو احساس دلا دیتے تھے کہ وہ پہلے سے زیادہ زندہ و بیدار ہیں۔

"ریڈرز ڈائجسٹ" میں مضمون نگار نے امریکی ہوتے ہوئے بھی تعصب کا ذرہ بھر مظاہرہ نہیں کیا تھا اور انڈونیشی مجاہدین کو کشادہ ظرفی سے خراج تحسین پیش کیا تھا۔ اس نے لکھا کہ انڈونیشی گوریلے جب ایک آپریشن کے بعد کہیں حملہ کرتے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے انہیں زمین نے نِگل لیا تھا اور اب اگل دیا ہے اور زمین پھر انہیں نِگل کر اپنی

آغوش میں چھپالے گی۔

میں آپ کو اپنے ایک ساتھی کی کہانی سناتا ہوں۔ یہ تھا ہمارا اے کمپنی کا کلرک عاشق علی۔ میں نے شاید پہلے بتایا ہے کہ جنگِ عظیم کے دوران فوج میں جو کلرک بھرتی کئے جاتے تھے انہیں ڈائریکٹ حوالدار بھرتی کیا جاتا تھا۔ جنگ سے پہلے سپاہی کلرک ہُوا کرتے تھے۔ عاشق علی جنگ کے دوران بھرتی ہُوا تھا اور ٹریننگ کے بعد ہماری بٹالین میں آگیا۔ اسے اے کمپنی کا کلرک بنایا گیا۔

اُس کی عمر کوئی بائیس تیئس سال ہو گی۔ اُس کا رنگ گورا تھا اور وہ صحیح معنوں میں خوبصورت نوجوان تھا اُس میں زندہ دلی بھی تھی اور خاندانی شرافت بھی۔ وہ تحصیل چکوال کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اُس نے مجھے کئی بار کہا تھا کہ جب بھی موقع ملا وہ بھگوڑا ہو کر انڈونیشی مسلمانوں کے پاس چلا جائے گا اور کافروں کے خلاف لڑے گا۔ میں نے اسے کبھی نہیں بتایا تھا کہ میرا ان گوریلوں کے ایک دو کمانڈروں کے ساتھ خفیہ رابطہ رہا ہے اور اب بھی ہے۔ میں نے یہ سوچ کر اپنا یہ راز نہیں دیا کہ ابھی بچّہ ہے، کہیں ہندوؤں سکھوں میں بیٹھا یہ بات کہہ نہ ڈالے۔

میں جس ظالمانہ آپریشن کی بات کر رہا ہوں، اس میں ہماری چاروں کمپنیاں شامل ہوا کرتی تھیں۔ کمپنی کلرک بھی کمپنی کمانڈر کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ ایسے ایک آپریشن کے دوران اے کمپنی دُور جنگل میں جا کر کسی اور سمت چلی گئی۔ اسے وہ علاقہ دیا گیا تھا۔

عاشق علی اپنے کمپنی کمانڈر کے ساتھ تھا۔ کمپنی کمانڈر کے ساتھ اردلی بھی تھا اور آپریٹر بھی۔ اُس وقت ریڈیو ٹیلی فون فوج کو مل گئے تھے اور اس کے لئے ایک آپریٹر ہر آفیسر کے ساتھ ہوتا تھا۔ کمپنی کمانڈر ایک پلاٹون کی طرف چلا گیا اور یہ پلاٹون چٹانی علاقے میں گئی تو وہاں گوریلوں کی اچھی خاصی فائرنگ آنے لگی جو چاروں طرف سے آ رہی تھی۔

اسے گھات کہہ لیں یا گوریلے جنگل میں کہیں دیکھ رہے تھے اور جب انہوں نے دیکھا کہ ایک پلاٹون کمپنی سے الگ ہو کر چٹانی علاقے میں آگئی ہے تو انہوں نے چٹانوں کی اونچائیوں سے اس پلاٹون پر گولیاں برسانی شروع کر دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے چھ سات جوان مارے گئے۔ گوریلوں کو پہلے اطلاع نہیں دی جا سکی تھی کہ یہ مسلمانوں کی پلاٹون

ہے اور یہ فلاں علاقے میں جائے گی۔ پہلے کسی کو پتہ ہی نہیں تھا ورنہ انڈونیشی گوریلے مسلمانوں پر گولی نہ چلاتے۔

فائر ایسا آیا کہ کوئی گولی ضائع نہیں ہوتی تھی۔ انڈونیشی گوریلے اُس وقت رائفل سے گولی نکلتے تھے جب انہیں یقین ہوتا تھا کہ یہ گولی ایک فوجی کو ضرور لگے گی۔

ایسے کارگر فائر سے پلاٹون بوکھلا گئی اور اِدھر اُدھر بکھر گئی۔ جوانوں نے پوزیشنیں لے لیں اور اندھا دھند فائر شروع کر دیا، گرینیڈ بھی پھینکے اور مشین گنیں تو بے رحمی سے فائر کیں۔ گوریلے اپنا وار کر کے جنگل اور چٹانوں میں لاپتہ ہو گئے۔

جب فائر ختم ہُوا تو کمپنی کمانڈر، کمپنی صوبیدار اور حوالدار وغیرہ پلاٹون کے جوانوں کو دیکھنے نکلے۔ انہوں نے پلاٹون کو پکارا اور کہا کہ ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں لیکن پلاٹون کی حالت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ سارے جوان بکھر گئے تھے اور ان کا ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ نہیں رہا تھا۔

سورج غروب ہونے کو تھا۔ وہ آپریشن ختم کر دیا گیا۔ یہ آپریشن پورے ایک بریگیڈ کا تھا۔ واپسی کا حکم ملا۔ اے کمپنی کی اس پلاٹون کی لاشیں اٹھالی گئیں اور جو زخمی چل سکتے تھے وہ چل پڑے اور جو چلنے کے قابل نہیں تھے انہیں سٹریچروں پر ڈال لیا گیا۔

واپس آکر جب کمپنی کی گنتی کی گئی تو پتہ چلا کہ حوالدار کلرک عاشق لاپتہ ہے۔ اب یہ ممکن نہیں تھا کہ واپس جا کر اسے ڈھونڈا جاتا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور رات جلدی ہی گہری ہو گئی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ کمپنی کمانڈر نے واپس آتے ہوئے یہ بھی نہ دیکھا کہ اس کا کمپنی کلرک جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا اب اس کے ساتھ نہیں۔

اگلے دن کوئی ایسا آپریشن یا کوئی اور جنگی پروگرام نہیں تھا۔ ساری فورس کو جو دراصل پوری بریگیڈ کی نفری تھی، اُس روز آرام دیا گیا تھا۔ ہمارے کمانڈنگ آفیسر نے پوری کی پوری اے کمپنی کو آگے جانے کا حکم دیا تاکہ عاشق علی کی لاش لائی جا سکے یا ہو سکتا ہے وہ شدید زخمی حالت میں کہیں پڑا ہُوا ہو۔ کمانڈنگ آفیسر کا یہ جو حکم تھا کہ لاش لائی جائے، اس میں جذبات کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ لاش لانے کا مطلب یہ تھا کہ عاشق علی کی موت کی تصدیق ہو جاتی تھی۔

کمپنی گئی اور علاقے میں گھوم پھر کر، کھڈ نالے دیکھ کر مایوس واپس آگئی۔ کمپنی کو عاشق علی زندہ یا مُردہ نہ ملا۔

یہ میں جانتا تھا کہ عاشق علی انڈونیشی مسلمانوں کے پاس چلا گیا ہے۔ اسے کمپنی کمانڈر کے ساتھ رہنا چاہئے تھا لیکن وہ دانستہ اس سے الگ ہو گیا ہو گا اور ٹیکریوں اور چٹانوں اور اونچی گھاس میں چھپتا چھپاتا گوریلوں کے پاس پہنچ گیا ہو گا۔ میں نے کمپنی کمانڈر کے اردلی سے پوچھا تھا۔ یہ اردلی بھی مسلمان تھا۔ اُس نے بتایا کہ اسے پتہ ہی نہیں چلا محمد عاشق علی کس وقت اور کس جگہ ان سے الگ ہو گیا تھا۔

عاشق علی کے گھر یہ سرکاری اطلاع بھیجی گئی تھی کہ آپ کا بیٹا حوالدار کلرک عاشق علی لڑائی میں لاپتہ ہو گیا ہے.... اسے انگریزی میں کہا جاتا تھا Missing in action۔

○

میرے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں تھا کہ میں وثوق سے کہہ سکتا کہ عاشق علی انڈونیشی مسلمانوں کے پاس چلا گیا ہے لیکن میں یقین کے ساتھ کہتا تھا کہ وہ مرا نہیں نہ وہ زخمی ہُوا ہے بلکہ وہ اُدھر چلا گیا ہے۔ میں جب سوچتا تھا کہ ایک ماں کا اتنا خوبصورت اور نوجوان بیٹا اللہ کی راہ میں جان قربان کرنے کو چلا گیا ہے تو مجھے اپنے آپ میں شرم محسوس ہوتی تھی اور وہ بھولا بھالا انڈونیشی لڑکا میری آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا جو نائیک مجید کا پیغام لے گیا تھا۔ میں نے اب پکا ارادہ کر لیا کہ اب انگریزوں کی آرمی میں نہیں ٹھہروں گا۔

پانچ چھ دن گزر گئے تو بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے ایک سیکرٹ لیٹر آیا جس میں ہماری دونوں کمپنیوں کو ایک خاص ٹاسک دیا گیا تھا۔ اس میں ایک گاؤں کا نام لکھا ہُوا تھا۔ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو اطلاع یہ ملی تھی کہ اس گاؤں میں اسلحہ بارود کا ذخیرہ کیا جا رہا ہے اور وہاں چھاپہ مار کر وہ پکڑنا ہے اور وہاں جتنے بھی آدمی اور عورتیں ملیں انہیں گرفتار کرنا ہے۔ کمپنیوں نے ایک روز بعد روانہ ہونا تھا۔

موجوکرتو میں بھی میں نے ایک انڈونیشی کے ساتھ رابطہ رکھا ہُوا تھا۔ اس کے ساتھ کسی وقت مسجد میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ جنگِ آزادی کا ایک اہم کل پُرزہ تھا۔ اس کا کام مخبری اور جاسوسی تھا اور اس کا رابطہ اس علاقے کے گوریلا ہیڈ کوارٹر کے ساتھ تھا۔

بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے یہ خفیہ چٹھی آئی تو میں نے بڑی تیزی سے یہ نقل کی اور اسی دن کے پچھلے پہر اس شخص کے گھر چلا گیا۔ اُس کا نام حمزہ تھا۔ اُسے یہ نقل دی اور میں فوراً وہاں سے نکل آیا۔

میں وہاں سے نکل ہی رہا تھا کہ تو ہماری بٹالین کا پولیس حوالدار سامنے آگیا۔ ہر بٹالین میں رجمنٹل پولیس ہُوا کرتی تھی۔ اس میں ایک حوالدار اور چند ایک جوان ہُوا کرتے تھے۔ وہ ہم میں سے ہی ہوتے تھے۔ ہمارا پولیس حوالدار سرگودھا کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کا نام صداقت شاہ تھا۔ مجھے اس گھر سے نکلتا دیکھ کر رک گیا اور بڑے تپاک سے ملا۔

اس نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کِس کا گھر ہے۔ میں نے اُسے یہ نہ بتایا کہ یہ شخص کس حیثیت کا مالک ہے' میں نے یوں کہا کہ اس سے ایک بار مسجد میں ملاقات ہوئی تھی اور وہاں سے ایسے تعلقات شروع ہوئے کہ یہ اصرار کیا کرتا ہے کہ میں کبھی کبھار اس کے گھر آیا کروں۔ مطلب یہ کہ میں نے یہ تاثر دیا کہ یہ ایک دوستانہ بات ہے کہ میں اس شخص سے ملنے آیا تھا۔

مجھے پوری امید تھی کہ حوالدار صداقت شاہ چونکہ مسلمان ہے اس لئے اس کی ہمدردیاں انڈونیشی مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔ اس نے میرے ساتھ ایسی ہی باتیں شروع کر دیں جیسے وہ بھی کسی نہ کسی دن بٹالین سے بھاگ کر انڈونیشی مسلمانوں کے پاس چلا جائے گا۔ مجھے آج تک اس کی جوشیلی اور جذباتی باتیں اچھی طرح یاد ہیں۔

میں وہاں سے اپنے کمرے میں آیا۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد کسی نے مجھے بتایا کہ سی کمپنی کے دس بارہ جوانوں کو تیار کر کے قصبے میں لے گئے ہیں۔ لے جانے والا سی کمپنی کا کمانڈر تھا جو انگریز میجر تھا۔ میں نے سوچا کہ جاسوسوں نے کسی گھر کے بارے میں اطلاع دی ہو گی اور اس گھر پر چھاپہ مارنے کے لئے یہ جوان لے جائے گئے ہیں۔ میں نے کوئی زیادہ توجہ نہ دی۔

میں شام کا کھانا کھا کر فارغ ہُوا ہی تھا کہ میرے کمرے میں سی کمپنی کا کمانڈر داخل ہُوا اور بڑے رعب سے مجھے کہا کہ اُٹھو' ہمارے ساتھ چلو۔ میں فوراً" اٹھا اور اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

اپنے دفتر میں لے جا کر کمپنی کمانڈر نے وہ کاغذ جس پر میں نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا آپریشن آرڈر نقل کیا تھا' میرے آگے رکھ دیا اور پوچھا یہ تم اس گھر میں دے آئے تھے؟..... میں نے لاعلمی اور حیرت کا اظہار کیا۔ وہ اور زیادہ غصے میں آگیا اور مجھے حراست میں لینے کا حکم دے دیا۔

فوج میں کسی سپاہی کو جب حراست میں لیا جاتا ہے تو اسے کوارٹر گارڈ کی حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے لیکن حوالدار کو حراست میں لیا جائے تو اسے حوالات میں بند نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے ساتھ ایک حوالدار بطور گارڈ لگا دیا جاتا ہے۔ یہ حوالدار ہر روز تبدیل ہوتا ہے اور نیا حوالدار آ جاتا ہے۔ ہمارے وقتوں میں ایسی حراست کو "پٹی قید" کہا جاتا تھا۔

میرے ساتھ بھی ایک سکھ حوالدار گارڈ لگا دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اگلے روز کمانڈنگ آفیسر کے دفتر پیش کیا جائے گا۔ میں سمجھ گیا یہ کیا ہُوا ہے۔ پولیس حوالدار صداقت شاہ اپنا آدمی تھا لیکن یہ یقیناً" اُسی نے مخبری کی تھی۔ رجمنٹل پولیس کی یہی ڈیوٹی ہوتی تھی کہ مخبری اور چُغلی کی جاتی رہے۔ آخر ان لوگوں نے بھی ترقی لینی ہوتی تھی۔

اگلے روز جب مجھے کمانڈنگ آفیسر کے پیش کیا گیا تو چارج شیٹ پڑھ کر مجھے سنائی گئی۔ وہ یہ تھی کہ میں نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا ایک آپریشن آرڈر نقل کر کے دشمن کے حوالے کیا۔ اس کا گواہ پولیس حوالدار صداقت شاہ تھا اور قصبے کے دو انڈونیشی عیسائیوں کو بھی میرے خلاف گواہ بنا لیا گیا تھا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں کچھ دن پہلے یہاں سے نکل نہ گیا۔ میں ارادے ہی باندھتا رہا اور پکڑا گیا۔ پکڑے جانے کا مجھے ذرا برابر بھی افسوس نہیں تھا۔ میں اسے بھی جہاد کا ایک حصہ سمجھتا تھا لیکن بار بار دل پر چوٹ پڑتی تھی کہ مجھے تو میدان جنگ میں جانا تھا اور زیادہ سے زیادہ صلیبیوں' ہندوؤں اور سکھوں کو رائفل کا نشانہ بنانا تھا۔

یہ چارج شیٹ کسی معمولی سے جرم کی نہیں تھی بلکہ بڑا ہی سنگین جرم تھا کہ کوئی اتنی خفیہ اطلاع قبل از وقت دشمن کو پہنچا دے.... مجھے کمانڈنگ آفیسر سزا دے سکتا تھا لیکن اس نے میری چارج شیٹ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو بھیج دی.... پانچ چھ دنوں بعد بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے اطلاع آئی کہ میری چارج شیٹ ڈویژن ہیڈ کوارٹر بھیج دی گئی ہے اور ساتھ لکھا گیا ہے کہ اس حوالدار کلرک کا فیلڈ کورٹ مارشل ہونا چاہئے کیونکہ جرم سنگین ہے اور یہ کورٹ مارشل کا جرم ہے۔

فیلڈ کورٹ مارشل بڑی خطرناک چیز ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میدانِ جنگ میں جرم سرزد ہُوا ہے اور وہیں کورٹ بنا کر سزا سنا دی جاتی ہے۔ کوئی رُو رعایت نہیں ہوتی۔ میرا جرم واقعی سنگین تھا اور مجھے تو یہ توقع تھی کہ سزائے موت دی جائے گی

اور اگر ان انگریزوں نے مجھ پر رحم کیا تو عمر قید دیں گے۔ میرے پاس تو صفائی کا گواہ تھا ہی نہیں۔ میں آپ کو یہیں بتا دیتا ہوں کہ یہ کارستانی صداقت شاہ کی تھی۔ حوالدار' جمعدار اور صوبیدار وغیرہ جس طرح انگریز افسروں کی خوشامد کرتے تھے' وہ سویلین حضرات تصور میں نہیں لا سکتے۔ خوشامد اور چاپلوسی تو اب بھی ہوتی ہے لیکن آپ نے ہندوستانیوں کو خوشامد کرتے نہیں دیکھا تھا۔ مثلاً" ہماری بٹالین میں تین صوبیدار ایسے تھے جو پہلے تو فوجی انداز سے اٹینشن ہو کر اور اکڑ کر سیلوٹ کرتے تھے اور اس کے بعد صاحب کے آگے رکوع میں چلے جاتے تھے جو غیر فوجی حرکت تھی۔ انگریز انہیں اس غیر فوجی حرکت سے روکتے نہیں تھے کیونکہ وہ ہندوستانیوں کو ذہنی طور پر غلام بنا رہے تھے اور بنا لیا تھا۔

حوالدار صداقت شاہ رجمنٹل پولیس کا حوالدار تھا۔ اُس کی کوئی اور ڈیوٹی نہیں تھی۔ بٹالین میں کون سے ڈاکے پڑتے تھے کہ یہ حوالدار تفتیش کرتا ہو گا' اُس کا کام غیبت' چغلی اور مخبری کرنا تھا۔ وہ تو انگریز افسروں کے آگے بچھ بچھ جاتا تھا لیکن میری بدقسمتی کہ میں اُسے مسلمان سمجھتا تھا اور اُس سے یہی امید رکھتا تھا کہ وہ کم از کم میری چُغلی نہیں کرے گا لیکن اس نے کر دی۔ یہ تو اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ میں نے اس انڈونیشی کے گھر میں جا کر اسے کیا دیا ہے۔ ہمارے ایجوٹنٹ نے اس انڈونیشی کے گھر جا چھاپہ مارا اور ایسی تلاشی لی کہ آپریشن آرڈر کی نقل جو میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی برآمد کر ہو گی۔ حوالدار صداقت شاہ نے یقیناً" ایجوٹنٹ کو بتایا تھا کہ میرا رابطہ ان انڈونیشی گوریلوں کے ساتھ ہے۔

یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی کہ ایک مسلمان نے اپنے مسلمان بھائی کے خلاف کفار کو جا بھڑکایا اور اسے ثبوت مہیا کیا۔ یہ واقعہ اس لئے عجیب نہیں کہ ہماری قوم میں شجاعت اور جذبۂ ایثار بے مثال ہے جس کے حوالے دوسری قومیں بھی دیتی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ قوم نے جو غدار پیدا کئے ہیں وہ کوئی اور قوم پیدا نہیں کر سکی۔ تاریخ اسلام پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ شجاعت اور غداری پہلو بہ پہلو چلی آ رہی ہیں۔ اس حوالدار نے اللہ کی خوشنودی کی بجائے ایک انگریز افسر کی خوشنودی حاصل کرنا زیادہ بہتر سمجھا کیونکہ اسے امید تھی کہ یہ افسر خوش ہو کر ترقی دے دے گا۔

میرے لئے اذیت یہ تھی کہ مجھ پر ایک سکھ حوالدار ڈیوٹی دیتا تھا۔ ہر روز نیا حوالدار

آتا تھا اور جو بھی آتا وہ بظاہر ہمدردی سے لیکن در پردہ طنزیہ انداز میں مجھ سے بات کرتا اور کہتا تھا کہ انڈونیشی مسلمانوں کی مدد کرنے میں نقصان ہی نقصان ہے۔ پھر یہ حوالدار مجھ سے بھید لیتے تھے کہ میں نے واقعی انہیں آپریشن آرڈر کی کاپی دی ہے یا نہیں۔ میں انہیں ٹالتا رہتا تھا۔ میں نے فرار کی ترکیبیں بھی سوچیں لیکن یہ بدبخت سکھ حوالدار ایک منٹ کے لئے بھی مجھ سے پرے نہیں ہٹتے تھے۔

میں نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو سزائے موت یا عمر قید کے لئے تیار کر لیا۔ میرے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ میں نے انگریزوں کے دشمن کی مدد کی تھی۔ انڈونیشی مسلمان ایسے دشمن تھے جو شکست کا نام بھی نہیں سنتے تھے اور روز بروز طاقتور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ جاپان کی فوج بڑی ہی طاقتور فوج تھی اور اس کے پاس جدید اسلحہ تھا اور اسے اپنی نیوی کی اور اپنی ایئر فورس کی مدد بھی حاصل تھی پھر بھی امریکیوں اور انگریزوں نے اس سے ہتھیار ڈلوا لئے تھے لیکن انڈونیشی مسلمان دبنے میں آتے ہی نہیں تھے۔ ان کا تو یہ حال تھا جیسے چنگاریوں کو بارود کے ڈھیر میں دبانے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ ایسے دشمن کو مدد دینا بہت ہی بڑا جرم تھا اور میرا سب سے بڑا جرم تو یہ تھا کہ میں مسلمان تھا اور میں نے مسلمانوں کی مدد کی تھی۔

○

پانچ چھ دنوں بعد ڈویژن ہیڈ کوارٹر سے حکم نامہ آ گیا کہ اس حوالدار کا فیلڈ کورٹ مارشل کیا جائے۔ فوری طور پر کورٹ مارشل کے ممبر چنے گئے جو سب کے سب انگریز افسر تھے۔ کورٹ مارشل میں یوں ہوتا ہے کہ ایک آفیسر سرکاری وکیل یعنی پراسیکیوٹر بن جاتا ہے اور ایک کو ملزم کا صفائی کا وکیل بنا دیتے ہیں۔ میرے فیلڈ کورٹ مارشل کے لئے چار ممبر اور ایک پریذیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ دو افسر دوسری یونٹوں کے بلائے گئے۔

مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تو سب سے پہلے میری فردِ جرم سنائی گئی جو میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ سب سے پہلا گواہ جو میرے خلاف کورٹ مارشل کے سامنے آیا وہ حوالدار صداقت شاہ تھا۔ بات اتنی سی ہوئی تھی کہ میں اس انڈونیشی مسلمان کے گھر سے نکل رہا تھا تو صداقت شاہ سامنے آ گیا تو اس نے رک کر میرے ساتھ ہاتھ ملایا لیکن صداقت شاہ نے گواہی میں کہا کہ وہ کیمپ سے اس انڈونیشی کے گھر تک گیا تھا اور میرے پاس آپریشن آرڈر کی نقل تھی جو میں نے ہاتھ سے تیار کی تھی اور یہ بھی کہ میں

نے یہ نقل صداقت شاہ کو پڑھ کر سنائی تھی اور پھر میں جب اس انڈونیشی کے گھر تک پہنچا تو میں نے صداقت شاہ سے کہا کہ وہ ٹھہرے اور میں یہ کاغذ اندر دے کر آتا ہوں۔

میرے صفائی کے وکیل نے جو انگریز میجر تھا اور وہ جو مبنگ سے اپنی یونٹ سے آیا تھا حوالدار صداقت شاہ پر جرح کی لیکن یہ جرح بالکل بے معنی اور کھوکھلی تھی۔ وہ آخر انگریز افسر تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ میں بری ہو جاؤں۔ وہ تو کورٹ مارشل کی ایک خانہ پری کی گئی تھی کہ ملزم کا وکیل بھی قانوناً" لازمی ہوتا ہے۔ اس کی جرح کے جواب میں صداقت شاہ مزید جھوٹ بولتا رہا۔

جب جرح ختم ہوئی تو میں نے سوچا کہ مجھے سزا تو ضرور ہی ملے گی پھر میں اپنے دل کا غبار کیوں نہ نکال لوں۔ میں نے صداقت شاہ سے مخاطب ہو کر کہا ——— "لعنت ہے تم پر صداقت شاہ! ابھی تم پر اللہ کی لعنت پڑے گی اور تم کتے کی موت مرو گے"۔

کورٹ مارشل کا پریذیڈنٹ ایک انگریز لیفٹیننٹ کرنل تھا۔ اُس نے مجھے غصے سے شٹ اَپ کہہ کر چپ کرا دیا۔ اس نے کہا کہ ملزم کو بولنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اگر ملزم یوں بولے گا تو اسے توہینِ عدالت کی سزا الگ ملے گی۔

اس کے بعد دو انڈونیشی جو اسی قصبے کے رہنے والے تھے، عدالت میں میرے خلاف پیش کئے گئے اور دونوں نے اس قسم کی گواہیاں دیں کہ میں اس انڈونیشی سے ملتا ملاتا رہتا ہوں اور وہ انڈونیشی گوریلا ہیڈ کوارٹر کا آدمی ہے اور وہ جاسوسی کر کے اطلاعات و معلومات اپنے دفتر میں پہنچاتا ہے اور میں اُسے جاسوسی میں مدد دیتا ہوں۔ ان عیسائی گواہوں کو عینی شاہد بنایا گیا تھا۔

ہمارے ایکوئنٹ آفس میں میرے ماتحت چار حوالدار کلرک تھے جن میں ایک سکھ تھا۔ اسے کورٹ مارشل میں لایا گیا اور اس نے گواہی دی کہ میں جب آپریشن آرڈر کی نقل کر رہا تھا تو اس نے اپنی آنکھوں دیکھا تھا۔ اس طرح دو اور جھوٹے گواہ پیش کئے گئے اور پانچ چھ دنوں کی سماعت کے بعد کورٹ مارشل ختم ہو گیا اور اس کے کاغذات اوپر بھیج دیئے گئے۔ میں ابھی حراست میں تھا۔

میرا صفائی کا وکیل ہر گواہ پر جرح کرتا تھا اور میں صاف طور پر نوٹ کر رہا تھا کہ اس کے بعض سوال ایسے ہوتے تھے جیسے وہ صفائی کا وکیل نہیں بلکہ استغاثہ کا وکیل ہے اور میرے خلاف جرم ثابت کر رہا ہے۔ میرے خلاف تو جرم ثابت ہو ہی گیا تھا اور مجھے

یہاں سے انصاف کی توقع نہیں تھی۔ اگر یہ سول کی کورٹ ہوتی تو مجھے دو تین پیشیوں کے بعد ہی بری کر دیا جاتا کیونکہ کوئی ثبوت اور کوئی شہادت نہیں تھی لیکن کورٹ مارشل کا مطلب ہوتا ہے کہ جو ملزم اس کے سامنے لایا گیا ہے اس نے جرم کیا ہے اور اسے سزا دینی ہی ہے۔

○

پندرہ سولہ دنوں بعد فیصلہ آگیا جو مجھے اس طرح سنایا گیا کہ موجو کرتو میں ہماری جتنی بھی نفری تھی اسے پریڈ گراؤنڈ میں فال اِن کیا گیا اور مجھے ان کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ کمانڈنگ آفیسر نے اردو میں میرا جرم سنایا اور پھر سزا سنائی.... آٹھ سال سزائے قید بامشقت نوکری سے ہمیشہ کے لئے برطرف.... یہ سب کچھ سنا کر کمانڈنگ آفیسر میرے سامنے آن کھڑا ہُوا اور اس نے میرے بازو سے حوالداری کا نشان پکڑ کر اتنی زور سے کھینچا کہ میری قمیض بھی پھٹ گئی اور پھر اس نے میرے کندھوں سے رجمنٹ کے نشان اتار کر اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ اس کے بعد مجھے ایک سکھ حوالدار اور چار سکھ جوانوں کے حوالے کر دیا گیا اور حکم دیا کہ اسے سورابایا جیل میں لے جاؤ۔

میں چونکہ حوالدار تھا اس لئے مجھے ہتھکڑی نہ لگائی گئی۔ اصل وجہ یہ تھی کہ وہاں ہتھکڑی تھی ہی نہیں۔ سزا کے بعد میں حوالدار تو رہا ہی نہیں تھا اور اب میں سزا یافتہ مجرم تھا۔ ہتھکڑی نہ لگانے کی وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے لیکن میں اسے اللہ کا ایک خاص کرم کہا کرتا ہوں کہ میرے ہاتھ پاؤں کھلے رہے۔

سکھ حوالدار اور جوان مجھے وہاں سے لے کر اُس طرف چل پڑے جدھر ایک ٹرک کھڑا تھا۔ اس ٹرک سے مجھے سورابایا جیل جانا تھا۔ انڈونیشیا کا یہ بڑا شہر وہاں سے بیس میل دُور تھا۔ مجھے جب کمانڈنگ آفیسر کے حکم سے ٹرک کی طرف لے چلے تو کمانڈنگ آفیسر نے بٹالین کی اس نفری کو جو وہاں کھڑی تھی لیکچر دینا شروع کر دیا تھا۔ اس کے یہ الفاظ میرے کانوں میں پڑے کہ اب کوئی بھی اس طرح دشمن کی مدد کرتے ہوئے پکڑا گیا تو اسے سزائے موت دی جائے گی۔ اس انگریز کرنل نے یہ بھی کہا کہ میں مسلمانوں کو خبردار کرتا ہوں کہ وہ انڈونیشی باغیوں کی اس لئے مدد نہ کریں کہ وہ مسلمان ہیں۔ فوج میں کوئی مذہب نہیں ہوتا، فوج میں حکم اور فوجی قانون چلتا ہے۔

اس انگریز کرنل کے الفاظ دھیمے ہوتے گئے کیونکہ میں اس سے دُور ہٹتا جا رہا تھا اور

اور مجھے ٹرک میں بٹھا لیا گیا۔ میرا گارڈ سکھ حوالدار بختاور سنگھ تھا۔ میری سزا کے کاغذات اس کے پاس تھے۔ چار سکھ سپاہی میری گارد تھی۔ دو الگ ہٹ کر ایک طرف اور دو دوسری طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ سکھ حوالدار نے میرے ساتھ اظہار افسوس و ہمدردی کیا اور کہا تم تو خواہ مخواہ سزا لے بیٹھے ہو۔

"کوئی افسوس نہیں حوالدارا!" ـــــ میں نے ہنستے ہوئے کہا ـــــ "تم دیکھ لینا، ایک سال کے اندر اندر انڈونیشیا آزاد ہو جائے گا اور میں جیل سے باہر ہوں گا۔ اگر ایسا نہ ہُوا تو بھی کوئی افسوس نہیں۔ باہر حرام کی موت مرنے سے یہ بہتر نہیں کہ جیل میں جا بیٹھو اور مفت کی روٹیاں کھاؤ؟"

حوالدار بختاور سنگھ احمقوں کی طرح ہنس پڑا۔ وہ ذرا سا بھی محسوس نہ کر سکا کہ میں نے اپنی ہنسی میں اور ان الفاظ میں کیسا دکھ اور کیسا عزم چھپا لیا ہے۔ ٹرک چلا جا رہا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ ٹرک سے کود کر فرار ہو سکتا ہوں یا نہیں۔ حوالدار بختاور سنگھ کے پاس سٹین گن تھی اور چاروں سکھ جوانوں کے پاس رائفلیں تھیں۔ ان کی میگزینوں میں راؤنڈ بھرے ہوئے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ میں ٹرک سے کود گیا تو یہ مجھ پر گولی چلا دیں گے اور میں بے کار مارا جاؤں گا۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ اپنی جان انڈونیشی مجاہدین پر کس طرح قربان کروں۔ کبھی تو مایوسی سے دل ڈوب جاتا تھا کہ میں اپنے اس ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکوں گا۔ اس ذہنی کیفیت میں مَیں اپنے آپ کو کوستا تھا کہ پہلے ہی میں کیوں بھاگ نہ گیا۔ میں ٹرک میں دل ہی دل میں اللہ تبارک تعالیٰ کو یاد کرتا گیا اور یہ کہتا گیا کہ یا اللہ ' میں تو تیری راہ پر قربان ہونا چاہتا تھا ' یہ تُو نے کیا کیا ' مجھے تھوڑی سی تو مہلت دے دے کہ میں اسلام کے نام پر کچھ کر سکوں۔

میرے دل میں یہ دعا تھی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور میں سکھ حوالدار کے ساتھ اس طرح ہنس ہنس کر باتیں کرتا جا رہا تھا جیسے مجھے اس سزا کا کوئی غم نہیں بلکہ میں خوش ہوں کہ فوجی ڈیوٹی سے جان چھوٹی۔

سورابایا ساحلی شہر ہے۔ یہ شہر قریب آتا چلا گیا اور مجھ پر یہ مایوسی غالب آگئی کہ میں فرار نہیں ہو سکوں گا۔ میں اندازہ کرتا جا رہا تھا کہ کتنا سفر طے ہو گیا ہے اور کتنا باقی ہے۔

آگے ایک دریا آگیا۔ میں اس سارے علاقے سے ناواقف تھا۔ ٹرک اس دریا کے پُل پر چڑھا تو میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ وہاں دریا کا پاٹ کچھ تنگ تھا اس لئے پانی کا

جوش و خروش زیادہ تھا۔ ٹرک کے اوپر ترپال نہیں تھا اس لئے دُور دُور تک باہر کے منظر نظر آ رہے تھے۔ میں نے اُس طرف دیکھا جس طرف دریا کا بہاؤ تھا۔ تھوڑا ہی آگے جا کر دریا بائیں کو مڑتا تھا۔ وہاں کنارے کچھ اُونچے اور چٹانی تھے اور درخت اتنے زیادہ کہ کچھ دُور تک نظر نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے غور کیا کہ مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ اس دریا میں کود جاؤں؟.... میں تیرنا تو ٹھیک ٹھاک جانتا تھا لیکن ایسے سیلابی دریا میں کبھی نہیں اترا تھا۔

میں اٹھ کھڑا ہُوا۔ حوالدار بختاور سنگھ نے بیٹھ جانے کو کہا تو میں نے اسے بتایا کہ ذرا ٹانگیں سیدھی کر رہا ہوں۔ اسے میں نے یہ تاثر دیا تھا کہ اس سزا کا مجھے کوئی غم نہیں۔ میں آہستہ آہستہ ٹرک کے ٹیل بورڈ تک گیا اور بختاور سنگھ کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ میں یہ بھی سوچتا رہا کہ دریا میں کود جاؤں یا یہ خطرہ مول نہ لوں۔ اچانک ایک غیبی سی آواز آئی کہ اٹھو اور کود جاؤ۔ ٹرک کی رفتار تیز تھی اور یہ پُل کے درمیان چلا جا رہا تھا۔ وہاں سے میں دریا میں نہیں کود سکتا تھا۔ ایک ہی طریقہ تھا کہ پہلے میں ٹرک سے کودوں اور پھر پُل کے جنگلے پر چڑھوں اور دریا میں کود جاؤں۔ جنگلا اتنا ہی اونچا تھا جتنا ٹرک کا ٹیل بورڈ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اس طرح دریا میں نہیں کود سکوں گا۔ میں اتنی تیز ٹرک سے کودتا تو گرتا اور پھر اٹھتا۔ اتنی دیر میں میرے سکھ گارڈ پہنچ جاتے اور مجھے پکڑ لیتے اور اگر میں بھاگنے کی کوشش کرتا تو پیچھے سے گولی چلا دیتے۔

مجھے کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی.... اللہ نے کرم کیا کہ ٹرک یک لخت آہستہ ہو گیا اور اس کی رفتار کم ہوتے ہوتے ایسی رہ گئی جیسے کوئی آدمی پیدل چل رہا ہو۔ سامنے سے ایک فوجی کنوائے آ رہا تھا اور ہمارے ٹرک کے آگے دو گھوڑا گاڑیاں جا رہی تھیں جن کی کوئی رفتار ہی نہیں تھی۔ اب ٹرک کی پوزیشن یہ تھی کہ سڑک کے درمیان سے جنگلے کے ساتھ ہو گیا تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ٹرک رک گیا۔ اُس وقت ٹرک پُل کے وسط تک پہنچ گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے ایک غیبی طاقت نے مجھے پیچھے سے دھکا دیا ہو۔ میں نے ایک پاؤں ٹیل بورڈ پر رکھا۔ اُس وقت پُل کا جنگلہ بالکل ساتھ تھا۔ میں نے دوسرا پاؤں جنگلے پر رکھا اور پیشتر اس کے کہ میرے گارڈ مجھے پکڑتے یا رائفلیں اٹھا کر مجھے نشانہ بناتے میں نے دونوں پاؤں جنگلے پر رکھ دیئے اور سیلابی دریا میں ڈائیو لگا دی۔

دل میں اللہ کا نام تھا۔ مجھے یہ روحانی تسکین بھی تھی کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا، ڈاکہ نہیں ڈالا تھا، کسی کو قتل نہیں کیا تھا اور مجھے یہ سزا چوری کی واردات کی نہیں ملی تھی، میں اللہ کی راہ میں پکڑا گیا تھا اور کفار نے مجھے سزا دی تھی۔ روح کہتی تھی کہ اللہ میری مدد کرے گا.... میں دریا میں گرا تو نیچے ہی نیچے جاتا رہا۔ پُل خاصا بلند تھا۔ اتنی بلندی سے ڈائیو لگانے سے یہی ہوتا تھا کہ مجھے دریا کی تہہ تک چلے جانا تھا لیکن وہاں تو دریا کی تہہ تھی ہی نہیں۔ پاٹ تنگ تھا، دریا سیلابی تھا اور گہرائی کا کوئی حساب نہ تھا۔

○

مجھے اب یہ ڈر تھا کہ سکھ اوپر سے فائر کریں گے۔ میں نے اپنے ہوش و حواس ٹھکانے رکھے اور سانس روک کر پوری کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ دیر پانی کے اندر رہوں۔ دریا کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ آخر میں پانی سے اوپر اٹھنے لگا لیکن میری کوشش ابھی پانی کے اندر ہی رہنے کی تھی۔ میں پانی کے بہاؤ کی رفتار محسوس کر رہا تھا اور مجھے امید تھی کہ میں جب پانی سے ابھروں گا تو خاصی دُور پہنچ چکا ہوں گا۔ اس کے ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ رائفل بہت دُور تک مار کر سکتی ہے، سکھ گارڈ مجھے نشانہ بنا لیں گے۔

سانس روکے رکھنے کی حد ختم ہو گئی اور میں پانی سے ابھرا۔ وہاں موجیں اوپر نیچے ہو رہی تھیں اور انہوں نے مجھے بھی اسی طرح ہلارے دینے شروع کر دیئے۔ میں نے پیچھے نہ دیکھا، دیکھ سکتا بھی نہیں تھا کہ پُل کتنی دور رہ گیا ہے۔ موجیں مجھے اٹھا اٹھا کر پٹخ رہی تھیں۔ کچھ اور آگے جا کر میں نے محسوس کر لیا کہ پانی کے ساتھ بائیں کو مُڑ رہا ہوں۔ میں نے کنارے کی طرف تیرنے کی کوشش شروع کر دی لیکن پانی کا زور اتنا شدید تھا کہ کنارے تک پہنچنا محال نظر آ رہا تھا۔

ایک تو پانی کا جوش اور زور زیادہ تھا اور دوسرا خطرہ یہ نظر آنے لگا کہ سکھ پُل سے پار جا کر ٹرک دریا کے کنارے کنارے لے آئیں گے اور مجھے پکڑ لیں گے یا دریا ہی میں گولی مار دیں گے۔ میں نے سوچا کہ ٹرک وہاں تک آ جائے گا یا نہیں۔ مجھے یہ ممکن نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ کنارے پر گھنا جنگل اور ٹیکریاں تھیں۔ ٹرک کے لئے وہ علاقہ دشوار گذار تھا۔

آگے جا کر دریا کا پاٹ چوڑا ہو گیا اور دریا دائیں طرف کو مُڑ گیا۔ پاٹ کی چوڑائی نے سیلاب کا جوش اور زور کم کر دیا تھا جس سے میرے لئے تیرنا آسان ہو گیا۔ میں نے اپنے دماغ کو حاضر اور عقل کو ٹھکانے رکھا۔ دل پر ذرا سی بھی گھبراہٹ نہ آنے دی۔ میں نے

کسی بھی جگہ بلاوجہ ہاتھ پاؤں نہیں مارے تھے' میں نے سوچ لیا تھا کہ بازوؤں اور ٹانگوں کو تھکانا نہیں۔ پانی بہت ہی ٹھنڈا تھا جو میرے جسم کو اکڑا رہا تھا۔ میں اتنے ہی ہاتھ پاؤں مارتا تھا کہ پانی کی سطح پر رہوں۔

میرے اندازے کے مطابق ابھی دن کا ایک ہی بجا ہو گا۔ سورج سر پر آگیا تھا اور بادل گھنے ہوتے جا رہے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مینہ برسے گا۔ میں خود چاہتا تھا کہ موسلادھار بارش شروع ہو جائے تاکہ میں اس میں چھپا رہوں اور کچھ دُور سے بھی کوئی دیکھ نہ سکے۔

میں بار بار ایک بات دہرائے جا رہا ہوں۔ کہ میں بالکل پُرسکون تھا اور میرے دل پر خوف تو دور کی بات ہے' ذرا سی گھبراہٹ بھی نہیں تھی اور اسے میں اس امر کی نشانی سمجھتا تھا کہ میرے سر پر اللہ کا ہاتھ ہے اور میں ہر مشکل میں سے گزر جاؤں گا اور کوئی خطرہ میرے راستے میں حائل نہیں ہو سکے گا.... یہ تو میرا تجربہ ہے کہ انسان صحیح راستے پر جا رہا ہو اور اُس کی زبان پر صداقت ہو اور دل پاک ہو تو انسان بڑے سے بڑے خطرے میں سے بھی زندہ و سلامت گزر جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ مشکلیں آسان ہوتی جا رہی ہیں۔ اسے اللہ کی مدد کہتے ہیں۔

میں اب کنارے پر پہنچنے کے لئے جسم کی ساری طاقت صرف کر کے تیر رہا تھا۔ دریا کا اتنا تیز بہاؤ اور سیلاب مجھے اپنے ساتھ ہی ساتھ لے جا رہا تھا۔ آخر کار اللہ کی مدد سے میں سیلاب کی تندی و تیزی سے نکل آیا اور دریا کے اُس حصے میں پہنچ گیا جہاں پانی پُرسکون تھا اور میں کنارے کی طرف ذرا کم زور صرف کر کے تیر رہا تھا۔ مجھے زیادہ تیرنا نہ پڑا کیونکہ جسم کو ڈھیلا چھوڑا تو میرے پاؤں دریا کی تہہ سے لگ گئے۔ پانی کی گہرائی میری کمر تک تھی۔ میں پانی میں چلتا ہُوا دریا سے نکل گیا۔

وہ بالکل ہی ویران علاقہ تھا جو گھنا جنگل تھا لیکن درخت دوسرے جنگلات سے مختلف تھے۔ زیادہ تر تاڑ اور ناریل کے درخت تھے جو سمندر کے قریب ساحلی علاقوں میں ہوتے ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ میں سمندر کے قریب ہوں۔ وہاں ٹیکریاں بھی تھیں اور جنگل بہت گھنا تھا۔ کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔

گھڑی میرے پاس نہیں تھی۔ گھڑی کمرے میں اتار کر رکھی تھی اور جب مجھے حراست میں لینے کے لئے آئے تو اتنی جلدی مجھے لے گئے کہ تو میں گھڑی بھی اور کچھ اور

چیزیں بھی کمرے میں ہی چھوڑ آیا۔ میرا اندازہ تھا کہ دن کے ابھی تین بجے ہیں۔ مجھے بہت جلدی کسی آبادی میں پہنچنا تھا۔ میں جانتا تھا کہ آبادی کوئی بھی ہوئی' اس میں مسلمان ہی ہوں گے یا زیادہ تر گھر مسلمانوں کے ہوں گے۔

میں سورابایا جانا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ ایک بڑا شہر ہے اور اس شہر کی چھاؤنی بھی خاصی بڑی ہے اور یہاں امریکی اور برطانوی فوج کے ہیڈ کوارٹر بھی ہیں اور انڈین آرمی کا ہیڈ کوارٹر بھی غالباً" وہاں تھا۔ اس کے باوجود میں سورابایا اس امید پر جا رہا تھا کہ کسی مسلمان گھر میں جا پہنچوں گا اور جب انہیں بتاؤں گا کہ میں انڈین آرمی سے بھاگ کر مجاہدین کے پاس آیا ہوں تو وہ مجھے گلے لگا لیں گے۔ ایسا کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ انڈونیشیا کا کوئی مسلمان مجھے دھوکہ دے گا اور پکڑوا دے گا۔

میرے راستے میں ایک اونچی چٹان آگئی۔ میں اس خیال سے اس چٹان پر چڑھ گیا کہ اوپر جا کر ہر طرف دیکھوں گا' شاید کوئی آبادی نظر آجائے.... اوپر گیا تو بہت دُور ایسے آثار نظر آئے جیسے وہ بکھرے ہوئے جھونپڑے ہیں۔ میں نیچے اترا اور اس طرف چل پڑا۔ زمین سے وہ جھونپڑے نظر نہیں آتے تھے۔

ذرا ہی دور مجھے دو جنگلی قسم کے آدمی جاتے نظر آئے۔ وہ دریا کی طرف جا رہے تھے۔ سوائے چھوٹے سے ایک کپڑے کے جس سے انہوں نے اپنے اپنے ستر ڈھانپے ہوئے تھے' ان کے جسموں پر کوئی اور کپڑا نہیں تھا۔ ان کے رنگ سیاہ تھے۔ میں نے انہیں پکارا تو انہوں نے میری طرف دیکھا۔ میں ان کی طرف چل پڑا اور وہ آپس میں کوئی بات کر کے آہستہ آہستہ میری طرف آنے لگے.... وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں مسکرایا تو ان کے ہونٹوں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ میرے سر کی اور میرے کپڑوں کی حالت دیکھ کر وہ جان گئے تھے کہ میں دریا میں سے نکل کر آ رہا ہوں۔

میں نے دریا کی طرف اشارہ کیا اور پھر بازو گھما گھما کر انہیں سمجھایا کہ میں تیر کر نکلا ہوں اور پھر کہا ــــ "سورابایا.... سورابایا" ــــ اور پھر ہاتھ اور سر سے اشارہ کیا کہ یہ شہر کس طرف ہے۔ ان میں سے ایک میرے پیچھے آن کھڑا ہُوا اور اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ کر مجھے ذرا بائیں طرف گھمایا اور پھر میرے پہلو میں آ کر اس طرف اشارہ کیا اور کہا ــــ "سورابایا.... ہو ہو.... سورابایا" ــــ اس کا مطلب یہ تھا کہ سیدھے چلتے جاؤ اور آگے سورابایا آجائے گا۔ میں نے مسکرا کر اور ذرا جھک کر ان کا شکریہ ادا کیا

اور وہ بھی مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

○

میں اُس سمت کو چل پڑا۔ وہ علاقہ دشوار گذار تو نہیں تھا لیکن تیز اور سیدھا چلنا آسان بھی نہیں تھا کیونکہ اس علاقے میں ڈھیریوں جیسی ٹیکریاں بھی تھیں اور کھڈ بھی تھے۔ زمین کٹی پھٹی تھی اور بچ بچ کر چلنا پڑتا تھا۔ بہرحال میں نے سمت کا خیال رکھا اور راستہ بناتا ہوا چلتا چلا گیا۔

اب تھکن میرے جسم کو توڑنے لگی تھی۔ میں یخ دریا میں تیرا بھی تھا اور پیدل بھی چلتا رہا تھا اور پیٹ بھی خالی تھا اس لئے تھکن خاصی زیادہ ہو گئی تھی لیکن میں نے بھوک اور تھکن کو اپنے ذہن اور اعصاب پر سوار نہ ہونے دیا' قوتِ ارادی کو بھی مضبوط رکھا۔ پیاس تو محسوس ہی نہیں ہو رہی تھی کیونکہ جسم پانی میں سے نکل کر آیا تھا اور فضا میں نمی زیادہ تھی۔

ایک چھوٹے سے کھڈ سے بچنے کے لئے میں اس کے کنارے کنارے گزرنے لگا تو اس کے بالکل ساتھ ایک بڑا درخت تھا۔ مجھے اس درخت کے تنے کا سہارا لینا پڑا۔ میں نے ہاتھ تنے سے لگایا اور اُدھر دیکھا نہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ درخت کا تنا کھُردرا نہیں جیسے ہر درخت کا ہوتا ہے بلکہ یوں لگا جیسے میں نے کسی انسان کے جسم پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ انسان کا جسم بھی تو اتنا نرم نہیں ہوتا۔ میں نے ادھر دیکھا تو کوئی چیز متحرک نظر آئی جس کا رنگ درخت جیسا ہی تھا۔ میں تو جمپ لگا کر تین چار قدم آگے جا پڑا اور پھر پیچھے دیکھا۔ میرا دل بڑی زور سے دھک دھک کرنے لگا.... وہ ایک اژدہا تھا جو تنے کے ساتھ لپٹا ہُوا اوپر جا رہا تھا۔ اُس کی موٹائی بلا مبالغہ آٹھ نو انچ تھی۔ دس انچ بھی ہو سکتی تھی۔ اس کا منہ ایک ٹہن تک پہنچ گیا تھا اور دم ابھی زمین سے ذرا سی اٹھی تھی۔ اس سے اندازہ کریں کہ اس کی لمبائی کتنی تھی۔ میرا ہاتھ لگنے سے وہ رک گیا تھا اور اس نے مُنہ نیچے لٹکا لیا تھا۔ میں نے وہاں سے بھاگنے ہی میں عافیت سمجھی۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ انڈونیشیا کے جنگلوں میں درختوں پر رہنے والے اژدہا اکثر پائے جاتے ہیں لیکن یہ اتنے خطرناک نہیں ہوتے کہ انسان کو ہی نگل جائیں' جنگل کے چھوٹے چھوٹے جانوروں کو اور درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں اور ان کے بچوں اور ان کے انڈوں کو اپنی روزمرہ کی خوراک بنائے رکھتے ہیں۔

میں وہاں سے بہت تیز چل پڑا جیسے میرے جسم میں نئی طاقت آ گئی ہو۔ مجھے وہ مکان نظر آنے لگے جو میں نے چٹان پر چڑھ کر دیکھے تھے۔ وہاں سے وہ یوں نظر آئے تھے جیسے یہ عام سی قسم کے جھونپڑے ہوں لیکن یہ جھونپڑے نہیں بلکہ اچھی قسم کے مکان تھے۔ ان میں کچھ ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور کچھ الگ الگ تھے۔ گھنا جنگل پیچھے رہ گیا تھا اور دریا تو چھ سات میل دور چلا گیا تھا۔ میں نے بڑا لمبا اور مشکل سفر طے کیا تھا۔ اب آگے درخت تو تھے لیکن دُور دُور تھے اور مجھے پکا راستہ بھی نظر آ گیا جو اس بستی کی طرف جاتا تھا۔

اس چھوٹی سی بستی کے پس منظر میں مجھے ایک شہر نظر آنے لگا تھا لیکن ابھی مکانوں کی منڈیریں ہی نظر آتی تھیں۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ یہ گھر مسلمانوں کے ہی ہو سکتے تھے۔ سوچا کہ میں کسی گھر کے دروازے پر جا دستک دوں گا اور جب اپنا تعارف کراؤں گا تو وہ لوگ میرا پُرتپاک استقبال کریں گے۔

ایک مکان دوسروں سے الگ اور میرے قریب تھا۔ میں اسی طرف چل پڑا۔ سورج مغرب کی طرف نیچے چلا گیا تھا۔ میں ابھی اس مکان سے کچھ دور ہی تھا کہ مکان کے پچھواڑے سے ایک جوان لڑکی سامنے آئی اور اُس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے ہاتھ اوپر کر کے ہلایا اور وہ تیزی سے میری طرف آ گئی۔ میں رک گیا۔ وہ اور تیز چلتی میرے سامنے آ رکی اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اُس نے پاجامہ سا پہن رکھا تھا اور فراک نما لمبی قمیض تھی اور اس نے سر پر سکارف باندھا ہُوا تھا۔ لڑکی جوان تھی اور گورے رنگ کی تھی اور بڑی خوبصورت تھی۔

"مسلم!" —— میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا —— "انڈین آرمی.... مسلم.... مسلم سمہ سمہ!"

"مردیکا!" —— لڑکی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا —— "مسلم.... مسلم سمہ سمہ!" —— اُس نے اپنے گھر کی طرف اشارہ کیا اور کچھ کہا جس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ آؤ میرے گھر چلو۔

میں اُس کے ساتھ چل پڑا۔

"انڈین آرمی؟" —— لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے بڑی خوشی سے اوپر نیچے سر ہلایا کہ ہاں میں انڈین آرمی سے آیا ہوں۔

اب اُس نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر پھر کہا ـــــ ’’مسلم..... مردیکا!‘‘ ـــــ اس نے کچھ اور بھی کہا جو میں نہ سمجھ سکا۔

مکان چبوترے پر بنا ہُوا تھا۔ چبوترے کی چار پانچ سیڑھیاں تھیں اور باہر برآمدہ بھی تھا۔ میں لڑکی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ گیا اور لڑکی نے دروازہ کھولا۔ میں اس کے ساتھ اندر گیا تو یہ گھر بڑا ہی صاف ستھرا نظر آیا۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ لڑکی نے مجھے ایک کرسی پر بٹھایا اور دوڑتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

وہ واپس آئی تو اس کے ساتھ ایک آدمی تھا جس کی عمر پچاس سال سے زیادہ لگتی تھی۔ اس کا لباس خالصتاً انڈونیشی مسلمانوں جیسا تو نہ تھا لیکن غیر مسلموں جیسا بھی نہیں تھا۔ اس آدمی نے اندر آ کر مجھے بازوؤں میں لے کر گلے لگا لیا۔ پھر اُس نے بڑے پیار سے مجھے کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ بار بار لفظ مسلم‘ مردیکا اور مسلم سمہ سمہ کہتا تھا۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ وہ انڈونیشی زبان بول رہا تھا۔

میں نے اشاروں میں اسے بتایا کہ میں دریا تیر کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ اس آدمی کے ساتھ بات کرتے ہوئے مجھے کچھ سہولت مل گئی کہ وہ کوئی کوئی لفظ انگریزی کا استعمال کرتا تھا۔

پھر ایک عورت کمرے میں آئی جس کی عمر پچاس سال سے کچھ کم ہی لگتی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اس آدمی کی بیوی اور اس لڑکی کی ماں تھی۔ اُس نے بھی مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر میرا ماتھا پھر میرے گال چومے اور بٹھا دیا۔ میں نے اشارے سے انہیں بتایا کہ میں بہت بھوکا ہوں۔ یہ عورت تو جیسے تڑپ اٹھی ہو۔ اُس نے اشارے سے کہا کہ ٹھہرو ابھی بندوبست کرتی ہوں۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ یہ عورت ایک ٹرے اٹھائے کمرے میں آئی اور ایک تپائی گھسیٹ کر میرے آگے کر دی اور ٹرے اس پر رکھی۔ یہ چائے تھی اور اس کے ساتھ آملیٹ تھے اور مچھلی تو بے شمار تھی۔ ڈبل روٹی کے سلائس بھی تھے۔ میں تو محفل کے اور کھانے کے آداب بھول ہی گیا اور ان چیزوں پر ہلّہ بول دیا۔ جب میرا پیٹ بھر گیا تو میں شرمندگی سی محسوس کرنے لگا کہ یہ لوگ کہیں گے کہ یہ جنگلی کہاں سے آ گیا ہے۔

اس کے بعد لڑکی نے مجھے ایک پاجامہ اور قمیض اور ایک تولیہ دیا اور بازو سے پکڑ کر مجھے اٹھایا اور غسل خانے میں چھوڑ آئی۔ میں بڑے اطمینان سے نہایا‘ صابن سے اپنا جسم

پاک صاف کیا اور تولیے سے جسم پونچھ کر کپڑے پہنے اور واپس اسی کمرے میں آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ سورج غروب ہو گیا تھا اور کمرے میں ایک لالٹین جل رہی تھی۔ میں نے تنہائی سی محسوس کی اور کچھ دیر انتظار کیا کہ میرے میزبانوں میں سے کوئی نہ کوئی تو کمرے میں آئے گا لیکن یوں معلوم ہونے لگا جیسے اس گھر میں کوئی رہتا ہی نہیں۔ میں نے سوچا خود ہی باہر نکل کر دیکھتا ہوں۔ پیٹ بھر چکا تھا اور میں نے غسل کر لیا تھا‘ اس سے میری طبیعت بحال ہو گئی تھی اور میں عجیب سی تازگی محسوس کر رہا تھا۔

میں نے بند دروازے کو ذرا سا دھکیلا تو دروازہ نہ کھلا۔ ذرا زور سے دھکیلا تو بھی نہ کھلا اور مجھے پتہ چل گیا کہ دروازہ باہر سے بند ہے۔ کمرے کی ایک ہی کھڑکی تھی جس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اس کمرے کے ساتھ دوسرا کمرہ تھا اور ان دونوں کمروں کے درمیان دروازہ تھا۔ میں نے وہ دروازہ کھولا۔ اس کمرے میں اندھیرا تھا۔ مجھے ویسے ہی کوئی وہم سا ہونے لگا۔ میں یہ تو محسوس کر ہی رہا تھا کہ انڈونیشی مسلمانوں کے گھر اس طرح نہیں ہوتے۔ میں نے لالٹین اٹھائی اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں تین چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور ایک دیوار کے ساتھ کارنس تھی۔

کارنس پر کچھ چیزیں ڈیکوریشن کے انداز سے بڑے قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ ایک جوان آدمی کا فوٹو بھی فریم میں لگا ہُوا رکھا تھا اور درمیان میں بہت بڑی فریم میں لگی ہوئی حضرت عیسیٰؑ کی پینٹنگ تھی جس میں حضرت عیسیٰؑ کو صلیب کے ساتھ لٹکا ہُوا دکھایا گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی ہوں۔ یہ لوگ مسلمان نہیں تھے اور ظاہر ہے یہ ولندیزی تھے۔ تب مجھے لڑکی کا چہرہ یاد آیا جو بہت ہی خوبصورت تھا اور یہ خوبصورتی ولندیزی عورتوں کی ہی ہو سکتی تھی۔

ایک دیوار کے ساتھ ایک بڑے سائز کی الماری رکھی ہوئی تھی۔ میں نے الماری کھولی۔ اس میں کپڑے اور ایسی ہی کچھ چیزیں رکھی تھیں اور ایک خانے میں تین چار کتابیں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک کتاب اٹھا کر دیکھی تو یہ بائبل (انجیل) تھی۔ اب تو کوئی شک نہ رہا کہ یہ لوگ مسلمان نہیں۔ الماری میں ایک خانہ نیچے سے اوپر تک لمبوترا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بے تحاشا خوشی ہوئی کہ اس میں ایک دو نالی بندوق رکھی تھی اور الماری کے ساتھ کارتوسوں کی بیلٹ لٹک رہی تھی۔ میں نے بندوق اور بیلٹ وہاں

سے نکال لی اور الماری بند کر دی۔

میں نے دماغ کو حاضر رکھا اور اللہ تبارک و تعالیٰ سے مدد مانگی۔ میں نے سوچا کہ یہ لوگ اچھے خاصے احمق ہیں۔ یہ تو میں سمجھ ہی گیا تھا کہ اس لڑکی نے مجھے دھوکہ دیا تھا اور اب کمرہ اس لئے باہر سے بند کر دیا ہے کہ مجھے بند کر کے وہ آدمی پولیس کو اطلاع دینے چلا گیا ہے لیکن جاہل آدمی نے یہ نہ سوچا کہ ساتھ والا کمرہ کھلا تھا اور اس میں بندوق اور کارتوس رکھے ہوئے ہیں۔

میں واپس اُسی کمرے میں آیا اور لالٹین رکھ دی۔ اب مجھے تیزی سے سوچنا اور اس سے زیادہ تیزی سے حرکت کرنی تھی۔ ایک خیال یہ آیا کہ بندوق کے بٹ سے دروازہ توڑ دوں اور بھاگ جاؤں اور دوسرا خیال یہ آیا کہ دروازے پر دستک دوں اور گھر کا کوئی فرد آ جائے تو میں اس سے بندوق کی نالی پر پوچھوں کہ اپنی اصلیت بتاؤ کیا ہے.... مجھے یہ صورت زیادہ اچھی لگی۔



میں نے دروازے پر زور زور سے ہاتھ مارے۔ تھوڑی ہی دیر بعد دروازہ کھلا اور وہی لڑکی اندر آئی۔ وہ ہنستی ہوئی آئی تھی اور اس نے مجھے بازوؤں میں لے لیا۔ میرے ہاتھ میں بندوق تھی۔ میں نے لڑکی کو ہلکا سا دھکا دے کر اپنے جسم سے الگ کیا اور بندوق کی بیرلیں یعنی نالیاں جھکا کر اس میں دو کارتوس ڈالے اور نالیاں لاک کر دیں۔ نالیاں لڑکی کے سینے کے ساتھ لگا دیں۔

لڑکی ذرا سی بھی نہ ڈری۔ اُس نے بڑے اطمینان سے اپنے ہاتھ سے بندوق ایک طرف کر دی اور پھر میرے ساتھ بغل گیر ہو گئی اور میرا منہ چومنے لگی۔

میں نے اُسے پھر دھکا دیا اور کہا ـــ "ڈچ!.... یو ڈچ!"

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بار بار کہتی تھی ـــ "مسلم.... می مسلم.... نو ڈچ.... مردیکا، مردیکا"۔

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ تمہارا باپ اور تمہاری ماں کہاں ہیں لیکن زبان کی مجبوری تھی۔ بہت اشارے کئے لیکن اس لڑکی نے یہ حرکت کی کہ پاجامہ اتار دیا اور مجھے گناہ کی دعوت دینے لگی۔ سر پر سکارف نہیں تھا اور میں اس کے بال دیکھ رہا تھا جو بڑی کشش والے تھے۔ صحیح الفاظ میں تو یہ کہوں گا کہ بال اشتعال انگیز تھے۔ یہ میں پہلے

آپ کو سنا چکا ہوں کہ ولندیزی عورتوں کا کردار اچھا نہیں تھا اور وہ راشن، شراب اور سگریٹ کے عوض اپنی عزت اور اپنا جسم پیش کر دیتی تھیں اور یہ ان کا کلچر بن گیا تھا۔

میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا کہ میرے لئے یہ کتنا سخت امتحان تھا۔ میں کوئی فرشتہ تو نہ تھا، آخر ایک دیہاتی اور فوجی تھا اور گھر سے نکلے ہوئے برسوں گزر گئے تھے۔ میں یہ بھی بیان نہیں کر سکا کہ یہ لڑکی کس قدر خوبصورت تھی اور اس کے جسم میں کیسا جادو تھا لیکن میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اللہ کو دل میں رکھ کر دل ہی دل میں کہا، یا اللہ، اس امتحان سے مجھے نکال دے اور یہ ایک معجزہ ہو گا۔

لڑکی نیم برہنہ ہو چکی تھی اور اُس نے ایسے انداز سے گناہ کی دعوت دی تھی جسے شاید ہی کوئی جوان آدمی ٹھکرا سکتا لیکن اللہ نے میری مدد یہ کی کہ اب وہ میری طرف آئی تو میں نے فوج میں جس طرح بیونٹ فائٹنگ (سنگین بازی) کی ٹریننگ لی تھی اس طرح بندوق کا بٹ اپنی کہنی کے نیچے کر کے پوری طاقت سے اُس کے منہ پر مارا۔ یہ ضرب تو کوئی ہٹا کٹا آدمی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ لڑکی پیچھے گرتے گرتے دیوار کے ساتھ جا لگی اور فرش پر گری پھر اس کے جسم نے کوئی حرکت نہ کی۔ میں کمرے سے نکل گیا۔

اب وہاں رکنا اور مزید تحقیقات کے لئے مکان کو دیکھنا خودکشی کے برابر تھا۔ باہر اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں مکان سے نکل آیا اور ایک طرف چل پڑا۔ یہ تو مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ سورابایا کا شہر کس طرف ہے۔ میں دراصل شہر میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ شہر کا مضافاتی علاقہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے منہ آسمان کی طرف کر کے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جس نے شیطان کا اتنا سخت حملہ ناکام بنانے کی ہمت عطا فرمائی تھی۔ مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت زیادہ طاقت دے رکھی ہے، یہ ہماری بدبختی ہے کہ ہم اس طاقت کو استعمال نہیں کرتے اور ذرا موقع ملتا ہے تو شیطان کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔

میں ابھی وہاں سے چلا ہی تھا کہ باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور ایک ٹارچ جلی اور بجھ گئی اور پھر یہ آوازیں قریب آنے لگیں۔ ٹارچ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد جلتی بجھتی تھی اور پھر میں قدموں کی آہٹ بھی سننے لگا جو بڑی تیزی سے قریب آ رہی تھی۔

میں مکان کی اوٹ میں ہو گیا۔ مکان کے پچھواڑے کی کھڑکی میں سے روشنی باہر جا

رہی تھی۔ اس روشنی میں جب وہ لوگ آئے تو لڑکی کے باپ کو تو میں نے پہچان لیا کیونکہ اسے میں پہلے دیکھ چکا تھا لیکن یہ اچھی طرح نہ دیکھ سکا کہ اس کے ساتھ دو آدمی کون تھے۔ کسی حد تک مجھے یقین ہُوا کہ یہ ملٹری پولیس کے انگریز سارجنٹ تھے یا ایک آفیسر تھا اور دوسرا سارجنٹ تھا' البتہ یہ یقین تو تھا ہی کہ یہ فوجی تھے اور مجھے گرفتار کرنے آئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ انہیں لڑکی کا باپ لایا تھا۔ مجھے اس سے اندازہ ہُوا کہ چھاؤنی دور نہیں۔ لڑکی کا باپ ان فوجیوں کو ایک گھنٹے کے اندر اندر لے آیا تھا۔

میں ایسی پوزیشن میں تھا کہ یکے بعد دیگرے دونوں کارتوس فائر کر کے ان تینوں کو مار سکتا تھا۔ کارتوسوں کے چھرّے پھیل کر تینوں کو بڑی آسانی سے گرا لیتے لیکن وہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں فائر کرتا۔ ان تینوں کو تو میں ختم کر دیتا لیکن ایسی صورتِ حال پیدا ہو سکتی تھی جو میرے لئے بہت بڑا خطرہ بن جاتی۔ وہ تینوں مکان کے دوسرے پہلو سے آئے اور میں دبے پاؤں اپنی اوٹ سے ہٹا اور ایک طرف چل پڑا۔ میں تیز نہ دوڑا کیونکہ میرے قدموں کی آہٹ میری نشاندہی کر سکتی تھی۔

اس مکان سے کچھ دور آ کر میں تیز چلنے لگا اور پھر دوڑ پڑا۔ ایک جگہ رک کر پیچھے دیکھا۔ ٹارچ کی روشنی مکان سے باہر گھوم پھر رہی تھی۔ وہ لوگ مجھے تلاش کر رہے تھے۔ میں پھر دوڑ پڑا اور اگلی آبادی قریب آنے لگی۔ بندوق اور کارتوسوں کی بیلٹ میرے پاس تھی۔

ذرا غور فرمائیں کہ ان ولندیزیوں کی لڑکیاں انڈونیشیا کی جنگِ آزادی کو نقصان پہنچانے کے لئے کیا رول ادا کر رہی تھیں' اور پھر لڑکی کے باپ کی کارروائی پر غور کریں۔

میں دوڑتے دوڑتے تھک گیا تو چلنے لگا اور زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اچھی قسم کے جھونپڑوں کی بستی شروع ہو گئی۔ میری پریشانی اب یہ تھی کہ میں اندھا دھند کسی دروازے پر دستک دینے سے گھبرا رہا تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ گھر مسلمان کا ہی ہوتا۔ میں ایک گلی میں جا رہا تھا تو ایک مکان کے اندر سے ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ دروازے کے سامنے سے گزرا تو دروازہ کھلا ہُوا دیکھا۔ آگے صحن تھا اور اس کے آگے برآمدہ تھا اور اس کے آگے کمرہ تھا اور کمرے اور برآمدے میں دیئے جل رہے تھے۔ یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ مسجد ہے۔ تب میں نے اوپر دیکھا تو دو لمبوترے مینار نظر آئے

لیکن گنبد نہیں تھا۔

اس گھر میں داخل ہونے سے مجھے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ میں نے پشاوری چپل پہن رکھے تھے۔ یہ اتارے اور اندر چلا گیا۔ مسجد کے اندرونی کمرے میں داخل ہوا تو ایک آدمی دیا سامنے رکھے تلاوتِ قرآن کر رہا تھا۔ لوگ عشاء کی نماز پڑھ کر جا چکے تھے۔ میں آہستہ آہستہ چلتا اُس شخص کے قریب گیا تو اُس نے قرآن مجید سے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ میں نے السلام علیکم کہا اور اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ انڈونیشی تھا۔

اس نے یہ تو دیکھ ہی لیا تھا کہ میں انڈونیشی نہیں ہوں اور میں یقیناً" ہندوستانی ہوں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اردو سمجھ سکتا ہے؟

"تھوڑا تھوڑا!" ــــ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے کچھ اشاروں میں اور کچھ الفاظ میں اسے بتایا کہ میں انگریزوں کی فوج سے بھاگ آیا ہوں اور مجاہدین کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ اُس نے قرآن بند کر دیا اور ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر اور سر ہلا کر اور مسکرا کر خراجِ تحسین پیش کیا۔ میں اسے اشاروں میں سمجھانا چاہتا تھا کہ مجھے گوریلوں کے کسی کمانڈر تک پہنچا دے۔ معلوم نہیں وہ میری بات سمجھا تھا یا نہیں' وہ اتنی سی بات تو سمجھ گیا تھا کہ میں اس کے پاس آیا ہوں اور اب یہ اس کا فرض ہے کہ مجھے اپنی پناہ میں لے لے۔ میرا خیال ہے اُسے کوئی حیرت نہیں تھی کہ ہندوستانی فوج کا ایک حوالدار ان کے پاس آ گیا ہے کیونکہ اُس وقت تک انڈین آرمی کے بہت سے مسلمان ان کے پاس پہنچ چکے تھے اور وہ ملیبیوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔

اُس نے قرآن مجید الماری میں رکھا اور پھر اُس نے مجھے اٹھنے کو کہا اور دِیا بجھا دیا۔ وہاں سے نکلے تو اس نے برآمدے کا دِیا بھی بجھا دیا اور ہم مسجد سے نکل آئے۔ وہ مجھے مسجد کے قریب ہی چھوٹی چھوٹی گلیوں میں سے گھماتا پھراتا ایک بڑے مکان کے سامنے جا رکا اور دروازے پر دستک دی۔

دروازہ ایک عورت نے کھولا۔ عورت نے اور اس آدمی نے آپس میں کوئی بات کی اور پھر یہ آدمی مجھے اندر لے گیا اور مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ دو تین منٹ بعد ایک ادھیڑ عمر انڈونیشی کمرے میں آیا۔ مجھے اس گھر میں لانے والا اٹھ کھڑا ہُوا اور میں بھی اٹھا۔ اس نے اپنی زبان میں میرا تعارف کرایا اور اس شخص نے میرے ساتھ ہاتھ

ملایا۔ اس کے ساتھ بات کرتے یہ سہولت مل گئی کہ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بول سکتا تھا۔ میں نے اسے تفصیل سے سنایا کہ میں کس طرح اپنی یونٹ سے بھاگا ہوں اور کس طرح دریا میں کود کر اس علاقے تک پہنچا ہوں اور ولندیزیوں کے پھندے میں آگیا تھا لیکن اللہ نے مدد کی اور میں نکل آیا۔

اس ادھیڑ عمر انڈونیشی نے مجھ سے کچھ سوالات پوچھے۔ وہ شاید یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میں جاسوس تو نہیں۔ میں نے بندوق اور کارتوسوں کی بیلٹ اسے پیش کی جو اس نے مسکراتے ہوئے مجھے لوٹا دی۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ میں جاسوس نہیں۔ وہ اٹھ کر اندر چلا گیا اور پانچ سات منٹ بعد واپس آیا۔ اُس کے پیچھے ایک بڑا خوبصورت نوجوان بھی کمرے میں داخل ہُوا۔ میں نے اسے بڑی غور سے دیکھا تو مجھے یوں وہم ہُوا جیسے میں بیداری کے عالم میں نہیں۔ وہ نوجوان مسکرایا اور بازو پھیلا کر میری طرف آیا۔

تب میں اٹھ کر اس کی طرف بڑھا اور دوسرے لمحے ہم ایک دوسرے کے بازوؤں میں تھے.... وہ میرا ساتھی نوجوان حوالدار کلرک عاشق علی تھا جس کے متعلق رپورٹ دی گئی تھی کہ وہ لاپتہ ہو گیا ہے۔

دنیا کا نقشہ کھول کر دیکھیں اور انڈونیشیا کا شہر سورابایا سے پنجاب کے شمالی علاقے تک کا فاصلہ ناپیں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ فاصلہ ساڑھے تین ہزار میل سے کچھ زیادہ ہے۔ انڈونیشیا تو کرۂ ارض کے دوسری طرف واقع ہے لیکن جب میں اُس انڈونیشی کے گھر میں جا بیٹھا تھا جہاں عاشق علی سے ملاقات ہوئی تھی تو یوں لگا جیسے میرے اور اس انڈونیشی کے درمیان بال برابر بھی فاصلہ نہیں۔ فاصلے دلوں کے پیمانے سے ناپے جاتے ہیں۔ میں جب انگریزوں کو' امریکیوں اور ولندیزیوں کو' اپنے ساتھی ہندوؤں اور سکھوں کو دیکھا کرتا تھا تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ میرے اور ان کے درمیان بڑی ہی لمبی اور کٹھن مسافت حائل ہے۔ ہمارے راستے جدا اور منزلیں جدا تھیں لیکن اس انڈونیشی کے گھر بیٹھ کر جس کا نام عثمان تھا' مجھے یوں روحانی سکون محسوس ہُوا جیسے میں اپنے گھر پہنچ گیا ہوں۔

یہ کیسا رشتہ تھا جو از خود ہی میرے سینے سے ایک شدید احساس بن کر اُبھر آیا تھا؟.. .. میری اس داستان یا سفرنامے کا پچھلا باب پڑھیں کہ میں کس طرح اس ادھیڑ عمر انڈونیشی مجاہد عثمان کے گھر پہنچا تھا۔ آپ کو ایک مسجد کا ذکر ملے گا جہاں میں ایک انڈونیشی کے پاس جا بیٹھا تھا اور وہ انڈونیشی تلاوتِ قرآن کر رہا تھا۔ یہ تھا وہ رشتہ جس نے میرے اور عثمان کے درمیان اجنبیت ہی پیدا نہ ہونے دی.... مسجد اور قرآن.... یہ تھا اسلام کا رشتہ جو دو مسلمانوں کے درمیان فاصلہ پیدا ہونے ہی نہیں دیا کرتا۔ پھر ایک رشتہ جہاد کے جذبے نے پیدا کیا تھا جو اور ہی زیادہ مضبوط تھا۔ اسے خون کا رشتہ کہنا چاہئے۔ دو مجاہدین جب کندھے سے کندھا ملا کر کفار کے خلاف میدانِ جنگ میں لڑتے

ہیں، زخمی ہوتے ہیں، گرتے اور اکٹھے شہید ہوتے ہیں تو ان کے جسموں سے بہتا ہوا خون ایک ہو جاتا ہے۔

یہ ہے اخوت اور اتحادِ مسلمین۔ آج پاکستان میں خصوصاً" اور عام طور پر ساری دنیا میں مسلمانوں کو ذلیل و خوار کرنے کے لئے اہلِ صلیب اور یہودی جو حربے آزما رہے ہیں، ذرا ان پر غور کریں۔ کہیں مسلمانوں کو قتل و غارت گری سے ختم کیا جا رہا ہے اور کہیں مالی امداد اور کہیں قرضوں کے ذریعے مسلمانوں کو مفلوج کر کے ان کا دین و ایمان خریدا جا رہا ہے۔ اہلِ صلیب صرف اس لئے کامیاب ہیں کہ ہم میں اسلام کا بنیادی اصول، اخوت اور اتحاد، ناپید ہو چکا ہے۔

میں بڑی شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ میری یہ داستان دراصل اسلامی اخوت اور اتحاد کی اور جہاد کی روائیداد ہے۔ انڈونیشی مسلمانوں نے اسی اصول کو سینے سے لگایا اور میں بھی اسی اصول کو اپنی روح میں بیدار کر کے وہاں پہنچا تھا۔ یہاں میں ایک بار پھر کہہ دیتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو ایک ہیرو کے طور پر پیش نہیں کر رہا، وہاں تو بے شمار ہیرو گئے تھے۔ یہ سب انڈین آرمی کے مسلمان فوجی تھے۔ میں آپ کو ایسے واقعات سناؤں گا جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی مدد کس طرح مجاہدین کو ملتی تھی۔ بعض واقعات تو معجزوں جیسے ہوئے تھے۔



عثمان کے گھر میں میرے ساتھ وہ سلوک نہیں ہوا جو میزبان اپنے مہمان کے ساتھ کرتے ہیں بلکہ یوں ہوا جیسے میں ان لوگوں کا بچھڑا ہوا ایک بھائی تھا اور واپس اپنے گھر آ گیا ہوں۔ مجھے نہلایا گیا، کپڑے دیئے گئے، کھانا کھلایا گیا اور ایک الگ کمرے میں عاشق علی کے ساتھ میرا بستر بچھا دیا گیا۔ عاشق علی کے مل جانے سے مجھے یہ سہولت میسر آ گئی کہ جو الٹی سیدھی بات دل میں آتی تھی وہ میں اس کے ساتھ کر لیتا تھا۔ زبان کی دشواری بھی نہیں تھی۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ وہ بھی پنجاب کا رہنے والا تھا اور اس کا گاؤں میرے قصبے سے کوئی زیادہ دور نہیں تھا۔

میں اور عاشق علی ساری رات جاگتے اور باتیں کرتے رہے۔ اس نے پہلے مجھ سے پوچھا کہ یہاں تک کس طرح پہنچا ہوں۔ یہ تو میں عثمان کو سنا چکا تھا اور عاشق علی نے بھی سن لیا تھا لیکن وہ اس سے پہلے کی باتیں پوچھ رہا تھا۔ میں بے تاب تھا کہ وہ اپنی سنائے کہ

س طرح یہاں تک پہنچا ہے۔ وہ اس نے پوری تفصیل سے سنایا.... یہ ہے وہ کہانی جو آپ تک بھی پوری تفصیل سے پہنچانا چاہتا ہوں۔ اس میں آپ کو کچھ اللہ کی مدد بھی ملیں گے۔

پچھلا باب ایک بار پھر دیکھ لیں۔ آپ کو یاد آئے گا کہ عاشق علی کہاں سے لاپتہ ہوا ...اب میں عاشق علی کے ساتھ اس کا حوالداری عہدہ نہیں لکھوں گا کیونکہ اب وہ ین آرمی کا فوجی نہیں بلکہ انڈونیشیا کی جنگِ آزادی کا مجاہد تھا.... مختصراً" بات یوں ی تھی کہ وہ پورے بریگیڈ کا آپریشن تھا جس میں ہماری بٹالین بھی شامل ہوئی تھی۔ ن کی کمپنی کا ایریا بڑی دشوار زمین والا تھا۔ وہاں ٹیکریاں بھی تھیں اور پیڑ پودوں کا گھنا ل بھی تھا اور چھوٹے بڑے کھڈ بھی تھے اور اونچی گھاس بھی تھی۔

عاشق علی اپنے کمپنی کمانڈر انگریز میجر کے ساتھ کمپنی کی ایک پلاٹون پوزیشنوں کی ف گیا۔ وہ پلاٹون کمپنی سے کچھ زیادہ ہی الگ تھلگ اور تھوڑی دور پوزیشن میں پہنچ تھی کہ اچانک تین اطراف سے اس پر رائفلوں اور ٹامی گنوں کا اور ایک یا دو مشین ن کا فائر اس طرح آنے لگا جیسے اچانک موسلا دھار مینہ برس پڑا ہو۔ اس پلاٹون کو اور آگے جانا تھا۔ اس کی نفری تیس پینتیس کے درمیان تھی۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ ان انڈونیشی گوریلوں کی گھات میں آ گئی تھی۔ میں نے پچھلے باب میں لکھا ہے کہ ونیشی گوریلوں کو پتہ نہیں چل سکا تھا کہ یہ پلاٹون مسلمانوں کی ہے ورنہ اس پر وہ ایک بھی فائر نہ کرتے۔ پلاٹون کا ہر جوان آڑ میں تھا اس لئے گوریلوں کو یہ جوان نظر نہیں تے تھے، انہیں صرف یہ معلوم تھا کہ کچھ نفری انڈین آرمی کی اس علاقے میں آ گئی اور گوریلوں نے اس پر فائر کھول دیا۔

عاشق علی کو اپنے کمپنی کمانڈر کے ساتھ رہنا تھا۔ کمپنی کمانڈر کے ساتھ وائرلیس یٹر بھی تھا۔ فائر ایسا اچانک اور اتنا زیادہ آیا کہ نفسا نفسی کا ماحول بن گیا اور عاشق علی ب ہی ایک کھڈ میں کود گیا۔ اس نے یہ نہ دیکھا کہ کمپنی کمانڈر اور وائرلیس آپریٹر دھر نکل گئے ہیں۔

جس کھڈ میں عاشق علی اترا تھا، اس میں تین چار جوان بیٹھ سکتے تھے۔ یہ اتنا ہی را تھا کہ بیٹھ کر سر بھی چھپایا جا سکتا تھا۔ اس کے کناروں پر جھاڑیاں تھیں اور گھاس تھی۔ ان کی وجہ سے کھڈ میں بیٹھا ہوا آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ عاشق علی کو بڑی اچھی

اور محفوظ پناہ ملی گئی تھی۔ گولیاں اُس کے سر کے اُوپر سے گزر رہی تھیں اور وہ گولیوں کے دھماکے ہی نہیں بلکہ اپنے اوپر گزرتی گولیوں کی سیٹیاں بھی سن رہا تھا۔

زیادہ فائر تو عاشق علی کی کمپنی کی طرف سے ہو رہا تھا۔ انڈونیشی گوریلے تو سوچ سمجھ کر اور اپنا ہدف دیکھ کر فائر کرتے تھے لیکن اس روز انہیں کہیں سے مشین گن مل گئی تھی اور وہ فوجیوں کی طرح برسٹ فائر کر رہے تھے۔ انگریزوں کی فوج کے پاس تو ضائع کرنے کے لئے بھی بے انداز ایمونیشن تھا۔ ہمارے فوجی اپنی حفاظت اس طریقے سے کیا کرتے تھے کہ اندھا دھند مشین گنیں' سٹین گنیں اور رائفلیں فائر کرنی شروع کر دیتے اور اکثریوں ہوتا کہ ٹریگر دبایا تو پھر اسے چھوڑنا بھول جاتے تھے۔

عاشق علی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اُس کی پلاٹون کے آدھے سے زیادہ جوان زخمی یا ہلاک ہو چکے ہوں گے اور باقی بڑی تیزی سے پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ اُس کا اندازہ غلط نہیں تھا جس کا ایک ثبوت یہ تھا کہ جس کھڈ میں وہ چھپا ہوا تھا اس کے بالکل قریب سے ایک انڈونیشی دوڑتا ہُوا گزرا۔ وہ اُس طرف جا رہا تھا جس طرف عاشق علی کی پلاٹون پسپا (ری ٹریٹ) ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور انڈونیشی گوریلا اس کھڈ سے اس طرح گزرا کہ وہ کھڈ میں گرا نہیں بلکہ اس کے اوپر سے کُود گیا۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کھڈ میں ایک فوجی چھپا بیٹھا ہے۔

میدانِ جنگ کی صورت یہ تھی کہ عاشق علی کی پلاٹون ہی نہیں بلکہ پوری کمپنی بڑی تیزی سے پیچھے ہٹ رہی تھی اور انڈونیشی گوریلے اس کے تعاقب میں جا رہے تھے۔ میں ایڈوانس اور ری ٹریٹ کو فوجی زبان میں بیان کر کے آپ کو بور نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ ضرور بتاؤں گا کہ پسپا ہونے کا یعنی پیچھے ہٹنے کا مطلب یہ نہیں کہ عاشق علی کی کمپنی کے افسر اور جوان اُٹھ کر پیچھے کو دوڑ پڑے تھے اور گوریلے ان کے تعاقب میں دوڑے جا رہے تھے۔ طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جوان ایک پوزیشن اور آڑ سے سرک کر پیچھے ہٹتے یا دوڑتے ایک اور آڑ میں جا پوزیشن لیتے اور فائر کرتے ہیں۔ اس طرح کمپنی یا نفری پیچھے ہٹتی جاتی ہے اور دشمن آگے بڑھنے کی جرات کم ہی کرتا ہے لیکن دشمن بھی پوزیشنیں بدل بدل کر پسپا ہونے والوں کا تعاقب کرتا ہے۔ وہ چونکہ گوریلے تھے اس لئے وہ بڑی دلیری سے دوڑتے اور کہیں پوزیشن لیتے پسپا ہونے والوں پر فائر کر رہے تھے۔

عاشق نے ابھی اس کھڈ سے نکلنے کی سوچی ہی نہیں تھی۔ اُسے ڈر تھا کہ وہ اٹھا تو

...سی گوریلے کی نظر میں آ جائے گا۔ یہ تو بعد میں دیکھے گا کہ یہ فوجی مسلمان تھا یا ہندو' ...یلے گولی چلائے گا۔ سب کے سروں پر سٹیل ہیلمٹ ہوتے تھے اس لئے یہ معلوم کرنا ...کن نہیں تھا کہ اس سٹیل ہیلمٹ کے نیچے جو فوجی ہے وہ مسلمان ہے یا ہندو۔

کچھ دیر بعد پھر دو انڈونیشی گوریلے عاشق علی والے کھڈ کے کنارے سے دوڑتے ...زر گئے۔ اب وہ آگے کو نہیں بلکہ پیچھے جا رہے تھے۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ ...گریزوں کی فوج بھاگ ہی جاتی اور دشمن اس کے تعاقب میں رہتا۔ ہماری بٹالین یا ...یگیڈ کی طرف سے پسپائی کے بعد کی کارروائی شروع ہو گئی۔ وہ یہ تھی کہ فیلڈ توپ ...نے کی توپیں گولہ باری کرنے لگیں۔ عاشق علی نے بتایا کہ اس گولہ باری میں ہماری ...لین کی مارٹر پلاٹون کی گولہ باری بھی شامل تھی۔ میں نے آپ کو پہلے بتایا ہے کہ ...گریزوں کی فوج کے پاس پھونکنے کے لئے بے انداز ایمونیشن تھا۔ اس بے دریغ گولہ ...ری کا مطلب اور مقصد یہ تھا کہ جہاں جہاں بھی گوریلے ہیں' وہ زد میں آ جائیں۔ توپ ...ارٹر گن کا گولہ پھٹتا ہے تو اس کے چھوٹے بڑے ٹکڑے گولیوں کی طرح ہر طرف ...تے ہیں اور ایک بھی ٹکڑا کسی کو لگ جائے تو وہ جوان بُری طرح زخمی ہوتا ہے اور اگر ...ر میں لگے اور ٹکڑے کا سائز ذرا بڑا ہو تو پھر وہ آدمی مر بھی جاتا ہے۔

انڈونیشی گوریلے اپنا کام کر گئے تھے۔ یہ تو انگریز بھی جانتے تھے کہ ان کا مقابلہ کسی ...اعدہ فوج کے ساتھ نہیں بلکہ گوریلوں سے مقابلہ ہے جو بکھرے ہوئے ہیں۔ بکھرے ...ے گوریلوں پر گولہ باری ہی کی جاتی تھی۔ گوریلوں نے اب تو پیچھے ہی ہٹنا تھا اور وہاں ...ے غائب ہو جانا تھا۔ بریگیڈ کے اس بڑے آپریشن کے دوران گوریلوں کی تعداد زیادہ ...ں۔ انہوں نے کئی اور یونٹوں کی کمپنیوں یا پلاٹونوں کو گھیر کر نقصان کیا تھا۔

○

عاشق علی نے مجھے سنایا کہ اب گولے اُس کے اِردگِرد پھٹنے لگے تھے۔ اُس کا تو دماغ ...ا رہا تھا۔ توپوں کی گولہ باری سے کوئی اور نقصان چاہے نہ ہی لیکن ہو' جس نفری کے ...رمیان یا اردگرد گولے پھٹتے ہیں اس نفری کے دماغ مسلسل دھماکوں سے ماؤف ہو جاتے ...ا اور وہ لڑنے کے قابل نہیں رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں دشمن کے مورچوں پر حملہ ...رنا ہوتا ہے' اس سے پہلے وہاں بے انداز گولہ باری کی جاتی ہے۔

عاشق کی باتوں سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ پہلے گولہ باری خاصی آگے کی جا رہی

تھی اور پھر گولے پیچھے آ کر پھٹنے لگے۔ عاشق علی نے یہ تو ارادہ کر ہی رکھا تھا کہ جب بھی اسے موقع ملا وہ اِدھر سے بھاگ کر انڈونیشی گوریلوں کے پاس چلا جائے گا۔ اب اُسے موقع مل گیا تھا لیکن وہ اس ڈر سے کھڈ میں ہی بیٹھا رہا کہ باہر نکلا تو گولہ باری میں مارا جائے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دور سے کوئی گوریلا اُسے دیکھ لے اور گولی مار دے۔ یہ سوچ کر وہ وہیں دبکا رہا۔ گولے زناٹوں سے اس کے اوپر سے گزرتے جا رہے اور اب وہ دھماکوں کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔

عاشق علی کے کھڈ کے بالکل قریب ایک ایسا زبردست دھماکہ ہُوا جیسے زمین پھٹ گئی ہو۔ اس کے ساتھ ہی عاشق علی کو ایک کربناک آواز سنائی دی جو چیخ نما تھی۔ اس کے فوراً بعد ایک انڈونیشی گوریلا کھڈ میں آ پڑا۔ دھماکہ اتنا زور دار تھا کہ عاشق علی کے کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں۔ گوریلا کھڈ میں گرا تو عاشق علی کچھ گھبرا سا گیا۔ گوریلا پیٹ کے بل گرا تھا۔ وہ فوراً ہی سیدھا نہ ہُوا بلکہ آہستہ آہستہ اٹھنے اور سیدھا ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ عاشق علی کے پاس سٹین گن تھی جس میں میگزین لگی ہوئی تھی۔ وہ اس گوریلے کو سیدھا ہونے سے پہلے ہی مار سکتا تھا لیکن اس نے ایسا سوچا ہی نہیں۔

گوریلے کے پاؤں عاشق علی کو لگ رہے تھے کیونکہ کھڈ اتنا ہی چوڑا تھا۔ اس میں صرف بیٹھا جا سکتا تھا۔ کوئی دوسرا آدمی لیٹ نہیں سکتا تھا۔ وہ گوریلا جب سیدھا ہُوا تو عاشق علی نے دیکھا کہ وہ بڑا خوبصورت اور نو عمر لڑکا تھا۔ اُس نے سر پر ایک رومال لپیٹ رکھا تھا اور اس رومال کو سر پر ہی رکھنے کے لئے ایک بیلٹ یا پٹی سی باندھ رکھی تھی۔ جونہی گوریلے نے عاشق علی کو دیکھا، اس نے اپنی ٹامی گن جو اس کے قریب گری تھی اٹھا لی اور اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ یہ غصے اور دشمنی کا رنگ تھا۔ اُس نے بڑی تیزی سے ٹامی گن عاشق علی کی طرف سیدھی کی لیکن عاشق علی نے اپنی سٹین گن اس کی طرف نہ کی بلکہ دونوں ہاتھ اُس کی طرف کر دیئے۔

"مسلم..... مسلم!" —— عاشق علی نے اپنا ایک ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر کہا —— "مردیکا —— مسلم سمہ سمہ!"

یہ تو اس انڈونیشی نو عمر گوریلے نے دیکھ ہی لیا ہو گا کہ وہ پیٹ کے بل گرا تھا اور اگر یہ ہندوستانی فوجی مسلمان نہ ہوتا تو اسے سیدھا ہونے سے پہلے ہی سٹین گن کے ایک برسٹ سے ختم کر دیتا۔ اُس نے بھی کہا —— "مسلم..... ہاہا..... مسلم" —— اُس وقت

...شق علی نے دیکھا کہ اس گوریلے کی پتلون گھٹنے سے پھٹ گئی تھی اور وہاں سے خون ...ل اُبل کر نکل رہا تھا۔ عاشق علی نے پریشان سا ہو کر سٹین گن الگ پھینکی اور اُس کے ...خم کو دیکھنے لگا۔

...گوریلے نے پتلون اوپر کی تو زخم صاف نظر آنے لگا۔ جو گولہ قریب پھٹا تھا اس کا ...ب بڑا ٹکڑا اس گوریلے کی ٹانگ میں لگا اور خاصا بڑا زخم کر گیا تھا۔ یہ زخم گھٹنے سے ذرا ...اوپر تھا۔ خون بہت ہی زیادہ نکل رہا تھا۔ عاشق علی نے اپنے جھولے سے فیلڈ پٹی نکالی ...بڑی تیزی سے اسے کھولا۔ فوجیوں کے پاس جو فیلڈ پٹی ہوتی ہے وہ خاصی زیادہ چوڑی ...لمبی ہوتی ہے اور اس میں روئی کا ایک پیڈ بھی بنا ہُوا ہوتا ہے۔ عاشق علی نے وہ پیڈ ...ڈونیشی لڑکے کے زخم پر رکھا۔ اس پیڈ پر دوائی بھی لگی ہوئی ہوتی ہے جس کا رنگ پیلا ...تا ہے۔

عاشق علی نے پیڈ زخم پر رکھا اور پٹی کس کر لپیٹ دی اور پھر اسے گانٹھ دے دی۔ ...ی کو ضرب ضرور پہنچی ہو گی کیونکہ ٹانگ کے اس مقام پر گوشت کم ہوتا ہے اور ہڈی ...ب ہوتی ہے۔ زخم بہت ہی بڑا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی درندے نے منہ ڈال کر وہاں ...ے بوٹی ہی نکال لی ہو۔ گوریلے کا رنگ زرد ہو گیا تھا اور وہ بہت ہی درد محسوس کر رہا ...۔ گولے کے ٹکڑے بہت ہی گرم ہوتے ہیں۔ ان ٹکڑوں کے ساتھ جلے ہوئے بارود ...دھواں یا اثر بھی ہوتا ہے جو زخم کو خراب بھی کرتا ہے اور درد میں اضافہ بھی کرتا ...ے۔

انڈونیشی گوریلے نے دیکھا پٹی تو بندھ گئی ہے لیکن خون شاید بند نہ ہو اور یہ پٹی ...ل ہو گی۔ اُس نے اپنے سر پر باندھا ہُوا وہ بڑا رومال اتارا اور اُسے تہہ کر کے پٹی کے ...پلیٹ کر اچھی طرح باندھ دیا..... پہلے تو عاشق علی دیکھتا رہا کہ یہ نوجوان گوریلا کیسی ...شمندی سے زخم اور پٹی پر رومال باندھ رہا تھا لیکن جب رومال بندھ چکا تو اس نے دیکھا ...اس گوریلے کے سر کے بال خاصے لمبے تھے جو اُس نے لپیٹ کر اوپر کر رکھے تھے اور ...پر رومال باندھ کر ڈھک دیا تھا۔ اب یہ بال آزاد ہو کر نیچے کو گرے تو اُس کے شانوں ...بھی نیچے چلے گئے۔ یہ بال کسی مرد کے نہیں بلکہ عورت کے تھے۔ عاشق نے بے ...تہ اس کے سر کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اُس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ گوریلا ابھی اپنے ...کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا سر اوپر اٹھا تو عاشق علی کو یقین آیا کہ یہ لڑکا نہیں لڑکی ہے۔

اس لڑکی کی عمر سترہ یا زیادہ سے زیادہ اٹھارہ سال تھی۔ عاشق علی کو خیال آیا کہ یہ لڑکی اس غلط فہمی میں نہ آجائے کہ میں اس کے ساتھ کوئی بدسلوکی کروں گا۔

"بہن!" —— عاشق علی نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر دوسرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر کہا —— "بھائی.... سسٹر.... مائی سسٹر!"

عاشق علی کو معلوم نہیں تھا کہ اُس کی زبان میں بہن بھائی کو کیا کہتے ہیں۔ لڑکی مسکرائی اور اُس نے اوپر نیچے سر ہلایا جیسے وہ سمجھ گئی ہو کہ عاشق علی کی نیت خراب نہیں اور وہ اسے اپنی بہن سمجھتا ہے۔ عاشق علی نے مجھے سنایا کہ اُس پر کوئی ایسا پاکیزہ تاثر طاری ہو گیا تھا کہ اسے شک ہُوا کہ لڑکی ابھی تک اس کی نیت کو نہیں سمجھی۔ اس نے انگلی آسمان کی طرف کر کے کہا —— "اللہ" —— پھر اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور پھر کہا —— "اللہ.... عاشق علی.... علی.... علی.... علی۔"

"آمنہ!" —— لڑکی نے اپنے سینے پر آہستہ آہستہ ہاتھ مار کر کہا پھر وہی ہاتھ عاشق علی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا —— "علی.... علی!" —— لڑکی نے ایک بار پھر مسکرا کر اپنا سر اوپر نیچے ہلایا لیکن فوراً ہی اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور چہرے پر شدید درد کا تاثر آ گیا۔ اُس نے اپنے زخم پر ہاتھ رکھ لیا۔ لڑکی نے ہاتھوں کے اشارے سے بتایا کہ وہ جا رہی ہے۔" وہ اپنی ٹامی گن لے کر اٹھنے لگی تو عاشق علی نے اُس کا بازو پکڑ کر بٹھا دیا اور ہاتھ اوپر کر کے ہلایا جس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی گولہ باری ہو رہی ہے اور وہ باہر نہ نکلے۔ لڑکی بیٹھ گئی اور اس نے اپنے بائیں پاؤں پر ہاتھ پھیرا اور عاشق کی طرف دیکھا۔ اُس نے کچھ اشارہ بھی کیا جس کا مطلب عاشق علی نہ سمجھ سکا۔ لڑکی نے فلیٹ شوز پہن رکھے تھے۔

عاشق علی نے اپنے تاثرات سناتے ہوئے کہا کہ وہ کچھ دیر تو اس لڑکی کی طرف ہی دیکھتا اور حیران ہوتا رہا کہ ایسی نو عمر اور خوبصورت لڑکی کس طرح مردوں کے دوش بدوش انگریزوں اور امریکیوں جیسی جنگی طاقت کے خلاف لڑ رہی ہے۔ لڑکی کا رنگ سفیدی مائل پیلا تھا اور اس میں ہلکی ہلکی سرخی تھی جو اس جنگل اور جنگ میں بھاگنے دوڑنے سے چہرے پر آ گئی تھی۔ عاشق علی نے کہا کہ فوجی کسی برائے نام عورت کو بھی دیکھ لیں تو احمقوں کی طرح اسے دیکھتے ہی رہتے ہیں اور ان کے چہروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں اور ان کی نیت کیا ہے لیکن عاشق علی جوں جوں اس لڑکی کو دیکھتا تھا

اُس کے دل میں پاکیزگی اور تقدّس کا تاثر بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

○

گولہ باری یکلخت بند ہو گئی اور جنگل پر گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ جنگل نہ جانے کب سے ایسے ہی خاموش چلا آ رہا ہے اور یہاں کبھی کوئی ہنگامہ نہیں ہُوا لیکن آمنہ اور عاشق علی کے لئے بہت کچھ ہو گیا تھا۔ وہ اس طرح کہ آمنہ گولہ باری بند ہوتے ہی اٹھی اور کھڈ سے نکلنے لگی تو اس کے منہ سے کربناک "سی" نکل گئی۔ اُس نے وہیں رک کر اور ذرا جھک کر اپنے بائیں پاؤں کی طرف دیکھا اور پھر عاشق علی کی طرف دیکھا۔ عاشق علی تو یہی سمجھتا تھا کہ اُس کے زخم سے درد کی ٹیس اٹھی ہے لیکن آمنہ نے اپنا بایاں پاؤں ذرا ٹیڑھا کر کے اور کچھ ہاتھوں کے اشارے کئے تو عاشق علی سمجھ گیا کہ اس کے پاؤں کو موچ آ گئی ہے۔ آمنہ نے مزید اشارے کئے اور کچھ جسم سے ایسی حرکات کیں جن سے پتہ چلا کہ جب اس کے قریب گولہ پھٹا تھا تو وہ گری تھی تو اُس وقت اُس کا بایاں پاؤں مُڑ گیا تھا۔ گرتے وقت جسم کا بوجھ بھی اس پاؤں پر پڑا۔ اب آمنہ کی معذوری یہ تھی کہ دائیں ٹانگ میں اتنا بڑا زخم تھا اور بائیں ٹانگ پاؤں کی موچ کی وجہ سے معذور ہو گئی اس کا وہاں سے نکل جانا بھی بہت ہی ضروری تھا۔ عاشق جانتا تھا کہ اب اُس کی اپنی کمپنی یا دو تین کمپنیاں آگے آئیں گی اور اپنی لاشوں اور زخمیوں کو اٹھا کر پیچھے لے جائیں گی۔ آمنہ کو اس سے پہلے وہاں سے غائب ہو جانا چاہئے تھا لیکن اُس کا بایاں پاؤں جسم کا وزن اٹھا ہی نہ رہا تھا۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ عاشق علی نے مجھے کئی بار کہا تھا کہ وہ انڈونیشی مجاہدین کے پاس چلا جائے گا۔ اب اُسے بڑا اچھا موقع مل گیا تھا لیکن اس میں کچھ جھجک سی تھی جو ڈر کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ عاشق کوئی شہری نوجوان نہیں بلکہ ایک گاؤں کا رہنے والا تھا اس لئے اُس میں اتنی زیادہ خود اعتمادی اور عقلمندی نہیں تھی لیکن اب اُس نے دیکھا کہ ایک انڈونیشی لڑکی جو مردوں کے دوش بدوش لڑ رہی ہے' وہاں سے نکل جانے سے معذور ہے اور اگر وہ نہ نکلی تو پکڑی جائے گی تو یہ بہت ہی بُری بات ہو گی۔ وہ جانتا تھا کہ ایسی نو عمر اور خوبصورت لڑکی کو انگریز افسر اپنے پاس رکھ لیں گے اور پھر اس کے ساتھ جو سلوک ہو گا وہ عاشق علی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ یہ سوچ کر عاشق علی کے خون میں جوش آ گیا اور وہ اپنی سٹین گن اور آمنہ کی ٹامی گن اٹھا کر کھڈ

سے نکلا اور دونوں گنیں الگ رکھ کر کھڈ کے کنارے دو زانوں ہو کر آمنہ کی بغلوں میں ہاتھ رکھے اور اسے اوپر کھینچ لیا۔ سٹین گن کے ساتھ سلنگ لگا ہوا تھا۔ عاشق نے سلنگ کندھے میں ڈال لیا اور ٹامی گن جو بغیر سلنگ کے تھی' ہاتھ میں لے لی۔

آمنہ چلنے لگی تو ایک ٹانگ کا زخم اور دوسرے پاؤں کی موچ اُسے چلنے نہیں دے رہی تھی۔ اُس نے بے بسی کے عالم میں عاشق کی طرف دیکھا۔ عاشق نے اُس کا ایک بازو اپنے کندھوں پر رکھا اور اپنا دایاں بازو اس کی پیٹھ پر رکھ کر اس کا وزن سہار لیا اور دونوں چل پڑے۔ وہ کوئی ہموار زمین نہیں تھی۔ اونچی نیچی جگہیں زیادہ تھیں اور ٹیکریاں سیدھا رستہ نہیں دیتی تھیں۔ ان کی رفتار بہت ہی سست تھی۔ یہ ایک خطرہ تھا۔

وہ تھوڑی ہی دور گئے تو عاشق علی رک گیا۔ وہ آمنہ سے کہنا چاہتا تھا کہ رفتار پر چلے تو تھوڑی دیر بعد پکڑے جائیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ عاشق اسے اٹھالے۔ اتنی بات وہ آمنہ کو اشاروں میں سمجھا نہیں سکتا تھا' اس نے اشاروں کی بجائے عمل زیادہ بہتر سمجھا جو یہ تھا کہ وہ آمنہ کے سامنے جھکا اور آمنہ کے پیٹ کے ساتھ اپنا دائیں کندھا لگایا اور اُسے اٹھالیا۔ آمنہ کا پیٹ اس کے کندھے پر تھا' اُس کا سر عاشق کی پیٹھ کی طرف اور ٹانگیں آگے کو تھیں۔ اب عاشق علی تیز چل سکتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ آمنہ نازک اندام سی لڑکی تھی جس کا وزن کوئی ایسا زیادہ نہیں تھا لیکن اس دشوار گزار جگہ سے نکلنا خاصا تھکا دینے والا کام تھا۔ ایک جذبہ تھا جس نے عاشق علی کو کوئی اور ہی طاقت دے دی تھی۔

عاشق علی کو خیال آیا کہ وہ جا کہاں رہا ہے؟ نہ آمنہ نے اُسے بتایا تھا کہ کہاں تک اور کس طرف جانا ہے نہ اس نے خود سوچا تھا۔ وہ کچھ دور تک چلے گئے تھے۔ آمنہ نے اپنا ایک ہاتھ اس کی پیٹھ پر مارا اور کچھ کہا جس کا مطلب غالباً" یہ تھا کہ وہ رک جائے۔ عاشق رک گیا اور آمنہ اس کے کندھے سے اتری۔ اس نے زور زور سے دو تین سانس لئے جس کا مطلب یہ تھا کہ عاشق ذرا ستا لے۔ عاشق بیٹھ گیا اور آمنہ بھی اس کے پاس بیٹھ گئی۔ عاشق کی اس وقت ضرورت یہی تھی کہ ذرا دم لے لے۔ اس نے آمنہ سے اشاروں میں پوچھا کہ جانا کہاں ہے۔ آمنہ نے ایسے اشارے کئے جن سے یہ ظاہر ہُوا کہ وہ ٹھیک سمت کو جا رہے ہیں لیکن وہ عاشق علی کا یہ سوال اشاروں میں نہ سمجھ سکی کہ وہ جگہ کتنی دُور ہے جہاں تک جانا ہے۔

عاشق علی نے اپنی پانی والی بوتل نکالی۔ پہلے آمنہ کو پانی پلایا پھر خود پیا اور ایک بار پھر اُسے کندھے پر ڈال کر چل پڑا۔ اب وہ جس علاقے میں جا رہے تھے وہاں ٹیکریاں کچھ کم ہو گئی تھیں لیکن زمین کھڈوں والی تھی۔ بعض جگہ تو پانی رُکا کھڑا تھا اور کیچڑ بھی تھا۔ ایسی جگہ سے بچنے کے لئے راستہ لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ وہاں کہیں کہیں سیاہ رنگ کی چٹانیں بھی نظر آنے لگی تھیں۔ وہاں تک پہنچے تو ایک بار پھر فائرنگ شروع ہو گئی۔ یہ فائرنگ ان سے کچھ دُور تھی لیکن تھی بہت ہی زیادہ۔ وہ شاید کسی اور بٹالین کا ایریا تھا اور انڈونیشی گوریلوں نے شاید کسی اور کمپنی یا پلاٹون کو گھات میں لے لیا تھا اور دونوں طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ گولے ان کے قریب آ کر پھٹنے لگے لیکن اتنے قریب بھی نہیں کہ وہ اُن کے اڑتے ٹکڑوں کی زد میں آ جاتے' بہرحال گولہ باری ان کے سر پر بھی آ سکتی تھی۔ عاشق علی نے وہاں سے ایک طرف کو ہٹنا شروع کر دیا۔ سورج غروب ہو چکا ہوتا تو پھر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ رات کو فوج کا کوئی آپریشن نہیں ہُوا کرتا تھا لیکن دن کے ابھی دو یا اڑھائی ہی بجے تھے۔

عاشق علی' چلتا گیا اور اچھی خاصی تھکن محسوس کرنے لگا۔ گولہ باری بند ہو گئی اور اب دُور سے اِکے دُکے فائر کی آواز آتی تھی۔ عاشق علی رُک گیا اور آمنہ کو کندھے سے اتارا۔ عاشق تو پسینے سے نہا گیا تھا۔ دونوں بیٹھ گئے۔ آمنہ نے عاشق علی کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر ایسا تاثر آ گیا جیسے اسے عاشق علی پر رحم آ رہا تھا اور شکریے کا تاثر بھی جھلک رہا تھا۔ اس نے جو اشارے کئے وہ عاشق علی نے سمجھ لئے۔ آمنہ اسے کہہ رہی تھی کہ مجھے یہیں چھوڑ کر تم واپس چلے جاؤ۔ عاشق علی نے سر ہلایا اور کچھ اشارے کئے جن کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ واپس نہیں جائے گا بلکہ وہ اب انڈونیشی مجاہدین میں شامل ہو گا۔ معلوم نہیں آمنہ نے اُس کے باقی اشارے سمجھے تھے یا نہیں' عاشق علی اُسے اشاروں کی زبان میں کہہ رہا تھا کہ وہ اسے اس معذوری کی حالت میں جنگل میں تو کسی قیمت پر چھوڑ کر نہیں جائے گا۔

عاشق علی نے اسے پھر کندھے پر اٹھایا اور چل پڑا۔ انہوں نے دیکھا کہ خُون پوری طرح بند نہیں ہُوا۔ پٹیوں پر ذرا ذرا سا خون آ گیا تھا۔ یہ دیکھ کر عاشق علی پریشان ہو گیا اور وہ اور تیز چلنے لگا کہ آمنہ کو اس کے ٹھکانے پر جلدی پہنچا دے تاکہ اس کا خون روکنے کا بندوبست کیا جا سکے.... اب پھر گھنا جنگل آ گیا اور پھر پہلے جیسی ٹیکریاں شروع ہو

گئیں۔ وہ گولہ باری اور فائرنگ کی دنیا سے دور نکل گئے تھے۔ آمنہ نے یقیناً محسوس کر لیا تھا کہ عاشق علی بہت تھک گیا ہے۔ اس نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر روکا اور اُس کے کندھے سے اُتر آئی۔ عاشق علی نے اُسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو آمنہ نے اپنا ایک بازو عاشق علی کے گلے میں ڈال دیا اور اشارہ کیا کہ وہ اُس کے سہارے چلنا چاہتی ہے۔ عاشق نے اپنا ایک بازو اس کی کمر میں ڈال دیا اور دونوں چلنے لگے۔ چند قدم ہی گئے ہوں گے کہ عاشق رُک گیا۔ ایک تو اُس نے یہ محسوس کیا کہ اس رفتار بہت کم ہے اور دوسرا خطرہ یہ کہ آمنہ چلی تو اس کے زخم سے خون زیادہ نکلنے لگے گا۔ اس نے آمنہ کو اٹھانا چاہا تو آمنہ نے کچھ مزاحمت کی اور اشاروں میں بتایا کہ تمہاری ٹانگیں رہ جائیں گی لیکن عاشق نے اسے کندھے پر اٹھالیا اور چل پڑا۔

یہ روئیداد سناتے ہوئے عاشق علی نے مجھ سے تین بار پوچھا کہ آمنہ جیسی خوبصورت لڑکی کے معاملے میں اُس کے وہ جذبات کہاں چلے گئے تھے جن کے لئے فوجی بدنام ہیں۔ جذبات سے اُس کا مطلب حیوانی جذبات تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ہم لوگ دیہات سے آئے ہیں اور فوج میں آکر ہمارے دماغ کسی اور طرف پھر جاتے ہیں لیکن آمنہ کو اپنے رحم و کرم پر پاکر وہ اتنا سرد کیوں ہو گیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ آمنہ کے بال بڑے ہی ملائم تھے اور وہ بال کئی بار اس کے منہ کے ساتھ لگے بلکہ دو تین بار جب اُس نے آمنہ کو اٹھایا تو آمنہ کا منہ عاشق کے منہ کے ساتھ لگا اور پھر اس کا جسم عاشق کے جسم پر سوار بھی رہا لیکن وہ یوں محسوس کرتا رہا جیسے یہ کوئی لڑکی نہیں بلکہ لڑکا ہے اور اس کا چھوٹا بھائی ہے اور زخمی ہے اور اسے منزل پر پہنچانا ہے۔

میں اُس وقت عاشق کو کوئی ٹھیک سا جواب نہیں دے سکا تھا سوائے اس کے کہ یہ اسلامی برادری کا مسئلہ ہے اور یہ جہاد کا معاملہ ہے.... اُس وقت علم تو تھا ہی نہیں اور جو ذرا سا تجربہ تھا وہ خام تھا۔ میں آج عاشق علی کے سوال کا جواب ذرا بہتر طریقے سے دے سکتا ہوں۔ جواب یہ ہے کہ جس قوم کے نوجوانوں کے سامنے کوئی نصب العین نہ ہو اور اس قوم کے حکمران لوٹ مار میں لگے ہوئے ہوں اور وہ اپنا ایمان بیچ کر غیر ملکی کلچر اپنے ہاں در آمد کر کے نوجوانوں میں پھیلا رہے ہوں، اُس قوم میں قومی جذبہ مر جاتا ہے اور حیوانی جذبات ابھر آتے ہیں۔ ہم جب انگریز کے غلام فوجی تھے تو یہی سمجھتے تھے کہ عیش موج کرو اور عورت کو تفریح طبع کا ذریعہ بنائے رکھو۔ یہ تو ایک عام فہم بات ہے کہ

عاشق علی نے اپنا ایمان بیدار کر لیا تھا اور اسے یہ نصب العین نظر آرہا تھا کہ انڈونیشی مسلمان ہیں اور کفار کے خلاف لڑ رہے ہیں کہ وہ انہیں غلام نہ بنا سکیں۔ جب یہ جذبہ بیدار ہوتا ہے تو حیوانی جذبات دم توڑ جاتے ہیں۔

○

عاشق علی آمنہ کو کندھے پر ڈالے چلا جا رہا تھا کہ اسے فضا میں گھن گرج سی سنائی دینے لگی۔ اس آواز کو عاشق علی بھی پہچانتا تھا اور آمنہ بھی۔ وہ لڑاکا بمبار ہوائی جہاز تھے۔ ان کی گھن گرج بلند سے بلند تر ہوتی گئی اور جب وہ بالکل قریب آگئی تو فضا سے مشین گنیں چلنے کے مسلسل دھماکے سنائی دیئے۔ ہوائی جہاز جنگل میں مشین گنیں فائر کر رہے تھے۔

یہ تو بہت بڑا آپریشن یا ملٹری ایکشن تھا جس میں ہوائی جہاز بھی استعمال کئے جا رہے تھے۔ یہ سب جانتے تھے کہ ہوائی جہازوں کو اتنے گھنے جنگل میں کوئی گوریلا یا ان کا ڈھکا چھپا ٹھکانہ نظر نہیں آتا لیکن وہ جنگل پر غوطے میں آکر بے طرح مشین گنیں فائر کرتے تھے۔

ایک ایک ہوائی جہاز میں چار چار مشین گنیں ہوتی تھیں۔ ان کی گولیاں خاصی بڑی ہوا کرتی تھیں اور ان گولیوں میں کچھ ایسی بھی تھیں جو زمین پر لگ کر گرینیڈ کی طرح پھٹتی تھیں۔ ہوائی جہاز جب اس طرح جنگل پر گولیاں برساتے تھے تو جنگل میں کچھ لوگ تو ان کی زد میں آہی جایا کرتے تھے.... میں یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کیسا آپریشن تھا لیکن یہ بتا سکتا ہوں کہ اس آپریشن کا طریقہ اور مقصد یہ تھا کہ اس جنگل کو اس طرح صاف کر دیا جائے جس طرح جھاڑو پھیرا جاتا ہے۔

عاشق علی اور آمنہ کے لئے یہ ایک اور آفت آسمان سے نازل ہو گئی۔ عاشق علی نے برما فرنٹ پر جاپانی ہوائی جہازوں کی اس طرح کی فائرنگ اور بمباری دیکھی تھی اور آمنہ نے جنگِ آزادی میں ہوائی جہازوں کی یہ تباہ کاری کئی مرتبہ دیکھی تھی۔ اب دونوں کو پناہ کی تلاش تھی۔ ان کے سامنے کم و بیش بیس قدم دور دو بڑے اور پرانے درخت تھے جن کا درمیانی فاصلہ چھ سات قدم ہو گا۔ ان دونوں درختوں کے تنے خاصے موٹے اور چوڑے تھے اور اوپر سے درخت گھنے بھی تھے۔ وہ ہوائی حملے سے بچاؤ کے لئے بہت اچھی پناہ تھی لیکن یہ بیس قدم بڑے ہی خطرناک قدم تھے۔ وہ چلنے ہی لگے تھے

کہ ایک طرف سے ہوائی جہاز گن فائرنگ کرتا ہوا آیا تو اس کی گولیاں ان دونوں سے چارپانچ گز دُور گرتی ہوئی آگے چلی گئیں۔ عاشق نے گولیوں کو پھٹتے ہوئے بھی دیکھا لیکن اللہ نے اس کی مدد کی۔

عاشق علی آمنہ کو اٹھائے دوڑ پڑا اور جس قدر تیز دوڑ سکتا تھا اتنا تیز دوڑا اور اُن دو بڑے درختوں کے درمیان تک پہنچ گیا۔ اُس نے آمنہ کو کندھے سے اتار دیا اور دونوں ایک درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ دونوں کے جسم ایک دوسرے کے ساتھ لگے ہوئے تھے اور پھر انہوں نے اپنے جسم اور زیادہ ایک دوسرے کے ساتھ لگا لئے تاکہ تنا دونوں کو بچائے رکھے۔

عاشق کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ہوائی جہاز کتنے ہیں۔ وہ ہوائی جہازوں کو غوطوں میں آتے دیکھتا تھا لیکن ان کی گنتی نہیں ہو سکتی تھی۔ سر کے اوپر گھنے درخت تھے۔ وہ اور آمنہ اتنا ہی جانتے تھے کہ فضا میں ہوائی جہازوں نے قیامت کا ہنگامہ بپا کر رکھا ہے اور وہ گونجتے گرجتے آتے ہیں اور آگ برساتے ہوئے پھر اوپر چلے جاتے ہیں۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ یہ دونوں درخت بالکل قریب قریب تھے اور خاصے پرانے بھی تھے۔ اُن کے تنے دور اوپر نہیں بلکہ زمین سے کچھ ہی اوپر سے شروع ہو جاتے تھے۔ عاشق علی بائیں طرف جھکا ہوا ہوائی جہازوں کو فضا میں چکر لگاتا اور غوطوں میں آتا دیکھ رہا تھا۔ آمنہ نے اُسے زور سے ہلایا تو اُس نے آمنہ کی طرف دیکھا۔ آمنہ نے اپنے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ عاشق علی نے اُدھر دیکھا تو اس نے یوں محسوس کیا جیسے اس کی رگوں میں خون یکلخت جم گیا ہو۔ ایک بہت بڑا اژدہا درخت سے اُتر آیا تھا لیکن ابھی اس کا منہ اور تھوڑا سا حصہ زمین پر آیا تھا اور باقی سب کا سب ابھی تنے کے ساتھ لپٹا ہوا تھا۔ اُس کے منہ اور عاشق اور آمنہ کے درمیان بمشکل ایک گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

دونوں جہاں تھے وہیں سن ہو کے رہ گئے جیسے ان میں اتنی طاقت رہی ہی نہ ہو کہ اُٹھ کر بھاگ جائیں۔ عاشق علی نے ایسے اژدہاؤں کے متعلق ایک بڑی غلط بات سنی تھی جسے وہ سچ مانتا تھا۔ وہ یہ کہ اژدہا منہ کھول کر اتنی زور سے سانس اندر کو کھینچتا ہے کہ اس کا شکار دس بارہ قدم دُور ہو تو بھی کھنچا ہوا اس کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ چند سیکنڈ کے لئے عاشق علی نے تو یہ یقین کر لیا کہ ابھی اژدہا منہ کھولے گا' سانس اندر کو کھینچے گا اور وہ یا آمنہ اس کے منہ میں چلے جائیں گے۔

آمنہ تیزی سے اُٹھی اور ایک طرف چلنے لگی تو پاؤں کی موچ اور دوسری ٹانگ کے زخم کی وجہ سے گر پڑی۔ تب عاشق علی خوفزدگی کی حالت سے بیدار ہو گیا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور آمنہ پر جُھکا۔ آمنہ اٹھ رہی تھی اور عاشق نے اُسے اپنے بازوؤں میں لے کر تیزی سے اٹھایا اور اسی طرح اٹھا کر چند قدم دُور ہو گیا۔ اس نے ایک اور درخت کے نیچے جا آمنہ کو کھڑا کیا۔ اس کی حالت یہ تھی جیسے سانس لینے میں بھی دشواری محسوس کر رہا تھا۔ ابھی تک وہ اس خوف میں تھا کہ اژدہا جو آدھے سے زیادہ زمین پر آگیا تھا بڑی تیزی سے دوڑے گا اور دونوں کو پکڑ لے گا۔ اژدہا کا منہ دوسرے درخت تک پہنچ گیا تھا۔ میں نے پچھلے باب میں ایک اژدہا کا ذکر کیا ہے۔ یہ ہرے رنگ کا تھا اور اژدہاؤں کی یہ قسم انڈونیشیا کے جنگل میں پائی جاتی تھی۔

شاید ایک منٹ نہیں گزرا ہو گا کہ دونوں درختوں کے درمیان ہوائی جہاز کی گولیوں کی بوچھاڑ پڑی اور گولیاں پھٹیں بھی اور یہ بوچھاڑ خاصی آگے جا کر رکی۔ جس جہاز نے یہ مشین گنیں فائر کی تھیں وہ غوطے سے اُٹھ کر اوپر چلا گیا تھا۔ عاشق نے دونوں درختوں کے درمیان دیکھا تو کوئی اور ہی منظر آیا۔ ہوائی جہاز کی گولیوں نے اژدہا کو چھلنی کر دیا تھا اور اس کا باقی جسم درخت سے نیچے آپڑا تھا۔ وہاں سے خون بہنا شروع ہو گیا تھا۔

گولیوں کی یہ بوچھاڑ بالکل وہیں پڑی تھی جہاں ایک آدھ منٹ پہلے عاشق اور آمنہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اگر اژدہا درخت سے نہ اترتا تو وہ وہیں بیٹھے رہتے اور اُن کے جسم وہیں چھلنی ہو کر مُردہ ہو جاتے۔ تب عاشق علی نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف کر کے اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکریہ ادا کیا۔ یہ معجزہ نہیں تو اور کیا تھا۔ اللہ نے ان دونوں کو وہاں سے اٹھانے کے لئے اژدہا کو درخت سے اُتارا تھا۔

ایک ایسا ہی اژدہا مجھے بھی ملا تھا: جس پر میں نے اسے دیکھے بغیر ہاتھ رکھ دیا تھا اور ایک اژدہا عاشق علی کو ملا۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ انڈونیشیا کے جنگل ایسے ہی اژدہاؤں سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ کہیں کہیں گھنے جنگل میں نظر آتا تھا۔

عاشق علی کا حوصلہ بحال اور دل مضبوط ہو گیا۔ اللہ مردانِ مومن کی اسی طرح مدد کیا کرتا ہے.... یہ آخری گن فائرنگ تھی۔ اس کے بعد ہوائی جہازوں کی گھن گرج دُور دور ہٹتی گئی اور بالکل خاموش ہو گئی۔ عاشق اور آمنہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی اور عاشق نے آمنہ کو پھر کندھے پر پہلے کی طرح اٹھا

لیا اور چل پڑا۔

وہ زیادہ دُور نہیں گیا ہو گا کہ اُسے کسی کی ایسی آواز سنائی دی جیسے کسی آدمی نے اسے پکارا ہو۔ وہ رُک گیا اور ادھر دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ دو انڈونیشی گوریلے بڑی تیز تیز چلے آرہے تھے۔ عاشق علی آگے کو جھکا اور آمنہ کو زمین پر کھڑا کر دیا۔ آمنہ نے بھی ان دو آدمیوں کی طرف دیکھا اور بازو اوپر کر کے لہرایا۔ وہ ہنستے ہوئے دوڑ پڑے اور ان دونوں تک پہنچے۔ آمنہ نے بولنا شروع کر دیا۔ ظاہر ہے وہ انہیں بتا رہی تھی کہ اُس پر کیا بیتی ہے اور وہ کس طرح یہاں تک پہنچی ہے۔ وہ دونوں انڈونیشی اسی کی تلاش میں آئے تھے۔ انہیں ابھی آگے اُس جگہ تک جانا تھا جہاں انہوں نے ہماری پلاٹون کو گھات میں لیا تھا۔ آمنہ کو دیکھ کر وہ بہت ہی خوش ہوئے کہ وہ زندہ ہے اور قریب سے ہی مل گئی ہے۔

اب میں آپ کو ایک ایک قدم کی یہ کہانی نہیں سناؤں گا کہ عاشق علی اور آمنہ کس طرح آگے گئے' میں کچھ اہم اور موٹی موٹی باتیں سناؤں گا.... آمنہ کو اب دو انڈونیشیوں نے باری باری کندھے پر اٹھایا اور وہاں سے کم و بیش تین میل دور ایک گاؤں میں جا پہنچے۔ وہ سب ایک گھر میں داخل ہوئے۔ وہ آمنہ کا گھر تھا۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ گھر میں آمنہ کی ماں تھی' باپ تھا اور اس کا ایک بڑا بھائی تھا جو گھر میں اس لئے موجود تھا کہ وہ ایک گوریلا ایکشن میں زخمی ہو گیا تھا ورنہ کوئی جواں سال انڈونیشی گھر میں نہیں ملتا تھا۔ سب کسی نہ کسی رنگ میں جنگِ آزادی میں سرگرم رہتے تھے۔

انہوں نے جب دیکھا کہ آمنہ کو اٹھا کر لا رہے ہیں تو وہ یہ سمجھ کر آمنہ کی طرف لپکے کہ شہید ہو گئی ہے لیکن اسے زندہ دیکھا تو ماں اور باپ نے انڈونیشی کندھے سے اُتار کر چارپائی پر ڈالا اور بے پناہ پیار کیا۔ انہیں جب بتایا گیا کہ آمنہ کو یہ ہندوستانی اٹھا کر لا رہا تھا تو انہوں نے جو پیار عاشق علی سے کیا' وہ عاشق علی ساری عمر نہیں بھول سکے گا۔ اتفاق سے آمنہ کا باپ اُردو بول لیتا تھا۔ اس سے عاشق علی کو سہولت میسرّ آگئی کہ وہ اشاروں میں بات کرنے سے بچ گیا تھا اور اپنے دل کی اور مطلب کی ہر بات کر سکتا تھا۔

آمنہ کے باپ نے عاشق کو خراجِ تحسین پیش کیا کہ اُس نے انڈونیشیا کی آزادی کے لئے اتنی بڑی قربانی دی ہے۔

"نہیں محترم!" ـــــ عاشق نے کہا ـــــ "قربانی تو آپ لوگ دے رہے ہیں کہ اپنی اولاد تک آپ نے قربان کر دی ہے"۔

"تم نے بہت بڑی قربانی دی ہے" ـــــ باپ نے کہا ـــــ "میں ایسے چار پانچ فوجیوں سے مل چکا ہوں جو انگریزوں کی فوج سے بھاگ کر ہمارے ساتھ آن ملے ہیں۔ ہم لوگ تو اپنے وطن میں ہی ہیں' تم لوگوں نے اپنا وطن چھوڑا' فوج کی نوکری چھوڑی اور اپنے عزیز رشتہ دار چھوڑے اور اِدھر آگئے۔ تم لوگ جانتے ہو کہ اب واپس وطن اور اپنے گھر نہیں جا سکو گے۔ جاؤ گے تو انگریز تمہیں گرفتار کر کے قید خانے میں بند کر دے گا"۔

"میں تو اللہ کے نام پر آیا ہوں" ـــــ عاشق نے کہا ـــــ "میں آپ لوگوں کو اتنا ہی جانتا ہوں کہ آپ مسلمان ہیں اور آپ کا مقابلہ کفار کے ساتھ ہے۔ میں اپنی جان قربان کرنے آیا ہوں"۔

عاشق علی کی اس شخص کے ساتھ بہت باتیں ہوئی تھیں۔ میں نے ان کے جو ایک دو مکالمے سنائے ہیں' یہ لبِّ لباب تھا ان کی گفتگو کا اور آخر میں آمنہ کا باپ عاشق علی سے اس قدر متاثر ہُوا کہ اس نے عاشق سے کہا کہ تمہیں اصل صلہ اور اجر تو اللہ کی طرف سے ملے گا لیکن میں ایک صلہ یہ دیتا ہوں کہ ہماری جنگِ آزادی کامیاب ہو گئی تو میں اپنی بیٹی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دوں گا۔

عاشق علی نے جب مجھے سنایا کہ اس بزرگ اور دانشمند آدمی نے اسے اپنی بیٹی پیش کر دی تو عاشق کو ذرا سی بھی خوشی نہ ہوئی کہ اتنی خوبصورت اور نوجوان لڑکی اسے مل رہی ہے۔ عاشق علی نے یہ بھی محسوس کیا جیسے اس شخص نے کوئی اچھی بات نہیں کی کہ اس کے جذبۂ جہاد کو ٹھیس پہنچائی ہے جیسے وہ اس لڑکی کی خاطر انڈونیشیا کے مجاہدین کے پاس آیا تھا۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ عاشق علی انسانی فطرت کے یہ مدوجزر سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ اُس کے اندر جو انقلاب آگیا تھا' اس کا وہ تجزیہ نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ حیران تھا کہ اتنی خوبصورت لڑکی اُس کے حیوانی جذبات کو بیدار نہ کر سکی بلکہ اس میں جو جذبہ پیدا ہو گیا تھا اس جذبے کو مزید تقویت ملی۔ یہاں میں پھر کہوں گا کہ انسان اپنے ذہن میں کوئی بلند و بالا اور مقدس نصب العین رکھ لے تو وہ اللہ کے بہت ہی قریب پہنچ جاتا ہے۔ ہماری مجبوری ہے کہ ہم لوگ بہت جلد اپنی نفسانی خواہش کے جال میں آجاتے ہیں اور

جب طبیعت اس لذّت سے خوش ہو جاتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ بس جی ہم نے تو دُنیا کے خزانے پا لئے ہیں اور پھر ہوتا یہ ہے کہ اللہ کی ذات کو ہم ایک طرف رکھ دیتے ہیں

انڈونیشیا کی جنگِ آزادی میں شامل ہونے والے ہم جیسے ہندوستانی فوجی اللہ کو دل میں رکھ کر گئے تھے۔ بس یہ تھی اس انقلاب کی وجہ۔ جو حقیقت ہے کہ اُس وقت میں بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔ میں نے اس داستان کے آغاز میں کہا ہے کہ میں کوئی شریف آدمی نہ تھا لیکن وہاں جا کر ایسے لمحے بھی آئے کہ میں اپنے آپ کے لئے بھی اجنبی ہو گیا۔

میں اپنی روئیداد پڑھنے والوں سے استدعا کروں گا کہ صرف کہانی کے چسکے میں نہ پڑے رہیں بلکہ اس میں سے کام کی کچھ باتیں نکال لیں اور انہیں اپنی روز مرّہ کی زندگی میں شامل کر لیں۔

○

اگر میں روایتی قسم کا تاریخی ناول لکھ رہا ہوتا تو عاشق اور آمنہ کے عشق و محبت کے کچھ مناظر تخلیق کر کے قلم بند کرتا اور بڑے رومانی مکالمے بھی لکھتا اور دو تین باب اس پر صرف کر دیتا لیکن وہاں ایسا منظر کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ آمنہ جیسی بے شمار لڑکیاں اپنے جیسے نوجوان اور خوبرو لڑکوں کے ساتھ گوریلا ایکشن یا شب خون مارنے کے لئے جایا کرتی تھیں۔ لڑکے زخمی لڑکیوں کو اور لڑکیاں زخمی لڑکوں کو اٹھا کر پیچھے لاتی تھیں جس طرح عاشق علی آمنہ کو اٹھا لایا تھا۔ وہاں محبت ضرور ہوتی تھی۔ بعض انڈونیشی لڑکیاں انڈین آرمی کے فوجیوں پر مر مٹی تھیں۔ بڑے جذباتی اور درد ناک واقعات ہوئے تھے۔ آمنہ تو عاشق علی کے لئے پاگل ہوئی جاتی تھی لیکن ان کا جو اصل مقصد اور نصب العین تھا' اس میں انہوں نے کوتاہی نہیں کی۔ میں آگے چل کر مناسب موقع پر آمنہ اور عاشق کی محبت کی کچھ باتیں سناؤں گا لیکن میں یہیں بتا دیتا ہوں کہ اس منظر کشی میں فلمی مکالمے نہیں ہوں گے۔

آیئے اب یہاں سے آگے بڑھتے ہیں.... آمنہ کا گاؤں اُس دریا کے پار تھا جس دریا کی سیلابی موجوں نے مجھے یہاں عثمان کے گھر تک پہنچایا تھا۔ عثمان اپنے علاقے کے گوریلوں کو کنٹرول کرتا تھا۔ اُسے ہیڈ کوارٹر سے باقاعدہ آپریشن آرڈر ملتے تھے جن میں اُسے بتایا جاتا تھا کہ اُس نے اتنے آدمیوں کی ایک پارٹی فلاں فلاں جگہ فلاں مقصد کے لئے بھیجنی ہے۔ میں نے آپ کو پہلے تفصیلاً بتایا ہے کہ انڈونیشیا کی جنگِ آزادی باقاعدہ پلان

ی نت لڑی جا رہی تھی اور ایسا نہیں ہوتا تھا کہ کسی پارٹی کے دماغ میں کوئی سکیم یا کوئی ن آیا تو وہ پارٹی اپنے آپ ہی اس طرف اُٹھ دوڑتی۔

آپ کی یاد دہانی کے لئے ایک بار پھر بتا دیتا ہوں کہ احمد سوئیکارنو کی صدارت میں باقاعدہ حکومت قائم ہو چکی تھی اور جی ایچ کیو جیسا فوجی ہیڈ کوارٹر الگ تھا جو احکام ڈسپلن کا پابند تھا اور تمام انڈونیشیا میں سرگرم عمل گوریلا فورس کو احکام کا پابند رکھنے ذمہ دار تھا۔ ایسے واقعات بھی ہوئے کہ کسی کمانڈر نے احکام کی خلاف ورزی کی یا پلن کے خلاف کوئی کام کیا تو اُسے باقاعدہ سزا دی گئی۔

عثمان ایریا کمانڈر تھا اور اس کی ذمہ داری میں خاصا وسیع ایریا تھا۔ عاشق علی کو اس ایریئے میں شامل کیا گیا تھا اور عاشق علی ایک ہی روز پہلے یہاں پہنچا تھا۔ عثمان نے اسے کسی ایکشن میں بھیجنا تھا۔ وہ عاشق کو اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ چکا تھا۔ اُسے ن نے اپنے ہاں ہی رکھ لیا تھا۔ ابھی عاشق کسی ایکشن میں شامل نہیں ہوا تھا۔ اس ح یہ اتفاق ہُوا کہ عاشق علی یہیں تھا اور میں پہنچ گیا۔

ان لوگوں کو تنظیم ملاحظہ ہو۔ عاشق علی آمنہ کے گاؤں پہنچا تو وہاں سے عثمان کو ع دی گئی کہ ہندوستانی فوج کا ایک مسلمان اُدھر سے بھاگ کر یہاں آ گیا ہے۔ عثمان پیغام بھیجا کہ اُسے فوراً اُس کے پاس بھیج دیا جائے .... عاشق نے مجھے سنایا کہ وہ آمنہ کے گھر سے رخصت ہونے لگا تو اُس کمرے میں گیا جس میں آمنہ لیٹی ہوئی ۔ آمنہ کو پتہ چل چکا تھا کہ عاشق جا رہا ہے۔ عاشق جس وقت آمنہ کے کمرے میں گیا ل وقت وہاں سے سب لوگ باہر آ گئے تھے۔

آمنہ اٹھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے بازو پھیلا دیئے اور رے لمحے وہ دونوں ایک دوسرے کے بازوؤں میں جکڑے ہوئے تھے۔ یہ محبت کا نہ اظہار تھا۔ وہ ایک دوسرے کی زبان تو بول ہی نہیں سکتے تھے اس لئے انہوں نے لی باتیں اشاروں میں کہی اور سنیں۔

○

گزشتہ رات جب میں یہاں پہنچا تھا تو عثمان کے ساتھ رسمی تعارف اور دیگر باتیں ی تھیں۔ صبح اُس نے مجھے بلایا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ اب اُس کا انداز گزشتہ رات سے مختلف تھا۔ گزشتہ رات وہ میزبان تھا لیکن اب وہ ایریا کمانڈر تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ

میرا انٹرویو لے کر دیکھنا چاہتا ہے کہ میں کتنے پانی میں ہوں اور میں کس نیت سے آیا ہوں۔

میں نے اُسے سنایا کہ میں ہندوستان کی آزادی کا خیال دل میں لے کر انڈین آرمی سے بھگوڑا ہُوا اور انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہونے کے لئے چل پڑا تھا۔ میں نے اُسے مختصراً بتایا کہ میں برما کے جنگلات میں کس طرح بھٹک گیا تھا اور بعد میں مجھے کس طرح پتہ چلا کہ یہ انڈین نیشنل آرمی ایک فریب ہے جو وہ ہندوستان کی تمام قوموں خصوصاً مسلمانوں کو دے رہے ہیں اور وہ جاپانیوں کی مدد سے پورے ہندوستان پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔

عثمان کے ساتھ مجھے یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ اردو ذرا رُک رُک کر بول لیتا لیکن اپنی بات پوری طرح واضح کر سکتا تھا۔ کوئی کوئی لفظ انگریزی کا بھی بول جاتا تھا۔

"میرے پردیسی دوست!" —— اُس نے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ لا کر کہا —— "تم نے صرف سنا ہے کہ آئی این اے ہندوؤں کا ایک فراڈ تھا لیکن میں نے اس فراڈ کو اپنے سامنے عملی میدان میں دیکھا ہے۔ تم شاید یہ سن کر حیران ہو جاؤ کہ انڈین آرمی سے مسلمان ہمارے پاس آئے ہیں، ان میں کچھ انڈین نیشنل آرمی کے آدمی ہیں۔ ان میں سے کچھ تو قابلِ اعتماد ہیں اور وہ صحیح اسلامی جذبے سے آئے ہیں لیکن کچھ ایسے جو ہماری جنگِ آزادی کو ناکام کرنے کے لئے تخریبی کارروائیاں کر رہے ہیں۔ ایسے تین آدمی پکڑے گئے ہیں اور ان تین میں ایک مسلمان تھا اور دو ہندو جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے رہے۔ وہ ایک گوریلا ایکشن میں شامل ہو گئے اور ہمارے دشمن کو بھی یہ اطلاع دے دی کہ فلاں جگہ اتنی نفری کی انڈونیشی پارٹی گوریلا ایکشن کے لئے آ رہی ہے۔ اس غداری کے نتیجے میں ہماری آدھی پارٹی ماری گئی۔ ایسے جس غدار کو ہم پکڑتے ہیں اُسے فوراً گولی مار دیتے ہیں"۔

"اللہ کا شکر ہے"۔ —— میں نے کہا —— "کہ میں اس آرمی میں شامل ہی نہ ہوا اور میں اور میرے کچھ اور ساتھی بھی اس آرمی کی اصلیت کو جانتے تھے.... میری مجبوری یہ ہے کہ میں آپ کو اپنی وفاداری اور اپنی نیت کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتا"۔

"مجھے ثبوت کی ضرورت بھی نہیں"۔ —— عثمان نے کہا —— "ہمیں دھوکہ دے

تو صرف ایک بار دے سکو گے۔ تمہیں دوسرا موقع ملے گا ہی نہیں اور اگر مل گیا تو وہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہو گا.... میں دراصل تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس قسم کے ہندوستانی فوجیوں سے ہوشیار رہنا بلکہ تمہاری عقل کام کرے تو ہر ہندوستانی فوجی کو شک کی نگاہ سے دیکھنا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ یہ شخص کہاں تک دیانتدار ہے۔ بس اتنی سی بات تمہیں سمجھانی تھی"۔

اُس نے تفصیل سے بتایا کہ امریکہ اور برطانیہ اپنی بے پناہ جنگی طاقت لے آئے ہیں اور اس میں انہوں نے اور زیادہ اضافہ کر لیا ہے اور امریکہ کے لڑاکا بمبار ہوائی جہاز تمام انڈونیشیا کے جنگلوں میں بارش کی طرح گولیاں اور بم برساتے رہتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ انڈونیشی اتنی بڑی طاقت سے ڈر جائیں اور ہتھیار ڈال دیں۔ عثمان نے کہا کہ ہم اپنی لاشیں ڈال دیں گے ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔

یہ بات مجھے عثمان سے معلوم ہوئی کہ ہندوستان میں مسلمان اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور وہ اپنے الگ ملک کا مطالبہ کر رہے ہیں جسے وہ پاکستان کہتے ہیں اور ان کا لیڈر احمد سیکارنو کی طرح محمد علی جناح ہے جسے تمام ہندوستان کے مسلمان قائدِ اعظمؒ کہتے ہیں۔ عثمان نے قائدِ اعظمؒ کا نام لیا تو مسکرا کر مجھ سے پوچھا کہ محمد علی جناح تو نام ہے لیکن قائدِ اعظمؒ کے معنی کیا ہیں۔ وہ معنی میں نے اسے بتائے۔ میں حیران تھا کہ عثمان دنیا بھر کی سیاسی اور دیگر خبروں سے آگاہ تھا۔ اس کے پاس انگریزی اخبار بھی رکھے ہوئے تھے اور اپنے ملک اور اپنی زبان کا اخبار بھی اس کے پاس تھا اور پھر اس کے پاس ریڈیو سیٹ بھی تھا۔

"ہندوستان کے مسلمان سیاسی قسم کی جنگ لڑ رہے ہیں" —— عثمان نے کہا —— "میرا خیال ہے کہ جنگِ آزادی ہماری طرح مسلح ہی ہونی چاہئے۔ بات یہ ہے میرے دوست! کوئی حکمران تمہیں آزادی پلیٹ میں رکھ کر پیش نہیں کرے گا۔ آزادی لی جاتی ہے.... زبردستی.... ایمان اور جذبے کی طاقت سے.... پھر بھی تمہارے ملک کے حالات جو پلٹا کھا رہے ہیں کہ مجھے امید ہے کہ تم لوگوں کو ہندوستان میں آزادی مل جائے گی انشاء اللہ تمہارا الگ وطن بھی بن جائے گا"۔

اُس سے میں نے یہ بات سنی تو میرے تاثرات میں کچھ اور تبدیلی آ گئی اور یہ خیال آیا کہ میں واپس چلا جاؤں اور اپنے ملک کے مسلمانوں کی جنگ آزادی میں شامل ہو

جاؤں لیکن اس خطرے کے پیش نظر میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا کہ ابھی تو وہاں انگریزوں کی بادشاہی ہے اور وہ مجھے پکڑ کر عمر قید دے دیں گے۔

"اب ایک اور ضروری بات سن لو" —— عثمان نے کہا —— "میں نے ہندوستانی مسلمانوں میں ایک خامی دیکھی ہے۔ ہمارے پاس ایسے مسلمان آئے ہیں اسلام کے نام پر مرمٹنے کے لئے تیار رہتے ہیں اور جوش و خروش سے پھٹے جاتے ہیں لیکن انہیں میدانِ عمل میں اُتارتے ہیں تو وہ ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں اور کوئی نہ کوئی مذہبی مسئلہ کھڑا کر کے پیچھے ہٹ آتے ہیں۔ عام طور پر سبھی ایسے نہیں ہوتے۔ ہمارے پاس جو مسلمان آئے ہیں ان کی اکثریت صحیح جذبہ لے کر آئی ہے اور انہیں میں نے ٹھیک ٹھاک لڑتے دیکھا ہے لیکن کچھ تعداد اُن کی بھی ہے جو جذبہ تو رکھتے ہیں لیکن ان کے اندر بے عملی بھی موجود ہے....

"ایسا ایک ہندوستانی مسلمان میرے پاس بھی آیا تھا۔ اُس نے تمہاری طرح چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے میرے ساتھ ایسی باتیں کیں جیسے وہ مجھے اناڑی اور اَن پڑھ سمجھتا تھا۔ وہ مجھے دینِ اسلام کے سبق دینے لگا اور اُس نے ہمارے مجاہدین پر پہلا اعتراض یہ کیا کہ یہ لوگ داڑھی نہیں رکھتے۔ ان پر پابندی عائد کی جائے کہ داڑھیاں رکھیں۔ پھر اُس نے کہا کہ مردوں اور عورتوں کا شانہ بشانہ لڑنا جائز نہیں۔ عورت کو پیچھے رہنا چاہئے۔ عورت کے ذمے صرف یہ کام ہو کہ زخمیوں کو پانی پلائے اور انہیں پیچھے لے آئے .... ایسے ہی اس نے اور بھی اعتراض کئے اور سب سے بڑا اعتراض یہ کیا کہ لڑائی کے دوران نماز کا وقت ہو جائے تو باقاعدہ اذان دی جائے اور باجماعت نماز پڑھی جائے اور اسلام کے احکام کے مطابق دو آدمی سنتری کھڑے رہیں جو بعد میں نماز پڑھ لیں.... میں اس شخص کو سمجھ گیا اور اس کی کسی بھی بات کا جواب نہ دیا۔ اُسے چھوٹے سے ایکشن میں بھیج دیا اور وہ مجھے پھر کبھی نظر نظر آیا۔ میں نے یہ یقین کر لیا تھا کہ وہ زخمی بھی نہیں ہُوا اور پکڑا بھی نہیں گیا' معلوم نہیں کہاں لاپتہ ہو گیا تھا"۔

"میں اس قسم کے لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں" —— میں نے کہا —— "میں اپنے بارے میں قسم تو نہیں کھاؤں گا' کسی ایکشن میں بھیج کر دیکھ لیں پھر آپ کو پتہ چلے گا کہ میں کس قِسم کا آدمی ہوں اور میں مجاہد کہلوانے کے قابل بھی ہوں یا نہیں۔

ہندوستان میں ایسے بے شمار مسلمان پائے جاتے ہیں جن میں سے ایک کا آپ نے ذکر کیا ہے"۔

میں اس موضوع پر اور اس قسم کے "مجاہدین" کے متعلق بڑا لمبا چوڑا اظہارِ خیال اور اپنے مشاہدات پیش کر سکتا ہوں لیکن میں صرف اپنی داستان تک محدود رہوں گا۔

○

اب یہ واقعہ سنئے اور اس پر غور کریں.... مجھے اور عاشق کو چار پانچ دن وہیں رہنا پڑا۔ میں عثمان سے کہتا تھا کہ ہم دونوں کو کسی چھوٹے سے ایکشن میں نہ بھیجے بلکہ پہلے ہی ہمیں ایسے ایکشن میں بھیجے جو بہت ہی بڑا ہو اور زیادہ سے زیادہ فوج کے مقابلے میں ہو۔ میں نے جب بھی اُس کے ساتھ یہ بات کی تو وہ جواب میں صرف مسکرا دیا۔ وہ عقل اور ہوش والا آدمی تھا۔ بات مختصر اور دو ٹوک کیا کرتا تھا۔ ایک روز پتہ چلا کہ اُس نے ایک کمرے میں وائرلیس سیٹ بھی رکھا ہُوا ہے۔ جس پر اسے پیغام ملتے ہیں اور پیغام بھیجتا بھی ہے۔ ظاہر ہے یہ وائرلیس سیٹ انہوں نے فوجیوں سے چھینا ہو گا۔

ایک روز عثمان کے ہاں دو عورتیں آئیں۔ دونوں کی عمریں تیس سال سے کچھ کم ہی لگتی تھیں اور وہ ذرا خوبصورت عورتیں تھیں۔ ایک تو انڈونیشی تھی لیکن دوسری ہندوستانی تھی۔ دونوں نے انڈونیشی لباس پہن رکھا تھا۔ مجھے انڈونیشی عورت کا نام یاد نہیں رہا۔ یہی یاد ہے کہ وہ مسلمان تھی اور دوسری نے اپنا نام رقیہ بتایا۔ انڈونیشی عورت سے کچھ پوچھنا تو ضروری نہیں تھا لیکن قدرتی طور پر ہندوستانی عورت سے یہ پوچھنا ضروری سمجھا گیا کہ وہ یہاں کس طرح آئی ہے۔

اس ہندوستانی عورت رقیہ نے بتایا کہ اُس کا خاوند انڈونیشیا کے مرکزی شہر جکارتہ میں کپڑے کا کاروبار کرتا تھا۔ جنگِ آزادی شروع ہوئی تو وہ بھی اس میں شامل ہو گیا اور ابتداء میں ہی پکڑا گیا۔ اسے جیل میں بند کر دیا گیا اور اس کے بعد اُس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ اُس کے بھائیوں نے کاروبار پر قبضہ کر لیا اور رقیہ کو بے دخل کر دیا۔

رقیہ جوان لڑکی تھی اور خوبصورت بھی تھی۔ ایک انڈونیشی نے اس کے ساتھ شادی کر لی لیکن ڈیڑھ سال بعد وہ مر گیا۔ اس کے بعد رقیہ نے شادی نہ کی اور دو مسلمان گھرانوں نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا۔ اُسے جب پتہ چلا کہ انڈونیشیا کے لوگ مسلح جنگِ آزادی لڑ رہے ہیں اور اس میں لڑکیاں بھی شامل ہوتی ہیں تو وہ بھی اس جہاد میں

شریک ہو گئی۔

اس نے تین چار گوریلا ایکشن سنائے اور بتایا کہ وہ ان میں شامل تھی اور باقاعدہ لڑی تھی۔ پھر اس نے خاصی لمبی کہانی سنا کر کہا کہ آخر وہ یہاں سے پندرہ میل دُور ایک گاؤں میں آ کر آباد ہو گئی اور اس کے بعد کسی ایکشن میں شریک نہ ہوئی۔

اُس کے ساتھ جو انڈونیشی عورت تھی' اُس نے رقیہ کے بیان کی تصدیق کی اور یہ بھی بتایا کہ وہ بھی دو گوریلا کارروائیوں میں شامل ہوئی تھی۔ اس عورت نے رقیہ کو اپنے گھر میں رکھ لیا تھا۔ اس گاؤں میں ان کی بڑی ٹھیک ٹھاک گزر بسر ہو رہی تھی لیکن فوجیوں نے اب وہاں جینا حرام کر دیا ہے۔

میں ان دونوں کا پورا پورا بیان نہیں سنا رہا۔ صرف یہ بتا رہا ہوں کہ دونوں کے بولنے کا انداز ایسا تھا کہ سننے والے کو متاثر کرتا تھا۔ وہ مسئلہ یہ لے کر آئی تھیں کہ پندرہ میل دُور ان کا چھوٹا سا گاؤں ہے جس میں جوان لڑکیاں کچھ زیادہ ہی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہاں سے تین چار میل دور ایک فوجی کیمپ ہے اور اس کیمپ میں سے ہر رات چھ سات فوجی آ جاتے ہیں اور دھمکیاں دے کر تلاشی کے بہانے گھروں میں گھُس جاتے ہیں اور لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ جس عورت یا لڑکی کو پکڑتے ہیں اُسے اس طرح ڈراتے ہیں کہ ریوالور یا رائفل کی نالی اس کے سر کے ساتھ لگا کر کہتے ہیں کہ سارے کپڑے اتار دو۔

ان دونوں عورتوں نے یہ بھی بتایا کہ گاؤں میں دو گھر ولندیزیوں کے ہیں۔ دونوں گھروں میں شراب بڑی افراط سے مل جاتی ہے اور انہوں نے باقاعدہ شراب خانے کھول رکھے ہیں۔ فوجی وہاں آ کر شراب پیتے اور گاؤں میں من مانی کرتے ہیں۔ لوگ وہاں سے بھاگ جانے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے لیکن کوئی بھی وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے تو گاؤں سے دور یا نزدیک فوجی اسے پکڑ لیتے ہیں اور واپس گاؤں لے آتے ہیں۔ زیادہ تر تو لڑکیوں کے والدین وہاں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن انہیں نکلنے نہیں دیا جاتا۔

"آپ صرف یہ بتائیں کہ آپ چاہتی کیا ہیں؟" —— عثمان نے اُن سے پوچھا۔

"اپنی حفاظت کے سوا ہم اور کچھ نہیں چاہتیں" —— انڈونیشی عورت نے جواب دیا" —— اگر آپ کو ہماری اور گاؤں کی لڑکیوں کی عزت کا کچھ خیال ہے تو ایک ایک

رات اپنے آدمی وہاں بھیجیں جو گاؤں میں آئے ہوئے فوجیوں کے خلاف کوئی شدید کارروائی کریں۔ ہم دونوں بھی دو دو تین تین مرتبہ ان فوجیوں کے ہاتھوں بے آبرو ہو چکی ہیں"۔

یہ بات کہتے ہوئے اس عورت کے آنسو نکل آئے۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ یہ شکایت وہاں عام تھی۔ جس گاؤں کے قریب فوجی آ کر ڈیرے ڈالتے تھے اس گاؤں میں وہ ایسی ہی بدتمیزیاں کرتے تھے۔ انڈونیشی مجاہدین کو اطلاع ملتی تو وہ کوئی نہ کوئی کارروائی کر کے اس گاؤں کو محفوظ کرتے یا وہاں کی ساری آبادی کو کسی اور گاؤں میں منتقل کر کے اس گاؤں کو جو خالی ہو چکا ہوتا تھا آگ لگا دیتے تھے۔ یہ دو عورتیں ویسی ہی شکایت لے کر آئی تھیں جس پر عثمان کو ذرا سا بھی شک نہ ہُوا۔ نہ اس نے کچھ زیادہ سوچنے کی ضرورت محسوس کی۔

ان عورتوں نے تین دنوں بعد کی رات بتائی اور کہا کہ اس رات فوج کے تمام افسر جن میں انگریز افسر بھی شامل ہیں اور ہندوستانی افسر بھی' کوئی جشن منائیں گے۔ انہیں یہ بات ان ولندیزی گھرانوں میں سے ایک گھرانے کی ایک لڑکی نے بتائی تھی جنہوں نے شراب خانے کھول رکھے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام افسر شراب پی کر گاؤں کی لڑکیوں کو اپنے ساتھ رکھ لیں گے اور انہیں خراب کریں گے۔

عثمان نے ان کی یہ ساری بات سن کر ان سے کچھ اور پوچھا اور کچھ ہدایات دیں اور انہیں رخصت کر دیا۔ انہیں اطمینان دلایا کہ اُس رات کچھ آدمی گاؤں میں موجود ہوں گے لیکن کسی کو پتہ نہ چلے کہ کچھ آدمی آ رہے ہیں یا آ چکے ہیں۔ عثمان نے اُن دونوں کے ساتھ اپنے دو آدمی بھیجے کہ ان عورتوں کا اکیلے جانا ٹھیک نہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ دونوں آدمی گاؤں کا جائزہ لے آئیں کہ وہاں کا ماحول وغیرہ کیسا ہے اور کتنے آدمیوں کی پارٹی کافی ہو گی اور کیا اس پارٹی کو گاؤں میں چھپانا ہے یا گاؤں کے باہر جنگل میں چھپا کر رکھنا ہے۔

دونوں عورتیں فضول سی گھوڑا گاڑی پر آئی تھیں۔ عثمان کے آدمی سائیکلوں پر اُن کے ساتھ چلے گئے۔

○

دونوں آدمی شام کے وقت واپس آئے۔ میں اتنا ہی دیکھ سکا کہ وہ واپس آ گئے ہیں

لیکن مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انہوں نے عثمان کو کیا رپورٹ دی ہے۔ عثمان معروف آدمی تھا اور اُس کی حیثیت ایک کمانڈر کی تھی اس لئے میں اُس کے پاس زیادہ نہیں بیٹھتا تھا۔ میں وہی بات سنا سکتا ہوں جو اپنے کانوں سنی تھی یا اپنی آنکھوں دیکھی تھی۔ ہُوا یہ کہ اگلے ہی روز عثمان نے معلوم نہیں کہاں سے بیس انڈونیشی گوریلے اکٹھے کر لئے۔ مجھے اور عاشق کو بھی عثمان نے بلا کر کہا کہ ہم دونوں اس پارٹی کے ساتھ جائیں گے۔ ہم دونوں بہت خوش ہوئے کہ جہاد میں شریک ہونے کا پہلا موقع مل گیا ہے۔

میں آپ کو خاص بات یہ بتاتا ہوں کہ عثمان خود بھی پارٹی کے ساتھ جا رہا تھا۔ مجھے بعد میں یہ پتا چلا تھا کہ ان دونوں عورتوں نے عثمان پر بہت زور دیا تھا کہ وہ اس پارٹی کے ساتھ ضرور آئے۔ معلوم نہیں انہوں نے کیوں یہ ضرورت سمجھی تھی اور عثمان کیوں ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ وہ غالباً" اس کیمپ کو اپنی نظروں سے دیکھنا چاہتا تھا جس کے فوجی گاؤں میں آ کر بے ہُودہ حرکتیں کرتے تھے۔ وہ کیمپ کی نفری وغیرہ دیکھنا چاہتا ہو گا۔

وجہ خواہ کچھ بھی تھی ہُوا یہ کہ عثمان بھی ساتھ چل پڑا۔ ہم دوپہر کا کھانا کھا کر چلے تھے۔ ہمیں پیدل اُس گاؤں تک پہنچنا تھا۔

اس پارٹی کے گوریلوں نے میرے ساتھ اور عاشق کے ساتھ نہایت ہی پیار اسلوک روا رکھا۔ سب باری باری ہمارے ساتھ چلتے اور اشاروں میں کچھ کہتے اور خوشی کا اور محبت کا اظہار کرتے تھے۔ ان میں سے ایک بھی اردو نہیں بولتا یا سمجھتا تھا۔ ان کی ہنسی اور مسکراہٹوں میں پیار اور اخوت موج زن تھی۔

اگر علاقہ میدانی ہوتا تو پندرہ میل پیدل کوئی فاصلہ نہیں تھا لیکن زمین کھڈ نالوں سے بھرپور تھی اور ٹیلے ٹیکریوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ پھر یہ گھنا جنگل تھا۔ چند قدم چلنے کے بعد راستہ مُڑتا تھا اور اس طرح فاصلہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ہم وہاں پہنچے تو سورج اُفق کے قریب پہنچ چکا تھا۔

عثمان نے پوری پارٹی کو ایک ٹیکری کے پیچھے بٹھا دیا اور وہ خود آگے گاؤں کو دیکھنے کے لئے چلا گیا۔ یہ دیکھ بھال (رِیکی) بڑی احتیاط سے کرنی تھی۔ احتیاط یہ کہ گاؤں میں ولندیزی بھی آباد تھے' انہیں پتہ نہ چلے کہ گوریلے آ گئے ہیں یا آ رہے ہیں۔

عثمان اُس وقت واپس آیا جب سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ پارٹی کو ٹیکری کی اوٹ

اوٹ میں ایک طرف لے گیا۔ وہاں بھی ایسی ٹیکریاں تھیں اور جنگل تو اور زیادہ گھنا تھا۔ وہاں سے گاؤں نظر آتا تھا اور گاؤں چند قدم ہی دور تھا۔ پتہ چلا کہ ولندیزیوں کے مکان گاؤں کے دوسری طرف ہیں اور جس طرف ہم چھپے ہوئے تھے' یہ مکان مسلمانوں کے تھے۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اِدھر سے ہم گاؤں میں داخل ہوتے تو دوسری طرف کسی کو پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ یہ کوئی بڑا گاؤں نہیں تھا۔ پچاس یا زیادہ سے زیادہ ساٹھ مکان ہوں گے۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ یہ ہمارے مکانوں جیسے مکان نہیں تھے بلکہ جھونپڑے سے تھے جو بڑے سلیقے سے تعمیر کئے گئے تھے۔

عثمان نے انڈونیشیوں کو اپنی زبان میں کچھ ہدایات دیں اور مجھے اور عاشق کو اردو میں بتایا کہ ایک ایک آدمی اس طرف سے چھُپ کر فلاں مکان کے قریب جائے گا اور وہاں اسے ایک آدمی ملے گا اور وہ اسے کسی نہ کسی مکان میں لے جائے گا۔ پھر اُس نے یہ بتایا کہ رات اشارہ ملنے پر حملہ کیا جائے گا اور گاؤں کے مسلمان اتنی آگ باہر جلا دیں گے کہ پوری روشنی ہو جائے گی اور کسی فوجی کو زندہ نہیں نکلنے دینا۔

یہ میں بڑی مختصر بات سنا رہا ہوں۔ عثمان کی ہدایات جنگی نقطۂ نگاہ سے بڑی ہی دانشمندانہ ہدایات تھیں اور وہ ایک ایک بات کو نہایت اچھی طرح واضح کر رہا تھا تاکہ یہ کارروائی ناکام نہ ہو جائے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ آخر میں اشارہ ملے گا تو ہر آدمی اپنے اپنے طور پر واپس جائے گا اور اپنے ساتھیوں کا انتظار نہیں کرے گا۔



سورج غروب ہو گیا اور شام بڑی جلدی گہری ہو گئی۔ جنگل کی شام ایسی ہی گہری ہو جایا کرتی ہے۔ عثمان ہمارے ساتھ تھا۔ اُس نے ایک ایک آدمی کو گاؤں میں بھیجنا شروع کر دیا۔ ایک آدمی گاؤں میں چلا جاتا تھا تو دوسرا آدمی ادھر سے چل پڑتا تھا۔ عثمان نے کہا تھا کہ اپنے ہتھیار تیار رکھنا تاکہ کسی آدمی کو کوئی دشمن یا فوجی دیکھ لے اور اسے پکڑنے کو آئے تو اسے گولی مار دی جائے۔

اس طرح ہم سب گاؤں میں داخل ہو گئے۔ میں اور عاشق ایک مکان میں چلے گئے۔ وہاں ہمیں گاؤں کا ایک آدمی لے گیا تھا۔ اب ہم اشارے کے منتظر تھے۔ مجھ پر ہیجانی سی کیفیت طاری تھی۔ عاشق علی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اُس کے جذبات میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو ہم مسکرائے لیکن

یہ عام قسم کی مسکراہٹیں نہیں تھیں۔ ہم پہلے ایکشن میں آئے تھے اور اس قسم کی ذہنی کیفیت قدرتی بات تھی۔

وقت گزرتا جا رہا تھا اور گاؤں میں بالکل خاموشی تھی۔ رات پوری طرح تاریک ہو چکی تھی۔ اب تک وہ ہنگامہ شروع ہو جانا چاہئے تھا جس کی رپورٹ عثمان کو ملی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا' میری بے تابی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے عاشق سے کہا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گوریلا پارٹی کو گاؤں میں داخل ہوتے ولندیزیوں نے دیکھ لیا ہو گا اور انہوں نے فوجیوں کو اطلاع دے دی ہو گی کہ آج رات گاؤں میں نہ آئیں کیونکہ گوریلے گھات میں بیٹھے ہیں۔ عاشق علی نے کہا کہ پھر تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فوجی چپکے سے آ کر گاؤں کو محاصرے میں لے لیں اور ہم مارے جائیں۔

کچھ دیر اور گزری تو عثمان اس جھونپڑے میں داخل ہوا جس میں عاشق علی اور میں بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ اُس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ دھوکے میں آ گئے ہیں لیکن ابھی کچھ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس شک کی اُس نے وجہ یہ بتائی کہ ہندوستانی عورت تو اس کے ساتھ تھی لیکن دوسری جو انڈونیشی تھی وہ کہیں غائب ہو گئی ہے۔ عثمان نے یہ بھی بتایا کہ یہاں کوئی شراب خانہ نہیں اور چند ایک گھرانے آباد ہیں جن میں تین چار ولندیزیوں کے ہیں۔ اگر یہاں افسروں نے آ کر جشن منانا ہوتا تو وہ اب تک آ چکے ہوتے۔ یہاں جشن کا کوئی نام و نشان نظر نہیں آتا۔

عثمان ابھی یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ باہر سے بلند آواز اٹھی۔ کوئی آدمی انڈونیشی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ عثمان نے کہا کہ اس کا شک ٹھیک نکلا ہے۔ فوجیوں نے گاؤں کو محاصرے میں لے لیا ہے اور انہوں نے انڈونیشی زبان میں اعلان کروایا ہے کہ تمام مسلمان گوریلے باہر آ کر ہتھیار ڈال دیں ورنہ سب مارے جائیں گے اور گاؤں کو تباہ کر دیا جائے گا۔ عثمان نے یہ بھی بتایا کہ وہ اس کا نام لے کر کہہ رہے ہیں کہ عثمان باہر آ جائے۔

اس کے فوراً بعد اردو میں اعلان ہوا کہ انڈین آرمی کے جو دو حوالدار گاؤں میں ہیں وہ باہر آ کر اپنے آپ کو فوج کے حوالے کر دیں تو انہیں معاف کر دیا جائے گا ورنہ گاؤں میں ہی انہیں گولی مار دی جائے گی۔

اب تو کوئی شک نہ رہا کہ عثمان جیسا عقل مند کمانڈر پھندے میں آ گیا تھا۔ میں نے

اُسے کہا کہ اس ہندوستانی عورت کو نہ چھوڑے اور اگر ہم یہاں سے صحیح سلامت نکل گئے تو اس عورت کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔ عثمان نے کہا کہ اسی شک پر اُس نے اس عورت کو اپنے ساتھ پابند کر لیا تھا اور وہ کہیں نہیں جا سکتی۔ پھر عثمان نے مجھے اور عاشق علی کو یہ ہدایت کی کہ ہم باہر آ کر کسی اچھی پوزیشن میں چلے جائیں اور کوئی فوجی نظر آئے تو گولی مار دیں اور پھر یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں اور اگر ہم مناسب سمجھیں اور صورتِ حال اجازت دے تو ہم پیچھے سے فوجیوں پر گولیاں برسائیں۔

میرے پاس سٹین گن تھی اور تین گرینیڈ تھے۔ سٹین گن کی میگزینیں کافی تھیں۔ عاشق علی کے پاس بھی سٹین گن تھی اور تین گرینیڈ تھے۔ عثمان نے کہا کہ وہ اب باقی پارٹی کے ہر آدمی کے پاس جائے گا اور اب ہم اپنے اپنے طور پر لڑیں گے یہاں سے نکلیں گے۔

○

عثمان ہمیں ہدایات دے کر چلا گیا۔ اُس نے محاصرہ توڑنے کے انتظامات کرنے تھے۔ اُس نے جاتے جاتے ہمیں کہا تھا کہ اب تم دونوں انگریزوں کی فوج میں نہیں ہو اس لئے یہ ایمونیشن سوچ سمجھ کر اور کنجوسی سے فائر کرنا۔ وہ ہمارے جھونپڑے سے نکلا ہی تھا کہ تین چار دھماکے سنائی دیئے اور ان کے فوراً بعد باہر کی فضا روشن ہو گئی۔ یہ ان فوجیوں کی حماقت تھی کہ انہوں نے روشنی راؤنڈ فائر کر دیئے تھے اور یہ نہیں سوچا تھا کہ ان کی روشنی میں وہ خود بھی ہمیں نظر آ جائیں گے۔ میں اور عاشق جھونپڑے سے نکلے اور کسی اچھی پوزیشن کی تلاش اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ ایک جھونپڑا نظر آیا جس کے پچھلی طرف دو کھڑکیاں تھیں۔ ہم اس کے اندر چلے گئے۔ یہ خالی تھا۔

پہلے فائر کئے ہوئے روشنی راؤنڈ نیچے آ چکے تھے کہ فوجی بیوقوفوں نے چار پانچ اور روشنی راؤنڈ فائر کر دیئے اور مجھے اس جھونپڑے سے پچیس تیس گز دور چار پانچ ہندوستانی فوجی نظر آئے۔ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کون سی رجمنٹ کے تھے۔ میں نے سٹین گن سیدھی کی اور ٹریگر دبا دیا اور وہ سب ڈھیر ہو گئے۔ اُدھر عاشق نے بھی تین چار کو گرا لیا اور ہم دونوں اس جھونپڑے سے نکل گئے۔ اتنی عقل تو مجھ میں تھی کہ پوزیشن بدل بدل کر فائر کرنا ہے۔

اب تو یہ عالم تھا کہ دونوں طرف کی فائرنگ سے رات لرز رہی تھی اور کوئی آواز

سنائی ہی نہیں دیتی تھی۔ عثمان نے ایک نہایت اچھا انتظام کر لیا۔ اس نے ایک خالی جھونپڑے کو جو لکڑی کا بنا ہُوا تھا آگ لگادی۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور خالی جھونپڑے سے شعلے اٹھنے لگے۔ اب ہمارے لئے روشنی کافی ہو گئی تھی۔ فوجیوں نے گاؤں میں گرینیڈ پھینکے۔ آدھے سے زیادہ گاؤں خالی تھا۔ گرینیڈ وہ نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے جو فوجیوں نے سوچا ہو گا۔ مجھے معلوم نہیں کہ میری پارٹی کے انڈونیشی گوریلے کیا کچھ کر رہے تھے لیکن وہ سب تجربہ کار گوریلے تھے اور عثمان کے چُنے ہوئے۔ وہ اتنی جلدی ہار ماننے والے نہیں تھے۔ تھوڑی دیر بعد گاؤں کے اندر اور باہر بھی گرینیڈ پھٹنے لگے لیکن میں نے اور عاشق نے ابھی ایک بھی گرینیڈ نہیں پھینکا تھا کیونکہ ہم اتنی قیمتی چیز ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہاں میں اپنی اور عاشق کی ایک کمزوری بتا دوں۔ ہم دونوں حوالدار کلرک تھے اور ہمیں لڑنے کا تجربہ نہیں تھا۔ ہمارے پاس لڑنے کا جذبہ تھا اور ہم ہتھیاروں کا استعمال جانتے تھے اور ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ گاؤں سے نکلنا ہے اور پیچھے سے ان فوجیوں پر فائر کرنا ہے۔

میں نے صرف ایک جھلک دیکھی کہ چھ سات فوجی گاؤں میں داخل ہو گئے تھے اور کسی طرف سے گرینیڈ آیا جو ان کے قدموں میں پھٹا۔ تصوّر میں لائیں کہ اُن کے جسموں کا کیا حشر ہُوا ہو گا۔ معلوم نہیں کہ یہ گرینیڈ اُن کے اپنے ہی ساتھی نے پھینکا تھا یا کسی گوریلے نے۔ میں اور عاشق تین یا شاید چار جھونپڑے بدل چکے تھے اور ہم دونوں تین تین چار چار فوجیوں کو نشانہ بنا چکے تھے۔

کچھ دیر بعد پانچ چھ جھونپڑے جل رہے تھے۔ اُن کے شعلے دور اوپر تک جا رہے تھے۔ اور انہوں نے تاریک رات کو چمکتا ہُوا دن بنا دیا تھا۔ میں نے ایک بڑا ہی بھیانک منظر دیکھا۔ اُس وقت میں اور عاشق ایک جھونپڑے سے نکل کر کسی اور پوزیشن کی طرف جانے لگے تھے۔ دو فوجی سٹین گنیں سیدھی کیے، اِدھر اُدھر دیکھتے ایک جلتے ہوئے مکان کے قریب سے گزر رہے تھے کہ پیچھے سے دو انڈونیشی گوریلے آئے اور انہوں نے ایک ایک فوجی کو بازوؤں میں جکڑ کر اٹھا لیا اور جلتے ہوئے جھونپڑے کے شعلوں میں پھینک دیا ان کی چیخیں فضا کو چیر رہی تھیں۔ وہ دوڑتے ہوئے شعلوں سے نکلے تو ان کی پوری کی پوری وردی شعلے بنی ہوئی تھی۔ انڈونیشی تو وہیں کہیں غائب ہو گئے لیکن ان دونوں کو میں نے زندہ جلتے، چیختے اور تڑپتے اور پھر گرتے دیکھا۔

پھر مجھے اور عاشق کو ایک طرف سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ ہم دونوں نے دراصل جان کا خطرہ مول لیا تھا۔ اس طرف فوجی ہو سکتے تھے لیکن ہماری خوش نصیبی کہ نہیں تھے۔ ہم دونوں دبے پاؤں باہر نکل گئے اور قریبی ٹیکری پر جا چڑھے۔ روشنی اتنی زیادہ تھی کہ ہمیں اِکا دُکا فوجی نظر آ جاتا تھا اور دوسرے لمحے ہمارے فائر سے گرتا، تڑپتا اور ٹھنڈا ہو جاتا۔ میں یوں محسوس کرنے لگا جیسے کچھ اور گوریلے بھی باہر آ گئے ہیں اور انہوں نے فوجیوں پر پیچھے سے فائرنگ شروع کر دی ہے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ان فوجیوں کی نفری کوئی زیادہ نہیں پچاس ہو سکتی تھی اور زیادہ سے زیادہ ایک سو یعنی ایک کمپنی۔ میرے اندازے کے مطابق آدھی نفری زخمی یا ہلاک ہو چکی تھی۔ ہم جس ٹیکری پر تھے اُس طرف کا بھی ایک جھونپڑا جلنے لگا۔ جھونپڑے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے، انہیں تو جلنا ہی تھا۔ اس کی روشنی میں مجھے ایک گورا چہرہ نظر آیا۔ وہ انگریز افسر تھا جو یقیناً" کمپنی کمانڈر ہو گا۔ اس کے ساتھ کمپنی صوبیدار ہو گا اور دو اور جوان تھے۔ بڑا خوبصورت ٹارگٹ تھا۔ میں نے اور عاشق نے مل کر ان پر فائر کیا اور سب کو ڈھیر کر دیا۔

یہاں میں آپ کو سٹین گن کے متعلق ایک بات بتاتا ہوں۔ سٹین گن میں یہ خرابی ہے کہ یہ ٹھیک نشانے پر فائر نہیں کر سکتی۔ اگر آپ نشانہ لے کر فائر کریں گے تو گولیاں نشانے سے اوپر جائیں گی۔ سٹین گن دراصل اٹلی کے ڈاکوؤں نے بنائی تھی اور وہاں سے یہ فوج میں آئی۔ اسے ہجوم پر فائر کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ مجھے فوج میں پتہ چلا تھا کہ سٹین گن کا فائر صحیح نشانے پر کرنا ہو تو نشانے سے گن کو ذرا نیچے رکھیں۔ میں نے یہ بات عاشق کو بھی بتا دی تھی۔ اگر ہم یہ بات نہ جانتے تو گولیاں ضائع کرتے رہتے۔

فوجیوں کی طرف سے فائر میں کچھ کمی آنے لگی۔ عاشق نے کہا کہ اب ہمیں پیچھے ہٹ جانا چاہئے۔ اُس کا مشورہ ٹھیک تھا۔ ہم دشمن کو اچھا خاصا نقصان پہنچا چکے تھے اور اُن کو ہم بڑی اچھی کارکردگی کی رپورٹ دینے کے قابل ہو گئے تھے۔ پیچھے نکلنے کے لئے راستہ صاف تھا۔ ہم وہاں سے چل پڑے۔ شک ہوتا تھا کہ ہم راستہ بھول بیٹھے ہیں۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ وہاں ٹیکریاں زیادہ تھیں اس لئے راستے کے موڑ بھی قدم قدم پر تھے۔ اللہ کا نام لیتے ہوئے ہم چلتے گئے، کچھ بھٹکے بھی اور آخر واپس ٹھکانے پر پہنچ

گئے۔ وہاں پہنچے ہی تھے کہ فجر کی اذان کی مقدّس صدا اٹھی۔ عثمان کے گھر والے اور وہ تین ساتھی بے تابی سے منتظر تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی سب نے نے گھیر لیا اور پوچھا کر وہاں کیا ہُوا ہے۔ ہم نے بات یہاں سے شروع کی کہ بہت بڑا دھوکہ ہُوا ہے اور پھر انہیں اس معرکے کا پورا حال سنایا۔

باتیں تو بہت سی سنانے والی ہیں لیکن میں سب سے زیادہ اہم بات ہی سناؤں گا۔ صبح طلوع ہونے تک عثمان بھی خیر خیریت سے آگیا اور اس سے کچھ پہلے اور کچھ بعد گیارہ ساتھی واپس آئے' باقی شہید ہو گئے تھے۔ عثمان کے ساتھ وہ ہندوستانی عورت تھی جس کا نام رقیہ تھا۔ معلوم ہُوا کہ اُس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے تھے اور جب معرکہ ختم ہُوا تو اسے اٹھا کر لے آئے۔

اس میں تو کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ ان دو عورتوں نے ہمیں دھوکہ دیا تھا اور اس پھندے میں لے گئی تھیں لیکن یہ عورت کچھ بتاتی نہیں تھی۔ ابھی تک کہہ رہی تھی کہ اس نے کوئی دھوکہ نہیں دیا لیکن اس سے پوچھتے تھے کہ جو انڈونیشی عورت اس کے ساتھ آئی تھی وہ کہاں ہے تو وہ لاعلمی کا اظہار کرتی تھی۔

اس عورت کے بال اس کی کمر تک لمبے تھے۔ عثمان نے دو رسّیاں منگوائیں۔ اس عورت کے بال دو حصوں میں تقسیم کر کے اوپر کو کئے اور ایک رسّی ایک طرف کے بالوں کے ساتھ اور دوسری رسّی دوسری طرف کے بالوں کے ساتھ باندھ دی اور اُسے باہر لے گئے۔ ایک درخت کے اونچے ٹہن پر ایک لڑکے کو چڑھایا اور دونوں رسیّوں کے سرے اوپر پھینکے۔ وہ سرے لڑکے نے پکڑ لئے۔ عورت کو پکڑ کر اوپر اٹھایا اور لڑکے سے کہا کہ وہ دونوں رسّیاں ٹہن کے ساتھ باندھ دے۔ وہ اس نے باندھ دیں اور عورت کو چھوڑ دیا۔ وہ اب بالوں سے لٹک رہی تھی اور اس کے پاؤں زمین سے ڈیڑھ دو فٹ اوپر تھے۔ اس نے چیخنا چلّانا شروع کر دیا۔ عثمان نے اپنے قریب کھڑے ایک آدمی سے کچھ کہا۔ وہ آدمی اس عورت تک گیا اور اسے کمر سے پکڑ کر ذرا اوپر اٹھایا اور چھوڑ دیا۔ اس جھٹکے سے اور اُس کے جسم کے وزن سے اس کے بال اکھڑتے تھے اور جو اسے تکلیف ہوتی تھی وہ اس کی چیخوں سے ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ آدمی تین چار منٹ بعد اسے اسی طرح ذرا اوپر اٹھا کر چھوڑ دیتا۔ یہ اذیّت کم از کم یہ عورت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

تقریباً" پندرہ منٹ بعد عثمان اُس کے پاس گیا اور کہا کہ یہ ابھی ابتدا ہے۔ اس کے بعد اسے جو اذیّتیں دی جائیں گی وہ اسے زندہ بھی نہیں رہنے دیں گی اور مرنے بھی نہیں دیں گی لیکن وہ عورت مان گئی اور کہنے لگی کہ وہ سب کچھ بتائے گی۔ اسے اتار دیا گیا اور اس کے بالوں سے رسّیاں کھول دی گئیں۔ وہ بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر رہانے لگی۔ عثمان نے اسے بازوؤں سے پکڑا اور جھٹکے سے اٹھا کر کمرے میں لے گیا اور اسے کہا کہ وہ زیادہ انتظار نہیں کرے گا۔

اس کمرے میں اور کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ میں بھی باہر کھڑا رہا اور جو بات بعد میں معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ وہ انڈونیشی عورت جو اس کے ساتھ تھی اور اپنے آپ کو مسلمان کہتی تھی وہ دراصل ولندیزی تھی۔ اس کے نقش انڈونیشیا کے لوگوں جیسے اس لئے تھے کہ اس کی ماں انڈونیشی اور باپ ولندیزی تھا۔

یہ ہندوستانی عورت' اپنے بیان کے مطابق' مسلمان نہیں ہندو تھی۔ اس کا تعلق انڈین نیشنل آرمی کے ساتھ تھا۔ میں نے انڈین نیشنل آرمی کے بانی سبھاش چندر بوس کی جو فوٹو دیکھی تھی' اس میں اس کے ساتھ وردی پہنے ہوئے دو جوان سال لڑکیاں بھی تھیں۔ اس نے عورتوں کی فوج الگ بنانے کی بھی کوشش کی تھی۔ معلوم ہُوا کہ بنگال کی کچھ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو ملایا پہنچایا گیا تھا۔ پھر وہ انڈونیشیا آ گئی تھیں۔ یہ عورت رقیہ نہیں بلکہ نرملا تھی۔

اُس نے اپنے اقبالی بیان میں کہا کہ اسے اور اس کے ساتھ آنے والی ولندیزی عورت کو فوج کے اعلیٰ امریکی اور انگریز افسروں نے اس راستے پر ڈالا تھا اور اس کارروائی میں جو انہوں نے کروائی تھی مقصد یہ سامنے رکھا تھا کہ عثمان کو قتل کروانا ہے کیونکہ وہ اس علاقے کا بڑا مشہور اور دہشت ناک گوریلا کمانڈر تھا۔ ان عورتوں کو فوج کی طرف سے بھیجا گیا تھا کہ اس طرح عثمان کو اس گاؤں میں کھینچ کر لاؤ اور زیادہ سے زیادہ ساتھی عثمان کے ساتھ آئیں۔

اس عورت نے صاف الفاظ میں کہا کہ امریکی اور انگریز تو چاہتے ہی ہیں کہ مسلمان آزاد نہ ہوں لیکن ہندوستان کے ہندو بھی نہیں چاہتے کہ انڈونیشیا کے مسلمانوں کی الگ مملکت بنے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ انڈین نیشنل آرمی کا اصل مقصد ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنا تھا۔ اس طرح اُس نے کوئی پردہ نہ رہنے دیا۔

عثمان نے اس عورت سے یہ بیان لیا اور اسے کمرے سے باہر لے آیا۔ اُس وقت

ہم سب باہر کھڑے تھے۔ عثمان نے اسے کہا کہ وہ یہاں سے چلی جائے۔ مجھے وہ منظر آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ اُس عورت نے حیرت زدہ نظروں سے عثمان کی طرف دیکھا جیسے اُسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو۔ اُسے تو حیران ہونا ہی تھا۔ ہم سب حیران رہ گئے کہ عثمان اس عورت کو آزاد کر رہا ہے۔ عثمان نے دیکھا کہ عورت ابھی وہیں کھڑی ہے تو اُسے ایک بار پھر کہا کہ یہاں سے چلی جاؤ۔ وہ چل پڑی۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلی ہو گی کہ عثمان نے اپنے قریب کھڑے ایک گوریلے سے اُس کی ٹامی گن لی جس پر میگزین چڑھی ہوئی تھی۔ عثمان نے گن اُس عورت کی طرف کی اور ایک برسٹ فائر کیا۔ عورت رُکی، گری اور بغیر تڑپے مر گئی۔

اس ہندو عورت نرملا پر کیجئے۔ انڈونیشی مسلمانوں کی جنگِ آزادی کو نقصان
ر پہنچانے کے لئے وہ کتنی بڑی سازش میں شریک ہوئی تھی۔ یہ سازش
یشی مجاہدین آزادی کے لئے بھی خطرناک اور اس کی اپنی ذات کے لئے بھی
ک تھی۔ اس کے لئے آخر خطرناک اور جان لیوا ہی ثابت ہوئی۔ اُس کے دل میں
نوں کی ایسی نفرت بھر دی گئی تھی کہ اُس نے خطرہ مول لے لیا اور اپنی جان دے

میں جن انڈونیشی مجاہدین کی پارٹی میں شامل ہُوا تھا وہ شہروں سے دُور دُور ہی رہی
اُس پارٹی کا دائرۂ عمل دیہاتی علاقہ تھا۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ وہاں کسی کی
ند اور مرضی نہیں ہوتی تھی کہ وہ کس پارٹی میں رہنا چاہتا ہے۔ ایسے فیصلے گوریلوں
رکزی تنظیم کیا کرتی تھی۔ انڈین آرمی سے جو مسلمان فوجی انڈونیشی مجاہدین
ں سے جا ملے تھے، انہیں باقاعدہ گوریلا تنظیم میں شامل کیا گیا تھا اور کسی کو اجازت
تھی کہ وہ اپنی من مانی کارروائیاں کرتا پھرتا۔ جو حکم ملتا یا جو آپریشن آرڈر آتا، اس
طابق کارروائی کرنی ہوتی تھی۔

میں کہہ رہا تھا کہ میں بڑے شہروں سے دُور ہی رہا اس لئے شہروں کے متعلق مجھے
ں معلوم ہوئی تھیں وہ آزادی مل جانے کے بعد ہوئی تھیں۔ معلوم ہُوا تھا کہ کچھ
ی انڈونیشی گوریلوں میں شامل ہو گئے تھے۔ ان میں سے بعض نے یہ دھوکہ دیا کہ
آپ کو مسلمان ظاہر کیا اور کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنی اصلیت پر پردہ نہ ڈالا۔
مانے اپنے اصل نام بتائے اور کہا کہ وہ ہندو ہیں اور وہ اس لئے انڈونیشیا کی جنگ

آزادی میں شامل ہو رہے ہیں کہ انہیں انگریزوں سے نفرت ہے اور یہ بھی کہ انگ
ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترک دشمن ہے۔

اُن ہندوؤں میں زیادہ تعداد ان ہندوؤں کی تھی جو میری طرح آرمی سے بھاگ کر انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو گئے تھے لیکن اب وہ اس ڈر سے واپس ہندوستان نہ جاتے تھے کہ پکڑے جائیں گے اور سزا پائیں گے۔ یہ تو ایک وجہ تھی کہ وہ انڈونیشیا رک گئے تھے۔ ان میں سے چند ایک انڈونیشیا کی جنگِ آزادی میں شامل ہوئے تھے یہ ایک باقاعدہ پلان کی ہوئی سازش تھی جس کے تحت ان ہندوؤں کو مجاہدینِ آزادی درمیان چھوڑ دیا گیا تھا۔ کچھ ہندو انڈونیشیا کے ہی رہنے والے تھے۔ وہ ہندو تاجروں اور دکانداروں کی اولاد تھے۔ ان کا دائرۂ عمل شہروں میں تھا۔ ان کی کئی باتیں سازشیں مجھے سنائی گئی تھیں جو میں یہاں سنانے بیٹھ گیا تو بات لمبی ہو جائے گی۔ ان یہ تھا کہ ظاہری طور پر وہ انڈونیشی گوریلا مجاہدین کے ساتھ رہتے اور ہر کارروائی سرگرم ہوتے تھے لیکن درپردہ وہ مسلمانوں کو دھوکے دیتے تھے اور ان میں بددل آپس میں نفاق پیدا کرتے تھے۔

میں ذرا یہ بات واضح کرنے کے لئے ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ جکارتہ انڈو مرکزی شہر تھا۔ اس کے مضافات میں گوریلوں کی ایک بڑی پارٹی سرگرم رہتی تھی۔ کمانڈر انڈین آرمی سے بھاگ آنے والا ایک مسلمان حوالدار تھا۔ اس پارٹی میں دو بھی شامل ہو گئے۔ پہلے تو انہوں نے ہر گوریلا ایکشن میں بڑی ہی دلیری اور جانبازی مظاہرے کئے اور پارٹی میں نام پیدا کر لیا۔ پھر پارٹی میں پارٹی کمانڈر یعنی اس حوالدا خلاف ایک لہر چل پڑی جیسے پارٹی اس کمانڈر سے مطمئن نہیں رہی تھی۔

پارٹی میں ایک اور انڈونیشی تھا جس کے حق میں آوازیں اٹھنے لگیں اور مطالبہ سر اٹھانے لگا کہ پارٹی کمانڈر تبدیل ہونا چاہئے اور فلاں کو کمانڈر بننا چاہئے۔

صورتِ حال ایسی پیدا ہو گئی کہ پارٹی کمانڈر اور اس انڈونیشی کے مابین جسے پار کمانڈر بنانا چاہتی تھی، ایسی چپقلش پیدا ہو گئی کہ نوبت ہاتھاپائی تک جا پہنچی اور پارٹی گوریلا کارروائیاں تھیں وہ ناکام رہنے لگیں اور پھر یہ پارٹی دو حصوں میں تقسیم ہو گ دونوں حصے ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے۔ ایسے نظر آنے لگا تھا کہ یہ پارٹی کسی آپس میں ہی لڑ مرے گی۔

انڈین آرمی کے مجھ جیسے جو جوان انڈونیشی مجاہدین آزادی سے جا ملے تھے، وہ دین ایمان کی دولت سے مالا مال تھے اور انہیں کوئی لالچ نہ تھا۔ وہاں کوئی تنخواہ نہیں لیتے نہ انہیں یہ توقع تھی کہ انڈونیشیا آزاد ہو جائے گا تو انہیں فوج میں بڑے بڑے دیئے جائیں گے۔ یہ حوالدار جو اس پارٹی کا کمانڈر تھا کچھ زیادہ ہی مرد مومن ثابت ہوا۔ وہ پنجاب کے علاقہ پوٹھوہار کا رہنے والا تھا۔ ایک روز اس نے ساری پارٹی کو بٹھالیا اور درمیان میں قرآنِ پاک رکھ دیا پھر پوچھا کہ جو کوئی بات کرے وہ اس کلام پر ہاتھ رکھ کر کرے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جس کی بات جھوٹی ثابت ہوئی، اُسے میں گولی مار دوں گا۔

میں جنگِ آزادی سے پہلے کی بات نہیں کرتا اور پھر میں جب انڈونیشیا سے واپس آ گیا تھا اس کے بعد کی بات نہیں کرتا کہ انڈونیشی مسلمان کیا تھے اور کیا ہو گئے اور کیا وہ مسلمان رہے بھی تھے یا نہیں، میں جنگ آزادی کے دوران کی بات کرتا ہوں۔ اُس انڈونیشی پکے مسلمان اور ایماندار تھے۔ جھوٹ بولنے اور قرآن پر جھوٹی قسم کھانے کو تو وہ گناہ کبیرا سمجھتے تھے۔ وہ ایسے نہ ہوتے تو آزادی کی ضرورت ہی نہ سمجھتے۔ کہتے کہ کوئی آ جائے، ہم پر حکم چلائے لیکن ہماری ضروریات پوری کرتا رہے اور نیک و بد سے نہ روکے۔

حوالدار نے جب قرآن سامنے رکھ کر تحقیقات شروع کی اور کہا کہ کھُل کر بات کریں اور ایک دوسرے سے مت ڈریں اور دل میں صرف اللہ کا خوف رکھیں۔ اس کا یہ ہوا کہ ہر ایک نے بتایا کہ اسے فلاں بات فلاں نے بتائی تھی اور اُس نے کیا کہا تھا۔ بات اُن دو ہندوؤں پر جا رُکی اور پتہ چلا کہ یہ فساد خفیہ طریقوں سے انہوں نے ہی کیا تھا۔

حوالدار کو کچھ شک ہوا۔ یہ دونوں ہندو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر رہے تھے۔ اٹھا اور ان دونوں کے کپڑے اتروا کر بالکل برہنہ کر دیا تو سب نے دیکھا کہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ حوالدار نے وہیں سے باہر نکل کر ان دونوں کو ایک درخت کے ساتھ کیا اور پارٹی سے کہا کہ سب ان پر فائر کرو۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور دونوں ہندوؤں کے گولیوں سے چھلنی ہو گئے۔

یہ واقعہ ایسا ہے جس میں ان ہندوؤں کا پتہ چل گیا تھا، کئی واقعات ایسے ہوئے کہ

ہندوؤں کی سازش کامیاب ہوئی اور متعلقہ گوریلا پارٹیوں میں فتنہ فساد ہُوا۔

یہ الگ بات ہے کہ ان سازشی کارروائیوں کا مجموعی طور پر جنگِ آزادی پر کوئی بُرا اثر نہ ہُوا لیکن قابلِ غور امر یہ ہے کہ ہندو نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کبھی کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ان ہندوؤں کی ایسی تخریبی سرگرمیاں شہروں تک محدود تھیں مثلاً "جکارتہ' جوگ جکارتہ' بنڈونگ وغیرہ۔

○

میں جانتا ہوں کہ بعض قارئین کرام میری ان باتوں سے بوریت محسوس کرتے ہوں گے۔ میں آپ کی اس فرمائش کا احترام کرتا ہوں کہ دلچسپ' سنسنی خیز اور جذباتی سے واقعات سناؤں لیکن میں مناسب نہیں سمجھتا کہ اس حقیقی داستان کو ناول بنا دوں۔ یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور قارئین کرام سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ خفا نہیں ہوں گے کہ میں ایک ہی بات بار بار کہے جا رہا ہوں۔ ضرورت یہ ہے کہ میرے ان تجربات اور مشاہدات سے آپ سب کو کچھ حاصل ہو۔ حاصل اسی صورت میں ہو گا کہ آپ میری روئیداد کو ذاتی سطح پر نہیں بلکہ قومی سطح پر آ کر پڑھیں۔

بات اتنی سی ہے جو میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہندو مسلمان کا نہ کبھی دوست رہا ہے اور نہ کبھی رہے گا۔ میں نے انڈونیشیا کی جنگ آزادی لڑی ہے۔ اپنی جنگِ آزادی یعنی تحریکِ پاکستان میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔ انڈونیشیا سے واپس آ کر مجھے تحریکِ پاکستان کی جو باتیں معلوم ہوئی تھیں ان میں خاص بات یہ تھی کہ ہندوؤں نے تحریکِ پاکستان کی جڑیں کاٹنے کے لئے کیا کچھ کیا تھا۔ قومی یعنی سیاسی سطح پر تو ہندوؤں نے جو کیا وہ اُس وقت کے اخباروں میں اور بعد میں لکھی جانے والی کتابوں میں محفوظ ہے لیکن ہندوؤں نے ذاتی سطح پر مسلمانوں کو یا یوں کہئے کہ سرکردہ مسلمانوں کو اپنی گرفت میں لینے کے لئے اپنی دولت اور اپنی خوبصورت بیٹیاں بھی استعمال کی تھیں۔

چند مہینے پہلے آپ نے اخباروں میں پڑھا ہو گا کہ بھارت سے ایسی آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ انہوں نے یعنی بھارت نے پاکستان پر جو ثقافتی (کلچرل) حملہ کیا ہے وہ سو فیصد کامیاب ہے۔ ہندو لیڈر تو یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے اپنا کلچر آہستہ آہستہ اسلامی کلچر پر غالب کر دیا ہے اور اب پاکستان پر فوجی حملے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ ہندو لیڈروں کے ان بیانات کو فلمی بڑھکیں نہ سمجھیں۔ قومی سطح پر آ کر ان پر غور کریں۔ ان کا براہِ راست تعلق امریکہ کے "نیو ورلڈ آرڈر" کے ساتھ ہے۔ پاکستان سے اسلام پسندی اور اسلام کی عسکری روح کو ختم کرنے کے لئے امریکہ بھارت کو استعمال کر رہا ہے۔ تشویش ناک بات یہ ہے کہ ہمارے نوجوان بلکہ نوجوانوں کے والدین بھی ہندو کا کلچر اُس کی فلموں وغیرہ کے ذریعے دل و جان سے قبول کرتے چلے جا رہے ہیں اور وہ نتائج سے بے خبر ہیں۔

میں آپ کو اس باب میں ایک زبردست گوریلا ایکشن سناؤں گا جو آپ کو چونکا دے گا لیکن میں آپ کو اسلام اور پاکستان کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ میری یہ باتیں بھی سن لیں اور ان پر غور بھی کریں اور عمل بھی۔

میں یہاں دو تین خطوط کے جواب مختصر طور پر دوں گا۔ "حکایت" کے ایڈریس پر مجھے یہ خطوط ملے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ میں سوئیکارنو کو فرشتہ سیرت لیڈر بنا کر پیش کر رہا ہوں لیکن وہ تو عیاش' شرابی اور اتنا آزاد خیال آدمی تھا کہ اُس کا سارا کردار اسلام کے منافی تھا.... جواب میں عرض ہے کہ پاکستان میں ایسے لوگ موجود ہیں جو قائدِ اعظمؒ کے خلاف ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قائدِ اعظمؒ کی داڑھی نہیں تھی' نماز نہیں پڑھتے تھے' انگلینڈ گئے تو وہاں شراب پیتے تھے اور ان کی رشتے داریاں پارسیوں کے ساتھ تھیں وغیرہ۔ ایک عالمِ دین نے تو قائدِ اعظمؒ کو کافرِ اعظم بھی کہا ہے۔ مولوی صاحبان کے علاوہ یہ الزام لگانے والے اُن سیاسی پارٹیوں کے لوگ بھی ہیں جو تحریکِ پاکستان کے خلاف تھے۔ ایک الزام یہ بھی ہے کہ قائدِ اعظمؒ اسلامی نظام کے سخت خلاف تھے اور وہ سیکولر نظام چاہتے تھے اور یہ بھی کہ وہ تھے ہی انگریزوں کے ایجنٹ۔

یہی سلوک احمد سوئیکارنو کے ساتھ ہُوا اور ہو رہا ہے۔ میں سوئیکارنو کو ایک فرشتہ بنا کر پیش نہیں کر رہا لیکن یہ مت بھولیں کہ تاریخ تاقیامت گواہی دیتی رہے گی کہ سوئیکارنو جنگِ آزادی کے لیڈر اور ہیرو تھے۔ انہوں نے دو بڑی طاقتوں' امریکہ اور برطانیہ' کی بے پناہ جنگی طاقت کے خلاف منظم طریقے سے جنگِ آزادی لڑوائی' اپنے ان عوام کو جو بڑی لمبی مدت سے ولندیزیوں کے غلام چلے آ رہے تھے' ایک غیور اور پُر وقار قوم بنایا اور دنیا کے نقشے پر ایک نیا اور آزاد ملک پیدا کیا جس کا نام انڈونیشیا رکھا۔ آج تمام ملک ڈرتے ہیں کہ اقوامِ متحدہ ان میں سے کسی پر پابندیاں عائد نہ کر دے۔ سوئیکارنو وہ واحد حکمران ہیں جنہوں نے اقوامِ متحدہ کے اجلاس میں کھڑے ہو کر ان بڑی طاقتوں کے

منہ پر تھوکا اور اقوامِ متحدہ سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ اس کے نتائج انڈونیشیا کے لئے بڑے ہی خطرناک ہو سکتے تھے لیکن احمد سوئیکارنو نے اپنی قوم اور اپنے ملک کے وقار کو سامنے رکھا اور نتائج کی پرواہ نہ کی۔ انہوں نے روس کے ساتھ معاہدہ کر کے اپنے ملک کو ایک جنگی طاقت بنادیا۔

یہ تفصیلات میں پہلے بھی پیش کر چکا ہوں۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ امریکہ احمد سوئیکارنو کو کسی قیمت پر معاف نہیں کر سکتا تھا۔ ایک جرم یہ کہ سوئیکارنو کی قیادت میں انڈونیشی مسلمانوں نے امریکہ اور برطانیہ کو شکستِ فاش دی تھی۔ دوسرا جرم یہ کہ سوئیکارنو نے اقوامِ متحدہ کی توہین کر دی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقوامِ متحدہ امریکہ کا اپنا ادارہ ہے پھر احمد سوئیکارنو نے یہ جرم کیا کہ روس کے ساتھ دوستی کرلی اور اپنے ملک کو جنگی طاقت بنالیا۔ زمین کی معدنی دولت سے عوام کو خوشحالی دی۔

احمد سوئیکارنو نے سب سے بڑا گناہ یہ کیا کہ ستمبر 1965ء کی جنگ میں پاکستان کو بھرپور جنگی مدد دی۔ یہ تفصیل بھی میں پہلے سُنا چکا ہوں۔ امریکہ سخت ناراض ہُوا۔ امریکہ کی کوشش یہ تھی کہ پاکستان بھارت کے ہاتھوں ایسی بُری حالت کو پہنچے کہ بھارت کی برتری تسلیم کرلے اور اپنے اسلامی تشخص اور خود ارادیت سے دستبردار ہو جائے۔ یہ بھی مان لے کہ امریکہ اسے بھارت کے ہاتھوں پٹوا بھی سکتا ہے اور چھڑوا بھی سکتا ہے۔ سوئیکارنو کو امریکہ نے اس جرم کی یہ سزا دی کہ سی آئی اے کے انتظامات کے تحت انڈونیشیا میں ایسی قتل و غارت کروائی کہ ملک خون میں ڈوب گیا۔ امریکہ سوہارتو کو اوپر لایا اور سوئیکارنو کو قید میں ڈال کر سوہارتو کو صدر بنا دیا اور اس طرح امریکہ نے انڈونیشیا فتح کرلیا۔

آج اکتیس سال گزر گئے ہیں، سوہارتو ہی انڈونیشیا کا صدر چلا آ رہا ہے۔ وہاں باقاعدہ الیکشن ہوتے ہیں اور ہر بار جیت سوہارتو کی ہوتی ہے۔ یہ الیکشن فوج اور پولیس کے زیرِ سایہ ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ سوہارتو کے دورِ حکومت میں انڈونیشیا پر امریکہ کی گرفت مکمل طور پر مضبوط ہو گئی اور سوہارتو نے اپنے ہاتھوں اسلام کی جڑیں کاٹیں اور عوام کے لئے روٹی کپڑے کا مسئلہ کھڑا کر کے انہیں غریب اور کنگال بنا دیا۔ انڈونیشیا ہزاروں جزیروں کا مجموعہ ہے۔ کئی جزیروں میں ایک عرصے سے یہ مہم چل رہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کر کے وہاں عیسائیوں کو آباد کیا جا رہا ہے اور عوام احتجاج کرتے ہیں تو اُن پر پولیس اور فوج کو کتوں کی طرح چھوڑ دیا جاتا ہے۔ امریکہ یہی چاہتا تھا کہ یہ ملک آہستہ آہستہ عیسائیوں کے قبضے میں آجائے اور اسلام برائے نام رہ جائے۔

اپنی اس داستان کو آگے چلانے سے پہلے میں موزوں سمجھتا ہوں کہ انڈونیشیا میں اب جو خونریز صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے، اس کا انتہائی مختصر ذکر کر دوں۔ یہ اس لئے کہ انڈونیشیا میں ایک بار پھر سوئیکارنو کے نعرے لگنے شروع ہو گئے ہیں۔ وہاں ایک اور الیکشن مہم شروع ہو گئی ہے اور سوہارتو اب بھی ملک کا پریذیڈنٹ بننا چاہتا ہے۔ امریکہ کے اِس پٹھو کی عمر 75 برس سے تجاوز کر گئی ہے اور وہ دل کے کسی عارضے میں بھی مبتلا ہو چکا ہے جس کا وہ علاج کروا رہا ہے لیکن ہوسِ اقتدار کا یہ عالم کہ وہ اب بھی پہلے کی طرح پولیس اور فوج کی رائفلوں کے سائے میں صدارت کی کرسی پر براجمان رہنا چاہتا ہے لیکن احمد سوئیکارنو کی بیٹی میگاوتی سوئیکارنو پتری اُس کے مقابلے کے لئے میدان میں اُتر آئی ہے۔ اس خاتون کی عمر 43 سال ہے۔ اس نے اپنی پارٹی بنالی ہے جس کا نام انڈونیشی جمہوری پارٹی ہے اور وہ اُس کی چیئرپرسن ہے۔ "سوئیکارنو پتری" کا مطلب ہے سوئیکارنو کی بیٹی۔ انڈونیشیا کے عوام اور وہاں کا نوجوان طبقہ 'کیا بچہ کیا بوڑھا کیا جوان' میگاوتی کے جھنڈے تلے جمع ہو گیا ہے۔ وہاں کے لوگ سوہارتو کی اکتیس سالہ ڈکٹیٹرشپ سے اتنے زیادہ تنگ آچکے ہیں کہ وہ گلیوں میں اور سڑکوں پر نعرے لگاتے ہیں —— "میگاوتی جیتے گی"۔

ڈیڑھ دو مہینے پہلے جکارتہ میں لوگوں نے بڑے لمبے لمبے جلوس نکالے اور نعرہ بازی کی۔ وہ سوہارتو جو پولیس اور فوج کے زیرِ سایہ انڈونیشیا کا تاحیات بادشاہ بنا بیٹھا ہے، کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ کوئی اور کرسیٔ صدارت سے اُٹھانے کے لئے اس کے مقابلے میں آئے۔ اُس نے حکم دے دیا کہ مظاہرین پر گولی چلا دو۔ پولیس نے گولی چلائی، بہت خون خرابہ کیا اور میگاوتی پر پابندیاں عائد کر دیں۔ اس کے جواب میں لوگوں نے بڑے ہی خطرناک مظاہرے کئے، پولیس کی گاڑیاں جلا ڈالیں اور جتنی بھی توڑ پھوڑ کر سکتے تھے کی اور پھر پولیس اور فوج نے ان مظاہروں کو کنٹرول کرنے کے لئے پہلے سے زیادہ ظلم و تشدد کیا۔

میں ان مظاہروں اور پولیس اور فوج کی ظالمانہ کارروائیوں کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا، اس کی بجائے میں آپ کو ایک دو دلچسپ باتیں سناتا ہوں۔ ایک یہ کہ میگاوتی

اپنے نام کے ساتھ "سوئیکارنوپُتری" لکھتی ہے۔ عوام کی غالب اکثریت اس کے ساتھ ہو گئی ہے۔ سوہارتو کی حکومت کے ہر شعبے میں فوجی افسر مقرر ہیں جو ہر شعبے کی کارکردگی پر نظر رکھتے ہیں تاکہ کوئی کام سوہارتو کے خلاف نہ ہو۔ معلوم ہُوا ہے کہ محکمۂ اطلاعات و نشریات میں جو فوجی افسر بیٹھا ہے' اس نے اخباروں کو یہ نوٹس بھیجا ہے کہ وہ جب کسی خبر میں میگاوتی کا نام لکھیں تو اُس کے ساتھ سوئیکارنوپُتری نہ لکھا کریں بلکہ اُس کے خاوند کا نام لکھیں۔ اس حکم کا مطلب یہ ہے کہ میگاوتی کو جو اتنی زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے یہ اس کے باپ سوئیکارنو کے نام کی وجہ سے ہے لہٰذا سوئیکارنو کو بلیک آوٹ کر دیا جائے۔

انڈونیشیا پر دراصل جرنیل حکومت کر رہے ہیں۔ انڈونیشی ذرائع کے مطابق یہ جرنیل امریکہ کے وظیفہ خور ایجنٹ ہیں۔ میگاوتی نے قوم کو یہ نعرہ دیا ہے کہ انڈونیشیا میں جرنیلی حکومت نہیں جمہوری حکومت چلے گی لیکن جرنیل یہ پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ میگاوتی دراصل کیمونسٹ ہے اور ملک میں کیمونزم رائج کرنا چاہتی ہے۔ یہ اس لئے کہا جا رہا ہے کہ سوئیکارنو نے روس کے ساتھ دوستی کر لی تھی۔ امریکہ کے اسلحہ خانے میں سب سے بڑا بم یہی ہے کہ کسی ملک کے حکمران کو رسوا کرنا چاہتا ہے تو اُس کے خلاف یہ پروپیگنڈہ زور و شور سے شروع کر دیتا ہے کہ یہ کیمونسٹ ہے۔ فلپائن میں مسلمان اپنا الگ وطن بنانے کے لئے لڑ رہے ہیں لیکن امریکی پروپیگنڈہ اخباروں اور رسالوں میں پڑھو تو لکھا ہے کہ فلپائن کی حکومت کے خلاف کیمونسٹ گوریلے لڑ رہے ہیں۔

میں صرف یہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ جنگِ آزادی کا لیڈر اور ہیرو احمد سوئیکارنو ایک بار پھر زندہ ہو گیا ہے۔ آپ کی دلچسپی کے لئے بتاتا ہوں کہ سوئیکارنو نے اپنے تین بیٹوں کے جو نام ہیں ان ناموں کے معنی یہ ہیں —— "ایک ہے آسمانی بجلی' دوسرا رعد کی گرج اور تیسرے کا نام ہے تیز و تند سمندری طوفان" —— اس بیٹی کا نام میگاوتی ہے۔ میگا کے معنی ہیں بادل۔ سوہارتو دیکھ رہا ہے بادل میں آسمانی بجلیاں چمکنے اور گرجنے لگی ہیں اور تیز و تند سمندری طوفان آ رہا ہے۔

اگر میگاوتی جیت گئی تو یہ امریکہ کی شکست ہو گی۔ ایک ایسا ملک اُس کے ہاتھ سے نکل جائے گا جس کی زمین تیل' پٹرول اور بڑی ہی قیمتی اور وافر معدنیات دیتی ہے۔ امریکہ کے لئے یہ بھی بڑے دکھ والی بات ہو گی کہ ایک مسلمان ملک جس میں وہ سوہارتو

کے ذریعے عیسائیوں کو آباد کرتا چلا جا رہا تھا اور اسلام کی بیخ کُنی ہو رہی تھی' وہ ملک اس کے پنجے سے نکل جائے گا۔

ہماری اصل مجبوری یہ ہے کہ عالمی میڈیا (اخبار رسالے اور ٹی وی وغیرہ) امریکہ کے ہاتھ میں ہے۔ تیسری دنیا کے ذرائع ابلاغ تو ہیں ہی امریکہ کے زیر اثر۔ اس صورتِ حال میں ہمیں جو خبریں اور تبصرے پڑھنے کو یا سننے کو ملتے ہیں' وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہوتے' ان میں امریکی مفاد اور نقطۂ نگاہ چھپا ہُوا ہوتا ہے۔ آج کی دنیا کے سامنے احمد سوئیکارنو کی جو تصویر پیش کی جا رہی ہے' وہ امریکی مفادات اور نقطۂ نگاہ کے مطابق مسخ شدہ ہوتی ہے۔ میں اس سوئیکارنو کو جانتا ہوں جس کے احکام اور تنظیم میں شامل ہو کر میں نے جنگِ آزادی لڑی تھی۔ میں اکیلا ہی نہیں' اُس وقت کی انڈین آرمی کے بے انداز مسلمان فوجی انڈونیشیا کی جنگِ آزادی میں شریک تھے اور ان میں بہت سے ایسے ہیں جنہیں سوئیکارنو ملا تھا اور ملتا رہتا تھا۔ یہ وہ مسلمان فوجی تھے جو انڈونیشیا کے مرکزی شہر جکارتہ میں یا اس کے مضافات میں تھے۔ ایسے لوگ ابھی زندہ ہوں گے' ان کی رائے بھی لے لیں۔



میں چونکہ برما وغیرہ کے علاقوں میں رہا ہوں اور جاپانی فوجی ہر وقت دل و دماغ پر آسیب کی طرح سوار رہتے تھے اور پھر میں جاپانیوں کے ساتھ رہا بھی ہوں اس لئے اس وقت کی کوئی بات کسی اخبار یا کتاب میں دیکھتا ہوں تو بڑے ہی شوق اور دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ میری زندگی کے بہترین اور بڑے ہی قیمتی سال ان علاقوں میں گزرے ہیں۔ آغازِ جوانی کا ہی تو وقت ہوتا ہے جب انسان اپنا مستقبل بناتا ہے لیکن میرا وہ وقت ایسی زمین پر اور ایسے حالات میں گزرا جب موت سائے کی طرح ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور کوئی بھی قدم زندگی کا آخری قدم ہو سکتا تھا۔ ذہن میں یہ سوچ رہتی تھی کہ میں اپنی فوج کی گولی سے مروں گا یا جاپانی پکڑ لیں گے اور میرے جسم پر سنگین بازی کی مشق کریں گے یا ہوائی جہاز سے بم گرے گا یا کسی توپ کا گولہ میرے قریب پھٹے گا اور میرے جسم کے ٹکڑے اُڑ جائیں گے۔

کچھ دن پہلے عالمی ٹی وی سی این این پر چھوٹی سی ایک فلم دیکھی جس میں تھائی لینڈ اور برما کے جنگلوں میں سے گزرتی ہوئی ایک ریلوے لائن دکھائی گئی۔ یہ ریلوے لائن

سامنے آ جاتی ہے اور جب تک میں اسے کاغذ پر اُگل نہ دوں یا دو چار دوستوں کو سنا نہ دوں مجھے چین نہیں آتا۔

آیئے' میں آپ کو میدانِ حشر میں لے چلتا ہوں جہاں دنیا کی سب سے بڑی صلیبی طاقتیں مسلمانوں کو اپنا غلام بنانے کے لئے اپنے بمبار ہوائی جہازوں' توپوں اور مشین گنوں سے آگ برسا رہی تھیں۔ مسلمانوں کو غلام بنانے کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس خطے سے اسلام کی آواز نہ اُٹھ سکے اور یہاں سے اسلام کو بے دخل کر دیا جائے۔

یہ میں بتا چکا ہوں کہ انڈونیشی مجاہدین آزادی کے پاس ہوائی جہاز بھی نہیں تھے اور توپخانے بھی نہیں تھے۔ وہ ٹینکوں اور بکتربند گاڑیوں سے بھی محروم تھے۔ پھر انہوں نے جنگ آزادی کس بل بوتے پر اور کس طاقت کے زور پر جیت لی تھی؟..... کچھ واقعات تو سنا چکا ہوں' ایک اور سناتا ہوں۔

پچھلے باب میں جو واقعہ سنایا ہے' اس کے بعد مجھے اور عاشق علی کو ہیڈ کوارٹر کے حکم کے مطابق عثمان کی پارٹی میں ہی "مستقلاً" شامل کر دیا گیا تھا۔ یوں تو عثمان ہمیں بڑا پکا لگتا تھا لیکن عثمان میں کچھ ایسے اوصاف تھے کہ میں اور عاشق علی اسے اپنا پیر استاد اور بڑا ہی مخلص دوست سمجھنے لگے تھے۔ وہ ہم دونوں کے ساتھ دوستانہ رویّہ رکھتا تھا اور کبھی نہیں بھولتا تھا کہ ہم اتنی دُور پردیس کے رہنے والے اُس کی مدد کو آئے تھے۔ فرائض کے معاملے میں بڑا ہی سخت آدمی تھا۔ غلطیاں اور بھول چُوک برداشت کر لیتا تھا لیکن دانستہ کوتاہی اور بزدلی ...... کبھی معاف نہیں کرتا تھا۔ گوریلا کارروائیوں میں اگر کوئی بہت ہی مشکل صورتِ حال پیدا ہو جاتی تو وہ ایسی بے خوفی اور دلیری کے مظاہرے کر گزرتا تھا کہ وہ انسان کم اور آسمان سے اُتری ہوئی مخلوق زیادہ لگتا تھا۔

مجھے اور عاشق کو اس کے ساتھ رہتے ہوئے چار پانچ مہینے گزر گئے تھے۔ اس عرصے میں ہم نے چھوٹی موٹی گوریلا کارروائیاں کی تھیں۔ یہ سب کی سب سنانا ضروری نہیں۔ ایک بڑی جھڑپ سناتا ہوں۔ ہیڈ کوارٹر سے عثمان کا بلاوا آیا اور وہ چلا گیا اور وہ شام کو واپس آیا۔ اس کے پاس ایک آپریشن آرڈر تھا۔

میں نے یہ آپریشن آرڈر پڑھا۔ یہ انگریزی زبان میں ٹائپ کیا ہُوا تھا۔ عام طور پر ان کے آپریشن آرڈر ان کی اپنی زبان میں لکھے جاتے تھے لیکن میں سمجھ نہیں سکا کہ یہ آپریشن آرڈر انگریزی میں کیوں لکھا گیا تھا بلکہ ٹائپ کیا ہُوا تھا۔ میں جب فوج میں تھا تو

بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے آئے ہوئے سیکرٹ آپریشن آرڈر پڑھا کرتا تھا۔ اب ان گوریلوں کا آپریشن آرڈر پڑھا تو ذرا سا بھی شک نہ رہا کہ اوپر ہیڈ کوارٹر میں صحیح معنوں میں فوجی ذہن والے لوگ موجود ہیں۔ تحریر اور انداز خالصتاً" فوجی تھا۔

جنگِ آزادی کا وہ دَور عروج کا دَور تھا اور یہ جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ اُدھر امریکیوں اور انگریزوں نے بھی مزید کمک منگوائی تھی اور کبھی تو یوں لگتا تھا جیسے یہ اہلِ صلیب باؤلے ہو گئے ہیں۔ اندھا دھند جنگلوں میں اُن کے ہوائی جہاز بم پھینکتے رہتے تھے اور ذرا سے اشارے پر ان کے توپ خانے آگ برسانے لگتے تھے۔

حکم یہ آیا تھا کہ دریا کے پار ساڑھے تین چار میل ہی دو گاؤں تھے۔ ظاہر ہے وہ مسلمانوں کے گاؤں تھے۔ یہ وہی دریا تھا جو میں نے تیر کر عبور کیا تھا۔ یہ دونوں گاؤں اُس طرف تھے جس طرف سے میں آیا تھا۔ دریا تو مُڑ کر کسی اور طرف چلا جاتا تھا اور جو گاؤں بتائے گئے تھے ان کے قریب سے ایک ندی گزرتی تھی جس کی چوڑائی تقریباً" پچیس گز بتائی گئی تھی اور اس کی گہرائی پانچ یا چھ فٹ کے درمیان تھی۔ اس ندی پر لکڑی کا ایک پل تھا جس کے نیچے کوئی ستون نہیں تھا۔

یہ دونوں گاؤں ندی کے ایک طرف تھے اور ندی سے ان کا فاصلہ تقریباً" ایک ایک میل تھا۔ ندی کے دوسرے کنارے سے تقریباً" اتنی ہی دُور ایک گورا رجمنٹ کی دو رائفل کمپنیوں نے آ کر ڈیرے ڈال لئے تھے۔ وہاں غالباً" جاپانیوں نے جنگِ عظیم کے دوران عارضی کچّی سی تین چار بارکیں بنائی تھیں۔ گوروں کی یہ کمپنیاں ان بارکوں میں رہتی تھیں۔ ان گوروں کی نفری دو سو سے زیادہ تھی۔

ان کمپنیوں کی کچھ نفری نے ان دونوں بستیوں کے درمیان آ کر ایک پوسٹ یعنی چوکی سی بنالی تھی۔ سینڈ بیگوں کی دیواریں کھڑی کر لی تھیں اور ان کے اندر تین خیمے گاڑ لئے تھے۔ سینڈ بیگوں کی دیوار میں سے انہوں نے دو جگہوں سے دیوار میں سوراخ چھوڑ دیئے تھے۔ ان میں مشین گنیں لگا دی تھیں۔ ایک طرف اس پوسٹ سے چار پانچ فرلانگ دُور ایک گاؤں تھا اور پوسٹ سے آگے اتنی ہی دُور دوسری بستی تھی۔ اطلاع کے مطابق دونوں بستیوں میں آبادی بہت ہی کم تھی۔ وہاں زیادہ تر بوڑھے' عورتیں اور بچّے تھے۔ یہ تو ہم جانتے تھے کہ تمام لڑکے اور جوان آدمی لڑنے کے لئے گھروں سے غائب ہو گئے ہیں۔

عثمان کو ہیڈ کوارٹر میں بلا کر زبانی بتایا گیا تھا کہ یہ گورے وقتاً فوقتاً ان دونوں بستیوں میں جا دھمکتے ہیں اور آباد گھروں کی تلاشی لیتے ہیں اور جو گھر خالی ہیں' ان کے اندر جا کر بھی دیکھتے ہیں۔ ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی کہ انہوں نے کسی عورت کو کبھی چھیڑا ہو یا کسی اور طریقے سے گاؤں والوں کو پریشان کیا ہو۔ بتایا گیا کہ وہ جب تلاشی لیتے ہیں تو بڑے غصے میں ہوتے ہیں اور بار بار رائفلوں کی نالیاں گاؤں والوں کی طرف کر کے ڈراتے ہیں۔

پھر ان گوروں نے گاؤں والوں تک اپنی باتیں پہنچانے کا یہ ذریعہ حاصل کر لیا کہ دو انڈونیشی اپنے ساتھ رکھ لئے جو انگریزی جانتے اور بول سکتے تھے۔ وہ یقیناً مسلمان نہیں تھے' ولندیزی ہی ہو سکتے تھے۔ اب وہ گاؤں میں داخل ہوتے تو ان آدمیوں کی معرفت لوگوں سے بات کرتے تھے۔ گاؤں والے اور ہم سب سمجھتے تھے کہ یہ گورے فوجی اس شک پر بار بار گاؤں کی تلاشی لیتے ہیں کہ کوئی گوریلا پارٹی یا ایک دو گوریلے یہاں آ کر پناہ لیتے ہوں گے۔

میں نے بتایا ہے کہ گورا رجمنٹ کے یہ جوان کسی عورت کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بڑے اچھے کردار والے اور شریف گورے تھے' وجہ یہ تھی کہ انہیں معلوم تھا کہ کسی عورت پر دست درازی کی تو گوریلے بہت بُرا انتقام لیں گے۔ گوروں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ دو ملکوں کی بری اور فضائی جنگی طاقت ان مسلمانوں کو نہیں دبا سکی بلکہ یہ روز بروز کامیابیاں حاصل کرتے جا رہے ہیں اس لئے انہیں اس قسم کا اشتعال نہ دلایا جائے کہ ان کی عزت پر ہاتھ ڈالا جائے۔ انہیں اوپر سے ایسا ہی حکم ملا ہو گا' حالانکہ میں نے بعد میں دونوں بستیوں میں دیکھا تھا' کچھ جوان اور اچھی شکل و صورت کی عورتیں موجود تھیں۔

اصل بات عثمان نے مجھے اور عاشق علی کو بتائی تھی۔ ہیڈ کوارٹر نے یہ محسوس کیا تھا کہ امریکی اور انگریز دیہاتی علاقوں میں آ کر پوسٹیں بنا رہے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گوریلوں کے قریب آتے چلے جا رہے ہیں جیسے گھیرا تنگ کیا جاتا ہے۔ گوریلا آپریشن کا مقصد یہ تھا کہ ان کمپنیوں پر' ان کی اس پوسٹ پر ایسا حملہ کیا جائے کہ انہیں بہت سا جانی نقصان دیا جائے تاکہ یہ یہاں سے بھاگ جائیں اور پھر دشمن اپنی فوج کو دیہاتی علاقے میں اس طرح نہ بھیجے کہ بستیوں کے قریب آ کر پوسٹیں بنا لیں۔ یہ کمپنیاں

دراصل گوریلوں پر نظر رکھنے کے لئے اور ان کی نقل و حرکت میں رکاوٹ پیدا کرنے کے لئے یہاں آئی تھیں۔

ہمارے لئے حکم یہ تھا کہ ہماری پوری پارٹی عثمان کی قیادت میں دریا کے اُس کنارے پر جائے گی اور اُس کنارے سے جو علاقہ شروع ہوتا تھا' اس علاقے کی ایک یا دو گوریلا پارٹیاں ہمارے ساتھ مل جائیں گی اور پھر ہم ان گوروں پر حملہ کریں گے۔

عثمان نے پوری پارٹی کو اکٹھا کر کے اس آپریشن کی بریفنگ دی اور بتایا کہ کل صبح جب ابھی اندھیرا ہو گا' پارٹی روانہ ہو جائے گی۔ عثمان نے پہلے انڈونیشی زبان میں پارٹی کو سارا آپریشن سمجھایا اور اس کے بعد مجھے اور عاشق کو اردو میں یہ سب کچھ بتایا۔

میں خاص طور پر بتانا چاہتا ہوں کہ ہمیں آمنے سامنے مورچہ بند ہو کر نہیں لڑنا تھا بلکہ یہ گوریلا آپریشن تھا جس کا اصول ہوتا ہے' ضرب لگاؤ اور اِدھر اُدھر ہو جاؤ۔ ہماری پارٹی کی جو نفری جا رہی تھی اس کی تعداد صرف سترہ تھی۔ پندرہ آدمی تھے اور دو جوان سال لڑکیاں۔ لڑکیوں کو آدمیوں کی کمی کی وجہ سے ساتھ لے جایا جا رہا تھا۔ کمی کی وجہ یہ تھی کہ پارٹی کے کچھ جوان کسی اور مشن پر چلے گئے تھے اور تین چار دنوں تک ان کی واپسی متوقع نہیں تھی.... ہمیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ پہلے گوروں کی پوسٹ پر شب خون مارا جائے گا اور توقع ہے کہ ندی کے پار ان کی جو نفری بارکوں میں رہتی ہے وہ اُن کی مدد کو دوڑی آئے گی۔ اس نفری کو روکنے کے لئے ندی کا پل بارود سے اڑا دیا جائے گا۔

○

ہمیں بتایا تو یہ گیا تھا کہ روانگی علی الصبح ہو گی لیکن یہ وقت بدل دیا گیا اور ہم دوپہر کے بعد اپنے ٹھکانے سے چلے۔ ہم اکٹھے نہیں چل رہے تھے بلکہ دُور دُور بکھر کر جا رہے تھے۔ ہم دُور سے دیکھے نہیں جا سکتے تھے کیونکہ وہ علاقہ گھنا جنگل تھا اور اس میں چٹانیں اور ٹیکریاں بھی تھیں۔ گھاس خاصی اونچی تھی اور جنگلی پودے بھی زیادہ تھے۔ ہم دریا کے کنارے اس وقت پہنچے جب سورج غروب ہو رہا تھا۔ دریا کے کنارے دو کشتیاں بندھی ہوئی تھیں اور چار آدمی وہاں موجود تھے۔ یہ چپّوؤں سے چلنے والی چھوٹی کشتیاں تھیں۔ یہ دونوں آدمی ملّاح تھے۔ انتظام دیکھئے وہ پہلے سے موجود تھے اور انہیں معلوم تھا کہ یہ سارا کام کیا ہے۔ ان میں سے ایک نے بتایا کہ آگے راستہ صاف ہے۔

جب شام گہری ہو گئی تو سات آٹھ آدمی ایک کشتی میں بیٹھے اور دو ملّاحوں نے چپّو

مارنے شروع کر دیئے۔ آدھی پارٹی ابھی پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کشتی کو وہاں سے سامنے والے کنارے تک لے جاتا تھا جو بڑا ہی مشکل کام تھا کیونکہ دریا کا پاٹ تنگ تھا اور گہرائی زیادہ تھی اس لئے موجیں ذرا زیادہ اُٹھ رہی تھیں۔ یہ ان ملاّحوں کا ہی کمال تھا کہ وہ کشتی پار لے جا رہے تھے۔ میں تو دیکھ دیکھ کر کہتا تھا کہ کشتی ابھی ڈوبی کہ ڈوبی۔ موجیں اسے اوپر اٹھا اٹھا کر پٹختی تھیں۔

اندھیرا اتنا ہو گیا تھا کہ اب پار والا کنارہ بلکہ دریا بھی نظر نہیں آتا تھا۔ پار والے کنارے پر ایک ماچس جلی اور ایک دو سیکنڈ بعد بجھ گئی۔ عثمان ہمارے ساتھ تھا۔ اس نے کہا کہ چلو کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ وہ روشنی اشارہ تھا کہ پہلی کشتی پہنچ گئی ہے اور دشمن کا کوئی خطرہ نہیں۔ ہم سب کشتی میں بیٹھے اور ملاّحوں نے چپّو مارنے شروع کر دیئے۔ خطرہ یہ تھا کہ کبھی کبھی دریا میں فوجی موٹر بوٹ میں گشت کے لئے نکلا کرتے تھے لیکن میں تو دشمن سے زیادہ اس دریا کو دشمن سمجھ رہا تھا۔ میں اس علاقے کا رہنے والا ہوں جس میں کوئی دریا اور کوئی نہر بھی نہیں۔ یہی دریا تھا جس میں مَیں پُل سے کُود آیا اور تیر کر کنارے لگا تھا لیکن اُس روز یہ دریا غرّا غرّا کر کشتی کو اوپر نیچے پھینکتا اور جھنجھوڑتا تھا۔

آخر کشتی کو ملاّح کنارے پر لے گئے اور ہم اُترے۔ اب یہ خطرہ شروع ہو گیا تھا کہ یہ علاقہ دشمن کی زیرِ نگرانی تھا اور وہ پوسٹ کوئی زیادہ دور نہیں تھی۔

○

عاشق علی مجھ سے الگ ہو گیا تھا اور عثمان نے مجھے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ وہاں دو آدمیوں نے ہمارا استقبال کیا۔ عثمان نے انہیں بتایا کہ میں انڈین آرمی سے بھاگ کر ان کے پاس آیا ہوں۔ وہ دونوں بڑے تپاک اور پیار سے ملے۔ ان میں ایک اس پارٹی کا کمانڈر تھا جو پہلے ہی اس علاقے میں موجود تھی۔ انہوں نے عثمان کے ساتھ کچھ باتیں کیں جو میں نہ سمجھ سکا۔ اپنے مشن کی ہی باتیں کی ہوں گی۔ اس پارٹی کے جوان کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ معلوم ہُوا کہ ان کی تعداد بارہ ہے۔

اگر یہ پارٹی فوج کی ہوتی تو کشتیوں میں اس کا بہت سا سامان بھی لدا ہُوا ہوتا۔ ایمونیشن اور گرینیڈوں کے بکس تو ضرور ہوتے لیکن ہمارے پاس کوئی ایسا فالتو سامان نہیں تھا۔ وہی کچھ تھا جو ہم نے اپنے جسموں کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ رائفلیں، ٹامی گنیں اور سٹین گنیں تھیں۔ ان کا ایمونیشن ہم نے پوچوں میں ڈال رکھا تھا اور پوچ

ہمارے جسموں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے اور ہر جوان کے پاس دو دو گرینیڈ تھے۔ یہ گرینیڈ فوجیوں سے چھینے گئے تھے۔ انڈونیشی مجاہدین کی اپنی کوئی فیکٹری تو تھی ہی نہیں۔ ہر آپریشن آرڈر کے نیچے یہ الفاظ ضرور لکھے ہوتے تھے کہ گولی اُس وقت چلاؤ جب یقین ہو کہ ایک دشمن کو ضرور لگے گی۔ یہ تو ہر کسی کے ذہن میں ڈال دیا گیا تھا کہ ہمارے پاس ضائع کرنے کے لئے ایک بھی گولی نہیں۔

دوسری پارٹی کا کمانڈر عثمان کے ساتھ باتیں کر کے چلا گیا اور میں اور عثمان اکیلے رہ گئے۔ ہماری اپنی پارٹی کے آدمی اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ اس طرح بکھر کر ایک دوسرے سے دُور ہو جانا سکیم کے عین مطابق تھا۔ ہر آدمی کو اپنے اپنے کام کا پورا پورا پتہ تھا۔ اتنے گھنے جنگل میں جہاں اونچی نیچی ٹیکریاں بھی تھیں، وہاں ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ ممکن نہیں تھا لیکن رابطہ قائم تھا جسے صرف ہم ہی سمجھ سکتے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مینڈک بولتا تھا یا کہیں سے اُلّو کے بولنے کی آواز آتی تھی۔ اگر مجھے معلوم نہ ہوتا تو میں ان آوازوں کی طرف توجہ ہی نہ دیتا اور انہیں مینڈک اور اُلّو کی ہی آوازیں سمجھ کر نظرانداز کرتا رہتا۔ یہ تو جنگل کی رات کی آوازیں ہوتی ہیں لیکن یہ آوازیں ہمارے اپنے ساتھیوں کی تھیں۔ ایک بار عثمان نے بھی منہ سے الو کی آواز نکالی۔ اس کے جواب میں مینڈک بولا۔ انہوں نے ان آوازوں کا کوڈ بنا رکھا تھا جسے ابھی میں نہیں سمجھ سکتا تھا۔

ہمارے اس مِشن کی ہر بات اور ہر حرکت بڑی ہی دلچسپ، پُراسرار اور ایمان افروز تھی لیکن میں یہ ساری تفصیلات نہیں سنا سکوں گا.... اُس روز میرے پاس سٹین گن تھی اور اس کی بھری ہوئی چار میگزینیں میں نے الگ اٹھا رکھی تھیں۔ دو گرینیڈ تھے اور ایک خنجر۔ ملٹری پوسٹ جس پر پہلے حملہ کرنا تھا وہ ابھی کچھ دور تھی۔ مینڈکوں اور اُلّوؤں کی آوازیں تھوڑی ہو گئی تھیں اور دُور ہٹتی جا رہی تھیں۔ میں اور عثمان آپس میں کوئی بات کرتے تو وہ کان میں کرتے تھے۔ ہمیں ہلکے ہلکے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ عثمان نے اپنا بازو میرے آگے کر کے مجھے روک لیا۔ ہم دونوں نے غور سے سنا تو ہمیں باتیں سنائی دینے لگیں۔ یہ آوازیں آہستہ آہستہ ہماری طرف آ رہی تھیں۔

آوازیں ہمارے سر پر پہنچ گئیں تو میں نے سنا کہ وہ انگریزی میں باتیں کرتے آ رہے تھے جس سے کوئی شک نہ رہا کہ یہ گورا رجمنٹ کے گشتی سنتری ہیں۔ ایک نے منہ سے

سیٹیاں بجانی شروع کردیں جو ان گوروں کی عادت تھی۔ ہُوا یہ کہ وہ ذرا تیز رفتار سے آ رہے تھے اور ہم اتنی تیزی سے چھُپ نہ سکے۔ عثمان اس طرف تھا جس طرف سے وہ آ رہے تھے۔

عثمان بڑی پھُرتی سے بیٹھا اور پیچھے کو سرکا لیکن اُس کے یوں پیچھے ہٹنے اور چھُپنے سے جھاڑیوں نے آواز پیدا کی جو رات کے سنّاٹے میں دُور دُور تک سنی جاسکتی تھی۔ میں بھی ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہوگیا تھا۔ اندھیرے میں بھی وہ دونوں گورے نظر آنے لگے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کے قد عام انسانوں سے کچھ زیادہ ہی اونچے ہوگئے ہوں' شاید یہ نظر کا دھوکہ تھا' میں جھاڑی کے پیچھے بیٹھا ہُوا انہیں دیکھ رہا تھا اور میرے دل سے دعا نکلی کہ یااللہ ان کے پاس ٹارچ نہ ہو۔ اگر ہو گی تو وہ نہ جلے لیکن انہیں شک ہو گیا تھا کہ یہاں کچھ ہے۔ دونوں رک گئے۔ مجھے یہ بھی نظر آ گیا کہ دونوں کے پاس سٹین گنیں تھیں جو سلنگوں سے انہوں نے اپنے کندھوں سے لٹکا رکھی تھیں۔

ان میں سے ایک تو ایک ہی جگہ رکا کھڑا رہا اور دوسرا آہستہ آہستہ چلتا اس جھاڑی تک پہنچا جس کے پیچھے عثمان چھپا بیٹھا تھا۔ گورے نے سٹین گن کندھے سے اُتار لی تھی۔ وہ انگریزی میں اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ یہاں کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ میرا تو جیسے خون ہی خشک ہو گیا ہو۔ وہ بدبخت اس جھاڑی کے اوپر جا رکا تھا جس کے پیچھے عثمان چھپا ہوا تھا۔ اُس کافر نے عثمان کو دیکھ لیا اور اپنی زبان میں کہا کہ فوراً" اُٹھو' تم ہو کون اور پھر اُس نے انگریزی میں گالی دی۔

اُس کا ساتھی بھی جھاڑی کے قریب آن کھڑا ہوا۔ وہ گورا جو پہلے آیا تھا اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ فاصلہ تین گز سے زیادہ نہیں تھا۔ انہیں یہ تو پتہ ہی نہیں چل سکا تھا کہ کوئی اور بھی ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ گیا ہے۔ میں نے ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا کہ آج کی رات میری اور عثمان کی زندگی کی آخری رات ہے۔ عثمان اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرتا تو سٹین گن کا ایک ہی برسٹ اسے ختم کر دیتا۔ میں نے اس صورتِ حال میں بھاگ نہیں جانا تھا بلکہ ان گوروں پر سٹین گن چلانی تھی اور انہوں نے بھی مجھ پر فائر کرنا تھا۔

سوچنے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ وہاں تو ایک سیکنڈ بھی بڑا لمبا وقت تھا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ فوج سے بھاگنے کے بعد موت میری ہم سفر رہی ہے۔ فوراً" فیصلہ کر لیا کہ

مرنے سے پہلے موت پر ایک جھپٹا تو ضرور ماروں گا۔ عثمان ابھی جھاڑی سے اٹھا نہیں تھا۔ میں نے خنجر نکالا اور پاؤں پر بیٹھے بیٹھے اسی پوزیشن پر ہو گیا کہ جمپ آسان ہو گئی۔ میں نے دل میں اللہ سے یوں التجا کی — "یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ بِرَحْمَتِکَ اَسْتَغِیْثُ" — پھر میں دبا کر چھوڑے ہوئے سپرنگ کی طرح اچھلا۔ جس گورے کی پیٹھ میری طرف تھی' پیچھے سے اپنا بایاں بازو اس کی گردن میں ڈال دیا اور بازو کا گھیرا یکلخت تنگ کر دیا اور اس کے ساتھ ہی خنجر بلند کر کے گورے کی پسلیوں میں گھونپ دیا' نکالا اور پھر گھونپا اور نکال کر ایک بار پھر مارا اور گورے کو اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک اس کی سٹین گن اس کے ہاتھ سے گر نہ پڑی تھی۔

مجھے خطرہ یہ نظر آ رہا تھا کہ دوسرا گورا عثمان پر سٹین گن فائر کر دے گا لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایک ایسا منظر دکھایا جو اس صورت حال میں بالکل ہی غیر متوقع تھا۔ وہ یہ کہ اِدھر میں نے اُس گورے کو چھوڑا اور اُدھر دیکھا کہ دوسرا گورا بھی گر پڑا تھا اور عثمان اس کے سر پر کھڑا تھا۔ اس ساری کارروائی میں پانچ نہیں تو زیادہ سے زیادہ سات سیکنڈ لگے ہوں گے۔

ہُوا یہ تھا جو عثمان نے مجھے بتایا کہ دوسرا گورا ایسے زاویے پر کھڑا تھا کہ عثمان اُس پر وار کر سکتا تھا۔ عثمان کے پاس بھی سٹین گن تھی لیکن رات کو خاموشی برقرار رکھنے کی ضرورت تھی اس لئے سٹین گن فائر نہیں کی جا سکتی تھی۔ میں نے جب ایک گورے کو دبوچ لیا تو دوسرا گورا جو تین چار گز یا شاید اس سے زیادہ فاصلے پر کھڑا تھا' ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کا بایاں پہلو عثمان کی طرف تھا۔ عثمان نے بڑی پھُرتی سے خنجر نکالا اور اُٹھ کر گورے کو دبوچا نہیں بلکہ بڑی ہی تیزی سے اُٹھ کر خنجر گورے کے پہلو میں مارا اور اس طرح دو تین بار خنجر اس کے پہلو اور سینے میں گھونپا۔ وہ گورا بھی گر پڑا۔ ان گوروں پر ہمارا حملہ غیر متوقع تھا اس لئے وہ سنبھل نہ پائے۔ پھر بھی میں عثمان کی پھُرتی اور حملے پر حیران رہ گیا۔ میں نے بھی ایک گورے کو مار دیا تھا لیکن حملہ پیچھے سے کیا تھا۔ عثمان اس گورے کے تقریباً" سامنے ہو گیا تھا اور دونوں کے درمیان فاصلہ چار پانچ قدم تھا۔ وہ گورا اسے دیکھ کر اس پر فائر کر سکتا تھا لیکن عثمان حیران کن حد تک تیز نکلا۔

○

ہم نے دونوں گوروں کی سٹین گنیں لے کر اپنے کندھوں سے لٹکا لیں اور جن لمبے

پوتچوں میں ان کی بھری ہوئی میگزینیں رکھی تھیں وہ پوچ ہی اتار کر گلے میں ڈال لئے۔
ہم نے ان کی جیبوں کی تلاشی نہ لی' ان کے بازوؤں سے گھڑیاں بندھی تھیں' وہ اتار لیں اور آگے چل پڑے۔ عثمان نے کہا کہ بسم اللہ اچھی نہیں ہوئی' دعا کرو اللہ خیر کرے۔

ابھی اُس نے یہ الفاظ کہے ہی تھے کہ ایک ٹامی یا سٹین گن فائر ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی گوروں کی پوسٹ سے دُور روشنی راؤنڈ فائر ہوئے۔ ہم ابھی اس پوسٹ سے یعنی اپنے ٹارگیٹ سے دُور تھے۔ اس فائر سے یہ نقصان ہوا کہ ہم گوروں پر بے خبری میں جو شب خون مارنا چاہتے تھے وہ صورت ختم ہو گئی تھی اور گورے بیدار ہو گئے تھے۔ عثمان نے کہا کہ اپنے کسی آدمی نے کسی وجہ سے گھبرا کر یہ برسٹ فائر کیا ہے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ جس طرح ہمیں دو گورے گشت پر مل گئے تھے' اسی طرح دو گورے سپاہی ایک اور جگہ گشت پر جا رہے تھے۔ بالکل ہماری طرح دوسری پارٹی کے دو آدمی اچانک ان کے راستے میں آ گئے اور چھپ گئے۔ گوروں نے اُنہیں دیکھ لیا اور جب ان کے قریب گئے تو ایک نے سٹین گن کا برسٹ فائر کر کے دونوں کو ختم کر دیا۔ ان دونوں انڈونیشی گوریلوں کی جانیں تو بچ گئیں لیکن شب خون کا جو SURPRISE تھا وہ ختم ہو گیا تھا۔ یہ عنصر ختم ہو جائے تو سمجھو مشن ہی ناکام ہو گیا لیکن ہمارے بے خوف مجاہدین نے کچھ اور سوچنے کی بجائے پوسٹ پر ہلّہ بول دیا۔ پھر تو یوں ہُوا کہ جنگل کی خاموشی اور تاریک رات رائفلوں اور مشین گنوں کے بے ہنگم فائر سے لرزنے لگی۔
پوسٹ کی مشین گنوں نے اندھا دُھند فائر کھول کر دیا۔ ہم جانتے تھے کہ فوج میں مشین گنیں کس بے دردی سے فائر کی جاتی تھیں اور فائر کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ گن کی نالی ہر طرف گھمائی جاتی تھی اور اس سے ایک انچ جگہ بھی محفوظ نہیں ہوتی تھی۔

پوسٹ سے روشنی راؤنڈ فائر ہو رہے تھے جن کی روشنی کی وجہ سے مجاہدین پوسٹ تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ دو گرینیڈ پھینکے گئے لیکن وہ پوسٹ کے باہر گرے۔ میں اور عثمان دوڑتے وہاں تک گئے لیکن آگے نہ جا سکے۔ مشین گنوں اور رائفلوں کی گولیاں سروں کے اوپر سے گزر رہی تھیں اور ہمارے دائیں بائیں' آگے اور پیچھے زمین میں بھی لگ رہی تھیں۔

پوسٹ سے دو تین سرخ روشنی راؤنڈ فائر ہوئے۔ یہ پوسٹ نے ندی کے پار اپنی کمپنیوں کو اشارہ دیا تھا کہ خطرہ ہے اور مدد کو پہنچو۔ پوسٹ کے ساتھ ہی ایک چٹان تھی۔

عثمان نے مجھے کہا کہ چلو اس چٹان پر چلتے ہیں.... کہنے کی حد تک تو ٹھیک تھا لیکن اتنی زیادہ فائرنگ میں سے گزر کر وہاں تک پہنچنا خودکشی کے برابر تھا۔ بہرحال کچھ تو کرنا ہی تھا۔ بڑی آسان صورت یہ تھی کہ ہم لوگ پسپا ہو آتے اور یہ سمجھتے کہ شب خون ناکام ہو گیا ہے لیکن یہ ہم میں سے کسی کو بھی منظور نہیں تھا۔

دوسری پارٹی کے ایک انڈونیشی نے حیران کُن جرأت کا مظاہرہ کیا۔ جب روشنی راؤنڈوں کی روشنی ختم ہوئی تو پیٹ کے بل رینگتا ہُوا پوسٹ کی ایک مشین گن پوزیشن کے نیچے تک پہنچ گیا۔ وہاں سینڈ بیگوں کی دیوار تھی۔ وہ نیچے سے اٹھا' مشین گن کی نالی دونوں ہاتھوں سے پکڑی اور گن کو زور سے پیچھے کو دھکیلا اور پھر آگے کو کھینچا۔ گنر غالباً "پہلے دھکے" سے پیچھے کو گر پڑا ہو گا اسی لئے گن ہمارے آدمی کے ہاتھ آ گئی اور وہ گن لے کر وہاں سے دوڑ پڑا۔ گن کے ساتھ گولیوں کی بیلٹ لگی ہوئی تھی۔ اس مجاہد کی یہ دلیری بے مثال تھی لیکن اس کے ہاتھ آنے والے چند دنوں کے لئے بے کار ہو گئے تھے کیونکہ فائر کرتی ہوئی مشین گن کی نالی اتنی ہی گرم ہوتی ہے جتنی گرم وہ سلاخ ہو جاتی ہے جسے کچھ دیر آگ میں رکھا جاتا ہے۔ اس مجاہد کی دونوں ہتھیلیاں جل گئی تھیں۔ صبح تک ہتھیلیوں پر آبلے اٹھ آئے تھے لیکن رات کو اُس نے پرواہ تک نہ کی اور مشین گن چٹان تک لے گیا۔

اِدھر سے میں اور عثمان بچتے بچاتے' کہیں رینگتے کہیں اوٹ کے پیچھے چٹان کے اوپر پہنچ گئے۔ اُدھر سے یہ مشین گن آ گئی۔ تب ہمیں پتہ چلا تھا کہ یہ جانباز یہ گن کہاں سے اور کس طرح لایا ہے۔ عثمان نے گن لے لی اور وہاں سے پوسٹ پر فائر کرنے لگا۔ پوسٹ پر چھت تو تھی نہیں' سینڈ بیگوں کی دیوار کے اندر خیمے تھے۔ میں نے سٹین گن سے پوسٹ کے اندر فائر کیا پھر پوسٹ کے اندر ایک گرینیڈ پھٹا۔ اب ہمیں اطمینان ہو گیا کہ ہم جو نقصان کرنا چاہتے تھے وہ کر لیا ہے۔

میں نے عثمان سے کہا کہ ہمیں یہاں سے اب نکل جانا چاہئے کیونکہ ندی کے اُس طرف سے دو کمپنیاں بھی آ رہی ہوں گی۔ عثمان نے اتنا ہی کہا' نہیں آ سکیں گی' انتظام کر دیا ہے....

عثمان نے اتنا ہی کہا تھا کہ ندی کی طرف بڑے زور کا دھماکہ ہُوا اور بہت بڑا شعلہ بھڑک کر بجھ گیا۔ عثمان نے کہا' دیکھا پُل اُڑا دیا گیا ہے' اب ہماری طرف کوئی نہیں آ سکتا۔

...پُل اڑانے کا انتظام دوسری پارٹی کے ساتھ تھا۔ اُس پارٹی کے آدمیوں نے یہ کام بڑی کامیابی سے کر دیا تھا۔ اگلے روز پتہ چلا تھا کہ دونوں کمپنیاں اپنی پوسٹ کی مدد کے لئے آ رہی تھیں اور پُل تک پہنچ بھی گئی تھیں لیکن پل درمیان سے اڑا دیا گیا اور لکڑی کا وہ پُل ندی میں کئی ٹکڑوں میں گرا اور ندی میں ڈوب گیا۔

○

گوروں کی پوسٹ خاموش ہو چکی تھی۔ یہ اب دوسری پارٹی کا کام تھا کہ پوسٹ سے اسلحہ اور ایمونیشن اور کام کی دیگر چیزیں اٹھا کر لے جائے۔ ہماری پارٹی کے لئے حکم تھا کہ مشن مکمل کر کے فوراً واپس آ جائے..... مشن مکمل ہو چکا تھا..... میں اور عثمان چٹان سے اُترے اور دوسری پارٹی کے کمانڈر کو ڈھونڈنے اور پکارنے لگے۔ وہ مل گیا اور اس نے کہا کہ آپ لوگ نکل جائیں۔ اس مشن کا دراصل مقصد یہ تھا کہ فوج کو یہ بتانا تھا کہ اب اس علاقے میں فوج کا عمل دخل ختم کر دیا گیا ہے اور آئندہ کوئی فوجی پوسٹ کسی بستی کے قریب نہ بنائی جائے۔

ذرا غور سے سنیئے کہ پُل کس طرح اُڑایا گیا۔ پُل کو اس بارُود سے اُڑایا گیا تھا جسے بتی سے آگ لگائی جاتی تھی۔ دوسری پارٹی کا ایک انڈونیشی یہ بارود اس میں بتی لگا کر لے گیا۔ ہماری پارٹی کا جو آدمی اس کے ساتھ وہ عاشق علی تھا۔ دونوں پُل کے درمیان تک چلے گئے۔ پُل کے اس طرف یا اس طرف کوئی سنتری نہیں تھا۔ انڈونیشی نے پُل کے کنارے سے جھک کر نیچے ایک جگہ ڈائنامیٹ کا سلیب رکھ دیا۔ بتی کا سرا پُل پر تھا۔

اُس نے ماچس جلا کر بتی کو آگ لگا دی۔ بتی کا چھوٹا سا شعلہ شرارے کی مانند تھا جو ندی کے دوسرے کنارے تک گوروں کو نظر آ گیا۔ کمپنیاں پُل تک آ گئی تھیں۔ اِدھر سے ایک گولی فائر ہوئی۔ گولی ڈائنامیٹ رکھنے والے کو لگی۔ یہ وہ وقت تھا جب وہ بتی جلا چکا تھا۔ اُس نے عاشق علی سے کہا کہ مجھے گولی لگ گئی ہے' میں بچ نہیں سکوں گا' تم بھاگ جاؤ۔ عاشق نے اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ اٹھ سکا۔ اُس نے پھر عاشق سے کہا کہ وہ بھاگ جائے۔

عاشق وہاں سے دوڑا تو پیچھے سے مشین گن یا سٹین گن کے دو تین برسٹ فائر ہوئے جن سے عاشق شدید زخمی ہو گیا لیکن وہ پُل سے نکل آیا اور ہماری طرف آ کر گرا۔ اس کے ساتھ ہی بارُود یعنی ڈائنامیٹ پھٹا اور پُل کے ساتھ وہ انڈونیشی مجاہد بھی اڑ

گیا۔ دونوں پارٹیاں قریب والے گاؤں میں اکٹھی ہوئیں تو پتہ چلا کہ چھ انڈونیشی مجاہدین شہید ہو چکے ہیں اور تین چار زخمی ہیں۔ ایک کمرے میں لالٹین کی روشنی تھی۔ دو انڈونیشی عاشق علی کو اٹھا کر لائے۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ کچھ گولیاں اس کے دائیں کندھے کے قریب لگی تھیں اور کچھ بائیں ٹانگ میں لگیں۔ دوسری پارٹی کے کمانڈر نے کہا کہ اسے یہیں چھوڑ جاؤ لیکن عثمان نے کہا کہ وہ اسے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ چنانچہ فوری طور پر اس کے زخموں پر کپڑے باندھ دیئے گئے اور میں نے اور دو اور انڈونیشیوں نے اٹھا لیا۔ گاؤں کے ایک آدمی نے کہا کہ اسے اس طرح مت اٹھاؤ' چارپائی پر ڈال کر لے جاؤ۔ ہم نے اسے چارپائی پر ڈالا اور اٹھا کر چل پڑے۔

ہم تھوری ہی دُور گئے تھے کہ پیچھے کوئی دوڑتا آیا اور چارپائی پر ہاتھ رکھ دیئے۔ عثمان ساتھ تھا۔ وہ کوئی انڈونیشی گوریلا تھا۔ عثمان نے اس کے ساتھ بات کی تو میں یہی سمجھ سکا کہ یہ انڈونیشی اپنی کسی بات پر اُڑا ہُوا ہے اور ضد کر رہا ہے۔ کچھ دیر ان میں اپنی زبان میں بحث ہوتی رہی۔ آخر عثمان مان گیا اور آگے آگے چل پڑا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس انڈونیشی کی آواز مردانہ نہیں۔ اندھیرے میں چہرہ تو ٹھیک طرح نظر نہیں آتا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ چل پڑا۔

میں اور عثمان آگے آگے چل رہے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کون ہے اور کیا باتیں ہو رہی تھیں.... عثمان نے بتایا کہ یہ وہ لڑکی ہے جسے زخمی حالت میں عاشق علی اٹھا کر ادھر آیا تھا اور پھر ہمارے ساتھ ہی رہ گیا.... وہ آمنہ تھی جو دوسری پارٹی کے ساتھ اس مشن یا آپریشن میں شریک ہوئی تھی۔

ہمارے ساتھ جو لڑکیاں تھیں انہوں نے آمنہ کو اپنے ساتھ لے لیا اور پتہ چلا کہ وہ عاشق علی کے لئے اتنی پریشان ہے کہ رو رہی ہے اور ضد یہ کر رہی تھی کہ عاشق کے ساتھ ہی جاؤں گی اور کچھ دن اس کے ساتھ رہوں گی۔

وہ ہمارے ساتھ آ گئی اور پھر کشتیوں نے ہمیں اپنے کنارے تک پہنچا دیا اور پھر ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ یہاں مرہم پٹی کا نہایت اچھا انتظام تھا لیکن آمنہ کی بے تابیاں ایسی کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ عاشق اتنا شدید زخمی ہو کر بھی بچ گیا تھا۔ وہ چوتھے دن ہوش میں آیا تھا اور اس نے آنکھیں کھولی تھیں اور یہ چار دن آمنہ اس کے ساتھ رہی۔ اس نے جب ہوش میں آ کر آنکھیں کھولی تھیں تو اسے جو پہلا چہرہ نظر آیا وہ آمنہ کا تھا۔

(جاری ہے)

آزاد ملکوں کی فوجیں جنگیں لڑتی آئی ہیں۔ ہر جنگ میں فوجی بہادری کے کارنامے کرتے ہیں جن میں کچھ عمر بھر کے لئے معذور ہو جاتے ہیں اور کچھ اپنی جانیں ہی قربان کر دیتے ہیں۔ ایسا ہوتا آیا ہے اور ایسا ہی ہوتا چلا جائے گا۔ ان بہادروں کو اور جذبۂ ایثار کے مظاہرے کرنے والوں کو بہادری کے تمغے دیئے گئے تھے اور آئندہ بھی دیئے جائیں گے۔

کچھ عرصہ پہلے جنگِ عظیم لڑی گئی تھی جس میں بے مثال بہادری کے مظاہرے ہوئے تھے اور انگریزوں نے ایسے مظاہرے کرنے والوں کو اپنا سب سے بڑا اعزاز وکٹوریہ کراس دیا تھا۔ پاکستان میں نشانِ حیدر بھی دیئے گئے' ہلال جرأت' ستارہ جرأت لور تمغۂ جرأت دیئے گئے تھے لیکن انڈونیشیا کی جنگِ آزادی لڑنے والوں کے لئے کوئی تمغہ نہیں تھا اور ان مجاہدین کو تمغے کا کوئی لالچ بھی نہیں تھا۔ انڈونیشی گوریلے چھوٹی چھوٹی پارٹیوں میں دور جنگلوں اور پہاڑی علاقوں میں جا کر لڑتے تھے۔ ان کے پارٹی کمانڈر کو بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ کون کیسی بہادری دکھا رہا ہے۔ اسے یقین اور اعتماد ہوتا تھا کہ جو کوئی جہاں بھی ہے' وہ اپنے فرض سے غافل نہیں اور وہ اپنی جان کو آزادی سے زیادہ قیمتی نہیں سمجھتا۔

میں نے پاکستان میں واپس آکر تحریکِ پاکستان کی تفصیلات سنی تھیں اور مجھے پتہ چلا تھا کہ میری قوم نے کس طرح جان و مال کی قربانیاں دی تھیں۔ بخدا میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا تھا لیکن تحریکِ پاکستان مسلح جنگِ آزادی نہیں تھی جیسی انڈونیشیا کے مسلمانوں نے لڑی تھی۔ وہ تو دنیا کی دو بڑی جنگی طاقتوں کے خلاف جنگ تھی۔ مجاہدین جب کسی

مشن پر جاتے تھے تو یہ توقع اور امید دل سے نکال پھینکتے تھے کہ وہ زندہ واپس آجائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ زندہ واپس آنے کے لئے جاتے ہی نہیں تھے۔ ہر کوئی اسلام کی آزادی کے لئے اپنی جان کا نذرانہ لے کر جاتا تھا لیکن اسے ایسا کوئی لالچ نہیں ہوتا تھا کہ وہ بڑھ چڑھ کر بہادری کا مظاہرہ کرے گا تو بڑھ چڑھ کر انعام دیا جائے گا۔

میں نے صرف ایک واقعہ سنایا ہے کہ ایک انڈونیشی نے گورا رجمنٹ کی دو کمپنیوں کے سامنے پل میں ڈائنامیٹ لگایا' اس کے پھٹنے سے پہلے ہی اسے گولیاں لگ گئیں لیکن وہ وہاں سے نہ اٹھا اور پل کے ساتھ ہی اُڑ گیا۔ میں ایسے کارنامے سنانے لگوں تو دو چار نہیں' بے شمار ہیں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ کسی بھی تحریک' مہم یا معرکے میں دلوں پر طمع یا لالچ غالب آجائے تو ناکامی لازمی ہو جاتی ہے۔ طمع رکھنے والوں کی لوحِ تقدیر سے کامیابی کا لفظ کھُرچ کر غائب کر دیا جاتا ہے۔

یہاں میں اپنی روئیداد سے ہٹ کر اپنے ملک کی ایک بات کرنا چاہوں گا۔ اگر کسی کو بُری لگے تو میں کسی سے معذرت نہیں چاہوں گا اور نہ معافی مانگوں گا۔ اس میں شک و شبے کی گنجائش نہیں رہی کہ ہماری قوم جسے عوام بنا دیا گیا ہے' ایک فریب خوردہ قوم ہے بلکہ مظلوم اور مجبور عوام کا ایک ہجوم ہے۔ حکمرانی جس کو بھی ملی' اس نے ایک نیا ہی فریب ایجاد کر کے قوم کو دھوکہ دیا اور مقبولیت حاصل کرنے کی مذموم کوشش کی۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم نے یہ بیخ نکالی کہ تحریکِ پاکستان میں نمایاں کام کرنے والوں کو تمغہ اور نقد انعام دیا جائے۔ چنانچہ ہر یومِ آزادی پر کچھ لوگوں کو یہ تمغے اور انعام دیئے جاتے ہیں۔ اس دور کے لوگ ابھی زندہ ہیں۔ میں تو تحریکِ پاکستان سے دُور انڈونیشیا میں تھا اس لئے عینی شاہد نہیں ہوں لیکن اس دُور کے لوگ بتاتے ہیں کہ یہ انعام و اکرام ایسے افراد کو بھی دیئے گئے ہیں جن کا تحریکِ پاکستان کے ساتھ خاصی دُور کا یا رسمی سا تعلق تھا۔ میں سوچتا یہ ہوں کہ پاکستان گمنام مجاہدین کی قربانیوں کا حاصل ہے۔ میرے اپنے قصبے میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے بے مثال کام کئے تھے اور کسی لالچ کے بغیر کئے تھے۔ ایسے گمنام مجاہدین سینکڑوں یا ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ ان میں سے بہت سے دنیا سے اٹھ گئے ہیں۔ اُن کے پسماندگان جب دیکھتے ہیں کہ تمغے اور انعام کن لوگوں کو مل رہے ہیں تو ان کے ذہن میں کچھ تلخیاں اور شِکوے پیدا ہوتے ہیں جو پاکستان کی سلامتی اور بقاء کے لئے اچھے نہیں۔

پاکستان کے زوال کا باعث صرف لالچ اور طمع ہے۔ اوپر سے نیچے تک دیکھتے آئیں، حکمران بھی لالچ اور طمع میں مبتلا ہیں اور یہی کیفیت حاکموں پر طاری ہے اور جس شخص کو بھی سرکاری یا غیر سرکاری عہدہ مل گیا' اس نے اپنے دل و دماغ پر لالچ اور طمع کا غلبہ طاری کر لیا۔ ایک غیر ملکی دانشور نے کہا تھا کہ جس آزاد ملک کے حکمران اور اس کا انتظام چلانے والے حاکم اپنی توجہ طمع اور ذاتی تحفظ پر مرکوز کر لیں' اس ملک کو آزاد رہنے کے حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ محروم کرنے والا کون ہے؟.... اللہ تبارک و تعالیٰ کا قانون!

○

انڈونیشیا کی جنگِ آزادی میں اپنا آپ قربان کر دینے والوں میں عاشق علی پاکستانی بھی تھا۔ اس وقت وہ پاکستانی نہیں تھا لیکن تحریکِ پاکستان کا ذکر آیا ہے تو دل چاہتا ہے کہ عاشق علی کو پاکستانی لکھوں جبکہ وہ اس وقت ہندوستانی تھا.... اُس کا کارنامہ سنا چکا ہوں۔ وہ جانتا تھا کہ سامنے سے گورا رجمنٹ کی کمپنیاں آ رہی ہیں اور وہ ایک انڈونیشی مجاہد کے ساتھ پُل کو اُڑانے جا رہا تھا۔ وہ ایسا بُری طرح زخمی ہُوا تھا کہ اس کی زندگی کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ سورابایا تک اس کا زندہ رہنا ایک معجزہ تھا۔ اتنے وقت میں اس کا جسم خون سے خالی ہو جانا چاہئے تھا۔

وہ ایک امیر کبیر انڈونیشی کا خاصا بڑا مکان تھا جس میں پانچ چھ چھوٹے بڑے کمرے تھے۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ کسی اور جگہ منتقل ہو گیا تھا اور اس مکان کو اس نے جنگِ آزادی کے زخمیوں کا ہسپتال بنا دیا تھا۔ وہاں اُس وقت کی جدید سہولتیں اور سائنسی آلات تو میسر نہیں تھے لیکن ایسے انتظامات موجود تھے کہ شدید زخمیوں کا علاج معالجہ ہو جاتا تھا اور ٹوٹی ہوئی ہڈیاں بھی جوڑی جاتی تھیں۔ ڈاکٹر بھی موجود تھے اور تیمارداری کا انتظام بھی تھا۔ زخمیوں کی دیکھ بھال زیادہ تر عورتیں کرتی تھیں جن میں تربیت یافتہ نرسیں بھی تھیں۔

میں صبح شام عاشق علی کو دیکھنے جایا کرتا تھا اور ہر بار یہی جواب ملتا کہ ابھی عاشق بے ہوش ہے اور اسے گلوکوز اور خون لگا ہُوا ہے۔ خون کا انتظام خاصا اچھا تھا اور خون کا گروپ بھی معلوم کرنے کا انتظام تھا۔ میں نے پیشکش کی تھی کہ میں عاشق کو اپنا خون دوں گا۔ معلوم ہُوا تھا کہ آمنہ نے بھی اپنا خون پیش کیا تھا لیکن ڈاکٹر نے نہ میرا خون لیا

نہ آمنہ کا کیونکہ خون کی بوتلیں بھری رکھی تھیں۔

آمنہ عاشق علی کے ساتھ رہی اور وہی اس کی نرسنگ کرتی تھی۔ مجھے ابھی عاشق کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔ آمنہ باہر آتی تو وہ مجھے اُس کی حالت بتاتی تھی۔ وہ تو بہت ہی اداس اور پریشان تھی۔ اُس نے بتایا کہ عاشق کسی کسی وقت بے ہوشی میں کچھ بڑبڑاتا ہے اور اپنی زبان میں کوئی بات کرتا ہے۔ آمنہ ہماری زبان نہیں سمجھتی تھی۔

آمنہ نے جب یہ بات سنائی تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے یہ خیال آیا کہ عاشق علی ابھی نوجوانی کی عمر میں تھا۔ وہ زخمی ہُوا تو معلوم نہیں اسے ماں یاد آتی ہو گی' بہنیں یاد آتی ہوں گی اور اسے اپنا وطن' اپنا گھر تو یاد آیا ہو گا اور ہو سکتا ہے اسے یہ خیال بھی آیا ہو کہ وہ ہزارہا میل دُور پردیس میں مر رہا ہے۔ بے ہوشی میں شاید وہ اپنے گھر والوں کو یاد کرتا ہو گا اور ہو سکتا ہے خواب کی طرح اسے ماں باپ اور بہن بھائی نظر آتے ہوں۔ مختصر یہ کہ عاشق نے انڈونیشیا کے لئے یا اسلام کی خاطر بہت بڑی قربانی دی تھی۔

مشکل یہ تھی کہ میں آمنہ کی بات سمجھ نہیں سکتا تھا۔ یہ میری حماقت کہئے یا کچھ کہئے' میں نے انڈونیشی زبان سیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ عاشق علی یہ زبان سیکھ رہا تھا.... آمنہ سر کے اشارے سے بتاتی تھی کہ عاشق علی کی حالت ٹھیک نہیں' باقی بات اشاروں سے کرتی تھی جو میں کچھ سمجھ جاتا اور زیادہ تر کچھ بھی نہ سمجھتا۔

دوسرے یا تیسرے روز آمنہ کا والد بھی آ گیا تھا۔ وہ اردو بولتا اور سمجھتا تھا۔ وہ عاشق علی کو دیکھنے آیا تھا اور ظاہر ہے اپنی بیٹی کے متعلق بھی پریشان ہو گا۔ اُس نے عاشق علی کو بے دریغ خراجِ تحسین پیش کیا اور اس دوران اُس کی آنکھیں آنسوؤں کو نہ روک سکیں۔ وہاں ڈاکٹر انڈونیشی تھے۔ آمنہ کے باپ نے ان سے پوچھ کر مجھے بتایا تھا کہ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ عاشق علی زندہ رہے گا یا نہیں.... آمنہ نے باپ سے کہہ دیا تھا کہ وہ ابھی گھر واپس نہیں آئے گی اور باپ نے اسے اجازت دے دی تھی۔

یہ تھی مسلمان کی شان اور مومن لوگوں کا صحیح کردار جسے اسلامی کردار کہنا چاہئے۔ اس باپ کو ایسا کوئی غم فکر نہ تھا کہ اس کی نوجوان بیٹی یہاں محفوظ نہیں رہے گی یا اس کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ کرے گا یا یہ یہاں تکلیف میں رہے گی۔ میں نے سنا ہے کہ تحریکِ پاکستان میں ایسی ہی فضا پیدا ہو گئی تھی جس میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے

اپنے مشن میں لگن رہتے تھے اور لڑکے لڑکیوں کو ان کے گھروں تک چھوڑ آتے تھے....

آج پاکستانی کردار ایسا پست ہُوا ہے کہ میں جب اس دُور کی باتیں سوچتا ہوں اور اب لکھ رہا ہوں تو کبھی یوں لگتا ہے جیسے میں افسانہ لکھ رہا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ آج بھی ہمارا قومی کردار اور معاشرتی اخلاق اسی بلند مقام پر پہنچ جائے جو میں نے انڈونیشیا میں دیکھا تھا یا آپ نے تحریک پاکستان کے دور میں دیکھا تھا تو پاکستان ایک ایسی طاقت بن سکتا ہے کہ دشمن ہماری طرف دیکھنے سے پہلے سوچ سمجھ لے کہ اس باوقار ملک کی طرف دیکھنا بھی ایک جسارت ہے۔

○

یہاں میں ایک ہندوستانی ڈاکٹر کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ہے کہ اس ہسپتال میں تمام ڈاکٹر انڈونیشی تھے۔ غالباً" چوتھا دن تھا' میں عاشق علی کے متعلق پوچھنے گیا تو اندر سے ایک ہندوستانی ڈاکٹر نکلا جسے میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ انڈونیشیوں میں ہندوستانی تو فوراً" پہچانا جاتا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا لیکن میں کوشش کے باوجود مسکرا نہ سکا۔ میرے دل اور دماغ پر عاشق علی سوار تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ عاشق اب کس حالت میں ہے۔

"الحمدللہ!" ـــ اُس نے کہا ـــ "خطرے سے نکل آیا ہے اور انشاء اللہ زندہ رہے گا"۔

مجھے اُس کی اس رپورٹ سے ایسا دلی اطمینان ہُوا جیسے میں خطرے سے نکل آیا ہوں اور زندہ رہوں گا۔

"کیا آپ انڈین آرمی سے آئے ہیں؟" ـــ ڈاکٹر نے پوچھا۔

"ہاں صاحب!" ـــ میں نے جواب دیا ـــ "میں انڈین آرمی سے بھگوڑا ہو کر آیا تھا اور یہ زخمی عاشق بھی میرا ساتھی ہے۔ ہم دونوں مختلف حالتوں اور طریقوں سے یہاں پہنچے تھے"۔

وہ اپنے کام سے فارغ ہو چکا تھا۔ ہندوستانی ہونے کے ناطے سے وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا جہاں ڈاکٹر بیٹھا کرتے تھے۔ وہ کوئی پرانی عمر کا آدمی نہیں تھا۔ اس کی عمر ستائیں اٹھائیس سال تھی۔ وہ اسی روز اس ہسپتال میں آیا تھا اور اُس روز اُسی نے عاشق علی کی پٹیاں کھولیں اور زخموں کی حالت دیکھ کر مرہم پٹی کر دی تھی۔ اُس نے بتایا

کہ عاشق کا زندہ رہنا بھی معجزہ ہے لیکن اس سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ اتنی زیادہ گولیاں لگنے کے باوجود اُس کی ہڈیاں محفوظ رہ گئی ہیں۔

"اب ایک خطرہ باقی رہ گیا ہے" ـــ ڈاکٹر نے کہا ـــ "دایاں بازو تو یہ اب استعمال نہیں کر سکے گا جس طرح پہلے کیا کرتا تھا۔ کندھے کے پٹھے کٹ گئے ہیں اور ایک دو اہم رگیں بھی کٹی ہیں جس کا اثر یہ ہو گا کہ اب یہ بازو کو پوری طرح گھما نہیں سکے گا۔ تھوڑا سا اٹھا سکے گا اور ہاتھ کی گرفت ذرا کمزور ہو جائے گی۔ اسی طرح ٹانگوں کے پٹھے بھی کٹ گئے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ یہ زخمی ٹانگ سے اتنا کام نہیں لے سکے گا جتنا لیا جانا چاہئے۔ بہرحال مجھے یہ تو اطمینان ہے کہ اللہ نے اس کی قربانی قبول کر لی ہے"۔

اُس نے مجھ سے پوچھا میں یہاں کس طرح پہنچا تھا۔ یہ سوال وہ مجھ سے پہلے بھی پوچھ چکا تھا اور میں نے چند الفاظ میں جواب دیا تھا۔ میں اُس وقت صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ عاشق کس حال میں ہے۔ اب ذرا تفصیلی جواب دیا لیکن کم سے کم الفاظ میں اسے بتایا کہ میں کہاں سے اور کس طرح یہاں پہنچا تھا۔ عاشق کے متعلق بھی بتایا کہ وہ کس طرح آیا تھا۔ میں اس کے متعلق جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ میں نے انڈونیشیا کے مجاہدین کے پاس پہنچ کر بڑی قربانی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن اس ڈاکٹر کی بات سنی تو میں نے کہا کہ قربانی تو اس شخص نے کی ہے۔ وہ ہندوستان کے مشہور شہر آگرہ کا رہنے والا تھا۔ اس کا نام جمشید انور تھا اور انڈین آرمی میں کیپٹن ڈاکٹر تھا۔

وہ کسی امیر باپ کا بیٹا نہیں تھا۔ اس کا باپ ایک مسلم ہائی سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ جمشید سب سے بڑا تھا۔ اسے باپ نے میڈیکل کالج میں داخل کروا دیا تھا اور جمشید اتنا محنتی نکلا کہ ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کر لی۔ اس زمانے میں کسی مسلمان کا میٹرک پاس ہونا بھی بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ وکالت اور ڈاکٹری تو بڑے ہی امیر خاندانوں کے ریزرو تھیں۔ مسلمان بہت ہی کم وکیل یا ڈاکٹر بنتے تھے لیکن جمشید کے باپ کا ایک عزم تھا اور یہ اس کی خواہش تھی کہ اس کے بیٹے معاشرے میں اونچا مقام پیدا کریں۔ جمشید سے چھوٹا بھائی بی اے کر کے بی ایڈ کر رہا تھا۔ اسے باپ ٹیچنگ لائن میں بھیجنا چاہتا تھا۔ اس سے چھوٹا بھی تھرڈ ایئر میں پڑھتا تھا۔

جمشید انور نے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کر لی تو جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ اس

نے فوج میں قسمت آزمائی کی تو اسے فوراً لیفٹیننٹ کے عہدے پر لے لیا گیا۔ جنگ کی وجہ سے فوج کی بھرتی عام تھی اور ڈاکٹروں کی تو بہت ہی زیادہ ضرورت تھی۔ باپ کا ارادہ تو یہ تھا کہ جمشید نوکری کر کے تجربہ حاصل کر لے اور پھر اپنا کلینک کھول لے لیکن اُس زمانے میں ڈاکٹر نوکری کو زیادہ پسند کرتا تھے۔

ڈاکٹر اس وجہ سے نوکری پسند کرتے تھے کہ ان وقتوں میں بیماریوں کا یہ حال نہیں تھا جو ہم آج کے دَور میں دیکھ رہے ہیں۔ آج کل تو کوئی آدمی یہ کہے کہ وہ تندرست ہے تو حیرت ہوتی ہے۔ وہ میری جوانی کا وقت تھا۔ کوئی کوئی شخص بیمار ہوتا تھا اور گھریلو ٹوٹکے استعمال کر کے یا کسی سیانے کے بتائے ہوئے پرہیز سے ہی ٹھیک ہو جاتا تھا۔ اشیائے خورد و نوش خالص ہوتی تھیں۔ آج کل تو ہوا بھی خالص نہیں ملتی اور پانی بھی صاف ستھرا نہیں ہوتا۔ ہسپتال خالی پڑے رہتے تھے۔ ان حالات میں ڈاکٹر نوکری کو ہی اچھا سمجھتے تھے۔

ڈاکٹر جمشید انور کا باپ کوئی مردِ مومن تھا۔ جمشید کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ اُس کا باپ پکا مسلمان تھا لیکن ملا ٹائپ نہیں بلکہ مجاہدانہ خیالات کا آدمی تھا۔ وہ اپنے بیٹوں کو جہاد کی باتیں سناتا رہتا تھا اور زیادہ تر صلیبی جنگوں کی باتیں کرتا تھا۔ جمشید انور نے اپنے باپ کا سب سے زیادہ اثر قبول کیا اور اس نے تاریخ اسلام کی جنگوں کا مطالعہ سب سے زیادہ کیا اور اس طرح اُس کے خیالات اسی سانچے میں ڈھل گئے۔ اس کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت بھر گئی۔ انگریزوں کو وہ صلیبی کہا کرتا تھا۔

وہ فوج میں آیا تو اسے ہر طرف ہندو افسر نظر آئے جن میں دو چار ایسے تھے جو ہندوستان کی آزادی کی باتیں کرتے تھے اور انگریزوں کے خلاف سکیمیں بناتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر جمشید ان کی باتوں سے متاثر ہو گیا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال یقین بن کر بیٹھ گیا کہ ہندوستان سے اگر کوئی انگریزوں کو نکال سکتا ہے تو وہ ہندوؤں کی کانگرس پارٹی ہے اور اس کے لیڈر ہیں۔ فوج میں آ کر اس نے یہ ارادہ کر لیا کہ وہ صرف ڈاکٹر ہی نہیں رہے گا بلکہ لڑنے والا افسر بنے گا۔

اسے ایک یونٹ کے ساتھ برما کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ جاپانی سنگاپور ملایا وغیرہ کو فتح کرتے ہوئے بڑی ہی تیزی سے برما تک پہنچ گئے۔ یہ میں پہلے تفصیل سے سنا چکا ہوں کہ جاپانیوں نے کس طرح برق رفتار حملے سے برما لے لیا تھا اور انڈین آرمی کی بے شمار

نفری کو جنگی قیدی بنا لیا تھا۔ ڈاکٹر جمشید بھی جاپانیوں کے ہاتھ آ گیا۔

بین الاقوامی قانون کے مطابق ڈاکٹر دشمن کا جنگی قیدی بن جائے تو بھی اسے ڈاکٹر ہی تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ جنگی قیدیوں والا سلوک نہیں کیا جاتا۔ مطلب یہ کہ وہ دشمن کے پاس جا کر بھی اپنی حیثیت سے محروم نہیں ہوتا۔ جاپانیوں کو بھی آخر زیادہ سے زیادہ ڈاکٹروں کی ضرورت تھی اس لئے انہوں نے جمشید انور کو پوری تعظیم اور تکریم دی اور وہ ڈاکٹری کا کام ہی کرتا رہا۔

اس دوران ڈاکٹر جمشید نے سبھاش چندر بوس کا نام پہلی بار سنا اور وہ انڈین نیشنل آرمی کے حوالے سے اس کانگرسی لیڈر سے متعارف ہُوا۔ میں یہ بات بھی آپ کو پہلے تفصیل سے سنا چکا ہوں' یہاں ایک بار پھر سنانے کی ضرورت نہیں۔ انڈین آرمی کے جنگی قیدیوں کو انڈین نیشنل آرمی میں شامل کیا گیا تو ڈاکٹر جمشید بھی اُدھر ہی چلا گیا۔ ہندوستان کی آزادی کے متعلق وہ جذباتی تھا یا نہیں' وہ انگریزوں کو اپنا اور اسلام کا بدترین دشمن سمجھتا تھا۔ میں آپ کو اس کی ساری بات نہیں سنا رہا۔ صرف یہ بتاتا ہوں کہ وہ اس معاملے میں یعنی اسلام کے سلسلے میں بہت ہی جذباتی تھا اور حقیقت کو کچھ کم ہی دیکھتا تھا۔ اسے آپ اندھی عقیدت کہہ لیں جس میں انسان عقل سے کم اور جذبات سے زیادہ سوچتا ہے۔ البتہ ڈاکٹر جمشید انور کے کردار کا بنیادی وصف یہ تھا کہ سو فیصد مخلص اور اپنے اسلامی عزم کا وفادار تھا۔

میری طرح اس پر بھی انڈین نیشنل آرمی کی حقیقت کھلی تو وہ تڑپنے لگا کہ اب کیا کرے اور کہاں جائے۔ ہندو افسروں کی باتوں سے وہ صرف اس لئے متاثر ہُوا تھا کہ دشمن مشترک تھا یعنی انگریز۔ ڈاکٹر جمشید نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ انگریز ہندوستان سے چلے گئے تو وہ ہندوستان پر ہندو راج کو قبول کر لے گا۔ یوں کہہ کہ وہ دو قومی نظریئے کا ماننے والا تھا اور اس کا مطالبہ یہ تھا کہ پورے ہندوستان میں نہ سہی' ہندوستان کے کسی حصے کو اسلامی ملک بنا دیا جائے۔ اُس وقت نہ وہ نہ ہم دو قومی نظریئے اور پاکستان سے واقف تھے۔ میں تو چھوٹے سے عہدے کا فوجی تھا اس لئے بڑے لیڈروں سے نہیں مل سکا تھا' ڈاکٹر جمشید ان بڑے افسروں سے ملتا تھا جو انڈین نیشنل آرمی کے کمانڈر بن گئے تھے۔ ان کی باتیں سن کر جمشید بہت ہی پریشان ہو گیا تھا۔

جاپانیوں کی پسپائی شروع ہوئی تو آئی این اے لاوارث ہو کر بکھرنے لگی۔ پھر جس

طرح میں آئی این اے سے بچ بچا کر انڈونیشیا کے مسلمانوں کے پاس پہنچ گیا تھا اسی طرح ڈاکٹر جمشید بھی انڈونیشیا کی جنگِ آزادی میں شامل ہو گیا۔ اب وہ پوری طرح خوش اور مطمئن تھا۔ اس نے عہد کر رکھا تھا کہ انڈونیشیا آزاد ہو گیا تو وہ اسی ملک کا باشندہ بن جائے گا اور واپس اپنے گھر یعنی آگرہ اس وقت جائے گا جب ہندوستان سے انگریز جا چکے ہوں گے۔

وہ صرف ایک پریشانی لئے پھرتا تھا۔ اپنے ماں باپ کو یاد کرتا اور غمگین ہو جاتا تھا۔ کہتا تھا کہ اس کے باپ نے اپنا پیٹ کاٹ کر اُسے ڈاکٹر بنوایا تھا۔ اسے سرکاری اطلاع یہ ملی ہو گی کہ تمہارا بیٹا لاپتہ ہو گیا ہے۔ لاپتہ ہونے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ زندہ نہیں یا یہ کہ اس کی لاش نہیں ملی۔

"میرے والد صاحب کا ہارٹ فیل ہو چکا ہو گا" —— ڈاکٹر جمشید نے کہا —— "ہو سکتا ہے میری والدہ بھی زندہ نہ ہو۔ سوچتا ہوں بھائیوں کا کیا بنے گا"۔

یہ تھی ڈاکٹر جمشید کی قربانی۔ اُس نے اپنے والدین کی امنگیں قربان کر دی تھیں۔ باپ کے بعد خاندان کی ساری ذمہ داریاں اس کے کندھوں پر آتی تھیں لیکن اُس نے اس کی بھی پرواہ نہ کی۔

"لیکن اللہ سے ہمیشہ خیر کی توقع رکھنی چاہئے" —— اس نے کہا —— "میں کسی ذاتی غرض اور مقصد کے لئے تو یہاں نہیں آیا۔ یہ لوگ اللہ کے نام پر اسلام کی آن کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ ان کا مقابلہ صلیبی طاقتوں سے ہے۔ میری کوشش یہ رہتی ہے کہ اس جہاد میں جو زخمی ہو جائے' اس کی صبح شام شفقت اور محبت سے مرہم پٹی کروں اور نرسنگ کروں اور اسے زندہ رکھوں۔ میں جب کسی مجاہد کی مرہم پٹی کر رہا ہوتا ہوں تو کوئی نہ کوئی وظیفہ کرتا رہتا ہوں۔ اس کے لئے مجھے ہر وقت باوضو رہنا پڑتا ہے"۔

○

ڈاکٹر جمشید انور کے پاس اتنا وقت نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن اُس روز اُسے خاصی فراغت میسر آ گئی۔ وہ اس طرح کہ اسے عاشق علی کے لئے یہاں بھیجا گیا تھا۔ انڈونیشی ہندوستانی مسلمانوں کی تو خاص طور پر دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا تھا کہ ہمارے ایریا کمانڈر عثمان نے ہیڈ کوارٹر والوں سے کہا تھا کہ عاشق علی کی حالت ٹھیک نہیں اس لئے کوئی اور ڈاکٹر بھیجا جائے۔ ڈاکٹر جمشید سپیشلسٹ نہیں تھا نہ وہ ایکسپرٹ تھا

لیکن اسے زخموں کی مرہم پٹی وغیرہ کا خصوصی تجربہ حاصل ہو گیا تھا۔ چھُری چاقو' تلوار خنجر' بلکہ کلہاڑی کے زخموں کی مرہم پٹی آسان ہوتی ہے لیکن جو زخم رائفلوں اور مشین گنوں کی گولیوں کا پیدا کردہ ہوتا ہے یا توپ کے گولے کے ٹکڑے سے جو زخم آتا ہے' اس کی مرہم پٹی آسان نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر جمشید جب سے یہاں پہنچا تھا' وہ ایسے ہی زخمیوں کا علاج کرتا رہا تھا۔ ہیڈ کوارٹر نے اس روز اُسے صرف عاشق علی کے لئے بھیجا تھا۔

اس کے ہاتھ میں اللہ نے ایسی شفا دی تھی کہ صبح آتے ہی اُس نے عاشق کی پٹیاں کھولیں' زخم دیکھے اور معلوم نہیں اس نے کیا کیا کہ پٹیاں باندھ دیں اور کچھ دیر بعد عاشق ہوش میں آ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا تو نہیں تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اس نے مرہم پٹی کے دوران کوئی وظیفہ پڑھا ہو گا۔

اب وہ عاشق علی کی طرف سے مطمئن ہو گیا تھا لیکن ابھی اسے وہیں رہنا تھا اور رات اور دن عاشق علی کی صحت یابی کا جائزہ لیتا تھا۔ اس طرح اسے اتنی فرصت مل گئی کہ میرے ساتھ باتیں کرتا اور سنتا رہا۔ میں چونکہ ہندوستانی مسلمان تھا اس لئے بھی وہ میرے ساتھ باتیں کرنا اور سننا چاہتا تھا۔

"معلوم نہیں آپ کو کوئی ایسا تجربہ ہُوا ہے یا نہیں" —— اُس نے کہا —— "یہاں کے صلیبی مسلمانوں کی اس جنگِ آزادی کو ناکام کرنے کے لئے زمین دوز کارروائیاں کر رہے ہیں۔ ہندو بھی ان کے ساتھ شامل ہیں۔ صلیبیوں میں ایک تو انڈونیشی عیسائی ہیں اور دوسرے ڈچ (ولندیزی) ہیں۔ میں ان کی زمین دوز تخریب کاری کے کچھ واقعات سن چکا ہوں اور ایک ایسا واقعہ میرے ساتھ بھی ہُوا ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہے کہ یہ کفار مسلمانوں کی جنگِ آزادی کو سبوتاژ نہیں کر سکیں گے"۔

"انشاء اللہ کفار بُری طرح ناکام رہیں گے" —— میں نے کہا —— "جو قوم دو طاقتور ال کی فوج' ایئر فورس اور نیوی کو ناکوں چنے چبوا رہی ہے اور فتح صاف نظر آنے لگی ہے' اس قوم کا زمین دوز کارروائیاں کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔ ہمارے ساتھ ایسا ایک واقعہ ہو چکا ہے"۔

ڈاکٹر جمشید باتوں کے دوران تین بار عاشق علی کو دیکھنے کے لئے اُس کے کمرے میں گیا تھا اور اس نے مجھے ہر بار آکر بتایا تھا کہ اب عاشق سویا ہوا ہے اور اُس کی نبض بالکل

ٹھیک چل رہی ہے۔ وہ ایک بار پھر گیا اور عاشق کو دیکھ کر آ گیا۔ آمنہ کے متعلق دو چار باتیں ہوئیں اور وہ پھر اسی موضوع پر آ گیا۔ میں نے اسے سنایا کہ ایک ولندیزی اور ایک ہندو عورت ہمیں ایک پھندے میں لے گئی تھیں اور یہ اللہ کا کرم تھا کہ ہم وہاں سے نکل آئے تھے۔ میں نے اسے وہ واقعہ بھی سنایا جب میں سورابایا میں داخل ہونے سے پہلے ایک ولندیزی گھر میں چلا گیا تھا اور ان لوگوں کے دھوکے میں آ گیا تھا۔

"آپ خوش قسمت تھے کہ وہاں سے نکل آئے" ——— ڈاکٹر جمشید نے کہا ——— "اگر آپ اس پھندے سے نکل نہ سکتے اور ان لوگوں کا دھوکہ کامیاب ہو جاتا تو وہ لوگ آپ کو گرفتار کروا کے انگریزوں کے حوالے کر دیتے پھر آپ کا کورٹ مارشل ہوتا اور آپ کو دو تین سال سزائے قید مل جاتی۔ اس سے زیادہ کچھ بھی نہ ہوتا۔ میں تو ایسے ایک پھندے میں پھنس گیا تھا جس میں سے اللہ تعالیٰ مجھے نہ نکالتا تو میں قتل ہو گیا ہوتا۔ وہ میرے قتل کی ہی سازش تھی۔ یہ میرا ایمان ہے اور ہر مسلمان کا بھی ایمان ہونا چاہئے کہ اللہ کی راہ پر چلنے والوں کی رہبری اللہ ہی کیا کرتا ہے"۔

ڈاکٹر جمشید انور نے جب مجھے یہ واقعہ سنایا تو میں کچھ دیر تو اس کے منہ کی طرف ہی دیکھتا رہا۔ مجھے اتنا حیران نہیں ہونا چاہئے تھا۔ ڈاکٹر جمشید نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ایمان پکا ہو تو اللہ مدد کیا کرتا ہے۔ میرا بھی یہی ایمان تھا۔ انڈونیشیا کی جنگِ آزادی میں اس سے بھی زیادہ حیرت ناک واقعات ہوئے ہیں مگر آج پاکستان میں بیٹھ کر جب میں وہ وقت یاد کرتا ہوں تو دکھ ہوتا ہے کہ پاکستان میں وہ ایمان نہیں رہا۔

ڈاکٹر جمشید نے یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ سنایا تھا۔ اسے میں اپنی زبان میں پیش کروں گا.... ڈاکٹر جمشید مجھ سے بہت پہلے انڈونیشیا کی جنگِ آزادی میں شامل ہُوا تھا۔ وہ ڈاکٹر تھا اور کیپٹن بھی تھا اس لئے وہ ایک اہم شخصیت تھا۔ مجھ جیسا کوئی سپاہی یا چھوٹے سے رینک کا آدمی مارا جاتا ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن کسی افسر کے مارے جانے سے اور بھی بہت کچھ مرجاتا ہے۔ جمشید قتل ہو جاتا تو ایک ڈاکٹر مرجاتا اور پھر ایک کیپٹن مرجاتا اور ایسا خلا پیدا ہو جاتا جسے ایک کیپٹن ڈاکٹر ہی پر کر سکتا تھا لیکن وہاں ڈاکٹروں کی کمی تھی۔

ڈاکٹر جمشید کی ایک اہمیت اور افادیت اور بھی تھی۔ وہ مبلغ بھی تھا اور جہاں جاتا وہاں جہاد کی تلقین اور تبلیغ کرتا تھا۔ میرے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اس نے میرا ذہن

اف اور جذبہ تیز کر دیا تھا۔ اسے جاننے والے ہندو اسے زندہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔

ڈاکٹر جمشید آئی این اے میں سے نکل کر انڈونیشیا کے ایک بڑے شہر جوگ جکارتہ ہنچا تھا اور وہاں کے مسلمانوں سے ملا تو انہوں نے اسے اپنے گوریلا ہیڈ کوارٹر میں لے جا کر جنگِ آزادی میں شامل کر لیا تھا۔ انڈونیشی بہت ہی خوش ہوئے کہ انہیں ایک ڈاکٹر ل گیا ہے۔ میں یہ بتانا ضروری نہیں سمجھتا کہ ڈاکٹر جمشید کس جوش اور جذبے سے ڈاکٹر ی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے لگا تھا۔ وہ دو چار مہینے جوگ جکارتہ میں رہا ر پھر اسے ایک اور شہر سوراکارتہ بھیج دیا گیا جو وہاں سے تقریباً نوّے میل دور تھا۔ اں زخمی زیادہ تعداد میں آتے تھے۔

○

اُس وقت سوراکارتہ چھوٹا سا قصبہ ہُوا کرتا تھا۔ آبادی کی اکثریت مسلمانوں کی تھی کن زیادہ تر لوگ قصبے میں موجود نہیں تھے۔ وہ لڑنے کے لئے مختلف جگہوں پر چلے گئے ے۔ قصبے میں اسی قسم کا ایک ہسپتال بنا لیا گیا تھا جیسا سورابایا میں بنایا ہُوا تھا۔ قصبے میں ورتیں تھیں یا بچے یا وہ جواں سال آدمی نظر آتے تھے جو زخمیوں کو لاتے اور ایک دو ن قصبے میں رک کر چلے جاتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہاں کوئی جوان آدمی تھا نہیں۔ کچھ گھرانے ولندیزیوں کے تھے اور کچھ عیسائیوں کے بھی۔ مسلمان جوان بھی ظر آتے تھے لیکن زیادہ دیر نہیں رکتے تھے۔

ڈاکٹر جمشید وہاں پہنچا تو اس نے ہسپتال کی ڈیوٹی سنبھال لی اور زخمیوں میں مصروف گیا۔ تیسرا یا چوتھا دن تھا کہ ایک ہندوستانی اس کے پاس آیا اور کہا کہ یہاں ایک گھر سلمانوں کا ہے جس میں ماں ہے اور ایک جوان سال بیٹی۔ یہ بھی بتایا کہ اس عورت کا وند جنگِ آزادی میں شامل تھا اور تین مہینوں سے اس کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ اس کی ل اولاد یہ بیٹی ہے اور ایک جوان بیٹا ہے جو اپنی گوریلا پارٹی کے ساتھ باہر ہی رہتا ہے۔

"میں اتفاق سے اس گھر کے سامنے سے گزرا" ——— اس ہندوستانی مسلمان نے کہا ——— "عورت دروازے میں کھڑی تھی اور رو رہی تھی۔ میں نے رونے کی وجہ پوچھی تو ں نے بتایا کہ گھر میں کوئی ایک بھی مرد نہیں اور اُس کی بیٹی کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے کہ ب و غریب حرکتیں کرتی ہے"۔

"تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟" ——— ڈاکٹر جمشید نے پوچھا ——— "کیا یہاں اور

کوئی ڈاکٹر نہیں؟"

"آپ کے اس ہسپتال میں اور بھی ڈاکٹر ہیں" ـــ اس ہندوستانی مسلمان نے کہا ـــ "لیکن میں ان کی زبان نہیں جانتا۔ آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ ایک تو آپ ہندوستانی مسلمان ہیں اور دوسری وجہ یہ کہ میں نے آپ کو آئی این اے میں دیکھا تھا۔ میں بھی فوج سے بھاگ کر آئی این اے میں آگیا تھا"۔

"اس انڈونیشی عورت کی زبان تم کس طرح سمجھ گئے تھے؟" ـــ ڈاکٹر جمشید نے پوچھا۔

"میں جس گھر کی بات کر رہا ہوں وہ کوئی اونچا تعلیم یافتہ گھر معلوم ہوتا ہے" ـــ ہندوستانی مسلمان نے جواب دیا ـــ "عورت اتنی سی انگریزی بول سکتی ہے کہ اپنا مطلب واضح کر لیتی ہے۔ میں بھی اتنی سی ہی انگریزی جانتا ہوں"۔

ڈاکٹر جمشید کا انداز انکوائری والا یا شک رفع کرنے والا نہیں تھا۔ وہ ویسے ہی اس ہندوستانی سے کچھ باتیں پوچھ رہا تھا۔ ڈاکٹر تو جوشیلا جوان تھا' وہ جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہُوا تھا۔ وہ انڈونیشیا آیا ہی اس مقصد کے لئے تھا۔ وہ اس آدمی کے ساتھ چل پڑا۔

اس گھر میں ایک ادھیڑ عمر عورت نے ان کا استقبال کیا۔ وہ چہرے کے خدوخال سے انڈونیشی لگتی تھی۔ اُس نے اپنے خاوند کا نام بتایا جو مجھے ڈاکٹر جمشید نے بتایا تھا لیکن یاد نہیں رہا۔ وہ بڑی مغموم اور پریشان تھی۔ ڈاکٹر جمشید نے اس کے ساتھ انگریزی میں بات کی اور عورت نے بھی انگریزی بولی جو گرامر کے لحاظ سے خاصی ناقص تھی لیکن ڈاکٹر جمشید اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے گھر کے کمروں پر نظر دوڑائی' زیب و زیبائش دیکھی اور فرنیچر دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ کسی تعلیم یافتہ اور اونچے درجے کے آدمی کا گھر ہے۔

ڈاکٹر جمشید کو انڈونیشی مسلمانوں کے گھروں میں جانے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ یہ پہلا گھر تھا جس میں وہ داخل ہُوا تھا۔ شاید یہ وجہ تھی کہ وہ وہاں کے گھروں کی اونچ نیچ کو نہیں سمجھتا تھا۔ کچھ بھی نہ سمجھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جمشید مرد مومن تھا اور وہ اپنے کردار کی آنکھ سے سب کچھ دیکھتا تھا اور اس وقت اس کے ذہن پر ایک مریضہ غالب آئی ہوئی تھی جسے دیکھنے کے لئے وہ وہاں گیا تھا۔ اگر اسے بتایا جاتا کہ یہ ایک مقامی عیسائی کا یا کسی ولندیزی کا گھر ہے اور یہاں ایک مریض تڑپ رہا ہے تو بھی ڈاکٹر جمشید کسی

خطرے کی اور کسی پابندی کی پرواہ نہ کرتا اور وہاں جا پہنچتا۔

عورت اسے ایک کمرے میں لے گئی۔ اس کمرے کا فرنیچر وغیرہ بھی امیرانہ تھا اور ہر چیز سلیقے اور قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ ایک پلنگ پر ایک جوان لڑکی لیٹی ہوئی تھی۔ بڑی ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کے خدوخال انڈونیشی ہی تھے لیکن ماں سے ذرا مختلف لگتی تھی۔ عورت نے بتایا کہ یہ اس کی بیٹی ہے اور نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔

لڑکی ڈاکٹر کو دیکھ کر اٹھ بیٹھی اور اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات آ گئے۔ وہ ڈاکٹر سے دُور ہٹنے کے لئے پلنگ پر سرکتی ایک کونے تک چلی گئی۔ اس کی ماں نے اسے پیار کیا' پکارا اور کہا کہ یہ ڈاکٹر ہے اور تمہیں اس ذہنی اذیت سے نجات دلا دے گا۔ وہ اپنی زبان میں بیٹی سے بات کر رہی تھی۔ ڈاکٹر جمشید نہیں سمجھ سکا تھا۔ مجھے یہ بات سناتے ہوئے اس نے کہا کہ ماں اپنی بیٹی کو یہی کہتی ہو گی کیونکہ اس کی حرکتیں ایسی ہی تھیں۔

ہندوستانی جس نے اپنا نام عبدالخالق بتایا تھا' ڈاکٹر کے ساتھ تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو بتایا کہ یہ لڑکی بھی کچھ کچھ انگریزی بول لیتی ہے اور سمجھتی بھی ہے۔ اس وقت ڈاکٹر جمشید کو خیال آیا کہ عبدالخالق کا اس گھر کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اس نے عبدالخالق سے پوچھا تو عبدالخالق نے اسے بتایا کہ وہ جب انڈین نیشنل آرمی سے بھاگ کر یہاں آیا تھا تو اسی گھرانے نے اسے پناہ دی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس گھر میں چونکہ کوئی مرد نہیں رہا اور یہ ماں بیٹی اکیلی ہیں اس لئے وہ ان کی دیکھ بھال کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً آتا رہتا ہے۔

مجھے اگر اس ڈاکٹر کا صرف یہ واقعہ ہی سنانا ہوتا تو میں ذرا ذرا سی تفصیلات بھی سناتا۔ کہانی خاصی طویل ہے لیکن میں ذرا اختصار سے کام لوں گا۔ واقعہ پورا سناؤں گا اور اس میں کوئی تشنگی نہیں رہنے دوں گا۔

ڈاکٹر جمشید نے جان لیا کہ لڑکی کو کوئی جسمانی بیماری لاحق نہیں اور اگر کچھ ہے تو وہ اس کے ذہن میں ہے اور یہ صدمے کا اثر ہے۔ ڈاکٹر جمشید کو ایک شک یہ بھی تھا کہ لڑکی کے ساتھ کسی نے زبردستی دست درازی اور زیادتی کی ہو گی۔ اس وقت انڈونیشیا میں کوئی قانون نہیں چلتا تھا۔ پولیس شاید ہو گی لیکن وہ مفلوج اور بے کار تھی۔

ایک صدمے کے متعلق تو اسے بتایا ہی گیا تھا کہ لڑکی کا باپ جنگِ آزادی میں شامل

ہُوا اور پھر اس کا پتہ ہی نہ چلا۔ ایک جوان بھائی تھا' وہ بھی کچھ عرصے سے گھر نہیں آیا تھا۔ بہرحال ڈاکٹر جمشید سمجھ گیا کہ لڑکی کے ذہن میں صدمے کا بے پناہ اثر موجود ہے اور یہ اثر اسے پاگل پن تک بھی پہنچا سکتا ہے۔

ڈاکٹر جمشید اٹھا اور لڑکی کے پاس جا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور انگریزی میں اسے کہا کہ وہ اس کا ہمدرد ہے اور اس کے باپ اور بھائی کو ڈھونڈ کر لے آئے گا لیکن ابھی وہ اسے یعنی لڑکی کو ذہنی سکون دینے آیا ہے اور یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی بات ہے تو وہ بتا دے اور ڈرے نہیں اور تعاون کرے۔

لڑکی کا جسم ساکن ہو گیا اور وہ آنکھیں پھاڑے ڈاکٹر کے منہ کی طرف دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر پلنگ پر بیٹھ گیا تھا اور لڑکی اس سے ذرا دُور سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر نے ہاتھ اس کی طرف لمبا کیا تو وہ آہستہ آہستہ سرکتی ڈاکٹر کے قریب ہو گئی۔ ڈاکٹر نے اسے مزید تسلی تشفی دی اور بڑے پیارے انداز میں باتیں کیں۔ لڑکی نے ڈاکٹر کا ایک بازو پکڑ کر اپنی پیٹھ کے پیچھے کر لیا اور ڈاکٹر کے ساتھ اس طرح لگ گئی جیسے ڈرا ہُوا بچہ اپنی ماں کی آغوش میں پناہ لیا کرتا ہے۔

ڈاکٹر جمشید پکّا مومن تھا۔ وہ مومن تو پکّا تھا لیکن عمر ابھی کچّی تھی۔ اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال ہی تھی۔ لڑکی کی عمر تیئیس چوبیس یا زیادہ سے زیادہ پچیس سال تھی۔ ڈاکٹر جمشید نے مجھے بتایا کہ لڑکی جب اس کے بازو کے گھیرے میں آ کر اس کے جسم کے ساتھ لگی تو اس کے گال لڑکی کے سر کے ساتھ مَس کرنے لگے۔ لڑکی کے کھلے ہوئے بال ریشم جیسے ملائم تھے۔ ڈاکٹر جمشید نے اپنے جذبات میں کچھ عجیب سی ہلچل محسوس کی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی نیّت بد ہو گئی تھی بلکہ مطلب صرف اتنا تھا کہ اسے اپنائیت کا احساس ہونے لگا اور یہ احساس بھی کہ اس لڑکی کے ساتھ اس کا کوئی اور تعلق بھی ہے یا ہو سکتا ہے۔ لڑکی کی ماں اس طرف کھڑی تھی جس طرف اس کی بیٹی کی پیٹھ تھی۔ وہ ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور سر سے ہلکا سا اشارہ کر کے باہر نکل گئی۔ اشارے کے مطلب یہ تھا کہ تم جو کچھ بھی کر رہے ہو یہ ٹھیک ہے اور اسے یعنی ماں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ عبدالخالق بھی باہر نکل گیا۔ ان کے جانے کے بعد لڑکی کا خوف کچھ کم ہونے لگا۔ کسی وقت لڑکی کا جسم اچانک لرز جاتا تھا جیسے جھٹکا لگا ہو۔

یہاں میں اپنی تھوڑی سی رائے دینا چاہوں گا۔ وہ اس لئے کہ بعض لوگ یہ واقعہ

پڑھ کر کہیں گے کہ یہ ڈاکٹر اچھا مومن تھا کہ ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر پگھل گیا۔ ڈاکٹر جمشید کے اس وقت کے تاثرات کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے کچھ عرصہ ان حالات میں گزرا ہو جن حالات میں اس ڈاکٹر نے عمر کے چار سال گزار دیئے تھے۔ یہ کیفیت مجھ پر بھی طاری ہو چکی تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ برما کے جنگلوں میں ایسی ہی ایک خوبصورت لڑکی نے مجھے بھی اس آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ ذرا تصوّر میں لائیں کہ آپ تین چار برس جنگل میں جانوروں کی طرح بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ جانوروں کی طرح خوراک اور پناہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ پھر آپ کو ایک ایسی جنگ میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں صرف گولیاں چلتی ہیں اور موت کے قہقہے سنائی دیتے ہیں۔ آپ کے اعصاب پر مسلسل بوجھ بھی پڑ رہا ہے اور کھچاؤ ایسا جو بعض اوقات ناقابلِ برداشت ہو کر دماغی توازن بگاڑ دیتا ہے۔ ایسے حالات میں ایک جوان لڑکی آپ کے اتنے قریب آ بیٹھتی ہے کہ آپ اس کے جسم کی تپش اور بُو بھی محسوس کر سکتے ہیں تو اس وقت آپ کو اپنا گھر یاد آئے گا' ماں بھی' بہن بھی اور کوئی بیٹی ہے تو وہ بھی اور اگر کوئی بیوی ہے تو وہ اور ہی زیادہ یاد آئے گی۔ آپ کو اس خوبصورت لڑکی کے وجود میں سب کچھ نظر آنے لگے گا.... ماں بھی' بہن بھی' بیٹی اور بیوی بھی.... میں ان تاثرات کو اچھی طرح اور پورے وثوق کے ساتھ اس لئے بیان کر سکتا ہوں کہ میں اس پُل صراط سے گزرا ہوں۔

ڈاکٹر جمشید کی نیّت بد نہیں ہُوئی تھی نہ اس میں حیوانی جذبات بیدار ہوئے تھے لیکن یہ خواہش یقیناً" بیدار ہوئی تھی کہ یہ خوبصورت اور ملائم جسم والی لڑکی کچھ دیر اور اس کے لگی بیٹھی رہے اور وہ اس کے ساتھ پیار اور ہمدردی کی باتیں کرتا رہے۔ ذہن میں یہ حقیقت رکھیں کہ ڈاکٹر جمشید انسان بھی تھا اور جوان بھی۔ اس نے لڑکی کو اپنے بازو کی گرفت میں اور زیادہ لے لیا اور اس کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ لڑکی کا انداز ایسا ہو گیا جیسے اس نے اپنا سراپا اور اپنا وجود جمشید کے حوالے کر دیا ہو۔

لڑکی کی انگریزی بہت ہی ناقص تھی اور وہ کچھ باتیں اشاروں سے واضح کرتی تھی لیکن ڈاکٹر جمشید اس کا عارضہ سمجھ گیا تھا۔ لڑکی اسے کہہ رہی تھی کہ وہ ہر وقت اس کے پاس رہے لیکن ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ یہ اس کے لئے ممکن نہیں' وہ اس کے پاس آتا رہے گا۔ پھر ڈاکٹر جمشید نے اسے کہا کہ وہ اسے ایک دوائی دے گا جس سے نیند آ جائے گی اور جس ذہنی بے چینی یا صدمے میں مبتلا ہے' اس میں خاصا افاقہ ہو گا۔

ڈاکٹر جمشید کو یہاں آتے ہی ایک بیگ دے دیا گیا تھا جس میں ایمرجنسی کی تمام ضروری دوائیاں ڈالی گئی تھیں۔ اُس نے ایک گولی بیگ میں سے نکال کر لڑکی کو دی اور کہا کہ یہ ابھی پانی کے ساتھ لے لے۔ لڑکی نے گولی تکیئے کے نیچے رکھ دی اور کہا کہ گولی ڈاکٹر کے جانے کے بعد لے گی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ وہ گولی ابھی لے لے لیکن لڑکی نے کہا کہ جب تک وہ اس کے پاس موجود ہے' وہ گولی نہیں لے گی کیونکہ اس کی موجودگی میں وہ بیدار رہنا چاہتی ہے۔ ڈاکٹر اس کی باتوں میں آگیا اور کچھ دیر اور اس کے پاس بیٹھا رہا۔ اس نے دیکھا کہ لڑکی اس طرح اس کے اور ہی زیادہ قریب ہونے کی کوشش کر رہی تھی جیسے اس کے جسم میں سما جانا چاہتی ہو۔

آخر ڈاکٹر اٹھا اور لڑکی کے ساتھ پھر آنے کا وعدہ کر کے کمرے سے نکل آیا۔ اس نے لڑکی کی ماں کو بتایا کہ وہ ایک گولی دے چلا ہے جو لڑکی کو ابھی پانی کے ساتھ دے دینی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ تھوڑی ہی دیر بعد گہری نیند سو جائے گی اور جب جاگے گی تو اس کی حالت بہتر ہو جائے گی۔ اس نے ماں کو یہ بھی بتایا کہ یہ صدمے کا اثر ہے اور گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔

ماں نے پریشانی کے عالم میں بتایا کہ اس لڑکی کا علاج نہ ہُوا تو یہ ٹھیک ہے کہ یہ پاگل ہو جائے گی۔ اس نے بتایا کہ رات گہری نیند سے جاگ اٹھتی ہے اور بڑی زور کی چیخ مارتی ہے جس سے ماں کا دل دہل جاتا ہے۔ اچانک بیٹھے بیٹھے بلند آواز سے بولنا شروع کر دیتی ہے اور اس طرح ہر طرف' اوپر نیچے دیکھتی ہے جیسے اسے کوئی غیر مرئی چیز نظر آ رہی ہو۔

ڈاکٹر جمشید نے مجھے بتایا کہ اس کی تشخیص کے مطابق یہ اعصاب زدگی کا کیس تھا اور اعصاب زدگی کا باعث صدمہ تھا۔ اگر اس لڑکی کے بارے میں ڈاکٹر جمشید کی نیت شیطانی ہوتی تو وہ مجھے یہ بات اس طرح سناتا جیسے وہ اس لڑکی کے حسن اور جوانی سے ذرا بھی متاثر نہیں ہُوا اور ایک مومن کی طرح اس کا علاج شروع کیا تھا لیکن ڈاکٹر جمشید نے بڑی ہی صاف گوئی اور صداقت سے مجھے یہ واقعہ سنایا اور لڑکی کی قربت نے اس کے جذبات میں جو ہلچل مچائی تھی وہ مکمل طور پر سنائی اور پھر اس نے کہا کہ اس کی نیت بری نہیں تھی البتہ لڑکی اس کے ذہن پر سوار ہو گئی تھی۔

○

ڈاکٹر جمشید اپنے ہیڈ کوارٹر میں واپس آیا تو وہاں بتایا کہ ایک لڑکی کو دیکھنے گیا تھا اور وہ اعصاب زدگی کا کیس ہے جسے وہ پھر بھی دیکھنے جائے گا۔ کسی نے اس سے نہ پوچھا کہ وہ لڑکی کون ہے' کس کی بیٹی ہے اور کہاں رہتی ہے۔ ان لوگوں کے لئے یہی کافی تھا کہ ڈاکٹر جمشید نے انہیں بتایا کہ وہ مسلمان ہیں اور لڑکی کا باپ لاپتہ ہے اور بھائی بھی کچھ عرصے سے گھر نہیں آیا۔ دراصل بات یہ تھی کہ اس گوریلا ہیڈ کوارٹر میں کسی کو اِدھر اُدھر کی ہوش نہیں تھی۔ وہاں اوپر سے آپریشن آرڈر آتے رہتے تھے' یہاں مشن کے لئے پارٹیاں بنتی رہتی تھیں اور اِدھر اُدھر گوریلا کارروائیوں اور ان کے نتائج کی رپورٹیں آتی رہتی تھیں۔ زخمی آتے تھے تو دو تین ڈاکٹر جو وہاں موجود تھے' زخمیوں کی مرہم پٹی میں مصروف ہو جاتے تھے۔ اس صورتِ حال میں ڈاکٹر جمشید کی کسی نے پوری بات بھی نہ سنی۔

شام کے وقت ڈاکٹر جمشید پھر اس لڑکی کو دیکھنے چلا گیا۔ لڑکی کی ماں اسے لڑکی کے کمرے میں لے گئی۔ اس وقت لڑکی صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی اور اُس کے چہرے پر تازگی بلکہ کچھ بشاشت تھی۔

ڈاکٹر جمشید نے اُس سے پوچھا کہ نیند آئی تھی؟.... پہلے ماں بولی' نیند تو بڑی ہی گہری آئی تھی اور یہ کچھ ہی دیر پہلے جاگی ہے۔ لڑکی نے مسکرا کر سر ہلایا جو اشارہ تھا کہ ماں ٹھیک کہتی ہے۔ ڈاکٹر جمشید نے لڑکی سے پوچھا کہ وہ اب کتنا کچھ افاقہ محسوس کر رہی ہے۔

ڈاکٹر ابھی بیٹھا نہیں تھا' صوفے پر بیٹھی لڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس نے اُس کی ماں کے ساتھ کوئی بات کرنا چاہی تو اُدھر دیکھا لیکن ماں وہاں نہیں تھی۔ وہ کمرے سے نکل گئی تھی۔ لڑکی اٹھی اور اپنے دونوں بازو ڈاکٹر جمشید کے گلے میں ڈال کر اس کے ساتھ جیسے چپک گئی ہو۔ ڈاکٹر جمشید نے ذرا سی بھی مزاحمت نہ کی بلکہ اس کا بھی ایک بازو لڑکی کے گرد لپٹ گیا۔

اپنے جذبات کا اس طرح والہانہ اظہار کر کے لڑکی نے ڈاکٹر جمشید کو بتایا کہ وہ خاصی بہتر محسوس کر رہی ہے لیکن ابھی کچھ بے چینی سی ذہن میں موجود ہے اور دل پر خوف سا بھی طاری ہو جاتا ہے لیکن اس کی شدت میں کمی آگئی ہے۔

کچھ دیر بعد لڑکی کی ماں چائے لے کر آگئی اور ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ چائے کے

دوران لڑکی کی ذہنی کیفیت اور علاج کی ہی باتیں ہوتی رہیں اور اس دوران ڈاکٹر جمشید نے دیکھا کہ لڑکی اسے جذباتی سی نظروں سے دیکھ رہی ہے اور ڈاکٹر نے بھی چند مرتبہ بے اختیار ہو کر لڑکی کو دیکھا اور دونوں کے ہونٹوں پر تبسّم آ گیا۔

ماں چائے کے برتن اٹھا کر چلی گئی تو لڑکی نے ڈاکٹر جمشید سے کہا کہ اس کی گولی کا تو صرف یہ اثر ہُوا ہے کہ وہ سو گئی تھی اور اس سے اسے کچھ جسمانی سکون آ گیا ہے جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کئی دنوں اور راتوں سے جاگتی ہی چلی آ رہی تھی اور وہ سو جاتی تھی تو بھی اس پر بیداری کا احساس طاری رہتا تھا لیکن اسے ولی سکون ڈاکٹر جمشید کی ذات سے اور باتوں سے ملا ہے۔ لڑکی نے جذباتی الفاظ میں بے ساختہ اظہار محبت کر دیا۔ تب ڈاکٹر جمشید نے اسے بتایا کہ اس کے بارے میں اس کے اپنے جذبات بھی ایسے ہی ہیں لیکن ان جذبات میں وہ بدی کو کسی قیمت پر نہیں لائے گا۔

لڑکی کے پاس انگریزی کے اتنے زیادہ الفاظ نہیں تھے کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار پوری طرح کر سکتی لیکن اس نے پوری کوشش کی کہ دل کھول کر اس ڈاکٹر کے آگے رکھ دے۔ اسے جہاں الفاظ نہ ملے‘ اس نے ڈاکٹر جمشید کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چُوم لیا یا ایسے ہی کوئی اور جذباتی حرکت کر کے اپنے جذبات اور احساسات ڈاکٹر کے آگے کھول کر رکھ دیئے۔ ایک بار تو اس نے ڈاکٹر کا بازو پکڑا اور اسے اپنی طرف گھسیٹ کر اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا۔ ڈاکٹر جمشید کو یہ ڈر تھا کہ اس کی ماں آ جائے گی لیکن لڑکی پوری طرح بے باک تھی جیسے اُسے یقین تھا کہ ماں نہیں آئے گی۔

ڈاکٹر جمشید نے مجھے بتایا کہ یہ لڑکی اُس کے دل پر قابض ہوتی جا رہی تھی لیکن وہ اسے بھی علاج کا ایک حصہ سمجھ رہا تھا.... ڈاکٹر جمشید بات سناتے ہوئے یہ کوشش بھی کر رہا تھا کہ میں اس پر کوئی شک نہ کروں۔ میں نے اس پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں نے اس پر کوئی شک کیا ہے۔ میں حقیقت کو سمجھنے والا آدمی تھا اور اسے فرشتہ نہیں سمجھتا تھا۔

ڈاکٹر نے محسوس ہی نہ کیا کہ اسے وہاں بیٹھے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا ہے اور اسے واپس جانا چاہیے۔ وہ تو جیسے بھول ہی گیا تھا کہ وہ کسی اور کے لئے بھی ڈاکٹر ہے اور ہو سکتا ہے کچھ اور زخمی کہیں سے آئے ہوں۔ اسے اطمینان تھا کہ وہاں دو اور ڈاکٹر موجود تھے.... جب اسے خیال آیا کہ اب چلنا چاہیے‘ عبدالخالق آ گیا۔ ڈاکٹر جمشید نے اسے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا کہ لو بھائی‘ تمہاری مریضہ کو میں نے ٹھیک کر دیا ہے لیکن

پوری طرح صحت یاب ہونے میں کچھ دن اور لگیں گے۔

”نہیں ڈاکٹر صاحب!“ ——— عبدالخالق نے کہا ——— ”یہ مریضہ میری نہیں‘ آپ کی ہے۔ میں تو اس ماں بیٹی کو جانتا تک نہ تھا۔ اس کی ماں کو باہر دروازے میں کھڑے روتا نہ دیکھتا تو آپ بھی اس گھر میں نہ آتے اور پھر آپ جانتے ہیں کہ اس لڑکی کا انجام کیا ہوتا۔ میں یہ دیکھ کر آپ کے پاس گیا تھا کہ یہ جوان اور خوبصورت لڑکی ہے۔ اگر ذہنی خرابی میں یہ باہر نکل گئی تو پھر آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا کیا حشر ہونا تھا۔ یہاں قانون تو کوئی ہے ہی نہیں۔ جسے موقع ملتا ہے وہ من مانی کر جاتا ہے۔ یہ انڈونیشی مسلمان اپنی جنگِ آزادی میں مصروف ہیں۔“

”نہیں بھائی!“ ——— ڈاکٹر جمشید نے کہا ——— ”یہ جنگِ آزادی صرف ان کی نہیں بلکہ ہم دونوں کی بھی ہے اور دنیا کے ہر مسلمان کی ہے۔ ہمیں اس خطے میں اسلام کو آزاد رکھنا ہے۔ یہاں سے ہم اسلام کو اور آگے لے جائیں گے“۔

”میں آپ کا ہم خیال ہوں ڈاکٹر صاحب!“ ——— عبدالخالق نے کہا ——— ”ہم تو گمراہ ہو کر انڈین نیشنل آرمی میں جا شامل ہوئے تھے۔ میں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس اسلامی جنگِ آزادی میں شرکت کا موقع مل گیا۔ یہ تو میں آپ کو بتا ہی نہیں رہا کہ میں اس وقت تک ان گوریلا مجاہدین کے ساتھ کیسے کیسے خطرناک مشن کر چکا ہوں“۔

کچھ دیر اور باتیں ہوئیں اور عبدالخالق اجازت لے کر چلا گیا۔ جس وقت عبدالخالق اُس کمرے میں موجود تھا اس وقت لڑکی کی ماں بھی آ گئی تھی لیکن عبدالخالق وہاں سے نکلا تو ماں بھی اُس کے ساتھ ہی نکل گئی۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر جمشید نے نیند کی ایک اور گولی لڑکی کو دے کر کہا کہ کھانے کے بعد پانی سے لے لے۔ ساتھ ہی اسے وٹامن کی گولیاں بھی دیں۔ یہ اعصابی طاقت کے لئے تھیں۔ وہ جانے کے لئے اُٹھا تو لڑکی ایک بار پھر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور اسے کہا کہ وہ صبح ہوتے ہی اس کے پاس آ جائے۔ ڈاکٹر وعدہ کر کے چلا گیا۔

○

اگلی صبح طلوع ہوئی تو ڈاکٹر جمشید نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور پھر ہسپتال میں اُن زخمیوں کو دیکھا جو اس کی ذمہ داری میں تھے اور پھر ایک دو کی پٹیاں بدل کر فارغ ہُوا تو اپنے ساتھی ڈاکٹروں کو یہ بتا کر کہ وہ اپنی مریضہ کو دیکھ کر واپس آتا ہے‘ چلا گیا۔ ابھی وہ

باہر نکلا ہی تھا کہ ایک ڈاکٹر دوڑتا ہوا باہر آیا اور اسے آواز دے کر کہا کہ وہ جلدی واپس آ جائے کیونکہ کچھ دیر پہلے اطلاع آئی تھی کہ چند ایک زخمی لائے جا رہے ہیں۔

لڑکی کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ ڈاکٹر جمشید بہت ہی تیز تیز چلتا لڑکی کے گھر پہنچا۔ اسے اپنا منتظر پایا۔ سب سے پہلے اس کی ذہنی حالت پوچھی۔ وہ تو اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ چہرے پر وہی تازگی تھی جو اس نے گزشتہ شام دیکھی تھی۔ ماں حسب معمول کمرے سے نکل گئی اور لڑکی نے محبت کی دیوانگی کا اظہار اپنے ہاتھوں اور ہونٹوں سے شروع کر دیا۔ ڈاکٹر جمشید نے اسے بتایا کہ وہ زیادہ دیر رک نہیں سکے گا کیونکہ کچھ زخمی آ رہے ہیں۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ دن کے وقت اسے نیند کی گولی نہیں دی جائے گی اور لڑکی دوسری گولیاں لیتی رہے جو اعصابی طاقت کے لئے تھیں۔ بس اتنی سی بات کہہ کر ڈاکٹر جمشید وہاں سے آ گیا۔ وہ اپنے فرائض میں کوتاہی کرنے والا آدمی نہیں تھا۔

اُس کا وہ دن بہت ہی مصروف گزرا۔ چار زخمی آئے تھے جن میں سے ایک کی حالت بہت ہی بُری تھی۔ بڑی کوشش کے باوجود اسے بچایا نہ جا سکا اور وہ مرہم پٹی کے دوران ہی شہید ہو گیا۔ دوسرے زخمیوں کے زخم بھی گولیوں کے تھے لیکن گولیاں ٹانگوں اور بازوؤں میں لگی تھیں اس لئے ان کی جانیں بچائی جا سکتی تھیں جو انہوں نے بچا لیں۔ البتہ ایک زخمی کا ایک بازو کندھے سے کاٹنا پڑا کیونکہ مشین گن کا پورا برسٹ کلائی سے کندھے تک ہڈیاں ٹکڑے ٹکڑے کر گیا تھا۔

شام تک ڈاکٹر جمشید نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر لڑکی کے گھر جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ اس نے ایک بار پھر زخمیوں کو دیکھا اور ساتھی ڈاکٹروں کو بتا کر وہاں سے نکل گیا۔

اُس نے اس شام بھی لڑکی کو بے تابی کی حالت میں دیکھا اور وہ اُٹھ کر ڈاکٹر کے گلے لگ گئی۔ لڑکی کی ماں نے آ کر کہا کہ آج وہ کھانا یہیں کھائے گا۔ ماں اتنی سی بات کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ جمشید نے لڑکی سے کہا کہ وہ کھانے کے لئے نہیں رکے گا کیونکہ سب ڈاکٹر اکٹھے کھانا کھایا کرتے ہیں اور اس نے اپنے ساتھیوں کو نہیں بتایا تھا کہ وہ کھانے پر نہیں پہنچ سکے گا۔ لڑکی نے اصرار کیا لیکن ڈاکٹر جمشید نے اسے منوا لیا کہ وہ نہیں رک سکے گا۔

وہ اس خیال سے اٹھا کہ باورچی خانے میں جا کر لڑکی کی ماں سے کہہ دے کہ وہ اس کے لئے کھانے کا تردد نہ کرے.... یہ مکان اندر سے خاصا بڑا تھا اور صحن تو کچھ زیادہ ہی

وسیع تھا۔ ایک طرف کیارے تھے جن میں پودے اور چھوٹے چھوٹے درخت اُگے ہوئے تھے۔ جمشید جب بھی یہاں آیا' اس نے ان کیاروں کی طرف دیکھا ہی نہیں تھا۔ اب وہ صحن میں نکلا تو صحن کا بلب جل رہا تھا۔ وہ باورچی خانے میں جا رہا تھا جو سامنے تھا۔

جمشید کی نظر کیاروں کی طرف گئی تو اُسے تازہ کھدی ہوئی مٹی کا ڈھیر نظر آیا۔ اُس نے اس مٹی کو کوئی اہمیت نہ دی۔ کیاروں کے ساتھ ہی مکان کی اونچی دیوار تھی۔ باورچی خانہ ان کیاروں کے قریب ہی تھا۔ جمشید باورچی خانے میں گیا اور لڑکی کی ماں سے کہا کہ وہ کھانے کے لئے نہیں رک سکے گا۔ اس نے وہی وجہ بتائی جو لڑکی کو بتائی تھی۔ وہ باورچی خانے سے نکلا تو ماں بھی اس کے ساتھ ہی نکل آئی۔ ڈاکٹر جمشید نے دیکھا کہ مٹی کے ڈھیر کے ساتھ کیارہ کھُدا ہوا تھا اور اس کی گہرائی کم و بیش تین فٹ تھی اور لمبائی چھ فٹ کے لگ بھگ تھی۔

ڈاکٹر جمشید نے لڑکی کی ماں سے ویسے ہی پوچھا کہ یہ جگہ یہاں سے کیوں کھُدوائی گئی ہے؟.... ماں نے بڑے شگفتہ لہجے میں بتایا کہ اس کی بیٹی کو پودوں اور پھول دار درختوں کے ساتھ بڑی ہی دلچسپی ہے اور یہاں تین درخت لگانے ہیں اور یہ لڑکی کو خوش رکھنے کا اہتمام ہے۔ اس نے بتایا کہ دن کو دو مزدور بلائے تھے اور یہ گڑھا کھُدوایا ہے اور کل یہی مزدور درخت لے آئیں گے اور اس میں لگا کر مٹی بھر دیں گے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اسے بتایا گیا تھا کہ درخت ابھی چند فٹ ہی اونچے ہیں لیکن انہیں گہرائی میں لگانا ہے۔

ڈاکٹر جمشید نے ادھر کوئی توجہ نہ دی' اس نے ماں بیٹی کے ذوق کی تعریف کی اور واپس لڑکی کے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ لڑکی اُس شام سوائے محبت اور پیار کے کوئی بات کرتی ہی نہیں تھی۔ اُس نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اسے ذہنی اذیت سے نجات دلا دی ہے۔

ایسی ہی جذباتی کیفیت ڈاکٹر پر بھی طاری ہونے لگی۔ لڑکی نے اسے کہا کہ وہ بے فکر رہے' اس کی ماں اچانک کمرے میں نہیں آئے گی۔ لڑکی نے یہ بھی کہا کہ اس نے اپنی ماں کو بتا دیا ہے کہ وہ ڈاکٹر کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے اور اس کی صحت یابی کی وجہ یہی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ماں نے اس کے ان جذبات کو اور اس محبت کو قبول کر لیا

ہے اور کہا ہے کہ وہ ڈاکٹر کے ساتھ کسی وقت بات کرے گی اور اسے شادی کے لئے رضامند کرلے گی۔

میرا خیال تو یہ تھا کہ ڈاکٹر سادہ آدمی تھا۔ اس کی اپنی فطرت میں کوئی ہیر پھیر نہیں تھا اس لئے ہر کسی کو اپنے جیسا مخلص سمجھتا تھا۔ یہاں اس کے لئے ایک مجبوری یہ بھی پیدا ہوگئی کہ اتنی خوبصورت لڑکی نے اس کی فطرت میں ایک تشنگی پیدا کردی تھی جو انسان کی فطرت کی ایک کمزوری ہوتی ہے۔

اب آپ اُس منظر کو تصوّر میں لائیں جو میں بیان کرنے لگا ہوں۔ ڈاکٹر نے تو ذرا ذرا سی بات اور حرکت مجھے سنائی تھی اور ایسے لگ رہا تھا جیسے ڈاکٹر کسی انگریزی فلم کا سین سنا رہا ہو۔

یہ منظر یوں بنا کہ لڑکی صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ قریب ہی ایک لمبوترا سا سٹول تھا جس پر بڑی خوبصورت گدی سلی ہوئی تھی۔ لڑکی نے یہ سٹول گھسیٹ کر اپنے سامنے رکھ لیا اور ڈاکٹر کا بازو پکڑ کر کھینچا اور اسے اس سٹول پر بٹھا دیا۔ سٹول لڑکی کے اتنا قریب تھا کہ دونوں کی ٹانگیں ایک دوسرے میں الجھ گئی تھیں۔

اس شام تو لڑکی نے بہت ہی زیادہ جذباتی ہو کر محبت کا اظہار کیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ ڈاکٹر کی گردن میں دائیں بائیں رکھے اور اسے آگے کو کرکے اپنا منہ اس کے منہ کے قریب کرلیا۔ ایک دو منٹ بعد ڈاکٹر ذرا پیچھے ہوگیا اور اس نے اپنا منہ ذرا اوپر کیا۔

کمرے کا دروازہ ڈاکٹر کی پیٹھ کے پیچھے تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے سنایا کہ ویسے ہی اس کی نظر صوفے کے دائیں طرف کمرے میں ایک کونے میں گئی۔ وہاں قدِ آدم آئینے والا ڈریسنگ ٹیبل رکھا تھا۔ سامنے انگیٹھی یعنی ایک بڑی خوبصورت سیزی فریم میں لگی ہوئی رکھی تھی۔ یہ دو فٹ سے ذرا زیادہ لمبی اور فٹ ڈیڑھ فٹ چوڑی تھی۔ فریم میں شیشہ لگا ہوا تھا۔ کمرے کی بتی چھت سے لٹک رہی تھی۔

آپ ذرا تصوّر میں لانے کی کوشش کریں۔ ڈریسنگ ٹیبل کا آئینہ ایسے زاویے پر رکھا تھا کہ دروازے میں سے داخل ہونے والا کوئی بھی شخص اس میں سے نظر نہیں آتا تھا لیکن سیزی کے شیشے میں صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ دروازہ ہے اور اس کے آگے صحن ہے۔ وہ جو عکس سیزی کے شیشے میں آتا تھا وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں سے ہو کر آرہا

تھا۔ سیزی کے شیشے میں دروازے کا براہِ راست عکس نہیں آسکتا تھا کیونکہ اس کا زاویہ کچھ اور تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے آئینے اور شیشے اور دروازے کے نشان بنا کر اور لکیریں ڈال کر سمجھایا تھا کہ یہ عکس کدھر سے کدھر آتا تھا۔

لڑکی پر اُس شام محبت کی کچھ زیادہ ہی دیوانگی طاری ہوگئی تھی۔ وہ بار بار ڈاکٹر کے کندھوں پر یا گردن پر ہاتھ رکھ کر اس کا منہ اپنے منہ کی طرف کرتی تھی اور ڈاکٹر کی پوزیشن ایسی ہو جاتی تھی جیسے رکوع میں ہوتی ہے۔ ایک بار پھر لڑکی نے یہی حرکت کی تو ڈاکٹر کو جمائی آگئی۔ اس نے اپنے آپ کو سیدھا کیا اور جمائی لینے کے لئے منہ ذرا اوپر کیا تو اس کی نظر سیزی والے شیشے میں چلی گئی۔ اسے پیٹھ پیچھے کھلا دروازہ نظر آیا لیکن دروازہ خالی نہیں تھا۔ اس نے صاف طور پر دیکھا کہ دروازے میں عبدالخالق کھڑا تھا اور اس کے پیچھے ساتھ ہی لگا ایک اور ہندوستانی کھڑا تھا۔ اسے یہ بھی نظر آگیا کہ دونوں کے ہاتھوں میں ننگے خنجر تھے۔

وہ عام قسم کے سیدھے خنجر نہیں تھے بلکہ وہ انڈونیشیا کے خاص قسم کے خنجر تھے جن کے بلیڈ یعنی پھل دستے کے قریب چوڑے تھے اور آخر میں آکر نوکیلے ہو جاتے تھے اور اس بلیڈ کی شکل رینگتے ہوئے سانپ جیسی تھی۔ یہ خنجر کسی کے جسم میں داخل کرکے جب کھینچا جاتا تھا تو وہاں سے گوشت باہر آجاتا تھا اور زخم ایسا ہوتا تھا جس کی مرہم پٹی بھی دشوار ہو جاتی تھی۔ یہ انڈونیشیا کا بڑا ہی خطرناک خنجر تھا۔

میں حیران ہوں کہ ڈاکٹر جمشید نے اپنے ہوش و حواس کس طرح ٹھکانے رکھے۔ کوئی اور ہوتا تو وہ فوراً" پیچھے دیکھتا لیکن ڈاکٹر نے ذرا سی بھی حرکت نہ کی اور ظاہر یہ کیا کہ اسے کچھ بھی معلوم نہیں کہ اس کے عقب میں کیا ہے۔ دماغ حاضر اور ٹھنڈا رکھنے کا نتیجہ تھا کہ وہ سمجھ گیا کہ یہ جو دو ہندوستانی آئے ہیں' ان کے انداز سے ان کا ارادہ بے حد خطرناک ہے۔

خالق کی نیّت ٹھیک ہوتی تو وہ دروازے میں داخل ہوتے ہی السلام علیکم کہتا لیکن وہ دبے پاؤں آیا اور پھر ہاتھ میں کھلا خنجر اس کی نیّت کا اظہار کرتا تھا۔ ڈاکٹر لڑکی کے ساتھ باتیں کرتا رہا لیکن نظر سیزی کے فریم کے شیشے میں رکھی۔

خالق دبے پاؤں آگے آتا رہا اور اس کا ساتھی اس کے پیچھے اور ذرا دائیں اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ لڑکی نے ڈاکٹر کو ایک بار پھر گردن سے پکڑا اور اپنی طرف

جھکانے لگی۔ ڈاکٹر فوراً" سمجھ گیا کہ اب خنجر اس کی پیٹھ میں اُترے گا۔

ڈاکٹر نے آگے جھکنے میں ذرا مزاحمت کی اور اُس کے ساتھ ہی اپنے دونوں ہاتھ لڑکی کی گردن کے دائیں بائیں بڑے پیار سے رکھ لئے اور نظریں شیشے پر رکھیں۔ خالق کا خنجر اوپر کو اٹھا اور جونہی خنجر نیچے آیا ڈاکٹر نے لڑکی کو گردن سے پکڑے ہوئے اپنی طرف کھینچا اور خود اپنے آپ کو سٹول سے بائیں طرف گرا دیا۔ خنجر ڈاکٹر کی پیٹھ میں اُترنے کی بجائے لڑکی کی پیٹھ میں اُس مقام میں اُتر گیا جو شولڈر بلیڈوں کے درمیان ہوتی ہے۔

ڈاکٹر سپرنگ کی طرح اچھل کر اٹھا۔ عبدالخالق تو سُن ہو کے رہ گیا ہو گا کہ اُس نے خنجر ڈاکٹر کو مارا تھا لیکن خنجر لڑکی کی پیٹھ میں اُتر گیا۔ عبدالخالق ابھی جُھکا ہُوا ہی تھا کہ ڈاکٹر نے اس کے بائیں طرف سے اس کے پیٹ میں نیچے سے ایسی کِک ماری کہ خالق کے ہاتھ سے خنجر چھوٹ گیا اور لڑکی کی پیٹھ میں ہی رہ گیا اور خالق مزید جُھک گیا کیونکہ پیٹ میں ایسی کِک شاید گھوڑا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر نے حیران کن پھرتی سے خنجر لڑکی کی پیٹھ سے نکال لیا۔ یہ خنجر اس نے خالق کو مارنا تھا لیکن اس کا ساتھی جُھکے ہوئے خالق کے پیچھے سے ڈاکٹر کی طرف خنجر تول کر آنے لگا۔ ڈاکٹر نے ایک اور کمال کر دکھایا۔ وہ جمپ لگا کر خالق کے دوسرے پہلو کی طرف ہو گیا اور پوری طاقت سے خنجر جُھکے ہوئے عبدالخالق کی پیٹھ میں اتار دیا۔ خنجر نکالا اور اس کے ساتھ ہی خالق سیدھا ہو گیا۔ درد سے خالق کے دانت بجنے لگے۔

ڈاکٹر نے پوری طاقت سے عبدالخالق کو سینے پر ایسا دھکا دیا کہ اس کی پیٹھ اس کے ساتھی کے سینے سے ٹکرائی۔ پیچھے چھوٹا صوفہ رکھا تھا جس سے ٹھوکر لگی تو خالق کا ساتھی صوفے پر ایسے گرا جیسے بیٹھ گیا ہو اور خالق بھی اس کی گود میں گرا۔ ڈاکٹر نے خنجر پورا بلند کر کے خالق کے ساتھی کی گردن کے قریب ہنسلی میں اتار دیا۔ اس نے خنجر اوپر سے نیچے اتارا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ خنجر کم و بیش چھ انچ جسم کے اندر چلا گیا ہو گا۔ اس سے اس کا اس طرف کا پھیپھڑا کٹ گیا ہو گا۔

ڈاکٹر نے خنجر کا ایک اور وار خالق کے سینے میں کیا اور خالق خنجر کھا کر ایک طرف لڑھکا تو ڈاکٹر نے خنجر اس کے ساتھی کی گردن میں شہ رگ میں اتار دیا اور پیچھے کھینچا۔ اس کے ساتھی کا خنجر فرش پر گر پڑا جو ڈاکٹر نے اٹھا لیا۔

اتنے میں لڑکی کی ماں کمرے میں داخل ہوئی تو اندر کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں

ھر گئیں اور یوں لگتا تھا جیسے اس کی آنکھوں کے ڈھیلے باہر آ جائیں گے اور پھر اُس کا منہ ی کھل گیا تھا۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر خنجر کی نوک اُس کی شہ رگ پر رکھ دی اور کہا' ہے آگے آگے چلو۔

وہ عورت تو بت بن گئی تھی۔ ڈاکٹر جمشید نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر زور ے جھٹکا دیا اور اسے بائیں کو موڑ دیا۔ پیچھے سے لات مار کر اسے پھر کہا' آگے آگے چلو۔ رت چل پڑی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ جس شخص نے اس کی بیٹی کو اور ان دو آدمیوں مار ڈالا ہے' وہ اسے بھی مار ڈالے گا۔

○

ڈاکٹر جمشید کے دونوں ساتھی ڈاکٹر اس کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ واپس آئے تو کھانا ائیں۔ ڈاکٹر جمشید آ تو گیا لیکن اس حالت میں کہ اُس کے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک خنجر تھا جن میں سے ایک خنجر خون آلود تھا اور ڈاکٹر نے ایک عورت کو آگے لگا رکھا ۔ ایک ڈاکٹر نے اسے دیکھا تو دوڑا آیا اور ذرا سی دیر میں ہسپتال کے سارے لوگ ے ہو گئے۔

ڈاکٹر جمشید نے سارا واقعہ سب کو سنایا۔ کسی نے کہا کہ یہ عورت تو ولندیزی ہے اس کی ایک بیٹی بھی ہے۔ ڈاکٹر جمشید نے کہا کہ وہی ہو گی جسے میں قتل کر آیا ہوں... ں علاقے کا جو گوریلا کمانڈر تھا' فوراً" اسے اطلاع دی گئی اور وہ دوڑا آیا۔ اس کے ، تین چار آدمی تھے۔

جمشید ابھی انڈونیشی زبان نہیں بول اور سمجھ سکتا تھا۔ اس کے ساتھی ڈاکٹر بڑی اسے انگریزی بولتے تھے۔ انہوں نے کمانڈر کو سارا واقعہ سنایا اور پھر سب اس ت کو ساتھ لے کر اس کے گھر چلے گئے۔ وہاں تین لاشیں پڑی تھیں اور کمرے میں بہہ رہا تھا بلکہ بہہ کر جم چکا تھا۔

اس عورت سے پوچھا گیا کہ یہ کیا سازش تھی۔ وہ کچھ بتا نہیں رہی تھی۔ اُسے ا تھا کہ یہ لوگ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے اس لئے راز اپنے ساتھ ہی لے جائے اس کے ساتھ وعدہ کیا گیا کہ اُسے معاف کر دیا جائے گا۔ وہ پھر بھی نہ بولی تو کمانڈر ا کہ اس کی دونوں آنکھیں نکال دو اور زبان کاٹ دو اور ہسپتال لے جا کر اس کے یک کر دو" تاکہ اس حالت میں یہ زندہ رہے۔

آخر اُس نے خوفزدہ ہو کر راز فاش کر دیا۔ وہ انڈونیشی عیسائی تھی یعنی انڈونیشیا کی ہی پیدائش تھی۔ اُس نے ایک ولندیزی کے ساتھ شادی کر لی تھی جس سے یہ لڑکی اور دو لڑکے پیدا ہوئے تھے۔ جب جاپانیوں نے ان علاقوں پر حملہ کیا تو اس عورت کا خاوند یہاں سے بھاگ گیا تھا اور ان کے دونوں بیٹے مارے گئے تھے۔ یہ عورت اپنی بیٹی کو ساتھ لئے کہیں چھپی رہی ورنہ جاپانی اتنی خوبصورت لڑکی کو گھر میں نہ رہنے دیتے اور اپنے ساتھ لے جاتے۔

یہ ایک الگ کہانی ہے کہ یہ عورت کہاں اور کس طرح چھپی رہی۔ مختصر یہ کہ جاپانیوں نے انڈونیشیا والوں کے ساتھ سمجھوتہ کر کے ان کی حکومت بنا دی تھی۔ میں یہ تفصیلات پہلے سنا چکا ہوں۔

ایک انڈونیشی عیسائی نے اس عورت کو اپنے گھر رکھ لیا تھا یا غالباً" وہ عیسائی اس کے گھر میں آ گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں رہا۔ وہ کوئی بوڑھا اور امیر کبیر عیسائی تھا جس کی دولت اور زیورات کی شکل میں سونا محفوظ تھا لیکن اس کا بہت بڑا گھر بمباری سے تباہ ہو گیا تھا۔ اس عیسائی نے اس عورت کے ساتھ شادی نہ کی لیکن اسے داشتہ بنائے رکھا۔ عورت نے اپنی بیٹی کو اس شخص سے بچائے رکھا۔

معلوم نہیں یہ جوان لڑکی اس دولتمند عیسائی سے بچی رہی تھی یا نہیں' ہُوا یہ کہ جاپانیوں کی پسپائی اور شکست شروع ہو گئی اور یہاں امریکی اور انگریز فوجیں پہنچ گئیں اس عورت نے اس عیسائی کو زہر دے کر مار ڈالا۔ وہ کوئی بوڑھا آدمی تھا۔ اس کی ساری دولت اس عورت کے ہاتھ میں آ گئی۔

اس کا رابطہ ملٹری انٹیلی جنس کے ساتھ ہو گیا تو یہ اس کی مخبر بن گئی اور اس نے کچھ مسلمانوں کو دھوکہ دے کر گرفتار بھی کروایا اور مروایا بھی.... میں اس عورت کی ہسٹری سنا کر اپنا اور آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ انڈونیشی مسلمانوں کی جنگِ آزادی کو ناکام بنانے کے لئے امریکیوں' انگریزوں' ولندیزیوں اور ہندوؤں نے کیسا متحدہ محاذ بنایا تھا اور کس طرح سازشیں تیار کی تھیں۔ یہ واقعہ اسی سازش کی ایک کڑی تھی۔

یہ عورت کچھ عرصے سے تخریب کاری اور سبوتاژ کی کارروائیوں میں باقاعدہ شرکت کرنے لگی تھی اور جہاں ضرورت پڑتی' اپنی بیٹی کو بھی استعمال کر لیتی تھی۔ اس

کی اسے باقاعدہ اُجرت ملتی تھی اور اس نے اس عیسائی کی دولت بھی ہتھیالی تھی۔ ڈاکٹر جمشید نے مجھے اتنا ہی سنایا تھا کہ اس عورت نے اپنے بیان میں اپنی کچھ تخریبی کارروائیوں کا ذکر کیا تھا لیکن ڈاکٹر نے مجھے یہ کارروائیاں نہیں سنائیں۔

عورت نے اپنے بیان میں بڑے واضح الفاظ میں کہا کہ اسے سابقہ آئی این اے کے آدمی دیئے گئے تھے اور صلیبیوں کی ملٹری انٹیلی جنس نے یہ سکیم بنائی تھی کہ انڈونیشی مسلمان لیڈروں کو قتل کرایا جائے اور گوریلا کمانڈروں کو بھی ختم کیا جائے۔ ان اہم شخصیات کی ہٹ لسٹ میں وہ ڈاکٹر بھی شامل کئے گئے تھے جو زخمی مجاہدین کی مرہم پٹی کرتے تھے۔

یہ دونوں آدمی جنہیں ڈاکٹر جمشید نے قتل کیا تھا' آئی این اے میں تھے اور جب آئی این اے بکھر گئی تو یہ انڈونیشیا میں آ گئے اور بعد میں ان کا رابطہ ملٹری انٹیلی جنس کے ساتھ ہو گیا۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ دونوں مسلمان ہی تھے۔ عبدالخالق کا صحیح نام یہی تھا۔ یوں نہیں ہُوا جیسا کہ میں پہلے ایک واقعہ سنا چکا ہوں کہ ہندو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے انڈونیشی گوریلوں میں شامل ہو گئے تھے۔ عبدالخالق اور اس کے ساتھی نے ڈاکٹر جمشید کو کہیں دیکھ لیا تھا اور اس عورت کو بتایا تھا کہ ایک شکار پھانسا جا سکتا ہے۔

یہ عورت بہت ہی چالاک اور عقل مند تھی اور اس کی بیٹی بھی اسی جیسی ہو گئی تھی۔ ان چاروں نے ڈاکٹر جمشید کو ختم کرنے کی سکیم بنائی اور اس پر عمل کیا۔

اس عورت سے پوچھا گیا کہ کسی آدمی کو گھر بلا کر قتل کر دینا کوئی مشکل کام نہیں' پھر انہوں نے پہلے روز ہی اس ڈاکٹر کو قتل کیوں نہ کر دیا؟

عورت نے بتایا کہ عبدالخالق کا ساتھی کسی اور کام سے سوراکارتہ سے باہر چلا گیا تھا اور یہ کام اس کے آنے پر ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے کہا کہ ان دو دنوں میں یہ فائدہ ملا کہ لڑکی نے ڈاکٹر جمشید کو اپنے حسن و جوانی کے طلسم میں گرفتار کر لیا تھا۔ تاخیر کی دوسری وجہ یہ تھی کہ لاش گھر میں ہی غائب کرنی تھی۔ عبدالخالق کا ساتھی آ گیا تو انہوں نے اس یقین کے ساتھ کہ وہ بڑی آسانی سے ڈاکٹر جمشید کو قتل کر لیں گے' ایک کیارہ کھود کر اس کی قبر تیار کر لی تھی۔

اتفاق سے یہ قبر ڈاکٹر جمشید نے دیکھی تھی اور اس عورت سے پوچھا تھا کہ یہ گڑھا

کیوں کھودا گیا ہے۔ عورت نے کہا تھا کہ اس میں درخت لگانے ہیں۔ ڈاکٹر جمشید کے ذہن میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ وہ اپنی قبر دیکھ رہا ہے۔ اسے اس گڑھے میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جانا تھا۔

عورت نے اپنے بیان میں کہا کہ یہ پہلا آدمی ہے جو ان کے جال سے زندہ نکل گیا ہے۔ اس نے حیرت کا اظہار کیا کہ اس ڈاکٹر نے کس طرح ان دونوں کو قتل کر دیا تھا اور اُسے یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس کی بیٹی کی پیٹھ میں خنجر کس طرح لگا۔ ڈاکٹر جمشید نے اُسے بتایا کہ وہ عبدالخالق کا خنجر تھا جو اسی کے ہاتھ سے اس کی بیٹی کی پیٹھ میں اتر گیا۔

اس عورت کو معاف نہیں کیا گیا تھا نہ ہی کسی قیمت پر معاف کرنا تھا۔ اس سے یہ بیان اسی گھر میں لیا گیا تھا جس گھر میں اس کی بیٹی اور اس کے گینگ کے دو آدمیوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ گوریلا کمانڈر اٹھا اور اس عورت کو اپنے ساتھ لاشوں والے کمرے میں لے گیا۔ ڈاکٹر جمشید نے مجھے سنایا کہ اس کمرے سے ریوالور کی تین گولیاں چلنے کے دھماکے سنائی دیئے اور فوراً بعد گوریلا کمانڈر واپس اس کمرے میں آ گیا جہاں سب بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ عورت کو اُس کے گینگ کے پاس پہنچا آیا تھا۔

رات کو یہ چاروں لاشیں اٹھوا کر قریبی ندی میں پھینک دی گئی تھیں اور یہ مکان انڈونیشی گوریلوں کے ہیڈ کوارٹر نے بلکہ انڈونیشی حکومت نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ اس مکان سے اچھی خاصی رقم نکلی اور زیورات بھی ملے تھے۔

"غور فرمایئے صاحب!" —— ڈاکٹر جمشید نے یہ واقعہ سنا کر کہا —— "یہ صحیح ہے کہ میں صرف ڈاکٹر ہی نہیں بلکہ اپنے شوق سے کچھ ملٹری ٹریننگ بھی لی تھی لیکن جس طرح میں نے لڑکی کو اس کے اپنے ہی ساتھی سے مروایا اور پھر جس طرح ان دو ہٹے کٹے آدمیوں کو جن کے پاس خنجر تھے، انہی کے خنجر سے مارا، اسے میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا معجزہ کہتا ہوں۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے اور سیزی کے شیشے نے جس طرح میری مدد کی اور پھر جس طرح میرا دماغ ٹھکانے رہا، یہ اللہ کی خاص مدد تھی اور یہ ہے اصل ایمان کہ ایمان پختہ ہو اور انسان اللہ کی راہ پر چلا جا رہا ہو تو وہ درندوں سے بھی محفوظ رہتا ہے اور غالباً درندے بھی اس سے ڈرتے ہیں۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے کہ جب عبدالخالق نے خنجر اوپر کر کے مجھے مارنا چاہا تھا، اُس وقت سے اس وقت تک جب میں نے عبدالخالق اور اس کے ساتھی کو مار ڈالا تھا، زیادہ سے زیادہ پانچ سیکنڈ لگے ہوں گے۔ کیا میں اتنا تیز ہو گیا تھا؟ نہیں، یہ اللہ کا ہاتھ تھا جس نے مجھے محفوظ رکھا اور اسلام کے دشمنوں کو میرے ہاتھوں انہی کے خون میں ڈبو دیا"۔

مجھے یاد آ گیا کہ ڈاکٹر جمشید نے کہا تھا کہ وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے ہوئے یا کسی مشکل کے وقت کسی وظیفے کا ورد جاری رکھتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اُس نے جب سیزی کے شیشے میں دو آدمیوں کو ہاتھوں میں خنجر لئے دیکھا اور ان کی نیت اور ارادے کو سمجھ گیا تو کیا اُس نے کوئی وظیفہ یا قرآن کی کوئی آیت پڑھی تھی؟

"ہاں صاحب!" —— اُس نے جواب دیا —— "آپ نے بڑے کام کی بات پوچھی ہے۔ میرا جواب اپنے ذہن میں نقش کر لیں۔ جب مجھے ان لوگوں کے ارادے کا علم ہو گیا میرے سوچے بغیر ہی میری زبان پر یہ کلمہ آیا، حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ عَلَی اللّٰہِ تَوَکَّلْنَا... اس کے معنی ہیں، ہمیں اللہ کی مدد کافی ہے اور وہی سب سے بڑھ چڑھ کر کارساز ہے اللہ پر ہی ہمیں بھروسہ ہے۔.. میں نے دل ہی دل میں اس وظیفے کا ورد شروع کر دیا اور میں سو فیصد یقین سے کہتا ہوں کہ اللہ کے اسی کلام کی برکت تھی کہ میں دشمنوں پر حاوی ہو گیا"۔

میں نے یہ وظیفہ زبانی یاد کر لیا اور آج تک جہاں کہیں مشکل پیش آئی، میں نے یہ وظیفہ پڑھا اور اللہ تعالیٰ نے میری مدد فرمائی۔



میں اُس روز عاشق علی کو نہ دیکھ سکا۔ ڈاکٹر جمشید انور نے اگلے روز آنے کے لئے کہا۔ صرف آمنہ کو کمرے میں جانے بلکہ رہنے کی اجازت تھی۔ میں ڈاکٹر جمشید کی اتنی لمبی اور سنسنی خیز کہانی سن کر واپس چلا آیا۔

میں اگلے روز دوپہر کے بعد جا سکا۔ آمنہ باہر آئی تو مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ میں سمجھ گیا کہ عاشق بہتر ہو گیا ہے۔ وہ مجھے کمرے میں لے گئی۔ عاشق جاگ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور بایاں ہاتھ آگے کیا کیونکہ اُس کا دایاں بازو پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔

اس کے ساتھ جو باتیں ہوئیں وہ ایسی نہیں جو میں آپ کو سناؤں۔ سنانے والی بات یہ ہے کہ باتوں کے دوران ایک بار اس کے آنسو نکل آئے۔ میں یہ سمجھا کہ اسے گھر یاد آ رہا ہے۔ آمنہ نے اس کے آنسو دیکھ لئے اور وہ پریشان ہو گئی۔ عاشق کے تکئے کے پاس رومال پڑا ہوا تھا۔ آمنہ نے رومال سے اس کے آنسو پونچھ ڈالے اور اشاروں سے

پوچھنے لگی کہ وہ کیوں رویا ہے۔ عاشق علی نے ذرا سا مسکرا کر اور سر ہلا کر اسے بتانے کی کوشش کی کہ کوئی ایسی بات نہیں۔

عاشق علی یہ سوچ کر غمگین ہو گیا تھا کہ وہ اگر بازو اور ٹانگ سے معذور ہو گیا تو اُس کا عزم ختم ہو جائے گا۔ اُس نے کہا کہ وہ جو مقصد اور جو جذبہ لے کر آیا تھا وہ دھرا رہ جائے گا اور محتاجی کی زندگی کی سوچ کر اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ میں اسے جھوٹی سچی تسلیاں دینے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسے ڈاکٹر جمشید انور کا بتایا ہُوا وظیفہ یاد کرا دیا اور کہا کہ وہ اس کا ورد کرتا رہا کرے۔

کچھ دیر آمنہ کی وارفتگی کی باتیں ہوئیں اور میں نے اس کے ساتھ ڈاکٹر جمشید انور کی باتیں شروع کر دیں۔ اس نے اس ڈاکٹر کی بہت ہی زیادہ تعریف کی اور ساتھ ہی یہ خبر بھی سنائی کہ وہ واپس چلا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمشید عاشق علی سے مل کر گیا تھا اور اسے تسلی دے کر گیا تھا کہ وہ ایسا معذور نہیں ہو گا کہ کسی کا محتاج ہو جائے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے کی بجائے آپ کو ایک اور واقعہ سنا دوں.... میں اب تک یہ کہتا آیا ہوں کہ انڈونیشی مسلمان بڑے ہی زبردست جذبے سے لڑ رہے تھے اور بے دریغ خون اور جان کے نذرانے دے رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر انڈونیشی مسلمان کا یہی جذبہ تھا۔ تاریخ اسلام کے دو پہلو ہیں۔ غالب پہلو تو شجاعت اور جذبۂ ایثار کا ہے لیکن غدّاری کا پہلو بھی ہر دور میں موجود رہا ہے۔ ایسے غدار انڈونیشیا کی جنگِ آزادی میں بھی موجود تھے اور کچھ ایسے تھے جو غدار تو نہیں تھے لیکن ان حالات میں بھی وہ اپنے ذاتی جذبات کے پابند تھے۔

ایسے ہی ایک انڈونیشی نوجوان مجاہد نے عاشق علی کے لئے خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ اس کا ابھی عاشق علی کو علم نہیں تھا۔ میں جس روز عاشق علی کو دیکھنے گیا تھا اُسی رات عثمان نے مجھے ایک بات سنائی۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ میں عاشق علی کو دیکھ آیا ہوں۔ اس نے بتایا کہ میرے بعد وہ بھی عاشق کو دیکھنے گیا تھا۔

عثمان نے مجھے سنایا کہ عاشق علی کا ہسپتال میں تیسرا دن تھا' شام کے وقت آمنہ عثمان کے پاس آئی اور اسے بتایا کہ اُس روز وہ عاشق علی کے کمرے سے نکل کر کسی اور طرف چلی گئی تھی۔ واپس کمرے میں آئی تو ایک انڈونیشی نوجوان عاشق علی پر جُھکا ہُوا تھا۔ اسے پتہ نہ چل سکا کہ آمنہ دروازے میں کھڑی ہے۔ آمنہ نے اسے عقب سے ہی

پہچان لیا تھا کہ وہ کون ہے۔

آمنہ کھڑی دیکھتی رہی کہ یہ کیا کر رہا ہے یا کیا کرے گا۔ اس نوجوان کا نام علی الشام تھا اور اسے علی کہتے تھے۔ سال ڈیڑھ سال پہلے آمنہ کے والدین نے آمنہ کو علی سے منسوب کر دیا تھا۔ یوں کہہ لیں کہ علی آمنہ کا منگیتر تھا لیکن آمنہ عاشق علی کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔

آمنہ نے عثمان کو بتایا کہ علی اچھی نیت سے نہیں آیا تھا۔ اُس نے اُس باریک سی پائپ کو ہاتھ لگا کر بھی دیکھا جس سے علی کے جسم میں گلوکوز اور خون جا رہا تھا۔ جب اس نے علی کو یہ حرکت کرتے دیکھا تو آمنہ کو خطرہ محسوس ہُوا کہ یہ کہیں نالی کھینچ ہی نہ دے جو عاشق علی کی جان بھی لے سکتی تھی۔

اس خطرے کے پیش نظر آمنہ تیزی سے آگے ہوئی۔ علی نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ کھسیانا سا ہو گیا۔ اس وقت عاشق علی بے ہوشی میں تھا۔ وہ ایک منٹ کے لئے بھی ہوش میں نہیں آیا تھا۔

آمنہ نے علی سے پوچھا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟.... علی نے کہا کہ وہ عاشق کو دیکھنے آیا ہے کہ ہوش میں آ چکا ہے یا نہیں اور اس کی حالت کیا ہے۔

آمنہ نے عثمان کو سنایا کہ اس نے علی سے کہا کہ وہ اس کمرے میں آ کیسے گیا ہے' کسی کو اندر آنے کی ابھی اجازت نہیں ملی۔ آمنہ نے اسے کہا کہ وہ فوراً یہاں سے چلا جائے ورنہ آمنہ اس کی رپورٹ کر دے گی.... علی نے آمنہ کو بازو سے پکڑا اور اسے باہر لے آیا۔ آمنہ غصے میں آ گئی اور علی سے کہا کہ وہ یہاں بھی نہ آئے اور اس کے سامنے بھی نہ آئے۔

"ہوش میں آؤ آمنہ!" — علی نے آمنہ سے کہا — "اپنا دماغ ٹھکانے پر لے آؤ اور اس آدمی کو ذہن سے اتار دو۔ تم میری ہو اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ تم کسی اور کو اپنے دل میں بٹھالو"۔

"یہ فیصلہ میرا نہیں" — آمنہ نے کہا — "میرے باپ نے عاشق علی کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ انڈونیشیا آزاد ہو گیا تو وہ مجھے اس کے ساتھ بیاہ دے گا.... میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ جاؤ اور میرے باپ کے ساتھ بات کرو لیکن میں تمہیں بتا دیتی ہوں کہ میں اپنا فیصلہ کر چکی ہوں اور جو بدل نہیں سکتا"۔

"تمہارے باپ کے ساتھ بات کرنا بیکار ہے" ___ علی نے کہا ___ "تم اس ہندوستانی کو چاہتی ہو اور یہ مجھے منظور نہیں"۔

آمنہ نے عثمان کو بتایا کہ علی کے ساتھ اُس کی اچھی خاصی ترش کلامی ہوئی اور علی اُسے یہ دھمکی دے کر چلا گیا کہ وہ اس ہندوستانی کو یعنی عاشق علی کو واپس ہندوستان بھیج دے گا اور اسے انڈونیشیا میں رہنے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔ جاتے جاتے علی یہ بھی کہہ گیا کہ یہ شخص بڑے دُور کے ایک ملک کا باشندہ ہے اور کچھ پتہ نہیں کہ یہاں سے بھاگ جائے' اور اب تو یہ ایسا زخمی ہُوا ہے کہ بازو اور ٹانگ سے معذور اور محتاج ہو جائے گا۔

آمنہ نے اسے کہا کہ معذور ہو سکتا ہے لیکن عاشق علی کو وہ کسی کا محتاج نہیں ہونے دے گی۔ اس نے کہا کہ عاشق علی انگریزوں کا فوجی قانون توڑ کر انڈونیشیا کی آزادی کی جنگ لڑنے آیا اور اسی جہاد میں اتنا شدید زخمی ہو گیا ہے تو ہم انڈونیشی ایسے گھٹیا لوگ تو نہیں کہ اسے کچھ صِلہ بھی نہ دیں گے۔

آمنہ نے یہ باتیں عثمان کو اس لئے بتائی تھیں کہ یہ ایریا عثمان کا تھا اور آمنہ نے عثمان کو اس خطرے سے آگاہ کیا تھا کہ علی رقابت کے جوش میں آکر عاشق علی پر اوچھا وار کرے گا۔ آمنہ نے صاف الفاظ میں بتایا کہ علی کا ہسپتال آنا اور عاشق علی کے کمرے میں جا کر اس پر جھکنا اور پھر خون اور گلوکوز کی نالیوں کو دیکھنا' بڑے خطرناک ارادے کا اظہار کرتا ہے۔

عثمان نے آمنہ کو تسلّیاں دے کر مطمئن کیا اور کہا کہ وہ علی کو بلا کر اسے سمجھانے کی کوشش کرے گا اور اگر اس نے پھر کوئی ایسی خطرناک حرکت یا بے ہُودہ بات کی تو اس کے خلاف باقاعدہ کارروائی کی جائے گی۔

عثمان میرا کمانڈر تھا لیکن اس تعلق کے علاوہ اس نے مجھے اپنا دوست بنا لیا تھا اور ہر بات میرے ساتھ کرتا تھا سوائے ان رازوں سے جن کا تعلق جنگ آزادی کے ساتھ تھا۔



اب میں پانچ چھ مہینے آگے کی بات سناؤں گا۔ اس عرصے میں عاشق علی کے زخم بھر گئے تھے' خون کی کمی کبھی کی پوری ہو چکی تھی اور وہ زخمی ہونے سے پہلے کی طرح روزمرّہ کے معمولات میں رواں ہو گیا تھا لیکن اُس کے جسم میں کچھ تبدیلی آ گئی تھی۔

ایک یہ کہ وہ تیز دوڑنے کے قابل نہیں رہا تھا نہ ہی وہ تیز چل سکتا تھا۔ جو ٹانگ زخمی ہوئی تھی' اس ٹانگ کو وہ کھینچ کر چلتا تھا اور گھٹنے سے یہ ٹانگ پہلے کی طرح دوہری نہیں ہوتی تھی۔ ایسے ہی دایاں بازو پوری طرح اوپر نہیں اٹھتا تھا نہ تندرست بازو کی طرح گھمایا جا سکتا تھا۔ ہاتھ کی گرفت ٹھیک تھی لیکن بازو کمزور سا ہو گیا تھا۔ عاشق علی اس ہاتھ سے رائفل اور ٹامی گن وغیرہ چلا سکتا تھا لیکن پہلے کی طرح نہیں۔ اب وہ صرف لیٹ کر فائر کر سکتا تھا۔

ان پانچ چھ مہینوں میں مَیں چند ایک گوریلا کارروائیوں میں گیا تھا اور عاشق علی بھی دو کارروائیوں میں شامل ہو چکا تھا۔

ایک اور بڑے گوریلا ایکشن آپریشن آرڈر آ گیا۔ میں اس آپریشن کو پوری طرح بیان کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ یہ بھی ویسا ہی آپریشن تھا جیسا وہ آپریشن تھا جس میں عاشق علی زخمی ہُوا تھا۔ یہ سارے آپریشن ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے اس لئے بھی میں آپ کو بور نہیں کرنا چاہتا۔ میں بھی اس آپریشن میں شامل تھا لیکن مجھے کسی اور طرف بھیج دیا گیا تھا۔ دن بھر لڑائی ہوئی' آپریشن کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا اور ہمارے کچھ آدمی زخمی ہوئے اور تین شہید بھی ہوئے۔

پچھلے پہر کے چار بج رہے تھے جب اس آپریشن میں شامل ہونے والی پارٹیاں ایک جگہ اکٹھی ہوئیں۔ ایک امریکی بٹالین کو گھات میں لینا تھا جو ہم نے لیا اور امریکیوں کو خاصا جانی نقصان پہنچایا۔ کچھ دیر جم کر فائرنگ کا تبادلہ بھی ہُوا۔ آخر امریکی بہت سی لاشیں پیچھے چھوڑ کر اپنے ٹرکوں میں بیٹھ کر چلے گئے۔

میں نے آپریشن ختم ہونے کے بعد آمنہ کو دیکھا۔ اس آپریشن میں بھی چند ایک لڑکیاں شامل تھیں۔ آمنہ عثمان کے پاس آئی اور سر کے اشارے سے اسے الگ لے گئی۔ دونوں دور کھڑے باتیں کرتے رہے اور پھر آمنہ اپنی پارٹی میں چلی گئی اور عثمان واپس آکر الگ تھلگ بیٹھ گیا اور اس نے سر جھکا لیا۔ میں سمجھ گیا کہ آمنہ نے اسے کوئی خاص بات بتائی ہے۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ عثمان مجھے اپنا دوست بنائے ہوئے تھا۔ آخر اس نے مجھ سے حلفیہ وعدہ لیا کہ میں یہ راز سوائے عاشق علی کے کسی اور کو نہیں بتاؤں گا.... آمنہ کا کردار اور ایمان دیکھیں کہ وہ آپریشن ختم ہونے کے بعد عثمان کے پاس آئی اور اسے بتایا

کہ جب دونوں طرف سے فائر کھل گیا تو وہ پوزیشن بدلنے لگی۔ اس جگہ اونچی نیچی ٹیکریاں اور کھڈ بھی تھے اور جنگل گھنا تھا۔ اس نے علی کو دیکھا کہ وہ اپنی پوزیشن سے اٹھ کر بائیں طرف کو جا رہا تھا۔ آمنہ کو اچانک خیال آگیا کہ اس طرف عاشق علی پوزیشن میں تھا۔

آمنہ کو عاشق علی کے ساتھ ایسی والہانہ محبت تھی کہ آپریشن پر بھی اس کی نظر عاشق علی کی طرف جاتی تھی۔ چونکہ علی بھی ان کے درمیان موجود تھا اس لئے آمنہ جتنی توجہ اس آپریشن پر دے رہی تھی اتنی ہی عاشق علی پر بھی دیتی تھی۔ اس نے جب علی کو بلاجواز اپنی پوزیشن سے اس طرف جاتے دیکھا جس طرف عاشق علی تھا تو آمنہ بھی آپریشن کو بھول کر چھپتی چھپاتی علی کے پیچھے گئی۔ علی ایک جگہ لیٹ گیا اور وہاں سے ایک طرف گھٹنوں اور کہنیوں کے بل رینگنے لگا۔ آمنہ کے سامنے ایک اونچی ٹیکری تھی جس پر درخت بھی تھے اور جھاڑیوں کے علاوہ اونچی گھاس بھی تھی۔ آمنہ اس پر اس طرح چڑھ کر چھپ گئی کہ وہ کسی کو نظر نہیں آسکتی تھی۔

آمنہ تربیت یافتہ اور تجربہ کار گوریلا فائٹر تھی۔ مجھے اس کی وہ نوجوانی یاد آتی ہے' میں نے اسے اپنی آنکھوں سے تین چار مرتبہ ایکشن میں دیکھا تھا۔ اُس نے عثمان کو بتایا کہ جب اس ٹیکری پر جا کر پوزیشن لی تو اسے بائیں طرف کچھ آگے عاشق علی نظر آیا جو ذرا کم بلند ٹیکری پر ایک درخت کے پیچھے بیٹھا فائر کر رہا تھا۔

آمنہ کو علی بھی نظر آگیا جو عاشق کے پیچھے ایک ٹیکری پر پوزیشن لے رہا تھا۔ اس کے اور عاشق علی کے درمیان بیس پینتیس گز فاصلہ تھا۔ علی کے پاس رائفل تھی اور آمنہ کے پاس ٹامی گن تھی۔ آمنہ اور علی کے درمیان پچیس گز کا فاصلہ تھا۔

آمنہ نے دیکھا کہ علی نے رائفل کندھے سے لگائی اور رائفل کی نالی عاشق علی کی طرف تھی۔ علی جس پوزیشن میں تھا وہاں سے وہ دشمن پر فائر نہیں کر سکتا تھا' وہ عاشق علی کو گولی مارنے کے لئے اس پوزیشن میں گیا تھا۔

جونہی علی نے رائفل کندھے سے لگا کر عاشق علی کی طرف سیدھی کی' آمنہ نے ٹامی گن علی کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ علی کا دایاں پہلو آمنہ کی طرف تھا۔ گن کا پورا برسٹ علی کے پہلو میں لگا اور وہ وہیں بغیر تڑپے مر گیا.... آمنہ نے عاشق علی کو بچا لیا تھا۔

اگر آمنہ عثمان کو نہ بتاتی کہ علی کو اس نے مارا ہے تو کسی کو شک تک نہ ہوتا۔ وہاں

ہمارے کچھ ساتھی زخمی بھی ہوئے اور شہید بھی ہوئے تھے۔ باقی سب علی کو بھی شہید کہہ رہے تھے لیکن آمنہ کے کردار اور ایمان کو دیکھیں کہ اس نے عثمان کو صحیح بات بتا دی اور یہ بھی کہا کہ آپ میرے کمانڈر ہیں' اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے بلاجواز قتل کیا ہے تو مجھے یہیں گولی مار دیں۔

عثمان نے کچھ دیر سوچا اور کہا — "تم نے ٹھیک کیا ہے۔ علی اسی قابل تھا.... کسی کو بتا نہ دینا"۔

(جاری ہے)

ایک روز عثمان کو جکارتہ سے اطلاع آئی کہ ایک دو دنوں تک ناسوشن اُس کے ایریا ہیڈ کوارٹر میں آرہا ہے اور یہ ایک کانفرنس ہوگی جس کے لئے اسے تیاری کرلینی چاہئے۔

پہلے میں آپ کو بتادوں کہ ناسوشن کون تھا.... وہ احمد سوئیکارنو اور سوہارتو کے پائے کا لیڈر تھا اور یہ سب جرنیل تھے۔ جکارتہ میں ہماری فوج کے جی ایچ کیو کی طرح گوریلا فورس کا ایک جی ایچ کیو تھا اور بڑے بڑے گوریلا اور کمانڈو آپریشن کے احکام اسی ہیڈ کوارٹر سے آیا کرتے تھے اور ان پر دستخط ناسوشن کے ہوتے تھے۔ ناسوشن گوریلا طرزِ جنگ میں خصوصی مہارت رکھتا تھا۔ جنگِ عظیم سے پہلے جب انڈونیشیا کا نام ونشان نہ تھا اور وہ خطّہ ولندیزیوں کے زیرِ نگیں تھا' اُس وقت ناسوشن ولندیزی فوج میں اعلیٰ رینک میں تھا۔

میں پچھلے کسی باب میں تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ یہ جرنیل انڈونیشیا کی جنگِ آزادی ایک خاص تنظیم' پلان اور ڈسپلن کے تحت لڑا رہے تھے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوتا تھا کہ کہیں بھی چند ایک جوشیلے نوجوان اکٹھے ہوجاتے اور دشمن پر حملہ کردیتے۔ چھوٹے چھوٹے گوریلا آپریشن لڑانے کے لئے ایریا کمانڈر مقرر تھے جیسا عثمان تھا۔ ساری تنظیم ایک باقاعدہ فوج جیسی تھی' فرق یہ تھا کہ انڈونیشی مسلمان فوج کی طرح مورچہ بند ہوکر نہیں لڑتے تھے۔ وہ شب خون مارتے تھے اور —"ضرب لگاؤ' غائب ہوجاؤ"— کے اصول پر لڑتے تھے۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ قوم کا بچہ بچہ' عورتیں بھی مرد بھی گوریلے فائٹر بن گئے تھے اور وہ اپنے آپ کو کمانڈروں کے احکام اور ضروری ڈسپلن کے

پابند رکھتے تھے۔

اگلی صبح کانفرنس میں شریک ہونے والے ہمارے ہیڈ کوارٹر میں پہنچنے لگے۔ دوپہر تک دو سو آدمی آچکے تھے۔ ان میں بیس اکیس ہندوستانی مسلمان بھی تھے۔ یہ سب میری طرح انڈین آرمی سے بھگوڑے ہوکر انڈونیشیا آئے تھے۔ چار ایریا کمانڈر شام تک آگئے۔ اس سے مجھے اندازہ ہُوا کہ یہ کوئی بڑی کانفرنس ہے اور اس کا کوئی خاص مقصد ہوگا۔ عثمان میرا کمانڈر تھا لیکن میرے ساتھ اور عاشق علی کے ساتھ دوستانہ مراسم بھی رکھے ہوئے تھا۔ وہ مجھے ہربات بتادیا کرتا تھا لیکن کوئی جنگی راز کی بات ہوتی تو وہ گول کرجاتا' میں سمجھ جاتا اور پھر نہ وہ بتاتا اور نہ میں پوچھتا تھا۔

○

اس کانفرنس کے متعلق عثمان نے مجھے بتادیا کہ اس کے اغراض ومقاصد کیا ہیں اور اس کا پس منظر کیا ہے۔ بات یہ تھی کہ اقوام متحدہ نے ایک سال سے زیادہ عرصہ پہلے انڈونیشی لیڈروں کے ساتھ مذاکرات شروع کردیئے تھے اور انہیں آمادہ کیا جارہا تھا کہ جنگ بندی کردیں۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے اور پھر دیگر نمائندوں نے بھی انڈونیشی لیڈروں کے آگے کچھ شرائط رکھیں جن میں ایک یہ بھی تھی کہ انہیں انڈونیشیا کے کچھ حصے پر خود مختاری دے دی جائے گی لیکن انڈونیشی لیڈر کوئی شرط قبول نہیں کررہے تھے۔ وہ ایک ہی شرط پیش کرتے تھے' وہ تھی آزادی اور مکمل آزادی اور ولندیزیوں کا انخلاء۔

انڈونیشی لیڈروں کا مؤقف یہ تھا کہ جاپانیوں نے ولندیزیوں سے یہ خطّہ جنگ لڑکر چھین لیا اور اس پر قابض ہوگئے تھے پھر انڈونیشی مسلمانوں نے اپنے آپ کو منظم کرکے جاپانیوں کو یہاں سے بھگادیا اور اس خطّے کو اپنا ملک بنالیا۔

پھر انڈونیشی لیڈروں کا ایک مؤقف یہ بھی تھا کہ یہ خطّہ مسلمانوں کا ہے اور یہاں مسلمان غالب اکثریت میں آباد ہیں۔ وہ اب اس خطّے پر کسی دوسری قوم کا تسلّط قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے اور اسے وہ اپنا جائز حق سمجھتے تھے۔

انڈونیشی کمانڈروں نے باقاعدہ انٹیلی جنس تنظیم بنا رکھی تھی۔ اس انٹیلی جنس کی رپورٹ یہ تھی کہ امریکہ اور برطانیہ جو اس طرح کی بات کرتے ہیں جیسے ان کے دلوں میں انڈونیشی مسلمانوں کے لئے رحم ہے اور وہ انہیں اپنی جنگی طاقت سے بچانا چاہتے

ہیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ ان دونوں صلیبی ملکوں کی حکومتوں اور فوجی قیادت نے دیکھ لیا تھا کہ انڈونیشی مسلمانوں کو شکست دینا یا انہیں دبا لینا اتنا آسان کام نہیں جتنا وہ شروع میں سمجھے تھے۔ انڈونیشی مسلمانوں نے جذبۂ حریت اور عسکری اہلیت سے ان صلیبیوں پر ثابت کر دیا تھا کہ —— ''آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا''

انڈونیشیا کی جنگِ آزادی چوتھے سال میں داخل ہو چکی تھی۔ اتحادی طاقتوں یعنی امریکہ اور برطانیہ کو توقع تھی کہ ان دونوں کی ہوائی جہازوں کی طاقت اور بحری اور برّی جنگی طاقت یہاں کے مسلمانوں کو تباہ کر دے گی اور جو زندہ رہیں گے ان پر دہشت طاری ہو جائے گی۔ انہوں نے یہ توقع لگا رکھی تھی کہ ان مسلمانوں کے پاس ایمونیشن ختم ہو جائے گا اور خالی رائفلیں اور مشین گنیں رہ جائیں گی۔ ان کی یہ توقع بجا تھی کیونکہ انڈونیشی حریت پسندوں کے پاس کوئی ایمونیشن کی فیکٹری نہیں تھی نہ انہیں کسی بھی ملک سے ایمونیشن ملتا تھا۔ اس کے باوجود ان کے پاس ایمونیشن ختم ہونے کی بجائے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ یہ سب امریکہ اور برطانیہ کی فوجوں سے چھینا ہوا تھا۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ گوریلوں کے لئے یہ حکم تھا کہ وہ ایمونیشن خود حاصل کریں اور گولی اس وقت چلائیں جب انہیں یقین ہو کہ گولی ضائع نہیں جائے گی۔

انگریزوں کو ایک زد اور بھی پڑ رہی تھی۔ وہ یہ کہ انگریز انڈین آرمی کو بھی انڈونیشی حریت پسندوں کے خلاف لڑا رہے تھے اور ان کی انڈین آرمی سے مسلمان ایک ایک دو دو کر کے بھگوڑے ہو رہے تھے اور انڈونیشی مسلمانوں کے پاس جا رہے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کا یہ جذبہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ انگریزوں اور امریکیوں کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ مسلمان فوجی فوج میں رہ کر بھی انڈونیشی مجاہدین کی کسی نہ کسی طرح مدد کر رہے ہیں۔

یہ مدد بڑی واضح اور نمایاں تھی۔ انگریز دیکھ رہے تھے کہ وہ انڈونیشی گوریلوں کے کسی ٹھکانے پر حملہ کرنے جاتے ہیں تو وہ راستے میں ہی انڈونیشی مجاہدین کی گھات میں آ کر مارے جاتے ہیں۔

انڈین آرمی سے انڈونیشیوں کو کچھ اور سازوسامان بھی مل رہا تھا مثلاً سگنل کور کے فوجی بھگوڑے ہوئے اور وہ خالی ہاتھ نہیں گئے بلکہ وائرلیس سیٹ (ریڈیو ٹیلی فون) اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اسی طرح کچھ اور ضروری سامان انڈونیشی مسلمانوں

تک پہنچ جاتا تھا۔ انڈین آرمی کی گاڑیاں تک ان کے پاس پہنچیں۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ انڈونیشیا کے لیڈر مخلص اور بے غرض تھے۔ انہوں نے قوم میں اتحاد پیدا کر دیا تھا۔ نہ وہاں کوئی سیاسی پارٹی تھی نہ کوئی مذہبی فرقہ تھا۔ وہاں کے لوگ فرقہ بندیوں کو بھول گئے تھے۔ ان کے ذہن میں دو ہی چیزیں رہ گئی تھیں.... اسلام اور آزاد انڈونیشیا.... ہر مرد اور عورت اپنی اپنی جگہ فرض شناس اور ذمہ دار بن گئے تھے۔ میں اپنی آنکھوں دیکھے واقعات سنا چکا ہوں کہ وہاں کے مردوں اور عورتوں کا کردار کس طرح بلند ہو گیا تھا۔ ان کا نعرہ اور نصب العین ایک ہی تھا.... ''مردیکا''.... (آزادی)۔

صلیبی اتحادیوں نے پوری کوشش کی تھی کہ حریت پسندوں کے اتحاد کو توڑا جائے اور ان میں گروہ بندی یا فرقہ بندی پیدا کی جائے۔ انہوں نے ولندیزی اور ہندو عورتوں کے ذریعے سبوتاژ کے ڈرامے کھیلے تھے لیکن ناکام رہے۔ میں نے یہ دو تین واقعات آپ کو سنائے ہیں۔

○

میں نے پاکستان کا ذکر نہیں کیا کیونکہ میں اسے ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمیں ریڈیو کے ذریعے خبر مل گئی تھی کہ پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا ہے اور پھر قائد اعظمؒ کے انتقال کی خبر بھی ملی تھی۔ پاکستان بننے کی خبر آئی تھی تو ہمارے انڈونیشی بھائیوں نے ہمیں گلے لگا لگا کر مبارکباد دی تھی اور بعض جگہ جشن بھی منائے گئے تھے۔ قائد اعظمؒ کی وفات کی خبر آئی تو انہوں نے ہمارے ساتھ بیٹھ کر آنسو بھی بہائے اور آہیں بھی بھری تھیں۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے ہم ہندوستانی مسلمانوں کو ایک تو یہ خوشی ہوئی کہ ہم آزاد ہو گئے ہیں اور اب انگریز کے غلام نہیں رہے۔ دوسری خوشی یہ کہ ہم انڈین آرمی کے بھگوڑے تھے اور کبھی یہ ڈر دل میں آ ہی جاتا تھا کہ کبھی انگریزوں کے ہاتھ چڑھ گئے تو وہ کورٹ مارشل کر کے ہمیں سزائے قید دے گا۔ اب وہ خطرہ ختم ہو گیا تھا اور ہم کہتے تھے کہ اس ملک کو آزاد کرا کے اپنے آزاد ملک میں واپس جائیں گے۔ مختصر یہ کہ اب ہم انگریز کی فوج کے بھگوڑے نہیں رہے تھے۔

پاکستان کے وجود میں آنے سے انڈونیشی مسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ انھیں یہ

تاثر ملا کہ آزادی حاصل کی جاسکتی ہے۔ تعلیم یافتہ انڈونیشی کہتے تھے کہ ایک مسلمان ملک پاکستان کے نام سے وجود میں آیا ہے اور ایسا ہی دوسرا آزاد مسلمان ملک انڈونیشیا ہو گا۔

ہم بہت کوشش کرتے تھے کہ ریڈیو پاکستان کی آواز سنیں لیکن پاکستان کا ریڈیو اتنا کمزور تھا کہ اتنی دُور تک اپنی آواز نہیں پہنچا سکتا تھا۔ ہمیں مجبوراً آل انڈیا ریڈیو سننا پڑتا تھا۔ اس کی ٹرانسمیشن میں اتنی طاقت تھی کہ انڈونیشیا میں صاف سنائی دیتا تھا لیکن اس کی خبریں اور تبصرے یکطرفہ اور پاکستان کے خلاف ہوتے تھے۔ صحیح خبر ہم بی بی سی اور امریکہ کے ریڈیو سے سنا کرتے تھے۔ ان نشریاتی اداروں کی خبروں سے ہمیں پتہ چلتا تھا کہ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا' انہیں لُوٹا' اُن کے گھر نذر آتش کئے' ان کی بیٹیاں اغوا کیں اور وہاں کے مسلمانوں کو قتل کردیا اور جو بچّے وہ پاکستان کو بھاگ گئے۔

ان خبروں کا ردِّعمل سورابایا میں ظاہر ہُوا۔ انڈونیشیا میں جنگِ عظیم سے پہلے ہندوؤں کی اچھی خاصی آبادی تھی۔ یہ سب تاجر اور دکاندار تھے۔ جاپان نے حملہ کیا تو جس طرح دوسرے لوگ آبادیوں سے بھاگے اس طرح ہندو بھی نکل بھاگے لیکن وہ جا ہی کہاں سکتے تھے۔ وہ اپنے زیورات اور دولت یعنی روپیہ پیسہ اپنے ساتھ لئے جنگلوں میں جا چھپے تھے۔ کچھ تو جنگل کی صعوبتیں برداشت نہ کرتے ہوئے مر گئے اور بعض جاپانیوں کے ہاتھوں مارے گئے پھر بھی ان کی خاصی تعداد صحیح اور سلامت رہی۔

جاپانیوں نے ان علاقوں پر قبضہ کرکے انڈونیشی مسلمانوں کی حکومت قائم کردی تو ہندو پھر واپس آگئے اور منڈی میں کاروبار سنبھال لیا۔ یہ تو بڑی ہی عیّار اور مکّار قوم ہے' انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی یہاں حکومت بن گئی ہے تو یہ مسلمانوں کے وفادار بن گئے اور خوب فائدہ اٹھایا۔ فائدہ یہ کہ کاروبار سنبھال لیا۔

سورابایا میں ہندوؤں کے دو گھر تھے۔ پہلے زیادہ تھے لیکن جنگ کے دوران ان میں سے بہت سے دوسرے بڑے شہروں کو چلے گئے تھے۔ ایک روز خبر ملی کہ ان دونوں ہندو گھروں کے تمام افراد کو قتل کردیا گیا ہے۔ ان کے گھر اور ان کی دکانیں لوٹ لی گئی تھیں اور ان کے مکانوں پر مسلمانوں نے قبضہ کرلیا تھا۔ یہ دو پاکستانیوں کی انتقامی کارروائی تھی۔ یہ دونوں پاکستانی میری طرح پہلے ہندوستانی فوجی تھے اور انڈین آرمی سے بھگوڑے

ہوئے تھے۔ انہوں نے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتلِ عام کی خبریں بی بی سی اور امریکی ریڈیو سے سنی تھیں۔ انہیں پتہ چلا کہ شہر میں دو ہندو فیملیاں آباد ہیں۔ ان پاکستانیوں نے اپنے چند ایک انڈونیشی دوستوں کو ساتھ لیا اور ان دونوں فیملیوں کا بچہ بچہ قتل کرڈالا' گھروں کو لُوٹا' کاروبار کو لوٹا اور انتقام لے لیا۔



عثمان کے ہیڈکوارٹر میں کانفرنس منعقد ہو رہی تھی جس میں کسی بڑے آپریشن کا فیصلہ کرنا اور پلان بنانا تھا۔ اقوام متحدہ مذاکرات کے ذریعے فائر بندی کرانے کی بہت کوشش کرچکی تھی لیکن انڈونیشی لیڈر سوائے آزادی کے کوئی اور بات سنتے ہی نہیں تھے۔ مجھے مزید باتیں معلوم ہوئیں جو یوں تھیں کہ انڈونیشی انٹیلی جنس کی رپورٹوں کے مطابق صلیبی اتحادی ہار گئے تھے لیکن اس شکست کو اپنی جنگی طاقت سے چھپائے ہوئے تھے۔ ان اتحادیوں نے دیکھ لیا تھا کہ ان کے فوجیوں کا مورال بری طرح پست ہو گیا تھا وجہ یہ تھی کہ یہ جنگ اور ہی قسم کی تھی۔ اتحادی فوجوں نے جنگِ عظیم رجمنٹوں اور بریگیڈوں کی صورت بھی لڑی تھی اور انہیں توپوں اور ہوائی جہازوں کی مدد حاصل تھی مگر انڈونیشیا میں وہ اس طرح نہیں لڑسکتے تھے۔

فوجی ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنا حوصلہ اور مورال قائم رکھتے ہیں لیکن ان فوجوں کے خلاف لڑنے والے نظر ہی نہ آئیں تو یہ کچھ اور ہی بات بن جاتی ہے۔

بات یہ بن جاتی ہے کہ کچھ پتہ ہی نہیں ہوتا کب کوئی گوریلا یا کمانڈو پارٹی ان پر شب خون مارے گی اور سوئے ہوئے کو گولی مار کر یا گرینیڈ پھینک کر غائب ہو جائے گی۔ یہ فوجیں جب جنگل میں گوریلوں کے خلاف جاتی تھیں تو ہر لحہ ہر فوجی پر موت کا خوف طاری ہوتا تھا کہ نہ جانے کس طرف سے ایک گولی یا ایک گرینیڈ آئے گا اور کئی ایک کو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ گھات کا خطرہ بھی ہوتا تھا۔ امریکی اور انگریز فوجی رات کو خیموں میں یا بارکوں میں سوتے تھے تو بھی ان پر خوف طاری ہوتا تھا کہ دشمن کی گوریلا پارٹی شب خون مارے گی اور وہ سوئے ہوئے موت کے گھاٹ اُتر جائیں گے۔

یہ ایسی صورتِ حال تھی جس نے امریکیوں اور انگریزوں کا مورال مجروح کردیا تھا۔ یہ دیکھ کر بھی وہ اس کوشش میں تھے کہ فائر بندی ہو جائے۔

یہ تو آپ اور ہم سب جانتے ہیں کہ صلیبی اس کوشش میں تھے کہ ایک اور

مسلمان ملک وجود میں نہ آئے اور یہاں صلیبی حکومت قائم رہے جو مسلمانوں کو دینی اور نظریاتی لحاظ سے ناکارہ کر دے۔

مجھے یہ بھی پتہ چل گیا کہ اس کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ امریکیوں اور انگریزی افواج پر ایسے زوردار حملے کئے جائیں کہ ان کا دم خم ٹوٹ جائے اور پھر حملوں اور شب خونوں کا تسلسل قائم رکھا جائے۔ مطلب یہ تھا کہ کہ اقوام متحدہ کو یقین ہو جائے کہ انڈونیشی حریت پسند اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ وہ اس کی ہر شرط کو ٹھکرا کر اپنی شرط منوا سکیں۔

کانفرنس میں شریک ہونے والے اتنے زیادہ افراد کو شہر میں مسلمانوں کے گھروں میں بطور مہمان ٹھہرایا گیا۔ ایسے گھرانے بھی تھے جو تین تین مہمانوں کو اپنے گھروں میں لے گئے تھے۔ کانفرنس اگلے روز شروع ہونی تھی لیکن اس میں ان سب کا شریک ہونا ضروری نہیں تھا۔ صرف لیڈروں نے اکٹھے ہو کر بات چیت کرنی تھی۔ وہ دو سو آدمی جو مسلح تھے وہ تجربہ کار گوریلے تھے۔ کانفرنس میں حملہ پلان کر کے یہیں سے اس پر عمل کیا جانا تھا۔

اگلی صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ میں اور عاشق علی باہر کھڑے تھے۔ ہمیں پتہ چلا تھا کہ ناسوشن رات کو آ گیا ہے۔ ہم اُسے دیکھنا چاہتے تھے۔ عثمان نے بتایا تھا کہ وہ ہم دونوں کو ناسوشن سے ملوائے گا۔ اس نے بتایا کہ ناسوشن انڈین آرمی کے بھگوڑے مسلمانوں سے مل کر بہت خوش ہوتا ہے اور ان کی بہت ہی قدر کرتا ہے۔

○

اس گوریلا پارٹی کے دو انڈین آرمی کے مسلمان باہر آئے جو پارٹی ناسوشن سے پہلے یہاں پہنچی تھی۔ وہ دونوں پنجابی تھے اور ہمارے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ ایک دوسرے کا تعارف ہُوا اور اتنے میں ایک ہوائی جہاز کی آواز سنائی دی۔ ہم چاروں نے اس طرف دیکھا۔ دُور سے ایک لڑاکا ہوائی جہاز نیچی پرواز کرتا ہماری طرف آ رہا تھا۔

ہمارے سروں پر پہنچ کر ہوائی جہاز اُٹھا اور کچھ آگے جا کر بائیں کو مُڑا۔ اس کی بلندی اتنی کم تھی کہ اس کے پروں کے نیچے لگے ہوئے دو بم ہمیں صاف نظر آئے۔ یہ ایک انجن والا لڑاکا بمبار ہوائی جہاز تھا۔ بائیں کو مُڑ کر وہ پھر بائیں کو مُڑا۔ اب اس کی بلندی زیادہ تھی۔ اس بلندی سے وہ غوطے میں آیا۔ میں نے اس کے پروں کے نیچے سے

دونوں بم الگ ہوتے دیکھے جو بڑی تیزی سے نیچے کو آنے لگے۔ ہوائی جہاز وہیں سے پُل اپ PULL UP کر کے ہمارے اوپر سے گزر گیا۔

ہم چاروں فوجی تھے، ٹریننگ کے مطابق جونہی ہم نے بم نیچے آتے دیکھے، ہم پلک جھپکتے پیٹ کے بل زمین پر گرے اور دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر دبا لئے۔ بم کے دھماکے سے بچنے کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ زمین پر پیٹ کے بل لیٹ جاؤ اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس لو یا کانوں پر ہاتھ رکھ لو۔ ہمیں ابھی یہ معلوم نہیں تھا کہ بم کس جگہ گریں گے۔ ایک توقع یہ بھی تھی کہ ہمارے اوپر گریں گے یا ہمارے بالکل قریب۔

اتنا شدید اور زوردار دھماکہ ہُوا کہ کان ہاتھوں سے بند رکھنے کے باوجود بالکل ہی بند ہو گئے جیسے ان کے پردے پھٹ گئے ہوں۔ کانوں میں ساں ساں کی آوازیں آنے لگیں۔ زمین اتنے زور سے ہلی جیسے زمین کے نیچے سے مجھے کسی نے دھکا دیا ہو۔ یہ پانچ سو پونڈ کے بم تھے۔ پھٹنے کے بعد ہمیں ان کے اڑتے ہوئے ٹکڑوں کے زناٹے اور شائیں سنائی دیں اور پھر میں نے یوں محسوس کیا جیسے ہوا کے طوفانی جھونکے نے ہمیں اُس طرف بڑی زور سے دھکیلا ہو جس طرف بم گرے تھے۔

یہ کیفیت چند سیکنڈ رہی اور ہم چاروں جس طرح گرے تھے اسی طرح اپنے آپ کو بڑی تیزی سے اٹھایا اور اُس طرف دوڑے جہاں بم گرے تھے۔ ہم تماشا دیکھنے نہیں جا رہے تھے بلکہ وہاں ہماری شدید اور فوری ضرورت تھی۔ ہمیں ان لوگوں کو سنبھالنا تھا جو ان بموں کی زد میں آئے تھے۔

وہ تمام کی تمام گوریلا فورس جو ناسوشن کے حکم پر یہاں آئی تھی اور تمام ایریا کمانڈر اور دیگر شرکائے کانفرنس اس قدر تیزی سے باہر آئے جیسے پہلے ہی باہر موجود تھے۔ ہمیں لوگوں کی چیخ و پکار سنائی دی۔

خوش قسمتی دیکھئے کہ بم گرے کہاں۔ بارش کے پانی کا ایک خاصا لمبا چوڑا چھپڑ تھا جس میں کناروں تک پانی بھرا ہُوا تھا۔ دونوں بم اس میں گرے اور پھٹے تھے۔ اس چھپڑ کے کناروں سے کچھ فاصلے پر لوگوں کے مکان تھے لیکن اتنے زیادہ نہیں تھے۔ گنجان آبادی چھپڑ سے کچھ دُور تھی۔ یہ ساری آبادی سورابایا کے باہر کی طرف تھی۔ اصل شہر ذرا ہٹ کر آباد تھا۔

چھپڑ کے قریب جو چند ایک مکان تھے وہ جھونپڑے سے تھے طور ان میں لکڑی اور

بانسوں کے بنے ہوئے بھی دو یا تین جھونپڑے تھے۔ یہ سب ملبے کے ڈھیر بن گئے تھے لیکن جو اچھے مکان ان سے ہٹ کر تھے وہ بالکل محفوظ تھے۔

میں آپ کو بم پھٹنے کے اثرات ذرا سمجھانا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہوائی جہاز سے گرایا بم جب زمین سے ٹکرا کر پھٹتا ہے تو اس کے دھماکے کی اس قدر زیادہ قوّت ہوتی ہے کہ ہوا کو بڑی تیزی سے پیچھے کو دھکیلتا ہے' اس حد تک کہ جہاں بم پھٹتا ہے وہاں خلا بن جاتا ہے جسے VACUUM کہتے ہیں۔ خلا کو اپنی فطرت کے مطابق ہوا اس قدر زیادہ تیزی سے آکر پُر کرتی ہے جس تیزی سے رائفل سے نکلی ہوئی گولی جاتی ہے۔ ایک تو مکان بم کے دھماکے سے اس وقت گرتے ہیں جب دھماکہ ہوا کو ہر طرف پیچھے دھکیلتا ہے لیکن یہی ہوا اس قدر تیزی سے آتی ہے کہ کھڑے مکان بھی گر پڑتے ہیں۔ زیادہ نقصان واپس آنے والی ہوا کرتی ہے۔ کوئی آدمی کھڑا ہو تو اُسے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لائے گی۔

امریکی لڑاکا بمبار ہوائی جہاز کے گرائے ہوئے یہ بم اگر خشک زمین پر گر کر پھٹتے تو چھپڑ سے دُور دُور کی آبادی کو ملبے میں بدل ڈالتے لیکن یہ پانی کے اندر پھٹے اس لئے اس کے دھماکے کے اثرات نصف سے زیادہ زائل ہو گئے۔ چھپڑ کے کنارے جو مکان گرے تھے وہ اتنے کمزور نہ ہوتے تو نہ گرتے۔

بموں کے ٹکڑوں سے دو معصوم بچے بُری طرح کٹ کر مارے گئے۔ تین آدمی اور ایک عورت جو چھپڑ کے کنارے کھڑے یا بیٹھے تھے مارے گئے اور پھر ہم سب گرے ہوئے مکانوں کا ملبہ ہٹانے لگے تو تین بوڑھے آدمیوں کی لاشیں ملیں اور چند ایک کو ہم نے زندہ نکال لیا۔ وہ صرف زخمی ہوئے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ چھپڑ میں ایک گائے اور دو بھینسیں اُتری ہوئی تھیں وہ ماری گئیں اور دو تین اور مویشی جو چھپڑ سے پانی پی رہے تھے مارے گئے۔

میں اتنا جانتا ہوں کہ ہوائی جہاز امریکی ایئر فورس کا تھا۔ امریکہ اور برطانیہ کی ایئر فورسوں نے انڈونیشیا میں بمباری سے بہت تباہی مچائی تھی لیکن صرف دیہاتی علاقوں اور جنگلوں میں۔ شہروں پر انہوں نے اس طرح کی بمباری بہت کم کی تھی۔ دیہاتی علاقوں میں وہ اسلئے دیہاتی بستیوں پر بمباری کرتے تھے کہ وہاں گوریلا حرّیت پسندوں کو پناہ اور دیگر مدد ملتی تھی۔

ناسوشن بھی وہاں آگیا تھا اور وہ دوسرے عام لوگوں کی طرح بھاگتا دوڑتا پھر رہا تھا۔ پھر وہ ایک جگہ رُک گیا اور گوریلا کمانڈر اس کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ میں اور عاشق بھی قریب چلے گئے۔ مجھے آج تک وہ جلال یاد ہے جو میں نے اُس کے چہرے پر دیکھا تھا۔

وہ پوچھ رہا تھا کہ یہ ہوائی جہاز کس طرف سے آیا تھا۔ میں آگے ہو گیا۔ مجھے خیال تھا کہ وہ میری زبان نہیں سمجھ سکے گا لیکن پتہ چلا کہ وہ انگریزی ٹھیک ٹھاک بولتا اور سمجھتا ہے۔ عثمان نے آہستہ سے مجھے کہا کہ انگریزی زبان میں بات کرنا۔

میں نے بتایا کہ جہاز فلاں طرف سے آیا تھا اور یہ بھی بتایا کہ میرے تین ساتھی بھی دیکھ رہے تھے۔ میں نے اُس طرف اشارہ کیا جس طرف سے ہوائی جہاز آیا تھا۔

اُس کے منہ سے آواز نکلی — "ملانگ" — پھر وہ اپنے جونیئر کمانڈروں سے مخاطب ہوا اور اپنی زبان میں باتیں کرنے لگا۔ اس نے دو تین مرتبہ ملانگ کہا اور کمانڈروں نے سرہلا کر اس کی تائید کی یا غالباً" شک کا اظہار کیا۔ دو اور آدمیوں نے بھی آکر وہی سمت بتائی جو میں بتا چکا تھا۔ وہ دو آدمی ہوائی جہاز کو آتا دیکھ چکے تھے۔



وہاں اس وقت تو مجھے کچھ پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ یہ لوگ آپس میں کیا باتیں کر رہے ہیں۔ بعد میں یہ سب باتیں عثمان کی زبانی معلوم ہوئیں۔ یہ میں آپ کو سناتا ہوں:

"یہ ہوائی جہاز دوبارہ نہیں اُڑے گا" — ناسوشن نے بڑے اطمینان سے کہا — "اس کے پائلٹ کو بھی زندہ نہیں رہنا چاہئے۔"

اس کے بعد اُس نے کہا کہ ایک ہفتہ پہلے تک ملانگ میں کسی ایئر فورس کا کوئی ہوائی جہاز نہیں تھا۔ اس نے حکم دیا کہ ابھی آدمی بھیجو جو یہ دیکھ کر آئیں کہ وہاں کوئی ایئر فورس آگئی ہے یا وہاں کچھ بھی نہیں پھر دوسرے ہوائی اڈوں سے معلوم کریں گے۔

ملانگ چھوٹا سا قصبہ تھا جو سورابایا کے جنوب کی طرف ستر پچہتر میل دُور تھا۔ عثمان نے بعد میں بتایا تھا کہ وہاں ہوائی اڈا تو نہیں لیکن درخت کاٹ کر کھلی جگہ بنائی ہوئی تھی۔ یہ غالباً" جاپانیوں نے بنائی تھی جسے عارضی ہوائی اڈا کہا جا سکتا ہے۔ ایک رن وے بنا دیا گیا اور اس سے ذرا ہٹ کر ہوائی جہاز کھڑے کرنے کے لئے جگہ بنائی گئی تھی اور

اس کے عملے وغیرہ کے لئے بارکیں بنادی گئی تھیں۔

ناسوشن کے پاس چھوٹا فوجی ٹرک تھا جس پر وہ ہمارے پاس آیا تھا۔ اُس نے اپنے منتخب کئے ہوئے دو آدمیوں سے کہا کہ وہ ملانگ تک جائیں۔ چونکہ میں نے کہا تھا کہ بم گرانے والے ہوائی جہاز کو اچھی طرح دیکھا تھا اس لئے مجھے کہا کہ میں ان کے ساتھ جاؤں اور یقین کرکے واپس آؤں کہ بم گرانے والے ہوائی جہاز ملانگ میں موجود ہیں اور بالکل ایسے ہی ہیں۔ میں نے عاشق علی کو بھی ساتھ لے لیا۔

ہمارے پاس رائفلیں اور سٹین گنیں تھیں جو ہم نے تیار کرکے لوڈ رکھی ہوئی تھیں۔ راستے میں کہیں بھی دشمن کی کسی پارٹی کے ساتھ ہماری ٹکر ہو سکتی تھی۔۔۔۔

راستے میں تین چار مرتبہ ٹرک روکا اور قریب سے گزرنے والے آدمیوں سے پوچھا کہ انہوں نے ایک جہاز سورابایا کی طرف آتا دیکھا ہوگا اور اگر دیکھا ہے تو وہ کس طرف سے آیا تھا۔ چونکہ یہ ہوائی جہاز بہت ہی نیچی پرواز کرتا ہُوا آیا تھا اس لئے ان سب نے رک کر اسے دیکھا تھا۔ ان سب نے بتایا کہ جہاز ملانگ کی طرف سے آیا تھا۔ پھر یہ بھی بتایا کہ ملانگ کی طرف ہی واپس گیا تھا۔

اس طرح ہم ملانگ تک پہنچ گئے۔ ہمارے انڈونیشی ساتھی نے ملانگ کے چند آدمیوں سے پوچھا تو پتہ چلا کہ ملانگ کی لینڈنگ گراؤنڈ پر تین چار دن پہلے ہوائی جہاز آئے ہیں۔ لینڈنگ گراؤنڈ آبادی سے دو میل دُور بنائی گئی تھی۔ ہم وہاں تک چلے گئے۔

وہاں گھنا جنگل تھا۔ ٹرک کچھ دور روک لیا اور ہم پیدل آگے چلے گئے۔ ہمارے سامنے کھلا بلکہ وسیع وعریض میدان تھا جس میں کچا رن وے بنایا گیا تھا۔ کچے کا مطلب یہ ہے کہ اسے سڑک کی طرح پکا نہیں کیا گیا تھا جس طرح ہوائی اڈوں کے رن وے ہوتے ہیں۔ اس سے تھوڑا ہی پرے آٹھ ہوائی جہاز پہلو بہ پہلو کھڑے تھے۔ وہ سب ایک ہی قسم کے تھے اور بم گرانے والا جہاز بھی اسی قسم کا تھا۔ یہ امریکی ایئر فورس کے جہاز تھے۔

وہاں ایئر فورس کے کئی ایک آدمی گھوم پھر رہے تھے اور مختلف کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ ان سے کچھ دُور تین لمبی بارکیں تھیں جن میں اس ایئر فورس کی نفری رہتی تھی۔ میرے انڈونیشی ساتھیوں نے صرف یہ نہیں دیکھا کہ ہوائی جہاز کھڑے ہیں بلکہ وہ مختلف جگہوں اور زاویوں سے ہوائی جہازوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اور کوئی زبان نہیں سمجھتے تھے اس لئے میں ان سے کوئی بات نہ کرسکا۔ اتنا سمجھ گیا کہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ ان

ہوائی جہازوں کو کس طرح تباہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ ہماری طرف دیکھتے اور مسکراتے تھے اور ہم دونوں بھی سرہلا کر مسکرادیتے تھے۔

ہم شام سے کچھ دیر پہلے واپس سورابایا پہنچ گئے۔ میں اور عاشق علی باہر ہی رہے اور وہ دونوں انڈونیشی عثمان کے گھر میں داخل ہوگئے۔ ناسوشن وہیں تھا اور وہ اسے رپورٹ دینے گئے تھے۔۔۔۔ شام کا کھانا کھانے کے بعد مجھے اور عاشق علی کو عثمان نے بلایا۔ ہم فوراً اُس کے پاس پہنچے۔ اس نے بتایا کہ آج رات ایک پارٹی ان ہوائی جہازوں کو تباہ کرنے کے لئے جارہی ہے اور ہم دونوں اس پارٹی کے ساتھ جائیں گے۔

ہمیں اس پارٹی کے کمانڈر سے ملوایا گیا۔ وہ بہت ہی کم اُردو جانتا تھا اور اُس کی انگریزی بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اردو یا انگریزی میں اظہار خیال پوری طرح نہیں کرسکتا تھا۔ اُس نے ہم دونوں کو جو ہدایات دینی تھیں وہ عثمان نے اردو میں ہمیں سمجھادیں۔

ہم دونوں کو ملا کر یہ دس آدمیوں کی پارٹی تھی۔ پارٹی کے ہر فرد کو تین تین گرینیڈ دیئے گئے تھے۔ ہمارے پاس رائفلیں اور سٹین گنیں بھی تھیں۔ پارٹی کے ایک آدمی کے پاس لائٹ مشین گن تھی۔



ہم دن کے وقت بھی اُدھر گئے تھے' واپس بھی آئے تھے اور اب رات کو بھی ملانگ پہنچ گئے تھے۔ ہمیں راستے میں کسی نے نہ روکا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ امریکہ اور برطانیہ کی فوجیں بے بس ہو چکی ہیں اور اب ان علاقوں پر اور ان راستوں پر ان کا کنٹرول نہیں رہا۔ کچھ عرصہ پہلے فوجی جس کسی کو چاہتے روک کر چیک کرتے اور پھر آگے جانے کی اجازت دیتے تھے۔ انڈونیشی گوریلوں کی یہ کامیابی تھی کہ انہوں نے دشمن کی فوجوں کو دور پیچھے دھکیل دیا تھا اور ان کا حکم کھوکھلا کردیا تھا۔

آدھی رات سے کچھ پہلے ہم ملانگ پہنچ گئے۔ حریت پسندوں نے یہ قصبہ بھی فوج سے آزاد کرالیا تھا ورنہ ہم اتنی آزادی سے وہاں گھوم پھر نہ رہے ہوتے۔ اس نقل وحرکت کی آزادی سے جنگِ آزادی میں سہولت حاصل ہوگئی تھی۔ ہم ٹرک میں ہی بیٹھے رہے اور پارٹی کمانڈر اُتر کر کہیں چلا گیا۔۔۔۔ کچھ ہی دیر بعد وہ واپس آیا اور اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ کمانڈر کے کہنے پر ہم ٹرک سے اُترے اور وہ دو آدمی ہمیں تپاک سے ملے۔ معلوم ہُوا کہ ٹرک یہیں چھوڑنا ہے اور آگے ٹارگیٹ تک پیدل جانا ہے۔

پارٹی کمانڈر نے ہمیں آخری بار ہدایات دیں جو پہلے دی جا چکی تھیں۔ مجھے اور عاشق علی کو عثمان نے یہ ساری باتیں اُردو میں سمجھا دیں تھیں۔ ہمیں بتا دیا گیا تھا کہ ہوائی جہاز کس طرح تباہ کئے جائیں گے۔ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ٹارگیٹ پر پہنچنے کے بعد اتنی خاموشی برقرار رکھنی ہے کہ کھانسی بھی نہ آئے اور چھینک پر بھی قابو رکھا جائے۔ یہ تو ہمیں اندازہ تھا کہ ان ہوائی جہازوں کی حفاظت کے بڑے سخت انتظامات ہوں گے۔ رات کے وقت وہاں سنتریوں کا ہونا تو لازمی تھا۔

پیدل چلتے ہوئے ہم اُس جگہ پہنچ گئے جہاں سے دن کے وقت ٹرک روک کر ہوائی جہاز دیکھے تھے۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ وہاں جنگل تھا۔ ہمیں ایک سہولت یہ بھی حاصل تھی کہ راتیں تاریک ہُوا کرتی تھیں۔ اُن دنوں چاند آدھی رات کے بعد اُفق سے اوپر آیا کرتا تھا۔

ایسا ممکن نہیں تھا کہ ہم سیدھے ہوائی جہازوں تک جا پہنچتے۔ ہمارے سامنے کھلا میدان تھا۔ کوئی آڑ اور کوئی اوٹ نہیں تھی۔ ہوائی جہازوں پر پہرے کے لئے ایک یا دو سنتریوں کی موجودگی لازمی تھی۔ ہم نے دن کے وقت دیکھا تو نہیں تھا' امکان یہ بھی تھا کہ ہوائی جہازوں کی حفاظت کے لئے قریب کہیں گارد کی پوسٹ ہو سکتی ہے۔ بہرحال ہم ہر قسم کی صورتِ حال سے نبرد آزما ہونے کے لئے تیار تھے۔

ہمیں دُور کا چکر کاٹنا تھا۔ جہاں رن وے اور میدان ختم ہوتا تھا اس طرف سے ہمیں جنگل میں چھپ چھپ کر آگے جانا تھا اور ہم بڑی خاموشی سے قدم پھونک پھونک کر رکھتے اُس طرف چلے جا رہے تھے.... اس طرح ہم سامنے کی طرف پہنچ گئے۔ آگے درخت کچھ دور دور تھے۔ پارٹی کچھ بکھر گئی اور اپنے اپنے طور پر ایک ایک درخت کی اوٹ میں ہوتے ہوئے ہم آگے بڑھتے گئے اور ہوائی جہازوں کے قریب جا پہنچے لیکن مشکل یہ پیدا ہو گئی کہ آگے کوئی آڑ اور اوٹ نہیں تھی۔ اتنی سی سہولت مل گئی کہ گھاس ذرا اونچی تھی جس میں لیٹ کر آدمی چھپ سکتا تھا اور کچھ جھاڑیاں بھی تھیں۔ چاند اُفق سے نکل آیا تھا۔ اس کے زیادہ اوپر آ جانے سے پہلے ہمیں اپنا کام ختم کرنا تھا کیونکہ چاند اُن دنوں پورا تھا اور اوپر آنے کی صورت میں روشنی ہمارے لئے خطرناک تھی۔ ہم لیٹ کر کہنیوں اور گھٹنوں کے بل گھاس میں سرکنے لگے۔ ہم ایک دوسرے کے پیچھے تھے اور درمیانی فاصلہ زیادہ رکھا تھا۔

ہوائی جہاز کم و بیش ایک سو گز دُور تھے اور اب کچھ کچھ نظر بھی آنے لگے تھے۔ یہ بھی نظر آ گیا کہ ایک پٹرول ٹینک بھی کھڑا تھا۔ یہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا آپ سڑک پر دیکھا کرتے ہیں۔ اس کے ذریعے پٹرول پمپوں کو پٹرول سپلائی کیا جاتا ہے۔ یہ ٹینک ہمارے قریب تھا۔ ہوائی جہاز اس سے آگے تھے۔ ہم رینگتے گئے اور پٹرول ٹینک سے چند ہی قدم دور رہ گئے۔

ہلکے ہلکے قدموں اور باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہم سب اس طرح گھاس میں دبک گئے جیسے یہاں کوئی ہے ہی نہیں۔ میں درمیان میں تھا اور عاشق علی میرے ساتھ تھا۔ پٹرول ٹینک کی اوٹ سے دو آدمی آہستہ آہستہ چلتے سامنے آئے۔ انہوں نے کندھوں سے رائفلیں لٹکا رکھی تھیں۔ یہ یقیناً" ایئر فورس کے آدمی تھے جو ہوائی جہازوں پر پہرہ دے رہے تھے۔ ہوائی جہازوں پر پہرہ لازمی تھا کیونکہ اس خطّے میں جنگی صورتِ حال بنی ہوئی تھی اور کسی بھی وقت انڈونیشی گوریلے ان جہازوں کو نقصان پہنچا سکتے تھے بلکہ نقصان پہنچانے آ گئے تھے۔ روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ ان سنتریوں کے چہرے پہچانے جا سکتے تھے۔ ان کے لمبے قد اور ڈیل ڈول سے پتہ چلتا تھا کہ یہ امریکی ہیں۔

وہ دونوں ہمارے قریب آ گئے اور رک گئے۔ انہیں اب پیچھے جانا تھا کیونکہ وہ ہوائی جہازوں سے دور نکل آئے تھے۔ ان میں سے ایک نے نہ جانے کسے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ وہ انڈونیشیوں کو ہی بُرا بھلا کہہ رہا ہو گا۔ ان ہی کی وجہ سے ان کو رات کو پہرہ دینا پڑتا تھا.... ذرا رُک کر وہ اسی طرف چلنے لگے جس طرف سے آئے تھے۔ وہ تیز نہیں بلکہ ٹہلنے کی رفتار سے چلتے تھے' بہت آہستہ آہستہ۔

میرے قریب پیچھے سے دو انڈونیشی اٹھے اور اتنی احتیاط سے اٹھے کہ مجھے ان کی ہلکی سی سرسراہٹ بھی نہ سنائی دی۔ دونوں سنتری اپنی باتوں میں مگن آہستہ آہستہ جا رہے تھے کہ پیچھے سے ایک ایک انڈونیشی نے انہیں جست لگا کر اس طرح پکڑ لیا کہ بایاں بازو گردن میں ڈالا اور بازو کا گھیرا تنگ کر دیا۔ آدمی کو قابو کرنے کا یہی طریقہ ہوتا ہے لیکن یہاں یہ دشواری سامنے آ گئی کہ سنتریوں کے قد خاصے لمبے تھے اور دونوں انڈونیشیوں کے قد چھوٹے تھے۔ ویسے بھی یہ دونوں انڈونیشی کچھ دبلے پتلے تھے۔ انہوں نے امریکیوں کے گلوں میں بازو تو ڈال لئے مگر خنجر نہ چلا سکے کیونکہ دونوں

امریکیوں نے ایسا داؤ کھیلا کہ گوریلوں کے پاؤں زمین سے اُٹھ گئے اور امریکیوں نے دھوبی پٹڑے کے انداز سے انہیں اپنے آگے گرا لیا۔ ہم ہر صورتِ حال کے لئے تیار تھے۔ ہمارے دونوں ساتھی تو امریکیوں کے آگے گر پڑے تھے اور اب یوں ہونا تھا کہ امریکیوں نے رائفلیں کندھوں سے اتار کر ان دونوں کو گولی مار دینی تھی لیکن ہُوا یوں کہ دونوں امریکی سیدھے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک کی گردن میرے بازو کی گرفت میں آ گئی اور دوسرے کی گردن پارٹی کمانڈر کے بازو کے شکنجے میں آ گئی۔

میرا قد ٹھیک ٹھاک تھا اور پارٹی کمانڈر کا قد بھی موزوں تھا۔ ہم دونوں نے بازوؤں کے شکنجے کس دیئے اور دائیں ہاتھ سے خنجر نکال کر دونوں کے پیٹوں میں مارے۔ میں نے اپنے شکار کے پیٹ اور سینے میں تین بار خنجر مارا تھا۔ ہمارے کمانڈر نے بھی اپنے شکار کا پیٹ چاک کر دیا تھا۔

ان دونوں کو چھوڑا تو وہ گر پڑے۔ ہم نے ان کی لاشیں گھسیٹ کر گھاس میں پھینک دیں اور ان کی رائفلیں اور ایمونیشن ان کے پاس ہی رہنے دیا جو واپسی پر ہم نے ساتھ لے جانا تھا۔

ہم مطمئن ہو گئے کہ سنتریوں کو اپنے راستے سے ہٹا دیا ہے لیکن پھر ہمیں قدموں اور باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہماری پارٹی پھر پیچھے ہٹ کر گھاس میں دبک گئی اور ہم آنے والوں کا انتظار کرنے لگے۔ پٹرول ٹینک کی اوٹ سے دو اور امریکی سنتری سامنے آئے اور وہیں رُک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ یہ دونوں غالباً" پہلے سنتریوں کی جگہ آئے تھے اور اب ان کا پہرہ شروع تھا۔ فوج میں اسے سنتریوں کی بدلی کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ رات کو چار سنتری ڈیوٹی پر ہوتے ہوں گے۔ اگر ایسا تھا تو کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ گوریلوں کی دلیرانہ کارروائیوں کے پیشِ نظر اتنے قیمتی ہوائی جہازوں کی حفاظت کا ایسا ہی انتظام ہونا چاہئے تھا۔

ایک نئے آنے والے سنتری نے اپنے ساتھی سے کہا کہ معلوم نہیں وہ دونوں کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ وہ دونوں وہیں کھڑے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ ایک نے کہا وہ کہیں سو نہ گئے ہوں۔ ایک نے بلند آواز میں انہیں پکارا لیکن کوئی جواب نہ پا کر دوسرے نے بھی ہانک لگائی۔ سوائے خاموشی کے انہیں کوئی جواب نہ ملا۔

وہ آگے نہ آئے۔ وہیں سے پیچھے کو مُڑے اور آہستہ آہستہ چل پڑے۔ وہ پٹرول

ٹینک کی اوٹ میں ہوئے تو ہمارا کمانڈر اٹھا۔ اُس نے ایک انڈونیشی کو ساتھ لیا اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دبے پاؤں چلتے پٹرول ٹینک کے دوسرے پہلو تک پہنچ گئے۔ دو اور انڈونیشی اٹھے اور وہ بھی ان کے پیچھے چلے گئے۔ وہ دونوں اس لئے گئے تھے کہ اُن کے اگلے ساتھی ناکام ہو جائیں تو وہ دونوں فوراً" ان کی مدد کو پہنچ جائیں جیسا پہلے ہو چکا تھا۔

ان دونوں سنتریوں نے یوں کیا کہ آگے جانے کی بجائے پٹرول ٹینک کے سامنے چلے گئے اور وہاں سے اُس طرف مُڑ آئے جدھر میرے ساتھی جھکے ہوئے کھڑے تھے۔ یہ تو آمنے سامنے والی خطرناک صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ دونوں امریکیوں نے اپنی رائفلیں کندھوں سے لٹکا رکھی تھیں۔ پیشتر اس کے کہ وہ رائفلیں کندھوں سے اتار کر ہاتھوں میں لیتے اور پھر ان انڈونیشیوں کی طرف نالیاں کرتے' چاروں انڈونیشی مجاہد بجلی کی سی تیزی سے اُن تک پہنچ گئے اور انہیں اپنے نرغے میں لے لیا۔ ان میں سے دو کے پاس ٹامی سب مشین گنیں تھیں' ایک کے پاس سٹین گن اور چوتھے کے پاس رائفل تھی جس کے آگے سنگین لگی ہوئی تھی۔

آپ شاید جانتے ہوں کہ امریکی جنگجو قوم نہیں۔ ہندوؤں کی طرح امریکی بھی بُزدل اور بنئے ہیں۔ عیّاری' مکّاری اور فریب کاری سے کام چلاتے ہیں۔ لڑنا پڑے تو ہجوم کی صورت میں لڑتے ہیں لیکن فرداً" فرداً" لڑائی لڑنی پڑے تو پھر ان کے پاؤں نہیں جم سکتے۔ ہندوؤں کے متعلق آپ کو ایک بات بتاتا ہوں جو آپ نے 1965ء کی جنگ میں دیکھی ہو گی اور 1971ء کی جنگ میں بھی۔ ہندو فوج انتہائی زیادہ نفری سے حملہ کرتی ہے۔ جونہی ان کا جانی نقصان ہونا شروع ہوتا ہے اور نفری کم ہونے لگتی ہے' ان کا حوصلہ ٹوٹ جاتا ہے اور وہ پیچھے کو دیکھنے لگتے ہیں۔ دفاع کی صورت میں وہ سیمنٹ اور کنکریٹ کے بنکروں کے اندر سے ٹھیک فائر کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں بنکروں سے نکلنا پڑے تو پھر وہ حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں۔ یہی حال امریکیوں کا ہے۔ اپنی قوم کو آپ جانتے ہیں کہ جہاں بھی لڑی ہے بہت ہی کم تعداد میں لڑی ہے اور فتح بھی حاصل کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مسلمان کو عسکری روح ورثے میں ملی ہے۔

○

ان دونوں امریکی سنتریوں نے جب دیکھا کہ چار ہتھیاروں کے نرغے میں آ گئے ہیں تو بڑی برخورداری سے اپنے کندھوں سے رائفلیں اتاریں اور ہمارے ساتھیوں کے

حوالے کردیں۔ انہوں نے منہ سے ذرا سی بھی آواز نہ نکالی۔

ان دونوں کو اِدھر ہی لے آئے جدھر پہلے ہی ان کے دو ساتھیوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ لاشیں انہیں دکھائی گئیں تو ان کے چہروں سے صاف پتہ چلتا تھا کہ ان پر خوف طاری ہو گیا ہے۔ ان میں سے ایک نے پوچھا کہ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟ میں نے پہلے بتایا ہے کہ ہمارا پارٹی لیڈر اردو اور انگریزی اتنی تھوڑی جانتا تھا کہ اپنا مدعا بیان نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس امریکی فوجی کی اتنی سی بات سمجھ گیا کہ تم کیا چاہتے ہو۔ میں نے کمانڈر کی طرف دیکھا۔

کمانڈر نے کچھ اشارے کئے' چند لفظ انگریزی کے بولے اور چند اردو کے۔ میں نے اور عاشق علی نے بڑی مشکل سے اس کی بات سمجھی۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ ہوائی جہاز کیسے کھلتے ہیں۔ گرینیڈ ہوائی جہازوں کے اندر پھینکنے تھے تاکہ یہ بالکل تباہ ہو جائیں۔ کچھ دن بعد مجھے معلوم ہُوا کہ یہ کسی کو بھی خیال نہیں آیا تھا کہ جہاز کس طرح کھلتا ہے۔ جہازوں کے نیچے گرینیڈ پھینکنے سے ان کے انجن تباہ نہیں ہو سکتے تھے' باڈی کو نقصان پہنچایا جا سکتا تھا جو مرّمت ہو جاتا تھا۔

میں نے ان امریکیوں سے کہا کہ وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمارے ساتھ چلیں اور سارے جہاز اوپر سے کھول دیں۔ ان دونوں کے پہلوؤں کے ساتھ ٹامی گنوں کی نالیاں لگی ہوئی تھیں۔ انڈونیشی حریّت پسند ٹامی گنوں کی نالیاں ان کے جسموں سے ہٹاتے ہی نہیں تھے۔ دونوں امریکی چپ چاپ آگے چل پڑے۔ میں نے راستے میں پوچھا کہ یہاں اور کوئی سنتری یا حفاظتی چوکی ہے؟ انہوں نے بتایا کہ اور کچھ بھی نہیں اور وہ دونوں پہلے سنتریوں کی جگہ لینے آئے تھے اور انہوں نے واپس چلے جانا تھا یعنی پہلے سنتریوں کی ڈیوٹی ختم ہو گئی تھی۔

آٹھ ہوائی جہاز اس طرح پہلو بہ پہلو کھڑے تھے کہ ان کے پروں کے درمیان چند انچوں کا فاصلہ تھا۔ ایک امریکی سنتری پہلے جہاز کے پر یعنی وِنگ پر چڑھ گیا۔ اس کے اوپر کاک پِٹ (پائلٹ کی سیٹ) تھی۔ اوپر سلائیڈنگ کور تھا۔ یہ پلاسٹک کا بنا ہُوا تھا جو آگے پیچھے سلائیڈ ہوتا تھا۔ امریکی نے اس پر ہاتھ رکھ کر پیچھے کو دبایا تو یہ کور پیچھے چلا گیا اور کاک پِٹ کھل گئی۔ اس طرح آٹھوں جہازوں کی کاک پٹیں کھلوالی گئیں۔ یہ پہلے ہی طے ہو گیا تھا کہ ان ہوائی جہازوں کو کس طرح تباہ کیا جائے گا۔ ناسوشن ان جہازوں سے

واقف تھا۔ میں انڈونیشی مسلمانوں کی عقل اور ذہانت کا تو پہلے ہی قائل تھا لیکن جس طرح ان جہازوں کو تباہ کرنے کا پلان بنا لیا گیا تھا' اس سے تو میں اور زیادہ متاثر ہُوا کہ یہ لوگ کتنی عقل رکھتے ہیں۔

غور کریں' اگر باری باری ہر جہاز میں گرینیڈ پھینکا جاتا تو پہلے ہی دھماکے سے بارکوں میں جو نفری سوئی ہوئی تھی وہ فوراً" بیدار اور مسلح ہو کر پہنچ جاتی اور ہم اگر بھاگ نکلتے تو باقی جہاز محفوظ رہتے لیکن فوج کی بے پناہ فائرنگ سے سب کا بچ کر نکل آنا بھی ناممکن ہوتا۔

ناسوشن نے طریقہ یہ بتایا تھا کہ سارے ہوائی جہاز اوپر سے کھول لئے جائیں اور ہر ہوائی جہاز پر ایک ایک بندہ چلا جائے اور ایک ہی بار آٹھوں آدمی اپنا اپنا گرینیڈ پھینک کر نیچے اُتر آئیں اور بہت تیزی سے جہازوں سے دور بھاگیں۔ ہم نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ ایک ایک آدمی ایک ایک گرینیڈ لے کر ایک ایک ہوائی جہاز کے وِنگ پر چلا گیا اور کمانڈر کے اشارے پر گرینیڈوں سے پِنیں نکال دیں اور جب سب تیار ہو گئے تو کمانڈر کے اشارے پر گرینیڈ تمام ہوائی جہازوں کی کاک پٹوں میں پھینک دیئے گئے۔ تمام آدمی وِنگوں سے کودے اور کئی قدم دوڑ کر زمین پر لیٹ گئے۔

آٹھ گرینیڈ اکٹھے پھٹے تو ان کا دھاکہ پانچ سو پونڈ کے بم جتنا تھا۔

سب اُٹھے اور اس طرف دوڑ پڑے جہاں دو امریکیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ مجھے ٹامی گنوں کے دو لمبے برسٹ فائر ہونے کی آواز سنائی دی جو بالکل قریب تھی۔ جلدی ہی پتہ چلا کہ ہمارے کمانڈر نے یہ گن فائر کی تھی اور دونوں امریکیوں کو مار ڈالا تھا۔

ہمارا مشن مکمل ہو گیا تھا اور اب ہمیں بہت تیزی سے وہاں سے بھاگنا تھا۔ ہوائی جہازوں کو آگ بھی لگ گئی تھی۔ اس آگ کی روشنی میں مجھے دو جہاز نظر آ سکے جو درمیان سے ٹوٹ گئے تھے اور ان کی باڈیاں زمین کے ساتھ لگ گئی تھیں اور ابھی ان کے پٹرول ٹینک پھٹنے تھے۔

ہم وہاں سے بھاگے تو ایک بڑا ہی زور کا دھماکہ ہُوا۔ پیچھے مُڑ کر دیکھا تو پٹرول ٹینک پھٹ گیا تھا اور اس کا شعلہ دور اوپر تک چلا گیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ افسوس ناک بات بھی معلوم ہوئی کہ اپنا ایک انڈونیشی ساتھی بھی پٹرول ٹینک کے ساتھ ہی اُڑ گیا ہے۔ یہ اس طرح ہُوا تھا کہ یہ انڈونیشی جوش میں آکر پٹرول ٹینک پر چڑھ گیا تھا۔ اسے

معلوم ہوگا کہ یہ اوپر سے کھلتا ہے۔ اس نے پٹرول ٹینک کھول لیا اور ایک گرینیڈ اس کے اندر پھینک دیا۔ اُسے غالباً" اندازہ نہیں تھا کہ یہ پٹرول سے بھرا ہُوا ٹینک کس طرح پھٹے گا۔ وہ اوپر سے کودا اور پھر اٹھ کر بھاگنے کی مہلت نہ ملی۔ ٹینک پھٹا اور بے انداز پٹرول اُس پر گرا۔ یہ پٹرول تو اب آگ کا مہیب شعلہ تھا جس نے ہمارے ساتھی کو فوراً" ہی ختم کرڈالا اور اس طرح وہ زندہ جل کر شہید ہوگیا۔

ہم بہت ہی تیز دوڑے۔ ہمیں یقین تھا کہ بارکوں میں سوئے ہوئے امریکی ہم تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ انہیں بیدار ہونا تھا' پھر ہتھیار لینے تھے اور پھر جلتے ہوئے ہوائی جہازوں تک آنا تھا' اتنی دیر میں ہم نے جنگل میں غائب ہو جانا تھا۔

ہم غائب ہو بھی گئے۔ ہم دوڑتے بھی جا رہے تھے اور جلتے ہوئے ہوائی جہازوں کو بھی بار بار دیکھتے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کئی دھماکے ہوئے۔ یہ جہازوں کی ٹینکیاں پھٹ رہی تھیں۔ ایسے مہیب شعلوں کی روشنی میں ہمیں بہت سے امریکی نظر آئے جو اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ اس سے ہمیں اطمینان ہُوا کہ وہ ہمارے تعاقب میں نہیں آرہے اور نہ آئیں گے۔ یہ تو انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ جہازوں کو تباہ کرنے والے کدھر نکل گئے ہیں۔

دوڑ دوڑ کر ہم تھک گئے تو چلنے لگے۔ چاند اتنا اوپر آگیا تھا کہ اس کی روشنی میں خاصی دور تک چیزیں نظر آتی تھیں۔ جنگلاتی علاقوں میں چاندنی بڑی ہی شفاف ہُوا کرتی ہے کیونکہ نمی کی وجہ سے فضا بالکل صاف ہوتی ہے۔ کچھ دور آکر ہم اکٹھے ہونے لگے اور ایک دوسرے کو دیکھنے اور پوچھنے لگے کہ سب خیریت سے ہیں یا کوئی زخمی ہُوا ہے.... سب خیریت سے تھے لیکن ہمارا ایک ساتھی ہم میں نہیں تھا۔ اُسے جس نے زندہ جلتے دیکھا تھا سب کو بتایا کہ جوش میں آکر وہ کیا کارروائی کر بیٹھا تھا۔

سحری کے وقت ہم واپس اُس جگہ پہنچ گئے جہاں اپنا ٹرک چھوڑ کر گئے تھے۔ سحری کا وقت تھا' ہر سو خاموشی تھی۔ پٹرول ٹینک اور ہوائی جہازوں کی ٹینکیوں کے دھماکے ملانگ بستی تک سنائی دیئے تھے۔ بہت سے لوگ جاگ اُٹھے تھے اور گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ وہاں سے انہیں دو میل دور کے شعلے تو دکھائی نہیں دیتے تھے کیونکہ راستے میں جنگل تھا لیکن ان شعلوں نے اُس طرف کا آسمان روشن کر دیا تھا۔ وہاں کا گوریلا کمانڈر جانتا تھا کہ ہم کس مشن پر گئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ ہم سب سے بغلگیر ہو کر ملا اور بے

تحاشہ خوشی کا اظہار کیا۔ ہم ٹرک میں بیٹھے اور واپس چل پڑے۔

○

پَو پھٹ رہی تھی جب ہم واپس سورابایا پہنچ گئے۔ عثمان اور کچھ دوسرے لوگ ہمارے انتظار میں سو بھی نہ سکے تھے لیکن ناسوشن گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ ہمارے کمانڈر نے عثمان کو مشن کی کامیابی کی اطلاع دی تو عثمان کچھ کہے بغیر دوڑ پڑا اور ناسوشن کو جگا کر اسے بتایا کہ پارٹی مشن کی تکمیل کے بعد واپس آگئی ہے۔ ناسوشن بہت بڑا لیڈر تھا' جرنیل بھی تھا اور اسے احمد سوئیکارنو اور سوہارتو کے ساتھ بین الاقوامی شہرت اور اہمیت حاصل ہوگئی تھی لیکن اس کا انداز اللہ کے سپاہیوں جیسا تھا۔ جونہی اسے ہماری کامیابی کی اطلاع ملی' وہ شب خوابی کے لباس میں باہر آیا اور پارٹی کے ہر آدمی کو گلے لگا کر ملا۔

امریکہ جیسے امیر ملک کے لئے آٹھ جہازوں کا نقصان کوئی معنی نہیں رکھتا تھا لیکن اس نقصان کی اہمیت یہ تھی کہ اُس قوم نے اُس کے ہوائی جہاز تباہ کر دیئے ہیں جن کے پاس ایئر فورس تھی ہی نہیں اور توپیں بھی نہیں تھیں اور جن کو وہ دھوکہ دے کر اپنا غلام بنانا چاہتا تھا۔ اس لحاظ سے یہ امریکہ اور برطانیہ کے لئے بہت بڑی چوٹ تھی۔

کچھ دنوں بعد عثمان نے مجھے بتایا تھا کہ احمد سوئیکارنو نے اقوام متحدہ کے نمائندوں سے کہا تھا کہ امریکہ نے شہری آبادی پر بم پھینکے ہیں جس کے جواب میں ہم نے وہ آٹھ جہاز تباہ کر دیئے ہیں جن میں ایک ہوائی جہاز بمباری کرنے آیا تھا۔ اگر آئندہ اس طرح بمباری کی گئی تو ہم اس سے زیادہ نقصان پہنچا کر انتقام لیں گے۔

انڈونیشی حرّیت پسندوں کی انٹیلی جنس کی رپورٹ یہ تھی کہ اتحادی صلیبیوں کی انٹیلی جنس نے معلوم کر لیا تھا کہ فلاں دن فلاں جگہ فلاں وقت ناسوشن سورابایا ایک بڑی ہی اہم کانفرنس کے لئے جا رہا ہے۔ یہ دو بم دراصل ناسوشن پر گرائے گئے تھے۔ بم بڑے صحیح وقت پر گرائے گئے لیکن پائلٹ کو کچھ غلطی لگی اور بم کانفرنس والی جگہ سے دُور پانی میں گرے۔ یہ تھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی مدد۔ اسلام کی آن پر لڑنے والوں کے سروں پر اللہ کا ہاتھ تھا۔

انڈونیشی لیڈروں کا ڈسپلن ملاحظہ فرمائیں۔ ناسوشن کو انٹیلی جنس نے بتایا کہ بم اُس پر گرائے گئے تھے تو یوں نہیں ہُوا کہ ناسوشن اپنے آپ کوئی بیان جاری کر دیتا اور اپنے جذبات اور انتقامی جذبے کا اظہار کرتا۔ ان کا کوئی لیڈر اپنے طور پر کوئی بیان ریڈیو یا اخبار

کو نہیں دیتا تھا۔ ہر بات احمد سوئیکارنو تک پہنچتی اور پھر سرکاری بیان جاری ہوتا تھا۔

ناسوشن تو آیا ہی بہت بڑا آپریشن پلان تیار کرنے کے لئے تھا لیکن اب اُس کی جذباتی حالت یہ تھی کہ وہ بڑا ہی زبردست انتقامی وار کرنے پر تُل گیا تھا۔ امریکیوں کے آٹھ ہوائی جہاز تباہ کر کے اُس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔

○

کانفرنس منعقد ہوئی جس میں صرف ایریا کمانڈر شامل کئے گئے اور ہیڈ کوارٹر کے دو جونیئر کمانڈر بھی شریک ہوئے۔ دو گھنٹوں کے بعد ہم سب کو ایک جگہ اکٹھا کیا گیا اور بتایا گیا کہ ہمارا اگلا مشن کیا ہوگا۔

یہ مشن بڑا ہی خطرناک تھا۔ میں نے پچھلے ایک باب میں ایک گورا رجمنٹ پر ایک شبخون کا واقعہ لکھا ہے۔ اس میں ان کی دو پوسٹیں تباہ کی گئی تھیں اور ندی کا پل اُڑا دیا گیا تھا۔ وہ گورا رجمنٹ کبھی کی وہاں سے جا چکی تھی اور اب امریکہ کی میرین فورس کی ایک بٹالین آگئی تھی جس کی نفری سات آٹھ سو بتائی گئی تھی۔ یہ بھی اطلاع ملی کہ اس بٹالین کے ساتھ ایمونیشن کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے جسے مختلف جگہوں پر اس بٹالین نے استعمال کرنا ہے۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ یہ بٹالین اس لئے یہاں رکھی گئی ہے کہ اس علاقے کے لوگوں پر جنگی طاقت کا رعب طاری کیا جائے۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا کہ اس بٹالین کی چیک پوسٹیں سورابایا تک ہر راستے پر اور اندر بھی قائم کی جائیں گی اور ہر آنے جانے والے کو چیک کیا جائے گا۔

ناسوشن نے اپنی زبان میں اس گوریلا فورس کو جو وہاں اکٹھی کی گئی تھی بڑا ہی جذباتی اور اشتعال انگیز لیکچر دیا لیکن اس کی جذباتیت اور اشتعال انگیزی لیکچر تک ہی محدود تھی۔ اُس نے پلان سنایا تو وہ ایسا حقیقت پسندانہ تھا جیسا ایک بڑے ہی قابل اور کامیاب جرنیل کا ہوتا ہے۔ یہ مختصراً یوں تھا کہ اس امریکی بٹالین پر رات کے وقت حملہ کرنا تھا اور کوشش یہ کرنی تھی کہ اس کے اسلحہ بارُود کے ذخیرے پر قبضہ کیا جائے اور قبضہ ممکن نہ ہو تو اُڑا دیا جائے۔

بات دراصل یہ تھی کہ اقوام متحدہ جو دراصل امریکہ کا اور صلیبی ممالک کا اپنا ادارہ ہے، انڈونیشیوں پر فائر بندی کے لئے دباؤ ڈال رہا تھا اور انہیں فائر بندی پر آمادہ کرنے کے لئے اپنی جنگی طاقت کا بھرپُور مظاہرہ کر رہا تھا۔ دوسری طرف انڈونیشی لیڈر

اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے اقوام متحدہ کو بتا رہے تھے کہ ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ دوسروں کی شرائط ماننے کی بجائے اپنے شرائط دوسروں سے منوائیں۔

ناسوشن کے متعلق بتا چکا ہوں کہ وہ بہت بڑا سیاسی لیڈر اور ہیڈ کوارٹر کا بہت بڑا جرنیل تھا۔ اتنے بڑے جرنیل کا اس آپریشن کے ساتھ اتنا ہی تعلق ہونا چاہئے تھا کہ حکم دیتا کہ یہ اپریشن کرنا ہے اور اسے کامیاب بنانا ہے لیکن وہ اس معاملے میں اتنا سنجیدہ تھا کہ خود اس اپریشن کی نگرانی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دے دی کہ وہ اپنا کام مکمل کر کے واپس آئے گا۔

انڈونیشیا میں جنگِ آزادی کے دوران بڑے ہی خطرناک گوریلا اور کمانڈو اپریشن ہوئے تھے۔ بہادری کے اور حُبّ الوطنی کے ایسے ایسے مظاہرے ہوئے کہ سننے والے حیرت میں ڈوب جاتے ہیں لیکن کسی بھی اپریشن پر اتنی زیادہ نفری استعمال نہیں کی گئی تھی جتنی اب ناسوشن نے تیار کی تھی۔ یہاں میں کئی بار کہی ہوئی بات ایک بار پھر کہوں گا کہ وہ دشمن کی جنگی طاقت کا رعب ماننے کی بجائے دشمن پر اپنی طاقت کا رعب جمانا چاہتا تھا۔

دو سو بڑے ہی تجربہ کار اور منتخب گوریلا مجاہدین باہر سے آئے تھے اور عثمان کے ایریا کے بیس گوریلا مجاہدین اس نفری میں شامل کئے گئے تھے۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں بھی اس فورس میں شامل تھا۔ عاشق علی کے بازو اور ٹانگ کی کمزوری کی وجہ سے اس میں شامل نہ کیا گیا لیکن اُس نے ایسی ضد کی کہ اسے شامل کرنا پڑا۔ اس نے کہا کہ وہ آٹھ ہوائی جہازوں کو تباہ کرنے والی پارٹی کے ساتھ چلا گیا تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ اُسے اس اپریشن میں شامل نہ کیا جائے۔ جذبہ دیکھئے کہ جب عاشق علی کو بتایا گیا تھا کہ اُسے اس فورس میں شامل نہیں کیا جا رہا تو اُس پر خاموشی طاری ہو گئی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ جی میں آتی ہے ایسے ہر گوریلا آپریشن کا ذکر ایسے کروں کہ کوئی بات رہ نہ جائے۔ اپنے ہر ساتھی کے جذبۂ ایثار کا تذکرہ ذرا ذرا سی تفصیلات کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں لیکن طوالت کے ڈر سے بات مختصر کرنا پڑتی ہے۔ آج جب اپنے ملک پاکستان کو اس دگرگوں اور افسوس ناک حالت میں دیکھتا ہوں تو مجھے انڈونیشی حریت پسند اور ان کے شجاعت کے کارنامے یاد آتے ہیں۔

جب حُبّ الوطنی کا جذبہ یاد آتا ہے تو عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے.... ایک

بات کہوں گا جو کسی کو بُری لگے تو اس سے معافی نہیں مانگوں گا۔ بات یہ ہے کہ کبھی کبھی یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے پاکستان پر ولندیزیوں کا قبضہ ہوگیا ہے اور امریکہ اور برطانیہ اُن کی پشت پناہی کر رہے ہیں کہ ولندیزی پاکستانیوں کو اپنا غلام بنائے رکھیں۔

ناسوشن نے کمانڈروں سے کہا کہ وہ آج شام تک آ جائیں اور اس امریکی بٹالین کا کیمپ دیکھ آئیں اور پھر دریا پار جا کر ان کی وہ پوسٹیں دیکھیں جو انہوں نے پُل کے ساتھ بنائی ہیں۔ اس حکم پر پانچ کمانڈر چلے گئے۔ میں نے یہ علاقہ پہلے دیکھا تھا اس لئے دوبارہ بیان نہیں کروں گا۔ ہم نے اسی جگہ ایک گورا بٹالین کو کمر توڑ نقصان پہنچایا تھا۔

شام کے وقت یہ کمانڈر واپس آ گئے۔ میں گورا بٹالین کا ذکر کر رہا ہوں' اس کی صرف دو کمپنیاں اس کیمپ میں آئی تھیں لیکن کمانڈروں نے بتایا کہ امریکی بٹالین کی نفری آٹھ سو کے قریب ہے اور بیرکیں چونکہ کم ہیں اس لئے باقی نفری کو خیموں میں رکھا گیا ہے۔ کیمپ کے اردگرد خاردار تار بچھادی گئی تھی جس کا صرف ایک گیٹ رکھا گیا تھا۔

یہ کیمپ دریا کے کنارے پر تھا۔ بٹالین کی دو مشین گن پوسٹیں دریا کے دوسرے کنارے پر تھیں۔ ان پوسٹوں کے درمیان وہ پُل تھا جسے ہمارے ایک انڈونیشی مجاہد نے اُڑا دیا تھا۔ یہ امریکیوں ہی نے مرمت کر کے قابلِ استعمال بنا دیا تھا۔

حملے کے لئے اگلی رات مقرر کی گئی۔

کشتیوں کا انتظام پہلے سے موجود تھا۔ یہ کشتیاں صرف اس آپریشن کے لئے نہیں تھیں بلکہ یہ عثمان کا انتظام تھا کہ اس کی پارٹیوں کے لئے ہر وقت کشتیاں موجود رہیں۔ دریا کے پار صرف بیس آدمیوں نے جانا تھا۔ ان کے ذمے دشمن کی پوسٹیں تھیں۔ باقی نفری کو دریا کے اپنے کنارے کی طرف رہنا اور کیمپ تک پہنچنا تھا۔ میں اور عاشق بھی ان بیس آدمیوں میں تھے۔ بیس آدمی خاموشی کو برقرار رکھتے ہوئے ٹارگٹ تک پہنچ سکتے تھے لیکن دو سو آدمیوں کو اس طرح بھیجنا کہ کسی کو پتہ نہ چلے' خاصا دشوار کام تھا۔

ان دو سو آدمیوں کو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یہ ٹولیاں اس طرح گئیں کہ فرداً فرداً بکھر کر آگے بڑھیں اور دوسری ٹولیاں ایک دوسری سے دُور دُور رہیں۔ یہاں بھی ہمیں رات کی تاریکی کا فائدہ حاصل تھا۔ دوسرا فائدہ یہ کہ یہ سارا علاقہ جنگلاتی تھا اور اس میں چٹانیں بھی تھیں اور ہری بھری ٹیکریاں بھی تھیں جن پر درخت

تھے اور گھنی جھاڑیاں بھی تھیں۔ اس طرح چھپنے کا قدرتی انتظام اچھا خاصا تھا۔ امریکیوں کا کیمپ کشادہ جگہ پر تھا۔

ہمارا کمانڈر عثمان تھا۔ اگر آپ کو یاد ہو تو گورا رجمنٹ پر شب خون مارنے ہم گئے تھے تو بھی میں عثمان کے ساتھ تھا۔ اس طرح مجھے اس علاقے اور علاقے کے خطروں سے واقفیت تھی۔ اب بھی ہمیں توقع تھی کہ گشتی سنتری ضرور ملیں گے۔ یہ تو ہر فوج کا طریقۂ کار ہوتا ہے۔

اندھیرے میں ہم کشتیوں کے ذریعے دریا پار کر گئے۔ اگلے کنارے پر جا کر پارٹی کو بکھیر دیا لیکن یہ بکھیرنا بھی ایک ترتیب اور تنظیم کے مطابق تھا۔ ہر مجاہد اپنی ذمہ داری سے واقف تھا۔

اس طرح بکھر کر ہم بڑھتے گئے۔ میں' عاشق اور عثمان اکٹھے تھے۔

آگے جا کر ہم چٹانوں اور ٹیکریوں میں پہنچے تو نہ جانے کیوں ایسا ہوگیا کہ میں عثمان اور عاشق سے چند قدم آگے نکل گیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ میرے یہ دونوں ساتھی مجھ سے کتنے قدم پیچھے ہیں اور انہیں میرا علم تھا کہ میں کہاں ہوں۔ آگے ایسے درخت آ گئے جو بہت ہی کم اونچے تھے اور ان کی شاخیں زمین سے تھوڑی ہی اوپر تھیں۔ انہیں ہٹا کر گزرنا پڑتا تھا۔

خاصا آگے جا کر میں ایک ٹیکری سے مُڑا تو قریب سے ہی آواز آئی۔ "ہالٹ"۔۔۔ یہ سنتری کی آواز تھی۔ ساری دنیا میں یہ ہوتا ہے کہ رات کا سنتری کسی کو اپنے علاقے میں دیکھے تو اُسے ہالٹ کہتا ہے اور پھر اسے اچھی طرح دیکھتا ہے کہ یہ کون ہے اور پھر جانے کی اجازت دیتا ہے۔

میں نے اُدھر دیکھا۔ دو سائے میرے قریب ہی کھڑے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگے۔ وہ گشتی سنتری تھے۔ انہوں نے انگریزی زبان میں پوچھا۔ کون ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟.... میں نے فوراً سوچ لیا کہ انگریزی نہیں بولوں گا۔ میرے لئے مشکل یہ تھی کہ میں انڈونیشی نہیں تھا۔ سوچا کہ ان امریکیوں کو یقیناً پتہ ہوگا کہ انڈین آرمی کے ہزاروں مسلمان بھگوڑے ہو کر انڈونیشی حریت پسندوں سے جا ملے ہیں۔ یہ مجھے پکڑ لیں گے اور انگریزوں کے حوالے کر دیں گے۔

وہ میرے بالکل قریب آ گئے۔ عثمان اور عاشق علی میرے پیچھے تھے۔ انہوں نے

سنتریوں کی آواز سن ہی لی ہوگی اور وہ دُبک گئے ہوں گے۔ اللہ نے میری یہ مدد کی کہ دماغ میں بڑی اچھی ترکیب آگئی۔ میں نے ہاتھ اوپر کردیئے۔ اُس رات میرے پاس سٹین گن تھی جس کا سلنگ میں نے کندھے میں ڈال رکھا تھا۔ وہ دونوں میرے اتنا قریب آگئے کہ اپنا منہ میرے منہ کے قریب لاکر مجھے دیکھنے لگے۔ میں آہستہ آہستہ بائیں طرف ہوگیا اور وہ اسی طرح تھوڑے تھوڑے مُڑ گئے۔ میری ترکیب یہ تھی کہ ان کی پیٹھیں عثمان اور عاشق کی طرف ہو جائیں، وہ ہو گئیں۔

ان میں سے ایک نے پوچھا—"انڈین؟"—میں نے سرہلا کر اقرار کیا کہ میں انڈین ہوں۔ دوسرے نے انگریزی میں پوچھا، انگریزی جانتے ہو؟ میں نے سرہلا کر انکار کیا۔ ایک نے جھپٹا مار کر میرے کندھے سے سٹین گن اتار لی۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ یہ امریکی سپاہی اُردو نہیں جانتے۔

"پیچھے آؤ بھائیو"—میں نے ذرا اونچی آواز میں عثمان اور عاشق سے کہا۔

"شٹ اَپ یُو باسٹرڈ انڈین!"—ایک سنتری نے میرے سینے پر گھونسے مارتے ہوئے کہا—"انگلش.... سپیک انگلش!"

میں نے سٹین گن کی میگزینیں بھی انہیں دے دیں اور جھولے میں دو گرینیڈ تھے وہ بھی ان کے حوالے کر دیئے اور پھر اشاروں میں بتانا شروع کردیا کہ میں ان کی زبان نہیں جانتا۔ میں دراصل انہیں اپنی طرف متوجہ رکھنے کے لئے اوٹ پٹانگ اشارے کررہا تھا۔ ان میں سے ایک نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے اور زور سے اس طرح گھمایا کہ میری پیٹھ ان کی طرف ہوگئی۔ پیچھے سے اُس نے مجھے بڑی زور سے لات ماری۔ میں منہ کے بل آگے جاپڑا۔

میں جتنی دیر میں اٹھا اتنی دیر میں ان دونوں امریکیوں کے سینوں میں خنجر اُتر چکے تھے۔ میری چال کامیاب رہی تھی۔ ان امریکیوں کو معلوم نہیں تھا کہ ان کا مقابلہ تربیت یافتہ گوریلوں سے پڑ گیا ہے۔ گوریلوں کا وار اسی قسم کا ہوتا ہے۔ اپنی پاک فوج میں جاکر دیکھیں۔ ایک تجربہ کار فوجی بھی اس طرح وار نہیں کرسکتا جس طرح ایک کم تجربہ کار کمانڈو کرسکتا ہے۔

مجھے عاشق کے متعلق ڈر تھا کہ اُس کا ایک بازو کمزور تھا جسے وہ ٹھیک طرح سے استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ یہ حملہ اس طرح ہُوا کہ عثمان اور عاشق نے ان سنتریوں کو اس

طریقے سے نہیں پکڑا تھا کہ پیچھے سے ان کی گردنوں میں بازو ڈال کر دبا دیتے اور پھر پیٹ اور سینے میں خنجر مارتے۔ اس کی بجائے انہوں نے یوں کیا کہ پیچھے سے انہیں کندھے پر اوپر سے نیچے کو خنجر مارا جو ہنسلی اور کندھے کے درمیان سے گزر کر پھیپھڑوں میں چلا گیا۔ عثمان کے لئے یہ طریقہ ٹھیک تھا۔ اس کا بایاں بازو بالکل ٹھیک تھا اس لئے اس نے بائیں ہاتھ میں خنجر لے کر مارا تھا۔ دونوں سنتری یہ وار اپنے جسموں میں لے کر پیچھے کو مُڑے تو میرے ساتھیوں نے خنجر سینوں میں گھونپ دیئے۔ دونوں سنتریوں کی ہلکی ہلکی آوازیں نکلیں اور وہ پاؤں پر کھڑے رہے لیکن تیسری بار خنجر کھا کر دونوں آہستہ آہستہ گرنے لگے۔ وہ جب گر پڑے تو عثمان نے دونوں کی شہ رگ کاٹ دی تاکہ یہ جلدی ختم ہو جائیں۔

میں نے اپنی سٹین گن اور جھولا لے لیا جس میں دو گرینیڈ تھے۔ ان کے پاس رائفلیں تھیں۔ ہم نے وہ بھی لے لیں اور ان کا ایمونیشن بھی لے لیا۔ عثمان نے کہا ان کی گھڑیاں اتار لو جو ہم نے اتار لیں۔ یہ ایک بہت بڑا خطرہ تھا جسے اللہ کی مدد سے ہم نے جلدی ہی راستے سے ہٹا لیا۔ گوریلا اور کمانڈو ایکشن میں سنتری، خصوصاً "گشتی سنتری بہت بڑی رکاوٹ ہُوا کرتے ہیں۔

ہماری پارٹی کو اپنا مشن شروع کرنے سے پہلے دو گھنٹے انتظار کرنا تھا کیونکہ دریا کے دوسرے کنارے کی طرف دو سو آدمیوں کو کیمپ تک پہنچنا تھا۔ ان کے لئے خاصا وقت درکار تھا۔ انہیں ایک اشارے کا انتظار کرنا تھا۔ اشارہ تھا روشنی راؤنڈ۔ پہلا ہی روشنی راؤنڈ فائر ہونے پر انہوں نے اپنا ایکشن شروع کردینا تھا لیکن یہ راؤنڈ ہماری پارٹی نے فائر نہیں کرنا تھا نہ ہمارے پاس روشنی راؤنڈ ہوتے تھے اور نہ راؤنڈ فائر کرنے والے پستول۔ یہ روشنی راؤنڈ دشمن نے ہی فائر کرنا تھا۔ ہم نے پوسٹ پر ایک خاص طریقے سے حملہ کرنا تھا اور پوسٹ والوں نے پہلا کام یہ کرنا تھا کہ روشنی راؤنڈ فائر کریں گے۔ یہ اشارہ ملتے ہی ہمارے دو سو ساتھیوں نے اپنا ایکشن شروع کردینا تھا۔

○

انتظار والی جگہ پر پہنچے، تو عثمان نے منہ سے مینڈک کی آواز نکالی۔ ہم وہیں رک گئے اور عثمان اپنی پارٹی کے ہر مجاہد کو دیکھنے کے لئے چلا گیا۔ وقت بہت تھا، دو گھنٹے انتظار کرنا تھا۔

عثمان خاصا وقت لگا کر واپس آگیا۔ تمام آدمی اپنی اپنی جگہ پہنچ گئے تھے۔ ہم بار بار گھڑیاں دیکھتے تھے۔ ہمارے پاس ریڈیم والی گھڑیاں تھیں جن کا وقت رات کی تاریکی میں نظر آجاتا ہے.... خدا خدا کر کے پورے دو گھنٹے گزر گئے۔ ہم اٹھے اور دبے پاؤں آگے بڑھنے لگے۔ اندھیرے میں بھی دشمن کی پوسٹیں نظر آنے لگیں۔ دونوں پوسٹیں دریا کے کنارے پر تھیں اور یہ کنارے ریتلے نہیں تھے بلکہ بڑی مضبوط مٹی اور چٹانوں جیسے پتھروں کے تھے اور ان کے ساتھ مشین گن پوسٹیں بنی ہوئی تھیں۔ ہم سمجھ نہ سکے کہ گورا رجمنٹ نے بھی یہیں پوسٹیں بنائی تھیں اور امریکیوں نے بھی وہی جگہیں موزوں سمجھیں۔ غالباً" وہ پُل کو اپنے قبضے میں اور اپنی حفاظت میں رکھنا چاہتے تھے۔ ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ جب سے یہ امریکی بٹالین آئی تھی' اُس نے پُل کو فوجی مقاصد کے لئے ریزرو کر لیا تھا اور شہریوں کو اس پل سے لاتعلق کر دیا تھا۔ شہری بڑی دور کا چکر کاٹ کر ایک اور پل سے آتے جاتے تھے۔

یوں تو ہر انڈونیشی جوان شجاعت میں اپنی مثال آپ ہی تھا لیکن ہماری پارٹی کے دو انڈونیشی غیر معمولی طور پر بہادر اور دلیر تھے۔ ہم جانتے تھے کہ یہ دونوں اپنے مشن پر روانہ ہو چکے ہوں گے۔ ان کا مشن یہ تھا کہ دریا کے کنارے رینگتے ہوئے پوسٹوں تک پہنچنا تھا اور پوسٹوں کے اندر گرینیڈ پھینکنے تھے۔ پھر ہم نے ہلّہ بولنا تھا۔ دونوں پوسٹوں میں نفری پندرہ پندرہ سولہ سولہ جوانوں کی تھی۔ دونوں پوسٹوں میں دو بڑی مشین گنیں تھیں۔ باقی سب رائفلیں' ہلکی مشین گنیں اور سٹین گنیں تھیں۔ گرینیڈوں کا سٹاک تو لازماً" ہو گا۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ یہ پوسٹیں آگ اگلنے والی چٹانیں تھیں۔ اُن پر سامنے سے کھلا حملہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں نے جن دو انڈونیشی حریّت پسندوں کی شجاعت کا ذکر کیا ہے' وہ اپنے مشن پر چلے گئے تھے۔ ہم نے انہیں دیکھا تو نہیں لیکن تصوّر کی آنکھ سے وہ دریا کے کنارے کنارے پیٹ اور گھٹنوں کے بل رینگتے ہوئے اپنے ٹارگٹ کی طرف جا رہے تھے۔

ایسے مشن میں وہی کامیاب ہو سکتے ہیں جو یہ حقیقت قبول کر کے آگے جاتے ہیں کہ زندہ واپس نہیں آنا۔

انتظار کا ایک ایک منٹ ایک ایک گھنٹے کے برابر ہُوا جا رہا تھا۔ آخر دونوں پوسٹوں کے اندر ایک ایک گرینیڈ کا دھماکہ ہُوا۔ یہ گرینیڈ ہمارے ان دو جری اور بے خوف

انڈونیشی جوانوں نے پیچھے سے پوسٹ کے قریب جا کر اندر پھینکے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ ان گرینیڈوں نے پوسٹ کے اندر کی آدمی سے زیادہ نفری کو ہلاک اور شدید زخمی کر دیا ہو گا پھر بھی دونوں پوسٹوں سے مشین گن کا فائر شروع ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک پوسٹ سے روشنی راؤنڈ فائر ہوا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ پوسٹوں کے اندر ابھی کچھ جوان زندہ ہیں۔

مشین گنوں کی نالیوں سے گولیاں نکلتی تھیں تو وہاں شرارے پیدا کرتی تھیں جن سے ان کی نشاندہی ہو رہی تھی۔

ہم سب پلان کے مطابق چٹانوں اور ٹیکریوں کی اوٹ میں آگے بڑھے۔ اتنے میں دونوں پوسٹوں میں ایک ایک گرینیڈ اور پھٹا اور پھر پوسٹیں خاموش ہو گئیں۔ ہم نے دریا کے کنارے جا پوزیشنیں لیں۔ ہم جانتے تھے اب کیا ہو گا۔

سب کام ہمارے پلان کے مطابق ہو رہے تھے۔ پوسٹوں میں گرینیڈوں کے دھماکوں اور مشین گنوں کے فائر سے دریا کے پار امریکی بٹالین جاگ اٹھی اور وہاں ہڑبونگ بپا ہو گئی۔ میں نہیں بتا سکتا کہ اس بٹالین کی ایک کمپنی پوسٹوں کی طرف آئی یا دو کمپنیاں' وہ جتنی نفری بھی تھی ہم اس کے منتظر تھے۔

پُل پر امریکی میرین فورس کی خاصی نفری دوڑتی نظر آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پُل پر ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا جو پوسٹوں کی طرف اڑا آ رہا تھا۔ ہم کنارے پر منتظر بیٹھے تھے۔ جب دیکھا کہ ہجوم خاصا زیاہ ہو گیا ہے تو ہم نے اپنی گنوں کے منہ کھول دیئے۔ میرے کچھ ساتھی پُل سے آگے کنارے پر پوزیشنیں لئے ہوئے تھے۔ دونوں طرفوں سے فائر کھلا تو امریکی ہجوم میں بھگدڑ مچ گئی۔ چیخنے چلّانے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ اس ہجوم میں سے کچھ لوگ آگے کی طرف دوڑے اور کچھ واپس دوڑ پڑے۔ ہم نے فائر جاری رکھا۔

پوری بٹالین اور اس کے افسروں کی توجہ پوسٹوں کی طرف ہو گئی اور پُل پر آنے والوں پر جو فائرنگ ہوئی' اس نے سب کی توجہ اپنی طرف کر لی۔

وہاں بجلی کی روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ قصبوں اور شہروں میں بجلی کی روشنی ٹھیک ٹھاک سب کو ملتی تھی لیکن فوجیوں کی بیرکیں بجلی سے محروم تھیں۔ امریکیوں نے اس قدر روشنی راؤنڈ فائر کر دیئے کہ درختوں اور گھاس کا پتا پتا نظر آنے لگا۔

ہمارے دو سو مجاہدین نے اس ہڑبونگ اور بوکھلاہٹ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کیمپ

کے ارد گرد جو تار بچھائی گئی تھی وہ کئی جگہوں سے کاٹ دی اور کیمپ میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے عقب سے امریکیوں پر فائر کھول دیا۔ وہ خیموں اور بارکوں کی آڑ سے فائر کرتے تھے۔

امریکہ کی میرین فورس اُس وقت بھی شہرت یافتہ تھی اور آج بھی اس کی شہرت ویسی ہی ہے۔ بعض لوگ اسے کریک فورس بھی کہتے ہیں مگر اس کریک فورس کے لئے مجاہدین نے ایسی صورتِ حال پیدا کر دی تھی کہ جم کر لڑنے کے لئے بٹالین کو منظم کرنا محال ہو گیا تھا۔ انڈونیشی حریت پسندوں کا یہ شب خون بڑا ہی کارگر اور امریکیوں کے لئے ظالمانہ تھا۔

گوریلا کمانڈروں کو کیمپ کے نقشوں پر بتا دیا گیا تھا کہ اسلحہ اور ایمونیشن کا سٹور کہاں ہے۔ اس کے لئے الگ پارٹی تھی جسے اس کا کمانڈر وہاں لے گیا۔

وہ ایک بارک تھی جس کے دروازے لوہے کے تھے اور ان پر بڑے بڑے تالے لگے ہوئے تھے۔ اس بارک میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ کوئی روشن دان۔

امریکی سمجھ گئے تھے کہ یہ گوریلوں کا شب خون ہے۔ پوری ایک کمپنی نے اسلحہ بارود کے سٹوروں کو اپنے حصار میں لے لیا۔ انڈونیشی گوریلوں نے اُن پر فائر کیا مگر امریکیوں کا فائر بھی کچھ کم کارگر نہ تھا۔ امریکیوں کی کوشش تھی کہ ان سٹوروں تک گوریلے نہ پہنچیں اور اگر وہ اسلحہ اور ایمونیشن اٹھا کر لے جائیں گے تو ان ہی کے خلاف استعمال کریں گے۔

ایک جگہ بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان گاڑیوں کی چابیاں تو ان کے ساتھ نہیں تھیں کہ گوریلے ان کو چلا کر لے جاتے۔ ایک مجاہد نے یہ کمال کر دکھایا کہ ایک بڑے ٹرک کا سٹارٹنگ سوئچ توڑ کر تار ملا دیئے اور ٹرک سٹارٹ کر لیا۔ گوریلوں میں کچھ ڈرائیور بھی تھے۔ اس ڈرائیور نے اپنی زبان میں پکار پکار کر کہا کہ جو ساتھی گاڑیاں چلا سکتے ہیں وہ آجائیں۔ چار انڈونیشی آگئے۔ اس نے چار ٹرک سٹارٹ کر دیئے اور انڈونیشی گوریلے یہ ٹرک لے گئے۔

پلان کے مطابق گوریلے زیادہ دیر نہ رکے۔ انہیں صرف آدھا گھنٹہ وقت دیا گیا تھا' اس کے بعد انہیں وہاں سے نکلنا تھا۔ چنانچہ وہ فردا" فردا" وہاں سے نکلے اور جنگل میں غائب ہوتے گئے۔

ہمارا مشن ختم ہو چکا تھا۔ ہمارے کمانڈر عثمان نے ہمیں اکٹھا کیا اور ہم دریا کی طرف چلے گئے جہاں کشتیاں ہماری منتظر تھیں۔ ہم کشتیوں میں بیٹھے اور ملاحوں نے ہمیں دوسرے کنارے تک پہنچا دیا۔ ہمارا کوئی ایک بھی ساتھی شہید یا زخمی نہیں ہُوا۔

ہماری پارٹی سب سے پہلے سورابایا اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچی۔ کیمپ پر حملہ کرنے والی پارٹی کچھ دیر بعد واپس آئی۔ وہ ساری پارٹیاں امریکیوں کے ٹرکوں پر آئی تھیں اسی لئے دیر سے پہنچی تھیں کیونکہ جس علاقے سے وہ گزر کر آئی تھیں اس علاقے میں ٹرک مشکل سے ہی آگے بڑھ سکتا ہے۔ پھر بھی وہ ٹرک لے کر ہی آئے۔ وہ پارٹیاں اسلحہ اور ایمونیشن کے سٹوروں تک نہیں پہنچ سکی تھیں لیکن چار ٹرک لے آئی تھیں۔

گوریلوں کی اس دو سو نفری میں سے پندرہ جوان شہید ہو گئے تھے اور زخمی تیس کے لگ بھگ تھے۔ لاشیں تو نہ اٹھائی جا سکیں' زخمیوں کو ساتھ لے آئے۔

اگلے روز انڈونیشی انٹیلی جنس نے اطلاع دی کہ امریکی میرین بٹالین کے تقریبا" پانچ سو جوان مارے گئے ہیں جن میں تین افسر بھی شامل تھے۔ زخمیوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ اس لحاظ سے ہمارا آپریشن سو فیصد کامیاب ہُوا تھا۔

○

اس اتنی بڑی نفری کا شب خون کسی اور مقصد کے لئے مارا گیا تھا۔ میں یہ مقصد پہلے بیان کر چکا ہوں۔ ایک بار پھر بتا دیتا ہوں کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ امریکہ اور برطانیہ پر ایسا وار کیا جائے کہ وہ اس خوش فہمی سے نکل آئیں کہ انڈونیشی مسلمان کمزور ہو گئے ہیں اور جلد یا بدیر ان کے آگے ہتھیار ڈال دیں گے۔ ہم اس مقصد میں کامیاب ہو گئے تھے۔

ناسوشن نے ہم سب کو اکٹھا کر کے خراجِ تحسین پیش کیا تھا اور یہ اُس کے الفاظ تھے کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہیں اور اب اقوامِ متحدہ' امریکہ اور برطانیہ ہمارے مستقبل کے بارے میں بات کرنے سے پہلے کئی بار سوچ لیا کریں گے۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ آٹھ لڑاکا بمبار ہوائی جہازوں کا نقصان امریکہ کے لئے کچھ بھی نہیں مگر یہ نقصان ان لوگوں کے ہاتھوں ہُوا جنہیں امریکہ بہت کمزور سمجھتا تھا۔

ناسوشن اسی روز واپس جکارتہ چلا گیا۔ دوسرے افراد کی جو مختلف گوریلا پارٹیاں آئی تھیں' وہ بھی چلی گئیں۔ عثمان بہت ہی خوش تھا کہ اس کی عزت بڑھ گئی ہے اور کامیابی کا

سہرا اس کے ہیڈ کوارٹر کے سر ہے۔

میں بتا نہیں سکتا کہ میری اس داستان یا سفرنامے یا آپ بیتی کا یہ حصہ قارئین کرام پسند کر رہے ہیں یا نہیں لیکن میں اس حصے کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ میں نے کئی بار کہا ہے کہ میں یہ داستان پڑھنے والوں کو چسکے کی خاطر نہیں سنا رہا۔ آج دیکھ لیں کہ صلیبی اقوام کس بے دردی سے مسلمانوں کا قتلِ عام کر رہی ہیں اور بعض اسلامی ممالک کو انہوں نے اپنی فریب کارانہ چالوں سے غلام بنا لیا ہے۔ انہوں نے صاف الفاظ میں اعلان کر دیا ہے کہ کمیونزم کے بعد ہمیں اسلام سے خطرہ ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ غیر مسلم اقوام اسلام کی بیخ کنی کر رہی ہیں۔ عرب وہ مقدّس خطّہ ارض ہے جہاں سے اللہ کا یہ عظیم دین جلوہ افروز ہوا تھا مگر آج یہ خطّہ امریکہ کو اپنا خدا بنا بیٹھا ہے۔ اس خطّے پر یہودیوں کا آسیب طاری ہو چکا ہے۔

اگر آج مسلمان انڈونیشی حریت پسندوں والا جذبہ اور ملّی غیرت اپنے اندر پیدا کر لیں تو ان صلیبی اقوام کی ہیبت ناک جنگی طاقت کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ ٹھیک کہتے ہیں کہ اسلام ایک ایسی قوت ہے جسے کمزور کرنا ہے۔ اگر ہم مسلمان یہ عقیدہ اپنے دل پر نقش کر لیں کہ اسلام واقعی ایک قوت ہے اور ہماری طاقت اسلام ہی ہے تو اسلام کا بول بالا ہو سکتا ہے اور ہم صلیبی اقوام کو نیچا دکھا سکتے ہیں۔

میں نے آپ کو دکھا دیا ہے کہ انڈونیشی حریّت پسندوں نے امریکہ اور برطانیہ جیسی بڑی طاقتوں کا منہ پھیر دیا تھا۔ آپ یہ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ انڈونیشی حریّت پسندوں کی اصل قوت کیا تھی.... اسلام، اتحاد، لیڈروں کا خلوص اور ایک مقدّس نصب العین.. .. نہ کوئی سیاسی گروہ تھا نہ کوئی مذہبی فرقہ تھا۔ سب مسلمان تھے اور حریّت پسند!

میں آج اس داستان کو لپیٹ اور سمیٹ رہا ہوں۔ میں نے شجاعت اور حُبّ الوطنی کی دیوانگی کے چند ایک واقعات سنائے ہیں جن کا میں عینی شاہد ہوں۔ جنگِ آزادی کے دوران انڈونیشیا میں معجزہ نما کارنامے ہوئے تھے۔ عالم اسلام ان سے بے خبر رہا اور ساری دنیا بے خبر رہی۔ وجہ یہ تھی کہ انڈونیشیا والوں کے پاس ذرائع ابلاغ نہیں تھے۔ تمام تر عالمی میڈیا اور ذرائع ابلاغ یعنی اخبار، رسالے اور ریڈیو وغیرہ امریکیوں اور انگریزوں کے ہاتھوں میں تھے۔ ساری دنیا برطانیہ کے نشریاتی ادارے بی بی سی اور وائس آف امریکہ کو سنتی تھی۔ جرمنی اور فرانس کے نشریاتی ادارے اور خبر رساں ایجنسیاں بھی امریکہ اور

برطانیہ کی طرح انڈونیشیا کے حریّت پسندوں کا بلیک آؤٹ کرتی تھیں اور امریکہ اور برطانیہ کی فوجوں کو خراج تحسین پیش کرتی تھیں کہ یہ فوجیں انڈونیشیا سے بدامنی ختم کر رہی ہیں۔

میں نے بتایا ہے کہ انڈین آرمی کے بے شمار مسلمان جوان انڈونیشی حریّت پسندوں سے جا ملے تھے۔ ان میں سے کسی کو بھی ملیں تو وہ آپ کو ان واقعات سے کہیں زیادہ حیران کن واقعات سنائے گا جو میں سنا چکا ہوں لیکن دنیا والوں کو ان کی خبر نہ ملی۔ میں نے بے شمار واقعات سنے تھے لیکن ان سب کو اپنی داستان میں شامل کرنا ممکن نہ تھا۔ ایسا صرف ایک واقعہ سناؤں گا۔

یہ واقعہ سنانے والا انڈین آرمی کا ایک مسلمان فوجی تھا۔ ناسوشن کانفرنس کے موقع پر دو سو نفری کی جو گوریلا فورس آئی تھی، ان میں بیس انڈین آرمی کے بھگوڑے مسلمان بھی تھے۔ اتفاق دیکھئے کہ ان میں ایک لانس نائیک جمیل تھا جو میرے ہی علاقے کا رہنے والا تھا۔ اگر آپ کو یاد ہو تو میں نے اس کا ذکر پہلے بھی کیا ہے۔ جمیل کے ساتھ میری ملاقات ڈیڑھ پونے دو سال پہلے کوالالمپور میں ہوئی تھی۔ وہ اُس گاؤں کا رہنے والا تھا جس گاؤں میں واجدہ بیاہی گئی تھی۔ آصف اس کا خاوند تھا۔ مجھے امید ہے کہ آپ آصف کو نہیں بھولے ہوں گے۔ وہ تو مجھے اپنا دشمن سمجھتا تھا اور میں نے برما فرنٹ سے اُسے ایسی زخمی حالت میں اُٹھایا اور پیچھے بھجوایا تھا کہ اس کی دونوں ٹانگیں بیکار ہو چکی تھیں۔ آپ یہ واقعہ اس داستان کے پچھلے کسی باب میں دیکھ لیں اور جمیل نے آصف اور واجدہ کی جو باتیں مجھے سنائی تھیں وہ بھی پچھلے ایک باب میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ (حکایت سالنامہ 1996ء ماہ فروری)۔

جمیل میرے پاس دو تین راتیں رہا تھا اور ہم پوری پوری رات بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔ وہ جب انڈونیشیا میں آیا تو اسے ایک دور دراز علاقے کی پارٹی میں بھیج دیا گیا تھا۔ اُس نے اپنے کچھ مشن سنائے۔ وہ سنانے کی ضرورت نہیں۔ وہ ان واقعات سے ملتے جلتے ہیں جن میں سے میں کچھ آپ کو سنا چکا ہوں۔ اس نے تین مہینے پہلے کا ایک مشن سنایا تو میں کچھ دیر اُس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔

میں نے پیچھے ایک باب میں لکھا تھا کہ میرین فورس امریکہ کے بحری جہازوں میں آئی تھی۔ اور جنگی بحری جہاز تھے جو بڑے ہی قیمتی اور سمندری جنگ میں بڑے کار آمد

اور دہشتناک ہوتے ہیں۔

جمیل نے سنایا کہ تین مہینے پہلے جب انڈونیشی لیڈروں کو فائر بندی پر آمادہ کرنے کے لئے اقوام متحدہ نے سفارتی سطح پر زور دینا شروع کیا تو دوسری طرف اتحادیوں نے اپنی جنگی کارروائیاں تیز کردیں تاکہ انڈونیشی لیڈروں کو خوفزدہ کیا جاسکے۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں' انڈونیشی لیڈروں نے بڑی زبردست جوابی کارروائیوں کا پروگرام بنالیا۔ امریکہ کے یہ بحری جنگی جہاز انڈونیشیا کے ایک جزیرے بالی کے ساحل پر لنگر انداز تھے۔ انہیں ایک دوسرے سے دور دور لنگر انداز کیا گیا تھا۔ ان میں سے جو سب سے بڑا تھا وہ ساحل سے کچھ دور لنگر انداز تھا۔

امریکہ کو معلوم تھا کہ ان بحری جہازوں کے لئے کوئی خطرہ نہیں کیونکہ انڈونیشیا والوں کے پاس ایئر فورس تو تھی نہیں نہ ان کے پاس بحری طاقت تھی۔ انڈونیشی لیڈروں نے ہیڈ کوارٹر میں یہ پلان بنایا کہ ان بحری جہازوں میں سے ایک تباہ کرکے ڈبو دیا جائے۔ یہ کام انسانوں نے کرنا تھا اور بظاہر یہ کام مشکل تھا' ناممکن کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

چند ایک تیراک چُنے گئے۔ جمیل نے بھی اپنا نام دے دیا۔ وہ اپنی بٹالین میں تیراکی کے مقابلوں میں شامل ہُوا کرتا تھا۔ آخر چار تیراک منتخب کئے گئے جن میں ایک جمیل بھی تھا۔

ان چاروں کو سمندر میں کشتیوں پر لے جاکر بار بار اتارا گیا اور خُوب مشق کرائی گئی۔ انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ بحری جہاز کو کس طرح تباہ کرنا ہے۔ آخر ایک روز ایک بادبانی کشتی میں چاروں کو بٹھایا گیا۔ وقت رات کا تھا۔ انہیں وہ لباس پہنایا گیا جس کے ساتھ آکسیجن سلنڈر بھی ہوتا ہے اور تیراک کے سر اور منہ پر ماسک چڑھا ہوتا ہے' آنکھوں کے آگے شیشے ہوتے ہیں اور سلنڈر سے آکسیجن اس ماسک میں جاتی رہتی ہے اور تیراک خاصی دیر سمندر میں رہ سکتا ہے۔

انہیں موٹر بوٹ یا لانچ میں بھیجا جاسکتا تھا لیکن رات کے وقت اس کے انجن کی آواز اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ دور سے سنائی دیتی ہے اور اگر یہ استعمال کی جاتی تو بحری جہاز والے دور سے معلوم کرلیتے اور اسے پکڑ سکتے تھے۔ بادبانی کشتی کی کوئی آواز نہیں ہوتی۔ انہیں بارودی سرنگیں دی گئیں۔ یہ مقناطیسی سرنگیں ہوتی ہیں۔ ایک ایسی

بارودی سرنگ بحری جہاز کے نیچے یعنی اس حصے کے ساتھ چپکا دی جائے جو پانی میں ہوتا ہے تو مقناطیس کی وجہ سے الگ نہیں ہوتی۔ اس کا وقت سیٹ کردیا جاتا ہے۔ جو تیراک یہ سُرنگ کسی بحری جہاز کے نیچے چپکاتا ہے وہ اتنا وقت سیٹ کرتا ہے کہ خود وہاں سے دُور کسی محفوظ مقام تک جاسکے۔

سمندر کے اس تھوڑے سے حصے میں جہاں وہ بحری جہاز ساحل سے دور دوسرے جہازوں کے ساتھ کھڑا تھا' اُس زمانے میں شارک مچھلیاں بھی ہوتی تھیں۔ آپ جانتے ہوں گے کہ شارک مچھلی کس قدر خونخوار ہوتی ہے۔ یہ وہیل مچھلی تک پر حملہ کردیتی ہے۔ ان چاروں تیراکوں کو معلوم نہیں تھا کہ وہاں شارک مچھلیوں کا خطرہ ہے پھر بھی انہوں نے پرواہ نہ کی اور کہا کہ سُرنگ جہاز کے ساتھ لگ جائے پھر وہ مر بھی جائیں تو کوئی بات نہیں۔

رات کے وقت ان چاروں کو بادبانی کشتی میں بٹھا کر اور سرنگیں دے کر اللہ حافظ کہہ دیا گیا۔ کشتی دُور کا چکر کاٹ کر مطلوبہ مقام تک پہنچی اور بادبان لپیٹ لئے گئے۔ کشتی کو بحری جہاز کے قریب نہیں لانا تھا بلکہ دُور کھڑا کرنا تھا۔

چاروں تیراک ایک ایک سرنگ اپنے جسموں سے باندھ کر کشتی سے اُترے۔ وہاں سے بحری جہاز کم و بیش ایک میل دور تھا۔ جمیل نے بتایا کہ رات کے وقت وہ سائے کی طرح صاف نظر آرہا تھا۔

چاروں تیراک دیئے گئے ٹارگٹ کی طرف تیرنے لگے۔ جب وہ بحری جہاز کے قریب پہنچے تو ڈبکی لگا گئے اور عین اُس وقت انہیں پتہ چلا کہ ایک شارک مچھلی ان کے ارد گرد گھوم رہی ہے۔ انہوں نے پرواہ نہ کی اور سمندر کے اندر اندر تیرتے ہوئے بحری جہاز تک پہنچ گئے اور سُرنگیں ان جگہوں پر چپکا دیں جو انہیں پہلے ہی سمجھا دی گئی تھیں۔

بحری جہاز کی ایک میگزین ہوتی ہے جس میں گولہ بارُود سٹور کیا جاتا ہے۔ یہ پھٹ جائے تو بحری جہاز دو ٹکڑوں میں کٹ جاتا ہے یا فورا" ڈوب جاتا ہے۔ ایک سُرنگ میگزین کے مقام پر چپکائی گئی۔ انہوں نے پانی کے نیچے نیچے ٹائم سیٹ کرلیا جو وہ اندھیرے میں کرسکتے تھے۔

اتنے بڑے اور لمبے بحری جہاز کے ساتھ چار مقناطیسی سُرنگیں چپک گئیں اور جہاز

والوں کو خبر تک نہ ہوئی۔ چاروں سمندر کے نیچے نیچے واپس تیرنے لگے۔ جمیل نے محسوس کیا کہ اس کے ساتھ تیرنے والے نے اس کا ایک بازو پکڑ لیا ہے پھر اس طرح ہُوا کہ وہ انڈونیشی جمیل کے بازو کو مضبوطی سے پکڑ رہا تھا اور صاف پتہ چل رہا تھا کہ کوئی چیز اُسے پیچھے کو کھینچ رہی ہے۔ پھر اس انڈونیشی کا ہاتھ جمیل کے بازو سے اُکھڑ گیا۔ جمیل نے کسی نہ کسی طرح محسوس کر لیا کہ اس بدقسمت انڈونیشی کو شارک نے پکڑ لیا تھا۔

وہ کشتی تک پہنچ گئے اور ملاحوں نے ان کے ہاتھ پکڑ کر انہیں کشتی میں سوار کرایا لیکن اب وہ چار نہیں بلکہ تین تھے۔ وہاں وہ اپنے اس ساتھی کو پکار نہیں سکتے تھے' وہ تو سمندر سے اُبھرا ہی نہیں تھا۔

انہوں نے کچھ دیر انتظار کیا لیکن وہ زیادہ دیر وہاں رُک نہیں سکتے تھے کیونکہ سرنگیں پھٹنے میں تھوڑا سا ہی وقت باقی تھا۔ اس صورت میں کشتی دُور سے نظر آ سکتی تھی۔ آخر وہ چل پڑے۔ جمیل کو پورا پورا یقین تھا کہ ان کے اس ساتھی کو شارک مچھلی لے گئی ہے۔

کشتی جب خاصی دُور نکل گئی تو سمندر میں اس قدر زوردار دھماکہ ہُوا کہ سمندر کی ایک لہر چند سیکنڈ بعد کشتی سے آ ٹکرائی۔ کشتی ڈول گئی۔ ان حریت پسندوں نے بحری جہاز کی طرف دیکھا۔ جہاز کو آگ لگ گئی تھی۔ اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ میگزین پھٹ گئی تھی اور ایک سُرنگ اس جگہ لگائی گئی تھی جہاں بحری جہاز کے تیل کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ اس جہاز کو اب ڈوبنا ہی تھا۔

یہ ایک بہت بڑی ضرب تھی جو امریکہ کے سر پر پڑی اور امریکہ والے یقیناً" مان گئے ہوں گے کہ انڈونیشی مسلمانوں کو دبا لینا ممکن نہیں۔ اس بحری جہاز کو ڈبونے کا مقصد یہی تھا۔

○

امریکہ کی میرین بٹالین کے کیمپ پر شب خون مارنے کے پندرہ دن بعد یوں ہُوا جیسے اچانک اس سارے منظر پر ایک پردہ گر پڑا ہو اور اب جو پردہ اُٹھا تو کوئی اور ہی منظر سامنے آ گیا.... انڈونیشیا آزاد ہو گیا تھا۔ تاریخ تھی 27 دسمبر 1949ء۔ دنیا ہی بدل گئی۔ میں یہ بیان کر کے آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا کہ انڈونیشیا کے مسلمانوں نے کس طرح خوشیاں منائیں اور کس طرح جشن برپا کئے۔ ہم جو انڈین آرمی کے بھگوڑے ہو کر

ان کے پاس گئے تھے ان کے لئے فرشتے بن گئے۔ ہمیں وہ اس طرح گلے سے لگاتے اور دباتے تھے جیسے پسلیاں ہی توڑ ڈالیں گے۔ بڑی عمر کی عورتیں ہمارے سر اور ماتھے چُومتی تھیں۔ ہر کسی کے چہرے پر آزادی کی خوشی کا جلال تھا۔ بڑی عمر کے آدمیوں اور عورتوں کی آنکھوں میں آنسو تھے' یہ خوشی کی انتہا کے آنسو تھے۔ لیکن یہ آنسو ان بیٹوں کی یاد میں بھی بہہ رہے تھے جو جنگِ آزادی میں شہید ہو گئے تھے۔

آج مجھے وہ سارے مناظر اور جشن اور انڈونیشی مسلمانوں کا پیار یاد آ رہا ہے لیکن یہ میرے جذبات ہیں' انہیں مجھ تک ہی رہنے دیں۔ میں اتنی سی بات کہوں گا کہ انڈونیشیا کی آزادی ضربِ کلیم کا کرشمہ تھی۔

ہم جو انڈین آرمی سے وہاں گئے تھے' انڈونیشیا کے دارالحکومت جکارتہ بلائے گئے اور احمد سوئیکارنو جو آزاد انڈونیشیا کا پہلا صدر بنا تھا' ہمیں خاص طور پر ملا اور اُس نے ہمارے اعزاز میں جشن بھی منایا اور باقاعدہ ہمارا جلوس بھی نکلوایا تھا تاکہ انڈونیشی قوم دیکھ سکے کہ کہاں کہاں کے رہنے والے مسلمان کیسے کیسے خطرے قبول کر کے ان کے ساتھ آن ملے تھے۔

میں اب واپس اپنے وطن آنا چاہتا تھا لیکن فوری طور پر کوئی انتظام نہیں ہو رہا تھا۔ سمندر کے راستے ہی آنا تھا لیکن یہ ابھی ممکن نہ تھا۔ ظاہر ہے یہ انتظام انڈونیشی حکومت کے کرنے والا تھا۔ عثمان مجھے جکارتہ سے واپس سورابایا اپنے گھر لے گیا۔ اُس نے مجھ پر زور دینا شروع کر دیا کہ میں اب ہمیشہ کے لئے وہیں رہوں۔ وہ کہتا تھا کہ میں کسی بھی لڑکی کو پسند کروں وہ میری شادی اس لڑکی کے ساتھ کروا دے گا لیکن مجھے گھر کی یاد ستا رہی تھی۔ اپنے والدین اور بہن بھائی یاد آ رہے تھے۔ والدین کے متعلق میں پریشان تھا کہ وہ نہ جانے کس حال میں جی رہے ہوں گے۔ وہ تو مجھے یقیناً مرا ہُوا سمجھ چکے ہوں گے۔

آزادی کے اعلان کے اگلے ہی روز آمنہ کا باپ ہمارے پاس آیا اور عاشق علی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اُس نے صاف بتایا کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے عاشق علی سے کہا تھا کہ انڈونیشیا آزاد ہو گیا تو وہ اپنی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کرے گا۔ انڈونیشیا آزاد ہو گیا تھا اور آمنہ عاشق علی کی محبت میں تڑپ رہی تھی۔

چند دنوں بعد آمنہ کا باپ پھر آیا۔ اُس نے مجھے اور عثمان کو دعوت دی کہ اُس کی

بیٹی اور عاشق علی کی شادی پر آئیں۔ ہمارے لئے یہ خوشی کا موقع تھا۔ ہم شادی کے دن وہاں پہنچ گئے۔ بڑی سادگی سے ان کا نکاح ہُوا اور جو چند ایک مہمان مدعو کئے گئے تھے' انہیں بڑی پُرتکلف ضیافت دی گئی۔

میں نے عاشق علی سے کہا کہ اب واپسی کا پروگرام بناتے ہیں لیکن عاشق علی نے اپنا فیصلہ سنایا کہ وہ اب انڈونیشیا کو ہی اپنا وطن بنائے گا۔ آمنہ کے باپ نے بھی اسے کہا تھا کہ وہ یہیں رہ جائے۔

عاشق علی نے جو فیصلہ کیا تھا وہ ٹھیک کیا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ ہم دیہاتی لوگ ہیں اور ہماری تہذیب' ہمارا کلچر اور ہمارے لوگ بالکل ہی مختلف ہیں۔ جانے وہ آمنہ کو قبول کرتے ہیں یا نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آمنہ وہاں جا کر پچھتانے لگے کہ یہ محبت تو بہت مہنگی پڑی۔ میں نے اُس کی تائید کی اور اس کا فیصلہ پوری طرح پکا کر دیا۔

ایک عاشق علی ہی نہیں بلکہ بہت سے ہندوستانی اور پاکستانی مسلمان انڈونیشیا میں ہی ہمیشہ کے لئے آباد ہو گئے تھے۔ میں اپنے آپ کو وہاں تاعمر رہنے پر آمادہ نہ کر سکا پھر بھی مجھے تین سال وہاں رہنا پڑا۔ میں وہاں کیسے رہا' کیا کرتا رہا' ان باتوں کو چھوڑیئے۔ یہ میرے ذاتی معاملات تھے اور میں کوئی ایسا بڑا لیڈر یا جرنیل نہ تھا کہ پڑھنے والے میری ان ذاتی باتوں میں بھی دلچسپی رکھتے ہوں گے۔

آخر وہ دن آ گیا جب میں جکارتہ جا کر ایک بحری جہاز میں سوار ہُوا۔ اخراجات انڈونیشی حکومت نے ہمارے سفارت خانے کی معرفت مجھے دیئے تھے۔ اس جہاز نے ڈیڑھ ماہ بعد مجھے کراچی کی بندرگاہ پر اُتارا اور میں جو ایک آزاد ملک سے آیا تھا اپنے آزاد ملک میں داخل ہُوا۔

○

میں نے کراچی سے دور اوپر شمال میں اپنے قصبے تک سفر کے دوران کیا کیا دیکھا' یہ لکھنے لگوں تو ایک کتاب لکھ ڈالوں لیکن اتنا ہی کہوں گا کہ مجھے مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا۔ قوم کا وہ اتحاد جس نے پاکستان بنایا تھا' ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ درجنوں سیاسی پارٹیاں بن چکی تھیں اور اسلام کئی ایک فرقوں میں بٹ گیا تھا۔ صرف یہ خوشی حاصل ہوئی کہ اب ہم آزاد ہیں لیکن قوم اخلاقی قدروں سے بھی آزاد ہو چکی تھی۔ قوم تو ایک لفظ ہے' پاکستانی ایک قوم رہے ہی نہیں تھے۔

میں مزید کوئی اظہارِ خیال نہیں کروں گا نہ کوئی اور رائے دوں گا کیونکہ میں وہی کہوں گا جو پہلے ہی آپ کے دل میں ہے اور آپ خود محسوس کر رہے ہیں۔ میں ایک دلچسپ بات سنا کر اس داستان کو سمیٹ دیتا ہوں۔

میں جب اپنے قصبے میں پہنچ کر اپنی گلی میں داخل ہُوا تو وہ آدمی اور وہ عورتیں جو مجھے دُور سے ہی پہچان لیا کرتی تھیں' مجھے دیکھ کر حیرت زدہ ہو کے رہ گئیں۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں زندہ واپس آ گیا ہوں۔ ہو سکتا ہے میرے بعض محلے داروں نے یہ سمجھ لیا ہو کہ میں ان کے ایک محلے دار کے بالکل مشابہ ہوں جو برما فرنٹ پر مارا گیا تھا۔ بعض نے تو میرے سلام کا جواب بھی نہ دیا۔ ہو سکتا ہے انہوں نے مجھے میری بدروح سمجھ لیا ہو اور دیکھ رہے ہوں کہ میں ابھی غائب ہو جاؤں گا۔

اپنے گھر میں داخل ہُوا تو میری والدہ اور بہن نے چونک کر دیکھا جیسے کوئی اجنبی کوئی غیر مرد بھولے بھٹکے ان کے گھر میں آ گیا ہو۔ بڑی مشکل سے انہیں یقین آیا کہ میں زندہ اور سلامت ہوں اور میں اپنی روح یا بدروح نہیں ہوں۔ پھر آپ ان ماں باپ کی خوشیوں کا اندازہ کر ہی سکتے ہوں گے جنہیں گم شدہ بچہ ایک مدت بعد صحیح سلامت مل گیا ہو۔

"میں تمہیں سب سے پہلے پیر صاحب کے پاس لے جاؤں گا" — میرے والد صاحب نے کہا — "میں نے اُن کی بہت خدمت کی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ تمہارا بیٹا آ جائے گا"۔

ہمارے گھر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ سب حیران تھے اور میرے والدین کو مبارک دیتے تھے کہ اللہ نے مجھے نئی زندگی دے کر واپس گھر بھیج دیا ہے۔

اگلے روز صبح والد صاحب مجھے پیر کے پاس لے جانے کے لئے تیار ہوئے اور مجھے بھی تیار کیا۔ یہ پیر صاحب میرے فوجی دوست حمید کے گاؤں میں رہتے تھے۔ میری اس داستان کا تیسرا باب پڑھ لیں تو آپ کو اس پیر کی ساری باتیں یاد آ جائیں گی (حکایت شمارہ اکتوبر 1994ء)۔ میں نے والد صاحب کو یہ نہ بتایا کہ میں اس پیر کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ان کا دل رکھنے کے لئے میں ان کے ساتھ چلا گیا۔ راستے میں والد صاحب مجھے بار بار یہ ہدایت دیتے تھے کہ پیر صاحب کے پاؤں اور گھٹنے چھونا اور ان کے آگے سر اور نظریں جھکا کر رکھنا' ذرا سی بھی بدتمیزی نہ ہو۔

آخر ہم پیر صاحب کے حضور پہنچ گئے۔ یہ وہی پیر تھا جسے میں نے اور حمید نے ننگا کر کے اور درخت کے ساتھ باندھ کر اتنا پیٹا تھا کہ وہ بے ہوش ہو گیا تھا اور معلوم نہیں وہ زندہ کس طرح رہا تھا۔ اس نے لوگوں کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ اس کے قبضے میں جنات ہیں اور ایک دو جنات باغی ہو گئے تھے اور انہوں نے اسے پیٹا ہے۔ بہتر ہے آپ یہ باب پڑھ لیں۔

میں نے پیر کے پاؤں بھی چھوئے اور گھٹنے بھی چھوئے اور سر جھکایا اور اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ میرے والد صاحب پیچھے بیٹھ گئے۔ میں دنیا کا اور خصوصیت سے اسلام کا حقیقی پہلو دیکھ کر آیا تھا۔ اس پیر کو میں ایک شیطان سے زیادہ کوئی وقعت نہیں دیتا تھا۔ میں اُس کی آغوش میں جُھک گیا۔

"جناب پیر صاحب!" —میں نے سر جھکائے ہوئے سرگوشی کی— "تم مجھے جانتے ہو اور میں تمہیں جانتا ہوں۔ تم میرے باپ کو یہ کہہ کر لُوٹتے رہے ہو کہ تمہارا بیٹا آ جائے گا۔ میں تمہارا پردہ نہیں اٹھاؤں گا' یہ خیال رکھنا کہ میرے ساتھ کوئی بدمعاشی نہ ہو"۔

"نہیں ہو گی یار!" —پیر نے کہا— "تم بھی ذرا زبان بند رکھنا۔ کبھی دوستوں کی طرح ہی آ جایا کرنا۔"

اُس پیر کی مریدی دُور دُور تک پھیل گئی تھی اور پڑھے لکھے لوگ بھی اس کے مرید بن گئے تھے۔ اس نے غنڈے بھی پالے ہوئے تھے اور وہ ایک پاور بن گیا تھا۔

پھر میں آصف کے گھر گیا اور واجدہ کو وہاں دیکھا۔ آصف نے تو مجھے ایسا گلے لگایا کہ چھوڑ ہی نہیں رہا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ واجدہ اس کی پوری پوری خدمت کر رہی تھی۔ واجدہ نے مجھے اتنا ہی کہا' اب شادی کر لو۔

وہ میں نے کر لی اور زندگی بہت اچھی گزری۔

ختم شُد